وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر:۲۲)

تفسیرِ کبیر

از افاضات

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود

رضی اللہ عنہ

جلد دوم

سورۃ بقرہ رکوع ۱۷ تا آخر

نظارت نشرو اشاعت قادیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ   نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

پیش لفظ!

یہ تفسیر جو احباب کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے سورۃ البقرۃ کے اکتیس ۳۱ رکوعوں کی تفسیر پر مشتمل ہے اور چونکہ اس سے پہلے تفسیر کبیر کی ایک جلد جو ابتدائی نو ۹ رکوع کی تفسیر پر مشتمل ہے خود حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے قلم سے شائع ہو چکی ہے اسلئے ان نوٹوں کے ذریعے خدا تعالیٰ کے فضل سے سورۃ بقرہ کی مکمل تفسیر احباب کی خدمت میں پہنچ گئی ہے ــــ یہ تفسیر حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے اُن پُر معارف درسوں کا مجموعہ ہے جو حضور نے ابتدائے زمانۂ خلافت میں قادیان میں دیئے تھے۔ حضور نے اپنے زمانۂ خلافت میں قرآن کریم کے ابتدائی دس پاروں کا دو ۲ دفعہ درس دیا ہے۔ ایک دفعہ جون ۱۹۱۷ء میں اور دوسری دفعہ اگست ۱۹۲۲ء میں۔ یہ درس انہی دنوں قلمبند کیے گئے تھے۔ اور پھر حضور کے ارشاد پر اُن کی ایک مجموعی کاپی تیار کی گئی تھی جس سے انگریزی ترجمۃ القرآن والوں نے بھی فائدہ اٹھایا۔ اب وہی درس اس تفسیر کی شکل میں احباب کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اسجگہ یہ ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آجکل حضور اپنی علالت کیوجہ سے مسودات پر نظر ثانی کا کام نہیں فرما سکتے اور نہ اتنے لمبے مضامین حضور کو سُنائے جا سکتے ہیں اسلئے جسطرح آجکل حضور کے تمام خطبات، تقاریر اور ملفوظات وغیرہ حضور کے ملاحظہ اور نظر ثانی کے بغیر شائع کیے جاتے ہیں اور حضور نے خود اسکی اجازت مرحمت فرمائی ہوئی ہے اسی رنگ میں یہ تفسیر بھی الشرکۃ الاسلامیہ حضور کی اجازت کے ماتحت اپنی ذمہ واری پر شائع کر رہی ہے۔ حضور نے اسپر نظر ثانی نہیں فرمائی۔ اگر اسمیں کسی دوست کو کوئی ایسی بات نظر آئے جو اُسکے نزدیک حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ کی اپنی کسی تحریر کے منافی ہو تو وہ اس سے الشرکۃ الاسلامیہ کو مطلع کر دے۔ اصولاً یاد رہے کہ حضور کی خود نوشت تحریر استناد کے لحاظ سے مقدم ہوگی۔

اس تفسیر میں حضور کے ان معارف کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو حضور نے اپنی تقاریر یا خطبات و تصانیف میں بیان فرمائے ہیں ــــ آخر میں الشرکۃ الاسلامیہ مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب فاضل انچارج شعبۂ زود نویسی کی ممنون ہے کہ انہوں نے حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کے درسوں کے علاوہ حضور کی تصانیف اور خطبات و ملفوظات وغیرہ میں جسقدر قرآنی معارف متفرق طور پر بیان ہو چکے تھے انہیں بھی حضور کی اجازت کے ماتحت اسمیں شامل کر کے اسے حضور کے بیان فرمودہ تفسیری حقائق کا صحیح رنگ میں آئینہ دار بنا دیا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ اسی طرح مکرم مولوی ابو المنیر نور الحق صاحب فاضل بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے اس تمام مسودہ کو دوبارہ بڑے غور کیساتھ پڑھا اور اسکی کاپیاں اور پروف بھی بڑی توجہ سے دیکھے۔ اللہ تعالیٰ ان ہر دو اصحاب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور انہیں بیش از بیش دینی خدمات سرانجام دینے کی توفیق بخشے۔

الشرکۃ الاسلامیہ حقائق و معارف کا یہ نایاب خزانہ احباب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے دعا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تفسیر کو زیادہ سے زیادہ قرآنی انوار اور برکات کی اشاعت کا موجب بنائے اور ایک عالم کو اسکے معارف سے فیضیاب کرے۔ آمین

ربوہ ۲ر دسمبر ۱۹۶۲ء

خاکسار
جلال الدین شمس

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ

اور (اُس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت

إِلَّا ٱللَّهَ قف وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَ

نہ کروگے اور والدین سے احسان (کا معاملہ) کروگے اور (اسی طرح) قرابت دار اور

ٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُوا۟ لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ

یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور (یہ عہد بھی لیا تھا) کہ لوگوں کے ساتھ ملاطفت کے ساتھ کلام کیا کرو

أَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ط ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ

اور نماز کو قائم رکھا کرو اور زکوٰۃ ادا کیا کرو مگر (اس کے بعد) تم میں سے چند ایک

إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿۸۴﴾

کے سوا باقی سب (کے سب) اعراض کرتے ہوئے پھر گئے۔ ۵

مِیْثَاقٌ

۵ **حل لغات**:- مِیْثَاقٌ:- اَلْمِیْثَاقُ عَقْدٌ مُؤَكَّدٌ بِيَمِيْنٍ وَّعَهْدٍ - مِیْثَاقٌ کے معنے ہیں ایسا عہد کرنا جو قسم سے مؤکد ہو۔ (مفردات)

تفسیر:- گذشتہ کئی رکوعوں میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے اُن افعالِ شنیعہ کا ذکر کیا تھا جن کا ارتکاب انہوں نے اپنے انبیاء کے مقابلہ میں کیا۔ اور بتایا تھا کہ یہود کی اِن متواتر نافرمانیوں کی وجہ سے ابراہیمی وعدۂ نبوت بنو اسحاق کی بجائے بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہود صرف اس وجہ سے مجرم نہیں تھے کہ انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں معاندانہ رویہ اختیار کیا اور اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا بلکہ اُن کے جرموں کا ایک لمبا سلسلہ تھا جسکی بنا پر آخر نبوت بنو اسحاق سے نکل کر بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوگئی۔ اگر صرف اس آخری جرم کی وجہ سے انکو نبوت سے محروم کیا جاتا تو بے شک یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ صرف ایک جرم کی وجہ سے بنی اسرائیل کو نبوت سے کیوں محروم کر دیا گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے جرائم کا ایک لمبا سلسلہ بیان فرما کر اس اعتراض کو دور کر دیا اور بتا دیا کہ تمہارے پے در پے گناہوں نے تمہیں اس سزا کا مستحق ٹھہرایا ہے کہ تم کو اس نعمت سے محروم کر دیا جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ بنو اسحاق میں نبوت کا اجراء اُن کی کسی ذاتی فضیلت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ابراہیمی وعدوں کی وجہ سے تھا۔ جب انہوں نے ابراہیمی عہد کو پسِ پشت پھینک دیا تو محض بنو اسحاق کا ایک فرد ہونا انہیں نبوت کے انعام کا مستحق نہیں بنا سکتا تھا۔

اس کے بعد قرآن کریم نے انہیں بتایا کہ تمہارا جرم اب بھی کچھ کم نہیں۔ اس رسول کے آنے سے پہلے تمہاری قوم جو کچھ کیا کرتی تھی وہ تم نے اس رسول کے زمانہ میں بھی جاری رکھا ہے۔ اگر اب بھی تمہاری قوم میں سے کوئی نبی آجاتا تو تم اس سے بھی یہی سلوک کرتے۔ پس تمہارا یہ کہنا کہ ہمارے لئے اس رسول کی تعلیم حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ بنی اسمٰعیل میں سے ہے درست نہیں کیونکہ تمہارا رویہ بتا رہا ہے کہ اگر تم میں سے کسی کو اب بھی نبی بنا دیا جاتا تو تم اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے جیسا کہ تم پہلے آنے والے انبیاء سے کرتے رہے ہو۔

اب اسی رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اس اعلیٰ تعلیم کو جانے دو جس میں تمہیں اس رسول سے اختلاف ہے تم صرف ان افعال کو زیر بحث لاؤ جن کو تم بھی قومی اور اخلاقی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے ہو۔ اور بتاؤ کہ کیا تم ان پر کاربند ہو۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ ہم نے تم سے ایک عہد لیا تھا اور عہد بھی ایسا جو نہایت پختہ تھا۔ جس کے پورا کرنے پر انعام اور توڑنے پر سزا مقدر تھی۔ مگر کیا وہ عہد تم نے پورا کیا؟ اگر تمہارا اپنے مذہب پر بھی عمل نہیں رہا اور ہمارے رسول کا بھی تم انکار کر رہے ہو تو بتاؤ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تم کتنے بڑے مجرم ہو!

اس آیت میں جس میثاق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے کوئی خاص عہد مراد نہیں بلکہ مختلف عہد مراد ہیں جو بنی اسرائیل سے متفرق اوقات میں لئے جاتے رہے اور جن پر عمل کرنے کی بائیبل میں ان کو سخت تاکید کی گئی ہے۔ اسی لئے یہ احکام بائیبل میں کسی ایک جگہ بیان نہیں ہوئے بلکہ متفرق مقامات میں ان کا ذکر آتا ہے۔ قرآن کریم نے ان احکام کا اکٹھا ذکر اس لئے کیا ہے تاکہ ان کو یاد دلایا جائے کہ وہ اپنے مذہب سے کس قدر دور جا چکے ہیں۔ مزید برآں قرآن کریم نے ان احکام کو ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے جو اس کے حُسن کو نمایاں کرنے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور معبود کی پرستش سے بائیبل میں بہت سے مقامات پر روکا گیا ہے بلکہ یہ حکم خود موسیٰؑ کے دس احکام میں بھی پایا جاتا ہے چنانچہ خروج باب ۲۰ آیت ۳ تا ۶ میں لکھا ہے:۔

"میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہو۔ تو اپنے لئے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو اُنکے آگے اپنے تئیں مت جُھکا۔ اور نہ اُنکی عبادت کر کیونکہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں۔ اور باپ دادوں کی بدکاریاں اُن کی اولاد پر جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں تیسری اور چوتھی پشت تک پہنچاتا ہوں۔ پر اُن میں سے ہزاروں پر جو مجھ سے پیار کرتے اور میرے حکموں کو قبول کرتے ہیں رحم کرتا ہوں۔"

(۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم بھی انہیں احکام میں موجود ہے۔ چنانچہ خروج باب ۲۰ آیت ۱۲ میں لکھا ہے:۔

"تو اپنے ماں باپ کو عزّت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہووے۔"

اسی طرح استثناء باب ۲۱ آیت ۱۸ تا ۲۱ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ لکھا ہے:۔

"اگر کسی آدمی کا بیٹا گردن کش اور گرا ہو جو اپنے باپ اور اپنی ماں کی

آواز کو نہ سُنے۔ اور وے ہر چند اُسے تنبیہ
کریں پر وہ ان پر کان نہ لگاوے۔ تب
اُس کا باپ اور اُس کی ماں اُسے پکڑیں
اور باہر لے جا کے اُس شہر کے بزرگوں
کے پاس اور اس جگہ کے دروازے پر لائیں
اور وے اس شہر کے بزرگوں سے عرض
کریں کہ یہ ہمارا بیٹا گردن کش اور مگرا ہے
ہرگز ہماری بات نہیں مانتا۔ بڑا ہی کھاؤ
اور متوالا ہے۔ تو اس کے شہر کے سب
لوگ اس پر پتھراؤ کریں کہ وہ مر جائے
تو شرارت کو اپنے درمیان سے یوں دفع
کیجیو تاکہ سارا اسرائیل سُنے اور ڈرے۔"

(۳) ذی القربیٰ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا
ذکر احبار باب ۱۹ آیت ۱۶ تا ۱۸ میں یوں آتا ہے:-

"تو عیب جوئیوں کی مانند اپنی قوم میں
آیا جایا نہ کر۔ اور اپنے بھائی کے خون
پر کمر نہ باندھ۔ میں خداوند ہوں۔ تو
اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ
رکھ۔ تو البتہ اپنے بھائی کو نصیحت کر
تاکہ تو اس کے سبب خطاکار نہ ٹھہرے
تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلا مت لے
اور نہ ان کی طرف سے کینہ رکھ۔ بلکہ تو
اپنے بھائی کو اپنی مانند پیار کر۔ میں
خداوند ہوں۔"

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ تورات میں تمام رشتہ داروں
کے لئے عام طور پر بھائی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

(۴) بہو سے نیک سلوک کرنیکا ذکر خروج باب ۲۱
آیت ۹ میں اس طرح آتا ہے کہ

"اگر وہ اُس کی منگنی اپنے بیٹے کے
ساتھ کر دے تو وہ اُس سے بیٹیوں کا
سا سلوک کرے۔"

(۵) ہمسایہ سے نیک سلوک کا ذکر احبار
باب ۱۹ آیت ۱۳ میں آتا ہے۔ لکھا ہے:-

"تو اپنے پڑوسی سے دغا بازی نہ کر
نہ اس سے کچھ چھین لے۔"

چونکہ ذوی القربیٰ سے ظاہری قرابت
بھی مراد ہو سکتی ہے اس لئے ہمسایہ کا ذکر کر دیا
گیا ہے۔

(۶) یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر استثنا
باب ۱۴ آیت ۲۹ میں آتا ہے۔ لکھا ہے:-

"مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے
پھاٹکوں کے اندر ہیں آویں اور کھاویں
اور سیر ہو دیں تاکہ خداوند تیرا خدا تیرے
ہاتھ کے سب کاموں میں جو تو کرتا ہے
تجھے برکت بخشے۔"

(۷) مساکین کے متعلق استثنا باب ۱۵ آیت ۱۱
میں یوں حکم ہے کہ

"مسکین زمین پر سے کبھی جاتے نہ
رہیں گے۔ اس لئے یہ کہہ کے میں تجھے
حکم کرتا ہوں کہ تو اپنے بھائی کے واسطے
اور اپنے مسکین کیلئے اور اپنے محتاج کے
واسطے جو تیری زمین پر ہے اپنا ہاتھ کشادہ
رکھیو۔"

(۸) تمام بنی نوع انسان سے نیک سلوک کرنے
کا حکم خروج باب ۲۳ آیت ۱ تا ۷ میں اس طرح ہے:-

"تو کسی کی جھوٹی خبر مت اُڑا۔ تو ظلم
کی گواہی میں شریروں کا ساتھی مت ہو
تو گروہ کی پیروی بدی کرنے میں مت کیجیو

اور تو کسی جھگڑے میں لوگوں کی بہتات کے سبب
اُن کی طرف مائل ہو کے ناحق مت کہیو اور
نہ کنگال کی اُس کے مقدمہ میں طرفداری کیجیو
اگر تو اپنے دشمن کے بیل یا گدھے کو بے راہ
جاتے دیکھے تو ضرور اُسے اُس کنے پہنچائیو
اگر تو اُس کے گدھے کو جو تیرا کینہ رکھتا ہے
دیکھے کہ بوجھ کے نیچے بیٹھ گیا اور تو اس کی
مدد نہ کرنا چاہے تو البتہ اس کی کمک کر۔
تو اپنے محتاج سے اس کے مقدمہ میں انصاف
کو مت پھیریو۔ جھوٹے معاملہ سے دُور
رہیو۔ اور بے گناہوں اور بچوں کو قتل
مت کیجیو۔ کیونکہ میں شریر کی تصدیق نہ
کروں گا۔"

اسی طرح امثال باب ۳ آیت ۳۰ میں لکھا ہے:۔
"اگر کسی نے تجھے نقصان نہ پہنچایا ہو
تو اُس سے بے سبب جھگڑا نہ کرنا۔"

(۹) نماز قائم کرنے کا حکم استثناء باب ۱۳
آیت ۴ میں یُوں ہے کہ
"چاہیئے کہ تم خداوند اپنے خدا کی پیروی
کرو۔ اور اُس سے ڈرو اور اس کے حکموں
کو حفظ کرو۔ اور اس کی بات مانو۔ تم
اُس کی بندگی کرو اور اس سے لپٹے
رہو۔"

اسی طرح استثنا باب ۶ آیت ۱۳ میں لکھا
ہے:۔
"تو خداوند اپنے خدا کا خوف ماننا۔
اور اُسی کی عبادت کرنا اور اُسی کے نام
کی قسم کھانا۔"

(۱۰) زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم خروج باب ۲۳
آیت ۱۰ و ۱۱ میں یوں ہے:۔
"اور چھ برس زمین میں کھیتی کر اور اس
سے جو پیدا ہو جمع کر۔ پر ساتویں برس اُسے
چھوڑ دے کہ پڑی رہے تاکہ تیری قوم کے
مسکین اُسے کھاویں۔ اور جو ان سے بچے
میدان کے چارپائے چریں۔ ایسا ہی تو اپنے
انگور اور زیتون کے باغ کا معاملہ بھی
کیجیو۔"

مگر باوجود ان احکام کے یہود ان کی پرواہ نہیں
کرتے تھے۔ اور ان کے سلوک اپنوں اور بیگانوں سے
خراب ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض
حضرت عزیر کو ابن اللہ قرار دینے لگ گئے تھے۔
جیسا کہ یہود کا صدوقی فرقہ جو یمن کی طرف رہتا تھا
اس شرک میں ملوث ہو چکا تھا۔[۱] اور بعض اپنے
علماء کے ہر ایک حکم کو وحی الٰہی کے طور پر مانتے اور
اپنی کتاب کے احکام کو پس پُشت پھینک دیتے۔
یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ ان کا سلوک نہایت بُرا
تھا۔ اور بنی نوع انسان کی ہمدردی اُن کے اندر
نام کو بھی نہ تھی۔ عبادتوں میں سستی اور زکوٰۃ دینے
سے جی چُراتے تھے۔ جیسے آجکل کے مسلمان ایک
طرف تو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور دوسری طرف
وہ تمام باتیں جو یہود کے متعلق خدا تعالیٰ نے بیان
فرمائی ہیں ان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہود سے تو صرف
یہ عہد لیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت
نہ کرنا۔ لیکن مسلمانوں پر خدا تعالیٰ نے اتنا فضل کیا
کہ اسلام کی بنیاد ہی اس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر
رکھی۔ یعنی اس بات پر کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں

[۱] الملل والنحل جلد اول صفحہ ۹۹

نہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ہر ایک کام خود کر سکتا ہے۔ اُس کو کسی کی مدد کی ہرگز ضرورت نہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ اسلام کی بنیاد لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پر رکھی گئی تھی آج مسلمانوں میں اِس قدر شرک پایا جاتا ہے کہ اور قوموں میں اس کی نسبت بہت کم ہے۔ مسلمان قبروں پر بغیر کسی قسم کے حجاب کے اس طرح سجدہ کرتے ہیں کہ خدا کے آگے سجدہ کرنے والوں میں اور ان میں ذرہ بھی فرق نہیں رہ جاتا۔ مجھے اس بات پر ہمیشہ تعجب آیا کرتا تھا کہ کیا کوئی مسلمان بھی قبر پر سجدہ کر سکتا ہے ؟ اور مَیں باوجود شہادتوں کے اس پر یقین نہیں کرتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ جب ہم چند آدمی ہندوستان میں اسلامی مدارس دیکھنے کیلئے گئے تو لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسہ دیکھکر میرا دل بہت خوش ہُوا۔ اچھے لائق اور عالم اُستاد تھے۔ ہوشیار اور ذہین شاگرد معلوم ہوتے تھے لیکن اس مدرسہ اور دوسرے مدارس کو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس اپنے مکان کی طرف آرہے تھے تو ایک قبر کے سامنے جو آدمی پورا پورا سجدہ کر رہا تھا وہ فرنگی محل کے مدرسہ کا ایک استاد تھا۔ مجھے اس کو دیکھ کر تعجب ہُوا کہ اس نے علم پڑھ کر بھی اس کی کچھ قدر نہ کی۔ اور قبر پر سجدہ کرنے لگ گیا۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اِن آیات میں اسی لئے یہود کا ذکر سنایا تھا کہ ایک دن تم بھی اِسی طرح کرنے لگ گے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہود سے ہم نے یہ بھی اقرار لیا تھا کہ والدین کے ساتھ احسان کرنا۔ یہ بات بھی اِس زمانہ میں مسلمانوں سے بالکل مِٹ گئی ہے۔ یہ تو ضروری سمجھا جاتا ہے کہ والدین اپنی اولاد سے نیک سلوک کریں۔ اُن کی پرورش کریں۔ اُن پر اپنا مال صرف کریں لیکن یہ ضروری نہیں سمجھا جاتا کہ اولاد بھی والدین پر احسان کرے اور اُن کی خدمت بجا لائے۔ اِسی طرح یہود سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ قریبیوں یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ پھر تمام دنیا میں جسقدر لوگ ہیں انکو نیک باتیں کہنا۔ یہ کیسی اچھی اور عمدہ تعلیم تھی کوئی بوجھ نہ تھا۔ کوئی عقل کے خلاف بات نہ تھی لیکن جس طرح یہود نے اِن احکام پر عمل ترک کر دیا تھا اِسی طرح مسلمانوں نے بھی ان احکام پر عمل ترک کر دیا۔ پھر حکم تھا کہ نمازیں پڑھو۔ لیکن دیکھلو آج کتنے مسلمان ہیں جو نمازیں پڑھتے ہیں۔ پھر حکم تھا کہ زکوٰۃ دو۔ مگر بہت تھوڑے ہیں جو اس کے پابند ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہود کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ ان احکام کو سُن کر پھر گئے اور ان پر عمل نہ کیا۔ اِسی طرح اب مسلمانوں نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اِن احکام سے اکثر پھر گئے۔ اسی طرح مسلمان ذوی القربیٰ کو شرکا یعنی دشمنی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن کے ساتھ نیک سلوک کرنیکا حکم دیا تھا اُن سے دشمنی اور لڑائی جھگڑے کئے جاتے ہیں۔ یتیموں کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا حکم تھا لیکن ان کے اموال بڑی دلیری سے کھائے جاتے ہیں۔ مسکینوں کی خبر گیری اُن کا فرض تھا لیکن انہیں حقارت اور نفرت سے دیکھا جاتا ہے۔ تمام بنی نوع انسان کو نیک باتوں کی تلقین کرنا ان کا فرض تھا لیکن اس فرض کی ادائیگی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ وہ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ تم ہمیں کافر کہتے ہو مگر خود یہ کبھی سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اُن کا اپنا عمل اسلام پر کہاں تک ہے۔ مجھے کئی غیر احمدیوں سے گفتگو کرنیکا موقعہ ملا ہے جب اِس قسم کی بحث ہو تو میں اُن سے پُوچھا کرتا ہوں کہ آپ اپنے آپکو کیا سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مسلمان۔ مَیں کہتا ہوں کہ مَیں بھی آپ لوگوں کو مسلمان ہی سمجھتا ہوں۔ مگر آپ یہ بتائیں کہ کیا آجکل مسلمانوں میں اسلامی احکام پر عمل پایا جاتا ہے؟ تو انہیں اقرار کرنا پڑتا ہے

کہ نہیں پایا جاتا ۔ میں کہتا ہوں کہ ہم بھی یہی بات کہتے ہیں کہ آجکل مسلمانوں میں حقیقتِ اسلام نہیں رہی ۔ ورنہ نام کے لحاظ سے تو وہ یقیناً مسلمان ہی ہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ پس جس طرح مسلمان جانتے ہیں کہ چوری ناجائز ہے ۔ جھوٹ اور افتراء ناجائز ہے ۔ دوسروں کے حقوق غصب کرنا ناجائز ہے مگر پھر بھی وہ ان افعال کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود بالکل مطلب پرست اور مشرک ہو گئے تھے اور باوجود اس کے وہ مسلمانوں سے جو ان احکام پر بلکہ اِن سے بڑے بڑے احکام پر عمل پیرا تھے لڑتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ ان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے متعلق تو یہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ ہم ان پر ایمان نہیں رکھتے مگر تورات کے اِن احکام کے متعلق کیا عذر کر سکتے ہو ۔ تمہارا ان احکام کو تسلیم کرنا اور پھر اُن سے کلّی طور پر اعراض اختیار کر لینا بتاتا ہے کہ اب تم میں صداقت باقی نہیں رہی ۔ مگر جیسا کہ قرآن کریم کا طریق ہے اُس نے اِس آیت میں بھی یہود کی بدیوں کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی تمام قوم کو یکساں مجرم قرار نہیں دیا بلکہ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ فرما کر اُن میں سے جو نیک لوگ تھے اُن کو مستثنیٰ کر لیا ہے ۔

اِس آیت کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم میں ہر جگہ ترتیب کے حُسن کو قائم رکھا گیا ہے اِسی طرح یہاں بھی ترتیب الفاظ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا گیا ۔ سب سے پہلے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ میں واحد خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنیکا حکم بیان کیا ہے کیونکہ توحید ایک بنیادی اصل ہے جو تمام انبیاء کا مشترک مشن تھا اور جس کے سمجھنے سے ہی باقی تمام مسائل سمجھے جا سکتے ہیں ۔

اِس کے بعد وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا کا حکم دے کر والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنیکا حکم بیان کیا ہے ۔ کیونکہ والدین کا احسان خدا تعالیٰ کے احسان کا ظل ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا احسان حقیقی ہوتا ہے اور باقی سب احسان ظلّی ہوتے ہیں ۔ اور چونکہ والدین بھی اپنی اولاد کے لئے خدا تعالیٰ کی صفات کے ایک رنگ میں مظہر ہوتے ہیں ۔ اس لئے توحید کے ذکر کے بعد والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ذکر فرما دیا ۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ والدین سے سلوک بھی احسان کے معروف معنوں میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ کیونکہ اس آیت میں احسان کا لفظ عام معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ایک اور معنیٰ میں استعمال ہوا ہے ۔ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ کسی امر کے بدلہ کے لئے بھی وہی لفظ استعمال کر دیا جاتا ہے ۔ جیسے ظلم کے بدلہ کا نام بھی ظلم رکھ دیا جاتا ہے اور اس سے مراد ظلم نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنے صرف ظلم کا بدلہ لینے کے ہوتے ہیں ۔ جیسے اسی سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔ (بقرۃ ع ۲۴) یعنی جو شخص تم پر ظلم کرے تم اُس پر اُسی قدر ظلم کر سکتے ہو ۔ اب یہ امر ظاہر ہے کہ ظلم کا اسی قدر بدلہ لینا ظلم نہیں کہلا سکتا ۔ پس بدلہ لینے والے کیلئے جو اِعْتِدَاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کے معنے محض بدلہ کے ہیں نہ کہ ظلم کے ۔ اِسی طرح احسان کرنے والے کے حق میں جب احسان کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنے بدلۂ احسان کے ہوتے ہیں نہ کہ احسان کے لیکن احسان کرنیوالوں کے سوا دوسرے لوگوں کی نسبت اس لفظ کا استعمال اپنے معروف معنوں میں ہوتا ہے ۔

اس کے بعد ذِی الْقُرْبٰی کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر ہے ۔ کیونکہ ماں باپ سے حسنِ سلوک کے بعد

طبعاً ہر شخص اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتا ہے اور وہ بھی والدین کی عدم موجودگی میں والدین کے قائم مقام سمجھے جاتے ہیں - پھر عام لوگوں کو لیا ہے جنکا احسان حقیقی معنوں میں نہیں ہوتا بلکہ قومی معنوں میں ہوتا ہے - ان میں سے پہلے یتامیٰ کو لیا ہے - یہ خود محسن نہیں ہوتے لیکن ان کے ساتھ احسان اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ بوجہ اپنی کمزوری اور صغر سنی کے اپنے مطالبات کو خود پورا کروانے کی طاقت نہیں رکھتے - اور اُن کے حقوق کو دلیری کے ساتھ غصب کر لیا جاتا ہے - پھر اس لئے بھی وہ محبت اور حسن سلوک کے مستحق ہوتے ہیں کہ وہ اپنے والدین کے سایۂ عاطفت سے بچپن میں ہی محروم ہو جاتے ہیں اور اس وجہ سے وہ قوم کی ایک قیمتی امانت ہوتے ہیں - اگر اُن کی صحیح نگرانی کی جائے - ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے اُنکو آوارگی سے محفوظ رکھا جائے تو وہ قوم کا ایک مفید وجود بن جاتے ہیں - اور نہ صرف انکی اپنی زندگی سنور جاتی ہے بلکہ وہ دوسروں کی زندگیوں کو بھی سنوارنے والے بن جاتے ہیں -

ان کے بعد مساکین کا ذکر کیا - یہ لوگ گو محتاج ہوتے ہیں مگر سوال کے ذریعہ کسی کو اپنی غربت کا پتہ لگنے نہیں دیتے - پس مساکین کا ذکر کر کے اس طرف توجہ دلائی کہ تمہیں یہ طریق اختیار نہیں کرنا چاہیئے کہ جو شخص تمہارے سامنے دست سوال دراز کرے اس کی تو تم مدد کر دو اور جو خاموش بیٹھا رہے اس کو تم نظر انداز کر دو - بلکہ تم ایسے لوگوں کی طرف بھی توجہ رکھو جو غربت کے باوجود اپنے وقار کو قائم رکھتے ہیں اور اخلاقی بلندی کا ثبوت پیش کرتے ہیں -

اس کے بعد تمام بنی نوع انسان کی ہمدردی کا ذکر کیا - اور فرمایا قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا - یہ لفظ حُسْنًا اور حَسَنًا دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن بعض نے فرق بھی کیا ہے - کہ اگر حَسَنًا ہو تو مصدر محذوف کی صفت ہوگا - یعنی قُوْلُوْا لِلنَّاسِ قَوْلاً حَسَنًا - اور اگر حُسْنًا ہو تو حذفِ مضاف ہوگا - یعنی قُوْلُوْا لِلنَّاسِ قَوْلاً ذَا حُسْنٍ (املاء) دونوں صورتوں میں اس کے معنے یہ ہیں کہ تم لوگوں کو ایسی باتیں کہو جو نہایت اچھی ہوں - عام بنی نوع انسان کو بعد میں اس لئے رکھا کہ یہ لوگ یتامیٰ اور مساکین کی طرح محتاج نہیں ہوتے بلکہ اپنی ضروریات کے آپ کفیل ہوتے ہیں - پس سب سے کم احتیاج رکھنے کی وجہ سے ان کو سب سے آخر میں رکھا -

غرض ان تمام احکام میں ایک اعلیٰ درجہ کی ترتیب پائی جاتی ہے - ایک خدا کی پرستش کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا - ایک وہ جو بطور حق نیک سلوک کے مستحق ہیں اور دوسرے وہ جو بطور رحم کے مستحق ہیں - پہلوں کا مقدم ذکر کیا کیونکہ وہ ایک قرضہ کی ادائیگی کی سی صورت تھی - اور جو بطور رحم احسان کے مستحق تھے ان کو بعد میں رکھا - اور پھر جو شخص جس قدر رحم کا محتاج تھا اُسی درجہ پر اُس کا ذکر کیا - اس کے بعد عبادات کو لیا - اور اُن میں سے بدنی اور مالی عبادات کی سردار عبادات نماز اور زکوٰۃ کو چن لیا - اور اس کا ذکر بنی نوع انسان سے حسن سلوک کے بعد اس لئے کیا کہ بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک روحانیت کی طرف پہلا قدم ہے اور انسان کو کئی مواقع پر فطرتاً بغیر کسی شریعت کے اس کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے اور عبادات کا تفصیلی طور پر بجا لانا ایک دوسرا قدم ہے - پس جو شخص پہلا قدم اٹھائیگا - وہی دوسرا قدم اُٹھا سکیگا -

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کبھی تو وقعت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے حقوق کا پہلے ذکر کر دیتا ہے

اور بندوں کے حقوق کا بعد میں ذکر کرتا ہے۔ اور کبھی بندوں کے حقوق کا پہلے ذکر کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کو بعد میں رکھتا ہے۔ درجہ کے لحاظ سے چونکہ اللہ اعلیٰ ہے اور انسان ادنیٰ اس لئے اللہ تعالیٰ کے حقوق کا ذکر پہلے رکھا جاتا ہے۔ اور بندوں کے حقوق کو بعد میں۔ مگر جہاں بندوں کے حقوق کا ذکر پہلے ہوتا ہے وہاں ان کی کمزوری کو مدّنظر رکھ کر پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کمزور نہیں بلکہ طاقتور ہے اس لئے اس کے حقوق کا بعد میں ذکر کیا جاتا ہے۔ جیسے اسی آیت میں یتامیٰ کی کمزوری کے لحاظ سے ان کا پہلے ذکر کیا گیا ہے اور مساکین کا بعد میں ذکر کیا گیا ہے لیکن اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا حق بیان فرمایا ہے اور بعد میں بندوں کا حق بیان کیا ہے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ میں استقلال کے ساتھ بغیر کسی ناغہ کے نماز ادا کرنا شامل ہے۔ اور نوافل اس کے تابع ہیں اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ میں صدقہ و خیرات بھی شامل ہیں۔ جو زکوٰۃ کے تابع ہے۔ گویا بدنی اور مالی دونوں قسم کی عبادات کی ادائیگی کا اس آیت میں ذکر فرما دیا۔

بہرحال قرآن کریم نے بائیبل کے پراگندہ احکام کو ایسی عجیب ترتیب دی ہے کہ جس سے ان احکام کی عظمت اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ اوّل خدا تعالیٰ کی عبادت کو لیا کہ وہ سب سے اعلیٰ ہے۔ پھر بندوں سے حُسن سلوک کا ذکر کیا۔ اور اُن میں سے بھی پہلے والدین کا ذکر کیا جو بطور حق کے حسن سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ پھر قریبیوں اور رشتہ داروں کو رکھا۔ جنکا مقام والدین کے بعد دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد عام لوگوں کو لیا۔ اور اُن میں سے پہلے اُن کا ذکر کیا جو اپنی خبرگیری آپ کرنے کے قابل نہیں ہوتے یعنی یتامیٰ۔ پھر مساکین کو لیا جو بوجہ خود طاقت رکھنے کے اسقدر مدد کے محتاج نہیں ہوتے جس قدر کہ یتامیٰ۔ اس کے بعد قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا فرما کر سب لوگوں سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا۔ جس میں دو امور شامل تھے۔ اوّل تمام بنی نوع انسان سے مذہب و ملّت کے امتیاز کے بغیر حسن سلوک۔ دوّم بنی نوع انسان کی ترقی کی فکر اور دوسرے لوگوں کو اس کی تلقین۔ پھر یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جب تم خدا اور اس کی مخلوق دونوں کے حقوق توڑتے ہو اور ان احکام کی پرواہ نہیں کرتے حالانکہ تم انکو تسلیم کرتے ہو تو یہ کس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ تم ان حالات میں مومن ہو۔ اور وہ قوم جو دنیا کی اصلاح کر رہی ہے کافر ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ تمہارا خدا تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور تم صداقت سے بہت دُور جا چکے ہو۔

اسجگہ اس سوال پر روشنی ڈالنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں لَاتَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰہَ کہنے کی بجائے لَاتَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ کیوں فرمایا ہے۔ اگر لَاتَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰہَ کہا جاتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ تم نے خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کی پرستش نہیں کرنی۔ مگر کہا یہ گیا ہے کہ لَاتَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ یعنی ہم نے انہیں کہا کہ تم خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کی پرستش نہیں کرو گے۔ گویا بجائے نہی پر زور دینے کے اُن سے اس توقع کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی کے سامنے سربسجود نہیں ہونگے۔ پس طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں خدا تعالیٰ نے یہ نرالا طریق کیوں اختیار کیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم اور عام عربی زبان کا یہ محاورہ ہے کہ بعض دفعہ نہی پر زور دینے کے لئے نہی کی بجائے نفی استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ بات زیادہ زوردار طریق پر ذہن نشین کروائی جا سکے۔ اس کی مثال ہماری زبان میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہم بعض دفعہ ایک بچّہ کو بجائے یہ کہنے کے کہ تم ایسا مت کرو یہ کہتے ہیں کہ مَیں اُمید کرتا ہوں کہ تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ یا کہتے ہیں کہ مَیں تو یہ خیال بھی نہیں کر سکتا کہ تم ایسا کرو گے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ طریق نہی سے زیادہ مؤثر ہے۔

یہی طریق اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اختیار فرمایا ہے۔ اور لَا تَعْبُدُوْا اِلَّا اللّٰہَ کہنے کی بجائے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ فرما کر اپنے اس یقین اور اعتماد کا اظہار کیا ہے کہ تمہارے متعلق تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم شرک کروگے۔ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تم ہمیشہ اُسی کی عبادت کیا کروگے۔ گویا یہ کام صرف بُرا ہی نہیں بلکہ ایک اور وجہ بھی ہے جس کی وجہ سے تمہیں اس سے بچنا چاہیئے۔ اور وہ ہمارے اور تمہارے تعلقات ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ تم ان تعلقات کی وجہ سے ایسا کبھی نہیں کروگے۔ یہ جذبات کو اُبھارنے کے لئے ایک نہایت ہی مؤثر طریق کلام ہے۔ اس سے جذباتِ محبت برانگیختہ ہوجاتے ہیں۔ اور اگر اس کے بعد بھی کوئی شخص ایسے حکم کو توڑے تو اس کا جرم زیادہ شدید ہوجاتا ہے کیونکہ وہ ایک حکم کو بھی توڑتا ہے اور دوسرے کی امید بھی ٹھکرا دیتا ہے۔

اس کی اور توجیہات بھی کی گئی ہیں۔ مگر میرے نزدیک جذباتی پہلو کے لحاظ سے اس توجیہہ کو دوسری توجیہات پر فضیلت حاصل ہے۔ اس کی ایک توجیہہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ اصل میں یہ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا ہے۔ حرفِ جار کو حذف کردیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد اَنْ کو بھی محذوف کرکے فعل کو مرفوع بنا کر لَا تَعْبُدُوْنَ کردیا گیا ہے۔ اور گو یہ بھی ممکن ہے۔ مگر میرے نزدیک پہلے معنے زیادہ اچھے ہیں۔ کیا بلحاظ معنوی خوبی کے اور کیا بلحاظ ظاہری کے۔ نفی اُمید بھی دلاتی ہے اور اس میں نہی بھی آجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے ان توقعات کا اظہار کیا تھا کہ تم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لاؤ گے۔ والدین کیساتھ نیک سلوک کروگے یتامیٰ کے ساتھ حسن سلوک کروگے۔ مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کروگے۔ اور لوگوں کو ہمیشہ اچھی باتیں کہوگے۔ نمازیں پڑھوگے۔ زکوٰۃ دوگے۔ اور یہ وہ احکام ہیں جن سے تمہیں کوئی اختلاف نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے متعلق تمہیں اختلاف ہے۔ حضرت مسیح ناصری کی صداقت کے متعلق تمہیں اختلاف ہے مگر یہ ایسی باتیں ہیں جن سے تمہیں کوئی اختلاف نہیں بلکہ تم خود ان کو اپنے لئے تسلیم کرتے ہو۔ تمہیں کہا گیا تھا کہ تم توحید الٰہی پر قائم رہو اور تم اس بات کو مانتے ہو کہ تمہیں ایسا حکم دیا گیا تھا۔ تمہیں کہا گیا تھا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اور تم تسلیم کرتے ہو کہ تمہیں واقع میں یہ تعلیم دی گئی تھی۔ تمہیں رشتہ داروں۔ یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا تھا۔ اور تم مانتے ہو کہ یہ بات درست ہے۔ پھر تمہیں یہ بھی کہا گیا تھا کہ تم لوگوں کو تکلیف نہ دو۔ ان کے جذبات کا خیال رکھو۔ اُن کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ۔ اور تم یہ اقرار کرتے ہو کہ ہمیں یہ احکام دیئے گئے تھے۔ پس سوال یہ ہے کہ کیا تم ان احکام پر عمل کرتے ہو۔ اگر تم اپنے حالات کا جائزہ لو تو تمہیں ماننا پڑے گا کہ تم ان احکام پر عمل نہیں کرتے۔

اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ ہر قوم میں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام خرابی واقع ہونے کے بعد بھی نیکی پر قائم رہتے ہیں مگر وہ قوم بحیثیت مجموعی مُردہ ہی کہلاتی ہے کیونکہ اس کی اکثریت احکامِ الٰہی سے اعراض کررہی ہوتی ہے اور یہی یہود کی کیفیت تھی۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے یہود نے صرف ظاہری طور پر کسی مجبوری یا ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔ ورنہ دلوں میں وہ ان احکام کی عظمت اور ان کی اہمیت کے قائل ہوں۔ جیسے مسلمانوں میں کئی ہیں جو نمازیں نہیں پڑھتے۔ کئی ہیں جو روزے نہیں رکھتے

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم (آپس میں) اپنے خون نہ بہاؤ گے

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ

اور اپنے آپ کو (یعنی اپنی قوم کے لوگوں کو) اپنے گھروں سے نہ نکالو گے اور تم نے (اس کا)

اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۵﴾

اقرار کر لیا تھا اور تم (اس عہد کے متعلق ہمیشہ) گواہی دیتے رہے ہو۔ ۵۲

کئی ہیں جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔ کئی ہیں جو استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتے۔ مگر وہ اپنے دلوں میں نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اپنی بدعملی کو صرف غفلت اور گناہ کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے یہود بھی صرف ظاہری طور پر بدعمل ہو چکے ہوں اور دلوں میں ان احکام کی عظمت کے قائل ہوں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ میں تو اس طرف اشارہ فرمایا۔ کہ تمہارا ان احکام پر ظاہری طور پر کوئی عمل نہیں۔ اور اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ تمہارے دلوں میں بھی ان کی طرف کوئی رغبت نہیں رہی۔ اور اب تم موسوی شریعت سے کلی طور پر بیگانہ ہو چکے ہو۔ گویا ظاہری طور پر بھی تم میں بے دینی اور اباحت پیدا ہو گئی ہے اور باطنی طور پر بھی تمہاری روحانیت مر چکی ہے۔

۵۲ تفسیر :۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے دو اور تمدنی نقائص بیان کرتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں خاص طور پر پائے جاتے تھے۔ اور جن کے [illegible] اکثر مرتکب ہوا کرتے تھے۔ فرماتا ہے کہ تم اس وقت کو بھی یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم اپنے خون نہ بہاؤ گے۔ اور اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو گے۔

اپنے خون بہانے سے اس جگہ اپنے ہم قوموں کا قتل مراد ہے۔ اور یہ الفاظ اس لئے اختیار کئے گئے ہیں کہ اپنی قوم کو قتل کرنا درحقیقت اپنا ہی قتل کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض افراد کی ہلاکت یا ان کا قتل تمام قوم پر بحیثیت مجموعی اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنے آپ کو گھروں سے نکال دینے سے بھی اپنے آپ کو گھروں سے نکالنا مراد نہیں جیسا کہ خود اگلی آیت سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد بھی اپنی قوم کا نکالنا ہے۔ ورنہ کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے گھر سے نکالا نہیں کرتا۔ اس جگہ بھی پہلی بیان کردہ حکمت کے ماتحت قوم کے بعض افراد کے نکالنے کا ذکر کرنے کی بجائے اپنا نکالنا بیان کیا گیا ہے تاکہ انکو اپنی حماقت کا احساس ہو۔ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کرنا اور اپنی قوم کے افراد کو اپنے گھروں سے نکالنا تمہارے لئے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ مگر تم نے اس حکم کو بھی توڑا جیسا کہ اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اس آیت کے شروع میں الفاظ وَاِذْ اَخَذْنَا

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ

پھر تم لوگ ہی ہو کہ (اس عہد کے باوجود) آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک جماعت کو

فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ

گناہ اور ظلم کے ساتھ (ان کے دشمنوں کی) مدد کرتے ہوئے ان کے گھروں سے نکالتے ہو

بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى

اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر (مدد مانگنے کے لئے) آئیں۔

تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط

تو تم فدیہ دیکر انہیں چھڑا لیتے ہو گو حقیقتاً ان کا (گھروں سے) نکالنا (بھی) تم پر حرام کیا گیا تھا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر تو ایمان لاتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو؟

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى

پس تم میں سے جو ایسا کرتے ہیں اُن کی سزا اس (جہان کی) زندگی (ہی) میں رسوائی (اٹھانے)

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ

کے سوا اور کیا ہے (جو انہیں ملے گی) اور وہ قیامت کے دن اس سے بھی سخت

مِیثَاقَکُمْ رکھے گئے ہیں۔ اور اس سے پہلی آیت کو وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ سے شروع کیا گیا ہے۔ حالانکہ دونوں عہد بنی اسرائیل سے ہی لئے گئے تھے پھر ان دو آیتوں میں مختلف الفاظ کیوں رکھے گئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ ایک عجیب کمال ہے جو اس کے بے نظیر ہونے کے ہزاروں دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ کہ وہ الفاظ کی خفیف تبدیلیوں سے مختلف مضامین ادا کر جاتا ہے اور فقروں کا کام لفظوں

سے لے لیتا ہے۔ اس جگہ بھی بنی اسرائیل کی جگہ کُمْ رکھ کر ایک خاص امر کی طرف متوجہ کیا ہے اور وہ یہ کہ اوّل الذکر بدیاں تو وہ تھیں جو اس وقت تمام یہودیوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور موخر الذکر بدیاں وہ ہیں جو خاص طور پر یہود کے اُن قبائل میں رائج تھیں جو مدینہ اور اس کے نواح میں رہتے تھے۔ پس ایک جگہ بنی اسرائیل کا لفظ رکھ کر اس کی عمومیت کی طرف اشارہ کیا تو دوسری طرف کُمْ فرما کر عرب کے

اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۶﴾

عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے ہرگز بے خبر نہیں۔ ۵۳

یہود قبائل کو خاص طور پر مخاطب کیا اور انہیں اس طرف توجہ دلائی کہ ان بدیوں کے تم خاص طور پر شکار ہو۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ اس میں بتایا کہ بعض اوقات محض ادب کی وجہ سے انسان کسی بات کو مان لیتا ہے۔ مگر اس کا دل اس کی برتری اور اہمیت کا قائل نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے یہ احکام اتنے اعلیٰ درجہ کے تھے کہ نہ صرف تم نے اپنی زبانوں سے اس کا اقرار کیا بلکہ تمہارے دل بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ احکام بہت مفید ہیں۔ مگر تم نے اپنے اقرار کو بھی پس پشت پھینک دیا۔ اور اپنی قلبی شہادت کو بھی ٹھکرا دیا۔ اور اپنے بھائیوں کے خلاف تم نے جنگ شروع کر دی۔

۵۳ حل لغات:۔ خِزْیٌ۔ یہ لفظ ذلّت۔ سزا۔ بُعد اور ندامت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ لغت میں لکھا ہے۔ اَلْخِزْيُ : اَلْهَوَانُ وَ الْعِقَابُ وَالْبُعْدُ وَالنَّدَامَةُ۔ (اقرب الموارد)

تفسیر:۔ اس آیت میں بتایا کہ یہود کی یہ کیفیت ہے کہ باوجود اس کے کہ شریعت میں ان کو ان دونوں کاموں سے روکا گیا تھا۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔ گھروں سے نکالنے کا مطلب یا تو جلاوطن کرنا ہوتا ہے یا دوسرے کو غلام بنا لینا۔ غلام چونکہ دوسرے کے تابع ہوتا ہے اور وہ اُسے جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لئے اسجگہ گھروں سے نکالنے کے معنے جلاوطنی کے نہیں بلکہ غلامی کے ہیں۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ اس سے پہلے سَفْکُ الدِّمَآءِ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں جنگ کی طرف اشارہ ہے۔ پس ضروری ہے کہ گھروں سے نکالنے کے معنے غلامی ہی کیلئے جائیں جو جنگ کے نتیجہ میں لازماً پیدا ہوتی ہے۔

یہ حکم کہ تم دوسروں کو قتل نہ کرو۔ خروج باب ۲۰ آیت ۱۳ میں اس طرح آتا ہے کہ

"تو خون مت کر۔"

اور دوسروں کو گھروں سے نہ نکالنے کا اصولی ذکر خروج باب ۲۱ آیت ۱۶ میں پایا جاتا ہے۔ وہاں لکھا ہے:۔

"اور جو کوئی کسی آدمی کو چُرائے خواہ وہ اُسے بیچ ڈالے خواہ وہ اس کے ہاں ملے۔ وہ قطعی مار ڈالا جائے۔"

اسی طرح کسی اسرائیلی کو غلام بنانے کی ممانعت کا ذکر احبار باب ۲۵ آیت ۳۹ تا ۴۱ میں اس طرح کیا گیا ہے کہ

"اگر تیرا بھائی جو تجھ پاس ہے مفلس ہو جائے اور تیرے ہاتھ بک جائے تو تُو اس سے غلام کی مانند خدمت نہ کروا بلکہ وہ مزدور اور مسافر کی مانند تیرے ساتھ رہے اور یوبل کے سال تک تیری خدمت کرے۔ اور بعد اس کے وہ تجھ سے جُدا ہو جائیگا۔ اور وہ اور اس کے لڑکے اُس کے ساتھ اور اپنے گھرانے کے پاس اور اپنے باپ کی ملکیت کو پھر جائیگا۔"

اسی طرح احبار باب ۲۵ آیت ۵۴ میں لکھا ہے:۔

"اگر وہ ان برسوں میں چھڑایا نہ جائے تو یوبل کے سال میں (جو ہر ساتویں سال آتا ہے)

وہ آزاد ہو جائیگا ۔ اور اس کے لڑکے اس کے ساتھ ۔"

اِن احکام سے یہود نے جو کچھ نتیجہ نکالا وہ نحمیاہ نبی کے طریق عمل سے ظاہر ہے جنہوں نے بنی اسرائیل کے سب غلاموں کو آزاد کروا دیا ۔ ان کو بھی جو غیر قوموں کے پاس تھے اور ان کو بھی جو اپنوں کے پاس تھے ۔(نحمیاہ باب ۵ آیت ۸)

اور طالمود کے زمانہ میں تو یہود کا اس بات پر اتفاق ہوگیا تھا کہ یہودی غلام نہیں بنایا جا سکتا ۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۴ میں لکھا ہے ۔

" یہ اصل کہ کوئی یہودی کبھی غلام نہیں بنایا جا سکتا طالمودی قانون میں شامل کیا گیا ۔حتّٰی کہ وہ چور بھی جسے اُس کے جرم کی وجہ سے فروخت کیا جاتا تھا ۔ غلام نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ اور سلوقیوں SCLEUCIDS) اور طولمیوں PTOLEMIES کی جنگ کے وقت جب بہت سے یہودی کافروں کے ہاتھ میں قید ہو گئے تو ان کا چھڑانا ایک فرض اور ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا ۔"

(انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۴ کالم ۴۶۵۷)

اِن احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کو غلام بنانا جو اُن کو گھروں سے نکالنے کے مترادف ہے بائبل کے حکم کے مطابق ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا ۔ اور اگر کوئی قید ہو جائے تو اس کے لئے ایسے احکام تھے جن کے نتیجہ میں وہ جلد سے جلد آزاد ہو جائے ۔ یہودی غلام صرف دو طرح بن سکتا تھا ۔ اوّل اس طرح کہ کوئی اپنے آپ کو بیچ ڈالے ۔ ہماری شریعت نے اسے ناجائز قرار دیا ہے مگر اُن میں یہ جائز تھا ۔ وہ قرضہ اور تنگی کے باعث اپنے آپ کو فروخت کر سکتے تھے ۔ دوم اس طرح کہ عدالت اس کو بیچ دے ۔خواہ قرضہ میں بیچے یا کسی ایسے جرم کے نتیجہ میں بیچے جس سے مالی طور پر دوسرے کا نقصان ہوا ہو ۔ مثلاً کسی نے چوری کر لی ہو یا غبن کر لیا ہو یا کوئی اور نقصان پہنچایا ہو ۔مگر ان دونوں صورتوں میں غیر یہودی کے ہاتھ میں اس کا غلام ہونا بہت ہی بُرا سمجھا جاتا تھا ۔حتّٰی کہ عدالت جس کو بیچتی تھی اس کو بھی کسی غیر یہودی کے ہاتھ نہیں بیچ سکتی تھی

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ باوجود اس کے کہ تم کو یہ احکام دیئے گئے تھے تم ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو ۔یعنی اس سے جنگ کرتے ہو ۔ اور تم میں سے ایک فریق اپنے آدمیوں کو ان کے گھروں سے باہر نکال لیتا ہے ۔یعنی اس جنگ کے نتیجہ میں وہ قید ہو کر غلام بنائے جاتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کے خلاف دشمنوں کی گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو ۔ حالانکہ شرعاً تمہارے لئے ان کے خلاف ایسا قدم اٹھانا جائز ہی نہیں ۔ اور اگر وہ قیدی کی صورت میں تمہارے پاس لائے جاتے ہیں تو تم فدیہ دیکر ان کو چھڑا لیتے ہو ۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ ان کا گھروں سے نکالنا بھی تم پر حرام کیا گیا تھا ۔یعنی پہلا کام جس کے نتیجہ میں تم فدیہ دیکر انہیں چھڑاتے ہو وہ بھی تم پر حرام تھا ۔ مگر تم نے اس کا ارتکاب کر لیا ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ تم کتاب کے ایک حصّہ پر ایمان لاتے ہو ۔ اور دوسرے کا انکار کرتے ہو ۔

اللہ تعالیٰ نے اسجگہ یہود کے ان واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا وہ مدینہ کے مشرک قبائل کے ساتھ مل کر ارتکاب کیا کرتے تھے ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے قبل مشرکوں کی دو پارٹیاں تھیں جن میں سے ایک کا نام اوس اور دوسری کا نام خزرج تھا ۔

بعثت سے کچھ عرصہ پہلے سے ان کی آپس میں جنگ چلی آتی تھی - یہودی قبائل جو مدینہ میں اس خیال سے آکر آباد ہو گئے تھے کہ جب [illegible] موعود نبی جو اس ملک میں آنے والا ہے آئیگا تو ہم اُس پر ایمان لائیں گے - وہ تین تھے - بنو قریظہ - بنو قینقاع اور بنو نضیر - اُس زمانہ کے دستور کے مطابق جتھہ بندی ہی امن کا ذریعہ تھی - اس کے بغیر لوگ اطمینان سے نہیں رہ سکتے تھے چونکہ اوس اور خزرج کی آپس میں جنگ تھی اس لئے انہوں نے یہودی قبائل سے سمجھوتہ شروع کر دیا بنو قینقاع اور بنو قریظہ اوس کے حلیف ہو گئے اور بنو نضیر خزرج کے ساتھ مل گئے - جب اوس اور خزرج میں جنگ ہوتی تو یہودی بھی اپنے معاہدہ کے مطابق اُن کے ساتھ جنگ میں شامل ہوتے اور اُن کے ساتھ ہو کر لڑتے اور ان کی مدد کرتے - اس طرح ہر قبیلہ اپنے عمل سے دوسرے یہودی قبیلہ کو جنگ کے لئے اس کے گھر سے نکالتا - لیکن جنگ کے بعد ان میں سے جو پارٹی بھی جیتتی وہ جہاں دوسرے قبیلہ کے آدمیوں کو قید کرتی وہاں یہودیوں کو بھی قید کر لیتی - اس پر اُس پارٹی کے یہودی جو ہار جاتی تھی اُن سے جا کر کہتے کہ ہمارے مذہب میں یہودی کو غلام بنانا ناجائز ہے اس لئے تم فدیہ لیکر ان کو چھوڑ دو - چنانچہ وہ آپس میں چندہ کر کے ایک بڑی رقم بطور فدیہ اُن کو دیدیتے اور یہود کو مشرکین کی غلامی سے آزاد کروا لیتے اور کہتے کہ یہودی کا کسی غیر یہودی کے پاس غلام رہنا درست نہیں - اللہ تعالیٰ یہود کے اِس فعل کو قابل مذمت قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم کو دو باتوں سے منع کیا گیا تھا - آپس میں جنگ کرنے سے بھی - اور اپنے بھائیوں کو غلام بنانے سے بھی - مگر تم جنگ بھی کرتے ہو اور اُس کے نتیجہ میں اپنی قوم کے افراد کو غیر یہودیوں کا غلام بنانے یا بنوانے کی کوشش بھی کرتے ہو - مگر غلام بناتے وقت تو تمہیں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں - اور جب [illegible] غلام بن جاتے ہیں تو تم بڑے نیک بن کر انہیں فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہو اور کہتے ہو کہ ہمارے مذہب میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو غلام بنانا حرام کیا ہوا ہے - حالانکہ تم خود غیر یہودیوں کی مدد کر کے آپس میں جنگ کرتے ہو اور یہودیوں کو اُن کے ہاتھوں میں قید کرواتے اور اُن کو غلام بناتے ہو - پس اس سے زیادہ اور کیا شرارت ہوگی کہ تم ایک حصہ کتاب کو تو مانتے ہو اور ایک کو رد کرتے ہو - ایک طرف یہودی غلاموں کو آزاد کرتے ہو اور دوسری طرف خود ایسے اسباب پیدا کرتے ہو جن سے وہ غلام بنیں - پھر تمہارا آپس میں تو کوئی جھگڑا ہی نہیں - تم صرف ایک مشرک قبیلہ کی دوستی کی وجہ سے لڑتے ہو اور اپنے آدمیوں کو غیر مذاہب والوں کا غلام بنا کر کہتے ہو کہ ان کو چھڑانا چاہیئے -

تاریخ میں لکھا ہے کہ جب عرب کے قبائل یہودیوں کو طعنہ دیتے کہ تم یہ کیا کرتے ہو کہ خود پہلے جنگ کرتے ہو اور پھر فدیہ دیکر اور یہ کہہ کر کہ ہم میں یہود کا غلام بنانا ناجائز ہے ان کو چھڑاتے ہو تو وہ کہتے کہ ہمارے لئے ان سے لڑنا تو منع ہے لیکن ہمیں اپنے حلیفوں سے شرم آجاتی ہے اور مجبوراً لڑائی میں شامل ہو جاتے ہیں اس لئے بعد میں فدیہ دیدیتے ہیں - (محیط) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے کا انکار کرتے ہو - یعنی جو شخص ایک حصہ کتاب کو مانتا ہے وہ اپنے عمل سے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اس کتاب کی صداقت کا قائل ہے - پس اس کا دوسرے حصے کو ترک کرنا اس کے نفس کی گندگی پر دلالت کرتا ہے -

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ - فرماتا ہے کہ تمہارے جیسے لوگ جن کو اصلاح کے اس قدر مواقع دیئے گئے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کی باتوں سے

اس قدر واقف ہیں تمہیں سوائے اس کے اور کیا سزا دی جا
سکتی ہے کہ ان جرائم کی وجہ سے تمہیں دنیا میں رسوا کر دیا
جائے۔ اور آخرت میں تو اس سے بھی زیادہ سخت عذاب
کی طرف تمہیں لوٹایا جائیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک بہت بڑی مرض جو انسان
کی رُوح کو کھانے والی ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ
اپنے منشا اپنے خیالات اور اپنی آرزو کے مطابق مذہب کی
جس بات کو دیکھتے ہیں صرف اُس پر عمل کرنا وہ اپنے لئے کافی
سمجھ لیتے ہیں اور اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ کئی اور
احکام بھی ہیں جن کو وہ بڑی دلیری سے نظر انداز کر رہے ہیں۔
چونکہ بنی نوع انسان کی عادات مختلف حالات اور مختلف
صحبتوں کی وجہ سے بدلتی رہتی ہیں اس لئے ہر انسان اپنا
ایک خاص ذوق رکھتا ہے جس کو وہ پورا کر لیتا ہے۔ اور
جو چیز اس کے ذوق کے خلاف ہو اُسے نظر انداز کر دیتا
ہے۔ اگر اپنے ملک کے مختلف علاقوں پر ہی نظر دوڑائی
جائے تو معلوم ہوگا کہ بعض مقامات کے لوگ نمازوں
کے زیادہ پابند ہوتے ہیں اور روزوں میں سُستی کرتے ہیں۔
بعض جگہ کے لوگ زکوٰۃ تو بڑی پابندی سے دیتے ہیں مگر
نماز اور روزہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ اسی طرح بعض جگہ نماز
اور روزہ کی تو پابندی کی جاتی ہے مگر زکوٰۃ کی طرف توجہ
نہیں کی جاتی۔ پھر بعض جگہ کے لوگ باوجود استطاعت
کے حج نہیں کرتے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر حج کے
لئے بھی جائیں تو شائد اس سفر میں بھی نماز نہ پڑھیں۔
اب اس نماز اس روزہ اس زکوٰۃ اور اس حج کو خدا تعالیٰ
کی فرمانبرداری نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اگر وہ خدا تعالیٰ
کی سچے دل سے فرمانبرداری کرتے تو جس خدا نے نماز
پڑھنے کا حکم دیا ہے اُسی نے روزہ رکھنے کا بھی حکم دیا
ہے۔ اور جس خدا نے زکوٰۃ کا ارشاد فرمایا ہے اُسی نے
حج کی بھی تاکید فرمائی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا ایک حکم
ماننے اور دوسرے کو ترک کرنے نے اس بات کو ثابت کر دیا
کہ ایسے لوگ جس فعل کو خدا تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری
سمجھتے ہیں وہ درحقیقت فرمانبرداری نہیں بلکہ اُن کے نفس
کا ایک دھوکا ہوتا ہے۔ اطاعت اور فرمانبرداری کا ثبوت
تب ملتا ہے جب انسان ہر رنگ میں اللہ تعالیٰ کے ہر
حکم کا فرمانبردار ہو۔ خواہ وہ حکم اس کے منشاء، خیالات
اور رسم و رواج کے مطابق ہو یا مخالف۔

بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعتوں میں غصہ
نہیں ہوتا۔ اُن کے خلاف اگر کوئی بات کہتا ہے تو وہ
بڑی خندہ پیشانی سے اس کو برداشت کرتے ہیں لیکن
اگر ان پر کوئی ایسا موقعہ آئے جہاں خدا تعالیٰ کے لئے
ناراضگی کے اظہار کی ضرورت ہو اور وہاں بھی وہ
عفو اور درگذر کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اُن کا عفو
اور درگذر اپنے اندر کوئی نیکی نہیں رکھتا۔ اگر اُن کا
عفو خدا تعالیٰ کے حکم اور منشاء کے ماتحت ہوتا تو
جہاں اللہ تعالیٰ کا منشاء تھا کہ عفو سے کام نہ لیا
جائے وہاں وہ کیوں عفو سے کام لیتے۔

غرض اطاعت صرف اپنے ذوق کے مطابق احکام
پر عمل کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے ہر حکم پر
عمل کرنے کا نام ہے خواہ وہ کسی کی عادات یا مزاج
کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ یہود کی نسبت فرماتا ہے کہ
اُن کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بڑے بڑے گناہ تو کر
لیتے تھے لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں اور حکموں کے متعلق
کہہ دیتے کہ ہم ان کی پابندی کرتے ہیں کیونکہ خدا
تعالیٰ کا حکم ہے۔ اُن کو حکم تھا کہ ایک دوسرے کو
قتل مت کرو۔ اُن کو حکم تھا کہ اپنے لوگوں کو گھروں سے
مت نکالو۔ مگر وہ لڑائی جھگڑے میں ایک دوسرے کو
خوب قتل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو گھروں سے

نکلنے کا موجب بنتے۔ لیکن جب اس کے بعد ان کا کوئی آدمی قید ہو جاتا تو پھر وہ چندہ کر کے اس کو چھڑانے کی فکر کرتے اور کہتے کہ بائیبل کا چونکہ حکم ہے کہ کوئی یہودی کسی غیر قوم کے پاس قید نہ رہے اس لئے ہم اس حکم کی تعمیل میں اسے چھڑاتے ہیں۔ انہیں اپنے بھائیوں کو قتل کرنے اور انہیں جلا وطن کرنے کے وقت تو بائیبل کا حکم یاد نہ آتا لیکن قید کے لئے یاد آجاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا ان کی اس اطاعت سے ہم خوش ہو سکتے ہیں۔ کہ جو حکم اپنی مرضی کے مطابق دیکھا اُس کی تعمیل کر لی اور جو نہ دیکھا اُس کو پس پُشت ڈال دیا ایسے لوگوں کو ہم ذلیل اور رُسوا کریں گے کیونکہ یہ لوگ جب اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات دیکھتے ہیں تو بڑے بڑے احکام کی پروا نہیں کرتے اور جب اپنی مرضی کے مطابق پاتے ہیں تو مان لیتے ہیں۔ حالانکہ سچا مومن وہ ہے جو ہر بات میں خدا تعالیٰ کی رضا کو مدّنظر رکھے۔

حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص جو زانی تھا میں نے اس کو نصیحت کی کہ یہ کام چھوڑ دو۔ وہ کہنے لگا۔ میں نے تو فلاں عورت سے عہد کیا ہوا ہے کہ تم سے بیوفائی نہیں کرونگا۔ اگر آپ فرماتے ہیں تو میں بیوفائی کا جرم کر لیتا ہوں۔ گویا اُس شخص نے بے وفائی اور عہد کے توڑنے کو تو گناہ سمجھا لیکن زنا کے متعلق کسی گناہ کا خیال نہ آیا۔ پس مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت ہوشیار رہے اور یہود کی طرح خدا تعالیٰ کے احکام کے ساتھ یہ تمسخر نہ کرے کہ جس حکم پر جی چاہا عمل کر لیا اور جس کے متعلق جی چاہا اُسے نظر انداز کر دیا۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی تھی کہ ایک زمانہ میں مسلمان بھی یہود کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اور وہ اس طرح ایک دوسرے کے مشابہ ہو جائیں گے جس طرح ایک بالشت دوسری بالشت کے اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے مشابہ ہوتا ہے۔ (بخاری کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب اسلام پر تنزل کا دور آیا تو وہ تمام خرابیاں جو یہود میں پائی جاتی تھیں ایک ایک کر کے مسلمانوں میں بھی پیدا ہونے لگ گئیں۔ یہود کو کہا گیا تھا کہ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ دیکھو اپنی قوم کے افراد سے مت لڑو۔ اور اُن کا خون مت بہاؤ۔ ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے۔ اور یہی نصیحت مسلمانوں کو بھی کی گئی تھی۔ مگر اسلام کے دورِ تنزل کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مسلمانوں نے خود مسلمانوں کا خون بہایا۔ اور اپنی حکومتوں کو تباہ کرنے کے لئے انہوں نے ہر قسم کی خفیہ ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے کام لیا یہاں تک کہ عیسائی حکومتوں سے معاہدہ کر کے مسلمان حکومتوں کا تختہ اُلٹنے کی بھی سازشیں کیں۔ چنانچہ خلافت اندلس نے روما کے عیسائی بادشاہ سے خفیہ معاہدہ کیا کہ وہ اُس کے ساتھ مل کر خلافتِ عباسیہ کو تباہ کریگی۔ اور عباسی حکومت نے شاہِ فرانس سے مل کر یہ معاہدہ کیا کہ وہ سپین کی اسلامی حکومت کو متزلزل کرنے کے لئے اس کا ساتھ دیگی۔ گویا انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے بھائیوں کے خون سے رنگے۔ اور یہ نہ سمجھا کہ اسلامی سیاست میں مسیحیوں کو داخل کر کے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اسی طرح صلاح الدین ایّوبی جب سارے یورپ کے مقابلہ میں لڑ رہا تھا۔ اُس وقت مسلمان اور عیسائی حکومتوں نے باہم معاہدہ کر کے اس کو قتل کرنے کی سازش کی اور آخر ایک مسلمان کو ہی اس کام پر مقرر کیا گیا اور اُس نے صلاح الدین پر نماز پڑھتے ہوئے قاتلانہ حملہ کر دیا گو اللہ تعالیٰ نے اُس پر فضل کیا اور وہ اس قاتلانہ حملہ سے محفوظ رہا۔

پھر یہود کو کہا گیا تھا کہ تم نے یہ کیا دوغلی پالیسی اختیار کر رکھی ہے کہ ایک طرف اپنے بھائیوں سے جنگ کرتے ہو اور دوسری طرف جب وہ قید ہو جاتے ہیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز

اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اِس (جہان کی) زندگی کو بعد میں آنیوالی (زندگی) پر مقدم کر لیا ہے۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ ع

اِس لئے نہ تو اُن سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُنکی (کسی اور رنگ میں) مدد کی جائیگی۔ سکھ

۱۰ ع ۱۰

تو تم فدیہ دے کر اُن کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہو۔ یہی کیفیت مسلمانوں کی بھی نظر آنے لگی۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم میں مسلمانوں نے ترکوں کے خلاف لشکروں میں بھرتی ہو کر جنگ کی۔ لیکن جب وہ لوگ قید ہو گئے تو پھر انکو فدیہ دیکر چھڑانا چاہا۔ غرض جس طریق پر یہود نے قدم مارا تھا مسلمانوں نے اسی طریق پر چلنا شروع کر دیا حالانکہ یہ واقعات اس لئے بتائے گئے تھے کہ مسلمان ہوشیار رہیں اور اپنے اندر ان خرابیوں کو پیدا نہ ہونے دیں۔ بیشک جہاں تک اہل کتاب کی اصلاح کا سوال ہے اِس سے یہود اور نصاریٰ ہی مراد ہیں۔ لیکن اِس میں کیا شبہ ہے کہ مسلمان بھی اہل کتاب ہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں اہل کتاب صرف مسلمان ہی کہلا سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک کامل کتاب عطا فرمائی ہے جبکہ دوسری قومیں ایسی کامل اور بے عیب کتاب سے محروم ہیں۔ پس اہل کتاب ہونے کے لحاظ سے بھی مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ یہود اور نصاریٰ کی خرابیوں پر کڑی نگاہ رکھتے۔ اور ان کو اپنے اندر نہ آنے دیتے۔

۸۷ تفسیر:۔ اِس آیت میں بتایا کہ چونکہ یہود نے دین کو چھوڑ کر دنیا اختیار کر لی ہے۔ اِس لئے اِس جرم کی سزا میں اب ان سے دنیا کی حکومت چھین لی جائے گی اور جب تک کہ وہ پھر دین کو اختیار نہ کریں اُس وقت تک اُن کے اس عذاب میں کمی نہیں کی جائیگی۔ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ

سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ آسمانی عذاب بھی اُن سے کم نہیں ہونگے اور دُنیا کی قومیں بھی اُن پر رحم نہیں کریں گی۔

قرآنی ترتیب کا یہ اصول ہے کہ وہ اپنے پہلے مضمون کو آخر میں پھر دُہرا دیتا ہے۔ شروع میں بیان فرمایا تھا کہ یہود کا یہ خیال کہ ہمیں صرف چند دن عذاب ہوگا۔ غلط ہے۔ اب آخر میں فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ فرما کر بتا دیا کہ اِس رکوع میں بھی لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً والا مضمون ہی چل رہا تھا جو یہاں آکر ختم ہوا۔ اور انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ تم شریعت کے احکام کو اس طرح کھیل بنا لینے کے جُرم میں مختلف قسم کے آسمانی عذابوں میں گرفتار رہوگے اور تمہیں کسی کی مدد حاصل نہیں ہو سکیگی۔ پس تمہارا یہ دعویٰ کہ تمہیں صرف چند دن عذاب ہوگا باطل ہے۔ تمہیں عذاب ہوگا اور عذاب بھی ایسا کہ جو ہلکا نہیں کیا جائیگا یعنی ایک لمبے عرصہ تک وہ تمہیں سوزش اور جلن میں مبتلا رکھے گا۔

دوسرا خیال ان کا یہ تھا کہ ہمارا انبیاء سے تعلق ہے۔ وہ ہماری مدد کریں گے۔ سو اس کی بھی اللہ تعالیٰ نے تردید فرما دی کہ ان کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ ان کی کوئی بھی مدد نہیں کریگا۔

غرض قرآنی ترتیب کا یہ اصول ہے کہ وہ اپنے پہلے مضمون کو آخر میں پھر دُہرا دیتا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہاں گذشتہ بحث ختم ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ

اور ہم نے (یقیناً) موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کے بعد ہم نے (ان) رسولوں کو (جنہیں تم جانتے ہو) اس کے پیچھے بھیجا۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ

اور عیسیٰ ابن مریم کو (بھی) ہم نے کھلے کھلے نشانات دیئے اور رُوح القدس کے ذریعہ سے

الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى

اُسے طاقت بخشی (لیکن تم نے سب کا مقابلہ کیا) تو پھر (تم ہی بتاؤ کہ) کیا یہ بات ناپسندیدہ نہیں کہ) جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول

اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا

اس (تعلیم) کو لے کر آیا جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے تو تم نے تکبر (کا مظاہرہ) کیا۔ چنانچہ بعض کو تم نے

تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۸﴾

جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ ۵۵

اور آئندہ نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔

اس رکوع میں پہلے جس عہد کا ذکر کیا تھا وہ عام تھا مگر اس کے بعد اس خاص عہد کا ذکر کیا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے اُن یہود سے تعلق رکھتا ہے جو مدینہ اور اسکے نواح میں رہنے والے تھے۔ اس کے بعد اُن کی دُوا دو قومی غلطیوں کا ذکر فرمایا۔ یہ وہ غلطیاں تھیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود میں خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھیں۔ پھر اس ترتیب میں بھی پہلے ان غلطیوں کا ذکر کیا جو نیکیوں کے ترک کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور پھر ان غلطیوں کا ذکر فرمایا جو اپنی ذات میں گناہ اور ظلم ہیں۔

تَقَفَّيْنَا[۲] یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا نوع انسان سے تعلق ہوتا ہے۔ پھر وہ گناہ بھی جنکا دوسروں سے تعلق ہوتا ہے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ گناہ جن میں انسان کو احساس ہو کہ میں گناہ کر رہا ہوں اور وہ اُن گناہوں کو چھپانے کی کوشش کرے۔ دوم وہ گناہ جن کے کرتے وقت انسان محسوس ہی نہ کرے کہ میں کسی گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ فرما کر دو مثالیں یہود کے اُن گناہوں کی بیان فرمائی ہیں جن کے متعلق انہیں احساس ہونا چاہیئے تھا کہ اگر یہ بات لوگوں کے سامنے آئی تو وہ ملامت کریں گے مگر باوجود اس کے کہ یہ نہایت واضح گناہ تھے اور ان کا اُن کی قوم کے ساتھ تعلق تھا پھر بھی وہ دلیری کے ساتھ ان گناہوں میں ملوث رہے اور اپنی شریعت کی بے حرمتی کرتے رہے۔

۵۵ حل لغات۔ تَقَفَّيْنَا: قَفّٰى فُلَانٌ زَيْدًا اَوْ بِزَيْدٍ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے ہیں وہ زید کے پیچھے پیچھے چلا۔ اور قَفّٰى کے معنے ہیں پیچھے چلایا۔

یہ لفظ قَفَا سے نکلا ہے اور قَفَا انسان کے سر کا پچھلا حصّہ
ہوتا ہے جسے اردو زبان میں گُدّی کہتے ہیں۔ اور گدی کے
ساتھ ساتھ ہونے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ چیز پیچھے
بھی ہو۔ اور قریب بھی۔ اصل معنے تو اس کے ساتھ ساتھ
اور قریب قریب جانے کے ہیں مگر محاورہ میں اس کے معنے
وسیع کر لئے گئے ہیں۔ اس لئے اب یہ لفظ ایسے موقع
پر بھی استعمال کر لیا جاتا ہے جبکہ کوئی پیچھے چل کر آئے
خواہ وہ فاصلہ پر ہی ہو۔

بیّنٰت

بَیِّنٰت :۔ وہ دلائل ہوتے ہیں جو اپنی ذات
میں کسی نبی کی صداقت کا ثبوت ہوتے ہیں۔ دلائل دو قسم
کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جن سے کسی نبی کی صداقت کا استنباط
کیا جاتا ہے۔ مثلاً زمانہ کے خراب ہو جانے کے وقت نبوت
اور اس کی ضرورت بتانے کیلئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا
خراب ہو گئی ہے۔ لوگ شریعت کو بھول گئے ہیں۔ اس
کے احکام انہوں نے ترک کر دیئے ہیں اس لئے اب ایک
نبی کی ضرورت ہے اور وہ آنیوالا ہی ہے۔ یہ سب باتیں ایک نبی کی ضرورت
بتانے کے لئے بطور استنباط ہوتی ہیں۔ یہ دلائل تو ہیں
مگر بیّنات نہیں کہلا سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی
پیشگوئیاں ہوں جو قرب زمانہ کی تعیین کرتی ہوں نہ کہ خود
اس زمانہ کی تو وہ پیشگوئیاں بھی اُس نبی کے لئے بیّنات
میں شمار نہیں ہونگی۔ جیسے وہ نشانات و حالات ہیں جو
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ظاہر ہوئے۔ اور
جن سے آپ کی صداقت کا استنباط کیا جا سکتا ہے
وہ آپ کی صداقت کے دلائل تو ہیں مگر چونکہ وہ معین
رنگ میں آپ کی شناخت نہیں کراتے اس لئے وہ بیّنات
نہیں کہلا سکتے۔ مگر دوسری قسم کے دلائل وہ ہیں جو بیّنات
کہلاتے ہیں۔ وہ ایسے دلائل ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں
کسی نبی کی صداقت کا مشاہدہ کراتے ہیں اور جن کے ذریعہ
حق و باطل بالکل کھل جاتا ہے۔ جیسے حضرت مسیح موعود
علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی طاعون کی پیشگوئی کی اور رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طاعون کی پیشگوئی فرمائی۔ اب یہ
صرف دلیل ہی نہیں بلکہ بیّنہ بھی ہے کیونکہ یہ پیشگوئی قرب
ہی ثابت نہیں کرتی کہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں آنیوالے
کو آنا چاہیئے بلکہ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ آپ مسیح موعود
ہیں۔ غرض بیّنہ وہ ہوتی ہے جو صداقت کی وضاحت
کر دیتی ہے۔ مگر دوسری دلیل صرف اشارہ کنایہ سے صداقت
کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ
والسلام کی صداقت کے بعض دلائل صرف کنایہ و اشارہ
کی قسم میں سے ہیں اور بعض بیّنات ہیں۔ اور درحقیقت
ہر نبی دونوں قسم کے دلائل اپنے ساتھ رکھتا ہے کیونکہ
صرف کنایہ و اشارہ ہی صداقت کے ثبوت کے لئے
کافی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے ساتھ بیّنات کا ہونا بھی
ضروری ہے تاکہ عام لوگوں پر اس کی صداقت واضح ہو
جائے ورنہ انکو معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ وہی شخص ہے
جس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ البیّنات کے معنے علامہ
ابو حیان اپنی تفسیر میں یہ لکھتے ہیں کہ اَلْحُجَجُ الْوَاضِحَۃُ
الدَّالَّۃُ عَلٰی نُبُوَّتِہٖ۔ یعنی ایسے واضح دلائل جو حضرت
مسیحؑ کی نبوت کو ثابت کرنے والے تھے (بحر محیط جلد اوّل)

روح القدس

رُوْحُ الْقُدُسِ :۔ کے معنے لسان العرب میں
یہ لکھے ہیں کہ خدا کا پاک یا مبارک کلام۔ رُوح کے معنے
کلام اور قدس کے معنے مبارک یا پاک کے ہیں۔ اسلئے
دونوں لفظوں کے ملکر یہ معنے ہوئے کہ مبارک یا مقدس
کلام۔ لسان العرب اور عربی کی دوسری لغت کی کتب
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیس کا لفظ صرف اُن اشیاء
کے متعلق بولا جاتا ہے جو خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہوں
یوں تو پاکیزگی کے لئے اور بھی کئی الفاظ ہیں مگر ان کے
لئے یہ شرط نہیں۔ صرف تقدیس کے متعلق یہ شرط ہے
کہ اس کا استعمال شرعی یا رُوحانی اشیاء کے متعلق

ہوتا ہے۔ پس مقدس پاکیزگی وہ ہے جو شریعت کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ جیسے مقدس مقام وہ ہوگا جو شرعی اور رُوحانی طور پر اعزاز رکھتا ہو۔ یوں تو نظافت کا لفظ بھی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے مگر اس کا تعلق شرعی اور رُوحانی پاکیزگی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ جیسے ایک کافر بھی نظیف کہلا سکتا ہے لیکن مقدس انسان وہی کہلا سکتا ہے جسے خدا تعالیٰ کی طرف سے روحانی اعزاز حاصل ہو۔ اسی طرح مبارک اور مقدس کلام بھی صرف پاکیزہ خیالات کو ہی نہیں کہتے ورنہ ایک فلاسفر کے خیالات بھی پاکیزہ ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی طبیعات کے متعلق نئے سے نئے نکتے نکالتا رہتا ہے۔ مگر وہ مؤید بروح القدس نہیں ہوتا۔ وہ وحی الٰہی سے مشرف نہیں ہوتا۔ وہ ایسے خیالات سے مشرف نہیں ہوتا جو خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کر دیتے ہیں۔ مؤید بروح القدس صرف وہ کلام ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو۔ اور جو ہر لحاظ سے مبارک اور پاکیزہ ہوتا ہے۔

(۲) رُوح کے معنے فرشتہ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے روح القدس کے معنے ہیں فرشتۂ تقدس و برکات۔ فرشتے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ جو خدا تعالیٰ کی طرف سے کلام لاتے ہیں۔ دوم وہ جو اس کلام کو یا قضاء وقدر کو دنیا میں جاری کرتے ہیں۔ جو فرشتے کلام الٰہی لانے والے ہوتے ہیں اُن کو رُوح القدس کہتے ہیں۔ خصوصاً کلام لانے والے فرشتوں کا سردار جبرائیل رُوح القدس کہلاتا ہے۔

پس اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے یہ معنے ہیں کہ (۱) ہم نے تقدس و برکات والے فرشتہ سے اس کی مدد کی۔ جو خدا تعالیٰ کے حضور سے کلام لاتا ہے۔ یا (۲) خدا نے اُسے اپنے پاک اور مبارک کلام سے مشرف کیا اور اُسے طاقت بخشی۔

تفسیر:- جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے لفظ قَفَّیْنَا کے معنے ہیں "ہم نے پیچھے چلایا"۔ اس لفظ سے نہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور بھی بہت سے انبیاء آئے۔ بلکہ یہ ظاہر کرنا بھی مطلوب ہے کہ وہ صاحب شریعت نبی نہ تھے۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبع تھے اور اُسی راستہ پر چلتے تھے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام چلے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتاب "شہادۃ القرآن" میں اس سے یہ استدلال فرمایا ہے کہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے بعد کئی ایسے انبیاء آئے جن کی کوئی جدید شریعت نہ تھی۔ بلکہ وہ تورات کے احکام ہی لوگوں سے عمل کرواتے اور اُسی کی تعلیم کو رائج کرتے تھے (شہادۃ القرآن صفحہ ۴۲)

عام طور پر مفسرین یہ خیال کرتے ہیں کہ ہر رسول نئی شریعت لے کر آتا ہے۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر انبیاء آئے وہ سب کے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع اور اُنکی شریعت پر عمل کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے علامہ ابو حیان نے اپنی تفسیر میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد جتنے نبی ہوئے ہیں وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے بلکہ وہ حضرت موسےٰ کی شریعت ہی کے تابع ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر بحر محیط میں اس آیت کے ماتحت لکھتے ہیں۔ وَیَحْتَمِلُ اَنْ تَکُوْنَ التَّقْفِیَۃُ مَعْنَوِیَّۃً وَھِیَ کَوْنُھُمْ یَتَّبِعُوْنَہٗ فِی الْعَمَلِ بِالتَّوْرٰۃِ وَاَحْکَامِھَا وَیَاْمُرُوْنَ بِاِتِّبَاعِھَا وَالْبَقَاءِ عَلَی الْتِزَامِھَا۔ (بحر محیط جلد اوّل صفحہ ۲۹۹) یعنی آیت زیر بحث میں قَفَّیْنَا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تورات پر عمل کرنے اور

اس کے احکام کو بجا لانے میں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے تھے اور لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ تورات کے احکام پر پوری طرح عمل کیا جائے۔ اور ہمیشہ اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے۔ گویا ظاہری طور پر نقش قدم پر چلنا ہی مراد نہیں بلکہ معنوی طور پر بھی چلنا مراد ہے۔

(ب) وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ بیّنات اور روح القدس کے ذریعے حضرت مسیحؑ کا تائید پانا یہ دونوں چیزیں ایسی نہیں جو صرف حضرت مسیحؑ ناصری کے ساتھ مخصوص ہوں یا اس سے دوسرے انبیاء پر اُن کی کسی فضیلت کا استدلال ہو سکے۔ چنانچہ قرآن کریم اسی سورۂ بقرۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ (سورۃ بقرۃ آیت ۹۲) یعنی موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس بیّنات لے کر آئے تھے۔ مگر پھر بھی تم نے اُن کے (پہاڑ پر جانے کے) بعد شرک کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بارہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیّنات دیئے گئے تھے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (بقرہ آیت ۱۰۰) یعنی یقیناً ہم نے تیری طرف بیّنات نازل کی ہیں۔ جنکا نافرمانوں کے سوا اور کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسی طرح سورۂ مومن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے زمانہ کی اقوام کی تباہی کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (مومن: ۲۳) یعنی اُن کے ہلاک ہونے کا باعث یہ تھا کہ اُن کے پاس اپنے اپنے وقت میں ہمارے رسول بیّنات لے کر آئے تھے لیکن انہوں نے اُن کا انکار کر دیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو گرفتارِ بلا کر دیا۔ اور وہ طاقتور اور بعض شرارتوں پر فوری سزا دینے والا ہے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر انبیاء دنیا میں آئے سب اپنے ساتھ بیّنات بھی رکھتے تھے۔ اگر اُن کے ساتھ بیّنات نہ ہوتے تو وہ رسول ہی ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ پس آیت زیرِ تفسیر میں حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے نام کے ساتھ بیّنات کا ذکر کرنے سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ انکو اس امر میں کوئی امتیازی خصوصیت حاصل تھی بلکہ اس سے یہود کو صرف یہ بات بتلانا مدِّ نظر ہے کہ مسیح علیہ السلام بھی اُن تمام انبیاء کی طرح جن کی صداقت کے تم قائل ہو اپنے ساتھ اپنی صداقت کے نشانات رکھتے تھے۔

اسی طرح رُوح القدس کے ذکر سے یہ بتلانا مدِّ نظر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی دوسرے انبیاء کی طرح الہام ہوتا تھا۔ نہ یہ کہ اُن کو دوسرے انبیاء پر کوئی خاص فضیلت حاصل ہے۔ یا وہ صاحبِ شریعت نبی ہیں۔ اور اگر رُوح کے معنے فرشتے کے کئے جائیں اور رُوح القدس کے معنے پاک فرشتہ کے لئے جائیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اُن کی تائید کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کو مقرر کر دیا تھا۔ تاکہ وہ لوگوں کے دلوں میں اُن کی قبولیت بٹھائیں یا خود اُن کے دل کو مضبوط کریں۔ چنانچہ ایک دوسری آیت سے اس کی تشریح ہو جاتی ہے فرماتا ہے۔ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ (سورۃ مائدہ آیت ۱۱۲) اس واقعہ کو بھی یاد کرو جبکہ میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وحی

عام طور پر ملائکہ کے توسط سے ہی ہُوا کرتی ہے۔ پس ایک مطلب اس آیت کا یہ بھی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تائید جبرائیل کے ذریعہ کی۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں بلکہ اعلیٰ درجہ کے مومنوں کو بھی نصیب ہوتی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی نسبت قرآن کریم میں آتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (مجادلہ آیت ۲۳) یعنی یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان راسخ کر دیا ہے اور اپنی طرف سے رُوح بھیجکر اُن کی مدد کی ہے۔ یعنی ملائکہ کو اُن کی مدد پر مقرر فرمایا ہے۔ گو اسجگہ رُوح القدس کے الفاظ نہیں مگر رُوْحٌ مِّنْهُ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور وہ رُوح جو خدا تعالیٰ کی طرف آتی ہے وہ مقدس ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل آیت ۱۰۳) یعنی اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تُو لوگوں سے یہ کہدے کہ رُوح القدس نے اس قرآن کریم کو تیرے رب کی طرف سے حق و حکمت کے ساتھ اُتارا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں وہ ہمیشہ کے لئے ایمان پر قائم کر دے۔ نیز اُس نے یہ کتاب مومنوں کی مزید ہدایت اور انہیں بشارت دینے کے لئے نازل فرمائی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورۃ بقرۃ آیت ۹۸) یعنی رُوح القدس نے اس کتاب کو تیرے دل پر اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ نازل کیا ہے۔ پس بیّنات دیئے جانے اور مؤید بروح القدس ہونے کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کوئی خاص فضیلت نہیں دی جا سکتی۔

قرآن کریم کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے بھی ثابت ہے کہ رُوح القدس کا نزول حضرت مسیح ناصریؑ کے علاوہ اور انبیاء بلکہ غیر انبیاء پر بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت حسانؓ کا واقعہ اس پر شاہد ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت اس زمانہ کے اشرار رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات کے خلاف نہایت گندی نظمیں اور اشعار بنا بنا کر پڑھا کرتے تھے۔ ایک مدت تک تو صحابہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق صبر سے کام لیتے رہے مگر جب وہ اس خباثت میں حد سے بڑھ گئے تو بعض صحابہؓ نے حضرت حسانؓ سے خواہش کی کہ وہ ان کا جواب دیں۔ حضرت حسانؓ نے اُن کے کہنے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کے متعلق عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ! انہوں نے آپ پر بہت حملے کئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ اُن کو جواب دوں۔ اور اُن کے عیوب ظاہر کروں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جواب دینا اچھی بات ہے مگر اس میں ایک دِقت ہے اور وہ یہ کہ اُن کے اور ہمارے آباؤ اجداد ایک ہی ہیں۔ اگر تم اُن پر حملہ کرو گے تو وہ حملہ ہم پر بھی ہو گا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں آپکو اور آپ کے خاندان کو اُن سے اس طرح الگ کرونگا جس طرح مکھن میں سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ یہ اُن کے قادر الکلام ہونے کی دلیل تھی۔ کیونکہ قادر الکلام شاعر ہی اس رنگ میں شعر کہہ سکتا ہے کہ دوسرے کو جواب بھی دیدے اور اپنے بزرگوں پر بھی حملہ نہ ہونے دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اُهْجُ قُرَيْشًا وَرُوْحُ الْقُدُسِ مَعَكَ (البحر المحيط جلد اوّل صفحہ ۲۹۹) یعنی اے حسان! قریش کی ہجو کر رُوح القدس تیرے ساتھ ہے۔

اب یہ کوئی الہام نہ تھا جس کا آپؐ نے ذکر فرمایا ہو۔ بلکہ بغیر الہام کے آپؐ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے۔ کیونکہ حسانؓ اُس وقت دین کی تائید کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔

پس رُوح القدس کے الفاظ سے کہیں یہ سمجھنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو کوئی خصوصیّت حاصل تھی درست بات نہیں۔ اسی طرح ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت حسانؓ کو فرمایا۔ وَجِبْرِیْلُ مَعَكَ (البحر المحیط جلد اوّل صـ۲۹۹) یعنی جبریل تیرے ساتھ ہے۔ حضرت حسانؓ اپنے ایک شعر میں بھی فرماتے ہیں ؎

وَجِبْرِیْلُ رَسُوْلُ اللّٰہِ فِیْنَا
وَرُوْحُ الْقُدُسِ لَیْسَ لَہٗ کِفَاءٗ

(البحر المحیط جلد اوّل صـ۲۹۹)

یعنی اللہ کے رسول پر اُترنے والا جبریل ہم میں ظاہر ہوا ہے اور وہ ایسی پاکیزہ رُوح ہے جس کا کوئی مثیل نہیں۔ یعنی جبریل جو اللہ کا رسول ہے ہم میں ہے اور رُوح القدس کا کوئی مثیل نہیں۔ اس شعر کے مطابق تمام صحابہ کرامؓ کو رُوح القدس کی تائید حاصل تھی۔ پس صرف رُوح القدس کی تائید حاصل ہونے سے عیسائیوں کا یہ استدلال کرنا کہ حضرت مسیحؑ ابن اللہ تھے یا اِلٰہ تھے نادانی ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کا جواب دینے کے لئے حضرت حسانؓ کو فرمایا اور دُعا کی کہ اَللّٰھُمَّ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ اے خدا! رُوح القدس سے اس کی تائید فرما۔ (مشکوٰۃ باب البیان والشعر و کنز العمال جلد ۲ صـ۲۲-۲۳) ایک اور روایت کے مطابق فرمایا اُھْجُ الْمُشْرِکِیْنَ فَاِنَّ جِبْرِیْلَ مَعَكَ (بخاری کتاب المغازی باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب) یعنی اے حسانؓ! مشرکین کی ہجو کر۔ جبریل تیرے ساتھ ہے۔

پس حضرت مسیحؑ کا رُوح القدس سے مؤید ہونا اُن کی کسی فضیلت کا ثبوت نہیں اس میں تمام انبیاء بلکہ غیر انبیاء بھی شریک ہیں۔ اور سب کو اپنے اپنے درجہ اور مقام کے مطابق رُوح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ حضرت معین الدین صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ جو اُمتِ محمدیہ کے ایک مسلّمہ بزرگ ہیں وہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ ؎

دمبدم رُوح القدس اندر معینے می دمد
من نمی گویم مگر من عیسیٰ ثانی شدم

(دیوان حضرت خواجہ معین الدین صاحب چشتی صـ۵۹)

یعنی رُوح القدس بار بار میرے اندر اس طرح نفخِ رُوح کر رہا ہے کہ شاید مجھے عیسیٰ ثانی کا مقام حاصل ہوگیا ہے۔ پس حضرت مسیحؑ کا مؤید بروح القدس ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ میں اگر حضرت مسیحؑ ناصری کی کوئی امتیازی خصوصیت بیان نہیں کی گئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد باقی سب انبیاء کا مجموعی ذکر کرنے کے بعد حضرت مسیحؑ کا علیحدہ ذکر کیوں کیا گیا ہے اور اُن کے متعلق یہ مخصوص طور پر کیوں بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے عیسیٰؑ بن مریم کو بیّنات دیں۔ اور اس کی رُوح القدس سے تائید کی؟

عیسائی تو اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ انکو دوسرے انبیاء پر فضیلت حاصل تھی اور وہ دوسروں سے بالا مقام رکھتے تھے اس لئے ان کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اگر وہ بھی رسول ہی ہوتے تو اُن کا الگ ذکر نہ کیا جاتا۔ لیکن مفسرین یہ کہتے ہیں کہ چونکہ دوسرے انبیاء کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے بلکہ موسوی شریعت کے تابع تھے اس لئے ان کا اکٹھا ذکر کیا گیا ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعت موسوی کے متبع نہیں تھے بلکہ

وہ ایک نئی شریعت لائے تھے اس لئے ان کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے
مگر یہ صحیح نہیں ۔ کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے خود کہا ہے کہ
"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں
کو منسوخ کرنے آیا ہوں ۔ منسوخ کرنے نہیں
بلکہ پورا کرنے آیا ہوں ۔ کیونکہ میں تم سے
سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین
ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت
سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا
نہ ہو جائے" (متی باب۵ آیت ۱۸۰۱۷)

پس یہ تو غلط ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا علیحدہ ذکر
اس لئے کیا گیا ہے کہ آپ صاحب شریعت جدیدہ تھے ۔
لیکن یہ سوال ضرور قائم رہتا ہے کہ اگر بیّنات دیئے جانے اور
رُوح القدس سے مؤید ہونے میں اُن کی کوئی خصوصیت نہیں
تھی تو پھر ان کا علیحدہ ذکر کیوں کیا گیا ۔ سو یاد رکھنا چاہیئے
کہ بنی اسرائیل میں جس قدر انبیاء حضرت مسیحؑ سے پہلے گزر
چکے ہیں اُن کی عظمت کے بنی اسرائیل کسی نہ کسی رنگ میں
ضرور قائل تھے ۔ اور گو ابتداء میں اُن کی مخالفت بھی ہوئی
لیکن بعد میں اُن کی صداقت کو یہودیوں نے قبول کر لیا تھا ۔
چنانچہ بائیبل میں ملاکی نبی تک سب انبیاء کی کتب موجود
ہیں جن کو وہ پڑھتے اور قابل عمل سمجھتے ہیں ۔ حتیٰ کہ حضرت
داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جن کے آخر عمر میں مرتد ہونے کے
وہ قائل ہیں ان کا ذکر بھی بائیبل میں موجود ہے اور اُنکے
اعمال کو نظر انداز کرتے ہوئے اُن کے کلام کی اُن میں اب
تک قدر پائی جاتی ہے ۔ اسی طرح حضرت زکریاؑ اور یحیٰؑ کو
بھی گو وہ نبی تسلیم نہیں کرتے لیکن عالم اور نیک آدمی سمجھتے
ہیں ۔ پس سب انبیاء کی عظمت کے وہ قائل ہیں گو بعض
کو بحیثیت عالم اور نیک ہی مانتے ہیں ۔ لیکن حضرت مسیحؑ
کی نسبت اُن کا عقیدہ نہایت گندہ اور ناپاک ہے ۔
آپ پر خطرناک الزام لگاتے ہیں اور نعوذ باللہ مفتری
اور ملعون قرار دیتے ہیں ۔ پس یہود نے نبیوں کی جو مخالفت
کی تھی اُس کا ذکر کرتے ہوئے ضروری تھا کہ حضرت مسیحؑ
کا ذکر دوسرے انبیاء سے علیحدہ اور خاص طور پر کیا
جاتا کیونکہ اُن کے ساتھ انہوں نے سب سے بُرا سلوک
کیا تھا ۔ اور قرآن کریم کے نزول تک اپنے اس عقیدے پر
قائم تھے کہ نعوذ باللہ آپ مفتری تھے ۔ اور صداقت سے
آپ کو کوئی حصہ نہیں ملا تھا ۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ سے یہود
کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا بتلا دینا بھی
ضروری تھا کہ گو یہود انہیں جھوٹا قرار دیتے ہیں لیکن وہ
اپنے ساتھ صداقت کی وہ تمام علامتیں رکھتے تھے جو دوسرے
راستباز انبیاء جن کی نبوت کے بنی اسرائیل قائل ہیں اپنے
ساتھ رکھتے تھے ۔ چنانچہ انبیاء کی صداقت کی زبردست علامات
میں سے دو کو حضرت مسیحؑ کے ذکر کے ساتھ بیان کر دیا جن
میں سے پہلی علامت آپ کے ساتھ بیّنات یعنی کھلے کھلے
نشانات کا ہونا ہے جو ہر نبی کی صداقت کے اظہار کے لئے
اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں ۔ اور دوسرے
رُوح القدس کی تائید ہے کہ یہ بھی ہر نبی کے لئے ضروری
ہے ۔ بیّنات اور رُوح القدس کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا
ہے کہ یہودی حضرت مسیحؑ پر یہی دو اعتراض کیا کرتے
تھے ۔ کہ اوّل اُس نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا ۔ دوّم
وہ نعوذ باللہ ناپاک تھا اور اُس پر شیطانی رُوح آتی
تھی ۔ چنانچہ معجزہ نہ دکھانے کے اعتراض کا ذکر متی باب ۱۲
آیت ۳۸ تا ۴۰ میں اس طرح آتا ہے کہ

"تب بعضے فقیہوں اور فریسیوں نے جواب
میں کہا ۔ کہ اے اُستاد! ہم تجھ سے ایک
نشان دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اُس نے انہیں جواب
دیا ۔ اور کہا کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار
لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں ۔ پر یونس نبی کے
نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائیگا ۔

کیونکہ جیسا یونسؑ تین رات دن مچھلی کے پیٹ
میں رہا ویسا ہی ابن آدم تین رات دن زمین
کے اندر رہے گا۔"

اور شیطانی رُوح کے متعلق یہود کے الزام کا ذکر لوقا باب ۱۱ آیت ۱۵ میں آتا ہے۔ لکھا ہے :-

"پھر وہ ایک گونگی رُوح کو نکال رہا
تھا۔ اور جب وہ بد رُوح نکل گئی۔ تو
ایسا ہوا کہ گونگا بولا۔ اور لوگوں نے
تعجب کیا۔ لیکن ان میں سے بعض نے کہا۔
یہ تو بدرُوحوں کے سردار بعلزبول کی
مدد سے بدرُوحوں کو نکالتا ہے۔"

بلکہ لوگوں نے حضرت مسیحؑ کا نام ہی بعلزبول رکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے شاگردوں کو صبر کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"جب انہوں نے گھر کے مالک کو بعلزبول
کہا تو اس کے گھرانے کے لوگوں کو کیوں نہ
کہیں گے۔" (متی باب ۱۰ آیت ۲۵)

پس اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ میں یہود کے پہلے اعتراض کا ردّ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے ہاتھ پر ہم نے بڑے بڑے نشانات ظاہر کئے تھے۔ گو افسوس ہے کہ انجیل آپ کے وہ معجزات پیش نہیں کرتی جو یہود کے مقابلہ میں حضرت مسیحؑ کی صداقت کی دلیل ہو سکتے۔ آپ کا صرف ایک ہی معجزہ تھا اُسے بھی عیسائیوں نے اپنی نادانی سے مشتبہ کر ڈالا۔ وہ معجزہ وہی تھا جس کا حضرت مسیحؑ نے خود ذکر کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ انہیں یونس نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان نہیں دکھایا جائیگا۔ حضرت یونسؑ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہے اور زندہ ہی نکلے۔ مگر عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر ہی مر گئے تھے اور مر کر ہی قبر میں گئے تھے اور پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔ اِس معجزہ کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ بدن کے ساتھ تعلق رکھتا تھا اسے خود عیسائیوں نے مشتبہ کر دیا۔ دوسرا حصہ کہ وہ زندہ ہو گئے اُسے یہود مانتے ہی نہ تھے گویا ایک ہی معجزہ جو حضرت مسیحؑ نے دکھانے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی انجیل کے مطابق نہ دکھایا جا سکا۔ ایک حصہ کے متعلق تو عیسائیوں نے مان لیا کہ وہ غلط نکلا ہے اور دوسرا حصہ یہود کے لئے حجت نہیں ہو سکتا تھا۔ پس بیّنات کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعتراض کا ردّ کیا ہے۔ باقی انبیاء کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ اُن پر تو یہ اعتراض ہی نہ ہوا تھا صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا تھا۔ پس اس اعتراض کا ردّ کرنے کے لئے خاص طور پر فرمایا کہ یہود اور نصاریٰ جو کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا یہ غلط ہے۔ ہم نے اُن کو بہت سے معجزات اور بیّنات دے کر مبعوث کیا تھا۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ پر نعوذ باللہ شیطانی رُوح کا نزول ہوا کرتا تھا۔ اس کا ردّ اللہ تعالیٰ نے اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے ذریعہ کیا۔ جس طرح عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے ایک ہی معجزہ کو یہ کہکر باطل کر دیا کہ حضرت مسیحؑ صلیب پر مر گئے تھے اور مر کر ہی قبر میں گئے اسی طرح انہوں نے یہود کے اس اعتراض کو بھی پختہ کر دیا کہ حضرت مسیحؑ کا نعوذ باللہ شیطان سے تعلق ہے۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ شیطان نے حضرت مسیحؑ کا امتحان لیا (متی باب ۴) اب بھلا شیطان کو ایک نبی کا امتحان لینے کی جرأت ہی کیسے ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ تو اس کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ مگر انہوں نے انجیل میں اس کا ذکر کرکے یہود کے اِس اعتراض کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ کہ حضرت مسیحؑ کا شیطان سے تعلق تھا۔ پس چونکہ اس اعتراض کا بھی کسی اور نبی کے

ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسیحؑ کا الگ ذکر کر کے اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ فرما دیا۔ اور اس اعتراض کو باطل کر دیا کہ جو یہود آپ کی ذات پر کرتے تھے۔

یہاں تک تو یہود کے نقطۂ نگاہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ کا باقی انبیاء سے علیٰحدہ کیوں ذکر کیا گیا ہے۔ اب مَیں عیسائیوں کے نقطۂ نگاہ کو مدّنظر رکھ کر جواب دیتا ہوں۔ جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے۔ عیسائی اس آیت سے فائدہ اُٹھا کر حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت مسیحؑ اللہ تعالیٰ کے رسول ہوتے تو اُن کو وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ میں پہلے ہی شامل کر لیا گیا تھا پھر ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ ان کا الگ ذکر کرنا بتاتا ہے کہ اُن کو رسولوں سے بالا ہستی قرار دیا گیا ہے۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ انبیاء جنکو وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ میں بیان کیا گیا ہے اُن کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی الگ جماعتیں موجود نہ تھیں مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کی کوئی جماعت نہ تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی کوئی جماعت نہ تھی۔ حضرت یحییٰؑ کی کوئی جماعت نہ تھی۔ حضرت الیاسؑ کی کوئی جماعت نہ تھی۔ حضرت زکریاؑ کی کوئی جماعت نہ تھی۔ اسی طرح دانی ایل اور حزقی ایل کی کوئی جماعت نہ تھی۔ پس ان کا الگ ذکر کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جماعت یہود سے الگ موجود تھی اس لئے ضروری تھا کہ ان کا علیٰحدہ ذکر کیا جاتا۔ دوسرے اس لئے بھی انکا علیٰحدہ ذکر ضروری تھا کہ اُن کی قوم نے اُن سے رسالت کا اصل رنگ ہٹا کر اُن کو ابنیت کی چادر پہنا دی تھی۔ باقی تمام رسول جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنو اسرائیل میں آئے ایک ہی تسبیح کے دانے تھے اور اُن میں سے کسی کو وہ کوئی خاص امتیاز نہیں دیتے تھے اس لئے اُن کا ایک ہی جگہ ذکر کر دیا گیا مگر مسیحؑ کا ذکر اس لئے علیٰحدہ کیا کہ اُن کی الوہیت کی وہ چادر ہٹانی ضروری تھی جو عیسائی انہیں پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ آیت حضرت مسیحؑ کے متعلق عیسائیوں کے عقیدہ کو ردّ کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے۔ اور انہیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا انہیں خدا یا خدا کا بیٹا قرار دینا تمہاری کم فہمی پر مبنی ہے۔ وہ تو صرف ایک رسول تھے جن کی بیّنات اور رُوح القدس سے تائید کی گئی تھی اور بیّنات شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے سب انبیاء کو ملے ہیں۔ آج تک دنیا میں ایسا کوئی نبی نہیں آیا جو بغیر بیّنات کے آیا ہو۔ اسی طرح قرآن کریم کی نصوص بیّنہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی رُو سے رُوح القدس کا نزول غیر نبی پر بھی ہو سکتا ہے۔ پس حضرت مسیحؑ کو بیّنات اور روح القدس کی تائید حاصل ہونا نہ تو انہیں شرعی نبی ثابت کرتا ہے اور نہ ابن اللہ یا اِلٰہ ثابت کرتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا پہلا لفظ اٰتَيْنَا ہے یعنی ہم نے انکو دیا اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی اَور دیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو وہ ہستی ہے جسے لینے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ خود دوسروں کو اپنی نعمتیں دیتا ہے۔ مگر حضرت مسیحؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم نے اُس کو دیا۔" پس اس آیت کا پہلا لفظ ہی ان کے اقنوم ہونے کو باطل قرار دے رہا ہے۔

دوسرا بیّنات کا لفظ ہے۔ یہ بھی مسیحؑ کی ابنیت کو باطل ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ جو شخص اپنی صداقت منوانے کے لئے دوسرے کی دی ہوئی بیّنات کا محتاج ہے وہ اِلٰہ نہیں ہو سکتا ہے۔

دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں (۱) ایک مادی

(۲) اور دوسری غیر مادی - مادی چیزیں سبب اور مسبّب کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں - اور ان کو اپنا وجود منوانے کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہوتی ہے - مگر وہ ذات جو غیر مادی ہو - سبب اور مسبّب سے بالا ہوتی ہے - اسے اپنی ذات منوانے کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی - بلکہ اس کے دعویٰ کی دلیل خود اس کا اپنا وجود ہوتا ہے - جیسے کسی نے کہا ہے کہ

ع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ اپنی صداقت منوانے کے لئے خارجی دلائل کے محتاج ہوئے اس لئے معلوم ہوا کہ وہ مخلوق تھے نہ کہ خالق - اور مخلوق الٰہ نہیں ہو سکتی -

اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ وہ دوسرے کی مدد کے محتاج تھے - اور جو دوسرے کی مدد کا محتاج ہو وہ خدا کس طرح ہو سکتا ہے - طاقت اور قوت تو اسی کو بخشی جاتی ہے جو کمزور اور ضعیف ہو - پس اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے الفاظ بھی حضرت مسیحؑ کی کمزوری کو ظاہر کر رہے ہیں کیونکہ روح القدس کی تائید کی ضرورت تبھی تسلیم کی جا سکتی ہے جبکہ پہلے ان کی کمزوری مانی جائے - اور جو ہستی کمزور اور ضعیف ہو وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں کہلا سکتی - پس یہ فقرہ خود ان کی ذات میں ان کی خدائی کی تردید کر رہا ہے - اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ انہیں پاکیزگی کی قوت خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی - اگر خدا تعالیٰ ان کو پاکیزگی عطا نہ کرتا تو وہ صرف گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہوتے - پس یہ فقرات حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی الوہیت کا عقیدہ رکھنے والوں پر ایک کاری ضرب ہیں -

اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ الخ - اس میں بتایا کہ نبی تو اس وقت آتا ہے جب کہ لوگ صحیح راستہ کو چھوڑ بیٹھتے ہیں - اور اس وجہ سے لازماً اس کی تعلیم لوگوں کے خیالات کے خلاف ہوتی ہے - لیکن یہود نے اپنی یہ عادت بنا رکھی ہے کہ جو بات اپنی رائے کے مخالف ہو اسے قبول نہیں کرنا - اس لئے ہر رسول کے آنے پر انہوں نے تکبّر سے کام لیا - اور اگر ایک حصّہ کو صرف زبان سے جھٹلا دیا تو دوسرے حصّہ کو قتل کرنے تک کے منصوبے کئے -

اللہ تعالیٰ یہود کی اس شقاوت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب تم نے انکار ہی کرنا ہے تو پھر تمہارا یہ کہنا کہ اگر بنی اسحاق میں سے نبی ہوتا تو ہم اسے مان لیتے کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے - یہ تو تمہارا صریح جھوٹ ہے -

فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ کے یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ تم نے بعض کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا - جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا گیا - مگر کَذَّبْتُمْ اور تَقْتُلُوْنَ کے صیغوں میں چونکہ فرق کر دیا گیا ہے اس لئے فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہود کا ارادہٗ قتل بھی ہو سکتا ہے - یعنی پچھلوں کو تم نے جھٹلایا اور اس نبی کو تم قتل کرنیکا ارادہ رکھتے ہو - یا اس سے لڑائی کرتے ہو - اس صورت میں اس کے معنے قتل کے نہیں بلکہ لڑائی کے ہونگے - بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا گند کم نہیں ہوا بلکہ اور بھی بڑھ گیا ہے اور جہاں تک تمہارا بس چلا ہے تم نے خدا تعالیٰ کے نبیوں کی مخالفت کرنے میں کوئی کمی نہیں کی -

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ

اور (ہمیں معلوم ہے کہ) انھوں نے (یہ بھی) کہا ہے (کہ) ہمارے دل تو پردوں میں (ہیں مگر یہ بات) نہیں بلکہ اللہ نے اُن کے کفر کے

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٨٩﴾

سبب سے اُن پر لعنت کی ہے۔ پس وہ بہت ہی کم ایمان لاتے ہیں۔ ؎۱۵

؎۱۵ حل لغات:۔ غُلْفٌ: اَغْلَفُ کی جمع ہے اور غِلَافٌ کی بھی۔ اس کے معنے نامختون کے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ عربی زبان میں دو عام محاورے بھی ہیں۔ کہتے ہیں (۱) قَلْبٌ اَغْلَفُ یعنی ایسا دل جو اپنے اندر سمجھ نہ رکھتا ہو۔ اور (۲) سَيْفٌ اَغْلَفُ یعنی تلوار ایسے غلاف میں ہے کہ جس میں باہر سے کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔

تفسیر:۔ جب کسی صداقت کا مقابلہ دلائل کے ساتھ کوئی انسان نہ کر سکے اور اسے قبول کرنے کیلئے بھی تیار نہ ہو تو وہ ادھر اُدھر کی باتیں بنا کر اُسے ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس آیت میں یہود کا ایک ایسا ہی عذر بیان کیا گیا ہے جس کے ذریعے وہ اسلام سے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس زمانہ میں بھی ضدی لوگ اسی قسم کے عذرات کرکے اپنے آپ کو اس صداقت سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ دنیا میں بھیجی گئی ہے۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے۔ غُلْفٌ اَغْلَفُ کی بھی جمع ہے جس کے معنے ناسمجھ کے ہیں اور غِلَافٌ کی بھی جمع ہے۔ اگر غُلْفٌ کو غِلَافٌ کی جمع سمجھا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ ہمارے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک قیمتی چیز کی طرح پردہ میں رکھا ہوا ہے۔ تمہاری باتیں ہمارے دلوں پر اثر نہیں کر سکتیں۔

غلاف چونکہ اعلیٰ درجہ کی چیزوں پر چڑھایا جاتا ہے تاکہ وہ میلی نہ ہوں اس لئے قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کا فقرہ کہہ کر اُن کا منشا یہ ہوتا کہ تم ہمیں کیا سمجھاتے ہو ہمارے دل تو خود بڑے پاک اور ہر قسم کی آلائشوں سے مبرّا ہیں۔ اس لئے تمہاری باتوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں تمہارے اثرات سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

اور اگر اس کے معنے ناسمجھ کے لئے جائیں۔ تو قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کا یہ مفہوم ہوگا کہ مسلمان جب اُنکے سامنے دلائل پیش کرتے تو وہ اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے کہہ دیتے کہ یہ باتیں تو بڑی اچھی ہیں مگر ہم ناسمجھ اور جاہل ہیں بھلا ہم ان باتوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے بعض لوگوں کی تو یہ مراد ہوتی۔ کہ ہم کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ تم ہمارے علماء کو سُناؤ اور سمجھاؤ ہمارے ساتھ کوئی گفتگو نہ کرو۔ اور بعض لوگ طنز کے طور پر کہتے کہ آپ لوگ تو بڑے عالم ہیں۔ ہم جاہل لوگ ہیں یہ باتیں ہمیں کہاں سمجھ آسکتی ہیں۔ جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوتا۔ کہ ہم لوگ جو سمجھدار ہیں جب ہماری سمجھ میں بھی یہ باتیں نہیں آئیں تو تم کیونکر سمجھ گئے۔ یا یہ کہ تمہارے نزدیک ہمارے دل غلاف میں ہیں یعنی سزا کے طور پر اُن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پھر ایسی صورت میں تم کیوں سمجھانے آتے ہو۔

اگر غُلْفٌ کے معنے علم کے خزانہ کے لئے جائیں۔ تو یہودیوں کا ان الفاظ سے یہ مطلب ہوتا کہ ہمارے دل تو

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ

اور جب اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب آئی جو اس (کتاب کی پیشگوئیوں) کو جو اُن کے

لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ

پاس ہے سچا کرنے والی ہے تو باوجود اس کے کہ پہلے یہ (لوگ اللہ سے) کافروں پر فتح (پانے کی دُعا)

عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا

مانگا کرتے تھے جب اُن کے پاس وہ چیز آگئی جس کو انہوں نے پہچان لیا

علم کے خزانے ہیں ہمیں کسی مزید صداقت کی کیا ضرورت ہے)۔

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہمارے دل ناپاک ہیں۔ یعنی جب انہیں کوئی جواب نہیں آتا تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم گندے لوگ ہیں ہمیں چھوڑ دو اور کسی اور سے گفتگو کرو گویا مسلمانوں سے وہ اپنا پیچھا چھڑانے کیلئے ایسا کہتے ہیں حالانکہ ہدایت تو آتی ہی ایسے لوگوں کیلئے ہے جو گندے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بطور تمسخر کے کہتے ہوں یعنی جب تم ہمیں گندہ اور ناپاک سمجھتے ہو تو ہمیں نصیحت کیوں کرتے ہو۔

بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ :۔ فرماتا ہے یہود کا ان الفاظ سے خواہ کچھ بھی مطلب ہو۔ خواہ وہ بات کو ختم کرنے کیلئے ایسا کہیں خواہ طنزاً ایسا کہیں خواہ اپنی علمیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کیلئے ایسا کہیں حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت پڑ گئی ہے اور اسی لعنت کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ قبول حق سے محروم ہو گئے ہیں۔

بِكُفْرِهِمْ میں بتایا کہ یہ لعنت اُن پر اس لئے پڑی ہے کہ انہوں نے متواتر اللہ تعالیٰ کے انبیاء کا انکار کیا اور اُن کی مخالفت کی۔ پس نہ تو یہ ایسے ناسمجھ ہیں کہ بات کو سمجھ ہی نہ سکیں اور نہ ہی اعلیٰ درجہ کے سمجھدار وجود ہیں کہ کسی کی تبلیغ کے محتاج ہی نہ ہوں۔ اصل وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر لعنت ڈال دی ہے۔ اس وجہ سے باوجود اس کے کہ اسلام کی تعلیم دوسری تمام تعلیموں سے افضل ہے اور فطرت انسانی اس کو قبول کرتی ہے اور عقل سلیم اس سے مطمئن ہوتی ہے پھر بھی وہ اس کا انکار کر رہے ہیں۔

لَعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ کے الفاظ اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کسی پر بلاوجہ نہیں پڑتی بلکہ اس کا اصل باعث کفر ہوتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں پر بے حد رحم و کرم سے کام لینے والا ہے انہیں اپنی محبت سے محروم نہیں کرتا۔ وہ اسی وقت اپنے قرب کے دروازے ان پر بند کرتا ہے جب وہ خود اس کی رحمت کے دروازوں کو اپنے ہاتھ سے اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ :۔ اس کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ وہ تھوڑا ایمان لاتے ہیں یعنی بعض باتوں کو مانتے ہیں اور بعض کو ردّ کر دیتے ہیں۔ جیسے یہود کے متعلق پچھلے رکوع میں آچکا ہے کہ يُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَيَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ یعنی وہ احکامِ الٰہی میں سے بعض کو تو مان لیتے ہیں اور بعض کا انکار کر دیتے ہیں۔ پس اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ ناقص طور پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن اس کے

كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۰﴾

تو اُس کا انکار کر دیا پس ایسے کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔ ؎

یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ بالکل ایمان نہیں لاتے۔ کیونکہ
نفی کے لئے بھی قلیل کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں۔ علامہ
ابو البقاء نے لکھا ہے کہ اس کے معنے اس طرح بھی ہو
سکتے ہیں کہ مَا نافیہ مانا جائے اور اصل عبارت یوں
سمجھی جائے کہ مَا یُؤْمِنُوْنَ قَلِیْلًا وَّ لَا کَثِیْرًا۔ مگر
اس صورت میں بھی معنے ایک ہی رہتے ہیں کہ یہ لوگ
ایمان سے بالکل محروم ہو چکے ہیں۔

یَسْتَفْتِحُوْنَ

؎ **حل لغات**: یَسْتَفْتِحُوْنَ: اِسْتَفْتَحَ
فُلَانٌ کے معنے ہوتے ہیں طَلَبَ الْفَتْحَ وَاسْتَنْصَرَ
اُس نے فتح اور نصرت چاہی۔ اور اِسْتَفْتَحَ الْبَابَ
کے معنے ہوتے ہیں فَتَحَهٗ اُس نے دروازہ کھولا (اقرب)

تفسیر: مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ: یاد رکھنا
چاہیئے کہ تصدیق دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قسم تو یہ ہے
کہ مثلاً ہم کہیں کہ زید سچا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوگا
کہ زید کی طرف جھوٹ منسوب نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری
قسم یہ ہے کہ زید کہے بکر آجائیگا اور وہ آجائے۔
تو ہم کہیں کہ بکر نے زید کو اپنی بات میں سچا کر دیا ہے
یعنی اُس نے زید کی بات سچی ثابت کر دی۔ اسجگہ بھی
تصدیق کے یہ معنے نہیں کہ قرآن کریم نے تورات کی ساری
تعلیم کو سچا قرار دے دیا ہے بلکہ اس کا صرف یہ مطلب ہے
کہ وہ پیشگوئیاں جو بائبل میں قرآن کریم اور رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے متعلق پائی جاتی تھیں قرآن کریم نے اپنے نزول سے
اُنکو سچا ثابت کر دیا ہے۔ پس یہ تصدیق پیشگوئیوں کے
بارہ میں ہے۔ یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم بائبل کی تمام
باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا
ہے کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جس کے متعلق خود یہود کی
اپنی کتابوں میں پیشگوئیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر قرآن کریم
نہ آتا تو اُن کی پیشگوئیاں جھوٹی ثابت ہوتیں مگر اب
قرآن کریم نے بائبل کی ان پیشگوئیوں کو سچا ثابت کر دیا
ہے۔ اگر ان کے اندر اپنی کتب پر سچا ایمان پایا جاتا
تو اُن کا فرض تھا کہ وہ قرآن کریم کی صداقت کو تسلیم
کرتے اور اس طرح اپنے عمل سے بائبل کی صداقت کا
اقرار کرتے۔

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ
کہ وہ کفار کے ماتحت رہتے تھے اس لئے وہ اُن پر
فتح حاصل کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کے حضور دعائیں کیا
کرتے تھے کہ اے اللہ! آنے والے موعود نبی کو بھیج۔
اور ایسے سامان پیدا فرما جن کے ذریعہ سے ہمیں کفار
پر غلبہ حاصل ہو۔ اس لحاظ سے یَسْتَفْتِحُوْنَ کے
یہ معنے ہونگے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے فتح مانگتے تھے۔ اور
دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ کفار پر اپنی کتاب کی پیشگوئیوں
کا باب کھولتے تھے اور انہیں بتایا کرتے تھے کہ فلاں
فلاں علامت رکھنے والے ایک رسول کی ہمیں خبر دی گئی
ہے۔ چونکہ اُن کے دلوں میں ابھی اپنی کتاب کا احترام باقی
تھا۔ اس لئے وہ اپنی کتاب کی اُن پیشگوئیوں کو جو
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تھیں کافروں کے سامنے
بیان کیا کرتے تھے اور اُن کو بتایا کرتے تھے کہ جب وہ
نبی آئیگا تو ہمیں سب کفار پر غلبہ حاصل ہو جائیگا۔
(ابن ہشام صفحہ ۱۵۵) یہی بات تھی جو مدینہ کے لوگوں کے
ایمان لانیکا باعث ہوئی۔ یہود کے تین قبائل جو ہجرت

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ

اور بہت ہی بُرا ہے جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ رکھا ہے۔ اور وہ ان کا اللہ کے اُتارے

اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى

ہوئے کلام سے اس بات پر بگڑ کر انکار کرنا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (کیوں) اپنا فضل نازل

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ

کر دیتا ہے۔ پس یہ لوگ غضب کے بعد غضب کا مورد ہو گئے

کرکے مدینہ آگئے تھے اُنکو اپنے بزرگوں سے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ موعود نبی مدینہ اور اس کے اردگرد کے علاقہ میں آنے والا ہے۔ چنانچہ وہ مدینہ کے لوگوں کے سامنے یہ پیشگوئیاں بیان کیا کرتے تھے اور انکو بتایا کرتے تھے کہ ہمارے اندر ایک نبی آنیوالا ہے اس کے ذریعہ کفر مٹ جائیگا۔ اور دینِ حق غالب آئیگا۔ چنانچہ ایک سال جب مدینہ کے لوگ حج کرنے کیلئے مکہ مکرمہ گئے تو اُن کو اس بات کا علم ہُوا کہ مکہ کے ایک شخص نے رسول ہونیکا دعویٰ کیا ہے اسپر انہوں نے آپس میں مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ یہود کہا کرتے تھے کہ ایک نبی آئیگا جسے نہ ماننے والے تباہ ہو جائیں گے۔ چلو ہم اُسے مان لیں اور تباہی سے بچ جائیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ انہوں نے آپس میں یہی ذکر کیا کہ یہود عقلمند ہیں۔ مالدار ہیں۔ طاقتور ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اُسے مان کر ہم پر غالب آجائیں۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم پہلے مان لیں۔ یہی بات انہوں نے اپنی قوم سے جاکر بیان کی اور اُسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کی خبر دی۔ اسپر وہ قریبًا سب کے سب ایمان لے آئے۔ مگر یہود ان لوگوں کو جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا تھا کافر کہنے لگ گئے۔ حالانکہ اس سے قبل آنے والے رسول کے متعلق وہ اپنی

کتابوں سے خود پیشگوئیاں نکال نکال کر بیان کیا کرتے تھے اور اس بات پر فخر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ موعود نبی آئیگا تو پھر ہم تمہاری خوب خبر لیںگے لیکن جب وہ رسول آگیا۔ تو وہ تاویلیں کرنے لگ گئے یہی حال آجکل کے مسلمانوں کا ہے۔ وہ بھی کفار پر غلبہ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر جب آنے والا آگیا تو وہ تاویلیں کرنے لگ گئے۔ اور پھر یہ کہنے لگ گئے کہ یہ خیالات ہمارے اندر مجوسیوں سے آگئے ہیں۔ ورنہ دراصل ہمارے ہاں کوئی ایسی پیشگوئی ہی نہ تھی۔

فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ اس جگہ کافر سے مراد عام کافر بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر زیادہ تر وہی کافر مراد ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تو یہ دُعائیں کیا کرتے تھے کہ الٰہی کوئی ایسا رسول مبعوث فرما جو دینِ حق کو ادیانِ باطلہ پر غالب کردے لیکن جب وہ رسول آگیا۔ اور ان لوگوں نے علامات سے یہ بات دیکھ لی کہ باطل پر صداقت غالب آرہی ہے اور عنقریب کلی طور پر غالب آجائیگی تو اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پس واضح صداقت کو دیکھ کر اور حجت قائم ہونے اور دُعائیں کرنے کے بعد اُن کے انکار کرنے کے یہ معنے ہیں کہ اُن پر خدا تعالیٰ کی لعنت پڑ رہی ہوئی ہے۔ ورنہ ایسی واضح صداقت کا وہ بلا وجہ

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۱﴾

اور ایسے (ہی) کافروں کے لئے رُسوا کرنے والا عذاب (مقدّر) ہے۔ ۵۸

کس طرح انکار کر سکتے تھے۔

واقعہ میں جب ہم اس بات پر غور کریں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت کس طرح حضرت موسیٰؑ اور دوسرے اسرائیلی نبیوں کی عزّت عرب کے دلوں میں بیٹھ گئی اور وہ جو اُن انبیاء کو مفتریوں کی طرح سمجھتے تھے صادقوں کی طرح اُن کی عزّت کرنے لگے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہود کو آخر وہ کونسی تکلیف پہنچی تھی جس کی وجہ سے ایسے محسن انسان کی دشمنی اور ایذاء دہی میں انہوں نے عرب کے کفار سے بھی زیادہ زور لگایا۔

۵۸ حل لغات:- اِشْتَرٰی - یہ لفظ خریدنے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور بیچنے کے معنوں میں بھی۔ یہاں دونوں معنے چسپاں ہو جاتے ہیں۔

اِشْتَرٰی

تفسیر:- بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ یہ ایک وسیع مضمون ہے جو لمبی تفصیل سے تعلق رکھتا ہے مگر میں اسے اختصار کے ساتھ بیان کر دیتا ہوں۔

قرآن کریم سے یہ بات ثابت ہے کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو اس وقت اللہ اور اس کے درمیان ایک سودا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ آیت ۱۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے اموال اس وعدہ کے ساتھ خرید لئے ہیں کہ انہیں اس کے بدلہ میں جنّت دی جائے گی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ وہ مومنوں سے ان کے مال اور جان خرید لیتا ہے اور اس کی قیمت میں انہیں جنّت دے دیتا ہے جنّت مرنے کے بعد ملنے والی چیز ہے

اور جو چیز بعد میں ملنے والی ہوتی ہے اس کے لئے سودا کرتے وقت کوئی نہ کوئی رسید دی جاتی ہے جسے وہ موقع پر دکھا سکے۔ اس نکتۂ نگاہ سے جنت کے لئے بھی کوئی پروانہ ہونا چاہیئے تھا جسے وہ موقعہ پر دکھا کر داخل ہو سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ جنت کے لئے ایک پروانہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۞ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۞ (فجر آیت ۲۸ تا ۳۱) یعنی اے نفس مطمئنہ تُو اپنے ربّ کی طرف اس حالت میں رجوع کر کہ تُو اپنے رب سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو گویا یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ سودا ٹھیک ہے۔ چونکہ دینے والا اور لینے والا دونوں راضی ہونگے اسلئے ثابت ہو جائیگا کہ سودا بالکل درست ہے۔ غرض ایمان لانا ایک سودا ہے جو بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو جنّت میں داخل کر لیتا ہے۔ اور اس کے لئے پہلے اسے ایک پروانہ دے دیتا ہے اور وہ پروانہ یہ ہے کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ تُو میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ گویا عبودیت کا مقام وہ ٹکٹ ہے جسے دکھا کر ایک مومن بندہ جنّت میں داخل ہو جائیگا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (انعام آیت ۱۲۶) یعنی جسے اللہ تعالیٰ ہدایت کا راستہ دکھانا چاہتا ہے اور کامیاب کرنا چاہتا ہے اور جنّت میں پہنچانا چاہتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔

اسلام کا لفظ بعض دفعہ ایمان کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ ایمان اور اسلام دونوں الگ الگ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس جگہ اسلام کا لفظ ایمان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور بتایا گیا کہ جسے اللہ تعالیٰ جنّت میں لے جانا چاہتا ہے اُس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے گویا سینے کا کھلنا بھی جنّت کا ایک ٹکٹ ہے۔ غرض ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے عبودیت کے ٹکٹ کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ شرح صدر کو اُس کی علامت قرار دیا ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ کیونکہ تعبّد کے معنے تذلّل اور خدا کے نقش کو قبول کرنے کے ہیں۔ اور عبدِ کامل وہ ہوتا ہے جو خدا تعالیٰ کے نقش کو قبول کرنے لگ جائے اور یہی معنے شرح صدر کے ہوتے ہیں۔ غرض یہ ایک ثابت شدہ امر ہے کہ انسان کا مومن ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سودا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنا مال اور اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اُسے جنّت دے دیتا ہے۔ جنّت چونکہ مرنے کے بعد ملا کرتی ہے اسلئے اس دنیا میں اس کے لئے اُسے ٹکٹ دے دیا جاتا ہے کہ اسے دکھانا اور اندر چلے جانا۔ ورنہ اُسے کیا پتہ لگ سکتا ہے کہ مرنے کے بعد اُسے جنّت ملے گی یا نہیں۔ اس لئے اس کی علامت مقرر کر دی جو عبودیت اور اسلام کیلئے شرح صدر ہے گویا ایمان و اسلام ایک ٹکٹ ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو ملتا ہے اور اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا سودا خدا تعالیٰ سے طے پا گیا ہے۔ جب وہ اسے پیش کر دیتا ہے تو اُسے جنّت مل جاتی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس سودا کو فسخ کرنا چاہے تو کیا کرے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے کہیگا کہ جنت کا ٹکٹ واپس کر دو۔ اور اپنی چیز لے لو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب اُن پر ایمان لائی تو اُس کا خدا تعالیٰ سے سودا ہو گیا اور اُسے جنت کے لئے ٹکٹ مل گیا۔ اسی طرح جب عیسائی قوم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مان لیا تو اُس کا بھی خدا تعالیٰ سے سودا ہو گیا اور اُسے جنّت کا ٹکٹ مل گیا۔ یہ لوگ اپنے اپنے زمانہ میں مومن تھے اور اُنکا خدا تعالیٰ سے سودا ہو گیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کا بھی خدا تعالیٰ سے سودا ہو گیا اور اُن کو بھی خدا تعالیٰ نے جنّت کا ٹکٹ دے دیا۔ مگر یہود نے یہ حماقت کی کہ انہوں نے اس بیع کو فسخ کر دیا۔ اور جنّت کا ٹکٹ جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا تھا واپس کر دیا اور اپنی جانوں اور مالوں کو لے لیا۔ خدا کی دی ہوئی چیز ایمان اور اسلام واپس کر دی اور اپنی جانیں اور اموال لے لئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ پہلی بیع تو برکت والی تھی مگر یہ بیع نہایت گندی اور تباہ کن ہے۔ پہلے سودے میں خدا تعالیٰ کی دی ہوئی چیز اچھی تھی۔ اور اُن کی دی ہوئی ناقص تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے اس نفع مند سودا کو فسخ کر دیا۔

بیع فسخ کرنے کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز جو لی گئی ہو اچھی نہ ہو بلکہ ناقص ہو۔ مگر یہاں یہ بات نہ تھی۔ خدا کی دی ہوئی چیز ناقص نہ تھی بلکہ کامل تھی۔ دوّم خدا کی طرف سے جو چیز ملی ہو وہ تو اچھی ہو مگر اُس کے مقابلہ میں قیمت زیادہ دینی پڑی ہو۔ اگر اس وجہ سے بھی سودا فسخ ہو تو بھی قابلِ اعتراض نہیں ہوتا۔ مگر یہاں یہ بات بھی نہ تھی۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ بیع فسخ کرنے میں یہود نے کونسی بات کو مدّ نظر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُن کے بیع فسخ کرنے کی ان دو میں سے کوئی

وجہ نہ تھی بلکہ اُن کے فسخ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے سرکشی کی۔ اور بعض شرارت سے کہا کہ ہمارے سوا دوسروں کو یہ چیز کیوں دی گئی ہے۔ یہود کی یہ بات کس قدر حماقت پر مبنی ہے۔ کیا کوئی دوکاندار کے متعلق کہہ سکتا ہے کہ اس نے فلاں سودا میرے سوا دوسرے شخص کو کیوں دیا۔

یہود کے اس نظریہ کی تشریح کے لئے حدیث میں آتا ہے کہ اِن لوگوں کی مثال اس واقعہ کے ساتھ ملتی ہے کہ کسی ٹھیکیدار نے بعض اشخاص کو صبح سے ظہر تک اور بعض کو ظہر سے عصر تک اور بعض کو عصر سے مغرب تک کام کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اور مزدوری سب کو ایک ہی دی۔ اِس پر ظہر اور عصر تک کام کرنے والوں نے ٹھیکیدار کو کہا کہ عصر سے مغرب تک کام کرنے والوں نے تو تھوڑا کام کیا ہے اور معاوضہ ہمارے جتنا لے گئے ہیں یہ قرینِ انصاف نہیں۔ اِس پر ٹھیکیدار نے انکو کہا کہ یہ میری مرضی ہے۔ اس پر تم کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی حال یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا ہے۔ یہود اور نصاریٰ نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے وہی انعامات مسلمانوں کو بھی دے دیئے ہیں جو انہیں ملے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ مسلمان جو آخر میں آئے تھے اُن کو وہی انعامات کیوں مل گئے جو ہمیں ملے تھے۔ غرض اس غصہ اور حسد کی وجہ سے کہ مسلمانوں کو بھی جنت مل گئی ہے حالانکہ جنت صرف ہمیں ملنی چاہیئے تھی انہوں نے اسلام کو قبول نہ کیا اور بزبانِ حال اللہ تعالیٰ سے کہنے لگے کہ ہمارا جو سودا پہلے ہُوا تھا اُسے فسخ کر دیجیئے۔ یہود کی یہ بات کہ ہمارا سودا فسخ کر دیجیئے کیونکہ وہی سودا مسلمانوں کے ساتھ کرکے اُن کو بھی جنت کا حقدار قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں میں تمام اقوام شامل ہو کر نجات پاسکتی اور جنت میں جاسکتی ہیں اسکا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِن پر دُہرا غضب نازل ہوُا۔ ایک تو اُن کے کفر اختیار کرنے اور ترکِ ایمان کی وجہ سے اور دوسرے اُن کے اس حسد کی وجہ سے کہ مسلمانوں کو بھی جنت کا حقدار بنا دیا گیا ہے۔ گویا ایک تو بغاوت اور دوسرے حسد کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا۔ اپنا ذاتی فائدہ مدنظر نہ رکھا اور سودا فسخ کر دیا۔

دوم اِشْتَرٰی کے معنے اگر بیچنے کے لئے جائیں تو کسی چیز کے بدلے میں اپنی جانوں کو بیچنے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ انسان اُس میں منہمک ہو جائے۔ اِس صورت میں بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ کے یہ معنے ہونگے کہ وہ چیز جس کے ساتھ انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔ بہت بُری ہے یعنی کفر۔ کفر کیلئے اپنے آپ کو فروخت کر دینا درحقیقت ایک عادت کی بازی میں مبتلا ہو جانیکا۔ اردو زبان میں بھی کہتے ہیں کہ تم فلاں بات میں ہی لگ گئے ہو۔ پس اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ کفر میں ہی منہمک ہو چکے ہیں۔ اور اِن کی کفر میں ترقی کی بڑی وجہ یہ حسد ہے کہ نبوت ہمیں کیوں نہیں ملی مسلمانوں کو کیوں مل گئی ہے۔ غرض یہاں اِشْتَرٰی کے دونوں معنے چسپاں ہو سکتے ہیں خریدنے کے بھی اور بیچنے کے بھی۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ میں بتایا کہ یہود خدا تعالیٰ کے متواتر غضب کو لے کر اس طرح بن گئے کہ گویا خدا تعالیٰ کا غضب انہیں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا گیا کہ یا رسول اللہ! سورۃ فاتحہ میں جو مغضوب اور ضالین کا ذکر آتا ہے اس میں مغضوب سے کون لوگ مراد ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا۔ یہود۔ (فتح البیان جلد اول) اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ متواتر

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ

اور جب اُن سے کہا جائے کہ جو کچھ اللہ (تعالیٰ) نے اُتارا ہے اُس پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اُس پر ایمان

بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ

لاتے ہیں جو ہم پر اُتارا گیا ہے اور (یہ کہتے ہوئے) اس کے بعد آنے والے (کلام) کا وہ انکار کر دیتے ہیں حالانکہ وہ اس (کلام)

الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ

کو جو اُن کے پاس ہے سچا کرکے کامل طور پر سچا (ثابت ہو چکا) ہے تُو (ان سے) کہہ کہ اگر تم (واقعی) مومن ہو تو پھر

اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۲﴾

تم کیوں اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کے قتل کے درپے رہے ہو۔ ۵۹

اللہ تعالیٰ کے انبیاء کا مقابلہ کرتے رہے اور غضب الٰہی کے مورد بن گئے۔

بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ کے الفاظ اس لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ ایک دفعہ تو یہود حضرت مسیحؑ کا انکار کرکے خدا تعالیٰ کے غضب کا مورد بنے تھے اور دوسری دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرکے وہ اُس کے غضب کا مورد بنے گویا دوہرے طور پر وہ غضب الٰہی کا مورد بن گئے۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ میں بتایا کہ حسد کرنے والے آخر میں ضرور رُسوا ہوتے ہیں۔ اگر دیانتداری سے کسی مذہب کی مخالفت ہو تو وہ ایک علیحدہ امر ہے لیکن یہود کو اپنی کتاب کی پیشگوئیاں دیکھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا علم ہو چکا تھا۔ مگر اسکے باوجود وہ آپ کا انکار کرتے رہے۔ اور جو شخص کسی صداقت کا عمدًا انکار کرتا ہے وہ یقینًا رسوا ہوتا ہے بلکہ اگر بعد میں وہ مان بھی لے تب بھی لوگ اُسے رُسوا کرتے ہیں کہ اس نے انکار کرکے مان لیا۔

۵۹ تفسیر:۔ یہود کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اس بات پر غصہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سوا دوسروں میں اپنا نبی کیوں بھیج دیا۔ چنانچہ جب اُن سے کہا جاتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ اُترا ہے اُس پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے کہ ہم تو اُسی پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ حالانکہ وہ اس بات میں بھی جھوٹے تھے۔ اگر وہ موسیٰؑ کی کتاب پر سچے دل سے ایمان رکھتے تھے اور نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا کہنے میں راستی پر تھے تو اُن پیشگوئیوں کا وہ کیوں انکار کرتے تھے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اُن کی کتاب میں پائی جاتی تھیں۔ اُن کا اپنی کتاب کی پیشگوئیوں کو جھٹلا دینا بتاتا ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے تھے کہ ہم صرف اپنی کتاب پر ایمان رکھیں گے۔ ورنہ اگر اُن میں دیانتداری پائی جاتی تو وہ سمجھتے کہ اگر وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائیں گے تو خود اُن کے مذہب پر حملہ ہوگا کیونکہ اُن کی اپنی کتاب میں ایک آنے والے رسول اور ایک جدید کتاب کا ذکر ہے۔ اور وہ نشانیاں جو اس رسول اور اس کتاب کی بتائی گئی ہیں وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اور قرآن کریم پر حرف بحرف منطبق ہوتی ہیں۔ پس اُنکا انکار در حقیقت اپنی کُتب کی صداقت سے بھی انکار کرنا ہے۔ کیونکہ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ علامات باطل تھیں اور جھوٹے آدمی میں بھی پائی جاسکتی تھیں۔ یا یہ کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے سوا شیطان بھی غیب کی باتیں بتا سکتا ہے۔ اور اُس نے پہلے انبیاء کو آنے والے رسول کی نسبت بعض ایسی علامات بتادیں جو ایک جھوٹے نبی میں پائی جاتی تھیں۔

نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا سے یہ امر بھی مستنبط ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی شخص پر کوئی ایسا انعام نازل ہو جس سے ساری قوم کو فائدہ پہنچے تو اُس وقت ایسا ہی سمجھا جاتا ہے کہ گویا وہ انعام ساری قوم کو ملا ہے۔ چنانچہ دیکھو تورات یہود پر نازل نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر اُتری۔ کیونکہ اس کتاب سے تمام یہود نے بحیثیت قوم فائدہ اٹھایا تھا۔ افسوس ہے کہ اِس زمانہ میں مسلمان بھی یہی کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو مان کر مرزا صاحب کی کیا ضرورت ہے؟ گویا [illegible] بھی نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ کے مصداق بنتے ہیں۔

وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ۔ فرماتا ہے کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری یہ تعلیم حق ہے یعنی ایک اٹل صداقت ہے جو دنیا میں نمایاں ہو کر رہیگی۔ عربی زبان میں سچائی کے اظہار کے لئے جتنے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ سب دوام پر دلالت کرتے ہیں یعنی ایسی بات پر جو نہ ٹلنے والی ہو اور پوری ہو کر رہنے والی ہو۔ پس هُوَ الْحَقُّ میں بتایا کہ یہ دائمی صداقت ہے جو کبھی نہیں ٹلے گی۔ اِسکا انکار تم کو کیا فائدہ دیگا۔ کیوں نہ تم اسے پہلے ہی مان لو۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشگوئیاں بائبل میں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب قرآن کریم کے ذریعہ پوری ہوئی ہیں اور اسی کے ذریعہ سچی ثابت ہوتی ہیں۔ اِن میں سے بعض پیشگوئیاں عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان پیشگوئیوں کی علامات بتا دیتی ہیں کہ اِن کا حضرت مسیحؑ پر چسپاں کرنا غلطی ہے۔ اِس بارہ میں سب سے پہلی پیشگوئی استثنا باب ۱۸ آیت ۱۸ تا ۱۹ کی ہے۔ یہ پیشگوئی اتنی واضح ہے کہ اِسے کسی صورت میں بھی کسی اور پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو طور کے دامن میں لے گئے تو بائبل میں لکھا ہے کہ آسمان پر متواتر بجلی چمکنی شروع ہوئی اور اُس سے زور زور کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ بنی اسرائیل خوفزدہ ہو گئے۔ اور حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے کہ تُو خود جا اور خدا سے کلام کر ہم اُس کا کلام سُننا نہیں چاہتے اور نہ ہماری اولادیں اُسے سُنیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ اِن کو کہدے کہ مَیں نے اِن کی بات سُن لی ہے۔ اَب مَیں اِن سے وہی معاملہ کرونگا جو وہ چاہتے ہیں۔ یعنی آئندہ میں اِن میں سے شرعی نبی برپا نہیں کرونگا۔ بلکہ اِن کے بھائیوں سے برپا کرونگا۔ یہ پیشگوئی حضرت مسیحؑ پر کسی صورت میں بھی چسپاں نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے اُن پر چسپاں کیا جائے تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند ہیں۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرعی نبی نہ تھے۔ اور حضرت موسیٰؑ شرعی نبی تھے۔ اِس کی دلیل حضرت مسیح علیہ السلام کا وہ قول ہے جو انجیل میں آتا ہے کہ

"یہ نہ سمجھو کہ مَیں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے

ہرگز نہ ٹلیگا۔ جب تک سب کچھ پورا نہ ہو
جائے۔" (متی باب ۵ آیت ۱۷-۱۸)

لیکن اگر بفرضِ محال حضرت مسیحؑ کو شرعی نبی بھی مان لیا جائے تب بھی وہ موسیٰؑ کی مانند نہیں ہو سکتے کیونکہ عیسائی نقطۂ نگاہ سے انہوں نے شریعت کو لعنت قرار دیدیا تھا اور خود بھی لعنتی ہو گئے تھے۔

پھر اس پیشگوئی میں لکھا ہے کہ وہ نبی تیرے بھائیوں میں سے ہوگا۔ مگر انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو داؤد کی نسل بتاتی ہے۔ اگر اس پیشگوئی کو حضرت مسیحؑ پر چسپاں کیا جائے تو لازماً اُن کا حضرت داؤد علیہ السلام کی نسل سے ہونا غلط قرار پاتا ہے۔ حالانکہ مسیحی لوگ نہیں کہہ سکتے کہ انجیل نے جو کچھ بتایا ہے وہ غلط ہے۔ اور تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے نہ کہ بنی اسمٰعیل میں سے۔ پس تیرے بھائیوں سے لازماً بنی اسرائیل مراد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اُن کے بھائی بنی اسمٰعیل ہی مراد ہیں۔

پھر اگر اس سے حضرت مسیح علیہ السلام مراد ہوتے تو وہ اپنے آپ کو اس کا مصداق بھی قرار دیتے اور دعویٰ کرتے کہ میں مثیلِ موسیٰ ہوں۔ مگر انجیل کو دیکھنے سے یہ بات کہیں نظر نہیں آتی کہ حضرت عیسیٰؑ نے کبھی مثیلِ موسیٰؑ ہونے کا دعویٰ کیا ہو۔ لیکن قرآن کریم میں یہ دعویٰ موجود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (مزمل آیت ۱۶) یعنی اے لوگو! ہم نے تمہاری طرف ایک ایسا رسول بھیجا ہے جو تم پر نگران ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ فرعون کی طرف ہم نے رسول بھیجا تھا۔ یہ مثیلِ موسیٰ ہونیکا دعویٰ ہے۔ اسی طرح سورۂ احقاف میں بھی مثیل کا لفظ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (احقاف آیت ۱۱) یعنی کہہ دے کہ اے لوگو (جو قرآن کریم پر غور کرنا بھی پسند نہیں کرتے) بتاؤ تو سہی اگر یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہو اور تم نے اس کا انکار جانتے بوجھتے کر دیا (تو اس کا نتیجہ کیا نکلیگا) اور پھر بنی اسرائیل میں سے ایک شخص (موسیٰؑ) اپنے ایک مثیل کی گواہی بھی دے چکا ہے۔ پس وہ تو اس پر ایمان لے آیا۔ مگر تم لوگوں نے تکبّر کیا۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ ظالموں کو کبھی کامیابی کا مُنہ نہیں دکھاتا۔ یہ اُسی پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے۔ جو حضرت موسیٰؑ نے کی تھی۔ اس جگہ اس پیشگوئی کو بطور دلیل کے پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں۔ اور موسیٰؑ تو پیشگوئی کرکے اس آنے والے نبی پر ایمان لے آیا۔ مگر تم نے انکار کر دیا اور تکبّر سے کام لیا۔ غرض اس آیت میں عَلٰى مِثْلِهٖ کی پیشگوئی کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کیا گیا ہے۔ مگر حضرت عیسیٰؑ نے کہیں اسے اپنے اوپر چسپاں نہیں کیا۔

اس سے بڑھ کر ایک اور بات یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے خود مثیلِ موسیٰ ہونے سے انکار کیا ہے اور اُن کا یہ انکار کتاب اعمال باب ۳ آیت ۱۹ تا ۲۶ میں درج ہے لکھا ہے:-

"پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے
گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند کے حضور سے
تازگی بخش ایام آویں۔ اور یسوع مسیح کو
پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں میں آگے
سے ہوئی۔ ضرور ہے کہ آسمان اُسے لئے رہے
اُس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے
اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا
اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے

باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے
تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک
نبی میری مانند اٹھا دیگا - جو کچھ وہ تمہیں
کہے اُس کی سب سُنو - اور ایسا ہو گا کہ
ہر نفس جو اس نبی کی نہ سُنے قوم سے
نیست کیا جائیگا - بلکہ سب نبیوں نے
سموایل سے لیکے پچھلوں تک جتنوں نے
کلام کیا ان دنوں کی خبر دی ہے - تم نبیوں
کی اولاد اور اس عہد کے ہو جو خدا نے
باپ دادوں سے باندھا ہے جب ابراہام
سے کہا کہ تیری اولاد سے دنیا کے سارے
گھرانے برکت پاویں گے - تمہارے پاس خدا
نے اپنے بیٹے یسوع کو اُٹھا کے پہلے بھیجا کہ
تم میں سے ہر ایک کو اُسکی بدیوں سے پھیر کے
برکت دے۔"

اِس حوالہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام دوبارہ اس وقت تک نہیں آسکتے جب تک کہ وہ تمام پیشگوئیاں پوری نہ ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھیں - اور آیت ۲۰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثیل موسیٰ مسیح کی پہلی بعثت کے بعد اور دوسری بعثت سے پہلے آئے گا گویا اسجگہ آن کی دو بعثتوں کا ذکر ہے - جن میں سے پہلی بعثت مثیلِ موسیٰ سے پہلے ہے اور دوسری بعثت مثیل موسیٰ کے بعد ہے - پس انجیل مثیلِ موسیٰؑ کی پیشگوئی حضرت مسیح علیہ السلام کی دو بعثتوں کے درمیان بتاتی ہے - حضرت مسیح علیہ السلام کا پہلا نزول مثیلِ موسیٰؑ سے پہلے ہوا - اور دوسرا نزول اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جبتک کہ وہ تمام پیشگوئیاں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے مثیل کے متعلق بیان فرمائی تھیں پوری نہ ہو جائیں

اِسی طرح استثناء باب ۳۳ آیت ۲ میں بھی ایک پیشگوئی بیان کی گئی ہے جو یہ ہے :-

" اور اُس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا
اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا - فاران ہی کے
پہاڑ سے جلوہ گر ہوا - دس ہزار
قدوسیوں کے ساتھ آیا - اور اُس کے
داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کیلئے
تھی - "

اِس میں آنے والے موعود کے متعلق کئی باتیں بیان کی گئی ہیں - اوّل یہ کہ فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوگا - اور فاران کا پہاڑ مکّہ کے علاقہ میں ہی ہے - دوسرے یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئیگا - اسجگہ دس ہزار قدوسیوں سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فتح مکّہ کے موقع پر دس ہزار صحابہؓ کا موجود ہونا ہے - اتنی بڑی تعداد کسی اور نبی کے ساتھ ایک جگہ کبھی جمع نہیں ہوئی - اور پھر صحابہؓ کے قدوسی ہونیکا ثبوت بھی قرآن کریم سے ملتا ہے - فرماتا ہے - رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (سورۂ توبہ آیت ۱۰۰) کہ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے - حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ صرف بارہ حواری تھے - مگر اُن میں سے بھی ایک نے تو تیس روپے لے کر حضرت مسیحؑ کو گرفتار کرا دیا - اور دوسرے نے آپ پر لعنت ڈالی اور باقی سب گرفتاری کے وقت آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے - مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ نے ایسے جاں نثار صحابہؓ بخشے جنہوں نے ہر مشکل گھڑی میں آپ کا ساتھ دیا اور اپنی جانیں قربان کرکے آپ کی حفاظت کی - تیسری علامت یہ بتائی گئی تھی کہ اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ہوگی - اگر مثیل موسیٰ سے مراد اسجگہ حضرت مسیح علیہ السلام سمجھے جائیں تو یہ پیشگوئی غلط ٹھہرتی ہے کیونکہ مسیحؑ کے پاس کوئی

نئی شریعت نہیں تھی۔ اسجگہ قرآنی شریعت کو آتشیں شریعت اس لئے کہا گیا ہے کہ آتش کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ اوّل جلانا دوسرے نور دینا۔ گرم پانی یا گرم لوہا دوسری چیز کو جلا تو سکتا ہے مگر وہ کسی کو نور نہیں دے سکتا۔ مگر آگ جلانے کے علاوہ نور بھی دیتی ہے پس آتشی شریعت کہہ کر بتایا گیا ہے کہ وہ ایسی شریعت ہوگی جو دو کام کرے گی۔ اس میں ایک طرف تو نار ہوگی اور دوسری طرف نور ہوگا۔ وہ ایک طرف تو تمام گندی اور بُری باتوں کو جلا کر راکھ کر دیگی اور دوسری طرف لوگ اُس سے نور حاصل کرینگے۔

غرض فاران سے دس ہزار قدوسیوں سمیت ایک الٰہی جلوہ کے ظہور کا وعدہ تھا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پورا ہوا۔ فتح مکّہ کے وقت آپ کے ساتھ دس ہزار قدوسی بھی تھے اور پھر موسیٰؑ کے بعد شریعت لانے کا دعویٰ بھی آپ کے سوا اور کسی نبی نے نہیں کیا۔

ان دو پیشگوئیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہوتی ہیں۔ دیکھو یسعیاہ باب ۸ آیت ۱۴ تا ۱۷ و باب ۹ آیت ۱۳ و ۱۷ و باب ۲۸ آیت ۹ تا ۱۳ و باب ۳۵ آیت ۲ تا ۸ و باب ۴۰ آیت ۹ تا ۱۲ و باب ۴۲، ۴۹ آیت ۵ تا ۸ و باب ۶۲ آیت ۲ تا ۴۔ نیز دیکھو دانیال باب ۲ و غزل الغزلات باب ۵ آیت ۱۰ تا ۱۶ و متی باب ۲۱ آیت ۴۲ تا ۴۴۔

غرض فرمایا کہ ایک طرف تو یہ تعلیم حق پر مشتمل ہے اور دوسری طرف اس کے ماننے سے گذشتہ الہامی کتابوں کی پیشگوئیوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اگر وہ اس کا انکار کرینگے تو ان کو اپنی کتابوں کی بھی بہت سی باتیں جھوٹی ماننی پڑیں گی۔

اسجگہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم کی صداقت منوانے کے لئے تین دلائل دیئے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ تعلیم خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ دوم دنیا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی وہ ضرور دنیا میں قائم ہو کر رہے گی۔ سوم یہ تعلیم تمہاری اپنی کتابوں کی پیشگوئیوں کو جو آنیوالے موعود اور قرآن کریم کے متعلق ہیں پورا کرتی ہے۔ اگر تم اس کا انکار کرتے ہو تو تمہیں اپنی کتابوں کا بھی انکار کرنا پڑیگا۔ اور تم ان پر قائم نہیں رہ سکوگے۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے قبل یہود آپ کے منتظر تھے۔ اور اپنے بچوں کے نام تک محمد رکھا کرتے تھے۔ اور اس لئے رکھتے تھے کہ شاید وہ نبی ہم میں ہی پیدا ہو جائے۔ لیکن جب وہ آگیا تو اُسکا انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ وہ بنی اسمٰعیل سے کس طرح آسکتا تھا۔ اُس نے تو ہماری طاقت کو بڑھانا تھا۔ عیسائی کہنے لگ گئے کہ اس سے مراد کلیسیا کی طاقت تھی۔ اسی طرح اور مختلف قسم کی تاویلیں کرنے لگ گئے۔ حالانکہ اگر وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیتے تو یقیناً ان کی طاقت بڑھ جاتی اور وہ تباہی سے بچ جاتے۔

فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ اگر ہم میں سے نبی آتا تو ہم اسے ضرور مان لیتے تو تم یہ بتاؤ کہ تم اُن انبیاء کو جو تمہاری قوم میں سے آئے تھے قتل کرنے کے کیوں درپے رہے؟ اگر تم میں ایسی ہی شرافت پائی جاتی ہے۔ اور تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو بتاؤ کہ تم اُن پر کیوں ایمان نہ لائے اور ان کا مقابلہ کیوں کرتے رہے۔ پس یہ غلط ہے کہ جو کلام اسرائیلی نبی پر نازل ہوا اُسے تم مان لیتے ہو۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ایمان کی خرابی کی وجہ سے انسان حق کا انکار کیا

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ

اور موسیٰ تمہارے پاس یقیناً کُھلے کُھلے نشانات لے کر آیا تھا۔ پھر (بھی) تم نے اُس کے

الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَاِذْ

(پہاڑ پر جانے کے) بعد ظلم کرتے ہوئے (خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر) بچھڑے کو (معبود) بنا لیا۔ ؁۱۰ اور (اُس وقت کو بھی

اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ

یاد کرو) جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا تھا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کیا تھا (یہ کہتے ہوئے کہ)

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا

جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اُسے مضبوطی سے پکڑو اور اُس (یعنی اللہ) کی اطاعت کرو۔ اس پر (تم میں سے جو لوگ اُس وقت

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ق وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

ہمارے مخاطب تھے) انہوں نے کہا تھا کہ (بہت اچھا) ہم نے سُن لیا اور (ہم یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ) ہم نے (اس حکم کے) نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

کرتا ہے۔ اور تم کبھی اسی وجہ سے اس کلام کا انکار کر رہے ہو۔ یہ محض تمہارے نفس کا ایک دھوکا ہے کہ اگر کوئی اسرائیلی نبی ہوتا تو تم اُسے ضرور مان لیتے۔ تمہارا عمل بتا رہا ہے کہ تم ہمیشہ انبیاء کا مقابلہ کرتے چلے آئے ہو۔ چنانچہ یہود کی اِس دیرینہ عادت کا حضرت مسیحؑ نے بھی ان الفاظ میں نوحہ کیا ہے کہ

"اے یروشلم اے یروشلم جو نبیوں کو مار ڈالتی اور انہیں جو تجھ پاس بھیجے گئے پتھراؤ کرتی ہے" (متی باب ۲۳ آیت ۳۷)

؁۱۰ **تفسیر:۔** فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس قول کا اجمالی جواب دیا تھا کہ اگر یہ نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو ہم اُسے مان لیتے۔ اور فرمایا تھا کہ اگر تم اپنے اِس قول میں سچے ہوتے تو اس سے قبل بھی تم میں انبیاء آتے رہے ہیں تم ان کا مقابلہ کیوں کرتے رہے پس تمہارا یہ کہنا کہ اگر یہ نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو ہم اِسے مان لیتے بالکل غلط ہے۔ اب اِسی بات کا اللہ تعالیٰ اسجگہ مزید تشریح کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ فرماتا ہے کہ تم حضرت موسیٰ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہو۔ اور تم نے اُس کے ساتھ بیّنات اور کُھلے کُھلے دلائل بھی دیکھے۔ مگر جب وہ طُور پر خدا سے برکات لینے گئے تو تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اُس کی پرستش شروع کر دی۔ اب تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ اگر یہ بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو ہم اسے مان لیتے۔ تم نے اس نبی کے ساتھ جس پر تمہیں بڑا ناز ہے جب ایسا سلوک کیا تو اب تم سے یہ کیسے اُمید کی جا سکتی ہے کہ اگر یہ بنی اسرائیل میں سے ہوتا

بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ

اور انکے کفر کے سبب سے اُن کے دلوں میں بچھڑا (یعنی اسکی محبت کا جذبہ) گھر کر گیا۔ تو (اُن سے) کہہ کہ اگر تم (جیساکہ تم دعویٰ کرتے ہو)

إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾

مومن ہو تو وہ کام جس کا تمہیں تمہارا ایمان حکم دیتا ہے بہت بُرا ہے۔ ۱۱۵

تو تم اسے ضرور مان لیتے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے بَیِّنٰت کا لفظ رکھا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بھی یہی لفظ استعمال فرمایا ہے۔ عیسائی لوگ بیّنات سے اُن کی ابنیت اور الوہیت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر اُن کا یہ استدلال درست ہو تو پھر انہیں حضرت موسیٰؑ کو بھی خدا کہنا چاہیئے۔ مگر اُنکے متعلق وہ ایسا نہیں کہتے۔ پس ان کا صرف بیّنٰت سے حضرت مسیحؑ کی ابنیّت یا الوہیّت کا استدلال کرنا غلط ہے۔

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۔ حقوق کا تلف کرنا دو قسم کا ہوتا ہے۔ اوّل خدا تعالیٰ کے حقوق کو تلف کرنا۔ دوم بندوں کے حقوق کو تلف کرنا۔ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق تلف کئے جانے کی طرف توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ تم مشرک ہو جو میرے حقوق کو تلف کرتے ہو۔ ظالم کا لفظ مشرک کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ ظُلم کے لغوی معنے وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهٖ کے ہیں۔ یعنی کسی چیز کو اُس کی مناسب جگہ سے ہٹا کر غیر مناسب جگہ رکھنا۔ چونکہ مشرک بھی اللہ تعالیٰ کی صفات دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا ہے اس لئے اُس پر ظالم کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔

۱۱۵ حل لغات :- اِسْمَعُوْا : سَمِعَ لَهٗ کے معنے ہیں اَطَاعَهٗ اُس کی اطاعت کی۔ پس اِسْمَعُوْا کے معنے ہیں اطاعت کرو۔ اصل میں یہ اِسْمَعُوْا لَنَا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے کہا ہے اُس طرح کرو۔ مگر صلہ کو محذوف کر دیا گیا ہے۔ اگر اس کے معنے سُننے کے کئے جائیں۔ تو پھر اس لفظ کا استعمال لغو ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُن سے پہلے ایک عہد لے لیا گیا تھا اور عہد لے لینے کے بعد اُس کے سُننے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ پس اس کے معنے اطاعت کرنے کے ہی کئے گئے ہیں۔

اِسْمَعُوْا

اُشْرِبُوْا

اُشْرِبُوْا ۔ اُشْرِبَ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ عربی زبان کا محاورہ ہے اُشْرِبَ فُلَانٌ حُبَّ فُلَانٍ (اقرب) کہ فلاں شخص کی محبت دوسرے کے دل میں رچ گئی ہے۔ یہ لفظ ہمیشہ مجہول استعمال ہوتا ہے اور اس سے پلانا نہیں بلکہ ملانا مراد ہوتا ہے۔ پس مطلب یہ ہے کہ بچھڑے کی محبت اُن کے ذرہ ذرہ میں رچ گئی۔ اصل میں اس سے مائع کا جامد چیزوں میں ملانا مراد ہوتا تھا۔ چنانچہ بحرِ محیطؔ میں لکھا ہے۔ وَالْاِشْرَابُ مُخَالَطَةُ الْمَائِعِ الْجَامِدَ وَتُوُسِّعَ فِيْهِ حَتّٰى صَارَ فِي اللَّوْنَيْنِ وَقَالُوْا اَشْرَبْتُ الْبَيَاضَ حُمْرَةً اَيْ خَلَطْتُهَا بِالْحُمْرَةِ ۔ یعنی اِشْرَابٌ کسی مائع چیز کو جامد کے ساتھ ملانے کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال اسقدر وسیع ہو گیا کہ یہ رنگوں کے آپس میں ملانے پر بھی بولا جانے لگا۔ چنانچہ اگر یہ کہنا ہو کہ میں نے سفیدی کو سُرخی میں ملا دیا۔ تو اُس وقت اِشْرَابٌ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی وسعت کے ماتحت یہ لفظ محبت کے دل میں گھر کر جانے پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :-

إِذَا مَا الْقَلْبُ أُشْرِبَ حُبَّ شَيْءٍ
فَلَا تَأْمُلْ لَهُ عَنْهُ انْصِرَافَا

یعنی جب کسی کے دل میں کسی کی محبت سرائت کر جاتی ہے تو اُس کے بعد یہ اُمید رکھنا کہ وہ محبت اُس سے جاتی رہے گی ناممکن ہے۔

تفسیر:— وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ۔ اس میں یہود کی عہد شکنی کی ایک اور مثال بیان کی ہے۔ فرماتا ہے تم اُس وقت کو بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰؑ کے زمانہ میں تم سے ایک عہد لیا۔ اور عہد بھی ایسی حالت میں لیا جبکہ تم طور کے دامن میں کھڑے تھے جو کہ ایک مقدس مقام تھا مگر پھر بھی تم نے بدعہدی سے کام لیا اور طور کی تقدیس اور اس کی حرمت کا بھی خیال نہ رکھا۔ درحقیقت کسی مقدس مقام میں کھڑے ہو کر جو عہد کیا جاتا ہے اُسے باقی عہدوں پر ایک نمایاں فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی بعض قسموں کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ نماز کے بعد لی جائیں۔ کیونکہ ایسے موقع پر لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ یہ عہد کیا تھا جو بنی اسرائیل سے لیا گیا؟ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے خود ہی کر دیا ہے کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اِسے مضبوطی سے پکڑو اور ہماری اطاعت کرو۔ مگر انہوں نے بجائے اطاعت کرنے کے کہا کہ ہم نے بات تو سُن لی ہے مگر ہم یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہم اس کی نافرمانی کرینگے۔ یہ ضروری نہیں کہ انہوں نے اپنی زبانوں سے ہی یہ الفاظ کہے ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی عملی نافرمانی کا ان الفاظ میں اظہار کیا گیا ہو۔ یعنی اُن کے اندر رُوحانی لحاظ سے ایسا بگاڑ تھا کہ وہ اِدھر بات سُنتے اور اُدھر اس کی نافرمانی شروع کر دیتے۔ عربی زبان میں قَالَ کا لفظ کبھی زبانی قول کی بجائے عملی حالت کے اظہار کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَقَالَ قَطْنِیْ یعنی حوض بھر گیا اور اُس نے بزبانِ حال کہا کہ اب مجھ میں اور گنجائش نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ انہوں نے عملاً اس کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں انہوں نے سَمِعْنَا بھی کہا ہو۔ اور عَصَيْنَا بھی کہا ہو۔ کیونکہ انسان کسی بات کا دو طرح جواب دیا کرتا ہے۔ ایک زبان سے اور دوسرے دل سے۔ پس اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی زبانیں سَمِعْنَا کہہ رہی تھیں اور ان کے دل عَصَيْنَا کہہ رہے تھے۔ زبانیں تو کہتی تھیں کہ بس حضور یہی صحیح ہے گویا وہ فرمانبرداری کا اقرار کر رہی تھیں مگر اُن کے دل نافرمانی کر رہے تھے۔ اور انکار پر مصر تھے اور کہتے تھے کہ یہ تعلیم قابلِ عمل نہیں ہو سکتی۔

وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ۔ اس واقعہ کا ذکر خروج باب ۳۲ آیت ۲ میں اِس طرح آتا ہے کہ

"اس نے اس بچھڑے کو جسے انہوں نے
بنایا تھا لیا۔ اور اُس کو آگ سے جلایا اور
اُس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا۔"

مگر قرآن کریم اِسے رد کرتا ہے۔ کیونکہ سونا نہ جل سکتا ہے اور نہ پانی میں حل ہو سکتا ہے۔ اس جگہ عجل سے مراد حُبُّ الْعِجْلِ ہے۔ یعنی اُن کے دلوں میں اُس کی محبت گھر کر گئی تھی۔

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ۔ فرماتا ہے اگر تم واقعہ میں ایمان لانے والے ہوتے۔ تو کیا تمہارے ایمان تمہیں اس بات کی اجازت دے سکتے تھے کہ جب موسیٰؑ چند دنوں کے لئے باہر جاتے تو تم بُت پرستی شروع کر دیتے۔ پھر تو اس ایمان سے کفر ہی بہتر ہے۔ یہ ویسا ہی مضمون ہے جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ؎

بعد از خدا بعشق محمدؐ مخمّرم
گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ

تو (ان سے) کہہ کہ اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر (باقی) لوگوں کو چھوڑ کر صرف

خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

تمہارے ہی لئے ہے تو اگر تم (اس دعوٰی میں) سچے ہو تو موت

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۵﴾

کی خواہش کرو۔ ۱۲۵

یعنی مجھ میں حسنہ چیزوں کا عشق پایا جاتا ہے ایک اللہ کا اور دوسرے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اگر تم اس وجہ سے مجھے کافر ٹھہراتے ہو تو میں بھی تمہارے ساتھ مل کر اس امر کی تصدیق کرتا ہوں کہ میں بڑا سخت کافر ہوں۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی اسلوب اختیار فرمایا ہے کہ اگر تمہیں ایمان کا دعوٰی ہے تو پھر تو تمہارا وہ ایمان تمہیں بہت بُرا حکم دیتا ہے کیونکہ تم ابتداء سے ہی اللہ تعالیٰ کے نبیوں کا انکار کرتے آئے ہو اور نبیوں کی مخالفت خواہ زبان سے ہو خواہ اعمال سے کبھی نیک نتائج پیدا نہیں کرتی۔ پھر اس کے ہوتے ہوئے تم اپنے آپ کو ایماندار اور مومن کیسے کہتے ہو۔ اگر اس کا نام تم ایمان کی بجائے انکار رکھو تو بہتر ہے۔ کیونکہ ایمان اور نبیوں کی مخالفت دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

۱۲۵ تفسیر:۔ جو قوم اپنے اندر نبوت کو محدود کرتی ہے وہ لازماً نجات کو بھی محدود قرار دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ چونکہ یہود کے اندر یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ انبیاء صرف بنی اسرائیل میں ہی آسکتے ہیں۔ اس لئے لازماً اُن کے اندر یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ اگلے جہان کے انعامات کے بھی وہی حقدار ہیں۔ اور نجات صرف اُنہی کا حق ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی قوم نجات حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ بظاہر ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے۔ مگر افسوس ہے کہ قرآن مجید سے قبل اس حقیقت کو اور کسی نے نہیں سمجھا۔ حالانکہ یہ ایسی غیر معقول بات ہے جسے کوئی عقل سلیم رکھنے والا انسان ایک منٹ کے لئے بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ خیال صرف یہود ہی کا نہ تھا بلکہ اس وقت بعض اور اقوام میں بھی یہ بات پائی جاتی تھی۔ چنانچہ ہندو قوم کو دیکھ لو۔ وہ بھی نجات صرف اپنے اندر محدود قرار دیتی ہے۔ کسی اور کو نجات یافتہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ عیسائیوں نے بے شک آجکل اپنے مذہب کی تبلیغ عام کر دی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جو بھی مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئے وہ نجات پا سکتا ہے مگر بعثت مسیحؑ سے پہلے وہ بھی نجات کو محدود قرار دیتے رہے ہیں اور اب بھی وہ اگر ساری دنیا کو تبلیغ کر رہے ہیں تو حضرت مسیحؑ کی تعلیم کے مطابق نہیں کر رہے۔ بلکہ اس کی تعلیم کو پس پُشت ڈال کر کر رہے ہیں ورنہ مسیحؑ نے تو خود کہا تھا کہ

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا۔"

(متی باب ۱۵ آیت ۲۴)

اسی طرح انہوں نے ایک طالب ہدایت عورت کو جو کہ اسرائیلی نہ تھی بلکہ کنعان کی رہنے والی تھی۔ صاف طور پر کہا کہ

"مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر
کتوں کے آگے پھینک دیویں"

(متی باب ۱۵ آیت ۲۶)

پھر حواریوں کا بھی یہی طرزِ عمل رہا۔ کہ وہ غیر اقوام میں انجیل کی منادی کرنا ناجائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ اعمال میں لکھا ہے کہ

"وے جو اس جور و جفا سے جو کچھ ستفن
کے سبب برپا ہوئی تتر بتر ہو گئے تھے
پھرتے پھرتے فنیکے دکپرس اور انطاکیہ
میں پہنچے مگر یہودیوں کے سوا کسی کو کلام
سُناتے تھے"

(اعمال باب ۱۱ آیت ۱۹)

اسی طرح جب حواریوں نے سُنا کہ پطرس نے ایک جگہ غیر قوموں میں انجیل کی منادی کی ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے۔ اور جب پطرس یروشلم میں آیا تو مختون اُس سے یہ کہکر بحث کرنے لگے کہ تو نامختونوں کے پاس گیا اور اُن کے ساتھ کھانا کھایا۔ (اعمال $\frac{11}{3,2}$)

غرض مسیحیت کی عام تبلیغ اناجیل کے نقطۂ نگاہ سے بالکل ناجائز ہے۔ اور جب مسیحیت کا دائرہ بھی ایک خاص طبقہ تک محدود ہے تو لازماً اُن کے نزدیک بھی نجات اُنہی لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو حضرت مسیح پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن اسلام بتاتا ہے کہ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے کہ نجات کسی خاص قوم میں محدود ہے۔ وہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ فرما کر نجات دُنیا کے ہر فرد کا حق قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کی پیدائش ہی اسی لئے ہوئی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کا عبد بنے اور اُس کی صفات کا انعکاس اپنے آئینۂ قلب میں پیدا کرے۔

زیرِ تفسیر آیت میں اللہ تعالےٰ نے یہود کے دو دعوے بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ جنت اُن کا حق ہے اور دوسرا یہ کہ جنت میں اُن کے سوا اور کوئی نہیں جائیگا۔ اللہ تعالیٰ اسجگہ یہود کے اس عقیدہ کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ کے حضور دار آخرت صرف تمہارے لئے مخصوص ہے اور تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت صرف تمہارے گھرانے کیلئے ہی مخصوص کر دی ہے۔ اور دوسرے لوگ اس سے محروم ہیں تو پھر آؤ اس جھگڑے کے تصفیہ کے لئے موت کی تمنا کرو۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ تم مباہلہ کر لو۔ یعنی مسلمانوں کا دُعا سے مقابلہ کر کے دیکھ لو اور کہو کہ الٰہی ہم میں سے جو جھوٹا ہے تو اُسے تباہ و برباد کر دے۔ اگر خدا تعالےٰ کے نزدیک تم سچے ہوئے تو خدا تعالےٰ تمہیں بچا لیگا۔ اور مسلمانوں کو تباہ کر دے گا۔ اور اگر مسلمان سچے ہوئے۔ تو اللہ تعالےٰ تمہیں تباہ کر دیگا۔ اور مسلمانوں کو بچا لیگا۔ اور اس طرح دنیا کو پتہ لگ جائیگا کہ خدا تعالیٰ کس سے ناراض ہے اور کس سے خوش۔ اس جگہ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالےٰ نے یہاں صرف موت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مَوْتَكُمْ نہیں فرمایا کیونکہ مباہلہ میں یہ شرط ہوتی ہے کہ دونوں فریق یہ دُعا کریں کہ جھوٹے پر عذاب نازل ہو۔ اس میں کسی فریق کی تعیین نہیں کی جاتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت مباہلہ میں بھی یہ الفاظ رکھے ہیں کہ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (آل عمران آیت ۶۲) یعنی ہم جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔ پس فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے یہ معنے ہیں کہ اگر یہود حق پر ہیں اور اگلے جہان میں خدا تعالےٰ کے انعامات کے وہی وارث ہیں تو اس بات کو ثابت کرنے کے لئے وہ مسلمانوں کے

مقابلہ میں یہ دُعا کریں کہ الٰہی ہم میں سے جو فریق جھوٹا ہے اور
جس سے تو ناراض ہے اُسے ہلاک اور برباد کر دے۔ اگر
خدا تعالیٰ کے نزدیک واقع میں یہود پسندیدہ ہیں۔ اور
مسلمان قابلِ سرزنش ہیں تو مسلمان ہلاک ہو جائیں گے اور
یہود کو سرفرازی حاصل ہو جائے گی۔ اور اس طرح دنیا
کو یہ فیصلہ کرنیکا موقع مل جائیگا کہ آخرت کے متعلق کس
قوم کا دعویٰ سچا ہے۔ کیونکہ آخرت کے متعلق مختلف
مذاہب کے دعووں کی صداقت پرکھنے کا سوائے اِس کے
اَور کوئی ذریعہ نہیں کہ اِس دنیا میں ہی آسمانی تائیدات سچے
مذہب کے ادعا کو ثابت کر دیں۔ اور دُنیا پر ظاہر ہو جائے
کہ خدا کس کے ساتھ ہے۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ
اگر تمہارا یہ دعویٰ درست ہے کہ تم ہی نجات یافتہ ہو تو
اس دعویٰ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمہارے متعلق یہ
سمجھا جائے کہ تمہارا ہر فرد پاکیزگی کے اعلیٰ مقام پر قائم
ہے۔ اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کے انوار اور اُسکی برکات
کا تجلّی گاہ ہے۔ ایسی صورت میں تم خدا تعالیٰ کی رضا میں
اپنے آپ کو فنا کیوں نہیں کرتے اور اپنی سفلی زندگی پر
ایک موت وارد کیوں نہیں کرتے۔ جو قوم ایسی جنّت
کی مستحق ہو اُسے اس دُنیا سے محبت کیوں ہو۔ اُسے
تو رضاءِ الٰہی کے کاموں میں اپنے آپ کو فنا کر دینا چاہیئے
کیونکہ خدا تعالیٰ نے بہترین جہاں اس کے لئے مخصوص کر
دیا ہے۔ پس فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے دوسرے معنے یہ
ہیں کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو خدا تعالیٰ کی محبت
میں اپنے آپ کو فنا کر دو۔ اور اس راہ میں جس قدر
بھی تکالیف تمہیں برداشت کرنی پڑیں اُن کو برداشت
کرو۔ اور ہر قسم کی جانی اور مالی قربانیوں میں حصّہ لیکر
ثابت کر دو کہ تم نے ایک بے جان چیز کی طرح اپنے
آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر رکھا ہے۔ اگر تم ایسا کرو
تو یہ سمجھ لیا جائیگا کہ تمہارا یہ دعویٰ درست ہے کہ تمہارے
سوا اور کسی کے لئے اُخروی انعامات مقدر نہیں۔ مگر
فرمایا۔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ۔ یہ اس موت کو کبھی بھی اپنے اوپر وارد
نہیں کر سکتے کیونکہ وہ عیاشیوں میں اپنی زندگی بسر کرتے
ہیں اور خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت سے غافل ہیں۔ ان
میں اخلاص اور قربانی کی کوئی رُوح موجود نہیں۔ اور
جنّت کا اُن کے لئے مخصوص ہونا تو الگ رہا۔ اُن کو
جنّت کے ملنے کا بھی یقین نہیں۔ بلکہ اُس کے وجود پر
بھی انہیں یقین نہیں۔ کیونکہ دنیا کی محبت اُن کی رگ
رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے اور یہ محبت اُن کے
بعث بعد الموت پر عدم ایمان کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو
آیا ہے کہ یہود کہتے ہیں لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا
مَّعْدُوْدَةً یعنی ہمیں دوزخ میں صرف چند دن کے
لئے ڈالا جائیگا۔ اور یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جنّت
صرف تمہارا ہی حق ہے۔ ان دونوں باتوں میں تو بہت
بڑا اختلاف ہے۔ پھر بیک وقت دونوں باتیں اُنکی
طرف کس طرح منسوب ہو سکتی ہیں؟ سو یاد رکھنا چاہیئے
کہ یہود کے دو گروہ ہیں اور ان دونوں کے الگ الگ
عقیدے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہم کچھ دن
دوزخ میں رہ کر نکل آئیں گے اور دوسرا کہتا تھا کہ ہم
دوزخ میں بالکل نہیں جائیں گے۔ پہلے اس گروہ کا ذکر
آچکا ہے جو صرف گنتی کے چند دنوں کے لئے دوزخ میں
ڈالے جانے کا قائل تھا۔ اب اللہ تعالیٰ اس گروہ کا ذکر
کرتا ہے جس کا یہ عقیدہ تھا کہ نجات صرف بنی اسرائیل
سے مخصوص ہے اور نبوت بھی کسی اور قوم میں نہیں
جا سکتی۔ اس گروہ کے متعلق یہود کی کتاب ایمرون طالمود
میں لکھا ہے کہ گنہگار یہودی دوزخ کے [illegible]

لے جائے جائیں گے۔ تو وہاں تو یہ کریں گے۔ اور وہاں
سے بغیر سزا دیئے کے واپس کر دیئے جائیں گے اور پھر
اُن کو جنت میں لے جایا جائے گا (جیوش انسائیکلوپیڈیا
زیر لفظ (GEHENNA) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہود
کا وہ گروہ جو کہتا ہے کہ ہمیں سزا نہیں ملے گی۔ اور
جس کا یہ دعویٰ ہے کہ دوسروں کے لئے ہرگز نجات
نہیں۔ وہ اگر اپنے اِس عقیدہ میں سچے ہیں تو مسلمانوں
سے مباہلہ کر لیں۔ یا اپنے عمل سے خدا تعالیٰ کے لئے
اپنے اوپر موت وارد کر کے اپنی پاکیزگیٔ نفس اور بلندیٔ
کردار کا ثبوت پیش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام
سے قبل تقریباً تمام مذاہب میں یہ تعلیم پائی جاتی تھی
کہ نجات صرف اُنہی کا حق ہے۔ بلکہ ہندوؤں کا تو یہ
عقیدہ تھا کہ جو شودر وید سُن لے اُس کے کانوں میں
سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ہیں تو
اللہ تعالیٰ کے بندے۔ مگر ان کو کلام الٰہی سُننے کا کوئی
حق نہیں۔ بدھ قوم میں دوسروں کی نسبت قومی
احساس کم تھا اور ان کی تبلیغ عام تھی لیکن تبلیغ
عام ہونے کے باوجود وہ نبوت کو عام نہیں سمجھتے تھے
بلکہ اُسے محدود قرار دیتے تھے اِس لئے اُن کے نظریہ میں
بھی وہ وسعت نہیں تھی جو اسلام نے پیش کی ہے۔
یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کا بھی تو یہی
عقیدہ ہے جو یہود کا تھا کہ نبوت صرف ہم میں ہی
رہے گی اور ہم ہی نجات کے مستحق ہیں۔ پھر مسلمانوں
کو دوسروں پر کیا فضیلت حاصل ہوئی اس کا جواب
یہ ہے کہ مسلمان نہ تو ہر نام نہاد مسلمان کے لئے
جنّت ضروری قرار دیتے ہیں اور نہ کسی خاص قوم کے
آدمیوں کے سوا دوسروں کے لئے نجات کا دروازہ
بند قرار دیتے ہیں بلکہ وہ سب دنیا کے لئے اُس کا
دروازہ کھلا تسلیم کرتے ہیں۔ پس اسلام پر یہ اعتراض
نہیں ہو سکتا کہ اُس نے نجات اپنے پیروؤں
کے لئے مخصوص کر لی ہے۔ اسلام تمام قوموں کی ہدایت
کے لئے نازل ہوا ہے اور دنیا کا ہر فرد اس کے پیغام
کا مخاطب ہے۔ اگر بنی اسرائیل بھی اس نبی کو مان لیتے
تو وہ اپنے اوپر نجات کا دروازہ کھول سکتے تھے۔
اِس طرح دوسری اقوام بھی اس نبی کو مان کر نجات پا
سکتی ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک بات
بطور استحقاق ہوتی ہے اور ایک بطور تلطّف اور
رحم کے ہوتی ہے۔ جو شخص سچی تعلیم کو ماننے والا ہو۔
اسکا ایک حق ہوتا ہے اور گو وہ حق اس کا ذاتی طور پر
نہیں ہوتا مگر بہرحال خدا تعالیٰ نے اس کا ایک حق
قائم کیا ہوتا ہے۔ اِس نقطۂ نگاہ سے جو شخص شریعتِ
حقّہ اسلامیہ پر ایمان رکھے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا
وعدہ ہے کہ وہ اُسے نجات دیگا۔ یہ امر اس کے لئے
استحقاق کے طور پر ہے اور اِسی وجہ سے سچے مذہب
کے تمام پیرو نجات حاصل کرنے کے مستحق ہوتے ہیں
لیکن دوسرے لوگ بطور تلطّف اور رحم کے نجات
حاصل کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع
ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ
كُلَّ شَيْءٍ (اعراف آیت ۱۵۷) کہ میری رحمت ہر چیز
پر حاوی ہے۔ اِس رحمتِ عام میں یہودی عیسائی اور
ہندو وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت
کے ماتحت ہر شخص جنّت میں جا سکتا اور اللہ تعالیٰ کی
رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام پر اعتراض تب ہوتا
جب اسلام میں دوسرے لوگ شامل نہ ہو سکتے۔ مگر
جب اسلام نے ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگوں کے
لئے اپنے دروازے کھول رکھے ہیں اور اُن کو دعوت
دے دی ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔
اعتراض اُن مذاہب پر پڑتا ہے جنہوں نے نجات کا

دروازہ دوسروں کے لئے بند کر دیا ہے اور انہیں اپنے اندر شامل کرنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ بہرحال اسلام کے سوا باقی تمام مذاہب نے نجات کو اپنے لئے مخصوص کیا ہوا ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اسے اپنے ساتھ مخصوص نہیں کرتا۔ کیونکہ تلطف کی نجات صرف مسلمانوں کیلئے مخصوص نہیں بلکہ اس میں غیر مسلم بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہودی تعلیم کی رُو سے کوئی غیر یہودی نجات حاصل نہیں کر سکتا اور عیسائیوں کے نزدیک کوئی غیر عیسائی نجات نہیں پا سکتا لیکن اسلام یہ نہیں کہتا کہ جنت صرف مسلمان کہلانے پر ملتی ہے۔ بلکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمان کہلا کر بُرے کام کرتا ہے تو وہ بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان نہ ہو اور وہ جنت میں چلا جائے۔ کیونکہ جنت صرف مُنہ کے اقرار کا نتیجہ نہیں بلکہ جنت بہت سی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے نتیجہ میں ملتی ہے۔ اسی طرح دوزخ صرف مُنہ کے انکار کا نتیجہ نہیں بلکہ دوزخ کا شکار بننے کے لئے بہت سی باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ کوئی انسان دوزخ میں نہیں جا سکتا جب تک اس پر اتمام حجت نہ ہو خواہ وہ بڑی سے بڑی صداقت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچپن میں مر جانے والے یا اتنے بوڑھے جن کی سمجھ ماری گئی ہو۔ یا پاگل جو عقل سے عاری ہوں یا بہرے جو کسی بات کو نہیں سُن سکتے۔ اُن سے کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا بلکہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن ان لوگوں کی طرف دوبارہ نبی مبعوث فرمائیگا اور ان کو سچ اور جھوٹ پہچاننے کا موقعہ دیا جائیگا تب جس پر حجت تمام ہوگی وہ دوزخ میں ڈالا جائیگا اور جو ہدایت قبول کریگا وہ جنت میں جائیگا (رُوح المعانی جلد ۴ زیرآیت وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا) پس یہ غلط ہے کہ ہر وہ شخص جو اسلام میں داخل نہیں ہوتا دوزخی ہے۔

نجات کے متعلق اسلامی نظریہ یہ ہے کہ وہ شخص جو صداقت کے سمجھنے سے گریز کرتا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ ہدایت کی بات اسکے کان میں نہ پڑے تاکہ اُسے ماننی نہ پڑے یا جس پر حجت تمام ہو جائے مگر پھر بھی ایمان نہ لائے۔ وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قابلِ مؤاخذہ ہے۔

بانیٔ سلسلہ احمدیہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"اگر درحقیقت خدا تعالیٰ کے علم میں ایسا ہوگا کہ اس پر اتمام حجت نہیں ہوا تو اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہاں جو اسلام سے محض بے خبر ہے اور بے خبری میں مر جائے جیسے نابالغ بچے اور مجانین یا کسی ایسے ملک کے رہنے والے جہاں اسلام نہیں پہنچا تو وہ معذور ہیں۔"

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۸۱)

اسی طرح آپ ایک اور جگہ فرماتے ہیں:-

"اگر یہ کہو کہ جن تک کتاب الہامی نہیں پہنچی اُن کی نجات کا کیا حال ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ اگر ایسے لوگ وحشی اور عقلِ انسانی سے بے بہرہ ہیں تو وہ ہر یک باز پرس سے بَری اور مرفوع القلم ہیں۔ اور مجانین اور مسلوب الحواسوں کا حکم رکھتے ہیں لیکن جن میں کسی قدر عقل اور ہوش ہے اُن سے بقدر عقل ان کی محاسبہ ہوگا۔"

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۱۸۵ حاشیہ ۱۱)

اگر کوئی شخص سوال کرے کہ اگر اسلام قبول کئے بغیر بھی انسان کو نجات مل سکتی ہے تو پھر مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران آیت ۸۶) کا کیا مطلب ہے؟ تو اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ نجات جو استحقاق

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ

اور (اے مسلمانو! یاد رکھو کہ) جو کچھ ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں اس کے سبب سے وہ کبھی بھی اس (قسم) کی موت

وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۶﴾

کی تمنا نہیں کریں گے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۱۳ھ

کے طور پر ملتی ہے۔ وہ مسلمانوں کے سوا اور کسی کو نہیں مل سکتی۔ مگر جیسا کہ بتایا جاچکا ہے یہ حق بھی وہ ہے جو خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہوا ہے۔ ورنہ بندہ کا اللہ تعالیٰ پر کوئی ذاتی حق نہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے خود بندے کا اپنے اوپر ایک حق قائم کرلیا ہے اور خدا تعالیٰ کے مقرر کرنے کی وجہ سے بطور استحقاق نجات صرف مسلمانوں سے مخصوص ہے۔ ان میں سے جو شخص بھی قرآن کریم پر عمل کریگا نجات حاصل کرلیگا لیکن دوسرے لوگ بطور رحم کے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی بچہ بہرہ یا پاگل اور معذور ہو تو اُسے دوبارہ موقعہ دیا جائیگا۔ اور یا پھر اس کے فطرتی ایمان کے مطابق فیصلہ کردیا جائیگا اور یہ دیکھا جائیگا کہ آیا اس نے اس ایمان کے مطابق عمل کیا تھا یا نہیں ورنہ اگر خدا تعالیٰ کسی کو بخشنا چاہے تو ہم اُس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ وہ مالک ہے جسے چاہے نجات دے۔ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص غیر اسلام کا اعتقاد کرتا ہے وہ عام قانون کے مطابق نجات نہیں پا سکتا۔ کیونکہ وہ خود اپنے لئے نجات کا دروازہ بند کرتا ہے اور استحقاق سے اپنے آپ کو محروم کرتا ہے۔ لیکن نجات کے اور بھی ذرائع ہیں۔ اگر ان کے تحت کوئی شخص آجائے تو یقیناً نجات پا جائیگا۔

۱۳ھ تفسیر: — تَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے دو معنوں کی رُو سے اس کے بھی دو معنے ہونگے۔ اگر موت سے مباہلہ مراد لیا جائے تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ وہ ہرگز مباہلہ نہیں کرینگے۔ اور ان کا یہ گریز اس امر کا ثبوت ہوگا کہ اُن کے دل جانتے ہیں کہ انہوں نے خدا کی مرضی کے مطابق کام نہیں کیا۔ ورنہ وجہ کیا ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے ہیں۔ اُن کا پیچھے ہٹنا بتاتا ہے کہ انہیں اپنی بدیاں معلوم ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مباہلہ کیا تو انہیں اپنے گناہوں کی سزا مل جائیگی۔

دوسرے معنے تَمَنَّوُا الْمَوْتَ کے یہ تھے کہ تم خدا کی رضاء کے لئے اپنے آپ کو فنا کرو اور اپنے اوپر وہ موت وارد کرو جو ابدی زندگی کا پہلا قدم ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ کبھی بھی اس موت کو جس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے حیات ابدی عطا کرتا ہے قبول نہیں کریں گے کیونکہ گناہوں کی وجہ سے اُن کی روحانیت مسخ ہوچکی ہے اور اب وہ ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اُن کے دلوں میں یہ خیال بھی نہیں آسکتا کہ وہ خدا کے لئے اپنے آپ پر موت وارد کریں۔ گویا اُن کی گردنوں میں جو گناہوں کے طوق و اغلال پڑے ہوئے ہیں اُن کی وجہ سے انہیں یہ توفیق ہی نہیں ملے گی کہ وہ یہ نمونہ دکھا سکیں۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ میں بتایا کہ جھوٹے [illegible] علامت ہے کہ وہ [illegible] بہانوں سے مباہلہ کو ٹلاتا

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ

اور تو یقیناً انہیں (بھی) اور بعض اُن لوگوں کو (بھی)، جو مشرک ہیں سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا

الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ

حریص پائیگا اُن میں سے (ہر) ایک (یہی) چاہتا ہے کہ اُسے ہزار سال کی عمر

سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ

مل جائے حالانکہ یہ (امر) یعنی اس کا (لمبی) عمر پانا اس کو عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُسے دیکھ رہا ہے ۱۴۵

ع ۱۱

چلا جاتا ہے کبھی مقابلہ پر نہیں آتا۔ مگر کیا وہ اس طرح بچ جائیں گے؟ آخر ایک دن پکڑے جائیں گے۔ اور ان کا انجام لوگوں پر ظاہر کردیگا کہ کون ظالم تھا اور کون راستباز چنانچہ یہود پر جو تباہیاں آئیں۔ اُس نے اُن کے انجام کو ظاہر کردیا۔

۱۴۵ حل لغات:۔ یَوَدُّ کے معنے پسند کرنے کے ہیں مگر جب لَوْ اس کے بعد آئے تو اس کے معنے تمنا کرنے کے ہوتے ہیں۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہ لوگ سب سے زیادہ اس بات کے حریص ہیں کہ زندہ رہیں۔ حتّٰی کہ مشرکوں سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ گویا اَحْرَص ہونا یہود کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے۔ یوں مشرک بھی بڑے حریص ہوتے ہیں کیونکہ وہ قیامت کے منکر ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ جس قدر ہو سکے دنیا میں زندہ رہیں۔ مگر فرماتا ہے۔ یہ لوگ ان سے بھی زیادہ حریص ہیں۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ ان لوگوں میں سے بھی جنہوں نے شرک کیا ہے بعض کو تو دنیا کی زندگی کا زیادہ حریص پائیگا۔

گویا ان کو حرص پر زیادہ زور دینے کے لئے مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا کو النَّاس سے علیحدہ کرلیا۔ جیسے کہتے ہیں جَآءَ قَوْمٌ وَ زَيْدٌ وَ عَمْرٌو۔ قوم کے لوگ آئے اور زید اور عمرو بھی آگئے۔ حالانکہ زید اور عمرو بھی قوم میں شامل ہیں مگر ان کو نمایاں کرنے کیلئے الگ نام لے لیا گیا۔

یَوَدُّ

مشرک دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو قیامت کے منکر ہوتے ہیں اور اس جہان میں آرام سے رہتے ہیں۔ وہ طبعاً دنیوی زندگی کے بہت زیادہ حریص ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے مشرک وہ ہوتے ہیں جو قیامت کے تو منکر ہوتے ہیں مگر اس جہان میں انہیں آرام نہیں ہوتا۔ اس قسم کے مشرک زندگی کے ختم ہونے کے متمنی ہوتے ہیں تاکہ انہیں ان تکالیف سے نجات مل جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کا ختم ہو جانا ہی سکھ کا موجب ہے۔ اس لئے فرمایا کہ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا۔ ان مشرکوں میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو ہزار سالہ زندگی چاہتی ہے ورنہ سارے مشرک ایسے نہیں۔

اس آیت سے نصِ صریح کے طور پر تو نہیں مگر ایک

استنباط کے رنگ میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآنی نظریہ کے مطابق انسان کی ہزار سالہ زندگی ایک بعید از قیاس امر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب کتاب "چشمۂ معرفت" لکھ رہے تھے تو آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ بعض دفعہ اُس کے مضامین دوسروں کو بھی سُنا دیا کرتے تھے ایک دفعہ آپ نے حضرت نوحؑ کی ۹۵۰ سالہ عمر پر اول کے اعتراض کے بارہ میں فرمایا کہ ہم نے اس کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ نبی کی عمر سے مراد اُس کی اپنی عمر نہیں ہوتی بلکہ اُس کی جماعت کی عمر ہوتی ہے۔ آپ یہ سُنا ہی رہے تھے کہ حضرت نانا جان میر ناصر نواب صاحب تشریف لے آئے۔ وہ کہنے لگے بات تو ٹھیک ہے مگر لوگ نیچریت کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ہوتے ہیں تو ہوں پھر کیا ہوا۔ ہمیں تو جہاں بھی اسلام کی صداقت نظر آئیگی ہم اُسے پیش کرینگے خواہ کوئی اُس سے نیچریت کی طرف ہی کیوں نہ مائل ہو جائے۔ بہرحال قرآن مجید میں جہاں کسی نبی کی زیادہ عمر کا ذکر آتا ہے۔ وہاں ایک فرد کی عمر مُراد نہیں بلکہ اُس کی اُمت کی عمر مراد ہے۔

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ میں هُوَ کی ضمیر اَحَدُهُمْ کی طرف جاتی ہے اور ترجمہ کے لحاظ سے یہ عبارت یوں بنتی ہے کہ مَا اَحَدُهُمْ بِمُزَحْزِحِهٖ تَعْمِيْرُهٗ مِنَ الْعَذَابِ کہ اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جسے زیادہ عمر کا دیا جانا عذاب سے بچا سکے۔

فرماتا ہے لمبی عمر کی خواہش کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کیونکہ آرام کی لمبی گھڑیاں دُکھ کی ایک چھوٹی سی گھڑی کے مقابلہ میں بھی ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اور راحت کی گھڑیوں پر غالب آجاتی ہے۔ پس لمبی عمر انہیں عذاب سے بچا کر کہاں لے جائیگی۔ اور ان کو اس سے کیا فائدہ ہوگا یہ تو حماقت کی بات ہے۔ مگر وہ اس میں اسی طرح مبتلا ہیں جس طرح وہ اپنی اس پہلی حماقت میں مبتلا تھے کہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور کو انعام نبوت حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب بھی یہ احمق لوگ یہ خواہش تو نہیں کرتے کہ عذاب کو اُن سے ٹلا دیا جائے۔ بلکہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ عذاب کچھ دیر پیچھے ہو جائے۔ حالانکہ اس سے انہیں کیا فائدہ؟ اصل علاج تو یہ تھا کہ وہ اسلام کو قبول کر لیتے جس نے اُن کے لئے نجات کا دروازہ کھولا ہوا ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ اسلام قبول کر کے اس عذاب کو ٹلا دیں یہ اس کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ وہ پیچھے ہو جائے۔ حالانکہ کوشش یہ ہونی چاہیئے تھی کہ وہ اس سے بچ جائیں اور خدا تعالیٰ کی رحمت کو کھینچ لیں۔

اس رکوع کی آیت ۸۸ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو بتایا تھا کہ دیکھو تم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیکر حضرت مسیح علیہ السلام تک تمام انبیاء کی مخالفت کرتے آئے ہو اور گو اُن کی مخالفت تمہارے آباء نے کی مگر تم بھی اُس میں اس لئے شریک ہو کہ تمہاری اور اُن کی مخالفت کی وجہ ایک ہی ہے۔ یعنی اپنے منشاء کے خلاف نبیٔ وقت کی تعلیم کا ہونا۔ پس اگر ان کے وقت میں تم ہوتے تو اُس وقت بھی تم وہی کچھ کرتے جو اب کر رہے ہو۔

آیت ۸۹ میں یہود کا ایک قول نقل فرمایا کہ نبیوں کے جواب میں ایسے اقوال سے تم اُن کی ہنسی اُڑایا کرتے۔ یا اپنے تکبّر کا اظہار کیا کرتے تھے۔

آیت ۹۰ میں بتایا کہ غضب الٰہی اور تمہاری آبائی عادت کا یہ نتیجہ ہے کہ جب وہ موعود رسول آیا جس کا تم انتظار کر رہے تھے تو تم انکار کر بیٹھے۔ آیت ۹۱ میں اس کے انکار کی وجہ بتائی جو صرف یہ ہے کہ غیر قوم سے کیوں رسول آیا؟ آیت ۹۲ میں ان کے تمردانہ انکار کا نقشہ کھینچا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ پیش کیا جاتا ہے تو بغیر سوچے سمجھے اور دلائل پر غور کرنے کے کہہ

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى

تو (اُن سے) کہہ دے کہ جو شخص اِس وجہ سے جبریل کا دشمن ہو کہ اُس نے تیرے دل پر اللہ کے

قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

حکم سے اس (کتاب) کو اتارا ہے جو اس (کلام) کو جو اس سے پہلے موجود ہے سچا کرنے والی ہے -

وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۸﴾

اور مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔ ۱۵

دیتے ہیں کہ ہم تو وہی مانیں گے جو بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہوا۔ حالانکہ یہ نبی بھی اُنہی انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں کے مطابق آیا ہے۔ پھر اُن کے اس مقابلہ کو یاد دلا کر جو انبیائے بنی اسرائیل کا وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہیں ان کو نادم کیا گیا ہے۔ کہ تم نے اُن کے وقت میں حق کو بھی نہیں مانا تھا۔ آیت ۹۳ میں بتایا کہ اور انبیاء تو الگ رہے خود حضرت موسیٰؑ کی تم نے مخالفت کی آیت نمبر ۹۴ میں بتایا کہ یہ مخالفت ایسے وقت میں کی جب تم طور پر نیا نیا عہد باندھ کر آئے تھے۔

آیت نمبر ۹۵ میں بتایا کہ ان کا یہ عذر باطل ہے کہ ہم صرف بنی اسرائیل کے نبیوں کا کلام مانیں گے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ نجات ہمارے لئے مخصوص ہے۔ اچھا اگر اُن کو اس بات پر یقین ہے تو مباہلہ کر لیں۔ آیت نمبر ۹۶ میں بتایا کہ وہ مباہلہ کے لئے ہرگز نہیں آئیں گے کیونکہ انہیں اپنے جھوٹے ہونے کا علم ہے۔ آیت نمبر ۹۷ میں اُن کی اِس بُری حالت کو مشرکوں سے بھی بدتر بتایا۔ اور فرمایا کہ آخرت میں جانے سے تو اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہاں سزا ملے گی لیکن ان کے لئے اِس دُنیا میں بھی سُکھ نہیں پس ایسے عذرات سے کیا حاصل ہے۔

۱۵ حل لغات :- جِبْرِیْلَ: جبریل کا لفظ جبر اور ایل سے مرکب ہے۔ جبر کے معنے عبرانی زبان میں خادم اور غلام کے ہوتے ہیں۔ اور ایل کے معنے خدا کے۔ پس جبریل کے معنے ہیں خدا کا خادم یا خدا کا غلام۔

جِبْرِیْلَ

عربی زبان میں (۱) جبر کے معنے اصلاح کرنے اور ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنے کے ہوتے ہیں (۲) دوسرے معنے کسی کو کام پر مجبور کر دینے کے ہیں۔ (۳) تیسرے معنے اَلرَّجُلُ الشُّجَاعُ کے ہیں (اقرب) یعنی بہادر آدمی۔ چنانچہ جبر کا لفظ ایک شعر میں بھی بہادر کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ عرب شاعر ابن عمر کہتا ہے۔ ؎

وَ انْعِمْ صَبَاحًا اَيُّهَا الْجَبْرُ

اے بہادر آدمی تم پر صبح اچھی ہو۔ "گڈ مارننگ" GOOD MORNING اِسی سے لیا گیا ہے۔

پس جبر جو عبرانی میں خادم اور غلام کے معنے رکھتا ہے اس کے یہ معنے عربی زبان میں بھی ملتے ہیں لیکن ایل کے معنوں میں عربی اور عبرانی زبان میں بڑا فرق ہے۔ عبرانی میں عام طور پر یہ لفظ خدا کے لئے آتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے عربی میں نہیں پائے جاتے۔

بلکہ ایل کا لفظ ہی عربی زبان میں نہیں آتا۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں آئِل کا لفظ آتا ہے جو اٰلَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور آلَ کے معنے ہیں۔ اُس نے تدبیر سے حکومت کی۔ چنانچہ اٰلَ الْمَلِکُ رَعِیَّتَہٗ کے معنے ہوتے ہیں سَاسَھُمْ بادشاہ نے اپنی رعایا کی ضروریات کا انتظام کیا۔ اور اٰلَ عَلَی الْقَوْمِ کے معنے ہیں وَلِیَ وہ قوم کا بادشاہ بن گیا غرض آلَ کے عربی زبان میں کئی معنے ہیں۔ ایک معنے اِس کے لوٹنے کے بھی ہیں اس لحاظ سے آئِل لوٹنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب) پس آئِل لوٹنے والے مدبّر حاکم اور بادشاہ کو کہتے ہیں۔ اور یہ سب الفاظ خدا تعالیٰ پر چسپاں ہو سکتے ہیں۔ ان معانی کے لحاظ سے جبریل کے تین معنے ہونگے (۱) بادشاہ کا بہادر اور اچھا خادم (۲) ایک مدبّر ہستی کا بہادر اور اچھا غلام (۳) اپنے بندوں کی طرف بار بار رحمت کے ساتھ لوٹنے والے خدا کا بہادر اور اچھا خادم۔

عبرانی زبان میں بھی ایل کے معنے آئِل سے ملتے جُلتے ہیں۔ کیونکہ عبرانی کے بعض ماہر علماء کہتے ہیں کہ ایل کے معنے طاقتور کے ہیں (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۲ کالم ۳۳۲۶) جو حاکم یا مدبّر سے ملتے ہیں۔ لیکن عبرانی کے بعض دوسرے ماہر کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنے ہیں "وہ وجود جو سب انسانوں کا مرجع ہے"۔ یہ آئِل کے دوسرے معنی یعنی لوٹنے والے سے کسی قدر فرق کے ساتھ ملتے ہیں۔

عربی زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے جبریل کے معنے ہیں بار بار لوٹنے والے یعنی توّاب خدا کا خادم یہ خدا تعالیٰ ہی کی صفت ہے کہ وہ بار بار الہام نازل کرتا ہے اور بار بار اپنے بندوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں عبرانی زبان کے ماہر کہتے ہیں کہ عبرانی میں ایل کے معنے ہیں "وہ ذات جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں۔ اور جو سب انسانوں کا مرجع ہے۔ یہ معنے عربی زبان سے کسی قدر مختلف ہیں۔ گو جہاں تک لوٹنے کا سوال ہے اس کا دونوں معنوں میں ذکر آتا ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ عبرانی نے اُسے مرجع بتایا ہے اور عربی نے راجع۔ یعنی عربی میں اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ خدا جو بندہ کے پشیمان ہونے پر بار بار اپنے فضل کے ساتھ اُس کی طرف رجوع کرتا ہے اور عبرانی میں اس کے معنے ہیں وہ ہستی جس کی طرف لوگ بار بار رجوع کرتے ہیں۔ یہ تغیر ایسا ہی ہے جیسے عبرانی میں ایلوھیم جس کے معنے مضبوط اور طاقتور ہونے کے ہیں ان کے معنے مضبوط کے ہوگئے ہیں اور اب محاورہ میں یہ لفظ ہر اس وجود کے لئے استعمال کر لیتے ہیں جو مضبوط اور طاقتور ہو۔ پس جس طرح یہاں معنوں میں تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ اسی طرح آئِل کے معنے لوٹنے والے سے بدل کر "جس کی طرف لوٹا جائے" ہوگئے۔

اس کی زیادہ تر وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہود خدا تعالیٰ کی توّاب صفت کے قائل نہیں تھے اور وہ اس کے قائل ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ جو قوم یہ سمجھتی ہو کہ خدا تعالیٰ پر ہمارا حق ہے وہ ہمیں بہرحال نجات دیگا وہ خدا تعالیٰ کو توّاب کیسے مان سکتی ہے وہ تو اُسے کبھی بھی توّاب نہیں مانیگی اُسے توّاب وہی مان سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ اُس پر میرا کوئی حق نہیں۔ مگر یہود کا یہ عقیدہ نہ تھا۔ وہ خدا تعالیٰ پر اپنا حق جتاتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ایل کے معنے کر دیئے "وہ ہستی جس کی طرف لوگ لوٹتے ہیں۔ نہ یہ کہ وہ خدا جو لوگوں کی طرف بار بار رحمت کے ساتھ لوٹتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

عبرانی زبان میں تواب کے معنوں میں اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت بیان نہیں ہوئی ۔ لیکن زیادہ صحیح یہی ہے کہ اس کے اصل معنے لئے جائیں ۔ یعنی بار بار لوٹنے والے خدا کا بہادر اور اچھا خادم یا ایک مقتدر ہستی کا بہادر اور اچھا خادم ۔

تفسیر:۔

قرآن کریم اور بائبل دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ جبریل خدا تعالیٰ کے مقرب ملائکہ کا سردار ہے اور اس کا کام بندوں تک کلامِ الٰہی پہنچانا ہے ۔ مگر یہود اپنے تنزل کے زمانہ میں جبریل کو لڑائی اور عذاب کا فرشتہ سمجھنے لگ گئے تھے[1] اور اسے اپنا دشمن تصور کرتے تھے ۔ چنانچہ مسند احمد بن حنبل اور ابن کثیر کی روایت ہے کہ یہود جب مسلمانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے دلائل اور براہین سُنتے اور کوئی جواب نہ دے سکتے تو کہہ دیتے کہ اچھا ہمیں یہ بتاؤ ۔ کہ اُن کی طرف وحی کون لاتا ہے ؟ اس کے جواب میں مسلمان کہتے کہ جبریل ۔ اس پر یہود پکار اُٹھتے کہ جبریلُ ذَاكَ الَّذِيْ يَنْزِلُ بِالْحَرْبِ وَالْقِتَالِ وَالْعَذَابِ عَدُوُّنَا[2] ۔ یعنی جبریل تو وہ فرشتہ ہے جو جنگ و جدال اور عذاب لے کر نازل ہوتا ہے اور ہمارا دشمن ہے اس لئے ہم یہ کلام نہیں مان سکتے ۔

یہود میں یہ خیال زیادہ تر تالمودی روایات اور تارگم کی تفسیروں سے پھیلا ہے ۔ ورنہ بائبل جبریل کو کلام الٰہی لانے والا فرشتہ ہی قرار دیتی ہے چنانچہ دانیال باب ۸ آیت ۱۶ و ۱۷ میں لکھا ہے :۔

"اور میں نے اولائی میں سے آدمی کی آواز سُنی جس نے بلند آواز سے کہا کہ اے جبریل اِس شخص کو اس رؤیا کے معنے سمجھا دے ۔ چنانچہ وہ جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور اُس کے آنے سے میں ڈر گیا اور مُنہ کے بل گرا ۔ پر اُس نے مجھ سے کہا ۔ اے آدم زاد سمجھ لے کہ یہ رؤیا آخری زمانہ کی بابت ہے ۔"

اسی طرح دانیال باب ۹ آیت ۲۱ میں لکھا ہے ۔

"میں دُعا میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ وہی شخص جبرائیل جسے میں نے شروع میں رؤیا میں دیکھا تھا حکم کے مطابق تیز پروازی کرتا ہوا آیا اور شام کی قربانی گذراننے کے وقت کے قریب مجھے چھوا اور اس نے مجھے سمجھایا اور مجھ سے باتیں کیں ۔"

لوقا باب ۱ آیت ۱۹ میں بھی لکھا ہے :۔

"فرشتہ نے جواب میں اُس سے کہا ۔ میں جبرائیل ہوں جو خدا کے حضور کھڑا رہتا ہوں اور اس نے بھیجا گیا ہوں کہ تجھ سے کلام کروں اور تجھے ان باتوں کی خوشخبری دوں ۔"

اسی طرح لوقا باب ۱ آیت ۲۶ میں لکھا ہے :۔

"چھٹے مہینے میں جبرائیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا ۔"

مگر بعد میں یہودی احادیث میں جبرائیل کو عذاب کا فرشتہ قرار دے دیا گیا ۔ اور میکائیل کو وحی الٰہی لانے والا فرشتہ سمجھا جانے لگا ۔ دانیال نبی کے

---

[1] انسائیکلوپیڈیا ببلیکا ۔ زیر لفظ جبریل ۔

[2] تفسیر ابن کثیر جلد اول برحاشیہ تفسیر فتح البیان جلد اول صفحہ ۲۲۲

وقت تک وہ مانتے تھے کہ جبرائیل کلام الٰہی لانے والا فرشتہ ہے۔ اور دنیوی ترقیات کا تعلق میکائیل کے ساتھ ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ میکائیل کو کلامِ الٰہی لانے والا فرشتہ سمجھنے لگ گئے اور جبرائیل جو کلام لاتا تھا وہ چونکہ نہ ماننے والوں کے لئے سزا کا بھی پیغام لاتا تھا اس لئے وہ اُسے ناپسند کرنے لگ گئے۔ یہاں تک کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں یہود کا یہ پختہ خیال ہو گیا کہ جبرائیل گرج اور عذاب کا فرشتہ ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ جبریل)

معلوم ہوتا ہے کہ یہود چونکہ مغضوب قوم تھی۔ اور جو نبی بھی اُن کی طرف آتا وہ اُنہیں ڈراتا اور کہتا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لئے وہ عذابوں کے پےدر پے آنے کے سبب سے یہ سمجھنے لگ گئے کہ جبرائیل اُنکا دشمن ہے۔ کیونکہ وہ جو کلام بھی لاتا ہے اُس میں عذاب ہی عذاب کی خبریں ہوتی ہیں۔ پس وہ جبریل سے عداوت رکھنے لگ گئے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں اس کے ماننے کی ضرورت نہیں۔ اصل فرشتہ میکائیل ہے جس کی لائی ہوئی وحی ماننے کے قابل ہے۔ وہ جبرائیل کو لڑائی اور جھگڑے پیدا کرنیوالا فرشتہ اس لئے کہتے تھے کہ وہ ہمیشہ انبیاء کا انکار کرتے تھے اور اس انکار کی وجہ سے اللہ تعالےٰ اُن پر عذاب نازل کیا کرتا تھا۔ اِن عذابوں کو وہ جبرائیل کی طرف منسوب کر دیتے اور سمجھتے تھے کہ وہ عذاب کا فرشتہ ہے۔ آجکل بھی لوگ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیوں کے ماتحت جب عذاب آتے دیکھتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ کیسے نبی ہیں جو دنیا کو ہلاک کرنے کے لئے آئے ہیں یہی الزام جبرائیل پر لگایا گیا تھا جسے اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں دُور کیا ہے۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ اس وجہ سے اُس سے عداوت کرتے ہیں کہ اُس نے قرآن مجید کو تیرے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نازل کیا ہے۔ اِس جگہ فَاِنَّهٗ لِاَنَّهٗ کے معنوں میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ اس وجہ سے جبریلؑ سے عداوت کرتے ہیں کہ اُس نے یہ کتاب کیوں نازل کی۔ حالانکہ یہ ایسی کتاب ہے جو اپنے اندر کئی قسم کی خوبیاں رکھتی ہے اور جن کو دیکھتے ہوئے اس سے دشمنی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اِس جگہ یہود کے مذکورہ بالا شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے چار جواب دیئے ہیں۔ پہلا جواب تو یہ دیا ہے کہ کوئی فرشتہ اپنی طرف سے کلام نازل نہیں کر سکتا بلکہ اس کا نزول اللہ تعالےٰ کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے۔ پس خواہ کوئی فرشتہ کلام نازل کرنے والا ہو۔ جبریل ہو یا میکائیل جسے وہ اپنا دوست سمجھتے ہیں بہر حال کلام نازل کرنے والا تو خدا ہے اور اس کے کلام پر فرشتہ کی دشمنی کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کلام لانیوالے کے فرق سے کلام میں فرق نہیں آسکتا۔ پس اگر کسی قومی روایت کی وجہ سے جبرائیل سے نفرت بھی ہو تو اس کلام سے نفرت کس طرح جائز ہو سکتی ہے جو وہ لاتا ہے۔ وہ کلام تو بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا اور اُس کا قبول کرنا ضروری ہوگا۔

باقی رہا یہ کہ جبریل اِسے کیوں لایا میکائیل کیوں نہیں لایا۔ سو جبرائیل نے اِسے خود نازل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کے حکم سے نازل کیا ہے۔ اور جب خدا کے حکم سے اُس نے اسے اتارا ہے تو اس سے دشمنی کیسی؟ اُس نے تو خدا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔

اِسی ضمن میں اللہ تعالےٰ نے اس کلام کی برتری اور اس کی فضیلت کی ایک یہ بھی دلیل دی ہے کہ یہ تعلیم اس نبی کے دل پر اتاری گئی ہے۔ جس کی وجہ سے اس تعلیم نے اس کے جذبات کو اس کے تابع کر دیا ہے۔

اِس جگہ نزلا مفسروں کے خیالات اور نبیوں کے کلام میں یہ فرق بتایا گیا ہے کہ نبی پر جو کلام اُترتا ہے وہ اُس کے

دل پر نازل کیا جاتا ہے۔ مگر فلاسفر کے خیالات کا نزول اُس کے دماغ پر ہوتا ہے۔ فلاسفر بھی اچھی باتیں کہتا ہے مگر اُس کے جذبات اُس کے افکار کے تابع نہیں ہوتے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اُس کے مطابق اُس کا عمل نہیں ہوتا۔ لیکن نبی پر جو کلام نازل ہوتا ہے اُس کا عمل اس کے مطابق ہوتا ہے۔ انگریزوں میں کئی بڑے بڑے فلاسفر گذرے ہیں جن کی کتابیں اخلاقی باتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ لیکن اُن کا عمل دیکھ کر انسان کو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ اِس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کے فلسفہ کا نزول دماغ پر ہوتا ہے اور کلامِ الٰہی کا قلب پر جس کی وجہ سے کلامِ الٰہی انسان کی زندگی کو پاک کر دیتا ہے۔ لیکن ایک فلاسفر کا فلسفہ اُس کے دل کو پاک نہیں کر سکتا اِسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جبریلؑ نے اِس کلام کو تیرے دل پر نازل کیا ہے یعنی اُس نے اِس کلام کو تیرے جسم اور رُوح کے ذرّہ ذرّہ میں داخل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تُو خود قرآن ہو گیا ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے؟ تو آپ نے فرمایا۔ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ (مجمع البحار جلد اول ص ۳۷۲) کہ آپؐ کے اخلاق معلوم کرنے چاہو تو قرآن کریم پڑھ کر دیکھ لو جتنی باتیں قرآن کریم میں لکھی ہیں وہ سب آپؐ میں پائی جاتی تھیں۔

غرض نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ میں جہاں یہ جواب دیا گیا ہے کہ جبریلؑ نے یہ کلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُتارا ہے۔ اِس میں اُس کی مرضی کا کوئی دخل نہیں کہ یہ کہا جائے کہ اُس نے تم سے دشمنی کی وجہ سے کسی اور پر وحی نازل کر دی ہے۔ وہاں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مطہر کا ذکر فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ تمہارا یہ خیال کہ جبریلؑ نے تمہاری دشمنی کی وجہ سے بنی اسمٰعیل کے ایک فرد پر یہ کلام بلاوجہ نازل کر دیا ہے غلط ہے۔ یہ کلام اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُسی شخص پر نازل کیا ہے جو اس عظیم الشان امانت کا سب سے زیادہ اہل تھا۔

دوسری بات یہ بتائی کہ وہ کلام جو اس رسول پر نازل ہوا ہے اُن پیشگوئیوں کو پورا کرنے والا ہے جو تمہاری کُتب میں موجود ہیں۔ پس یہ تو عداوت نہیں بلکہ دوستی کی علامت ہے کہ ایسے کلام کا نزول ہوا جو تمہاری کتب کی صداقت کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اگر یہ کلام نہ اُترتا تو تمہاری کتابیں جھوٹی ہو جاتیں اور اُن کی پیشگوئیاں باطل قرار پاتیں پس یہ تعلیم جو جبریلؑ نے اتاری ہے ایسی ہے جو تمہاری کتابوں کی پیشگوئیوں کو پورا کرتی ہے۔ اگر یہ نبی اس زمانہ میں نہ آتا یا بنی اسمٰعیل میں سے نہ آتا تو بائیبل کی پیشگوئیاں غلط ہو جاتیں۔ پس جبریلؑ نے تمہاری دشمنی نہیں کی بلکہ خیرخواہی کی۔ اگر جبریلؑ کی تمہارے ساتھ دشمنی ہوتی تو پھر یہ کلام تمہاری کتابوں کی تصدیق کیوں کرتا۔ پس اِس وحی کے قبول کرنے میں ہی تمہاری عزت ہے۔ تمہیں اس کلام کو ردّ نہیں کرنا چاہیئے۔

تیسری بات یہ بتائی کہ یہ کتاب لوگوں کے لئے ہادی اور رہنما ہے۔ یعنی اور باتوں کے علاوہ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ہدایت کے صحیح رستہ کی طرف لے جاتی اور گمراہی سے بچنے کے ذرائع بیان کرتی ہے۔ اور اگر یہ قرآن تم کو تقویٰ اور پرہیزگاری اور نیکی کی تعلیم دیتا ہے تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ بہرحال اس کا قبول کرنا تمہارے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ تم اس کے ذریعہ سے پاک اور متقی بن جاؤ گے۔ اگر یہ کتاب باطل کی طرف لے جاتی تو پھر بے شک تم اس کا انکار کر سکتے تھے۔ مگر تم جانتے ہو کہ یہ کتاب باطل کی طرف نہیں بلکہ ہدایت کی طرف لے جاتی ہے اور کسی کلام کے ماننے یا ردّ کرنے میں اصل سوال یہی قابلِ غور ہوتا ہے کہ وہ درست ہے یا غلط۔ پس اگر یہ کلام صحیح ہے اور اس میں بنی نوع انسان کی خیرخواہی اور اُن کی ترقی کی تعلیم دی گئی ہے تو تمہیں

کسی اور امر کو مدنظر رکھ کر اُسے چھوڑنا نہیں چاہیئے۔

چوتھی بات یہ بتائی کہ یہ تعلیم ایسی ہے جو اپنے ماننے والوں کے لئے بُشریٰ ہے۔ یعنی اُن کو بڑے بڑے انعامات کا وعدہ دیتی ہے۔ گویا اگر کوئی شخص صرف اس لئے کسی صداقت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ وہ بنفسہٖ صداقت ہے بلکہ وہ انعامات کا بھی طالب ہو تو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص اِسپر سچے دل سے عمل کرے گا۔ اُسے بڑے بڑے انعامات بھی ملیں گے۔ پس اس کو چھوڑنا اپنا نقصان کرنا ہے۔ اس فقرہ میں بھی یہود کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم تو کہتے ہو کہ جبریلؑ عذاب کا فرشتہ ہے۔ مگر اس کلام میں تو بشارتیں ہی بشارتیں بھری پڑی ہیں۔ پھر وہ عذاب کا فرشتہ کیسے ہوا؟

غرض بتایا کہ یہ بحث ہی لغو ہے کہ کلامِ الٰہی جبریلؑ لاتا ہے یا میکائیلؑ۔ کلام تو خدا نازل کرتا ہے۔ پس اگر کلام کی وجہ سے کسی سے دشمنی ہونی چاہیئے تو خدا سے ہونی چاہیئے۔ جبرائیلؑ جو ایک درمیانی واسطہ ہے اُس سے دشمنی کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ مگر تم خدا کو تو اپنا دوست قرار دیتے ہو اور جبرائیلؑ جو اس کا ایلچی ہے اُسے گالیاں دینے لگ جاتے ہو۔ پھر دوسری طرف تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دشمنی کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جبریلؑ اُسپر کلام کیوں لایا۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ اس کا کلام تمہاری کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اُن کی پیشگوئیوں کو پورا کرتا ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جبریلؑ کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ جبریلؑ تمہارا دشمن ہے تو عجیب دشمنی ہے کہ اُسی کے کلام سے تمہاری کتابیں بھی ثابت ہو رہی ہیں۔ پھر اس کا ھُدًی اور بُشریٰ ہونا بھی بتاتا ہے کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جبریلؑ آگ اور عذاب کا فرشتہ ہے کیونکہ اس کے ذریعہ جو کلام نازل ہوا ہے وہ ہدایت سے پُر ہے اور ایمان لانے والوں کو اعلیٰ درجہ کے رُوحانی انعامات سے سرفراز کرتا ہے۔ پس جبرائیلؑ یا میکائیلؑ کی بحث میں پڑ کر اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیئے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قبول کر لینا چاہیئے۔

مَیں نے اس آیت میں فَاِنَّهٗ کے معنے لِاَنَّهٗ کے کئے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہاں فاء لام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر فاء کے عام معنے قائم رکھ کر دوسرے معنے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ مگر اس صورت میں یہ جواب محذوف ماننا پڑے گا۔ کہ فَلَا وَجْهَ لِعَدَاوَتِهٖ۔ اس سے عداوت رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ اُس نے اس کلام کو تیرے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُتارا ہے۔ اس میں بتایا کہ وہ لوگ جو جبریلؑ سے دشمنی کرتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جو کچھ اس نے اس رسول کے دل پر اُتارا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اِذن سے اُتارا ہے اور اس کے کہنے کے مطابق اُتارا ہے۔ پس اس سے دشمنی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر تم دشمنی کرو گے تو اللہ تعالیٰ سے کرو گے نہ کہ جبریلؑ سے (۲) وہ تعلیم تمہاری کتابوں کی پیشگوئیوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اگر جبرائیلؑ کو تم سے دشمنی ہوتی تو وہ ایسی تعلیم جو تمہاری تعلیم کو پورا کرتی ہے نہ اُتارتا۔ پس جبرائیلؑ سے دشمنی کرنے کے یہ معنے ہیں کہ تم اپنی کتابوں سے بھی دشمنی کر رہے ہو۔ (۳) پھر یہ کلام اس حال میں اُترا ہے کہ وہ ہادی اور مُبشّر ہے۔ جو شخص ہادی سے دشمنی کرتا ہے وہ گویا اپنی جان سے دشمنی کرتا ہے۔ اور جو شخص مبشّر سے دشمنی کرتا ہے وہ اپنی آئندہ نسلوں سے دشمنی کرتا ہے۔ ہدایت انسان کے اپنے نفس سے تعلق رکھتی ہے اور بشارت آئندہ نسلوں کے ساتھ۔ ہدایت ورثہ میں نہیں دی جاتی۔ مگر دنیوی انعامات عام طور پر ورثہ میں چلے جاتے ہیں پس فرمایا کہ یہودی لوگ منبع سے بھی دشمنی کرتے ہیں۔ اور

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ

(تو اُسے یاد رہے کہ) جو شخص (بھی) اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور

جِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۹﴾

جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو تو (ایسے) کافروں کا اللہ بھی یقیناً دشمن ہے۔ ؎۱۶

درمیانی حالت سے بھی دشمنی کرتے ہیں اور انتہائی حالت سے بھی دشمنی کرتے ہیں۔ (۱) منبع تو اللہ تعالےٰ ہے جس سے وہ دشمنی کرتے ہیں (۲) پھر وہ انبیاء جو دنیا میں اُس کے ظل اور مظہر ہوتے ہیں اور ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے ہیں اُن سے دشمنی کرتے ہیں۔ (۳) پھر اپنی ذات کے بھی دشمن ہیں اور آئندہ نسلوں سے بھی دشمنی کرتے ہیں اور انہیں اُن انعامات اور افضال سے جو ایمان لانے سے اُنکو مل سکتے ہیں محروم کرتے ہیں۔ پس جبریل کی دشمنی کوئی معمولی دشمنی نہیں۔ جو اُس سے دشمنی کرتا ہے وہ دراصل اس سے نہیں بلکہ اللہ اور اپنی جان اور اپنی آئندہ نسلوں سے دشمنی کرتا ہے۔

دوسرے معنی کی صورت میں مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ کا جواب اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت کے آخر میں رکھا ہے۔ یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ مگر چونکہ فقرہ لمبا ہو گیا تھا اس لئے اس کے بعد پھر اس کے ذکر کو دُہرا دیا ہے۔ اور ساتھ ہی میکائیل کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ کیونکہ جبرائیل کی دشمنی میکائیل کی بھی دشمنی ہے اور اس کے بعد اس کی اصل جزاء بتا دی ہے۔

اوپر جو مضمون بیان ہوا ہے اس سے یہود کو یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی الٰہی کا نزول خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے اور اسی نے ان کو نبی بنایا ہے۔ پس تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی کرنا خدا تعالےٰ سے دشمنی کرنا ہے۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے کلام کا انکار دراصل موسیٰؑ کا انکار ہے جس نے اس کی پیشگوئی کی تھی۔ اب تم خود سوچ لو کہ تم اس مخالفت میں کہاں تک حق بجانب ہو۔

؎۱۶ تفسیر:۔ اس میں بتایا کہ فرشتے تو ایک واسطہ ہیں جس طرح ہوا آواز پہنچانے کا واسطہ ہے۔ پس جو شخص اُن سے عداوت رکھتا ہے وہ درحقیقت اُس سے عداوت رکھتا ہے جس نے انکو بھیجا۔ اور اُس پر یہ الزام لگاتا ہے کہ اس نے انتخاب میں غلطی کی۔ پس اس قسم کے خیالات کے یہ معنے ہیں کہ یہود خدا سے دشمنی کرتے ہیں۔ کیونکہ ایلچی کی ہتک درحقیقت بادشاہ کی ہتک ہوتی ہے۔ پس جو شخص فرشتوں میں سے کسی کو بُرا کہتا ہے وہ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ پر الزام لگاتا ہے کہ اُس نے وحی الٰہی نازل کرنے کے لئے ایک ناقص ہستی کو تجویز کیا۔ پس جبریل کی دشمنی صرف ایک فرشتہ کی دشمنی نہیں بلکہ خدا تعالےٰ کی دشمنی ہے۔ پھر جو جبریل کا دشمن ہے وہ تمام ملائکہ کا بھی دشمن ہے۔ کیونکہ جبریل خود ملائکہ میں سے ایک مَلک ہے۔ پھر جبریل کی دشمنی کے نتیجہ میں انسان تمام رسولوں کا بھی دشمن بن جاتا ہے کیونکہ جبریل ابتداء سے اللہ تعالےٰ کے نبیوں پر کلام الٰہی لاتا رہا ہے۔ آخر میں پھر جبریل کا ذکر کر کے یہود کو متنبہ کیا ہے،

کہ اس کو اپنا دشمن مت سمجھو ورنہ اس کی دشمنی تمہیں خدا تعالیٰ کے دشمنوں میں شامل کر دیگی ۔ اور خدا تعالیٰ کے افعال پر جرح کر نیوالا انسان مجبور ہوتا ہے کہ وہ سب ملائکہ اور رسولوں پر بھی معترض ہو کیونکہ ان سب کی عزت ذاتِ باریؐ کی اطاعت کے ساتھ وابستہ ہے پس روحانی سلسلہ کے کسی ایک رُکن پر الزام لگانا یا اُس سے عداوت کا اظہار کرنا انسان کو ہدایت سے بہت دُور لے جاتا ہے اور ایسے اشخاص آخر اللہ تعالیٰ کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں ۔ یعنی اُن فیوض اور برکات سے اپنے آپ کو محروم کر لیتے ہیں جو اس کے دوستوں پر نازل ہوتی ہیں اور اُن عذابوں کے مورد بن جاتے ہیں جو اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں ۔

جبرئیل کے بعد میکائیل کا خصوصیت سے اس لئے ذکر کیا کہ یہود کا خیال تھا کہ میکال ان کا خاص مہربان فرشتہ ہے ۔ اور وہ اسے اسرائیل کا محافظ فرشتہ یا شہزادہ خیال کرتے تھے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۱۸ صفحہ ۳۵۲)

میکال کے معنے ہیں خدا کی مانند ۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس فرشتہ کا کام زیادہ تر صفتِ ربوبیّت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے یعنی اُس کے سپرد دنیا کا رزق اور خبر گیری ہے اور جبرئیل کا روحانیات کے ساتھ تعلق ہے اور [illegible] کلامِ الٰہی لاتا ہے ۔ گویا ہدایت لانے کا کام جبرائیل کے سپرد ہے ۔ اور بُشریٰ یعنی دنیوی ترقیات کے سامان مہیا کرنا میکائیل کا کام ہے اور بشریٰ ہمیشہ ہدایت کے تابع ہوتی ہے ۔ جب انسان اس تعلیم پر جسے جبرائیل لاتا ہے عمل کر کے مہدی بن جاتا ہے تب اُسے بُشریٰ یعنی دنیوی انعامات حاصل ہوتے ہیں ۔ پس جو شخص مہدی نہ ہو وہ دنیوی انعامات بھی حاصل نہیں کر سکتا ۔ اسی طرح جو شخص جبرائیل سے دشمنی کرے گا میکائیل خود بخود اس کا ساتھ چھوڑ دے گا اور دشمن ہو جائیگا ۔ غرض یہود کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم جبریل سے دشمنی کروگے تو میکال بھی تمہارا دشمن ہو جائیگا ۔ اور اس طرح تمہارا دین اور دنیا دونوں برباد ہو جائیں گے ۔

جبریل اور میکال کے دوبارہ ذکر کرنے کا مقصد تاکید بھی ہے ۔ یعنی جو کوئی ان کا دشمن ہوگا اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی دشمنی میں اللہ اور اس کے ملائکہ اور اُس کے تمام رسولوں کی دشمنیاں بھی شامل ہیں ۔

پھر ان فرشتوں کا دوبارہ ذکر اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ فرشتے اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں وہ صرف ایک درمیانی واسطہ ہیں ۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام نے فرشتہ کی مثال ہوا سے دی ہے یعنی جس طرح کلام کرنے والے اور سُننے والے کے درمیان ہوا کا واسطہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان فرشتہ واسطہ ہوتا ہے ۔ اگر کوئی شخص اس واسطہ سے دشمنی کرتا ہے جو ایک مزدوری چیز ہے تو در اصل اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ [illegible] اس چیز سے نہیں بلکہ اُس سے دشمنی کرتا ہے جس نے اس واسطہ کو بنایا ہے ۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انتخاب میں غلطی کی ہے ۔ پس در اصل جبرائیل کی دشمنی خدا کی دشمنی ہے ۔ اور جو آقا کا دشمن ہوتا ہے ماتحت بھی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے فرمایا کہ میکائیل بھی ان کا دشمن ہے ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آقا ہے اور باقی سب اس کے تابع ہیں ۔ جو زنجیر کی کڑیوں کی طرح ہیں ۔ اگر زنجیر کی ایک کڑی ٹوٹ جائے تو ساری کی ساری زنجیر ٹوٹ جاتی ہے ۔ اسی طرح جبریل کی دشمنی سے نہ صرف وہی بلکہ تمام ملائکہ دشمن ہو جاتے ہیں اور ایک کڑی کے ٹوٹنے

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا

اور ہم نے یقیناً تجھ پر کھلے کھلے نشانات نازل کئے ہیں اور

سے ساری زنجیر بے کار ہو جاتی ہے۔ یہود میکائیل کو اسرائیل کا شہزادہ اور اپنا دوست اور محافظ سمجھتے تھے۔ اِس لئے اُس کا خاص طور پر ذکر کر کے بتایا کہ جبرائیلؑ کی دشمنی سے وہ بھی تمہارا دشمن بن گیا ہے۔

پھر میکالؑ کا اس لئے بھی خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب اُن کی کسی مقدس ہستی کو کوئی نادان بُرا کہے تو وہ ضِد اور تعصب کی وجہ سے دوسرے کی مقدس ہستیوں کو بھی بُرا بھلا کہنے لگ جاتے ہیں۔ چونکہ ممکن تھا کہ کسی وقت مسلمانوں میں سے بھی بعض نادان یہود کی ضِد کی وجہ سے میکالؑ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور ان دونوں فرشتوں کو یہود اور مسلمانوں کے خاص محافظ فرشتے قرار دے کر ایک دوسرے کے مقابل میں کھڑا کر دیا جاتا۔ اِس لئے اس غلطی سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے میکالؑ کا نام علیحدہ بھی لے دیا تاکہ یہود جب مسلمانوں کے سامنے یہ کہیں کہ جبریلؑ ہمارا دشمن ہے تو مسلمان ان کے مقابلہ میں ان کی اس عداوت کی وجہ سے یہ نہ کہہ دیں کہ اچھا اگر جبرائیلؑ تمہارا دشمن ہے تو میکالؑ ہمارا دشمن ہے۔ اِس خطرہ کو دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے میکالؑ کا ذکر خصوصیت سے فرما دیا اور بتایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مقدس ہستیاں ہیں۔ ان سے عداوت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ اگر یہود جبریلؑ کے دشمن ہیں تو تم میکالؑ کو بُرا نہ کہو۔

بائیبل سے پتہ لگتا ہے کہ دنیا کو رزق دینے والا اور لوگوں کی خبر گیری کرنے والا فرشتہ میکالؑ ہے چنانچہ دانیال باب ۱۰ آیت ۱۳ میں لکھا ہے کہ

" میکائیل جو مقرب فرشتوں میں سے ہے میری مدد کو پہنچا۔ اور میں شاہانِ فارس کے پاس رُکا رہا۔"

اور آیت ۲۱ میں لکھا ہے:۔

" جو کچھ سچائی کی کتاب میں لکھا ہے تجھے بتاتا ہوں اور تمہارے مؤکل میکائیل کے سوا اس میں میرا کوئی مددگار نہیں ہے۔"

اِسی طرح دانی ایل باب ۱۲ آیت ۱ میں لکھا ہے:۔

" اور اس وقت میکائیل مقرب فرشتہ جو تیری قوم کے فرزندوں کی حمایت کے لئے کھڑا ہے اُٹھیگا اور وہ ایسی تکلیف کا وقت ہوگا کہ ابتدائے اقوام سے اس وقت تک کبھی نہ ہُوا ہوگا۔ اور اس وقت تیرے لوگوں میں سے ہر ایک جس کا نام کتاب میں لکھا ہوگا رہائی پائیگا۔"

غرض میکالؑ کا ذکر کر کے مسلمانوں کو اُس کے ساتھ دشمنی کرنے سے روکا ہے اور بتایا ہے کہ ایسا نہ ہو تم ضد میں آکر اپنا نقصان کر لو۔ اور یہود کے مقابلہ میں میکالؑ سے دشمنی کرنے لگو۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ میں ضمیر کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ضمیر کے استعمال سے یہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کا مرجع میکالؑ کو نہ قرار

يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝١٠

نافرمانوں کے سوا اُن کا انکار کوئی نہیں کرتا۔ ۱۷۵

دے دیں۔ پس ضمیر کی بجائے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بتایا کہ اگر تم جبریل کو بُرا بھلا کہو گے اور اپنی اس عادت کو ترک نہیں کرو گے تو پھر خدا بھی تمہارا دشمن ہو جائیگا۔ اور تمہاری ناکامی و نامرادی میں کوئی شبہ نہیں رہیگا۔

۱۷۵ تفسیر :۔ عیسائی لوگ اس سورۃ کی آیت وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ (ع ۱۴) سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیوں ہم سے براہ راست اللہ تعالیٰ بات نہیں کرتا۔ یا کیوں ہمارے پاس تو کوئی نشان نہیں لاتا۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے بیّنٰت کا لفظ آجائے جیسا کہ پچھلے رکوع میں ہی آچکا ہے تو وہ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ مسیح نبی نہیں تھا بلکہ نبیوں سے بالا ہستی تھی۔ مگر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لئے وہی الفاظ آجائیں تو نہایت خاموشی سے گذر جاتے ہیں۔ بلکہ کفار کے مطالبہ کو پیش کرکے کہتے ہیں کہ چونکہ کفار یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں آیات نہیں دکھائی جاتیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کوئی نشان نہیں دکھایا۔ حالانکہ اگر کفار کے آیات مانگنے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا تو پھر یہی اعتراض حضرت مسیح علیہ السلام پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اور اُن کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ چنانچہ متی باب ۱۲ آیت ۳۸، ۳۹ میں لکھا ہے کہ:۔

"تب بعضے فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں کہا۔ کہ اے اُستاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس نے انہیں جواب دیا اور کہا کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان انہیں دکھایا نہ جائیگا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اُس وقت تک جب آپ نے یہود کو یہ جواب دیا تھا کوئی معجزہ نہیں دکھایا تھا۔ اور پھر اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ساری عمر یہود کو کوئی نشان نہیں دکھایا کیونکہ یونس نبی سے مماثلت کا نشان وہ ہے جو اُن کی موت کے وقت ظاہر ہوا۔ اور یہود کا سوال یہ تھا کہ ہمیں اب کوئی نشان دکھایا جائے۔ مگر جب اُن سے کوئی نشان طلب کیا گیا تو انہوں نے بقول انجیل یہ کہا کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگوں کو کوئی نشان نہیں دکھایا جائیگا۔ گویا انہوں نے دشمن کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کر لیا۔ اور کہا کہ اُن کو سوائے یونس نبی کے معجزہ کے اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا جائیگا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے انہوں نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا تھا اور آئندہ کے لئے بھی صرف ایک نشان کا انہوں نے وعدہ کیا مگر یہ وعدہ بھی غلط ہو گیا۔ کیونکہ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر مر گئے تھے۔ اور مر کر ہی قبر میں گئے تھے۔ حالانکہ یونس علیہ السلام سمندر میں گرے تو زندہ رہے۔ پھر مچھلی نے اُن کو نگلا تب بھی وہ زندہ ہی رہے۔ اور پھر اس کے پیٹ میں سے بھی زندہ ہی نکلے۔ مگر مسیح علیہ السلام تو اُن کے نزدیک صلیب پر ہی مر گئے تھے۔ گویا ایک ہی معجزہ

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ

اور کیا (یہ بُری بات نہیں کہ) جب بھی ان لوگوں نے کوئی عہد کیا تو اُن میں سے ایک فریق نے اُسے پھینک دیا۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

(یہی نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر (تو) ایمان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ ۱۵۸

جس کے دکھانے کا انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ اُس کے متعلق مسیحیوں نے کہہ دیا کہ وہ نہیں دکھایا گیا۔ اور اس طرح انہوں نے ثابت کر دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کوئی نشان نہیں دکھایا۔

مگر اس کے مقابلہ میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑی کثرت کے ساتھ معجزات دیئے گئے تھے۔ عیسائی یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو معجزات منسوب کئے جاتے ہیں انہیں ہم معجزہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے مگر یہ کہنا کہ قرآن کریم رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا منکر ہے صریح ظلم ہے۔ قرآن کریم نہایت واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بڑے بڑے معجزات دیئے گئے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ یعنی ہم نے یقیناً تجھ پر کھلے کھلے نشانات نازل کئے ہیں۔ اسجگہ آیات بینات سے وہ تمام نشانات مراد ہیں جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت ثابت کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمائے اور جن کی نظیر نہ موسیٰؑ کے نشانوں میں مل سکتی ہے اور نہ عیسیٰؑ کے نشانوں میں۔ مگر فرمایا۔ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ باوجود اس کے کہ نشانات الٰہیہ کی بارش برس رہی ہے پھر بھی اطاعت سے نکل جانے والے لوگ انکار پر کمربستہ ہیں۔ مگر اُن کا انکار اُنہیں کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ جس طرح پہلے نبیوں کے منکر تباہ ہوئے اُسی طرح یہ بھی تباہ ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اُس سکیم کو پورا کرکے رہیگا جس کے لئے وہ متواتر اپنے نبیوں سے ہر زمانہ میں پیشگوئیاں کرواتا چلا آیا ہے۔

۱۵۸ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ ہر نبی کے وقت لوگ عہد و پیمان کرتے ہیں۔ مگر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ انہی میں سے کچھ لوگ اُس عہد کو پس پُشت پھینک دیتے ہیں۔ اور ان کا حال پہلے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہ مرض صرف یہود ہی میں نہیں بلکہ تمام اقوام اس مرض میں شریک ہیں۔ ہر قوم میں ایسے لوگ ہیں جن میں عہد و پیمان کو پس پُشت پھینک دینے کا مرض پایا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ یہ مرض کبھی دُور بھی ہوگا یا نہیں۔ نبی کا آنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اُس وقت آسمان و زمین کے ذرہ ذرہ میں ایک ہیجان پایا جاتا ہے۔ اور جس طرح ایک عورت کو بچہ جننے کے وقت دردِ زہ کی تکلیف ہوتی ہے اُسی طرح نبی کے آنے کے وقت زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ میں دردِ زہ کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ اُس کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کہیں زلزلے آتے ہیں۔ کہیں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ کہیں ستارے ٹوٹتے ہیں کہیں بیماریاں پڑتی ہیں کہیں قحط آتے ہیں۔ غرض سارے عالم میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایسی دردِ زہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آخر دردِ زہ کی اس کیفیت کے بعد

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک ایسا رسول آیا جو اس (کتاب) کو جو اُن کے

مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ

پاس ہے سچا کرنیوالا ہے تو اُن لوگوں میں سے جنہیں (وہ) کتاب دی گئی تھی ایک فریق نے اللہ کی (تازہ)

وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا۔ گویا کہ وہ (اُسے) جانتے ہی نہیں۔ ف۱۹

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ

نیز وہ (یعنی یہودی) اُس (طریق عمل) کے پیچھے پڑ گئے جس کے پیچھے سلیمانؑ کی حکومت کے زمانہ میں (اُسکی حکومت کے) باغی

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا

پڑے رہتے تھے۔ اور سلیمانؑ کافر نہ تھا بلکہ (اُس کے) باغی کافر تھے۔

نیچر میں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی غور و پرداخت شروع ہو جاتی ہے۔ مگر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرتا کہ کچھ لوگ فتنہ و فساد اور شرارت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ اور شیطان پھر اپنا سر اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس قسم کے شیطانی عنصر کی علامت یہ ہوتی ہے کہ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ اُن میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو حقیقی ایمان سے محروم ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی بے ایمان بنا دیں۔ اور اُس مقصد کو باطل کر دیں جس کے لئے خدا تعالےٰ نے اپنا نبی بھیجا تھا۔

ف۱۹ تفسیر:۔ فرماتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا بلاوا آتا ہے تو ایک فریق اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لیتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی آواز کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ حالانکہ خدا کا بلاوا کوئی معمولی چیز نہیں۔ اگر ایک معمولی افسر کا بھی بلاوا آجائے تو بسا اوقات انسان پھولا نہیں سماتا۔ مگر خدا تعالیٰ کا بلاوا آتا ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر دل میں نورِ ایمان ہو تو اس آواز کو سُنکر انسان پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو جانی چاہیئے۔ دنیا کے اعزاز اس کے مقابلہ میں کیا چیز ہیں! خدا تعالیٰ خود بندوں کو یاد کرتا ہے۔ اور اپنا نبی اُن میں بھیجتا ہے مگر لوگ ایسے بیوقوف ہوتے ہیں کہ وہ اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ حالانکہ اُس آواز پر لبیک کہنا اُن کے لئے فخر کا موجب ہوتا ہے۔ اسی طرح یہود کو تو خوشی منانی چاہیئے تھی کہ ہماری کتابوں کی سچائی ظاہر ہو رہی ہے اور یہ نبی اُن کی کتابوں اور بزرگوں کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر وہ قوم جو غلط رویّہ اختیار کر چکی ہو وہ ایسا کس طرح کر سکتی ہے؟

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ سے یہی مراد ہے کہ اس رسول نے اپنی بعثت کے ساتھ اُن پیشگوئیوں کو پورا کر دیا ہے

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ

وہ لوگوں کو دھوکا دینے والی باتیں سکھاتے تھے اور (بزعم خود) اس بات کی (بھی نقل کرتے ہیں) جو بابل میں

بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ

دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اتاری گئی تھی۔ حالانکہ وہ دونوں (تو) جب تک یہ نہ کہہ لیتے تھے کہ ہم

حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ

(خدا تعالیٰ کی طرف سے) آزمائش کے طور پر (مقرر ہوئے) ہیں۔ اس لئے (اے مخاطب! ہمارے احکام کا) انکار نہ کر کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے

مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ

جس پر وہ (یعنی اس زمانہ کے لوگ) اُن (دونوں) سے وہ بات سیکھتے تھے جس کے ذریعہ وہ مرد اور اسکی بیوی کے درمیان تفریق کر دیتے تھے اور وہ

بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

اللہ کے حکم کے سوا کسی کو بھی اس (بات) کے ذریعہ سے ضرر نہیں پہنچاتے تھے۔ اور (اس کے بالمقابل) یہ (یعنی رسول کریم صلعم کے دشمن)

مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا

تو وہ بات سیکھ رہے ہیں جو انہیں ضرر دیگی اور نفع نہیں دیگی۔ اور یہ لوگ یقیناً جان چکے ہیں کہ جو اس (طریق) کو

جو خدا تعالیٰ نے ان کتابوں میں بیان فرمائی تھیں جو یہود کے پاس ہیں۔ گویا اس رسول کے ذریعہ اسرائیلی نبیوں کی صداقت واضح ہو رہی ہے۔ پس اس رسول پر ایمان لانا درحقیقت اُن کا اپنے سابق الہامی کلام کی تصدیق کرنا اور اُس کے حکموں کی تعمیل کرنا ہے۔ اور اگر یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے تو یہ اپنی کتاب اور اپنے نبیوں کی پیشگوئیوں کو جھٹلاتے ہیں۔ غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مُصدِّق ہیں موسیٰؑ کے۔ مُصدِّق ہیں تورات کے مُصدِّق ہیں تمام اسرائیلی نبیوں کے مگر ان معنوں میں نہیں کہ تورات اپنی موجودہ حالت میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں پر ایمان لانا ہی کافی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں بلکہ وہ صرف ان معنوں میں مُصدِّق ہیں کہ آپ نے اپنی بعثت سے اُن کی پیشگوئیوں کو سچا ثابت کر دیا اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دیگر اسرائیلی نبیوں کی سچائی ظاہر ہو گئی۔ اب یہ ان لوگوں کا کام ہے کہ وہ اپنی کتاب کی لاج رکھتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں یا اسے رد کر دیں۔ مگر جیسا کہ آیت کے اگلے ٹکڑہ میں بیان کیا گیا ہے یہود نے ان پیشگوئیوں سے کوئی فائدہ نہ اُٹھایا اور انہوں نے کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا۔

اس جگہ کِتٰبَ اللّٰهِ سے مراد تورات ہے اور اسے اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دینے سے یہ مراد ہے کہ وہ

لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۛ وَ

اختیار کرے آخرت میں اس کا کوئی بھی حصہ نہیں اور وہ چیز جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے

لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

بہت ہی بُری ہے - کاش کہ یہ جانتے - ۲۰؎

اس کے ساتھ ایسی تذلیل کے ساتھ پیش آتے ہیں کہ گویا وہ اسے اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا انہیں ادب کرنا چاہیئے تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب تو الگ رہی نبیوں کے کلام کی تحقیر بھی انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسریٰ کو جو تبلیغی خط لکھا تھا وہ اُس نے اپنی بیوقوفی سے پھاڑ ڈالا تھا۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہُوا تو آپ نے فرمایا:- اس نے ہمارا خط پھاڑا ہے خدا اس کی سلطنت کو تباہ کرے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک خط کو پھاڑ کر انسان اتنی سزا کا مستحق ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینکنے والا اور اُس کی تذلیل کرنے والا کتنی سزا کا مستحق ہوگا۔ جب اللہ تعالےٰ اپنے رسول کا خط پھاڑنے والے کو تباہ کر دیتا ہے تو وہ اپنے خط کی تذلیل کس طرح برداشت کر سکتا ہے۔

عَلٰی

مُلْكٌ

تَتْلُوْا

۲۰؎ حل لغات:- تَتْلُوْا: تَلَا سے مضارع واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ تَلَا ماضی کا صیغہ ہے۔ جو مختلف معنوں میں آتا ہے۔ جن میں سے ایک معنے پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس میں تَلَوْتُهٗ تُلُوًّا کے معنے لکھے ہیں تَبِعْتُهٗ میں نے اُس کی پیروی کی۔ اور لکھا ہے وَ ذَالِكَ يَكُوْنُ بِالْجِسْمِ وَتَارَةً بِالْاِقْتِدَاءِ فِي الْحُكْمِ۔ یہ اقتداء ظاہری رنگ میں بھی ہو سکتی ہے۔ اور اقتداء فی الحکم کے رنگ میں بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہری اتباع کے معنی میں اس کا استعمال قرآن کریم میں بھی آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (الشمس: ۳) ہم چاند کو شہادت کے طور پر پیش کرتے ہیں جبکہ وہ سورج کے پیچھے آتا ہے۔ اور معنوی پیروی کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے کہ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (بقرہ ۱۴ع آیت ۱۲۲) یعنی وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی اسی طرح پیروی کرتے ہیں جس طرح اس کی پیروی کرنی چاہیئے۔ گویا وہ اتباع کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

عَلٰی اَور معنوں کے علاوہ فِيْ کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی آیت اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ میں عَلٰی بمعنٰی فِيْ ہی استعمال ہُوا ہے۔ (مغنی اللبیب جلد اوّل ص۱۱۱)

مُلْكٌ کے (۱)- ایک معنے اَلْعَظَمَةُ وَالسُّلْطَانُ کے ہیں۔ یعنی غلبہ اور دبدبہ (۲) اس کے دوسرے معنی ہیں اِحْتِوَاءُ الشَّيْءِ وَ الْقُدْرَةُ عَلَى الْاِسْتِبْدَادِ بِهٖ یعنی کسی چیز پر کسی شخص کا قبضہ کر لینا۔ اس پر حاوی ہو جانا اور اس کو اپنے منشا کے مطابق کر لینا (لسان العرب) یہ معنے بھی دبدبہ کا ہی مفہوم رکھتے ہیں (۳) اس کے تیسرے معنے مُلک کے بھی ہیں جو عام مروّج ہیں۔

سِحْر: اس کے عربی میں کئی معنے ہیں۔ اوّل کُلُّ مَا لَطُفَ مَاْخَذُہٗ وَدَقَّ۔ ہر وہ بات جس کا ماخذ نہایت باریک اور دقیق ہو۔ اور جس کی اصلیت معلوم نہ ہو سکے سحر کہلاتی ہے۔ دوم فساد۔ سوم اِخْرَاجُ الْبَاطِلِ فِیْ صُوْرَۃِ الْحَقِّ۔ باطل کو سچائی کی صورت میں پیش کرنا۔ چہارم خِدَاعٌ یعنی دھوکا۔ پنجم طمع سازی ششم راستہ سے ہٹا دینا۔ چنانچہ سَحَرَہٗ کے معنے ہوتے ہیں صَرَفَہٗ اُسے ایک طرف کر دیا۔ (اقرب الموارد)

مَلَکَیْنِ: مَلَائِکَہ کے اصل معنے فرشتہ کے ہیں۔ لیکن مجازاً ملک کا لفظ نیک انسانوں پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس کی ایک قرأت مَلِکَیْنِ بھی آئی ہے (بحر محیط) اور قرأت صحیح معنوں کی مفسّر ہوتی ہے اسلئے یہ دوسری قرأت اس کے صحیح معنوں کو حل کر دیتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ اسجگہ دو فرشتے مراد نہیں بلکہ دو فرشتہ خصلت بزرگ مراد ہیں جن کو انکی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے مَلَک قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ مَلَک کا لفظ استعارۃً اچھے اور نیک انسان پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت آتا ہے کہ اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ (یوسف:۳۲) یعنی یہ تو ایک معزز فرشتہ ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ بڑا بزرگ اور خوبیوں والا انسان ہے۔ مَلَک کے اس استعمال کو مدنظر رکھ کر مَلَکَیْن کے معنے یہ ہوئے کہ دو نہایت اچھے شریف اور فرشتہ خصلت بزرگ۔ اور یہی معنے اسجگہ چسپاں ہوتے ہیں۔ مَلَک سے مراد فرشتہ کی بجائے انسان ہم اسلئے بھی سمجھتے ہیں کہ اسجگہ ان دونوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ وہ لوگوں سے ملتے تھے اور انہیں اہم باتیں سکھاتے تھے۔ اور قرآن کریم سے ظاہر ہے کہ ملائکہ انسانوں کی طرف اس طرح نہیں بھیجے جاتے کہ وہ انسانوں میں مل جل کر رہیں اور انہیں پڑھائیں اور سکھائیں۔

سِحْر

بلکہ ہمیشہ انسان رسول ہی لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَھُمُ الْھُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ع آیت ۹۵) یعنی لوگوں کو ہدایت کے قبول کرنے سے سوائے اس بات کے اور کسی چیز نے نہیں روکا کہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر کوئی نبی آنا تھا تو کیا آدمیوں میں سے ہی آتا؟ فرماتا ہے۔

مَلَکَیْنِ

تو انہیں جواب میں کہدے کہ لَوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْھِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل آیت ۹۶) اگر زمین میں آدمیوں کی بجائے فرشتے ہوتے جو اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم بے شک کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر بھیج دیتے۔ مگر چونکہ دنیا میں آدمی بستے ہیں اس لئے ہم بھی آدمیوں ہی کو نبی بنا کر بھیجتے ہیں۔ غرض چونکہ خدا تعالیٰ نے یہ فرما دیا ہے کہ ہمیشہ آدمی ہی رسول بن کر آتے ہیں اس لئے اسجگہ بھی انسان ہی مراد ہو سکتے ہیں فرشتے نہیں۔

پھر ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ بطور واقعہ کے فرماتا ہے کہ جس قدر رسول دنیا میں گذرے ہیں وہ سب انسان ہی تھے۔ جیسا کہ فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْھِمْ فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (انبیاء ع آیت) یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھ سے پہلے جتنے رسول بھیجے تھے وہ سب کے سب انسان تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے اور اگر تم کو اس بات کا علم نہیں تو تم ان قوموں سے جن کے پاس کلام الٰہی ہے پوچھو کہ دنیا میں انسان نبی ہو کر آتے تھے یا فرشتے؟ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت سے بتا دیا ہے کہ

دنیا میں کبھی بھی آزمائش یا ہدایت کے لئے مَلَک رسول نہیں آئے
بلکہ ہمیشہ مرد رسول آتے رہے ہیں۔ اور فرشتے صرف انبیاء و
اولیاء پر کلام الٰہی لے کر نازل ہوتے ہیں یا شاذ و نادر کے
طور پر بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشفی طور پر نظر آجاتے ہیں
اور چونکہ اس آیت میں بتایا ہے کہ وہ دونوں مَلَک دنیا
میں رہتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اس لئے اس جگہ
مَلَکَیْنِ سے دو فرشتے نہیں بلکہ دو فرشتہ خصلت بزرگ
مراد ہیں جو اپنی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے يَفْعَلُوْنَ مَا
يُؤْمَرُوْنَ میں شامل تھے یعنی انہیں جو بھی حکم دیا جاتا
اُس پر وہ چلتے تھے۔ اور اُس کی کسی حالت میں بھی خلاف
ورزی نہیں کرتے تھے۔ اور چونکہ ملائکہ کی بھی یہی صفت
ہے۔ اس لئے ان کا نام بھی مَلَک رکھا گیا۔

پھر اس کی ایک قرأت جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے
مَلِکَیْنِ بھی آئی ہے۔ اس سے بھی ان معنوں کی تصدیق
ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ
ھَارُوْت و مَارُوْت دو فرشتے تھے جنہوں نے بابل میں آکر
لوگوں کو سحر سکھلایا اور اُن کے ایمان کی آزمائش کی وہ
قرآن کریم کے مطالب سے آگاہ نہیں۔ ورنہ جب دنیا
میں فرشتے نہیں بستے تو فرشتے رسول بن کر کیوں آئیں
پس یہ قطعی طور پر محال ہے کہ بجائے انسان کے فرشتے
لوگوں کی ہدایت کے لئے آیا کریں۔ تاریخ پڑھ کر دیکھ لو
ہمیشہ رَجُل ہی نبی بن کر آیا ہے۔ نہ کبھی عورت نبی بنی
ہے اور نہ ہی کبھی کوئی غیر انسان نبی ہو کر آیا ہے۔

پس یا تو اس کے یہ معنے کرنے پڑیں گے کہ ھَارُوْت
و مَارُوْت دونوں ملکوتی صفات انسان تھے جیسے حضرت
یوسف علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ
كَرِيْمٌ۔ اور یا یہ ماننا پڑیگا کہ اگر وہ واقعی فرشتے تھے
تو وہ دو نبیوں پر اُترے تھے نہ کہ عام لوگوں کی طرف
مبعوث ہوئے تھے کیونکہ جیسا کہ قرآن کریم کی آیت
لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ
(بنی اسرائیل ع) سے ظاہر ہے فرشتے مُطْمَئِنِّيْنَ کی طرف
آیا کرتے ہیں یعنی ان لوگوں کی طرف جو نیک اور پاک
اور خدا رسیدہ ہوں۔ بدیوں سے کلّی طور پر اجتناب
کرنے والے ہوں۔ ہر قسم کے رزائل سے محفوظ ہوں اور
الٰہی انعامات اور برکات کے مورد ہوں۔ مُطْمَئِنِّيْنَ کی
یہ وہ تعریف ہے جو قرآن کریم نے اس آیت میں بیان کی ہے
يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ
رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ
جَنَّتِيْ (سورۃ فجر آیت ۲۸ و ۲۹) پس مطمئنین سے مراد وہ
لوگ ہیں جو نفس مطمئنہ رکھنے والے ہوں۔ یہ مراد نہیں
کہ اطمینان سے زمین میں کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہوں۔
اور بُرائیوں سے اجتناب کرتے ہوں۔ اور درحقیقت ایسے
ہی لوگوں پر ملائکہ کلام الٰہی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ یہ کبھی
نہیں ہوا کہ کفار پر ملائکہ نازل ہوئے ہوں اور انہیں
اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچائے گئے ہوں۔

ھَارُوْتَ

ھَارُوْت: ھَرَت سے نکلا ہے اور ھَرَت کے
معنے ہیں پھاڑنا۔ پس ھَارُوْت کے معنے ہیں بہت
پھاڑنے والا۔

مَارُوْتَ

مَارُوْت: مَرَت سے نکلا ہے جس کے معنے
توڑنے کے ہیں۔ پس مَارُوْت کے معنے ہیں بہت توڑنے والا۔

فِتْنَةٌ

فِتْنَةٌ: وہ آزمائش جس کے ذریعہ سے کسی انسان
کی خوبی یا بُرائی معلوم کی جائے۔ اور بھلے بُرے کو پرکھا جائے۔
اور خیر و شر کا پتہ لگایا جائے۔ جیسے امتحان کے ذریعہ
انسان کی خوبی یا نقص کو ظاہر کر دیا جاتا ہے۔

تفسیر:۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام
مئی ۱۹۰۸ء میں فوت ہوئے تھے۔ غالباً آپ کی وفات
کے ایک ماہ بعد کی بات ہے کہ مجھے الہام ہوا:۔
اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ اے داؤد کی نسل

شکر گذاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور اعمال بجا لاؤ۔ اِس الہام میں اللہ تعالیٰ نے لفظ سلیمان تو استعمال نہیں فرمایا مگر آلِ داؤد کہکر حضرت سلیمانؑ کی بعض خصوصیات کا مجھ کو ▪▪ دیا گیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں اُن باتوں میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت جو ہمیشہ لوگوں کے لئے اضطراب کا موجب رہی ہے مجھ پر ابتدائی زمانہ ہی میں کھول دی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس میں یہ بھی پیشگوئی تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلافت کے مقام پر مجھ کو کھڑا کیا جائیگا اور ان مشکلات کا بھی اس میں ذکر تھا جو میرے راستہ میں آنیوالی تھیں۔ چونکہ انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ تکالیف اور اعتراضات سے گھبراتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا کہ تکالیف اور اعتراضات کوئی نئی چیز نہیں ہیں بلکہ آلِ داؤد ہونے کے لحاظ سے تمہیں ان کا منتظر رہنا چاہیئے۔ اور ان سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ آیت زیرِ تفسیر میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی بعض اُن مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے جو اُن کو پیش آئیں۔ گو یہ آیت ہمارے نزدیک واضح ہے لیکن اس کے متعلق پہلے مفسرین کو بہت دقتیں پیش آئی ہیں۔ اور آخر وہ اس کے یہ معنے کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ دنیا میں دو دفعہ سحر سکھایا گیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان آدمیوں میں رل مِل گئے تھے اور وہ اُن کو سحر سکھایا کرتے تھے اور دوسری دفعہ بابل میں دو فرشتے ھاروت اور ماروت خدا تعالیٰ کی طرف سے اُترے تھے اور وہ لوگوں کو سحر سکھاتے تھے۔ مگر وہ لوگوں کو یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے آزمائش کیلئے بھیجا ہے اسی طرح جو لوگ اُن سے سحر سیکھنا چاہتے تھے اُن کو وہ یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ سحر سیکھنا کفر ہے لیکن اگر تم کفر کرنا چاہتے ہو تو ہم تم کو کفر سکھا دیتے ہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اسجگہ ان دونوں واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عوام میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہیں ہم بچپن میں وہ کہانیاں سُنا کرتے تو بڑے حیران ہوتے تھے اب تو شاید ہی کبھی احمدی بچوں کے کانوں میں وہ کہانیاں پڑتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی برکت سے ▪▪ سارے کام کیا کرتے تھے۔ اُسی کو خاتمِ سلیمانی کہتے ہیں۔ وہ انگوٹھی شیطانوں نے کسی بہانے سے حضرت سلیمان علیہ السلام سے لے لی جس کی وجہ سے سالہا سال تک حضرت سلیمان علیہ السلام بھٹکتے پھرے اور شیطان اُن کی صورت بن کر لوگوں پر حکومت کرتا رہا۔ ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ انگوٹھی ایک شخص کو ملی اور اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دی جس کی وجہ سے انہیں دوبارہ بادشاہت نصیب ہوئی۔

اِسی طرح ھاروت و ماروت کے متعلق بھی عوام میں یہ قصہ مشہور ہے کہ وہ دو فرشتے تھے جنہوں نے خدا تعالیٰ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آدمؑ والے قصہ میں فرشتوں والی بات درست نکلی کہ انہوں نے کہا تھا کہ کیا تُو ایسی مخلوق بنائیگا جو زمین میں فساد کریگی اور خون بہائیگی۔ اور خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ تم نہیں جانتے۔ مگر آخر اُن کی بات درست نکلی کہ آدمؑ کی نسل دنیا میں شیطان کے قبضہ میں چلی گئی۔ اُن فرشتوں نے خدا تعالیٰ کو کہا کہ اگر ہم دنیا میں ہوتے تو یہ شرارتیں کیوں ہوتیں۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کو دنیا میں بھیج دیا۔ اور فرمایا کہ تم دنیا میں جاؤ ہم دیکھیں گے تم کیسے عمل کرتے ہو۔ ▪▪ دنیا میں آگئے اور لوگوں میں رہے۔ اُنکو اسمِ اعظم اور جادو آتا تھا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے رہے اور خدا تعالیٰ پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ لوگ جان بُوجھ کر کفر اختیار کرتے ہیں وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ اس کا سکھنا منع ہے اس سے انسان کافر ہو جاتا ہے اب جس کی مرضی ہے سیکھ لے اور جس کی مرضی ہے نہ سیکھے مگر لوگ پھر بھی سیکھ لیتے۔ وہ صرف مردوں کو سحر سکھایا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں عورتوں سے جُدائی ہو جاتی تھی۔ اِسی دوران میں زُہرہ نامی

ایک کنچنی اُن سے اسم اعظم سیکھنے کیلئے آئی۔ وہ دونوں اُس پر عاشق ہو گئے۔ چنانچہ اُن دونوں نے اُسے ایک دن شراب پلائی اور اُس کے ساتھ بدکاری میں مبتلا ہوئے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے اُن سے پُوچھا کہ اب بتاؤ اِس کی سزا میں تم دنیا میں کنوئیں میں لٹکنا چاہتے ہو یا قیامت کے دن تم کو سزا ملے چونکہ انہوں نے خدا کا عذاب دیکھا ہوا تھا اسلئے انہوں نے کہا کہ دنیا میں ہی ہمیں عذاب دیدیا جائے۔ چنانچہ بابل میں ایک اندھے کنوئیں میں گرائے گئے اور وہ اُس میں اب تک لٹکے ہوئے ہیں۔ اور زُہرہ جس نے اسم اعظم سیکھا تھا عوام کے نزدیک ستارہ بن کر آسمان پر چلی گئی۔ اُن کے نزدیک آسمان پر جو زہرہ ستارہ دکھائی دیتا ہے وہ وہی کنچنی ہے جو ہاروت ماروت کے پاس آئی تھی۔

کشمیریوں نے تو اس کے متعلق یہ ہی کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاروت و ماروت کا کنواں کشمیر میں ہے۔ گویا وہ بابل سے اُٹھ کر وہاں جا پہنچے تھے۔ اِن خرافات کو پیش کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فرشتوں نے جو اعتراض کیا تھا وہ درست نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے آدمؑ کو بھیجا۔ مگر اُس کی نسل خراب ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیجے۔ مگر وہ بھی انسانوں کی وجہ سے خراب ہو گئے۔ حالانکہ اُن کا یہ نتیجہ سراسر غلط ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ ملائکہ سب کے سب نیک ہوتے ہیں اور اُن میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا مادہ ہی نہیں پایا جاتا۔ لیکن انسانوں میں بعض نیک اور بعض بد ہوتے ہیں۔ اگر انسان خراب ہو گئے تھے تو اعتراض ہوتا ہے کہ آدمیوں کے مقابلہ میں فرشتے بھی خراب ثابت ہوئے۔ اس سے تو اعتراض دُور نہ ہوا بلکہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ خدا تعالیٰ نے جن کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ نہیں بگڑیں گے وہ بھی بگڑ گئے۔ انسانوں کے متعلق تو فرمایا تھا کہ اُن میں کچھ نیک، اور کچھ بد ہمیشہ رہیں گے مگر فرشتوں کے متعلق تو یہ کہا گیا تھا کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (تحریم آیت ۷) اُنکو جو حکم دیا جاتا ہے اُس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرتے بلکہ جو کچھ اُن کو کہا جاتا ہے وہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر اس قصہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ خدا تعالیٰ کے صریح احکام کی نافرمانیاں کرتے ہیں اور کنچنی اُن کے مقابلہ میں زُہرہ بن جاتی ہے۔ اور وہ سزا کے طور پر کنوئیں میں لٹکائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہم نے خود ان کو بابل کے کنوئیں میں لٹکے ہوئے دیکھا ہے۔ اور اُن کی زیارت کی ہے۔ مگر یہ سب خرافات اور واہیات قصے ہیں۔

میرے نزدیک یہ کہنا کہ دو فرشتے لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام بھی جادو جانتے تھے اور لوگوں کو سحر سکھاتے تھے بالکل غلط ہے۔ کیونکہ اس سے انبیاء اور ملائکہ دونوں پر اعتراض پڑتا ہے۔ اور پھر یہ بات تاریخ کے بھی بالکل خلاف ہے۔ اس قسم کا سحر کوئی ہے ہی نہیں۔ مسمریزم بالکل اور چیز ہے۔ مگر یہ اِدھر کچھ پھونکا اور اُدھر کوئی عجیب چیز بن گئی بالکل غلط بات ہے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

اصل بات یہ ہے کہ آیت زیر تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود کی بعض خفیہ سازشوں اور شرارتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ویسا ہی طریق کار اختیار کر رہے ہیں جیسے حضرت سلیمانؑ کے ایام حکومت میں اُن کے مخالف اُن کے خلاف کیا کرتے تھے اور جن کے ذریعہ سے وہ آپ کی حکومت کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ اور بتایا گیا ہے کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل پر ان سازشوں میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

اگر مفسرین کے بیان کردہ قصے درست ہوں جیسے کہ نادانوں نے چھوڑ دیئے ہیں تو اس کا جوڑ پچھلی آیات سے کوئی نہیں تھا۔ اور یہ آیت بے تعلق ہو جاتی ہے۔ لیکن میرے اس مضمون سے جو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کھولا ہے اس کا جوڑ

پچھلی آیات سے قائم رہتا ہے اور ملائکہ پر بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کے واقعات کے خلاف بھی کوئی بات نہیں رہتی۔ اور یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت بن جاتی ہے۔

میں بتا چکا ہوں کہ جو قصے اس آیت کے متعلق لوگوں میں مشہور ہیں وہ اوّل تو بے ثبوت ہیں۔ دوم وہ ایسے لغو ہیں کہ عقل اُن کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا قرآن کریم کی عبارتیں انکو رد کرتی ہیں۔ اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے معنے کیا ہیں اور اس لئے کہ لوگ آسانی سے اس کے معنے سمجھ سکیں میں وہ دماغی اور فکری عمل جو اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے طبعی طور پر کام کرتا ہے مدّنظر رکھونگا اور اس کے مطابق تشریح اور تفسیر کرونگا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تین وقت کے اعمال کا ذکر ہے۔ وہ عمل جو تینوں دفعہ ہؤا کوئی خفیہ بات یا سازش ہے۔ یہ عمل مندرجہ ذیل تین مواقع پر ہؤا ہے۔

اوّل۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں

دوم۔ بابل میں

سوم۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت اس کا وقوع وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ کے الفاظ سے ثابت ہے۔ اور بابل کے موقع کے لئے مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ کے الفاظ شاہد ہیں۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں اس کا صدور وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ سے ثابت ہے۔ بلکہ دوسری آیت وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ غرض آیت کے یہ تین حصے اس عمل کے تین دفعہ صادر ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

چوتھی بات اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ تینوں دفعہ اس عمل کا صدور یہود سے ہؤا تھا۔ یہ چار باتیں ہمارے معنوں کو محدود کر دیتی ہیں۔ پس وہی معنے صحیح ہونگے جو مذکورہ بالا چار باتیں اپنے اندر رکھتے ہوں۔ یعنی وہی معنے ان آیات کے مطابق ہو سکتے ہیں جو

(۱) ایسے عمل پر دلالت کرتے ہوں جو تین دفعہ صادر ہؤا ہو۔

(۲) جو کسی ایسے عمل پر دلالت کرتے ہوں جو خفیہ سازش یا خفیہ سوسائٹی کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں۔

(۳) جو ثابت کرتے ہوں کہ اُن کا ایک وقوع حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت۔ دوسرا بابل میں اور تیسرا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت ہؤا۔

(۴) جو معنے یہ بتائیں کہ تینوں واقعات یہود کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

پس جو معنے اس کے خلاف ہوں گے آیت ان کو ردّ کردیگی۔ اسی طرح جو معنے مفسرین نے بیان کئے ہیں لازماً اُن میں بھی ان چاروں پہلوؤں میں سے کوئی پہلو ضرور مفقود ہوگا یعنی

(۱) یا تو یہود کا اُن سے تعلق نہ ہوگا۔

(۲) یا وہ تین دفعہ نہ ہؤا ہوگا

(۳) یا ان تینوں موقعوں پر نہ ہؤا ہوگا۔

(۴) یا اس میں خفیہ سازش اور سوسائٹیوں کا ذکر نہ ہوگا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کونسی بات ہے جو ان چاروں اصول پر حاوی ہو۔ اور پھر تین زمانوں پر حاوی ہو اور انہیں زمانوں پر حاوی ہو جن کا اسجگہ ذکر ہے۔ ان چاروں اصول میں سے ایک اصل ہمیں واضح طور پر نظر آتا ہے جس پر ہم اپنی تحقیق کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور وہ یہ کہ [illegible] معنے ایسی خفیہ سازش اور سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جو مرد اور عورت کے درمیان تفریق پیدا کر دیتی تھی یعنی وہاں یہ شرط پائی جاتی تھی کہ اس میں صرف مرد ہی داخل ہو سکتے ہیں عورتیں نہیں۔ اس شرط سے ہمارے لئے تحقیقات میں بہت سی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی سوسائٹی ہے جو مرد و عورت میں جدائی ڈالتی ہو اور آیا اس کا تعلق ان زمانوں کے ساتھ ہے؟ سو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی سوسائٹی ہے جس میں مرد اور عورت میں تفریق پیدا کی جاتی ہے اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ تک نظر آتی ہے بلکہ آج سے پندرہ بیس سال پہلے تک بھی چلی آئی ہے۔ اور وہ فری میسنز کی سوسائٹی ہے۔ جو پنجاب میں جادو کی سوسائٹی کہلاتی ہے۔ یہ ایک خفیہ سوسائٹی ہے جس کا اصول یہ ہے کہ عورتیں اس کی ممبر نہیں ہو سکتیں فقط مرد ہی ممبر ہو سکتے ہیں۔ اس سے ہم اصل مضمون کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور ہم اس پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ سوسائٹی مخفی بھی ہے اور پھر مردوں ہی کو اپنے اندر داخل کرتی ہے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ موجودہ فری میسن سوسائٹی کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں اس میں صرف اُس فری میسن سوسائٹی کا ذکر ہے جس کا تعلق تین زمانوں سے ثابت ہو اور تاریخی واقعات سے بھی اُس کی تصدیق ہو۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی فری میسن سوسائٹی کا آج تک تسلسل قائم نہیں رہا۔ کوئی چار سو سال تک رہی کوئی پانچسو سال تک۔ کوئی بارھویں صدی میں مٹ گئی کوئی پندرھویں صدی میں۔ کوئی اٹھارویں صدی میں قائم ہوئی اور پھر اسی صدی میں مٹ گئی اور کوئی انیسویں صدی میں قائم ہوئی۔ پس ہم کسی ایک سوسائٹی کے اصول پر قطعی بنیاد نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ بہت سی سوسائٹیاں قائم ہوئیں اور انہوں نے پہلوں کی بعض باتیں لے لیں اور بعض ترک کر دیں۔

مگر ایک اصل میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایسی خفیہ سوسائٹی کا یہود سے تعلق ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان تینوں باتوں کا یہود سے ہی تعلق ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا فری میسن سوسائٹی کا یہود سے کوئی تعلق ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ جس میں یہودیوں کے متعلق فری میسنری Freemasonry کے ماتحت اِس بات کا ازالہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فری میسنوں کا یہود سے کوئی تعلق ہے۔ اسی سے اس بات کا واضح طور پر ثبوت ملتا ہے کہ یہود کا فری میسنو سے تعلق رہا ہے۔

اوّل تو انسان اسی مضمون سے سمجھ سکتا ہے کہ اُنکا اس سوسائٹی سے تعلق رہا ہے ورنہ انہیں جواب دینے کی کیا ضرورت تھی لیکن اسکے علاوہ خود اس مضمون سے بھی واضح ہے کہ یہود کا اس سوسائٹی سے تعلق رہا ہے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فری میسن سوسائٹیوں کے اُصولوں میں یہودی نشانات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بات سوسائٹی کا اُن سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ کیونکہ ان نشانات کا ابتدائی تعلق اُن انجنیئروں کے ساتھ ثابت ہے جن کا حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ معبد میں دخل تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس سوسائٹی کی علامات حضرت سلیمان علیہ السلام کے پہلے تیار کردہ معبد کے انجنیئروں کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہ سوسائٹی بھی تسلیم کرتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنا پہلا معبد بنایا۔ اُس وقت سے ہماری سوسائٹی کی ابتداء ہوئی۔ بلکہ بعض لوگ اس سے بھی اوپر جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت سے ہماری ابتداء ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ ہمارے گرینڈ ماسٹر ہیں۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ان کی روایات میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اُن کا

حورآم ابّی سے تعلق ہے جس نے مسجد بنائی تھی۔ اور جس کا ذکر ۲-سلاطین باب ۲ آیت ۱۲ و ۱۴ میں اِس طرح آتا ہے :-

" اور اب میں حورآم ابّی ایک ہوشیار شخص کو جو کہ امتیاز کرنا جانتا ہے بھیجتا ہوں وہ دآن کی بیٹیوں میں سے ایک عورت کا بیٹا ہے۔ پر اُس کا باپ صور کا ایک شخص ہے۔ وہ سونے اور روپے اور پیتل اور لوہے اور پتھر اور لکڑی اور ارغوانی اور آسمانی اور کتانی اور قرمزی اور ہر طرح کی نقاشی کا کام جانتا ہے۔ اور ہر ایک منصوبے کو جو اُس سے پوچھا جاوے اس کے ایجاد کرنے میں ماہر ہے۔ وہ تیرے ہنرمندوں اور میرے مخدوم تیرے باپ داؤد کے ہنرمندوں کے ساتھ سب کام بنا دے گا۔"

فری میسنوں کی روایات کے مطابق مسجد بننے کے بعد تین مزدوروں نے حورام ابّی کو قتل کر دیا تھا۔ اور فری میسنوں کی رسموں میں اس کی موت کو بڑا بھاری بھید قرار دیا جاتا ہے۔

مصنّف کہتا ہے کہ ہم اس کا حل یوں کر سکتے ہیں کہ ابّی لٹریچر میں جو روایات آتی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انجنیروں نے کام پورا کر لیا تو اُن کو اس وجہ سے قتل کروا دیا گیا کہ وہ مسجد کو بُت خانہ نہ بنا دیں اور اِس طرح اُس کی ہتک نہ ہو۔ اُن کی روایات میں یہ آتا ہے کہ حورآم حنوک کے پاس آسمان پر بیٹھا ہے۔ فری میسنوں کی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ باقی انجنیروں کو بھی قتل کروا دیا گیا تھا۔ مگر حورآم آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ مصنّف کہتا ہے کہ ہماری رائے ہے کہ باقی تاریخی کتب میں اس بات کا ذکر نہیں آتا۔

پھر وہ کہتا ہے کہ جو اصطلاحات و نشانات اور یہودی خیالات و روایات فری میسنوں میں پائی جاتی ہیں بالکل ممکن ہے کہ بغیر یہودیوں کے دخل کے خود انہوں نے بائیبل سے نقل کر لی ہوں۔ لیکن بہرحال بہت سی روایات یہود سے لی گئی ہیں۔ اور ان کے دوست فری میسنوں کی علامات میں وہ بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ دو عمود JACHIN اور BRAZE کو فری میسنوں کی علامات میں خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

فری میسن سوسائٹی کا یہود سے تعلق اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ سکاٹ لینڈ کی فری میسنز سوسائٹی میں جو قمری مہینے اور سال استعمال کئے جاتے ہیں وہ ابتدائی یہودی زمانہ کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر جیوش انسائیکلوپیڈیا کا مصنّف اس کے متعلق کہتا ہے کہ کیا پتہ ہے کہ وہ عیسائیوں کے ذریعہ سے اُن میں داخل ہو گئے ہوں۔ وہ ان اصطلاحات کی لسٹ دیتا ہے جو ان میں داخل ہیں۔ اور وہ تیس چالیس کے قریب ہیں۔ اسی طرح فری میسنوں کی جو اصطلاحات ہیں اُن میں حورآم کا بھی نام آتا ہے اور وہ ساری رسوم اور اصطلاحات یہودی ہیں۔ اور انسائیکلوپیڈیا میں اسے تسلیم کیا گیا ہے۔

فری میسنوں کی کتابوں میں یہ بھی روایت پائی جاتی ہے کہ اُن کا حضرت سلیمان علیہ السلام سے مقابلہ تھا۔ چنانچہ فری میسنوں کی ایک کتاب "دنیا کی خفیہ انجمنیں" ہے۔ اس کی جلد اوّل صفحہ ۱۰۱ میں لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت ان کا ایک انجنیر حورام تھا۔ اُس پر بلقیس عاشق ہو گئی تھی اور وہ بلقیس پر عاشق تھا سلیمانؑ کو حسد پیدا ہوا اور انہوں نے حورآم کے تین نائبوں کو جو اُس کے حاسد تھے اپنے ساتھ ملا کر اُسے قتل کروا دیا اور خود بلقیس سے جبراً نکاح کر لیا۔ اور یہ کہ اُسی وقت سے فری میسن چلے آ رہے ہیں۔ اور

اُن میں معماری کی علامات پائی جاتی ہیں۔ بلکہ فری میسنز ACCEPTED MASONS کے معنے ہی آزاد معمار کے ہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فری میسنز سوسائٹی سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں کا گہرا تعلق تھا۔ اور لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور فری میسنوں میں دشمنی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بھی روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت ایک خفیہ سوسائٹی تھی جو آپ کے خلاف کام کر رہی تھی اور ■■ ایک پُرانی روایت ہے جو قدیم فری میسنوں میں مشہور تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بلقیس سے قبل بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو حورام سے دشمنی تھی۔ وہ بڑا عقلمند اور ذہین تھا۔ اور اسے بڑا رسوخ حاصل تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی عقل اور ذہانت پر حسد تھا۔ انہوں نے ایک دفعہ اُسے خفیہ طور پر ہلاک کرنا چاہا اور اُسے اُبلتے ہوئے تیل کے تالاب میں گروا دیا لیکن اُس کے دادا قابیل کی رُوح نے اس کو وہاں سے نکال کر بچا لیا مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی خبر دے دی کہ آخر دشمن غالب آجائیگا۔ اسی کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے حاسدوں کو کچھ دے دلا کر تین انجنیئروں کو قتل کروا دیا۔ جن میں یہ بھی شامل تھا۔

اس کی نسبت یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے کچھ خفیہ علامات مقرر کی ہوئی تھیں۔ جو اُس نے خود وضع کی ہوئی تھیں اور جو اس کے اور اُس کے ساتھیوں کے درمیان بطور راز کے تھیں جن کے ذریعہ وہ فوراً اکٹھے ہو جاتے تھے (سیکرٹ سوسائٹیز آف دی ورلڈ جلد ۲ صفحہ تا صفحہ)

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایکسپٹڈ میسنز (Accepted Masons) کے طریق سے پہلے تمام فری میسنز سوسائٹیوں میں وہی علامات جاری تھیں جو حورام کے وقت جاری تھیں۔ اُن میں جو نئے لوگ داخل ہوتے اور ممبر بنتے تھے اُن کو کچھ خفیہ باتیں عمل کرنے کے لئے بتائی جاتی تھیں اور حورام کا واقعہ بھی اُن کو سُنایا جاتا تھا۔ (جلد دوم صفحہ) یہ بھی ذکر آتا ہے کہ جب کسی کو فری میسن بناتے تھے تو اُسے حورام کا قصہ کچھ زبانی سُنایا جاتا تھا اور کچھ ڈرامے کے طور پر دکھایا جاتا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں یہ ذکر ہے کہ حورام کا ذکر فری میسن کی علامات میں دوہرایا جاتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے یہ بھی کوشش کی کہ یہ پتہ لگ جائے کہ وہ علامات کیا ہیں۔ مگر وہ علامتیں اُس کے گلے میں بندھی ہوئی تھیں جب اسے حضرت سلیمانؑ نے قتل کیا۔ تو انہیں اتار کر پھینک دیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خفیہ انجمنیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت ہوتی تھیں اور وہ آپ کی دشمن تھیں اور آپ کے خلاف خفیہ سازشیں کیا کرتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اُن کے لیڈر کو مروا دیا تھا۔ اُس کے بعض متبع اُسے اتنا مقدس انسان سمجھتے تھے کہ وہ کہتے تھے کہ وہ مرا نہیں بلکہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا ہے۔ پس یہ لوگ یہودی تھے۔ ان میں یہود کی علامات اور یہودیم کا پایا جانا اور اُن کو حورام کی طرف منسوب کرنا اور حورام کا اُن کے نزدیک آسمان پر اُٹھایا جانا بتاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت یقیناً ایک خفیہ سوسائٹی تھی جس کا مقصد حضرت سلیمان علیہ السلام کو نقصان پہنچانا تھا۔

اس کے بعد ہم بائیبل کو دیکھتے ہیں تو اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ کچھ سوسائٹیاں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف تھیں گو اُن میں حورام کا نام نہیں آتا مگر بائیبل سے یہ پتہ ضرور لگتا ہے کہ یہود کو حضرت سلیمان علیہ السلام سے دشمنی تھی وہ انہیں کافر کہتے تھے اور اُن کی طرف

وہی بات منسوب کرتے تھے جس کا قرآن کریم کی اس آیت
میں ذکر آتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف خفیہ سازشوں
اور منصوبوں اور دھوکا دینے والے اشارات میں مخفی
کارروائیاں کرنے والے لوگوں کا جو ذکر قرآن کریم کی اس
آیت میں ہے اس کے متعلق ۱ سلاطین باب ۱۱ آیت ۳ و ۴
سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر
بُت پرستی کا الزام لگایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ
آپ مشرک ہوگئے ہیں اور توحید کو ترک کر دیا ہے
چنانچہ لکھا ہے :-

" اس کی سات سو جوروئیں بیگمات تھیں
اور تین سو حرمیں۔ اور اس کی جوروؤں نے
اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ
جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں
نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف
مائل کیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا
کی طرف کامل نہ تھا جیسا اس کے باپ
داؤد کا دل تھا۔"

اسی طرح ۱ سلاطین باب ۱۱ آیت ۹ و ۱۰
میں لکھا ہے :-

" اور خداوند سلیمان سے ناراض ہوا
کیونکہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا
سے پھر گیا تھا جس نے اسے دوبار دکھائی
دے کر اس کو اس بات کا حکم کیا تھا
کہ وہ غیر معبودوں کی پیروی نہ کرے
پر اس نے وہ بات نہ مانی جس کا حکم
خداوند نے دیا تھا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی حضرت سلیمان
علیہ السلام کو کافر کہتے تھے اور آپ کی نسبت بُت پرستی
کا الزام لگایا جاتا تھا اور لوگوں میں اُسے پھیلایا
جاتا تھا۔ عَلٰی مُلْكِ سُلَيْمٰنَ کے الفاظ سے بھی معلوم
ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کو کافر کہنے کا عام رواج تھا۔

دوسری بات جس کا وہاں سے پتہ لگتا ہے یہ ہے
کہ جو لوگ بظاہر ان کے ماتحت تھے وہی آپ کے خلاف
فساد کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چونکہ بقول
بائیبل مشرک ہوگئے تھے اس لئے خدا نے اُن کے تین
دشمن کھڑے کر دیئے تھے۔

اوّل - ادومی ہُدَد
دوم - الیدع کا بیٹا رزون دمشق کا بادشاہ۔
سوم - یربعام جسے اخیاہ نبی نے سلیمانؑ کی
مخالفت پر ابھارا۔

چنانچہ ۱ سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۴ و ۲۳ و ۲۶
میں لکھا ہے :-

" سو خدا نے ادومی ہُدَد کو اُبھارا کہ
سلیمان کا دشمن ہو۔"

ہُدَد ادومی بادشاہوں کی نسل میں سے تھا اور
حضرت داؤدؑ کے وقت مصر بھاگ گیا تھا مگر سلیمانؑ کے
تخت نشین ہونے پر پھر واپس آگیا اور اس نے آپ
کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔

پھر لکھا ہے :-

" اور خدا نے الیدع کے بیٹے رزون
کو بھی اُبھارا کہ سلیمان کا مخالف ہو۔
..... اور اس نے اپنے پاس لوگ جمع کر لئے
اور جب داؤد نے ضوباہ والوں کو قتل کیا
تو وہ ایک فوج کا سردار ہو گیا۔ اور
وہ دمشق جاکر وہیں رہنے اور دمشق میں
سلطنت کرنے لگے۔"

" اور صریدہ کے افرائیمی نباط کا بیٹا

یربعام جو سلیمان کا ملازم تھا اور جس کی ماں کا نام جو بیوہ تھی صردعہ تھا اُس نے بھی بادشاہ کے خلاف اپنا ہاتھ اٹھایا۔"

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ آپ کے خلاف کئی اندرونی دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی طرف سے آپ کے خلاف خفیہ سازشیں بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ ۲۔ تاریخ باب ۱۰ آیت ۲ تا ۴ میں لکھا ہے:۔

"اور ایسا ہوا کہ جب نباط کے بیٹے یربعام نے جو مصر میں تھا کہ وہاں سلیمان بادشاہ کے آگے سے نکل بھاگا تھا یہ سُنا تو یربعام مصر سے پھر آیا اور لوگوں نے بھیج کر اُسے بلایا۔ سو یربعام اور سارے اسرائیلی آئے اور رحبعام سے ہمکلام ہوئے اور بولے کہ تیرے باپ نے ہم پر بھاری جُوا رکھا۔ سو اب تو اس سنگین خدمت کو اور اس بھاری جوئے کو جو تیرے باپ نے ہم پر رکھا کچھ ہلکا کر تو ہم تیری خدمت کریں گے۔"

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات کے ساتھ ہی بنی اسرائیل نے آپ کے خطرناک دشمن یربعام کو مصر سے بُلا بھیجا اور آپ کے بیٹے کے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی اس سے بعض مطالبات منظور کروانے چاہے اور اپنی اطاعت کو اُن مطالبات کی منظوری کے ساتھ مشروط قرار دیا۔

بائبل سے ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اُن میں خفیہ علامتیں بھی مقرر تھیں۔ چنانچہ ۱۔ سلاطین باب ۱۱ آیت ۲۹ تا ۳۲ میں لکھا ہے:۔

"اور ایسا ہوا کہ یربعام ایک بار یروشلم سے باہر گیا۔ اس وقت سیلانی اخیاہ نبی نے اُسے راہ میں پایا۔ اور وہ ایک نئی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ یہ دونوں میدان میں اکیلے تھے۔ سو اخیاہ نے اُس نئی چادر کو جو اس پر تھی۔ پکڑ کے پھاڑا اور بارہ ٹکڑے کئے۔ اور یربعام کو کہا کہ دس ٹکڑے تو لے کہ خداوند اسرائیل کا خدا یُوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں سلیمان کے ہاتھ سے سلطنت چاک کر لونگا اور دس فرقے تجھے دونگا۔ مگر ایک فرقہ میرے بندے داؤد کی خاطر اور یروشلم کے لئے ہاں اس شہر کے لئے جسے مَیں نے بنی اسرائیل کے سارے فرقوں کے شہروں میں سے چُن لیا ہے اُسے دیا جائیگا۔"

اِس حوالہ میں خدا تعالیٰ کا نام تو معلوم ہوتا ہے یہود بعد میں لے آئے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یربعام ایک دلیر آدمی تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ باڈی گارڈ کا افسر تھا اور حاجب کا عہدہ رکھتا تھا۔ اس لئے ایسے شخص کو ساتھ ملایا گیا۔ اور تصویری زبان میں بات کرنا اُس میلان کو ظاہر کرتا ہے جو فری میسنوں کی طرف ان لوگوں میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے چادر کے بارہ ٹکڑے کئے گئے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے بارہ فرقے تھے اور دس ٹکڑے یربعام کو دیئے گئے۔ اُسے دس ٹکڑے دینے کا مطلب یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی دس قومیں تیرے ساتھ ہیں تم حضرت سلیمانؑ کے خلاف بغاوت کر دو۔ چنانچہ اُس کے فوراً بعد بغاوت ہو گئی۔ اور اُن دس فرقوں نے اُسے اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اور

قرآن کریم کے بیان کے مطابق یا تو حضرت سلیمان علیہ السلام پر کفر کا الزام لگایا جاتا تھا یا پھر یربعام نے سلطنت سنبھالتے ہی مختلف بتوں کے لئے مندر بنوانے شروع کر دیئے۔ اور شرک میں مبتلا ہو گیا۔ چنانچہ ۲ تواریخ باب ۱۱ آیت ۱۵ میں اس کے متعلق یوں لکھا ہے :-

"اور اُس نے اپنے واسطے اونچے مکانوں کے اور شیاطین کے اور اُن بچھڑوں کے لئے جو اُس نے بنائے تھے کاہنوں کو مقرر کیا۔"

اِن حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں لوگ تصویری زبان میں باتیں کیا کرتے تھے اور ان کو یہ سبق دیا گیا تھا کہ تم اشارات میں اپنا کام کرو تا کہ سلیمانؑ کو اس کا پتہ نہ لگے۔ غرض لالچ دینا عہدوں پر مقرر کرنا۔ رشوت دینا۔ خفیہ سازشیں کرنا اور اشاروں میں باتیں کرنا ان کا کام تھا۔

غرض وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ کی آیات میں اُن ساری سازشوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف کرتے تھے۔ اور بتایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود بھی ویسی ہی شرارتیں کر رہے ہیں۔ لیکن وہ اپنی سازشوں میں ناکام رہیں گے۔

دوسرا موقع قرآن کریم نے بابل کا بیان کیا ہے اُس وقت بھی بنی اسرائیل نے خفیہ سوسائٹیوں سے کام لیا تھا۔ لیکن اُس وقت اُن کے سردار اور لیڈر خدا تعالیٰ کے دو نبی تھے جو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُن کی رہائی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ اور اُن کا کام بنی اسرائیل کے دشمنوں کو توڑنا اور پھاڑنا تھا۔ یہ جن لوگوں کو اس مقصد کے لئے اپنے ساتھ ملاتے تھے۔ انہیں کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہم خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش اور امتحان ہیں۔ ہمارے ذریعہ سے نیکوں اور بدوں میں فرق کیا جائیگا اِس لئے ہماری بات کا انکار نہ کرنا کہ یہ کفر ہے۔ اور وہ اپنے اس ارادہ اور سکیم سے عورتوں کو آگاہ نہ کرتے تھے اور نہ اُن کو اپنے ساتھ ملاتے تھے یہ ایک قدیم رسم ہے جو اکثر خفیہ سوسائٹیوں میں چلی آتی ہے کہ وہ عورتوں کو اپنے اندر شامل نہیں کرتیں۔ بنی اسرائیل اور اُن کے دو نبی جن کا نام اِس آیت میں ہاروت و ماروت رکھا گیا ہے اپنی اِن خفیہ تدابیر سے صرف ان لوگوں کو نقصان پہنچاتے تھے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا تھا کہ ان کے خلاف کوشش کرو اور انہیں نقصان پہنچاؤ۔ پس اب دوسری بات یہ رہ جاتی ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ بابل میں کیا واقعہ ہُوا تھا؟

بابل کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے چند سو سال بعد بابل کا بادشاہ بخت نصر یہودیوں کو یروشلم سے پکڑ کر اور انہیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ بارہ قبیلے تھے جن میں سے دس کو وہ قید کر کے لے گیا اور دو کو چھوڑ گیا (یہ دس قبیلے پھیل کر کشمیر وغیرہ کی طرف آگئے) بنی اسرائیل کے جلاوطن ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یرمیاہ نبی نے یہ خبر دی تھی کہ اگر تم سبت کا احترام نہ کرو گے تو تم پر تباہی آجائے گی۔ چنانچہ اُس کی وجہ سے وہ قید ہو کر بابل میں چلے گئے۔ بابل میں اُن کو رہتے ہوئے عرصہ گذر گیا مگر اُن کو نجات نہ ملی۔ آخر انبیاء بنی اسرائیل کے ذریعہ یہ پیشگوئیاں ہوئیں کہ وہ واپس اپنے مرکز میں لے جائے جائیں گے۔ چنانچہ ان پیشگوئیوں کے مطابق ستر سال کے بعد میڈیا اور فارس کا ایک بادشاہ بنا جسے خورس اور انگریزی میں سائرس کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان کئے کہ اُس کی بابل کے بادشاہ کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔ چونکہ یہ بادشاہ

طاقت پکڑ رہا تھا اس لئے بابل اور دوسری حکومتوں نے اُس پر
حملہ کرنا چاہا - مگر یہ اُن سے زیادہ دانا نکلا - اُس نے اُن کو
ایک ایک کرکے مارنا شروع کر دیا - اور بابل پر بھی حملہ کر
دیا - ھاروت و ماروت جو دو نبی تھے انہوں نے اُس کے ساتھ
یہ معاہدہ کیا کہ وہ باہر سے حملہ کرے تو یہود اندر سے اُس
کی مدد کریں گے - اور اُس نے اُن کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ
بابل فتح ہونے پر انہیں واپس یروشلم جانے کی اجازت
ہوگی - بلکہ میں تمہیں معبد کی تعمیر کے لئے بہت کچھ مدد
بھی دونگا - چنانچہ اُس نے بابل پر حملہ کیا اور اندر سے
یہود نے اُن کی مدد کی اور بابل فتح ہو گیا - اور انہیں
واپس اپنے وطن یروشلم جانے کی اجازت ملی - اور
عزرا نبی کے زمانہ میں یروشلم پھر آباد ہوا - اور خورس نے
اُن کو بہت سا سامان اپنے پاس سے دیا جس میں لکڑی
وغیرہ بھی تھی - چنانچہ ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ
جلد ۲ صفحہ ۱۲۶ میں یہ ذکر پایا جاتا ہے کہ یہود نے
خورس سے خفیہ معاہدہ کیا تھا اور اُس کے حملہ آور ہونے
پر اندر سے اُس کی مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ بابل
پر قابض ہو گیا اور اُس کی مدد سے یہود بابل کی قید سے
رہا ہو کر واپس اپنے وطن چلے گئے -

ھاروت و ماروت جن کا اس جگہ ذکر آتا ہے یہ
دو نبی ہیں جو جلا وطنی کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو واپس
لانے پر مقرر ہوئے تھے - اور جنہوں نے مید اور فارس
کے بادشاہ کی مدد سے آزادی حاصل کی - قرآن کریم نے
ان دونوں نبیوں کے صفاتی نام لئے ہیں - یعنی ہاروت
اور ماروت - ھاروت جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا
چکا ہے ھرت سے نکلا ہے جس کے معنے پھاڑنے کے
ہیں - اور ماروت مرت سے نکلا ہے جس کے معنے توڑنے
کے ہیں (تاج العروس) پس ھاروت اور ماروت کے معنے
ہوئے پھاڑنے اور توڑنے والے - چونکہ اُن نبیوں کے
سپرد بعض حکومتوں یا جماعتوں کو پھاڑنے اور اُنکی طاقت
کو توڑنے کا کام تھا اس لئے اُن کا یہ صفاتی نام رکھا گیا -
بائیبل پر غور کرنے سے اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ یہ حجّی نبی
اور ذکریاہ بن عِدّو ہیں - چنانچہ عزرا باب ۵ کے مطالعہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ حجّی اور ذکریاہ نبی نے ہی یہود کی
آزادی کے لئے کوششیں کیں - اور خورس سے مخفی
سمجھوتہ کیا - اور اُس سے آرڈر لکھوائے - پس ھاروت
و ماروت حجّی اور ذکریاہ نبی ہیں جنہوں نے خورس سے سمجھوتہ
کیا اور اندر سے زور ڈالا جس کی وجہ سے باہر سے خورس
نے حملہ کیا - اور بابل فتح ہو گیا - ان سب واقعات کی
طرف اشارہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ
هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى
يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ
مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ
بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ میں کیا گیا ہے -

اب تیسری بات یہ رہ جاتی ہے کہ کیا رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہود نے کبھی ایسی سازشیں
کی تھیں یا نہیں ؟ اس غرض کے لئے جب تاریخ کا مطالعہ
کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تو یہود نے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کعب بن اشرف کو
بھڑکایا - اور اُس نے آپؐ کے خلاف تمام عرب میں مخالفت
کی ایک خطرناک آگ بھڑکا دی اور پھر اُس نے یہیں تک
بس نہ کی بلکہ اپنے اشعار میں اُس نے مسلمان خواتین کی
عزت و ناموس پر حملے کرنے شروع کر دیئے - یہاں تک کہ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کی مقدس
خواتین کو بھی اُس نے اپنے اوباشانہ حملوں کا نشانہ بنانے
سے دریغ نہ کیا - مگر اس تمام مخالفت کے باوجود جب
انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی حکومت روز بروز بڑھ رہی ہے
اور مسلمانوں کا قدم پیچھے نہیں ہٹتا بلکہ آگے ہی آگے بڑھتا

جاتا ہے تو انہوں نے بعض غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ مل کر اسلام کو مٹانے کی کوششیں شروع کردیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ عرصہ قبل یہود کا ایران کے بادشاہ کے ساتھ دوستانہ تعلق قائم ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہچنسن ہسٹری آف دی نیشنز اور انسائیکلوپیڈیا ببلیکا ص ۶۳۸ پر لکھا ہے کہ نصاریٰ کے ظلم سے تنگ آکر یہود کا فارس کے بادشاہ کی طرف خاص میلان ہوگیا تھا۔ اُس زمانہ میں دو ہی بڑی حکومتیں تھیں ایک مجوسیوں کی اور ایک مسیحیوں کی۔ مجوسیوں کی حکومت ایران میں تھی اور مسیحیوں کی روما میں۔ چونکہ ایرانیوں کو روما سے دشمنی تھی اور روما والے عیسائی تھے اور یہود کو بھی اُن سے عداوت تھی اور پھر اُن کے ملک میں اُنکو تکلیف بھی بہت تھی اس لئے صرف ایک ہی حکومت ایرانیوں کی رہ جاتی تھی جس پر اُن کو کچھ بھروسہ ہوسکتا تھا کہ وہ ان کی طرف توجہ کریگی۔ اور انہیں مدد دیگی۔ اِس لئے یہود کا ایرانیوں سے اور ایرانیوں کا یہود سے تعلق قائم ہوگیا۔ وہاں اُن کو رسوخ بھی حاصل تھا۔ کیونکہ اُس وقت کی مسیحی حکومتوں سے تنگ آکر وہ لوگ ایران چلے گئے تھے۔ اور اُن کے ماتحت رہتے تھے وہاں اُن کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہیں اُن کی طالمود تیار ہوئی تھی۔ اور وہیں اُن کے بڑے بڑے پادری رہتے تھے اور دربار میں اُن کو بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا خصوصاً جسٹینین (۵۲۷ء و ۵۶۷ء) کے وقت سے تو مسیحیوں کی طرف سے اُن پر بہت ہی مظالم شروع ہوگئے تھے اور سوائے ایران کے اور کوئی جائے پناہ اُن کے لئے نہ رہی تھی۔ اور اُن کا مذہبی مرکز بجائے یہودا یا یروشلم کے بیبلونیا ہوگیا تھا۔ (ہچنسن ہسٹری آف دی نیشنز)

HUTCHINSONS HISTORY OF THE NATIONS PAG 550

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تو یہ حالت تھی کہ یہود مسیحیوں سے بالکل تنگ آچکے تھے کیونکہ قیصر روم نے یہودیت کو مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ اور اس مقصد کیلئے وہ نہ صرف خود ہر قسم کا ظلم روا رکھتا تھا بلکہ یہودیوں سے جبراً تبدیلیٔ مذہب بھی کراتا۔ اور انہیں جلاوطن بھی کر دیتا پس آپ کے زمانہ میں اگر کسی حکومت پر یہودی اپنی مدد کا بھروسہ کر سکتے تھے تو وہ صرف حکومتِ فارس ہی تھی۔ جہاں اُن کے ہم مذہب بہت بارسوخ تھے اور انہیں شاہانِ ایران کے دربار میں خاص عزت کے مقام پر بٹھایا جاتا تھا۔ پس اگر یہ ثابت ہوجائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام کو مٹانے کے لئے کوئی سازش ہوئی تھی تو ماننا پڑے گا کہ وہ یہود کی سازش تھی۔ کیونکہ مشرکینِ عرب کا ایرانیوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اسلام کے خلاف یہودیوں کی طرف سے کوئی سازش ہوئی یا نہیں؟ سو تاریخ اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ ایران کے بادشاہ خسرو ثانی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گرفتاری کا حکم بھیجا تھا اُس نے اپنے یمن کے گورنر کے نام آرڈر لکھا کہ مجھے رپورٹ پہنچی ہے کہ عرب میں ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اُسے پکڑ کر ہمارے پاس بھجوا دو تاکہ اُسے سزا دی جائے۔ گورنر یمن نے اپنے دو سفیر آپ کی طرف بھیجے جنہوں نے آکر اطلاع دی کہ ہمیں آپ کی گرفتاری کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیں اور انکار نہ کریں ورنہ ممکن ہے کہ ایران کے بادشاہ کو غصہ آئے اور وہ عرب پر حملہ کر دے۔ آپ نے ان کو دوسرے دن ملنے کے لئے فرمایا۔ جب وہ دوسرے دن آپ سے ملے تو آپ نے فرمایا۔ کہ میرے خدا نے مجھے بتایا ہے کہ اُس نے آج رات

تمہارے خداوند کو قتل کر دیا ہے۔ انہوں نے نادانی سے
سمجھا کہ شاید یہ نہ جانے کیلئے بہانہ بنایا جا رہا ہے۔
اور کہا کہ ہم آپ کی خیر خواہی کے طور پر کہتے ہیں کہ آپ
ہمارے ساتھ چلیں ورنہ بادشاہ کو غصہ آئیگا۔ اور
ممکن ہے کہ وہ سارے عرب کو ہی تباہ کر دے۔ لیکن
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے میرے خدا نے
بتایا ہے کہ اُس نے آج رات تمہارے خداوند کو مار ڈالا
ہے۔ اس لئے جو کچھ میں نے تمہیں کہا ہے وہی اپنے گورنر
کو جا کر پیغام دیدو۔ انہوں نے واپس جا کر گورنر یمن
کو یہی بات کہہ دی۔ گورنر نے کہا۔ ہم چند دن انتظار
کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے
اگر یہ بات درست نکلی تو واقعی وہ سچا نبی ہے۔ ورنہ
عرب کی خیر نہیں۔ کسریٰ سارے عرب کو تباہ کر دے گا
چند دن کے بعد بندرگاہ پر ایک جہاز پہنچا اور اُس میں سے
ایک سفیر اُتر کر گورنر یمن کے پاس آیا۔ اور اُس نے گورنر
کو ایک شاہی مکتوب دیا جو سر بمہر تھا۔ مگر مہر کسی اور
بادشاہ کی معلوم ہوتی تھی۔ خط کو دیکھتے ہی اُس کا ماتھا
ٹھنکا۔ اور اُس نے کہا۔ عرب کے نبی کی بات سچ معلوم
ہوتی ہے۔ پھر اُس نے خط کھولا تو وہ خسرو کے بیٹے
شیرویہ کا خط تھا۔ جسے انگریزی میں سائروس STROES
کہتے ہیں۔ اس میں لکھا تھا کہ ہمارا باپ سخت ظالم تھا
آخر اس کے ظلموں سے تنگ آ کر ہم نے اُسے قتل کر دیا ہے
اور اَب میں اس کا جانشین ہوں۔ تم ہمارے نام پر
سب لوگوں سے اطاعت کا عہد لو اور یہ بھی یاد رکھو
کہ میرے باپ نے جو حکم عرب کے ایک مدعی نبوت کو
گرفتار کرنے کیلئے بھیجا تھا وہ بھی ظالمانہ حکم تھا۔ اُسے
بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ اور جب تک کوئی نیا حکم
نہ آئے اس کے متعلق کوئی کاروائی نہ کرو۔ (طبری جلد ۳
صفحہ ۱۵۸۳، ۱۵۸۴)

غرض اُسی رات جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو
الہاماً یہ خبر دی گئی تھی کہ کسریٰ کو خدا تعالیٰ نے ہلاک کر
دیا ہے خسرو کے بیٹے شیرویہ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا
اور بیٹے کا اپنے باپ کو مارنا خدا ہی کا مارنا ہے۔ ورنہ
یہ رشتہ ایسا ہے کہ کوئی اس کام کے لئے ہاتھ نہیں
اُٹھا سکتا۔

اِس واقعہ کے متعلق لوگوں کو حیرت ہے کہ اِس کی
وجوہات کیا تھیں؟ اور کیوں کسریٰ نے رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی گرفتاری کے احکام جاری کئے۔ مگر
یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ایران کا بادشاہ جس کا عرب کے ساتھ
کوئی تعلق نہ تھا اُسے بعض نے اُکسایا اور اُس نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گرفتاری کا حکم بھجوا دیا۔ یہ
بات ظاہر ہے کہ

(۱) ایرانیوں کے بادشاہ کو عیسائی تحریک نہ کر
سکتے تھے کیونکہ روما اور ایران کی آپس میں دشمنیاں تھیں

(۲) ایران کے بادشاہ کو عرب بھی تحریک نہیں کر سکتے
تھے۔ کیونکہ عرب بہت ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ
ایران کے بادشاہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں
جبکہ مسلمانوں کی فوجیں ایران پر حملہ آور ہوئیں کہا تھا
کہ تم دو دو اشرفیاں لے لو اور واپس اپنے ملک میں
چلے جاؤ۔ تم لوگ گوہ کھانے والے ہو تمہیں ملکوں سے
کیا واسطہ؟ پس ان کے نزدیک جب عرب ایسے ذلیل
تھے تو عربوں کو یہ جرأت ہی کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ
شاہ ایران کو بھڑکائیں۔ اور شاہِ ایران فوراً رسول کریم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گرفتاری کا آرڈر دیدے۔

پھر عرب لوگ بالکل پراگندہ تھے اور اُن کی کوئی
تنظیم نہ تھی۔ پس اگر کوئی یہ کہے کہ عربوں نے فارس کے
بادشاہ پر زور ڈالا تو یہ دُور از قیاس امر ہے۔ عرب
ایسے بے اثر اور متمدن دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے

لوگ اتنے بڑے بادشاہ پر جس کے ماتحت آدھی دنیا تھی اور جس سے وہ کچھ بھی تعلق نہ رکھتے تھے کس طرح زور ڈال سکتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایرانی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر یہودی لوگ فائز تھے۔ اور وہاں بڑا رسوخ رکھتے تھے۔ اُن کا رئیس شاہانِ ایران کے دربار میں خاص عزت کے مقام پر بٹھایا جاتا تھا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو اسلام اور بانیٔ اسلام کے شدید ترین دشمن تھے۔ جب یہ ہر طرف سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے مختلف ذرائع سے شاہ ایران کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف اکسانا شروع کر دیا جس کے نتیجہ میں اُس نے وہ چٹھی لکھی جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شاید شاہِ ایران کی اس کارروائی کا محرک رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وہ تبلیغی خط تھا جو آپؐ نے اُسے لکھا تھا۔ اس خط سے ناراض ہو کر اُس نے گورنر یمن کو حکم بھیجا کہ اس شخص نے ہماری گستاخی کی ہے اس لئے اسے گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر تاریخی شہادت سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ خط کی وجہ سے ہی اُسے طیش آیا تھا۔ تو پھر تو یہ بات ٹھیک ہو گی۔ لیکن اگر تاریخی شہادت اِسے درست قرار نہ دے تو ماننا پڑے گا کہ کوئی اور رپورٹیں اُسے پہنچائی گئی تھیں جن کی وجہ سے اُسے طیش آیا تھا۔

بعض مسلمان مؤرخین نے بے شک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی خط کو اس واقعہ کا محرّک بتایا ہے مگر یہ غلط ہے۔ وہ خط اس امر کا محرّک نہیں ہُوا بلکہ کسریٰ کے افسر آپؐ کے خط سے پہلے ہی آپؐ کی گرفتاری کے لئے آپؐ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چنانچہ زرقانی جلد ۲ صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲ پر لکھا ہے کہ لِاَنَّ بَعْثَہٗ لِلْمُلُوْکِ اِنَّمَا کَانَ بَعْدَ الْعَوْدِ مِنْھَا فِیْ غُرَّۃِ الْمُحَرَّمِ سَنَۃَ سَبْعٍ کَمَا یَأْتِیْ یعنی یکم محرم ۷ھ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے تھے۔ جو اس تاریخ کے لحاظ سے جو ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہجرت کی مقرر کی ہے (جلد ۸ صفحہ ۱۱۸) اس کی تاریخ ۱۲ اپریل ۶۲۸ء بنتی ہے۔ اور خسرو ثانی جس نے آپؐ کی گرفتاری کا حکم بھیجا تھا وہ ۲۵ فروری ۶۲۸ء کو پکڑا گیا اور ۲۹ فروری ۶۲۸ء کو قتل کیا گیا تھا۔ (ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۸ صفحہ ۹۵) گویا خط اُس کے مارے جانے کے ایک ماہ بارہ دن بعد بھیجا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خط اس بات کا محرک ہُوا تھا کہ خسرو ثانی آپؐ کی گرفتاری کا حکم بھیجے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قاصد اس کے قتل کے بعد مدینہ سے مدائن کی طرف جو ان دنوں ایران کا پایۂ تخت تھا روانہ ہُوا تھا۔ اگر آپؐ کے خط کو اس کا محرک سمجھا جائے تو وہ خط کم از کم تین چار ماہ قبل کا ہونا چاہیئے یعنی اس صورت میں آپ کا خط دسمبر ۶۲۷ء کا ہونا چاہیئے۔ حالانکہ آپؐ کا خط یکم محرم ۷ھ کو گیا ہے جس کی تاریخ حساب کے رُو سے ۴ مارچ ۶۲۸ء بنتی ہے۔ پس جو خط آپؐ نے ۴ مارچ ۶۲۸ء کو لکھا وہ اس حکم کا باعث نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا باعث وہی جھوٹی اور غلط رپورٹیں تھیں جو اُسے یہود کی طرف سے پہنچی تھیں۔ اور جن سے مشتعل ہو کر اُس نے یہ ظالمانہ حکم دے دیا۔ اور چونکہ وہ ۲۵ فروری کو پکڑا گیا تھا اور ۲۹ فروری کو قتل کر دیا گیا اسلئے یہ خط بہر حال اس کی طرف نہیں ہو سکتا۔ بلکہ دوسرے کسریٰ کی طرف تھا جو اس کے قتل کے بعد تخت نشین ہُوا۔ یعنی اس خط کا مخاطب کسریٰ نہیں تھا بلکہ اس کا بیٹا شیرویہ تھا جس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ جن لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی خط کو

اِس اشتعال کی وجہ قرار دیا ہے آخر اُن کو بھی تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یہ باہر کی تحریک تھی جس سے متاثر ہو کر اُس نے یہ قدم اُٹھایا۔ یہ تحریک گورنروں کی طرف سے نہیں ہو سکتی کیونکہ عرب کا علاقہ اس کے ساتھ نہ تھا۔ یہ صرف یہودیوں کی کارروائی تھی۔ انہوں نے چاہا کہ جس طرح فارس والوں کے ساتھ مل کر ہم نے بابل کو تباہ کیا تھا۔ اسی طرح دربارِ ایک بادشاہ کو اکسائیں اور اس کی مدد سے مدینہ والوں کو تباہ کر دیں۔

یہود کی اس سازش کا سر ولیم میور کو بھی اقرار کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" ایڈیشن دوم میں لکھتا ہے کہ کسریٰ شاہ ایران کے افسر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط پہنچنے سے پہلے روانہ ہو چکے تھے۔ اور پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہودی آپؐ کے خلاف ایرانی بادشاہ کو اکسایا کرتے تھے۔ عربوں کی تو ایرانی بادشاہ کے دربار میں کوئی رسائی نہ تھی۔ عیسائی اس کے دشمن تھے اس لئے وہ بھی اُسے اکسا نہ سکتے تھے۔ باقی صرف یہودی رہ گئے۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ جس طرح فارس کے بادشاہ کی مدد سے بابل والے تباہ ہو گئے تھے اسی طرح مدینہ بھی ہم فتح کر لیں گے۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ یہودیوں کی طرف سے متواتر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے کئے گئے۔ اور آپ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ آپ پر جسقدر خفیہ حملے کئے گئے ہیں وہ سب یہودیوں ہی کی طرف سے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک یہودی عورت کی طرف سے آپؐ کو زہر دینا ثابت ہے اسی طرح خفیہ طور پر آپؐ پر ایک بڑی بھاری پتھر کی سِل پھینک کر مارنے کی کوشش بھی یہود ہی کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ لوگ خفیہ سازشوں میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے حالانکہ بہادر اور شریف دشمن ایسی باتوں کو عار سمجھتے ہیں اور سامنے آ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر یہ لوگ ایسے گرے ہوئے تھے کہ انہوں نے خفیہ طور پر آپ کو زہر دینے کی کوشش کی۔ پھر گھر پر بُلا کر مارنے کی کوشش کی۔ اور جب یہ لوگ خود اپنے ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تو انہوں نے ایران کے بادشاہ کو اُکسا کر آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی۔

اس ساری تحقیق سے ثابت ہے کہ

(۱) خفیہ سوسائٹیوں کی ابتداء یہود سے ہوئی۔

(۲) یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں سے تعلق رکھتے تھے۔

(۳) تین دفعہ انہوں نے خفیہ کوششیں کیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف۔ بابل کے خلاف اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف۔

جب اِن تمام واقعات کی کڑی مل گئی تو ثابت ہو گیا کہ اِن آیات میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں اور خورس اور بابل کے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ اِسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ایرانی بادشاہ کی نالائق حرکت اور یہود کی اُن تمام کوششوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کروانے کیلئے کی تھیں۔

اب ہمیں ایک ایسے واقعہ کا علم ہو گیا جو اُن تمام اصولی باتوں کو جو اس آیت سے مستنبط ہوتی ہیں پورا کرتا ہے۔ یعنی وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ والی ایک جماعت ہمیں نظر آ گئی جو اس کام کے مشابہ کام کرتی تھی جو شیاطین یعنی بدی کے سرداروں نے ملکِ سلیمانؑ کے خلاف کیا تھا اور اس فعل سے ایک جزئی مشابہت رکھتا تھا جو ملکین یعنی ہاروت و ماروت نے بابل میں کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں زمانوں میں ایک ہی قسم کا فعل ہوا تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے،

کہ وہ کام اپنے اندر ایک حد تک اخفاء کا پہلو رکھتا تھا۔

پس ان واقعات کی روشنی میں زیر تفسیر آیات کا ترجمہ کیا جائے تو یہ ہوگا کہ یہ لوگ اس چیز کی پیروی کر رہے ہیں جس کی شیطان صفت لوگ یعنی بدی کے سردار حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے زمانہ میں کیا کرتے تھے اور وہ یہ تھا کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ کافر ہو گیا ہے۔ بے دین اور مشرک ہو گیا ہے بتوں کی پرستش کرتا ہے یا ایسی تعلیم دیتا ہے جو دین کے خلاف ہے۔ اور وہ یہ باتیں لوگوں میں مخفی طور پر مشہور کیا کرتے تھے۔ وہ آپ کے متعلق یہ بھی مشہور کیا کرتے تھے کہ اس پر بیویوں کا قبضہ ہے اور وہ ان کے مجبور کرنے کی وجہ سے معبودانِ باطلہ کی پرستش کرتا ہے۔ حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے سلیمانؑ نے ہرگز ایسا نہیں کیا بلکہ یہ شیطان یعنی بدیوں کے سردار خدا تعالیٰ کی باتوں کا انکار کرتے تھے۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جسے میں نے پہلے بیان نہیں کیا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہاں دو دعوے کئے گئے تھے۔ اول یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت دشمنوں کی طرف سے کفر کا الزام لگایا جاتا تھا دوسرے یہ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا بلکہ اس کی حکومت کے باغی لوگ خود کافر اور بے ایمان تھے۔ اس کے متعلق چونکہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ممکن ہے کافر کہنے والے مخالف دیانت داری سے ان کی طرف یہ الزام منسوب کرتے ہوں یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے ان کی مخالفت ہو یا انہوں نے ان پر الزام تو شرارت سے لگایا ہو مگر ان کی اپنی حالت درست ہو۔ اس لئے فرمایا کہ الزام لگانے والے مخالف نہ تو دیانت داری سے الزام لگاتے تھے اور نہ ہی کسی غلط فہمی کی وجہ سے اور نہ ہی یہ صورت تھی کہ وہ صرف شرارت سے الزام لگاتے ہوں اور اُن کی ایمانی حالت درست ہو بلکہ وہ اپنی بدعملی اور بے دینی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔ یہ مزید دعویٰ ہے جو قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر جو الزام لگایا گیا تھا اس کا حوالہ ۱۔ سلاطین باب ۱۱ آیت ۳ و ۴ و ۵ و ۱۰ ہے جو پہلے گذر چکا پھر آیت ۲۹ تا ۳۳ میں ذکر آتا ہے کہ یربعام جس نے بعد میں بغاوت کر دی تھی اُس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بیٹے کا مقابلہ کرکے دس قوموں کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا اور اُس نے خاص طور پر اُن پر الزام لگایا تھا۔ اس میں یربعام اور اُس کے ساتھی انبیاء کے ذریعہ (جسے نبی کہا گیا ہے) حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے بُت پرستی کی ہے اور کفر کیا ہے اور شرک میں مبتلا ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ الزام لگانے والے خود بُت پرست تھے اور بُت پرستی قائم کرنا چاہتے اور اُس میں دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا چاہتے تھے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا اس کا بھی کوئی ثبوت ملتا ہے یا نہیں۔ سو اس کا ثبوت کہ انہوں نے بُت پرستی کی ۲۔ تواریخ باب ۱۳ آیت ۸ سے ملتا ہے کہ یربعام کی حکومت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک شخص ابیاہ کو کھڑا کیا۔ یہ یربعام کے مقابلہ کے لئے فوج لے کر گیا اور اُس کو مخاطب کرکے کہا:۔

"اب تم کو یہ گمان ہے کہ تم خداوند کی بادشاہت جو داؤد کی اولاد کے ہاتھ میں ہے اس کا سامنا کر سکو گے۔ اور تم بڑے انبوہ ہو۔ اور تمہارے ساتھ وے سنہلے بچھڑے ہیں جنہیں یربعام نے بنایا

کہ تمہارے معبود ہو دیں۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ گوسالہ پرستی کر رہے تھے۔ اس کا مصر بھاگ جانا اور پھر وہاں سے واپس آنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ پہلے بھی مصری سے گوسالہ پرستی کی بیماری آئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصری کمزور لوگوں کو خرید لیا کرتے تھے۔ اور اس طرح اپنے معبود کی عظمت کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بُت پرستی کا الزام لگاتے تھے حالانکہ وہ خود بُت پرست تھے۔ اگر یہ الزام نہ لگاتے تو اُن کی قوم جو موحّد تھی نہ بھڑکتی اس لئے انہوں نے آپ پر ایسا الزام لگایا جس سے قوم بھڑک اُٹھی اور جب وہ مشتعل ہو گئی تو انہوں نے بُت بنا بنا کر شرک کو رائج کر دیا جس کا بائیبل سے ثبوت ملتا ہے۔

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو فریب [illegible] باتیں بتاتے تھے جن کا ظاہر کچھ اَمعۃ تا اور باطن کچھ اَ[illegible]۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اُن کے دل میں شرک تھا۔ مگر زبان سے توحید کا اظہار کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر اُن کی قوم اُن کے ساتھ نہ مل سکتی تھی۔ پس وہ لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے تھے کہ ہم موحّد ہیں اور سلیمانؑ مشرک ہے۔ ہم دنیا میں خدا تعالیٰ کی توحید قائم کرنا چاہتے ہیں۔ منافق بھی ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (بقرہ ع آیت ۱۲) ہم تو اصلاح کی غرض سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس پر کمزور ایمان والے کہتے ہیں کہ یہ لوگ بڑی اچھی بات کیلئے کھڑے ہوئے ہیں ہمیں ان کی تائید کرنی چاہیئے۔ اسی طرح وہ بھی لوگوں کو ملمع سازی کی باتیں سکھایا کرتے تھے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ

هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ کے دو طرح معنے ہو سکتے ہیں۔

(۱) اوّل اس طرح کہ واوٗ عطف کے لئے ہو۔ اس صورت میں مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ کے ساتھ مل کر اس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ اس دوسرے زمانہ میں بھی ویسا ہی کام ہوا ہے۔ جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا تھا۔ جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف سوسائٹی بنی تھی اسی طرح ایک اور بادشاہ کے مقابلہ میں بھی اس قسم کی سوسائٹی بنی۔ مگر فرماتا ہے کہ یہ مشابہت صرف ظاہری ہے ورنہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف کھڑے ہونے والے کافر تھے اور دوسرے وقت بابل کا بادشاہ کافر تھا اور جو مقابلہ کر رہے تھے وہ مومن تھے۔ پہلے زمانہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو نقصان پہنچانے کے لئے یہ قوم کھڑی ہوئی تھی اور دوسرے زمانہ میں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک کافر بادشاہ کو نقصان پہنچانے کیلئے یہ قوم کھڑی ہوئی تھی۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جماعت احمدیہ کی ہمیشہ یہ تعلیم رہی ہے کہ حکومتِ وقت کے خلاف کھڑا ہونا درست نہیں مگر یہاں تو بغاوت قابلِ تعریف فعل نظر آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر اپنی حکومت کے خلاف کھڑا ہونا بھی درست ہے۔ یہ اعتراض بظاہر وزنی معلوم ہوتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری تعلیم استثناء رکھتی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ اسلام کی تعلیم میں ہی یہ بات شامل ہے کہ اگر کوئی قوم کسی حکومت کو چھوڑ کر جانا چاہے اور وہ حکومت اُسے جانے نہ دے تو پھر وہ قوم اُس کی مخالفت کر سکتی ہے اور اُسے اجازت ہے کہ وہ چاہے مخفی بغاوت کرے یا کھلم کھلا۔ وہ اس کا ہر رنگ میں مقابلہ کر سکتی ہے۔ اسلام بتاتا ہے کہ جب تم بادشاہ پر خوش نہ ہو اور ناخوشی معمولی ہو تو اُس وقت تک

تم انتظار کرو کہ خدا تعالیٰ اپنا فضل تم پر نازل کرے۔ اور اگر یہ ناخوشی غیر معمولی ہو اور تم انتظار نہ کر سکو۔ تو پھر اس حکومت سے نکل جاؤ۔ اور اس ملک کو چھوڑ دو۔ لیکن اگر وہ حکومت تمہیں زبردستی روکے اور وہاں سے جانے نہ دے اور ظلم بھی دور نہ کرے تو اس صورت میں تم اس کا مقابلہ وہاں رہ کر کر سکتے ہو۔ یہودی لوگ بابل میں قید تھے۔ اور ان کو واپس اپنے وطن جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اپنے وطن سے باہر ایک غیر علاقہ میں تھے۔ اس علاقہ کو چھوڑنے کی انہیں اجازت نہ تھی اور یہ ایک رنگ میں اُن کے مذہب میں دخل اندازی تھی۔ اس صورت میں ظاہری یا مخفی طور پر بغاوت یا مقابلہ کرنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے۔ گویا مومن جن باتوں کو برداشت کر سکتا ہے اُن کو تو برداشت کر لیتا ہے مگر جن کو وہ برداشت نہیں کر سکتا اُن کے متعلق وہ صاف طور پر کہہ دیتا ہے کہ ہم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ہماری جائیدادیں سنبھال لو۔ ہمارے مال زمینیں مکانات لے لو۔ ہم یہاں سے جاتے ہیں۔ اور اگر حکومت پھر بھی نہ جانے دے تو اس کا مقابلہ کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ مومن اس بات کو پیش کر کے کہ ہماری جائدادیں سنبھال لو اور ہمیں جانے دو۔ اپنی طرف سے امن قائم کر دیتا ہے لیکن اگر حکومت پھر بھی نہ جانے دے تو مومنوں کو اجازت ہوتی ہے کہ وہ ظاہر یا مخفی مقابلہ کریں۔ کیونکہ اس صورت میں بادشاہ خود امن برباد کرتا ہے اور مقابلہ کی صورت پیدا کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی حالت تھی اور اس حالت میں بادشاہ کا مقابلہ کرنا جائز تھا۔ کیونکہ نہ تو اُن کو واپس اپنے وطن جانے کی اجازت تھی اور نہ وہاں کے لوگوں کو اپنے شہر کے آباد کرنے کی اجازت تھی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے یروشلم کے آباد کرنے کی صورت پیدا کی۔ چنانچہ عزرا نبی کی کتاب باب ۱ آیت ۱ تا ۳ میں آتا ہے کہ

"شاہِ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہووے۔ خداوند نے شاہِ فارس خورس کا دل اُبھارا کہ اُس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کروائی اور اُسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہودہ میں ہے اس کے لئے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہووے اور وہ یروشلم کو جو شہر یہودہ ہے جاوے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بناوے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔"

یہ وہی خورس ہے جس کی یہود نے مدد کی اور جس نے آکر اعلان کر دیا کہ بنی اسرائیل واپس یروشلم جا سکتے ہیں۔ پھر یہ وہی شخص ہے جس کا ذکر سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے آتا ہے۔ اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا تھا کہ تم بنی اسرائیل کو واپس یروشلم جانے دینا چنانچہ اُس نے اُن سے دوستی قائم کی۔ اور بابل کی حکومت کو شکست دی۔ بابل کی حکومت سینکڑوں سال سے چلی آتی تھی جس کے مقابلہ میں اُس کی حکومت ایک معمولی ریاست تھی لیکن خورس کی ترقی دیکھ کر چند حکومتوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اسے کچل دیں۔ اُسے کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا چنانچہ اُس نے اندرونی طور پر یہودیوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ اور بابل پر حملہ کر دیا۔ اور خدا تعالیٰ کی تائید سے اُسے فتح کر لیا۔

ان واقعات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی یہود انہی افعال کی نقل کر رہے ہیں جو سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں

شیطانی لوگ اُس کی حکومت کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا کرتے
تھے۔ اسی طرح یہ لوگ اُن باتوں کی بھی پیروی کرنا چاہتے ہیں جو
بابل میں ہاروت اور ماروت پر نازل کی گئی تھیں۔ مگر یہ نہیں
سوچتے کہ سلیمانؑ کا مقابلہ کرنے والے وہ لوگ تھے جو گندے
اور ناپاک تھے اور ہاروت و ماروت سے خفیہ تدابیر سیکھنے والے
وہ لوگ تھے جو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُس میں حصہ لیتے
تھے کیونکہ وہ بابل کے بادشاہ سے بنی اسرائیل کو نجات
دلانے کے لئے کھڑے کئے گئے تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے تھے
کہ ہماری بات مان لو اور اندر ہی اندر تیار ہو جاؤ۔ جب
خورس اور اس کی قوم باہر سے حملہ آور ہو تو تم اندر سے حملہ
کر دو۔ اور وہ یہ بات عورتوں کو نہیں بتاتے تھے کیونکہ وہ
کمزور دل ہوتی ہیں اور اُن کے متعلق خطرہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں
دوسروں کو نہ بتا دیں پس فرمایا کہ تمہاری خفیہ تدابیر اور اُن
تدابیر میں بہت بڑا فرق ہے۔ وہ خدا کے حکم سے لوگوں کو سکھاتے
تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ ہماری ان باتوں کو ردّ نہ کرنا ورنہ
کفر ہو جائیگا۔ کیا یہ لوگ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر کر رہے ہیں
وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں اور خدا تعالیٰ کی رضامندی
کے لئے کر رہے ہیں۔ اور کیا یہ اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ
جو اُسے ردّ کریگا وہ کافر ہو جائیگا۔ جب محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے
تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے باغیوں
سے مشابہ ہیں نہ کہ بابل کے باغیوں سے۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ میں بتایا
کہ بابل والے ملکوتی صفت انسان کسی کو نقصان یا ضرر
نہیں پہنچاتے تھے۔ وہ اگر کسی کو نقصان پہنچاتے تھے تو
خدا کے الہام کے ذریعہ۔ اپنے منشاء سے ایسا نہیں کرتے
تھے۔ کیا یہ لوگ بھی الہام کے مدعی ہیں؟ کیا یہ بھی خدا
کے کسی حکم کی تعمیل کر رہے ہیں؟ کیا انہیں بھی یہ الہام ہوتا
ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرو؟
مگر باوجود اس کے کہ ان کو ایسا کوئی الہام نہیں ہوتا۔ جب
ان کو ان باتوں سے منع کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہمیں اس
بات کی اجازت مل چکی ہے۔ ہم بابل میں یہی کام کر چکے ہیں۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا وہ باتیں اور صورتیں اور وجوہات
تمہیں یہاں نظر آتی ہیں۔ تمہارے مقابل پر تو نبی ہے جس
کے خلاف تم کام کر رہے ہو اور اُس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے
الہام نازل ہوتا ہے۔ پس تمہاری صرف حضرت سلیمان
علیہ السلام کے مخالفوں اور دشمنوں سے مشابہت ہے۔ جس طرح
وہ لوگ اُن کو کافر کہتے تھے اُسی طرح تم محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کافر کہتے ہو۔ اور جس طرح وہ
اُن کے خلاف جھوٹی باتیں لوگوں میں پھیلاتے تھے اُسی طرح تم
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کے ماتحت ہیر پھیر
کرتے ہو۔ مگر بابل میں خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق دو نبیوں
کے ماتحت ایسی قوم کے خلاف باتیں کی جاتی تھیں جس کی
ہلاکت کا خدا تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ الہام
کے ماتحت کام کر رہے تھے نہ کہ اپنی طرف سے۔ وہاں
خدا کے نبیوں کی اتباع میں کام ہو رہا تھا نہ کہ نبیوں کے
خلاف۔ مگر اب تم چاہتے ہو کہ جس طرح دو ملائکہ صفت
انسانوں نے بابل کی حکومت کو تباہ کیا اُسی طرح تم
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ تباہ کر دو۔
مگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تمہاری اُن کے ساتھ
مشابہت نہیں بلکہ تمہاری مشابہت سلیمان علیہ السلام
کے دشمنوں سے ہے۔ وہاں بھی تم مخفی سمجھوتے کرتے تھے۔
مگر آخر تم ہی جلاوطن ہوئے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی ہوگا
اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں تم
ناکام و نامراد رہو گے۔

مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ درحقیقت جملہ مستانفہ
ہے اور مطلب یہ ہے کہ سلیمانؑ کے دشمنوں کی بات اور،

اور ہاروت اور ماروت پر جو کچھ نازل ہوا ہے وہ اور ہے
ان کا یہ دعویٰ کہ ہم ہاروت اور ماروت کے وقت کے
لوگوں کے مشابہ ہیں غلط ہے کیونکہ وہ جو کچھ کرتے تھے
الہام الٰہی کے ماتحت کرتے تھے۔ پس ان کی مشابہت صرف
سلیمانؑ کے دشمنوں سے ہی ہے جنہوں نے ایک نبی کی مخالفت
کی اور تباہ ہوئے ہاروت و ماروت کے وقت کے لوگوں کے
ساتھ نہیں۔

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ انکی
مشابہت دوگروہوں سے ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام
کے مخالفوں سے اور بابل کے مخالفوں سے۔ پہلوں سے
یہ صحیح معنوں میں مشابہ ہیں اور دوسروں سے صرف سطحی
رنگ میں۔

وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ

اس میں بتایا کہ یہود کا خیال یہ ہے کہ جس طرح ہم بابل سے
فارس اور میڈ کے بادشاہ کی مدد سے آزاد ہو گئے تھے اسی
طرح اب بھی غیر حکومتوں سے ریشہ دوانیاں کر کے محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت سے آزاد ہو جائینگے
مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاروت و ماروت کے وقت انکی
کامیابی کا باعث یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق
کام کرتے تھے۔ لیکن اب یہ اس کے حکم کے خلاف کر رہے
ہیں۔ اس لئے اب ان کا سلیمانؑ کے مخالفوں کی طرح محمد
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کافر کہنا اور کسریٰ سے
مخفی سمجھوتہ کرنا اور بیرونی دشمنوں سے مل کر آپ کا
مقابلہ کرنا جیسے خیبر کے وقت کیا گیا۔ ان کو کوئی فائدہ
نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کو تباہ کرنے کی بجائے یہ یہودی لوگ خود تباہ ہوں گے
گویا اسجگہ ان کے متعلق پیشگوئی کر دی اور انہیں سمجھایا
کہ وہ دو وقت خفیہ تدابیر سے مقابلہ کر چکے ہیں۔ ایک
سلیمانؑ کے وقت جبکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے نبی کی
مخالفت کی تھی اور دوسرے ہاروت و ماروت کے وقت
جبکہ بابل میں انہوں نے آزادی کے حصول کے لئے خورس
سے مخفی سمجھوتہ کیا۔ اب نتائج سے مقابلہ کر کے دیکھ
لو کہ تمہاری کن لوگوں سے مشابہت ہے۔

پہلی سازش جو ایک نبی کے خلاف کی گئی تھی اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی طاقت کمزور ہو گئی اور آہستہ
آہستہ ایسے ذلیل ہوئے کہ ایک وقت بندستی بابل کی طرف
جلا وطن کر دیئے گئے۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بڑے دشمن
یربعام کیلئے بھی سوائے اسکے کوئی چارہ نہ رہا کہ بھاگ کر مصر چلا جائے۔
مگر جب اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے ماتحت انہوں نے نیک
تدابیر اختیار کیں تو جلا وطنی سے اپنے وطن واپس آ گئے
اور ان کا دشمن تباہ ہو گیا۔

ان دو مثالوں کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ چونکہ
اس وقت یہود اسی راستہ پر قدم مار رہے ہیں جس راستہ پر
سلیمانؑ کے دشمنوں نے قدم مارا تھا۔ اس لئے جس طرح سلیمانؑ
کے دشمن جلا وطن کئے گئے تھے اسی طرح یہود کو بھی جلاوطن
کیا جائیگا۔ اور ان کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہوگا جیسے
سلیمان کے دشمنوں سے ہوا اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا
کہ یہ جھوٹے ہیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں سے
مشابہ ہیں۔ چنانچہ یہود کو پہلے مدینہ سے جلا وطن کیا جائیگا
پھر خیبر سے بھی نکال دیا جائیگا۔ حتیٰ کہ ان کے ایرانی
منصوبوں کی وجہ سے آخر ان کو عرب سے بھی نکال
دیا جائیگا اور خطۂ عرب ان کے وجود سے بالکل پاک
ہو جائیگا۔ چنانچہ ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ کسریٰ
بھی ہلاک ہوا اور وہ خود بھی عرب سے جلا وطن کئے گئے۔
پہلے ان کو مدینہ سے نکالا گیا۔ اور یہ لوگ خیبر میں چلے گئے
پھر وہاں سے بھی نکالے گئے اور آخر ان کو عرب کا ملک
چھوڑنا پڑا جو بالکل اس نتیجہ کے مطابق تھا جو حضرت
سلیمانؑ کے خلاف سازش کرنے کا ہوا تھا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو (انہیں معلوم ہو جاتا کہ) اللہ کی طرف سے ملنے والا بدلہ

خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

(ہی) بہترین (بدلہ) ہے کاش کہ یہ جانتے۔ ۱۲ ع ۱۲ ۱۲۱

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ میں فرمایا کہ یہ لوگ خوب سمجھتے ہیں کہ نبیوں کی مخالفت اور ایسے گھناؤنے کام کرنے والوں کا اُخروی زندگی کے انعامات میں کوئی بھی حصہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ اس قسم کی کارروائیوں سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ ایک دفعہ یہود کے دو عالم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے۔ جب واپس گئے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ اِسکے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ اُس نے کہا۔ معلوم تو سچا ہوتا ہے؛ دوسرے نے کہا۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ پھر کیا رائے ہے آیا قبول کر لیا جائے؟ اُس نے جواب دیا کہ جب تک جان میں جان ہے ماننا نہیں۔ دوسرے نے کہا۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ دلائل اور سابقہ پیشگوئیوں کی وجہ سے دل میں آپؐ کی سچائی کا اقرار کرتے تھے۔ مگر زبان سے آپ کی سچائی کو نہیں مانتے تھے فرماتا ہے کہ ان کے بڑے بڑے لوگ جو شرارت کرنیوالے ہیں وہ لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اُکساتے ہیں اور وہ اس بات کی بُرائی کو بھی جانتے ہیں کہ ایسے کام اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتے۔ مگر پھر بھی ان کاموں سے باز نہیں آتے۔

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس ذریعہ سے ہم نے اپنی جانوں کو خرید لیا ہے یعنی انہیں ہلاکت سے بچا لیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے اُلٹ ہے۔ یہ لوگ اسی کے ذریعہ ہلاک ہوں گے۔

چنانچہ اِدھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو سزا دیں گے اور اُدھر ہم آخرت میں انہیں عذاب میں گرفتار کرینگے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اِس قدر طاقت حاصل ہو جائیگی کہ وہ انہیں عرب سے نکال دینگے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایکدن بادشاہت اور حکومت مل جائیگی اور ان کے لئے عرب میں ٹھہرنا بھی مشکل ہو جائیگا۔

اِس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام خفیہ منصوبوں اور خفیہ سوسائٹیوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور بابل کا واقعہ ایک استثنائی رنگ رکھتا ہے۔ کیونکہ وہاں جو کچھ ہوا خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہوا۔

۱۲۱ تفسیر: فرماتا ہے۔ اگر یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اُن کو دین و دنیا میں بڑی ترقی ملتی۔ مگر یہ محض اِس ضد کی وجہ سے مخالفت کرتے ہیں کہ کیوں ہم میں سے کسی پر الہام نازل نہیں کیا گیا۔ بنو اسمٰعیل کا کیا حق تھا کہ اُن کے ایک فرد پر یہ کلام اُتارا جاتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ان کو پتہ ہوتا کہ ہمارے لئے کیا کیا عذاب مقدر ہے اور مسلمانوں کو کیا کیا انعامات ملنے والے ہیں۔ اور انہیں معلوم ہوتا کہ مستقبل میں حالات کیا شکل اختیار کرنیوالے ہیں اور محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر عظمت اور شوکت حاصل کر لی ہے، تو یہ دوڑتے ہوئے آتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر لیتے مگر انکو مستقبل کا علم نہیں صرف دنیا طلبی میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخالفت کا شور مچا رہے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لو۔ انہوں نے جب اسلام قبول کیا تو لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مکہ کا ایک لیڈر تھا اب ذلیل ہو گیا مگر اسلام سے پہلے اُنکی اس سے زیادہ کیا عزت ہو سکتی تھی کہ دو سو یا تین سو آدمی ان کا نام عزت سے لیتے ہونگے لیکن اسلام کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خلافت اور بادشاہت کی برکت سے نوازا۔ اور انہیں دنیا بھر میں دائمی عزت اور ایک لازوال شہرت کا مالک بنا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فوت ہوئے اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب کئے گئے تو کسی نے مکہ میں جا کر یہ خبر سُنائی کہ ابوبکرؓ خلیفہ تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہ بھی اُسی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کون ابوبکر؟ خبر لانے والے نے بتایا کہ ابو قحافہ کا بیٹا! آپ کے والد نے نہایت حیرت سے پوچھا۔ کون ابو قحافہ؟ جب انہیں معلوم ہُوا کہ خود اُنہی کا بیٹا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ منتخب ہوا ہے تو انہوں نے دوبارہ کلمہ پڑھا۔ اور کہا کہ آج مجھ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت منکشف ہو گئی ہے۔ اگر آپ سچے نہ ہوتے تو ابوبکرؓ کی کیا حیثیت تھی کہ اس کو اتنی بڑی عزت ملتی۔ غرض کہاں ایک قبیلہ کی لیڈری اور کہاں یہ کہ تمام مسلمانوں کا خلیفہ اور مملکتِ عرب کا بادشاہ ہونا جس نے ایران اور روم سے ٹکر لی اور انہیں نیچا دکھایا۔ پس ذرایا۔ اسلام کیلئے جو قربانیاں انہیں دینی پڑیں گی۔ وہ اُن فوائد کے مقابلہ میں بہت حقیر ہیں جو انہیں اسلام سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کاش وہ جانتے اور اس کی قدر کرتے۔

آخر میں اس شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وَاتَّبَعُوْا میں ماضی کا صیغہ کیوں رکھا گیا ہے۔ چاہیئے تھا کہ يَتَّبِعُوْنَ کہا جاتا۔ اور مضارع کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ اس کے لئے یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں جس فعل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ وہ شرارتیں ہیں جو انہوں نے ایرانی بادشاہ خسرو ثانی کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھڑکانے کے لئے کی تھیں۔ لیکن خسرو ثانی کے بعد ایک ایسا بادشاہ تخت نشین ہُوا۔ جس کی پالیسی سابق فرمانروا کے خلاف تھی یعنی شیرویہ۔ وہ تخت حکومت پر بیٹھا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس قسم کی ظالمانہ شکایات کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس وجہ سے یہاں مضارع کا صیغہ نہیں بلکہ ماضی کا صیغہ ہی استعمال ہو سکتا تھا۔ اگر يَتَّبِعُوْنَ کہا جاتا تو پھر یہ سمجھا جاتا کہ خسرو ثانی کی پالیسی بعد میں بھی جاری رہی تھی حالانکہ وہ مارا گیا تھا۔ اور اس کے بیٹے نے اپنے باپ کے حکم کو منسوخ کر دیا تھا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ تَتْلُوْا مضارع ہے حالانکہ یہاں ماضی زیادہ مناسب تھی۔ مفسرین نے تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اصل میں كَانَتْ تَتْلُوْا ہے۔ کانت کو اُڑا کر تَتْلُوْا کر دیا گیا اور الفاظ کو حذف کر دینا عربی زبان کی اُن خصوصیات میں سے ہے جو اُسے دوسری زبانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ دوسری زبانوں میں زور دینے کے لئے تنبیہ کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں صرف حذف سے ہی یہ فائدہ اٹھا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ كَانَتْ تَتْلُوْا سے صرف تَتْلُوْا کر کے یہ مضمون واضح کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کے دشمنوں نے بڑے زور سے یہ کام کیا تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بھی اُنہی کے نقشِ قدم پر چل کر اسلام کو مٹانے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا

اے ایمان والو! (رسول کو مخاطب کرکے) رَاعِنَا مت کہا کرو اور اُنْظُرْنَا کہا کرو۔

کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

لیکن اِس کے علاوہ عربی محاورات میں جب کسی لمبی عادت کا ذکر کرنا ہو تو عرب ماضی کی جگہ مضارع استعمال کرتے ہیں جیسے قرآن کریم کی آیت فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ (سورۃ بقرہ آیت ۹۲) میں تَقْتُلُوْنَ سے قَتَلْتُمْ مراد ہے اِسی طرح یہاں جو مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اِس سے یہود کی اُن لمبی سازشوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے کرتے چلے آئے تھے اور جو اُن کی ایک رنگ میں طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھیں اِسی لئے ماضی کی بجائے یہاں مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

میں نے پچھلے رکوع میں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے بنی اسرائیل کی اُن مخالفتوں کا ذکر کیا ہے جو وہ سابق انبیاء کے مقابلہ میں کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اُن کی بداعمالیوں کے سلسلہ کا ذکر کرتے ہوئے بات کو یہاں تک پہنچایا تھا کہ انہوں نے انبیاءِ سابقین کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی مخالفت کی۔ اب اِس رکوع میں اُس سلسلۂ مخالفت کی بعض اور کڑیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو مخالفت کر رہے ہیں یہ اُن کا ایک دیرینہ مشغلہ ہے۔ اور اُن کی یہ مخالفت انہیں خدا تعالیٰ کی مخالفت پر بھی آمادہ کر رہی ہے۔

چنانچہ آیت ۹۸ میں بتایا کہ یاد رکھو۔ اس کلام کی دشمنی درحقیقت کلام بھیجنے والے کی دشمنی ہے اور آیت ۹۹ میں بتایا کہ خدا تعالیٰ کی دشمنی گویا تمام اسبابِ روحانی اور جسمانی کی دشمنی ہے جو انسانی ترقی کے ممد و معاون ہیں۔ اس لئے یہ نہ سمجھو کہ قرآن کریم کا انکار ایک معمولی بات ہے بلکہ یہ خالقِ اسباب اور قوموں کو ترقی و تنزل دینے والے سے جنگ ہے۔ آیت ۱۰۰ میں بتایا کہ قرآن مجید کا انکار بلاوجہ ہے کیونکہ اس کی صداقت کے زبردست دلائل موجود ہیں۔ آیت ۱۰۱ و ۱۰۲ میں بتایا کہ یہ اپنے انبیاء سے عہد کر چکے ہیں کہ ہم آنے والے رسول کو مانیں گے مگر پھر بھی نہیں مانتے۔ آیت ۱۰۳ میں بتایا کہ یہ لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صرف انکار ہی نہیں کرتے بلکہ آپ کے ہلاک کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے کر رہے ہیں جن میں بعض بادشاہوں سے خفیہ خط و کتابت بھی شامل ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ سلسلہ تباہ ہو جائیگا۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ یہ لوگ اپنے اس مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہونگے۔

یہ وہی مضمون ہے جو اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ (بقرہ آیت ۸۸) میں بیان کیا گیا تھا۔ اور پھر اس کی شہادت کے طور پر فرمایا کہ ان کا یہ دیرینہ اصول ہے کہ مخالفت ضرور کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اس رکوع میں اس کی ایک مثال دی جو تینوں زمانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک تو انتہائی ترقی کے وقت چسپاں ہوتی ہے یعنی حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے وقت پر۔ دوسرے درمیانی وقت پر یعنی یحییٰ اور زکریا نبی کے زمانہ پر۔ اور آخری مثال اُن کے تنزل کے زمانہ کی ہے گویا

وَاسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

اور (توجہ سے اس کی) بات سُنا کرو - اور (یاد رکھو کہ) منکروں کیلئے دردناک عذاب (مقدر) ہے[۲۲]

کوئی زمانہ بھی اُن کی مخالفت سے خالی نہیں رہا - آیت ۱۰۲ میں بتایا کہ ایمان لانا اور شیوۂ اِتّقاء اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچنا بہت بڑے ثواب کا کام ہے -

۲۲ حل لغات - رَاعِنَا - یہ مرکب ہے رَاعِ اور نَا سے اور رَاعِ باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے رَاعَی الرَّجُلَ کے معنے ہیں (۱) اِلْتَفَتَ اِلَيْهِ مُحْسِنًا - اُس نے شفقت سے کام لیتے ہوئے دوسرے کی طرف توجہ کی (۲) ایک دوسرے کے ساتھ رعایت اور نرمی کا معاملہ کیا - لیکن چونکہ رَاعِنَا باب مفاعلہ سے ہے - اور باب مفاعلہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں مقابلہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ ایک جیسا عمل کرتے ہیں - اس لحاظ سے رَاعِنَا کے معنے یہ ہونگے کہ تم ہمارا لحاظ کرو تو ہم تمہارا کرینگے - تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کرینگے - یہ معنے علاوہ ان معنوں کے ہیں جو اوپر کئے گئے ہیں کہ احسان سے توجہ فرمایئے اور مہربانی کی نظر کیجیئے -

اُنْظُرْنَا : کے معنے ہیں ہماری طرف توجہ کیجیئے ہمارا انتظار کیجیئے - ہمیں ساتھ شامل کرنے کے لئے ذرا ٹھہر جایئے - گویا اُنْظُرْنَا کے بھی وہی معنے ہیں جو رَاعِنَا کے ہیں - مگر اس میں وہ شرط نہیں پائی جاتی جو رَاعِنَا میں پائی جاتی ہے -

تفسیر : - لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا - یہود مسلمانوں کے خلاف دو قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے - اوّل بیرونی اور دوم اندرونی - یہاں اُن کی اُن شرارتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اندرونی طور پر مسلمانوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برگشتہ کرنے اور اُن کے دلوں میں آپکا ادب اور احترام کم کرنے کے لئے کیا کرتے تھے - وہ جسطرح اسلام کو تباہ کرنے کے لئے بیرونی لوگوں کو بلکہ حکومتوں تک کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسایا کرتے تھے اسی طرح وہ مسلمانوں کو بھی اسلام سے بدظن کرنے کیلئے کئی قسم کے حیلے اور تدابیر اختیار کرتے - جہاں کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی فوراً اس سے ہمدردی کا اظہار شروع کر دیتے - اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں آ آ کر ایسے الفاظ استعمال کرتے جن کے دو معنے ہوتے تھے ایک اچھے اور ایک بُرے تاکہ مسلمان بھی ان الفاظ کو استعمال کرنے لگیں - اور اس طرح ان کے دلوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور آپ کا احترام جاتا رہے - اور اُن میں گستاخی اور بے ادبی کی رُوح پیدا ہو جائے - مثلاً تضحیک کرنے کیلئے وہ آپ سے بعض دفعہ کوئی بے معنی سا سوال کر دیتے - اور اِس سے اُن کی غرض یہ ہوتی کہ مسلمانوں کے دلوں سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رُعب جاتا رہے اور ان کا اخلاص کم ہو جائے یا شرمندہ کرنے کے لئے عبرانی کے متعلق کوئی سوال کر دیتے یا کوئی حوالہ پُوچھ لیتے - حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس سے فی الحقیقت کسی کی عزت کم ہو جائے - اگر آپ کو پتہ نہ ہوتا تو آپ اعتراف فرما لیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں - حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آپ نے اپنے چند صحابہؓ کو دیکھا کہ وہ کھجور کے نر و مادہ کا آپس میں پیوند کر رہے ہیں - آپؐ نے فرمایا - ایسا کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں - آپ نے فرمایا - اگر تم

رَاعِنَا

اُنْظُرْنَا

ایسا نہ کرو تو شاید یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہو۔ انہوں نے یہ سمجھ کر کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند نہیں فرمایا چھوڑ دیا۔ لیکن جب درختوں کو پھل نہ آیا۔ تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ آپ کی ہدایت پر ہم نے کھجور کے نر و مادہ کو آپس میں ملانا چھوڑ دیا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھل نہیں آیا۔ آپ نے فرمایا۔ اس قسم کے معاملات کے متعلق تم مجھ سے زیادہ واقف ہو۔ جب میں تمہیں کوئی دینی حکم دوں تو اس کی اطاعت تم پر فرض ہے لیکن اگر کسی دنیوی معاملہ کے متعلق رائے دوں۔ تو میں بھی تمہاری طرح ایک بشر ہوں ہو سکتا ہے کہ وہ غلط ہو (مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل)

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ طریق تھا کہ اگر آپ کو کسی بات کا علم نہ ہوتا تو آپ صاف طور پر فرما دیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن یہود کا مقصد چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب اور احترام مسلمانوں کے دلوں سے کم کرنا تھا اس لئے وہ مجالس میں آ آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے سوال کر دیتے جس سے ان کی یہ غرض ہوتی تھی کہ اگر آپ کو ان کا جواب نہ آئیگا تو آپ شرمندہ ہونگے۔ اور مسلمانوں میں بد دلی پیدا ہوگی۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے الہام کے ذریعہ آپ کو ان کی شرارتوں سے محفوظ کر دیتا۔ انہی شرارتوں میں سے انکی ایک شرارت یہ بھی تھی کہ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جن سے اندرونی طور پر ہتک ہوتی تھی۔ لیکن اگر کوئی روکتا تو وہ کہہ دیتے کہ تم ہماری بات سمجھے نہیں۔ ہماری تو اس سے یہ غرض نہیں تھی۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ یہود بعض دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہنے کی بجائے اَلسَّامُ عَلَیْکَ کہہ دیا کرتے تھے۔ سننے والا تو سمجھتا کہ انہوں نے سلام کیا ہے مگر ان کے مدنظر سام ہوتا جس کے معنے تباہی اور ہلاکت کے ہیں۔ ایک دفعہ بعض یہودیوں نے ایسا ہی کیا۔ تو حضرت عائشہؓ بھانپ گئیں اور انہوں نے فوراً کہا عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ یعنی تم پر ہی ہلاکت اور تباہی نازل ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ عائشہ سختی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ رفق اور نرمی سے کام لینا زیادہ پسند کرتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! آپ نے سنا نہیں کہ یہود نے کیا کہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ میں کیا جواب دیا کرتا ہوں۔ میں ان کے اس فقرہ کے جواب میں صرف عَلَیْکُمْ کہہ دیا کرتا ہوں۔ (بخاری کتاب الدعوات باب الدعاء علی المشرکین)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کی یہ عادت تھی کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کرتے جو گستاخانہ بھی ہوتے اور عامیانہ بھی اور اس سے ان کا مقصد محض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تذلیل اور آپ کا استخفاف ہوتا اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان کے اس اندرونی بغض کی ایک مثال دیتا ہے فرماتا ہے اے مومنو! تم رَاعِنَا مت کہو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ حالانکہ رَاعِنَا کے بھی وہی معنے ہیں جو اُنْظُرْنَا کے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ رَاعِنَا نہ کہو بلکہ اُنْظُرْنَا کہو۔ اس کی وجہ جیسا کہ خود قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر صراحت کی ہے یہ ہے کہ یہود کا یہ طریق تھا کہ جب وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے رَاعِنَا کا لفظ استعمال کرتے۔ گو رَاعِنَا کے لغتاً یہ معنے ہیں کہ آپ ہماری رعایت رکھیں اور ہم سے مہربانی کا سلوک کریں مگر قرآن کریم بتاتا ہے کہ وہ سیدھی طرح یہ لفظ استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی زبان کو پیچ دے کر اور اس لفظ کو ایسے رنگ میں بگاڑ کر استعمال کرتے تھے کہ بادی النظر میں

تو رَاعِنَا ہی سمجھا جاتا مگر درحقیقت وہ ایک طنزیہ کلام یا گالی بن جاتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اس شرارت کا ذکر کرتے ہوئے سورۃ نساء میں فرماتا ہے۔ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۚ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ (نساء آیت ۴۷)

یعنی یہودیوں میں سے بعض لوگ خدا تعالیٰ کے الہامات کو اُن کے اصل مقام سے اِدھر اُدھر بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا اور نافرمانی کی۔ اور کہتے ہیں۔ ہماری باتیں سُن تجھے خدا کا کلام کبھی نہ سُنایا جائے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ رَاعِنَا۔ یعنی ہمارا لحاظ کر۔ مگر یہ بات اپنی زبانوں کو پیچ دیتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اگر وہ اس شرارت اور فتنہ انگیزی کی بجائے یہ کہتے کہ ہم نے سُنا اور ہم نے اطاعت کی اور کہتے کہ ہماری معروضات سُن اور ہمارا بھی لحاظ رکھ تو یہ امر اُن کے لئے بہت بہتر اور بہت زیادہ درستیٔ اخلاق کا موجب ہوتا۔

مفسّرین لکھتے ہیں کہ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی زمانہ میں بکریاں بھی چرائی تھیں اس لئے فتنہ پرداز یہودی ذرا لہجہ بدل کر رَاعِنَا کی بجائے رَاعِيْنَا کہہ دیا کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ تُو تو ہمارا چرواہا ہے اَب تُو نبی کس طرح بن گیا۔ مگر علّامہ اصفہانی صاحب مفردات لکھتے ہیں کہ كَانَ ذٰلِكَ قَوْلًا يَقُوْلُوْنَهٗ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى سَبِيْلِ التَّهَكُّمِ يَقْصِدُوْنَ بِهٖ رَمْيَهٗ بِالرُّعُوْنَةِ وَيُوْهِمُوْنَ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ رَاعِنَا اَيْ اِحْفَظْنَا مِنْ قَوْلِهِمْ رَعُنَ الرَّجُلُ يَرْعُنُ رَعْنًا فَهُوَ رَعِنٌ وَاَرْعَنُ۔ یعنی یہودی رَاعِنَا کا لفظ کھٹی ہنسی اور مذاق کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اُن کا اصل مقصد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حماقت سے متہم کرنا ہوتا تھا۔ لیکن وہ سُننے والوں کو اس وہم میں بھی مبتلا رکھنا چاہتے تھے کہ وہ رَاعِنَا کا لفظ اِحْفَظْنَا کے معنوں میں استعمال کر رہے ہیں حالانکہ وہ رَاعِنَا نہیں بلکہ رَعِنَا کہہ رہے ہوتے تھے۔ چنانچہ اہل عرب بیوقوف اور احمق انسان کو رَعِنٌ اور اَرْعَنُ کہا کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ لفظ رَعِنٌ سے بھی بن سکتا ہے جس کے معنے احمق خود پسند اور متکبّر انسان کے ہیں منادیٰ ہو کر یہ لفظ رَعِنَا ہُوا اور چونکہ وہ لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ کے ماتحت اپنی زبان کو پیچ دے کر یہ لفظ استعمال کرتے تھے تا اُن کی منافقت پر بھی پردہ پڑا رہے اس لئے وہ رَعِنَا کو ایسے رنگ میں ادا کرتے کہ وہ رَاعِنَا ہی سمجھا جاتا۔ اور چونکہ آخری الف خطاب کیلئے ہے اس لئے رَعِنَا کے معنے یہ ہوتے کہ اے بیوقوف یا اے دھوکہ خوردہ انسان۔ گویا بظاہر تو یہی دکھائی دیتا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ بڑے معزز اور بزرگ ہیں۔ آپ ہمیں بھی موقعہ دیں کہ ہم آپ کی باتیں سُنیں۔ مگر وہ کہتے یہ تھے کہ اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا یہ بڑا متکبّر اور خود پسند انسان ہے۔ اور اگر انہیں کہا جاتا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو تو وہ فوراً کہہ دیتے کہ ہم نے رَاعِنَا کہا ہے اور آپس میں اشارے کر کے خوش ہوتے کہ دیکھو ہم نے انہیں کیسا بیوقوف بنایا ہے۔

مگر میرے نزدیک ایک اَور وجہ بھی ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو رَاعِنَا کہنے سے روکا گیا ہے۔ اور وہ وجہ یہ ہے کہ رَاعِ باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے اور اس باب میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ تم مقابل میں ایک بات کرو گے تب ہم تمہارے لئے ایسا کریں گے۔ پس رَاعِنَا میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ آپ ہماری رعایت مدّنظر رکھیں گے تب ہم بھی آپ کی رعایت ملحوظ رکھیں گے

ورنہ نہیں۔ مگر اُنْظُرْنَا کے صرف یہی معنے ہیں کہ آپ ہماری رعایت رکھیئے یا ہماری طرف نظر عنایت کیجئے۔ پس رَاعِنَا کے معنے اگرچہ عام محاورہ میں یہی ہیں کہ آپ ہماری رعایت رکھیں۔ لیکن اس لفظ کے مادہ میں چونکہ بے ادبی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور کسی بڑے آدمی کو جس کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیئے یہ کہنا کہ ہم آپ کی رعایت اور ادب صرف اسی صورت میں کرینگے جب آپ بھی ہماری رعایت رکھیں گے ایک سخت بے ادبی کا کلام ہے۔ اور یہ ایک قسم کا سودا بن جاتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اور عظمت کے منافی تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مخالفت فرمائی اور اسی مفہوم کو ایسے لفظ میں ادا کرنے کا حکم دیا جس میں بے ادبی کا کوئی احتمال نہیں۔

غرض میرے نزدیک مسلمانوں کو اس لفظ کے استعمال سے اِس لئے نہیں روکا گیا کہ اُن کی یہودیوں سے مشابہت نہ ہو۔ کیونکہ اگر نیت نہ ہو تو مشابہت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس لئے روکا گیا ہے کہ رَاعِ مُرَاعَاةٌ سے ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ تو میری رعایت کر تو میں تیری رعایت کرونگا۔ جیسے قَاتَلَ کے معنے ہیں یہ اُس سے لڑا اور وہ اس سے لڑا۔ اور بَاهَلَ کے معنے ہیں اُس نے اِس پر لعنت کی اور اِس نے اُس پر۔ اسی طرح اگرچہ رَاعِنَا کے عام استعمال میں یہی معنے لئے جاتے تھے کہ آپ ہماری رعایت کریں مگر لغت میں اسکا یہ مفہوم بھی ہے کہ تم ہماری رعایت کرو تب ہم تمہاری رعایت کریں گے اور اس میں گستاخی اور بے ادبی پائی جاتی ہے۔ یہودیوں کا منشاء تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے الفاظ بار بار استعمال کریں تا اُن سے سُن کر مسلمان بھی ان الفاظ کو استعمال کرنے لگ جائیں۔ اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب اور احترام

آہستہ آہستہ اُن کے دلوں سے دُور ہو جائے۔ اِس بدی کا سدّ باب کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے سختی سے حکم دیدیا کہ کوئی شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ لفظ استعمال نہ کرے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں جو تباہی اور خرابی پیدا ہوئی اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ادب اور احترام کے الفاظ گندے معنوں میں استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ انکی حکومتیں مٹ گئیں سلطنتیں برباد ہوگئیں صرف اس لئے کہ اُن کے نزدیک بادشاہ کے معنے بیوقوف کے ہوگئے۔ جہاں بادشاہ بیوقوف کو کہا جائیگا وہاں بادشاہ کا ادب کہاں رہیگا اور جب بادشاہ کا ادب مٹ گیا تو حکومت بھی تباہ ہوگئی۔ اسی طرح علماء اور بزرگوں کا ادب مسلمانوں کے دلوں سے اس طرح اُٹھا کہ حضرت کا لفظ جو اُن کے متعلق استعمال ہوتا تھا وہی لفظ شریروں اور بدمعاشو کے متعلق بھی استعمال کرنے لگ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کا ادب مٹ گیا اور اُن کی بے ادبی شروع ہوگئی اسی طرح دیکھو۔ اللہ تعالیٰ کے لفظ کی بے ادبی سے مسلمانوں پر کس طرح تباہی اور بربادی آئی ہے جب کسی کے پاس کچھ نہ رہے تو کہتے ہیں اب تو اللہ ہی اللہ ہے یعنی اُن کے نزدیک اللہ کے معنے صفر کے ہیں۔ اُن کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا اللہ اُن کے مدّ نظر ہے۔ یا حضرت ابوبکرؓ والا اللہ اُن کے ذہن میں ہے جن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر جبکہ وہ اپنا سارا مال خدا کی راہ میں دینے کے لئے لے آئے تھے پُوچھا تھا کہ آپ گھر میں کیا چھوڑ آئے ہیں۔ تو انہوں نے کہا تھا اللہ۔ یہ بالکل اللہ تک تھا لیکن مسلمان جب یہ کہتے ہیں کہ اب اللہ ہی اللہ ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اب کچھ بھی

نہیں رہا۔ غرض اسی رنگ میں اللہ کے لفظ کے استعمال کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں سے خدا تعالیٰ پر ایمان اُٹھ گیا اور اُن میں دہریت آگئی۔ پس اس بات کو اچھی طرح یاد رکھو کہ ادب اور احترام کے الفاظ کبھی گندی اور بُری جگہ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ ورنہ قابلِ احترام چیزوں کا ادب بھی اُٹھ جائیگا۔ اور اس کا نتیجہ سوائے تباہی اور بربادی کے اَور کچھ نہیں ہوگا۔ اسی طرح آیت۔ معجزہ کرامت۔ نبی۔ رسول۔ شہید وغیرہ تمام الفاظ ہمارے نزدیک بڑے معزز و مکرّم ہونے چاہئیں۔ ورنہ اگر ان الفاظ کا ادب اُٹھ گیا تو پھر ان لوگوں کا ادب بھی اُٹھ جائیگا جن کے متعلق یہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح اباحت اور بے دینی پیدا ہو جائیگی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ فرمایا کرتے تھے اَلطَّرِیْقَۃُ کُلُّھَا اَدَبٌ۔ یعنی روحانیت کی تمام تر بنیاد ادب پر ہے۔ اگر ادب ملحوظ نہ رکھا جائے یا ایسے الفاظ استعمال کرلئے جائیں جو ذو معنیین ہوں تو بعض دفعہ اس کا نہایت خطرناک نتیجہ نکلتا ہے۔

انشاء اللہ خان انشاء ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ اور ہمیشہ اس امر کی کوشش کیا کرتے تھے کہ بادشاہ کی تعریف میں دوسروں سے بڑھ کر بات کہیں۔ ایک دن دربار میں بادشاہ کی تعریف ہونے لگی۔ تو کسی نے کہہ دیا کہ ہمارے بادشاہ بڑے نجیب ہیں۔ انشاء اللہ خان نے فوراً کہا۔ نجیب کیا حضور تو اَنجب ہیں۔ اَب انجب کے ایک معنے تو زیادہ شریف کے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے ایک معنے لونڈی زادہ کے بھی ہیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ بادشاہ تھا بھی لونڈی زادہ۔ تمام دربار میں سنّاٹا چھا گیا۔ اور سب کی توجہ لونڈی زادہ والے مفہوم کی طرف پھر گئی۔ بادشاہ کے دل میں بھی یہ بات بیٹھ گئی۔ اور انشاء اللہ خان کو اُسنے قید کردیا اور آخر اسی قید میں انہیں جنون ہو گیا اور وہ مر گئے۔

غرض اللہ تعالیٰ مومنوں کو ہدایت دیتا ہے کہ دیکھو تم رَاعِنَا مت کہا کرو۔ بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو۔ اور ایسے طریق جن سے خدا کے رسول کی بے ادبی ہوتی ہو بچو۔

لَیًّا کے معنے بھی اِخْفَاءٌ وَکِتْمَانٌ کے ہیں جس میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ رَاعِنَا کا لفظ تو اُن کی زبانوں پر ہوتا تھا۔ مگر اس چیز کو چھپاتے ہوئے جو اُن کے مدنظر ہوتی تھی وہ اس لفظ کا استعمال کیا کرتے تھے۔ یعنی ان کی زبانوں پر تو یہی لفظ ہوتا۔ مگر دل میں کچھ اَور مطلب ہوتا۔ اصل میں تو یہ مراد ہوتی کہ تُو بڑا احمق اور خود سر انسان ہے۔ مگر جب پُوچھا جاتا تو صاف کہہ دیتے کہ ہم تو ان کی نظرِ عنایت کے طلبگار ہیں۔ اور رَاعِنَا عرض کر رہے ہیں حالانکہ یہ بات نہیں ہوتی تھی۔ اور پھر وہ الگ ہو کر کہا کرتے کہ دیکھا ہم نے نعوذ باللہ اسے اُس کے متبعین میں کیسا ذلیل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مومنوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے یہود دلیر ہو جاتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ماننے والے بھی انہیں کچھ وقعت نہیں دیتے۔ بے شک اُنْظُرْنَا کے بھی یہی معنے ہیں کہ ہماری طرف توجہ کیجیئے مگر اس میں برابری کا وہ مفہوم نہیں پایا جاتا جو رَاعِنَا میں پایا جاتا ہے۔ اگر اس کے مفہوم میں بھی یہ بات ہوتی کہ تُو توجہ کر تو پھر ہم بھی توجہ کرینگے تو بے شک بے ادبی ہوتی مگر اسکا یہ مفہوم نہیں ہے۔

اُنْظُرْنَا کے یہ بھی معنے ہیں کہ ہمارا انتظار کیجیئے یا ہمیں مہلت دیجیئے یا ہمیں موقعہ دیجیئے کہ ہم اپنی معروضات کو پوری طرح پیش کر سکیں۔ پس یہ ادب کے الفاظ ہیں اور ایسے ہی الفاظ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنا ایک مومن کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

وَاسْمَعُوْا میں بتایا کہ ہم تمہیں جو یہ حکم دیا ہے

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ

اہل کتاب میں سے اور نیز مشرکوں میں سے جن لوگوں نے (ہمارے رسولوں کا) انکار کیا ہے وہ پسند نہیں کرتے کہ

اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ

تم پر تمہارے رب کی طرف سے کسی قسم کی خیر (اور برکت) اتاری جائے اور (بھول جاتے ہیں کہ) اللہ تو

بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۱۰۶)

جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کیلئے خاص کر لیتا ہے۔ اور اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے ۱۲۳

تمہارا فرض ہے کہ تم اسے قبول کرو اور توجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں سنا کرو تاکہ تمہیں دوسری دفعہ آپؐ سے سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آوے اور یہ الفاظ تمہیں استعمال ہی نہ کرنے پڑیں۔ اگر پہلے توجہ نہ کرو گے اور آپؐ کی باتوں کو پورے غور کے ساتھ نہ سنو گے تو تمہیں یہ کہنا پڑیگا کہ ہمیں پھر سمجھائیے اسلئے خدا کے رسول کی باتوں کی طرف تم ایسی توجہ رکھو کہ یہ بات ہی پیدا نہ ہو اور دوسری دفعہ تمہیں سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے غرض وَاسْمَعُوْا کے دونوں مفہوم ہیں یہ بھی کہ تم ہماری بات مان لو اور یہ بھی کہ تم توجہ سے اس کی باتیں سنو تاکہ یہ صورت ہی پیدا نہ ہو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو یاد رکھو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بن جائیں گی اور تمہارے دل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت نہیں رہیگی۔ کیونکہ ظاہر کا باطن پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مگر ظاہری آداب سے وہ باتیں مراد نہیں جو انسان کو دوسرے کا غلام بنا دیں مثلاً دوسرے کے پاؤں یا گھٹنے کو ہاتھ لگانا۔ یہ ایک مومن کی انتہائی ذلت ہے جو کسی صورت میں بھی جائز نہیں دوسرے کا ادب بغیر اپنے نفس کو ذلیل کرنے کے بھی ہو سکتا ہے پس جس بات میں ذلتِ نفس پائی جائے اُسے کبھی اختیار نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اسلام ایسی تعلیم دیتا ہے۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ میں کفار سے مراد وہی مفسد اور فتنہ پرداز یہود ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت اور مسلمانوں میں منافقت کا بیج بونے اور اُن کے دلوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب اور احترام کم کرنے کے لئے اس قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو ایک دن انہیں اُن کی شرارتوں کا دردناک انجام دیکھنا پڑیگا۔

۱۲۳ تفسیر:۔ فرمایا نہ اہل کتاب اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تم پر خدا کا فضل نازل ہو اور نہ ہی مشرک۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن کی وجہ سے تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظاہری ادب ترک کر دو۔ اور تمہارے دلوں میں اُن کی وقعت کم ہو جائے اور اس طرح تم میں تفرقہ اور شقاق اور فساد پیدا ہو جائے اور تمہارا اتحاد جس کی وجہ سے تمہیں طاقت حاصل ہے جاتا رہے۔ اس لئے تمہیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔ دشمن کی غرض تو ہنسانا اور تضحیک کا پہلو پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مگر وہ جانتا نہیں کہ اس سے خود اُس کی کمینگی ظاہر ہوتی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا بگڑتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ

جس کسی پیغام کو بھی ہم منسوخ کر دیں یا بھلوا دیں تو اس سے بہتر یا اُس جیسا (پیغام) ہم (دوبارہ دنیا میں)

مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۷﴾

لے آتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہر ایک امر پر (جس کا وہ ارادہ کرے) پورا قادر ہے۔ ۲۲۴؎

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ فرماتا ہے اِن باتوں سے کیا بنتا ہے۔ خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے مختص کر لیتا ہے۔ اِس وقت اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی رحمت کو مخصوص کر دیا ہے پس تم چاہے کتنی گالیاں دے لو۔ خدا کا نبی جیتتا چلا جائیگا۔ کیونکہ اس کے لئے خدا تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئی ہوئی ہے۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ میں اِس طرف توجہ دلائی کہ اُس کی رحمت عام ہے اس لئے اگر تم ایمان لے آؤ تو ہماری رحمت ختم نہیں ہوگئی۔ اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں بھی ہماری رحمت سے حصّہ مل جائیگا۔

۲۲۴؎ **حل لغات** :۔ نَسَخَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَزَالَهٗ وَ اَبْطَلَهٗ وَ مَسَخَهٗ ۔ اُس نے کسی چیز کو مٹا دیا۔ باطل کر دیا اور مسخ کر دیا۔

نُنْسِهَا: اَنْسَى الرَّجُلُ الشَّيْءَ کے معنے ہیں حَمَلَهٗ عَلٰى نِسْيَانِهٖ ۔ اُسے بھول جانے پر آمادہ کر دیا۔ پس نُنْسِهَا کے معنے ہیں ہم بھلوا دیں اور ذہنوں سے محو کر دیں۔

اَلْاٰيَةُ کے معنے ہیں اَلرِّسَالَةُ ۔ رسالت۔

تفسیر :۔ یہ آیت ایسی اہم ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں اِس آیت کے متعلق جو غلط فہمی لوگوں میں پائی جاتی تھی اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام صرف اسی کو دُور کرتے تو میرے نزدیک یہی ایک بات آپ کی نبوت اور ماموریت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ اس کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں اُن کی موجودگی میں اسلام کو سچا مذہب قرار دینا یا اُسے قلبی تسلّی اور اطمینان کا موجب سمجھنا ناممکن تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں اس آیت کے معنے مسلمانوں میں یہ رائج تھے کہ ہم قرآن کریم کی جو آیت بھی منسوخ کر دیں یا اُسے بھلا دیں ہم اُس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت لے آتے ہیں۔ اس آیت کے یہ معنے کر کے وہ اِس سے قرآن کریم میں نسخ کا ثبوت نکالا کرتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات یقیناً منسوخ ہوگئی تھیں۔ اور منسوخ کے وہ یہ معنے لیتے تھے کہ اُن کے احکام کو معطّل کر دیا گیا تھا۔ اور بعض آیات کے متعلق وہ سمجھتے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے بھلا دیا تھا۔

اِس نسخ کے متعلق مسلمانوں کے مختلف نظریات ہیں۔ اُن کے نزدیک نسخ کی ایک قسم یہ ہے کہ آیت کے معنے تو قائم ہوتے ہیں مگر الفاظ محو کر دیئے جاتے ہیں گویا ایک آیت معنًا تو قرآن کریم میں موجود ہوتی ہے مگر اُس کے الفاظ اس میں نہیں ہوتے۔ وہ اس کی مثال یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کریم میں پہلے یہ آیت موجود تھی کہ اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ (روح المعانی جلد اوّل) یعنی اگر کوئی بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کریں تو اُن دونوں کو سنگسار کر دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے طور پر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔" مگر پھر اسے

نَسَخَ

نُنْسِهَا

اَلْاٰيَةُ

نکال دیا گیا لیکن اس کا حکم باقی ہے۔ اور اس پر عمل کرنا ضروری
ہے۔ دوسری آیت جو اُن کے خیال میں قرآن کریم سے نکال
دی گئی تھی وہ یہ ہے کہ لَوْ کَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِیَانِ
مِنْ مَّالٍ لَا بْتَغٰی وَادِیًا ثَالِثًا وَ لَا یَمْلَأُ جَوْفَهٗ
اِلَّا التُّرَابُ (فتح البیان جلد اول) یعنی اگر ابن آدم کے
پاس مال و دولت سے بھری ہوئی دو وادیاں بھی ہوں تو
وہ چاہتا ہے کہ ایسی ہی اُسے ایک تیسری وادی بھی مل جائے۔
اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر
سکتی۔

دوسری قسم کا نسخ وہ یہ بتاتے ہیں کہ الفاظ آیت
تو قائم رکھے جاتے ہیں۔ مگر اس کا حکم منسوخ کر دیا جاتا ہے۔
وہ اس کے ثبوت میں آیت لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (بقرہ آیت ۲۵۷)
کو پیش کرتے ہیں۔ اس آیت کا حکم اُن کے نزدیک منسوخ ہے
مگر الفاظ قائم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کو آیاتِ جہاد
نے منسوخ کر دیا ہے۔ اور اب کفار کو ڈنڈے مار مار کر اسلام
میں داخل کرنا جائز ہے۔ اس کی دوسری مثال وہ یہ دیتے
ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا
نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ
صَدَقَةً ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ (مجادلہ آیت ۱۳)
یعنی اے مومنو! جب تم رسول سے الگ مشورہ کرنا چاہو
تو اپنے مشورہ سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو۔ یہ تمہارے
لئے اچھا ہوگا اور تمہارے دل کو پاک کرنے کا موجب ہوگا
اُن کے نزدیک اس آیت کے حکم کو اگلی آیت نے منسوخ
کر دیا ہے کہ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ
نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ
عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا
اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (مجادلہ آیت ۱۴)
یعنی کیا تم مشورہ کرنے سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے؟ سو
چونکہ تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے تم پر فضل فرمادیا
ہے۔ پس تم نمازیں قائم کرو اور زکوٰتیں دو۔ اور اللہ تعالیٰ
اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو
اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔

تیسری قسم کا نسخ وہ ہوتا ہے جس میں اُن کے نزدیک آیت
کے الفاظ اور معنے دونوں منسوخ ہو جاتے ہیں۔ اس کی
مثال وہ تحویلِ قبلہ کا حکم بتاتے ہیں کہ پہلے مسلمان
بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے لیکن اب
اس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں۔ حالانکہ نہ اس کا حکم موجود
ہے اور نہ ہی عملاً اب مسلمان اس کی طرف منہ کر کے نماز
پڑھتے ہیں۔

غرض یہ تین قسمیں وہ منسوخ آیات کی بتاتے ہیں اور
نُنْسِهَا کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے
کہ وہ حصہ ذہنوں سے اُتر جاتا ہے۔ اس کی مثال وہ یہ
دیتے ہیں کہ دو صحابہؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
سے ایک سورۃ سیکھی۔ پھر وہ دونوں ایک رات اسے
پڑھنے لگے۔ مگر اس کا ایک لفظ بھی اُن دونوں کو یاد
نہ رہا۔ صبح ہوئی تو وہ دونوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ یا رسول اللہ
وہ سورۃ ہمارے ذہنوں سے اُتر گئی ہے آپ نے فرمایا
اِنَّهَا مِمَّا نُسِخَ وَ نُسِیَ یعنی یہ سورۃ بھی منسوخ آیات
میں سے تھی جسے خدا تعالیٰ کی طرف سے منسوخ کر دیا گیا
ہے۔ اور اسے بُھلا دیا گیا ہے۔ اسی مضمون کی ایک
روایت امام قرطبی نے بھی لکھی ہے۔

بعض نے نُنْسِهَا کی بجائے نَنْسَأْهَا پڑھا ہے۔ اُن
کے نزدیک اس کے معنے بُھلانے کے نہیں بلکہ یہ ہیں کہ ہم اسے
چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہم اسے
قرآن کریم میں ہی رہنے دیتے ہیں بدلتے نہیں۔

بعض نے اسے نُنْسِهَا ہی رکھا ہے مگر اس کے معنے
نُنْسِئْهَا کے لئے ہیں۔ یعنی ہم اسے غائب کر دیتے یا

ذہنوں سے محو کر دیتے ہیں۔ گویا وہ اِس کے معنے بھُول جانے کے لیتے ہیں۔ مگر ہر شخص معمولی تدبّر سے بھی کام لے کر سمجھ سکتا ہے کہ نسخ کا عقیدہ تسلیم کرنے کے بعد قرآن کریم کا کوئی اعتبار نہیں رہ جاتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ خدا تعالیٰ نے فلاں آیت کا حکم منسوخ کر کے اُسے قرآن کریم سے نکال دیا ہے تو یہ بات کم از کم قرآن مجید کے متعلق شبہ پیدا کرنے والی نہ ہوتی۔ یا جن آیات کو خدا تعالیٰ نے تبدیل کرنا تھا اُن کو قرآن کریم میں مندرج ہی نہ کیا جاتا بلکہ ان کی بجائے جو مستقل حکم دینا تھا صرف اُسے ہی درج کر دیا جاتا تب بھی کوئی بات تھی لیکن اگر اُن کی بجائے کوئی مستقل حکم نہ لانا تھا تو منسوخ شدہ آیات کو قرآن کریم میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ بے شک یہ درست ہے کہ بعض وقتی احکام منسوخ بھی ہوتے ہیں جیسا کہ صُحفِ ابراہیمؑ کو صحفِ موسیٰؑ نے منسوخ کر دیا اور صحفِ موسیٰؑ کو قرآن کریم نے منسوخ کر دیا۔ پس احکامِ الٰہیہ کا منسوخ ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہیں جو معیوب بات ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی طرف جو ایک دائمی شریعت ہے اس بات کو منسوب کیا جائے کہ قرآن کریم میں بعض آیات کو درج کر کے پھر انہیں نکال دیا گیا تھا پھر اگر ان کو خارج کر دیا جاتا تب بھی اتنی خطرناک بات نہ تھی۔ لیکن جب کوئی شخص یہ بات کہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات منسوخ ہیں اور اُن کے الفاظ قرآن مجید میں موجود ہیں اور وہ اس کے ثبوت میں کوئی وحیِ الٰہی پیش نہ کر سکے بلکہ صرف اپنا قیاس پیش کرے تو اس سے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور قرآن کریم کا کوئی اعتبار نہیں رہتا۔ انسانی دماغ کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ بعض باتوں کو ایک دماغ سمجھتا ہے اور دوسرا نہیں سمجھتا۔ اگر اس بات کا فیصلہ انسانی دماغ پر رکھا جائے کہ قرآن مجید میں سے کونسی آیت قابلِ عمل ہے اور کونسی منسوخ تو ایک رنگ میں سارا قرآن ہی منسوخ ہو جائیگا۔ کیونکہ کسی حصّہ کو کوئی نہیں سمجھتا اور کسی کو کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ آیات سے لے کر گیارہ سو آیات تک منسوخ قرار دی جاتی ہیں۔ گویا جس کی سمجھ میں پانچ آیتیں نہ آئیں اُس نے پانچ منسوخ کر دیں اور جس کی سمجھ میں سو نہ آئیں اُس نے سو منسوخ کر دیں اور جس کی سمجھ میں ہزار نہ آئیں اُس نے ہزار منسوخ کر دیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آکر بتایا کہ شروع سے لیکر آخر تک سارا قرآن قابلِ عمل ہے بسم اللہ کی باء سے لیکر والنّاس کے س تک قرآن کریم قائم اور قیامت تک کے لئے قابلِ عمل ہے۔ آپ کے یہ الفاظ مجھے خوب یاد ہیں کہ جب کوئی انسان اس بات کا قائل ہو گا کہ قرآن کریم کے اندر ایسی آیات بھی موجود ہیں جو منسوخ ہیں تو اُسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ قرآن کریم پر غور کرے اور سوچے اور اُس کے احکام پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ وہ تو کہیگا کہ جب اس میں ایسی آیات بھی ہیں جو منسوخ ہیں تو میں ان پر غور کر کے اپنا وقت کیوں ضائع کروں۔ ممکن ہے میں جس آیت پر غور کروں مجھے بعد میں معلوم ہو کہ وہ منسوخ ہے لیکن جو شخص یہ کہیگا کہ یہ کلام تمام کا تمام غیر منسوخ ہے اور اس کا ہر شوشہ تک قابلِ عمل ہے وہ اس کے سمجھنے کی بھی کوشش کریگا اور اس طرح قرآن اس کی معرفت کی ترقی کا موجب بن جائیگا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں بڑے بڑے علم والے لوگ پیدا کئے۔ مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے سارا علمِ قرآن حاصل کر لیا ہے۔ میں بھی کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بے شمار معارف کھولے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کریم کا سارا علم میں نے حاصل کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ کوئی شخص اس کے تمام معارف سمجھ لیتا تو قیامت آ جاتی۔ کیونکہ قرآن کریم قیامت تک کے لئے ہے۔ اور اس کے بعد اور کوئی کتاب نہیں۔ جب

اس میں سے نئے نئے مضامین نکلنے بند ہو جائینگے اُس وقت قیامت آجائیگی۔ پس اس کے معارف کبھی ختم نہیں ہو سکتے اور یہ کتاب ہمیشہ نئے نئے مطالب دنیا میں ظاہر کرتی رہیگی۔ اگر مفسرین اسے سمجھ نہ سکتے تھے تو کم از کم انہیں اس کی طرف اس قسم کی باتیں تو منسوب نہیں کرنی چاہئیں تھیں کہ جن کو کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ میں جب تفسیریں دیکھتا اور ان میں نسخ کی بحث پڑھتا ہوں تو مجھے تو ایک بھی آیت ایسی نظر نہیں آتی جو منسوخ ہو۔ اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔ کہ نسخ ماننے سے قرآن کریم کا وجود ہی بیکار ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس آیت کے جو معنے کئے گئے ہیں قرآن کریم کی رُو سے قطعًا غلط ہیں۔ اللہ تعالیٰ واضح الفاظ میں ایک دوسری جگہ فرماتا ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى (سورۃ الاعلیٰ آیت ۷) یعنی ہم یہ قرآن تجھے اس طرح پڑھائیں گے کہ اس کے نتیجہ میں تو بھولے گا نہیں۔ اگر نُنْسِهَا کا لفظ قرآن کریم کے لئے ہے تو سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى بھی تو قرآن کریم ہی کیلئے فرمایا گیا ہے۔ اب جو معنے وہ لوگ کرتے ہیں اُن کو مدّنظر رکھ کر ان دونوں میں سے ایک آیت ضرور منسوخ ہوگی۔ اگر دوسری کو منسوخ قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تو قرآن کریم ہمیشہ بھول جایا کریگا اور وہ تجھے کبھی یاد نہیں رہیگا۔ حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے بھی عجیب کام ہوتے ہیں۔ اس نے بھی یہ تدبیر کی کہ فَلَا تَنْسٰى والی آیت کو منسوخ کرنیکا خیال کسی کو بھی نہ سوجھا۔ حالانکہ اگر قرآن کریم میں نسخ قرار دینا تھا تو انہیں سب سے پہلے اس آیت کو منسوخ کرنا چاہیئے تھا مگر انہوں نے اسے منسوخ قرار نہیں دیا۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر آیت ۱۰) کہ ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے چلے جائینگے۔ اسجگہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دائمی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہم مستقل طور پر قرآن کریم کی حفاظت کرتے چلے جائیں گے۔ پس جس کلام کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اٹھایا ہے اُس کے بھول جانے یا اس میں کسی آیت کے منسوخ ہونے کے کیا معنے ہیں؟ اور اگر وہ بھول گیا یا اُس میں نسخ ہو گیا تو پھر اُس کی حفاظت کے کوئی معنے نہیں رہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حصہ منسوخ نہیں اس کا ایک ایک لفظ قابلِ عمل ہے اور یہ قیامت تک قائم رہنے والی شریعت ہے۔ میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں کسی کو کہتا ہوں کہ قرآن کریم کا ہر لفظ اور ہر زبر اور ہر زیر اپنے اندر معنے رکھتی ہے اور قرآن کریم میں چھوٹے چھوٹے فرق سے اُس کے معانی بدلتے جاتے ہیں۔ اور اس میں جسقدر حکمتیں ہیں کوئی کتاب انکی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ساری حکمتیں ہر شخص پر کھل جائیں۔ ہاں ہر زمانہ میں قرآن کریم کے کچھ نئے معنے کھلتے ہیں اور اُن کے علاوہ کچھ زائد معنے ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے اگلوں کے لئے رکھے ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

جو لوگ قرآن کریم میں نسخ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس کے ثبوت کے طور پر اس قسم کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہو کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ یا آپؐ نے یہ فرمایا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں آیت منسوخ کر دی ہے۔ یا لوگ آپؐ کی مجلس میں آئے ہوں اور آپؐ نے فرمایا ہو کہ مجھے الہام ہوا ہے کہ آج رات یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے وہ صرف استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ فلاں آیت کا فلاں آیت سے مخالف مفہوم ہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک ناسخ ہے اور دوسری منسوخ۔ گویا جو آیت بھی اُن سے حل نہیں ہوتی اُسے وہ منسوخ قرار دے

دیتے ہیں - اور یہ محض عدم علم کی وجہ سے ہوتا ہے - مگر
تعجب کی بات ہے کہ اِدھر تو وہ یہ کہتے ہیں کہ احادِ احادیث
قرآن کریم کو منسوخ نہیں کرتیں - اور یہ بات صحیح ہے -
ہم بھی کہتے ہیں کہ ایک چھوڑ کروڑ احاد احادیث بھی
قرآن کریم کا کوئی حصہ منسوخ نہیں کر سکتیں مگر دوسری
طرف وہ اپنے ظن اور قیاس سے کام لے کر قرآن کریم کی
آیات کو منسوخ قرار دینے لگ جاتے ہیں - انا للہ و انا الیہ
راجعون - منسوخ کی وہ قسم کہ جس کے الفاظ بھی
منسوخ ہوں اور حکم بھی منسوخ ہو اس کی وہ کوئی مثال
پیش نہیں کرتے - حالانکہ اُن کو چاہیئے تھا کہ وہ اس کی
کوئی مثال پیش کرتے اور بتاتے کہ فلاں آیت قرآن کریم
میں تھی اور اُس کے الفاظ اور حکم دونوں منسوخ ہیں -
وہ صرف تحویلِ قبلہ کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا حکم قرآن کریم
میں تھا مگر اس کے الفاظ وہ پیش نہیں کرتے اس لئے
ان کا یہ دعویٰ قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا -

پھر جن آیات کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ صحابہؓ
کو بھول گئی تھیں - اُن کا بھولنا تو ایک معجزہ بن جاتا
ہے - اگر کبھی ایسا ہوا ہوتا تو اس کے متعلق سارے
صحابہؓ میں شور پڑ جانا چاہیئے تھا - کیونکہ آپ سینکڑوں
آدمیوں کو قرآن کریم سکھاتے اور حفظ کرواتے تھے -
چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک لڑائی میں ستر قاری
شہید ہو گئے تھے - جب صرف ایک لڑائی میں شہید
ہونے والوں کی تعداد اس قدر ہو تو اس سے اندازہ لگایا
جا سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں کس قدر قاری
پائے جاتے تھے اور یہ سینکڑوں حفاظ ان پانچ حفاظ
کے علاوہ تھے جنہیں آیات نازل ہونے کے فوراً بعد
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد کروا دیتے تھے - یہ
پانچ خاص حفاظ تھے - اور آگے اُن کے سینکڑوں
شاگرد تھے جن کو آیاتِ قرآنیہ حفظ تھیں - پس اگر
بعض آیتیں یکدم ذہنوں سے محو ہو گئی تھیں تو مسلمانوں
میں شور مچ جانا چاہیئے تھا - اور چاہیئے تھا کہ اس قسم
کی بیسیوں روایات ہوتیں - اور بڑے بڑے جلیل القدر
صحابہؓ مثلاً حضرت ابوبکرؓ - حضرت عمرؓ - حضرت عثمانؓ
اور حضرت علیؓ وغیرہ کہتے کہ فلاں سورۃ ہمیں یاد تھی
مگر پھر اچانک بھول گئی - اسی طرح اگر لوگوں کو کوئی
آیت بھول جاتی تو وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ
سے پوچھتے - وہ کہتے کہ ہمیں بھی بھول گئی ہے - پھر
وہ حضرت عثمانؓ سے پوچھتے - وہ کہتے کہ مجھے بھی
بھول گئی ہے - پھر وہ حضرت علیؓ سے پوچھتے - وہ
کہتے کہ مجھے بھی بھول گئی ہے - پھر وہ سارے مل کر
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے اور آپ سے
پوچھتے تو آپؐ فرماتے کہ اسے تو فرشتے اٹھا کر لے
گئے ہیں اور مجھے بھی یاد نہیں رہی اس طرح تو ایک
شور پڑ جانا چاہیئے تھا - مگر کہا یہ جاتا ہے کہ صرف
دو آدمیوں کو جن کے باپ کا نام بھی معلوم نہیں ایک
سورۃ بھول گئی تھی - اور پھر یہ عجیب لطیفہ ہے کہ
وہ رات کو اکٹھے لیٹے اور پھر وہ اکٹھے ہی نماز کے
لئے اُٹھے اور پھر وہ آیتیں اکٹھی ہی اُن کو بھول گئیں
اور صبح کو پھر وہ اکٹھے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس پوچھنے کے لئے گئے - اور پھر یہ بھول
اتنی بڑھی کہ اس روایت کے راویوں کے نام بھی لوگ
بھول گئے - اور انہیں یاد نہ رہا کہ یہ دو کون آدمی
تھے - بھول کا یہ لطیفہ کوئی احمق ہی درست تسلیم کر
سکتا ہے عقلمند انسان تو اسے بالکل مان نہیں سکتا -

جن آیات کے الفاظ منسوخ اور معنے قائم قرار
دیئے جاتے ہیں - اُن کے متعلق قابلِ غور بات
یہ ہے کہ جب حکم قائم تھا تو اُن کے
الفاظ کو کیوں باطل کیا گیا؟ یہ بات بھی ایسی ہے

جیسے کوئی عقل تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتی۔ وہ لوگ اس کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں پہلے رجم کا حکم تھا مگر اب نہیں لیکن رجم کا حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اسی طرح قرآن کریم میں پہلے یہ آیت ہوا کرتی تھی کہ اَلشَّیْخُ وَ الشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا مگر اب یہ حکم تو قائم ہے مگر الفاظ نکال دیئے گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ الفاظ کیوں نکال دیئے گئے ہیں۔ اور اس کا کیا فائدہ ہوا؟ حکم تو موجود رہا پھر الفاظ کیوں غائب کر دیئے گئے؟

اس سے بڑھ کر یہ لطیفہ ہے کہ ایک اور آیت میں یہ ذکر آتا ہے کہ انسان بڑا حریص ہے۔ اس کے متعلق بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ منسوخ ہوگئی ہے۔ حالانکہ وہ ایک واقعہ ہے نہ کہ حکم۔ اور واقعہ کے متعلق سب مفسرین متفق ہیں کہ وہ منسوخ نہیں ہوا کرتا۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے اَمَّا الْاَخْبَارُ فَلَا یَکُوْنُ فِیْھَا نَاسِخٌ وَلَا مَنْسُوْخٌ یعنی خبروں اور واقعات میں کوئی نسخ نہیں ہوتا۔ (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد اول صفحہ ۲۵۰) پس واقعہ والی آیت کو منسوخ کرنے کے کیا معنے؟ اس کے تو یہ معنے بنتے ہیں کہ واقعہ کے متعلق خدا تعالیٰ کو غلطی لگ گئی تھی۔ حکم کے نسخ کے تو کچھ معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن غیر حکم میں تو نسخ نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیوں منسوخ ہوگیا؟

غرض یہ باتیں اپنی ذات میں اتنی مضحکہ خیز ہیں کہ کوئی انسان انہیں درست تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور پھر منسوخ شدہ آیات کے جو الفاظ بتاتے ہیں۔ وہ بھی عجیب و غریب ہیں شلًّا اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا میں شیخ کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔ اوّل عالم یا قوم کا رئیس اور سردار دوم شادی شدہ مرد کیونکہ عربی زبان میں شَیْخُ الْمَرْاَۃِ عورت کے خاوند کو کہتے ہیں۔ سوم۔ بوڑھا اور ضعیف انسان۔ ان معنوں کے لحاظ سے اس فقرہ کا یہ مفہوم بنتا ہے کہ اگر کوئی بڑا عالم یا معزز شخص زنا کرے تو اُسے رجم کر دو۔ چھوٹا کرے تو نہ کرو۔ دوسرے معنے یہ بنتے ہیں کہ اگر میاں بیوی آپس میں زنا کریں تو ان کو رجم کر دو۔ کیونکہ شیخ اور شیخۃ کے معنے اسجگہ میاں بیوی کے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ میاں بیوی بھی آپس میں زنا کیا کرتے ہیں۔ تیسرے معنے یہ بنتے ہیں کہ بڈھا مرد اور بوڑھی عورت جو ناقابل جماع ہوتے ہیں زنا کریں تو اُن کو رجم کر دو۔ غرض تینوں جگہ ناممکنات تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔ یعنی ناقابل جماع مرد اور عورت آپس میں زنا کریں۔ یا میاں بیوی زنا کریں تو اُن کو رجم کر دو۔ یا بڑے آدمی زنا کریں تو ان کو رجم کر دو اور اگر چھوٹے کریں تو نہ کرو۔ غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے اسے کوئی شخص قرآنی آیت قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

پھر سوال یہ ہے کہ یہاں نسخ آیات کے ذکر کا موقع ہی کیا تھا۔ یہاں تو یہودیوں کی کتاب کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اپنی ہی کتاب مانیں گے۔ پس اگر یہاں نسخ کا ہی ذکر تسلیم کیا جائے تو پھر اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ یہاں صُحُفِ ماضیہ کے نسخ کا ذکر ہے۔ یعنی تورات وغیرہ کا۔ مگر مفسرین کہتے ہیں یہاں قرآن کریم کے نسخ کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس بات کا پہلے مضمون کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ پہلے یہ مضمون ہے کہ یہود کہتے ہیں ہم خدا کے خاص فضلوں کے وارث ہیں ہم اپنے نبیوں کے کلام کو مانتے ہیں۔ غیر کے کلام کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے اُن کے سامنے یہ کیا دلیل پیش کی کہ میرا قرآن بھی منسوخ ہو جاتا ہے اور بُھلا بھی دیا جاتا ہے اس لئے تم اسے مان لو۔

حقیقت یہ ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَا اَوْ مِثْلِھَا میں قرآن کریم کی آیات کے منسوخ ہونیکا کہیں ذکر نہیں۔ بلکہ جیسا کہ ترتیب مضمون سے ظاہر ہے پچھلی آیات میں یہود کے متعلق

یہ ذکر کیا گیا ہے۔ کہ وہ نہیں چاہتے کہ تم پر کسی قسم کی خیر نازل ہو۔ اور سب سے بڑی خیر الہام الٰہی ہے۔ پس اس آیت میں کوئی ایسا ہی ذکر ہو سکتا ہے۔ جو پچھلی آیات کے مطابق ہو۔ کوئی مضمون بے تعلق نکالنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا اور وہ مضمون یہی ہے کہ یہود تو پسند نہیں کرتے کہ تم پر کوئی خیر نازل ہو لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے فضل کرتا ہے۔ پس اس نے تم پر خیر نازل کر دی ہے یعنی قرآن کریم لیکن چونکہ اس پر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ پہلے شرائع کے ہوتے ہوئے نئی کتاب کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ دیا کہ ان کتب کے بعض حصص اس قابل تھے کہ منسوخ کر دیئے جاتے اور بعض ایسی باتیں تھیں کہ مرورِ زمانہ سے لوگوں کو بھول گئی تھیں۔ اور آہستہ آہستہ کتبِ سماویہ سے محو ہو گئی تھیں۔ اُن کا دوبارہ بیان کرنا ضروری تھا۔ پس ایک حصّہ کو ہم نے منسوخ کر دیا اور اس سے بہتر تعلیم اس کتاب میں بیان کر دی۔ اور وہ تعلیم جو بھول گئی تھی اُس کو پھر اُسی طرح بیان کر دیا اور اہل کتاب اس پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خود اُن کی کتابوں میں نئی شریعت کی خبر موجود ہے۔ چنانچہ یرمیاہ باب ۳۱ آیت ۳۰ میں لکھا ہے:-

" دیکھ وے دن خداوند کہتا ہے۔ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہود کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔ اس عہد کے موافق نہیں جو میں نے اُن کے باپ دادا سے کیا۔"

اسی طرح عبرانیوں باب ۸ آیت ۸، ۹ میں لکھا ہے:-

" دیکھ خداوند فرماتا ہے۔ وے دن آتے ہیں کہ میں اسرائیل کے گھرانے اور یہود کے خاندان کے لئے ایک نیا عہد باندھونگا یہ اُس عہد کی مانند نہ ہوگا جو میں نے اُن کے باپ دادوں سے اُس دن کہ جب میں نے اُن کا ہاتھ پکڑا کہ انہیں سرزمین مصر سے نکال لاؤں باندھا تھا۔ اس واسطے کہ وے میرے عہد پر قائم نہیں رہے۔"

یہی معنے ہیں جو سیاقِ آیت اور قرآن کریم کے مضمون کے مطابق ہیں۔ ورنہ وہ معنے جو بعض مفسرین نے کئے ہیں اور جو اوپر بیان ہو چکے ہیں ہرگز درست نہیں۔ نہ تو الفاظِ قرآن کریم اُن کے متحمل ہیں اور نہ سیاقِ آیت اُن پر شاہد ہے اور نہ عقل ان کی تائید کرتی ہے۔ اور نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی بات مروی ہے جو اُن کے خیال کی مؤید ہو۔ قرآن کریم سب کا سب قابلِ عمل ہے۔ چنانچہ اپنی وفات کے دن تک آپؐ قرآن کریم کے تمام احکام کے عامل رہے اور اس پر عمل کرواتے رہے۔ اور قرآن کریم بھی کھلے الفاظ میں اپنے محفوظ ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ جیسا کہ آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ سے ظاہر ہے۔ پس ان واقعات کی موجودگی میں یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم کی بعض آیات منسوخ ہوں۔ اِس وقت جو قرآن کریم دنیا میں موجود ہے۔ اُس میں سے ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ اور اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں جس کے مٹانے کیلئے ہمیں کسی نسخ کے جواز کا فتویٰ دینا پڑے۔ وہ اپنی موجودہ صورت میں کامل اور بے عیب ہے۔ اور اسلام کے تمام مخالفین مل کر بھی اگر اس میں کوئی اختلاف ثابت کرنا چاہیں۔ تو نہیں کر سکتے اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے دعوے سے کہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا شخص جو علمی حیثیت رکھتا ہو یا کوئی مخالف جماعت قرآن کریم میں اختلاف ثابت کرنا چاہے تو ہم قرآن کریم سے ہی اُس کا ردّ

کر سکتے ہیں۔

غرض اس آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گذشتہ زمانوں میں جو پیغام آتے رہے ہیں یا آئندہ آئیں گے ان سب کے متعلق ہمارا ایک قانون جاری ہے اور وہ یہ ہے کہ کبھی تو وہ اپنی ضرورت کو پورا کر لیتے ہیں اور اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں مٹا دیا جائے اور اُن کی جگہ ایک نیا نظام آسمان سے اتارا جائے اور کبھی لوگ انہیں بھلا دیتے ہیں اور صرف اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو نظام لوگوں کی غفلت کی وجہ سے الٰہی نظام کی جگہ قائم ہو گیا ہے اُسے مٹا کر پھر نئے سرے سے وہی پہلا الٰہی نظام قائم کیا جائے۔ جب الٰہی نظام ہی اپنی ضرورت پوری کر کے مٹائے جانے کے قابل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اُس سے بہتر نظام دنیا میں بھجوا دیتا ہے۔ اور جب وہ نظام تو صحیح ہو اور لوگوں نے اُسے بھلا دیا ہو تو اللہ تعالیٰ اُسی پہلے نظام کو بجنسہٖ پھر دنیا میں قائم کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ دونوں قدرتیں حاصل ہیں۔

پھر فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ہم ایک انقلاب عظیم کے پیدا کرنے کے لئے اور ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین پیدا کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے کفار کو صرف اس امر کا تو غصہ نہ تھا کہ اُن کے خیالات کے خلاف ایک نیا خیال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں پیش کرتے ہیں۔ انہیں جس بات کا خطرہ تھا اور جس کا تصور کر کے بھی انہیں تکلیف محسوس ہوتی تھی وہ یہی تھی کہ کہیں قرآن کی حکومت قائم نہ ہو جائے۔ پس فرمایا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اے انکار کرنے والو! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا زمین و آسمان کا بادشاہ ہے پس جب اس نے اس بادشاہت کو ایک نئے رنگ میں قائم کرنیکا فیصلہ کر لیا ہے تو اس کے فیصلہ کے پورا ہونے کو کون روک سکتا ہے۔

غرض قرآن کریم نے مذاہب کے بارہ میں یہ قاعدہ بتایا ہے کہ ہر مذہبی نظام جو قائم کیا جاتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد یا تو ناقابلِ عمل ہو جاتا ہے یا لوگ اُسے بھول جاتے ہیں۔ ناقابلِ عمل وہ دو طرح ہوتا ہے۔ یا لوگ اُس میں ملاوٹ کر دیتے ہیں یا زمانہ کے مطابق اُس کی تعلیم نہیں رہتی۔ یعنی یا تو یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس تعلیم میں تصرف کر دیتے ہیں اور یا پھر تعلیم تو محفوظ ہوتی ہے مگر زمانہ چونکہ ترقی کر جاتا ہے اس لئے وہ قابلِ عمل نہیں رہتی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی کا لباس پھٹ جائے اور اُسے نیا لباس سلوانے کی ضرورت پیش آئے۔ یا بچہ ہو اور اُس کا لباس تو اچھا ہو لیکن قد بڑھ جانے کی وجہ سے اس کے قد پر اب پہلا لباس درست نہ آتا ہو اور نیا لباس تیار کروانا پڑے۔ اسی طرح تعلیم یا تو اس لئے بدل جاتی ہے کہ وہ خراب ہو جاتی ہے یا اس لئے بدل جاتی ہے کہ انسانی حالت میں ایسا تغیر آ جاتا ہے کہ پہلی تعلیم اسکے مطابق نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ سمجھتا ہے کہ اب اس کے لئے دوسری تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہ جو تعلیم کے خراب ہو جانیکی صورت ہے یہ بھی درحقیقت اسی وقت واقع ہوتی ہے جب وہ تعلیم ناقابلِ عمل ہو جائے۔ ورنہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنے دین کا خود محافظ ہوتا ہے۔ ہاں جب اس تعلیم کی ضرورت کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ بندوں سے کہتا ہے کہ اب بے شک اس میں تغیر و تبدل کر لو مجھے پروا نہیں۔ جیسے گھر میں بعض دفعہ کوئی خراب اور پھٹا پرانا کپڑا ہو اور بچہ اُسے پھاڑ دے تو ہم پروا نہیں کرتے۔ اسی طرح مذہب میں قطع و برید کی اجازت اللہ تعالیٰ اسی وقت دیتا ہے جب زمانہ کو اس تعلیم کی

ضرورت نہیں رہتی اور انسان کے حالات نئی تعلیم کا تقاضا
کرتے ہیں۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ اس فرسودہ مذہب کی
حفاظت چھوڑ دیتا ہے اور بندوں کو اجازت دے دیتا
ہے کہ وہ اس میں تصرف کریں اور اس سے کھیلیں۔ انسان
یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی تعلیم سے کھیل رہا ہے۔
حالانکہ خدا اس تعلیم کو زمانہ کے مطابق نہ پا کر اسے
بندوں کے حوالے کر چکا ہوتا ہے اور اپنی حفاظت کا
ہاتھ اس سے اُٹھا چکا ہوتا ہے۔ پس فرمایا کہ پیغام الٰہی
کے متعلق دو ہی صورتیں ہیں (۱) جب وہ ناقابلِ عمل ہو جاتا
ہے تو ہم اس سے بہتر تعلیم لاتے ہیں۔ بہتر کا لفظ اس لئے
استعمال کیا کہ پہلی تعلیم ناقابلِ عمل ہو چکی ہوتی ہے اور اب
اُس سے بہتر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر بہتر کی ضرورت نہ
ہوتی تو پہلی تعلیم ہی کافی ہوتی۔ اسی حقیقت کے اظہار
کے لئے نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ کے الفاظ استعمال فرمائے
(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جب تعلیم تو قابلِ عمل ہو مگر
لوگ اس پر عمل ترک کر دیں اور اپنے لئے خود ایسے قواعد
تجویز کر لیں جو الٰہی تعلیم کے مخالف ہوں۔ اس حالت میں
نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ پرانی تعلیم کی حکومت کو
از سرِ نو قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا اَوْ
مِثْلِهَا۔ یعنی جب تعلیم اپنی اصلی حالت میں موجود ہو
صرف لوگوں نے اس پر عمل چھوڑ دیا ہو تو پھر ہم ویسی ہی
تعلیم لے آتے ہیں۔ یعنی اسی تعلیم کو دوبارہ قائم کر دیتے
ہیں۔ مثل کا لفظ خدا تعالیٰ نے اس لئے استعمال کیا ہے
تا یہ بتائے کہ پہلی تعلیم چونکہ مر چکی ہوتی ہے اس لئے ہم
اُس میں نئی زندگی پیدا کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایک رنگ
میں پہلی تعلیم کا مثل ہوتی ہے۔

پس اس آیت میں بتایا گیا کہ کلامِ الٰہی بھی ایک عرصہ
کے بعد یا تو قابلِ عمل نہیں رہتا یا لوگ اس پر عمل ترک کر
دیتے ہیں۔ قابلِ عمل نہ رہنا دو طرح ہوتا ہے (۱) لوگ
اس میں ملاوٹ کر دیتے ہیں۔ (۲) یا زمانہ کے مطابق تعلیم
نہیں رہتی۔ ان دونوں حالتوں کے مقابل پر اللہ تعالیٰ کی
بھی دو سنتیں جاری ہیں۔ جب کلام ناقابلِ عمل ہو جائے
تو اللہ تعالیٰ اُسے منسوخ کر دیتا ہے اور اس سے بہتر تعلیم
بھیج دیتا ہے کیونکہ زمانہ ترقی کی طرف جا رہا ہوتا ہے۔ لیکن
جب لوگ عمل ترک کر دیں اور تعلیم محفوظ ہو تو اللہ تعالیٰ
اسی کلام کو دُہرا دیتا ہے۔ اور اُس کا مثل نازل کر دیتا ہے
یعنی اُسی تعلیم میں ایک نئی زندگی ڈال دیتا ہے۔ اِس آیت
کے آخر میں یہ جو فرمایا کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ
اِس بات پر قادر نہیں۔ ان الفاظ سے وہ معنے جو عام طور
پر اس آیت کے کئے جاتے ہیں یعنی کہا جاتا ہے کہ اس آیت
میں قرآنی آیات کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے ردّ ہو جاتے
ہیں۔ کیونکہ قرآنی آیات کے منسوخ ہونے سے قدرتِ الٰہی
کے اظہار کا کوئی تعلق نہیں۔ قدرت کا مفہوم انہی معنوں
میں پایا جاتا ہے جو مَیں نے کئے ہیں۔

پھر یہ جو فرمایا کہ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے
کہ ہر کلام جب آئے یا اُسے دوبارہ زندہ کیا جائے
وہ ایک انقلاب چاہتا ہے اور یہی امر لوگوں کے خیال
میں ناممکن ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسے انقلاب پر قادر
ہے۔ خواہ نئے کلام کے ذریعہ سے وہ انقلاب پیدا کر دے
خواہ پُرانے کلام ہی کو زندہ کر کے انقلاب پیدا کر دے۔

معنے جو مَیں نے کئے ہیں گو جدید ہیں لیکن آیت
کے تمام ٹکڑوں کا حل انہی معنوں کے ساتھ ہوتا ہے۔
پہلے مفسر اس کے معنے یہ کیا کرتے تھے کہ قرآن کریم میں
بعض آیتیں اللہ تعالیٰ نازل کرتا اور پھر انہیں منسوخ
کر دیتا ہے۔ مخالف اِن معنوں پر تمسخر کیا کرتے اور کہا کرتے
تھے کہ وہ آیت نازل کر کے اُسے منسوخ کیوں کرتا ہے
کیا اُسے حکم نازل کرتے وقت یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ حکم

لوگوں کے مناسبِ حال نہیں۔ دوسرے نسخ سے تو اُس کی
کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس فقرہ کے کیا معنے
کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ مگر جو معنے میں نے کئے
ہیں اُن میں ایک زبردست قدرت کا اظہار ہے۔ یہ آسان
کام نہیں کہ ایک ایسے قانون کو جو لوگوں کے دلوں پر نقش فی الحجر
کی طرح جما ہُوا ہو اور جسے چھوڑنے کے لئے وہ کسی صورت
میں بھی تیار نہ ہوں مٹا کر اس کی جگہ ایک نیا قانون قائم
کر دیا جائے۔ یا جبکہ ایک قوم مرگئی ہو اور اپنے قانون کو
پس پُشت ڈال چکی ہو اور اس کی خوبیوں سے غافل ہو گئی ہو
پھر اس مردہ قوم میں سے ایک حصہ کو زندہ کرکے اس بھلائی
ہوئی تعلیم کی حکومت دُنیا میں قائم کر دی جائے۔ یقیناً یہ
نہایت ہی مشکل کام ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت
پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس قدرت کے مزید اظہار کے لئے
ہی آیت کے آخر میں یہ الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں کہ اَلَمْ
تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کیا تمہیں
علم نہیں کہ زمین و آسمان کی بادشاہت خدا ہی کے ہاتھ
میں ہے۔ اور وہ ایسا انقلاب نہایت آسانی سے پیدا کرسکتا ہے
ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخی طور پر عیسوی دَور وہ پہلا دَور ہے
جو اس آیت کے دوسرے حصہ کے ماتحت آتا ہے۔ کہ
مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ
اَوْ مِثْلِهَا کہ ہمارے احکام جب لوگوں کے ذہنوں سے
اُتر جاتے ہیں تو ہم ویسے ہی احکام پھر اتار دیتے ہیں۔ یعنی
دوبارہ ان کو زندہ کر دیتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں ایک
ایسا نبی آیا جو نئی شریعت نہیں لایا۔ اور توراۃ کے بعض
مضامین کو اس نے نمایاں طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔
اسی طرح موجودہ زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ
والسلام کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ آپ وہ دوسری قسم کا
انقلاب پیدا کریں۔ جیسے اس آیت کے آخری حصہ میں بیان
کیا گیا ہے۔ یعنی کبھی انقلاب اس طرح بھی پیدا کیا
جاتا ہے کہ کتاب وہی واجب العمل رہتی ہے جو پہلے سے
موجود ہو مگر خدا تعالیٰ دوبارہ اس کی مردہ تعلیم کو زندہ کرنے
کے لئے ایک انسان اپنی طرف سے کھڑا کر دیتا ہے۔ جو
لوگوں کو پھر اس تعلیم پر از سرِ نو قائم کرتا ہے۔ اسی کی طرف
سورۃ جمعہ میں بھی ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ
ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا
عَلَیْھِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ
الْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔
وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ وَھُوَ الْعَزِیْزُ
الْحَکِیْمُ (سورۃ جمعہ ع) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے
اُمیّوں میں اپنا رسول بھیجا جو اُن پر آیات الٰہیہ کی تلاوت کرتا
ان کا تزکیہ نفس کرتا اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا
ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔ اور
وہ خدا ہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوبارہ
دنیا میں بھیجیگا اور پھر آپ کے ذریعہ ایک ایسی جماعت
پیدا کرے گا جو صحابہؓ کے رنگ میں کتاب جاننے والی
پاکیزہ نفس اور علم و حکمت سے واقف ہوگی۔ گویا وہی کام
جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نئے سرے سے حضرت
مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کرنا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے
کہ وہ کلامِ الٰہی جو اپنی ضرورت کو پورا کر لیتا ہے مٹا دیا
جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا قانون نازل کیا جاتا ہے
تو کیا قرآن کریم بھی کسی وقت منسوخ ہو سکتا ہے یا نہیں؟
سو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی نسبت اللہ تعالیٰ
واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ع) یعنی یقیناً ہم نے ہی
اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت
کرینگے۔ اور جس تعلیم کی حفاظت کی جائے اس کے معنے یہ
ہوتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی تمام تعلیموں سے افضل رہیگی۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِہَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْہَآ اَوْ مِثْلِہَا کہ اگر کوئی کلام منسوخ ہو تب اس سے بہتر لایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی نکلا کہ جس کلام کو منسوخ نہ کیا جائے اُس سے بہتر اور کوئی کلام نہیں۔ پس معلوم ہُوا کہ قرآن کریم نہ صرف گذشتہ تمام الہامی کتابوں سے افضل ہے بلکہ ہمیشہ افضل رہے گا اور اس کی تنسیخ کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم لائے۔ اور جو باتیں مٹ گئی ہوں ان کو دوبارہ زندہ کردے۔ آخر بائیبل کے مٹے ہوئے حصے کون دوبارہ لا سکتا تھا۔ جبکہ یہودی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو اس وقت تمام پُرانے صحیفے تباہ ہو گئے تھے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا م۳۶۵۳ و ۶۵۴) اِسی طرح کنفیوشس کی کھوئی ہوئی تعلیم کو کون لا سکتا تھا وید کے بھُولے ہوئے ٹکڑوں کو کون لا سکتا تھا۔ ژند اور اوستا کی بھولی بسری تعلیم کو کون لا سکتا تھا؟ صرف خدا ہی ان کو لا سکتا تھا۔ ورنہ سارے یہود مل کر بھی تورات کے گُم شدہ حصّے نہیں لا سکتے تھے۔ اسی طرح کنفیوشس کے ماننے والے مل کر بھی اُس کی تعلیم کو نہیں لا سکتے تھے۔ صرف خدا ہی اُسے لا سکتا تھا اور وہی لایا۔ اور قرآن کریم کے ذریعہ لایا۔ غرض اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ لوگ اعتراض کرینگے کہ ان کو کون لا سکتا ہے فرمایا ہم لا سکتے ہیں۔ اور ہم لاکر دکھا دیں گے۔ قرآن کریم نے یہود پر یہ دوسری حجت قائم کی ہے کہ تمہاری کتابیں مٹ چکی تھیں مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دوبارہ دنیا میں لا رہے ہیں۔ اگر تمہیں اس کے ماننے میں گریز ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی کتاب کو بھی نہیں مانتے۔ اور اُسے ردّ کرتے ہو۔ جب یہ پہلے سے بہتر تعلیم لایا ہے اور ایسی کتاب لایا ہے جس میں انسانی ضروریات جذبات احساسات تمدّن سیاست اور معاملات وغیرہ کے بارہ میں مکمل احکام موجود ہیں تو تمہیں چاہیئے تھا کہ خوش ہوتے اور اسے فوراً مان لیتے۔ اور اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے تو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تمہارے ناقص احکام بہرحال انسانی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہود کو یہ بات بُری لگتی تھی کہ اُن کی بجائے نبوت بنی اسمٰعیل میں کیوں آگئی۔ اور تورات کی بجائے قرآن کریم کی شریعت کیوں نازل ہوگئی! خدا تعالیٰ نے فرماتا ہے کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ بائیبل کو منسوخ کرکے اِس سے اعلیٰ کتاب قرآن کریم کی شکل میں لے آئیں۔ اور موسیٰؑ سے اعلیٰ اور بڑا نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں دنیا میں بھیج دیں۔ تورات کے متعلق خود یہود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بخت نصر کے وقت اُسے بالکل مٹا دیا گیا تھا۔ بلکہ عزرا نبی کے وقت تک جو قریباً چار سو سال قبل مسیح ہُوا تورات اور دوسرے انبیاء کی کتابوں کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا تب عزرا نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ الٰہی دنیا تاریکی میں ہے اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر روشنی کے ہیں۔ کیونکہ تیرا قانون جل گیا۔ پس کوئی نہیں جانتا اُن چیزوں کو جو تو کرتا ہے اور ان کاموں کو جو شروع ہونے والے ہیں لیکن مجھ پر اگر تیری مہربانی ہے تو رُوح القدس کو مجھ میں بھیج اور میں لکھوں۔ جو کچھ کہ دنیا میں ابتداء سے ہُوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا تاکہ تیری رٰہ کو پا دیں"۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

کیا تجھے معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ (تعالیٰ) ہی کی ہے؟

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۸﴾

اور اللہ (تعالیٰ) کے سوا تمہارا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔ ۲۵

نازل کی۔ کہ تُو چالیس دن کی علیحدگی اختیار کر۔ اور پانچ زود نویس اپنے ساتھ لے مَیں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن کرونگا۔ جو نہ بجھے گی تاوقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو تو لکھنا شروع کریگا۔ چنانچہ حضرت عزرا اور پانچ زود نویس چالیس روز تک دوسروں سے الگ تھلگ جا بیٹھے۔ اور انہوں نے الہامی تائید سے ان کُتب کو مکمل کیا (

APOCRYPHA 11
ESDRAS 14

غرض اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ تم تو اپنی تعلیموں کو بالکل بھول گئے تھے۔ مگر ہم نے تم پر یہ احسان کیا کہ تمہاری بُھولی ہوئی تعلیم کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ تم اس نعمت کی قدر کرتے تم نے اس کا انکار کر کے اپنی تعلیم سے بھی بے اعتنائی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

۲۵ تفسیر:۔ اس آیت میں اَلَمْ تَعْلَمْ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں بلکہ ہر انسان مراد ہے۔ چنانچہ اس آیت کا یہ دوسرا ٹکڑا کہ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات والا صفات سے نہیں ہے بلکہ فرداً فرداً ہر قاری سے یا ہر سامع سے یا ہر انسان سے ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اے انسان! یا اے قرآن کے پڑھنے والے یا اے قرآن کریم کے سُننے والے کیا تُو اِس بات کو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہت اللہ ہی کے قبضے میں ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ دنیوی بادشاہتیں بُرے لوگوں سے لے کر قابل ہاتھوں میں دے دیتا ہے اسی طرح رُوحانی بادشاہت بھی وہ بعض دفعہ ایک قوم سے لے کر دوسری قوم کو دے دیتا ہے۔

اور جب آسمان اور زمین دونوں ایک ہی بادشاہ کے تابع ہیں تو لازماً دونوں میں قانون بھی ایک ہی جاری ہونا چاہیئے اور آسمانی قانون کا زمینی قانون پر اور زمینی قانون کا آسمانی قانون پر قیاس کرنا چاہیئے۔ اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تمہارے پاس کوئی نص موجود نہ ہو تو تم قانونِ شرعی کا جو کہ آسمانی قانون ہے قانونِ قدرت پر جو کہ زمینی قانون ہے قیاس کر لیا کرو۔ کیونکہ جس طرح آسمانی بادشاہت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے زمینی بادشاہت بھی اُسی کے قبضہ میں ہے اور یہ ممکن نہیں کہ ان دونوں میں کوئی تخالف ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اس اصول کو ہمیشہ پیش فرمایا کرتے تھے۔ کہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے اور قانونِ قدرت اس کا فعل ہے۔ اولیٰ ناممکن ہے کہ دونوں کا بنانے والا تو ایک ہو اور ان میں کوئی اصولی اختلاف پایا جاتا ہو۔ جس طرح زمین میں یہ قانون جاری ہے کہ جب تک کوئی قوم بادشاہت کی ذمہ داریوں کو ادا کرتی رہتی ہے اس کے پاس بادشاہت رہتی ہے اور جب وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے تو بادشاہت اُس سے چھین لی جاتی ہے۔ اسی طرح جو مذہب دنیا کی

ضروریات کو پورا نہیں کرتے ان کو منسوخ کر دیا جاتا ہے۔
تمہارا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے پر
اعتراض کرنا قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ بہر حال کوئی
نہ کوئی کلام اس وقت لوگوں کی ہدایت کے لئے آنا چاہیئے
تھا۔ اگر یہ شخص نہ آتا تو کوئی اور آجاتا۔ بہر حال جب
پہلی کتابیں اپنی اصلاح کی قابلیت کو کھو بیٹھیں تو ضروری
تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی جگہ کوئی اور کتاب بھیج دیتا۔
حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بعثت کے
متعلق بھی اسی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا
ہے کہ ؎

میں نہ آتا تو کوئی اور ہی آیا ہوتا

یعنی زمانہ چاہتا تھا کہ کوئی مصلح آئے۔ پس اگر میں نہ آتا
تو کوئی اور آجاتا۔ یہی مضمون اس آیت میں بیان
کیا گیا ہے کہ تمہاری یہ ناراضگی کہ محمد رسول اللہ کیوں
نبی بن گئے بلاوجہ ہے۔ تم سماوی قانون کا قانونِ قدرت
پر قیاس کرو۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب کوئی چیز
مفید نہیں رہتی تو وہ مٹا دی جاتی ہے۔ جیسا کہ
اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ اَمَّا
مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (رعد آیت)
یعنی ہمارا یہ قانون ہے کہ جو چیز نفع رساں ہو اُسے زمین
میں قائم رکھا جاتا ہے اور جو چیز نفع مند نہ رہے اُسے
مٹا دیا جاتا ہے۔ اور یہی قانون شریعت کے متعلق بھی
ہے کہ جب وہ زمانہ کی غرض کو پورا نہیں کرتی تو اُسے
منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ

پہلے ہر فرد کو مخاطب کیا تھا اور اسے عام رکھا تھا۔ اب
صرف مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے لئے علاوہ
اللہ تعالیٰ کے کوئی دوست اور مددگار نہیں۔ جب تم
نے ساری دنیا کی کتابوں کو منسوخ قرار دے دیا ہے تو
پھر تمہارا کون دوست ہوگا۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام
یہود کے کلام کو منسوخ کرتے تو بے شک یہود اُن کے
دشمن ہوتے مگر ہندوؤں کو اُن سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔
اور اگر کوئی ہندوؤں کے کلام کو منسوخ کرتا تو ہندو تو
اُس کے دشمن ہوتے مگر دوسروں کو کیا ضرورت پڑی تھی
کہ وہ اُس سے دشمنی کرتے۔ اسی طرح اگر کوئی زرتشتیوں کے
کلام کو منسوخ کرتا تو زرتشتی تو اس کے دشمن ہو سکتے تھے
مگر یہودیوں کو اُس سے دشمنی کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔
مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کتاب نے تو تمام کتابوں
کو منسوخ کر دیا ہے اور یہ نبی تمام قوموں اور افراد کی
اصلاح کرنے کے لئے آیا ہے اور جب یہ تمام کتابوں کی
غلطیاں درست کرنے والا ہے اور ہر کتاب میں سے اس کا
کچھ حصہ منسوخ کر دیا ہے اور کچھ حصہ جو لوگوں کو بھول
چکا ہوتا ہے اُسے تازہ کرتا ہے تو اس نے تو ہر ایک کے
گھر میں تہلکہ مچا دیا۔ اس لئے تمام لوگ تمہارے دشمن
ہیں۔ گو اصل حقیقت یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اُن کی خیر خواہی کرتے ہیں مگر وہ تو اس بات کو نہیں سمجھتے۔
پس فرماتا ہے کہ جب تمہاری اس کتاب نے دوسروں کی
سب کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے تو تمہارا کوئی بھی دوست
نہیں ہو سکتا۔ سب لوگ تمہارے دشمن ہیں۔ ان الفاظ میں
اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر پیدائش
باب ۱۶ آیت ۱۲ میں اس طرح آتا ہے کہ:۔

"اُس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ
اس کے برخلاف ہوں گے۔"

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
کو مکہ میں بھجوایا۔ تو فرمایا کہ اس کے بھائیوں کی تلوار
ہمیشہ اس کے مقابلہ میں اور اس کی تلوار ان سب
کے مقابلہ میں اُٹھی رہے گی۔ یعنی ساری دنیا اس کی
دشمن ہو گی۔ یہی حالت حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ہے

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْـَٔلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسٰى

کیا تم اپنے رسول سے اُسی طرح سوال کرنا چاہتے ہو جس طرح (اس سے) پہلے موسیٰؑ سے

مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ

سوال کئے گئے تھے۔ اور (بھول جاتے ہو کہ) جو شخص کفر کو ایمان سے بدل لے تو سمجھو کہ وہ

ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٩﴾

سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔ ۲۶ ۵

کیونکہ آپ تمام اقوام کی طرف مبعوث ہوئے ہیں اسلئے تمام اقوام آپ کی مخالف ہیں۔ اور ہر ایک کی چوٹ ہم پر پڑتی ہے شریف لوگ بے شک ایسا نہیں کرتے۔ وہ بحیثیت افراد ہم سے تعلق رکھتے ہیں مگر بحیثیت جماعت نہیں۔ پھر لطیفہ یہ ہے کہ ہماری مخالفت میں ہندو۔ عیسائی اور مسلمان سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں قومیں اسلام پر تبر چلاتی ہیں۔ مگر احمدیت کے مقابلہ میں اسلام کا سارا درد ہندوؤں اور عیسائیوں میں چلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سب لوگوں کی اصلاح کے لئے آئے ہیں۔

غرض بتایا کہ چونکہ یہ رسول یہود و نصاریٰ اور زرتشتیوں کی کتابوں کو منسوخ کرتا ہے اس لئے آج روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی والی اور مددگار نہیں۔ پہلے بتایا تھا کہ یہودی چاہتے ہیں کہ تم میں بگاڑ پیدا ہو اس لئے اُن کی ظاہری حالت پر مت جاؤ وہ تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ اور اب بتایا کہ صرف یہود ہی کا سوال نہیں دنیا کی کوئی قوم تمہاری دوست نہیں ہو سکتی۔ یہ مضمون بھی واضح کرتا ہے کہ پہلی آیت میں قرآن کریم کی آیات کے منسوخ ہونے کا ذکر نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کی کُتب کے منسوخ ہونیکا ذکر ہے۔

ورنہ یہودیوں اور عیسائیوں کو کیوں غصہ آتا۔ اگر قرآن کریم کی آیات منسوخ ہوگئی تھیں تو اس پر انہیں کیوں غصہ آتا۔ ان کی دشمنی صاف بتا رہی ہے کہ چونکہ قرآن کریم نے انکی کتابوں کو منسوخ کر دیا تھا۔ اس لئے وہ ناراض ہوگئے پس پہلی آیت میں قرآن کریم کے نسخ کا ذکر نہیں بلکہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کے منسوخ کئے جانے کا ہی ذکر ہے۔

۲۶ ۵ حلِ لغات:۔ تَبَدَّلَ: یہ باب تفعّل سے ہے۔ اور باب تَفَعُّل کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں کسی چیز کو اختیار کر لینے کے معنے ہوتے ہیں پس مَنْ يَّتَبَدَّلِ کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی ایمان چھوڑ کر اس کے بدلہ میں کفر لے لیتا ہے۔

ضَلَّ: دو طریق پر استعمال ہوتا ہے۔ (۱) ضَلَّ الطَّرِيْقَ (۲) ضَلَّ عَنِ الطَّرِيْقِ۔ اسے راستہ نہ ملا۔ یا بھول گیا (اقرب) اسی طرح ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ اور ضَلَّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ آتا ہے۔

سَوَآءَ کے معنے ہیں سیدھا اور مستقیم جس میں کوئی کجی نہ ہو۔ پس معنے یہ ہوئے کہ درست یا صحیح راستہ سے جس میں کوئی کجی نہ ہو وہ گمراہ ہو گئے یا اُسے بھول گئے۔

تفسیر:۔ نادان عیسائی مصنف اعتراض کیا

تَبَدَّلَ

ضَلَّ

سَوَآءَ

کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نعوذ باللہ اپنی کم علمی
چھپانے کے لئے صحابہؓ کو سوال کرنے سے منع فرمایا کرتے
تھے لیکن قرآن کریم کی یہ آیت بتاتی ہے کہ صحابہؓ کو سوال
کرنے سے نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے
لوگوں جیسے سوال کرنے سے روکا گیا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ کوئی سوال زیادتیٔ علم کیلئے ہوتا
ہے اور کوئی کج بحثی کے لئے۔ کوئی بے ادبی کیلئے ہوتا ہے
اور کوئی تحقیر و تذلیل کے لئے۔ غرض ہر سوال الگ رنگ
رکھتا ہے۔ معقول انسان کبھی بھی کسی غیر معقول سوال
کی دوسرے کو اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی لڑکا
کالج میں پروفیسر کے سامنے کھڑے ہو کر سوال پر سوال کرتا
چلا جائے تو وہ لازماً اُسے ڈانٹے گا۔ اور کہیگا کہ تم
فضول وقت ضائع کر رہے ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں
ہوگا کہ پروفیسر اپنی کم علمی کی وجہ سے اسے سوال کرنے
سے روک رہا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے لغو اور
بے ہودہ سوالات کو ناپسند کیا ہے نہ کہ محض سوالات
کو چنانچہ سُئِلَ مُوْسٰی میں اسی طرف اشارہ کیا
گیا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لوگ جس قسم کے
سوالات کیا کرتے تھے۔ ان کا نمونہ قرآن کریم کی اس آیت
میں دکھایا گیا ہے کہ یَسْئَلُکَ اَھْلُ الْکِتٰبِ اَنْ
تُنَزِّلَ عَلَیْھِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا
مُوْسٰٓی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً
(نساء آیت ۱۵۴) یعنی یہ اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں
کہ تو آسمان سے اُن پر ایک کتاب اُتار کر لے آئے۔ یہ سوال
تو انہوں نے پھر بھی کم کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام
سے تو اس سے بھی بڑا سوال کیا گیا تھا۔ اور کہا گیا تھا
کہ تو خدا کو پکڑ کر ہمارے سامنے لے آ تب ہم ایمان
لائیں گے۔ اسی طرح تورات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا
ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بات بات پر
سوال کیا کرتے تھے۔ مگر صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ
وہ کہتے ہیں۔ ہم اس بات کا انتظار کیا کرتے تھے کہ
کوئی اعرابی آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
کوئی سوال پوچھے تاکہ ہم بھی سُن لیں۔ گویا انہیں اسقدر
وقار اور ضبطِ نفس حاصل تھا کہ خود کوئی سوال پوچھنے
کی جرأت نہیں کرتے تھے۔ بہر حال مسلمانوں کو صرف
ایسے سوال کرنے سے روکا گیا ہے جو سنّت اللہ اور
قانونِ شریعت کے خلاف ہوں یا اپنے اندر گستاخی اور
بے ادبی کا رنگ رکھتے ہوں۔ یا جن سے محض وقت
کا ضیاع ہوتا ہو۔ کوئی حقیقی فائدہ حاصل نہ ہو۔

مجھے یاد ہے حافظ روشن علی صاحب اور میں دونوں
حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پڑھا کرتے تھے
بعض اور دوست بھی ہمارے اس سبق میں شریک تھے۔
حافظ صاحب کی عادت تھی کہ وہ بات بات پر بال کی
کھال اتارنے کی کوشش کرتے اور بڑی سختی سے جرح کرتے
تھے۔ ابھی ہم نے بخاری کا سبق شروع ہی کیا تھا اور
صرف دو چار سبق ہی ہوئے تھے کہ حضرت خلیفہ اوّل
رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُن کے سوالوں سے تنگ آگئے۔ وہ
سبق کو چلنے ہی نہیں دیتے تھے پہلے ایک اعتراض کرتے اور
جب حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ اس کا جواب دیتے
تو وہ اس جواب پر اعتراض کر دیتے۔ پھر جواب دیتے
تو جواب الجواب پر اعتراض کر دیتے اور اس طرح اُنکے
سوالات کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کہتے ہیں
خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ میری عمر
اس وقت میں اکیس سال کی تھی اور طبیعت بھی تیز تھی
حافظ صاحب کو سوالات کرتے دیکھا تو میں نے خیال
کیا کہ میں کیوں پیچھے رہوں چنانچہ چوتھے دن میں نے
بھی سوالات شروع کر دیئے۔ ایک دن تو حضرت
خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ چُپ رہے۔ مگر دوسرے دن

جب مَیں نے بعض سوالات کئے تو آپ نے فرمایا حافظ صاحب کیلئے سوالات کرنے جائز ہیں تمہارے لئے نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ دیکھو تم بڑی مدت سے مجھ سے پڑھنے والے ہو اور تم میری طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ مَیں بخیل ہوں۔ یا کوئی علم میرے پاس ایسا ہے جسے مَیں چھپا کر رکھتا ہوں۔ مَیں نے کبھی کوئی بات دوسروں سے چھپا کر نہیں رکھی۔ جو کچھ آتا ہے وہ بتا دیا کرتا ہوں اب خواہ تم کتنے اعتراض کرو۔ مَیں نے تو بہرحال وہی کچھ کہنا ہے جو مَیں جانتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ بتا نہیں سکتا۔ اب کسی بات کے متعلق دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو جو بات مَیں نے بتائی ہے وہ معقول ہے تم اُسے سمجھے نہیں۔ یا پھر جو بات مَیں نے بتائی ہے وہ غلط ہے اور تمہارا اعتراض درست ہے۔ اگر جو کچھ مَیں نے بتایا ہے وہ غلط ہے۔ تو یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ مَیں بد دیانتی سے تم کو دھوکا دینے کیلئے کوئی بات نہیں کہتا۔ جو کچھ کہتا ہوں اُسے صحیح سمجھتے ہوئے ہی کہتا ہوں۔ اس صورت میں خواہ تم کتنے اعتراض کرو مَیں تو وہی کہتا چلا جاؤنگا جو مَیں نے ایک دفعہ کہا۔ اور اگر مَیں نے جو کچھ کہا ہے وہ درست ہے تو اُس پر اعتراض کرنے کے یہ معنے ہیں کہ وہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایسی حالت میں اگر تم اعتراض کروگے تو اس سے تمہاری طبیعت میں ضد پیدا ہوگی۔ فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے میری نصیحت یہ ہے کہ تم سوالات نہ کیا کرو۔ بلکہ خود سوچنے اور غور کرنے کی عادت ڈالو۔ اگر کوئی بات تمہاری سمجھ میں آجائے تو اُسے مان لیا کرو۔ اور اگر سمجھ میں نہ آئے تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کیا کرو کہ وہ خود تمہیں سمجھائے اور اپنے پاس سے علم عطا فرمائے۔ اس نصیحت کے بعد مَیں نے پھر حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ دن گذرے تو آپ نے حافظ صاحب کو بھی ڈانٹ دیا کہ وہ دورانِ سبق میں سوالات نہ کیا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے روزانہ بخاری کا آدھ آدھ پارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ بے شک اَور علوم بھی ہم پڑھتے تھے لیکن بہرحال آدھ پارہ روزانہ تبھی ختم ہو سکتا ہے جب طالب علم اپنے مُنہ پہ مہر لگا لے اور وہ فیصلہ کرلے کہ مَیں نے اُستاد سے کچھ نہیں پُوچھنا۔ جو کچھ وہ بتائے گا اُسے سُنتا چلا جاؤں گا۔ بہرحال حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ کے اس روکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مَیں نے خود قرآن کریم پر غور کرنا شروع کر دیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ مَیں ابھی طالب علم ہی تھا کہ مَیں نے خود درس دینا شروع کر دیا۔ گویا حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوالات سے روک کر میرے ذہن کو اس طرف متوجہ کر دیا کہ مجھے خود بھی قرآن کریم پر غور کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سوالات سے روک کر اُن کی فطرت اور ذہنیت کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ بے شک بعض اوقات دوسرے سے بھی کوئی بات پوچھنی پڑتی ہے مگر زیادہ تو خود ہی غور کرنے کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ مَیں نے دیکھا ہے قرآن کریم میں آدمؑ کا قصہ آ جائے تو لوگ بڑی کثرت سے سوال کرنے لگ جاتے ہیں حالانکہ اگر سوال کرنے کی بجائے وہ خود سوچیں تو اُن کی تمام مشکلات حل ہو جائیں۔ اسجگہ صرف ایسے ہی سوالات سے روکا گیا ہے جو انسان کے ایمان کو تباہ کر دیتے ہیں اور اُس کے اندر کفر پیدا کر دیتے ہیں۔ ورنہ عام سوالات سے جو تحقیق کی غرض سے کئے جائیں اسلام منع نہیں کرتا۔

وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔ فرماتا ہے۔ سوال کی اصل غرض تو علم کی زیادتی ہوتی ہے۔ مگر جو شخص گستاخانہ سوالات کرتا رہتا ہے اور خدا اور اس کے رسول اور اس کے کلام کا ادب ملحوظ نہیں رکھتا۔ وہ اس گستاخی کے نتیجہ میں اپنے پہلے ایمان کو بھی کھو بیٹھتا ہے اور ایمان میں ترقی کرنے کی بجائے کفر کی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ دائرۂ ادب کے اندر رہتے

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

اہلِ کتاب میں سے بہت سے لوگ بعد اس کے کہ حق اُن پر خوب کھل چکا ہے اُس حسد کی وجہ سے جو اُن کی اپنی ہی

اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا

جانوں سے (پیدا ہوا) ہے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لے آنے کے بعد تمہیں پھر کافر بنا دیں۔ پس تم اُس وقت تک کہ

تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ

اللہ (تعالیٰ) اپنے حکم کو نازل فرمائے اِنہیں معاف کرو اور (ان سے) درگذر کرو۔

بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اللہ یقیناً ہر ایک امر پر پُورا (پورا) قادر ہے ۱۲۷

ہوئے نیک نیتی سے سوال کرتا تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔ پس انسان کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ اپنے قلب کا جائزہ لیتا رہے اور لغو بحثوں اور لغو سوالات میں حصہ نہ لیا کرے۔ حضرت مولوی عبداللہ صاحب غزنوی جنہوں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا تھا کہ قادیان سے ایک نُور نکلا ہے مگر میری اولاد اس سے محروم رہی ہے۔ اُن کے پاس ایک دفعہ کوئی مولوی بحث کے لئے آگیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مَیں بحث کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ مولوی صاحب کی نیّت بخیر ہو۔ معلوم ہوتا ہے وہ مولوی اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت رکھتا تھا۔ اُس نے یہ فقرہ سُنتے ہی کہہ دیا کہ مَیں آپ سے بحث نہیں کرتا کیونکہ مناظرات میں عموماً نیت بخیر نہیں ہوتی بلکہ صرف اتنا ہی مقصد ہوتا ہے کہ دوسرا فریق ذلیل ہو جائے۔ اور لوگوں میں واہ واہ کا ایک شور مچ جائے۔ غرض چونکہ بعض سوال حق پانے کے لئے نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کی غرض محض بحث و مباحثہ لڑائی اور دوسرے کو شرمندہ کرنا ہوتی ہے۔ اِس لئے فرماتا ہے کہ مومنوں کو اس قسم کے سوالات سے بچنا چاہیئے۔

۱۲۷ حل لغات:۔ وَدَّ کے معنے چاہنے کے ہیں۔ اور وَدُوْد بہت محبت کرنے والے کو کہتے ہیں۔

لَوْ کے معنے "کاش" کے ہوتے ہیں۔ اور یہ "اگر" کے معنے بھی دیتا ہے۔ اسی طرح مصدری معنے بھی دیتا ہے۔

يَرُدُّوْنَكُمْ:۔ یہ اَنْ يَّرُدُّوْكُمْ کا قائم مقام ہے۔ چونکہ اسجگہ دو مفعول آئے ہیں اِس لئے یہ صَيَّرَ كُمْ کے معنے دیتا ہے جس کے معنے بنا دینے کے ہیں۔ كُمْ مفعول اوّل اور كُفَّارًا مفعول ثانی ہے اور حَسَدًا مفعول لہٗ ہے۔

عَفْو کے معنے مٹا دینے کے ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ کسی مذہبی امر کے متعلق ہو تو اِس کے معنے گناہ کو مٹا دینے کے ہوتے ہیں۔

صَفْح کے معنے ہیں "پہلو پھیر لیا"۔ جب انسان مقابلہ کرنا چاہتا ہے تو سامنے آتا ہے اور اُس کا ناک آنکھ مُنہ نظر آ رہا ہوتا ہے۔ لیکن جب مقابلہ نہ کرنا چاہے تو دوسری طرف چلا جاتا ہے اسلئے اس کے معنے ہیں درگذر کرنا۔ مُنہ پھیر لینا۔

وَدَّ

لَوْ

يَرُدُّوْنَكُمْ

عَفْو

صَفْح

تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آخری عمر میں اُن کا پلوٹھا بیٹا اسمٰعیلؑ ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہُوا اور اس کے بعد اُن کی پہلی بیوی سارہ کے بطن سے اسحاقؑ پیدا ہُوا۔ سارہ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ماموں کی بیٹی تھی انکو خیال تھا کہ میں خاندانی ہوں اور ہاجرہ باہر کی ہے۔ اس لئے وہ اپنا درجہ بڑا سمجھتی تھیں۔ اتفاقاً حضرت اسمٰعیلؑ جو بچے تھے ایک دفعہ حضرت اسحاقؑ کی کسی حرکت پر یا کسی اور وجہ سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ حضرت سارہ نے سمجھا کہ اس نے میری اور میرے بچے کی تحقیر کی ہے اور قہقہہ مارا ہے شاید یہ بھی خیال کیا کہ یہ اس بات پر خوش ہے کہ یہ بڑا بیٹا ہے اور یہ وارث ہو گا اور اسحاق وارث نہیں ہو گا۔ تب انہوں نے غصہ میں آکر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اس کو اور اس کی ماں کو گھر سے نکال دو کیونکہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے بیٹے کے ساتھ یہ بڑا بیٹا وارث ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے تو اس بات کو بُرا منایا۔ اور اس کام سے رُکے۔ مگر خدا تعالیٰ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مکہ سے ظاہر کرنا چاہتا تھا اُس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی کی کہ جو کچھ تیری بیوی سارہ کہتی ہے وہی کر۔ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۲) چنانچہ خدا کے حکم کے ماتحت حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو وادیٔ حرم میں چھوڑ گئے اور سارہ اور اسحاقؑ کے سپرد کنعان کا علاقہ کر دیا گیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل نے مکہ میں بڑھنا شروع کیا اور وہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسمٰعیل کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مگر یہ رقابت یہیں ختم نہیں ہو گئی بلکہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش پر انکی ماں سے کہا تھا۔ اسی طرح ہُوا کہ

"اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اسکے خلاف ہونگے۔" (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲)

یعنی ایک زمانہ تک اسماعیلی نسل تھوڑی ہوگی اور اسحاقؑ کی نسل زیادہ ہوگی اور وہ سب کے سب مل کر اسماعیلی سلسلہ کی مخالفت کرینگے۔ اور کوشش کرینگے کہ وہ کامیاب نہ ہو قرآن مجید نے اس کا یوں ذکر فرمایا ہے کہ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ الخ یعنی اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اسمٰعیلی نسل یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اُسے چھوڑ کر پھر کافر ہو جائیں اور یہ بغض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قصور کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کے اپنے دلوں سے پیدا شدہ بغض کی وجہ سے ہے اور رقابت کی وجہ سے ہے۔ وہ سارہ اور ہاجرہ کی لڑائی کو دو ہزار سال تک لمبا لے جانا چاہتے ہیں۔ پس اُن کی اس خواہش کی بنیاد کسی جذبۂ خلوص پر نہیں بلکہ اُن کے حسد پر ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مان کر تم اُن سے نیکی اور تقوٰی میں بڑھ گئے ہو۔ پس اب وہ اس کا ازالہ اس رنگ میں کرنا چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی ایمان سے محروم کر دیں۔ حالانکہ اگر وہ خود ایمان لے آئیں تو وہ بھی مسلمانوں کے دوش بدوش نیکی اور تقوٰی میں ترقی کر سکتے ہیں۔ مگر اُن کے دلوں میں یہ جلن ہے کہ تم نے مان لیا اور وہ محروم رہ گئے۔ اور اس حسد اور بغض کی وجہ سے وہ تمہاری کسی نیکی اور خوبی کو برداشت نہیں کر سکتے۔

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ دوسرا مفعول لہٗ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنے ہونگے کہ یہ جذبہ خود اُن کے اپنے نفس کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہُوا ہے۔ تمہارا کوئی فعل اس کا باعث نہیں۔ دُنیا میں حسد دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو باعث کے لحاظ سے اچھا ہوتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو باعث کے لحاظ سے

بھی بُرا ہوتا ہے اور نفس کے لحاظ سے بھی بُرا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی غیر مسلم مال و دولت میں بڑھ جائے اور کوئی مسلمان اس پر حسد کرے تو یہ حسد اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ کفر کی طاقت بڑھ گئی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کفر کو ناپسند کرتا ہے اور اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اپنا نفس اس بات کو برداشت نہ کر سکتا ہو کہ کسی غیر مسلم کو زیادہ دولت مل جائے۔ اور پھر یہ حسد محض نفسانی بھی ہو سکتا ہے جس میں کسی دینی جذبہ کا دخل نہ ہو بلکہ محض دنیوی خواہشات اس کی پشت پر کام کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کا حسد مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ ہے۔ یعنی یہ حسد اُن کے اپنے نفسوں کی خرابی اور بخل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے جس کا موجب مسلمانوں کا کوئی فعل نہیں۔ اگر مسلمان ان کو چڑاتے اور اس وجہ سے انکو غصہ آتا تو پھر حسد کا باعث مسلمان ہوتے لیکن مسلمان تو اُن کی خیر خواہی کرتے اور اُن کی ترقی کی کوشش کرتے ہیں پس اُن کا حسد اُنکے اپنے نفس سے پیدا ہوا ہے۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ۔ مسلمانوں کو کافر بنانے کی خواہش دو وجوہ سے ہو سکتی تھی۔ اوّل اس وجہ سے کہ اہل کتاب غلطی سے یہ سمجھتے ہوں کہ مسلمانوں کی حالت کفار سے بگڑی ہوئی ہے اس لئے بہتر ہے کہ وہ پھر کفر اختیار کر لیں۔ دوسرے اہل کتاب غلطی سے نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت سمجھتے ہوں کہ مسلمانوں کی حالت اہل مکہ کی حالت سے بھی گری ہوئی ہے اور سمجھتے ہوں کہ اگر یہ اس پہلی حالت پر رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر واقع میں اُن کی یہ خواہش نیک نیتی پر مبنی ہوتی تو اور بات تھی مگر اُن کی یہ خواہش اس لئے نہیں کہ مکہ والے ان سے اچھے ہیں بلکہ یہ لوگ محض حسد کی وجہ سے ایسی خواہش کرتے ہیں۔ دوسرے یہ خواہش کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ یہ جانتے ہوئے کہ مکہ والوں کی حالت ان سے ادنیٰ ہے اور یہ جانتے ہوئے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے پھر بھی یہ مسلمانوں کو کافر بنا دینے کے درپے ہیں۔ پس یہ مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے بھی دشمن ہیں۔ اسجگہ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ نے واضح کر دیا ہے کہ باوجود اس بات کے جاننے کے کہ اِس مذہب کو فضیلت حاصل ہے پھر بھی لوگ چاہتے ہیں کہ کفر پھیلے اور ہدایت کا دائرہ زیادہ سے زیادہ تنگ ہوتا چلا جائے۔ مسلمانوں کے متعلق اہل کتاب کی جس خواہش کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے قرآن کریم کے بعض اور مقامات میں بھی اس کا بیان ہوا ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ (آل عمران آیت ۷۰) یعنی اہل کتاب میں سے ایک گروہ یہ آرزو رکھتا ہے کہ کاش وہ تمہیں گمراہ کر دے۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو ہی گمراہی میں مبتلا کر رہے ہیں۔ اسی طرح سورہ آل عمران میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (آل عمران آیت ۱۰۱) کہ اے مومنو! اگر تم ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے کسی فریق کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر تمہیں کافر بنا دینگے۔

فَاعْفُوْا: گناہوں کو تین رنگ میں مٹایا جاتا ہے۔ اوّل دنیوی نتائج کے لحاظ سے۔ جیسے گنہگار کو جسمانی سزا سے بچا لینا۔ دوم اُخروی نتائج کے لحاظ سے۔ جیسے گنہگار کو شرعی سزا سے بچا لینا۔ سوم گناہ کے زنگ اور اس کے میلان تک کو مٹا دینے کے لحاظ سے۔ یہ عفو کامل سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں دل پر جو گناہ کا زنگ لگ جاتا ہے اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے۔ چونکہ اسجگہ مسلمان مخاطب ہیں۔ اس لئے اسجگہ اُخروی شرعی سزا مراد نہیں بلکہ دنیوی سزا

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ

اور نماز کو (مطابق شرائط) قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور (یاد رکھو کہ) جو نیکی بھی تم (اپنی ذات کے لئے آگے

مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

بھیجوگے تم اُسے اللہ کے پاس پاؤگے۔ اللہ (تعالیٰ) تمہارے اعمال کو یقیناً دیکھ رہا ہے۔ ۱۲۸

مراد ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ تم ان کو خود سزا دینے کی کوشش نہ کرو۔ بلکہ عفو سے کام لو۔

فَاعْفُوْا کی ف لو سے ظاہر ہے کہ یہ حکم اہل کتاب کے کسی پہلے فعل کے نتیجہ میں دیا گیا ہے۔ اور وہ پہلا فعل یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کو پھر کافر بنانا چاہتے تھے۔ پس فَاعْفُوْا کا یہ مطلب نہیں کہ چونکہ یہ لوگ تمہیں دین سے منحرف کرنا چاہتے ہیں اس لئے تم انہیں معاف کردو کیونکہ معافی کا موجب ہمیشہ کوئی نیکی ہُوا کرتی ہے اور نیکی انہوں نے کوئی کی نہیں بلکہ الٹا یہ خطرناک دشمنی کی کہ مسلمانوں کی مرکزیت کو تباہ کرکے پھر انہیں لامرکزیت کی طرف لے جانیکی کوششیں شروع کردیں۔ ایسی صورت میں اُن کی کسی نیکی کو اس معافی کا موجب نہیں سمجھا جاسکتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انہوں نے کوئی نیکی نہیں کی بلکہ ذکر یہ کیا جا رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک ایک کرکے پھر مرتد کرنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا کا حکم کیوں دیا گیا؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں عفو اور صفح سے عفو کی تین مذکورہ بالا قسموں میں سے صرف اوّل قسم مراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ تم انہیں جسمانی سزا دینے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ اُن کے اس فعل کی سزا ہم خود انہیں دینگے۔ اور عفو کے ساتھ صفح کو جس کے معنے مُونہہ پھیر لینے کے ہیں اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ نہ صرف اُن کو کوئی سزا نہ دو بلکہ یوں بھی سختی سے پیش نہ آؤ۔ بلکہ اُن سے اعراض کرو۔ اسی لئے فرمایا کہ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ۔ یعنی تم اُن سے درگذر کرو۔ یہاں تک کہ اُن کے لئے خدا تعالیٰ کا فیصلہ نافذ ہو جائے۔ یا اُن پر عذاب نازل ہو جائے۔ اسجگہ امر سے مراد جہاد کا حکم نہیں ہے بلکہ یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نافذ کرے۔ یعنی مختلف عذابوں سے انہیں ہلاک کرے۔ آخر جو لوگ جسمانی۔ قلبی۔ دماغی اور روحانی لحاظ سے اتنے بڑے جرائم کے مرتکب ہو جائیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ کفار اُن سے ادنیٰ ہیں پھر بھی مسلمانوں کو کفر کی طرف لوٹانا چاہیں اور پھر یہ لوگ حاسد بھی ہوں اور حسد کا موجب انکے اپنے نفسوں کی کمینگی اور گندگی ہو تو انکو سوائے خدا کے اور کون سزا دے سکتا ہے۔ انسان صرف جسمانی سزا دے سکتا ہے۔ وہ دماغی فکری قلبی اور روحانی سزا کسی کو نہیں دے سکتا۔ یہ قطعی اور یقینی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مل سکتی ہے کیونکہ انسان کے دماغ قلب جسم اور روح پر اُسی کا قبضہ ہے اسلئے فرمایا کہ ان پر ہم چوٹ لگائینگے۔ تم انہیں ہمارے لیے چھوڑ دو۔ ہم انکے دماغ پر بھی چوٹ لگائینگے ہم انکے فکر پر بھی چوٹ لگائینگے۔ ہم انکے قلب پر بھی چوٹ لگائینگے ہم انکی رُوح پر بھی چوٹ لگائینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہود مدینہ نے زبانی باتوں سے گذر کر سیاسی طریقوں سے مسلمانوں کو دکھ پہنچانا چاہا اور قتل تک کی سازشیں کیں۔ تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن سے جنگ کی اجازت ہوئی اور مسلمانوں کی قلیل جماعت کے ہاتھوں یہود سخت ذلیل اور رُسوا ہوئے۔

۱۲۸ تفسیر:- خدا تعالیٰ کا یہ کہنا کہ تم ان لوگوں کو سزا نہ دو بلکہ اسے ہم پر چھوڑ دو چونکہ مسلمانوں پر

گراں گذر سکتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ جب تمہیں دشمن کے مقابلہ میں اپنی بے بسی کو دیکھ کر غصہ آئے اور تمہارے لئے صبر کرنا مشکل ہو جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر جھک جاؤ اور نمازوں میں ہم سے دعائیں مانگو۔ کہ اے اللہ تو خود ان کو ہدایت دے اور اگر ان کے لئے ہدایت مقدر نہیں تو ہمیں انکے شر سے محفوظ رکھ۔ اور انہیں ہمارے راستہ سے ہٹا دے۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ - اور دوسرا علاج یہ ہے کہ تم زکوٰۃ کے ذریعہ غرباء کی مدد کرو۔ یتامٰی و مساکین اور بیوگان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ قوم کے کمزور طبقہ کو اونچا کرنے کی کوشش کرو۔ اور وہ لوگ جو کفار میں سے نیک نیتی کے ساتھ مذہب کی تحقیق کرنا چاہیں انکو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرو۔ اس میں اشارہ فرما دیا کہ ان لوگوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے۔ جسے ہم بچانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حسن سلوک کے ذریعے اپنی طرف کھینچ لو۔ جب وہ ان میں سے نکل آئیں گے تو باقیوں کو ہم ہلاک کر دینگے۔

وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ - اس میں بتایا کہ تم جو بھلائی کے کام کرو گے اُسے تم خدا تعالیٰ کے حضور پاؤ گے۔ یعنی تم یہ خیال مت کرو کہ یہ صبر کی تعلیم نقصان دہ ہے۔ صبر کرنا اپنی ذات میں ایک بڑی نیکی ہے۔ اور وہ تمہارے نیک اعمال میں اسی طرح شمار کی جاتی ہے جس طرح نماز اور روزہ وغیرہ۔ چونکہ گالیاں سُنکر صبر کرنا ایک بڑا مجاہدہ ہے اس لئے فرمایا کہ جب اس کی جزا تمہیں قیامت کے دن ملے گی تو یہ ایک نیکی ڈھیروں ڈھیر ثواب کی صورت میں تمہارے سامنے آ جائے گی۔ اور تم اسے دیکھ کر حیران ہو جاؤ گے اور کہو گے کہ ہم نے تو کوئی ایسی نیکی نہیں کی جس کی اتنی بڑی جزا ہو۔ مگر خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ نیکی اسی جزاء کی مستحق ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا صبر کو بزدلی سمجھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ اس نیکی سے محروم رہتی ہے۔ حالانکہ صبر اور بزدلی میں بڑا بھاری فرق ہے۔ صبر کے معنے یہ ہیں کہ وہ امور جن کی شریعت نے حد بندی کر دی ہے۔ ہم اس کے اندر رہیں۔ ورنہ صبر کے یہ معنے نہیں کہ انسان اپنے حقوق چھوڑ دے یا اپنے مقاصد کو نظر انداز کر دے حقیقی صابر اور بزدل میں فرق ہی یہی ہے کہ صابر اُس وقت صبر کرتا ہے جب شریعت کہتی ہے کہ صبر کرو۔ لیکن جہاں دین کے وقار اور اعزاز کا سوال آ جائے وہ دُنیا کو دکھا دیتا ہے کہ اس جیسا بہادر کوئی نہیں اور وہ کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ لیکن بزدل کی یہ علامت ہوتی ہے کہ اس کا صبر شریعت کے احکام کے ماتحت نہیں ہوتا۔ وہ جو رویّہ خود بخود اختیار کرتا ہے اس کا نام صبر رکھتا ہے لیکن اس کا انجام ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ صبر نہیں تھا بلکہ بزدلی تھی۔ صبر کے معنے یہ ہیں کہ اگر تمہیں کوئی گالی دے تو تم اسے گالی نہ دو۔ اگر کوئی تم پر ظلم کرے تو تم اس وقت تک ظلم کا جواب نہ دو جب تک شریعت تمہیں جواب دینے کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن صبر کے یہ معنے نہیں کہ تم اپنا دفاع چھوڑ دو اور دین کے معاملہ میں ذلّت برداشت کر لو۔ کیونکہ اس طرح بہادری اور دلیری نہیں بلکہ بزدلی پیدا ہو جائیگی اور بزدلی خوبصورتی نہیں بلکہ بدصورتی ہے۔ پس مومن کا کام یہ ہے کہ جہاں اُس کی قربانی کی ضرورت ہو وہاں قربانی کرے خواہ ساری دنیا اس کی مخالف ہو۔ اور جہاں شریعت کہے کہ خاموش رہو اور صبر سے کام لو وہاں خاموش رہے۔ مگر وہ اس لئے خاموش نہ رہے کہ دشمن طاقتور ہے اور وہ اس سے ڈرتا ہے بلکہ اس لئے خاموش رہے کہ اس موقعہ پر خاموش رہنے کے لئے خدا تعالیٰ کہتا ہے ورنہ

جسے ایک لحہ بھر کے لئے بھی یہ خیال آتا ہے کہ دشمن طاقتور ہے اس لئے خاموشی اختیار کرنی چاہیئے وہ بزدل ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی مقدس جماعت میں کوئی بزدل انسان شامل ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔

صبر کے معنے یہ ہیں کہ انسان متواتر اور استقلال کے ساتھ ان بدیوں کا مقابلہ کرے جو اس کو اپنی طرف کھینچ رہی ہوں۔ اور اُن بدیوں کے مقابلہ کے لئے تیار رہے جو اس کو آئندہ پیش آنے والی ہوں۔ اسی طرح صبر کے ایک معنے یہ ہیں کہ انسان استقلال کے ساتھ اُن نیکیوں پر قائم رہے جو اس کو حاصل ہو چکی ہوں اور اُن نیکیوں کے حصول کی کوشش کرے جو اس کو ابھی ملی نہیں۔ غرض استقلال کے ساتھ بدیوں کا مقابلہ کرنے۔ استقلال کے ساتھ نیکیوں پر قائم رہنے اور استقلال کے ساتھ آئندہ نیکیوں کے حصول کے لئے کوشش کرنے کا نام صبر ہے۔

دوسرے معنے صبر کے یہ ہیں کہ انسان جزع فزع نہ کرے۔ جب کوئی مصیبت آ پڑے تو گھبرائے نہیں اور ہمت نہ ہارے۔ اگر اس کا کوئی عزیز مرتا ہے یا اس کا مال کھویا جاتا ہے۔ یا اسی قسم کا کوئی اور واقعہ پیش آتا ہے تو وہ اس امر کو مدنظر رکھے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہے وہ اُس کا نہیں بلکہ بطور انعام خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہوا ہے اور صبر سے کام لے۔ پھر اس صبر کی بھی آگے دو قسمیں ہیں۔ ایک اُن معاملات میں صبر کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بندوں کا ان میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور دوسرے اُن معاملات میں صبر کرنا جو بندوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ جو معاملات اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اُن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کا کوئی رشتہ دار فوت ہو گیا یا بیمار ہو گیا۔ یا ملک میں قحط پڑ گیا یا کوئی ایسی جنگ چھڑ گئی جس کی وجہ سے اُس کے کاروبار میں گھاٹا پڑ گیا۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ ان میں انسان کا کوئی دخل نہیں۔ ان میں خدا تعالیٰ کی رضا پر استقلال کے ساتھ قائم رہنا صبر کہلاتا ہے۔ لیکن ایسے معاملات جو بندوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اُن میں بعض دفعہ انسان ہاتھ پاؤں ہلا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص اس پر سختی کرتا اور اس کو دکھ دیتا ہے تو وہ مقابلہ نہیں کرتا۔ مثلاً کوئی اُس کو تھپڑ مارتا ہے تو وہ آگے سے بولتا نہیں۔ خدا تعالیٰ تو اگر اُس کی جان بھی لے لے تو وہ بول نہیں سکتا۔ لیکن اگر کوئی شخص اُسے تھپڑ مارے تو یہ بھی مناسب جواب دے سکتا ہے۔ اگر اس کو تھپڑ مارنا ہی مناسب ہو۔ تو تھپڑ مار سکتا ہے اور اگر اس وقت تھپڑ مارنا قومی فوائد کے لحاظ سے یا اس شخص کی اصلاح کے نقطہ نگاہ سے مناسب نہ ہو تو تھپڑ نہیں مارتا۔ بہرحال ایسی حالت میں اگر کوئی شخص خاموش رہتا ہے تو یہ صبر کہلاتا ہے۔ لیکن اس حالت میں ضروری ہے کہ یہ شخص بزدل نہ ہو اور اس وجہ سے چپ نہ ہو کہ دوسرا شخص بھی مجھے آگے سے مارے گا۔ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں تو اس کا چُپ رہنا اور صبر کرنا عدمِ مقدرت پر مبنی ہوگا۔ لیکن انسانوں کے مقابلہ میں اس کا صبر عند المقدرت ہوگا۔ یعنی اگر وہ بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہے لیکن اس لئے بدلہ نہیں لیتا کہ شاید بدلہ نہ لینے سے کوئی مفید نتیجہ نکل آئے تو یہ اس کا صبر کہلائیگا۔ مگر خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں یہ بدلہ لینے کی مقدرت ہی نہیں رکھتا وہاں اُس کا چُپ رہنا یا نہ رہنا برابر ہوگا۔ اس لئے وہاں صبر کے یہی معنے ہونگے کہ گھبرائے نہیں اور ہمت ہار کر بیٹھ نہ رہے لیکن بندوں کے مقابلہ میں اس کو بدلہ لینے کی مقدرت ہو اور پھر صبر کرے تو صبر صبر کہلانے کا مستحق ہوگا کیونکہ

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ط

اور وہ (یعنی یہودی اور مسیحی یہ بھی) کہتے ہیں کہ جنت میں سوائے اُن (لوگوں) کے جو یہودی ہوں یا مسیحی ہوں ہرگز کوئی داخل نہیں ہوگا

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱۲)

یہ (محض) اُن کی آرزوئیں ہیں۔ تو (انہیں) کہدے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو۔ ۲۹

یہ بدلہ لینے کی طاقت رکھتے ہوئے صبر کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص قید میں کوٹھڑی کے اندر بند ہو۔ کوئی راستہ اُس کے نکلنے کا نہ ہو۔ اور وہ کہے کہ میں صبر کرکے بیٹھا ہُوا ہوں تو یہ اس کا صبر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر دروازہ کھلا ہوتا اور کوئی اُسے کو نہ روکتا تو وہ ضرور قید سے نکل جاتا۔ اس کا اس وقت قید میں چپ بیٹھے رہنا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اُس کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ پس اُس کا یہ صبر صبر نہیں کہلائیگا۔ غرض انسانوں کے مقابلہ میں صبر ہمیشہ وہ ہوتا ہے جو عند المقدرت ہو۔ بے شک بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کمزور ہوتا ہے۔ اس میں بدلہ لینے کی طاقت اور ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اور وہ خیال کرتا ہے کہ اچھا میں صبر کرتا ہوں۔ مگر اُسے ہم صبر نہیں کہہ سکتے۔ صبر یہی ہے کہ وہ دیکھے کہ مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ میں بدلہ لے سکتا ہوں لیکن پھر بھی وہ عفو سے کام لے۔

۲۹ تفسیر: — یہ مضمون مختلف شکلوں میں قرآن کریم میں تین دفعہ آیا ہے۔ پہلی دفعہ سورۃ بقرہ آیت ۸۱ میں یہ مضمون اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ آگ ہمیں چند دن سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ گویا اہل کتاب دوزخ میں جائیں گے تو سہی۔ مگر اللہ تعالیٰ اُن سے رعایت کا معاملہ کرے گا۔ اور چند دنوں کے بعد جو اُن کی کتابوں میں زیادہ سے زیادہ بارہ ماہ تک شمار کئے گئے ہیں اُن کو دوزخ میں سے نکال لیا جائیگا۔ بلکہ بارھواں مہینہ بھی ختم نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُن کو آگ سے نکال لے گا۔

دوسری دفعہ یہ مضمون سورۃ بقرہ آیت ۹۵ میں اس طرح آیا ہے۔ کہ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ یعنی اہل کتاب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے صرف وہی مستحق ہیں اور جنت میں داخل ہونے کے وہی حقدار ہیں۔ اور کوئی قوم جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعض یہود کا یہ دعویٰ تھا کہ ہمیں عذاب ملیگا ہی نہیں بلکہ وہ سیدھے جنت میں جائیں گے اور کسی غیر یہودی کو جنت نہیں ملیگی۔ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتا ہے کہ ان سے پوچھو اور دریافت کرو کہ اگر یہ صحیح ہے کہ جنت کے صرف تم ہی مستحق ہو اور کوئی قوم اس میں داخل نہیں ہوگی تو تم رضائے الٰہی کے لئے وہ کوشش کیوں نہیں کرتے جو موت کے مترادف ہوتی ہے۔ یا اس بات کے لئے مباہلہ کیوں نہیں کرتے۔ دوسروں کو تو تم اس سے محروم قرار دیتے ہو اور جنت صرف اپنے لئے مخصوص کرتے ہو۔ لیکن اگر یہ درست ہے تو تمہارے لئے تو خدا کے لئے اپنی زندگی وقف کرنا اور اس کی رضا کے حصول کے لئے کوشش کرنا اولین فرض ہو جاتا ہے۔ پھر تم کیوں ایسا نہیں کرتے۔

تیسری جگہ جہاں یہ مضمون بیان ہُوا ہے یہ آیت ہے۔ اصل میں یہ دو الگ الگ فقرے ہیں جن کو عربی زبان کے محاورہ کے مطابق مختصر کر دیا گیا ہے اصل عبارت یوں ہے۔

کہ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا
وَقَالَتِ النَّصٰرٰى لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ نَصٰرٰى
یہود کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی ہی داخل ہونگے اور
کوئی داخل نہیں کیا جائیگا ۔ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ جنت میں
صرف نصاریٰ ہی داخل ہونگے اور کوئی داخل نہیں ہوگا
پس یہ ایک فقرہ نہیں ۔ کیونکہ کوئی یہودی یہ نہیں کہتا
کہ جنت میں صرف یہود اور نصاریٰ ہی داخل ہوں گے
اور نہ نصاریٰ میں سے کوئی کہتا ہے کہ صرف یہود اور نصاریٰ ہی
جنت میں داخل ہونگے ۔ پس یہ الگ الگ فقرے ہیں ۔
جن کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔

یہ تیسرا دعویٰ ہے جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے ۔
کہ غیروں کو تو اہل کتاب جنت سے محروم کرتے ہی تھے ان
کا آپس میں بھی اس قدر اختلاف ہے کہ ایک فریق دوسرے
فریق کو جنت سے محروم قرار دیتا ہے ۔ گویا ایک جماعت
کا تو یہ دعویٰ ہے کہ یہودی دوزخ میں جا تو سکتے ہیں گر
وہ جلدی ہی نکال لئے جائیں گے ۔ چنانچہ سیل نے اپنے
ترجمۂ قرآن میں لکھا ہے کہ یہود کے نزدیک یہ تسلیم شدہ
امر ہے کہ کوئی یہودی خواہ کیسا ہی گنہگار ہو گیارہ یا بارہ
ماہ سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہے گا ۔ سوائے دو یہودیوں
داتھن اور ابیرام کے یا سوائے دہریوں کے جو ہمیشہ کے عذاب
میں مبتلا رہیں گے ۔ اسی طرح جیوش انسائیکلو پیڈیا میں بھی
طالمود کے حوالہ جات سے یہود کے اس عقیدہ کو ثابت
کیا گیا ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۵۸۲) لیکن
دوسری جماعت کا یہ دعویٰ ہے کہ یہود کو عذاب ملیگا ہی نہیں ۔
اور ایک جماعت وہ ہے جو نجات کو اور بھی تنگ کر دیتی
ہے ۔ اور یہودی صرف یہود کو اور عیسائی صرف عیسائیوں
کو ہی نجات کا مستحق قرار دیتے ہیں اور کسی کو نہیں ۔ چنانچہ
عیسائیوں میں سے بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ دوزخ دو قسم کی
ہے ۔ ایک مستقل اور دوسری عارضی ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر عیسائی دوزخ
میں جائیں گے تو وہ عارضی دوزخ میں جائیں گے ۔ پھر وہاں
سے نکال لئے جائیں گے ۔ انہیں مستقل دوزخ میں داخل نہیں
کیا جائیگا ۔ اور بعض کہتے ہیں کہ جس کے دل میں حضرت
مسیح علیہ السلام کی ذرہ بھر بھی محبت ہوگی ۔ وہ کسی حالت
میں بھی دوزخ میں نہیں ڈالا جائیگا ۔ اس عقیدہ کا لازمی
نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے
خلاف عقیدہ رکھتے ہیں ۔ اور غلطی کرتے کرتے اس حد تک
پہنچ گئے ہیں کہ یہود نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ گو عیسائی
بھی تورات اور بائیبل پر ایمان لاتے ہیں مگر وہ جنت میں
داخل نہیں ہونگے ۔ اور عیسائیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا
کہ گو یہود بائیبل پر ایمان رکھتے ہیں مگر وہ جنت میں داخل
نہیں ہونگے ۔ بلکہ صرف عیسائی ہی اس میں داخل ہونگے ۔

ترتیب مضامین کے لحاظ سے ان تین آیتوں میں سے پہلی آیت
سورۂ بقرہ کے نویں رکوع میں آتی ہے ۔ اس رکوع میں
اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ کا
ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ یہودی آپ کی مخالفت کرتے
ہیں ۔ مگر اُن کی یہ مخالفت ایمان داری کے طریق سے نہیں
یوں مخالفت ناجائز نہیں ہوتی کیونکہ اگر کوئی بات کسی کی
سمجھ میں نہ آئے تو وہ مخالفت کرنے کا حق رکھتا ہے
اور اگر وہ کوئی بات غلط سمجھ کر مخالفت کرتا ہے تو
وہ معذور ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کسی مجلس میں بات
سُن کر اور سمجھ کر جاتا ہے اور پھر باہر جا کر اُسکی مخالفت
شروع کر دیتا ہے تو اُس کی مخالفت دیانت داری پر مبنی
نہیں ہوتی ۔ پس مخالفت جائز ہے بشرطیکہ وہ دیانتداری
سے ہو ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر قسم کی علمی ترقی رُک جاتی ۔
کیونکہ تمام علمی ترقیات اختلاف سے وابستہ ہوتی ہیں ۔ پس
مخالفت جائز ہے مگر وہ دیانت داری پر مبنی ہونی چاہیئے
اور اظہار اختلاف کا طریق شریفانہ ہونا چاہیئے کسی قسم
کی ضد اور ہٹ نہیں ہونی چاہیئے ۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

کہ یہ لوگ ضد اور ہٹ سے کام لیتے ہیں اور جان بوجھ کر قرآن کریم کی باتیں غلط رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ پس ان کی باتیں ایمانداری پر مبنی نہیں۔ ان کی مخالفت اُسی صورت میں دیانت داری پر مبنی ہو سکتی ہے جبکہ یہ حقیقۃً ان کو غلط سمجھتے ہوں اور اُن کے غلط ہونے کی دلیل بھی دیتے ہوں۔ لیکن اگر یہ لوگوں کے سامنے حقیقت پر پردہ ڈال کر اُسے غلط طریق سے پیش کرتے ہیں یا اس کے مقابلہ میں کوئی دلیل نہیں دے سکتے تو پھر یہ محض اُن کی شرارت ہے اور یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ اُن کو یہ یقین ہے کہ ہم آگ میں داخل نہیں ہونگے۔ اور جب کوئی قوم نجات کو ورثہ کے ساتھ وابستہ کرتی ہے تو اس قوم میں سے تقویٰ مٹ جاتا ہے۔ دنیا میں بالعموم دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض احسان اور محبت سے مانتے ہیں اور بعض ڈر اور خوف سے مانتے ہیں۔ عذاب کا ڈر ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہوتا ہے جو انہیں ناشائستہ حرکات سے روکتا ہے لیکن اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے احسان اور محبت ہوتی ہے جو ان کو اس قسم کی حرکات سے باز رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایسے ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں کہ یہ صرف عذاب سے ہی ڈر سکتے تھے۔ مگر ان کی قوم نے ان سے کہا کہ تم عذاب سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیئے گئے ہو۔ اس لئے ان کے دلوں سے عذاب کا خوف نکل گیا جس کی وجہ سے یہ حیا سوز حرکات کرتے ہیں۔ اگر انسان کسی مذہب سے تعلق نہ رکھتا ہو تو پھر بھی وہ مادر پدر آزاد ہو سکتا ہے مگر یہ باوجود مذہبی آدمی ہونے کے ایسی حرکات کرتے ہیں جو مادر پدر آزاد بھی نہیں کرتے۔

دوسری آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جو قومیں انعاماتِ الٰہیہ کو اپنے ساتھ مخصوص کر لیتی ہیں وہ ہدایت کی جستجو بھی ترک کر دیتی ہیں۔ ہدایت کی جستجو کوئی قوم تبھی کرتی ہے جب وہ یہ یقین رکھتی ہو کہ ہدایت اور انعامات کا دروازہ کھلا ہے۔ لیکن جو قوم یہ یقین رکھتی ہو کہ ہدایت صرف ہماری ہی قوم کے ساتھ مخصوص ہے تو صرف انہی باتوں کو جو اُن کی کتابوں میں لکھی ہوں درست سمجھے گی اور دوسری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم نجات کو صرف اپنے تک محدود کر کے اُسے تنگ کر دیتی ہے اور اس میں ناواجب ضد پیدا ہو جاتی ہے جو اُسے تقویٰ سے دُور لے جاتی ہے۔

زیرِ تفسیر آیت میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ اس قسم کے عقائد کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومیں دائرہ نجات کو محدود کرتی جاتی ہیں اور پھر آپس میں بھی ایک دوسرے کو نجات سے محروم کر دیتی ہیں۔ اور تقویٰ جو اصل معیار ہے وہ اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے حالانکہ کسی وقت بھی کسی شخص کو ہدایت کا دروازہ بند نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ جو کلام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو اس کو قبول کر لینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصَارٰى کا یہ مطلب نہیں کہ یہود کا یہ کہنا کہ صرف یہودی ہی نجات پائیگا کوئی بُری بات ہے۔ کیونکہ ہر مذہب والا اپنے آپ کو ہی نجات یافتہ کہتا ہے بلکہ ایک مسلمان بھی یہی سمجھتا ہے کہ جنّت میں صرف مسلمان ہی داخل ہونگے۔ پس اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہود اپنے مذہب میں نجات کو کیوں محدود قرار دیتے ہیں۔ یا عیسائی عیسائیت میں نجات کیوں سمجھتے ہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ نجات کو مخصوص قرار دیکر یہ لوگ خدا تعالیٰ کے وسیع فیضان کو محدود کرتے ہیں اور دنیا کے ایک بڑے حصّہ کو اُس کی رحمت سے محروم قرار دیتے ہیں۔ ورنہ قرآن کریم کا یہ منشاء نہیں کہ اُن کو یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ یہودیت

کے بغیر نجات نہیں یا عیسائیت کے بغیر نجات نہیں - اسلام کا بھی تو یہی دعویٰ ہے کہ اس کے بغیر نجات نہیں مگر جہاں اسلام یہ کہتا ہے کہ اسلام ہی بنی نوع انسان کی نجات کا ذریعہ ہے - وہاں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہدایت کے دروازہ کو بند نہیں کرتا - بلکہ کہتا ہے کہ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ - یعنی مومنوں کی یہ علامت ہے کہ جب بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی تازہ کلام نازل ہو وہ فوراً اُس پر ایمان لے آتے ہیں - پس وہ نجات کو کلامِ الٰہی پر ایمان لانے کے ساتھ وابستہ قرار دیتا ہے - خواہ وہ کلام کسی پہلے زمانہ میں نازل ہو چکا ہو یا آئندہ نازل ہو - اس کے مقابلہ میں عیسائیوں اور یہودیوں میں سے یہودی کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بغیر نجات نہیں اور وہ اپنے مذہب میں کسی کو داخل بھی نہیں کرتے - کیونکہ وہ دوسروں میں سے کسی کی نجات کے قائل نہیں - وہ صرف اپنی قوم کے ساتھ نجات کو مخصوص کرتے ہیں نہ کہ اپنے مذہب کے ساتھ - لیکن عیسائی اپنی قوم کے ساتھ نجات مخصوص نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے مذہب کے ساتھ اُسے مخصوص کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دوسروں میں سے ہر شخص عیسائیت میں داخل ہو کر نجات پا سکتا ہے - گویا عیسائیت کو اسلام سے ایک ظاہری مشابہت یہ حاصل ہے کہ عیسائی بھی تمام دنیا کے لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور ہدایت کو کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں کرتے اور اسلام بھی تمام دنیا کے لوگوں کو اپنے اندر شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے اور ہدایت کو کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں کرتا - اور چونکہ ان دونوں میں یہ ایک ظاہری مشابہت پائی جاتی ہے - اس لئے اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر عیسائیوں کا یہ کہنا کہ صرف عیسائی مذہب میں نجات ہے قابلِ اعتراض ہے تو اسلام کا یہ کہنا کہ صرف اسلام میں نجات ہے کیوں قابلِ اعتراض نہیں ؟

سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام اور عیسائیت کے اِن دعووں میں جو ظاہری مشابہت پائی جاتی ہے وہ درحقیقت کوئی حقیقی مشابہت نہیں بلکہ ایک خود ساختہ مشابہت ہے - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گو عیسائی تمام دنیا کے لوگوں کو اپنے مذہب میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں مگر اُن کا مذہب اُن کو غیر مذاہب کے لوگوں کو اپنے اندر شامل کرنے کی اجازت نہیں دیتا - اس کا ثبوت ہمیں اناجیل سے واضح طور پر نظر آتا ہے - متی باب ۷ آیت ۶ میں لکھا ہے :- (۱)

" وہ چیز جو پاک ہے کتّوں کو مت دو -
اور اپنے موتی سؤروں کے آگے نہ پھینکو
ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں پامال کریں اور
پھر کر تمہیں پھاڑیں - "

اس حوالہ میں بتایا گیا ہے کہ مسیح ناصری کی معرفت جو تعلیم تم لوگوں کو ملی ہے وہ موتیوں کی طرح ہے - وہ صرف اسرائیلیوں کے لئے رہنی چاہیئے - اسے غیر قوموں کے سامنے نہیں رکھنا چاہیئے - کیونکہ بقول انجیل غیر قومیں سؤروں اور کتّوں کی طرح ہیں - اگر یہ تعلیم اُن کے سامنے گئی تو وہ اُسے توڑ کر رکھ دیں گی یا پرے پھینک دینگی - اور اس کے غلط معنے کر کے اس پر حملہ کریں گی اور اس کی ہتک کا ارتکاب کریں گی -

(۲) متی باب ۱۰ آیت ۵ و ۶ میں لکھا ہے :-

" ان بارھوں کو یسوع نے فرما کے بھیجا کہ
غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے
کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے بنی اسرائیل
کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ - "

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے ہی بھیجا تھا - اور انہیں واضح طور پر یہ ہدایت دی تھی کہ غیر اقوام کو تبلیغ نہ کریں - اسجگہ عیسائی ایک نقطہ سے

فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں "پہلے" کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں صرف اسرائیلیوں تک تبلیغ محدود ہوگی۔ مگر آئندہ زمانہ میں انہیں اپنی تبلیغ وسیع کرنے کی اجازت ہوگی۔ لیکن اسی باب کی آیت ۲۳ اس مفہوم کو ردّ کر دیتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:-

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل
کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے جب تک
کہ ابن آدم نہ آئے۔"

اس میں حضرت مسیح کہتے ہیں کہ میں تم کو یہ بتا دیتا ہوں کہ میری آمدِ ثانی تک تمہاری یہ تبلیغ غیروں میں شروع نہیں ہوگی اور جب تک کہ ابن آدم دوبارہ دنیا میں نہ آئے تمہارا یہ مشن جو بنی اسرائیل میں قائم کیا گیا ہے ختم نہیں ہوگا۔ ہاں جب وہ آجائے گا تو پھر اجازت ہوگی کہ دوسروں کو بھی تبلیغ کی جائے۔ پس "پہلے" کی تشریح اس باب کی آیت ۲۳ نے کردی ہے۔

اسی طرح متی باب ۱۵ آیت ۲۴ میں لکھا ہے:-

"اس نے جواب میں کہا۔ میں اسرائیل
کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور
کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔"

یہاں حضرت مسیح اس بات کا صاف طور پر اقرار کرتے ہیں کہ میں اسرائیلیوں کے سوا کسی اور کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ پس پہلے اور بعد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح مرقس باب ۷ آیت ۲۷ میں آتا ہے:-

"یسوع نے اسے کہا کہ پہلے فرزندوں
کو سیر ہونے دے۔ کیونکہ فرزندوں کی روٹی
لے کے کتوں کے آگے ڈالنا لائق نہیں۔"

یہاں بھی متی باب ۱۰ والے حوالہ کا مضمون ہے اور اس میں بھی غیر اسرائیلیوں کو کتے قرار دیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ روٹی کتوں کے لئے نہیں بلکہ صرف اسرائیلیوں کے لئے ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام اپنی تبلیغ کو کسی خاص قوم تک محدود نہیں کرتا چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف آیت ۱۵۹) یعنی اے رسول! تو کسی ایک قوم کو نہیں بلکہ تمام دنیا کی قوموں کو مخاطب کرکے کہہ دے کہ میں تم سب کی طرف رسول بناکر بھیجا گیا ہوں۔ دوسری جگہ سورۂ سبا میں فرماتا ہے وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (سورۂ سبا آیت ۲۹) یعنی ہم نے تجھے تمام بنی نوع انسان کی طرف ایسا رسول بناکر بھیجا ہے جو مومنوں کو خوشخبری دینے والا اور کافروں کو ہوشیار کرنے والا ہے لیکن انسانوں میں سے اکثر اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں كَانَ كُلُّ نَبِيٍّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلٰى كُلِّ اَحْمَرَ وَّاَسْوَدَ۔ (مسلم کتاب المساجد) یعنی مجھ سے پہلے جس قدر انبیاء تھے وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے مگر مجھے ہر اسود و احمر کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ غرض قرآن کریم میں بھی یہ دعویٰ موجود ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بتادیا ہے کہ آپ کسی خاص قوم یا خاص ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔

ایک دوسری حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَآفَّةً۔ مجھے تمام مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہے[1]۔ پس گو بظاہر اسلام اور عیسائیت کے متبعین کا دعویٰ مشترک معلوم ہوتا ہے۔ مگر عیسائی ایسی بات کہتے ہیں جو اُن کے اپنے مذہب کے خلاف ہے جب خدا تعالیٰ نے عیسائیت کو غیر مذاہب والوں کے لئے رکھا ہی نہیں تو وہ اُسے قبول کرکے نجات کس طرح حاصل کرسکتے ہیں؟ اگر

[1] مسلم کتاب المساجد

یہ گورنمنٹ کسی کو کہیں جانے کا حکم دے اور وہاں کوئی اور
چلا جائے تو وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی
غیر اسرائیلی عیسائی ہو جائیگا تو وہ انعام کا نہیں بلکہ سزا کا
مستحق ہوگا۔

پھر ایک اور نقطۂ نگاہ سے بھی اسلام اور
دوسرے مذاہب میں فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ یہود و نصاریٰ
کا یہ دعویٰ ہے کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى کہ یہود اور نصاریٰ کے سوا اور کوئی
بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یہاں کسی ابتدائی زمانہ کا
ذکر نہیں بلکہ یہ ذکر ہے کہ سو ہزار لاکھ بلکہ کروڑ سال کے
بعد بھی یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی اس میں داخل نہیں
ہوگا۔ مگر اسلام کی تعلیم اس سے مختلف ہے۔ وہ
دوزخ کے عذاب کو دائمی قرار نہیں دیتا۔ بلکہ کہتا ہے
کہ کوئی انسان خواہ دہریہ بھی ہو آخر ایک دن جنت میں
داخل ہو جائیگا۔ کیونکہ انسان کا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ
کا عبد بنے۔ اگر یہ مقصد پورا نہ ہو تو انسان کی پیدائش لغو
قرار پاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ مَا
خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات)
یعنی میں نے جن و انس کو کسی اور غرض کے لئے نہیں بلکہ
صرف اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ دوسری جگہ
فرماتا ہے۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (سورۃ
فجر آیت ۳۰، ۳۱) یعنی اے نفسِ مطمئنہ کے حامل تو میرے
بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت کو لے لے۔ اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کیلئے یہ مقدر
کر رکھا ہے کہ وہ جنت میں جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو
پیدائش انسانی کی غرض باطل ہو جاتی۔ اور اللہ تعالیٰ پر
اعتراض واقع ہوتا کہ اُس نے انسان کو جس مقصد کے
لئے پیدا کیا تھا۔ وہ پورا نہ ہوا۔ غرض اسلام لَنْ يَّدْخُلَ
الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى کو غلط
قرار دیتا ہے۔ اور پھر آخر میں تو وہ ہر شخص کو جنت کا
حقدار قرار دے دیتا ہے۔

پھر اسلام اور عیسائیت کے نظریۂ نجات میں ایک
نمایاں فرق یہ بھی پایا جاتا ہے کہ مسلمان تو اس بات کو
تسلیم کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی کا سلسلہ
ہمیشہ کے لئے جاری ہے اور جو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے
تازہ وحی آئے اُس کا قبول کرنا ضروری ہے۔ لیکن عیسائیت
یہ نہیں کہتی۔ بلکہ وہ کلام الٰہی کو حضرت مسیح علیہ السلام
تک محدود قرار دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اب کوئی تازہ
کلام بطور تشریح اور تفسیر بھی نہیں آ سکتا۔ اس لئے
اگر کوئی تازہ کلام وحی یا تشریح کے طور پر خدا تعالیٰ کی
طرف سے آئے۔ تو وہ اپنے اس عقیدہ کی وجہ سے اُسے
ردّ کر دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان اُسے قبول کرنے پر مجبور ہوتے
ہیں۔ کیونکہ ایک سچے مسلمان کی یہ علامت بیان کی گئی
ہے کہ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ یعنی وہ بعد میں آنے
والی ہدایت پر اُسی طرح ایمان لاتے ہیں جس طرح پہلی
ہدایتوں پر اُن کا ایمان ہوتا ہے۔ یہ فرق ہے جو اسلام اور
عیسائیت کے نظریۂ نجات میں پایا جاتا ہے۔ عیسائی
نجات کو محدود کرتے ہیں کیونکہ وہ وحی کا دروازہ بند
سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام اُسے کھلا رکھتا ہے۔ اسلام کہتا
ہے کہ ایمان کو تازہ کرنے اور انسانی علوم کو بڑھانے کے
لئے جو وحی آتی ہے اُس کا قبول کرنا بھی ضروری ہوتا ہے
لیکن عیسائی اس قسم کی وحی کا دروازہ بند کرتے ہیں۔ اور
بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم کرتے ہیں۔
اسلام نے انہیں توجہ دلائی ہے کہ تم وحی الٰہی کا دروازہ
بند کر کے خدا تعالیٰ کی ہدایت کو محدود نہ کرو۔ خدا صرف
یہودیوں اور عیسائیوں کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کا خدا
ہے اور ابتدائے آفرینش سے اپنے تمام بندوں کی ہدایت
کا سامان کرتا چلا آیا ہے اور آئندہ بھی وہ اس سلسلہ کو

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ

(اور بتاؤ کہ دوسرے لوگ کیوں نہیں (داخل ہونگے) جو بھی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کردے اور وہ نیک کام کرنے والا بھی ہو تو

ہمیشہ جاری رکھیگا۔ پس خدا تعالیٰ کے وسیع فیضان اور اُسکی رحمت کے بے کنار سمندر کو ایک خشک چشمہ کی شکل مت دو۔ اور نجات کو صرف اپنے لئے مخصوص کر کے خدا تعالیٰ کو قومی خدا مت بناؤ۔

غرض اس آیت میں نہایت واضح طور پر نجات کو اس ایمان کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ جو ہدایت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہم اُسے خوشی کے ساتھ قبول کریں گے ورنہ عیسائی جو تمام کیلئے نجات کا دروازہ کھلا بتاتے ہیں کیوں قابلِ الزام ہوتے؟ وہ اسی بنا پر قابلِ الزام ہیں کہ آئندہ الہام کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ پس اگر مسلمان بھی یہی مقام اختیار کریں تو اس آیت کے مضمون کے مطابق وہ بھی مجرم بن جائیں گے۔

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ۔ فرماتا ہے جب کوئی قوم ترقی سے محروم ہو جاتی ہے اور اپنا قدم آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے ہٹانا شروع کر دیتی ہے تو وہ عمل اور کردار کا اعلیٰ نمونہ بننے کی بجائے صرف حسرتوں اور آرزوؤں کی ایک تصویر بن کر رہ جاتی ہے اور جہاں محنت اور مشقت اور قربانیوں سے کام لینے والے لوگ دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر رہے ہوتے ہیں وہاں محنت سے جی چرانے والے اور گیدڑ کی طرح صرف شیر کا مارا ہوا کھانے والے اسی قسم کے تصورات میں مبتلا رہتے ہیں جس قسم کے تصورات شیخ چلی میں پائے جاتے تھے۔ یہ کہنا کہ ہم ایسے ہیں اور ہم ویسے ہیں ہم موسیٰؑ کی امت میں سے ہیں ہم عیسیٰؑ پر ایمان لانے والے ہیں یا ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہیں کسی کو کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ تم اُن جیسے کام کرو تب تو کوئی بات بھی ہے لیکن اگر تم اُن جیسے کام نہیں کرتے تو مُنہ کا دعویٰ تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ فرماتا ہے۔ اگر تم سچے ہو تو تم اس بات کی کوئی دلیل پیش کرو کہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے نجات ہے اور کسی کے لئے نہیں۔ یہ دلیل وہی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ اگر تمہاری بات سچ ہے کہ نجات صرف تمہی میں ہے غیروں میں نہیں تو خدا تعالیٰ کے افضال اور اُس کی برکات اور اس کا کلام تم سے وابستہ ہونا چاہیئے اگر نجات یہودیوں میں محدود ہے تو یہ چیزیں اُن کے ساتھ وابستہ ہونی چاہئیں۔ اگر عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے تو اُن سے یہ باتیں وابستہ ہونی چاہئیں۔ اور انہیں بتانا چاہیئے کہ ہمارے ساتھ خدا تعالیٰ کلام کرتا ہے اور اپنے نشانات ہماری تائید میں نازل کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ مومن کو دو جنتیں ملتی ہیں۔ ایک اس جہان میں اور ایک اگلے جہان میں۔ وہ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (رحمٰن آیت ۴۷) کہ جو شخص اپنے رب کی شان اور عظمت سے ڈرتا ہے اُسے دو جنتیں ملتی ہیں۔ پس اگر اُن کی یہ بات صحیح ہے کہ وہ نجات یافتہ ہیں تو وہ اپنی دنیوی جنت دکھائیں اور بتائیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام اور اس کا فضل اور اس کی برکات اُن پر نازل ہوتی ہیں؟ نازک مواقع پر خدا تعالیٰ اُن کے لئے غیرت دکھاتا ہے اور اُن کی تائید کے غیر معمولی سامان پیدا کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو بیشک وہ نجات کے مستحق ہیں لیکن اگر اُن کے ساتھ اس کا یہ سلوک نہیں تو انکو سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے اُن سے اپنی برکات چھین لی ہیں اور انہیں مر کر بھی نجات حاصل نہیں ہوگی۔

۱۳ ع ۱۲

اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ ع

اُس کے ربّ کے ہاں اُس کیلئے بدلہ (مقرر) ہے اور اُنکو (یعنی ایسے لوگوں کو آئندہ کے متعلق) کسی قسم کا خوف نہ ہوگا اور نہ وہ (کسی سابق نقصان کی) غمگین ہونگے۔

اَسْلَمَ

۱۱۳ حل لغات: اَسْلَمَ کے معنے ہیں اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا یا کلّی طور پر سونپ دینا۔

وَجْهَهٗ

وَجْهَهٗ کے کئی معنے ہیں (۱) توجہ (۲) نَفْسُ الشَّیْءِ کسی چیز کا وجود (۳) چہرہ - یہ سب معنے یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں - اور اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ (۱) جو اپنی توجہ پورے طور پر خدا کو سونپ دے یعنی تمام تر توجہ خدا کی طرف لگا دے (۲) جو اپنی ذات کو کامل طور پر خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اسے خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں دے دے - (۳) جو اپنا چہرہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے - ہر وقت اس کی طرف نظر رکھے اور اُس کی نگاہ کبھی غیر اللہ کی طرف نہ اُٹھے۔

مُحْسِنٌ

مُحْسِنٌ: احسان کے دو معنے ہیں (۱) دوسرے کو انعام دینا بغیر اُس کے کسی کام کے اُس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرنا یا اس کے کام کے بدلہ سے اُسے زیادہ دینا (۲) انسان کا اپنے ذاتی کام میں کمال کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنا یعنی اُسے اپنے کام کے متعلق اچھا علم حاصل ہو یا جو عمل کرے وہ اچھا ہو - غرض احسان یہ ہے کہ (۱) غیر کے ساتھ بغیر بدلہ کے نیک سلوک کرے (۲) اپنے علم اور عمل میں نیکی مدنظر رکھے اور اُس میں بدی کو داخل نہ ہونے دے - حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے - اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ مَا يُحْسِنُوْنَ کہ لوگ اس چیز کے بیٹے ہوتے ہیں جسے وہ اچھی طرح جانتے ہیں - یعنی انسان کی عزت اس علم کے مطابق ہوتی ہے جسے وہ اچھی طرح سیکھتا ہے اور اس عمل کے مطابق ہوتی ہے جسے وہ بہتر سے بہتر کر سکتا ہے - جیسے ایک شخص نجار کہلاتا ہے وہ کئی اور کام بھی جانتا ہے - مثلاً وہ روٹی پکا سکتا ہے - زراعت کا علم رکھتا ہے اور اُسے کر سکتا ہے - یا لوہار کا کام بھی جانتا ہے اور اس سے کام چلا سکتا ہے مگر وہ کہلاتا نجّار ہے اس لئے کہ سب سے زیادہ اُسے نجاری کا کام آتا ہے - اسی طرح کاتب کئی اور کام بھی جانتا اور کر سکتا ہے مگر کاتب کہلاتا ہے - اسلئے کہ وہ سب سے زیادہ کتابت جانتا ہے اور یہ اُس کا پیشہ ہے - اسی طرح ڈاکٹر باوجود کئی اور کام جاننے کے صرف ڈاکٹر کہلاتا ہے - اس لئے کہ وہ ڈاکٹری کا کام سب سے زیادہ جانتا ہے - پس محسن وہ ہے جو کامل علم رکھنے والا یا کامل عمل کرنے والا ہو -

اسی طرح اَحْسَنَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ حَسَنًا اُسے اچھا بنایا - جیسے قرآن کریم میں آتا ہے اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (سجدہ آیت ۸) کہ جس نے ہر چیز پیدا کی اور کام کے لحاظ سے اُسے بہتر سے بہتر طاقتیں بخشیں -

احسان انعام سے مختلف چیز ہے - انعام صرف دوسرے پر ہوتا ہے اور احسان اپنے نفس پر بھی ہوتا ہے اور دوسروں پر بھی پس تمام بنی نوع انسان سے نیک سلوک کرنا احسان ہے -

عدل کے لحاظ سے بھی احسان مقام بلند ہے عدل تو یہ ہے کہ جتنا کسی کا حق ہو اُتنا ہی انسان اُسے دے دے اس سے زیادہ نہ دے مگر احسان یہ ہے کہ جو کسی کا حق ہو اس کو اصل سے زیادہ ادا کیا جائے - اور جو لینا ہو وہ حق سے کم لیا جائے (مفردات راغب)

اقرب میں اس سے زیادہ مختصر معنے یہ لکھے ہیں کہ اَتٰی بِالْحَسَنِ - اچھی بات کہی یا اچھی بات جانی - یا اچھا کام کیا - یہ اَسَاءَ کی ضد ہے - یعنی بدسلوکی کے مخالف معنے دیتا ہے - پس اسکے معنے ہیں حسن سلوک

رہ گئے ہیں۔

اَحْسَنَهٗ کے معنے عَلِمَهٗ کے بھی ہیں یعنی اُسے اچھی طرح سے جان لیا۔ کہتے ہیں فُلَانٌ یُحْسِنُ الْقِرَاءَۃَ فلاں شخص قرأت کا خوب علم رکھتا ہے۔ اور اَحْسَنَ لَهٗ وَبِهٖ کے معنے ہیں اچھا عمل کیا یا کسی کے ساتھ نیکی کی (اقرب)

اسلامی نقطۂ نگاہ سے اَسْلَمَ وَجْهَهٗ اور وَهُوَ مُحْسِنٌ کے یہ معنے ہیں کہ ایسا شخص رسول کی اتباع کرتا ہو۔ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل فرمانبرداری کرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ کہ جو کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کے متعلق ہمارا حکم نہیں یا جس میں ہماری اجازت نہیں وہ مقبول نہیں ہوگا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کلام الٰہی کے اتارنے والے ہیں وہی خدا تعالیٰ کے منشا کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔ کہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی طرز پر کرے کہ وہ تجھے نظر آجائے یا کم از کم تجھے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ درحقیقت یہ ایک معیار ہے انسان کی روحانی ترقی پہچاننے کے لئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے کہ عبادتِ الٰہی اتنی کامل ہو جائے کہ خدا تعالیٰ نظر آنے لگے۔ یا اُس پر اتنی ہیبت طاری ہو جائے کہ وہ یہ سمجھے کہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں۔ خدا کو نظر کے سامنے رکھنے سے انسان کا دل بڑھ جاتا ہے جس طرح بھاگتی فوج بادشاہ کے آنے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو تو پھر وہ محسن نہیں رہتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی رُو سے مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ کے یہ معنے ہیں (۱) کہ جو اپنی توجہ کو خدا کے سپرد کر دے اور وہ پورے طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی مطیع ہو۔ دوسری روایت کی رُو سے یہ معنے ہیں (۲) کہ جو اپنی توجہ کو پورے طور پر خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور روحانی طور پر اتنا کامل ہو جائے کہ اُسے خدا تعالیٰ نظر آنے لگ جائے یا خدا کے حکم کے مطابق اس کا عمل ہو جائے۔ گویا ایک طرف خدا تعالیٰ کے منشا کے مطابق اس کا عمل ہو اور دوسری طرف اس کا علم کامل ہو اور اس کا عمل عرفان کے درجہ تک پہنچ جائے۔

لُغت کی رو سے اس کے یہ معنے ہیں کہ جو شخص اپنی نظر خدا تعالیٰ کی طرف رکھے۔ کسی انسان سے اُس کی اُمید وابستہ نہ ہو۔ اس کی امیدگاہ وہی ہو۔ اور دوسری طرف وہ محسن بھی ہو۔ یعنی اس کا عمل اتنا وسیع ہو کہ کوئی شخص اُس کے حسنِ سلوک سے باہر نہ رہے گویا اُس کا احسان ساری دنیا سے وابستہ ہو۔

تفسیر:۔ یہ آیت وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى کے جواب میں نازل کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست رکھنا اور خدا تعالیٰ کی مخلوق سے محبت کرنا۔ پس نجات کا مستحق صرف وہی شخص ہے جو ایک طرف تو اپنے آپ کو کلّیۃً اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر ڈال دے اور جو کچھ مانگنا ہو اُس سے مانگے۔ اور دوسری طرف اُس کا دامن اتنا وسیع ہو کہ آپ دوسروں سے لینے کے لئے تیار نہ ہو بلکہ ہر ایک کو دینے کیلئے آمادہ رہے۔ اسی مضمون کا ایک شعر میں نے بھی کہا ہے کہ

؎ تو سب دنیا کو دے لیکن
خود ترے ہاتھ میں بھیک نہ ہو

یہ محسن کا کمال ہے کہ وہ اپنے لئے خدا تعالیٰ سے مانگتا
ہے اور پھر سب دنیا کو دیتا ہے ۔ اور درحقیقت انابت
الی اللہ ۔ توجہ الی اللہ اور شفقت علی الناس ہی اسلامی
تعلیم کا خلاصہ ہے ۔ بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ
حضرت مرزا صاحبؑ نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ
دو باتیں اسلام کا خلاصہ ہیں اس کا ثبوت کیا ہے ؟
سو وہ خلاصہ اسی آیت میں درج ہے ۔ مَنْ اَسْلَمَ
میں انابت الی اللہ آ جاتی ہے اور وَهُوَ مُحْسِنٌ میں
لوگوں پر شفقت آ جاتی ہے ۔ اور بَلٰی کہہ کر بتا دیا
کہ نجات صرف انہی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ
تمہارے ساتھ ۔ ایسے لوگوں کے لئے اُن کے ربّ کے
پاس اُن کا اجر محفوظ رہیگا ۔

اس میں ایک لطیف بات بیان کی گئی ہے اور وہ
یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا نجات ہمارے ساتھ مخصوص ہے
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نجات کا گُر تو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ
کے سپرد کر دینا ہے نہ کہ کوئی خاص مذہب اختیار کرنا
محض نام نجات نہیں دلا سکتا بلکہ جب بھی خدا تعالیٰ
کا کوئی نیا حکم آئے تو اُسے قبول کرنا ہی حقیقی اسلام
ہے اور اُس کا انکار کرنا نجات کے مخالف ۔ باقی رہا یہ کہ
ان کے علاوہ کوئی ناجی ہے یا نہیں ؟ سو اس کے متعلق
یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام قانون کے طور پر صرف انہی
لوگوں کو نجات کا مستحق بتاتا ہے جو اَسْلَمَ وَجْهَهٗ
لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ کے ماتحت آتے ہوں ۔ باقی خدا تعالیٰ
مالک ہے جسے چاہے بخش دے ۔ اگر وہ کسی ہندو کو
بخشنا چاہے یا کسی سکھ کو بخشنا چاہے یا کسی عیسائی
اور یہودی کو بخشنا چاہے تو اُسے کون روک سکتا ہے ۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ میں اس طرف بھی
اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر سچے مومن کا یہ فرض ہے کہ وہ
اپنے سارے وجود کو خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر دے ۔
اور اپنی دنیوی حاجات کو بھی دینی حاجات کے تابع کر دے ۔
بظاہر یہ ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اسلام
اور دیگر ادیان میں یہی فرق ہے ۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم
علم حاصل نہ کرو ۔ نہ یہ کہتا ہے کہ تم تجارتیں نہ کرو ۔ نہ
یہ کہتا ہے کہ صنعت و حرفت نہ کرو ۔ نہ یہ کہتا ہے کہ
تم اپنی حکومت کی مضبوطی کی کوشش نہ کرو ۔ وہ صرف
انسان کے نقطۂ نگاہ کو بدلتا ہے ۔ دنیا میں تمام کاموں
کے دو نقطۂ نگاہ ہوتے ہیں ۔ ایک قشر سے مغز حاصل
کرنیکا نقطۂ نگاہ ہوتا ہے اور ایک مغز سے قشر حاصل
کرنیکا نقطۂ نگاہ ہوتا ہے جو شخص قشر سے مغز حاصل
کرنے کی اُمید رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اپنے مقصد
میں کامیاب ہو جائے بلکہ اکثر وہ ناکام رہتا ہے ۔ لیکن
جو شخص مغز حاصل کرتا ہے ۔ اسکو ساتھ ہی قشر بھی مل
جاتا ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے
اتباع کی تمام جدوجہد دین کے لئے تھی لیکن یہ نہیں
کہ وہ دنیوی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہوں ۔ جن لوگوں کو
دین ملے گا دنیا لونڈی کی طرح اُن کے پیچھے دوڑتی آئیگی
لیکن دنیا کے ساتھ دین کا ملنا ضروری نہیں ۔ بسا اوقات
وہ نہیں ملتا اور بسا اوقات رہا سہا دین بھی ہاتھوں
سے جاتا رہتا ہے ۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔

خوف آئندہ آنے والی باتوں کے لئے ہوتا ہے اور حزن
ماضی پر ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مسلمانوں کا مستقبل محفوظ
ہے ۔ انکو کوئی قوم نقصان نہیں پہنچا سکتی اور اُنکی
ماضی بھی اُن کو کبھی پریشان نہیں کر سکتی ۔ اگر اللہ تعالیٰ
ماضی معاف نہ کرتا تو انہیں فکر ہی لگی رہتی کہ ہم نے
تیس چالیس پچاس ساٹھ یا سو سال کی عمر ضائع کر دی
اور نافرمانیاں کرتے رہے ۔ مگر ادھر وہ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ
پر عمل کرتا ہے اور اسلام میں داخل ہوتا ہے اور ادھر

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ص وَّ

اور یہودی کہتے ہیں کہ مسیحی کسی (بھی) بات پر قائم نہیں ہیں - اور

قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ لا وَّ

مسیحی کہتے ہیں کہ یہود کسی (بھی) بات پر قائم نہیں ہیں - حالانکہ

اس کے تمام سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ گویا مومن کی ماضی اُسے کبھی پریشان نہیں کرسکتی۔ کیونکہ وہ ایمان لانے کے بعد ایسا ہوجاتا ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ۔ اگر بعد میں وہ کسی گناہ کا ارتکاب کریگا۔ تو بے شک وہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائیگا۔ مگر توبہ کے بعد پچھلے تمام گناہ مٹ جاتے ہیں۔

غرض اس آیت میں بتایا کہ جو شخص خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرلے اور مخلوقِ خدا پر بھی اس کے احسان کا دائرہ وسیع ہو اُسے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ حُزن۔ کیونکہ ایسا شخص خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجاتا ہے۔ خوف اُس شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو یا تو آخرت پر قطعی طور پر ایمان نہیں رکھتا اور سمجھتا ہے کہ جب مرگئے تو خاک ہوجائیں گے اس لئے وہ موت سے ڈرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے عیش کے دنوں کو لمبا کرے اور یا پھر خوف اس شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے جو مرنے کے بعد آنیوالی زندگی پر ایمان تو رکھتا ہے مگر اس کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ وہ ڈرتا ہے کہ اگر میں مرگیا تو خدا کو کیا جواب دونگا۔ لیکن وہ جو آخرت پر سچا ایمان رکھتا ہے اور اُس ایمان کے مطابق اعمال بھی بجا لاتا ہے اُس کے دل میں کوئی خوف نہیں رہتا۔ دوسری چیز حُزن ہے۔ خوف آئندہ کے متعلق ہوتا ہے لیکن حُزن ماضی کے متعلق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ سچے مومن ہوں اُن کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ انہیں حُزن بھی نہیں ہوتا۔ ایک صدمہ ایسا ہوتا ہے جو اتصال اور محبت کی وجہ سے کسی چیز کے ضائع ہونے پر ہوتا ہے۔ اس صدمہ کو محسوس کرنے اور اس کے اظہار سے خدا نے منع نہیں فرمایا۔ لیکن حُزن یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی گذشتہ کوتاہیوں کو دیکھتے ہوئے خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی کوئی تائید نہیں کرے گا۔ فرماتا ہے جسے خدا پر کامل ایمان ہو حُزن اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ کیونکہ وہ اپنے خدا کی محبت اور اُسکی قدرتوں پر کامل یقین رکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ خدا اپنے مخلص بندوں کو کبھی ضائع نہیں کیا کرتا

ترتیب و ربط: گذشتہ رکوع میں اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس منصوبہ کا ذکر کرکے جو وہ غیر سلطنتوں سے کرتے تھے آیت ۱۰۵ و ۱۰۶ میں اُن کے دوسرے منصوبہ کا ذکر کیا جو وہ خود مسلمانوں میں بدامنی پیدا کرنے کے لئے کررہے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمان گستاخی میں مبتلا ہوکر انعاماتِ الٰہیہ سے محروم ہوجائیں آیت ۱۰۷ میں بتایا کہ ہم کسی کلام کو منسوخ کرتے ہیں تو اُس سے بہتر لاتے ہیں۔ پس یہود سوچیں کہ کیا موسیٰؑ اور دیگر انبیاء پر جو کلام نازل ہوتا تھا اس کے اثر اور اشاعت کو کوئی قوم روک سکی تھی جو اب یہ روک لیں گے۔

آیت ۱۰۸ میں بتایا کہ یہ کلام زمین و آسمان کے بادشاہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اسکی مخالفت کا نتیجہ خطرناک ہوگا۔ آیت ۱۰۹ و ۱۱۰ میں یہود کی تیسری تدبیر کا ذکر ہے جو وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا

دونوں (ایک ہی) کتاب (یعنی تورات) پڑھتے ہیں - اسی طرح (دوسرے) لوگ جو علم نہیں رکھتے

يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

اُنہی کی سی بات کہا کرتے تھے - سو جس (بات) میں یہ اختلاف کرتے ہیں اس کے متعلق

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اللہ قیامت کے دن اُن کے درمیان فیصلہ کریگا - ۱۳۱

خلاف کیا کرتے تھے - اور وہ یہ کہ نہایت لغو اور بیہودہ سوالات کرتے تا کہ مسلمان بھی اُنکی دیکھا دیکھی اِس مرض میں مبتلا ہو جائیں - اور آہستہ آہستہ دینِ الٰہی کی عظمت اُن کے دلوں سے مٹ جائے - خدا تعالےٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ دیکھو یہ لوگ حضرت موسیٰؑ سے ایسے سوالات کرکے ہلاک ہو چکے ہیں اور اب تمہیں غافل اور گستاخ اور کافر بنانا چاہتے ہیں - آیت ۱۱۱ میں اُن کے شر سے بچنے کی تدبیر بتائی کہ عبادت میں لگ جاؤ اور مخلوق کی ہمدردی کرو - آیت ۱۱۲ میں صابیوں کا بھی ذکر کر دیا (جو موسوی مذہب کی ایک شاخ تھے مگر یہودیوں سے بالکل الگ ہو چکے تھے) اور فرمایا کہ جب خدا تعالیٰ نے ایک نیا عہد باندھا ہے اور اُن کی کتابوں میں اس کی خبر ہے تو اب اس سے منہ موڑ کر صرف یہودی یا عیسائی کہلانے سے کیونکر نجات ہو سکتی ہے - آیت ۱۱۳ میں اُن کے خیالات کو رد فرما کر نجات کا حقیقی ذریعہ بتایا جو خدا تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری اور اس کی مخلوق پر شفقت سے کام لینا ہے -

۱۳۱ تفسیر :- فرمایا - یہ لوگ تمہیں تو غیر ناجی قرار دیتے ہیں لیکن خود ان کی یہ حالت ہے کہ یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ میں کوئی خوبی نہیں پائی جاتی اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود اپنے اندر کوئی نیکی اور دیانت نہیں رکھتے - حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ بائیبل پر ہمارا ایمان ہے اور وہ بھی کہتے ہیں کہ بائیبل پر ہمارا ایمان ہے - صرف انجیل کے متعلق ان دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے یعنی یہود تو اسے کوئی مقدس کتاب تسلیم نہیں کرتے اور عیسائی اس پر ایمان رکھتے ہیں - لیکن بائیبل جس میں تمام عہد نامہ قدیم شامل ہے اس پر یہود اور عیسائی دونوں ایمان رکھتے ہیں اور دونوں کہتے ہیں کہ اس میں کئی خوبیاں پائی جاتی ہیں - مگر ایک کتاب پر ایمان رکھنے کے باوجود ان میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہودی عیسائیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان میں کوئی خوبی نہیں - اور عیسائی یہودیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ ان میں کوئی خوبی نہیں -

اِس سے پہلے یہود کے تین دعووں کا ذکر آ چکا ہے - اب ان کے متعلق یہ چوتھی بات بیان کی گئی ہے در حقیقت پہلی دو باتیں آپس میں مشابہ تھیں اور آخری دو باتیں آپس میں مشابہ ہیں - پہلے کہا تھا کہ یہود کا دعویٰ ہے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ہمیں آگ صرف چند دن چھوئیگی اور گیارھویں رکوع میں اُن کا یہ دعویٰ بیان کیا گیا تھا کہ اگلا جہان صرف

ہمارے لئے مخصوص ہے۔ گویا پہلے دعوے سے دوسرا دعویٰ بڑھ گیا
پہلا دعویٰ یہ تھا کہ اگر ہم دوزخ میں جائیں گے تو صرف چند دن ہی
اس میں رہیں گے۔ اور دوسرا دعویٰ یہ تھا کہ جنت میں ہمارے سوا
اور کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ یہ پہلے دعویٰ سے بڑھ کر دعویٰ ہے
اللہ تعالیٰ نے ان دونوں دعووں کا ردّ کر دیا۔ اب تیسرا اور چوتھا
دعویٰ آپس میں مشابہ ہیں۔ مگر چوتھا تیسرے سے بڑھ کر ہے۔
تیسرا دعویٰ یہ تھا کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا
اَوْ نَصٰرٰى کہ یہود کے نزدیک یہودیوں کے سوا اور کوئی جنت
میں داخل نہیں ہوگا اور عیسائیوں کے نزدیک عیسائیوں کے
سوا کوئی اور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ اور چوتھا دعویٰ
یہ ہے جو اس سے بھی بڑا ہے کہ دوسروں کے جنت میں جانے
کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہود کے نزدیک عیسائیوں
میں کوئی نیکی نہیں اور عیسائیوں کے نزدیک یہود میں کوئی
خوبی نہیں۔ یوں دوزخ میں جانے والوں میں بھی بعض نیکیاں
ہو سکتی ہیں کیونکہ آخر ایک یا دو نیکیوں سے انسان جنت
میں نہیں جا سکتا۔ جنت میں انسان اسی صورت میں داخل ہوتا
ہے جب نیکیاں زیادہ ہوں اور بدیاں کم ہوں۔ مگر یہ لوگ
ایک دوسرے کو دوزخی قرار دینے میں اتنا غلو کرتے ہیں کہ
کہتے ہیں ہمارے سوا دوسروں میں کوئی نیکی پائی ہی نہیں
جاتی۔ گویا قطعی طور پر وہ کسی نیکی کو دوسرے کی طرف منسوب
کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ باقی
نیکیوں کو تم جانے دو۔ تم یہ بتاؤ کہ عہد عتیق کا پڑھنا نیکی
ہے یا نہیں؟ وہ کم از کم اسے تو پڑھتے ہیں۔ اور جب
یہ نیکی کا کام کرتے ہیں تو پھر کلّی طور پر کسی کی نیکی کا کیوں
انکار کرتے ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مذہب اپنے اندر بعض صداقتیں
رکھتا ہے۔ اور سچے مذہب کے صرف یہی معنے ہوتے ہیں کہ وہ
دوسروں کی نسبت اپنے اندر بہت زیادہ خوبیاں اور کمالات
رکھتا ہے اور ہر قسم کے نقائص سے منزہ اور پاک ہوتا ہے۔
ورنہ تھوڑی بہت صداقت تو ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔
لیکن افسوس ہے کہ عام طور پر اس اصل کو نہیں سمجھا جاتا۔
جس کا نتیجہ شدید مذہبی عداوت کی شکل میں رونما ہوتا
ہے۔ اسلام اس کم حوصلگی بلکہ غلط بیانی کا شدید مخالف
ہے۔ اور اپنی صداقت کے دعویٰ کے ساتھ اس بات کا بھی
اعتراف کرتا ہے کہ ہر مذہب اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتا
ہے اور مختلف مذاہب کے پیروؤں کو نصیحت کرتا ہے
کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر اندھا دھند حملہ نہ کیا
کریں۔ بلکہ دوسروں کی خوبیوں کو بھی دیکھا کریں۔ اور
بلا غور و تحقیق مذہبی تعصب کی بنا پر یہ خیال نہ کر لیا کریں
کہ دوسرا مذہب سر سے پاؤں تک عیوب کا مجسمہ ہے اور
ہر قسم کی خوبی اس میں مفقود ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا
میں یہودیوں اور مسیحیوں کو ملامت کی گئی ہے کہ
ایک دوسرے سے اس قدر سخت عداوت رکھتے ہیں کہ
دوسروں کی کسی خوبی کے قائل ہی نہیں بلکہ تعصب مذہبی سے
اندھے ہو کر فریق مخالف کو سراسر غلطی پر خیال کرتے ہیں۔
حالانکہ اگر اور کچھ نہ ہو تو کم از کم دونوں ایک ہی کتاب
کے پڑھنے والے ہیں۔ پس اس ایک خوبی میں تو دونوں مشترک
ہیں۔ اگر قرآن کریم کی اس تعلیم پر لوگ عمل کریں تو دنیا کا
نقشہ بدل سکتا ہے۔ اور ہر قسم کے جھگڑے اور مناقشات
دور ہو کر صحیح معنوں میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ کیونکہ
تمام مذہبی جھگڑوں کی بنیاد اسی غلط فہمی پر ہے۔ لوگ
مخالف مذہب پر غور کرنے سے پہلے اس کی تردید شروع کر
دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے پیروؤں کے دل
میں بھی اس حملہ آور کے مذہب کی نسبت بغض پیدا ہو
جاتا ہے۔ اور اس طرح ٹھنڈے دل سے مختلف مذاہب پر
غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ اور بلا غور کئے تمام
مذاہب کے پیرو صرف دشمنوں کی روایات کی بنا پر دوسرے
مذاہب کے عقائد کو بعید از عقل اور مجموعہ توہمات

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ

اور اُس (شخص) سے بڑھ کر کون ظالم (ہوسکتا) ہے جس نے اللہ کی مساجد سے (لوگوں کو) روکا کہ اُن میں اُس کا

فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ

نام لیا جائے اور اُن کی ویرانی کے درپے ہوگیا۔ اِن (لوگوں) کے لئے مناسب نہ تھا کہ

لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا

اُن (مساجد) کے اندر داخل ہوتے مگر (خدا سے) ڈرتے ہوئے۔ اُن کے لئے دنیا میں (بھی)

خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

رسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) اُن کے لئے بڑا عذاب (مقدر) ہے۔ ۱۳۲

اور اس کے احکام کو ناقابلِ عمل اور دنیا کے امن کے منافی خیال کرلیتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اُن مذاہب سے نفرت کرنے لگتے ہیں لیکن اگر بہ سدا غور ہو تو ہر ایک مذہب میں بہت کچھ خوبیاں اور کسی قدر کمزوریاں نظر آئینگی سوائے اس ایک سچے مذہب کے جو سب نقصوں سے پاک ہوتا ہے پس اس غرور کا لازمی نتیجہ باہمی صلح اور آشتی ہوگا۔ ایک دوسرے کے مذہب پر ناجائز حملہ کرنے کی عادت لوگوں کو اس قدر پڑگئی ہے کہ اس زمانہ میں ▪▪ ایک شغل خیال کیا جاتا ہے حالانکہ اس کے نتائج بحیثیت مجموعی تمام دنیا کیلئے خطرناک ہیں - اور قرآن کریم نے اصولی طور پر اس آیت میں اسی نقص کے ازالہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں اسلامی فرقوں کا بھی یہی حال ہے کہ باوجود اس کے کہ ▪▪ ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایک رسول پر ایمان رکھتے ہیں پھر بھی وہ ذرہ ذرہ سے اختلاف پر ایک دوسرے کو کافر کہتے رہتے ہیں۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ عیب صرف یہود اور نصاریٰ میں ہی نہیں بلکہ وہ تمام لوگ جو علم صحیح سے بے بہرہ ہیں ایک دوسرے پر ایسے ہی حملے کرتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دینا اور لڑائی

جھگڑے کے وقت نیکی اور بدی کا موازنہ نہ کرنا صرف جُہلا کا کام ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک انسان خدا کو مانتا ہو اور پھر اُس میں کوئی نیکی نہ ہو۔ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دنیا میں ایک چیز موجود ہو اور پھر اُس میں کوئی خوبی نہ پائی جاتی ہو۔ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہیں کی جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ بلکہ اب تو سانپ اور بچھو کے زہر تک میں فوائد تسلیم کرلئے گئے ہیں۔ پھر انسان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس میں کوئی بھی خوبی نہیں سراسر ظلم اور خدا تعالیٰ پر حملہ ہے۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ فرماتا ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ یہود میں کسی قسم کی کوئی نیکی نہیں یا کہتے ہیں کہ نصاریٰ میں کوئی نیکی نہیں انکا یہ قول درست نہیں ہاں اُن میں غلطیاں ضرور ہیں تبھی تو اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے کہ اُن میں جو غلطیاں پائی جاتی ہیں وہ انکی اصلاح کرے مگر یہ کہنا درست نہیں کہ اُن میں کوئی نیکی ہے ہی نہیں۔ ہاں اُن میں نیکیاں کم اور بدیاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور جب دنیا میں نیکیاں کم اور بدیاں زیادہ ہوجائیں اور عالمگیر خرابی پیدا ہوجائے تو اسوقت اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنا کوئی نبی مبعوث فرماتا ہے تاکہ بدیاں کم اور نیکیاں زیادہ ہوجائیں اور لوگ پھر خدا تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کریں۔

۱۳۲ تفسیر:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص مساجد میں اللہ تعالیٰ کا نام نہ لینے دے اور اُس کی عبادت سے

لوگوں کو روکے اور اس طرح اُن کو ویران کرنے کی کوشش کرے وہ سب سے زیادہ ظالم ہے۔ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے جو اسلام نے پیش کی ہے۔ اِسے سامنے رکھ لو دُنیا کا کوئی مذہب اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا۔ مسلمانوں کا عمل جانے دو بلکہ اس حکم اور تعلیم کو دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کسی کا حق نہیں کہ ذکرِ الٰہی سے کسی کو روکے۔ اگر کوئی شخص مسجد میں جا کر ذکرِ الٰہی کرنا چاہے یا اپنے رنگ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لانا چاہے تو اس سے روکنا بالکل ناجائز ہے۔ کوئی ہندو سکھ یا عیسائی آجائے اور مسلمانوں کی مسجد میں اپنے رنگ میں عبادتِ الٰہی کرنا چاہے تو کسی مسلمان کو اُسے روکنے کا حق نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ باجا بجانا اور ناچنا اُن کی عبادت میں شامل ہے تو ہم کہیں گے کہ یہ کام وہ باہر کرلیں۔ جتنا حصہ ذکرِ الٰہی کا ہے وہ مسجد میں آکر ادا کریں۔ اس آیت میں ان تمام قسم کی زیادتیوں اور تعدّیوں کو جو ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں یا عبادات کے متعلق کرتے ہیں یک قلم موقوف کر دیا گیا ہے اور سب مذاہب کے پیرؤوں کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ عبادت خانوں اور عبادتوں کے متعلق اپنے دلوں اور اپنے حوصلوں کو وسیع کریں کیونکہ اُن کا موجودہ طریقِ عمل نہایت ظالمانہ اور جابرانہ ہے جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ وہ ظالمانہ طریق جو عبادتخانوں یا عبادات کے متعلق زمانہ نزولِ قرآن کے وقت برتے جاتے تھے یا اب بھی برتے جاتے ہیں اور جن سے قرآن کریم منع فرماتا ہے یہ ہیں:-

اوّل۔ اگر ایک گروہ دوسرے گروہ پر فتح پاتا تو اُس کے عبادتخانوں کو گرا دیتا یا انہیں مقفّل کر دیتا۔ یا اس مذہب کے پیرؤوں کو اُن میں عبادت نہ کرنے دیتا۔

دوّم۔ ہر مذہب کے پیرو اپنی اپنی عبادت گاہوں میں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو عبادت کرنے سے روکتے اور ان میں دوسروں کو داخل ہونے تک کی بھی اجازت نہ دیتے یہ باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وقت میں بڑے زور سے رائج تھیں۔ اور مختلف مذاہب کے پیرؤوں کی عادت میں داخل ہو گئی تھیں۔ اور اُس زمانہ میں یہ باتیں عیب نہیں بلکہ حق اور ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ اور تاریخ عالم بتاتی ہے کہ یہ اس زمانہ کی ایجاد نہ تھی بلکہ ہمیشہ سے دنیا انہی اُمور کی خوگر چلی آتی تھی۔ اس لئے کسی انسان کی طبیعت ان سے گھبراتی نہ تھی۔ بلکہ اس زمانہ میں بھی ایک یا دوسری شکل میں یہ سب باتیں دنیا میں رائج ہیں۔ اور گو علوم کی ترقی نے عبادت خانوں کو گرا دینا یا ان کو بند کر دینا بڑی حد تک دُور کر دیا ہے۔ لیکن اپنی عبادت گاہوں میں دوسرے مذاہب کے پیرؤوں کو عبادت کرنے کی اجازت نہ دینا تو اس زمانہ میں بھی ایک عام بات ہے۔ ایک مسیحی گرجا میں ایک مسلمان کو اور ایک یہودی گرجا میں ایک مسیحی کو اور ایک مندر میں ایک مسیحی کو اور ایک پارسی صومعہ میں ایک ہندو کو اپنی عبادت کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی۔ اور اگر کوئی ایسا کرے تو یورپ کے علوم و فنون سے آگاہ ممالک سے لیکر افریقہ کے نیم وحشی قبائل تک کے لوگ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ بلکہ بعض تو اپنے عبادتخانوں میں دوسروں کو داخل ہونے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ قرآن کریم اس ظالمانہ کارروائی سے روکتا ہے اور بتاتا ہے کہ گو خیالات متفرق ہیں لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اس کو اُس شہنشاہِ حقیقی کے نام لینے اور اُس کی عبادت کرنے سے روکنا یا مساجد میں کسی کو نہ آنے دینا اور اس طرح اُن کو ویران کرنے کی کوشش کرنا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ ہر ایک مذہب کے پیرؤوں کو خواہ وہ مفتوح ہوں یا فاتح مساجد کے استعمال کی کامل آزادی ہونی چاہیئے۔ اور اگر ایک مذہب کے عبادت خانہ میں

کسی دوسرے مذہب کا کوئی انسان اپنے طریق پر خدا تعالیٰ کا نام لینا چاہے اور اُس کی عبادت کرنا چاہے تو اس کو روکنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ مساجد ایک ایسا مقام ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ پس ان کے بارے میں انسان کو ڈر کر کام کرنا چاہیئے اور آپس کے اختلافات کو اُن تک وسیع نہیں کرنا چاہیئے۔ ورنہ جو لوگ اس بات کی پرواہ نہیں کرینگے اور اس عمل میں غلو سے کام لیں گے اِس دنیا میں بھی ان کو عذاب دیا جائیگا اور آخرت میں بھی وہ سزا سے بچ نہیں سکتے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو قرآن کریم نے مختلف مذاہب کے معبدوں کے احترام اور اُن کی عبادت کے متعلق دی ہے۔ کسی اور مذہب کی تعلیم کو اس سے ملا کر دیکھو اور مقابلہ کرو کہ وہ کونسی تعلیم ہے جو ایک طرف تو عقل اور فہم کے مطابق ہے اور دوسری طرف دنیا میں امن قائم کرنے والی ہے۔ اس تعلیم کے ہوتے ہوئے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ ایک متعصب مذہب ہے۔ مگر یہ اعتراض تبھی قابلِ قبول ہو سکتا ہے جب اس سے بڑھ کر عمدہ اور لطیف تعلیم دنیا میں کسی اور مذہب کی طرف سے پیش کی جائے۔ ورنہ زبانی اعتراض تو ہر مذہب کے لوگ دوسروں پر کر سکتے ہیں۔ دعویٰ بلادلیل بجائے نفع دینے کے عقلمندوں کی نظر میں انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ وسعتِ حوصلہ جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سب سے پہلا انسان جس نے اِس پر عمل کیا وہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے نجران کے مسیحیوں کو اپنی مسجد میں گرجا کرنے کی اجازت دے دی۔ زاد المعاد میں لکھا ہے۔ لَمَّا قَدِمَ وَفْدُ نَجْرَانَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلُوْا عَلَيْهِ مَسْجِدَهٗ بَعْدَ الْعَصْرِ فَحَانَتْ صَلٰوتُهُمْ فَقَامُوْا يُصَلُّوْنَ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَاَرَادَ النَّاسُ مَنْعَهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعُوْهُمْ فَاسْتَقْبَلُوا الْمَشْرِقَ فَصَلَّوْا صَلٰوتَهُمْ (زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۳۵) یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس نجران کا عیسائی وفد آیا۔ تو وہ لوگ عصر کے بعد مسجد نبویؐ میں آئے اور گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو کرتے کرتے اُن کی عبادت کا وقت آ گیا (غالباً وہ اتوار کا دن ہوگا) چنانچہ وہ وہیں مسجد میں اپنے طریق کے مطابق عبادت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے چاہا کہ وہ انہیں روک دیں مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ایسا مت کرو۔ چنانچہ انہوں نے اُسی جگہ مشرق کی طرف منہ کیا اور اپنے طریق کے مطابق عبادت کر لی۔

پس مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکنے کا کسی کو حق نہیں۔ اگر تمام اقوام اس بات پر عمل کرنے لگ جائیں تو تمام باہمی جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اگر ہر قوم اپنے معبد میں دوسروں کو آنے اور وہاں عبادت اور ذکر الٰہی کرنے کی اجازت دے دے تو کبھی آپس میں مناقشت اور جھگڑا پیدا نہ ہو اور دنیا میں ہر طرف امن قائم ہو جائے۔ مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے اعمال پر غور کریں اور سوچیں کہ کیا وہ اس تعلیم پر پوری طرح عمل کرتے ہیں جو قرآن کریم دیتا ہے۔ اور جس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تھا۔ یا اس کے خلاف اپنے خود ساختہ اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ آیت غیر احمدیوں اور ہم میں ایک فیصلہ کن آیت ہے

قرآن کریم میں مَنْ اَظْلَمُ کے الفاظ تین قسم کے لوگوں کے لئے آئے ہیں۔ اوّل جھوٹے مدعیان نبوت کیلئے۔ دوم سچے نبی کو جھوٹا کہنے والے کیلئے۔ جیسا کہ آتا ہے۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا

أَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (یونس آیت ۱۸) کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر
افترا کرتا ہے یا سچے نبی کے الہام کو جھٹلاتا ہے اس سے زیادہ
ظالم اور کون ہو سکتا ہے۔ متوتم۔ مساجد میں عبادِ الٰہی
سے روکنے والوں کے متعلق جیسا کہ اسجگہ ہے۔ اب
سوال یہ ہے کہ آیا بانی سلسلہ احمدیہ نے جھوٹا دعویٰ نبوت
کیا ہے یا غیر احمدی ایک سچے نبی کے منکر ہیں۔ بہر حال
دونوں میں سے ایک مَنْ اَظْلَمُ میں ضرور شامل ہے
اس سوال کو یہ تیسری آیت بالکل حل کر دیتی ہے۔ کیونکہ
جہاں جماعت احمدیہ میں ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی
کہ اس نے اپنی مساجد میں کسی کو عبادت کرنے سے روکا
ہو وہاں مسلمانوں میں ایسی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ
انہوں نے جماعت احمدیہ کے افراد کو اپنی مسجدوں میں
نمازیں پڑھنے سے روکا اور اُن پر سختیاں کیں۔ پس
اس آیت نے ثابت کر دیا کہ بانی سلسلہ احمدیہ کے
مخالفین اپنے عمل کے لحاظ سے اس گروہ میں شامل ہیں
جس کے متعلق مَنْ اَظْلَمُ کے الفاظ آتے ہیں اور
جو خدائی منشاء کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا
خَآئِفِيْنَ ۔ فرماتا ہے کہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ
خدا تعالیٰ کا گھر ہو اور پھر یہ ذلیل لڑائیاں ہوں۔
حالانکہ اُن کے لئے یہ ہرگز مناسب نہ تھا کہ اس قسم کی
ظالمانہ حرکت کرتے۔ یا ان کا کوئی حق نہ تھا کہ خدا تعالیٰ
کے گھر میں عبادت کرنے سے دوسروں کو روکتے۔ ان کو
تو چاہیئے تھا کہ خدا تعالیٰ کے گھر جاتے وقت خوف سے
اُن کا دل لرزتا اور اس قسم کے فسادات پر کمربستہ نہ ہوتے۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ فرماتا ہے چونکہ یہ لوگ ہمارے گھر
کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم بھی ان کے گھروں
کو برباد کر دینگے اور یہ دنیا میں بھی رسوا ہونگے۔ اور
آخرت میں بھی انہیں عذابِ عظیم ملیگا۔ کیونکہ جنت خدا
تعالیٰ کا گھر ہے جس کا ظلّ مسجد ہے۔ جب انہوں نے
مسجدوں کو ویران کر دیا تو ان کو اگلے جہان میں کہاں
امن میسّر آسکتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ مساجد
کی پناہ میں آنے والے لوگوں کو اسلامی شریعت نے قانون
سے بالا سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ (رکوع ۱۳)
میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے حکومتِ وقت
یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی جماعت
کے خلاف خفیہ کارروائیاں کرنے کے لئے ایک مسجد
تیار کی تھی اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں درخواست بھی کی تھی کہ آپ تشریف لاکر اس میں نماز
پڑھیں اور دُعا فرمائیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ پر حقیقت
کھول دی اور بتا دیا کہ ان لوگوں نے یہ مسجد صرف اسلئے
تیار کی ہے کہ ان کی منافقت پر پردہ پڑا رہے۔ اور یہ
لوگ یہاں جمع ہو کر اسلام کے خلاف منصوبے کرتے رہیں
اور مسلمانوں کو تباہ کریں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس مسجد کو گروا دیا اور اس کی جگہ کھاد کا ڈھیر لگوا
دیا۔ پس مسجد اپنی ذات میں کسی مجرم کو نہیں بچا سکتی۔ اگر
مسجد میں کوئی بُرا کام کیا جائیگا تو اس کو بُرا سمجھا جائے گا
اور اگر اچھا کام کیا جائیگا تو اس کو اچھا سمجھا جائیگا بلکہ
اور مساجد تو الگ رہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
حرم کعبہ کے متعلق بھی فرمایا ہے کہ وہ کسی مجرم یا قانون
کی خلاف ورزی کرنے والے کو پناہ نہیں دیتا اور نہ قتل
کرکے بھاگنے والے کی پناہ گاہ بن سکتا ہے اور نہ چوری
کرکے بھاگنے والے کو بچا سکتا ہے۔ بلکہ ایسے لوگ پکڑے
جائیں گے اور انہیں قانونی گرفت میں لایا جائیگا۔ چنانچہ
فتح مکہ کے موقعہ پر جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کو اطلاع پہنچی کہ ابن اخطل جس کے قتل کا آپ نے حکم
دیا تھا کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر کھڑا ہے تو آپ نے فرمایا۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ

اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں۔ اِس لئے جدھر بھی تم رُخ کرو گے اُدھر ہی اللہ کی توجہ ہوگی۔

وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۶﴾

اللہ (تعالیٰ) یقیناً وسعت دینے والا (اور) بڑا جاننے والا ہے ۳۳

۹۳ اُسے وہیں قتل کر دو۔ چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ (سیرۃ حلبیہ جلد ۳)

پس اگر بعض مجرموں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں بھی قتل کر دینے کا حکم دیا تھا تو دوسری مسجدوں کی خانہ کعبہ کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے کہ اُن میں خلاف آئین کام کرنے والے لوگوں کو قانون سے بالا سمجھا جائے۔ پس مساجد تقویٰ کے قیام کے لئے قائم کی گئی ہیں۔ نہ کہ قانون شکنی کے لئے۔ اگر مسجد میں بھی قانون شکنی کے اڈے بن جائیں۔ تو پھر شیطان کے لئے تو کوئی گھر بھی بند نہیں رہتا۔ جن گھروں کو خدا تعالےٰ نے اس لئے تسکینِ قلوب کیلئے۔ روحانیت کے لئے تقویٰ کے قیام کیلئے تعاون اور اتحاد باہمی کیلئے بنایا ہے ان گھروں کو مسلمانوں میں فتنہ ڈلوانے کا ذریعہ بنانا یا اُن گھروں کو حکومت سے بغاوت کرنیکا ذریعہ بنانا یا ان گھروں کو فتنہ و فساد کی بنیاد رکھنے کی جگہ بنانا ایک خطرناک ظلم ہے جس کی اسلام کسی صورت میں بھی اجازت نہیں دیتا۔

اِس آیت میں ان لوگوں کے لئے جو عبادت گاہوں میں خدا تعالیٰ کا نام بلند کرنے سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ دو سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ انہیں دنیا میں ذلت نصیب ہوگی اور دوسرے آخرت میں انہیں سخت سزا ملے گی۔ ذلت کی سزا اس لحاظ سے تجویز کی گئی ہے کہ مساجد اور معابد بنانے کی صرف ایک ہی غرض ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں خدا تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ پس جو شخص ان میں لوگوں کو خدا تعالےٰ کی عبادت کرنے سے روکتا ہے وہ دنیا کی نگاہ میں اپنے لئے ذلت اور رسوائی کے سامان پیدا کرتا ہے جو اس فعل کی ایک طبعی سزا ہے۔

یہ الفاظ مشرکین مکہ کے متعلق ایک عظیم الشان پیشگوئی پر بھی مشتمل ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کو کعبہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اور آخر جب مکہ فتح ہوا تو انہیں ذلت اور رسوائی کے عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔

۳۳ حل لغات :۔ وَجْهٌ کے تین معنے ہیں۔ (۱) نَفْسُ الشَّیْءِ یعنی کسی چیز کی ذات۔ (۲) توجہ (۳) مُنہ پس فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کے معنے ہوئے۔ اُدھر ہی اللہ کو پاؤ گے (۲) اُدھر ہی اللہ کی توجہ پاؤ گے۔ (۳) اُدھر ہی اللہ کا مُنہ پاؤ گے۔

وَجْهٌ

وَاسِعٌ : بڑی وسعت والا یا بڑی وسعت بخشنے والا۔

وَاسِعٌ

تفسیر :۔ عیسائی لوگ جو ہمیشہ قرآن کریم پر کوئی نہ کوئی اعتراض کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کا قبلہ بدلا ہے۔ اور زیادہ تر افسوس کا مقام یہ ہے کہ بعض مسلمان مفسرین نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے انہیں اِس اعتراض میں مدد دی ہے۔ حالانکہ یہ آیت اُن آیات میں سے سمجھی جاتی ہے جنہیں منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے اللہ تعالےٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ مشرق اور مغرب سب خدا کا ہے۔ اس لئے جدھر چاہو مُنہ کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔ پھر حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھو۔ اور آخر میں یہ حکم دے دیا کہ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔ گویا انکے نزدیک یہ پہلی آیت

جس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ تم جدھر چاہو منہ کرکے نماز پڑھ لیا کرو۔ لیکن پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ حالانکہ اس آیت کا قبلہ کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہیں۔ نہ تو اس آیت میں نماز کا ذکر ہے اور نہ اس آیت سے پہلے اس کا کوئی ذکر ہے۔ ہاں مساجد کا ذکر ضرور آتا ہے مگر ان کے ذکر کے بعد لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کے کوئی معنے نہیں بنتے۔ کیونکہ مساجد کے ذکر کے ساتھ ایک مخصوص جہت کی تعیین بھی ضروری تھی تاکہ سب مسلمان ایک طرف منہ کرکے نماز پڑھتے اور ایسا نہ ہوتا کہ کسی کا منہ ایک طرف ہوتا اور کسی کا دوسری طرف۔ اگر مساجد کے ذکر کے بعد یہ کہہ دیا گیا کہ مشرق و مغرب سب خدا کا ہے تم جدھر چاہو منہ کر لیا کرو۔ اور پھر اگلی آیت میں بھی نہ نماز کا ذکر آتا ہے اور نہ قبلہ کا۔ پس یہ معنے کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ گذشتہ کئی آیات سے یہ مضمون بیان کیا جا رہا ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سوائے ان کے کسی اور مذہب میں نجات نہیں اور مشرک جو کسی دین کے پابند نہیں یا دہریہ جو خدا تعالیٰ کے قائل نہیں۔ یہ لوگ بلا وجہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں دخل اندازی کرتے ہیں اور انہیں خدائے واحد کے آگے سربسجود ہونے نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کو ذلیل اور رسوا کریگا۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے گھر کو ویران کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور چونکہ قاعدہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی سے کوئی دولت چھینتا ہے تو پھر کسی اَور کو جو اس کا حقدار ہوتا ہے دے دیتا ہے اور چونکہ اس قسم کے افعال کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ان کے اموال اور جائیدادیں چھین لی جائیں اور انہیں ذلیل کیا جائے۔ اس لئے لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دی کہ تم اپنی بے بسی پر غم نہ کھاؤ۔ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کا ہے۔ ہم ان لوگوں سے حکومت چھین لیں گے اور اُن کی جگہ تمہیں مشرق و مغرب کا حکمران بنا دینگے۔

غرض اس جگہ صرف دنیوی فتوحات کا ذکر ہے۔ یہاں نماز کا ذکر نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چونکہ مشرق و مغرب ہمارے ہیں اس لئے اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جدھر بھی تم اپنے لشکر لے کر نکلوگے وہیں تم اللہ تعالیٰ کی توجہ یا اللہ تعالیٰ کا مُنہ یا خود اللہ تعالیٰ کا وجود پاؤ گے کیونکہ تمہارے سامنے ایک ہی مقصد ہوگا جس کو پورا کرنے کے لئے تم جدوجہد کر رہے ہو گے۔

مَیں نے ایک دفعہ رؤیا میں بھی دیکھا کہ مَیں اپنی جماعت کے دوستوں کے سامنے اس آیت پر تقریر کر رہا ہوں۔ اور مَیں انہیں کہتا ہوں کہ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر جماعت کا مقصد ایک ہو تو اس ایک مقصد کو سامنے رکھ کر پھر خواہ اس کے افراد مختلف جہات کی طرف جائیں اُن میں تفرقہ پیدا نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ بحیثیت قوم کام کرنے والے ہونگے۔ اور اگر کسی مقصد کے بغیر جماعت ایک طرف بھی چلے تب بھی اُس کے افراد پراگندہ اور متفرق ہونگے پس یہ مت خیال کرو کہ تم پر سب کا ایک جہت میں جانا ہی ضروری ہے بلکہ اگر تم مختلف جہات کی طرف ایک ہی مقصد لے کر جاؤ گے تو خدا تعالیٰ کے نزدیک تم اکٹھے ہی سمجھے جاؤ گے۔ اور خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ ہوگا۔ اور تمہیں ہر مقام پر اپنا چہرہ دکھائیگا۔

وَجْهُ اللّٰهِ کے جو معنے اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن کو مدِّنظر رکھتے ہوئے (۱) اللہ تعالیٰ کی توجہ کے یہ معنے ہیں کہ جس طرف مسلمان متوجہ ہونگے اُسی طرف خدا تعالیٰ انکی کامیابی کے سامان پیدا کرنے لگیگا اور انکو فتوحات پر فتوحات حاصل ہونگی۔ (۲) اللہ تعالیٰ کے مُونہہ کو پانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت کریگا اور اُن کی نگرانی کرتا رہے گا۔ (۳) خود اللہ تعالیٰ کو پانے کا یہ مفہوم ہے کہ اگرچہ یہ ملکی فتوحات بظاہر دنیوی کام نظر آئیگا مگر چونکہ یہ خدا تعالیٰ کی مسجدوں

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ

اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے (اپنے لئے) ایک بیٹا بنا لیا ہے (اُن کی بات درست نہیں) وہ (تو ہر کمزوری سے) پاک ہے۔ بلکہ جو کچھ

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

آسمانوں اور زمین میں ہے اُسی کا ہے ۔ سب اُس کے فرمانبردار ہیں ۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا

وہ آسمانوں اور زمین کو (بغیر کسی سابق نمونہ کے) پیدا کرنیوالا ہے ۔ اور جب وہ کسی امر (کے عالم وجود میں لانے) کا فیصلہ کر لیتا ہے

اور معبدوں کی حفاظت کے لئے ہے ۔ اس لئے یہ دنیوی کام بھی دینی ہی متصوّر ہوگا ۔ اور اس سے مسلمانوں کو خدا تعالیٰ کی رضاء اور اس کی خوشنودی حاصل ہوگی ۔ گویا ان فتوحات کے ذریعہ انہیں صرف دنیا ہی نہیں ملے گی بلکہ اُن کے ہر کام میں رضاء الٰہی کے سامان ہونگے اور ہر کام جو وہ خدمت دین کا کرینگے اس کے نتیجہ میں انہیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی ۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خدا تعالیٰ کی خاطر اپنی بیوی کے مُنہ میں ایک لقمہ بھی ڈالتا ہے وہ بھی ایک نیکی کا کام کرتا ہے ۔ حالانکہ اگر وہ بیوی کے مُنہ میں لقمہ ڈالتا ہے تو اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے ۔ مگر چونکہ وہ یہ کام خدا تعالیٰ کی خاطر کرتا ہے ۔ اِس لئے اُسے اس کا بھی ثواب مل جاتا ہے ۔ اسی طرح اور لوگ فتح حاصل کرتے ہیں تو اُن کو صرف دنیا ملتی ہے مگر مسلمانوں کو دین و دنیا دونوں چیزیں ملیں گی ۔ انعام بھی ملے گا اور ملک بھی فتح ہونگے۔

یہ پیشگوئی اس وقت کی گئی تھی جب مُٹھی بھر مسلمان ہر قسم کے مصائب میں سے گذر رہے اور آزمائشوں میں ڈالے جا رہے تھے ۔ اور ان کا مستقبل سخت تاریک دکھائی دیتا تھا ۔ لیکن یہ پیشگوئی جلد ہی فتح مکہ کی شکل میں پوری ہو گئی اور تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گیا ۔ اور ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں اسلام کا جھنڈا قریباً تمام ممالک میں لہرانا شروع ہو گیا ۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کے الفاظ میں اِس طرف بھی اشارہ ہے کہ اسلام کے لئے پہلے مشرق میں پھیلنا مقدّر ہے اور پھر آخری زمانہ کے موعود کی بعثت کے بعد وہ مغرب میں بھی پھیل جائے گا ۔ سو مغرب کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے ۔ کیونکہ وہ زمانہ اب دُور نہیں ۔ سورج نکل چکا ہے اور اس کی شعاعیں انہیں بیدار کر رہی ہیں ۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اِس آیت کا قبلہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ بڑی وسعت والا ہے ۔ وہ جسے چاہے دولت میں بڑھا دے اور پھر وہ علیم بھی ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ کن لوگوں کے پاس لوگ سُکھ اور آرام پا سکتے ہیں ۔ جس کے پاس رہ کر لوگوں کو آرام ملتا ہے اُسی کو حکومت ملا کرتی ہے ۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری جماعت کے متعلق بھی پیشگوئیاں ہیں کہ اُسے دنیوی ترقیات حاصل ہونگی ۔ مگر اللہ تعالیٰ دنیوی حکومتیں اُسی کو دیتا ہے جس سے لوگ زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کر سکیں پس تم بھی اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نافع الناس وجود بناؤ اگر تمہاری بھی وہی حالت ہو کہ خدا کے بندے تم سے دُکھ پائیں

فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۱۱۸﴾

تو اُس کے متعلق وہ صرف یہ کہتا ہے کہ تو ہوجا سو وہ ہوجاتا ہے۔[۳۴]

تو پھر کوئی وجہ نہیں ہوگی کہ دُنیا کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں دی جائے۔ اور ایک ظالم کو بدل کر دوسرا ظالم کھڑا کر دیا جائے۔

۳۴ حل لغات ۱۔ قَضٰی کے معنے ہیں۔ (۱) خَلَقَ۔ اِن معنوں میں اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں اور جگہ بھی آتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (حٰم آیت ۱۳) یعنی جو دنیا اُس نے پیدا کی تھی اُسے اُس نے سات آسمانوں کی صورت میں بنایا (۲) اَعْلَمَ یعنی اُس نے اُسے بتا دیا۔ علم دے دیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ (بنی اسرائیل آیت ۵) ہم نے تورات میں بنی اسرائیل کو یہ بات بتادی تھی۔ (۳) اَمَرَ حکم دیا۔ جیسے آتا ہے وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (بنی اسرائیل آیت ۲۴) کہ تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اُسی کی عبادت کرو۔ (۴) حجت پوری کر دینا۔ الزام قائم کر دینا۔ جیسے کہتے ہیں قَضٰى عَلَيْهِ الْقَاضِىْ۔ قاضی نے اُس پر حجت قائم کر دی یا اُس کے متعلق فیصلہ کر دیا۔ (۵) پورا کر دینا۔ جیسے آتا ہے فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ (قصص آیت ۳۰) جب موسٰیؑ نے اپنی مقررہ مدت پوری کر دی۔ (۶) ارادہ کرنا۔ جیسا کہ فرمایا فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا۔ جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے۔

اَمْرٌ کے بھی کئی معنے ہیں۔ (۱) دین جیسے ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ کے معنے ہیں اللہ کے احکام نازل ہوگئے (۲) بات جیسے آیت اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا (ھود: ۴۱) میں ہے ہماری بات کے پورا ہونے کا وقت آگیا (۳) عذاب۔ جیسا کہ قُضِىَ الْاَمْرُ (بقرۃ: ۲۱۱) میں ہے۔ (۴) قَضٰى اَمْرًا کے معنے قرآن کریم سے الہام الٰہی کے نزول کے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اِن معنوں کے علاوہ اِس کے اور بھی کئی معنے ہیں۔

قَضٰی

تفسیر: یہود کا یہ دعوٰی کہ نجات بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص ہے گو ایک غلط دعوٰی تھا مگر اُن میں اتنی معقولیت ضرور پائی جاتی تھی کہ وہ دوسروں کو تبلیغ نہیں کرتے تھے۔ مگر عیسائیوں کا یہ دعوٰی کہ نجات اُن سے مخصوص ہے نہ صرف ایک غلط دعوٰی ہے بلکہ اِس میں یہ غیر معقولیت بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اس دعوٰی کے باوجود دوسروں کو بھی تبلیغ کرتے ہیں۔ اور انہیں اپنے مذہب کی دعوت دیتے ہیں اور پھر اس غیر معقولیت کی بناء اس غیر معقول عقیدہ پر رکھتے ہیں کہ مسیح ابن اللہ تھا اور اب وہی لوگ نجات پا سکتے ہیں جو خدا کے بیٹے پر ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اِن کی تردید میں کئی دلائل دیتا ہے اور فرماتا ہے خدا تعالیٰ کے لئے کسی ولد کا ماننا اِس لئے درست نہیں کہ وہ پاک ہے۔ یعنی ولد کے ماننے سے اللہ تعالیٰ میں کئی نقائص ماننے پڑتے ہیں۔

اوّل ولد کے لئے شہوت کا ہونا ضروری ہے اور شہوت دوسری چیز کی طرف توجہ کرنے اور اس کی احتیاج پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ اِس سے پاک ہے۔

دوم ولد کے لئے بیوی کا ہونا ضروری ہے اور یہ ایک اور احتیاج ہے جس سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

اَمْرٌ

سوم بیٹے میں جزئیت ہوتی ہے یعنی وہ اپنے باپ کا جزو ہوتا ہے۔ اور اس کا خون اس میں شامل ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا بھی ولد تسلیم کیا جائے تو اُس کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ اُس کے اجزاء بھی تقسیم ہو سکے۔

چہارم بیٹا ماننے سے اُس کا فنا ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ بیٹے کی ضرورت ہمیشہ فانی وجودوں کو ہی ہوتی ہے

ورنہ جو چیزیں اپنے مقصد پیدائش تک قائم رہنے والی ہیں اُن کو کسی قائم مقام کی ضرورت نہیں جیسے سورج چاند ستارے آسمان اور زمین وغیرہ ہیں۔ یہ چیزیں چونکہ اُس وقت تک چلتی چلی جائیں گی جب تک کہ ان کی ضرورت قائم ہے۔ اس لئے نہ تو یہ فنا ہوتی ہیں اور نہ اُن کے کسی قائم مقام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لیکن انسان چونکہ فنا ہو جاتا ہے اسلئے اُسے قائم مقام کی بھی ضرورت ہوتی ہے پس اگر خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کیا جائے تو اس کے لئے بھی فنا ماننی پڑے گی۔ حالانکہ وہ اس نقص سے منزّہ ہے۔

دوسری بات لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں یہ بیان کی ہے کہ ایک بادشاہ کو بعض دفعہ بیٹے کی ایک اچھے مددگار کے طور پر ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ اُس کی سلطنت کو وسیع کر سکے۔ مگر خدا تعالیٰ کو کسی مددگار کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مدد کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی ایسی چیز ذاتی کوشش سے حاصل نہ ہو سکے۔ مگر جب تمام مخلوق خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تو پھر اُسے کسی مددگار کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹے کی ضرورت تو تب ہو جب اُسے نئی فتوحات کی ضرورت ہو یا نئے ممالک پر حکمرانی کی خواہش ہو۔ لیکن جب ہر چیز اُسی کی پیدا کردہ ہے تو پھر اُس نے بیٹا کیسے بنا لیا!

پھر بعض اوقات بادشاہ کو یہ مشکل پیش آجاتی ہے کہ ملک کا کوئی حصّہ باغی ہو جاتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ سلطنت کے شورش زدہ یا دُور افتادہ علاقوں پر کنٹرول کرنے کے لئے کوئی دست و بازو بنے اور مددگار کے طور پر کام آئے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکومت سے تو کوئی بھی باہر نہیں كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ سب کے سب اس کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ ایسی صورت میں اُس کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ اُس نے ایک شخص کو اپنا بیٹا بنا لیا کیسے درست ہو سکتا ہے؟

پھر ہو سکتا تھا کہ کوئی کہہ دیتا کہ اب تو اُسکا کام چل گیا ہے۔ لیکن زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے وقت تو کام بہت زیادہ تھا اس لئے اُسے بیٹے کی ضرورت تھی اس کے لئے فرمایا کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہ زمین و آسمان کو خود پیدا کرنے والا ہے۔ اُسے پیدا کرتے وقت بھی کوئی مشکل پیش نہ آئی تھی کہ اُسے کسی بیٹے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس میں اُن سبھی فرقوں کی تردید کی گئی ہے جن کا یہ خیال ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش میں مسیح بھی اللہ تعالیٰ کا شریک تھا۔ فرماتا ہے تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ اُسے پیدائش عالم کے وقت بھی کسی مددگار کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ عیسائی جو حضرت مسیحؑ کو زمین و آسمان کی پیدائش میں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اُن سے پوچھنا چاہیئے کہ بیٹے نے زمین و آسمان کی پیدائش میں کیا کام کیا ہے۔ اگر وہ کہیں کہ کچھ نہیں تو پھر بیٹے کا وجود بے فائدہ ہوا۔ اور اگر وہ کہیں کہ اُس نے دنیا پیدا کی ہے تو اُن سے پوچھنا چاہیئے کہ کیا اکیلا باپ خدا اُسے پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس کا جواب دیں کہ نہیں۔ تو انہیں خدا باپ کو ناقص تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور اگر وہ اُسے کامل قرار دیں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ اکیلا باپ خدا ہی اُسے پیدا کر سکتا تھا۔ مسیحؑ نے اس کی پیدائش میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

دوسری بات ان سے یہ پوچھنی چاہیئے کہ آیا رُوح القدس اُسے پیدا کر سکتا تھا یا نہیں؟ یہاں بھی اُن کے جواب کی دو ہی صورتیں ہونگی۔ اگر وہ کہیں کہ وہ پیدا نہیں کر سکتا تھا تو رُوح القدس میں نقص لازم آئیگا اور اگر کہیں کہ اُس نے پیدائش میں حصّہ لیا ہے تو باپ خدا میں نقص لازم آئیگا۔ آخر باپ بیٹا اور رُوح القدس میں سے اگر ہر ایک علیحدہ علیحدہ بھی دنیا کو پیدا کر سکتا تھا تو ان سب کو کیا ضرورت تھی کہ مل کر پیدا کرتے۔ اس کی تو ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے ایک فسل صرف ایک شخص اُٹھا سکتا ہے۔ اُسے

کسی اَور مددگار کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ اَوروں کو بھی
بلائے اور کہے کہ آیئے تا کہ سب مِل کر ایک پِسل اٹھائیں ۔ تو
ہر شخص اُسے بیوقوف کہیگا ۔ پس جب خدا تعالیٰ اکیلا زمین
و آسمان کو پیدا کر سکتا تھا تو عیسائیوں کا یہ کہنا کہ حضرت
مسیح علیہ السلام نے بھی پیدائش میں حصہ لیا خدا تعالیٰ کو
بے وقوف ٹھہراتا ہے کہ اُس نے خواہ مخواہ انکو اپنے ساتھ ملایا
حالانکہ ان کے بنانے میں اسے کوئی مشکل نہ تھی ۔ مَیں سمجھتا ہوں
اگر اسی دلیل سے کام لیا جائے تو ہر عیسائی اس کے جواب
سے اسی طرح عاجز آجائیگا جس طرح ایک دفعہ ڈلہوزی
میں سیالکوٹ کے ایک بڑے پادری کو میرے ساتھ گفتگو میں عاجز آنا پڑا ۔
اور اُسے اقرار کرنا پڑا کہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث
کا مسئلہ ایسا ہے جسے کوئی انسان سمجھ نہیں سکتا ۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں بَدَعَ
کے معنے نیست سے ہست کرنے کے ہوتے ہیں یعنی ایسی
چیز پیدا کرنا جس کا پہلے کوئی وجود نہ ہو ۔ ان معنوں کے
لحاظ سے اسلام رُوح و مادہ کو بھی حادث قرار دیتا ہے
اور ہندو مذہب کی اس تھیوری کو باطل قرار دیتا ہے کہ رُوح
و مادہ انادی ہیں ۔

پھر فرمایا وَاِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ
فَیَکُوۡنُ ۔ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے
تو پھر کوئی چیز اس کے ارادہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی ۔ وہ
اِدھر کُن کہتا ہے اور اُدھر اس کا فیصلہ دنیا میں نافذ
ہو جاتا ہے ۔ اس میں ایک تو اس امر کی طرف اشارہ فرمایا
کہ نہ صرف پیدائش عالم خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے بلکہ
فنا بھی اُسی کے اختیار میں ہے اور اس غرض کے لئے بھی
اُسے کسی بیٹے یا مددگار کی ضرورت نہیں ۔ اس شبہ کا ازالہ
اس لئے کیا گیا ہے کہ ممکن تھا بعض لوگوں کے دلوں میں
یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ۔ کہ خدا تعالیٰ نے سب چیزیں پیدا
تو کر لیں اور وہ سب کی سب خدا تعالیٰ کے قانون کی بھی
تابع ہیں لیکن ممکن ہے اس عالم موجودات کو فنا کرنے کیلئے
اُسے کسی ساتھی اور مددگار کی ضرورت ہو ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
تمہارا یہ خیال بھی درست نہیں ۔ فنا بھی اُسی کے اختیار
میں ہے ۔ پس اس غرض کے لئے بھی اُسے کسی بیٹے کی
ضرورت نہیں ۔

عیسائیت کے ذکر میں وَاِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا
یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ فرما کر عیسائیوں کے اس عقیدہ پر
بھی ایک لطیف رنگ میں چوٹ کی گئی ہے کہ مسیحؑ
مصلوب ہو گیا تھا ۔ فرماتا ہے جس خدا نے اپنے بیٹے کو
جسے تم خدا تسلیم کرتے ہو صلیب پر مار دیا اُسے دنیا کے
فنا کرنے میں کیا مشکل پیش آسکتی ہے وہ سب کو آسانی
سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے ۔ اور کوئی چیز اس کے فیصلہ
میں روک نہیں بن سکتی ۔

اِذَا قَضٰٓی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ میں
اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ الہام
الٰہی کا اجرا بھی خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جب
وہ کوئی نیا کلام دنیا میں نازل کرنا چاہے تو دنیا کی کوئی
طاقت اس کے نزول کو روک نہیں سکتی ۔ اس میں عیسائیوں
کے اس نقطہ نگاہ کا رد کیا گیا ہے کہ حضرت مسیحؑ پر
جو آخری الہام نازل ہونا تھا وہ ہو چکا اب آئندہ کے لئے
کسی پر کوئی نیا الہام نازل نہیں ہو سکتا ۔ مسیحی کتب میں
حضرت مسیحؑ کو کلام کہا گیا ہے اور قرآن کریم نے بھی ان
کے لئے کلمہ کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ عیسائی اس کے
غلط معنے کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ کلمہ اور کلام کے
چلے جانے کے بعد الہام کا سلسلہ بند ہو چکا ہے مگر فرمایا
تمہارا یہ خیال غلط ہے ۔ جس طرح وہ پہلے الہام الٰہی نازل
کرتا رہا ۔ اسی طرح وہ آئندہ بھی کرتا رہیگا ۔ اور جس طرح
پہلے روحانی نظام کے قیام کیلئے اُسے کسی مددگار کی ضرورت
نہیں تھی اسی طرح آئندہ بھی اسے کسی بیٹے یا مددگار کی ضرورت نہیں

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ

اور وہ لوگ جو (خدا تعالیٰ کی حکمتوں کا) علم نہیں رکھتے - کہتے ہیں کہ اللہ کیوں ہم سے (براہ راست) بات نہیں کرتا

اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

یا کیوں ہمارے پاس کوئی نشان (نہیں) آتا؟ اسی طرح - (بالکل) انہی کی سی بات (وہ بھی) کہا کرتے تھے جو

مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ

اُن سے پہلے (زمانہ کے) لوگ تھے۔ اِن سب کے دل ہم رنگ ہو گئے ہیں - ہم تو ایسے لوگوں کے لئے

کُنْ فَیَکُوْنُ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو [illegible] فوری طور پر ایک آن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ [illegible] انسانوں کی طرح حرکت کرے [illegible] اس کام کے کرنے کے لئے چل کر جائے بلکہ [illegible] صرف یہ ارادہ کر لیتا ہے کہ ایسا ہو جائے اور پھر کوئی چیز اس کے فیصلہ میں مزاحم نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ آیت کسی خاص وقت کے تعین پر بھی دلالت نہیں کرتی بلکہ کم یا زیادہ جتنا وقت بھی کسی چیز کی تکمیل کے لئے مزعی ہو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے بعد وہ اتنے عرصہ میں اپنی تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔ غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسیحؑ کی ابنیت کی پانچ دلائل سے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی بیٹے کی ضرورت نہیں وہ اس قسم کی تمام احتیاجوں سے بالا اور ارفع ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انجیل میں مسیح کی نسبت خدا تعالیٰ کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں لیکن بائیبل کا معمولی مطالعہ رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ یہود میں ابن اللہ کے معنے خدا کے پیارے یا اس کے نبی کے ہوتے ہیں۔ اور یہ لفظ متعدد مقامات پر اوروں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس میں مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ چنانچہ لوقا باب ۲۰ آیت ۳۴ تا ۳۶ میں آتا ہے:-

"یسوع نے جواب میں اُن سے کہا۔ اس
جہان کے لوگ بیاہ کرتے اور بیاہے جاتے
ہیں لیکن جو لوگ اُس جہان کے اور قیامت
کے شریک ہونے کے لائق ٹھہرتے نہ بیاہ
کرتے ہیں اور نہ بیاہے جاتے۔ پھر نہیں مرنے
کے۔ کیونکہ وے فرشتوں کی مانند ہیں۔
اور قیامت کے بیٹے ہو کر خدا کے بیٹے ہیں"۔

اسجگہ حضرت مسیحؑ نے ان تمام لوگوں کو جو اپنی زندگی دین کے لئے وقف کرتے ہیں خدا کے بیٹے قرار دیا ہے۔

اسی طرح متی باب ۵ آیت ۹ میں لکھا ہے:-

"مبارک وے جو صلح کرانے والے ہیں۔
کیونکہ وے خدا کے فرزند کہلائیں گے"۔

اسجگہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا ہے کہ صلح کرنے والے خدا کے فرزند کہلاتے ہیں۔ پھر متی باب ۵ آیت ۴۵ میں لکھا ہے:-

"تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے
فرزند ہو"۔

بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۹﴾

جو یقین رکھتے ہیں ہر طرح کے نشانات کھول کر بیان کر چکے ہیں مگر یہ لوگ مانتے نہیں ۱۴۵

اس میں تمام مومنوں کو خدا تعالیٰ کا فرزند اور بیٹا کہا گیا ہے۔ متی باب ۵ آیت ۴۸ میں آتا ہے:۔

"پس تم کامل ہو۔ جیسا تمہارا باپ جو آسمان پر ہے کامل ہے۔"

اس میں بھی مسیح علیہ السلام سب مومنوں کو خدا کے بیٹے قرار دیتے ہیں۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں بھی سب مومنوں کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا گیا ہے۔ لکھا ہے:۔

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔"

(استثنا باب ۱۴ آیت ۱)

خروج باب ۴ آیت ۲۲ میں آتا ہے:۔

"اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پلوٹھا ہے۔"

اس حوالہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تو خدا تعالیٰ کا بیٹا ہونے کا حق حضرت مسیحؑ کی بجائے حضرت یعقوب علیہ السلام کو حاصل ہے کیونکہ وہ پلوٹھے ہیں اور حضرت مسیح بیٹے تھے۔ پلوٹھے کے ہوتے ہوئے بیٹے کا کیا حق تھا کہ وہ جائیداد پر قبضہ کرتا۔ غرض عہد عتیق اور عہد جدید دونوں کی رُو سے تمام مومن خدا کے فرزند ہیں حضرت مسیحؑ کی اس میں کوئی تخصیص نہیں۔

۱۴۵ تفسیر:۔ بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بغیر کسی حکمت کے یونہی ایک شخص کو نبی بنا کر بھیج دیتا ہے اور وہ انتخاب میں کسی اہلیت کو مدنظر نہیں رکھتا۔ اور پھر اس غلط خیال کے نتیجے میں یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہمیں براہ راست کیوں حکم نہیں دے دیتا کہ ایسا کرو۔ اور ایسا نہ کرو۔ تاکہ کوئی جھگڑا ہی پیدا نہ ہو۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہونی چاہیئے کہ وہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا۔ اور اگر ہم اس بات کے مستحق نہیں کہ خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ باتیں کرے تو کم از کم یہ تو ہونا چاہیئے تھا کہ کوئی دلیل ہی مہیا کر دی جاتی جس کی وجہ سے ہم اسے مجبوراً مان لیتے۔

میری تحقیق یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی کفار کے آیت طلب کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں اس سے مراد ہمیشہ عذاب ہی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اُسکے خلاف وہاں کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ تمام مقامات جہاں کفار کی طرف سے آیت کا مطالبہ کیا گیا ہے اُن پر غور کرکے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر جگہ آیت سے مراد عذاب ہی ہوتا ہے۔ اس جگہ بھی یہی مراد ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہم پر نازل ہوتا اور ہم اسے مان لیتے۔ کیونکہ اگر یہ اس کا بندہ ہے تو ہم بھی اُسی کے بندے ہیں۔ پھر اس میں اور ہم میں کیا فرق ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ تم اس کے بندے تو ہو مگر تم عذاب کے مستحق ہو تو ایسی صورت میں ہم پر عذاب نازل ہونا چاہیئے۔ گویا دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہونی چاہیئے۔ اگر ہم اُس کے بندے ہیں تو ہم پر بھی کلام نازل ہونا چاہیئے اور اگر کہو کہ تم گندے ہو گئے ہو تو پھر ہمیں ہلاک کر دینا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ ہمیں ہلاک بھی نہیں کرتا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم گندے نہیں اس لئے ہم پر بھی کلام نازل ہونا چاہیئے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے کہ صرف اُسی پر کلام نازل ہوتا ہے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح اُن لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گذرے ہیں کہا تھا اور بالکل ان کی بات کے مشابہ کہا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کے مقابلہ میں ایک ہی قسم کے

اعتراض ہوتے چلے آئے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جب منہاجِ نبوت کا ذکر فرمایا کرتے تو دشمن چڑ جاتے اور کہتے کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کیوں نام لیتے ہو۔ مولوی محمد علی صاحب جو اُس وقت ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر تھے اِس کا یہ جواب دیا کرتے تھے کہ حضرت مرزا صاحب انبیاء میں شامل ہیں۔ پس اگر ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مثال نہ دیں تو اَور کس کی دیں۔ لیکن بعد میں وہی مولوی محمد علی صاحب کہنے لگے کہ مرزا صاحب نے نبوت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ یہ نیا عقیدہ ہے جو قادیان والوں نے ایجاد کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ان کا اعتراض صحیح ہے تو پھر تمام انبیاء کی نبوتیں باطل ٹھہرتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دعویٰ کیا تھا کہ اُن کو الہام ہوتا ہے تو اس وقت اَوروں کو الہام نہیں ہوا بلکہ صرف موسیٰ کو ہوا۔ پھر باقی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یکدم تباہ بھی نہیں کیا۔ ہاں حجت کے بعد ▪▪ ہلاک ہوئے اور وہ بھی آہستہ آہستہ۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب الہام ہوا تو اُن کے زمانہ میں بھی باقی لوگوں کو الہام نہیں ہوا اور پھر باقی لوگوں کو یکدم تباہ بھی نہیں کیا گیا۔ پس اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ ہم پر الہام نازل کرے اور اگر ہم الہام کے مستحق نہیں تو ہمیں تباہ کر دے۔ تو اس دلیل کو پہلوں پر چسپاں کر کے دیکھ لو کہ کیا یہ صحیح قرار پاتی ہے یا غلط۔ اور اگر تمہاری یہ دلیل پہلوں پر چسپاں نہیں ہوتی تو معلوم ہوا کہ تمہارا یہ مطالبہ منہاجِ نبوت کے خلاف ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی جواب بن نہ آئے تو وہ آگے سے ایسا عذر تلاش کرتا ہے جس پر بحث ختم ہو کر اس کا پیچھا چھوٹے۔ سچے نبیوں کے مقابلہ میں ہمیشہ یہی طریق اختیار کیا جاتا رہا ہے جب اُنکے مخالفوں کو اُن سے بحث کرنے میں ندامت ہوئی ہے تو فوراً انہوں نے ایسے مطالبات پیش کر دیئے ہیں کہ جن کی نسبت اُن کو یقین تھا کہ ایک یا دوسری وجہ سے اُن کا پورا ہونا ناممکن ہے کبھی تو سنّت اللہ کے خلاف کسی بات کا مطالبہ کر دیتے کبھی کسی دیر میں ہونے والی بات کو فوراً پورا کرنے کا مطالبہ کرتے۔ کبھی ایسے امر کا مطالبہ کرتے جو خلافِ شانِ الٰہی ہوتا اور پھر علاوہ ▪▪ اس قسم کے مطالبات کے یہ جواب بھی دیا کرتے کہ اچھا ہم لوگ جھوٹے ہیں تو عذاب الٰہی کیوں نہیں آتا۔ ہم پر عذاب الٰہی نازل ہو تب ہم مانیں گے ورنہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی اِس سلوک میں دوسرے نبیوں سے مستثنیٰ نہ تھے بلکہ جسقدر آپ کا درجہ بلند تھا اُسی قدر آپؐ سے آپؐ کے دشمنوں نے زیادہ غیر معقولیت کے ساتھ معاملہ کیا۔ جب اُن کو کوئی جواب نہ آتا تو قسم قسم کے سوال کرتے جن میں سے دو اِس جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر سچے ہو تو خدا تعالیٰ ہم سے خود کلام کرے اور ہم سے کہے کہ یہ شخص سچا ہے اس کو مان لو۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے کبھی کسی نبی کے زمانہ میں یہ نہیں کیا کہ ملک کے ہر آدمی کو الہام ہوا ہو کہ فلاں شخص سچا ہے اسے مان لو۔ یہ تو ہو جاتا ہے کہ بعض اشخاص کو خدا تعالیٰ رؤیا اور کشوف کے ذریعہ بتا دیتا ہے کہ یہ مامور سچا ہے۔ مگر سب لوگوں کو بتانا اس کی سنت کے خلاف ہے اور جن کو بتاتا ہے اُن کی شہادت سے لوگ فائدہ نہیں اُٹھاتے بلکہ اُن پر بھی الزام لگا دیتے ہیں کہ یہ بھی منصوبوں میں شامل ہیں۔ پھر سب کو الہام ہونا اس لئے بھی بے فائدہ ہے کہ ایمان تبھی مفید ہوتا ہے جبکہ وہ انسان کو کوشش سے حاصل ہو۔ اگر خدا تعالیٰ کا کلام سب پر نازل ہو تو پھر ایمان کا کوئی فائدہ نہیں رہتا۔ اور انسان کی پیدائش کی اصل غرض فوت ہو جاتی ہے اور دوسری مخلوق اور انسان میں کچھ فرق نہیں رہتا۔ پس فرمایا کہ یہ لوگ سنّت اللہ سے واقف نہیں اور نہیں جانتے کہ ایمان کس صورت میں نافع ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے

ہم سے کلام کرے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا مطالبہ ہے جو پہلے نبیوں سے بھی ہوتا رہا ہے جن کو یہ مانتے ہیں لیکن انہوں نے اسے پورا نہیں کیا۔ پھر اس نظیر کے موجود ہوتے ہوئے اس رسول سے کیوں ایسا مطالبہ کرتے ہیں۔ در حقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل پہلے انبیاء کے منکرین کے دلوں کے مشابہ ہو گئے ہیں۔

دوسرا مطالبہ یہ بیان کیا کہ ہمیں کوئی آیت دکھاؤ اس کا جواب یہ دیا کہ ایسی آیات تو ہم دکھا چکے ہیں جن سے اگر کوئی فائدہ اٹھانے والا انسان ہو تو فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن جن لوگوں نے ضد سے کام لینا ہو اور ہٹ پر قائم رہنا ہو اُن کا کوئی علاج نہیں۔

اسجگہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کریم میں جہاں تو آیت کا لفظ اللہ تعالیٰ اور اُس کے انبیاء اور مومنوں کی طرف سے استعمال کیا گیا ہے وہاں تو اس کے معنے عام ہوتے ہیں یعنی کوئی نشان جو کسی صداقت پر دلیل ہو۔ خواہ عذاب ہو یا انعام۔ خواہ کوئی ایسا نشان ہو جو ان دونوں قسموں میں سے نہ ہو اور صرف ایک علامت کے طور پر ہو لیکن جب کفار کے منہ سے یہ لفظ بیان کیا جائے تو اس کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ہمیشہ عذاب کے ہوتے ہیں۔ پس تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ سے مراد یہ ہے کہ ہم پر ایسا عذاب نازل ہو جو ہمیں تباہ کر دے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہاں تمہارا یہی کام تھا کہ تم اس قسم کے اعتراض کرتے اس لئے کہ جن لوگوں کے تم جانشین ہو وہ بھی یہی کہتے آئے ہیں۔ کیونکہ جس طرح نبی کا نبی مثیل ہوتا ہے اسی طرح اس نبی کے وقت کے کافر پہلے نبیوں کے کافروں کے مثیل ہوتے ہیں۔ پس اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے کوئی نشان نہیں دکھایا تو ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے دشمنوں کے مثیل تھے۔ اور اگر حضرت عیسیٰؑ کو اُن کے دشمن کہتے تھے کہ یہ کوئی نشان نہیں لایا تو سچ کہتے تھے کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کے دشمنوں کے مثیل تھے۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی اُن کے مخالفوں نے یہی کہا تو ان کا کہنا حق تھا کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دشمنوں کے مثیل تھے۔ اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے نہ ماننے والوں نے یہ کہا تو اُن کا حق تھا کیونکہ وہ حضرت نوحؑ کے دشمنوں کے مثیل تھے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے دل مل گئے ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں کہ کوئی نشان نہیں لایا۔ حالانکہ ماننے والوں کے لئے بہتیرے نشان ہیں۔ ہاں نہ ماننے والوں کے لئے کوئی نہیں۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ سے ظاہر ہے کہ انبیاء کی جماعتوں اور اُن کے مخالفین کا ایک ہی طریق عمل ہوتا ہے نبیوں کو مشابہت نبیوں سے۔ اُن کی جماعتوں کی مشابہت پہلی جماعتوں سے۔ اور اُن کے منکرین کی مشابہت پہلے منکرین سے ہوتی ہے جس طرح انبیاء اور اُنکی جماعتیں ایک ہی راستہ پر قدم مارتی چلی جاتی ہیں اسی طرح ان کے مخالفین بھی اپنے پیشروؤں کی سنتوں پر عامل ہوتے ہیں۔ خصوصاً جن انبیاء کی آپس میں مشابہت اور مماثلت ہو اور ایک ہی قسم کے کام ان کے سپرد ہوں اُن کے حالات تو آپس میں بہت ہی ملتے جلتے ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ میں بتایا کہ عذاب تو تم صداقت معلوم کرنے کے لئے مانگتے ہو حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے بہت سی آیات ظاہر کر دی ہیں جو اس رسول کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ تمہاری نیت ماننے کی ہو اور تم ضد اور تعصّب سے کام نہ لو۔ پس اگر تمہارا مطالبہ دیانت داری پر مبنی ہے تو تم اُن دلائل و براہین پر کیوں غور نہیں کرتے اور صرف عذاب کا مطالبہ ہی کیوں کرتے ہو۔ اگر انبیاء کی بعثت کی غرض یہ ہوتی کہ لوگوں کو تباہ کیا جائے تو

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا

ہم نے یقیناً تجھے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا (بناکر) حق (اور راستی) کے ساتھ بھیجا ہے۔ اور

تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۲۰﴾

دوزخیوں کے متعلق تجھ سے کوئی بازپُرس نہ کی جائے گی۔ ۳۶؎

اِدھر نبی آتا اور اُدھر خدا تعالیٰ تمام منکروں کو تباہ کردیتا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر مانتا کون؟ اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ انبیاء کی بعثت کے بعد پہلے رحمت کی آیات ظاہر ہوتی ہیں تاکہ جس نے ماننا ہو مان لے اور پھر جو ضدی طبع نہیں مانتے اُن پر عذاب آجاتا ہے۔ اس آیت میں لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ فرماکر اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف فرمایا ہے کہ نشان تو بہت ظاہر ہو چکے ہیں مگر جو شخص ہر بات میں شبہ پیدا کرے اُسے ہدایت کس طرح مل سکتی ہے۔ اگر تم ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی شکی طبیعت کو چھوڑ دو — اور یقین کا مادہ پیدا کرو۔ ورنہ جو لوگ صرف یہی کہنا جانتے ہیں کہ "اور نشان دکھاؤ" اُن کے لئے کہاں سے نشان آسکتے ہیں۔ ہماری زبان میں بھی مشہور ہے کہ سوتے کو سب جگا سکتے ہیں لیکن جاگتے کو کوئی نہیں جگا سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ہر نشان کا انکار کردیں اُن کے لئے کوئی نشان بھی ہدایت کا موجب نہیں بن سکتا۔

یہاں آیات سے قرآن کریم کی آیات مراد نہیں بلکہ ہر قسم کے دلائل اور براہین مراد ہیں جو کسی نبی کی صداقت ثابت کرنے کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس آیت نے عیسائیوں کے اس اعتراض کو بھی باطل کردیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی نشان نہیں دکھایا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم یقین رکھنے والی قوم کے لئے ہر قسم کے نشانات کھول کر بیان کرچکے ہیں۔

۳۶؎ **حل لغات** : بِالْحَقِّ میں باء کے معنے ساتھ اور معیّت کے ہیں۔ بِالْحَقِّ اس جگہ حال واقع ہوا ہے اور حال فاعل کا بھی ہوسکتا ہے اور مفعول کا بھی۔ اسجگہ دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں۔

تفسیر :— قرآن کریم کے معانی کے متعلق یہ اصول ہے کہ اگر کسی آیت کے کئی معنے ہوں اور وہ معنے دوسری آیات کے خلاف نہ ہوں تو وہ سارے کے سارے معنے چسپاں کئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم جن معنوں کو ردّ کرنا چاہتا ہے اُن کو دوسری جگہ ردّ کردیتا ہے۔ لیکن جو معنے قرآن کریم کی کسی اور آیت سے ردّ نہ ہوں وہ تمام کے تمام چسپاں ہوسکتے ہیں۔ یہاں بھی بِالْحَقِّ کے چار معنے ہوسکتے ہیں۔

اگر اسے فاعل کا حال قرار دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ ہم نے تجھے ایسی حالت میں بھیجا ہے کہ حق ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے آگے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے تجھے ایسے حال میں بھیجا ہے کہ حق کا خزانہ صرف ہمارے ہی پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں۔ اگر کوئی اور شخص تعلیم بناکر پیش کرتا تو اس میں کئی قسم کی غلطیوں کی آمیزش ہوتی اور وہ دنیا کو تباہ کردیتی۔ پس خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی ایسی سچی تعلیم نہیں دے سکتا تھا جس میں جھوٹ کی کوئی ملونی نہ ہوتی۔ اگر وہ کوئی تعلیم دیتا تو یقیناً اس میں دانستہ یا نادانستہ کئی قسم کی غلطیاں ہوتیں پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اسے بھیجا ہے اور ایسے حال میں بھیجا ہے

بِالْحَقِّ

کہ ہمارے پاس حق ہے۔ سچائی کا خزانہ ہمارے پاس ہے۔ اس لئے ہمارا ہی حق تھا کہ ہم تعلیم بھیجتے۔ کسی دوسرے کا حق نہیں تھا کہ وہ بھیجتا۔ اگر کسی دوسرے کی طرف سے تعلیم آتی تو وہ دنیا کو تباہ کر دیتی۔ کیونکہ اس میں جھوٹ کی ملونی ہوتی یا اس میں غلطیاں ہوتیں مگر جو تعلیم ہماری طرف سے آتی ہے وہ تباہی والی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ حقیقی اور سچی تعلیم ہوتی ہے اور وہی دوسروں کو حقیقی ہدایت دے سکتی ہے۔ پس یہ ہمارا ہی کام ہے کہ ہم لوگوں کو ہدایت کی تعلیم دیں۔

بِالْحَقِّ کے دوسرے معنے مَعَ الْحَقِّ کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے تجھے بھیجا ہے اور اس حال میں بھیجا ہے کہ ہم ہی اسے بھیجنے کے حقدار تھے۔ گویا جس طرح ہم بِيَدِهٖ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہیں اسی طرح ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ تعلیم بھیجیں۔ آخر جس نے اس نظام کو پیدا کیا ہے اُسی کا حق ہے کہ وہ حکم دے دوسرے کا کیا حق ہے کہ وہ اس میں دخل دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ہی اس تعلیم کو بھیجنے کے حقدار تھے کیونکہ ہم خالق اور مالک ہیں۔ آریہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ رُوح و مادہ کا خالق نہیں لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ قانون بناتا ہے۔ حالانکہ جب وہ خالق نہیں تو اس کا کیا حق ہے کہ وہ قانون بنائے۔ پس فرمایا کہ ہم حق رکھتے ہیں کہ ہم قانون بنائیں کیونکہ ہم خالق و مالک ہیں۔ اور جو خالق و مالک ہو وہ حق رکھتا ہے کہ اپنی مخلوق کے لئے قانون بنائے کیونکہ وہی مخلوق کی ضرورتوں کو جانتا ہے جس نے پیدا ہی نہیں کیا اُسے کیا معلوم کہ انسانی قلب میں کیا کیا جذبات اُٹھتے ہیں۔ اور اُسے کیا معلوم کہ کونسی باتیں اچھی ہیں اور کونسی بری۔ اس لئے یقیناً وہ غلط قانون بنائیگا جو لوگوں کی ٹھوکر کا موجب ہوگا۔

پھر مفعول کے لحاظ سے بھی اس کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اس حالت میں تجھے بھیجا ہے کہ تیرے ساتھ سچ ہے۔ اگر انسانی تعلیم ہوتی تو اس میں غلطی یا جھوٹ کا امکان ہوتا یا کوئی اور نقص ہوتا۔ مگر جو تعلیم تیرے پاس ہے وہ ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے۔ اور جب وہ بالکل پاک ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ہماری طرف سے ہے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ ہم نے تجھے اس حال میں بھیجا ہے کہ تو ہی اس بات کا حقدار تھا کہ تجھے بھیجا جاتا اور تجھ پر کلام الٰہی نازل ہوتا۔ یہ لَوْلَا تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ کا جواب ہے۔ فرماتا ہے کہ چونکہ تو ہی حقدار تھا اس لئے ہم نے تجھے بھیجدیا۔ وہ لوگ حقدار نہ تھے۔ اگر وہ حقدار ہوتے تو ہم ان کا حق انہیں دے دیتے اور انہیں بھیج دیتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ باقی لوگ پھر کس درجہ میں ہیں؟ سو اس کے متعلق فرماتا ہے کہ باقی دو درجوں میں ہیں۔ اوّل اگر وہ اس مستحق شخص کے ذریعہ اس کلام کو مان لیں گے تو بشارات سے حصہ لیں گے۔ دوم اگر وہ نہیں مانیں گے تو منکرین میں داخل ہو کر خدا تعالیٰ کے عذاب سے حصہ پائیں گے۔ اسی لئے فرمایا کہ تو بشیر اور نذیر ہے۔ یعنی کچھ لوگوں کے لئے تو بشارتیں لایا ہے اور کچھ لوگوں کے لئے انذار لایا ہے۔ یہ دو قسم کی آیات ہیں۔ جو بعض کو بچانے والی اور بعض کو تباہ کرنے والی ہیں۔ بشارت والی آیات پہلے ہوتی ہیں اور انذار والی آیات پیچھے ہوتی ہیں۔ پہلے تو بشیر ہے اس لئے پہلے بشارت والی آیات آئیں گی۔ پھر تو نذیر ہے جس کے نتیجہ میں انذار والی آیات آئیں گی۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ اگر بعض کو بچانا اور بعض کو تباہ کرنا ہو۔ تو پہلے بچانے والی آیات کا ظہور ہوتا ہے تاکہ جنہوں نے بچنا ہے وہ بچا لئے جائیں۔

غرض فرماتا ہے۔ اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى

اور (یاد رکھ کہ) جب تک تو اُن کے دین کی پیروی نہ کرے یہودی تجھ سے ہرگز خوش نہ ہوں گے اور

تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۚ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ

نہ ہی مسیحی (خوش ہونگے) تو (ان سے) کہہ دے کہ اللہ کی ہدایت ہی یقیناً اصل ہدایت ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ

اور اگر تو (اے مخاطب) اس علم کے بعد (بھی) جو تیرے پاس آچکا ہے اُن کی خواہشات کی

تیرے تین مقامات ہیں۔

اوّل تجھے اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ کا مقام حاصل ہے۔

دوم بشیر ہونے کا مقام حاصل ہے جس کا تعلق اُن بندوں سے ہے جو ایمان کی وجہ سے بچائے جاتے ہیں۔

سوم نذیر ہونے کا مقام حاصل ہے جس کا اُن بندوں سے تعلق ہے جو انکار کرنے کی وجہ سے تباہ کردیئے جاتے ہیں۔

بِالْحَقِّ کے ماتحت تجھ پر آیات کا نزول ہوتا ہے بشیر ہونے کی وجہ سے رحمت کی آیات کا نزول ہوگا اور پھر نذیر ہونے کی وجہ سے عذاب اور تباہی والی آیات کا نزول ہوگا۔

وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔

فرماتا ہے۔ ہمارا رسول صرف کلامِ الٰہی پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ لوگوں سے منوانا اس کا کام نہیں۔ اگر وہ سب لوگوں کو نہ منوا سکے اور کچھ لوگ رہ جائیں اور اپنے اعمال کی وجہ سے جہنم کے مورد بن جائیں تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں کیونکہ وہ سب کی نجات کا ٹھیکیدار نہیں۔ وہ تو مبلّغ بنا کر بھیجا گیا ہے جو اس کے ذریعہ مان لیں گے وہ بچا لیے جائیں گے اور نہ ماننے والے آہستہ آہستہ تباہ کردیئے جائیں گے

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے کہ تیرے پاس حق ہے اور تیرے ماننے والوں کے لئے کامیابی اور تیرے منکروں کے لئے تباہی اور ناکامی مقدّر ہے۔ اور یہ وہ نشانات ہیں جو تیری صداقت کے لیے ظاہر کئے گئے ہیں۔ مگر دلیل اس کے لئے کافی ہوتی ہے جو ماننے کے لیے تیار ہو۔ لیکن جو شخص یہ کہتا ہو کہ خواہ کچھ ہو مَیں نے ماننا ہی نہیں اس کو دلیل کچھ کام نہیں دیتی۔ جیسا کہ یہود کے دو علماء ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے جب واپس گئے تو اُن میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ کہ اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا۔ معلوم تو سچا ہی ہوتا ہے۔ مگر جب تک دم میں دم ہے ماننا نہیں دوسرے نے کہا میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ پس جب کوئی شخص یہ ارادہ کرلے کہ ماننا نہیں تو سب دلائل بے کار ہوجاتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم تجھے کس طرح ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔ ہم نے تو انسان کو آزاد بنایا ہے اور ہم نے اُسے کامل مقدرت اور اختیار دیا ہے کہ

مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۱﴾

پیروی کرے گا تو اللہ (کی طرف) سے نہ کوئی تیرا دوست ہوگا اور نہ مددگار۔ ۱۲۷

چاہے تو وہ قبول کرے اور چاہے تو ردّ کردے۔ اور پھر ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ ہم نے نہیں ماننا۔ ایسے لوگوں کی موجودگی میں ہم تجھے کس طرح ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔

۱۲۷ حل لغات:۔ هَوٰى محاورہ میں ایسی خواہش کے معنوں میں آتا ہے جو گری ہوئی ہوتی ہیں۔ اصل میں هَوْءٌ گڑھے یا قعر کی چیز پر دلالت کرتا ہے۔ اسلئے یہ لفظ گری ہوئی خواہش کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ اُن کی یہ خواہش نیچے کی طرف لے جانے والی ہے۔ قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اصلی اور حقیقی معنے بھی الفاظ میں مدّنظر رکھتا ہے۔

وَلِيٌّ: جو کسی کے کاموں کو چلائے۔ محاورہ میں اس کے معنے دوست کے ہیں۔ جو ذمہ دار ہو جائے۔ اور وَلَايَةٌ کے معنے حکومت کے بھی ہوتے ہیں۔ پس وَلِيٌّ وہ ہے جو ایجنٹ اور وکیل اور ذمہ دار ہو۔

نَصِيْرٌ: مددگار کے معنے دیتا ہے۔ اس میں آدمی کام تو خود کرتا ہے مگر دوسرا اُسے سہارا دیتا ہے۔ اور اُس کے لئے سہولت پیدا کرتا ہے۔ مدد دو طرح کی ہوتی ہے اوّل یہ کہ انسان کلّی طور پر دوسرے کا بوجھ اُٹھائے دوم جزئی طور پر بوجھ اُٹھائے۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اختلاف کی اصل وجہ بتلائی کہ یہود اور نصاریٰ تم سے اُس وقت تک خوش نہیں ہونگے جب تک کہ تم اُن کی بات نہ مانو۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کیونکہ تم کو اللہ تعالےٰ نے خود صداقت کی طرف ہدایت دی ہے۔ پھر جب کہ یہ لوگ صرف رسمی ایمان رکھتے ہیں اور اُن کے ایمان کی بناء نسلی تعصّبات پر ہے نہ کہ دلائل و براہین پر۔ اور باوجود صداقت پیش کرنے کے یہ لوگ اُسے قبول نہیں کرتے۔ تو جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہے وہ مشاہدہ کے بعد صداقت کو کب چھوڑ سکتا ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ تو اُنکو کہدے کہ ان رسمی ایمانوں کو ترک کرو اور خدا تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت ثابت ہو جائے اُسے قبول کرو۔ کہ اصل ہدایت وہی ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے ورنہ اپنی طرف سے ہدایت کے ذرائع تجویز کرنا اور اُن سے نجات کو وابستہ کرنا جھوٹ ہے۔ نجات کے قابل صرف وہی شخص ہوتا ہے جو اس ہدایت کو جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے مان لے۔ اور اُس پر چلے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ میں گو مخاطب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن مراد آپ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ اور یہ قرآن کریم کا ایک عام اسلوب بیان ہے۔ ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات سے بہت بالا و ارفع ہیں کہ آپؐ کی نسبت یہ کہا جائے کہ شاید آپؐ بھی خدا تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں آپؐ کی نسبت واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران آیت ۳۱) یعنی اے رسول! تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ اگر تم اللہ تعالےٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تعالےٰ تم سے محبت کرنے لگیگا۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (سورۃ احزاب آیت ۲۲) یقیناً تمہارے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

هَوٰى

وَلِيٌّ

نَصِيْرٌ

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ

لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اُس کی (اسی طرح) پیروی کرتے ہیں جس طرح اس کی پیروی کرنی چاہیئے

اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ ؕ وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

لوگ اُس پر پختہ ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ اس کا انکار کریں وہی نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ ۳۸

۱۴ ع ۱۴

میں ایک نیک نمونہ پایا جاتا ہے۔ اگر تم نیک اور پاک بننا چاہتے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرو۔ پس اسجگہ آپؐ سے نہیں بلکہ اُمّت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور ھَوٰی کا لفظ رکھ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ بُری خواہشات انسان کو ادنیٰ حالت کی طرف لے جاتی ہیں اور اعلیٰ خواہشات دینی ترقی کی طرف لے جاتی ہیں۔ فرماتا ہے۔ اگر انسان بُری خواہشوں کو قبول کرے تو وہ نیچے کی طرف چلا جاتا ہے اور اپنے مقام کو کھو بیٹھتا ہے۔ اگر کوئی اندھیرے میں گر پڑے اور ٹھوکر کھائے۔ تو وہ درگذر کے قابل سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص جان بُوجھ کر گر پڑے تو وہ قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کو دھوکا لگا ہُوا ہو اور وہ غلطی میں پڑا ہُوا ہو وہ قابلِ عفو ہو سکتا ہے۔ لیکن جس شخص پر سچائی کھل جائے اور وہ پھر بھی نہ مانے تو وہ قابلِ عفو نہیں ہو سکتا۔

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ

فرمایا کہ نہ کلّی طور پر کوئی بوجھ اٹھانے والا ملے گا اور نہ جزئی طور پر۔ اور مِنَ اللّٰهِ کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسے شخص کو ہی مدد مل سکتی ہے جو ہوا و ہوس کی پیروی کرنے والا نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تابع ہو۔

۳۸ حل لغات:۔ تِلَاوَتِہٖ: تَلَا یَتۡلُوۡ کے معنے پڑھنے کے ہیں۔ پس یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے اسے اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے یا جس غور و فکر سے اس کو پڑھنا چاہیئے اسی غور و فکر سے اُسے پڑھتے ہیں۔

(۲) تَلَا کے معنے پیچھے چلنے کے بھی ہیں۔ یعنی کہنے کے مطابق عمل کرنا۔ پس یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کے یہ بھی معنے ہیں کہ یَتَّبِعُوۡنَہٗ حَقَّ اِتِّبَاعِہٖ۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اُس پر پُورے طور پر عمل کرتے ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی استعمال ہوا ہے۔ فرماتا ہے۔ وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا (شمس آیت ۳) کہ ہم چاند کو بطور شہادت کے پیش کرتے ہیں جبکہ وہ سورج کے پیچھے چلتا ہے۔ اس صورت میں حَقَّ تِلَاوَتِہٖ حال ہے۔ دوسری صورت میں یہ خبر بنتا ہے حال نہیں رہتا۔ یعنی لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ہے اُن کی خبر یہ ہے کہ وہ اس پر پورے طور پر عمل کرتے ہیں۔

تفسیر:۔ اس جگہ لوگوں نے غلطی سے اَلۡكِتٰبَ سے مراد بائیبل لی ہے۔ مگر یہ معنے اس جگہ کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر اس سے بائیبل مُراد لیں تو اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ بنتا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے بائیبل دی ہے وہ اس کی اس طرح پیروی کرتے ہیں جس طرح اس کی پیروی کرنی چاہیئے اور وہ اس کی صداقت پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ حالانکہ نہ یہودی تورات پر عمل کر رہے تھے اور نہ عیسائی انجیل پر عمل کرتے تھے۔ پس

تِلَاوَتِہٖ

یہ معنے یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے ۔ یہاں اَلْکِتٰب سے مُراد
وہی کتاب ہو سکتی ہے جس کے ماننے والے اس کی کامل پیروی
کرتے تھے جب بائیبل کے احکام پر عمل ہی نہیں کیا جاتا تھا
تو اَلْکِتٰب سے تورات کس طرح مراد ہو سکتی ہے ۔ پھر اللہ
تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
کے زمانہ میں تورات وانجیل سب محرّف و مبدّل ہو چکی
تھیں ۔ اور اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ رہی تھیں جیسا کہ
وہ یہود کے متعلق فرماتا ہے کہ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ
ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ (بقرہ آیت ۸۰)
یعنی وہ اپنے ہاتھوں سے تورات میں بعض باتیں بڑھا دیتے اور
پھر کہہ دیتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ الہام ہے اتنی
بڑی تحریف کے بعد اُن کی خوبیاں بیان کرنے اور تعریف
کرنے کے کوئی معنے ہی نہیں ہو سکتے تھے ۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر
قرآن کریم کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ تورات اور انجیل ہی لوگوں
کی ہدایت کے لئے کافی تھیں ۔ پس یہاں اَلْکِتٰب سے مراد
قرآن کریم ہے نہ کہ تورات ۔ چونکہ دوسری جگہ یہود کے لئے
بھی اہل کتاب کا لفظ آیا ہے اس لئے لوگ غلطی سے یہاں
بھی وہی مراد لے لیتے ہیں ۔ حالانکہ ہمیشہ قرائن کو مدّنظر
رکھ کر معنے کرنے چاہئیں ۔ اگر کوئی غیر مشترک لفظ ہو تو
پھر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا ۔ لیکن مشترک لفظ ہو تو پھر
قاعدہ یہ ہے کہ قرینہ دیکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ آیت کے
معنے کس فریق پر چسپاں ہو سکتے ہیں ۔ چونکہ اَلْکِتٰب کا
لفظ تورات پر بھی بولا جاتا ہے اور قرآن کریم پر بھی اسلئے
ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اسجگہ اَلْکِتٰب کا لفظ کس کے متعلق
استعمال کیا گیا ہے ۔ حضرت قتادہؓ جو رئیس التابعین ہیں
اُن کا قول ہے کہ اسجگہ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ سے
مسلمان مراد ہیں اور اَلْکِتٰب سے مراد قرآن کریم ہے (ابن کثیر
جلد ۱ صفحہ ۲۶۲) درحقیقت اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے
یہود کو ملزم قرار دیا ہے کہ تم نے تو تورات کو پس پشت
پھینک رکھا تھا مگر اب یہ لوگ جن کو ہم نے قرآن کریم دیا
ہے اس پر پوری طرح عمل کرتے ہیں ۔ اور خدا تعالیٰ کے دین کو
قائم کرنے کیلئے اُس کے ایک ایک حکم کو بجا لاتے ہیں ۔ تم
کہتے تھے کہ ہمارے پاس سچی کتاب ہے ۔ حالانکہ اگر تمہارے
پاس سچی کتاب ہوتی تو چاہیئے تھا کہ تم اس پر عمل بھی
کرتے ۔ اور تم ہدایت یافتہ وجود ہوتے ۔ مگر تم خود بھی
تسلیم کرتے ہو کہ ہم خراب ہو گئے ہیں ۔ اس لئے لازماً اب
کوئی ایسی قوم ہونی چاہیئے تھی جو اپنا مال اپنا آرام
اور اپنی جانیں قربان کرتی اور خدا تعالیٰ کے دین کو ازسرِنو
قائم کرتی ۔ اور چونکہ یہ لوگ اپنا مال اپنا آرام اور
اپنی جانیں اسلام کے لئے قربان کر رہے ہیں اس لئے
معلوم ہوا کہ یہی لوگ حق پر ہیں اور جس کتاب پر ایمان
لائے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے ۔ کیونکہ جو کتاب
دنیا میں ہدایت قائم کر دیتی ہے وہی خدا کی طرف سے
نازل شدہ سمجھی جا سکتی ہے ۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ یہ دوسرا جملہ ہے یعنی
وہی اس پر پختہ ایمان لاتے ہیں ۔ یہ اس رسمی ایمان کے
علاوہ ہے جس کا پہلے ذکر آ چکا ہے ۔ دراصل ایمان کے
دو مدارج ہیں ۔ پہلا درجہ دلیل کے ساتھ ایمان لانا ہے
مگر دلیل انسان کو اس مقام تک نہیں پہنچاتی جسے مشاہدہ
کا مقام کہتے ہیں ۔ وہ ماننا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے
بادشاہ یا حاکم وقت کی حکومت مان لی جائے ۔ مگر دوسرا
درجہ انکشاف کا ہوتا ہے ۔ اس مقام پر پہنچ کر
انسان کا خدا تعالیٰ سے اتصال ہو جاتا ہے اور رسمی ایمان
حقیقی ایمان کی شکل اختیار کر کے اسکا جزو بن جاتا ہے
اور اُسے بشاشت قلبی حاصل ہو جاتی ہے جس کے بعد
اُس کے لئے کسی ارتداد یا ٹھوکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ
کے الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ اَلْکِتٰب سے یہاں قرآن کریم ہی

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ

اے بنی اسرائیل! میرے اس احسان کو جو میں تم پر کر چکا ہوں یاد کرو

عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور (اس بات کو بھی) کہ میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی۔ ۳۹

مراد ہے نہ کہ بائبل۔ کیونکہ قرآن کریم کی موجودگی میں بائبل کا انکار کرنیوالے خاسر نہ تھے بلکہ بائبل پر عمل کرنیوالے خاسر تھے جبکہ قرآن کریم ہی ایک ایسی کتاب ہے جس پر ایمان نہ لاکر انسان خسارہ پاتا ہے۔ لیکن باقی کتابوں کو چھوڑ کر انسان خسارہ نہیں بلکہ نفع پاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتا ہے۔ اس رکوع کی آیت ۱۱۴ میں یہود و نصاریٰ کی ایک اور بدی بیان فرمائی تھی کہ یہ ایک دوسرے کو ازراہ تعصب و ضد بُرا کہتے ہیں اور اُنکی کسی خوبی کے بھی قائل نہیں۔ حالانکہ ایک کتاب کو ماننے کی وجہ سے اُن میں کچھ باتیں مشترک بھی ہیں۔ آیت ۱۱۵ میں بتایا کہ اُنکا بغض اسقدر بڑھ گیا ہے کہ ایک دوسرے کو عبادت کرتے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے مقدس مقامات میں گھسنے نہیں دیتے حالانکہ عبادتخانوں کے معاملہ میں نہایت خوف سے کام لینا چاہیئے۔ آیت ۱۱۶ میں مسلمانوں کو بتایا کہ ان کی مخالفت سے مت ڈرو۔ یہ مورد غضب الٰہی ہو رہے ہیں۔ جدھر تمہاری توجہ ہوگی اُدھر ہی اللہ تعالےٰ تمہاری کامیابی کے سامان پیدا کریگا۔ آیت ۱۱۷ میں یہودی مذہب کی شاخ مسیحیت کی بُرائی بھی بتا دی تاکہ اُنکو بھی معلوم ہو جائے کہ اُن میں نبی کیوں پیدا نہ ہُوا اور کیوں وہ مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ کی نعمت سے محروم ہیں۔ آیت ۱۱۸ میں رابنیت کے غلط مفہوم کی تین دلائل سے تردید فرمائی۔ آیت ۱۱۹ میں اُن کے دو اعتراضوں کے جواب دیئے۔ اوّل اس کا کہ اگر ہم غلطی پر ہیں تو خدا تعالیٰ بذریعہ الہام ہمیں کیوں آگاہ نہیں کرتا۔ دوم ہم پر باوجود مخالفت کے عذاب کیوں نازل نہیں ہوتا۔ آیت ۱۲۰ میں بتایا کہ ہر رسول بشیر اور نذیر ہوتا ہے پس عذاب تو ضرور آئیگا مگر آہستہ آہستہ۔ آیت ۱۲۱ میں مخالفت کی اصل وجہ بتائی کہ اُنکی خواہشات کے مطابق تمہاری تعلیم نہیں۔ اسکا جواب یہ دیا کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جس پر خدا تعالیٰ قائم کرے پس جو ہدایت کو دیکھ کر پھر گمراہی کی طرف جھکیگا وہ سزا پائیگا۔ آیت ۱۲۲ میں فرمایا کہ مسلمان جن کو ہم نے قرآن کریم عطا کیا ہے اور جو اُسکی تعلیم پر کامل طور پر عمل پیرا ہیں وہ ایک دن کامیاب ہونگے اور خسارہ پانے والے صرف وہی لوگ ہونگے جو اس کتاب کے منکر ہیں۔

۳۹ **تفسیر:** — وہ مضمون جو گذشتہ رکوع پر ختم کیا گیا ہے پانچویں رکوع سے شروع ہُوا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے اور اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ کلامِ الٰہی کا نزول ابتدائے انسانیت سے جاری ہے بنی اسرائیل کے انعامات کا ذکر کیا گیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (بقرۃ آیت ۴۱) یعنی اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی تھی۔ اور میرے عہد کو پورا کرو۔ میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت شروع ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک آئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیکر حضرت مسیح ناصری کے زمانہ تک پہنچی پس جب وہ تمہارے

قریب ترین زمانہ تک چلی آئی ہے اور اس میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہُوا تو کوئی وجہ نہیں کہ جو سلسلہ ابتدائے عالم سے چلا آرہا ہے اسے اب تم ختم سمجھو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے انکار کردو - قرآن کریم کا طریق ہے کہ جب وہ کسی مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہے تو وہاں کوئی قرینہ رکھ دیتا ہے جس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اب نیا مضمون شروع ہونے والا ہے - اسجگہ بھی یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ فرما کر اللہ تعالےٰ نے اِس طرف اشارہ کیا ہے کہ اے بنی اسرائیل اِن تمام باتوں کے بعد جو ہم نے تمہارے سامنے بیان کی ہیں تم یاد تو کرو کہ مَیں نے اپنی نعمت تم پر کس طرح مکمل کی اور اس بات کو بھی یاد کرو کہ مَیں نے تم کو تمام قوموں پر فضیلت دی یعنی دو قسم کی برکات تم پر نازل ہوئیں - ایک تو یہ کہ نعمت نبوت تمہیں عطا ہوئی اور دوسرے نعمت ایسی تھی جس نے تمام قوموں پر تمہیں فضیلت دے دی تھی - اسجگہ بنی اسرائیل کو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے متواتر انعامات یاد دلا کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ بنی اسرائیل کو اب شکایت کا کوئی حق نہیں کہ نعمتِ نبوت بنو اسمٰعیل کو کیوں عطا کی گئی ہے - کیونکہ اِن سے وعدہ پورا ہوچکا ہے - اب جس خدا نے ان کا وعدہ پورا کیا ضروری تھا کہ وہ بنو اسمٰعیل کا وعدہ بھی پورا کرتا - کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ مَیں اُن کے دونوں بیٹوں کے ساتھ نیک سلوک کرونگا - جب ایک سے وعدہ پورا ہُوا تو ضروری تھا کہ دوسرے سے بھی پورا ہو - پس اب اُن کے لئے کسی شکایت کا موقعہ نہیں -

اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ - یہ قرآن کریم کا محاورہ ہے کہ جس قوم میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی آئے اور اُسے کلام الٰہی کی نعمت سے سرفراز فرمایا جائے اُس کیلئے فَضَّلْتُکُمْ کے الفاظ آتے ہیں - کیونکہ الہام کو باقی علوم پر فضیلت حاصل ہوتی ہے - باقی علوم میں غلطیاں بھی ہوسکتی ہیں - مگر الہام میں کوئی غلطی نہیں ہوتی - اس لئے جو قوم موردِ الہام الٰہی ہو وہ تمام قوموں پر فضیلت رکھتی ہے - اس میں عالمین سے تمام دنیا کی قومیں مراد نہیں بلکہ صرف وہ قومیں مراد ہیں جن میں الہام الٰہی کا سلسلہ جاری نہیں تھا - کیونکہ اسجگہ صرف وحیٔ نبوت کو فضیلت کا موجب قرار دیا گیا ہے - پس وحیٔ الٰہی کی مورد اقوام اس میں شامل نہیں بلکہ صرف غیر وحی والی اقوام عالمین میں شامل ہیں - اس لئے یہ جھگڑا ہی غلط ہے کہ اس قوم کو اس پر فضیلت ہے اور اس کو اُس پر فضیلت ہے - کیونکہ یہ الفاظ قرآن کریم میں مختلف اقوام کے متعلق استعمال ہوئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرآن کریم کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ وہ تمام قومیں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتی ہیں - مثلاً سورہ آل عمران میں آتا ہے - اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ - (آل عمران آیت ۳۴) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور نوحؑ اور آلِ ابراہیمؑ اور آل عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی - اب اس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی اور حضرت نوح علیہ السلام کو بھی تمام عالموں پر فضیلت دی تھی اور آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو بھی تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی - حالانکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام بنی آدم پر فضیلت تھی تو پھر حضرت نوح علیہ السلام کو تمام پر فضیلت حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ آدمؑ اُن کے دائرہ سے نکل گئے - اور اگر حضرت نوح علیہ السلام کو باہر نکال لیں تو آدم علیہ السلام کو سب پر فضیلت نہیں ہوسکتی - اِسی طرح آل ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا ہے کہ ہم نے اُسے بھی تمام جہانوں پر فضیلت دی تھی - اب اگر بنو اسمٰعیل کو سب پر فضیلت ہو تو بنو اسحاق کو نہیں ہوسکتی اور اگر بنو اسحاق کو

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا

اور اُس دن سے ڈرو جب کوئی شخص قطعاً کسی دوسرے شخص کا قائم مقام نہ ہو سکے گا۔

وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ

اور نہ اس سے کسی قسم کا معاوضہ قبول کیا جائیگا اور نہ کوئی سفارش اُسے فائدہ دے گی

سب پر فضیلت ہو تو بنو اسمٰعیلؑ کو سب پر فضیلت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسل کو سب پر فضیلت ہو تو آلِ ابراہیمؑ کو سب پر فضیلت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر آلِ عمران کو سب پر فضیلت حاصل ہو تو آلِ ابراہیمؑ کو سب پر فضیلت نہیں ہو سکتی پس اس آیت کے یا تو یہ معنے ہیں کہ اُن سب کو اپنے اپنے زمانہ میں باقی تمام لوگوں پر فضیلت حاصل تھی۔ اور یا پھر یہ معنے ہیں کہ صاحب وحی کو غیر صاحب وحی پر فضیلت ہوتی ہے۔ وحی کا تو صرف ایک عالم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ایک ہی ہے لیکن کفر کے کئی عالم ہوتے ہیں۔ ان عالموں کے افراد نزولِ وحی کو بھول کر باطل باتیں اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی نبی کی طرف نہیں بلکہ کسی فلسفی کی طرف منسوب کرنے لگ جاتے ہیں۔ جیسے بہت سے عیسائی اپنے آپ کو فلسفہ کا تابع قرار دیتے ہیں۔ مسلمان بھی آہستہ آہستہ یونانی فلسفہ کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ اور گو کوئی قوم ایسی نہیں جس کی بنا کسی مذہب کے ہاتھوں نہ رکھی گئی ہو لیکن افراد کے لحاظ سے کروڑوں ایسے ہیں جو کسی کتاب کے تابع نہیں ہیں۔ اِسی طرح الہام کی اتباع کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہزاروں مسلمان ایسے ہیں جو مذہب سے بیگانہ ہیں اور فلسفہ کے قائل ہیں۔ غرض تمام علمی اور اخلاقی اور اعتقادی باتوں پر الہام کو ہمیشہ فضیلت حاصل رہی ہے فلسفیوں کی باتیں کمزور اور ناقص نظر آئیں گی اور الہامِ الٰہی کی باتیں مضبوط اور غالب دکھائی دینگی۔

پس فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ اِس نعمت سے مراد انبیاء اور رُسُل ۲ ایک لمبا سلسلہ ہے جو بنی اسرائیل میں جاری رہا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں سورۂ فاتحہ میں ایک طرف تو مومنوں کو یہ دُعا سکھلائی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور دوسری طرف منعم علیہ گروہ کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا کہ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (سورۂ نساء آیت ۷۰) یعنی جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرینگے وہ اُن لوگوں میں شامل ہونگے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا۔ یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین پس چونکہ کمالِ انعام وحی سے تعلّق رکھتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَیں نے تم پر وحی نازل کرکے تمہیں غیر وحی والی قوموں پر بڑی بھاری فضیلت دی تھی۔ اور جس طرح یہ کمال تمہیں صرف وحی کی وجہ سے حاصل ہؤا تھا۔ اِسی طرح اب مسلمانوں کو تم پر وحی کے ذریعہ فضیلت دے دی گئی ہے۔ اگر تم اِسے ردّ کردو گے

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۱۲۴)

اور نہ اُن کی مدد کی جائیگی - ۱۴۰

تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو تمہارے مقابل پر دوسروں کا ہوا تھا - بنی اسرائیل تجربہ کر چکے تھے کہ بڑے بڑے فلاسفر موسیٰ کے الہام کے مقابلہ پر آئے مگر ان تمام کو تورات نے شکست دی پس فرمایا کہ اگر تم اس کے مقابلہ پر آؤگے تو تمہاری عقلیں بھی کسی کام نہ آئیں گی اور تم اس کے مقابلہ میں ناکام رہوگے -

۱۴۰ تفسیر :- یہ آیت سورۃ بقرۃ کے رکوع ۶ میں بھی آچکی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اُس آیت میں لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ تھا اور اِس میں لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ ہے - پھر پہلی آیت میں جہاں وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ تھا وہاں اِس آیت میں وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ رکھ دیا - اسی طرح پہلی آیت میں عدل کا ذکر تیسری جگہ تھا اور شفاعت کا دوسری جگہ اور اِس میں شفاعت کا تیسری جگہ اور عدل کا دوسری جگہ ذکر ہے - گویا اِن دو آیات میں تین فرق ہیں -

(۱) ایک فرق تو یہ ہے کہ پہلی آیت میں شفاعت کا ذکر پہلے تھا اور عدل کا بعد میں لیکن دوسری آیت میں عدل کا ذکر دوسری جگہ آگیا ہے اور شفاعت کا ذکر تیسری جگہ - (۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں عدل کے متعلق لَا يُؤْخَذُ کے الفاظ تھے اور دوسری آیت میں لَا يُقْبَلُ آگیا ہے - (۳) تیسرا فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں شفاعت کے لئے لَا يُقْبَلُ تھا اور دوسری آیت میں لَا تَنْفَعُهَا کر دیا گیا - اِس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت اس مقام پر بیان کی گئی ہے جبکہ ابھی بنی اسرائیل کے عیوب شمار نہیں کئے گئے تھے - اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب تک انسان پر اپنی کمزوریاں نہیں کھلتیں اُس کی اُمیدیں وسیع ہوتی ہیں اور وہ اپنے بزرگوں کی امداد پر زیادہ بھروسہ رکھتا ہے - اِس لئے پہلی آیت میں شفاعت کو پہلے رکھا گیا ہے - کیونکہ یہود یہ اُمید رکھتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہماری شفاعت کر کے ہمیں بچا لیں گے اور وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ کو بعد میں رکھا گیا کیونکہ جسے شفاعت کی اُمید ہو وہ عدل دینے پر زیادہ آمادہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ بغیر اس کے بھی کام نکل جائیگا - لیکن اس آیت کے بعد جب یہود کی نافرمانیاں اور انبیاء کی مخالفتیں چھٹے رکوع سے شروع کر کے پندرھویں رکوع تک بیان کر دی گئیں اور اُن کی مخالفتِ انبیاء کا راز فاش کر دیا گیا تو اُن کی یہ اُمید بھی جاتی رہی کہ نبی ہماری شفاعت کرینگے - اسلئے اب طبعی ترتیب یہ ہوگی کہ عدل کا ذکر پہلے ہو - اور شفاعت کا ذکر بعد میں - کیونکہ اب وہ شفاعت پر زیادہ زور نہیں دے سکتے تھے اور اُن کی یہ اُمید کمزور ہو گئی تھی - صرف عدل ہی رہ گیا تھا کہ شاید بدلہ دیکر چھوٹ جائیں اس لئے پہلے عدل رکھا کہ اب [illegible] عدل پر زیادہ زور دینے لگے ہیں -

اِسی طرح پہلی آیت میں لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ اور دوسری میں لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ ہے - اِس کی وجہ بھی یہ ہے کہ قبولیت اخذ سے اعلیٰ لفظ ہے اور اپنے اندر اعزاز کا ایک رنگ رکھتا ہے - جیسے کہتے ہیں بادشاہ نے فلاں چیز قبول کر لی - یہ کبھی نہیں کہتے کہ فقیر نے بادشاہ کی عطا کردہ چیز قبول کر لی لیکن اخذ میں یہ بات نہیں ہوتی - اخذ جس کے معنے لینا ہے ادنیٰ چیز اعلیٰ کے بدلہ میں لینے یا اعلیٰ چیز ادنیٰ کے بدلہ میں

لینے یا ایک ہی جیسی قیمت رکھنے والی چیزیں ایک دوسرے
سے لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے جب تک یہود کی اُمید
قائم تھی اور اُن کے عیوب گِنائے نہیں گئے تھے۔ یہ
فرمایا کہ اُن سے عدل نہیں لیا جائیگا۔ اور "لیا جائیگا" کے
معنے یہ ہوتے ہیں کہ خود لینے والا لے لے۔ اور اس طرح
حساب پورا کرے۔ لیکن لَا یُقْبَلُ سے یہ مراد ہوتی ہے
کہ دینے والا خود اصرار سے دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی نہیں
لیا جاتا۔ اور یہ بات مایوسی کی حالت میں پیدا ہوتی ہے
پس یہ تبدیلی بھی پندرھویں رکوع میں موقع کے لحاظ
سے کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ تو مایوسی کی
حالت میں چاہیں گے کہ معاوضہ لے لیا جائے مگر معاوضہ
قبول نہیں کیا جائیگا۔

تیسری تبدیلی یہ ہے کہ پہلی آیت میں شفاعت
کے لئے لَا یُقْبَلُ آیا تھا اور کہا گیا تھا کہ لَا یُقْبَلُ
مِنْهَا شَفَاعَةٌ لیکن دوسری آیت میں لَا تَنْفَعُهَا
شَفَاعَةٌ آیا ہے۔ یہ تبدیلی بھی موقع کے لحاظ سے
ضروری تھی جب تک یہود کے عیوب بیان نہیں کئے
گئے تھے۔ وہ اُمید کر سکتے تھے کہ ہم انبیاء کی سفارش
پیش کرینگے اور وہ قبول ہو جائیگی۔ اس خیال کے مناسب
حال یہ جواب دیا کہ شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔
لیکن بعد کے رکوعوں میں جب انبیاء کی مخالفتیں اور یہود
کے دوسرے عیوب گِنائے گئے تو یہود کی یہ اُمید منقطع
ہو گئی کہ ہم خود شفاعت پیش کر سکینگے۔ لیکن یہ امید اب
بھی ہو سکتی تھی کہ شاید انبیاء ہی رحم کر کے ہماری شفاعت
کر دیں۔ اس لئے پندرھویں رکوع میں وَلَا تَنْفَعُهَا
شَفَاعَةٌ کہا گیا جس کے معنے یہ ہیں کہ سفارش کرنے
والوں کی سفارش سے اور لوگ تو فائدہ اُٹھائیں گے
مگر ان کے حق میں کوئی شفاعت کی ہی نہیں جائیگی کہ یہ
اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لَا تَنْفَعُهَا سے یہ مراد
نہیں کہ شفاعت تو ہوگی مگر مانی نہیں جائیگی بلکہ مراد
یہ ہے کہ اُنکے حق میں کوئی از خود بھی شفاعت نہیں کریگا
آخر شفاعت تو اِذن سے ہوتی ہے بغیر اِذن کے کون
شفاعت کر سکتا ہے۔ پس جب اِذن نہ ہوگا تو شفاعت
بھی نہیں ہوگی۔ اور جب شفاعت نہ ہوگی تو اس رحمت
کے دروازے سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ غرض
یہ سب تبدیلیاں بالکل موقعہ کے مناسب ہیں۔ اور
قرآنی ترتیب کے کمال کی ایک زبردست شاہد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب قومیں اپنے تنزل کے
دَور میں اعمال صالحہ کی بجا آوری میں کمزور ہو جاتی ہیں
تو وہ شفاعتِ انبیاء پر زور دینے لگ جاتی ہیں۔
صحابہؓ کے اقوال میں ہمیں یہ بات کہیں نظر نہیں آتی کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے ہم نجات حاصل
کریں گے۔ بلکہ اُن کے کلام میں نیکی اور تقویٰ اور قرآن کریم
پر عمل اور قربانیاں کرنے پر خاص طور پر زور پایا جاتا ہے
مگر جُوں جُوں انبیاء سے بُعد ہوتا جاتا ہے لوگ یہ کہنے
لگ جاتے ہیں کہ ہم اپنے نبیوں کی شفاعت سے جنت میں
چلے جائیں گے۔ چونکہ یہود بھی شفاعتِ انبیاء پر
بھروسہ کر کے بیٹھے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کا
اس آیت میں ردّ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اُن کا یہ خیال
اُن کو کچھ بھی فائدہ نہیں دیگا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ
ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اس لئے
ابراہیمؑ ہماری شفاعت کریں گے یا ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام
کی امت میں سے ہیں اس لئے موسیٰؑ ہماری شفاعت کرینگے
وہ غلطی پر ہیں۔

جب اس مضمون کو رکوع ۶ سے شروع کیا گیا تھا
تو اس وقت چونکہ یہود کے اس دعوے کو ردّ کرنے پر
خاص طور پر زور دینا مدنظر تھا کہ انبیاء ہماری شفاعت
کریں گے اس لئے شفاعت کو جس پر سارا زور تھا مقدم رکھا۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ

اور (اس وقت کو بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو اُس کے رب نے بعض باتوں کے ذریعہ سے آزمایا اور اُس نے اُنکو پورا کر دکھایا

قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ

(اس پر اللہ نے) فرمایا کہ مَیں تجھے یقیناً لوگوں کا امام مقرر کرنے والا ہوں (ابراہیمؑ نے) کہا اور میری اولاد کو بھی (امام بنائیو)

اور فرمایا کہ ان کے متعلق نہ شفاعت قبول کی جائیگی جسے یہ اپنا حق سمجھتے ہیں اور نہ یہ اپنے بداعمال کا معاوضہ پیش کر سکیں گے۔

لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شرمندہ کیا ہے کہ تم کس منہ سے کہتے ہو کہ انبیاء ہماری شفاعت کرینگے کیا تم نے موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی تھی۔ کیا سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کی تھی۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی تھی۔ کیا دوسرے انبیاء کی اطاعت کی تھی۔ تم نے ہر ایک کا انکار کیا۔ اور اس کی مخالفت کی۔ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو تم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ اس لئے ہم اس پر کس طرح ایمان لائیں۔ حالانکہ سوال یہ ہے کہ تم نے کس نبی کی مخالفت نہیں کی؟ تم ہر ایک سے لڑتے رہے اور تم نے ہر ایک کی تکذیب کی پس جب ہر ایک کی تم تکذیب ہی کرتے رہے ہو تو اب تمہاری کون شفاعت کریگا۔ کیا موسیٰ علیہ السلام کریں گے جن کو تم نے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ آیت ۲۵) کہا تھا یا حضرت سلیمان علیہ السلام کرینگے جن کو تم نے کافر قرار دیا تھا۔ یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرینگے جن کو تم نے لعنتی قرار دیا تھا۔ آخر تم کس کی شفاعت کے امیدوار ہو۔ اب کے اپنے جس شفاعت پر ان کو ناز تھا گھمنڈ نہیں ہو سکتا تھا اور ان کی ہمتیں ٹوٹ چکی تھیں اس لئے اب قدرتی طور پر انہیں یہی خیال

ہو سکتا تھا کہ کوئی بدلہ لیکر چھوڑ دے۔ اس وجہ سے مضمون بھی تبدیل کر دیا گیا اور عدل کو پہلے اور شفاعت کو بعد میں رکھ دیا گیا۔ اور مایوسی کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے يُؤْخَذُ کی بجائے عدل کے ساتھ يُقْبَلُ کا لفظ رکھا گیا۔ یعنی وہ تو چاہیں گے کہ بدلہ لے لیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرے گا۔ اسی طرح شفاعت کے ساتھ لَا تَنْفَعُهَا کے الفاظ رکھدیئے کہ شفاعت کرنیوالے دوسروں کی تو شفاعت کرینگے مگر ان کے حق میں انہیں اذن ہی نہیں دیا جائیگا۔ کہ شفاعت اُن کو فائدہ دے سکے۔ گویا نہ ان کے اعمال اُن کے کام آئیں گے اور نہ شفاعت ان کو کوئی نفع دیگی۔ شفاعت کی قبولیت درحقیقت کلّی طور پر ہوتی ہے۔ اگر شفاعت قبول ہو جائے تو انسان جنت میں چلا جاتا ہے۔ لیکن اعمال صرف جزئی طور پر فائدہ دے سکتے ہیں۔ یعنی جتنے عمل اچھے ہوں اتنے کام آ سکتے ہیں۔ پس فرمایا کہ انکو قلیل طور پر بھی نفع نہیں ہو سکتا اور نہ شفاعت کے ذریعہ کلّی طور پر نفع ہو سکتا ہے۔

تیسری صورت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے معاف کر دے۔ اس کے لئے فرما دیا کہ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی انہیں کوئی مدد نہیں دی جائیگی۔ غرض تین ہی صورتیں ہو سکتی تھیں اور تینوں کی نفی کر دی گئی ہے۔ یعنی نہ تو

قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

(اللہ نے) فرمایا (ہاں! مگر) میرا وعدہ ظالموں تک نہیں پہنچیگا۔ ۱۴۱ء

ان کے حق میں شفاعتِ انبیاء ہوگی اور نہ انکے اعمال اُنکے کام آئیں گے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کوئی مدد حاصل ہوگی۔ صرف یہی صورت ان کی نجات کی تھی کہ اوّل اللہ تعالیٰ اپنا فضل نازل کرکے انہیں معاف کردے۔ دوّم انبیاء اُن کی شفاعت کرکے انہیں اپنے ساتھ ملالیں۔ سوّم اُنکے اپنے اعمال اُنکے کام آجائیں اور وہ انکو اللہ تعالیٰ کے فضل کا مستحق بنا دیں۔ مگر اُن کے لئے یہ تینوں راستے بند کردیئے گئے ہیں۔ نہ انکی شفاعت ہوگی۔ نہ انکے اعمال ایسے ہیں کہ وہ انہیں بچا سکیں اور نہ ہم مدد دینگے۔

۱۴۱ء حل لغات: ۔ اِبْتَلٰی کے دو معنے ہیں۔ اوّل کسی کی مخفی باتوں کو معلوم کرنا۔ دوّم کسی کی پوشیدہ قابلیتوں کو خواہ وہ نیک ہوں یا بد اچھی ہوں یا بُری ظاہر کرنا۔ جب اس لفظ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور کہا جائے اِبْتَلَی اللّٰہُ فُلَانًا تو اس سے دوسرے معنے مراد ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کی پوشیدہ قابلیتوں کو ظاہر کردیا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی ذات عالم الغیب ہے اُسے خود کوئی بات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اِبْتَلٰی

کَلِمٰتٍ

کَلِمَۃٌ کے معنے حکم کے ہوتے ہیں اور حکم میں اوامر و نواہی دونوں شامل ہیں۔ (مفردات راغب)

اَلْاِمَامُ

اَلْاِمَامُ کے معنے ہیں اَلْمُؤْتَمُّ بِہٖ جسے اُسوہ بنایا جائے۔ اور جس کے قول و فعل کی اقتداء کی جائے (۲) عربی زبان میں کتاب کو بھی امام کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے احکام کو مانا جاتا ہے۔

تفسیر: ۔ فرماتا ہے۔ تم اُس وقت کو بھی یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اندرونی نیکی اور تقویٰ کو لوگوں پر ظاہر کرنا چاہا۔ تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخفی روحانی طاقتیں اور قابلیتیں اُن کو معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ ان قابلیتوں کو ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اُن کو کچھ احکام دیئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن احکام کو پورا کردیا۔ اور اس طرح دُنیا کو معلوم ہوگیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اطاعت اور فرمانبرداری کی جو اعلیٰ طاقتیں ودیعت ہیں وہ دوسروں میں نہیں ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا تعالیٰ کی راہ میں ذبح کردیں۔ جب وہ ظاہری طور پر اس پر عمل کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ ہماری یہ مراد نہیں بلکہ کچھ اَور مراد ہے۔ اور پھر اللہ تعالےٰ کا منشاء اس رنگ میں ظاہر ہوا کہ اُس نے انہیں حکم دیا کہ وہ ہاجرہ اور اسمٰعیل کو ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آئیں۔ چنانچہ وہ انہیں وہاں چھوڑ آئے۔ اور اس امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ اور اس طرح دُنیا کو معلوم ہوگیا کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہر بات پر لبّیک کہنے والے ہیں۔ خواہ بادی النظر میں وہ کتنی ہی بھیانک اور خوفناک کیوں نہ ہو۔

یہاں وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فرمایا ہے اور کَلِمٰتٍ جمع کا صیغہ ہے مگر مشہور اُنکے بیٹے کے ذبح کا واقعہ ہے۔ لیکن طالمود میں لکھا ہے کہ اُن کی دس آزمائشیں ہوئی تھیں (جوزف بارکلے کی طالمود صفحہ ۲۳۲)

اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا میں امامت سے

نبوت مراد نہیں۔ کیونکہ نبوت تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ بلکہ امامت سے انہیں لوگوں کے لئے ایک نمونہ اور مقتدیٰ بنانا مراد ہے اور لِلنَّاسِ سے مراد انسانوں کا عظیم الشان گروہ ہے۔ درحقیقت اس میں آئندہ کے متعلق ایک وعدہ کیا گیا تھا۔ ورنہ اُس زمانہ میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ صرف چند ہی لوگ تھے۔ چنانچہ دیکھ لو آج دنیا کے کثیر حصّہ میں وہ امام اور مقتدیٰ سمجھے جاتے ہیں۔ اور بڑے ادب اور احترام کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے۔ یوں تو ہر نبی اپنی قوم کیلئے اُسوہ ہوتا ہے لیکن ہر نبی ساری دنیا کے لئے اُسوہ نہیں ہوتا۔ انبیاء سابقین میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جنکا تمام اقوام میں ادب اور احترام پایا جاتا ہے۔ عیسائیوں کو ہی دیکھ لو۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتنا ادب نہیں کرتے جتنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کرتے ہیں۔ بلکہ دوسرے نبیوں پر تو وہ کئی قسم کے الزام بھی لگاتے ہیں صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وہ خاص طور پر ادب کرتے ہیں کیونکہ انکو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں سے مانتے ہیں۔ ورنہ باقی انبیاء کو تو وہ چور اور بٹمار کہنے سے بھی باز نہیں آتے (یوحنا باب آیت ۸) مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بڑا ادب کرتے ہیں۔ یہی معنے اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کے ہیں۔ یعنی ہم تجھے ایک ایسا وجود بنائیں گے کہ لوگ تیرے اقوال و افعال کی اقتداء کرینگے۔ چنانچہ حج جو اسلامی عبادات میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے ہی قائم کیا اور آج تک دنیا حج کے ذریعے انکو یاد کرتی ہے۔ اسی طرح ہر قربانی کے موقعہ پر وہ یاد کئے جاتے ہیں۔

ہم اگرچہ اُمّتِ محمدیہ میں سے ہیں مگر ہم بھی عید الاضحیہ کے موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کو یاد کرتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیلیے اسلام میں کوئی دن مقرر نہیں کیا گیا کہ جس سے اُن کے کسی فعل کی یاد تازہ ہو۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یاد کے لئے ایک خاص دن مقرر کر دیا گیا ہے۔ پس امامت سے مراد نبوت نہیں بلکہ اُن کا اُسوہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم تجھے تمام لوگوں کے لئے ایک نمونہ بنائیں گے اور لوگ تیری اقتداء کرتے رہیں گے۔

شیعہ دوست کہا کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ایسے وقت میں فرمایا ہے جبکہ آپ نبی بن چکے تھے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کا مقام نبی سے بالا ہوتا ہے۔ اُن کی یہ بات تو بالکل درست ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت نبوت کے دعویٰ کے بعد دی گئی لیکن سوال یہ ہے کہ کیا امام اپنے لغوی معنوں کے لحاظ سے کوئی ایسا عہدہ ہے جو نبوت کے بعد ملتا ہے۔ اگر یہ ایسا عہدہ ہے جو نبوت کے بعد ملتا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ بعض نبی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اقتداء ضروری نہیں ہوتی کیونکہ لغت نے امام کے یہ معنے بتلائے ہیں جس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔ پس اگر یہ ایسا عہدہ ہے جو نبوت سے فائق ہے تو ماننا پڑے گا کہ بعض نبی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی اطاعت و فرمانبرداری فرض نہیں تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت بھی اس سے پہلے فرض نہ تھی حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نساء آیت ۶۵) یعنی ہم نے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس کی اطاعت دوسروں پر فرض نہ کی گئی ہو۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر نبی کی اطاعت فرض کی ہوئی ہے۔ اِدھر وہ نبی بنتا ہے اور اُدھر سے اُس کی بات کا ماننا واجب ہو جاتا ہے۔ اِن معنوں کی رُو سے امامت نبوت سے علیحدہ کوئی مقام نہ رہا بلکہ امامت

ونبوت دونوں لازم وملزوم قرار پاتی ہیں۔ پھر ہمیں قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک امامت نبوت سے بھی پہلے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (نساء آیت) یعنی اے مومنو! تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور جو اولی الامر لوگ غیر رسول ہیں اُن کی بھی اطاعت کرو۔ پہلے اللہ پھر رسول اور پھر اُن سے نیچے اولی الامر غیر رسول کو رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو رسول نہیں ہوتے۔ مگر اُن کی اطاعت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اگر امام کے معنے صرف مطاع کے لئے جائیں تو اِس قسم کی امامت تو نبوت سے بھی ادنیٰ ہوئی۔ جو امامت نبوت کے ساتھ لازم ہوتی ہے وہ نبوت کے ساتھ ہی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص نبی تو ہو مگر اُسے امامت نہ ملی ہو۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص امام ہو مگر اُسے نبوت نہ ملی ہو۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص نبی اور رسول ہو اور پھر امامت سے محروم ہو۔ جیسا کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ سے ظاہر ہے۔ اب ہمیں دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ماننی پڑتی ہے یا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا یہ نبوت سے پہلے کی بات ہے۔ یا نبوت کے بعد کی بات ہے۔ اگر نبوت کے بعد کی بات ہے تو اس صورت میں اس کے وہ معنے نہیں ہو سکتے جو عام طور پر کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس کے کچھ اور معنے ہونگے۔ اور واقعہ یہی ہے کہ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا نبوت کے بعد فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعض کلمات کے ذریعہ آزمائش کی گئی تو ابراہیم علیہ السلام نے اُن احکامِ الٰہی کو پورا کر دیا۔ اور انبیاء کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ نبوت کے ملنے سے پہلے امتحان نہیں لیا جاتا۔ بلکہ بعد میں لیا جاتا ہے۔ اِس لئے باقی انبیاء کے طریق کو دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ الہام بعد کا ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اس کے کوئی اور معنے ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر لفظ دو قسم کے معنے رکھتا ہے۔ اوّل اضافی دوم غیر اضافی۔ اضافی معنے ہمیشہ اضافت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً جب ہم سردار کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے عام طور پر یہ معنے ہوتے ہیں کہ جو کسی کے اوپر افسر ہو۔ لیکن سردار ایک گاؤں کا بھی ہوتا ہے ایک تحصیل کا بھی ہوتا ہے۔ ایک ضلع کا بھی ہوتا ہے۔ ایک صوبے کا بھی ہوتا ہے۔ ایک ملک کا بھی ہوتا ہے اور پھر کئی ملکوں کا بھی ہوتا ہے۔ پس یہ ایک عام لفظ ہے جو چھوٹے بڑے سب کی سرداری پر دلالت کرتا ہے اور کسی کی طرف اضافت کرنے کے بغیر کوئی خاص معنے معیّن نہیں کرتا۔ مگر جب ہم یہ کہیں کہ چوہڑوں کا سردار یا چپڑاسیوں کا سردار یا جرنیلوں کا سردار تو اس کے معنے معیّن ہو جاتے ہیں۔ اور پتہ لگ جاتا ہے کہ فلاں قوم سے اِسے نسبت ہے۔ اور اس اضافت سے معنوں میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اِس کی مثال قرآن کریم میں بھی ملتی ہے۔ قرآن کریم میں صِدّیق کا لفظ آتا ہے جس کے معنے بڑے راستباز کے ہیں۔ اب بڑا راستباز نبی بھی ہو سکتا ہے اور غیر نبی بھی۔ اگر صدّیق کا لفظ عام معنوں میں ہو تو یہ درجہ نبی سے چھوٹا ہے۔ مگر جب یہ لفظ نبی کے لئے آئے تو اس وقت یہ کسی خاص خصوصیت کا حامل بن جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم میں حضرت ادریسؑ کے متعلق آتا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ (مریم آیت ۵۷) یعنی تو قرآن کریم کی رُو سے ادریسؑ کا بھی ذکر کردہ ایک صدّیق نبی تھا۔ حالانکہ دوسری جگہ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ

وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ میں صدیقیت کو نبوت سے نیچے
رکھا ہے۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسبت آتا
ہے کَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا (مریم: ۵۶) کہ وہ اپنے ربّ کے
حضور پسندیدہ وجود تھا۔ مگر دوسری جگہ یہ درجہ نبوت سے
نیچے رکھا ہے۔ جیسے فرمایا۔ یٰۤاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ
ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً (فجر آیہ ۲۸، ۲۹) کہ اے
نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف ایسی حالت میں واپس جا کہ تو اس سے اور
وہ تجھ سے راضی ہے۔ اس آیت میں ہر مومن کا نام جو نفس مطمئنہ رکھتا
ہے اور ایمان کی حالت میں وفات پاتا ہے، مرضیہ رکھا گیا ہے
اگر کَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا کے یہ معنے کریں کہ وہ ہر شخص جس سے خدا
راضی ہو نبی سے بالا ہوتا ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہر مومن جو نفس مطمئنہ
رکھتا ہے وہ نبی سے بالا مقام رکھتا ہے۔ یا صِدِّیْقًا نَّبِیًّا کے تحت
کہنا پڑیگا کہ صدیق کا لفظ جس کے متعلق آئے وہ نبی سے بالا ہوتا
ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے متعلق
آتا ہے کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ
قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ
(حجرات آیت ۱۵) یعنی اعراب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی مجلس میں آکر کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو کہدے
کہ تم ابھی ایمان نہیں لائے۔ ہاں تم یہ کہو کہ ہم اسلام لے
آئے ہیں۔ ورنہ ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل بھی
نہیں ہوا۔ گویا اسلام ایمان کا ابتدائی درجہ ہے۔ مگر اسی
جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے اِذْ قَالَ
لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اس کے رب نے کہا کہ تو
اسلام لا۔ یعنی ہماری فرمانبرداری اختیار کر تو انہوں نے کہا
کہ خدایا میں تو پہلے ہی تمام جہانوں کے رب کی فرمانبرداری
اختیار کر چکا ہوں۔ یہ حکم ان کو نبوت کے بعد ہوا۔ اور
انہوں نے اَسْلَمْتُ کہا جس کی خدا تعالیٰ نے بڑی تعریف
فرمائی اور ادھر اٰمَنَّا کہنے والوں کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
تم اَسْلَمْنَا کہو۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں
ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام ایمان سے بھی
ادنیٰ تھا۔ اگر شیعوں والے معنے لئے جائیں تو اس کا یہ
مطلب ہوگا کہ ہر اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو مسلم
کہنے والا نبی سے بالا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
نبوت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ مسلم بن
جاؤ۔ اور انہوں نے اَسْلَمْتُ کہا۔ اسی طرح اگر
امامت نبوت کے بعد ملنے کے یہ معنے ہیں کہ امام نبی سے
بڑا ہوتا ہے۔ تو پھر امامت تو الگ رہی ان معنوں کو
تسلیم کرتے ہوئے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ہر مسلم کا درجہ
نبی سے بڑا ہوتا ہے کیونکہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو
نبوت کے بعد امامت ملی۔ اسی طرح نبوت کے بعد انہیں
مسلم بھی بننا پڑا۔ اس صورت میں ہر مسلم نبی سے بڑا ہو
جاتا ہے۔ پس خالی امامت نبوت سے بڑی نہیں ہوتی بلکہ
وہ امامت جو نبوت کے بعد ملتی ہے وہ بڑی ہوتی ہے۔
جس طرح خالی اسلام نبوت سے بڑا نہیں ہوتا بلکہ وہ
اسلام جو نبوت کے بعد حاصل ہوتا ہے بڑا ہوتا ہے۔
غرض ہر چیز کا الگ الگ دائرہ ہے۔ ایک اسلام وہ ہے
جو ایمان سے ادنیٰ ہوتا ہے اور ایک اسلام وہ ہے جو
ایمان کے بعد حاصل ہوتا ہے اور ایک اسلام وہ ہے جو
نبوت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ جیسے مانیٹر کا لفظ ایک
ہی ہے مگر ایک ادنیٰ جماعت کا مانیٹر ہوتا ہے اور ایک
بڑی جماعت کا۔ اب ادنیٰ جماعت کے مانیٹر ہونے کے یہ
معنے نہیں ہوتے کہ وہ اونچی کلاس کے مانیٹر سے بھی بالا
ہے۔ اس کا علم تو ایک بڑی جماعت کے طالبعلم سے بھی کم
ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ امامت جو نبوت سے الگ ہوتی ہے
اُسے اس امامت سے جو نبوت کے بعد ملتی ہے کوئی نسبت
ہی نہیں ہوتی۔ خود مسلمانوں میں دیکھ لو کہ نماز پڑھانیوالا
امام کہلاتا ہے۔ پھر خلیفہ بھی امام ہوتا ہے اور نبی بھی

امام ہوتا ہے۔ اِدھر قرآن کریم میں یہ دُعا سکھلائی گئی ہے
وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا (فرقان آیت ۷۵) کہ الٰہی
کچھ مومن بھی میرے مقتدی بنا دے اور مجھے اُن کا امام بنا
اب کیا اس کے یہ معنے ہونگے کہ ہر شخص یہ دُعا کرتا ہے
کہ اُسے نبیوں سے بالا درجہ مل جائے؟ اگر اس کے یہ
معنے ہوں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبیوں سے بالا درجہ بھی
مل سکتا ہے کیونکہ اس کی دُعا سکھائی گئی ہے جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص نبی سے بڑا درجہ پا سکتا
ہے۔ حالانکہ اس کے شیعہ بھی قائل نہیں۔ درحقیقت
اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا کے معنے یہ ہیں کہ اے
ابراہیم! تو اپنی قوم کے لئے نبی تھا مگر چونکہ تو آزمائشوں
میں ثابت قدم نکلا ہے اور تو نے بڑی دلیری سے میرے
حکم کو مانتے ہوئے اپنی بیوی اور بچے کو ایک ایسے جنگل
میں جا کر بسا دیا ہے جہاں پانی کا ایک قطرہ اور گھاس کی ایک
پتی تک نہ تھی اور تو نے اپنی اور اپنے خاندان کی موت قبول
کر لی ہے اس لئے میں بھی تجھے یہ انعام بخشونگا کہ تیرا یہ واقعہ
ساری دنیا کے لوگوں کے لئے قیامت تک بطور نمونہ قائم
رہیگا۔ اور جب بھی دنیا کو آزمائشوں اور امتحانوں میں ثابت
قدم رہنے کا درس دیا جائیگا تو اس وقت تیرے اِس
واقعہ کو نمونہ کے طور پر پیش کیا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ وَ
اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ کے ساتھ
ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا
ورنہ اگر یہ کوئی الگ عہدہ ہوتا تو آزمائشوں کے ذکر
کے ساتھ اس کے بیان کرنے کے کوئی معنے نہ تھے۔ حضرت
ابراہیم علیہ السلام کی ابتلاؤں میں شاندار کامیابی کے ذکر کے
معًا بعد اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کہنا بتاتا ہے کہ
اس میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تیری زندگی کا
یہ درخشاں واقعہ ہمیشہ کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گا
اور قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے تو ایک نمونہ کے
طور پر پیش کیا جائیگا۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام
کو آئندہ زمانہ کی یہ خبر دی گئی تو انہیں خیال آیا کہ جب
میں بعد میں آنے والوں کا امام بنایا جاؤنگا تو میری طرف
منسوب ہونے والی ذریت کی ہدایت کا بھی سامان ہونا
چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ الٰہی میری اولاد پر بھی
تیری رحمت کا ہاتھ رہے۔ فرمایا۔ ٹھیک ہے مگر میرا عہد
ظالموں کو نہیں پہنچیگا۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ اُنکی ساری ذریت ظالم ہو
جائیگی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اولاد دو قسم کی ہو گی۔ ایک
ظالم اور ایک مطیع و فرمانبردار۔ اللہ تعالیٰ نے ظالم اولاد
کی نفی کی ہے اور مطیع اولاد میں سے امام بنانے کا وعدہ
کیا ہے۔

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کے دو طرح معنے
ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عہد بمعنی معہود ہو یعنی جس
چیز کا عہد کیا گیا ہے وہ ظالموں کو نہیں ملیگی۔
دوسرے معنے یہ ہیں کہ میں ظالموں کے لئے کوئی عہد
نہیں کرونگا۔ صرف غیر ظالموں کے لئے کرونگا۔ یعنی
جو قوم بحیثیت قوم ظالم بن جائیگی اس میں سے سلسلۂ نبوت
منقطع ہو جائیگا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت
ابراہیم علیہ السلام کو امام بنانے کا وعدہ فرمایا۔ (۲)
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی نسبت بھی
اس وعدہ میں توسیع کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے
مشروط وعدہ فرمایا۔ یعنی وعدہ کیا کہ تمہاری اولاد میں
سے بعض اس عہد سے حصہ پائیں گے۔ مگر حصہ پانیوالے
وہی ہونگے جو قومی ظلم کے ذریعہ سے اپنے آپکو انعام سے محروم
نہ کر چکے ہوں۔

جب تک بنی اسرائیل اس وعدہ کے مستحق ہے اللہ تعالیٰ

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ

اور (اُس وقت کو بھی یاد کرو) جب ہم نے اس گھر (یعنی کعبہ) کو لوگوں کے لئے بار بار جمع ہونے کی جگہ اور امن (کا مقام) بنایا

وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ

تھا اور (حکم دیا تھا کہ) ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ اور

عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا

ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ میرے گھر کو

اپنے عہد کو پورا کرتا رہا۔ مگر جب بنی اسرائیل کی اولاد پر اس عہد کے انعامات کے ناقابل ہو گئے تو وہ عہد بنی اسرائیل کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو گیا۔

بائیبل میں بھی اس عہد کے مشروط ہونے کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۷ میں لکھا ہے:-

"پھر خدا نے ابراہام سے کہا۔ کہ تو اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت میرے عہد کو نگاہ رکھیں۔ اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ تمہاری پشت در پشت ہر لڑکے کا جب وہ آٹھ روز کا ہو ختنہ کیا جائے گا۔ کیا گھر کا پیدا کیا پردیسی سے خریدا ہوا جو تیری نسل کا نہیں۔ لازم ہے کہ تیرے خانہ زاد اور تیرے زرخرید کا ختنہ کیا جائے۔ اور میرا عہد تمہارے جسموں میں عہد ابدی ہوگا اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہیں ہوا وہی شخص اپنے لوگوں میں سے کٹ جائے کہ اس نے میرا عہد توڑا۔"

ان آیات سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کی اولاد کی نسبت جو عہد لیا گیا تھا وہ مشروط تھا اور اس کی ظاہری علامت ختنہ تھا۔ اور صاف طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ تیری اولاد میں سے جو اس عہد کی پابندی نہیں کریں گے۔ خدا تعالیٰ کا عہد بھی اُن سے کوئی نہیں رہے گا۔ اور اُن کو وہ انعامات نہیں ملیں گے جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے وعدہ کیا گیا ہے۔

اس عہد کا ظاہری نشان جو ختنہ کی صورت میں قائم کیا گیا تھا بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جاری رہا اور یہ قوم خدا تعالیٰ کے انعامات کی وارث رہی۔ مگر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگئے تو بنی اسرائیل کا وہ حصہ جو اُن پر ایمان نہ لایا تھا اس گروہ سے کٹ گیا جس کو انعامات کا وعدہ دیا گیا تھا اور صرف وہی لوگ انعامات کے مستحق رہ گئے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ لیکن آگے چل کر انہوں نے بھی

بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَ الْعٰکِفِیْنَ وَ الرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۶﴾

طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنیوالوں اور سجدہ کرنیوالوں کیلئے پاک (وصاف) رکھو۔

عہد توڑ دیا۔ اور ختنہ جو اس عہد کا ایک ظاہری نشان تھا اسے ترک کر دیا۔ غرض اس قوم کا کچھ حصہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے انکار کی وجہ سے خدائی انعامات سے محروم ہو گیا اور جنہوں نے مانا تھا انہوں نے ختنہ چھوڑ کر اور شریعت کو لعنت قرار دیکر اپنے آپ کو خدائی فضلوں سے محروم کر لیا۔ اور یہ وعدہ بنو اسحاق سے بنو اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو گیا۔ اور میرے نزدیک اسجگہ یہی ذکر ہے کہ امامت کا مقام بنو اسحاق کو نہیں ملیگا کیونکہ وہ بحیثیت جماعت ظالم ہو جانے والے تھے۔ ہاں بنو اسمٰعیل کو ملے گا۔ کیونکہ وہ بحیثیت جماعت کبھی ظالم نہیں ہونگے۔ بلکہ ہر زمانہ میں اُن میں ایسے لوگ ہوتے رہیں گے جو خدا تعالےٰ کی وحی کے قائل ہونگے۔ چنانچہ اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کا امام بنایا گیا۔ اور آپؐ کی اُمت میں سے اِس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ مقام بخشا گیا۔

اَمْنًا

مِنْ

مَثَابَۃً

۱۴۲؎ حل لغات:۔ مَثَابَۃٌ کے معنے ہیں مُجْتَمَعُ النَّاسِ بَعْدَ تَفَرُّقِهِمْ وہ جگہ جہاں متفرق ہونے کے بعد لوگ جمع ہوتے ہیں۔ (اقرب)

مُصَلًّی

عَہِدَ

مفرداتِ راغب میں لکھا ہے۔ اَلْمَثَابَۃُ: اَلْمَکَانُ الَّذِیْ یُکْتَسَبُ فِیْهِ الثَّوَابُ۔ مثابہ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں آنے کی وجہ سے انسان کو ثواب حاصل ہوتا ہے وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً میں مَثَابَۃً کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ مفعول ثانی ہے اور جَعَلَ بمعنے صَیَّرَ ہے۔ اس لحاظ سے اِس کے معنے یہ ہیں کہ صَیَّرْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً ہم نے خانہ کعبہ کو مثابہ بنایا ہے۔ دوسرے مَثَابَۃً حال بھی ہو سکتا ہے یعنی جَعَلْنَا الْبَیْتَ حَالَ کَوْنِهٖ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ۔ اِس صورت میں جَعَلَ بمعنے صَیَّرَ نہیں بلکہ بنانے کے ہونگے اور مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے خانہ کعبہ ایسے حال میں بنایا ہے کہ وہ اپنے اندر مثابہ کی خصوصیات رکھتا تھا۔

اَمْنٌ کے معنے ہوتے ہیں (۱) اطمینانِ قلب (۲) سَلَامَۃٌ مِّنَ الْخَوْفِ۔ دل کا اطمینان اور ظاہری خطرات سے نجات۔ جب انسان ظاہری خطرات سے بھی محفوظ ہو اور اس کے دل کو بھی اطمینان حاصل ہو تو یہ کامل امن ہوتا ہے۔

مِنْ کے کئی معنے ہیں۔ مگر اسجگہ یہ تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اور زائدہ بھی۔ زائدہ کے یہ معنے نہیں کہ وہ زائد ہے اور کوئی معنے نہیں دیتا بلکہ یہ عربی زبان کی ایک اصطلاح ہے جو زور دینے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ ایسا مِنْ بے معنی نہیں ہوتا بلکہ معنوں پر زیادہ زور دینے کے لئے لایا جاتا ہے۔ اور اُسے زائدہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عام طور پر استعمال نہیں کیا جاتا۔ اسجگہ وَاتَّخِذُوْا پر زور دیا ہے کیونکہ یہ فعل کے معنوں میں شدّت پیدا کر دیتا ہے۔

مُصَلًّی: جائے نماز کو کہتے ہیں۔

عَہِدَ: کے معنے ہیں اَوْصَاهُ وَشَرَطَ اِلَیْهِ۔ (اقرب) اُسے تاکید کی۔ اور اس کی پابندی اُس کے لئے ضروری قرار دی۔

مفرداتِ راغب میں لکھا ہے۔ اَلْقٰی اِلَیْهِ الْعَهْدَ وَاَوْصَاهُ بِحِفْظِهٖ۔ یعنی اُسے عہد سے واقف کیا اور اس عہد کی حفاظت کی اُسے تاکید کی۔ پس اِس کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت

اسمٰعیل علیہما السلام کو وصیت کی اور اس کی پابندی اُن
پر فرض کی۔

رُکَّعٌ: رَاکِعٌ کی جمع ہے اور رکوع کے معنے
رکوع کرنے یا توحید پر چلنے کے ہوتے ہیں۔

سُجُوْدٌ: سَاجِدٌ کی جمع ہے۔ اس کے معنے
(۱) سجدہ کرنے والے اور (۲) کامل فرمانبردار کے ہوتے ہیں

طَآئِفٌ: جو شخص بار بار
کسی جگہ آئے یا اس کے گرد چکّر لگائے وہ طائف
کہلاتا ہے۔

عَاکِفٌ: بیٹھنے والا۔ جو دھرنا مار کر بیٹھ
جائے۔ اِسی سے اعتکاف نکلا ہے۔

تفسیر:۔ اَلْبَیْتُ خانہ کعبہ کا نام ہے۔
اسے اَلْبَیْتُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بیت کے
تمام خواص جمع ہیں۔ جیسے کہتے ہیں زَیْدُنِ الرَّجُلُ
زید ہی آدمی ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک معقول آدمی
کے اندر جس قدر خوبیاں پائی جانی چاہئیں وہ سب کی
سب زید میں پائی جاتی ہیں۔ پس خانہ کعبہ ہی گھر ہے
کا مطلب یہ ہے کہ گھر کی جو خصوصیتیں ہوتی ہیں وہ
سب کی سب صرف اِسی گھر سے حاصل ہوتی ہیں۔ گھر
کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔ گھر کی یہ خصوصیات ہوتی
ہیں کہ (۱) گھر مستقل رہائش کی جگہ ہوتی ہے (۲) گھر
چوری اور ڈاکے سے حفاظت کا ایک ذریعہ ہوتا ہے (۳)
گھر اس کا مقام ہوتا ہے جس میں داخل ہو کر انسان
ہر قسم کے مصائب سے نجات پا جاتا ہے (۴) گھر تمام
قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کے جمع ہونے کی
جگہ ہوتا ہے (۵) گھر انسان کے مال و متاع کو محفوظ
رکھنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اِن پانچ خصوصیتوں کے لحاظ
سے اگر غور کیا جائے تو درحقیقت خانہ کعبہ ہی اصل گھر
ہے۔ کیونکہ اگر حفاظت کو لو تو بڑے بڑے قلعوں کو
لوگ تباہ کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں رہنے والوں
کو لوگ تباہ کر دیتے ہیں مگر خانہ کعبہ کو یہ خصوصیت حاصل
ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کی دائمی حفاظت حاصل ہے۔
اور ہر شخص جو اس پر ہاتھ اٹھانا چاہے اللہ تعالیٰ اس
کے ہاتھ کو شل کر دیتا ہے۔ چنانچہ ابرہہ کی مثال
اس بارہ میں ایک زندہ جاوید مثال ہے۔ ابرہہ جو
ایبے سینیا کی عیسائی حکومت کی طرف سے یمن کا گورنر
مقرر تھا۔ اس نے چاہا کہ خانہ کعبہ کو تباہ کر دے اور
عربوں کو مجبور کرے کہ وہ بیت اللہ کی بجائے صنعاء کے
گرجا کا حج کیا کریں۔ تاکہ عیسائیت کو فروغ حاصل ہو
جب وہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مکّہ کے قریب پہنچا۔ تو
اُس نے ایک خاص آدمی مکّہ والوں کی طرف بھجوایا۔ اور
اُسے یہ پیغام دیا کہ مَیں صرف خانہ کعبہ کو گرانے کے لئے
آیا ہوں۔ تمہارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں۔ اس لئے
اگر تم میرے ارادہ میں مزاحم نہ ہو تو مَیں تمہیں کچھ نہیں کہونگا
اللہ کعبہ کو گرا کر واپس چلا جاؤنگا۔ وہ شخص جب مکّہ پہنچا۔
تو اُس نے دریافت کیا کہ مکّہ والوں کا آجکل سردار کون
ہے۔ انہوں نے حضرت عبد المطلب کا نام لیا۔ وہ آپکے
پاس آیا اور اُس نے ابرہہ کا پیغام دیا۔ حضرت عبد المطلب
نے اُسے جواب دیا کہ اگر اس کی ہم سے لڑنے کی نیّت
نہیں تو ہم بھی اُس سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ ہم میں تو
اُس سے لڑائی کی طاقت ہی نہیں۔ باقی اِس گھر کے
متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ یہ خدا کا گھر ہے اور
اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہوا ہے
پس اگر اللہ تعالیٰ اس گھر کو بچانا چاہے تو یہ اُس کا
کام ہے ہم میں ابرہہ اور اُسکے لشکر کے مقابلہ کی کوئی طاقت نہیں۔ اس پر
اُس شخص نے کہا کہ اگر آپ لوگ لڑنا نہیں چاہتے تو بہتر ہے کہ آپ
میرے ساتھ چلیں اور ابرہہ سے ملاقات کریں۔ ابرہہ
نے بھی خواہش کی تھی کہ مَیں مکّہ کے کسی رئیس کو اپنے ساتھ

رُکَّعٌ
سُجُوْدٌ
طَآئِفٌ
عَاکِفٌ

لاؤں۔ اس سے اس کا دل خوش ہو جائیگا۔ اور ممکن ہے کہ وہ خانہ کعبہ کو گرانے کا ارادہ ہی ترک کر دے۔ بالآخر حضرت عبدالمطلب نے بعض رؤساء اور اپنے لڑکوں کو ساتھ لیا اور ابرہہ کی ملاقات کے لئے چل پڑے۔ ابرہہ آپ سے مل کر بڑا متاثر ہوا اور اس نے کہا کہ مجھے آپ سے ملاقات کر کے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ فرمائیں کہ آپ کی اس ملاقات کا مقصد کیا ہے؟ حضرت عبدالمطلب نے کہا۔ کہ آپ کے لوگ چھاپہ مار کر کچھ اونٹ لوٹ لائے ہیں جن میں میرے بھی دو سَو اونٹ ہیں۔ وہ مجھے واپس دلائے جائیں۔ یہ سُنکر اُسے غصہ آ گیا۔ اور کہنے لگا۔ میں نے تو آپ کو بڑا عقلمند سمجھا تھا اور میرا خیال تھا کہ آپ مجھ سے یہ کہیں گے کہ میں خانہ کعبہ پر حملہ نہ کروں مگر آپ نے خانہ کعبہ کا نام تک نہیں لیا اور اپنے دو سَو اونٹوں کا مطالبہ کر دیا ہے حالانکہ خانہ کعبہ کے مقابلہ میں دو سو اونٹوں کی حیثیت ہی کیا تھی کہ آپ اس کا ذکر کرتے۔ حضرت عبدالمطلب نے بے ساختہ جواب دیا کہ اگر عبدالمطلب کو اپنے دو سو اونٹ کی فکر ہے تو کیا خدا تعالیٰ کو اپنے گھر کی حفاظت کا فکر نہ ہوگا۔ وہ آپ اس کی حفاظت کریگا۔ مجھے تو صرف اپنے اونٹوں کی ضرورت ہے۔ ابرہہ یہ سُن کر طیش میں آ گیا اور اس نے اونٹ تو واپس کر دیئے۔ مگر بیت اللہ پر حملہ کرنے کا ارادہ زیادہ مضبوط کر لیا۔ ابھی اس نے حملہ نہیں کیا تھا کہ تمام فوج میں چیچک کی بیماری پھوٹ پڑی اور لوگ کتوں کی طرح مرنے لگے۔ آخر اتنی بھاگڑ مچی کہ وہ محاصرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ہزاروں انسان وادیوں میں بھٹک بھٹک کر مر گئے۔

غرض اَلْبَیْت میں بتایا ہے کہ حقیقی حفاظت لوگوں کو اسی گھر کے ذریعہ میسر آ سکتی ہے۔ یہ خدا کا گھر ہے جس پر کوئی دشمن حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

گھر کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مستقل رہائش کا مقام ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہی گھر ہے جو اَلْبَیْت کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ دائمی زندگی خدا کے گھر میں ہی ملتی ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کے گھر میں نہیں جاتے اُن کی زندگی کیا زندگی ہے۔ دنیوی گھر کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وہ ایک قلیل متاع ہے۔ لیکن اپنے گھر کے متعلق فرماتا ہے۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (فجر آیت ۳۰، ۳۱) یعنی جب انسان خدا تعالیٰ کا سچا پرستار بن جاتا ہے اور اس کا گھر مسجد ہو جاتا ہے تو پھر وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ غرض یہی بیت ہے جو انسان کو ہمیشہ کی زندگی دیتا ہے۔

گھر کی تیسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر مختلف قسم کے ذخائر اور اموال و امتعہ رکھتا ہے اس نقطۂ نگاہ سے بھی یہی گھر ہے جو رُوحانی برکات کے ذخائر اپنے اندر محفوظ رکھتا ہے۔ کیونکہ اور ذخائر تو خواہ کتنے بھی قیمتی ہوں ضائع ہو جاتے ہیں لیکن جو وقت عبادتِ الٰہی میں خرچ ہوتا ہے۔ وہ ضائع نہیں جاتا بلکہ ایک ایک لمحہ جو ذکرِ الٰہی اور عبادت میں بسر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے ہزاروں ہزار انعامات کے ذخائر کی صورت میں محفوظ رکھتا اور اپنے بندے کو اس سے متمتع فرماتا ہے۔

گھر کی چوتھی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ رشتہ داروں کے جمع ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ یہ خصوصیت بھی خانہ کعبہ میں بدرجہ اَتَم پائی جاتی ہے۔ کیونکہ تمام دنیا کے مسلمان وہاں ہر سال حج کیلئے جمع ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے مل کر اپنے ایمان تازہ کرتے ہیں۔ اور پھر اس لحاظ سے بھی

خانہ کعبہ سب لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے کہ وہ جگہ جہاں انسان اپنے تمام رشتہ داروں سے مل سکیگا صرف جنت ہے اور جنت کا ظلّ مسجد ہوتی ہے جس میں پانچوں وقت تمام مسلمان جمع ہو کر خدا تعالےٰ کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں اور ایکدوسرے کے حالات سے بھی باخبر رہتے ہیں۔ پھر گھر کی یہ خصوصیت کہ اس میں انسان کو ہر قسم کا امن حاصل ہوتا ہے یہ بھی خانہ کعبہ کو میسر ہے۔ کیونکہ امن اسی صورت میں میسر آتا ہے جب تمام جھگڑے مٹ جائیں اور خانہ کعبہ ہی ایک ایسا مقام ہے جو توحید کا مرکز ہونے کی وجہ سے تمام دنیا کو ایک نقطۂ اتحاد پر جمع کرنے کا ذریعہ ہے۔ غرض خانہ کعبہ ہی حقیقی اور کامل گھر ہے جس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک گھر میں پائی جانی چاہئیں۔

مَثَابَةً لِّلنَّاسِ: مثابہ کے معنے تفرقہ کے بعد اکٹھے ہونے کی جگہ کے ہیں۔ اس میں بتایا کہ بیت اللہ کا قیام اس لئے عمل میں آیا ہے کہ ساری دنیا کو ایک مرکز پر جمع کر دیا جائے اور وہ لوگ جو متفرق ہو چکے ہیں اس گھر کے ذریعہ پھر اکٹھے کر دیئے جائیں۔ یعنی ایک عالمگیر مذہب کا اس کے ساتھ تعلق ہے اور ساری دنیا کو یہ گھر جمع کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مختلف انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں اتحاد پیدا کیا ہے۔ مگر جہاں وہ ایک ایک قوم کے درمیان اتحاد پیدا کرتے وہاں دنیا میں اختلاف بھی پیدا کرتے تھے جیسے بنی اسرائیل کے لئے ضروری تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چلیں۔ حضرت کرشنؑ کے متبعین کے لئے ضروری تھا کہ ان کے پیچھے چلیں۔ ایرانیوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ زرتشتؑ کے پیچھے چلیں۔ اس طرح اگر انہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم میں اتحاد پیدا کیا تو دوسری طرف مختلف ممالک کے درمیان اختلاف بھی پیدا کر دیا۔ یہ صرف خانہ کعبہ ہی ہے جسے یہ خصوصیت حاصل ہے کہ تمام قوموں کو ایک مرکز پر جمع کرنے والا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ فرمایا کہ آپ ساری دنیا کی طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ اور پھر آپ نے یہ بھی دعویٰ فرمایا کہ تمام متفرق قوموں اور جماعتوں کو میرے ذریعے دین واحد پر اکٹھا کر دیا جائیگا۔ دیکھو کیسی عجیب رنگ میں اور کس شان و شوکت سے یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔ آخر مختلف اقوامِ عالم کے ایک جگہ جمع کر دینے کی خبر سوائے خدا کے اور کون دے سکتا تھا اور آئندہ جو کچھ مقدر ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ خدا تعالےٰ میرے ذریعے سب قوموں کو اکٹھا کر دیگا۔ اور ایک وقت ایسا آئیگا کہ اشرار چوہڑوں اور چماروں کی طرح رہ جائیں گے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"شیطان نے آدمؑ کو مارنے کا منصوبہ کیا تھا اور اس کا استیصال چاہا تھا۔ پھر شیطان نے خدا سے مہلت چاہی۔ اور اُس کو مہلت دی گئی۔ اِلٰی وَقْتٍ مَّعْلُوْمٍ (یعنی ایک معلوم وقت تک) بسبب اسی مہلت کے کسی نبی نے اس کو قتل نہ کیا۔ اُس کے قتل کا وقت ایک ہی مقرر تھا کہ وہ مسیح موعودؑ کے ہاتھ سے قتل ہو۔ اب تک وہ ڈاکوؤں کی طرح پھرتا رہا۔ لیکن اب اُس کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے۔ اب تک اخیار کی قلت اور اشرار کی کثرت تھی لیکن اب شیطان ہلاک ہوگا اور اخیار کی کثرت ہوگی اور اشرار چوہڑے چماروں کی طرح ذلیل بطور نمونہ کے رہ جائیں گے۔"

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۴ مؤرخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

میرے نزدیک اس پیشگوئی کے کامل طور پر پورے ہونے کا زمانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا زمانہ ہی ہے کیونکہ بنو اسحاق اور بنو اسمٰعیل دونوں کی شاخیں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود میں آکر مل گئی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تیرہ سو سال کے بعد یہ پیشگوئی پوری ہو رہی ہے اور یورپ امریکہ افریقہ آسٹریلیا ہندوستان اور دیگر ممالک کے باشندے یعنی چینی جاوی سماٹری ایرانی عیسائی ہندو مغل پٹھان راجپوت غرضیکہ ہر مذہب و ملت کے لوگ اسلام اور احمدیت کو قبول کر رہے ہیں۔ اور یہ پیشگوئی بھی ثابت ہو رہی ہے کہ بیت اللہ کو ہم نے متفرق لوگوں کو ایک جگہ پر جمع کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

اَمْنًا: دوسری پیشگوئی یہ فرمائی کہ (۱) یہ مقام امن والا ہوگا۔ یعنی اسے دوسروں سے ہمیشہ محفوظ رکھا جائیگا۔ (۲) یہ مقام لوگوں کو امن دینے والا ہوگا۔ اور چونکہ حقیقی امن اطمینانِ قلب سے حاصل ہوتا ہے اس لئے اَمْنًا کے تیسرے معنے یہ بھی ہیں کہ اطمینانِ قلب بخشنے والا۔ اطمینانِ قلب کے لحاظ سے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے باہر انسان کو اطمینانِ قلب کہیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی موٹی مثال یہ ہے کہ اسلام دلیل سے اپنی بات منواتا ہے جبکہ دوسرے مذاہب دلیل کی بجائے جبر اور تحکم سے کام لیتے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ جو شخص بغیر دلیل کے کوئی بات مانتا ہے اس کے ایمان کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرواتا ہے کہ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (یوسف آیت ۱۰۹) یعنی میں جس تعلیم کو پیش کرتا ہوں اُسے دلائل سے مانتا ہوں اور میرے متبعین بھی اُسے دلائل سے مانتے ہیں۔ پس میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں تم کہتے ہو کہ فلاں بات مان لو ورنہ جہنم میں جاؤ گے لیکن میں جو کہتا ہوں اس کے ساتھ اس کی معقولیت کی دلیل بھی دیتا ہوں کیونکہ اس کے بغیر اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

پھر اطمینانِ قلب کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ مشاہدہ یعنی اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہو جانا ہے۔ اگر یہ بات کسی انسان کو حاصل ہو جائے تو اُسے کوئی چیز پریشان نہیں کر سکتی۔ اسلام خانہ کعبہ سے تعلق رکھنے والوں کو اس کی بھی خوشخبری دیتا ہے اور فرماتا ہے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (سورۃ فجر) یعنی اے نفسِ مطمئنّہ! اپنے ربّ کی طرف اس حالت میں لوٹ کر تُو اس سے خوش ہے اور وہ تجھ سے خوش۔ پس آ اور میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ آ۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ یُوں تو سب مذاہب کے پیرو کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے مطابق عمل کرو تو تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ مگر اسلام یہ نہیں کہتا کہ تمہیں صرف مرنے کے بعد جنّت ملے گی۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ میں اسی دنیا میں تمہیں خدا دکھا دیتا ہوں جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میں حق پر ہوں۔ وہ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حٰمٓ سجدۃ : ۳۱) یعنی وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر مستقل مزاجی سے اس عقیدہ پر قائم ہو گئے اُن پر ملائکہ یہ کہتے ہوئے نازل ہوتے ہیں کہ ڈرو نہیں اور نہ کسی پچھلی کوتاہی کا غم کرو اور اس جنّت کے ملنے سے خوش ہو جاؤ۔ جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

غرض اسلام اطمینانِ قلب پیدا کرنے کا مدعی ہے جبکہ اور کوئی مذہب اس کا دعویٰ نہیں کرتا۔

اَمْنًا کے دوسرے معنے امن میں آنے والے کے ہیں۔ یہ معنے بھی خانہ کعبہ پر چسپاں ہوتے ہیں۔ کیونکہ دشمنوں کے بار بار کے منصوبوں کے باوجود یہ مقام خدا تعالیٰ کی مدد سے

محفوظ چلا آتا ہے حکومتوں کے بعد حکومتیں بدلیں اور ملکوں کے بعد ملک برباد ہوئے لیکن بیت اللہ دشمنوں کے حملوں سے محفوظ اور مقام امن ہی رہا۔ پھر دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس کا معبد ہمیشہ اسکے قبضہ میں رہا ہو۔ صرف اہلِ اسلام کا مقدس معبد ہمیشہ سے اس کے قبضہ میں رہا ہے۔ یروشلم جو یہودیوں اور مسیحیوں کا متبرک مقام ہے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ ہردوار اور بنارس جو ہندوؤں کے متبرک مقامات ہیں چھ سات سو سال تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہے اور پھر انگریزوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ اسی طرح گیا جو بدھوں کا متبرک مقام ہے۔ پہلے مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ پھر انگریز اس پر قابض ہوئے اور اب ہندوؤں کا اس پر قبضہ ہے یہی حال چینیوں کا ہے۔ ان کے معبد کبھی کسی کے قبضہ میں رہے اور کبھی کسی کے قبضہ میں۔ مگر خانہ کعبہ صرف مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہا اور کبھی کوئی غیر حکومت اُسے اپنے قبضہ میں لینے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ پس یہ ہمیشہ مقامِ امن ہی رہا۔

امن دینے کے لحاظ سے جو خانہ کعبہ کو خصوصیت حاصل ہے اس کی مثال بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ وہاں ہر چیز کو امن حاصل ہے۔ یہاں تک کہ جانوروں کو بھی امن حاصل ہے اور ان کا شکار منع ہے بلکہ درختوں کا کاٹنا تک منع ہے۔ سوائے اِذخر گھاس کے۔ انسانوں کو یہ امن حاصل ہے کہ حدودِ حرم میں لڑائی ممنوع ہے اور پھر انسان کو تقویٰ اور روحانیت کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت حاصل ہوتی ہے وہ مزید براں ہے۔ مگر تعجب ہے کہ وہی گھر جسے خدا نے امن دینے والا قرار دیا ہے اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ ایسے جہاد کے قائل ہیں جو دنیا میں کسی کو پناہ نہیں دیتا عجیب تماشہ ہے کہ جس مذہب کو امن والا کہا گیا تھا اُسی کو فساد والا قرار دیا جاتا ہے اور اس طرح اضداد کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم لوگوں کو بتائیں کہ اسلام میں کوئی جبر نہیں۔ وہ اپنے اندر امن کی تعلیم رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی امن دیتا ہے اور اسی مقصد کے لئے خانہ کعبہ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

غرض فرمایا کہ تم اس وقت کو یاد کرو۔ جب ہم نے اس گھر یعنی خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے مثابہ بنایا۔ یعنی تمام دنیا کے لئے نسل اور قومیت کے امتیاز کے بغیر اور ملک اور زبان کے امتیاز کے بغیر اس کے دروازے کھلے رکھے گئے ہیں۔ اسی طرح مثابہ اس منڈیر کو بھی کہتے ہیں جو کنوئیں کے اردگرد بنائی جاتی ہے اور جس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ جب زور کی ہوا چلے تو کوڑا کرکٹ اور گوبر وغیرہ اُڑ کر اندر نہ چلا جائے یا کوئی اور گندی چیز کنوئیں کے پانی کو خراب نہ کر دے۔ اسی طرح منڈیر سے یہ غرض بھی ہوتی ہے کہ کوئی شخص غلطی سے کنوئیں میں نہ گر جائے۔ غرض منڈیر کا مقصد کنوئیں کو بُری چیزوں اور لوگوں کو گرنے سے بچانا ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے خانہ کعبہ کو ایک تو اس غرض کے لئے بنایا ہے کہ دنیا کے چاروں طرف سے لوگ اس جگہ آئیں اور یہاں آ کر دینی تربیت اور اعلیٰ اخلاق حاصل کریں اور دوسرے ہم نے خانہ کعبہ کو اس لئے بنایا ہے تاکہ وہ دنیا کے لئے منڈیر کا کام دے اور ہر قسم کی بُرائیوں اور شر سے لوگوں کو محفوظ رکھے۔ تیسرے ہم نے اسے امن کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ گویا جس طرح قلعہ اس لئے بنایا جاتا ہے تاکہ فوج وہاں جمع ہو کر اپنے نظام کو مضبوط کر سکے اسی طرح خدا تعالیٰ نے بیت اللہ کو لوگوں کے جمع ہونے کا مقام بنایا ہے۔ اور جس طرح قلعہ کی یہ غرض ہوتی ہے کہ ناپسندیدہ عناصر اندر نہ آسکیں اسی طرح

بیت اللہ کو خدا نے منذیر بنایا ہے تاکہ غیر پسندیدہ عناصر اس سے دُور رہیں پھر قلعہ کی تیسری غرض ارد گرد کے علاقہ کی حفاظت کر کے امن قائم رکھنا ہوتی ہے۔ یہ غرض بھی بیت اللہ میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اَمْنًا کہکر اسی امر کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسے قیام امن کے لئے بنایا گیا ہے۔ گویا بیت اللہ قیام کا مرکز بھی ہے۔ غیر پسندیدہ عناصر کو دُور کرنیکا ذریعہ بھی ہے اور دنیا کے امن کے قیام کا سبب بھی ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ اس آیت میں مِنْ یا تو تاکید کیلئے آیا ہے یا تمیز کیلئے اور وَاتَّخِذُوْا سے پہلے قُلْنَا یا اَمَرْنَا محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم نے کہا یا ہم نے حکم دیا کہ تم تذلّل کے ساتھ مقام ابراہیم کو عبادت گاہ بناؤ۔ یا جہاں انہوں نے خانہ کعبہ کو بنانے کیلئے قیام کیا تھا اس میں کسی جگہ نماز پڑھو۔ یا یہ کہ ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ پر یعنی جہاں وہ عبادت کرتے تھے تم بھی طواف کے بعد اس شکریہ میں کہ خدا نے اس گھر کو دنیا کے جمع کرنے اور امن کو قائم کرنے کا ذریعہ بنایا ہے نماز پڑھو۔

مقام ابراہیم کعبہ کے پاس ایک خاص جگہ ہے جہاں طواف بیت اللہ کے بعد مسلمانوں کو دو سنتیں پڑھنے کا حکم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ کے بعد اسجگہ شکرانہ کے طور پر نماز پڑھی تھی اور اس سنت کو جاری رکھنے کے لئے وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى میں جس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے۔ کہ عبادت اور فرمانبرداری کے جس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے تم بھی اسی مقام پر اپنے آپ کو کھڑا کرنے کی کوشش کرو۔ لوگ غلطی سے مقام ابراہیمؑ سے مراد صرف جسمانی مقام سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ ابراہیمؑ کا اصل مقام وہ مقامِ اخلاص اور مقامِ تقوٰی تھا جس پر کھڑے ہو کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ گویا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اُسی رنگ میں دین کے لئے قربانیاں بجا لاؤ جس رنگ میں ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی اور جس رنگ میں ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے لئے قربانیاں کیں۔ پس یہاں مقام ابراہیم سے مراد کوئی جسمانی مقام نہیں بلکہ روحانی مقام مراد ہے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ تم نے میرے مقام کو نہیں پہچانا۔ اب اگر کوئی شخص یہ الفاظ کہے تو دوسرا شخص یہ نہیں کرتا کہ اُسے دھکا دے کر پرے پھینک دے اور کہے کہ تم جس مقام پر کھڑے تھے وہ تو میں نے دیکھ لیا ہے۔ ہمیشہ ایسے الفاظ سے درجہ کی بلندی مراد ہوتی ہے۔ پس وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کے یہی معنے ہیں کہ ابراہیمؑ نے جس اخلاص اور جس محبّت اور جس تقوٰی اور جس انابت الی اللہ سے نیکیوں میں حصّہ لیا تھا تم بھی اُسی مقام پر کھڑے ہو کر ان نیکیوں میں حصّہ لو تاکہ تمہیں بھی ابراہیمی مقام حاصل ہو۔ اگر مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کے یہی معنے ہوں کہ ہر شخص اُن کے مصلّٰی پر جا کر کھڑا ہو۔ تو یہ تو قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اوّل تو یہ جھگڑا رہتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں نماز پڑھی تھی یا وہاں۔ اور اگر بالفرض یہ یقینی طور پر پتہ لگ بھی جاتا کہ انہوں نے کہاں نماز پڑھی تھی تو بھی ساری دنیا کے مسلمان وہاں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ صرف حج میں ایک لاکھ سے زیادہ حاجی شامل ہوتے ہیں۔ اگر جلدی جلدی بھی نماز پڑھی جائے۔ تب بھی ایک شخص کی نماز پر دو منٹ صرف آئینگے اس کے معنے یہ ہوئے کہ ایک گھنٹہ میں تیس اور چوبیس گھنٹہ میں سات سو بیس آدمی وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ باقی جو ۹۹۲۸۰ رہ جائیں گے وہ کیا کرینگے اور باقی مسلم دنیا کیلئے تو کوئی صورت ہی ناممکن ہوگی۔ پس اگر اس حکم کو ظاہر پر محمول کیا جائے

تو اس پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر ایسی صورت میں فسادات
کا بھی احتمال رہتا ہے۔ بلکہ ایک دفعہ تو محض اسی جھگڑے
کی وجہ سے مکہ میں ایک قتل بھی ہو گیا تھا۔ پس اِس
آیت کے یہ معنے نہیں۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیم
علیہ السلام نے جس مقامِ اخلاص پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ
کی عبادت کی تھی تم بھی اُسی مقام پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ
کی عبادت کرو۔

پھر اس حکم میں اللہ تعالیٰ نے اِنِّیْ جَاعِلُکَ
لِلنَّاسِ اِمَامًا کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اور یہ
ہدایت دی ہے کہ تمہارا بھی ایک امام ہونا چاہیئے تاکہ
اس طرح سنّتِ ابراہیمی تم میں زندہ رہے۔ درحقیقت
ان دونوں آیات میں دو اماموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے
فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ اے ابراہیم
میں تجھے امام بنانے والا ہوں۔ اس پر ابراہیم علیہ السلام نے
عرض کیا کہ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اے خدا! میری ذریت کو
بھی اس مقام سے سرفراز فرما۔ کیونکہ اگر میں مر گیا تو کام
کس طرح چلیگا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تیری اولاد میں سے
تو ظالم بھی ہونے والے ہیں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ
ان ظالموں کے سپرد یہ کام کیا جائے۔ ہاں ہم تمہاری
اولاد کو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ سنتِ ابراہیمی کو ہمیشہ قائم
رکھیں جو لوگ ایسا کرینگے ہم اُن میں سے امام بناتے
جائیں گے اور وہ خدا تعالیٰ کے تازہ بتازہ انعامات سے
حصّہ لیتے چلے جائیں گے۔ پس اس رکوع میں اللہ تعالیٰ
نے دو اماموں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک امامتِ نبوت کا
جو خدا تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ملتی ہے اور دوسری
امامتِ خلافت کا جس میں بندوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔
اور جس کی طرف وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی
میں اشارہ کیا گیا ہے اور بنی نوع انسان کو یہ ہدایت
کی گئی ہے کہ جب امامتِ نبوت نہ ہو تو اُن کا فرض ہے
کہ وہ امامتِ خلافت کو اپنے اندر قائم رکھا کریں۔

پھر وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی
میں دنیا کے تمام اہم مقامات اور شہروں میں ایسے تبلیغی
مراکز قائم کرنے کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے جو خانہ کعبہ
کی ظلّیت میں اشاعتِ اسلام کے مراکز ہوں۔ اور
جہاں بیٹھ کر عبادتِ الٰہی کو قائم کیا جائے اور توحید
کی اشاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو
مخاطب کرتا اور انہیں فرماتا ہے کہ اے لوگو جو خانہ کعبہ
کے شیدائی بنتے ہو۔ جو بیت اللہ کی محبت کا دم بھرتے
ہو۔ تم ہر ایک چیز جو تمہیں پسند آتی ہے اس کی تصویر
اپنے گھروں میں رکھنا پسند کرتے ہو۔ اگر کوئی پھل تمہیں
پسند ہو تو تم اُسے اپنے گھر لاتے اور اپنے بیوی بچوں
کو کھلانے کی کوشش کرتے ہو۔ جب تم بازار میں خربوزہ
دیکھ کر اُسے اپنے گھر میں لاتے ہو۔ جب تم کسی اچھے
نظارہ کو دیکھتے ہو تو اس کی تصویر کھینچتے اور اپنے
بیوی بچوں کو بھی دکھاتے ہو تو کیا وجہ ہے کیا سبب ہے،
اور اس میں کونسی معقولیت ہے کہ تم اپنے مونہوں سے تو
خانہ کعبہ کی تعریفیں کرتے ہو۔ اپنے مونہوں سے تو خانہ کعبہ
کے احترام کا اظہار کرتے ہو لیکن تم ایک خربوزے کو تو گھر
میں لانے کی کوشش کرتے ہو۔ تم تاج محل کو دیکھتے ہو تو
اس کی تصویر لینے کی کوشش کرتے ہو مگر تم خانہ کعبہ کے
ظلّ کو اپنے ملک اور اپنے علاقہ میں لانیکی کوشش نہیں کرتے۔

خانہ کعبہ کیا ہے؟ ایک گھر ہے جو خدا تعالیٰ کی
عبادت کے لئے وقف ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ساری
دنیا کے انسان خانہ کعبہ میں نہیں جا سکتے۔ پس جس طرح
خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ابراہیم کی نقلیں دنیا میں پیدا
ہوں اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم خانہ کعبہ کی
نقلیں بناؤ جس میں تم اور تمہاری اولادیں اپنی زندگیاں
دین کی خدمت کے لئے وقف کر کے بیٹھ جائیں جس طرح

لوگ جو ابراہیمؑ کے نمونہ پر چلیں گے۔ ابراہیمؑ کی اولاد اور اس کا ظل ہونگے۔ اسی طرح یہ نقلیں خانہ کعبہ کی اولاد ہونگی۔ خانہ کعبہ کی ظل اور اس کا نمونہ ہوں گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک خانہ کعبہ کے ظل دنیا کے گوشہ گوشہ میں قائم نہ کر دیئے جائیں اس وقت تک دین کبھی پھیل ہی نہیں سکتا۔ یہی فرماتا ہے وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى اے بنی نوع انسان! ہم تم کو توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی ابراہیمی مقام پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادتیں کرو۔ یعنی ایسے مراکز بناؤ جو دین کی اشاعت کا کام دیں کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی کامل اشاعت کبھی نہیں ہو سکتی۔

وَعَهِدْنَا اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ

اب بتاتا ہے کہ وہ مقام ابراہیم کیا چیز ہے؟ فرماتا ہے۔ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو بڑی تاکیدی نصیحت کی تھی۔ عَهِدَ بِهٖ کے معنے ہوتے ہیں اس نے اس کے ساتھ عہد کیا۔ یعنی عَهِدَ کے ساتھ جب اِلٰی کا صلہ آئے تو اسکے معنے ہوتے ہیں کہ نصیحت کرنا یا وصیت کرنا۔ پس فرمایا۔ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو بار بار نصیحت کی تھی اور بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی اور تاکیدی حکم دیا اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک کرو اور اسے ہر قسم کے عیبوں اور خرابیوں سے بچاؤ۔ لِلطَّآئِفِيْنَ ان لوگوں کیلئے جو اِس کے اردگرد طواف کرنیوالے ہیں یا اُن لوگوں کے لئے جو اسجگہ بار بار آنے والے ہیں۔ وَالْعٰكِفِيْنَ اور ان لوگوں کے لئے جو اعتکاف کیلئے آئیں۔ یا اپنی زندگی وقف کر کے یہیں بیٹھ جائیں۔ طائفین وہ لوگ ہیں جو کبھی کبھی آئیں اور عاکفین وہ ہیں جو اپنی زندگی اِس گھر کے لئے وقف کر دیں۔ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور ان لوگوں کے لئے جو خدا تعالیٰ کی توحید کے قیام کے لئے کھڑے رہتے ہیں اور اس کی فرمانبرداری میں اپنی ساری زندگی خرچ کرتے ہیں۔ یا ان لوگوں کے لئے جو رکوع و سجود کرتے ہیں۔ اسجگہ رکوع و سجود سے ظاہری اور قلبی دونوں رکوع و سجود مراد ہیں۔ یعنی وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ سے وہ لوگ بھی مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے اور اس کے حضور رکوع اور سجدہ کرنے والے ہوں۔ اور وہ لوگ بھی مراد ہیں جو خدا تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھنے والے ہوں اور جو اس کے کامل فرمانبردار ہوں۔ اسی طرح تطہیر کے بھی دونوں مفہوم ہیں۔ اس سے مراد ظاہری صفائی بھی ہے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ مساجد کو صاف رکھو اور ان میں عود وغیرہ جلاتے رہو۔ اور اس سے باطنی صفائی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ یعنی مسجد کی حرمت کا خیال رکھو۔ اور اس میں بیٹھنے کے بعد لغویات سے کنارہ کش رہو۔ افسوس ہے کہ آجکل مساجد میں ذکر الٰہی کرنے کی بجائے لوگ اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتے رہتے ہیں حالانکہ مسجدیں خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں۔ بیشک ضرورت محسوس ہونے پر منظم طور پر سیاسی قضائی اور تمدنی امور پر بھی مساجد میں گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن مساجد میں بیٹھ کر گپیں ہانکنا اور اِدھر اُدھر کی فضول باتیں کرنا سخت ناپسندیدہ امر ہے۔ نوجوانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں محتاط رہنا چاہیئے۔

طَهِّرَا بَيْتِيَ میں اِس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ میں لوگوں نے اس کے اندر بُت رکھ دینے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان بُتوں کو نکالو اور بیت اللہ کو پاک و صاف کرو۔ لُغت کی رُو سے بھی نجاست ظاہری اور باطنی دونوں کو دُور کرنے کے لئے تطہیر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بیت اللہ کی تطہیر کی اور تین سو ساٹھ بتوں سے اس کو پاک کر دیا۔ آپ کا یہ فعل اسی وصیت کے مطابق تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کو

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا

اور (اُس وقت کو بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ اے میرے رب! اِس (جگہ) کو ایک پُر امن شہر بنا دے -

وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ

اور اِس کے باشندوں میں سے جو بھی اللہ پر اور آنے والے دن پر ایمان لائیں انہیں

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا

(ہر قسم کے) پھل عطا فرما - (اِس پر اللہ نے) فرمایا - اور جو شخص کفر کرے اُسے بھی میں تھوڑی مدت تک فائدہ پہنچاؤنگا

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٢٧﴾

پھر اُسے مجبور کرکے دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤنگا اور (یہ) بہت بُرا انجام ہے - ۱۴۳

فرمائی تھی کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ - یہ سورۃ ہجرت کے بعد نازل ہوئی تھی اور وہ ایسا وقت تھا کہ مسلمان مدینہ میں بھی محفوظ نہ تھے مگر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام دنیا جو اِس وقت متفرق ہے وہ اس مرکز پر جمع ہو جائے گی چنانچہ دیکھ لو۔ اب ساری دنیا سے لوگ حج کیلئے جاتے ہیں اور ادھر مُنہ کرکے نماز پڑھتے ہیں - اِس سے بڑھکر آپ کی صداقت کا اور کیا نشان ہو سکتا ہے -

۱۴۳ حل لغات :- ثَمَرٰت کا لفظ بالعموم نتائج کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے - اسی طرح ثمرات تازہ بتازہ پھلوں کو بھی کہتے ہیں -

اَضْطَرُّهٗ : اِضْطَرَّهٗ اِلَيْهِ کے معنے ہیں اَحْوَجَهٗ وَاَلْجَاَهٗ اِلَيْهِ کسی چیز کو گھیر گھار کر اور مجبور کرکے ایک طرف سے دوسری طرف لے جانا - اس لحاظ سے آیت کے معنے یہ ہیں کہ میں اُن کو گھیر گھار کر جہنم کی طرف لے جاؤنگا۔

تفسیر: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے بیت اللہ کو مرجع خلائق اور امنِ عالم کا گہوارہ بنایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور جُھک گئے اور انہوں نے دُعا کی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا - کہ اے خدا تُو نے جو یہ کہا ہے کہ طواف اور رکوع و سجود کرنے والے لوگ یہاں آئیں گے تو اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں آبادی ہوگی - پس میں تجھ سے دُعا کرتا ہوں کہ تو اس جگہ کو بَلَدًا اٰمِنًا بنا دے - یہاں کی آبادی خوب بڑھے اور پھولے پھلے - اور یہ ایک پُرامن شہر ہو - فتنہ و فساد اور لڑائیوں کی آماجگاہ نہ ہو - جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دُعا کی تھی - اُس وقت مکہ کوئی شہر نہیں تھا - صرف چند جھونپڑیاں تھیں جو ایک بے آب و گیاہ وادی میں نظر آتی تھیں - لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا یہ کی کہ یہ زمین جو ویران پڑی ہوئی ہے اسے ایک شہر بنا دے - عام طور پر جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ اس کے یہ معنے کیا کرتے ہیں کہ اس شہر کو امن والا بنا دے - حالانکہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہی منشا ہوتا تو آپ هٰذَا بَلَدًا کہنے کی بجائے هٰذَا الْبَلَدَ فرماتے مگر آپ هٰذَا الْبَلَدَ

ثمرٰت

اَضْطَرُّهٗ

نہیں کہتے بلکہ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا کہتے ہیں۔ پس یہ شہر کے بنانے کی دُعا ہے۔ شہر کو کچھ اور بنانے کی دعا نہیں۔ وہ فرماتے ہیں رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا اے میرے رب بنا دے اس ویران زمین کو بَلَدًا ایک شہر اٰمِنًا۔ مگر شہروں کے ساتھ فتنہ و فساد کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ جب لوگ مل کر رہتے ہیں تو لڑائیاں بھی ہوتی ہیں۔ جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ فسادات بھی ہوتے ہیں اور پھر شہروں کو فتح کرنے کیلئے حکومتیں بھی حملہ کرتی ہیں یا بعض شہر جب بڑے ہو جائیں تو اُن کے رہنے والے اپنا نفوذ بڑھانے کے لئے دوسروں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہ سارے خطرات شہروں سے وابستہ ہوتے ہیں اس لئے میں تجھ سے یہ دُعا کرتا ہوں کہ تو اِسے امن والا بنائیو۔ نہ کوئی اس پر حملہ کرے اور نہ یہ کسی اَور پر حملہ کرے تاکہ خانہ کعبہ کے قیام کا جو مقصد ہے وہ صحیح رنگ میں پورا ہو سکے۔ گویا جس امن کی پیشگوئی خانہ کعبہ کے متعلق تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاہا کہ وہ اس جگہ آباد ہونے والے شہر کی طرف بھی منتقل ہو جائے۔ درحقیقت خانہ کعبہ کی حرمت تو خدا تعالیٰ نے خود قائم فرمائی تھی۔ مگر مکہ مکرمہ کی حرمت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے قائم ہوئی۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا تھا۔ اور میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دُعا میں مَثَابَۃ کا لفظ چھوڑ دیا ہے اور صرف امن کی دُعا مانگی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک زائد دُعا کی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس گھر کے ساتھ ایک شہر بھی بن جائے اور وہ بھی امن والا ہو۔ اور محض کسی شہر میں آنا ثواب کا موجب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے انہوں نے اس حصّہ کو چھوڑ دیا کیونکہ عبادت اور ثواب صرف خانہ کعبہ سے تعلق رکھتا ہے مکہ سے نہیں۔ پس آپ نے مَثَابَۃ کو چھوڑ دیا اور امن کی دُعا کو لے لیا۔ جو خانہ کعبہ کیلئے بھی ضروری تھی۔ اور اس کے ارد گرد آباد ہونے والوں کے لئے بھی ضروری تھی۔ اس دُعا سے معلوم ہو سکتا ہے کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کے کلام کو پورا کرنے کے کس قدر حریص ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کے لئے کیا کیا کوششیں کرتے ہیں۔ بعض لوگ نادانی سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر فلاں الہام خدا تعالیٰ کا تھا تو مرزا صاحب نے اس کے پورا کرنے کی کیوں کوشش کی؟ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدائی کلام کے پورا کرنے کے لئے اُس کے معاً بعد دُعائیں کرنی شروع کر دیں حالانکہ جب خدا تعالیٰ فرما چکا تھا کہ اس گھر کو عاکفین کے لئے صاف ستھرا رکھو۔ تو اس کے معنے یہ تھے کہ یہاں لوگ مقیم بھی ہونگے اور باہر سے بھی آئیں گے۔ گویا اِس لفظ میں ایک شہر بن جانے کی خبر دیدی گئی تھی۔ پھر جو بات خدا تعالیٰ پہلے ہی منظور کر چکا تھا اس کے متعلق دُعا کرنے کے کیا معنے تھے؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ خدا تعالیٰ جو خبر دیتا ہے اس کے متعلق مومنوں کا بھی یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اُسے پُورا کرنے کی کوشش کریں اور اُن کی طرف سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے دُعائیں کرتے ہیں کہ اُن کی غفلت کی وجہ سے وہ وعدہ ٹل نہ جائے۔ پھر دُعا کے ساتھ دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ظاہری سامان مہیّا کرتے ہیں۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ جب حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السلام وہاں بس گئے۔ اور زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا تو انہی دنوں وہاں سے ایک قافلہ گزرا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں پانی کا وافر انتظام ہے تو انہوں نے حضرت ہاجرہؓ سے وہاں سکونت اختیار کرنے کی اجازت لی۔ حضرت ہاجرہؓ نے

اُن کی اِس درخواست کو قبول فرما لیا۔ اور انہیں وہاں پر رہائش کی اجازت دے دی۔ یہ مکّہ کی آبادی کی دوسری تدبیر تھی کہ قافلہ والوں کو رہائش کے لئے زمین دے دی گئی تاکہ وہ بات پوری ہو۔ جو خدا تعالیٰ نے فرمائی تھی کہ ہم نے اِس مقام کو مثابہ بنایا ہے۔ پس وہ لوگ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے فلاں بات کو پورا کرنے کی کیوں کوشش کی وہ درحقیقت کلامِ الٰہی کی حقیقت سے آگاہ نہیں۔ خدا تعالیٰ کے بندوں کا سب سے بڑا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن باتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کریں جن کے متعلق خدا تعالیٰ نے خبر دی ہو اور کہا ہو کہ ایسا ہو جائیگا۔ اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کو کسی کی مدد کی کیا ضرورت ہے تو یہ اعتراض صرف اس پیشگوئی پر ہی نہیں پڑے گا بلکہ ہر بات پر پڑیگا خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (ذاریات: ۵۷) یعنی میں نے جنّ و انس کو صرف اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔ اب اگر خدا تعالیٰ کی بات پوری کرنے کے لئے کوئی تدبیر کرنا جائز نہیں تو لوگوں کو نمازوں کی تلقین بھی چھوڑ دینی چاہیئے اور کہنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ خود لوگوں سے نمازیں پڑھوا لیگا ہم اس کے لئے کیوں کوشش کریں۔ اسی طرح فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر: ۱۰) یعنی ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اِس کی حفاظت کرینگے۔ اب اگر یہ درست ہے کہ خدائی وعدوں کو پورا کرنے کے لئے کوشش نہیں کرنی چاہیئے تو قرآن کریم کا حفظ کرنا بھی چھوڑ دینا چاہیئے کہ یہ خدا تعالیٰ کے وعدہ کی بے حرمتی ہے۔ اِسی طرح قرآن کریم کا چھاپنا بھی بند کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ ہم ہی اِس کی حفاظت کرینگے پھر ہم اسے کیوں چھاپیں۔ غرض یہ ایک احمقانہ خیال ہے جسے کوئی معقول انسان تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔

بہر حال اس آیت سے یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کوئی بات کہے تو مومنوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسے پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اور کوشش سے کام لیں اور اُس وقت تک صبر نہ کریں جب تک کہ خدا تعالیٰ کی بات پوری نہ ہو جائے۔

دوسرا امر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندے کو ہمیشہ الٰہی منشاء کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیئے اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ یعنی تیری اولاد میں کچھ ظالم لوگ بھی پیدا ہونے والے ہیں۔ جن سے میرا کوئی عہد نہیں ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی احتیاط دیکھو کہ انہوں نے فوراً اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیا اور جب مکّہ والوں کے لئے دُعا کی تو عرض کیا کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی اے خدا جو لوگ ان میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائیں تو اپنے فضل سے انہیں ہر قسم کے پھل عطا فرما گویا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ کی آواز سُنتے ہی انہوں نے منکرینِ توحید کو اپنی دُعا سے خارج کر دیا اور صرف اُن لوگوں تک اپنی دُعا کو محدود کر دیا جو خدا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہوں اور دُعا یہ کی کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ یعنی اے خدا میں تجھ سے ان کے لئے جعرات کی روٹی نہیں مانگتا۔ میں تجھ سے اُن کے لئے چاول نہیں مانگتا۔ میں تجھ سے اُن کیلئے زردہ اور پلاؤ نہیں مانگتا بلکہ میں یہ مانگتا ہوں کہ یہ جگہ جہاں گھاس کی ایک پتی بھی پیدا نہیں ہوتی اسجگہ دنیا بھر کے میوے آئیں اور یہ اُن میووں کو یہاں بیٹھ کر کھائیں تو روٹی دیگا تو میں نہیں مانوں گا کہ تُو نے اپنی خدائی کا ثبوت دیا۔ تو زردہ اور پلاؤ کھلائیگا تو میں نہیں مانونگا کہ تُو نے اپنی خدائی کا ثبوت دیا ہے۔ میں تیری خدائی

کا ثبوت تب مانوں گا۔ جب یہ مکہ میں بیٹھ کر چین اور جاپان اور یورپ اور امریکہ کے میوے کھائیں تب میں تسلیم کرونگا کہ تُو نے اپنی خدائی کا ثبوت دے دیا ہے۔ میں نے بندہ ہو کر ایک انتہائی قربانی کی ہے۔ اب اے خدا میں تیری خدائی کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اس رنگ میں کہ اس وادیٔ غیرذی زرع میں دنیا کا ہر بہترین پھل تو نہیں پہنچا۔ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کے اس چیلنج کو قبول کیا۔ اور اُس نے کہا اے ابراہیمؑ! تُو نے اپنی اولاد کو ایک وادیٔ غیرذی زرع میں لا کر بسایا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں نے اپنا بیٹا قربان کر دیا ہے۔ اب تُو بھی اپنی خدائی کا ثبوت دے۔ تُو نے کہا ہے کہ میں نے ایک عاجز بندہ ہو کر اپنی بندگی کا ثبوت دے دیا۔ اب اے خدا تُو بھی اپنی خدائی کا ثبوت دے اور تُو نے ثبوت یہ مانگا ہے کہ یہ نہ کمائیں۔ بلکہ بنی نوع انسان کمائیں اور انہیں کھلائیں۔ اور کھلائیں بھی معمولی چیزیں نہیں بلکہ دنیا بھر کے میوے اِن کے پاس پہنچیں۔ میں تیرے اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں اور میں اس وادیٔ غیرذی زرع میں جہاں گھاس کی ایک پتی بھی نہیں اُگتی تجھے ایسا ہی کر کے دکھاؤنگا۔ میں نے حج کے موقعہ پر خود اس کا تجربہ کیا ہے۔ میں نے مکہ مکرمہ میں ہندوستان کے گنے دیکھے ہیں۔ میں نے مکہ مکرمہ میں طائف کے انگور کھائے ہیں۔ میں نے مکہ مکرمہ میں اعلیٰ درجہ کے انار کھائے ہیں۔ گنّے کے متعلق تو مجھے یاد نہیں کہ میری طبیعت پر اس کے متعلق کیا اثر تھا لیکن انگوروں اور اناروں کے متعلق میں شہادت دے سکتا ہوں کہ ویسے اعلیٰ درجہ کے انگور اور انار میں نے اور کہیں نہیں کھائے۔ میں یورپ بھی گیا ہوں۔ میں شام بھی گیا ہوں۔ میں فلسطین بھی گیا ہوں۔ اٹلی کا ملک انگوروں کے لئے بہت مشہور ہے۔ یورپ کے لوگ کہتے ہیں کہ بہترین انگور اٹلی میں ہوتے ہیں۔ مگر میں نے اٹلی کے لوگوں سے کہا کہ مکہ کی وادیٔ غیرذی زرع میں ابراہیمی پیشگوئی کے ماتحت جو انگور میں نے کھائے ہیں وہ اٹلی کے انگوروں سے بہت زیادہ میٹھے اور بہت زیادہ لذیذ تھے۔ ہمارے اردگرد قندھار۔ کوئٹہ اور کابل کا انار مشہور ہے۔ مگر میں نے جو موٹا سُرخ شیریں اور لذیذ انار مکہ میں کھایا ہے اس کا سینکڑواں حصہ بھی قندھار اور کوئٹہ اور کابل کا انار نہیں۔ غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ اے خدا میں نے اپنی بندگی کا انتہائی ثبوت دیدیا ہے۔ اب تجھ سے میں درخواست کرتا ہوں کہ تُو بھی اپنی خدائی کا ثبوت دے اور وہ ثبوت میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ یہ نہ کمائیں بلکہ لوگ کما کر اِن کے پاس لائیں اور لائیں بھی معمولی چیزیں نہیں بلکہ دنیا بھر کے بہترین پھل اور میوے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ کی دُعا مانگ کر درحقیقت مکہ والوں کے لئے انتہا درجہ کے رزق کے لئے دُعا کر دی۔ کیونکہ مکہ میں ثمرات کا مہیا ہونا ناممکن تھا۔ وہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پھلوں کا دُور سے آنا ناممکن تھا۔ کیونکہ ثمرات کا تازہ بتازہ اور عمدہ ہونا ضروری ہوتا ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی کہ الٰہی یہ لوگ اِن چیزوں سے بھی محروم نہ ہوں۔ تاکہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم اِن ثمرات سے اس وجہ سے محروم ہیں کہ ہم دنیا سے کٹ کر صرف اس گھر کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ پس ایسی نازک اشیاء بھی یہاں پہنچ جائیں تاکہ دنیا پر حجت ہو کہ خدا تعالیٰ نے جنگل میں منگل کر دیا۔ چنانچہ اس ابراہیمی دُعا کی برکت سے ہر قسم کا تازہ بتازہ پھل مکہ والوں کو میسر آ رہا ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے۔ میں نے خود حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ میں نہایت شیریں انار دیکھے ہیں اور انگور ایسے اعلیٰ درجہ کے کھائے ہیں کہ اٹلی اور فرانس کا

انگور اس کے مقابلہ میں ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کابلی انگور
کے مقابلہ پر پنجابی انگور۔ غرضیکہ تمام اعلیٰ درجہ کی چیزیں
مکہ میں میسر آجاتی ہیں۔ ایک دفعہ حج کے موقعہ پر گرمی
کی شدت کی وجہ سے ایک بزرگ نے خواہش کی کہ اگر
برف ہوتی تو میں ستو پیتا۔ چنانچہ انہوں نے دعا کی
کہ الٰہی یہ تیرا گھر ہے اور تیرا وعدہ ہے کہ میں یہاں کے
رہنے والوں کو ہر قسم کا رزق عطا کروں گا۔ سو تو
اپنے فضل سے میرے لئے برف مہیا فرما دے۔ خدا تعالیٰ
نے اولے برسا دیئے جو لوگوں نے جمع کر لئے۔ اور
انہوں نے برف ڈال کر ستو پیئے۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ جو
لوگ یہاں رہیں گے ایسا نہ ہو کہ وہ یہ خیال کریں کہ
ہم خدا تعالیٰ کے گھر کی خدمت کی وجہ سے ان نعمتوں
سے جو دوسروں کو میسر ہیں محروم ہو گئے ہیں اس لئے
اے خدا تو انہیں ہر قسم کے اعلیٰ درجہ کے پھل کھلا۔
اور انہیں اپنے انعامات سے متمتع فرما تاکہ ان کو یہ
نظر نہ آئے کہ ہم اس گھر کے لئے قربانیاں کر رہے ہیں
بلکہ یہ نظر آئے کہ ہمیں خدا تعالیٰ اپنے انعامات سے
حصہ دے رہا ہے۔ یہاں بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے آرام کے
لئے دعائیں مانگی ہیں لیکن درحقیقت انہوں نے خدا تعالیٰ
کی غیرت بھڑکانے کے لئے یہ دعائیں کی ہیں۔ چونکہ خدا
تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ طَهِّرَا بَيْتِيَ۔ اس لئے ان کے
دل میں خیال آیا کہ آئندہ آنے والے یہ نہ سمجھیں کہ
ہم اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہے ہیں اور ایک بے آب
و گیاہ جگہ میں آکر خدا تعالیٰ کے گھر کی حفاظت کر
رہے ہیں۔ بلکہ وہ یہ محسوس کریں کہ خدا تعالیٰ ہم پر
احسان کر رہا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے نہایت احتیاط سے دعا کی اور کہا کہ الٰہی تو صرف
انکو ثمرات عطا فرما جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان
رکھنے والے ہوں۔ غالباً آپ کا منشاء یہ ہوگا کہ دوسرے
لوگ بھوک وغیرہ سے تنگ آکر خود ہی مکہ سے نکل
جائیں اور اس طرح یہ مقام ہمیشہ کے لئے خدا تعالیٰ کے
پاک بندوں سے آباد رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رزق کے
معاملہ میں اس تخصیص کو پسند نہ فرمایا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے مِنَ الثَّمَرٰتِ کیوں کہا؟ آخر میووں سے تو
کوئی نہیں جیتا۔ روٹی سے انسان زندہ رہتا ہے مگر
انہوں نے روٹی نہیں مانگی بلکہ پھل مانگا ہے اس کی
کیا وجہ ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ مکہ وہ مقام
ہے جہاں کوئی چیز پیدا ہی نہیں ہوتی تھی اور باہر سے
بھی سخت چیزیں تو وہاں پہنچ جاتی تھیں لیکن نازک
چیزیں وہاں پہنچتے پہنچتے گل سڑ جاتی تھیں پس انہوں
نے روٹی مانگنے کی بجائے پھل مانگے جو ایک نہایت
نازک چیز ہے اور سمجھا کہ جب میوے آجائیں گے
تو اور چیزیں تو خود بخود آجائیں گی۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے
بتایا ہے وہاں ہر ملک کے میوے ملتے ہیں۔ پس میوے
ملنے سے مراد یہ ہے کہ انکو میوے بھی مل جائیں اور
باقی اشیاء بھی مل جائیں۔ گویا میووں میں ہی باقی
اشیاء کا ذکر آجاتا ہے۔

قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا اللہ تعالیٰ
نے فرمایا کہ رزق کے معاملہ میں ہمارا اور حکم ہے اور
نبوت اور امامت کے معاملہ میں اور حکم ہے۔ نبوت
اور امامت صرف نیک لوگوں کو ملتی ہے۔ مگر رزق
ہر ایک کو ملتا ہے۔ پس جو کافر ہوگا دنیا کی روزی ہم
اس کو بھی دیں گے۔ چنانچہ سینکڑوں سال تک مکہ
کے لوگ مشرک رہے مگر خدائی رزق انکو بھی پہنچتا رہا
ہاں تیری نسل ہونے کی وجہ سے وہ اخروی عذاب سے

نہیں بچ سکتے۔ مرجائیں گے تو جہنم میں ڈالے جائیں گے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔

اسجگہ اُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا سے صرف چند دنوں کا مذتی مراد نہیں بلکہ اس سے دنیوی نفع مراد ہے جو مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ کا مصداق ہوتا ہے۔ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ میں یا تو فاء زائدہ ہے یا مَنْ کی خبر محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے۔ کہ اَرْزُقُهٗ فَاُمَتِّعُهٗ یعنی میں اُسے رزق بھی دونگا اور اس کے علاوہ ہر قسم کی دوسری منفعت بھی اُسے پہنچتی رہے گی۔ مگر رُوحانی فوائد جب تک کوئی شخص انبیاء سے تعلق نہیں رکھیگا اُسے نہیں ملیں گے۔ گویا اس جگہ فاء عطف کے لئے ہے۔

تورات میں اِس دُعا کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ کیونکہ یہود نے بنو اسمٰعیل کی دشمنی کی وجہ سے تورات سے مکّہ کا ذکر ہی اُڑا دیا ہے۔ البتہ خانہ کعبہ کا ذکر اُس میں بعض جگہ مل جاتا ہے۔

اِس آیت سے یہ استدلال بھی ہوتا ہے جس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑا زور دیا کرتے تھے۔ کہ انبیاء کے انکار کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا۔ بلکہ عذاب محض شرارت اور فساد کی وجہ سے آتا ہے۔ اگر لوگ تقوٰی کی زندگی بسر کریں تو محض انبیاء کے انکار کی وجہ سے اس دنیا میں اُن پر عذاب نہیں آسکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان جسم و رُوح سے مرکب ہے۔ وہ جسمانی اطاعت کے ساتھ جسمانی دنیا میں سُکھ پالیتا ہے۔ لیکن جب خالص رُوحانی دنیا آتی ہے تو چونکہ اُس نے اس زندگی کا کام نہیں کیا ہوتا اس لئے وہاں اُسے تکلیف پہنچتی ہے مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا میں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں امن قائم کرنے کا یہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کا ذریعہ بتایا ہے کہ اختلافِ مذہب دنیوی تعلقات کو توڑ دینے کا موجب نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر دنیا اس پر عمل کرے اور فتنہ و فساد میں حصہ نہ لے۔ تو تمام مذہبی جھگڑے اور فسادات مٹ سکتے ہیں۔

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا سے مراد کچھ دن نہیں بلکہ دنیوی زندگی ہے کیونکہ یہاں فرماتا ہے پھر انہیں مضطر کر کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا۔ اور عذاب کی طرف انسان موت کے بعد ہی جا سکتا ہے۔ بہر حال خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اور کوئی جگہ انکے پناہ کے لئے نہیں رہے گی۔ وہ ایک ہی جگہ بھیجے جائیں گے اور وہ عذاب کی جگہ ہوگی اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ گنہگار کو اور مجبور کر کے لے جانا اپنے اندر ایک حکمت رکھتا ہے۔ بظاہر اس کے یہ معنے معلوم ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ مجبور کر کے عذاب کی طرف لے جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں۔ بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انسان متواتر کوئی بُرا کام کرتا ہے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کی نیکی کی قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ بدیوں کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ اس بات کو نہیں مانتے وہ کہا کرتے ہیں کہ نیکی کا کیا ہے وہ تو ہم جب چاہیں کر سکتے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ گناہ کوئی مفرد چیز نہیں بلکہ وہ ایک بیج کی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح ایک بیج درخت پیدا کر دیتا ہے اور پھر اس سے آگے اور درخت پیدا ہو جاتے ہیں اسی طرح ہر گناہ اپنے ظہور کے بعد اور گناہ پیدا کرتا ہے۔ یہی حال نیکی کا ہے۔ ہر نیکی اپنے ظہور کے بعد اور نیکیاں پیدا کرتی ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ

اور (اُس وقت کو بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ اس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہا تھا اور (اس کے ساتھ) اسمٰعیل بھی (اور وہ دونوں کہتے جاتے تھے کہ)

اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اے ہمارے رب! ہماری طرف سے (اس خدمت کو) قبول فرما۔ تو ہی (ہے جو) بہت سُننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ ۴۴؎

خدا تعالیٰ کا رحیم ہونا نیکیوں کے بڑھانے پر دلالت کرتا ہے اور اُس کا قہّار ہونا بدیوں کے بڑھانے پر دلالت کرتا ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ خدا تعالیٰ انسان کو بدی پر مجبور کرتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ متواتر بدیوں کے نتیجہ میں انسان اپنے آپ کو ایسے مقام پر پاتا ہے جس سے اگر وہ بچنا بھی چاہے تو نہیں بچ سکتا۔ پس اَضْطَرُّہٗ میں انسان کو مایوس کرنا مراد نہیں بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو بدیوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ ورنہ اس پر ایسی حالت طاری ہو جائیگی کہ وہ بدیوں کی طرف کھینچا چلا جائیگا۔ اور اسکا پیچھے قدم ہٹانا مشکل ہو جائیگا۔ کیونکہ جب انسان کسی بدی میں پھنس جاتا ہے تو پھر اُس کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پس اس میں کسی جبر کی طرف اشارہ نہیں بلکہ احتیاط کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ چنانچہ آگے فرماتا ہے وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ اگر مجبور کرنا مراد ہوتا۔ تو بِئْسَ الْمَصِيْرُ کہنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ یہ الفاظ اس لئے لائے گئے ہیں کہ انسان کو توجہ دلائی جائے کہ اُسے اس بارہ میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اور بدی کے ارتکاب سے بچنا چاہیئے ورنہ اُس کے اندر بدی کے لئے ایک اضطرار کی سی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔ یہی حالت انسان کے دوسرے افعال میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگ بھی بعض دفعہ عجیب عجیب حرکتیں کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ پہلے انہوں نے کوئی حرکت چند بار کی اور پھر انہیں اس کی عادت پڑ گئی۔ اسی طرح نیکی اور بدی دونوں کی ابتداء انسان کے اپنے اختیار سے ہوتی ہے مگر انتہاء اضطرار پر ہوتی ہے۔ اور چونکہ ابتداء انسان کے اختیار سے ہوتی ہے اس لئے اُسکی انتہاء بھی اختیار کے تابع سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً جس انسان کو نماز کی پُرانی عادت ہو اُسے نماز کا ثواب برابر ملتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس نے ارادہ سے اس کی ابتداء کی ہوتی ہے۔ یہی حال بدی کا ہوتا ہے۔ انسان اُسے اپنے اختیار سے شروع کرتا ہے۔ لیکن آخر میں اضطرار تک حالت پہنچ جاتی ہے۔ اور پھر اگر وہ اس سے بچنا بھی چاہے تو بچ نہیں سکتا اور وہ اس بدی کا غلام بن جاتا ہے۔ اَضْطَرُّہٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ چونکہ یہ لوگ ایسے مقام پر پہنچ چکے تھے کہ اپنے آپ کو بدی کرنے پر مجبور پاتے تھے اس لئے خدا بھی انہیں مجبور کرکے دوزخ کی طرف لے جائیگا اور انہیں اپنے عمل کے مطابق بدلہ مل جائیگا۔

۴۴؎ **تفسیر:** اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ بیت اللہ کو ہم نے مثابہ اور امن کا مقام بنایا ہے۔ اس میں یہ کوئی ذکر نہیں تھا کہ بیت اللہ کی تعمیر کس کے ہاتھوں ہوئی۔ مگر اب فرماتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی بنیادیں کھڑی کیں اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی بنیادیں رکھی تھیں۔ مگر یہ درست نہیں۔ کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یَضَعُ الْقَوَاعِدَ نہیں فرمایا بلکہ یَرْفَعُ الْقَوَاعِدَ فرمایا ہے۔ اگر بنیاد رکھنے کا ذکر ہوتا تو وَضَعَ کا لفظ استعمال کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا،

کہ بیت اللہ پہلے سے موجود تھا مگر اس کی عمارت منہدم ہو چکی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت اُس کی بنیادوں کو بلند کیا۔ اور بیت اللہ کی از سرِ نو تعمیر کی۔ قرآن کریم کی بعض اور آیات سے بھی اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے:۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران: ۹۷) یعنی سب سے پہلا گھر جو تمام لوگوں کے فائدہ کے لئے بنایا گیا ––– وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے۔ وہ تمام جہانوں کے لئے برکت والا اور ہدایت کا مقام ہے۔ اسی طرح خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور جو دعائیں کیں اُس کے بعض الفاظ یہ ہیں کہ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (ابراہیم: ۳۸) یعنی اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے معزز گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لا بسایا ہے جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی۔ یہ دعا بھی بتاتی ہے کہ بیت اللہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ کیونکہ یہ دعا اُس وقت کی ہے۔ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ابھی بچے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو وہاں لا کر بسا دیا تھا۔ اُس وقت وہ دعا میں عِنْدَ بَيْتِكَ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جگہ خو الہاماً بتائی گئی تھی اور انہیں بتایا گیا تھا کہ یہ پہلا گھر ہے جو خدا تعالیٰ کے لئے تعمیر ہوا۔

اسی طرح قرآن کریم نے ایک مقام پر بیت اللہ کو بَيْتَ الْعَتِيْقِ بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔ وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (الحج آیت ۳۰) یعنی لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اس قدیم ترین گھر کا طواف کریں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ بہت پرانا گھر ہے یا یُوں کہو کہ وہ پہلی عبادت گاہ ہے جو دُنیا میں تیار کی گئی۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے بانی نہیں بلکہ انہوں نے صرف اس کی عمارت کی تجدید کی تھی اور اِسکی اصلی بنیادوں پر اُسے کھڑا کیا تھا۔ احادیث سے بھی اِس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آنے سے پہلے بیت اللہ کے نشانات موجود تھے۔

چنانچہ بخاری میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہاجرہ اور اسمٰعیل کو وہاں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو فَقَالَتْ يَا اِبْرَاهِيْمُ اَيْنَ تَذْهَبُ؟ وَ تَتْرُكُنَا بِهٰذَا الْوَادِي الَّذِيْ لَيْسَ فِيْهِ اِنْسٌ وَّلَا شَيْءٌ فَقَالَتْ لَهٗ ذٰلِكَ مِرَارًا وَ جَعَلَ لَا يَلْتَفِتُ اِلَيْهَا فَقَالَتْ لَهٗ أَ اللّٰهُ اَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قَالَ نَعَمْ! قَالَتْ اِذًا لَا يُضَيِّعُنَا۔ ثُمَّ رَجَعَتْ فَانْطَلَقَ اِبْرَاهِيْمُ حَتّٰى اِذَا كَانَ عِنْدَ الثَّنِيَّةِ حَيْثُ لَا يَرَوْنَهٗ اِسْتَقْبَلَ بِوَجْهِهِ الْبَيْتَ ثُمَّ دَعَا بِهٰٓؤُلَآءِ الْكَلِمٰتِ وَ رَفَعَ يَدَيْهِ۔ فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ۔ (بخاری کتاب بدء الخلق باب قول اللہ عزّ وجلّ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا) یعنی حضرت ہاجرہؓ نے کہا۔ اے ابراہیم! تم کہاں جا رہے ہو کیا تم ہمیں ایک ایسی وادی میں چھوڑ کر جا رہے ہو جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی اَور چیز۔ اور انہوں نے بار بار یہ سوال کیا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام شدّتِ رقّت کی وجہ سے جو اُن پر طاری تھی اِس کا جواب نہ دے سکے بلکہ اُن کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اِس پر حضرت ہاجرہؓ نے کہا۔ بتائیں کیا خدا نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں: تب حضرت ہاجرہؓ نے کہا۔ کہ پھر ہمیں کوئی ڈر نہیں۔ خدا تعالیٰ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ یہ کہکر وہ واپس چلی آئیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام موڑ پر پہنچے اور ہاجرہؓ

اور اسمٰعیلؑ اُن کی نظر سے اوجھل ہو گئے تو انہوں نے خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کیا (اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں خانہ کعبہ کا نشان موجود تھا گو عمارت نہیں تھی) اور ہاتھ اٹھا کر یہ دُعا کی کہ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ (ابراہیم : ۳۸)

یہ حدیث بھی بتاتی ہے کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا نہیں بلکہ انہوں نے صرف اس کی عمارت کی تجدید کی تھی۔ اور یہ کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے کا ہے اور اس کی ابتداء ایسے زمانہ سے وابستہ ہے جس کا علم صرف خدا تعالیٰ کو ہی ہو سکتا ہے۔ تاریخ اس کو بیان نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کی طرف مُنہ کر کے خاص طور پر دُعا کی اور اللہ تعالیٰ سے اُس کا فضل اور رحم طلب کیا۔

میور جیسا متعصب مصنف بھی اپنی تصنیف "لائف آف محمدؐ" میں تسلیم کرتا ہے کہ:-

"مکّہ کے مذہب کے بڑے بڑے اصولوں کو ایک نہایت ہی قدیم زمانہ کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔ گو ہیروڈوٹس (مشہور یونانی جغرافیہ نویس) نے نام لیکر کعبہ کا ذکر نہیں کیا مگر وہ عربوں کے بڑے دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا اللّات (یعنی خداؤں کا خدا) کا ذکر کرتا ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مکّہ میں ایک ایسی ہستی کی پرستش کی جاتی تھی جسے بڑے بڑے بتوں کا بھی خدا مانا جاتا تھا۔"

(ciii/۱۰۲)

پھر لکھتا ہے کہ مشہور مؤرخ ڈایوڈورس سکولس جو ساٹھ سال قبل مسیح گزرا ہے اُس نے بھی کہا ہے کہ عرب کا وہ حصہ جو بحیرہ احمر کے کنارے ہے وہاں پتھر کا ایک معبد بنا ہوا ہے جو بہت قدیم زمانہ سے ہے اور جس کی طرف عرب کے چاروں اطراف سے گروہ در گروہ لوگ آتے رہتے ہیں۔ سر ولیم میور اس کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ یہ الفاظ مکّہ کے مقدس گھر کے متعلق ہی ہیں کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں جس نے اتنا بڑا احترام حاصل کیا ہو۔ (دیباچہ لائف آف محمد ciii/۱۰۲)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

یہ انبیاء ہی کی شان ہے کہ وہ کام کے ساتھ ساتھ دُعائیں بھی کرتے چلے جاتے ہیں۔ لوگ تھوڑا سا کام کرتے ہیں تو فخر کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم نے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھو کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ بڑا ہوتا ہے۔ تو اُسے ایک ایسے جنگل میں چھوڑ آتے ہیں جہاں نہ کھانے کا کوئی سامان تھا نہ پینے کا۔ اور پھر خانہ کعبہ کی عمارت بنا کر اُن کی دائمی موت کو قبول کر لیتے ہیں۔ دائمی موت کے الفاظ میں نے اس لئے استعمال کئے ہیں کہ ممکن تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واپس آ جانے کے بعد وہ وہاں سے نکل کر کسی اور جگہ چلے جاتے۔ مگر بیت اللہ کی تعمیر کے ساتھ وہ خانہ کعبہ کے ساتھ باندھ دیئے گئے گویا خانہ کعبہ کی ہر اینٹ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بزبانِ حال کہہ رہی تھی کہ تم نے اب اسی جنگل میں اپنی تمام عمر گزارنا ہے۔ یہ کتنی بڑی قربانی تھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کی۔ مگر اس کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جھکتے اور کہتے ہیں کہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا۔ اے اللہ! ہم ایک حقیر ہدیہ تیرے حضور لائے ہیں تو اپنے فضل سے چشم پوشی فرما کر اسے قبول فرما لے۔ اور پھر کتنے تکلف سے قبول کی

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ

اے ہمارے رب! اور ہم یہ بھی التجا کرتے ہیں کہ) ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار (بندہ) بنا لے اور ہماری اولاد میں سے بھی

اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ

اپنی ایک فرمانبردار جماعت (بنا) اور ہمیں ہمارے (مناسب حال) عبادت کے طریق بتا اور ہماری طرف (اپنے) فضل کے ساتھ توجہ فرما

خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ تَقَبَّلْ باب تفعّل سے ہے اور تفعّل میں تکلّف کے معنے پائے جاتے ہیں۔ پس وہ کہتے ہیں کہ تُو خود ہی رحم کر کے اِس قربانی کو قبول فرما لے حالانکہ یہ اتنی بڑی قربانی تھی کہ اِس کی دُنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو قربان کر رہا تھا اور خانہ کعبہ کی ہر اینٹ اُن کو بے آب وگیاہ جنگل کے ساتھ مقیّد کر رہی تھی۔ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس کی ایک ایک اینٹ کے ساتھ اپنے جذبات واحساسات کو دفن کر رہے تھے۔ مگر دُعا یہ کرتے ہیں کہ الٰہی یہ چیز تیرے حضور پیش کرنے کے قابل تو نہیں مگر تُو ہی اِسے قبول فرما لے۔ یہ کتنا بڑا تذلّل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اختیار فرمایا۔ اور درحقیقت قلب کی یہی کیفیت ہے جو انسان کو اونچا کرتی ہے۔ ورنہ اینٹیں تو ہر شخص لگا سکتا ہے مگر ابراہیمی دل ہو تب وہ نعمت میسّر آتی ہے جو خدا تعالیٰ نے اُنہیں عطا فرمائی۔ پس ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ کہے۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا کہنے کی بجائے یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہماری قدر نہیں کی جاتی۔ حالانکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں دوسروں کی نقل میں کرتے ہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی کی نقل میں قربانی نہیں کی۔ بلکہ اِدھر خدا نے حکم دیا اور اُدھر وہ قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دُنیا کے ستون ہوتے ہیں اور جن کا بابرکت وجود مصائب کے لئے تعویذ کا کام دے رہا ہوتا ہے۔ وہ قربانیاں بھی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ کہتے جاتے ہیں کہ اے خدا ہماری قربانی اس قابل نہیں کہ تیرے حضور پیش کی جا سکے تیری ہستی نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ ہاں ہم امید رکھتے ہیں کہ تو چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے اِسے قبول فرمائیگا تیرا نام سمیع ہے اور تُو دعاؤں کو سُننے والا ہے۔ ہماری یہ قربانی قبول کرنے کے لائق تو نہیں مگر تُو جانتا ہے کہ ہمارے پاس اِس سے زیادہ اور کچھ چیز نہیں جو تیرے سامنے پیش کریں۔ ایک طرف تیرا سمیع ہونا چاہتا ہے کہ تو ہم پر رحم کرے اور دوسری طرف تیرا علیم ہونا اِس بات کا ثبوت ہے کہ تُو جانتا ہے کہ ہمارے جیسے نے کیا قربانی کرنی ہے۔ اسی رُوح کا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے مظاہرہ کیا۔ اور جب وہ دونوں مِل کر بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دُعائیں بھی کرتے جاتے تھے کہ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اے ہمارے رب ہم نے خالص تیری توحید اور محبّت کے لئے یہ گھر بنایا ہے تُو اپنے فضل سے اسے قبول کر لے اور اس کو ہمیشہ اپنے ذکر اور برکت کی جگہ بنا دے۔ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ تُو ہماری دردمندانہ دُعاؤں کو سُننے والا اور ہمارے حالات کو خوب جاننے والا ہے۔ تُو اگر فیصلہ کر دے کہ یہ گھر ہمیشہ تیرے ذکر کے لئے مخصوص رہیگا تو اسے کون بدل سکتا ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

یقیناً تُو (اپنے بندوں کی طرف) بہت توجہ کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۴۵

اِس آیت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بیت اللہ بانیکے درحقیقت دو حصے ہیں - ایک حصہ بندے سے تعلق رکھتا ہے - اور دوسرا حصہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھتا ہے جس مکان کو ہم بیت اللہ کہتے ہیں وہ اینٹوں سے بنتا ہے۔ چُونے سے بنتا ہے۔ گارے سے بنتا ہے اور یہ کام خدا نہیں کرتا بلکہ انسان کرتا ہے۔ مگر کیا انسان کے بنانے سے کوئی مکان بیت اللہ بن سکتا ہے۔ انسان تو صرف ڈھانچہ بناتا ہے۔ رُوح اُس میں خدا تعالیٰ ڈالتا ہے۔ اِسی امر کو مدّنظر رکھتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ڈھانچہ تو مَیں نے اور اسمٰعیلؑ نے بنا دیا ہے۔ مگر ہمارے بنانے سے کیا بنتا ہے - کئی مسجدیں ایسی ہیں جو بادشاہوں اور شہزادوں نے بنائیں مگر آج وہ ویران پڑی ہیں - اِس لئے کہ انسان نے تو مسجدیں بنائیں مگر خدا نے انہیں قبول نہ کیا۔ پس حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہم نے تیرا گھر بنایا ہے اِسے تو قبول فرما - اور تو خود اِس میں رہ پڑ۔ اور جب خدا کسی جگہ بس جائے تو وہ کیسے اُجڑ سکتا ہے - گاؤں اُجڑ جائیں تو اُجڑ جائیں شہر اُجڑ جائیں تو اُجڑ جائیں - مگر وہ مقام کبھی اُجڑ نہیں سکتا جس جگہ خدا بس گیا ہو -

۱۲۵ حل لغات :- مُسْلِمٌ فرمانبردار کو کہتے ہیں -

مُسْلِمٌ

اُمَّةٌ کے معنے جماعت کے ہوتے ہیں -

اُمَّةٌ

اَرِنَا: ہمیں دکھا دے - رُؤْيَة آنکھوں کی بھی ہوتی ہے اور دل کی بھی - یہاں دونوں ہی مراد ہو سکتی ہیں - مگر آگے چونکہ مَنَاسِك کا لفظ آیا ہے اسلئے بجائے دکھا دے کے ہم یوں کہیں گے ہم پر ظاہر کر دے یا ہمیں بتا دے۔

اَرِنَا

مَنَاسِكَ

مَنَاسِك : مَنْسَك کی جمع ہے جس کے معنے عبادت کے ہوتے ہیں - یا وہ تمام حقوق جو خدا تعالیٰ کے حضور ہمیں ادا کرنے چاہئیں -

تَوْبَة

تَوْبَة : جب یہ لفظ بندہ کے لئے آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں بندہ کا خدا تعالیٰ کی طرف سچے دل سے جھکنا اور اس کی طرف رجوع کرنا - اور جب یہ خدا تعالیٰ کے لئے آئے تو اس کے معنے ہوتے ہیں - خدا تعالیٰ کا بندوں پر رحم کرنا - اِس میں اور رحم میں یہ فرق ہے کہ رحیم کا لفظ نیکی کے بعد رُوحانی ترقیات دینے پر دلالت کرتا ہے اور توبہ کا لفظ اُن ترقیات پر دلالت کرتا ہے جو نیکی کے اعلیٰ مقام تک نہ پہنچیں بلکہ اُس سے نیچے رہیں - تَوَّاب زیادہ تر بدیوں اور کمزوریوں کے دُور کرنے کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور رُوحانی قابلیتوں اور طاقتوں کے پیدا کرنے کے موقع پر رحیم کا لفظ آتا ہے یہ دونوں الگ الگ قسم کی رحمت ہے - رحیم ارتقاء اور زیادتی کیلئے اور توّاب نقصان سے پاک ہونے کیلئے آتا ہے - گویا جب انسان نقصان سے پاک ہو جاتا اور رُوحانی ارتقاء کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو صفت رحیمیت کا دَور دَورہ ہو جاتا ہے -

تفسیر :- پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام دُعا مانگتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اے خدا! اِس گھر کی آبادی تیرے بندوں سے وابستہ ہے۔ مگر محض لوگوں کی آبادی کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اِس سے تعلق رکھنے والے نیک ہوں۔ پس ہم جو بیت اللہ کو بنانے والے ہیں -

اور جو دو افراد ہیں ہماری پہلی دُعا تو یہ ہے کہ تو خود ہمیں نیک بنا وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اور پھر ہماری اولاد میں سے ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے جو تیرا مطیع اور فرمانبردار ہو۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا اور ہمارے مناسب حال ہمیں عبادت کے طریق بتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کے دل میں خواہ کتنا ہی اخلاص ہو۔ اگر اسے طریق معلوم نہ ہو کہ کس طرح کسی گھر کو آباد رکھنا ہے تو پھر بھی وہ غلطی کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ دُعا کرتے ہیں کہ اے خدا نہ صرف ہمارے دلوں میں ایمان قائم رکھ بلکہ وقتاً فوقتاً ہمیں یہ بھی بتاتا رہیو کہ ہم نے کس طرح اسے آباد رکھنا ہے اور ہم وہ کونسا طریق عبادت اختیار کریں جس سے تو خوش ہو اور یہ گھر آباد رہ سکے۔

اس دُعا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اَرِنَا الْمَنَاسِكَ کہنے کی بجائے مَنَاسِكَنَا کہا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اور کامل مومن وہی ہوتا ہے جو ان فرائض کو سمجھنے کی کوشش کرے جو بدلے ہوئے حالات کے مطابق اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ بعض ایک پُرانی لکیر پر چلتے چلے جانا اور حالات کے تغیر کو مدنظر نہ رکھنا انسان کو کسی ثواب کا مستحق نہیں بناتا۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے بھی اس نکتہ کو نہ سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہاد بالسیف پر ہی زور دیتے رہے حالانکہ زمانہ اُن سے تلوار کے جہاد کا نہیں بلکہ زبان اور قلم کے جہاد کا مطالبہ کر رہا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام دُعا کرتے ہیں کہ الٰہی جو نیکی جس وقت کے مناسب حال ہو اس کو سرانجام دینے کی ہمیں توفیق عطا فرما اور اس بارہ میں ہمیشہ ہماری راہنمائی فرما۔

حدیثوں میں آتا ہے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سب سے بڑی نیکی کونسی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ سب سے بڑی نیکی تہجد ہے۔ پھر کسی اور نے آپ سے پوچھا کہ سب سے بڑی نیکی کونسی ہے تو آپ نے فرمایا جہاد سب سے بڑی نیکی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر شخص کیلئے الگ الگ بڑی نیکیاں ہیں۔ جو شخص جہاد نہیں کرتا اُس کے لئے جہاد ہی سب سے بڑی نیکی ہے اور جو شخص کبر و نخوت سے بھرا ہوا ہو۔ اس کے لئے سب سے بڑی نیکی یہی ہے کہ وہ کبر و نخوت چھوڑ دے۔ جو شخص نیند کا متوالا ہے اور اس وجہ سے عشاء اور صبح کی نمازیں مسجد میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ وہ نیند دُور کرے۔ اور نمازیں مسجد میں ادا کرے۔ جو شخص تہجد نہیں پڑھتا اس کے لئے سب سے بڑی نیکی تہجد پڑھنا ہے۔ جو شخص ماں باپ کی خدمت نہیں کرتا۔ اُس کے لئے سب سے بڑی نیکی ماں باپ کی خدمت کرنا ہے۔ غرض نیکی کا جو کام کسی کے نفس پر بوجھل ہو رہا اُس کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے۔ اسی طرح جس چیز کی ضرورت دوسروں پر مقدم سمجھی جائے۔ وہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ نماز کے وقت نماز ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اور روزہ کے وقت روزہ ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ غرض انسان کیلئے مختلف اوقات میں مختلف بڑی نیکیاں ہوتی ہیں اسی طرح مختلف اقوام اور افراد اور زمانوں کے لحاظ سے بھی سب سے بڑی نیکی کی تعیین مختلف ہوتی چلی جاتی ہے جس قوم یا جس فرد یا جس زمانہ کے لئے جس نیکی کی ضرورت ہو وہی اس کے لئے بڑی بن جاتی ہے اور اُس پر عمل اُسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا مستحق بنا دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے دُعا کرتے ہیں کہ الٰہی ہم کمزور اور ناطاقت ہیں اور ہم پوری طرح تیری عبادت بجا لانے سے قاصر ہیں تو آپ ہم پر رحم کیجیو اور ہمارے مناسب حال عبادات کے طریق بتائیو۔ ہم سے یہ بوجھ نہیں اٹھایا جاتا۔

وَتُبْ عَلَيْنَا۔ مگر اس الہام کے باوجود جو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح اس گھر کو آباد رکھنا چاہیئے اے خدا! ہم تیرے بندے ہیں ہم نے غلطیاں بھی کرنی ہیں۔ اس لئے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ

اور اے ہمارے رب! (ہماری یہ بھی التجا ہے کہ) تو انہی میں سے ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات

اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ

پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٣٠﴾ ع

یقیناً تو ہی غالب (اور) حکمتوں والا ہے ۱۴۶

١٥ ع ١٥

تو ہمیں معاف کر دیا کر۔ اور ہمارے گناہوں سے درگذر کرتا رہ۔

اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: تو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔ تواب اور رحیم نام اس لئے لائے گئے ہیں کہ بندہ خواہ کتنی بھی نیک نیتی کے ساتھ کام کرے وہ غلطی کر جاتا ہے۔ ایسی حالت میں توابیت اُس کے کام آتی ہے اور اگر اچھا کام کرے تو رحیمیت اُس کے کام آتی ہے۔

۱۴۶ حل لغات:۔ اٰيٰتٌ:۔ اٰيَةٌ کا لفظ اَوٰی سے نکلا ہے جس کے معنے ہیں "جگہ دی" (۲) اسی طرح ہر وہ کلام جو لفظی نشان کے ذریعہ ختم کیا جائے آیت کہلاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم کی آیات جہاں ختم ہوتی ہیں وہاں ایک نشان ڈال دیا جاتا ہے۔ جو آیت کے ختم ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ (۳) اس کے ایک معنے عبرت کے بھی ہیں یعنی ایسی بات جو دوسرے کے لئے نصیحت کا باعث ہو (۴) آیت کے معنے کسی چیز کے وجود اور اس کی شخصیت کے بھی ہیں۔ (۵) اس کے ایک معنے جماعت کے بھی ہیں گویا فردی شخصیت بھی اس لفظ کے مفہوم میں آجاتی ہے اور جماعتی شخصیت بھی۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ خَرَجَ الْقَوْمُ بِاٰيَتِهِمْ وَلَمْ يَدَعْ وَرَاءَهُمْ شَيْئًا۔ (اقرب) قوم اپنے سارے وجود کو لے کر چلی اور اپنے پیچھے کچھ بھی چھوڑا۔

بعض نحوی کہتے ہیں کہ آیت کا لفظ تَاَيِّيْ سے نکلا ہے جس کے معنے تَثَبَّتَ عَلَى الشَّيْءِ اور اقامت کے ہیں یعنی کسی چیز کا ٹِک جانا اور ایک جگہ پر جم جانا چونکہ یہ ایک جگہ پر قائم ہوتی ہے اسلئے اسے آیت کہتے ہیں۔ جیسے سڑکوں پر سنگِ میل ایک علامت اور نشان کے طور پر کھڑے ہوتے ہیں

(۶) اَلْاٰيَةُ: هِيَ الْعَلَامَةُ الظَّاهِرَةُ۔ اس کے ایک معنے ظاہری علامت کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ہر چیز کا جو جسم ہوتا ہے علامت اور آیت کہلاتا ہے۔ مثلاً ایک کتاب کے الفاظ علامت اور آیت کہلاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے ذریعہ مطلب کا پتہ لگتا ہے۔ غرض ہر وہ چیز جس کے ذریعہ کسی دوسری مخفی چیز کا پتہ لگے وہ آیت ہے۔

(۷) آیت بناء عالی کو بھی کہتے ہیں یعنی اونچی عمارت۔ یہ لفظ ان معنوں میں قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ آتا ہے۔ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ (شعراء: ۱۲۹) یعنی کیا تم پہاڑوں پر بے فائدہ عمارتیں بناتے ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے زمانہ میں یہ عام دستور تھا۔ کہ پہاڑوں پر لوگ

اٰيٰت

عمارتیں بناتے تھے۔ یہ یورپ کا نیا دستور نہیں۔

(۸) آیت کے معنے ٹکڑے کے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم کی آیات ہیں۔

(۹) آیت عذاب کو بھی کہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا۔ (بنی اسرائیل: ۶۰) یعنی ہم تو صرف خوف دلانے کے لئے آیات بھیجتے ہیں۔ (مفردات)

الکتاب

اَلْكِتٰبُ: اس کے کئی معنے ہیں (۱) اَلصَّحِيْفَةُ لکھی ہوئی چیز جسے عرفِ عام میں کتاب کہتے ہیں۔ (۲) اَلْحُكْمُ۔ حکم۔ (۳) اَلْفَرْضُ۔ فرض (۴) جامع یعنی جمع کرنے والی چیز۔ جیسے كَتِيْبَةٌ ایک بڑے لشکر کو کہتے ہیں جس میں جھنڈے، سامان اور فوج سب کچھ ہوتا ہے۔ کتاب کا لفظ اصل میں جوڑنے کے معنے رکھتا ہے۔ چنانچہ مشکیزہ کا منہ بند کر دینا۔ یا جانوروں کے منہ میں کوئی آلہ ڈال دینا۔ جس کی وجہ سے وہ دوسری چیزوں یا کھیتوں کو خراب نہ کر سکیں۔ اُسے کتبہ کہتے ہیں۔ یہ بھی کتاب کا مصدر ہے۔ اسی سے آگے حروف کو دوسرے حروف سے جوڑنے کے معنے پیدا ہو گئے۔ کتاب کا لفظ لکھی ہوئی چیز کے لئے زیادہ تر استعمال ہوتا ہے۔ گو محاورہ میں نہ لکھے ہوئے کلام کو بھی جو کہ معین ہو اور یاد کرایا جاتا ہو کتاب کہہ دیتے ہیں۔ لغت والے اس کی مثال میں الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں دیکھو الٓمّٓ کو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کہا ہے حالانکہ الٓمّٓ ابھی نازل ہو رہا تھا۔ اور لکھا ہوا نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ غیر مکتوب چیزیں بھی کتاب کہلاتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نہ لکھی ہوئی چیز کو بھی کتاب کہہ دیتے ہیں۔ لیکن لغت والوں کا اس سے یہ استدلال غلط ہے کیونکہ ذٰلِكَ کا اشارہ الٓمّٓ کی طرف نہیں بلکہ اس کا اشارہ سورۃ فاتحہ کی طرف ہے جو پہلے نازل ہو چکی تھی اور لکھی بھی جا چکی تھی۔ لیکن خواہ اس کا اشارہ الٓمّٓ کی طرف ہو یا ساری سورہ بقرۃ کی طرف ہو یا سارے قرآن کریم کی طرف ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ غیر لکھی ہوئی چیز کے لئے کتاب کا لفظ لایا گیا ہے کیونکہ بعض دفعہ جس بات کا ابتداء سے فیصلہ کر لیا گیا ہو اُسی کے مطابق نام رکھ دیا جاتا ہے۔ جیسے ماں باپ اپنے بچوں کا نام عبدالرحمٰن رکھ دیتے ہیں جس کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کو ظاہر کرنے والا۔ اب کیا اس کے یہ معنے ہونگے کہ وہ بچہ ماں کے پیٹ ہی میں یہ صفت ظاہر کرنے والا تھا؟ بلکہ اس کے صرف اتنے معنے ہوتے ہیں کہ وہ آئندہ بڑے ہو کر اس صفت کو ظاہر کرے گا۔ اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق فرماتا ہے۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (شعراء آیت ۱۲۰) کہ ہم نے نوحؑ اور اُس کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ اب اس کے یہ معنے نہیں کہ جو کشتی پہلے سے بھری ہوئی تھی اُس میں انہیں سوار کیا کیونکہ جو پہلے ہی بھری ہوئی ہو۔ اس میں سوار کرنے کے کیا معنے۔ بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ ایسی کشتی میں سوار کیا جو اُن کے بیٹھنے کی وجہ سے بھر گئی۔ پس جو فعل آئندہ کسی سے صادر ہونے والا ہو اس کی وجہ سے بھی نام دے دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کا الٓمّٓ کی طرف اشارہ نہیں کہ اس سے یہ سمجھا جائے کہ کتاب کا لفظ غیر لکھی ہوئی چیز کے لئے آیا ہے بلکہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک کامل کتاب بننے والی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فیصلہ فرما چکا ہے۔

کتاب کا لفظ اس چیز کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس کے اندر کوئی لکھی ہوئی چیز ہو۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ (انعام: ۸) یعنی اگر ہم تجھ پر ایک کتاب نازل کرتے جو کاغذوں پر ہوتی۔

غرض کتاب کے کئی معنے ہیں۔ محاورہ میں اس کے معنے

ایسی چیز کے ہیں جسے قائم کردیتے ہیں یا جس کا اندازہ کر لیتے ہیں یا جسے واجب کر دیتے ہیں یا فرض کر دیتے ہیں یا پختہ کر لیتے ہیں۔ اِن سب کے لئے کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پھر کَتَبَ کا لفظ قَضٰی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (توبہ : ۵۱) یعنی جس امر کا خدا نے فیصلہ کر دیا ہے اور جسے ہمارے لئے مقدر کر دیا ہے وہی ہمیں پہنچیگا (مفردات)

اَلْحِکْمَۃُ : اس کے کئی معنے ہیں (۱) اَلْعَدْلُ انصاف (۲) اَلْعِلْمُ۔ علم۔ (۳) اَلْحِلْمُ دانائی۔ (۴) مَا یَمْنَعُ مِنَ الْجَھْلِ جو بات جہالت سے روکتی ہو۔ (۵) وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ مَوْضِعِہٖ کسی چیز کو اُسکے مقام پر رکھنا (۶) اس کے ایک معنے صَوَابُ الْاَمْرِ وَ سَدَادُہٗ کے بھی ہیں یعنی صحیح اور درست کام (اقرب)

یُزَکِّیْ : زَکّٰی کے معنے ہیں (۱) اُس کو بڑھایا اور اس کی نشوونما کی۔ آگے نمو کے دو معنے ہیں۔ اُسے اپنی ذات میں بڑھایا یا اُسے باسامان کیا۔ (۲) اس کے ایک معنے تَطْہِیْر کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی پاک کرنا۔ اِس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگوں کو اُن کی ذات میں بڑھائیگا وہ اُن کو باسامان کریگا۔ وہ اُن کو پاک کریگا۔ پھر تَطْہِیْر بھی دو قسم کی ہوتی ہے ایک ظاہری طہارت اور دوسرے باطنی طہارت۔

تفسیر:۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام دُعا فرماتے ہیں کہ اے ہمارے رب تُو ان لوگوں میں سے جو اس جگہ رہیں گے ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔ مِنْھُمْ اور اے ہمارے رب رسول کے آنے سے یہ ضرورت تو پوری ہو جائیگی کہ خانہ کعبہ سے جس طرح تعلق رکھنا ہے اُس کا پتہ لگ جائیگا۔ اور وہ سچے اور مخلص مومن بن جائینگے مگر اے ہمارے رب ہم نے جو اپنی اولاد کو یہاں آکر بسایا ہے تو اس میں علاوہ اس غرض کے کہ تیرا نام بلند ہو ہماری یہ بھی غرض ہے کہ ہماری اولاد کے ذریعے تیرا نام بلند ہو۔ ہم نے صرف تیرا گھر نہیں بنایا بلکہ اپنی اولاد کو بھی یہاں لاکر بسا دیا ہے۔ گویا ہم نے جو تیرے نام کی بلندی کی کوشش کی ہے اِس میں کچھ اپنی غرض بھی شامل ہے۔ ہم نے یہ مکان بنایا ہے۔ اِس لئے کہ تیرا نام بلند ہو۔ اور ہم نے اپنی اولاد یہاں اِس لئے بسائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تیرا نام بلند ہو۔ پس ہم نے جو اپنی اولاد یہاں بسائی ہے اِس میں ہماری یہ غرض بھی شامل ہے کہ آنے والا رسول انہیں میں سے ہو باہر سے نہ ہو۔

اَلْحِکْمَۃُ

یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ اور وہ تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سُنائے۔ تیرے نشانات اور معجزات کے ذریعے اُن کے ایمانوں کو تازہ کرے۔ اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے والے دلائل لوگوں کے سامنے بیان کرے۔

یُزَکِّیْ

وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ اور تیری شریعت جس کے بغیر باطن پاکیزہ نہیں ہو سکتا۔ اور جو انسان کو مکمل نمونہ بنا دیتی ہے نازل ہو اور وہ لوگوں کو سکھائے۔

وَالْحِکْمَۃَ اور اے ہمارے ربّ! جب [illegible] رسول آئیگا۔ انسانی عقل تیز ہو چکی ہوگی۔ اُس وقت انسان بچہ نہیں ہوگا کہ اُسے یہ کہا جائے کہ اُٹھ اور فلاں کام کر۔ اور جب [illegible] کہے کہ مَیں کیوں کروں۔ تو اُسے کہا جائے کہ آگے سے بکواس مت کرو۔ عیسیٰؑ کے زمانہ میں اور موسیٰؑ کے زمانہ میں ایسا ہو چکا ہے۔ مگر جب وہ نبی آئیگا اس کا زمانہ انسانی عقل کے ارتقاء کا زمانہ ہوگا۔ اُس وقت بندہ یہ نہیں سُنیگا کہ کر۔ بلکہ پُوچھیگا کہ کیوں کروں۔ پس اے خدا تُو اسکو موسیٰؑ کی طرح صرف شریعت ہی نہ دیجیئو۔ نوحؑ کی طرح صحف ہی نہ دیجیئو۔ داؤدؑ کی طرح احکام ہی

نہ دیجیو۔ بلکہ ساتھ ہی اُن کی وجہ بھی بتا دیجیو۔ اور
ان احکام کی حکمت بھی واضح کیجیو۔ تاکہ نہ صرف
اُن کے جسم تیرے حکم کے تابع ہوں بلکہ اُن کا دماغ
اور دل بھی تیرے حکم کا تابع ہو اور وہ سمجھیں کہ جو کچھ
کہا گیا ہے فلسفہ کے ماتحت کہا گیا ہے عقل کے ماتحت کہا گیا ہے۔ ضرورت
کے ماتحت کہا گیا ہے۔ فوائد کے ماتحت کہا گیا ہے۔

وَيُزَكِّيهِمْ اور اُن کو پاک کرے۔ دماغ کو ہی
پاک نہ کرے بلکہ حکمت سکھا کر اُن کے قلوب کو بھی
محبت الٰہی سے بھردے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو
خدا تعالیٰ میں جذب کردیں الٰہی صفات اُن میں پیدا ہو جائیں
اور وہ چلتے ہوئے انسان نظر آئیں۔ بلکہ خدا نمائی کا ایک
آئینہ دکھائی دیں اور وہ ایسے ذرائع اختیار کرے جن سے
قوم کی ترقی کے سامان پیدا ہوں۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اے ہمارے رب!
ہم نے جو چیز مانگی ہے بظاہر یہ ناممکن نظر آتی ہے اور
جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے ایسا کبھی نہیں ہوا لیکن ہم
خوب جانتے ہیں کہ تجھ میں طاقت ہے تو عزیز خدا ہے۔
تو غالب خدا ہے اور تیری شان یہ ہے کہ ؎

جس بات کو کہے کہ کروں گا میں یہ ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا لیکن ہم یہ بھی جانتے
ہیں کہ تو ایسا کرسکتا ہے۔ چونکہ تو عزیز خدا ہے اسلئے
ہم جانتے ہیں کہ ایسا رسول آئے۔ اس پر اعتراض ہوسکتا
تھا کہ اگر پہلے خدا نے ایسا رسول نہیں بھیجا تو اب
کیوں بھیجے اور اگر پہلے بھی ایسا رسول بھیجنا ضروری تھا
تو پھر پہلے رسول کو نہ بھجوا کر بنی نوع انسان پر کیوں ظلم
کیا گیا۔ اس اعتراض کا الحکیم کہہ کر ازالہ کردیا۔ کہ
ہم جانتے ہیں پہلے ایسا رسول آ ہی نہیں سکتا تھا پہلے
لوگ اس قابل ہی نہیں تھے کہ محمدی تعلیم کو برداشت
کرسکیں۔ پس ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
عزیز کہہ کر خدائی غیرت کو جوش دلایا اور کہا کہ ہمارا
یہ مطالبہ غیر معقول نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تو ایسا کر
سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی حکیم کہہ کر بتا دیا کہ ہم یہ نہیں
سمجھتے کہ اگر تُو نے پہلے ایسا رسول نہیں بھجوایا تو نعوذ باللہ
تُو نے بخل سے کام لیا بلکہ ہم جانتے ہیں کہ اگر تُو نے
پہلے ایسا نبی نہیں بھیجا تو صرف اس لئے کہ پہلے ایسا
نبی بھیجنا مناسب نہیں تھا۔

اس دُعا میں ہمیں ایک عجیب بات نظر
آتی ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے
صرف رسولاً فرمایا ہے رُسُلاً نہیں فرمایا حالانکہ حضرت
ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی اپنی اولاد کے متعلق ایسی
واضح تھی کہ وہ جانتے تھے کہ ان میں بہت سے رسول
پیدا ہونگے۔ لیکن باوجود اس کے وہ حضرت اسمٰعیل
علیہ السلام کی اولاد میں صرف ایک رسول کے مبعوث کئے
جانے کی دُعا فرماتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے
کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات کھل چکی تھی کہ
خاتم النّبیّین بنی اسمٰعیل میں سے آنا ہے اور وہی ایک
رسول ہے جس کی کتاب پر تمام شرائع کا اختتام ہے۔
مَیں نے دیکھا ہے۔ میرے اس قسم کے الفاظ پر غیر مبائعین
کہا کرتے ہیں کہ دیکھو یہ بھی مانتے ہیں کہ رسول تو ایک
ہی ہے۔ مگر ہمیں اس سے کبھی انکار نہیں ہوا۔ کہ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی ایک ایسے
رسول ہیں جن کا سلسلۂ نبوت قیامت تک منقطع نہیں
ہوگا۔ اور ہم تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی نبوت
کو بھی آپ کی نبوت کے تابع اور اس کا ظل سمجھتے
ہیں اور ظلّ اصل سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہوتی پس
اب کوئی نیا حکم نہیں۔ کوئی نئی تعلیم نہیں۔ کوئی نیا
ارشاد نہیں۔ کوئی نئی ہدایت نہیں۔ وہی ارشاد وہی

ہدایت وہی تعلیم اور وہی احکام ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دنیا میں لائے تھے اور جو قرآن کریم میں بیان ہیں۔ اگر ہم حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مستقل نبی مانتے تو پھر تو اِس بات کی ضرورت تھی کہ ہر چیز نئی ہوتی۔ مگر یہاں تو سب کچھ وہی ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ صرف اتنی بات ہے کہ چونکہ لوگوں نے آپؐ کی تعلیم کو بھلا دیا تھا اور اُس پر عمل نہیں کرتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بروزِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجدیا۔ پس یہ رسالت کوئی الگ نہیں بلکہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی رسالت ہے۔ اور اگر ضرورت کے ماتحت ایسے کئی نبی بھی آجائیں تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اُن کے ذریعہ کوئی نیا دین جاری نہیں ہوگا۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہی زندہ ہوگا۔ بہرحال رَسُوْلًا کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو الہام سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ایک عظیم الشان رسول مبعوث ہونیوالا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ایک نبی اُن میں مبعوث ہونیوالا ہے تو انہوں نے اس کے لئے دُعا کیوں کی۔ سو جیسا کہ مَیں اوپر بتا چکا ہوں۔ الہام کا پُورا کرنا خود اپنی ذات میں ایک نیکی ہوتا ہے اور الہام کے پورا کرنے کے لئے سب سے پہلا کام جو انسان کر سکتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ وہ دُعا سے کام لے اور پھر اپنے عمل اور کوشش سے اُسے پورا کرے۔ نادان خیال کرتا ہے کہ الٰہی وعدہ کے بعد کوشش چھوڑ دینی چاہیئے۔ حالانکہ یہ بات انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنے محبوب کی بات پوری کرنے کیلئے اپنا سارا زور صرف کر دیتا ہے۔ انبیاء کو چونکہ خدا تعالیٰ سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لئے اُس کی بات کو پُورا کرنے کے لئے وہ ہر قسم کی جدوجہد سے کام لیتے ہیں تا کہ اُس کا نشان ظاہر ہو۔

پس اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک پیشگوئی کو پورا کرنے کیلئے دُعا کی تو یہ کوئی قابلِ اعتراض امر نہیں بلکہ اِس امر کا ثبوت ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ سے انتہائی اور کامل عشق تھا قطع نظر اِس بات کے کہ خدا تعالیٰ قادرِ مطلق ہے اور وہ اِسے خود پورا کر سکتا ہے۔ انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنی کامل محبت کا ثبوت دیدیا۔ اور اُسی وقت دُعا کی۔ کہ اے ہمارے رب! اِن میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔ تنوینِ تحقیر کے لئے بھی آتی ہے اور تعظیم کے لئے بھی۔ یہاں تعظیم کے لئے آئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔

میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دُعا بتاتی ہے کہ گو [illegible] جانتے تھے کہ اُن کی اولاد میں بہت سے رسول آنے والے ہیں۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ آخری رسول جو دُنیا کا نجات دہندہ بن کر آنے والا ہے وہ بنو اسحاق سے نہ ہو بلکہ بنو اسمٰعیل میں سے ہو۔ کیونکہ اُس وقت تک بنو اسحاق کو کافی حصہ مل چکا ہوگا۔ مسیحی مصنفین دُعائے ابراہیمی کے اِس حصہ پر بالعموم یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ بائیبل میں اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کی نسبت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کوئی وعدہ کیا گیا تھا اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کی نسبت کوئی وعدہ تھا تو اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ بائیبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور آپ کی نسل سے بنو اسحٰق کو شدید نفرت تھی۔ اور اِس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اُن کی دادی حضرت سارہؓ کو ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ سے نفرت تھی جسکا اثر آئندہ نسل میں بھی منتقل ہونا بعید از قیاس امر نہیں۔ اِسی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو ایک دُور دراز مقام پر چھوڑ آنے پر مجبور ہوئے۔ بائیبل کہتی ہے کہ:۔

"سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو
اُس کے ابرہام سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے
تب اُس نے ابرہام سے کہا۔کہ اس لونڈی
کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے۔ کیونکہ
اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے
ساتھ وارث نہ ہوگا۔"

(پیدائش باب ۲۱ آیت ۹ و ۱۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے تو یہ بات ناگوار
گذری مگر آخر خدا نے انہیں کہا کہ:۔

"تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث
بُرا نہ لگے۔جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے
تو اُس کی بات مان۔"

(پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۲)

بنو اسمٰعیل اور بنو اسحٰق کی اس باہمی رقابت کی طرف
بائیبل کی اس پیشگوئی میں بھی اشارہ موجود ہے جو حضرت
اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق کی گئی تھی کہ:۔

"اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے
ہاتھ اُس کے خلاف ہوں گے۔"

(پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲)

پس اس باہمی رقابت اور پھر اُس انسانی دستبرد
کی وجہ سے جس کا بائیبل تختۂ مشق بنی رہی اگر اُس میں
حضرت اسمٰعیلؑ اور اُن کی اولاد کی نسبت کوئی واضح پیشگوئی
موجود نہ ہو تو محض اس بنا پر قرآنی شہادت کو رد کر دینا
قرینِ انصاف نہیں کہلا سکتا جس طرح بائیبل کی شہادت
سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنو اسحاق سے کوئی وعدہ تھا
اسی طرح قرآن کریم کی شہادت سے بھی کہا جا سکتا ہے
کہ بنو اسمٰعیل سے بھی کوئی وعدہ تھا۔لیکن اگر اِس
نظریہ کو درست تسلیم نہ کیا جائے تب بھی بائیبل ایسے
اشارات سے خالی نہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ
حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل بھی خاص انعامات کی وارث ہوگی۔
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو الفاظ حضرت اسحاقؑ کی اولاد
کے متعلق بائیبل میں استعمال ہوئے ہیں وہی حضرت
اسمٰعیلؑ کے متعلق بھی استعمال ہوئے ہیں۔اور جس طرح
حضرت اسحٰقؑ کی اولاد کو بڑھانے اور اُن میں سے بادشاہ
پیدا کرنے کا وعدہ پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۶ میں ہے
اسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کو بڑھانے اور اُن میں
سے سردار پیدا کرنے کا وعدہ پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰
میں ہے۔پس جس قسم کے انعامات کا وارث حضرت
اسحٰقؑ کی اولاد کو قرار دیا گیا ہے اُسی قسم کے انعامات
کا وارث بنو اسمٰعیل کو بھی تسلیم کرنا پڑیگا۔اور اگر یہ
کہا جائے کہ حضرت اسحاقؑ کی نسبت اس باب کی
آیت ۲۱ میں لکھا ہے کہ

"میں اپنا عہد اضحاق سے باندھونگا۔"

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اس نسل سے ہوں گے
تو یہ دلیل بھی معقول نہیں۔کیونکہ اسحاقؑ کی پیدائش
سے بھی پہلے خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام
سے عہد کیا تھا اور اُس میں یہ شرط لگائی تھی کہ اس عہد
کی علامت ختنہ ہوگی (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۱) اور ہم
دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل
علیہ السلام کا بھی ختنہ کیا۔(پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۵)
اگر وہ عہد صرف اسحاقؑ اور اُس کی نسل سے ہوتا۔تو
حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنا ختنہ کراتے۔کیونکہ
اُن سے عہد تھا۔اپنے غلاموں کا کرواتے کیونکہ اُن کی
نسبت حکم تھا۔حضرت اسحاقؑ کا کرواتے کیونکہ اُن سے
اس عہد نے پورا ہونا تھا۔تیرہ سالہ لڑکے اسمٰعیل
کا ختنہ کس سبب سے کروایا گیا۔اس کی صرف ایک ہی
وجہ تھی کہ اُس کی نسل سے بھی اس عہد نے پورا ہونا
تھا۔پس آپ کا حضرت اسمٰعیلؑ کا بھی ختنہ کرانا ایک

صاف ثبوت ہے اس بات کا کہ حضرت اسمٰعیلؑ بھی آپ
کی اولاد میں سے تھے جس کے ساتھ وہ عہد پورا ہونا تھا
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو اسمٰعیل میں ختنہ کا رواج ہمیشہ
رہا۔ اور یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ حکم نہ صرف
اسمٰعیل کے لئے بلکہ اس کی اولاد کے لئے بھی سمجھا گیا تھا۔
پس عہد جس طرح حضرت اسحاقؑ کی اولاد کے لئے تھا۔
اسی طرح حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے لئے بھی تھا۔
باقی رہا پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۱ کا مطلب کہ

"میں اپنا عہد اسحاق سے باندھونگا"

سو دوسرے حالات کو مدنظر رکھ کر آیت کا یہ مطلب ہے
کہ اس ابدی عہد کی ابتداء بنو اسحاق سے شروع ہوگی۔
چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عہد جو حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی اولاد کے متعلق تھا ابتداء میں بنو اسحاق سے ہی پورا
ہوا۔ لیکن بائیبل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عہد
بنو اسمٰعیل کے بارہ میں بھی تھا۔ کیونکہ ختنہ کا حکم انہیں
بھی دیا گیا تھا۔ جیسا کہ لکھا ہے:-

"جب اس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا وہ
تیرہ برس کا تھا۔"
(پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۵)

اور اسمٰعیل کے متعلق بھی برکت کا وعدہ کیا گیا تھا
جیسا کہ لکھا ہے:-

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔
دیکھ میں اسے برکت دوں گا۔ اور اسے
برومند کرونگا اور اسے بہت بڑھاؤنگا"
(پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰)

اسی طرح پیدائش باب ۲۱ میں لکھا ہے:-

"میں اس (اسمٰعیل) کو ایک بڑی قوم
بناؤں گا۔" (آیت ۱۸)

پس ضروری تھا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی اس
برکت میں شامل ہوتے۔ گو وہ اس عہد میں شامل نہ تھے
جو کنعان کے قبضہ کے متعلق تھا۔ کیونکہ وہ وعدہ صرف
اسحاقؑ کی نسل کے ساتھ پورا ہونا تھا۔ لیکن یہود و نصاریٰ
غلطی سے یہ سمجھنے لگ گئے کہ برکت کا عہد صرف اسحاقؑ
کی اولاد سے تھا۔ حالانکہ ابراہیمی عہد کی دو شکلیں
تھیں۔ ایک مجمل اور ایک مفصّل۔ مجمل عہد تو یہ تھا
کہ میں تیری نسل کو برکت دونگا اور نسل سے مراد اسحٰق
اور اسمٰعیل دونوں تھے۔ اور مفصّل عہد آگے دو حصوں
میں منقسم تھا۔ اسحاقؑ کی نسبت تو یہ عہد تھا۔ کہ
کنعان کی حکومت اُسے نسلاً بعد نسلٍ حاصل ہوگی اور
اسمٰعیل کی نسبت بائیبل صرف اتنا بتاتی ہے۔ کہ
خدا تعالیٰ نے کہا کہ میں اسے برکت دونگا اور برومند
کرونگا۔ یہ برکت اُسے کس طرح دی گئی؟ اس کا
جواب ہمیں بائیبل سے نہیں بلکہ قرآن کریم سے ملتا ہے
قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق
یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اُسے اور اُس کی اولاد کو مکہ مکرمہ
اور اُس کے گرد و نواح پر حکومت دی جائیگی اور خدا تعالیٰ
اُن کے مرکز کو ہمیشہ دشمن کے حملہ سے محفوظ رکھیگا
اور تمام علاقہ پر اُن کی روحانی اور جسمانی حکومت ہوگی۔
اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن کی نسل میں سے ایک عظیم الشان
رسول مبعوث فرمائیگا۔ جو تمام دنیا کی ہدایت کا موجب
ہوگا۔ پس یہ غلط ہے کہ بنو اسمٰعیل کے ساتھ برکت کا
کوئی وعدہ نہ تھا۔ بائیبل کی خود اندرونی شہادات
بتا رہی ہیں کہ نسلِ اسمٰعیل کی ترقی کا بھی وعدہ کیا
گیا تھا۔ اور ضروری تھا کہ جس طرح بنو اسحاق کو ترقی
دی گئی اسی طرح بنو اسمٰعیل کو بھی ترقی دی جاتی۔ اور
اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوتا۔ باقی رہا یہ سوال کہ اگر
حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے کوئی وعدہ ثابت بھی
ہو تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ تو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ کسی خاص قوم کے کسی بزرگ انسان کی اولاد سے ہونے کا حقیقتاً ایک ہی ثبوت ہوتا ہے اور وہ اس قوم کی روایات ہیں جو نسلاً بعد نسل چلتی چلی جاتی ہیں تمام قوموں اور خاندانوں کے کسی خاص شخص سے متعلق ہونے کا اس کے سوا اور کیا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ قوم ایسا بیان کرتی ہے۔ پھر اس معاملہ میں کیوں عربوں کے بیان کو تسلیم نہ کیا جائے جبکہ قریش کا دعویٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بھی پہلے کا تھا کہ وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور تمام عرب اس بات کو تسلیم کرتے تھے۔ خود کعبہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا بُت بنا کر رکھا ہوا تھا۔ پھر قریش کے بنی اسمٰعیل ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کوئی ایسی دنیوی شہرت نہ رکھتے تھے کہ خیال کیا جائے کہ عرب کی بعض اقوام نے اس عزت میں حصہ لینے کے لئے اپنے آپ کو اُن کی طرف منسوب کر دیا ہو۔ پس ایک قوم کا دعویٰ جو صدیوں سے چلا آتا ہے کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ جھوٹ کا کوئی محرک بھی دکھائی نہیں دیتا۔

دوسرا ثبوت قریش کے بنو اسمٰعیل ہونیکا یہ ہے کہ اگر وہ جھوٹے طور پر بنو اسمٰعیل بن گئے تھے تو اصل بنو اسمٰعیل اُن کے اس قول کو رد کرتے۔ لیکن کسی قوم کا اُن کے دعویٰ کو رد کرنا ثابت نہیں۔

سوم پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۱ میں لکھا ہے کہ "میں اسماعیل کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔" اگر قریش آپ کی اولاد نہیں تو ■■ بڑی قوم کونسی ہے جس کا وعدہ دیا گیا تھا۔ کیونکہ پیشگوئی چاہتی ہے کہ وہ قوم شناخت بھی ہو۔ ورنہ اس کے پورا ہونے کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ پس چونکہ قریش ہی اس بات کے مدعی ہیں اس لئے اُن کا دعویٰ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔

غرض یہ دونوں اعتراض غلط ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے بھی بڑے بڑے انعامات کے وعدے تھے۔ پس بنو اسحاق کے بدعمل ہو جانے کے بعد خصوصیت سے بنو اسمٰعیل کا ہی حق تھا کہ اُن میں وہ نبی مبعوث ہو جس کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعائیں کی تھیں۔

درحقیقت یہ دُعا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی ہے اس میں اُن فرائض اور ذمہ داریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر نبی جو دنیا میں آیا اُس کا یہی کام تھا کہ وہ تلاوتِ آیات کرتا۔ کتاب اللہ کی تعلیم دیتا احکام کی حکمتیں بتاتا اور تزکیہ نفوس کرتا۔ اور یہی کام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سرانجام دینے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف دُعائے ابراہیمی کو قبول فرما کر بنو اسمٰعیل میں سے ایک عظیم الشان رسول بھیجا جس نے یہ چاروں کام کئے بلکہ آپ کو وہ مقامِ فضیلت بھی عطا فرمایا کہ اُس نے تلاوتِ آیات۔ تعلیم کتاب تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس میں ایسا نمایاں کام کیا۔ جس کی نظیر دنیا کے کسی اور نبی کی زندگی میں نظر نہیں آتی اور درحقیقت یہی وہ کوثر ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اوّلؓ کے زمانہ میں ایک دفعہ بعض دوستوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں انہیں قرآن کریم پڑھاؤں۔ چنانچہ میں نے سورۂ بقرہ شروع کی۔ جب میں اس آیت پر پہنچا کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ تو یکدم میرے دل میں

بجلی کی طرح ڈالا گیا۔ کہ یہ آیت اس سورۃ کے مضامین کی
کنجی ہے اور اس سورت کے تمام مضامین اس آیت کی
تشریح ہیں۔ بلکہ انہیں بیان بھی اسی ترتیب سے کیا
گیا ہے جس ترتیب سے دعائے ابراہیمی میں اُن کا ذکر
آتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ پر مزید یہ
امر کھولا کہ سورۃ کوثر دعائے ابراہیمی کا جواب ہے
جس کا سورۃ بقرۃ میں ذکر آتا ہے۔ چنانچہ سورۃ کوثر
کی تفسیر میں مَیں نے ان تمام امور کا تفصیلاً ذکر کر
دیا ہے۔

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ ۔ اس میں ایک پیشگوئی
کی گئی ہے۔ جو قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی تشریح
کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے کہ دشمن یہ
اعتراض کرتے ہیں کہ لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ
جُمْلَةً وَّاحِدَةً (فرقان آیت ۳۳) یعنی اس پر سارے
کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اُترا۔ اُدھر دشمنوں کا
یہ اعتراض ہے اور اِدھر یہ دُعا ہے جو حضرت ابراہیم
علیہ السلام نے کی کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ جس میں
اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کلام جو وہ لوگوں
کو پڑھ کر سنائیگا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوگا۔ ورنہ
اگر اس بات کی طرف اشارہ نہ ہوتا تو پھر یُوں کہنا
چاہیئے تھا کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ کَلَامَكَ وہ تیرا کلام
لوگوں کو پڑھ کر سنائیگا۔ آیات کے لفظ کا استعمال
بتاتا ہے کہ وہ کلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہوگا۔ کچھ
آیات اُتریں گی۔ اور وہ سُنا دیگا۔ پھر اور اُتریں گی
اور وہ سُنا دیگا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کلام کے نزول کی کیفیت
بھی بتا دی گئی تھی اور سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ اکٹھا نہیں
اُتریگا بلکہ آہستہ آہستہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُتریگا
قرآن کریم کے آہستہ آہستہ نازل ہونے میں حکمت یہ تھی کہ
اگر اکٹھی تمام شریعت نازل ہو جاتی تو انسان گھبرا جاتا اور
کہتا کہ مَیں اس پر کس طرح عمل کروں۔ مگر جب ایک ایک
ٹکڑا نازل ہوا تو لوگوں کے لئے عمل کرنا آسان ہوگیا
اور بتدریج وہ ترقی کرتے چلے گئے۔ غرض یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ
اٰیٰتِكَ میں قرآن کریم کے نزول کی کیفیت بتائی گئی ہے
اور اس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ وہ کلام ٹکڑے ٹکڑے
ہو کر نازل ہوگا۔

آیت کے ایک معنے علامت کے بھی ہوتے ہیں۔
اس لحاظ سے یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ کے معنے یہ
ہونگے کہ وہ تیری علامات لوگوں کو بتائے۔ اس میں
یہ اشارہ مخفی تھا کہ وہ ایسا کلام پیش کرے گا
جس سے خدا تعالیٰ کا وجود نظر آ جائیگا۔ قرآن کریم میں
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ
يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (انعام: ۱۰۴) یعنی آنکھیں اُس
تک نہیں پہنچ سکتیں مگر وہ اپنے کلام کے ذریعہ بینائیوں
تک پہنچ جاتا ہے۔ پس اس کے دوسرے معنے یہ ہیں
کہ وہ ایسی علامتیں لوگوں کو بتائیگا جن سے خدا تعالیٰ
کا وجود پہچانا جائیگا۔ اور ایسے دلائل پیش کریگا
جن سے انہیں خدا تعالیٰ نظر آ جائیگا۔ یہ دلائل آگے
دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عقلی اور دوسرے اعجازی
پس یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ میں بتایا کہ وہ اُن عقلی امور
کی طرف بھی لوگوں کی راہنمائی کریگا جو خدا تعالیٰ کی
معرفت عطا کرتے ہیں اور اُن معجزات اور نشانات کو
بھی پیش کریگا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوتے
ہیں۔

آیت کے ایک معنے چونکہ عذاب کے بھی ہوتے ہیں
اس لئے یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ سے یہ استنباط بھی
ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے خلاف عذاب کی خبریں
دیگا۔

پھر آیت کے ایک معنے چونکہ اونچی عمارت کے
بھی ہیں اس لئے یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ کا یہ مطلب
بھی ہے کہ اس کی تعلیم میں تمدنی ارتقاء ہوگا۔ جیسے
عمارت پر عمارت بنتی ہے۔ اور وہ اپنے اندر مومنوں
کے لئے بھاری ترقیات کے سامان رکھتی ہوگی۔
یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ۔ اس کے ایک معنے تو
یہ ہیں کہ وہ انہیں ایسی تعلیم دیگا جو ساری کی ساری
لکھی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ عربی زبان میں ہر اُس چیز
کو کتاب کہا جاتا ہے جس میں مختلف مسائل کا ابواب وار
اندراج ہو۔ اس لحاظ سے صرف قرآن کریم ہی ایک
ایسی کتاب ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
کی وفات پر صحابہؓ کو لکھی ہوئی ملی۔ اور صرف مسلمان
ہی دنیا میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا
قرآن شروع سے اب تک محفوظ صورت میں لکھا
ہوا چلا آرہا ہے۔ یہ خصوصیت کسی اور الہامی کتاب
کو ہرگز حاصل نہیں۔ کیونکہ دوسری کوئی کتاب بھی
لکھی ہوئی نہ تھی۔ کوئی سینکڑوں سال بعد جمع
کی گئی۔ اور کوئی کتاب اگر اُس وقت لکھی بھی گئی تو اسے
یہ خصوصیت حاصل نہ تھی کہ اس کا لفظ لفظ الہامی
ہو۔ بائیبل کے متعلق یہ کبھی بحث نہیں ہوئی کہ یہاں
زبر ہے یا زیر ہے۔ لیکن قرآن کریم کے متعلق یہ بحث
ہوتی تھی کہ یہاں زبر ہے یا زیر ہے بلکہ یہاں تک بھی
بحث ہوتی تھی کہ یہاں ٹھہرنا ہے یا نہیں ٹھہرنا۔
غرض اس میں بتایا کہ وہ رسول ایک ایسی کتاب
کی تعلیم دیگا جو بالکل محفوظ ہوگی اور اُس کے زمانہ
میں ہی لکھی جاچکی ہوگی۔
پھر کتاب جمع کرنے والی چیز کو بھی کہتے ہیں۔
اس لحاظ سے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ایسی تعلیم
دے گا جو تمام قسم کے علوم اور تعلیموں پر حاوی ہوگی
اور ہر قسم کی اخلاقی۔ تمدنی۔ مذہبی اور اقتصادی تعلیم
کی جامع ہوگی۔
کتاب کے ایک معنے چونکہ فرض کے بھی ہیں اس
لحاظ سے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ کے یہ معنے بھی ہیں کہ
وہ ایسی تعلیم دیگا جس پر عمل کرنا لوگوں کے لئے فرض
ہوگا۔ گویا وہ تمام ضروری باتیں جن کے بغیر رُوحانی
زندگی تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی اس کے ذریعہ لوگوں
کو بتادی جائیں گی۔
پھر کتاب کے ایک معنے حکم کے بھی ہیں۔ اگر
حکم کو فرض کا ہم معنے سمجھ لیا جائے۔ تب تو اس کے
کوئی علیحدہ معنے نہیں ہونگے۔ لیکن اگر حکم کو فرض سے
الگ سمجھا جائے تو پھر یہ مراد ہوگی کہ بعض احکام
تو فرض ہوتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو حالات
کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔ جو فرائض قطعی ہوتے
ہیں وہ ہر حالت میں قائم رہتے ہیں۔ جیسے نماز ہے
لیکن بعض حکم ایسے ہوتے ہیں جو حالات کے مطابق
بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اسلامی شریعت یہ کہتی ہے کہ
اگر تم سزا میں فائدہ دیکھو تو سزا دو اور اگر معاف
کرنے میں فائدہ دیکھو تو معاف کردو۔ پس جو احکام
بدلتے نہیں وہ فرائض ہیں اور جو ضرورت کے ماتحت
تبدیل ہو جاتے ہیں وہ حکم ہیں۔ ایسے احکام کو
حکم اس لئے قرار دیا جاتا ہے کہ یہ لفظ حکمت سے
نکلا ہے اور انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ تم خود
سوچ لو کہ ایسے وقت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔
فرض کی صورت میں تو اُس نے کسی اور پر بات نہیں
چھوڑی۔ لیکن احکام میں اُس نے رعایت دیدی ہے
مثلاً فرض نمازوں کی اُس نے خود ہی رکعات مقرر کر
دی ہیں جن کو انسان گھٹا بڑھا نہیں سکتا۔ لیکن نوافل
اُس نے انسان کی مرضی پر رکھ دیئے کہ جتنی توفیق ہو

پڑھ لو۔ اِس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے زیرِ تفسیر آیت کے یہ معنے ہونگے کہ وہ ایسی کتاب ہوگی جو تمام احکام کی جامع ہوگی۔ خواہ وہ لازمی ہوں یا اختیاری۔

پھر کتاب کےایک معنے قضاءِ آسمانی کے بھی ہیں۔ اِس لحاظ سے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کے یہ معنے ہونگے کہ وہ اُن کو تقدیرِ الٰہی کا علم دیگا۔ درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو تقدیر کا صحیح علم دینے والا صرف قرآن کریم ہی ہے۔ باقی سب لوگ یا تو جبر کی طرف چلے گئے ہیں یا قدر کی طرف مائل ہوگئے ہیں۔ جس کتاب نے جبر و قدر کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے وہ صرف قرآن کریم ہی ہے۔ افسوس ہے کہ قرآن کریم کے ماننے والوں میں سے بھی بعض قدری اور بعض جبری ہوگئے ہیں۔ حالانکہ صحیح مذہب اِن کے بَین بَین ہے میں نے خود حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے سُنا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے جتنا غور کیا ہے ہمیں یہی معلوم ہوا ہے کہ صرف قدر کے عقیدہ سے بھی امن اُٹھ جاتا ہے اور صرف جبر کے عقیدہ سے بھی امن اُٹھ جاتا ہے۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ صرف قدر ہی قدر ہے اور انسان تارک الدنیا ہو جائے تو وہ نیکیوں میں ترقی نہیں کر سکتا اور اگر جبر کا عقیدہ اختیار کر لیا جائے تو وہ سمجھیگا کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے خدا تعالیٰ اُس سے کرواتا ہے اور اُس کے نتیجہ میں اُسے کسی بدی سے بھی عار نہیں رہیگی کیونکہ وہ اُسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیگا۔ غرض صحیح عقیدہ اِن دونوں کے درمیان ہے۔ اور انسانی اعمال کی مثال ایک ایسے گھوڑے کی سی ہے جو نہی رسّی سے بندھا ہوا ہو۔ وہ یہ خیال کرکے کہ میں آزاد ہوں چلتا پھرتا ہے۔ مگر آخر اُسے جھٹکا لگتا ہے اور رُک جاتا ہے۔ اِسی طرح انسان مقید بھی ہے اور مختار بھی۔ انسان مختار ہے ایک حد کے اندر اور مقید ہے ایک حد کے اندر۔ جو قید کو نہیں سمجھتا وہ بھی گمراہ ہے۔ اور جو اختیار کو نہیں سمجھتا وہ بھی گمراہ ہے

اور یہ علم صرف قرآن کریم سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

وَالْحِكْمَةَ: حکمت کے ایک معنے چونکہ عدل کے بھی ہیں۔ اِس لئے حکمت سکھانے کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ وہ عدل سکھائیگا۔ اُس کی تعلیم میں ظلم بالکل نہ ہوگا۔

اِس کے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ علم کو کامل کریگا۔ یعنی بعض شریعتیں ایسی ہوتی ہیں جو صرف حکم دیتی ہیں۔ علم نہیں دیتیں۔ وہ کہتی تو ہیں کہ فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو۔ مگر اُس کی وجہ نہیں بتاتیں۔ اُن میں صرف عمر کا حصہ ہوتا ہے لیکن علم کا حصہ نہیں ہوتا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ پہلی شریعتوں میں جو احکام دیئے گئے اُن کی بھی حکمتیں تھیں مگر وہ حکمتیں بتائی نہیں جاتی تھیں۔ مگر قرآن کریم کے متعلق فرمایا کہ وہ ایسی تعلیم ہوگی جس کے ساتھ احکام کی حکمت اور وجہ بھی بتائی جائیگی وہ بتائیگا کہ نماز پڑھو۔ کیونکہ اِس میں یہ حکمت ہے۔ یا چوری نہ کرو کیونکہ اِس کی یہ وجہ ہے۔ وہ صرف یہ نہیں کہیگا کہ جھوٹ نہ بولو اور ظلم نہ کرو بلکہ وہ جھوٹ نہ بولنے اور ظلم نہ کرنے کی وجہ اور حکمت بھی ساتھ بتائیگا۔ اور عمل کے ساتھ علم کا حصہ بھی شامل کریگا۔

حکمت کے ایک معنے علم یعنی دانائی کے بھی ہیں۔ یعنی موقعہ اور محل کی شناخت۔ یہ چیز علم سے کسی قدر اختلاف رکھتی ہے۔ علم تو کہتا ہے کہ ایسا کرو یا نہ کرو لیکن دانائی بتاتی ہے کہ فلاں موقعہ پر یُوں کرو اور فلاں موقعہ پر یُوں۔ پس اِس کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ وہ مقررہ احکام کی تو حکمت بتائیگا اور جو معیّن احکام نہیں بلکہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اُن میں دانائی کی راہ سکھلائیگا اور بتائیگا کہ فلاں جگہ اِس طرح کرو اور فلاں جگہ اِس طرح۔

حکمت کے ایک معنے نبوت کے بھی ہیں۔ اِس لحاظ سے اِس کے معنے یہ ہیں کہ اِس رسول کے ذریعے انہیں نبوت کا مقام حاصل ہو سکیگا۔

اِس کے ایک معنے وَضْعُ الشَّيْءِ فِي مَوْضِعِهٖ کے بھی ہیں مگر یہ معنے دانائی میں ہی آجاتے ہیں۔ اِسی طرح اِسکے معنے مَا یَمْنَعُ مِنَ الْجَهَالَةِ کے بھی ہیں۔ یعنی ایسی وجوہ جو کسی بُرے کام سے روکنے والی ہوں۔ مگر یہ معنے بھی پہلے معنوں میں آجاتے ہیں۔ پس اصل میں اس کے چار معنے ہیں (۱) عدل (۲) علم۔ (۳) حلم (۴) نبوت۔

وَ يُزَكِّيْهِمْ میں اُن معنوں کے لحاظ سے جو حل لغات میں بیان کئے جا چکے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ (۱) وہ اُن کی تعداد کو بڑھائیگا۔ یعنی اس کے کلام میں غیر معمولی تاثیر ہوگی جس کی وجہ سے لوگ اُسے قبول کرتے چلے جائینگے اور اس کا مذہب دنیا پر غالب آنیوالا مذہب ہوگا۔ اِسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَاِنِّيْ مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْاُمَمَ۔ (ابوداؤد و نسائی کتاب النکاح) کہ بہت بچے جننے والی اور محبت کرنے والی عورتوں سے شادیاں کرو۔ کیونکہ میں باقی اُمتوں پر تمہاری کثرت کو پیش کرکے قیامت کے دن فخر کروں گا۔ غرض تعداد کا بڑھانا خواہ نسلی لحاظ سے ہو یا تبلیغی لحاظ سے يُزَكِّيْهِمْ میں ہی شامل ہے۔

پھر اسلامی تعلیم بنیادی طور پر ایسے امور پر مشتمل ہے جن سے مسلمان دنیوی لحاظ سے بھی غیر معمولی ترقی کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک بڑی تعلیم یہ دی گئی ہے کہ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ: ۱۰۳) یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اپنی اُمت کے لوگوں سے مال لے اور اس کے ذریعہ اُنکو پاک کر اور اُن کو بڑھا۔ یہ قانون جو اسلام نے قائم فرمایا ہے دنیا کی اور کسی مذہبی کتاب میں نہیں۔ صرف اسلام ہی ہے جس نے ایک قومی فنڈ مقرر کیا ہے جس کی غرض یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے غرباء کی طاقت کو بڑھایا جائے۔ اور انہیں بھی ترقی کی دوڑ میں اُمراء کے دوش بدوش کھڑا کیا جائے۔ یہ مال جن مقامات پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اِن میں سے ایک مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْبِ ہیں۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ روپیہ دیکر دوسروں کو مسلمان بنایا جائے۔ بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ غیر مذاہب میں سے جو لوگ اسلام سے دلچسپی رکھتے ہوں انہیں لٹریچر مہیا کیا جائے اور انہیں حق کی تلاش میں مدد دی جائے۔ پھر اس کا ایک مصرف مساکین ہیں۔ اور مساکین سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو کمائی نہیں کر سکتے اور جو دوسروں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ جب کسی قوم میں ایسے لوگ ہوں تو اُن کو دیکھ کر دوسروں کو بھی سوال کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اور اُن کی غیرت مٹ جاتی ہے۔ اگر ایک فنڈ ہو جس سے اُن کی مدد کی جائے تو قوم میں سوال کرنے کی عادت پیدا نہیں ہوتی۔ اسلامی طریق یہی ہے کہ لوگوں کی ضروریات کو جہاں تک ہو سکے خود پورا کیا جائے۔ اور جماعتی نظام اُن کا خیال رکھے اور اُن کے مانگنے کے بغیر ہی اُن کی ضرورت کو پورا کر دیا جائے۔ اور جو لوگ بغیر ضرورت کے مانگیں اُن کی سفارش نہ کی جائے اِس کے بغیر قوم کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔

پھر مسکین خالی وہ شخص نہیں جس کے پاس کچھ نہ ہو بلکہ مسکین وہ بھی ہے جو کوئی پیشہ تو جانتا ہو مگر اُس کے پاس اتنا روپیہ نہ ہو کہ وہ ضروری آلات خرید سکے ایسے شخص کے متعلق بھی ضروری ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور اُسے اپنے فن سے تعلق رکھنے والی ضروری اشیاء اور آلات مہیا کئے جائیں۔ اِسی طرح جو بیوگان اور یتامیٰ ہیں اُن کے کھانے پینے کا انتظام کیا جائے۔ یہ تمام باتیں يُزَكِّيْهِمْ میں شامل ہیں۔ کیونکہ اِس طرح قوم کے افراد ترقی کر سکتے ہیں۔

پھر تزکیہ سے ظاہری صفائی بھی مُراد ہے۔ جیسا کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ راستہ میں کوئی گند نہ پھینکا جائے کھڑے پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ سایہ دار جگہوں میں

جہاں لوگ آرام کرتے ہیں پاخانہ نہ پھرا جائے۔ اسی طرح وضو کرنا۔ جمعہ کے دن نہلانا بدن اور لباس کی میل دُور کرنا۔ ناک کان اور بالوں کی صفائی کرنا اور ناخنوں کے اندر میل جمنے نہ دینا۔ یہ تمام امور یُزَکِّیْهِمْ میں شامل ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص بُودار چیز کھا کر مسجد میں نہ آئے۔ کیونکہ اس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ پھر قلبی صفائی ہے۔ اس کے متعلق بھی اسلام اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا حامل ہے۔ اخلاقی تعلیم ہے اس کے متعلق بھی اسلام نے بڑا زور دیا ہے اور کہا ہے کہ غیبت نہ کرو۔ چغلی نہ کرو۔ حسد نہ کرو۔ دوسروں پر ظلم نہ کرو۔ تجارتی بددیانتی نہ کرو۔ حساب کتاب صاف رکھو۔ لین دین کے معاملات تحریر میں لے آیا کرو۔ سود نہ لو۔ قرض دو تو لکھ لیا کرو۔ قرض لو تو مقررہ وقت کے اندر ادا کرو۔ غرض تزکیۂ نفوس کے لئے تمام ضروری احکام اور اُن کی تفصیلات قرآن کریم نے بیان کر دی ہیں اور اُس نے انسانی اعمال اور جذبات اور فکر کا ایسا تزکیہ کیا ہے جس کی مثال کسی اور مذہب میں نظر نہیں آسکتی اور جس سے دعائے ابراہیمی کے پورا ہونے کا ایک زبردست ثبوت ملتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی کہ اے خدا! تُو ان میں ایسا رسول بھیج جو ان کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول فرماتے ہوئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نسلِ اسمٰعیل میں سے مبعوث فرما دیا۔ اور وہ تمام کام آپ نے کر دکھائے جن کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواہش کی تھی۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو دُعائے ابراہیمی کا مصداق قرار دیا ہے اور آپ نے فرمایا ہے۔ اَنَا دَعْوَةُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ (جامع البیان جلد اوّل صفحہ ۴۳۵) یعنی میں وہ شخص ہوں جو اپنے دادا ابراہیم کی دُعاؤں کے مطابق دنیا کی اصلاح کیلئے کھڑا کیا گیا ہوں۔ پس یہ ایک بہت بڑی دُعا ہے جو اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت ہے۔

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اسجگہ خدا تعالیٰ کی دو صفات عزیز اور حکیم کا اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ دُعائے ابراہیمی کا ایک حصہ صفت عزیز سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا صفت حکیم سے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ اور يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ والا حصہ صفت عزیز کے ماتحت ہے کیونکہ غالب خدا ہی بندوں تک پہنچ سکتا ہے۔ بندہ اپنی ذاتی جدوجہد سے اُس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور پھر غالب خدا کا ہی یہ حق ہے کہ احکام دے۔ دوسری طرف حکیم ہستی ہی دوسروں کو حکمت سکھا سکتی ہے۔ اور تزکیہ بھی حکمت ہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر حکمت سمجھائے بغیر کوئی بات منوائی جائے تو دل اُس کا تابع نہیں ہو سکتا۔ دل تبھی مانے گا جب وہ اس کی حکمت معلوم کرلیگا۔ اسی طرح تزکیہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جبتک دل پر اثر نہ ہو۔ غرض اس دُعا کا ایک حصہ صفت عزیز سے اور دوسرا صفت حکیم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی چار مقاصد خلافتِ اسلامی کے فرائض سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی دلائل سکھانا۔ خدا کی باتیں لوگوں کو بتانا شریعت سکھانا ایمان تازہ کرنے کے لئے قرآن کریم کے احکام اور اُن کی حکمتیں بتانا۔ جسمانی و قلبی طہارت پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ اور یہی مبلّغوں کارکنوں۔ پریذیڈنٹوں امیروں اور سکرٹریوں کا کام ہے۔ جب تک ان چاروں باتوں کو مدّنظر نہ رکھا جائے اُسوقت سلسلہ کی غرض و غایت پوری نہیں ہو سکتی۔ ابتدائے خلافت میں مَیں نے منصبِ خلافت میں اِنہی باتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا تھا تاکہ لوگ اس طرف توجہ کریں اور انہیں بار بار مجھ سے یہ پُوچھنے کی ضرورت نہ رہے کہ ہمیں بھی کوئی کام بتایا جائے۔ مگر بہت کم لوگ اس طرف توجہ کرتے ہیں۔ پس جو دوست سلسلہ کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں اُنہیں

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

اور اُس شخص کے سوا جس نے اپنے آپ کو ہلاک کر دیا ہو ابراہیم کے دین سے کون اعراض کر سکتا ہے؟

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٩﴾

اور ہم نے یقیناً اُسے (اس) دُنیا میں بھی برگزیدہ کیا تھا اور وہ آخرت میں بھی یقیناً نیک لوگوں میں (شمار) ہوگا۔ ١٤٧

چاہیئے کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں اور خود ہی دیکھ لیں کہ اُنکے کیا فرائض ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ وہ ان چاروں کاموں کو پُورا کریں۔ یہی وہ کام ہیں جن کیلئے اسلام نبوت خلافت اور امامت قائم کرتا ہے۔ پس نبی کا بھی اور پھر اس کے بعد خلفاء اور اُن کے تابعین کا بھی یہی کام ہوتا ہے اور جو شخص ان کاموں کو پُورا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے آپکو خدا تعالیٰ کے انصار میں شامل کر لیتا ہے۔

اِس رکوع کی آیت ۱۲۳ و ۱۲۴ میں یہ بتانے کے لئے کہ جو مضمون شروع کیا گیا تھا وہ ختم کیا جاتا ہے پھر اُسی مضمون کے الفاظ لائے گئے ہیں جو آیت ۴۱ میں تھے۔ اور فرمایا کہ دیکھو ہم نے اپنا عہد پورا کیا اور تمہیں لوگوں پر فضیلت دی۔ مگر اس کے مقابلہ میں تم نے جو شکر کیا وہ یہ ہے۔ پس اب تم میں نبی نہیں آسکتا۔ تم ایمان لاؤ۔ ورنہ عذاب الٰہی جب نازل ہوتا ہے تو نہ شفاعت کام دیتی ہے اور نہ تاوان۔ آیت ۱۲۵ میں بتایا کہ نبوت سے بنی اسرائیل کو محروم کرنا بھی اُسی عہد کے مطابق ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اولاد کے متعلق کیا گیا۔ آیت ۱۲۶ و ۱۲۷ میں اس سوال کا جواب دیا جو بنی اسرائیل کو نبوت سے محروم رکھنے پر پیدا ہُوا تھا کہ اب نبی کس قوم سے پیدا ہونا چاہیئے۔ فرمایا کہ بنو اسمٰعیل سے۔ چنانچہ اس کیلئے تعمیر کعبہ کا واقعہ یاد دلایا جس میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ بھی شامل تھے۔ اور دونوں نے بہت دُعائیں کی تھیں جو رائیگاں نہیں جا سکتیں۔ آیت ۱۲۸ و ۱۲۹ و ۱۳۰ میں ان دُعاؤں کا ذکر کیا اور اس نبی کے کاموں کی تفصیل بتائی جس کے مبعوث ہونے کی دُعا کی گئی تھی۔ اور ان دُعاؤں کو بیان کرکے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ بنو اسحٰق کی ترقی کے علاوہ بنو اسمٰعیل کی ترقی کے لئے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی۔ پس جب بنو اسحٰق اپنی بداعمالیوں سے نبوت کے انعام سے محروم کئے گئے تو اُن کے بعد بنو اسمٰعیل حق دار تھے کہ نبوت کا انعام انہیں ملتا۔ پس آنے والا نبی اسمٰعیل میں سے ہونا چاہیئے تھا اور انہیں میں سے آیا ہے۔

سَفِہَ

١٤٧ حل لغات:- سَفِهَ: (۱) سَفِهَ نَصِيْبَهٗ کے معنے ہیں نَسِيَهٗ اپنا حصہ بھول گیا۔ (۲) سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنے ہیں حَمَلَهٗ عَلَى السَّفَهِ۔ اُسے بیوقوفی پر آمادہ کیا۔ (۳) اَهْلَكَهٗ۔ اپنی جان کو ہلاک کیا۔ (۴) جَهِلَهٗ۔ اپنی حقیقت کو نہ سمجھا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے اِنَّمَا الْبَغْيُ مَنْ سَفِهَ الْحَقَّ اَيْ مَنْ جَهِلَهٗ یعنی ظلم کسی کا حق نہ پہچاننے کی وجہ سے ہوتا ہے اسجگہ سَفِهَ کے معنے حق کو بھول جانے اور اُس سے ناواقف ہو جانے کے ہیں۔ پس بھولنا۔ بیوقوف بنانا۔ ہلاک کرنا ناواقفی۔ عدم علم سب اس کے معنے ہیں۔ ان معانی کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ (۱) جو شخص اپنی جان کو بھول جاتا ہے (۲) جو اپنی جان کو حماقت پر آمادہ کرتا ہے یا اپنے نفس کو کہتا ہے کہ تم بیوقوفی کرو۔ (۳) جو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے (۴) جو اپنے نفس کو حقیقت سے آگاہ نہیں کرتا۔

اِصْطَفٰی کے معنے ہیں اِخْتَارَ۔ اختیار کر لیا پسند کر لیا۔ چن لیا۔ (۲) اَخَذَهٗ صَفْوَۃً اس کو پاکیزہ شکل میں لے لیا یعنی نہایت پسندیدہ صورت میں اسے اپنے قریب کر لیا۔ اور اس کے نیک اعمال دیکھ کر اسے اپنے قرب میں جگہ دی۔

صَالِحِیْن کے معنے ہیں درست جس میں صلاحیت پائی جائے۔ اور عملِ صالح وہ عمل ہے جو مناسب حال ہو۔ نیک عمل اور ہوتا ہے اور مناسب حال اور چیز ہے۔ نماز نیک عمل ہے مگر دشمن کے حملہ کے وقت وہ عمل صالح نہیں ہوتی بلکہ اس کے حملہ کا دفاع عمل صالح ہوتا ہے پس صالح وہ شخص ہے جس کی زندگی اپنے ماحول کے مطابق ہو۔ اور نیک بھی ہو۔ اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص صالح ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ نیک اعمال کرتا ہے اور مناسب حال کرتا ہے۔ بدی بھی کبھی مناسب حال ہوتی ہے۔ مگر وہ نیکی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ صالح نہیں ہوتی۔ صالح میں دونوں باتوں کی شرط ہے۔ یعنی وہ خیر ہی خیر ہو اور پھر مناسب حال ہو۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش کرنے کی بجائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال اس لئے پیش کی ہے کہ مخاطبین میں یہود اور نصاریٰ بھی شامل ہیں۔ اور ان کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ آپ پر ایمان ہی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال ان کے لئے دلیل ہو سکتی تھی کیونکہ عرب بھی اور یہودی بھی اور عیسائی بھی اور صابی بھی سب کے سب حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے میں مشترک تھے پس ضروری تھا کہ ان کے سامنے ایسے شخص کی مثال پیش کی جاتی جو علاوہ اہلِ عرب کے اہلِ کتاب کے تینوں گروہوں کے لئے بھی یکساں قابلِ احترام ہوتا اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہو سکتے تھے جو علاوہ عربوں کے یہود کے لئے بھی واجب الاحترام ہیں۔ عیسائیوں کے لئے بھی واجب الاحترام ہیں اور صابیوں کیلئے بھی واجب الاحترام ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اے عربو اور یہودیو اور عیسائیو اور صابیو! تم بھی ابراہیمی طریق اختیار کرو۔ اور جو خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم بن کر آیا ہے اُس کو مانو۔ اور قومی جنبہ داریوں اور تعصبات کو چھوڑ دو۔ جیسا کہ ابراہیم نے خدا تعالیٰ کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ تب تمہارے لئے بھی یہ موقعہ پیدا ہو جائیگا کہ تم خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کر لو۔

عربی زبان میں یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ اس میں صرف عن اور الی کے فرق سے بعض دفعہ ایک متضاد مفہوم پیدا کر دیا جاتا ہے حالانکہ دوسری زبانوں میں اس کے لئے مستقل لفظ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس جگہ بھی یَرْغَبُ کے ساتھ عَنْ کا صلہ استعمال کر کے اسے اعراض کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے حالانکہ الیٰ کے صلہ کے ساتھ اس کے معنے محبت اور پیار کے ہیں نہ کہ اعراض کے۔ درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو متضاد جذبات بھی ایک منبع سے تعلق رکھتے ہیں اور ظاہر میں ان کی جو ایک تبدیل شدہ شکل ہوتی ہے وہ حقیقت کا اختلاف نہیں بلکہ کیفیت کا اختلاف ہوتا ہے۔ رغبت اور نفرت بھی ایک ہی قسم کے جذبات ہیں۔ اسی طرح بہادری اور بزدلی بھی ایک ہی قسم کے جذبات ہیں صرف ان کی کیفیت بدل جاتی ہے مثلاً رغبت کو ہی لے لو۔ جب انسان ایک چیز کی رغبت کرتا اور اس کی طرف جاتا ہے اور دوسری چیز کی طرف سے ہٹتا اور نفرت کا اظہار کرتا ہے تو اگر ہم گہری چھان بین کریں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان دونوں کے پیچھے ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ جب انسان ایک چیز

اِصْطَفٰی

صَالِحِیْن

کی طرف جاتا ہے تو اس طرف جانے کا موجب بھی محبت ہوتی ہے۔ اور جب کسی چیز کی طرف سے پیچھے ہٹتا ہے تو اس کا موجب بھی ایک دوسری محبت ہوتی ہے۔ گویا رغبت کا منبع بھی محبت ہے اور بے رغبتی کا منبع بھی محبت ہے جب انسان ایک چیز کی طرف جاتا ہے تو وہ اُس چیز کی محبت کی وجہ سے جاتا ہے اور جب کسی سے پیچھے ہٹتا ہے تو کسی اور چیز کی محبت کی وجہ سے ہٹتا ہے۔ اسی طرح بہادری اور بزدلی خواہش حفاظت کے تابع ہوتی ہے۔ جب انسان حملہ کرتا ہے تب بھی اُس کی غرض جان بچانا ہوتی ہے اور جب دشمن سے بھاگتا ہے تب بھی وہ اپنی جان کی حفاظت کیلئے بھاگتا ہے لیکن طریق مختلف ہیں۔ ایک میں دوسرے پر حملہ کرکے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے اور دوسرے میں اپنے آپ کو ہٹا کر حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ غرض عن اور الیٰ کے استعمال میں یہ بتایا جاتا ہے کہ بہت سے جذبات ایک ہی منبع کے تابع ہوتے ہیں۔ مگر کیفیتوں کا اختلاف اور فرق اُن میں پایا جاتا ہے۔

اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ: سَفِهَ کے ایک معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے نَسِیَہٗ کے ہیں۔ اس لحاظ سے وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ کے یہ معنے ہونگے کہ اس شخص کے سوا جو اپنے نفس کے فوائد کو کلی طور پر نظر انداز کر دیتا ہے ابراہیمؑ کے دین سے کون اعراض کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کا طریق ترک کرنے سے نبیوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ہاں انسان کی اپنی جان کو ضرور نقصان پہنچتا ہے۔ ایک ظالم بادشاہ کو چھوڑنا اپنے نفس کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ مگر جو شخص عادل بادشاہ کو چھوڑتا ہے وہ اپنی جان کو آپ نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ وہ اُس کے عدل سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انبیاء کے نقش قدم پر نہ چلنا اور اُن کے طریق کو ترک کر دینا خود انسان کیلئے باعث نقصان ہوتا ہے کیونکہ وہ اُن فوائد سے محروم ہو جاتا ہے جو متابعت کے نتیجہ میں اُسے حاصل ہو سکتے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے۔ کہ ابراہیمؑ کا نمونہ یہ تھا کہ وہ تمام ابتلاؤں اور آزمائشوں کے دور میں سے کامیابی کے ساتھ نکلا اور اُس نے خدا تعالیٰ کی ہر آواز پر لبیک کہا۔ یہاں تک کہ جب اُسے کہا گیا کہ جا اور اپنے بیٹے اور بیوی کو ایک ایسے جنگل میں چھوڑ آ جہاں پانی کا ایک قطرہ اور غذا کا ایک دانہ تک نہیں ملتا تو [illegible] بے چون و چرا اُٹھا اور اُس نے میلوں میل کا سفر طے کرتے ہوئے اپنی بیوی اور بچے کو ایک بے آب و گیاہ جنگل میں لا کر چھوڑ دیا۔ اور خود واپس چلا گیا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ یہ عظیم الشان نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرکے فرماتا ہے کہ جو شخص اس ملت ابراہیمی سے اعراض کرتا اور خدا تعالیٰ کی راہ میں اُن قربانیوں سے کام نہیں لیتا جن کا اُس سے مطالبہ کیا جاتا ہے وہ بظاہر تو یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے اپنے نفس کی خیر خواہی کی۔ اُس نے اپنے مال کو بچا لیا۔ یا اپنی اولاد کو بچا لیا۔ یا اپنے جذبات اور احساسات کو قربان ہونے سے بچا لیا۔ مگر درحقیقت وہ اپنے نفس کو بھلانے والا ہوتا ہے۔

سَفِهَ نَفْسَهٗ کے دوسرے معنے ہیں حَمَلَهٗ عَلَى السَّفَهِ اُس نے اپنے نفس کو بیوقوفی پر آمادہ کیا اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ابراہیمی دعا جو ایک آنے والے عظیم الشان رسول کے متعلق ہے اپنے اندر دنیا کے لئے رحمت کا اتنا بڑا خزانہ پوشیدہ رکھتی ہے کہ جو شخص اس دعا سے اعراض کرتا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اس کے مصداق ہیں ایمان نہیں لاتا وہ اپنی حماقت اور بے وقوفی کا بدترین مظاہرہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ [illegible] اس وسیع نظام میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لئے تیار نہیں جو آیات الٰہیہ کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ہے جو کتاب اللہ کی ترویج کے لئے قائم کیا گیا ہے جو تمام احکام کی حکمتوں اور ضرورتوں کو

بیان کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے اور جو انسانی فکر اور عمل کی اصلاح اور تزکیۂ نفوس کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ جو شخص اِن تمام باتوں سے منہ موڑتا ہے اور نہ صرف روحانی تعلیمات سے اپنے آپ کو محروم رکھتا ہے بلکہ سیاست، تمدن، اقتصاد اور اخلاق کو ترقی دینے والی تعلیموں کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اور فلسفۂ احکام سے بھی غافل رہتا ہے اور فکر اور عمل کی بھی اصلاح نہیں کرتا۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس نظام کو ترک کر کے ایک بڑی بھاری حماقت کا ثبوت دیتا ہے۔

سَفِهَ نَفْسَهٗ کے تیسرے معنے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے ہیں چنانچہ لسان العرب میں سَفِهَ نَفْسَهٗ کے معنے یہ لکھے ہیں کہ اَهْلَكَ نَفْسَهٗ وَاَوْبَقَهَا۔ اُس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا اور برباد کر دیا۔ اس لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت کرنے والے خواہ مشرکین مکہ ہوں یا یہود اور نصاریٰ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ دعائے ابراہیمی کے اِس مصداق کو قبول نہیں کریں گے اور بیت اللہ کے قیام کے مقاصد اور ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کے مکہ میں قیام کی اصل غرض کو نظر انداز کر دیں گے تو وہ اپنی جان کو آپ ہلاک کرنے والے ہونگے یعنی اس لحاظ سے بھی اُن پر ہلاکت نازل ہوگی کہ وہ ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم سے محروم رہیں گے اور اس لحاظ سے بھی اُن پر ہلاکت نازل ہوگی کہ وہ خدائی عذاب میں گرفتار ہونگے جیسے ابوجہل نے تعلیم اسلامی پر عمل نہ کیا تو اُس پر خدا تعالیٰ کا فضل نازل نہ ہوا۔ یہ ایک طبعی نتیجہ تھا جو پیدا ہوا لیکن اِس کے علاوہ ایک شرعی نتیجہ بھی اُس نے دیکھا اور وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اُسے سزا دی اور وہ جنگِ بدر میں دو انصاری لڑکوں کے ہاتھوں نہایت ذلت کے ساتھ ہلاک ہوا۔

سَفِهَ نَفْسَهٗ کے چوتھے معنے جَهِلَهٗ کے ہیں اِس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہیں کہ اُس شخص کے سوا جو اپنے نفس کو اعلیٰ درجہ کے حقائق سے بے خبر رکھنا چاہتا ہے مِلّتِ ابراہیمی سے کون اعراض کر سکتا ہے! اِس میں یہ بتایا گیا ہے کہ دعائے ابراہیمی کے نتیجہ میں جو عظیم الشان تعلیم دنیا کو ملی ہے یہ انسان کی اندرونی قابلیتوں کو اُبھار کر اُسے کامیابیوں کے اعلیٰ مقام تک لے جاتی ہے۔ اور سوائے ایسے شخص کے جو اپنے نفس کا دشمن ہو اور اُسے اعلیٰ تعلیم سے باخبر رکھنا پسند نہ کرتا ہو اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ شخص جو ترقی کی دوڑ میں کسی دوسرے سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا وہ اُسے کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ اُس کے چھوڑنے سے نفسِ انسانی پر غفلت اور جمود کا طاری ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ جیسے موجودہ زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرنے والوں میں ایک عام جمود اور بے حسی پائی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ حج بھی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ بھی دیتے ہیں۔ صدقہ و خیرات میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ مگر ہمیں خدا نہیں ملتا حالانکہ اُن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہو کر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کہہ رہے ہوتے ہیں تو ساتھ ہی وہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے لئے تمام ترقیات کے دروازے بند ہیں۔ اور جب کسی انسان کا یہ خیال ہو تو اُسے نماز میں وہ جوش کس طرح پیدا ہو سکتا ہے جو اُسے خدا تعالیٰ تک پہنچا دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آتا ہے تو وہ کہتے ہیں۔ ابراہیمی انعامات میں ہم کہاں شریک ہو سکتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعام انہیں ملا وہ ہمیں کب مل سکتا ہے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں۔ اُن کے انعامات ہمارے لئے کہاں مقدر ہیں۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت مسیح علیہم السلام کا ذکر آتا ہے تو کہتے ہیں کہ جو کچھ

اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۲﴾

جب اُسکے ربّ نے اُسے کہا کہ (ہماری) فرمانبرداری اختیار کر۔ اُس نے (جواب میں) کہا کہ مَیں تو (پہلے ہی سے) تمام جہانوں کے ربّ کی فرمانبرداری اختیار کر چکا ہوں۔

خدا نے انہیں دیا وہ ہمیں کب میسّر آسکتا ہے۔ غرض جب بھی وہ کوئی اچھی چیز دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ہمیں نہیں مِل سکتی۔ پھر اُن کے اندر دُعا کے وقت جوش کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر ہمیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس مقام پر پہنچایا ہے کہ جب ہمارے سامنے اللہ تعالیٰ کے انبیاء کا ذکر آتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا وہ ہمیں بھی دے سکتا ہے اور ہمارے لئے بھی وہ مراتبِ قرب کھلے ہیں جو پہلے لوگوں نے حاصل کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے جو انعامات ہمیں ملتے ہیں وہ اُن کو نہیں ملتے۔ غرض مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰھٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے ذریعہ جو تعلیم دنیا میں آئی ہے وہ انسانی قوتوں کو اُبھارنے والی اور اُس کے نفس کو ترقیات کے بلند مینار تک لے جانیوالی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتی کہ انسان گنہگار پیدا ہُوا ہے بلکہ کہتی ہے کہ انسان فطرتًا نیک پیدا ہُوا ہے اور نیکی میں ترقی کرنے کیلئے پیدا ہُوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ مَیں اور نیکیاں کروں اور خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھ جاؤں لیکن جب یہ عقیدہ رکھا جائے کہ انسان گنہگار پیدا ہُوا ہے تو پھر انسان مُردہ ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ مجھے کسی نیک عمل کی کیا ضرورت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان اس تعلیم کو چھوڑ ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ تعلیم بڑی فوائد والی ہے اور اس سے وہی شخص اعراض کر سکتا ہے جو اپنے نفس کے حقوق پہچاننے سے بھی عاری ہو۔

اِصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں صفوۃ اور بزرگی بخشی تھی ۔ خدا تعالیٰ کا چنیدہ بندہ تھا۔ اُسے دوسروں پر فضیلت حاصل تھی اور خدا تعالیٰ کا قرب نصیب تھا۔

وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ اور آخرت میں بھی وہ یقینًا اُن بندوں میں شمار ہوگا جو جنتی زندگی کے مناسب حال اعمال بجالانے والے ہونگے۔ اِس سے صاف طور پر یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ جنت میں بھی عمل ہے اور وہ ایسا مقام نہیں۔ جیسا کہ مسلمان اس کا عام طور پر نقشہ کھینچا کرتے ہیں۔ کہ وہاں ہر شخص بیکار بیٹھا ہُوا رات دن کھانے پینے میں مشغول رہیگا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ وہاں اتنی حوریں ملیں گی۔ اتنے باغ ملیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اسکی بجائے وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگلے جہان میں بھی نیک عمل ہوگا۔ ورنہ کیا کوئی شخص یہ تصوّر بھی کر سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگلے جہان میں نعوذ باللہ بے نماز ہونگے یا وہاں اللہ تعالیٰ کے قرب میں بڑھنے کا احساس اُن کے دل میں نہیں رہیگا۔ پس وہاں بھی عمل ہوگا اور جنتیوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے قرب کے دروازے اُسی طرح کھلے ہونگے جس طرح اِس جہان میں کھلے ہیں۔

اَسْلَمَ

۲۸ حلِّ لغات:- اَسْلَمَ کے معنے ہیں اِنْقَادَ مطیع ہوگیا۔ (۲) تَدَیَّنَ بِدِیْنِ الْاِسْلَامِ اُس نے دین اسلام اختیار کر لیا۔ (۳) اَسْلَمَ اَمْرَہٗ اِلَی اللّٰہِ اُس نے اپنا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ پس اَسْلَمَ کے معنے ہیں سپرد کر دینا۔

تفسیر:- عربی زبان میں اَسْلَمَ کے ساتھ اِلٰی کا صلہ استعمال ہُوا کرتا ہے۔ لیکن یہاں اِلٰی کی بجائے لام کا صلہ استعمال کیا گیا ہے۔ مفسرین خیال کرتے ہیں کہ

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ

اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور (اسی طرح) یعقوبؑ نے بھی (اپنے بیٹوں کو) اس بات کی تاکید کی (اور کہا کہ) اے میرے بیٹو!

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ

اللہ نے یقیناً اس دین کو تمہارے لئے چن لیا ہے۔ پس ہرگز نہ مرنا

اس جگہ لام کا صلہ اِلٰی کا قائم مقام ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا تعالیٰ کے حکم اَسْلِمْ کے جواب میں اَسْلَمْتُ کہا تو یہ مضمون تو اس میں خود بخود آگیا کہ میں خدا تعالیٰ کا فرمانبردار ہو چکا ہوں کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کا ہی فرمانبردار ہونا تھا کسی اور کا نہیں۔ پس یہاں لام کا صلہ استعمال کرنے کی یہ وجہ نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے متعلق اپنی فرمانبرداری کا اظہار کرنا چاہتے تھے بلکہ درحقیقت اس میں اَسْلَمْتُ کہنے کی انہوں نے یہ وجہ بتائی ہے اور کہا ہے کہ میں اپنے کام خدا تعالیٰ کو اس لئے نہیں سونپتا اور اس وجہ سے اس کی فرمانبرداری نہیں کرتا کہ مجھے کوئی مادی نفع حاصل ہو۔ بلکہ میں رب العالمین خدا کی خاطر ایسا کرتا ہوں۔ تاکہ وہ مجھے مل جائے کیونکہ وہ میرا اور سب جہان کا محسن ہے اور میں اس سے جدا رہنا پسند نہیں کرتا۔ گویا یہ ایک زائد مضمون ہے جو انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ انہیں یہ حکم ہوا تھا کہ اَسْلِمْ یعنی اے ابراہیم! میں تجھے صرف یہی نہیں کہتا کہ تو کسی بت کو سجدہ نہ کر بلکہ میں تجھے یہ بھی کہتا ہوں کہ تو اپنے دل کے خیالات بھی کلی طور پر میری اطاعت میں لگا دے اور ابراہیمؑ نے اس کے جواب میں فوراً کہا کہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اے خدا! میرے جسم کا ذرہ ذرہ تیرے آگے قربان ہے۔ میری عقل اور میرا علم اور میرا ذہن سب تیرے احکام کے تابع ہیں۔ اور میری ساری طاقتیں اور ساری قوتیں رب العالمین خدا کی راہ میں لگی ہوئی ہیں۔ گویا انہوں نے بتایا کہ میری زندگی اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے وقف ہے۔ اور رب العالمین خدا کی مظہریت میں ساری مخلوق کی شفقت میرے پروگرام میں شامل ہے۔ اور میں اسے کبھی فراموش نہیں کرونگا۔ میں صرف اپنے لئے بھلائی نہیں مانگونگا بلکہ ساری دنیا کیلئے بھلائی مانگوں گا۔ اور ساری دنیا کی بہبودی ہمیشہ اپنے مدنظر رکھونگا۔ گویا انہوں نے اَسْلِمْ کے جواب میں اَسْلَمْتُ کہہ کر ایک تو اس طرف اشارہ کیا کہ میرے تو جسم اور روح کا ذرہ ذرہ پہلے ہی حضور کی راہ میں قربان ہے۔ حضور مجھ سے جو چاہیں معاملہ کریں اور پھر لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا اضافہ کر کے عرض کیا کہ میں نے تو اپنے آپ کو صفت رب العالمین کے ماتحت ساری دنیا کے لئے وقف کر دیا ہے۔ چنانچہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا مقام حاصل ہونے کی وجہ سے ہی انہوں نے یہ دعا مانگی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ چونکہ ان کی اپنی بعثت تمام دنیا کی طرف نہیں تھی اس لئے انہوں نے یہ دعا مانگی کہ الٰہی آئندہ دنیا میں ایک عظیم الشان رسول کھڑا کیجیئے اور وہ رسول میری اولاد میں سے ہو تاکہ ساری دنیا کی بھلائی ہو۔ اور رب العالمین

إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٣﴾ أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ

مگر اس حالت میں کہ تم (اللہ کے) پورے فرمانبردار ہو۔ ۳۹ھ کیا تم اُسوقت موجود تھے

إِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا

جب یعقوب پر موت (کی گھڑی) آئی۔ (اور) جب اُس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم

تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَ

میرے بعد کس کی عبادت کروگے! انہوں نے (جواباً) کہا کہ ہم تیرے معبود اور تیرے

کی تمام مخلوق اُس کے فیض سے مستفیض ہو۔

۳۹ھ تفسیر:- فرماتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اور ابراہیمؑ کے پوتے یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اِس بات کی تاکید کی تھی کہ تم اپنی خیرخواہی صرف اپنی ذات یا اپنی قوم تک محدود نہ رکھنا بلکہ اُسے وسیع کرتے چلے جانا اور ساری دنیا کو اِس میں شامل کرنا۔ اِس جگہ دین سے مراد وہی لائحہ عمل ہے جس میں تمام جہان کی بہتری مدنظر ہو۔ گویا ابراہیمؑ نے اپنے پڑپوتوں تک کو ہدایت دی کہ اپنے آپ کو صفت رب العالمین کا مظہر بنانا اور دنیا کی کسی قوم کو اپنی خیرخواہی سے محروم نہ رکھنا۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ ہروقت اسلام پر قائم رہو۔ کیونکہ موت کے متعلق کوئی انسان نہیں جانتا کہ وہ کب آجائے۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ ہمیشہ رب العٰلمین کے فرمانبردار رہو۔ اور خدا تعالیٰ کی اطاعت میں اپنی زندگی بسر کرو۔ تاکہ جب موت آئے تو وہ تمہیں اطاعت کے سوا اور کسی حالت میں نہ پائے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق بڑھاؤ کہ وہ تمہاری تباہی کو برداشت ہی نہ کرے۔ اور اُسوقت تم کو موت دے جبکہ تم کامل مومن بن چکے ہو اور اس کی خوشنودی حاصل کرچکے ہو۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان پر قبض اور بسط کی حالت آتی رہتی ہے کبھی تو انسان اللہ تعالیٰ کی محبت میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ دنیا جہان کو بھلا دیتا ہے اور کبھی دوسری چیزوں کی طرف اُسے اتنی توجہ ہوتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو منافق ہوگیا آپ نے فرمایا کس طرح؟ اُس نے کہا۔ یارسول اللہ! میں آپ کے پاس آتا ہوں تو میری اور حالت ہوتی ہے۔ اور جب میں گھر جاتا ہوں تو اَور حالت ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ کوئی گھبراہٹ والی بات نہیں۔ اگر ہروقت ایک جیسی حالت رہے تو انسان مرجائے۔ دراصل قبض اور بسط کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں۔ کامل مومن کی جو حالتِ قبض ہوتی ہے وہ اُس سے نچلے درجے والے کے لئے بسط کی حالت ہوتی ہے۔ اِسی طرح انبیاء پر بھی قبض و بسط کا دَور آتا رہتا ہے مگر نبیوں کی قبض صدیقوں کی بسط ہوتی ہے۔ اِسی لئے

اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا

باپ دادوں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی جو ایک ہی

وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٤﴾

معبود ہے عبادت کرینگے اور ہم اُسی کے فرانبردار ہیں۔ ۱۵۰؎

صوفیاء نے کہا ہے کہ حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ یعنی نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقربین کی بدیاں ہوتی ہیں۔ اِس کا یہی مطلب ہے کہ اوسط درجہ کے لوگ جس کو نیکی سمجھتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے نزدیک بعض دفعہ بدی بن جاتی ہے۔ اور اوسط درجہ کے لوگوں کی بدیاں ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی نیکیاں ہوتی ہیں۔ پس چونکہ یہ دو حالتیں انسان پر آتی رہتی ہیں اور موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ تم خدا تعالیٰ سے ایسا تعلق بڑھاؤ کہ تم پر موت ایسے وقت میں آئے جو تمہارا بہترین وقت ہو اور ملک الموت تمہاری اسوقت جان نکالے جب تمہارا خدا تعالیٰ سے ایک سچا اور مخلصانہ تعلق قائم ہوچکا ہو۔

۱۵۰؎ حل لغات:۔ اَلْاَبُ : اَلْوَالِدُ۔ وَيُسَمّٰى كُلُّ شَيْءٍ مَنْ كَانَ سَبَبًا فِيْ اِيْجَادِ شَيْءٍ اَوْ اِصْلَاحِهٖ اَوْ ظُهُوْرِهٖ اَبًا (مفردات راغب) یعنی اَبٌ والد کو کہتے ہیں۔ اِسی طرح ہر وہ چیز جو کسی چیز کے پیدا کرنے یا اصلاح کرنے یا ظاہر کرنے کا موجب ہو اُسے بھی اَبٌ کہتے ہیں۔ اور جب چچا کا باپ کے ساتھ ذکر کیا جائے تو چچا بھی اَبٌ کہلاتا ہے۔ اِسی طرح ماں باپ کیلئے اَبَوَيْن آتا ہے اور دادا اور باپ کا ذکر ہو تو بھی اَبَوَيْن کہتے ہیں۔ غرض ماں بھی اَبٌ اور چچا بھی اَبٌ اور دادا بھی اَبٌ کہلاتا ہے۔

تفسیر:۔ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ایک محاورہ ہے جو جان کندنی کے لئے نہیں بلکہ موت کے قریب آجانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ورنہ جان کندنی کے وقت تو انسان کلام ہی نہیں کر سکتا جب غرغرہ موت شروع ہو جاتا ہے تو انسان کے حواس پر اثر پڑنا شروع ہو جاتا ہے گو وہ بھی کبھی زیادہ لمبا اور کبھی بہت قلیل عرصہ کے لئے ہوتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ توبہ جان کندنی تک قبول ہوتی ہے۔ جب جان کندنی شروع ہو جائے۔ تو پھر توبہ قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب غرغرہ موت شروع ہو جاتا ہے تو حواس جاتے رہتے ہیں۔ یہ غرغرہ بھی دو قسم کا ہوتا ہے ایک ابتدائی اور ایک اُس کے بعد کا جو اصلی اور حقیقی ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے والد صاحب بڑے طاقتور تھے۔ غرغرہ موت شروع ہوا تو فرمانے لگے۔ غلام احمد یہ غرغرہ ہے۔ اور پھر چند منٹ کے بعد فوت ہو گئے۔ تو حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ سے مراد جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے یہ نہیں کہ جب جان کندنی شروع ہو گئی تھی۔ بلکہ اِس سے مراد یہ ہے کہ اُن کی موت کا وقت قریب آگیا تھا۔

اِذْ قَالَ یہ پہلے اِذْ کا بدل ہے۔ گویا حَضَرَ الْمَوْتُ سے مراد وہ وقت ہے۔ جب انہوں نے موت کو قریب دیکھتے ہوئے وصیت کی۔ اور اپنی اولاد سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے، قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ۔ اِس آیت پر عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ تو اُن کے آباء میں سے نہ تھے۔ بلکہ چچا تھے۔ پھر انہیں اَبٌ کیوں کہا گیا ہے، مگر یہ اعتراض

اَلْاَبُ

اُن کی عربی زبان سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ عربی زبان میں اَبٌ کا لفظ چچا کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے لیکن چونکہ عیسائی جب قرآن کریم پڑھتے ہیں تو اُن کی نیت صرف اعتراض کرنا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ بات بات پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے اُنکی اپنی نابینائی کا ثبوت ملتا ہے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب انہوں نے نَعْبُدُ اِلٰھَکَ کہدیا تھا تو پھر اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا کہنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ جو یعقوبؑ کا معبود تھا وہی ابراہیمؑ کا معبود تھا۔ وہی اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کا تھا۔ پس اِلٰھَکَ پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے اِلٰهَ اٰبَآئِكَ کہنا اور پھر اس پر بھی اکتفاء نہ کرتے ہوئے ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے الفاظ بڑھانا کیا معنے رکھتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں ایک حکمت ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وراء الوراء ہے جو انسان کو نظر نہیں آتی۔ ہم ربّ۔ رحمٰن اور رحیم وغیرہ الفاظ تو استعمال کر لیتے ہیں مگر خدا تعالیٰ کی پوری حقیقت صرف ان چند الفاظ سے واضح نہیں ہوتی۔ اور جب انسان یہ چاہتا ہو کہ وہ کسی بات کو کھول کر بیان کرے تو اس کی وضاحت کے لئے مختلف طریق اختیار کرتا ہے۔ جیسے اگر انسان اپنے کسی محسن کا احسان یاد دلائے تو وہ کہتا ہے کہ فلاں کا مجھ پر احسان ہے اور پھر اُس کی تشریح کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اُس نے کیا احسان کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے جلال اور اُس کے جمال کا اظہار مختلف تجلیات میں ہوتا ہے۔ کوئی تجلی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی۔ کوئی تجلی حضرت اسحاق علیہ السلام پر ہوئی۔ کوئی تجلی حضرت اسماعیل علیہ السلام پر ہوئی۔ پس اُن کی اولاد نے ضروری سمجھا کہ وہ اپنے اُن آباء کا نام لیکر کہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اُن تجلیات سے خوب آگاہ ہیں جو اُن کے وجود سے ظاہر ہوئیں۔ ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھی دیکھی ہے اور خدا تعالیٰ کی وہ تجلیات بھی دیکھی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ظاہر ہوئی تھی۔ اسی طرح ہم نے وہ تجلی بھی دیکھی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر ظاہر ہوئی تھی۔ پھر حضرت اسحاق علیہ السلام والی تجلی سے بھی ہم ناواقف نہیں۔ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اپنے تفصیلی علم کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ کیا اتنے جلوے دیکھنے کے بعد بھی ہم بے ایمانی کر سکتے ہیں۔ یہ ویسی ہی بات ہے۔ جیسا کہ ہندہ کے متعلق فتح مکہ کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا تھا کہ وہ جہاں ملے اُسے قتل کر دیا جائے۔ کیونکہ اُس نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کروایا تھا۔ مگر وہ عورت ہوشیار تھی۔ چالاکی سے عورتوں میں مل کر بیعت کرنے کے لئے آگئی۔ جب آپؐ نے عورتوں سے فرمایا کہ کہو ہم شرک نہیں کرینگی تو وہ فوراً بول اُٹھی کہ یا رسول اللہ! کیا اب بھی ہم شرک کرینگی۔ آپ اکیلے تھے اور آپ کے مقابلہ پر تمام عرب تھا۔ ہم نے آپکی مخالفت کی اور آپ کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا مگر اس کے باوجود آپ کامیاب ہوگئے اور ہمارے بتوں نے ہماری کچھ بھی مدد نہ کی۔ کیا اتنے واضح نشان کے بعد بھی ہم شرک کرینگی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے بھی یہی جواب دیا۔ چونکہ اُن کے ایک حصہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مخالفت کر کے عدم ایمان کا ثبوت دیا تھا۔ اور پھر مصر میں بُت پرستی بھی عام تھی اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اُن سے آخری وقت میں پوچھا کہ میری زندگی میں تم میری پیروی کرتے رہے۔ لیکن اب بتاؤ کہ میرے مرنے کے بعد تم کیا رویہ اختیار کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا ایمان اب پختہ ہو چکا ہے اور ہم پر تمام تجلیات ظاہر ہو چکی ہیں اب ہم خدا تعالیٰ کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ وہ نادانی کا

وقت آور تھا جبکہ ہم نے یوسف علیہ السلام کی مخالفت کی اور انکو کوئیں میں ڈال دیا تھا۔ اب ہم سے یہ حماقت نہیں ہو سکتی۔

اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ کا بدل ہے۔ چونکہ انہوں نے مختلف ناموں یعنی ابراہیمؑ۔ اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ کی طرف اللہ کو منسوب کیا تھا اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ شاید کئی اِلٰہ ہوں اس شبہ کے ازالہ کے لئے بتایا کہ وہ ایک ہی خدا ہے۔

اِلٰهًا وَّاحِدًا حال بھی ہو سکتا ہے یعنی حَالَ كَوْنِهٖ اِلٰهًا وَّاحِدًا اس حال میں کہ ایک ہی خدا ہے صرف اس کی تجلیات مختلف ہیں۔ درحقیقت اس میں یہود کو توجہ دلائی گئی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام تو مرتے وقت بھی ایک خدا کی پرستش کی تاکید کرتے گئے ہیں پھر اُن کی نسل آج اپنی ہوا و ہوس کے پیچھے کیوں پڑ رہی ہے۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک ہر سچا پرستار مسلم ہے۔ چنانچہ پہلے کہا تھا۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اور اسجگہ انہوں نے خود کہا ہے وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ حالانکہ اس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ابھی مبعوث نہیں ہوئے تھے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر دین کا سچا پرستار مسلم ہے اور اسی بنا پر تمام پہلے مذاہب کے پیرو جو اپنے مذہب کی تعلیم پر سچے دل سے عمل کرنے والے تھے وہ بھی مسلم ہی تھے۔ کیونکہ جو بھی خدا اور اُس کے نبی پر ایمان لاتا ہے۔ مسلم بن جاتا ہے۔ مگر اُن میں اور ہم میں یہ فرق ہے کہ اُن کا نام مسلم نہ تھا مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے لوگ مسلم نام سے پکارے جاتے ہیں۔ پہلی امتوں کے افراد بے شک اطاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے مسلم تھے۔ مگر لفظ مسلم نام کے طور پر وہ استعمال نہیں کرتے تھے اور نہ اس نام سے پکارے جاتے تھے۔ لیکن اس اُمت کے لوگ اِس نام سے پکارے جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے مذاہب منسوخ ہونے والے تھے۔ لیکن اسلام نے کبھی منسوخ نہیں ہونا تھا۔ پس اس کو یہ نام دیا گیا تاکہ گڑبڑ واقع نہ ہو۔ اور اسی مذہب کے پیرو مسلم کہلائیں جس نے قیامت تک قائم رہنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا تعالےٰ جب کوئی نام دیتا ہے تو اُسوقت دیتا ہے جب اُس نے ہمیشہ کے لئے قائم رہنا ہو جیسے کسی نبی کا پہلے کوئی کلمہ نہیں ہوتا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک کلمہ بھی دیا گیا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے بہت سے کلمے بنالئے ہیں جیسے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عِيْسٰى رُوْحُ اللّٰهِ - یا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اٰدَمُ صَفِيُّ اللّٰهِ یا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُوْسٰى كَلِيْمُ اللّٰهِ اور پھر اس کے لئے انہوں نے کوئی نہ کوئی روایت بھی گھڑلی ہے۔ مگر درحقیقت حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر بنی اسرائیل کے آخری نبی تک کوئی کلمہ نہ تھا صرف وہی کلمہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے۔ کیونکہ اگر پہلے خدا تعالےٰ کے نام کے ساتھ کسی نبی کا نام لگایا جاتا اور پھر اُسے ہٹایا جاتا تو یہ بے ادبی ہوتی۔ پس صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی خدا تعالےٰ کے نام کے ساتھ لگایا گیا کیونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نام نے قیامت تک چلنا تھا۔

غرض اللہ تعالےٰ کی یہ سنت ہے کہ جس چیز نے مٹ جانا ہو اُسے نام نہیں دیا جاتا۔ چونکہ اس امت نے قیامت تک رہنا تھا اس لئے اِسے مسلم نام دے دیا گیا۔ اِسی طرح آپ کی تعلیم کو بھی ایک نام دے دیا گیا۔ یعنی قرآن۔ پہلی کتابوں مثلاً تورات اور انجیل وغیرہ کا نام خدا تعالےٰ نے نہیں رکھا۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کا نام قرآن خود خدا نے رکھا ہے۔ غرض خدا تعالےٰ خود

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ

یہ وہ جماعت ہے جو (اپنا زمانہ پورا کر کے) فوت ہو چکی ہے۔ جو کچھ اُس نے کمایا (اُس کا نفع نقصان) اُس کیلئے ہے۔ اور جو کچھ تم نے کمایا (اُس کا نفع نقصان) ...

اپنی طرف سے اُن کو نام دیتا ہے جنہوں نے قائم رہنا ہوتا ہے۔ پس معنوی لحاظ سے تو سب لوگ مسلم تھے جو پہلی اُمتوں میں ہوئے مگر جہاں تک مسلم نام کا تعلق ہے خدا تعالیٰ نے یہ نام صرف اس اُمّت کو دیا ہے۔ کیونکہ یہ قیامت تک رہنے والی تھی۔ انجیل اور تورات لوگوں کے اپنے رکھے ہوئے نام ہیں۔ اور انہی ناموں سے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ اس بات سے کہ قرآن کریم میں انکے یہ نام آئے ہیں یہ استدلال نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ نے اُن کے یہ نام رکھے تھے۔ جیسے قرآن کریم نے زید کا بھی نام لیا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ جب وہ پیدا ہُوا تھا تو اس کا نام خدا تعالیٰ نے رکھا تھا وہ تو اس کے ماں باپ نے ہی رکھا تھا مگر خدا تعالیٰ نے بھی وہی نام لیا۔ کیونکہ اسی نام سے وہ مشہور تھا۔

پھر سابق مذاہب کے پیرؤوں کو اس وجہ سے بھی مسلم کا نام نہیں دیا گیا کہ نام پانے کا مستحق کامل مذہب ہی ہوتا ہے۔ پس جب وہ مذہب بھیجا گیا جو اپنے کامل ہونے کی وجہ سے تمام مذاہب سے افضل تھا تو اس کا نام بھی اسلام رکھ دیا گیا۔ تاکہ اس کا نام ہی اس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہو۔ وہیری ایک عیسائی مفسر ہے وہ اعتراض کرتا ہے کہ اس آیت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلے لوگ بھی میرے دین کے تابع تھے۔ چنانچہ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ سے وہ استنباط کرتا ہے کہ یعقوبؑ کی اولاد نے کہا کہ ہم محمدؐ پر ایمان لاتے ہیں اور پھر بہت سے دلائل سے اس بات کو رَدّ کرتا ہے اور کہتا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ مگر دراصل وہیری کو دھوکا لگا ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ وہ اُنہی تفاصیل کے پابند تھے جو اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں سچے دین کے پیرو تھے اور اس سے کوئی سلیم العقل انسان انکار نہیں کر سکتا۔ ورنہ نام کے طور پر یہ لفظ صرف اُمتِ محمدیہ کو ملا ہے اَور کسی کو نہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وصیّت کی تھی یا نہیں؟ اور اگر کی تھی تو اس کا کیا ثبوت ہے؟ اِس بارہ میں یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کا تورات سے ثبوت پیش کریں۔ یہ تو عقلی بات ہے کہ ہر راستباز اپنی اولاد کو اس قسم کی نصیحتیں کرتا اور اُن پر عمل کرنے کی تاکید کیا کرتا ہے۔ خصوصاً موت کے وقت اپنی اولاد کو وصیت کرنا تو ایک ایسی عام بات ہے جس کا نظارہ ہمیں لاکھوں آدمیوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے تو یہ بات اَور بھی ضروری تھی۔ کیونکہ وہ حصّہ جو ٹھوکر کھا چکا ہو اس کے متعلق والدین کو ہمیشہ فکر ہوتی ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے۔ پس یہ ایک فطری بات ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا لیکن اگر انہوں نے وصیت کی بھی تھی تو سوال یہ ہے کہ کیا بنی اسرائیل نے بائیبل میں یہ وصیّت رہنے دینی تھی؟ جن لوگوں کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے اتنا بغض ہے کہ راستہ چھوڑ کر بھی اُن کی عیب جوئی کر لیتے ہیں۔ اگر اُن کا ذکر آجاتا تو انہوں نے اُسے کہاں رہنے دینا تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ اُن کی کُتب انسانی دست بُرد سے

وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور جو کچھ وہ کرتے تھے اُس کے متعلق تم سے (کچھ) نہیں پُوچھا جائیگا۔ ۱۵۱ھ

محفوظ نہیں۔ اِس وصیّت کے کچھ کچھ نشان ہمیں مِل جاتے ہیں۔ اور یہ نشان بھی خود عیسائیوں نے ہمیّا کیا ہے۔ کئی عیسائیوں نے قرآن کریم کے ترجمے کئے ہیں۔ اُن میں سے ایک مترجم راڈول بھی تھا۔ اُس نے اپنے مترجم قرآن کریم میں اِس آیت کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ مدراش ربّاہ میں جو طالمود کا حصّہ ہے پیدائش باب ۴۹ آیت ۲ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"اُس وقت کہ ہمارے باپ یعقوب نے اس دنیا کو چھوڑا۔ اُس نے اپنے بارہ بیٹوں کو اکٹھا کیا اور اُن سے کہا۔ اپنے باپ اسحٰق کی بات کو سُنو۔ کیا تمہارے دلوں میں قدوس خدا کے متعلق کوئی شبہ ہے! انہوں نے کہا۔ سُن اے اسرائیل ہمارے باپ جس طرح تیرے دل میں کوئی شبہ نہیں۔ اِسی طرح ہمارے دل میں بھی نہیں۔ کیونکہ وہ آقا ہمارا خدا ہے اور وہ ایک ہے۔"

MIDS RABBAH ON GENESIS
PAGE 98
DEUT PARA 2

پس حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں کو جمع کرنا اور انہیں نصیحت کرنا اور پھر ان کا اقرار کرنا ثابت ہے۔ گو اس کی ساری تفصیل نہیں۔ اور یہی فرق ہے جو قرآن کریم کی عظمت کو دوبالا کرتا ہے۔ قرآن کریم ۱۹۰۰ سال کے بعد نازل ہوکر صحیح تفصیل بیان کر دیتا ہے۔ مگر بائبل اپنے زمانہ کی بھی صحیح تفصیل نہیں بتاتی۔

۱۵۱ھ حل لغات:۔ خَلَا کے معنے گزر جانے کے ہوتے ہیں (مفرداتِ راغب) چنانچہ خَلَا الزَّمَانُ کے معنے ہیں مَضٰی یعنی زمانہ گذر گیا۔ آگے محاورہ میں اِس کے معنے مَاتَ کے بھی آتے ہیں۔ خَلَتْ: مَاتَتْ۔ اِنْقَضَتْ وَسَارَتْ اِلَى الْخَلَاءِ وَهُوَ الْاَرْضُ الَّتِيْ لَا اَنِيْسَ فِيْهَا۔ یعنی خَلَتْ کے معنے ہیں مر گیا اور ایسی زمین میں چلا گیا جہاں اُس کا کوئی انیس اور غمخوار نہیں۔

تفسیر:۔ عام طور پر لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا کے اعمال ہمارے کام آجائیں گے۔ اگر وہ نیک اور پارسا تھے تو ہم بھی اُن کی اولاد ہونے کی وجہ سے اُنہی کے ساتھ جگہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں اِس خیال کی تردید فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ اُن کے اعمال اُن کے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ تم سے یہ نہیں پُوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادا کیسے اعمال کرتے تھے۔ بلکہ یہ سوال ہوگا کہ تم کیا کرتے رہے۔ اگر یہ سوال ہونا ہوتا کہ تمہارے باپ دادوں نے کیا کیا تھا تو شاید تم بچ جاتے مگر سوال تو یہ ہوگا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ چنانچہ لَهَا مَا كَسَبَتْ میں یہی بتایا ہے کہ اُن کی نیکیاں تمہارے کام نہیں آئینگی اور تمہاری بدیاں اُن کے ذمہ نہیں ڈالی جائیں گی۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ حضرت ابراہیمؑ۔ اسمٰعیلؑ اور اسحاق علیہم السلام نے کیا کیا تھا۔ بلکہ یہ پُوچھا جائیگا کہ تم نے کیا کیا۔

وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کا یہ مطلب نہیں کہ تم سے پہلے لوگوں کے گناہوں کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا بلکہ یہ مطلب ہے کہ تم سے یہ نہیں پُوچھا جائیگا کہ انہوں نے کیا کیا نیکیاں کی تھیں۔ بلکہ تم سے صرف

خَلَا

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ

اور (کیا تم نے سُنا کہ) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودی یا مسیحی ہو جاؤ (اس طرح) تم ہدایت پا جاؤ گے۔ تُو (اُن سے) کہہ دے کہ (یوں) نہیں

مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

بلکہ ابراہیم کے دین کو جو (خدا ہی کی طرف) جھکنے والا تھا (اختیار کرو) اور (یاد رکھو کہ) وہ مشرکوں میں سے نہ تھا ۵۲؎

تمہارے ذاتی اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ اس لئے اپنے اسلاف کے عمل پر اپنی نجات کو منحصر نہ سمجھو۔

اَلْحَنِيْفُ

۵۲؎ حل لغات:۔ اَلْحَنِيْفُ کے معنے ہیں اَلْمَائِلُ عَنِ الشَّیْءِ۔ کسی چیز کی طرف سے توجہ پھیر کر دوسری طرف جھک جانے والا۔ محاورہ میں اس کے معنے ہیں اَلْمَائِلُ عَنِ الضَّلَالَةِ اِلَى الْهُدٰى (مفردات) جو شخص ضلالت کی طرف سے منہ پھیر کر ہدایت کی طرف توجہ کرے۔ (۳) اَلْمُسْتَقِيْمُ۔ سیدھا (اقرب الموارد) (۴) اَلصَّحِيْحُ الْمَيْلَانِ اِلَى الْاِسْلَامِ۔ جس کی اسلام کی طرف صحیح توجہ ہو۔ پس حنیف کے معنے ہیں۔ ضلالت چھوڑنیوالا صحیح راستہ پر چلنے والا۔ اسلام کی طرف صحیح رغبت رکھنے والا۔ اور اس کے ایک معنے قرآن کریم سے یہ ثابت ہوتے ہیں کہ جو سارے رسولوں پر ایمان رکھتا ہو۔ کیونکہ اس کے معًا بعد یہ ذکر آتا ہے کہ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ گویا حنیف کی تشریح یہ ہے کہ جو سب رسولوں پر ایمان لائے۔ ابن کثیر میں ابوقلابہ کا بھی ایک قول آتا ہے کہ اَلْحَنِيْفُ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِالرُّسُلِ كُلِّهِمْ مِنْ اَوَّلِهِمْ اِلٰى اٰخِرِهِمْ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اوّل برحاشیہ فتح البیان صفحہ ۳۲۵) یعنی حنیف وہ ہے جو سب رسولوں پر ایمان لائے۔ انہوں نے معلوم نہیں کہاں سے استدلال کیا ہے مگر میں نے اس سے اگلی آیت سے استدلال کیا ہے۔ کیونکہ اگلی آیت میں حنیف ہی کی تشریح ہے اور تمام رسولوں کے ماننے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ یہودی بننے میں نجات ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ عیسائی بننے میں نجات ہے۔ مگر دونوں کی بات غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ یہودی کہلانے سے کام بنیگا نہ نصرانی کہلانے سے۔ بلکہ ابراہیمی ملت کی پیروی کرنے سے نجات ہوگی۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ابراہیمی کہلانے سے نجات ہوگی۔ کیونکہ یہ پھر ویسی ہی بات ہو جاتی جیسی انہوں نے کہی تھی۔ اسلئے فرمایا کہ ہدایت حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان ہدایت کا راستہ اختیار کرے۔ یہی طریق ابراہیمؑ کا تھا جو ہر وقت خدا کے حکموں کی طرف کان لگائے رکھتا تھا۔ محض یہودی یا عیسائی کہلانے سے کچھ نہیں بن سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں جسقدر مذاہب پائے جاتے ہیں ان سب کے پیروؤں میں اپنے تنزل کے زمانہ میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ شاید اسی مذہب میں شامل ہوکر نجات میسر آسکتی ہے لیکن یہ ایک غلط خیال ہے۔ نجات کا اصل باعث فضلِ الٰہی ہوتا ہے۔ اور فضلِ الٰہی کو جذب کرنے کا ذریعہ اطاعتِ الٰہی ہے۔ پس جبتک کسی سچے مذہب میں شامل ہوکر اطاعتِ الٰہی ہو اُسوقت تک تو اُس میں نجات کا امکان ہے۔ لیکن جب اطاعت نہ ہوتی ہو تو

کوئی نجات نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں یہود اور نصاریٰ کو جو زور دیتے ہیں کہ ہدایت پانا چاہو تو ہمارے مذہب میں داخل ہو جاؤ پھر ڈانٹا ہے کہ کیا کسی مذہب کا نام لینے سے نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ نجات حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ مِلّتِ ابراہیم کی اتباع کی جائے اور ابراہیمؑ کا طریق یہ تھا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم بھی ملا۔ انہوں نے اُس کو قبول کر لیا۔ یہی دینِ ابراہیمؑ ہے۔ اور اسی کی پیروی ہر اُس قوم پر فرض ہے جو ابراہیمؑ کی بزرگی کی قائل ہے۔ حنیف کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ایسے شخص کے ہیں جو ضلالت سے مُنہ موڑ کر ہدایت اور راستی کی طرف جھکا ہُوا ہو۔ اسی طرح حنیف اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو اسلام کا کلّی طور پر والہ و شیدا ہو اور اُس کی طرف اپنی تمام توجہات کو مرکوز رکھتا ہو۔ اور ابو القلابہ نے جو ایک بہت بڑے مفسر اور تابعین میں سے ہیں حنیف کے معنے ایسے شخص کے کئے ہیں جو اوّل سے آخر تک تمام انبیاء پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حنیف قرار دے کر بتایا گیا ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے ایک ایسے مقام پر فائز تھے کہ ضلالت کی طرف ایک معمولی میلان بھی اُن کے تصوّرات سے بالا تھا۔ اور خدا تعالیٰ کے احکام کی کامل اطاعت اور فرمانبرداری اُن کا شیوہ تھا۔ اس کے بعد فرمایا۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھے حنیف کے ساتھ ان الفاظ کی زیادتی اِس حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے کی گئی ہے کہ جو شخص الہام اور نبوّت و رسالت کے سلسلہ کو بند کر کے ایک مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے وہ حقیقتاً مشرک ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا نمائی کا آئینہ اس کے انبیاء ہوتے ہیں اور اُنہیں کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی حقیقی توحید دنیا میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

توحید صرف اس بات کا نام نہیں کہ خدا تعالیٰ کو ایک سمجھ لیا جائے بلکہ اُسے اپنی تمام صفات میں یکتا قرار دینا اور مخلوق میں سے کسی کو اُس کا شریک قرار نہ دینا توحید کا ایک اہم حصّہ ہے۔ جب کسی نبی کی بعثت پر ایک لمبا زمانہ گذر جاتا ہے تو توحید کا اقرار کرنے کے باوجود لوگ قسم قسم کے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کا حقیقی چہرہ لوگوں کی نگاہ سے مخفی ہو جاتا ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تمام مسلمان اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتے تھے مگر اس کے باوجود وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ مسیح علیہ السلام مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔ پرندے پیدا کیا کرتے تھے۔ اور علم غیب سے حصّہ رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام عقاید مشرکانہ ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جہاں اور غلط عقائد کی اصلاح فرمائی وہاں آپ نے ان مشرکانہ عقائد کی بھی پُرزور تردید فرمائی اور خدا تعالیٰ کی توحید دنیا میں قائم کی۔ پس انبیاء پر ایمان لائے بغیر توحیدِ حقیقی کا قیام ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی ذات پر ایمان لانے کے ساتھ ہی نبیوں پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دیا ہے۔ اگر یہ مقدس لوگ دنیا میں نہ آتے تو خدا تعالیٰ کا چہرہ لوگوں کو دکھائی نہ دیتا اور وہ ضلالت اور گمراہی سے نہ نکل سکتے۔ پس چونکہ خدا تعالیٰ کی شناخت انبیاء پر ایمان لانے کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے حنیف کے ساتھ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کے الفاظ اس امر کی طرف توجہ دلانے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ ابراہیمؑ مشرکوں میں سے نہ تھا بلکہ وہ سلسلۂ نبوت کے دائمی اجراء کا قائل تھا۔ اسی لئے اس آیت کے معاً بعد یہ کہا گیا ہے کہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ ہم تمام انبیاء سابقین پر بھی ایمان لاتے ہیں وَمَا اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ اور جو کچھ اور نبیوں کو دیا گیا یا آئندہ دیا جائیگا اس پر بھی ایمان لاتے ہیں

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ

تم کہو کہ ہم اللہ پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو کچھ ابراہیمؑ

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ

اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور (اُنکی) اولاد پر اتارا گیا تھا اور جو کچھ

اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ

موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا گیا تھا۔ (اسی طرح) جو کچھ (باقی) انبیاء کو اُن کے رب کی طرف سے دیا گیا تھا۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

(اس تمام وحی پر) ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اُن میں سے ایک (نبی اور دوسرے نبی) کے درمیان (کوئی بھی) فرق نہیں کرتے اور ہم اُسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۵۳

بے شک وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام شرک سے بالکل بیزار تھے اور ایک خدا کی پرستش کرتے تھے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ مشرکین مکہ نے خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے پھر بھی کسی بُت کی نسبت اُن کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس کی پرستش کیا کرتے تھے بلکہ وہ آپکو کامل موحد تسلیم کرتے تھے۔ اور اُن کی قدیم روایات اس کی تصدیق کرتی تھیں۔ اِسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُن حالات میں بھی جو بائیبل میں موجود ہیں شرک کی تعلیم کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ مگر یہ صرف اس ٹکڑہ کے ایک معنے ہیں جو اپنی جگہ درست ہیں لیکن حنیف کے ساتھ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا اضافہ بتا رہا ہے کہ اِس جگہ مشرک اس شخص کو نہیں کہا گیا جو عرفِ عام میں شرک کا ارتکاب کرتا ہے بلکہ اس شخص کو کہا گیا ہے جو سلسلہ رسالت کو مسدود قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی توحید کی اشاعت میں روک بنتا ہے۔ اور اُس کے مقابل پر اپنے ایک فرضی عقیدہ کو ہوا کر کھڑا کر دیتا ہے حالانکہ اصل مقام

اطاعت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جو کچھ کہے۔ انسان اُسے مان لے اور ہر زمانہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے جو پیغامبر آئے اُس کی آواز پر لبیک کہے۔

اَلْاَسْبَاطِ

۵۳ حل لغات:۔ اَلْاَسْبَاطِ: سِبْطٌ کی جمع ہے۔ اور سِبْطٌ کے معنے اصل میں پھیلاؤ کے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے لمبے بالوں کو سِبط کہتے ہیں۔ سخی آدمی کو سِبْطُ الْكَفَّيْنِ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا ہاتھ ہر ایک حاجت مند تک پہنچ جاتا ہے۔ بیٹے کے بیٹے کو بھی سِبط کہتے ہیں۔ کیونکہ جب بیٹوں کے بیٹے ہو جائیں تو نسل کا پھیلاؤ شروع ہو جاتا ہے۔ پس اَسْبَاط کے معنے پوتوں کے ہونگے یا اُن کی نسل کے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کے پھیلانے کا باعث اور ذریعہ ہوئی۔

تفسیر:۔ اِس آیت سے ظاہر ہے کہ مسلم وہ ہے جو خدا تعالیٰ کے تمام انبیاء پر ایمان لائے اور نفسِ نبوت کے لحاظ سے اُن میں کوئی فرق نہ کرے جن انبیاء کا اُسے علم ہو اُن کی نبوت کا نام لے کر اقرار کرے۔ اور جو معلوم نہیں اُن کی نبوت پر اجمالاً ایمان لائے یعنی یہ یقین کرے

کہ ہر قوم میں خدا تعالیٰ کا کوئی نہ کوئی نبی ضرور آیا ہے اور ہم سب کو سچا تسلیم کرتے ہیں اور ان کی پیش کردہ تعلیموں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مانتے ہیں۔ پس جو شخص اپنے زمانہ یا اس سے پہلے زمانہ کے سب نبیوں کی نبوت کا اقرار کرے اور کسی نبی کا انکار نہ کرے وہ مسلم ہے۔ کیونکہ تمام نبیوں کی نبوت کا اقرار کرانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فقرہ فرمایا ہے کہ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ ہم اسکے فرمانبردار ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اقرار کے بعد انسان مسلم بنتا ہے۔ اور یہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ دنیا کے تمام انبیاء کی صداقت کا اقرار کرتا ہے۔ ہر مذہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کے نبیوں کی صداقت تو منواتے ہیں۔ لیکن دوسری اقوام کے انبیاء کی صداقت منوانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ اسلام سب انبیاء کی صداقت کا اقرار کراتا ہے خواہ وہ بنی اسرائیل میں آئے ہوں یا ہند و ایران کے لوگوں میں مبعوث ہوئے ہوں یا دنیا کے کسی اور ملک میں اصلاح کیلئے کھڑے کئے گئے ہوں مگر اس سے تفصیلی ایمان نہیں بلکہ صرف اجمالی ایمان مراد ہے۔ اگر تفصیلی ایمان مراد ہوتا تو وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ فرما کر اُن نبیوں کا ذکر نہ کیا جاتا جن کا نام بھی ہمیں معلوم نہیں اور جن کے حالات کا قرآن کریم نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ مگر پھر بھی اجمالی طور پر اُن پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔

مَیں اس موقعہ پر مسلمانوں کو بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے جو سب نبیوں کو مانے وہی مسلم ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آنے والے مسیح کو نبی اللہ قرار دیتے ہیں اور اس زمانہ میں مسیحیت موعودہ کا وعدہ بانیٔ سلسلۂ احمدیہ کے وجود میں پورا ہو چکا ہے پس ہر شخص جو اسلام سے اپنے آپ کو وابستہ کرتا ہے اُس کا فرض ہے کہ وہ ہوشیار ہو جائے اور بے توجہی سے آپ کے دعویٰ کو نہ دیکھے۔ کیونکہ بے توجہی سے اسلام جیسی قیمتی چیز ہاتھ سے جانے کا اندیشہ ہے۔ مسلم وہی ہے جو خدا تعالیٰ کے تمام نبیوں کو مانے اور مسیح موعود کی نبوت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس مسلمانوں کے لئے ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ اس آیت کے یہ معنے نہیں کہ ہم انبیاء کے درجات میں فرق نہیں کرتے۔ کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورۃ بقرہ آیت ۲۵۴) یعنی یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت بخشی تھی۔ پس اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سب نبیوں کو درجہ اور مقام کے لحاظ سے ایک جیسا سمجھتے ہیں۔ بلکہ صرف یہ مطلب ہے کہ اُن پر ایمان لانے کے لحاظ سے ہم اُن میں کوئی فرق نہیں کرتے چاہے وہ شرعی نبی تھے یا غیر شرعی۔ ورنہ درجوں کا فرق تو خود قرآن کریم نے تسلیم کیا ہے۔

مسیحی مصنف اس آیت پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نبی نہ تھے مگر قرآن نے انہیں نبی کہہ دیا ہے۔ اور وہ دریافت کیا کرتے ہیں کہ اسمٰعیلؑ کی نبوت کا کیا ثبوت ہے؟ حالانکہ اگر وہ غور کریں تو یہی سوال اُلٹ کر اُن پر پڑتا ہے کہ اسحاقؑ کی نبوت کا کیا ثبوت ہے جو ثبوت اسحاقؑ کی نبوت کا ہے وہی اسمٰعیلؑ کی نبوت کا ہے موسیٰؑ اپنے دادا اسحاقؑ کی نبوت کا اعلان کرتے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دادا اسمٰعیلؑ کی نبوت کا اعلان کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بائیبل نے بخل سے کام لے کر حضرت اسمٰعیلؑ کی نبوت کا ذکر نہیں کیا۔ اور قرآن کریم جو کبھی کسی صداقت کا انکار نہیں کرتا۔ اُس نے نسلی تعصبات سے کام نہ لے کر دونوں بزرگوں کی بزرگی کا اقرار کیا ہے آخر بنی اسرائیل کے پاس اسحاقؑ کی نبوت کا اس کے سوا کیا ثبوت ہے کہ ایک سچے نبی نے جس کی نبوت اُن کے خیال میں

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

پس اگر وہ لوگ (اسی طرح) ایمان لے آئیں جس طرح تم اس (تعلیم) پر ایمان لائے ہو تو (بس) وہ ہدایت پا گئے۔

دلائل سے ثابت ہے۔ اسحاق علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کیا ہے۔ یہی دلیل ایک مسلمان دیگا کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی نبوت کا یہ ثبوت ہے کہ ایک سچے نبی نے جس کی نبوت دنیا کے تمام انبیاء کی صداقت کے دلائل سے زیادہ وزنی دلائل کے ساتھ ثابت ہے اُسے نبی قرار دیا ہے۔ اگر بائیبل کی شہادت سے اسحاق علیہ السلام نبی قرار پا سکتے ہیں تو قرآن کریم کی شہادت سے اسمٰعیل علیہ السلام کوکیوں نبی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسیحی مصنفوں کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نبوت کے ماننے میں سوائے اس کے کوئی عذر نہیں کہ اُن کا ذکر بائیبل میں نہیں۔ حالانکہ بائیبل سے ثابت ہے کہ اُن کو سارہ کے حسد کی وجہ سے وطن چھوڑ کر بے وطنی کی زندگی بسر کرنی پڑی تھی۔ اور جبکہ سارہ کو اسمٰعیلؑ سے اس قدر دشمنی تھی کہ اُن کو گھر چھوڑنا پڑا اور وہ بہت دُور ایک ملک میں چلے گئے۔ تو بنی اسرائیل نے اپنی کتب میں اُنکی کب تعریف کرنی تھی اور اُن کی نبوت کا کس طرح ذکر کرنا تھا۔ پس اُن کے حالات کا بائیبل میں نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کوکسی چیز کا عدم ذکر اس کے عدم وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ مگر موجودہ بائیبل بھی ایسے اشارات رکھتی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے بھی خدا تعالےٰ کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اوّل تو اُن کا نام ہی دلالت کرتا ہے کہ خدا تعالےٰ کے پیارے ہونے والے تھے۔ کیونکہ آپ کا الہامی نام اسمٰعیل تھا۔ جس کے معنے ہیں خدا نے سُنی۔ اور یہ نام بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۱ میں لکھا ہے:۔

"خداوند کے فرشتے نے اُسے (یعنی حضرت ہاجرہؓ کو) کہا۔ کہ تُو حاملہ ہے۔ اور بیٹا جنیگی۔ اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا۔"

اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی بشارت کے ماتحت ہوئی تھی۔ اور الہامی طور پر آپ کا نام اسمٰعیل رکھا گیا تھا اور جو بچہ اللہ تعالیٰ کی بشارت کے ماتحت پیدا ہُوا ہو اور الہام میں اس کا نام بھی تجویز ہُوا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خدا تعالیٰ کا برگزیدہ نہیں تھا خود الہام الٰہی کی تکذیب کرنا ہے۔

پھر پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۸ میں لکھا ہے:۔

"ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔"

اصل عبرانی الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ

"تیری آنکھوں تلے رہے اور تیرا مقبول ہو۔"

اِس کے مقابلہ میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا:۔

"اور اسمٰعیل کے حق میں مَیں نے تیری سُنی دیکھ مَیں اسے برکت دونگا۔ اور اُسے برومند کرونگا۔ اور اُسے بہت بڑھاؤنگا۔ اور اُس سے بارہ سردار پیدا ہونگے۔ اور مَیں اُسے بڑی قوم بناؤنگا۔" (آیت ۲۰)

اِن دونوں آیات کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا تعالےٰ سے دُعا کی تھی کہ اسمٰعیلؑ

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ

اور اگر وہ پھر جائیں تو (سمجھو کہ) وہ صرف اختلاف (کرنے) پر (تلے ہوئے) ہیں۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ تجھے ضرور ان

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳۸﴾

(کے شر) سے بچائیگا۔ وہ بہت ہی سننے والا (اور) بہت ہی جاننے والا ہے۔ ۵۴

خدا تعالیٰ کا برگزیدہ ہو۔ کیونکہ ان کے الفاظ ہیں "تیرے حضور جیتا رہے"۔ اور تیرے حضور جیتا رہنے کے معنے مقبول ہونے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کا یہ مطلب نہ ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صرف اس قدر کہہ دینا کافی تھا کہ وہ جیتا رہے۔ کیونکہ جس قدر لوگ زندہ رہے ہیں سب خدا تعالیٰ کے حضور ہی زندہ رہتے ہیں۔ اُس سے غائب نہیں ہوتے۔ پس "تیرے حضور" کے الفاظ بڑھانے کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں تھا کہ تیرے ساتھ تعلق رکھنے والوں میں سے ہو۔ اور نیک پاک اور خدا رسیدہ ہو چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس دُعا کو قبول کر لیا۔ اور کہا کہ میں نے تیری سُن لی۔

۵۴ حل لغات:۔ شِقَاقٌ: شِقٌّ جانب کو کہتے ہیں۔ پس شِقَاقٌ کے معنے دُوری کے ہیں۔

سَمِيعٌ: کے معنے ہیں بہت سُننے والا۔ اور عَلِيمٌ کے معنے ہیں۔ بہت جاننے والا۔

تفسیر:۔ اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی تشریح بیان فرمائی تھی کہ ایمان کامل وہ ہوتا ہے جس میں انسان کوئی شرط نہ لگائے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیم آجائے اسے مان لے۔ نہ قوم کی شرط ہو۔ نہ زمانہ کی۔ نہ ملک کی اور نہ یہ شرط ہو کہ پہلے نبیوں کو مانیں گے اور جو آئندہ آئیں گے اُنکو نہیں مانیں گے۔ فرمایا۔ تم عالم ہو یا نہ ہو۔ اگر تمہیں پتہ لگے کہ فلاں شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے تو تم اسے فوراً مان لو۔ پس یہ کہنا

کہ یہودی یا عیسائی ہونے سے نجات ملتی ہے۔ یہ سب ڈھکو نسلے ہیں۔ ایمان کی پہلی شرط یہی ہے کہ بغیر کسی شرط کے انسان ایمان لائے اور اس کے ساتھ کوئی قید نہ لگائے اور ہمیشہ خدا تعالیٰ کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہے

اس جگہ باء اور مثل دونوں لفظ ہم معنے آئے ہیں اور بظاہر یہ ایک تکرار نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً تکرار نہیں اصل بات یہ ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے۔ مگر زائدہ کے یہ معنے نہیں کہ اس کے کوئی معنے ہی نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ نئے معنے دیتی اور تاکید پیدا کرتی ہے بعض لوگ زائدہ کا لفظ سُنکر کہنے لگ جاتے ہیں کہ کیا قرآن میں بھی زوائد ہیں۔ حالانکہ یہ عربی زبان کی ایک اصطلاح ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بے حقیقت ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تاکید کے لئے استعمال ہوئی ہے۔ جیسے اردو میں "ہی" کا لفظ ہے۔ یہ کوئی نئے معنے نہیں دیتا بلکہ پہلے معنوں کی تاکید کر دیتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ "یہ زید ہی ہے"۔ اس فقرہ میں جو "ہی" استعمال ہوا ہے یہ معنوں کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے نہ کہ کوئی زائد معنے پیدا کرنے کے لئے۔ اسی طرح باء ہے۔ یہ مثل کی تاکید کے لئے آئی ہے۔ اور اس کے معنے ہیں۔ "بالکل ویسے ہی"۔ اگر صرف مثل کا لفظ استعمال کیا جاتا تو تھوڑی بہت ادھر اُدھر ہونے کی گنجائش رہ جاتی تھی اور شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید پوری مشابہت مراد نہ ہو۔ لیکن باء کی موجودگی نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی

شِقَاقٌ

سَمِيعٌ

عَلِيمٌ

اور پوری طرح واضح کر دیا کہ جب تک ایمان کا ہر ایک نقطہ دوسرے نقطہ کے مشابہ نہ ہو اُسوقت تک وہ ایمان ہی نہیں کہلا سکتا۔

زائدہ ہونے کے علاوہ باء استعانت کے لئے بھی ہوسکتی ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ فَاِنْ دَخَلُوْا فِی الْاِیْمَانِ بِشَھَادَةٍ مِثْلَ شَھَادَتِکُمْ۔ یعنی اگر وہ صداقتِ انبیاءؑ کی شہادت دیتے ہوئے اُن پر ایمان لے آئیں جیسے تم نے انبیاء کی صداقت کی شہادت دی ہے اور اُن پر ایمان لے آئے تو پھر وہ ہدایت پا جائیں گے۔ یعنی جب تک اُن کے ایمان کی وہی کیفیت نہ ہو جو تمہاری کیفیت ہے اُسوقت تک وہ ہدایت یافتہ نہیں سمجھے جا سکتے۔ یہ بھی تاکید کا ہی ایک رنگ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کریں تو پھر بے شک وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ ورنہ کسی نبی کو صرف منہ سے مان لینا انسان کو مومن نہیں بنا دیتا۔ اگر اُن کا وہ عاشقانہ رنگ نہیں جو تم میں پایا جاتا تھا۔ اور اگر وہ اپنے عمل سے اپنے ایمان کی شہادت نہیں دیتے تو محض ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اسحاقؑ موسٰیؑ عیسٰیؑ اور دوسرے نبیوں کو مان لینا کافی نہیں ہو سکتا۔ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان صرف نبی کے وجود پر ایمان لانے سے وابستہ ہوتا ہے حالانکہ نبی کی مثال تو ایک نَے کی سی ہوتی ہے جس طرح نَے بولنے والے کی آواز لوگوں کو پہنچاتی ہے اسی طرح نبی بھی خدا تعالیٰ کی آواز لوگوں کو پہنچاتا ہے اور نبی پر ایمان لانا صرف اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغامبر ہوتا ہے پس کسی ایک نبی پر ایمان لانا اور دوسرے کا انکار کر دینا انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ فائدہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ وہ ہر آواز پر لبیک کہنے کیلئے تیار ہے اسجگہ اللہ تعالیٰ کچھ نبیوں کا ذکر کر کے فرماتا ہے کہ تم کہو کہ ہم ان سب نبیوں کو مانتے ہیں جن کو تم مانتے ہو۔ اب خدا تعالیٰ نے ایک اور نبی بھیجا ہے جسے ہم مانتے ہیں مگر تم نہیں مانتے۔ تم بھی اسے مان لوتا کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات سے حصہ پاؤ۔ اور تمہیں دین و دنیا میں سُرخروئی حاصل ہو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا ھُمْ فِیْ شِقَاقٍ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر وہ پھر جائیں۔ تو تم گھبراؤ نہیں۔ اُن کے اس اعراض کی سوائے اس کے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ اختلاف کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اور تم سے کسی حالت میں بھی اتحاد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ عبارت اصل میں اِنْ ھُمْ اِلَّا فِیْ شِقَاقٍ ہے یعنی ان کے اس اعراض سے تم پریشان مت ہو جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض کمزور دل مسلمان خیال کر سکتے تھے کہ یہ لوگ تو ہم سے اور زیادہ دُور ہو جائیں گے۔ فرماتا ہے۔ یہ تو تم سے پہلے ہی دُور ہیں۔ اور ان باتوں کی طرف آنے کو تیار نہیں جو خدا تعالیٰ کے قریب کرنے والی ہیں۔ اور جب اُن کے دلوں میں اتنا بُغض ہے اور وہ پہلے ہی تم سے جُدا ہیں تو پھر اتحاد کیسے ہو سکتا ہے۔ پس اس بات سے مت ڈرو کہ علیحدگی کی صورت میں ہمیں اُن سے تکلیفیں پہنچیں گی اور لڑائیاں ہونگی۔

فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ۔ اُن کے مقابلہ میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ وہ اُن کے حملوں سے تمہیں خود بچائیگا اور تمہاری آپ حفاظت فرمائیگا۔ جب تک انسان کو یہ مقام حاصل نہ ہو وہ حقیقی مومن نہیں کہلا سکتا۔ ایمان کا مقام وہی ہے جو فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ کے ماتحت ہو۔ یعنی وہ اس مقام پر کھڑا ہو کہ دشمن اُسے نقصان پہنچانے کے لئے خواہ کس قدر کوشش کرے۔ وہ سمجھے کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے وہ دشمن کو مجھ پر غالب نہیں آنے دیگا۔ اور اگر اس مقابلہ میں میرے لئے موت مقدر ہے۔ تب بھی کوئی غم نہیں کیونکہ ہم نے مر کر خدا کے پاس ہی جانا ہے۔ آخر غور کرو کیا صحابہؓ کی بیویاں نہ تھیں۔ کیا اُن کے بچے نہ تھے۔ کیا اُن کی جائدادیں اور تجارتیں نہ تھیں۔ اگر وہ خدا کے لئے

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ز

(اے مسلمانو تم یہ کہو کہ ہم تو) اللہ کا دین (اختیار کرتے ہیں) اور دین (سکھانے کے معاملہ) میں اللہ (تعالیٰ) سے کون بہتر ہو سکتا ہے۔

اپنی جانیں قربان نہ کرتے تو ہم تک اسلام کس طرح پہنچتا۔ ہم تو جہالتوں میں مبتلا ہوتے۔ کوئی بتوں کو پوج رہا ہوتا۔ اور کوئی کسی دیوی دیوتا کے آگے اپنا سر جھکائے ہوتا۔ خدا تعالیٰ کی ان پر ہزاروں ہزار برکات ہوں کہ انہوں نے اپنی جانوں کو ہمارے لئے آگ میں ڈالا۔ اپنی اولادوں کو یتیم کیا۔ اپنی بیویوں کو بیوہ کیا۔ اپنے ماں باپ کو بے نور و بے چراغ کیا۔ اور ہمیں اسلام کی دولت سے مالا مال کیا۔ مگر افسوس کہ اُن کی اسقدر عظیم الشان قربانی کے بعد اور اُن سے نورِ ایمان حاصل کرنے کے بعد بجائے اس کے کہ مسلمان انہی کی طرح اس میدان میں نکلتے اور کہتے کہ ہم بھی وہی کچھ قبول کرتے ہیں جو صحابہؓ نے کیا۔ انہوں نے دنیوی تکالیف اور مصائب سے ڈر کر اپنے قدم پیچھے ہٹائے اور اسلام جن قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے اُن میں حصہ لینے سے انہوں نے ہچکچانا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم ڈرتے کیوں ہو۔ اگر تم خدا تعالیٰ پر ایمان لائے ہو۔ تو وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ اور وہی تمہیں ہر قسم کے نقصان سے بچائے گا۔

غرض اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو تم سمجھ لو کہ ان کے دلوں میں تمہاری نسبت سخت عداوت اور دشمنی ہے۔ اور وہ تمہارے خلاف شرارتیں کریں گے مگر ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کافی ہوگا وہ تمہیں اُن کے حملہ سے خود بچائے گا۔ اور اُن کی شرارتیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ فرماتا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ اب خدا تعالیٰ کی طرف سے چونکہ وعدہ ہو گیا ہے اس لئے ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ دعائیں کرو کہ ایسا ہی ہو۔ خدا تعالیٰ سننے والا ہے۔ اور جن باتوں کا تمہیں علم نہیں اُن کا اُسے خود علم ہے۔ وہ آپ اُن کا انتظام کر دیگا۔

انسان کی دو حالتیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان پر اس کا دشمن حملہ کرتا ہے اور اُس حملے کا اُسے علم ہوتا ہے اور جہاں تک اُس کے لئے ممکن ہوتا ہے اُس کا مقابلہ کرتا ہے اور اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتا ہے دوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ اُس کا دشمن ایسے وقت میں حملہ کرتا ہے جبکہ اُسے خبر نہیں ہوتی۔ یا ایسے ذرائع سے حملہ کرتا ہے جن کی اُسے خبر نہیں ہوتی۔ مثلاً اس کے کسی دوست کو خرید لیتا ہے اور اس کے ذریعے اُسے نقصان پہنچا دیتا ہے۔ یا رات کو اس پر سوتے ہوئے حملہ کر دیتا ہے۔ یا راستہ میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور اندھیرے میں حملہ کر دیتا ہے یا وہ اُسے تیر مار دیتا ہے یا کھانے میں زہر ملا کر اُسے کھلا دیتا ہے یا اس کا مال یا جانور چُرا لیتا ہے۔ یہ وہ حملے ہیں جو اُس کے علم میں نہیں ہوتے اور اس وقت ہوتے ہیں جبکہ وہ بے خبر ہوتا ہے۔ ان دونوں حملوں کے بچاؤ کی مختلف تدبیریں ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ دشمن کس طرح اور کس رنگ میں حملہ کریگا۔ اگر تم کو اس حملہ کا علم ہو مگر تم دفاع کی طاقت نہ پاؤ تو ایک سمیع اور علیم خدا موجود ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دشمن تم پر حملہ آور ہے اور تم میں اُس کے دفاع کی طاقت نہیں پس تم گھبراؤ نہیں۔ تم ہمیں آواز دو۔ ہم فوراً تمہاری مدد کے لئے آجائیں گے۔ اور اگر تم سوئے ہوئے ہو یا راستہ پر سے گذر رہے ہو یا تاریکی میں سفر کر رہے ہو

وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور ہم اُسی کی عبادت کرنے والے ہیں ۵۵

اور دشمن نے اچانک تم پر حملہ کر دیا ہے یا کھانے میں زہر ملا دیا ہے یا چوری سے مال نکال لیا ہے۔ یا کسی دوست سے مل کر اُس نے تم پر حملہ کر دیا ہے اور تمہیں اس کا علم نہیں ہُوا۔ تو فرماتا ہے کہ ہم علیم ہیں۔ ہم خوب جاننے والے ہیں اور ہمیں ہر قسم کی قوتیں حاصل ہیں۔ اس لئے ایسی حالت میں بھی تم گھبراؤ نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو پکارو اور اُس سے دعائیں کرو۔ وہ تمہاری تمام مشکلات کو دُور کر دیگا۔ اور تمہارے دشمن کو ناکام اور ذلیل کریگا۔

۵۵ حل لغات:۔ صِبْغَۃٌ کے معنے ہیں مِلّت۔ دین۔ فطرت۔ چمڑے کو رنگ دینا غوطہ دینا۔ چکا دینا۔ اس لحاظ سے صِبْغَۃَ اللّٰہِ کے معنے ہیں اللہ کے دین کو اختیار کرو۔ یا اللہ کے بتائے ہوئے طریق کو اختیار کرو۔ یا اللہ کی دی ہوئی فطرت کو اختیار کرو۔

صِبْغَۃَ

تفسیر:۔ صِبْغَۃَ اللّٰہِ کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا گیا ہے دین کے بھی ہیں۔ ملت کے بھی ہیں۔ فطرت کے بھی ہیں اور کسی چیز کو رنگ دینے کے بھی ہیں۔ یہ لفظ اسجگہ مفعول بہٖ استعمال ہُوا ہے جو اس لفظ کے آخر کی زبر سے جو مفعول بہٖ کا نشان ہے ظاہر ہے۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی کو کسی کام کی ترغیب دلانی ہو وہاں اُس فعل کو جس میں ترغیب کے معنے پائے جاتے ہیں حذف کر دیا جاتا ہے اور صرف مفعول بہٖ بیان کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی اِتَّبِعُوْا محذوف ہے اور اصل فقرہ یوں ہے اِتَّبِعُوْا صِبْغَۃَ اللّٰہِ یعنی تمہارے لئے مناسب ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دین کو اختیار کرو۔ اور اس سوال کو جانے دو کہ خدا تعالیٰ نے یہ تعلیم کس شخص پر اتاری ہے اور وہ کونسی قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ یہ تعلیم خدا تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے اور خدا ہمارا بھی ہے اور تمہارا بھی اس لئے اُسکی طرف سے جو دین بھی آئے۔ اُس کے ماننے میں تمہیں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انسان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دین کی اتباع کرے۔

مِلّت کے مفہوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نیکی اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک اُس کا نفس اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے ماتحت چلتا ہے۔ لیکن جب وہ خدائی راہنمائی کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے اور خدائی طریق کے علاوہ کوئی اور طریق اختیار کر لیتا ہے تو وہ خواہشات اُسے ہلاکت اور بربادی کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں۔

پھر فطرت کے مفہوم کے لحاظ سے اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان کو ہمیشہ فطرتِ صحیحہ سے کام لیتے ہوئے اختلافات کا فیصلہ کرنا چاہیئے کیونکہ ہر انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے پاک بنائی ہے اور اس سے سچائی کو پہچاننے میں بڑی بھاری مدد ملتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ فطرتِ صحیحہ مذہب کی قائم مقام ہے۔ وہ مذہب کی قائم مقام نہیں۔ بلکہ مذہب کے پہچاننے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر کسی کو فطرتِ صحیحہ نصیب نہ ہو تو اُسے سچا مذہب بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔ فطرتِ صحیحہ کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کسی کے پاس اس کے دوست کا خط آجائے۔ تو وہ اُس کے پڑھنے کے لئے عینک لگالے لیکن اگر وہ عینک لگا کر ہی بیٹھا رہے اور خط نہ پڑھے تو ہر شخص اُسے احمق قرار دیگا۔ اِسی طرح دین بھی ایک خط ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آیا اور عینک فطرتِ صحیحہ ہے جس طرح خط اصل چیز ہے اور اس سے

نہ پھیرنا اور صرف عینک پر اکتفاء کر لینا جہالت ہے۔ اسی طرح جو شخص فطرت صحیحہ کے بعد مذہب کی ضرورت نہیں سمجھتا وہ بھی احمق ہے۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔ یعنی ہمیشہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اور دیکھتے رہو کہ کیا تم صفات الٰہیہ کے مظہر بنے ہو یا نہیں بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اسی غرض کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بنے اور اس کی قابلیت خود اس نے انسانی فطرت کے اندر ودیعت کر دی ہے۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی ربوبیت کا مظہر نہیں بن سکتا یا رحمانیت کا مظہر نہیں بن سکتا یا رحیمیت کا مظہر نہیں بن سکتا یا مالک یوم الدین کا مظہر نہیں بن سکتا اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں یہ تمام قابلیتیں رکھ دی ہیں۔ اور اسی کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے کہ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ (بخاری جلد ۴ کتاب الاستیذان) یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مادی شکل نہیں۔ اور نہ اسلام اس کا قائل ہے پس اللہ تعالیٰ کی صورت پر آدم کو پیدا کرنے کا یہی مفہوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم میں صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بننے کی قابلیت رکھ دی۔ اب کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان صفات کو اپنے وجود کے ذریعہ ظاہر نہیں کر سکتا جسطرح خدا تعالیٰ ستار ہے۔ اسی طرح وہ بھی ستار بن سکتا ہے جس طرح خدا شکور ہے اسی طرح وہ بھی شکور بن سکتا ہے جس طرح خدا وہاب ہے اسی طرح وہ بھی وہاب بن سکتا ہے جس طرح خدا رزاق ہے اسی طرح وہ بھی اپنے دائرہ میں رزاق بن سکتا ہے۔ اور درحقیقت اسلامی نقطۂ نگاہ سے اللہ تعالیٰ کا قرب بھی وہی شخص حاصل کرتا ہے جو صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن کر اللہ تعالیٰ سے مشارکت پیدا کر لیتا ہے۔ اور اُسی کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔ دیکھو آک کا ٹڈا آک کے پتوں میں رہ کر ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتا ہے اور تیتری جن پھولوں میں اُڑتی پھرتی ہے اُن کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ کیا ہم ٹڈّوں اور تیتریوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اور ہمارا خدا نعوذ باللہ آک اور پھولوں سے بھی گیا گذرا ہے کہ ٹڈا اگر آک میں رہتا ہے تو اُن کا رنگ قبول کر لیتا ہے، تیتریاں جن پھولوں میں رہتی ہیں اُن کا رنگ اخذ کر لیتی ہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ کے بندے اس کے پاس جائیں اور وہ اُسکا رنگ قبول نہ کریں۔ درامل اپنے دل کی بدظنی ہی ہوتی ہے جو انسان کو ناکام و نامراد رکھتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ۔ جیسا بندہ میرے متعلق گمان کرتا ہے ویسا ہی مَیں اس سے سلوک کرتا ہوں۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا یا خدا تعالیٰ کے متعلق یقین نہیں ہوتا اُن کو کچھ نہیں ملتا۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں معزز بنایا ہے اور بڑی بڑی طاقتیں عطا کی ہیں اور وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے اور بڑے بڑے انعام دینے والا ہے وہ خالی نہیں رہتے بلکہ اپنے ظرف کے مطابق اپنا حصہ لے کر رہتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ نے اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ تم دنیا میں کسی نہ کسی کا رنگ اختیار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور جب تم نے بہرحال کسی کا رنگ اختیار کرنا ہے تو ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ تم اپنے دوستوں کا رنگ اختیار نہ کرو۔ تم اپنے بیوی بچوں کا رنگ اختیار نہ کرو۔ تم اپنے اساتذہ کا رنگ اختیار نہ کرو۔ تم اپنے ماحول کا رنگ اختیار نہ کرو۔ تم اپنی حکومت کا رنگ اختیار نہ کرو۔ بلکہ تم خدائے واحد کا رنگ اختیار کرو۔ کیونکہ اُس نے

تم کو پیدا کیا ہے۔ اور اُس سے تعلق ہی تمہاری نجات کا موجب ہو سکتا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اور اللہ تعالیٰ سے بہتر اور خوبصورت رنگ تم پر اور کون چڑھا سکتا ہے۔ اس رنگ کے بعد تم بہروپئے نہیں ہو گے بلکہ ایک حسین ترین وجود بن جاؤ گے۔ جسے دیکھ کر دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور وہ تمہیں اپنے مکالمات و مخاطبات سے مشرف کریگا۔ تم پر اپنے غیب کے اسرار کھولے گا۔ اور تمہیں اپنے غیر معمولی انعامات سے بہرہ ور فرمائیگا۔

مجھے یاد ہے مَیں ایک دفعہ دہلی گیا تو وہاں مجھے علم حساب کے ایک بہت بڑے ماہر جن کا نام پروفیسر موکر تھا ملے۔ اور انہوں نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے ذکر کیا کہ وہ اور نیویارک کے بعض اور پروفیسر تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس ساری یونیورس کا ایک مرکز ہے جس کے گرد یہ سورج اور اس کے علاوہ اور لاکھوں اور کروڑوں ستارے چکر لگا رہے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ میری تھیوری یہ ہے کہ یہی مرکز خدا ہے۔ گویا انہوں نے اس امر کا اظہار کیا۔ کہ پہلے تو سائنس خدا تعالیٰ کے وجود کو ردّ کرتی تھی۔ مگر اب ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس سارے نظام کا ایک مرکز ہے جو حکومت کر رہا ہے اور وہی مرکز خدا ہے۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ نظامِ عالم کے ایک مرکز کے متعلق آپ کی جو تحقیق ہے مجھے اس پر اعتراض نہیں۔ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے کہ یہ تمام دنیا ایک نظام کے ماتحت ہے اور اس کا ایک مرکز ہے۔ مگر آپ کا یہ کہنا کہ وہی مرکز خدا ہے درست نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے الہامات نازل ہوتے ہیں۔ اور وہ مجھے اپنے غیب سے اطلاع دیتا ہے۔ اگر آپ کا تجویز کردہ مرکز ہی خدا ہے تو آپ مجھے بتائیں کہ کیا وہ بھی کسی پر الہام نازل کر سکتا ہے کہنے لگے الہام تو نازل نہیں کر سکتا۔ مَیں نے کہا تو پھر مَیں کس طرح تسلیم کر لوں کہ وہی مرکز خدا ہے۔ مجھے تو ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ اور وہ باتیں اپنے وقت پر پوری ہو جاتی ہیں۔ کوئی بات چھ مہینے کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی سال کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی دو سال کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی چار سال کے بعد پوری ہو جاتی ہے اور اس طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ مجھ پر جو الہام نازل ہوا تھا۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف ہی سے تھا۔ پھر مَیں نے انہیں مثال دی اور کہا کہ آپ مجھے بتائیں۔ کہ کیا آپ کا وہ کرّہ جسے آپ خدا قرار دیتے ہیں کسی کو یہ بتا سکتا ہے کہ جنگِ عظیم میں امریکہ کی طرف سے انگلستان کی مدد کے لئے ۲۸ سو ہوائی جہاز بھجوایا جائیگا۔ میرا اشارہ اس رؤیا کی طرف تھا جو گذشتہ جنگ عظیم میں مجھے دکھایا گیا اور جس میں مجھے بتایا گیا تھا کہ امریکہ انگلستان کو ۲۸ سو ہوائی جہاز مدد کے طور پر بھجوائیگا۔ بلکہ مجھے خواب میں تار کے الفاظ بھی بتائے گئے تھے۔ اور مجھے دکھایا گیا تھا کہ برطانوی نمائندہ نے امریکہ سے یہ تار دیا ہے کہ

THE AMERICAN GOVERNMENT HAS DELIVERED 2800 AEROPLANES TO THE BRITISH GOVERNMENT

یعنی امریکن گورنمنٹ نے ۲۸ سو ہوائی جہاز برطانوی گورنمنٹ کو دیئے ہیں۔ چنانچہ دو ماہ کے بعد بعینہٖ یہی الفاظ برطانوی نمائندہ نے امریکہ سے بذریعہ تار بھجوائے۔ اور انگلستان کو ۲۸ سو ہوائی جہاز پہنچ گئے۔ وہ کہنے لگے اس کرّہ سے تو کوئی ایسی بات نہیں بتائی جا سکتی۔ مَیں نے کہا۔ تو پھر ماننا پڑے گا کہ اُس کرّے کا اور اسی طرح اور ہزاروں لاکھوں کرّوں کا خدا کوئی اور ہے۔ کیونکہ مَیں اپنے ذاتی تجربہ سے جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

تو (اُن سے) کہہ۔ کیا تم ہم سے اللہ کے متعلق جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی رب ہے اور ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ اور ہم تو اُس سے اخلاص (کا تعلق) رکھتے ہیں۔ ۵۶

انسان پر نازل ہوتا ہے جو کئی قسم کی غیب کی خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پس آپ بے شک اس مرکز کو ہی خدا مان لیں۔ لیکن ہم تو ایک علیم اور خبیر ہستی کو خدا کہتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ اُس کے اندر قدرت بھی ہوتی ہے۔ اُس کے اندر جلال بھی ہوتا ہے اسکے اندر جمال بھی ہوتا ہے۔ اسکے اندر علم بھی ہوتا ہے اُس کے اندر حکمت بھی ہوتی ہے۔ اُس کے اندر بسط کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اس کے اندر محی ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے اُس کے اندر ممیت ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے اس کے اندر حلیم ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے۔ اُس کے اندر مہیمن ہونے کی صفت بھی ہوتی ہے۔ غرض بیسیوں قسم کی صفات اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح اُس کا نور ہونا۔ اس کا وہاب ہونا۔ اس کا شکور ہونا۔ اسکا غفور ہونا۔ اس کا رحیم ہونا۔ اُس کا ودود ہونا۔ اُس کا کریم ہونا۔ اُس کا ستار ہونا اور اسی طرح اور کئی صفات کا اُس کے اندر پایا جانا ہم تسلیم کرتے ہیں۔ جب ایک طرف یہ صفات اس مرکز میں نہیں پائی جاتیں۔ اور دوسری طرف ہم پر ایک ایسی ہستی کی طرف سے الہام نازل ہوتا ہے جو اپنی صفات کو اپنے کلام کے ذریعہ دنیا پر ظاہر کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ ساری دنیا مخالفت کرتی ہے پھر بھی اس کا کلام پورا ہو جاتا ہے۔ تو اس ذاتی مشاہدہ کے بعد ہم آپ کی تھیوری کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگے۔ کہ اگر یہ باتیں درست ہیں۔ تو پھر ماننا پڑیگا کہ یہ تھیوری باطل ہے۔ کیونکہ اس کلام کے ہوتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی ایسا خدا نہیں جس کے تابع یہ تمام مرکز ہو۔

غرض صِبْغَۃَ اللّٰہِ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننے اور اُس کے رنگ میں رنگین ہونے کی نصیحت کی گئی ہے جو انسانی پیدائش کا حقیقی مقصد ہے اور جس پر بنی نوع انسان کی نجات اور اللہ تعالیٰ کا قرب منحصر ہے۔

۵۶ تفسیر:۔ اس آیت میں کیا ہی لطیف دلیل دی ہے۔ فرماتا ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ نے ہدایت صرف ہماری قوم میں محدود کر دی ہے اس کو ہم کب مان سکتے ہیں۔ اگر کسی اجنبی شے کے متعلق تم یہ بات کہتے تو تحقیق کی ضرورت بھی ہوتی مگر تم تو خدا کے متعلق یہ بات کہتے ہو جو ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ پھر ہم کس طرح اس بات کو مان لیں کہ بنو اسحاق سے باہر نبی نہیں آسکتا۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ نبی بھیجا کون کرتا ہے جب اللہ تعالیٰ ہی بھیجتا ہے تو تم ایسی بات کیوں کہتے ہیں۔ جسے کوئی فطرتِ صحیحہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی۔ وہ تمہارا بھی رب ہے اور ہمارا بھی اگر وہ صرف تمہارا ہی رب ہوتا تو تم کہہ سکتے تھے۔ کہ وہ ہمارے سوا کسی اور سے تعلق نہیں رکھ سکتا۔ مگر جب وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی تو کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں تو دے دے اور ہمیں چھوڑ دے۔

لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ۔ فرماتا ہے کہ

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَ

(اے اہل کتاب!) کیا تم (یہ) کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور

يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَأَنْتُمْ

یعقوب اور (اس کی) اولاد یہودی یا مسیحی تھے ؟ تو (ان سے) کہہ کہ کیا تم

أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً

زیادہ جانتے ہو یا اللہ (تعالیٰ) ؟ اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اس شہادت کو جو اُس کے

عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۱﴾

پاس اللہ (تعالیٰ) کی طرف سے ہو چھپائے ۔ اور اللہ (تعالیٰ) اس سے ہرگز ناواقف نہیں ہے جو تم کرتے ہو ۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا

یہ وہ جماعت ہے جو (اپنا زمانہ پورا کرکے) فوت ہو چکی ہے ۔ اور جو کچھ اُس نے کمایا (اُسکا نفع نقصان) اُس کیلئے ہے اور جو کچھ تم نے

كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۲﴾ ع

کمایا (اُسکا نفع نقصان) تمہارے لئے ہے اور جو کچھ وہ کرتے تھے اُس کے متعلق تم سے نہیں پوچھا جائے گا ۔ ۱۵۷

۱۶ ع ۱۶

دین میں حسد کی بھی کوئی وجہ نہیں کیونکہ کوئی شخص دوسرے کی کمائی نہیں لے سکتا ۔ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی جزا کا مستحق ہوگا ۔ تمہارے اعمال تمہارے کام آئینگے ۔ اور جس قوم میں سے یہ نبی آیا ہے اُس کے افراد کے اعمال اس کے کام آئیں گے ۔ جو شخص جسقدر کوشش کرے گا اسی قدر انعام پائیگا ۔ کوئی قومی رعایت نہیں ہوگی ۔

وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ اور ہم تو اُسی سے اخلاص کا تعلق رکھتے ہیں ۔ اِس میں بتایا کہ ہماری محبت ایسی نہیں کہ اگر وہ کچھ دے تو ہم اس پر ایمان لائیں ۔ بلکہ ہمارا تو یہ حال ہے کہ خواہ وہ ہمیں کچھ دے یا نہ دے تب بھی ہم اُسی کے لئے وقف ہیں اور اُسی کی اطاعت گذار رہیں گے ۔ اِس کے سوا ہمیں کوئی اور چیز مطلوب نہیں ۔

۱۵۷ تفسیر :— اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہود کا یہ دعویٰ بیان کرتا ہے کہ ابراہیمؑ ۔ اسماعیلؑ ۔ اسحٰقؑ یعقوب اور اس کی اولاد بھی یہودی یا مسیحی تھے ۔ قرآن کریم اس کا ایک سادہ سا جواب دیتا ہے مگر وہ ایسا جواب ہے کہ جس سے اُن پر موت وارد ہو جاتی ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ ۔ اسماعیلؑ ۔ اسحاقؑ ۔ یعقوبؑ اور ان کی اولاد سے تعلق رکھنے والے افراد توریت اور انجیل کے زمانہ سے بہت پہلے گذر چکے تھے ۔ اور توریت جسے [illegible] الہامی مانتے ہیں ۔ اس میں اس کا صاف طور پر ذکر آتا ہے ۔ پس

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم دانستہ جھوٹ بولتے ہو اور اُن گواہیوں کو چھپاتے ہو جو تورات میں موجود ہیں۔ جب اس میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ یہ لوگ پہلے گذر چکے تھے تو ان کا ایمان اس چیز سے جو ان کے بعد آئی کس طرح وابستہ ہو سکتا ہے اور وہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر ایمان لانے والے کس طرح قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ ویسی ہی حماقت ہے جیسے پادری ووڈ نے ایک دفعہ مجھے کہا کہ ابراہیم بھی کفارہ پر ایمان لایا تھا تب اس کی نجات ہوئی۔ یا جیسے بعض شیعہ احباب کہہ دیا کرتے ہیں کہ اِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شیعہ تھے۔ فرماتا ہے۔ ہم تمہاری بات مانیں یا تمہاری کتاب کو سچا تسلیم کریں۔ تمہاری تورات تو کہتی ہے کہ ابراہیمؑ زمانہ نزولِ تورات سے بہت پہلے ہوا۔ اور تم اُسے یہودی قرار دے رہے ہو۔ یہ کیسی احمقانہ بات ہے۔ تعجب ہے کہ اس زمانہ میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودی قرار دینے والے لوگ موجود ہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں JUDAISM کے نیچے لکھا ہے:۔

IBRAHIM IS CONSIDERED TO
HAVE BEEN THE FIRST
ADHERENT OF JUDAISM

یعنی ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ یہودیت کے سب سے پہلے پیرو کار تھے (العیاذ باللہ)

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ فرماتا ہے۔ یہ ایک اُمت تھی۔ جو گذر چکی۔ تم کیوں اپنی غلطیوں میں اُن کو شریک کرتے ہو۔ وہ اپنے اعمال کے آپ ذمہ دار ہیں اور تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔ پس اس بات سے کیا فائدہ کہ تم اُن کو بھی اپنے ساتھ شامل کرتے ہو۔ تم اپنے ایمان کی فکر کرو۔ اُن کا ایمان تمہیں کوئی فائدہ نہیں دیگا۔ اور نہ اُنکی نیکیاں تمہاری نجات کا موجب بن سکیں گی۔ گویا وہی مضمون جو آیت لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (انعام آیت ۱۶۰) میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کو نئے رنگ میں اللہ تعالیٰ نے پیش کیا ہے۔ اور عیسائیوں اور یہودیوں کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی طرف نہ دیکھیں۔ بلکہ اپنے اعمال پر نگاہ ڈالیں۔ اور سوچیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اور کیا وہ نجات کے مستحق ہیں یا نہیں۔

اس رکوع کی پچھلی آیات میں اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد کہ بنو اسحاق کے انعاماتِ نبوت سے محروم ہو جانے کے بعد بنو اسماعیل ہی حقدار انعام تھے۔ کیونکہ اُن کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا تھی۔ خصوصاً ایک صاحب شریعت نبی کی بعثت کی آیت ۱۳۱، ۱۳۲ میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو سمجھایا کہ مِلّتِ ابراہیمی کو ترک کرکے بیوقوف نہ ہو جانا۔ جو یہ ہے کہ جو حکم بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے اُسے قبول کر لیا جائے۔ جو شخص اس طریق کو اختیار نہیں کریگا۔ وہ نقصان اُٹھائیگا۔ آیت ۱۳۳ میں بیان فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نہ صرف خود اس طریق پر عامل تھے بلکہ اُن کی اولاد بھی اپنی اولاد کو یہی وصیت کرتی چلی آئی ہے کہ ہمیشہ خدا کے فرمانبردار رہنا۔ اور جب بھی کوئی مامور آئے اُس کے حزب میں داخل ہو جانا۔ آیت ۱۳۴ و ۱۳۵ میں بتایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے تو اُن کی اولاد نے عہد بھی کیا تھا۔ کہ وہ واحد خدا کی پرستش کرینگے اور اُس کے کامل فرمانبردار رہیں گے۔ اب تم لوگ اگر سچے اسرائیلی ہو تو تمہارا فرض ہے کہ اس عہد کو پورا کرو۔ اور حضرت یعقوبؑ کی طرح فرمانبرداری کرکے دکھاؤ۔ صرف اُن کی اولاد سے ہونا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ہر ایک اپنے اعمال کا جواب دہ ہے۔ آیت ۱۳۶ میں فرمایا۔ دیکھو یہ ضد چھوڑ دو کہ یہودی یا مسیحی ہونے کے بغیر نجات نہیں۔ ابراہیمی طریقِ عمل اختیار کرو۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ

کم عقل لوگ ضرور کہیں گے کہ اِن (مسلمانوں) کو اُن کے اس قبلہ سے جس پر یہ (پہلے) تھے

قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ

کس چیز نے پھیرا دیا ہے۔(جب وہ ایسا کہیں) تو (اُن سے) کہنا کہ مشرق و مغرب

الْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

اللہ ہی کے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے ایک سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ ۵۸

یعنی ہر حکم کو جس زمانہ میں بھی آئے مان لینا اور اس حکم الٰہی کے مقابل میں کسی روک کی پرواہ نہ کرنا۔ آیت ۱۳۷ میں مسلمانوں کو مخاطب کیا اور انہیں توجہ دلائی کہ وہ لوگ طریق ابراہیم اختیار کریں یا نہ کریں مگر تم ہمیشہ اس بات کا اقرار کرو کہ جو کچھ خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہم اُسے تسلیم کرتے ہیں آیت ۱۳۸ میں بتایا کہ اگر اہل کتاب تمہاری طرح اس عقیدہ پر راضی ہو جائیں تو سکھ پائیں گے ورنہ سزا۔ آیت ۱۳۹ میں تاکید فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ جو رنگ بھی چڑھائے وہ اپنے اوپر چڑھا لو۔ یعنی اسی رنگ میں رنگین ہو جاؤ جو اُس کا مامور چاہے۔ آیت ۱۴۰ میں فرمایا کہ ان اہل کتاب سے کہو کہ کیا تم خدا تعالیٰ کے متعلق ہم سے بحث کرتے ہو کہ اس نے تمہیں کیوں اپنے کلام کے لئے چن لیا۔ یہ اُس کا فضل ہے وہ ہمارے اور تمہارے اعمال سے خوب آگاہ ہے۔ پس جو اخلاص سے کام لیگا وہی انعام پائیگا۔ آیت ۱۴۱ میں فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ اگر یہودی یا مسیحی قوم میں نجات ہے تو حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے بیٹے پوتوں کا کیا حال تھا کیا وہ بھی یہودی تھے؟ یہ تو جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ تمہاری مسلمہ آسمانی کتاب سے پہلے زمانہ میں ہوئے ہیں۔ آیت ۱۴۲ میں اس قدر اتمام حجت کے بعد فرمایا۔ کہ یہ نبیوں کا گروہ اپنے زمانہ میں گذر گیا۔ اُن نبیوں کے اعمال تمہارے کام نہیں آسکتے۔ نہ مسیحؑ کا تکلیف اُٹھانا تمہاری نجات کا موجب بن سکتا ہے۔ تم سے تمہارے اعمال کی نسبت پوچھا جائیگا۔ اِس لئے تمہیں اپنا فکر کرنا چاہیئے۔

۵۸ حل لغات

سُفَهَآءُ :۔ سُفَهَآءُ : سَفِيْه کی جمع ہے۔ اور اَلسَّفَهُ کے معنے ہیں خِفَّةُ الْحِلْمِ علم کی کمی۔ اَلْجَهْلُ جہالت۔ اَلْخِفَّةُ ہلکا پھلکا ہونا اَلْحَرَكَةُ حرکت۔ اَلْاِضْطِرَابُ اضطراب (اقرب) پس سَفِيْه کے معنے ہوئے۔ کم علم۔ کم عقل۔ بات کو سمجھے بغیر بول اُٹھنے والے سطحی نگاہ والے۔ بے استقلال۔

اَلْقِبْلَةُ : اَلْجِهَةُ ۔ كُلُّ مَا يُسْتَقْبَلُ مِنْ شَيْءٍ قبلہ کے معنے ہیں جہت۔ ہر وہ چیز جس کی طرف مُنہ کیا جائے (اقرب)

عَلَيْهَا ۔ یہاں عَلٰی کے معنے جسمانی قیام کے نہیں بلکہ عمل اور عقیدہ کے لحاظ سے کھڑا ہونا مراد ہے۔ ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں کہ جس پر تم قائم ہو مطلب یہ کہ جس عقیدہ کے تم پابند ہو۔ پس كَانُوْا عَلَيْهَا کا مطلب یہ ہے کہ جس کے وہ پابند تھے۔

تفسیر :۔ قرآن کریم کا طریق ہے کہ جب وہ کوئی اہم بات بیان کرنا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ فوری طور پر اُس کے متعلق اپنا حکم بیان کر دے تمہید

کے طور پر بعض باتوں کا ذکر کر دیتا ہے۔ تاکہ اُس چیز کی اہمیت لوگوں پر واضح ہو جائے۔ اور اُن کے قلوب پہلے سے ہی الٰہی حکم کو بشاشت کے ساتھ تسلیم کرنے اور اس کے مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور اُن پر کم سے کم ابتلاء آئے۔ کیونکہ قرآن کریم کی غرض لوگوں کو ہدایت دینا اور انہیں شریعت کے ساتھ ساتھ حکمت سکھانا بھی ہے۔ پس وہ چاہتا ہے کہ جہاں تک لوگوں کو ٹھوکر کھانے سے بچایا جا سکے انہیں بچانے کی کوشش کی جائے۔ جیسے روزوں کا حکم دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ دنیا میں اور قوموں میں بھی روزے رکھنے چلی آئی ہیں اور یہ روزے اس لئے مقرر کئے جاتے رہے ہیں تاکہ تقویٰ پیدا ہو۔ اس تمہید کے بعد فرمایا کہ تم پر بھی روزے فرض کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی تحویل قبلہ کا حکم دینے سے پہلے لوگوں کی طبائع کو اس کیلئے تیار کیا اور آنیوالے انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا۔ یعنی ایسے لوگ جو حکمت سمجھے بغیر اعتراض کردینے کے عادی ہیں عنقریب ایک اعتراض کرنے والے ہیں۔ اور وہ اعتراض باوجود نہایت لغو ہونے کے دشمن کرتے ہی چلے جائیں گے اور کہیں گے کہ ان مسلمانوں کو اس قبلہ سے جس پر وہ پہلے قائم تھے کس چیز نے دوسری طرف پھرا دیا ہے۔ حالانکہ اُس وقت تک اس بارہ میں کوئی حکم نازل نہیں ہُوا تھا کہ تم خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کرکے نمازیں پڑھو۔ مگر اصل حکم کے نازل کرنے سے پہلے ہی دشمن کا اعتراض بیان کر دیا اور بتا دیا کہ ہم عنقریب تحویل قبلہ کے بارہ میں ایک حکم دینے والے ہیں جس پر بعض لوگ جو کم علم اور کم عقل ہیں یا بات کو سمجھے بغیر بول اٹھنے والے ہیں یہ اعتراض کرینگے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ سے جس پر وہ پہلے قائم تھے کس نے پھرا دیا۔ مگر تم نے اس اعتراض سے گھبرانا نہیں۔ کیونکہ اب اللہ تعالیٰ قبلہ کے بارہ میں ایک نیا حکم نازل فرما کر تمہارے ایمانوں کی آزمائش کرنے والا ہے۔

سَيَقُولُ میں سَ تاکید اور استمرار کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور استمرار میں مستقبل کا زمانہ شامل ہوتا ہے۔ اسی رنگ میں سَوْفَ کا لفظ بھی عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی تاکید کے لئے آتا ہے لیکن سَوْفَ کی نسبت سَ کا زمانہ زیادہ قریب ہوتا ہے۔

بہر حال سَيَقُولُ کے الفاظ میں یہ خبر دی گئی کہ عنقریب بعض کم عقل لوگ ایک اعتراض کرنیوالے ہیں اور وہ اعتراض باوجود نہایت لغو ہونے کے دشمن کرتا ہی چلا جائیگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف اُس زمانہ میں دشمنوں نے یہ اعتراض کیا بلکہ اب تک سیل، وہیری اور دوسرے مسیحی مصنف برابر یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ مکہ میں تھے تو کعبہ کی طرف منہ کیا کرتے تھے۔ مگر مدینہ میں آکر یہود کی خوشنودی کے لئے بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنے لگ گئے حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ میں قرآن کریم نے اپنی تعلیم کے مخالف کو بیوقوف قرار دیا ہے جو درشت کلامی ہے۔ مگر یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسجگہ اپنی تعلیم کے مخالف کو نہیں بلکہ صریح خلافِ عقل کام کرنے والوں کو بیوقوف کہا ہے اور ساتھ ہی اس کی دلیل بھی دی ہے جس کے بعد کسی کو اُن کی بیوقوفی میں شبہ ہی نہیں رہ سکتا۔ پھر وہ انہیں عقل کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ اور انہیں دلیل سے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور دلیل کے ساتھ دشمن کو سمجھانے والے کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے مخالف کے متعلق بلاوجہ سخت کلامی کرتا ہے۔ سخت کلامی

تب ہوتی جب یہ بات حقیقت کے خلاف ہوتی۔ یا دشمن کو صرف بیوقوف کہہ کر اُس کی ہنسی اڑائی جاتی مگر جب دشمن کو دلیل کے ساتھ قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے بیوقوف اپنی تعلیم کی مخالفت کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک صریح خلافِ عقل کام کرنے پر کہا گیا ہے۔ تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر یہ قابلِ اعتراض بات ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ کوئی شخص خواہ کتنی بھی حماقت کرے اُسے کچھ نہ کہا جائے۔ بلکہ اُس کی عقل اور تدبّر اور دانائی کی تعریف کی جائے۔ حالانکہ دنیا میں کبھی کسی شخص نے ایسا نہیں کیا۔ پھر اگر یہی طریق قرآن کریم نے بھی اختیار کر لیا تو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

بہرحال ایسی حالت میں جبکہ خود مسلمانوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ کب اور کس طرف انہیں مُنہ پھیرنے کا حکم دیا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے اور جانتا تھا کہ لوگوں نے اعتراض کرنے ہیں جس سے کمزور لوگوں کے ابتلاء کا خطرہ ہے اُس نے قبل اس کے کہ لوگ اعتراض کرتے بلکہ قبل اس کے کہ تحویلِ قبلہ کے بارہ میں کوئی حکم نازل ہوتا اُن کے اعتراض کا جواب دے دیا۔ اور فرمایا۔ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ اصل سوال تو خدا تعالیٰ کی عبادت کا ہے اور خدا تعالیٰ جدھر حکم دے اُدھر ہی مُنہ پھیرنا انسان کو خدا تعالیٰ کی رضا کا مستحق بناتا ہے۔ اگر وہ مشرق کی طرف مُنہ کرنے کا حکم دے تو مومنوں کا فرض ہے کہ وہ مشرق کی طرف مُنہ کریں اور اگر مغرب کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے تو مومنوں کا فرض ہے کہ مغرب کی طرف مُنہ کریں۔ اس لئے تحویلِ قبلہ پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں طرف مُنہ کیوں نہیں کیا۔ اور فلاں طرف کیوں کیا جہالت کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے مشرق و مغرب سب برابر ہیں۔ اور اگر ایک خاص جہت کی تعیین کی جاتی ہے تو اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ مشرق میں ہے یا مغرب میں بلکہ اس کی تعیین بعض اور حکمتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ مثلاً بڑی وجہ تو یہی ہے کہ اس کے ذریعے اتحاد قائم رہتا ہے۔ اگر نماز کے لئے کوئی خاص جہت مقرر نہ کی جائے تو کسی کا مُنہ مشرق کو ہوگا اور کسی کا مغرب کو۔ کسی کا شمال کو اور کسی کا جنوب کو اور ان میں کوئی تنظیم اور یکجہتی نظر نہیں آئیگی۔ پس مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے اور پھر صفوں کو درست رکھنے کے لئے اسلام نے ایک جہت مقرر کر دی۔ ہاں ریل اور جہاز میں اگر قبلہ معلوم نہ ہو تو انسان جدھر چاہے نماز پڑھ سکتا ہے جس سے معلوم ہُوا کہ جہت بالذات مقصود نہیں بلکہ تنظیم اور اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے اسکی تعیین کی گئی ہے۔

پھر بیت اللہ کو قبلۂ عالم مقرر کرنے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی تھی کہ اللہ تعالیٰ مکّہ والوں میں ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرمائے جو دنیا کی ہدایت اور راہنمائی کا موجب ہو۔ اس کے ہاتھ پر آیاتِ الٰہیہ کا ظہور ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ایک کامل شریعت عطا ہو۔ شریعت کے اسرار اور غوامض کو بیان کرنیوالا ہو اور تزکیۂ نفوس اسکا کام ہو۔ یہ دُعا اس امر کا تقاضا کرتی تھی کہ آنے والا عظیم الشان نبی اور اُس کے متبع بیت اللہ سے تعلق رکھنے والے ہوں تاکہ جب بھی وہ اُس کی طرف مُنہ کر کے نماز ادا کریں۔ انہیں ابراہیمی دُعا یاد آ جائے جو انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لئے کی تھی۔ جب ایک انسان اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ کر نماز میں کھڑا ہوتا ہے اور بیت اللہ کی طرف اُس کا مُنہ ہوتا ہے تو معاً اُس کا ذہن اس دُعا کی طرف پھر جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں میرا کام بھی یہی ہے کہ میں لوگوں کو

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ

اور (اے مسلمانو! جس طرح ہم نے تمہیں سیدھی راہ دکھائی ہے) اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کی امت بنایا ہے تاکہ تم (دوسرے)

عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ

لوگوں کے نگران بنو اور یہ رسول تم پر نگران ہو اور

مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ

ہم نے اس قبلہ کو جس پر تو (اس سے پہلے قائم) تھا صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ تا ہم اُس شخص کو جو

آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ دلاؤں۔ انہیں کتاب اللہ کا علم سکھاؤں۔ احکامِ الٰہیہ کی حکمت ان پر روشن کروں اور انہیں پاکیزہ اور مطہر بنانے کی کوشش کروں۔ یہ عظیم الشان مقصد لنڈن یا نیویارک کی طرف منہ کرنے سے کسی کی آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا۔ نہ پیرس کی طرف منہ کرنے سے انسانی قلب میں یہ ولولہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسکی طرف منہ کرنے سے تو ناچنے اور گانے کا ہی خیال آئیگا عبادت اور زہد اور خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنیکا کبھی خیال نہیں آئیگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ ہر جگہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عرب میں ہے اور امریکہ میں نہیں۔ یا مکہ میں ہے اور افریقہ میں نہیں۔ لیکن بعض چیزیں اپنے اندر ایسے محرکات رکھتی ہیں جو انسان کو غیر معمولی طور پر خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتی ہیں۔ اس لئے خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ ہر قسم کے تجسم سے بالا ہے۔ اور اس کے قرب کے دروازے دنیا کے ہر انسان کے لئے کھلے ہیں۔

بِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ پر بعض لوگ یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ یہی الفاظ سورۂ بقرۃ کے چودھویں رکوع میں استعمال ہوئے تھے تو وہاں اسکے یہ معنے کئے گئے تھے کہ تم جدھر چاہو منہ کرو۔ اب انہی الفاظ سے ایک قبلہ کی دلیل اخذ کی گئی ہے۔ دو متضاد مضمون ایک ہی دلیل سے کس طرح نکل سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ پہلے اس دلیل سے قبلہ کا رد کیا گیا ہے اور نہ اس سے قبلہ کو ثابت کیا گیا ہے۔ بلکہ پہلی جگہ بِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (آیت ۱۱۶) میں بتایا تھا کہ سب کچھ خدا کا ہے۔ وہ ایک دن تمہیں مشرق و مغرب کا حکمران بنادیگا اور تمہیں اپنے فضل سے سب کچھ دیگا۔ اور اب یہ بتایا ہے کہ قبلہ اصل مقصود نہیں ہوتا کہ اس پر اعتراض کیا جائے بلکہ اصل چیز تو خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے اور خدا جدھر منہ کرنے کا حکم دے اُسی طرف منہ کرنا انسان کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا مستحق بناتا ہے۔ پھر پہلی آیت بھی مدینہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ دشمنوں کے نزدیک بھی وہاں قبلہ مقرر ہو چکا تھا۔ پھر قرآن کریم یہ کب کہہ سکتا تھا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ جب قبلہ مقصود نہیں تو پھر مقرر کیوں کیا۔ کیونکہ جس طرح کسی مشورہ کیلئے جمع ہونے والے لوگ گو کسی خاص جگہ جمع ہونا اپنا مقصد نہیں ٹھہراتے مگر پھر بھی انکو جگہ اور وقت کی تعیین کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح قبلہ گو اصل مقصود نہیں مگر

مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ

اس رسول کی فرمانبرداری کرتا ہے اُس شخص کے مقابل پر جو ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے (ایک ممتاز حیثیت میں) جان لیں اور یہ امر

كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ

ان لوگوں کے سوا جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے (دوسروں کیلئے) ضرور مشکل ہے۔ اور اللہ (تعالیٰ ایسا) نہیں کہ تمہارے

لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۴۴)

ایمانوں کو ضائع کرے۔ اللہ یقیناً سب انسانوں پر نہایت مہربان (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۵۹

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنے اور اُن کی صفوں کو درست رکھنے کیلئے ایک جہت مقرر کر دی۔ ہاں سفر میں اگر قبلہ معلوم نہ ہو یا قبلہ تو معلوم ہو مگر نماز شروع کرنے کے بعد ریل یا جہاز یا سواری کا رُخ قبلہ کی طرف سے بدل جائے تو نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا جو اس بات کی دلیل ہے کہ جہت بالذات مقصود نہیں۔ بلکہ اتحاد اور تنظیم اور صفوں کی درستی کے لئے ہی اس کی تعیین کی گئی ہے۔

پھر فرمایا يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے ایک سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ "ایک سیدھی راہ" کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر زمانہ کے لحاظ سے تعلیمات کسی قدر فرق کے ساتھ آتی ہیں۔ کیونکہ یہ الٰہی سنت ہے کہ وہ جس قوم پر فضل کرتا ہے اس کے مناسب حال تعلیم بھی بھیج دیتا ہے۔ مسلمانوں کے مناسب حال قبلہ کعبہ ہی تھا۔ چنانچہ آخر اُس نے انکو اس کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع کر دیا تھا اور جو سمجھتے تھے کہ ہمارا کام یہی ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی آواز کے پیچھے چلیں اور مشرق و مغرب کی حدبندیوں سے اپنی نگاہ کو بالا رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی مخلصانہ اطاعت کی توفیق بخشی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُنہ پھیرتے ہی انہوں نے بیت اللہ کی طرف اپنے مُنہ کر لئے اور صراطِ مستقیم پر دوڑتے چلے گئے۔

۵۹ حل لغات :- اُمَّةً وَّسَطًا۔ وَسَط کے معنے درمیان کے ہوتے ہیں۔ چونکہ درمیان میں رہنے والی (یعنی حدِ اعتدال کے اندر رہنے والی) چیز ہمیشہ اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس لئے محاورہ میں وَسَط کے معنے اعلیٰ کے ہو گئے ہیں۔ افسرانِ اعلیٰ بھی فوج کے درمیان ہوتے ہیں۔ چنانچہ فوج کے کچھ دستے اُن کے آگے اور کچھ پیچھے ہوتے ہیں اور وہ خود درمیان میں ہوتے ہیں کیونکہ اعلیٰ چیز کی حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے درمیانی چیز اعلیٰ کے معنوں میں آتی ہے۔

. . . .

. . . .

عربی زبان میں وَسِيْط اُسے کہتے ہیں جو قوم میں سب سے زیادہ شریف ہو۔ چونکہ اُمتِ محمدیہ نہ تو اُمتوں کے درمیان ہے اور نہ تعلیم میں کم ہے بلکہ فرماتا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تم تمام اُمتوں میں سے بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہو۔ اس لئے اس کے معنے ہیں اعلیٰ اور اکمل۔

شَهِيْدًا کے معنے ہیں اَلشَّاهِدُ نگران (۲) اَلْاَمِيْنُ

اُمَّةً وَّسَطًا

شَهِيْدًا

فِی الشَّهَادَةِ جو اپنی شہادت میں بہت سچ بولنے والا ہو۔ (۳) اَلْقَتِیْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مارا جائے۔ (۴) اَلْعَالِمُ الَّذِیْ لَا یَغِیْبُ عَنْ عِلْمِهٖ شَیْءٌ وہ عالم جس کے علم سے کوئی بات غائب نہ ہو۔ (۵) اَلَّذِیْ یُعَایِنُ کُلَّ شَیْءٍ جو ہر چیز کو دیکھتا ہو۔ (اقرب)

كُنْتَ : کَانَ کے ایک معنے ہیں "ہے"۔ اور اسکے دوسرے معنے صَارَ کے بھی ہوتے ہیں یعنی "ہو گیا"۔ اور اس کے تیسرے معنے "تھا" کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے نہیں مقرر کیا اس قبلہ کو جس پر پہلے تو تھا۔ یا جس کی طرف تو اب پھر گیا اور جس پر اب قائم ہو گیا ہے۔ گویا ایک معنی کی رُو سے تبدیلی سے پہلے قبلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسرے معنے کی رُو سے تبدیلی کے بعد کے قبلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

نَعْلَمَ : عَلِمَ سے نکلا ہے اور اس کے معنے جاننے کے ہیں۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ کبھی سبب کو مسبّب کی جگہ رکھ دیتے ہیں یعنی جو چیز کسی دوسری چیز کا باعث ہوتی ہے اسکو اس نتیجہ کی جگہ رکھ دیتے ہیں جو اس کی وجہ سے پیدا ہوا ہوتا ہے اور کبھی اس کے اُلٹ بھی کر لیتے ہیں۔ اس جگہ سبب کو مسبّب کی جگہ رکھا ہے۔ علم کا نتیجہ امتیاز پیدا کرنا ہوتا ہے اور اس سے انسان کو اس بات کا پتہ لگ جاتا ہے کہ فلاں چیز اچھی ہے یا بُری۔ پس چونکہ تمیز علم سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اسجگہ تمیز کی بجائے علم کا لفظ رکھ دیا ہے تاکہ یہ بھی ثابت ہو کہ تمیز بغیر علم کے نہیں ہوتی (بحر محیط) قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اور لُغت میں بھی اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ جیسا کہ سَمَاءٌ کا لفظ بادل کے معنوں میں آجاتا ہے اس لئے کہ بادل درحقیقت بلندیوں سے اور سورج کی روشنی سے بنتے ہیں چونکہ سَمَاءٌ بادل بننے کا موجب اور ذریعہ ہے اس لئے بادل کو بھی سَمَاءٌ کہنے لگ گئے ہیں۔ پس لِنَعْلَمَ کے معنے یوں ہوئے کہ ہم نے یہ کام اس غرض سے کیا تھا تاہم ان لوگوں کو جو رسول کے متبع ہیں۔ اُن لوگوں سے جو اسکی طرف سے پھر جاتے ہیں ممتاز کر دیں۔ (۲) اس کے معنے امتیاز کرنیکی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عربی زبان میں جب عَلِمَ کے بعد مِنْ صلہ آئے تو اس وقت بھی علم سے تمیز مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ ائمہ لُغت لکھتے ہیں کہ اَلْعِلْمُ لَا یَتَعَدّٰی بِمِنْ اِلَّا اِذَا اُرِیْدَ بِهِ التَّمْیِیْزُ (بحر محیط)

كُنْتَ

یعنی عِلْم کا مِنْ کے ساتھ کبھی تعدیہ نہیں کیا جاتا۔ یعنی اسے متعدی نہیں بنایا جاتا سوائے اس صورت کے کہ اس سے تمیز مراد ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مِنْ تمیز کے لئے استعمال ہوتا ہے نہ کہ علم بمعنے جاننے کے معنے دینے کیلئے۔ پس جب اس کے ساتھ مِنْ آجاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ تمیز کے معنوں میں ہے (۳) علم کے معنے ظاہر کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ مگر یہ معنے عام لغات میں نہیں جنہوں نے قرآن کریم کی لغات لکھی ہیں۔ انہوں نے یہ معنے لکھے ہیں۔ اور قرآن کریم سے ظاہر ہے کہ یہ معنے درست ہیں۔

نَعْلَمَ

علم کے معنے ظاہر کرنے کے سورۃ احزاب کی اس آیت میں آتے ہیں کہ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ (احزاب آیت ۵۱) یہاں قطعی اور یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ علم کے معنے ظاہر کرنے کے ہیں۔ کیونکہ کوئی اپنی بات کے متعلق جاننے کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتا۔ مثلاً یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ مجھے علم ہے کہ میں کل لاہور گیا تھا۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو سُننے والے ہنس پڑیں گے کہ یہ کیسی بیوقوفی کی بات ہے۔ پس اگر اسجگہ یہ معنے کئے جائیں کہ جو کچھ ہم نے فرض کیا ہے اُس کا ہمیں علم ہو گیا ہے تو یہ درست نہیں۔ کیونکہ علم غیر کے متعلق ہوا کرتا ہے۔ اس لئے اس کے معنے علم کے نہیں بلکہ یہ معنے ہیں کہ جو کچھ ہم نے اُن پر فرض کیا تھا وہ ہم نے ظاہر کر دیا ہے یا بتا دیا ہے۔ پس چونکہ اس آیت میں سوائے ظاہر کرنے اور بتا دینے کے اور کوئی معنے نہیں

ہو سکتے ۔ اِس لئے یہی معنے کرنے پڑیں گے ۔ اور یہی اِلَّا لِنَعْلَمَ کا مفہوم ہے ۔

رَءُوْفٌ

رَءُوْفٌ : رَأْفَةٌ اور رَحْمَةٌ دونوں قریب قریب الفاظ ہیں ۔ مگر ان میں کچھ فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ رأفت خاص اور رحمت عام ہے ۔ رَأْفَةٌ میں دفع شر کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور رحمت میں دفع شر اور ایصال خیر دونوں شامل ہوتے ہیں ۔ بیمار کو دیکھ کر رأفت پیدا ہوتی ہے اور اُس کی بیماری کی وجہ سے رحمت پیدا ہوتی ہے ۔ کسی کو دُکھ میں دیکھ کر جو جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ رأفت کے نتیجہ میں بھی پیدا ہوتا ہے ۔ اور رحمت کے نتیجہ میں بھی پیدا ہوتا ہے ۔ صرف اتنا فرق ہے کہ احسان رحمت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے ۔ اور تکلیف کا دُور کرنا رأفت کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتا ہے ۔

تفسیر :۔ اِس آیت میں کَذٰلِكَ کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے ۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اشارہ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کی طرف ہے ۔ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیا کرتا ہے اور اُس نے تم کو اپنے فضل سے ہدایت دے دی ۔ اب کسی کو اِس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے اسی کی طرف کَذٰلِكَ میں اشارہ ہے یعنی جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اِسی طرح اُس نے دوسرا احسان تم پر یہ کیا ہے کہ اُس نے تمہیں اُمَّةً وَّسَطًا بنایا ہے ۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے وسط کے معنے درمیان کے ہوتے ہیں لیکن اُمت محمدیہ نہ زمانہ کے لحاظ سے درمیانی امت ہے اور نہ تعلیم اور شریعت کے لحاظ سے درمیانی امت ہے ۔ زمانہ کے لحاظ سے تو اِس لئے درمیانی اُمت نہیں کہ اُمتِ محمدیہ کے بعد اب قیامت تک اور کوئی اُمت نہیں ۔ پس وہ آخری اُمت تو کہلا سکتی ہے مگر درمیانی نہیں ۔ اور اگر شریعت کو دیکھا جائے تو اس لحاظ سے بھی امت محمدیہ درمیانی اُمت نہیں ۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نئی شریعت نہیں آنی کہ کہا جائے کہ کچھ شریعتیں اس سے پہلے آچکی ہیں اور کچھ بعد میں آئیں گی اور یہ اُمت دونوں کے درمیان ہے ۔ اسی طرح اگر تعلیم کو لیا جائے تو قرآن کریم سب سے آخری تعلیم ہے ۔ اِس لحاظ سے بھی قرآن کریم کی تعلیم وسطی اور درمیانی نہیں کہلا سکتی ۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ آیت ۴) یعنی آج میں نے تمہارے فائدہ کے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنے احسان کو کامل کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین کے طور پر صرف اسلام کو پسند کیا ہے ۔ پھر درجہ کے لحاظ سے بھی یہ اُمت درمیانی نہیں کیونکہ یہ سب سے اعلیٰ اور بہترین اُمت ہے ۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران آیت ۱۱۱) کہ تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے فائدہ کے لئے پیدا کیا گیا ہے ۔ پس اُمَّةً وَّسَطًا کے معنی یہاں درمیانی امت کے کسی صورت میں بھی چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ امت محمدیہ نہ تو زمانہ کے لحاظ سے درمیان میں ہے اور نہ تعلیم اور شریعت کے لحاظ سے درمیان میں ہے پس جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے تمہیں ایک ایسی امت بنایا ہے جو اپنے اعمال میں ایک وسطی رنگ رکھتی ہے اور نہ تو افراط کی طرف جھکنے والی ہے اور نہ تفریط کی طرف مائل ہونے والی ہے ۔ بلکہ اس کے اعمال ترازو کے تول کی طرح ایسے اعتدال میں رہتے ہیں کہ کوئی پہلو بھی ایک طرف جھکا ہوا دکھائی نہیں دیتا ۔ اسی لئے اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے تمام کاموں میں میانہ روی کی عادت

ڈالنی چاہیئے - یہ نہیں کہ ایک ہی طرف کا ہو جائے اور دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دے - اگر وہ ایک ہی طرف کا ہو جائیگا تو اس کے طبعی جذبات جوش میں آکر کناروں پر سے بہہ پڑیں گے - مثلاً اگر وہ رہبانیت اختیار کریگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے شہوانی جذبات کسی وقت اسکو بے قابو کر دیں گے اور وہ حلال طریق کو چھوڑ کر حرام میں مبتلا ہو جائیگا - اِسی طرح اگر وہ اپنا سب مال لوگوں میں تقسیم کر دیگا اور اپنے اور اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کے لئے کچھ نہیں رکھیگا تو چونکہ اُس کی ضروریاتِ خورد و نوش سب مال لٹا دینے سے باطل نہیں ہو جائیں گی - وہ اپنا مال لٹا کر یا تو سوال کرنے پر مجبور ہوگا جو بذاتِ خود ایک ناپسندیدہ امر ہے اور یا پھر چوری اور بددیانتی کی طرف مائل ہو جائیگا اور بجائے نیکی میں ترقی کرنے کے گناہ کا مرتکب ہوگا - پس شریعت اسلامی نے امت محمدیہ کو ایک ایسی امت قرار دیکر جو ہر کام میں اعتدال سے کام لیتی ہے گناہ کے تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے اور اُمَّۃً وَّسَطًا میں اسلام کی اسی وسطی تعلیم کی طرف اشارہ ہے جس میں وہ دوسرے تمام مذاہب سے امتیازی شان رکھتا ہے - اور اسی ایک دلیل سے اس کی فضیلت ثابت ہو جاتی ہے -

اِس کے بعد خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسا ہم نے اسلئے کیا ہے لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ تاکہ تم دوسرے مذاہب اور دوسری اقوام کے لئے ایک گواہ کی طرح رہو - یعنی جس طرح گواہ کی گواہی سے ثابت ہوتا ہے کہ حق کیا ہے اور کس کا ہے اسی طرح تم میں سے جو لوگ قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کر کے اس کے نیک اثرات کو اپنے اندر پیدا کریں گے وہ دوسری اقوام کے لئے جو ابھی تک قرآن کریم کی صداقت سے لذّت آشنا نہیں بطور ایک شاہد کے ہونگے - یعنی زبان اور عمل دونوں سے وہ اس بات کا اعلان کرینگے کہ انہوں نے اس کے دعاوی کو سچ پایا - اور لوگ انکی پاکیزہ زندگی اور آسمانی نصرت کو دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ سچا راستہ وہی ہے جس پر یہ لوگ چلتے ہیں - اور پھر آخر میں بتایا کہ جس طرح ہم نے ان مسلمانوں کو جو قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں دوسری اقوام کے لئے شاہد بنایا ہے اسی طرح ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جماعت کے لئے اسلام کی سچائی کا شاہد بنایا ہے - یعنی اُنکی دل میں آپؐ کے معجزات اور نصرتِ الٰہی کو دیکھ کر اسلام کی صداقت کامل طور پر گھر کر جاتی ہے -

غرض اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے ایسا اسلئے کیا ہے تاکہ تمہارے ساتھ خدا تعالیٰ کا معجزانہ سلوک دیکھکر اور تمہاری روحانیت اور تقویٰ کو دیکھ کر لوگ ہدایت پائیں اور دوسری طرف یہ رسول اسلام کی سچائی کا تمہارے سامنے ایک زندہ گواہ ہو یعنی اپنے معجزات اور نصرتِ الٰہی کی بارش - گویا تم دنیا کے لئے اسلام کی صداقت کے گواہ ہو - اور رسول تمہارے سامنے اسلام کی سچائی کا گواہ ہو -

اِسی طرح اس کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ رسول تم کو اسلام سکھائے اور تم دوسروں کو سکھاتے رہو - دراصل اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کی امت بننے کا یہ طریق بتایا ہے کہ وہ شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ہو - یعنی تعلیم و تربیت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھے اور لوگوں کے ایمانوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتی رہے اِسی لئے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اُمَّۃً وَّسَطًا بنایا ہے - تاکہ تم لوگوں کو سکھاؤ اور اُن کے نگران بنو - اور رسول کا کام ہے کہ وہ تمہیں سکھائے اور تمہاری کمزوریوں کو دُور کرے -

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انسانی جسم میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد فاسد فضلے جمع ہو جاتے ہیں جو کبھی قبض کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی اسہال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں - یا مکانوں اور چھتوں پر پانی کے نکاس کے راستے خراب ہو کر پانی جمع ہو جاتا اور چھتوں میں

سوداغ ہونے لگتے ہیں۔ اسی طرح قوموں پر بھی مختلف اوقات میں ایسے حالات وارد ہوتے رہتے ہیں اور جس طرح ایک زندہ انسان جسم کی کسی ایک کل کے درست ہونے سے اپنے تمام کام آپ ہی آپ نہیں چلا سکتا۔ بلکہ صبح شام اُس کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح قوموں کے اخلاق بھی آپ ہی آپ درست نہیں ہو جاتے بلکہ صبح شام اُن کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ فرد جس کی حیثیت قوم کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اُس کی زندگی کے لئے تو ضروری سمجھا جاتا ہے کہ صبح شام نگرانی ہو۔ روزانہ اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ آج صبح کیا پکائیں اور شام کو کیا پکائیں۔ گرمی ہے تو باہر سوئیں۔ یا سردی ہے تو اندر سوئیں ہوا ٹھنڈی چل رہی ہے تو سر کو ڈھانک کر رکھیں یا خشکی کا دور دورہ ہے تو سر کو کھلا رکھیں۔ دھوپ نکلی ہوئی ہے تو سایہ میں چلیں۔ یا بارش برس رہی ہے تو چھت کے نیچے ٹھہریں یا حبس ہے تو باہر نکل آئیں۔ غرض صبح شام ان باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں دن بھر میں انسان اپنے جسم کے متعلق پندرہ بیس دفعہ ضرور سوچتا ہے کہ اُسے اب کس چیز کی ضرورت ہے۔

کبھی خیال کرتا ہے کہ سونے کی ضرورت ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کہ لیٹنے کی ضرورت ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کہ ورزش کی ضرورت ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کہ سیر کی ضرورت ہے۔ کبھی خیال کرتا ہے کھانے کی ضرورت ہے۔ غرض ایک دو درجن دفعہ ضرور وہ اپنے افعال کے متعلق غور کرتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ مجھے اپنے جسم کی درستی کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن قوم کی درستی کے متعلق وہ کبھی نہیں سوچتا بلکہ سمجھتا ہے کہ وہ آپ ہی آپ درست ہو جائیگی۔ اور اگر وہ کوئی غلط قدم اُٹھا لیتی ہے تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے آپ پر الزام لگائے کہ میں نے قومی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا وہ سمجھتا ہے کہ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ قوم پر میں اپنے غصّے کا اظہار کر دوں اور عملی طور پر اسکی اصلاح کے لئے کچھ نہ کروں لیکن یہ درست نہیں۔ قومی درستی فردی درستی سے زیادہ توجہ چاہتی ہے اور ہر فرد کی توجہ چاہتی ہے۔ اگر ہر فرد اس مسئلہ کی طرف توجّہ نہیں کریگا تو بعض حصّوں میں ضرور نقائص پیدا ہو جائیں گے اور پھر وہ اتنے بڑھ جائیں گے کہ اُن کا دُور کرنا فرد کے اختیار میں نہیں رہیگا بلکہ ایک وقت ایسا آئیگا کہ اُن کا دُور کرنا قوم کے اختیار میں بھی نہیں رہیگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظام قائم رکھنے کیلئے اسلام نے خلافت کا سلسلہ قائم کیا ہے۔ لیکن غلطی یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف خلافت ہی کا ذمہ ہے کہ وہ تمام کام کرے حالانکہ یہ خلافت ہی کا ذمہ نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ایک شخص ساری قوم کی اس رنگ میں اصلاح کر سکتا ہے جب تک تمام افراد میں یہ رُوح نہ ہو کہ وہ قوم کی اصلاح کا خیال رکھیں۔ اور جب تک تمام افراد اس کی درستی کی طرف توجہ نہ کریں اس وقت تک اصلاح کا کام کبھی کامیاب طور پر نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں اگر قرآن کریم کے اس حکم کی تعمیل میں مسلمان نسلاً بعد نسلٍ تبلیغ ہدایت کا کام جاری رکھتے اور لوگوں کی نگرانی کا فرض صحیح طور پر ادا کرتے تو وہ کبھی تباہ نہ ہوتے۔ اب یہ ہماری جماعت کا کام ہے کہ وہ اس سبق کو یاد رکھے اور آئندہ نسلوں کی درستی کے لئے ہمیشہ جدوجہد کرتی رہے۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ایک طرف تو تمہارا فرض ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوحانی فیوض حاصل کر کے اقوامِ عالم کی رہنمائی کرو اور دوسری طرف ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم پر نگران و محافظ مقرر کیا ہے تاکہ اگر کوئی خرابی پیدا ہو

تو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہاری اصلاح کر سکیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جتنا اعلیٰ درجہ کا رسول ہو اُتنی ہی اعلیٰ درجہ کی قوم اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ اگر رسول اعلیٰ ہو اور امت ناقص۔ تو رسول کی طاقت ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا رسول تو بھیجے مگر اس کی قابلیتوں کے مطابق اُسے قوم نہ دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انکی استعداد کے مطابق قوم ملی۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپکی استعداد کے مطابق قوم ملی۔ اس کی موٹی مثال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ایک نہایت نازک موقعہ پر آکر کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ آیت ۲۵) یعنی تو اور تیرا رب دونوں جاکر لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے لوگوں سے جنگ بدر کے موقعہ پر مشورہ لیا تو ایک صحابیؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ ہم موسیٰ کی قوم کی طرح آپ سے یہ نہیں کہتے کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ بلکہ یا رسول اللہ! آپ ہمیں حکم دیجیئے ہم سمندر میں گھوڑے ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور اگر لڑائی ہوئی تو خدا کی قسم ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے اور آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گزرے جس وقت وہ صحابیؓ یہ کلمات کہہ رہا تھا۔ درحقیقت اُس کی بات سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری قوم بول رہی تھی اُسکی انفرادی آواز نہیں تھی بلکہ اجتماعی آواز تھی جو قوم کی نمائندگی میں اُس کی زبان سے بلند ہوئی۔ اور جس نے صحابہؓ کی فدائیت اور جاں نثاری کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰ علیہ السلام کی امت میں یہ فرق اسی لئے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک محدود زمانہ اور محدود قوم کے لئے آئے تھے اور محدود نقائص کو دُور کرنا آپ کے فرائض میں شامل تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تمام دنیا کی طرف تھی اور قیامت تک آپ کا دَور رُوحانی مقرر تھا اور قیامت تک آپ نے لوگوں کے نقائص کو دُور فرمانا تھا۔ پس آپ کو جو جماعت ملی وہ موسیٰؑ کو نہیں ملی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کی اُمّت بنایا ہے اور ہماری غرض یہ ہے کہ تم لوگوں پر نگران رہو اور رسول تم پر نگران ہو۔ یعنی رسول کی نگرانی میں تمہاری تربیت ہو اور پھر تمہاری نگرانی میں دنیا کی اصلاح ہو۔ کیونکہ ایک آدمی ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کی اُمّت اسی لئے بنایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قابلیت چاہتی تھی کہ آپ کی امت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ درجہ کے لوگ نہ ملتے تو محمد رسول اللہ کی بعثت کی غرض کس طرح پوری ہوتی؟ پس اُمت محمدیہ کا اعلیٰ ہونا بھی ضروری تھا تاکہ وہ اسلام کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرکے اس کے مطابق دُنیا کی اصلاح کر سکے۔ اگر اس میں یہ قابلیت نہ رکھی جاتی تو اصلاح خلق کا مقصد پورا نہ ہو سکتا۔

اِس آیت سے اُمّتِ محمدیہ میں بعثتِ مامورین کا بھی ثبوت نکلتا ہے کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُمتِ محمدیہ کو اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ دائمی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضان لوگوں کو پہنچاتی رہے مگر چونکہ یہ خطرہ تھا کہ ایک زمانہ میں خود مسلمان ہی اس فرض سے غافل ہو جائیں گے۔ اس لئے فرمایا کہ جب یہ فیضان مسلمانوں کی بدعملی کی وجہ سے بند ہو جائیگا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود شہید بن کر دنیا میں آجائیں گے۔ یعنی جب اُمّتِ محمدیہ دوسروں کی نگرانی نہ کر سکے گی بلکہ خود نگرانی کی محتاج ہو جائیگی تو یہ رسول ہی اس کی اصلاح کریگا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا کو پیچھے رکھا ہے اور تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کو مقدم

کیا ہے۔ اگر اس میں صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا ذکر ہوتا تو یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا پہلے اور لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ بعد میں ہوتا۔ کیونکہ صحابہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سکھایا تھا۔ پھر صحابہؓ نے دوسروں کو سکھایا۔ مگر قرآن کریم نے یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا کو پیچھے رکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا سے پہلی بعثت مراد نہیں بلکہ اس سے آپ کی دوسری بعثتیں مراد ہیں۔ یعنی جب کبھی اُمّتِ محمدیہ کی نگرانی میں فرق پڑ جائیگا اور مسلمانوں کا نمونہ اچھا نہیں رہیگا اُس وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پھر شہید اور نگران بن کر دنیا میں آجائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کی تربیت کرکے انہیں اس قابل بنادیں گے کہ وہ دوسروں کی تربیت کریں غرض یہ ترتیب بتاتی ہے کہ اسجگہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بروزی بعثتوں کا ذکر ہے اور الفاظ قرآنی بھی بتاتے ہیں کہ لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ سے صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت کے لوگ مراد نہیں۔ بلکہ اس سے قیامت تک کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔ پس یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا بھی قیامت تک سچا ثابت ہوتا رہیگا یعنی قیامت تک اُمّتِ محمدیہ شاہد رہے گی۔ اور قیامت تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شاہد رہیں گے۔ یعنی قیامت تک لوگ آپؐ سے فیضان حاصل کرکے دوسروں کو سکھاتے چلے جائیں گے اور قیامت تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شاہد اور نگران کے فرائض سرانجام دیتے رہیں گے۔ مگر چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جسمانی وجود کے ساتھ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے اسلئے یہ آیت آپ کی بعثت بروزی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ اُمّتِ محمدیہ دوسروں کی اصلاح کیلئے کھڑی کی گئی ہے۔ لیکن جب خود اُمّتِ محمدیہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا تو اس وقت کوئی باہر کا نبی اس کی اصلاح نہیں کرے گا بلکہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اپنی امت کی بروزی رنگ میں اصلاح فرمائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ آیت بھی اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے۔ کیونکہ اگر اسلام عالمگیر مذہب نہ ہوتا۔ اور قیامت تک قائم رہنے والا مذہب نہ ہوتا تو اصلاح خلق کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بروزی رنگ میں مبعوث نہ کیا جاتا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَیْهِ۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تحویل قبلہ سے قبل بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نمازیں پڑھا کرتے تھے اور تیرہ سالہ مکی زندگی میں آپ برابر اس طریق پر عمل پیرا رہے۔ اس کے بعد مدینہ تشریف لے گئے۔ تو وہاں بھی سولہ سترہ مہینے تک آپؐ نے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نمازیں پڑھیں۔ آخر ایک دن جب کہ آپ مسجد بنی سلمہ میں نماز پڑھا رہے تھے آپ پر تحویل قبلہ کے بارہ میں وحی نازل ہوئی اور آپؐ نے نماز کی حالت میں ہی بیت اللہ کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ اور صحابہؓ نے بھی آپؐ کے ساتھ ہی اپنا رُخ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف کرلیا۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں آپ کعبہ کی طرف مُنہ کرکے نمازیں پڑھتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ آئے تو بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نمازیں پڑھنے لگے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ مسیحی مؤرخوں نے اس خیال سے فائدہ اُٹھا کر اعتراض کیا ہے کہ محمد رسول اللہ کی اصل غرض یہود کی خوشنودی حاصل کرنا تھا جب وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر کعبہ کی طرف مُنہ کرلیا۔ چنانچہ ریورنڈ وہیری اور سیل لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینہ میں آکر بیت المقدس کی طرف مُنہ اس لئے کیا تھا کہ یہودی خوش ہوکر آپ پر ایمان لے آئیں مگر جب اس میں کامیابی

نہ ہوئی تو انہوں نے کہا۔ چلو ہم اپنے باپ دادا کے اصل کعبہ ہی کی طرف منہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں تو ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ مکہ میں بھی آپ کو یہی حکم تھا کہ بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھیں اور اس حکم کی تعمیل میں آپ ہجرت سے قبل بھی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ہی نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ یہود کو خوش کرنے کے لئے صرف مدینہ میں آپ نے بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنا شروع کر دیا ہو۔ اور مکہ میں تو کوئی یہودی نہ تھے جنہیں خوش کرنا مدنظر ہو۔ وہاں تو چاروں طرف مشرک ہی مشرک تھے۔ البتہ بعض روایات میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب آپؐ مکہ میں تھے تو آپ ایسی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے کہ خانہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں آپ کے سامنے رہتے تھے۔ لیکن جب آپ مدینہ تشریف لے آئے اور بیک وقت دونوں طرف منہ رکھنا ناممکن ہو گیا۔ کیونکہ یروشلم مدینہ سے شمال کی طرف تھا اور مکہ جنوب کی طرف تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ بیت المقدس کی طرف منہ رکھیں۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے :—

وَقَدْ جَآءَ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ اَحَادِیْثُ کَثِیْرَۃٌ وَحَاصِلُ الْاَمْرِ اَنَّہٗ قَدْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمِرَ بِاسْتِقْبَالِ الصَّخْرَۃِ مِنْ بَیْتِ الْمَقْدِسِ وَ کَانَ بِمَکَّۃَ یُصَلِّیْ بَیْنَ الرُّکْنَیْنِ فَتَکُوْنَ بَیْنَ یَدَیْہِ الْکَعْبَۃُ وَھُوَ مُسْتَقْبِلٌ صَخْرَۃَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ۔ فَلَمَّا ھَاجَرَ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ تَعَذَّرَ الْجَمْعُ بَیْنَھُمَا فَاَمَرَہُ اللّٰہُ بِالتَّوَجُّہِ اِلٰی بَیْتِ الْمَقْدِسِ (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد اوّل صفحہ ۳۲۹) یعنی تحویل قبلہ کی بحث میں بہت سی احادیث روایت کی گئی ہیں۔ ان سب کو جمع کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ صخرہ بیت المقدس کی طرف منہ کریں۔ چنانچہ آپ مکہ میں نماز پڑھتے ہوئے ایسے طور پر بیت المقدس کی طرف منہ کرتے تھے کہ کعبہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس بھی۔ لیکن جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ طریق جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ صرف بیت المقدس کی طرف منہ کر لیا کریں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ مکہ میں آپ بیت المقدس کو ہی اصل قبلہ سمجھتے تھے بے شک آپ ایسے رنگ میں کھڑے ہوتے تھے کہ بیت اللہ بھی سامنے آجاتا تھا مگر وہ ایک ضمنی فائدہ تھا اصل مقصد بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرنا تھا لیکن جب آپ مدینہ میں تشریف لے آئے تو جہت تبدیل ہو جانے کی وجہ سے کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف آپ کا منہ کرنا ناممکن ہو گیا اور آپ نے صرف بیت المقدس کی طرف منہ کرنا شروع کر دیا۔ بہرحال یہ بات صحیح نہیں کہ مدینہ میں آنے کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپکو بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنیکا حکم دیا گیا تھا کیونکہ ایسا کوئی حکم ثابت نہیں۔ پس مکہ مکرمہ میں اگر بیت المقدس کے ساتھ بیت اللہ کی طرف بھی آپ کا رُخ ہوتا تھا۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ خانہ کعبہ ہی اپنا اصل قبلہ سمجھتے تھے صحیح نہیں۔ آپ بیت المقدس کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے لیکن کھڑے ایسے رنگ میں ہوتے تھے کہ بیت اللہ بھی آپ کے سامنے آجاتا۔ پس جب یہ بات ہی غلط ثابت ہوئی تو دشمن کا اعتراض بھی غلط ہو گیا۔ اسی طرح سیل کا یہ اعتراض بھی غلط ہے کہ آپ مکہ میں جدھر چاہتے منہ کر لیا کرتے تھے۔ اس اعتراض کا ایک جواب یہ بھی ہے کہ جب آپ نے کعبہ کی طرف مُنہ کیا تو اس وقت حدیثوں میں آتا ہے کہ یہود نے تمسخر کرتے ہوئے مشرکوں سے کہا۔ کہ

اِشْتَاقَ مُحَمَّدٌ اِلٰی مَوْلِدِہٖ وَعَنْ قَرِیْبٍ یَرْجِعُ اِلٰی دِیْنِکُمْ (بحر محیط جلد اوّل صفحہ ۴۲۲) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر اپنے وطن کی یاد ستانے لگی ہے اور امید ہے کہ وہ اب

جلد ہی تمہارے دین کی طرف واپس لوٹ آئیگا۔ اس روایت سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ پہلے آپ بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرکے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ اگر آپ پہلے خانہ کعبہ کی طرف منہ کیا کرتے تو کفار آپ کے متعلق یہ اعتراض نہ کرتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آہستہ آہستہ مکہ والوں کے دین میں ہی شامل ہو جائیگا۔ ان کا یہ اعتراض اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ آپ بیت اللہ کی طرف نہیں بلکہ بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہوں۔

علاوہ ازیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کیا یہ تبدیلی فی الواقعہ کسی ذاتی فائدہ کے لئے تھی؟ معترضین کہتے ہیں کہ یہ تبدیلی اس غرض کے ماتحت کی گئی تھی کہ پہلے آپ نے یہودیوں کو اور بعد میں مکہ والوں کو خوش کرنا چاہا۔ لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ تبدیلی لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا ابتلا تھا۔ مکہ میں مکہ کے لوگوں سے بیت المقدس کی طرف منہ کرانا اور پھر مدینہ میں جہاں یہود و نصاریٰ کا زور تھا اور مشرک بھی ان سے متاثر تھے وہاں بیت اللہ کی طرف منہ کرانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر معمولی بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ کیوں فرماتا کہ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ۔ یعنی ہم نے اس قبلہ کو جس پر تو اس سے پہلے قائم تھا یعنی بیت المقدس کو صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ تا ہم اس شخص کو جو اس رسول کی فرمانبرداری کرتا ہے اس شخص کے مقابل پر جو ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے ایک ممتاز حیثیت میں ظاہر کر دیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم بطور آزمائش تھا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مکہ والوں کی نظر میں کعبہ کو جو فضیلت حاصل تھی حتیٰ کہ قاتل کو بھی اس میں کچھ نہ کہتے تھے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے سمجھا جا سکتا ہے کہ ان سے بیت المقدس کی طرف منہ کروانا ایک بہت بڑا ابتلاء تھا۔ اسی طرح مدینہ میں جہاں یہود کا زور تھا بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرف منہ کروانا ایک دوسرا ابتلاء تھا۔ اسی لئے قرآن کریم دونوں دفعہ کی تحویل کو ابتلاء قرار دیتا ہے۔ پہلی تحویل کی نسبت کہا ہے وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ اور دوسری تحویل کی نسبت کہا ہے سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا۔ یعنی سطحی رائے رکھنے والے اور بے وقوف لوگ عنقریب یہ اعتراض کرینگے کہ ان لوگوں کو ایک قبلہ سے دوسرے قبلہ کی طرف کس چیز نے پھرا دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں دفعہ کی تحویل ایک ابتلاء تھی اور لوگوں کو مخلص دین سے واقف کرنا اصل مقصود تھا۔ اگر معترضین کا خیال درست ہوتا کہ آپ اس ذریعہ سے مکہ والوں کو خوش کرنا چاہتے تھے تو چاہیئے تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا۔ ہم تحویل قبلہ کا حکم دیکر تم پر احسان کرنے والے ہیں تاکہ لوگ خوش ہو جائیں۔ اور اسلام کی طرف ان کا میلان بڑھ جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس حکم کے نازل ہونے پر لوگ اعتراض کرینگے۔ اور ان کے لئے یہ تبدیلی ٹھوکر کا موجب ہوگی۔ گویا قرآن کریم نے تحویل قبلہ کے واقعہ کو ایک ابتلاء اور آزمائش قرار دیا ہے۔ اسی طرح مکہ میں آپ کا بیت المقدس کی طرف منہ کرنا بھی ان لوگوں کے لئے جو اہل مکہ میں سے مسلمان ہوئے تھے ایک بڑا بھاری ابتلاء تھا۔ کیونکہ وہ صدیوں سے بیت اللہ کو ایک مقدس معبد مانتے چلے آئے تھے اور اس کے مقابلہ میں بیت المقدس کی ان کے دل میں کچھ بھی وقعت نہ تھی۔ پس مکہ والوں کو یہ کہنا کہ تم بیت المقدس کی طرف منہ کرو۔ ان کے لئے بڑا بھاری ابتلاء تھا۔ اور مدینہ میں جہاں یہود کا زور تھا یہ کہنا کہ تم بیت اللہ کی طرف منہ کرو۔ ان لوگوں کے لئے جو یہود اور نصاریٰ میں سے مسلمان ہوئے ایک بڑا بھاری ابتلاء تھا۔ کیونکہ ان کے لئے بیت المقدس ایک متبرک مقام تھا۔ اور تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کئی لوگوں کو اس پر ابتلاء آگیا اور وہ مرتد ہو گئے۔ پس یہ تغیر کسی خوشنودی کے حصول کے لئے

نہ تھا بلکہ ایمانوں کی ایک سخت آزمائش تھی۔ اگر قبلہ مقرر کرنے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف یہی غرض ہوتی کہ دوسروں کو خوش کیا جائے۔ تو اس کا صحیح طریق یہ تھا۔ کہ جب تک آپ مکہ میں رہے خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر فرماتے تاکہ اہل مکہ خوش رہیں اور مدینہ میں یروشلم کو قبلہ بنا لیتے تاکہ یہود خوش رہیں۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس نظر آتا ہے مکہ میں آپؐ نے بیت المقدس کی طرف مُنہ کیا اور مدینہ میں تشریف لانے کے کچھ عرصہ بعد خانہ کعبہ کی طرف مُنہ پھیر لیا۔ اور یہ تبدیلی دونوں جگہ لوگوں کے لئے سخت آزمائش کا موجب بنی اور کئی لوگ مرتد ہو گئے (تفسیر کبیر رازی جلد ۱ ص ۲۶ و تفسیر جامع البیان جلد ۲ ص ۸) اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً۔ یعنی تحویل قبلہ کا واقعہ یقیناً ان لوگوں کے سوا جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے ایک بڑی بھاری آزمائش ہے۔ کیونکہ جب انسان کا کسی چیز کے ساتھ گہرا تعلق ہو تو ▪▪ اس کو آسانی کے ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پا جائے اور کہے کہ میں ہر صورت میں خدا تعالیٰ کا حکم مانوں گا اُسکے لئے کوئی بڑی بات نہیں رہتی اور وہ کسی ابتلاء سے ٹھوکر نہیں کھاتا۔ آخر سورج اور چاند دیکھنے کے بعد ان کا کون انکار کر سکتا ہے۔ اسی طرح عقلی طور پر بیشک سوال پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے ایمان اور یقین کی دولت سے مالا مال کیا ہو اُن کے لئے کوئی سوال ٹھوکر کا موجب نہیں ہوتا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ۔ فرماتا ہے بے شک یہ ایک ابتلاء تھا جو بعض لوگوں کے لئے ٹھوکر کا موجب بنا مگر اس قبلہ سے تعلق رکھنے کے ساتھ جو الٰہی وعدے وابستہ تھے۔ اُن سے اللہ تعالیٰ تم کو کب محروم رکھ سکتا تھا جبکہ تم اس رسول پر سچے دل سے ایمان لے آئے تھے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ تحویل قبلہ سے پہلے جو لوگ فوت ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے ایمانوں کو ضائع نہیں کرے گا اور ان کے اُخروی درجات میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے بلکہ اس کے اصل معنے یہی ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف تھا کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور ہم اس گھر سے تمہارا دائمی تعلق پیدا نہ کرتے۔ کیونکہ اگر بیت اللہ کو قبلہ مقرر نہ کیا جاتا تو ابراہیمی پیشگوئی کی عظمت دنیا پر واضح نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ تم دُعائے ابراہیمی کے مصداق پر تو ایمان لاؤ اور تمہارا خانہ کعبہ کے ساتھ تعلق قائم نہ ہو۔

اسی طرح وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ابتلاء ایمان کو ضائع کرنے کے لئے نہیں آتے بلکہ سچے ایمان کو ظاہر کرنے اور جھوٹے کے جھوٹ کو کھولنے کیلئے آتے ہیں۔ اور اس لئے بھی آتے ہیں کہ ان سے حکمتِ احکام ظاہر ہو کر علم میں ترقی ہوتی ہے جیسا کہ تحویلِ قبلہ کے حکم سے مسلمانوں کے علم میں ترقی ہوئی۔ اور اگر ایک طرف اُن کے ایمانوں کی مضبوطی لوگوں پر ظاہر ہو گئی تو دوسری طرف خود انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ پہلے بیت المقدس کی طرف اور پھر بیت اللہ کی طرف مُنہ کرنے کا کیوں حکم دیا گیا تھا۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کی کیا کیا حکمتیں کام کر رہی تھیں۔ چونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ اسلئے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شائد ابتلاؤں کا آنا ایک ظلم ہے جو ایمان کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابتلاؤں سے مومنوں کا ایمان ضائع نہیں ہوتا بلکہ صرف نام نہاد مومنوں کا ایمان ضائع ہوتا ہے ورنہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ زید پختہ مومن ہو اور پھر ٹھوکر کھا جائے۔ ▪▪ اگر ٹھوکر کھاتا ہے تو صرف اس لئے کہ ▪▪ پہلے ہی صحیح

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً

ہم تیری توجہ کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں۔ اِس لئے ہم تجھے ضرور اُس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے

تَرْضٰهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا

جسے تو پسند کرتا ہے۔ سو (اب) تو اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لے۔ اور (اے مسلمانو!) تم (بھی) جہاں کہیں ہو

كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَإِنَّ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ

اُس کی طرف اپنے مُنہ کیا کرو۔ اور جن (لوگوں) کو کتاب (یعنی تورات) دی گئی ہے وہ یقیناً جانتے ہیں کہ یہ (تحویلِ قبلہ کا حکم)

معنوں میں مومن نہیں تھا۔ پس ابتلاء مومنوں کے ایمانوں کو ضائع کرنے کے لئے نہیں بلکہ سچے مومنوں کی تو علانی عظمت اور ان کے ایمانوں کی پختگی ظاہر کرنے اور احکامِ الٰہیہ کی حکمت ظاہر کرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔

ریورنڈ وہیری نے اس موقعہ پر اعتراض کیا ہے کہ جب لوگوں کو ابتلاء آیا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نعوذ باللہ یہ بہانہ بنایا کہ یہ ایک امتحان ہے۔ حالانکہ یہ آیتیں تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی ہیں پس جب ابھی حکم نازل ہی نہیں ہُوا تھا تو ابتلاء کس کو آنا تھا۔ اسی طرح سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ کے الفاظ بھی بتلاتے ہیں کہ یہ آیتیں پہلے کی نازل شدہ ہیں پس وہیری کا یہ اعتراض محض تعصب پر مبنی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ صاف طور پر فرماتا ہے کہ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ یعنی ہم نے اس قبلہ کو جس پر تو پہلے سے قائم تھا صرف اس لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون اس رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص حکم نازل ہُوا تھا۔ یہ نہیں کہ آپ محض اجتہادی طور پر اہلِ کتاب کی اتباع میں بیت المقدس کی طرف مُنہ کرکے نمازیں پڑھا کرتے ہوں۔ پس اگر قرآن کریم کے احکام جیسا کہ مفسرین لکھتے ہیں منسوخ بھی ہوتے ہیں تو چاہیئے تھا کہ وہ آیت بھی قرآن کریم میں موجود ہوتی۔ جس کی طرف وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ مگر وہ ہے نہیں۔ پس ماننا پڑیگا کہ اگر قرآن کریم کا کوئی حصّہ منسوخ ہوتا تھا تو پھر وہ قرآن کریم میں نہیں رکھا جاتا تھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا کوئی حصّہ کبھی منسوخ نہیں ہُوا بلکہ جو حکم منسوخ ہونا ہوتا تھا اُسے وحی متلو میں اتارا ہی نہیں جاتا تھا۔ بیت المقدس چونکہ عارضی قبلہ تھا اور مستقل قبلہ خانہ کعبہ بننے والا تھا۔ اس لئے وہ حکم قرآنی وحی سے علیحدہ نازل ہُوا اور بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام احکام جن کو بعد میں منسوخ قرار دے دیا گیا تھا وہ قرآن میں نازل نہیں کئے گئے تھے۔ اگر وہ احکام قرآن میں موجود تھے اور پھر منسوخ کر دیئے گئے تھے تو ضروری تھا کہ وہ قرآن میں اپنی اصلی شکل میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتے۔ مگر

اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۵﴾

تیرے رب کی طرف سے (بھیجی ہوئی ایک) صداقت ہے۔ اور جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ اس سے ہرگز بے خبر نہیں ہے۔ ۱۶۰ ؎

ان کا قرآن کریم میں موجود نہ ہونا بتلاتا ہے کہ منسوخ ہونے والی وحی قرآن کریم سے علیحدہ ہوتی تھی۔ جیسا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم قرآن میں کہیں موجود نہیں۔ لیکن اس حکم کا منسوخ ہونا بتاتا ہے کہ اس بارہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ضرور کوئی وحی نازل ہوئی تھی مگر چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس حکم نے منسوخ ہوجانا ہے اس لئے اسے قرآنی وحی میں شامل نہ کیا گیا۔ غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی دو قسم کی ہوا کرتی تھی ایک قرآنی اور دوسری غیر قرآنی قرآنی وحی ہر قسم کے نسخ سے بالا تھی۔ مگر غیر قرآنی وحی منسوخ بھی ہو جاتی تھی جیسا کہ تحویل قبلہ کے متعلق پہلا حکم منسوخ کر دیا گیا۔

۱۶۰ ؎ **حل لغات**:۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ: وَلَّاهُ الْاَمْرَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ وَالِيًا عَلَيْهِ اُسے فلاں پر مسلط کر دیا۔ (اقرب) اور وَلَّيْتُ وَجْهِيْ كَذَا کے معنے ہیں اَقْبَلْتُ۔ میں نے اُس کی طرف اپنا منہ پھیرا (مفردات)

تفسیر:۔ اس آیت کے متعلق بعض مفسرین روایات نقل کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نماز میں آسمان کی طرف منہ اُٹھا اُٹھا کر دیکھا کرتے تھے کہ تحویلِ قبلہ کا حکم کب نازل ہوتا ہے (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد اوّل صفحہ ۳۲۹) یہ تو الگ بحث ہے کہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے سے کب روکا گیا۔ لیکن اس غرض کے لئے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر دیکھنا اپنی ذات میں ایسا امر ہے جسے عقل انسانی ایک لمحہ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ اگر قبلہ کے علاوہ اور باتوں میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت ہوتی کہ آپ اُن کے بارہ میں الٰہی حکم معلوم کرنے کے لئے آسمان کی طرف دیکھا کرتے تو ہم اس امر کو بھی مان لیتے کہ شاید نماز پڑھتے وقت آپ آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے ہوں۔ مگر محض اس وجہ سے کہ قرآن کریم میں فِي السَّمَآءِ کے الفاظ آ گئے ہیں ایک ایسے فعل کو صحیح تسلیم کرنا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عام طریق عمل کے بالکل خلاف تھا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک محاورہ ہے جسے نہ سمجھتے ہوئے یہ خیال کر لیا گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تحویلِ قبلہ کے بارہ میں آسمان کی طرف اپنی آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھا کرتے تھے اور اس امر کے منتظر رہتے تھے کہ کب خدائی حکم نازل ہوتا ہے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ میری تو نظر ہی اُدھر لگی ہوئی ہے۔" یا کہتے ہیں "میری توجہ تو فلاں امر کی طرف پھر گئی ہے"۔ اور جب ہم یہ الفاظ کہتے ہیں تو ان کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ فی الحقیقت ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کسی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اسی طرح قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ کے بھی یہی معنے ہیں کہ ہم تیری توجہ کا بار بار آسمان کی طرف پھرنا دیکھ رہے ہیں۔ یعنی تیرے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس بارہ میں آسمان سے الٰہی حکم نازل ہو۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ

اگر ظاہری الفاظ کا ہی اتباع کیا جائے تو مفسرین کے بیان کردہ معنے یہاں چسپاں ہی نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ "تیرا آسمان میں اِدھر اُدھر اپنا مُنہ پھیرنا" اور یہ خود ایک ناقابلِ تسلیم بات ہے۔ کیونکہ مُنہ کا آسمان میں متقلب کرنا ناممکن ہے۔ پس الفاظِ قرآنی ان معنوں کو برداشت نہیں کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ فِي کے معنے اس جگہ اِلٰی کے ہیں۔ اور اس کی مثال قرآن کریم

میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ (سورۃ ابراہیم آیت ۱۰) یعنی جب لوگوں کے پاس اُن کے رسول کھلے کھلے دلائل لے کر آئے تو انہوں نے اُن کے ہاتھ اُن کے مونہوں کی طرف لوٹا دیئے۔ اسجگہ فِيْٓ اَفْوَاهِهِمْ سے اُن کے مونہوں میں ہاتھ ڈالنا مراد نہیں بلکہ اُن کی طرف لوٹانا مراد ہے۔

اسی طرح یہاں تَقَلُّبَ فِي السَّمَآءِ سے آسمان میں اِدھر اُدھر مُنہ پھیرنا مراد نہیں بلکہ آسمان کی طرف آپ کی توجہ کا بار بار پھرنا مراد ہے۔ ورنہ آسمان کی طرف مونہہ اُٹھانا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقار کے بھی خلاف تھا۔ میرے نزدیک اِس کے یہی معنے ہیں کہ ہم تیری توجہ کے بار بار آسمان کی طرف جانے کو دیکھ رہے ہیں۔ اردو میں ایسا ہی فقرہ ہے جیسے ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ ہماری نظر تو فلاں طرف لگی ہوئی ہے۔ یعنی ہمیں وہاں سے کامیابی کی اُمید ہے۔ اسی طرح گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنے کا حکم ملا تھا۔ مگر پرانی پیشگوئیوں سے جو اللہ تعالیٰ نے اُس وقت تک ظاہر کی تھیں اور دوسرے کلام سے آپ کو معلوم ہوتا تھا کہ آخر قبلہ کی طرف منہ کرنیکا حکم ملیگا اور وہ ترقی کا پہلا زینہ ہوگا۔ کیونکہ اسلام کی ترقیات کے زمانہ کا اس امر کو نشان قرار دیا گیا تھا۔ پس آپ بار بار خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے تھے کہ کب کعبہ کی طرف مُنہ کرنیکا حکم ملتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فِيْ اپنے اصلی معنوں میں ہو اور سماء سے مراد احکامِ سماوی ہوں۔ اور معنے یہ ہوں کہ تیری توجہ کا آسمانی احکام کے متعلق تقلّب یعنی تیری توجہ آسمانی احکام کے متعلق تقلّب کر رہی تھی اور بے قرار تھی کہ وہ کب نازل ہوتے ہیں۔ عربی زبان کا محاورہ بھی ہے کہ تَكَلَّمْتُ مَعَكَ فِيْ فُلَانٍ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ میں نے تیرے ساتھ فلاں شخص کے بارے میں کلام کیا۔ اس لحاظ سے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ کے یہ معنے ہونگے کہ ہم آسمانی احکام کے بارے میں تیری توجہ کا تقلّب دیکھ رہے ہیں یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے منتظر تھے کہ خدائی حکم نازل ہو اور آئندہ خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا جائے۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم ضرور تجھے اُس قبلہ کی طرف پھیر دینگے جسے تو پسند کرتا ہے۔ یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ کے وہی معنے صحیح ہیں جو میں نے کئے ہیں۔ کیونکہ اگر اس سے پہلے قبلہ کے متعلق کوئی حکم نازل ہو چکا تھا تو پھر فَلَنُوَلِّيَنَّكَ کے معنے کچھ نہیں بنتے۔ بعض لوگ اِس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ ہم تجھے والی کر دینگے۔ حالانکہ اگر اِس کے یہ معنے ہوتے تو پھر یہاں قبلہ کا لفظ نہیں رکھنا چاہیئے تھا۔ بلکہ بَلَدًا یا كَعْبَةً یا بَيْتًا کا لفظ رکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ قِبْلَةً کا لفظ اسجگہ جہت کے معنوں میں ہے اور جہت کا کوئی والی نہیں ہوتا بلکہ کسی ملک یا شہر یا مکان کا والی ہوا کرتا ہے۔ پس اگر نُوَلِّيَنَّكَ کے معنے والی کر دینے کے ہوتے تو پھر یوں فرمانا چاہیئے تھا کہ ہم بیت اللہ یا مکہ کا تجھے والی کر دیں گے۔ مگر خدا تعالیٰ نے قبلہ کا لفظ رکھا ہے جس کے معنے جہت کے ہیں۔ پس یہ معنے کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

علامہ ابن حیان نے نُوَلِّيَنَّكَ کے معنے یہ کئے ہیں وَلَنُمَكِّنَنَّكَ مِنْ ذٰلِكَ (بحرِ محیط جلد اول صفحہ ۴۲۸) ہم تجھے اس قبلہ پر مضبوطی سے قائم کر دینگے۔ یہ معنے بھی بتاتے ہیں کہ تحویلِ قبلہ کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا ورنہ قبلہ پر قائم کر دینے کے کوئی معنے ہی نہیں بنتے۔

نُوَلِّيَنَّكَ تک تو ابھی وعدہ ہی تھا اس کے بعد فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرما کر پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی بتا دیا کہ صرف مدینہ میں نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی ہو۔

اس کی طرف مُنہ کرنا۔ یعنی یہ نہ خیال کرنا کہ چونکہ مدینہ میں
بیت المقدس اور کعبہ دونوں کی طرف منہ نہیں ہو سکتا۔
اس لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرو۔ جب
دونوں جمع ہو سکیں تو پھر پہلے کی طرح حکم ہوگا اور دونوں
کو جمع کرنا اولیٰ ہوگا بلکہ اب یہی حکم ہے کہ کعبہ کی طرف مُنہ
کرو۔ بیت المقدس کا خیال رکھنا ہرگز ضروری نہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ
علیہ وسلم کی نظر رُوحانی معاملات میں اس قدر تیز تھی کہ
باوجود اس کے کہ آپ کو بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنیکا
حکم تھا آپ اپنی روحانی فراست کی بنا پر اس امر پر کامل
یقین رکھتے تھے کہ خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم
یک نہ ایک دن ضرور نازل ہوگا۔ مگر دوسری طرف خدا تعالیٰ کے
حکم کا ادب آپ کو اس قدر ملحوظ تھا کہ آپ نے تحویلِ قبلہ کے
متعلق کبھی دُعا نہیں فرمائی۔ صرف آسمان کی طرف آپ نے اپنی
نظریں رکھیں اور خدائی فیصلہ کے منتظر رہے۔ آخر آپ کی اس
توجہ رُوحانی کی برکت سے خدا تعالیٰ نے تبدیلِ قبلہ کے متعلق
اپنا حکم نازل فرما دیا۔ اور حکم دے دیا کہ اب بیت المقدس کی
بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا جاتا ہے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۔ اس سے پہلے فقرہ میں فرمایا تھا
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کہ تُو اپنا مُنہ
مسجد حرام کی طرف پھیر دے۔ اور اس فقرہ میں فرمایا ہے
کہ تم جہاں کہیں ہو۔ اپنے مُنہ اس کی طرف پھیر دو۔ پہلی جگہ
واحد مخاطب کا صیغہ رکھا اور دوسری جگہ جمع کا۔ اسی طرح
پہلے وَجْهَكَ فرمایا اور پھر وُجُوْهَكُمْ فرمایا۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ پہلے فقرہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو
مخاطب کیا گیا ہے اور دوسرے فقرہ میں تمام مسلمانوں سے
خطاب ہے جو مختلف بلاد و امصار میں رہتے تھے۔ بیشک
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی جب مدینہ سے باہر
تشریف لے جاتے تو آپ بھی بیت اللہ کی طرف ہی مُنہ
کرتے تھے۔ مگر آپ کا زیادہ تر قیام مدینہ میں ہی تھا۔ اور
باہر کا قیام عارضی تھا۔ لیکن دوسرے لوگوں کا مدینہ کا
قیام عارضی تھا۔ اور باہر کا مستقل۔ اس لئے پہلی جگہ
صرف آپ کو مخاطب کیا گیا۔ اور چونکہ آپ کے ساتھ
نماز پڑھنے والوں نے بھی اُدھر ہی مُنہ کرنا تھا جدھر رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کا مُنہ تھا اس لئے اُن کا علیحدہ ذکر نہ
کیا گیا۔ اور آپ کی نماز میں ہی اُن کی نماز کو شامل کر لیا گیا۔

میں سمجھتا ہوں۔ اس آیت سے یقینی طور پر یہ
استدلال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میں نماز
باجماعت کو نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس
نے فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرمایا ہے
فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ نہیں فرمایا۔
اور اس کی وجہ یہی ہے کہ باقی سارے مسلمانوں نے رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اقتدائے نماز میں شامل ہونا
تھا سوائے منافقوں کے جو دل سے ساتھ نہیں ہوتے اور
عمل میں بھی پیچھے رہتے ہیں۔ اور جن کے متعلق رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ لوگ جو عشاء اور فجر
کی نمازوں میں نہیں آتے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں اُن کے
گھروں کو جلا کر راکھ کر دوں۔ پس چونکہ تمام مومنوں
نے نماز میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی شریک
ہو جانا تھا۔ اس لئے اُن کا علیحدہ ذکر کرنے کی بجائے
صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہہ دیا
گیا کہ آپ اپنا مُنہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔ بہرحال
نماز باجماعت اسلام کا ایک نہایت ہی اہم حکم ہے۔
اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے متعلق اتنقدر
تاکید فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ایک نابینا شخص نے عرض
کیا کہ یا رسول اللہ میری آنکھیں نہیں اور رستہ میں لوگ
پتھر وغیرہ ڈال دیتے ہیں جن سے مجھے ٹھوکریں لگتی ہیں۔

کیا میں گھر پر نماز پڑھ لیا کروں ؟ پُرانے زمانہ میں لوگ دیواروں کے ساتھ ساتھ پتھر رکھ دیا کرتے تھے ۔ تاکہ مکان بارش کے پانی سے محفوظ رہیں ۔ اور دیواریں خراب نہ ہوں ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُسے اجازت تو دے دی لیکن پھر فرمایا ۔ کیا تمہارے مکان تک اذان کی آواز آتی ہے ؟ اُس نے کہا ۔ یا رسول اللہ ۔ آتی ہے ۔ آپ نے فرمایا پھر جس طرح بھی ہو مسجد میں آیا کرو ۔ مگر آجکل ان لوگوں کے سامنے جو اذان کی آواز سنکر بھی مسجد میں نہیں آتے کون سے پتھر پڑے ہوئے ہیں کہ وہ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں ۔ یا انہیں کونسی نابینائی لاحق ہوتی ہے ۔ کہ وہ مسجدوں میں نماز کے لئے نہیں آتے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ایک اندھے شخص کو بھی جو ٹھوکریں کھا کھا کر گرتا تھا اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ گھر پر نماز پڑھ لے مگر آجکل لوگ معمولی معمولی عذرات کی بنا پر باجماعت نماز کو ترک کر دیتے ہیں ۔ اور اس طرح اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انہیں روحانی نابینائی لاحق ہے غرض فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کہہ کر اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ امامت کے متعلق احکام صرف ایک شخص کو دینے کافی ہیں ۔ کیونکہ باقی سارے مسلمان اس کے ساتھ باجماعت نماز پڑھیں گے اور اس طرح وہ سارے کے سارے نماز میں شامل ہو جائیں گے ۔ اگر کوئی کہے کہ پھر دوسری جگہ جمع کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں دنیا بھر کے امام مخاطب ہیں جو ممکن ہے دس لاکھ یا دس کروڑ ہوں ۔ اور اُن کی متابعت میں تمام مسلمانوں پر وہ حکم حاوی ہے ۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۔ فرماتا ہے ۔ وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا حکم اللہ تعالیٰ کی اُن پیشگوئیوں کے مطابق ہے جو اُن کی کتب میں پائی جاتی ہیں ۔ مگر اسجگہ اہل کتاب سے صرف یہود کے مخصوص علماء مراد ہیں ۔ جو اپنی کتب کی پیشگوئیوں سے واقف تھے ورنہ اگر تمام اہل کتاب اس بات پر یقین رکھتے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کیوں نہ لاتے ۔ اُن کا ایمان نہ لانا بتاتا ہے کہ وہ دل سے آپ کی صداقت کے قائل نہیں تھے اور نہ آپ کو پرانی پیشگوئیوں کا مصداق تصور کرتے تھے ۔ پس اسجگہ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد صرف یہود کے وہ علماء ہیں جو اپنی کتب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور چونکہ قوم اپنے لیڈروں کے تابع ہوتی ہے اس لئے جب کسی قوم کے لیڈر کوئی بات سمجھ لیں تو محاورۂ زبان میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ قوم اس بات کو سمجھتی ہے ۔ اسی رنگ میں یہاں بھی اہل کتاب سے اُن کے مخصوص علماء اور لیڈر مراد ہیں ۔ جو انبیاء بنی اسرائیل کی پیشگوئیوں سے واقف تھے ۔ اور جانتے تھے کہ اب شریعت بھی بدلنے والی ہے اور قبلہ بھی تبدیل ہونے والا ہے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیحیوں کی دست بُرد کی وجہ سے موجودہ بائبل میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق اور مکہ مکرمہ کے متعلق پیشگوئیاں وضاحت سے نہیں مل سکتیں مگر پھر بھی اُن سے کچھ نہ کچھ نشان ضرور مل جاتے ہیں ۔ چنانچہ اس بارہ میں سب سے بڑی پیشگوئی وہ ہے جو استثنا باب ۳۳ آیت ۱ تا ۳ میں پائی جاتی ہے ۔ اور جس کے الفاظ یہ ہیں کہ :-

" یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی ۔ اور اُس نے کہا ۔ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا ۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا ۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا ۔ اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لئے تھی ۔"

چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ پیشگوئی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مابہ النزاع بننے والی ہے اس لئے اس نے شروع سے ہی اس پیشگوئی میں ایسے الفاظ رکھ دیئے ہیں جنکو عیسائی اپنے اوپر چسپاں ہی نہیں کر سکتے۔ عیسائیت کا سارا انحصار اس امر پر ہے ۔کہ شریعت لعنت ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑی خبر ہی اس پیشگوئی میں یہ دی ہے کہ آنے والے موعود کے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ہوگی ۔پس جو قوم شریعت کو لعنت قرار دیتی ہے۔ اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ اس پیشگوئی کو اپنے اوپر چسپاں کرے۔

پھر اس پیشگوئی میں یہ خبر دی گئی تھی کہ وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئیگا۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام کو دس ہزار چھوڑ دس قدوس بھی نصیب نہ ہوئے۔ ان کے صرف بارہ حواری تھے۔ ان میں سے ایک نے تو انکو پکڑوا دیا اور دوسروں کے متعلق انجیل میں لکھا ہے کہ جب دشمن حضرت مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کے لئے آئے تو وہ سب کے سب انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے (متی باب ۲۶ آیت ۵۶) صرف ایک حواری کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے تلوار نکال لی اور ایک شخص پر وار کرکے اس کا کان اُڑا دیا (متی باب ۲۶ آیت ۵۱) مگر یہ صرف ایک عارضی جوش کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس کے بعد حواریوں نے جس ایمان کا مظاہرہ کیا۔ اس کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے کارندے جب حضرت مسیحؑ کو گرفتار کرکے سردار کاہن کے پاس لے گئے تو پطرس بھی ساتھ ساتھ چل پڑا ۔ وہاں ایک لونڈی نے اُسے دیکھ کر کہدیا کہ تو بھی مسیح کے ساتھ تھا۔ اس پر اُس نے سب کے سامنے انکار کیا اور کہا کہ میں نہیں جانتا تو کیا کہتی ہے پھر دوبارہ کسی لونڈی نے یہی بات دُہرائی تو اُس نے قسم کھا کر پھر انکار کیا۔ اور کہا کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتا تھوڑی دیر کے بعد پھر ان لوگوں میں سے جو وہاں کھڑے تھے کسی نے کہہ دیا کہ تو بھی انہی لوگوں میں سے ہے جو اس کے ساتھ ہیں۔ اور تیری بولی سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اس پر اُس نے مسیحؑ پر لعنت ڈالی اور قسم کھا کر کہا کہ میں مسیح کو جانتا بھی نہیں۔ (متی باب ۲۶ آیت ۶۹ تا ۷۵)

غرض دس ہزار چھوڑ دس قدوس بھی حضرت مسیحؑ کو نہیں ملے۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے متعلق تاریخ یہ شہادت دیتی ہے کہ آپ کے ساتھ فتح مکہ کے موقعہ پر دس ہزار قدوسیوں کا لشکر تھا۔ جو بڑے جاہ و جلال کے ساتھ مکہ میں داخل ہوا۔ اور جس نے اپنی نیکی اور عفو اور اعلیٰ درجہ کے حسن سلوک سے مکہ والوں کے دل فتح کر لئے اور وہ کفر و شرک کو چھوڑ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں داخل ہو گئے۔

تیسری خبر اس پیشگوئی میں یہ دی گئی تھی کہ ایک شریعت جدیدہ فاران کی پہاڑیوں پر ظاہر ہونے والی ہے فاران کی پہاڑیوں سے مراد مکہ کی پہاڑیاں ہیں۔ کیونکہ عرب لوگ ہمیشہ سے مکہ کے پاس کے میدان کو دشتِ فاران کہتے چلے آئے ہیں۔ فاران کے معنے درحقیقت دو بھاگنے والوں کے ہیں۔ اور یہ نام اس جگہ کو حضرت ہاجرہؓ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی وجہ سے ملا ہے جو بائیبل کے بیان کے مطابق سارہ کے ستانے کی وجہ سے یہاں آکر آباد ہوئے۔

بے شک بائیبل میں مختلف جگہوں کا نام فاران آتا ہے۔ مگر اول تو مختلف جگہوں کا نام فاران آنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ فاران کی تعیین کے لئے ضروری ہے کہ پیشگوئی کے واقعات کو ملحوظ رکھا جائے۔ اور دیکھا جائے کہ وہ کس فاران پر چسپاں ہوتے ہیں۔ اگر ایک ہی جگہ کا نام فاران ہوتا۔ تب تو اور بات تھی لیکن چونکہ کئی مقامات کا نام فاران آتا ہے اسلئے فاران کی تعیین صرف پیشگوئی کے واقعات سے ہی کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً اگر فاران کی پہاڑیوں سے مکہ کی پہاڑیاں مراد نہیں بلکہ کوئی اور مقام

مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ وہاں کون شخص آیا ہے جس کے ساتھ دس ہزار قدوسی تھے۔ اور کس کے ہاتھ میں آتشی شریعت بھی اور وہ بھی اس کے داہنے ہاتھ میں۔ عیسائی تو بائیں ہاتھ چلو کے قائل ہیں۔ اگر ان واقعات پر نگاہ ڈالی جائے تو صرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی ایک ایسے وجود ثابت ہوتے ہیں جنہیں ایک آتشی شریعت دی گئی۔ جو دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہوئے اور جنہوں نے ہر کام میں دائیں کو بائیں پر ترجیح دی۔ گویا ان واقعات نے ثابت کر دیا کہ فاران سے صرف یہی فاران مراد ہے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہوئے تھے کوئی اور فاران مراد نہیں۔

دوم۔ بائبل میں مختلف جگہوں کا نام فاران آنا یہ شبہ بھی پیدا کرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی پیشگوئیوں کو مشتبہ کرنے کے لئے اس قسم کے نام رکھ دیئے ہونگے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت سے پہلے جب یہود نے اپنے علماء سے سُنا کہ عرب میں ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کا نام محمدؐ ہوگا تو انہوں نے بھی اپنے بچوں کا نام محمد رکھنا شروع کر دیا۔ تاکہ وہی اس پیشگوئی کے مصداق ہو جائیں۔ اسی طرح ممکن ہے بنی اسرائیل نے فاران کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کو دیکھتے ہوئے مختلف مقامات کا نام فاران رکھنا شروع کر دیا ہو۔ تاکہ آنے والا ادھر ہی ظاہر ہو۔ مگر لوگوں کے خودساختہ نام دھرے کے دھرے رہ گئے اور خدا تعالیٰ نے جس رسول کو مبعوث فرمانا تھا اُسے پیشگوئی کے مطابق مکہ میں مبعوث فرما دیا جس کے پاس کے میدان کو عرب لوگ ہمیشہ سے دشتِ فاران کہتے چلے آئے تھے۔

(۳) پھر جس پہاڑ کا نام یہود نے فاران رکھا ہے۔ وہ بھی عرب میں ہی ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ بھی فاران کو عرب سے باہر نہیں لیجا سکے۔

(۴) پھر بائبل سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ فاران سے مکہ کے پہاڑ ہی مراد ہیں۔ چنانچہ پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۱ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے:-

"وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ اور اُس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت اُس سے بیاہنے کو لی۔"

اور صرف مکہ ہی ایک ایسا شہر ہے جس کے رہنے والے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو اپنے شہر کا بانی سمجھتے ہیں اور یہ صرف ایک روایت ہی نہیں بلکہ قوموں کی قومیں اپنے آپ کو اُن کی طرف منسوب کرتی ہیں اور اُن کے سب آثار وہاں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ فتوحاتِ اسلام تک کعبہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بُت بھی پائے جاتے تھے پس مکہ والوں کے دعوے کو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا۔ ورنہ یہودیوں اور عیسائیوں کو وہ شہر پیش کرنا چاہیے۔ جس کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے رکھی ہو۔ اور جس کے رہنے والے اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہوں۔ اور اگر کوئی ایسا شہر پیش نہ کر سکیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہی وہ فاران ہے جس کے متعلق پیشگوئی کی گئی تھی۔ اسجگہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا رہنا ثابت ہے اور پھر اسی جگہ کے متعلق مکہ والے دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یہاں رہے اور یہیں اُن کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن وہ جگہ جسے یہودی اور عیسائی فاران قرار دیتے ہیں۔ اُس میں رہنے والے لوگ یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہاں حضرت اسمٰعیلؑ آکر رہے تھے۔ حالانکہ لوگ فخر حاصل کرنے کے لئے بلاوجہ بھی ایسی باتوں کو اپنی طرف منسوب کرلیتے ہیں۔

(۵) پھر وہ چشمہ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے خدا تعالیٰ نے نکالا تھا وہ بھی مکہ ہی میں ہے جو اس بات کا ایک یقینی اور قطعی ثبوت ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ یہیں آکر آباد ہوئے تھے۔ پھر انجیل میں بھی

ایک پیشگوئی قبلہ کے بدلنے کے متعلق پائی جاتی ہے۔ یوحنا باب ۴ آیت ۲۰، ۲۱ میں لکھا ہے کہ ایک سامری عورت نے جس سے مسیح نے پانی مانگا تھا کہا کہ

"ہمارے باپ دادوں نے اس پہاڑ پر پرستش کی اور تم کہتے ہو کہ وہ جگہ جہاں پرستش کرنی چاہیئے یروشلم میں ہے۔ یسوع نے اُس سے کہا۔ اے عورت: میری بات کا یقین رکھ کہ وہ گھڑی آتی ہے کہ جس میں تم نہ تو اس پہاڑ پر اور نہ یروشلم میں باپ کی پرستش کروگے۔"

اس پیشگوئی میں حضرت مسیح صاف الفاظ میں اعلان فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ میں نہ یہ پہاڑ قبلہ رہے گا اور نہ یروشلم بلکہ ان دونوں کو منسوخ کرکے اللہ تعالیٰ ایک تیسرا قبلہ مقرر کرے گا۔ اِن آیات میں جو پہاڑ پر اور یروشلم میں پرستش کرنے کا ذکر ہے۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ یہود سب یروشلم میں جاکر عبادت کیا کرتے تھے۔ اور سامری اس پہاڑ پر عبادت کرتے تھے۔ بلکہ اس سے یروشلم اور اس پہاڑ کو قبلہ بنانا ہی مراد ہے۔ یعنی وہ اُن کی طرف منہ کرکے عبادت کرتے تھے۔ پس پہاڑ پر اور یروشلم میں عبادت نہ کرنے کا یہی مطلب ہے کہ آئندہ ان کی طرف منہ کرکے عبادت نہیں کی جائیگی۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح انجیل نے پہاڑ کی طرف منہ کرکے عبادت کرنے کو پہاڑ پر عبادت کرنے کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے بھی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ کا محاورہ استعمال کیا ہے جس سے مراد آسمان کی طرف آپ کا منہ کرنا نہیں بلکہ آسمان کی طرف آپ کی توجہ کا مبذول ہونا مراد ہے۔ ان دو پیشگوئیوں کے علاوہ اور بھی بہت سی پیشگوئیاں ہیں جو کعبہ کی ترقی پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر مثال کے طور پر یہ صرف دو ہی کافی ہیں۔ پس ان پیشگوئیوں کی بنا پر گو یہود پہلے ان کا مطلب نہ سمجھتے ہوں مگر وقوع کے بعد اُن کیلئے اس امر کا سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ یہ حکم ایک قدیم پیشگوئی کے مطابق ہے اور اس پر اعتراض کرنا اپنی کتب پر اعتراض کرنا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ میں اہل کتاب سے مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ وہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم جیسی کامل کتاب عنایت فرمائی ہے وہ اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ تحویل قبلہ کا جو حکم دیا گیا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ نہ اسلئے کہ وہ جانتے تھے کہ کعبہ قبلہ ہوگا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں۔ اور اُن پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ناممکن تھا کہ وہ آپ کے احکام کو منجانب اللہ نہ سمجھیں اور آپ کی ہر رنگ میں کامل اطاعت نہ کریں۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۔ فرماتا ہے۔ ہم اُن کی حرکات کو خوب جانتے ہیں۔ اُن کے بڑے بڑے علماء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے قائل ہونے کے باوجود محض ضد اور تکبر کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی تبدیلی اور بنو اسمٰعیل میں ایک نبی کے آنے کے متعلق ان کی کتابوں میں پیشگوئیاں موجود ہیں۔ مگر پھر بھی یہ لوگ اپنے تکبر کی وجہ سے آپ پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

تحویل قبلہ ہجرت کے بعد کوئی سولہ ۱۶ مہینے گذرنے پر ہوئی ہے۔ چنانچہ بخاری میں حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لانے کے بعد سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے رہے۔ لیکن آپ کو پسند یہی تھا کہ قبلہ

بیت اللہ ہو۔ آخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بارہ میں حکم
نازل ہوا۔ اور آپؐ نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کرکے
پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔ ایک شخص جو نماز میں آپ کے ساتھ
شامل ہوا تھا۔ وہ نماز سے فارغ ہو کر ایک مسجد کے پاس سے
گذرا۔ تو اس نے دیکھا کہ لوگ رکوع کی حالت میں ہیں۔
اور بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھ رہے ہیں
اس پر اس نے بلند آواز سے کہا۔ کہ اَشْهَدُ بِاللّٰهِ
لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قِبَلَ مَكَّةَ۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں
کہ میں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ
کی طرف منہ کرکے نماز پڑھی ہے۔ اس پر لوگوں نے نماز
کی حالت میں ہی بیت المقدس سے منہ ہٹا کر خانہ کعبہ کی طرف
منہ کر لیا (تفسیر ابن کثیر جلد اول برحاشیہ فتح البیان صفحہ ۳۲۸)
نسائی نے ابو سعیدؓ سے روایت کی ہے کہ ظہر کی
نماز تھی جس میں تحویل قبلہ ہوئی۔ ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ میں
اور میرا ساتھی پہلے لوگ ہیں جنہوں نے بیت اللہ کی طرف
منہ کرکے نماز پڑھی۔

اور کئی مفسرین نے اور بعض دوسرے راویوں نے یہ بھی
بیان کیا ہے کہ ظہر کی نماز کی دو رکعتیں ہو چکی تھیں جبکہ یہ حکم
نازل ہوا۔ یہ حکم مسجد بنی سلمہ میں نازل ہوا تھا۔ اسی لئے
صحابہؓ اس مسجد کو مسجد القبلتین کہتے تھے (تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۲۹)

اوپر کی روایات سے ظاہر ہے کہ ایک میں تو یہ ذکر
آتا ہے کہ عصر کی نماز میں تحویل قبلہ ہوئی اور دوسری میں یہ
ذکر آتا ہے کہ تحویل قبلہ کا حکم ظہر کی نماز میں نازل ہوا۔ ظہر
والی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے
کہ تحویل قبلہ تو ظہر کے وقت ہوئی ہو۔ اور ایک شخص عصر
کی نماز میں آکر شامل ہوا ہو اور اس نے اس وقت رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے دیکھ
کر یہ سمجھ لیا ہو کہ تحویل اب ہوئی ہے۔ کیونکہ عصر کے وقت
آنیوالے کا خیال ظہر کی نماز کی طرف نہیں جا سکتا۔ پس
ظہر والی روایت کو ترجیح دی جائیگی۔

نویلہ بنت مسلم کی روایت ہے کہ وہ ظہر کی نماز
پڑھ رہے تھے کہ یہ خبر آئی کہ بیت اللہ قبلہ ہوگیا ہے۔
یہ بھی پہلی روایت کی تائید کرتی ہے چنانچہ لکھا ہے۔
کہ مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ ہوگئیں۔
(تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۳۳۰) یہ اسلامی حکم ہے
کہ مرد آگے ہوں اور عورتیں پیچھے۔ تحویل قبلہ کی وجہ سے
چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رُخ بدلنا پڑا۔
اس لئے مردوں اور عورتوں کو بھی اپنی ترتیب بدلنی
پڑی۔ اور عورتیں مردوں کی جگہ چلی گئیں اور مرد عورتوں
کی جگہ چلے گئے۔ اس حدیث میں ایسی تفصیل موجود
ہے جس کی بنا پر ظہر میں حکم نازل ہونے کا خیال زیادہ
صحیح قرار پاتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اہل قبا کو دوسرے
دن صبح کو اس بات کی اطلاع ہوئی کہ نماز کی جہت
بدل گئی ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ نماز پڑھ
رہے تھے۔ تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۳۰۔ اس سے میں یہ
استدلال کرتا ہوں کہ اگر ایک میل کے فاصلہ پر
بھی دوسرے دن اطلاع پہنچی تو براء ابن عازب کو بھی عصر کی
تعیین میں غلطی لگ سکتی ہے۔ انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ عصر کے
وقت تحویل قبلہ ہوئی ہے کیونکہ انہیں عصر کی نماز میں ہی شامل ہونے کا
موقعہ ملا۔ اور انہوں نے کسی سے دریافت بھی نہ کیا کہ تحویل قبلہ کب ہوئی ہے
خود ہی خیال کر لیا کہ یہ پہلی نماز ہے جس میں تحویل قبلہ ہوئی ہے۔

ان روایات میں بھی یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر بیت المقدس کی طرف
منہ کیا تھا۔ ورنہ اگر یہ بات درست ہوتی۔ تو جو لوگ
آپ کے مدینہ آنے سے پہلے وہاں آچکے تھے۔ ان میں سے
کسی کی روایت ملتی کہ وہ پہلے مکہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھا
کرتے تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ آپ مکہ میں بھی بیت المقدس

کی طرف مُنہ کیا کرتے تھے۔ اور پھر مدینہ میں بھی سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف ہی مُنہ کرکے نمازیں پڑھتے رہے۔ پس وہیری کا یہ اعتراض کہ محض یہود کو خوش کرنے کیلئے آپ نے مدینہ میں بیت المقدس کی طرف منہ کیا تھا اور جب یہ مقصد حاصل نہ ہُوا تو پھر مکّہ کی طرف مُنہ پھیر لیا بالکل غلط ہے۔ صرف ایک روایت ایسی ہے جو بتاتی ہے کہ نعوذ باللہ یہود کو خوش کرنے کے لئے مدینہ آکر قبلہ بدلا گیا۔ مگر اس روایت کے الفاظ ہی بتا رہے ہیں کہ وہ کسی بدباطن منافق یا یہود کی خود تراشیدہ روایت ہے۔ یہ روایت ابوداؤد نے اپنی کتاب ناسخ میں حضرت ابن عباسؓ سے بیان کی ہے۔ اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ۔ اَوَّلُ مَا نُسِخَ مِنَ الْقُرْاٰنِ الْقِبْلَۃُ وَ ذٰلِکَ اَنَّ مُحَمَّدًا کَانَ یَسْتَقْبِلُ صَخْرَۃَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ وَھِیَ قِبْلَۃُ الْیَھُوْدِ فَاسْتَقْبَلَھَا سَبْعَۃَ عَشَرَ شَھْرًا لِیُؤْمِنُوْا بِہٖ وَیَتَّبِعُوْہُ وَیَدْعُوْا بِذٰلِکَ الْاُمِّیِّیْنَ مِنَ الْعَرَبِ فَقَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ یعنی قرآن کریم کا سب سے پہلا حکم جو منسوخ کیا گیا۔ وہ قبلہ کے بارے میں تھا۔ اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مدینہ میں تشریف لانے کے بعد) صخرۂ بیت المقدس کی طرف مُنہ کرکے نمازیں پڑھا کرتے تھے جو یہود کا قبلہ تھا۔ اور آپ نے اُس کی طرف سترہ مہینے تک مُنہ رکھا۔ آپ کی بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی بڑی غرض یہ تھی کہ (نعوذ باللہ) یہود خوش ہوکر آپ پر ایمان لے آئیں۔ اور آپ کی اطاعت کریں۔ اور آپ اس قبلہ کی طرف اہلِ عرب کو بھی دعوت دیا کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔

اس روایت کے یہ الفاظ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ یہ تبدیلی یہود کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کی تھی واضح طور پر اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ کسی فتنہ پرداز منافق یا کسی خبیث یہودی کی شرارت ہے۔ اُس نے جب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے رُخ کو بدل کر خانہ کعبہ کی طرف کر لیا ہے تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اُس نے یہ روایت وضع کرکے مسلمانوں میں پھیلا دی کہ بیت المقدس کی طرف مُنہ تو صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ یہود کو مسلمان بنایا جا سکے۔ مگر جب یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کر لیا۔ اور بعض مفسرین نے بھی اپنی نادانی سے اس وضعی روایت کو اپنی تفسیروں میں درج کر دیا اور لکھ دیا کہ یہود کی تالیف قلب کے لئے ہی بیت المقدس کی طرف مُنہ کیا گیا تھا۔ (تفسیر جامع البیان جلد ۲ صـ)

پھر اس روایت کے وضعی ہونے کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے صرف محمد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے حالانکہ مسلمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے نام کی بجائے ہمیشہ آپ کے رُوحانی مقام سے پکارا کرتے تھے۔ یعنی محمد کہنے کی بجائے رسول اللہ کہا کرتے تھے۔ اور غیر مذاہب کے لوگ ایشیائی دستور کے مطابق آپ کا ادب اور احترام اِس طرح کرتے تھے کہ بجائے آپ کو محمد کہہ کر بلانے کے ابو القاسم کہہ کر بلاتے تھے جو آپ کی کنیت تھی۔ احادیث میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک یہودی مدینہ میں آیا۔ اور اُس نے آکر آپؐ سے بحث شروع کر دی۔ بحث کے دوران میں وہ بار بار کہتا تھا۔ اے محمد بات یُوں ہے اے محمد بات یُوں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلا کسی انقباض کے اُس کی باتوں کا جواب دیتے تھے مگر صحابہؓ اُس کی یہ گستاخی دیکھ کر بیتاب ہو رہے تھے۔ آخر ایک صحابیؓ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اور اُس نے یہودی سے کہا

کہ خبردار آپؐ کا نام لے کر بات نہ کرو۔ تم رسول اللہ نہیں
کہہ سکتے تو کم سے کم ابوالقاسم تو کہو۔ اس یہودی نے کہا
میں تو وہی نام لونگا جو ان کے ماں باپ نے ان کا رکھا
تھا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور آپؐ نے
صحابہؓ سے فرمایا۔ دیکھو یہ ٹھیک کہتا ہے میرے ماں باپ
نے میرا نام محمدؐ ہی رکھا تھا۔ جو نام یہ لینا چاہتا ہے
اسے لینے دو۔ اور اس پر غصہ کا اظہار مت کرو۔

اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ صحابہؓ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کو صرف محمدؐ کہہ کر کبھی نہیں پکارتے تھے
بلکہ اگر کوئی غیر مذہب کا پیرو بھی آپؐ کو یا محمدؐ کہتا تو
وہ انقباض محسوس کرتے۔ جن صحابہؓ کے اخلاص و محبت
کا یہ عالم تھا کہ وہ غیروں کے متعلق بھی یہ پسند نہیں
کرتے تھے کہ وہ آپؐ کو نام لے کر پکاریں ان کے متعلق
یہ تصور بھی کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود آپؐ کو
محمدؐ کہہ کر پکارتے ہوں۔ پس اس روایت کے یہ الفاظ کہ
محمدؐ پہلے صخرۂ بیت المقدس کی طرف مُنہ کیا کرتا تھا جو
یہود کا قبلہ تھا اور سترہ ماہ تک وہ ایسا ہی کرتا رہا
اور اُس نے بیت المقدس کی طرف مُنہ اس لئے کیا تھا
کہ وہ یہود کو خوش کرے اور وہ اُس پر ایمان لے آئیں
اور اُس کی اتباع کریں۔ لیکن جب وہ اس ذریعہ سے
مسلمان نہ ہوئے تو پھر اُس نے مکہ کی طرف مُنہ کر لیا
خود اپنی ذات میں اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ الفاظ کسی مسلمان
کے مُنہ سے نہیں نکل سکتے۔ بلکہ یقیناً کسی یہودی یا کسی
منافق کے ہی ہو سکتے ہیں۔ یہودی ہی یہ کہا کرتے تھے کہ
سترہ مہینے تک تو ادھر مُنہ کرتے رہے۔ اب دوسری
طرف کرنے لگ گئے ہیں۔ پس یہ الفاظ کسی مسلمان کی
طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ مگر یہ روایت وضع کرتے
وقت اُسے اتنا بھی خیال نہ رہا کہ میں الفاظ تو ایسے
لکھوں جن سے میری دھوکا دہی پر پردہ پڑا رہے۔ چنانچہ
اُس نے روایت تو بنالی مگر خدا تعالیٰ نے اس روایت کے
اندر ہی اُس سے ایسے الفاظ لکھوا دیئے جن سے اس
کی افتراء پردازی کا پردہ فاش ہو گیا اور پتہ لگ گیا کہ
اس کے پیچھے کوئی منافق یا کذاب بول رہا ہے۔ اُسے اپنے
بُغض کی شدت کی وجہ سے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ صحابہؓ
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محمدؐ کے لفظ سے نہیں بلکہ نبی
یا رسول کے لفظ سے پکارا کرتے ہیں اور صلی اللہ علیہ وسلم
کے الفاظ ساتھ استعمال کیا کرتے ہیں۔ اور گو "جامع البیان"
میں "اَلنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ" کے الفاظ استعمال
کئے گئے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ خود مسلمانوں
نے اس روایت کو نقل کرتے وقت لگائے ہیں۔ لیکن خواہ
اس روایت کے یہ الفاظ ہوں کہ اِنَّ مُحَمَّدًا کَانَ یَسْتَقْبِلُ
صَخْرَۃَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ یا یہ الفاظ ہوں کہ اَنَّ النَّبِیَّ
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَسْتَقْبِلُ صَخْرَۃَ بَیْتِ
الْمَقْدِسِ دونوں صورتوں میں اس روایت کا مضمون اپنی
ذات میں ایسا گندہ اور ناپاک ہے کہ کوئی سلیم الفطرت انسان
اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔

اسی طرح بیہقی نے اپنی کتاب "دلائل النبوۃ" میں
زہری سے روایت کی ہے کہ قبلہ کی تحویل مسجد حرام کی طرف
ماہ رجب میں ہوئی تھی جبکہ ہجرت کے بعد سولہ مہینے گذر
چکے تھے۔ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَلِّبُ
وَجْھَہٗ فِی السَّمَآءِ وَھُوَ یُصَلِّیْ نَحْوَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ
اور جب آپ بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھا کرتے
تھے تو آپ حالتِ نماز میں ہی بار بار اپنا مُنہ آسمان کی طرف
اُٹھاتے تھے اور چاہتے تھے کہ تحویل قبلہ کے بارے میں کوئی
خدائی حکم نازل ہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بیت الحرام
کی طرف مُنہ پھیرنے کا حکم نازل فرما دیا اور یہ آیات نازل
فرمائیں کہ سَیَقُوْلُ السُّفَھَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰھُمْ
عَنْ قِبْلَتِھِمُ الَّتِیْ کَانُوْا عَلَیْھَا۔ اس پر یہودی نے یہ کہا

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ج

اور جن لوگوں کو (تم سے پہلے) کتاب دی گئی ہے اگر تو اُن کے پاس ہر ایک (طرح کا) نشان (بھی) لے آئے (تو بھی) وہ تیرے قبلہ کی پیروی نہ کرینگے۔

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ج وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ

اور نہ تو اُن کے قبلہ کی پیروی کر سکتا ہے اور نہ اُن میں سے کوئی (فریق) دوسرے (فریق) کے قبلہ کی پیروی

بَعْضٍ ج وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ

کرے گا۔ اور (اے مخاطب) اگر اس کے بعد بھی کہ تیرے پاس (الٰہی) علم آچکا ہے تو نے اُن کی خواہشات کی

مِنَ الْعِلْمِ لا اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ م ﴿۱۴۶﴾

وقف لازم

پیروی کی تو یقیناً اس صورت میں تو ظالموں میں (شمار) ہوگا۔ ۱۶۱

شروع کر دیا قَدِ اشْتَاقَ الرَّجُلُ اِلٰى بَلَدِهٖ وَ بَيْتِ اَبِيْهِ یعنی یہ شخص پھر اپنے وطن اور اپنے باپ دادا کے گھر کا مشتاق ہوگیا ہے۔ ابن کثیر نے یہ الفاظ درج کئے ہیں کہ قَدِ اشْتَاقَ الرَّجُلُ اِلٰى بَيْتِ اَبِيْهِ وَ دِيْنِ قَوْمِهٖ (ابن کثیر جلد اوّل ۲۳۹) یعنی یہ شخص اپنے باپ دادا کے گھر اور اپنی قوم کے دین کا مشتاق ہوگیا ہے۔ اس روایت سے بھی پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا بیت المقدس کی طرف سے منہ پھیرنا یہودیوں پر سخت گراں گذرا تھا۔ اور وہ بڑے زور سے یہ اعتراض کرتے تھے کہ ان مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ کبھی اِس قبلہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی اُس قبلہ کی طرف۔ اور اسی طعنہ زنی کے شوق میں انہوں نے وہ روایت وضع کر لی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ بہر حال اس روایت سے صاف طور پر پتہ لگتا ہے کہ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا والی آیات قبلہ کے بدلنے کے حکم اور یہود کے اعتراض کے بعد نازل نہیں ہوئیں بلکہ پہلے نازل ہوئی تھیں۔ چنانچہ بعد میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے پر یہود نے بھی اعتراضات کئے اور بعض مسلمانوں کے قدم بھی لڑکھڑا گئے اور وہ مرتد ہوگئے۔ یہ مضمون عام تفاسیر کے خلاف ہے لیکن اوپر کی روایت سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ والی آیات پہلے اعتراضوں کے جواب میں نہیں بلکہ ان اعتراضات کے ردّ میں تھیں جو بعد میں لوگوں نے کرنے تھے اور جن کی قبل از وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی کر دی گئی تھی۔

۱۶۱ تفسیر:۔ فرماتا ہے کہ اگر تم اہل کتاب کو ہر قسم کے نشان دکھاؤ تو وہ پھر بھی تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کرینگے۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ اگر وہ تسلیم کر لیتے تو اس کے معنے یہ تھے کہ وہ بنو اسحاق میں سے سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کا اقرار کرتے اور اس کے یہ معنے تھے کہ یہودی مذہب باطل ہوگیا اور اسلام قائم ہوگیا لیکن یہود اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ پس اُن کی بے دینی اور مذہبی اور قومی مجبوریاں اُن کو اس قبلہ کی طرف نہیں آنے دیتی تھیں اور وہ انکار پر مصر رہتے تھے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ کبھی کوئی قوم ساری کی ساری نہیں مانا کرتی بلکہ کچھ لوگوں کا ہلاک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی جو رسولی عزت اللہ تعالیٰ کو منظور تھی اس لئے اس نے تیس برس تک آپ کو کوشاں رکھا اور اس عرصہ میں خبیث گروہ کو اس نے ہلاک کر دیا۔ اور بعد ازاں اہل عرب کو توفیق عطا فرمائی اور وہ آپ پر ایمان لے آئے بہرحال اختلافات کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور قیامت تک چلتا چلا جائیگا۔ پس وہ شخص جو اختلافات کو دیکھکر گھبراتا ہے نہایت بیوقوف ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ کہ تو بھی ان کے قبلہ کی کسی صورت میں پیروی نہیں کریگا۔ یہاں قرآن حیکم کلام دیکھو کہ اس فقرہ کو کس طرح اعتراض سے بچایا ہے۔ عام عربی قواعد کے لحاظ سے مَا تَتْبَعُ قِبْلَتَهُمْ کہنا چاہیئے تھا مگر اللہ تعالیٰ نے بجائے فعل کے اسم کا استعمال کیا ہے اور فقرہ کی شکل بدل دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے فقرہ کے ساتھ یہ فقرہ بھی تھا کہ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ کہ وہ ہر قسم کے نشانات دیکھنے کے باوجود تیرے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اگر اسی قسم کا جملہ بنایا جاتا اور اس میں اسی قسم کا فعل رکھا جاتا تو اس کے معنے یہ بنتے کہ یہ رسول بھی باوجود دلائل کے ان کے قبلہ کا پیرو نہیں ہوگا۔ اور چونکہ یہ قابل اعتراض بات تھی اسلئے اس کی بجائے ایک اور چھوٹا سا فقرہ رکھ کر اعتراض دور کر دیا اور بتا دیا کہ اس رسول کا انکار محض اس وجہ سے ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے دلائل دیئے گئے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ یہ تو محض ضد نظر آتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ضد نہیں کیونکہ آپ نے خدا تعالیٰ کے حکم کے مطابق بیت اللہ کی طرف منہ کیا تھا۔ اگر آپ کو یہود سے ضد ہوتی تو آپ کی زندگی میں بھی اور پھر ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف کبھی منہ نہ کرتے۔ پس آپ کے اس فعل نے ثابت کر دیا کہ آپ کو اُن سے کوئی ضد نہیں تھی۔ اِن یہود کے فعل نے یہ ثابت کر دیا کہ اُن کو ضد تھی۔ کیونکہ انہوں نے تبدیلی قبلہ کے متعلق اپنی کتب میں واضح پیشگوئیاں دیکھنے کے باوجود اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ غرض دو وجوہ سے آپ پر اعتراض نہیں پڑ سکتا۔ اوّل اس وجہ سے کہ آپ نے سالہا سال تک بیت المقدس کی طرف منہ کیا۔ پس آپ کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ آپ میں ضد پائی جاتی تھی۔ دوم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی طرف منہ کیا تو یہ الہام الٰہی کے ماتحت کیا تھا لیکن یہود نے محض ضد کی وجہ سے اس کا انکار کیا نہ کہ الہام الٰہی کی وجہ سے اس لئے آپ کے فعل کو ان کے فعل سے کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ۔ اب اللہ تعالیٰ اُن کی ضد کو اور زیادہ واضح کرنے کیلئے فرماتا ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی پیروی نہیں کرتے۔ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے قبلہ میں بھی فرق ہے۔ یہود کا قبلہ تو یروشلم تھا۔ جیسا کہ ۱۔ سلاطین باب ۸ آیت ۲۲ تا ۳۰ اور دانیال باب ۶ آیت ۱۰ سے ظاہر ہے لیکن یہود کا سامری فرقہ یروشلم کے ایک پہاڑ کی طرف اپنا منہ کیا کرتا تھا جیسا کہ انجیل میں لکھا ہے۔ حضرت مسیح نے ایک سامری عورت سے کہا کہ

"میری بات کو یقین رکھ کہ وہ گھڑی
آتی ہے کہ جس میں تم نہ تو اس پہاڑ پر
اور نہ یروشلم میں باپ کی پرستش کروگے۔"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں کم از کم دو فرقے تھے۔ ایک وہ جو یروشلم کے پہاڑ کی طرف منہ کرتے تھے اور دوسرے وہ جو یروشلم کی طرف منہ کرتے تھے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں

عیسائی مشرق کی طرف اور یہود بیت المقدس کی طرف مُنہ کرتے تھے۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جب نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو دورانِ بحث میں اُن کی عبادت کا وقت آگیا۔ اس پر انہوں نے مسجد نبوی میں ہی مشرق کی طرف مُنہ کیا اور اپنے طریق کے مطابق عبادت کرلی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ فَاسْتَقْبَلُوا الْمَشْرِقَ فَصَلَّوْا صَلٰوتَهُمْ (زرقانی جلد ۴ ص ۴۱) یعنی انہوں نے مسجد میں ہی مشرق کی طرف مُنہ کیا اور اپنی عبادت بجا لائے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ اُس زمانہ میں عیسائی مشرق کی طرف مُنہ کیا کرتے تھے۔ مشرق کی طرف مُنہ کرنے کی وجہ بقول پادری اکبر مسیح یہ تھی کہ چونکہ مشرق میں خداوند مسیح کا ستارہ دیکھا گیا تھا۔ اور خداوند کی پیدائش وحیات و وفات و قیامت سب ارضِ مقدس میں ہوئیں۔ اس لئے مشرق اور اس ملک کی طرف مُنہ پھیرنا انکو محبوب رہا (سلک مروارید حصّہ اوّل ص ۳۴) اس بارہ میں مزید تشریح کیلئے دیکھیں تفسیر کبیر تفسیر سورۃ مریم زیر آیت اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا۔

غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انہوں نے تمہاری بات کیا ماننی ہے ان میں تو اس قدر تعصب پایا جاتا ہے کہ ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہوئے بھی ان کے قبلوں میں فرق ہے اور جب یہ آپس میں ایک شریعت رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی ضد میں دین کی شکل بدلتے جاتے ہیں۔ تو انہوں نے تمہاری طرف کیا میلان رکھنا ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر علم رکھنے کے بعد بھی تو اُن کی گری ہوئی خواہشات کی پیروی کریگا تو تُو یقیناً ظالم ہوگا۔ اس آیت پر بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ممکن تھا کہ آپ انکی خواہشات کی پیروی کرکے ظالم بن جاتے۔ اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض جگہ بظاہر واحد مخاطب کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے مگر اس سے ہر انسان مراد ہوتا ہے نہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ قرآن کریم میں اس کی مثال موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۲۴) یعنی اگر تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں تو تم اُن سے نرمی کا برتاؤ کرو۔ اور انہیں اُف بھی نہ کہو۔ اب اس آیت میں بھی واحد مخاطب کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ حالانکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ماں باپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس جگہ ہر انسان کو مخاطب کیا گیا ہے۔ نہ کہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اے قرآن کریم کے پڑھنے والے اگر تو مخالفین اسلام کی گری ہوئی خواہشات کی پیروی کریگا تو تُو ظالم بن جائیگا۔ کیونکہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ایک یقینی علم نازل کر دیا ہے۔ اگر تُو اس سے فائدہ نہیں اُٹھائے گا اور اسے چھوڑ کر دوسروں کے پیچھے چلے گا تو تُو اپنے آپکو نقصان پہنچائیگا۔ ورنہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تو اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرما چکا ہے کہ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ تُو ان کے قبلہ کی کبھی پیروی نہیں کر سکتا۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ اتنی وضاحت سے ایک بات فرما چکا ہے تو اسی آیت میں اس کے خلاف یہ کیونکر فرما سکتا ہے کہ اگر تُو نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو تُو ظالموں میں سے سمجھا جائیگا۔ پس اس جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ عام مسلمان مراد ہیں۔ چنانچہ آجکل ایسا ہی ہو رہا ہے کہ مسلمان قرآن کریم کو چھوڑ کر دوسرے علوم کے پیچھے پڑے ہوئے

الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ

وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (سچائی) کو (اسی طرح) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

اور اُن میں سے کچھ لوگ یقیناً حق کو جان بوجھ کر چھپاتے ہیں۔ ۱۶۲

ہیں جو کہ روزانہ بدلتے ہیں۔ اور اس یقینی علم کو انہوں نے ترک کر دیا ہے جو قرآن کریم کی شکل میں ہے۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ جب مقدمہ کا فیصلہ لکھواتا ہے تو بعض مقامات پر اس میں مجرم کے خطاب کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔ اِس جرم میں تجھے اتنے ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔ اِس پر تم کبھی نہیں دیکھو گے کہ فیصلہ کو قلمبند کرنے والا کلرک کھڑے ہو کر شور مچانے لگ جائے کہ مجھے یہ سزا کیوں دی گئی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک فیصلہ کا اعلان فرمایا ہے اور اس سے مراد صرف وہی شخص ہے جو اس فیصلہ کی خلاف ورزی کرے کوئی دوسرا شخص مراد نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکم دیتے وقت اپنے کسی قریبی کو مخاطب کر لیا جاتا ہے مگر مراد اس سے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ اور اُس کو مخاطب اس لئے کیا جاتا ہے کہ اگر میرا قریب ترین عزیز بھی ایسا کرے گا تو میں اُسے سزا دونگا۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ قریبی ایسا کر سکتا ہے بلکہ اس سے جرم کی اہمیت بیان کرنا اور لوگوں کو ہوشیار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسجگہ بھی یہ مراد نہیں کہ ایسا کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممکن تھا بلکہ آپ کو اس لئے مخاطب کیا گیا ہے کہ دوسرے لوگوں کو ہوشیار کیا جائے اور انہیں متنبہ کیا جائے کہ اگر کوئی مجھ سے بڑا آدمی بھی ایسا کرے گا تو اُسے سزا ملیگی۔ اور اس کا کچھ بھی لحاظ نہیں کیا جائیگا۔ یہ بھی ہوشیار کرنے کا ایک طریق ہوتا ہے۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دوں۔ اب اِس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت فاطمہؓ بھی چوری کر سکتی تھیں۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ دوسرے لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ اور انہیں پتہ لگ جائے کہ قانون میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔

۱۶۲ تفسیر:- اللہ تعالیٰ اس آیت میں اہلِ کتاب کی نسبت فرماتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا جاتا ہے۔ بیٹے کی پہچان ہمیشہ بیوی کی شہادت پر ہوتی ہے۔ جب ایک خاوند اپنی بیوی کو عفیفہ اور صالحہ سمجھتا ہو تو اُس سے پیدا ہونیوالی اولاد کے متعلق وہ ہرگز کسی شبہ میں گرفتار نہیں ہوتا بلکہ اُسے جائز طور پر اپنی نسل سمجھتا ہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ اسجگہ پیش کرتا ہے کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ یعنی جس طرح ہر انسان اپنی بیوی کی پاکدامنی پر اعتبار کرتے ہوئے اُس کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کو اپنی اولاد سمجھتا ہے اور کبھی اِس واہمہ میں گرفتار نہیں ہوتا کہ شاید یہ کسی اَور کی اولاد ہو اسی طرح جن لوگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

دیانت اور آپ کی راستبازی کو دیکھا ہے اُن کے لئے
آپ کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل خود آپ کا اپنا
وجود ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم پر یہ وحی نازل ہوئی کہ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ
الْاَقْرَبِیْنَ تو آپ نے مکہ کے تمام قبائل کو جمع کیا۔
اور فرمایا کہ اگر میں تمہیں کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک
بڑا بھاری لشکر جمع ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم
مان لوگے ؟ اب باوجود اس کے کہ یہ ایک ناممکن بات تھی
کیونکہ اس پہاڑ کے پیچھے میدان تھا اور اس میں کوئی لشکر
تو الگ رہا پچاس ساٹھ آدمی بھی نہیں چھپ سکتے تھے۔
مگر پھر بھی انہوں نے کہا۔ ہم تمہاری بات یقیناً مان لینگے
کیونکہ تم نے آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ گویا
ناممکن بات کو بھی جو آپ کے مُنہ سے نکلے ماننے کیلئے
تیار تھے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ اگر تم میری اس بات
کو ماننے کے لئے تیار ہو۔ تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ خدا تعالےٰ
نے مجھے نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تم مجھے نہیں مانو گے تو
خدا تعالےٰ کے غضب کے نیچے آ ؤگے۔ اس پر وہ آپؐ کو
فریبی اور دغا باز کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔ غرض رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم اُن میں اِسقدر راستباز اور امین مشہور
تھے کہ دشمن بھی اقرار کرتا تھا کہ اس شخص سے بڑھ کر
سارے مکہ میں کوئی شخص دیانت دار اور راستباز نہیں
پھر اگر ایک انسان اپنی بیوی کے سو جھوٹ دیکھ کر بھی
اپنے دل میں کوئی وسوسہ پیدا نہیں کرتا۔ تو کیا وجہ ہے کہ
وہ ایسے شخص پر اعتبار نہیں کرتے جس کا ہر قول سچا اور
جھوٹ سے مبرّا رہا ہے۔ فرماتا ہے کم سے کم بیٹوں جیسا
سلوک تو اس کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ بیویوں کی سچائی
پر تو دو گواہ بھی نہیں ہوتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی سچائی پر تمام مکہ شاہد تھا اور دشمن بھی
آپؐ کی راستبازی سے انکار نہیں کرتا تھا۔ پھر آپؐ کا
انکار کیسے درست ہو سکتا ہے۔

وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ
یَعْلَمُوْنَ۔ فرماتا ہے۔ ان میں سے ایک فریق ایسا ہے جو
حق کو چھپا رہا ہے۔ اُسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راستبازی کا
علم ہے۔ اُسے آپ کی دیانت کا علم ہے۔ اسے آپؐ کی امانت
کا علم ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ یہ شخص جھوٹ اور
فریب کے کبھی قریب بھی نہیں گیا۔ مگر باوجود اس کے
وہ حق کو چھپا رہا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی تکذیب پر کمربستہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے جب دعویٰ نبوت فرمایا۔ تو اس وقت حضرت ابوبکر
رضی اللہ عنہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ واپس تشریف لائے
تو آپ کی ایک لونڈی نے آپ سے کہا کہ آپ کا دوست
تو (نعوذ باللہ) پاگل ہو گیا ہے۔ اور وہ عجیب عجیب
باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ مجھ پر آسمان سے فرشتے نازل
ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسی وقت اُٹھے
اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مکان پر پہنچ کر آپ
کے دروازہ پر دستک دی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
باہر تشریف لائے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔
کہ میں آپ سے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ کیا
آپ نے یہ کہا ہے کہ خدا کے فرشتے مجھ پر نازل ہوتے
ہیں اور مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو ان کو ٹھوکر لگ جائے
تشریح کرنی چاہی۔ مگر حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ آپؐ
تشریح نہ کریں اور مجھے صرف اتنا بتائیں کہ کیا آپؐ
نے یہ بات کہی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر
اس خیال سے کہ معلوم نہیں یہ سوال کریں کہ فرشتوں کی
شکل کیسی ہوتی ہے اور وہ کس طرح نازل ہوتے ہیں ؟
پہلے کچھ تمہیدی طور پر بات کرنی چاہی۔ مگر حضرت
ابوبکرؓ نے پھر کہا۔ نہیں نہیں آپ صرف یہ بتائیں

ع ۱۷/۱

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

یہ (مذکورہ بالا) صداقت تیرے رب کی طرف سے ہے۔ پس تو شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ بن۔ ۶۳

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا

اور ہر ایک (شخص) کا ایک (نہ ایک) مطمح نظر ہوتا ہے جسے وہ (اپنے آپ پر) مسلط کر لیتا ہے۔ سو (تمہارا مطمح نظر یہ ہو کہ) تم نیکیوں (کے حصول) میں ایک دوسرے

يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۹﴾

سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں کہیں (بھی) ہو گے اللہ تمہیں اکٹھا کر کے لے آئیگا۔ اللہ یقیناً ہر ایک امر پر پورا (پورا) قادر ہے۔ ۶۴

کہ کیا یہ بات درست ہے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں درست ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ اور پھر انہوں نے کہا۔ یا رسول اللہ! میں نے دلائل بیان کرنے سے صرف اس لئے روکا تھا کہ میں چاہتا تھا کہ میرا ایمان مشاہدہ پر مبنی ہو دلائل پر اسکی بنیاد نہ ہو کیونکہ آپ کو صادق اور راستباز تسلیم کرنے کے بعد کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ غرض جس بات کو کمزور دلائل نے چھپایا تھا اُسے حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عمل سے واضح کر کے دکھا دیا۔

۶۳ **حل لغات**: اِمْتِرَاءٌ کے معنے ہیں۔ (۱) جھگڑا کرنا۔ (۲) شک کرنا۔

اِمْتِرَاءٌ

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہ صداقت تیرے رب کی طرف سے ہے اور اُس نے دنیا میں ایک دن پھیل کر رہنا ہے جس بات کے پورا ہونے کے متعلق انسان کو شبہ ہو اسکے متعلق تو بہانہ بنا سکتا ہے کہ شاید وہ ٹل جائے۔ لیکن ہمارا رسول تو جو کچھ کہتا ہے وہ ایک اٹل صداقت ہے، جو ایک دن پوری ہو کر رہیگی۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ یہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ اور جس نے درجہ بدرجہ تمہیں ترقی دیتے ہوئے اس بلند مقام تک پہنچایا کیا ایسی اعلیٰ درجہ کی ربوبیت کرنیوالی ہستی کا کلام کبھی ٹل سکتا ہے پس اسکو رد کرنے کا کیا فائدہ۔ اس سے تو تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ تم اگر رد بھی کرو گے تو یہ تعلیم ضرور پھیل کر رہیگی۔ اسلئے اس کے انکار سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

میں ابھی چھوٹا تھا کہ میں نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ ایک سڑک پر جو مدرسہ احمدیہ کے پاس مہمان خانہ کو جاتی ہے کبڈی ہو رہی ہے۔ لکیر جو حد فاصل ہوتی ہے کھینچی ہوئی ہے اور ہم ایک طرف ہیں اور غیر احمدی دوسری طرف۔ غیر احمدیوں میں سے جو بھی ہماری طرف آتا ہے ہمارے آدمی اُسے پکڑ کر اُٹھا لیتے ہیں حتّٰی کہ انکے سارے آدمی ہماری طرف آگئے۔ صرف مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی پیچھے رہ گئے۔ اسکے بعد میں نے دیکھا کہ انہوں نے دیوار کی طرف منہ کر لیا اور آہستہ آہستہ ہماری طرف چلنا شروع کیا اور جب لکیر پر پہنچے تو کہنے لگے کہ جب سارے ہی آگئے ہیں تو میں بھی آجاتا ہوں اور وہ پھر وہ بھی ہماری طرف آگئے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ یہ صداقت تو دنیا میں غالب آنیوالی ہے۔ اور جب آخر میں تم نے ایمان ہی لانا ہے تو آج ہی کیوں نہیں مان لیتے۔ چنانچہ دیکھ لو آخر مشرکین مکہ فتح مکہ کے دن آپؐ کے پاس آئے اور منتیں کرنے لگے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے آپؐ نے فرمایا۔ جاؤ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ آج میں تمہیں کوئی سرزنش نہیں کرتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بھی فرمایا ہے ؎ قضائے آسمان است ایں بہر حالت شود پیدا یعنی یہ تو ایک آسمانی قضا ہے اور اس نے ضرور پورا ہونا ہے۔ پھر تم انکار کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو۔

۶۴ **حل لغات**:۔ وِجْهَةٌ کے تین معنے ہیں (۱) سمت (۲) منہاج یعنی راستہ اور طریقہ (۳)

وِجْهَةٌ

وہ چیز جس کی طرف انسان توجہ کرے یعنی مقصود۔
اِسْتَبِقُوْا: اِسْتَبَقَ سے جمع کا صیغہ ہے اور
اِسْتَبَقَ کے معنے عربی زبان میں اِذَا تَحَرَّ وَاجِدٌ اَنْ
يَّسْبِقَ الْاٰخَرَ کے ہیں۔ یعنی ہر ایک نے دوسروں سے
آگے نکل جانے کی کوشش کی۔

تفسیر:۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر شخص کا کوئی
نہ کوئی مطمح نظر ہوتا ہے جو ہر وقت اس کی آنکھوں کے
سامنے رہتا ہے اور اُسے پورا کرنے کے لئے وہ اپنی تمام مساعی
صرف کر دیتا ہے۔ کبھی وہ تجارت میں ترقی اپنا مقصد قرار
دے لیتا ہے۔ کبھی زراعت میں ترقی اپنا مقصد قرار دے
لیتا ہے۔ کبھی سیاسی لحاظ سے اقتدار کا حصول وہ
اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی سائنس میں ترقی کو
اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے۔ کبھی بیواؤں اور یتامیٰ اور
مساکین کی خدمت کو وہ اپنا مقصد قرار دے لیتا ہے کبھی
دین اور مذہب کی اشاعت کو اپنا مقصد قرار دے لیتا
ہے۔ غرض ہر شخص کسی نہ کسی مطمح نظر کو اپنے سامنے رکھتا
ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے وہ ہر قسم کی قربانیوں
اور جدوجہد سے کام لیتا ہے۔ نکمّے سے نکمّے انسان کو
بھی دیکھ لو۔ تو معلوم ہوگا کہ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ
کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ فراغت انسانی فطرت میں داخل
ہی نہیں۔ یہی حال اقوام کا ہے۔ ہر قوم نے اپنا کوئی
مقصد قرار دیا ہوا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے لئے سب
کچھ قربان کر دیتی ہے پس جب ہر انسان دنیا میں کچھ
نہ کچھ مقرر کرتا ہے اور کسی نہ کسی امر کے متعلق اسے شغف
ہوتا ہے تو تمہارا بھی ایک مطمح نظر ہونا چاہیئے۔ یہ نہ ہو
کہ تشتّتِ قومی کے ماتحت کوئی کسی مقصد کو اپنے سامنے
رکھ لے اور کوئی کسی مقصد کو۔ مُوَلِّيْهَا میں مفعول کو
حذف کر دیا گیا ہے اور اصل عبارت اس طرح ہے
کہ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا وَجْهَهٗ۔ یعنی
ہر شخص کی کوئی نہ کوئی جہت ہوتی ہے۔ یا ہر شخص کا کوئی
نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے جس پر وہ اپنی تمام توجہات
کو مرکوز کر دیتا ہے۔ اور جسے زندگی بھر اپنے سامنے رکھتا
ہے اور پورے انہماک اور توجہ سے اُسے حاصل کرنے کی
کوشش کرتا ہے۔ مگر لوگ تو اپنے مقاصد اپنے لئے خود
تجویز کرتے ہیں۔ لیکن ہم اُمّتِ محمدیہ پر رحم کرتے ہوئے
خود ہی ایک بلند ترین مطمح نظر اُس کے سامنے رکھتے ہیں
اور ہدایت دیتے ہیں کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔ تمہارا
مطمح نظر یہ ہونا چاہیئے کہ تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے
آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اسجگہ نیکیوں میں ایک دوسرے
کا مقابلہ کرنے کی تحریک فرما کر اللہ تعالیٰ نے قومی ترقی
کا ایک عجیب گُر بتایا ہے۔ جسے افسوس ہے کہ اِس
زمانہ میں بالعموم مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ عام طور
پر دیکھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کو نیکیوں میں حصہ لینے
کی نصیحت کی جائے یا کسی نیک کام کی ترغیب دلائی
جائے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ بس غریبوں پر ہی
سارا زور ڈالا جاتا ہے امیروں کو تو کوئی پوچھتا ہی
نہیں۔ حالانکہ اگر کوئی بڑا ہے اور وہ نیکیوں میں حصہ
نہیں لیتا تو وہ اُس کی مثال اپنے سامنے کیوں رکھتے
ہیں۔ انہیں تو اچھے نمونے کی اقتداء کرنی چاہیئے اور
امارت اور غربت پر بنیاد رکھنے کی بجائے ہمیشہ یہ دیکھنا
چاہیئے کہ نیکی اور تقویٰ کس میں پایا جاتا ہے۔ اگر ایک
غریب میں نیکی پائی جاتی ہے تو وہ اس امیر کے مقابلہ میں
جس کے اندر تقویٰ نہیں خدا تعالیٰ کے حضور لاکھوں گنے
زیادہ بہتر ہے۔ صحابہؓ کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ
غرباء نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر شکایت
کی۔ کہ یا رسول اللہ! جس طرح ہم نمازیں پڑھتے ہیں
اُسی طرح امراء بھی نمازیں پڑھتے ہیں جس طرح ہم روزے
رکھتے ہیں اُسی طرح امراء بھی روزے رکھتے ہیں جس طرح

اِسْتَبِقُوْا

ہم جہاد کرتے ہیں اُسی طرح امراء بھی جہاد کرتے ہیں مگر یا رسول اللہ ایک زائد کام وہ یہ کرتے ہیں کہ وہ صدقہ و خیرات دیتے ہیں اور ہم غربت اور ناداری کی وجہ سے اس میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ ہمیں کوئی ایسا طریق بتائیے جس پر چل کر ہم اس کمی کو پُورا کر سکیں۔ آپ نے فرمایا۔ تم ہر نماز کے بعد تینتیس تینتیس دفعہ سُبْحَانَ اللّٰہ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اور چونتیس دفعہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لیا کرو۔ وہ بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ مگر تھوڑے دنوں میں ہی امیروں کو بھی اس کا پتہ لگ گیا اور انہوں نے بھی تسبیح و تحمید شروع کر دی۔ اس پر غرباء نے پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ یا رسول اللہ! انہوں نے بھی تسبیح و تحمید شروع کر دی ہے۔ اب ہم کیا کریں۔ آپؐ نے فرمایا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نیکی کی توفیق دیتا ہے تو مَیں اس کو کس طرح روک سکتا ہوں۔ یہ تھی اُن کی نیکی اور اس میں تسابق کی رُوح۔ اسی طرح بجائے اس کے کہ انسان اعتراض کرے اور کہے کہ فلاں سے یہ کام کیوں نہیں کروایا جاتا۔ اُسے چاہیئے کہ خود اس میں حصّہ لے اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ غرض دنیا میں ہر شخص کا ایک مطمح نظر ہوتا ہے۔ کسی کو کھانے پینے کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو عیش و عشرت کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو تجارت کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو اچھے لباس کا شوق ہوتا ہے کسی کو غیبت اور بدگوئی کا شوق ہوتا ہے۔ کسی کو لڑائی جھگڑے کا شوق ہوتا ہے۔ غرض کوئی انسان نہیں جس نے اپنے لئے کسی نہ کسی چیز کے حصول کو اپنا مقصد قرار نہ دیا ہوا ہو۔ غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل بھی اپنے سامنے کوئی نہ کوئی مقصد رکھتا ہے کسی کا مقصد چودھرایت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ کسی کا مقصد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ کسی کا مقصد سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔ فرماتا ہے کہ جبکہ کوئی نہ کوئی مقصد ہر انسان کے سامنے ہوتا ہے تو پھر تم وہ بات کیوں نہ کرو جس میں سب اچھی باتیں آجائیں۔ تمہیں یہ تہیّہ کر لینا چاہیئے کہ کوئی خوبی ایسی نہ ہو جس میں دوسرا ہم سے آگے نکل جائے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ جب وہ جُدا ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو افسوس ہُوا آپ اس خیال سے کہ اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو کسی اور ذریعہ سے اس کی خبر ہوئی تو آپ کو تکلیف ہوگی فوراً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور عرض کیا یا رسول اللہ! آج ابوبکرؓ سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا جس کا مجھے افسوس ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سُن کر غصّہ آگیا۔ اور آپ نے فرمایا۔ تم لوگ کیوں اُسے تکلیف دینے سے باز نہیں آتے۔ جب تم لوگ اسلام کا مقابلہ کر رہے تھے تو وہ مجھ پر ایمان لایا تھا۔ اور اُس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ حضرت عمرؓ ابھی معذرت ہی کر رہے تھے۔ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی خیال آیا کہ شاید حضرت عمرؓ میرے متعلق کوئی ایسی بات نہ کر دیں جس سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مجھ سے ناراض ہوں اسلئے وہ بھی دوڑ کر آئے کہ مَیں چل کر حقیقت حال بتاؤں۔ کہ میرا نہیں بلکہ عمرؓ کا قصور تھا۔ مگر جونہی آپ دروازہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ معذرت کر رہے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُنکو ناراض ہو رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُسی وقت دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! فِدَاکَ اَبِیْ وَاُمِّیْ۔ قصور میرا ہی تھا۔ عمر کا قصور نہیں تھا۔ اس طرح آپ نے حضرت عمرؓ پر سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ یہ تھی اُن کی نیکی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی رُوح کہ قصور

حضرت عمرؓ کا ہے مگر معافی حضرت ابوبکرؓ مانگ رہے ہیں تاکہ حضرت عمرؓ پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ناراض نہ ہوں۔

درحقیقت اسلام اور دوسرے مذاہب میں جہاں اَور بہت سے امتیازات ہیں جو اُس کی فضیلت کو نمایاں طور پر ثابت کرتے ہیں وہاں ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ دوسرے مذاہب صرف نیکی کی طرف بلاتے ہیں مگر اسلام استباق کی طرف بلاتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ دنیا میں ہر قوم نے ایک ایک طرف اختیار کر لی ہے اور نیکی کی طرف سے اپنا مُنہ پھیر لیا ہے ۔ وہ کہتے تو یہی ہیں کہ ہم نیکی کی طرف لے جاتے ہیں لیکن واقعہ میں ایسا نہیں کرتے ۔ پس اُن کے اور اطراف کو اختیار کر لینے کی وجہ سے نیکی کی طرف بالکل خالی رہ گئی ہے تم اس کو لے لو اور اوّل تو نیکی اختیار کرو اور پھر نیکیوں میں استباق کرو ۔ اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو ۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں استباق کا لفظ رکھا ہے جس میں بظاہر سرعت اور تیزی نہیں پائی جاتی اس لئے کہ اگر دو آدمی سُست روی سے جا رہے ہوں اور ایک اُن میں سے کسی قدر آگے بڑھ جائے تو لُغت کے اعتبار سے اُس نے استباق کر لیا ۔ اسی طرح ہر کام میں تھوڑا سا بڑھنے کا نام استباق رکھا جا سکتا ہے لیکن دراصل اس لفظ میں انتہا درجہ کی سرعت اور تیزی سے آگے بڑھنے کا مفہوم پایا جاتا ہے ۔ کیونکہ ہر شخص کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ استباق کرے ۔ اب اگر ایک شخص کوشش سے کچھ آگے بڑھے تو دوسرے کیلئے بھی حکم ہے کہ وہ اس سے آگے بڑھے ۔ اور جب وہ اس سے آگے بڑھے گا تو پھر پہلے کو وہی حکم آگے بڑھنے کے لئے تیار کر دے گا ۔ غرض ہر ایک کے لئے استباق کا حکم ہے ۔ اور ہر شخص جہاں تک انسانی طاقت میں ہے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریگا اور اس طرح اُس کی نیکیوں میں ترقی کرنے کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی ۔ یوں تو فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کی بجائے بعض اور الفاظ بھی رکھے جا سکتے تھے ۔ مثلاً فَاسْعَوْا بھی رکھا جا سکتا تھا ۔ مگر جو حقیقت فَاسْتَبِقُوْا میں رکھی گئی ہے وہ کسی اور میں نہیں آ سکتی تھی ۔ درحقیقت اس جگہ قرآن کریم اسلام اور دیگر مذاہب کا مقابلہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ تمام مذاہب خیرات کی طرف سے غافل ہیں ۔ اور خیرات کی حقیقت سے ناواقف ہیں پس اس وقت مسلمانوں کے لئے موقعہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں یہ لفظ ایسا جامع ہے کہ جس سے بڑھ کر کسی مقصد اور مدعا کی طرف دوڑنے اور اُسے جلدی سے حاصل کرنیکا مفہوم کسی اور لفظ سے ادا ہی نہیں ہو سکتا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دوڑے مگر پوری طاقت سے نہ دوڑے ۔ جلدی کرے مگر جس قدر چاہیئے اس قدر جلدی نہ کرے لیکن استباق کے حکم کا اس وقت تک پورا ہونا ناممکن ہے جب تک کہ پورے زور اور پوری طاقت سے کام نہ لیا جائے ۔ اس لئے کہ جب ایک شخص سے دوسرا بڑھتا ہے تو اُس کو بھی تو حکم ہے کہ آگے بڑھو ۔ اس لئے وہ اس سے زیادہ تیزی سے بڑھے گا ۔ پھر پہلے کیلئے حکم آ جائیگا کہ تم آگے بڑھو ۔ اور وہ اُس سے زیادہ تیزی اختیار کریگا ۔ حتّٰی کہ جسقدر کسی میں طاقت اور ہمت ہوگی وہ سب اُس میں صرف کر دیگا ۔ پس استباق بظاہر اپنے اندر تیزی اور دوڑنے اور جلدی کرنے کے معنے نہیں رکھتا مگر حقیقت میں یہ لفظ اس قدر تیزی پر دلالت کرتا ہے کہ جس قدر کسی انسان کی طاقت میں ہوتی ہے ۔ دوسرے مذاہب والے کہتے ہیں کہ نیکی کرو ۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ نیکی کرو ۔ اور ایک دوسرے سے آگے بڑھو ۔ یہ کام کوئی معمولی کام نہیں ۔ ایک دو کا مقابلہ ہو تو کوئی بات بھی ہے لیکن یہاں تو لاکھوں کا مقابلہ ہے ۔ جب ایک دو کے مقابلہ میں بھی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تو جہاں

لاکھوں میں مقابلہ ہو وہاں کتنی بڑی تیاری کی ضرورت ہوگی۔ گھوڑ دوڑیں دیکھ لو۔ کتنی تیاری کی جاتی ہے۔ جب لوگ اُس میں حصہ لیتے ہیں تو کتنی کوشش اور تیاری کرتے ہیں۔ لیکن جہاں لاکھوں اور کروڑوں افراد ہوں وہاں تو جتنی تیاری کی ضرورت ہو سکتی ہے اُسے ہر انسان آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی شناخت کا یہ معیار بیان فرمایا ہے کہ وہ تسابق اختیار کرتے ہیں اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش یقیناً ہر قوم کے معیار کو اتنا بلند لے جاتی ہے کہ اس کا انسان قیاس بھی نہیں کر سکتا جب کبھی نیکی دنیا سے مفقود ہو جائے یا جب کبھی نیکی میں آگے بڑھنے کی رُوح مفقود ہو جائے۔ اس وقت قوم یا تو مرنا شروع ہو جاتی ہے۔ یا گرنا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک تسابق کی رُوح کسی قوم میں قائم رہے۔ اُس وقت تک خواہ وہ کتنی بھی ذلت میں پہنچی ہوئی ہو اور کتنی بھی گری ہوئی ہو پھر بھی اپنی چمک دکھلاتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے موقعہ ہوتا ہے کہ وہ پھر آگے بڑھے۔ ہمارے قریب کے بزرگوں میں سے ایسے زمانہ میں جب مسلمانوں پر ایک قسم کے تنزل کی حالت آگئی تھی ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ تسابق کی وجہ سے ان لوگوں کے واقعات سُن کر انسان کے دل میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ سید اسمٰعیل صاحب شہید جو تیرھویں صدی میں گذرے ہیں حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے مرید تھے۔ اور سید احمد صاحب بریلوی سکھوں سے جہاد کرنے کیلئے پشاور کی طرف گئے ہوئے تھے۔ سید اسمٰعیل صاحب کسی کام کے لئے دلی آئے ہوئے تھے۔ جب دلی سے واپس جاتے ہوئے کیمبل پور کے مقام پر پہنچے۔ تو کسی نے اُن سے ذکر کیا۔ کہ اس دریا کو یہاں سے تیر کر کوئی شخص نہیں گذر سکتا۔ اس زمانہ میں صرف فلاں سکھ ہے جو گذر سکتا ہے مسلمانوں میں سے

کوئی اُس کا مقابلہ کرنے والا نہیں۔ وہ وہیں ٹھہر گئے اور کہنے لگے کہ اچھا ایک سکھ ایسا کام کرتا ہے کہ کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اب جب تک میں اس دریا کو پار نہ کرلونگا میں یہاں سے نہیں ہلونگا۔ چنانچہ وہیں انہوں نے تیرنے کی مشق شروع کر دی۔ اور چار پانچ مہینہ میں اتنے مشّاق ہو گئے کہ تیر کر پار گذر گئے اور پار گذر کر بتا دیا کہ سکھ ہی اچھے کام کرنے والے نہیں بلکہ مسلمان بھی جب چاہیں اُن سے بہتر کام کر سکتے ہیں۔ اس تسابق کی رُوح کو جب بھی ہم اپنے سامنے لاتے ہیں۔ ہماری رُوحوں میں ایک بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے دلوں میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے دماغوں میں عزم پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مخالف یا مدّمقابل یا رقیب سے کسی صورت میں بھی دبینگے نہیں۔ اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ ہم نیکیوں کے مقابلہ میں شکست ہوں۔ بلکہ نیکی کے میدان میں اپنے باپ اور بھائی سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اسی طرح قومی وقار اور اعزاز کو ہمسایہ قوموں سے آگے بڑھانے کے لئے علمی اقتصادی سیاسی اور اخلاقی امور میں اُن سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ قرآن کریم نے فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ کہکر اور ایک جگہ وَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا فرما کر اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ اس دنیا میں مقابلہ ہو رہا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ اس مسابقت میں سب سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ ہماری جماعت کو بھی چاہیئے کہ ہم میں سے ہر فرد اپنے نفس کو ٹٹولتا رہے اور دین کے ساتھ ایک گہری محبت اور شیفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے بس یہی ایک مقصد اپنے سامنے رکھے کہ ہم نے اسلام کو دنیا میں غالب کرنا ہے۔ جب تک یہ رُوح ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتی اُسوقت تک ہم اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اِس آیت کا پہلی آیت سے یہ تعلق ہے کہ اوپر یہ بتایا گیا تھا کہ یہود نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو اپنا مقصد قرار دیا ہوا ہے چنانچہ فرمایا تھا وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ یعنی اگر تُو اہل کتاب کے پاس ہر قسم کا نشان بھی لے آئے تب بھی وہ تیرے قبلہ کی پیروی نہیں کرینگے۔ گویا خواہ ان کے ہاتھ سے خدا جائے یا اس کا رسول جائے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ضرور کرنی ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اِس امر کا کہ انہوں نے اپنا کوئی اعلیٰ مقصد قرار نہیں دیا ہوا پس چاہیئے کہ تم اپنا ایک اعلیٰ مقصد قرار دے لو۔ مگر یہ یاد رکھو کہ کوئی ایک نیکی اپنا مقصد قرار دے لینا کافی نہیں بلکہ الخیرات یعنی سب نیکیوں کو اپنا مقصد قرار دو اور جب بھی تمہیں کوئی نیک بات معلوم ہو بلا کسی اور خیال کے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور اس سے دُور رہنے کو ہلاکت سمجھو۔ اور دوسری بات یہ مدِّ نظر رکھو کہ نیکی کے حصول کے وقت تسابق کو مدِّ نظر رکھو یعنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اور تیسری بات یہ مدِّ نظر رکھو کہ اگر تمہارا قدم دوسروں کی سستی کی وجہ سے یا تمہاری چستی کی وجہ سے آگے بڑھ رہا ہے تو دوسروں سے صرف بعض نیکیوں میں آگے بڑھنے کو کافی نہ سمجھو بلکہ جس قدر جلد ہو سکے ہر قسم کی خیرات کے حصول کے لئے قدم بڑھاؤ۔ اِسی کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اِس حدیث میں بھی توجہ دلائی ہے کہ كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ اَخَذَهَا حَيْثُ وَجَدَهَا۔ یعنی حکمت کی بات مومن کی ایک گمشدہ متاع ہوتی ہے۔ وہ جہاں سے بھی ملے اسے فوراً لے لیتا ہے۔ اِس حدیث میں ایک تو اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومن کوئی بات بھی بغیر حکمت کے نہیں کرتا۔ تمام خوبیاں اس کے اندر پائی جاتی ہیں اور تمام نیکیاں اُس کے اندر جمع ہوتی ہیں اور دوسرے اس امر کی نصیحت کی گئی ہے کہ اُسے جب بھی کوئی حکمت کی بات نظر آئے تو وہ یہ دیکھے بغیر کہ یہ کلمۂ حکمت کسی کافر کے منہ سے نکلا ہے یا منافق کے مُنہ سے فوراً اسے اپنی کھوئی ہوئی چیز سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کرے گویا جس طرح ایک کھویا ہوا بچہ اُسے نظر آجائے تو وہ فوراً اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ بھی لپک کر اس خوبی کو لے لے اور کہے کہ اوہو! یہ تو میری ہی چیز تھی۔ افسوس کہ اسے کافر یا منافق لے گیا۔ اب یہ میرا کام ہے کہ میں اپنی گمشدہ متاع واپس لوں اور اس خوبی کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کروں۔ دُنیا میں بہت سی خرابیاں محض اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ جس کسی کے پاس جتنی نیکی ہوتی ہے وہ اُسی پر فخر کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ اور مزید خوبیاں اپنے اندر جمع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اور اگر دشمن میں اُسے کوئی خوبی نظر آتی ہے تو کینہ اور بُغض اور حسد کی وجہ سے وہ اُسے بھی بُرا قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ اس کے ایسا کرنے سے دشمن کا تو کوئی نقصان نہیں اُس کے پاس تو وہ خوبی ہے ہی نقصان اس کا اپنا ہے۔ کیونکہ بُغض کی وجہ سے وہ اُس خوبی کو حاصل نہیں کر سکیگا۔ پس مومن کا کام ہے کہ وہ ہر خوبی اپنے اندر پیدا کرے۔ اور ہر خوبی میں دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کرے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اسلام نے اس طرح حسد کی بنیاد رکھی ہے کیونکہ امورِ دینیہ اور امورِ دنیویہ میں یہ مقابلہ ضروری ہے۔ اس کے بغیر کامل ترقی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تمام ترقی کی بنیاد ہی مقابلۂ اقوام و افراد ہے۔ خود غرضی کی جڑ شریعتِ اسلام نے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کہہ کر اکھاڑ دی ہے کیونکہ مومن کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ جس درجہ تک

پہنچے اُس پر فوراً دوسروں کو بھی پہنچائے۔ کیونکہ اُس کی غرض ہی دوسروں کو نفع پہنچانا ہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران آیت ۱۰۵) یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔ اور اچھی باتوں کی تعلیم دے اور بُرائیوں سے روکے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ پس جس خیر کو بھی مومن حاصل کریگا وہ فوراً دوسروں کو بلائے گا کہ جلد آؤ اور اس چیز کو حاصل کرو۔ گویا مومنوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جب آگے بڑھیں تو پچھلوں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیں۔ پھر آگے بڑھیں۔ تو جو لوگ پیچھے رہ جائیں اُن کو دوبارہ کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ پھر دوڑیں اور اس طرح جو پیچھے رہ جائیں ان کو اپنے ساتھ شامل کریں اور پھر سارے مل کر نیکیوں کے میدان میں دوڑیں۔ اس پر پھر جو اُن میں سے آگے نکل جائیں وہ پچھلوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیں۔ اور یہی طرح ایک دوڑ جاری رہے۔ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے سبقت لے جائیں اور پیچھے رہ جانے والوں کو ساتھ ملا لیں۔ پھر ایک دوسرے سے سبقت لے جانیکی کوشش کریں۔ اور پھر پچھلوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ اور یہی عشق کی کیفیت ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ مومنوں سے یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ اُس کے پاس اکیلے نہ آئیں بلکہ دوسروں کو بھی ساتھ لیتے آئیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو مصر کی طرف روانہ کرتے وقت کہا تھا کہ تم نے اکیلے نہیں آنا بلکہ بن یامین کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ بھی کہتا ہے کہ تم میرے پاس دوڑ کر آنا۔ اور اکیلے نہ آنا بلکہ میرے دوسرے رُوحانی بیٹوں کو بھی ساتھ لے کر آنا۔ مومن دوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے خدا تعالیٰ کے حضور جانا ہے۔ وہاں میں اُسے کیا جواب دونگا۔ اس لئے وہ دوسروں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔

غرض كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ نے حسد اور خود غرضی کی جڑ کاٹ دی ہے۔ کیونکہ مومن جس خیر کو خود حاصل کریگا وہ فوراً اس میں شامل کرنے کے لئے دوسروں کو بھی بلائیگا اور اس طرح نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جہاں ایک لطیف مقابلہ جاری رہیگا وہاں خود غرضی اور حسد کا بھی کوئی شائبہ دکھائی نہیں دیگا۔ یہ کیا ہی لطیف مقابلہ مسابقہ اور پھر تجاذب ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا۔ فرماتا ہے تم جہاں کہیں بھی ہو گے آخر ایک دن اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کر کے اپنے پاس لے آئیگا اور تمہیں اپنی سُستیوں اور غفلتوں اور لوگوں کو نیکیوں کی دوڑ میں پیچھے چھوڑنے کا جواب دینا پڑے گا۔ پس اُس دن کا تمہیں خیال رکھنا چاہیئے۔ اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ وہ تم سے ضرور پوچھے گا۔ کہ جب میں نے تمہیں اسلام جیسی نعمت عطا فرمائی تھی تو تم نے اُسے دوسروں تک کیوں نہ پہنچایا۔ اور نیکیوں کی دوڑ میں تم نے دوسروں سے سبقت لے جانے کی کیوں کوشش نہ کی۔ پس تم اُس دن کے آنے سے پہلے پہلے تیاری کر لو۔ اور اپنے اعمال کا جائزہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ اس دن تمہیں شرمندگی لاحق ہو اور خدا تعالیٰ کے حضور تم مجرم قرار پاؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ فرماتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ تم اس مقصد کو ناقابلِ حصول مت سمجھو۔ جیسا کہ بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ

اور تو جس جگہ سے بھی نکلے اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف

الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا

پھیر دے اور یہ (حکم) یقیناً تیرے رب کی طرف سے (آئی ہوئی) صداقت ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے ہرگز بے خبر

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ

نہیں ہے۔ اور تو جس جگہ سے بھی نکلے اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ

پھیر دے اور تم (بھی) جہاں کہیں ہو اپنے منہ اس کی طرف کیا کرو۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۤ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

تا ان لوگوں کے سوا جو ان (مخالفوں) میں سے ظلم کے مرتکب ہوئے ہیں (باقی) لوگوں کی طرف سے تم پر الزام

مِنْهُمْ ۤ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۤ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ

نہ رہے سو تم ان (ظالموں) سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو (یہ حکم میں نے اس لئے دیا ہے کہ تم پر لوگوں کا الزام

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ ۙ

نہ رہے) اور تا کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تا کہ تم ہدایت پاؤ۔ ۶۵؎

ہماری قسمت میں کہاں رکھا ہے کہ ہم اتنا بڑا مقام حاصل کر سکیں۔ وہ ہمت سے کام لینا ترک کر دیتے ہیں۔ اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر کیا ہے وہی کچھ ہمیں ملیگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں بڑی طاقتیں رکھی ہیں وہ نیکیوں میں خود بھی بڑھ سکتا ہے اور دوسروں کو بھی کھینچ کر اپنے ساتھ شامل کر سکتا ہے۔ یہ کام ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

خَرَجْتَ

۶۵؎ حل لغات:۔ خَرَجْتَ :۔ عربی زبان میں خَرَجَ کا لفظ نکلنے کے علاوہ اور معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ (۱) جب خَرَجَ عَلَيْهِ کہیں تو اس کے معنے ہوتے ہیں بَرَزَ لِقِتَالِهٖ وہ اُس سے جنگ کرنے کے لئے نکلا۔ اگر اس آیت میں یہ معنے مراد لئے جائیں تو یہ لفظ جنگ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوگا۔ (۲) پھر اس لفظ کے معنے اطاعت ترک کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ خَرَجَتِ

اَلرَّعِیَّۃُ عَلَی الْوَالِیْ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خَلَعَتِ الطَّاعَۃَ یعنی رعیّت نے والی کی اطاعت چھوڑ دی اور بغاوت اختیار کرلی۔ (۳) اسی طرح خَرَجَ الْوَالِیْ عَلَی السُّلْطَانِ کے معنے ہوتے ہیں تَمَرَّدَ یعنی والی نے سلطان کے خلاف سرکشی کی۔

قتال کے معنوں میں قرآن کریم میں بعض دوسرے مقامات پر بھی یہ لفظ استعمال ہُوا ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ آیت ۸۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تجھ کو اُن میں سے ایک گروہ کی طرف لوٹا لائے اور وہ لوگ تجھ سے خروج کی یعنی کسی آئندہ جنگ میں شامل ہونے کی اجازت مانگیں۔ تو تُو اُن سے کہہ دے کہ تم کو کبھی بھی آئندہ ہمارے ساتھ جنگ پر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور کبھی بھی تم دشمن سے میرے ہمراہ ہو کر لڑنے نہیں پاؤگے۔ کیونکہ تم پہلی دفعہ پیچھے بیٹھ رہنے پر راضی ہوگئے تھے۔ پس آئندہ ہمیشہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ہی بیٹھے رہا کرو۔ یہاں خروج بمعنے قتال آیا ہے جیساکہ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا سے واضح ہے۔

حُجَّۃ

حُجَّۃٌ :- اس لفظ کے معنے عربی زبان میں اس دلیل کے ہوتے ہیں جو انسان کو دوسرے پر غالب کردے۔ قَالَ الْاَزْهَرِیُّ اَلْوَجْهُ الَّذِیْ یَكُوْنُ بِهِ الظَّفَرُ یُسَمّٰی حُجَّةً (لسان العرب) وَفِیْ اَبِی الْبَقَاءِ وَمِنْ حَیْثُ الْغَلَبَةِ عَلَی الْخَصْمِ یُسَمّٰی حُجَّةً ۔ یعنی ازہری کہتے ہیں کہ وہ دلیل جس سے انسان کو کامیابی حاصل ہوئے حجّت کہتے ہیں۔ اور کلیات ابوالبقاء میں لکھا ہے کہ اس کا نام حجّۃ اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے دشمن پہ غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ غالب کردینے والی دلیل کے معنے میں حجّۃ کا لفظ حدیث میں بھی استعمال ہُوا ہے۔ جیسے دجّال کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :- اِنْ یَّخْرُجْ وَاَنَا فِیْكُمْ فَاَنَا حَجِیْجُهٗ ۔ یعنی اگر دجّال نے خروج کیا۔ اور میں تم میں موجود ہُوا تو مَیں وہ دلائل اس کے سامنے پیش کرونگا اور ایسی باتیں اس کے سامنے رکھوں گا کہ وہ شکست کھا جائیگا۔ اس حدیث سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حجّت کے معنے اس دلیل کے ہوتے ہیں جس سے دشمن ہار جائے اور شکست کھا جائے۔ اور دوسری طرف اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دجّال سے تلوار کی لڑائی نہیں ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ مَیں اس سے بحث کرکے دلائل کے لحاظ سے فتح پاؤنگا۔ نہ کہ تلوار کے زور سے۔ پس معلوم ہُوا کہ دجّال پر حجّت کے لحاظ سے غلبہ حاصل کیا جانا مقدّر ہے نہ کہ تلوار کے ساتھ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر غیر احمدی علماء اعتراض کیا کرتے ہیں کہ انہوں نے دجّال سے تلوار کے ساتھ جنگ کرکے اس کو ہلاک نہیں کیا بلکہ جہاد بالسیف قطعی طور پر منسوخ کردیا۔ حالانکہ اگر وہ احادیث پر تھوڑا سا بھی غور کریں تو اُن پر واضح ہو جائے کہ دجّال پر دلائل کے ذریعہ ہی غلبہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ تلوار کے ذریعہ دجّال کی ہلاکت کی خبر کسی حدیث میں نہیں دی گئی۔ حُجَّۃ کا لفظ کبھی غلط یا کمزور دلیل کے معنے میں بھی استعمال ہو جاتا ہے بشرطیکہ اس کے ساتھ کوئی قرینہ موجود ہو۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (شوریٰ آیت ۱۷) یعنی اُن کی دلیل اُن کے رب کے حضور باطل اور ضائع ہونیوالی ہے۔

حُجَّۃ کے معنے خالص دلیل کے بھی ہوتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ (بقرۃ آیت ۲۵۹) یعنی کیا تجھے اس شخص کا حال معلوم نہیں جس نے ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بحث کی تھی۔ یہاں صرف دلیل کے معنوں میں یہ لفظ

استعمال ہوا ہے اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ دونوں فریق غالب نہیں ہو سکتے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا - اِلَّا کبھی لٰکِنْ کے معنے میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ عربی محاورہ ہے مَالَکَ عَلَیَّ حُجَّۃٌ اِلَّا اَنْ تَظْلِمَنِیْ اَیْ مَالَکَ عَلَیَّ حُجَّۃٌ وَلٰکِنَّکَ تَظْلِمُنِیْ (بحر محیط و فتح البیان) یعنی تجھے مجھ پر کوئی حجت تو حاصل نہیں۔ ہاں اگر تو مجھ پر ظلم کرے اور خواہ مخواہ اپنے باطل دعوے کو سچا سمجھے تو اور بات ہے۔

(۲)- کبھی اِلَّا عاطفہ ہوتا ہے یعنی واؤ کے قائم مقام ہو کر آتا ہے اور ماقبل کو مابعد کے ساتھ شریک کرتا ہے۔ جیسے لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ اور لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ میں ہے (مغنی اللبیب)

اس لحاظ سے اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا کے معنے ہوں گے وَلَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اور اِلَّا مَنْ ظَلَمَ کے معنے ہونگے وَلَا مَنْ ظَلَمَ - یعنی اس صورت میں اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا کے معنے یہ ہونگے کہ نہ معقول اور نہ غیر معقول لوگ کوئی بھی ایسی دلیل پیش نہیں کر سکتے جس سے وہ لوگوں میں مسلمانوں کے حق پر ہونے کو مشتبہ کر سکیں۔

تفسیر:۔ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ کے معنے مفسرین نے یہ کئے ہیں کہ تم جہاں کہیں بھی ہو ہر حالت میں اپنا قبلہ مسجد حرام کو ہی رکھو۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ پہلے حکم سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید یہ قبلہ صرف مدینہ والوں کے لئے ہی ہو باقی لوگوں کے لئے نہ ہو۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے فرما دیا کہ تم جہاں کہیں سے بھی نکلو اپنے منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ اس آیت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہو خواہ تمام مسلمانوں کو اس کے معنے قبلہ کی طرف منہ کرنے کے ہو ہی نہیں سکتے۔ اوّل تو اس لئے کہ وہ نمازیں جو کسی شہر یا گاؤں میں رہتے ہوئے ادا کی جاتی ہیں۔ شہر سے نکلتے وقت کی نمازوں سے بالعموم زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں حکم وہ دینا چاہیئے تھا جس کا زیادہ نمازوں پر اطلاق ہو سکتا۔ نہ کہ ایسا حکم دیا جاتا جس پر عمل کرنے کا امکان سفر کی حالت میں بہت ہی کم ہوتا ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص شہر سے دس بجے صبح نکلے یا عصر اور مغرب کے درمیان نکلے یا آدھی رات کے وقت نکلے۔ اور یہ سارے کے سارے اوقات ایسے ہیں جن میں نماز کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ان حالات میں وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا حکم بے معنی بن جاتا ہے۔ کیونکہ کسی شہر سے نکلتے وقت شاذ ہی نماز کا موقعہ ہوتا ہے۔ بالعموم یا تو انسان اس وقت نماز ادا کر چکا ہوتا ہے یا اگر ادا کرنی ہوتی ہے تو کچھ دیر کے بعد بھی وہ نماز پڑھ سکتا ہے۔ بہر حال خروج کے ساتھ نماز کا تعلق نہیں۔ پھر ان معنوں کو اس صورت میں بھی درست تسلیم کیا جا سکتا تھا جب کوئی نماز خروج کے وقت سے بھی خاص طور پر تعلق رکھتی۔ لیکن سب لوگ جانتے ہیں کہ کوئی نماز خروج کے وقت سے تعلق نہیں رکھتی ایسی صورت میں اس آیت کو بارادۂ سفر گھر سے نکلنے پر چسپاں کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ مزید دلیل اس بات کی کہ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ سے مراد نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنا نہیں یہ ہے کہ سفر کی حالت میں تو بعض دفعہ جہت کا سوال بھی اُٹھ جاتا ہے اور جدھر منہ ہو اُدھر ہی نماز جائز ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب انسان سواری سے اُتر نہ سکے تو قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہی ثابت ہے کہ اُس وقت اُس کا جدھر منہ ہو جائے اُدھر ہی نماز جائز ہے۔ چاہے قبلہ کی طرف منہ ہو یا کسی اور طرف اُس وقت جہت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مشرق مغرب شمال جنوب سب ایک جیسے ہوتے ہیں صرف قلبی توجہ خانہ کعبہ کی طرف ہونی ضروری ہے۔

اِلَّا

آجکل جب انسان ریل گاڑی میں بیٹھا ہوتا ہے تو اس وقت بھی جہت کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ کیونکہ گاڑی کبھی شمال کی طرف کبھی جنوب کی طرف کبھی مشرق کی طرف اور کبھی مغرب کی طرف مڑتی اور چکر کھاتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود جو شخص اُس میں بیٹھا نماز پڑھ رہا ہوتا ہے۔ اُس کی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اگر مفسرین کے معنوں کو درست سمجھا جائے تو اس حکم پر نہ سوار عمل کر سکتا ہے اور نہ ریل گاڑی پر بیٹھنے والا عمل کر سکتا ہے۔ پس جب خروج میں جہت کی تخصیص بھی قائم نہیں رہتی تو پھر اس آیت سے یہ مراد لینا کہ جہاں کہیں سے بھی تم نکلو خانہ کعبہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھو۔ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

پھر یہ معنے اس لئے بھی درست نہیں کہ اس آیت کے لفظی معنے یہ بنتے ہیں کہ تم جہاں سے بھی نکلو اپنے منہ مسجد حرام کی طرف کرو۔ یا جہاں سے بھی تُو نکلے تُو اپنا مُنہ مسجد حرام کی طرف کرلے۔ اب یہ تو ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ چلتے وقت نماز نہیں پڑھی جا سکتی بلکہ نماز ٹھہر کر ہی پڑھی جا سکتی ہے۔ ہاں اگر اس آیت کے یہ الفاظ ہوتے کہ حَيْثُ مَا كُنْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تو جہاں کہیں بھی ہو اپنا مُنہ مسجد حرام کی طرف کرلے۔ تب تو یہ معنے صحیح ہو سکتے تھے۔ لیکن یہاں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی اسے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا اے مسلمانو! جہاں سے بھی تم نکلو تم اپنے مُنہ مسجد حرام کی طرف کرلو۔ اب یہ صاف بات ہے کہ نماز نکلتے وقت نہیں پڑھی جاتی بلکہ کسی جگہ ہوتے ہوئے نماز پڑھی جاتی ہے۔ پس معلوم ہُوا کہ یہاں نماز پڑھنے کے معنے کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ اگر نماز اور خروج کا کوئی تعلق تسلیم نہ کیا جائے تو پھر تکرار لازم آتا ہے حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔ انہیں قرآن مجید میں تکرار صرف اس لئے نظر آتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے صحیح مطالب اور مضامین کے باہمی ربط کو نہیں سمجھ سکے۔ انہیں جہاں بھی کوئی اعتراض نظر آتا ہے فوراً ناسخ و منسوخ کی بحث شروع کر دیتے ہیں۔ اور ایک آیت کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیکر اعتراض سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کے جو حقائق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دُنیا کو بتائے ہیں اگر اُن کو مدنظر رکھا جائے تو نہ قرآن کریم میں کوئی تکرار نظر آسکتا ہے اور نہ کسی آیت کو منسوخ قرار دینا پڑتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مکہ مکرمہ سے نکالا گیا۔ اُس وقت دشمنانِ اسلام کو یہ اعتراض کرنے کا موقعہ ملا کہ جب آپ دُعائے ابراہیم کے موعود تھے اور خانہ کعبہ کے ساتھ آپ کا تعلق تھا تو آپ کو مکہ سے کیوں نکال دیا گیا۔ جب آپ کو مکہ سے نکال دیا گیا ہے تو آپ دُعائے ابراہیم کے کس طرح مصداق ہو سکتے ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تمہارا مکہ سے یہ نکلنا عارضی ہے۔ ہم تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم دوبارہ تمہیں یہ موقعہ دینگے اور تم مکہ پر قابض ہو جاؤ گے۔ لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں سے یہ وعدے ہوتے ہیں وہاں وہ اُن سے یہ بھی اُمید کرتا ہے کہ وہ اس وعدے کو پُورا کرنے کی کوشش کرینگے یہ نہیں کہ خدا اُن سے وعدہ کرے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور اُس وعدہ کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں اور یہ سمجھ لیں کہ جب خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے تو وہ اُسے خود پورا کرے۔ ہمیں اُس کے پُورا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ اُسے کنعان کا ملک دیا جائیگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ساتھ لے کر

چل پڑے جب وہ ملک سامنے آگیا۔ تو آپ نے اپنی قوم سے کہا۔ جاؤ اور لڑائی کرکے اس ملک پر قبضہ کر لو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے غلطی سے یہ خیال کر لیا کہ خدا تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اس لئے وہ خود ہی اس وعدے کو پورا کرے گا اور یہ ملک ہمارے قبضہ میں دے دیگا۔ ہم نے اگر اس ملک کو فتح کیا تو پھر وعدے کا کیا فائدہ ہوا۔ وعدہ تو خدا نے کیا ہے اس لئے وہ اُسے خود پورا کرے۔ ہمیں اس کے لئے کسی قسم کی کوشش کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ اے موسیٰ! تو ہم سے کہا کرتا تھا کہ یہ ملک خدا تعالیٰ نے ہمیں دے دیگا۔ اب تمام ذمہ داری تجھ پر ہے یا تیرے خدا پر۔ ہم نے اگر ملک فتح کیا تو پھر تیرے اور تیرے خدا کے وعدوں کا کیا فائدہ۔ چونکہ تو ہمیں بتایا کرتا تھا کہ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ یہ ملک ہمیں ضرور ملیگا اسلئے اب تو اور تیرا رب دونو جاکر لڑو۔ ہم یہیں بیٹھیں گے۔ جب تم ملک فتح کرکے ہمیں دے دوگے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ اب بظاہر ان کا کہنا درست معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سے کہے کہ میں تمہیں فلاں چیز دونگا۔ اور وہ اُس سے آکر وہ چیز مانگے اور وہ آگے سے کہدے کہ جاؤ بازار سے خرید لو تو سارے لوگ یہی کہیں گے کہ اگر اُس نے وہ چیز بازار سے ہی خریدنی تھی تو پھر اُس کے ساتھ وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پس بظاہر یہ بات معقول نظر آتی ہے لیکن الٰہی سلسلوں میں یہ اوّل درجہ کی غیر معقول بات ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی تعریف نہیں کی۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ تمہیں لڑنے کی ضرورت نہیں یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم یہ ملک لے کر تمہیں دیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم نے ہماری ہتک کی ہے اس لئے تمہیں اس ملک سے محروم کیا جاتا ہے۔ جاؤ چالیس سال تک جنگلوں میں بھٹکتے پھرو۔ تم اس ملک کے وارث نہیں بن سکتے۔ تمہاری نئی نسل اس ملک کی وارث ہوگی۔ کیونکہ تم نے ہماری ہتک کی ہے۔ تو دیکھو یہ چیز انسانی لحاظ سے تو درست اور معقول کہلا سکتی ہے لیکن الٰہی سلسلہ کے لحاظ سے نہایت ہی غیر معقول ہے اور انسان کو عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی انسان وعدہ کرتا ہے تو اُسے تغیرات سماوی اور تغیرات ارضیہ پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس لئے جب بھی وہ وعدہ کرتا ہے۔ تو ایسی چیز کا کرتا ہے جو اس کے اختیار میں ہوتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے جو وعدہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اگرچہ اس چیز کا حصول تمہارے لئے ناممکن ہے مگر یہ تمہیں ہماری مدد سے حاصل ہو جائیگی۔ وہ قوم جو فرعون کی سینکڑوں سال تک غلام رہی۔ اُس کیلئے اینٹیں بناتی رہی لکڑیاں کاٹتی رہی اور ذلیل سے ذلیل کام کرتی رہی وہ اتنے بڑے عظیم الشان ملک پر جس پر جابر قوم حکمران تھی کیسے قبضہ کر سکتی تھی۔ اُسے یہ ملک مل جانا آسان نہیں تھا۔ لیکن خدا نے کہا کہ گو یہ ملک حاصل کرنا تمہیں ناممکن نظر آتا ہے لیکن ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم یہ ملک تمہیں دینگے۔ اور تم یہ ملک ہماری مدد سے حاصل کر لو گے۔ پس خدا تعالیٰ کے وعدے کے یہ معنے نہیں ہوا کرتے کہ چونکہ اس نے وعدہ کر دیا ہے۔ اس لئے بندے کو کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تم اس چیز کو حاصل کرنے کے لئے تدبیر اختیار کروگے تو خدا تعالیٰ تمہاری مدد کریگا اور تم کامیاب ہو جاؤگے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے وعدے اور رنگ کے ہوتے ہیں اور بندے کے وعدے اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے وہ وعدے جن میں تدبیر شامل ہوتی ہے بندے کو ان میں دخل دینا پڑتا ہے اور اُن کو پورا کرنے کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر بندہ ان میں دخل نہیں دیگا اور اُن کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کریگا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ لیکن بندے کے وعدہ میں یہ نہیں ہوتا۔ بندہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارے لئے خدا تعالیٰ کی

تقدیر بدل دونگا۔ کیونکہ ... اُس کے اختیار میں نہیں ہوتی۔
اگر وہ ایسا کہیگا تو ہم اُس سے پوچھیں گے کہ تم تقدیر کو بدلنے
والے کون ہو۔ لیکن خدا تعالیٰ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر تم ایسا کروگے
تو میں تمہاری مدد کرونگا اور اپنی تقدیر کو بدل دونگا۔ کیونکہ
تقدیر ایسی چیز ہے جو اس کے قبضہ میں ہے اور وہ جب
چاہے اُسے بدل سکتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کو فتح مکہ کا وعدہ دیا گیا۔ تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ کہا
گیا کہ اے مسلمانو! تم موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہ سمجھ لینا
کہ خدا نے مکہ دے دینے کا وعدہ کیا ہے وہ خود اُسے
پورا کریگا۔ ہمیں اس کے لئے تدبیر کرنے کی ضرورت نہیں
بلکہ تمہیں بھی اس کے پورا کرنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔
خدائی وعدے کے یہ معنے ہیں کہ تم کمزور ہو۔ اگر تم کمزور نہ
ہوتے تو تم مکہ کو چھوڑ کر کیوں آتے۔ مکہ کو چھوڑنے کے
معنے ہی یہ تھے کہ تم کمزور ہو اور تمہارا دشمن مضبوط اور
طاقتور ہے لیکن خدا تعالیٰ تمہیں طاقت دیگا اور تم دشمن سے مکہ
چھین لوگے۔ پس وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے معنے یہ ہوئے کہ تم جہاں سے
بھی نکلو یا جس جگہ سے بھی نکلو تمہارا مقصد یہ ہونا چاہیئے
کہ ہم نے مکہ فتح کرنا ہے۔

پھر خروج کے معنے جیسا کہ حل لغات میں بتایا
جا چکا ہے لشکر کشی کے بھی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں آیت
کے یہ معنے ہونگے کہ تم جہاں بھی لشکر کشی کرو۔ کسی جگہ بھی لڑائی
کے لئے جاؤ۔ چاہے تم مشرق کی طرف نکلو یا جنوب کی طرف
نکلو۔ مغرب کی طرف نکلو یا شمال کی طرف نکلو تمہارا مقصد
یہ ہونا چاہیئے کہ تمہارا یہ خروج فتح مکہ کی بنیاد قائم
کرنیوالا ہو۔ مثلاً تم اگر جنوب کی طرف دشمن پر حملہ کرنا چاہو لیکن
تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس ملک کے مغرب کی طرف اس کے
دوست موجود ہیں اور ان کے متعلق یہ شبہ ہے کہ وہ کہیں پیچھے
سے حملہ نہ کر دیں۔ اور تم پہلے مغرب کی طرف حملہ کرکے اُنکو
صاف کر لو۔ تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ یہ مغرب کی طرف حملہ
اصل میں جنوب کے حملہ کا پیش خیمہ ہے۔ اسی طرح اگر اس
قوم کے ساتھی شمال میں بستے ہوں اور پہلے تم اُن پر حملہ کرو
تو تمہارا یہ حملہ اصل میں جنوب پر ہی ہوگا کیونکہ اصل مقصد
تمہارا جنوب کے دشمن پر حملہ کرنا ہوگا۔ اسی امر کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اے مسلمانو! تم
کسی قوم کسی ملک اور کسی علاقے پر چڑھائی کرو تمہارا رُخ
مکہ کی طرف ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے
ہاتھوں پر فتح کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ جب ہم آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم
ہوتا ہے کہ ان میں یہ رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔
اور آپکی سب لڑائیوں کا مقصد اعلیٰ فتح مکہ ہی تھا۔ جس
جنگ میں آپ یہ مقصد فوت ہوتا دیکھتے یا جس قوم کے متعلق
آپ محسوس فرماتے کہ اس سے جنگ کرنے کے نتیجہ میں فتح مکہ
میں تاخیر ہو جائیگی۔ وہاں باوجود اکسائے جانے کے آپ
خاموشی اور چشم پوشی اختیار فرماتے۔ چنانچہ کئی قومیں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لئے اُٹھیں اور انہوں نے
چھیڑ چھاڑ بھی کی۔ مگر آپ ہمیشہ اغماض سے کام لیتے رہے
لیکن جب کوئی ایسی قوم کھڑی ہوئی جس کو شکست دینے
سے فتح مکہ قریب ہو سکتی تھی تو اُس کے ساتھ آپ نے ضرور
جنگ کی۔ اگر تمام اسلامی غزوات پر نظر دوڑائی جائے۔
تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے اندر ایک حکیمانہ رنگ رکھتی تھیں
بالخصوص فتح مکہ سے پہلے جسقدر جنگیں ہوئیں۔ اُن سب
کا مقصد صرف یہی تھا کہ فتح مکہ کا راستہ صاف کیا
جائے۔ اگر اس آیت کے یہ معنے ہوتے کہ تم جہاں سے بھی
نکلو قبلہ کی طرف اپنا منہ کرو تو جیسا کہ بتایا جا چکا ہے
مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے الفاظ اس آیت میں نہ ہوتے
بلکہ ان الفاظ کی بجائے یہ الفاظ ہوتے کہ تم جہاں کہیں ہو
قبلہ کی طرف اپنا منہ رکھو۔ قبلہ کی طرف منہ کرنے کے لئے

جہاں کہیں کے الفاظ ہونے چاہیئے تھے۔ نہ یہ کہ تم جہاں سے بھی نکلو قبلہ کی طرف اپنا مُنہ پھیر دو۔ کیونکہ لوگ کہیں سے نکلتے وقت نمازیں نہیں پڑھا کرتے۔ نکلتے وقت تو لوگ چلا کرتے ہیں۔ پس اس آیت کا نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ تم جہاں سے بھی نکلو۔ چاہے تم اس مقام سے نکلو جس کا مُنہ مشرق کی طرف ہو۔ چاہے اس مقام سے نکلو جس کا مُنہ مغرب کی طرف ہو۔ چاہے اس مقام سے نکلو جس کا منہ شمال کی طرف ہو چاہے اس مقام سے نکلو جس کا مُنہ جنوب کی طرف ہو بہرحال تمہارا مُنہ مکّہ کی طرف ہونا چاہیئے۔ یعنی تمہاری توجہ اور تمہارا خیال اور تمہارا ذہن صرف اسی بات کی طرف رہنا چاہیئے کہ تم نے مکّہ فتح کرنا ہے۔ اور وہاں اسلام کو قائم کر کے سارے عرب کو زیرِ اثر لانا ہے۔ "وُجُوہ" کے معنے توجہات کے بھی ہوتے ہیں۔ پس اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا ایک ہی مقصد ہونا چاہیئے کہ تم نے خانہ کعبہ کو فتح کر کے اُسے اسلام کا مرکز بنانا ہے۔ کیونکہ جب تک مکّہ میں اسلام پھیل نہیں جاتا۔ جب تک مکّہ مسلمانوں کے ماتحت نہیں آجاتا۔ اس وقت تک باقی تمام عرب مسلمان نہیں ہو سکتا۔ یہ پروگرام تھا جو مسلمانوں کا مقرر کیا گیا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پروگرام ان کی طاقت سے بہت بالا تھا۔ بے شک عرب کی حکومت کوئی منظم حکومت نہ تھی گروہ طوائف الملوکی بھی نہیں تھی۔ مختلف بادشاہ اس کے ساتھ تعلق رکھتے اور معاہدات وغیرہ کرتے تھے۔ اسی طرح مکّہ گو پوری طرح منظم نہ ہو مگر بہرحال وہ ایک ایسے ملک کا دار الحکومت تھا جس کی آبادی پندرہ بیس لاکھ تھی۔ اور گرد کے تمام قبائل کی نگاہیں اس کی طرف اٹھتی تھیں اور وہ اُس کے فیصلوں اور حکموں کو واجب الاطاعت سمجھتے تھے۔ پھر اُس زمانہ کے لحاظ سے وہ ایک بہت بڑا شہر تھا۔ پندرہ سولہ ہزار اس کی آبادی تھی۔ اور نہ صرف اس کی تمام آبادی بلکہ ملک بھر کے پندرہ بیس لاکھ آدمی سب کے سب سپاہی تھے۔ فنونِ جنگ میں بہت بڑی مہارت رکھتے تھے۔ جنگجو بہادر اور لڑاکے تھے۔ اور مسلمانوں کے لیئے اُن کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا جس وقت یہ آیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اُسوقت مسلمانوں میں صرف چار پانچسو سپاہی تھے۔ زیادہ سے زیادہ ہزار سمجھ لو۔ اور عورتوں اور بچوں وغیرہ کو ملا کر ان کی کل تعداد گیارہ بارہ ہزار ہوگی۔ اس سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد نہیں تھی۔ اور اُن کی جنگی طاقت تو بہرحال ناقابلِ ذکر تھی۔ مگر ایسی حالت میں جبکہ مسلمان سخت کمزور تھے۔ جب اُن کی تعداد کفّار کے مقابلے میں کوئی نسبت ہی نہیں رکھتی تھی۔ جب اُن کے پاس لڑائی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اور جب اُن کی جنگی طاقت کفّار کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی تھی اللہ تعالےٰ تمام کفّار کو چیلنج دیتا ہے کہ یہ مسلمان گو تمہیں تھوڑے دکھائی دیتے ہیں۔ تمہیں کمزور اور ناطاقت نظر آتے ہیں۔ مگر یہی مسلمان ایک دن تمہارے ملک کو فتح کرینگے۔ تمہارے دار الحکومت پر قابض ہونگے اور وہاں ان کو اسقدر غلبہ میسر آجائیگا کہ یہ اسلام کے احکام کو وہاں جاری کرینگے اور کفر کو عرب کی سرزمین سے بالکل مٹا دینگے۔ یہ دعویٰ مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے ایک مجنونانہ دعویٰ تھا اور پھر یہ دعویٰ ایسا تھا جو کسی خاص علاقہ سے مخصوص نہیں تھا۔ بلکہ اس دعویٰ کا اثر وسیع سے وسیع تر تھا کیونکہ نہ صرف اس میں مکّہ کو فتح کرنے کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ نہ صرف عرب پر غالب آجانے کا اعلان کیا گیا تھا بلکہ عیسائیت کو بھی چیلنج دیا گیا تھا۔ یہودیت کو بھی چیلنج دیا گیا تھا۔ مجوسیت کو بھی چیلنج دیا گیا تھا۔ اور بڑے زور سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ان تمام مذاہب کو شکست دے کر اسلام ساری دنیا پر غالب آجائیگا۔ یہ دعویٰ

ایک مجنونانہ دعویٰ تھا۔ اسی وجہ سے کفار رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پاگل کہا کرتے تھے اور صحابہؓ کو بھی وہ پاگل سمجھتے تھے کیونکہ وہ ایک ایسا دعویٰ کر رہے تھے جس کے پورا ہونے کے اس مادی دنیا میں انہیں کوئی اسباب نظر نہیں آتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک غیر معمولی کاموں کے لئے ہر انسان کے اندر وہ حالت پیدا نہ ہو جائے جسے بعض حالتوں میں طب مالیخولیا کہتی ہے۔ جب تک وہ اور تمام مقاصد کو مجبول نہ جائے۔ جب تک اس کے اندر ہر وقت ایک غلش اور بے تابی نہ پائی جائے اور جب تک غیر معمولی کاموں کے لئے اس کے اندر جنون کا سا رنگ پیدا نہ ہو جائے اُس وقت تک ان کاموں میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اسی کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ تم باقی تمام مقاصد کو بھول جاؤ اور صرف اس مقصد کو اپنے سامنے رکھو کہ ہم نے مکہ کو اسلام کے لئے فتح کرنا ہے۔ جب تک یہ مرکز اور یہ قلعہ تمہیں حاصل نہیں ہوگا سارے عرب اور پھر ساری دنیا پر تمہیں غلبہ میسر نہیں آ سکیگا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا کہ تم جس جگہ سے بھی نکلو اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف رکھو۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ تم جس طرف بھی حملہ کرو اپنی توجہ مسجد حرام کی طرف رکھو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خروج کے وقت ہی یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ہمارا اس حملہ سے کیا مقصد ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ انسان لڑائی تو پہلے شروع کر دے اور اس کا مقصد بعد میں سوچے۔ پس چونکہ یہاں فتح مکہ کے مقصد کو سامنے رکھنے کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا اس لئے فرمایا کہ تم نکلتے وقت یہ دیکھ لیا کرو کہ ہماری اِس جنگ کا اثر فتح مکہ پر کیا پڑے گا۔ اگر وہ جنگ فتح مکہ میں ممد نہ ہو تو اُسے چھوڑ دو۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو جارحانہ جنگ کی اجازت دیتا ہے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ان آیات کے نزول سے پہلے ہی کفار سے جنگیں شروع ہو چکی تھیں۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد اس رنگ میں فتح مکہ کی ضرورت باقی نہیں رہنی تھی کیونکہ آپؐ کے بعد مکہ پر کوئی حملہ نہیں ہونا تھا بلکہ اُس نے کامل طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں ہی رہنا تھا۔ گویا اس میں آئندہ کے لئے یہ پیشگوئی کر دی کہ مکہ مکرمہ کی دوبارہ جسمانی فتح نہیں ہوگی کیونکہ مکہ کی عظمت قائم کرنے والی ایک فعّال جماعت پیدا کر دی جائیگی۔ اور وہ ہمیشہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں رہیگا۔

وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ۔ فرماتا ہے کہ یہ بات تو تیرے رب کی طرف سے ہو کر رہنے والی ہے۔ ان آیات کے نزول کا زمانہ ہجرت کے سولہ ماہ بعد کا ہے۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکلات ابھی کامل طور پر دُور نہیں ہوئی تھیں۔ اور ابھی کامل طور پر آپ کا رعب اور دبدبہ اور حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ ایسی صورت میں بظاہر یہ ایک ہنسی کی بات تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ فتح کریں گے۔ اِس لئے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ باتیں بنانے والے اور مخالفین وغیرہ بے شک استہزاء سے کام لیں۔ یہ بات تیرے رب کی طرف سے ہو کر رہے گی اور اُن کو بھی توجہ دلائی ہے کہ تم لوگ اِس کو ناممکن خیال کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس پیشگوئی کو پورا کر کے دکھا دیگا۔ پھر یہ فقرہ اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ انسان جنگ سے ڈرتا اور گھبراتا ہے۔ اُسے یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ معلوم نہیں فتح نصیب ہوگی یا شکست۔ لیکن جہت مخصوصہ کی طرف ہر وقت متوجہ رہنا انسان کی ہمّت کو بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوتی۔ یہ آیت اس کے لئے تسلّی کا موجب ہو جاتی کہ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ بات تمہارے رب کی طرف سے ہو کر رہنے والی ہے۔

اور وہ اس کام میں تمہارا حامی اور مددگار ہوگا۔ اسی طرح رَبِّكَ کہکر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر کام کے کچھ محرک ہوا کرتے ہیں۔ اور بہترین محرک کسی کام کا یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات کا احساس ہو کہ میرا محسن مجھ سے یہ خواہش رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بسا اوقات اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ تمہیں بھی یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ تمہارا رب جو تمہارا محسن ہے اُس کی یہ خواہش ہے کہ تم مکہ کو فتح کرو۔ پس گو یہ بات ایک دن پوری ہو کر رہے گی۔ مگر محسن کے احسان کا بدلہ اتارنا بھی تمہارا کام ہے اسلئے تمہیں اس کے متعلق اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیئے اور اس عظیم الشان مقصد کے حصول کے لئے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ تمہیں سزا دیگا۔ بلکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیوں کو دیکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اسلام اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک مکہ فتح نہ ہو جائے اسلئے تم اپنی کوشش اور جدوجہد کو جاری رکھو اور فتح مکہ کو کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کو ضائع نہیں ہونے دیگا۔ اس میں مسلمانوں کو قربانیوں کے لئے اُبھارا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری قربانیوں کو دیکھتا ہے مگر تمہارے انعام اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم مکہ فتح نہ کر لو۔ سو کوشش کرو کہ مکہ جلد فتح ہو جائے۔ اس میں جتنی دیر ہو گی اتنی ہی تمہاری ترقی پیچھے پڑ جائیگی۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ۔ یورپین مستشرق کہتے ہیں کہ اس جگہ قرآنی آیات میں تکرار پایا جاتا ہے۔ جو فصاحت کے خلاف ہے۔ جب اس سے پہلے غیر مبہم الفاظ میں یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تو اس کے معاً بعد پھر انہی الفاظ کا کیوں تکرار کیا گیا ہے۔ اِس اعتراض کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ مخالفین اسلام کی اتنی بات تو درست ہے کہ ان دونوں آیات کے معنوں میں کوئی فرق نہیں لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان دونوں کو ایک ہی غرض کے ماتحت بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان دونوں کے بیان کرنے کی اغراض مختلف ہیں۔ اگر دونوں جگہ ایک ہی غرض کام کر رہی ہوتی تو پھر تو بے شک تکرار کا اعتراض درست ہوتا لیکن جب کسی نئی غرض کیلئے پہلے کلام کو دہرایا جائے تو وہ حُسنِ کلام کے منافی نہیں ہوتا۔ صرف وہ تکرار قابلِ اعتراض ہوتا ہے جو بغیر غرض اور فائدہ کے ہو۔ لیکن اگر ایک حکم کو بیان کیا جائے اور پھر اس کے دہرانے کی کوئی نئی غرض پیدا ہو جائے تو اُسے تکرار نہیں کہا جاتا۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ہم بعض دفعہ مجلس میں کہتے ہیں "بیٹھ جاؤ" پھر تھوڑی دیر کے بعد کہتے ہیں "بیٹھ جاؤ"۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد کہتے ہیں "بیٹھ جاؤ"۔ اب بظاہر ان الفاظ میں تکرار نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم پہلی مرتبہ یہ الفاظ کہتے ہیں تو ہمارے مخاطب وہ تمام لوگ ہوتے ہیں جو اُس وقت کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن جب دوبارہ یہی الفاظ کہتے ہیں تو وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو ابھی تک نہیں بیٹھے ہوتے۔ اور جب ہم تیسری دفعہ کہتے ہیں تو پانچ دس لوگ مخاطب ہوتے ہیں جو ابھی تک کھڑے ہوتے ہیں۔ اب یہاں ایک جملے کا کئی دفعہ بولنا غیر فصیح نہیں اور نہ ہی اسے تکرار کہا جاتا ہے بلکہ ہر فقرہ اپنی ذات میں الگ الگ غرض کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی تکرار نہیں کیونکہ یہاں خدا تعالیٰ کا دوسری دفعہ وہی فقرہ لانا اپنے اندر ایک نئی حکمت رکھتا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں تو صرف یہ بتایا تھا کہ تمہاری لڑائیوں کا نقطۂ مرکزی مکہ کی فتح ہونا چاہیئے اور دوسری آیت میں فتح مکہ اور تحویلِ قبلہ کے بارہ میں دو تو

حکموں کو جمع کرکے اُن کی وجہ بتائی ہے اور وہ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ہے۔ اور حجت سوائے اِس کے کہ کوئی قرینہ ہو ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو غالب کر دینے والی ہو۔ پس یہ تکرار نہیں بلکہ فقرہ مکمل ہی نہیں ہوسکتا تھا جب تک کہ یہ دونوں باتیں دہرائی نہ جائیں۔ یعنی مکہ فتح نہ ہوا تب بھی تم پر لوگوں کی حجت ہوگی۔ اور اگر ادھر مُنہ نہ کیا تب بھی حجت ہوگی۔ پس اِس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر تم نے مکہ فتح نہ کیا تو تمہاری ترقی کے راستہ میں کئی قسم کی روکیں پیدا ہو جائینگی۔ اور اسلام پر دشمنوں کے اعتراضات کا دروازہ کھلا رہیگا۔ غرض دونوں آیات الگ الگ مقاصد رکھتی ہیں۔ اور دوسری جگہ اُس مضمون کو جسے پہلی آیت میں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا تھا وسیع کر دیا گیا ہے۔ اور اُن فوائد کو واضح کیا گیا ہے جو فتح مکہ اور تحویلِ قبلہ کے ساتھ وابستہ تھے۔

اِسی طرح دوسری آیت میں دنیا کے تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا فرض ہے کہ تم خانہ کعبہ کی حفاظت کرو۔ اور اُسے دشمنوں کے حملوں سے بچاؤ۔ یہ مضمون پہلی آیت میں نہیں تھا پس گو اس آیت میں بھی فتح مکہ کا ہی ذکر ہے مگر پھر بھی اسے تکرار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں نئے اسلوب اور نئے انداز سے فتح مکہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسکے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔

پھر ایک اور نقطۂ نگاہ بھی تکرار کے اعتراض کو باطل ثابت کرتا ہے اور وہ یہ کہ پہلی آیت اُن اعلیٰ درجہ کے لوگوں کیلئے ہے جو اخلاقی اور رُوحانی لحاظ سے دوسرے لوگوں سے بہت بڑھے ہوئے اور اپنے اندر خاص نوعیت رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ آیت ایسے لوگوں کے لئے ہے جو اخلاق اور روحانیت کے لحاظ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات میں مدغم ہیں۔ اور کامل طور پر آپکے ظلّ کہلا سکتے ہیں۔ ایسے وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا نہیں بلکہ آپ میں ہی شامل ہوتے ہیں اس لئے اُن کا ذکر آپ سے علیحدہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ لوگ ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے متعلق یہ علم تھا کہ ان کیلئے اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کہہ دینا ہی کافی محرک ہو سکتا ہے چنانچہ اگر غور سے کام لیا جائے تو دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو ادنیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے انسانوں کے لئے باریک باتیں ہی کافی محرک ہو جاتی ہیں لیکن ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے قریب کا محرک کام کرتا ہے۔ مثلاً اعلیٰ درجہ کے لوگ جب نماز پڑھتے ہیں۔ تو وہ اس بات کو اپنے دل کے کسی گوشہ میں بھی نہیں لاتے کہ انکو نماز کے بدلہ میں کیا ملیگا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری نماز خدا تعالیٰ کے احسانات کے شکریہ کے طور پر ہے۔ کسی جزا کے لئے نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر پہلے ہی کیا کم احسانات ہیں کہ ہم نماز پڑھ کر اُس سے بدلہ کی خواہش رکھیں۔ وہ لوگ اسی کو بہت بڑا احسان اور اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتے ہیں کہ اُس نے ہمیں اپنے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ لیکن اس کے مقابل پر ادنیٰ درجہ کے لوگ اگر چند دن بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور اس کے بعد انکو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جھٹ کہنے لگ جاتے ہیں کہ نماز میں کیا رکھا ہے۔ ہم نے تو نمازیں پڑھ پڑھ کر دیکھ لیا ہے کہ ان میں کچھ بھی نہیں۔ ایسے لوگ سودے کے طور پر نمازیں پڑھتے ہیں یہ لوگ بھول جاتے ہیں اس بات کو کہ انکی پیدائش سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن کی ماں کے دل میں محبت رکھی۔ وہ اِس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش کے ساتھ ہی انکی ماں کی چھاتیوں سے دودھ کے چشمے جاری کر دیئے تھے۔ اور وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی پیدائش کے ساتھ ہی اُن کے باپ کے دل میں رأفت پیدا کر دی تھی اور اُسے روزی کمانے کی توفیق دی۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دینی و دنیوی ترقی کے لئے انہیں ناک کان آنکھیں دل اور دماغ وغیرہ عطا فرمائے ہیں۔ وہ اِس بات کو بھی

قبول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کے قیام کے لئے سورج چاند ستارے آگ ہوا پانی زمین اور غذائیں وغیرہ پیدا کی ہیں۔ وہ اس بات کو بھی قبول جاتے ہیں کہ یہ سب انعامات کسی عمل کے نتیجہ میں نہیں ملے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے نتیجہ میں ملے ہیں۔ غرض ایک طرف تو بعض لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے اور دوسری طرف ایسے انسان بھی ہیں جو اپنے دل میں بدلے کا خیال تک نہیں لاتے۔ وہ سوالی بنکر اللہ تعالیٰ سے اپنی ضرورت کے مطابق مانگ تو لیتے ہیں مگر اپنے عمل کے بدلہ میں انعام کے طالب نہیں ہوتے۔ یہ لوگ نماز روزہ زکوٰۃ حج اور غریب پروری کے بدلے میں اللہ تعالیٰ سے انعام کے طالب نہیں ہوتے بلکہ اسی کو وہ لوگ انعام سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انکو شکریہ ادا کرنیکا موقعہ اور توفیق عطا فرمائی۔ یہ لوگ کنگال ہو کر بھی اپنے عمل کے بدلہ میں کسی انعام کے طالب نہیں ہوتے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے مانگنا پسند کرتے ہیں مگر عمل کے بدلہ میں انعام طلب نہیں کرتے۔ میں نے کئی دفعہ ایک بزرگ کا واقعہ سنایا ہے جو متواتر تیس سال ایک ہی دعا کرتے رہے اور ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ اس عرصہ میں ان کا ایک مرید بھی آ گیا۔ وہ بزرگ رات کو اٹھ کر دعا مانگ رہے تھے کہ انہیں الہام ہوا کہ تمہاری یہ دعا قبول نہیں ہوگی۔ یہ الہام ان کے مرید نے بھی سن لیا مگر وہ شرم کے مارے چپ رہا۔ اور اس نے زبان سے کچھ نہ کہا دوسری رات پھر اس بزرگ نے دعا کی تو پھر الہام ہوا کہ تمہاری یہ دعا قبول نہیں ہوگی اور ساتھ ہی مرید کو بھی اس کا پتہ لگ گیا۔ مگر وہ پھر بھی شرم کے مارے چپ رہا تیسری رات پھر وہ بزرگ مصلے پر بیٹھے ہوئے تھے کہ الہام ہوا۔ تمہاری یہ دعا قبول نہیں ہوگی۔ اور مرید نے بھی یہ آواز سن لی۔ وہ خاموش نہ رہ سکا اور اس نے کہا کہ ایک دفعہ دعا قبول نہ ہو یا دو دفعہ قبول نہ ہو تو کوئی بات نہیں مگر آپ کو تو کئی بار کہا گیا کہ یہ دعا قبول نہیں ہو سکتی مگر پھر بھی آپ مانگتے چلے جاتے ہیں۔ اس بزرگ نے کہا کہ تم تو ابھی سے تھک گئے ہو۔ میں تو یہ دعا تیس سال سے متواتر کر رہا ہوں اور تیس سال سے ہی مجھے یہ جواب مل رہا ہے۔ لیکن پھر بھی میں مانگتا چلا جاتا ہوں۔ لیکن تم تین دن ہی یہ آواز سنکر کہتے ہو کہ بس کرو۔ میرا کام اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا کام ماننا اور قبول کرنا ہے میں اپنا کام کرتا جاؤنگا اللہ تعالیٰ اپنا کریگا۔ وہ مانے یا نہ مانے اسکا اپنا اختیار ہے۔ پس اعلیٰ درجہ کے لوگ گھبراتے نہیں۔ وہ اعمال بجا لاتے ہیں مگر اس کے بدلے میں انعام کے طالب نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کیلئے اِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کہنا ہی کافی تھا۔ یعنی تمہارے رب کی یہ خواہش ہے کہ تم ایسا کرو۔ لیکن دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اعلیٰ ایمان والے نہیں۔ یہ لوگ چونکہ کام کرنے سے پہلے یہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں کیا ملیگا۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے بھی اس کا ذکر کر دیا کہ فتح مکہ کے نتیجہ میں ان پر کیا کیا انعامات نازل ہونگے۔ چنانچہ فرمایا:۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ۔ یہ حکم تمہیں اس لئے دیا گیا ہے تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ مل جائے۔ یعنی اگر تم مکہ فتح کرنے کے لئے نکلو گے تو سب سے پہلا انعام تم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ ہوگا کہ آئندہ تم پر لوگ اعتراض نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی تمہارے خلاف کوئی دلیل قائم کر سکیں گے۔

دوسرا انعام جو ادنیٰ درجہ کے لوگوں کیلئے بیان کیا گیا ہے وہ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي ہے۔ یعنی اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تمہیں حکومت اور بادشاہت عطا فرمادیگا۔ اس کا بیان کرنا صرف ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لئے ہی ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ کے لوگ ان باتوں کی پروا نہیں کرتے کہ ان کو کچھ ملیگا بھی یا نہیں۔

تیسرا انعام لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ کے الفاظ میں بیان

فرمایا کہ اس کی غرض یہ ہے کہ تم ہدایت پاؤ۔ ہدایت دراصل مقصود تک پہنچنے کو کہتے ہیں۔ پس ان الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو مل جاؤ گے۔ پہلے تم میں سے خاوند اپنی بیوی سے۔ بیوی اپنے خاوند سے۔ بیٹا اپنے باپ سے اور باپ اپنے بیٹے سے جُدا تھا اب مکہ کی طرف نکلنے میں تمہارا یہ بھی فائدہ ہے کہ تم اُنکو مل جاؤ گے۔ اور وہ سارا جھگڑا جس کے باعث تم ایک دوسرے سے جُدا تھے دُور ہو جائیگا۔ پس ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے لیے جو کام کرنے سے پہلے یہ پوچھتے ہیں کہ اس میں فائدہ کیا ہے اللہ تعالےٰ نے تین قسم کے انعامات بیان فرمائے ہیں۔ (۱) لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ (۲) وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ (۳) لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

پہلا انعام ذہنی ہے اس کے ذریعہ انسان کو دماغی طور پر اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ دوسرا انعام مادی ہے یعنی حکومت اور بادشاہت تم کو مل جائیگی۔ تیسرا انعام دل کے اطمینان کیلئے ہے کہ جب تم رشتہ داروں کو مل جاؤ گے تو تم کو اطمینانِ قلب حاصل ہو جائیگا۔ غرض پہلا حکم اور غرض سے ہے اور دوسرا اور غرض سے پہلے تو جنگ کا ذکر تھا اور اس کی غرض یہ بتائی تھی کہ اِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ یعنی خدا کا چونکہ وعدہ ہے اس لئے اپنے محبوب کے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے تمہیں کوشش کرنی چاہیئے۔ گویا ایک اعلیٰ غرض بتائی جو صرف کامل الایمان لوگوں کے سامنے ہوتی ہے مگر ساتھ ہی فرما دیا کہ جس طرح تمہارا اعلیٰ مقصد یہ ہو کہ ہمیں انعامات سے کیا تعلق ہے ہم نے تو اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنی ہے اور اُس کی مرضی کو پورا کرنا ہے۔ اسی طرح میرا اعلیٰ تعلق بھی تو یہ ہے کہ مَیں تمہارے اعمال سے غافل نہ رہوں اور کسی عمل کو ضائع نہ جانے دوں یعنی جب تم کوشش کرو گے تو میری غیرت بھی جوش میں آئیگی اور مَیں اعلیٰ سے اعلیٰ برکات تم پر نازل کرونگا۔ اس کے بعد دوسری دفعہ اس حکم کو اُن لوگوں کے لئے دہرایا ہے جو ایمان کے لحاظ سے اس اعلیٰ مقام پر فائز نہیں تھے جس پر پہلا گروہ قائم تھا اور بتایا کہ فتح مکّہ کے نتیجہ میں یہ تین فائدے تمہیں حاصل ہونگے۔ اوّل دشمن کا اعتراض جاتا رہیگا۔ دوّم فتح دنیوی حاصل ہو کر تمہیں امن میسّر آجائیگا۔ سوّم تمہارے وہ عزیز اور رشتہ دار جو اب بوجہ اختلاف مذہب تم سے جدا ہیں وہ تمہارے ساتھ آملیں گے۔ گویا روحانی مادی اور قلبی تینوں قسم کے آرام تمہیں نصیب ہو جائینگے پس چونکہ اسجگہ پہلی غرض کی نسبت ادنیٰ فوائد مذکور تھے اور پہلی جماعت کی نسبت ایک کمزور جماعت کو شامل کرنا مقصود تھا اس لئے اس کو الگ بیان کیا۔ اور چونکہ یہی فوائد پہلی جماعت کو بھی ملنے والے تھے اسلئے اس کو بھی ساتھ شامل کر دیا پس یہ تکرار نہیں بلکہ دوسری آیت میں ان کمزوروں کا ذکر کیا گیا ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے کامل ظل نہ تھے اور پہلے حکم میں شامل نہ ہو سکتے تھے اور پھر اُن کے لئے وہ فوائد بیان کئے جو اُن کے شایانِ شان تھے اور ساتھ ہی پہلوں کو بھی شامل کر لیا کیونکہ اُنکو بھی وہ چیزیں ملنے والی تھیں۔ اگر انہیں شامل نہ کیا جاتا تو یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ جب یہ انعامات ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو ملینگے تو کیا اعلیٰ درجہ کے لوگ ان انعامات سے محروم رہیں گے؟ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے ٹکڑہ میں ان کامل الایمان لوگوں کا ذکر کر دیا اور بتا دیا کہ گو وہ انعامات کے لالچ میں کوئی کام نہیں کرتے مگر جہانتک ان فوائد کا تعلق ہے جو فتح مکّہ سے وابستہ ہیں وہ اُن سے محروم نہیں رہیں گے بلکہ جس طرح دوسرے لوگ فائدہ اُٹھائینگے اسی طرح وہ بھی فائدہ اُٹھائیں گے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسجگہ حَيْثُ مَا خَرَجْتُمْ نہیں بلکہ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فرمایا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض کمزور اور معذور لوگ بھی تھے جن کی جسمانی کمزوریاں اُن کے نکلنے میں مانع تھیں جیسے لنگڑے یا اپاہج وغیرہ پس ان کو مدّنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے

حَیۡثُ مَاخَرَجۡتُمۡ کی بجائے حَیۡثُ مَاکُنۡتُمۡ کے الفاظ استعمال فرما کر یہ ظاہر کیا کہ اس ثواب میں صرف وہی لوگ شریک نہیں ہونگے جو خروج کی طاقت رکھتے ہیں بلکہ وہ بیمار جو چار پائیوں سے ہل نہیں سکتے۔ وہ اپاہج جو چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے وہ بیمار اور کمزور جو اپنی بیماری اور کمزوری جسم کی وجہ سے لڑائی کے ناقابل ہیں اگر وہ فتح مکّہ کے لئے دُعائیں کرتے رہتے ہیں اور اُن کے دل اس حسرت سے پُر ہیں کہ کاش اُن میں طاقت ہوتی اور وہ بھی جنگ میں شریک ہوسکتے تو اللہ تعالیٰ اُن کے اجر کو ضائع نہیں کریگا اور ان کو بھی ویسا ہی ثواب دیا جائیگا جیسے عملی طور پر جنگ میں حصّہ لینے والوں کو دیا جاتا ہے۔ غرض کمزور اور معذور لوگوں کو جو صدمہ ہوتا ہے کہ ہم اس ثواب سے محروم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس صدمہ کو دُور کرنے کے لئے وَحَیۡثُ مَاکُنۡتُمۡ کے الفاظ استعمال فرمادئے تاکہ ان کو تسلّی ہو جائے کہ ہم بھی اس میں شامل ہیں۔ ایک اپاہج اور کمزور آدمی جنگ میں شامل نہیں ہوسکتا۔ مگر وہ رات دن دُعائیں کرسکتا ہے کہ یا اللہ! مسلمانوں کو فتح دے اور انہیں مکّہ میں فاتحانہ طور پر داخل فرما یا اگر اُس کے پاس کوئی غیر مسلم آجاتا ہے اور وہ اُسے تبلیغ کرکے مسلمان بنالیتا ہے تو وہ بھی ایسا ہی سمجھا جائیگا جیسے عملی طور پر جنگ میں شامل ہونے والا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حَیۡثُ مَاخَرَجۡتُمۡ نہیں بلکہ حَیۡثُ مَاکُنۡتُمۡ فرمایا ہے اور یا پھر اس میں اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کو بھی شامل کر لیا ہے جب جنگ نہ ہو۔ اور ہدایت دی ہے کہ جب جنگ کو نکلو تب بھی اور جب گھروں میں ہو تب بھی مکّہ کی فتح کو اپنی آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہونے دو۔ اسی طرح ان الفاظ میں مسلمانوں کو اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ تم جہاں کہیں ہو تمہارا مُنہ ہمیشہ مکّہ ہی کی طرف رہنا چاہیئے۔ یعنی تمہیں ہمیشہ اپنے مرکز کی ترقی اور وہاں کے رہنے والوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے اور یہ امر مدّ نظر رکھنا چاہیئے کہ اگر مکّہ مکرّمہ میں کوئی خرابی پیدا ہوئی تو اس کا سارے عالم اسلام پر اثر پڑیگا اور اگر مکّہ کی ترقی ہوئی تو اس کا اثر بھی تمام عالم اسلام پر پڑیگا۔ کیونکہ لوگوں نے وہاں بار بار حج اور عمرہ کے لئے جانا ہے اور دنیا کے کناروں سے وہاں اکٹھا ہونا ہے۔ پس تمہیں کوشش کرنی چاہیئے کہ وہاں کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ اگر وہاں خرابی پیدا ہوئی تو لازماً ساری دنیا پر اس کا اثر پڑے گا چنانچہ دیکھ لو۔ اس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق اب تک بعض مخالف یہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو اپنے دعوے میں کس طرح سچا سمجھیں جبکہ مکّہ کے علماء نے بھی آپؑ پر کفر کے فتوے لگائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مکّہ والوں کی اصلاح کی طرف توجہ رکھنا کس قدر ضروری ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیت اللہ کبھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں نہیں جاسکتا۔ مگر اُس پر شیطانی حملے تو ہر وقت ہوسکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کے رہنے والوں میں بھی کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ پس اس آیت میں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ اے مسلمانو! تم خواہ دنیا کے کسی گوشہ میں رہتے ہو تمہیں ہمیشہ مکّہ کی طرف اپنی توجہ رکھنی چاہیئے اور اس کی اصلاح اور ترقی کی کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ افسوس ہے کہ گزشتہ دَور میں مسلمانوں نے اس اہم فرض کو نظر انداز کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اُن میں بھی کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ مَیں جب اسلامی تاریخ کو پڑھتا ہوں تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ مکّہ اور مدینہ کی آبادی تو چند ہزار یا ایک لاکھ کے ارد گرد گھومتی رہی۔ مگر بغداد۔ دمشق اور قاہرہ کی آبادی اور ایران اور ہندوستان کے اسلامی شہروں کی آبادیاں بیس بیس لاکھ تک پہنچ گئیں۔ مَیں سمجھتا ہوں اسلام کے تنزل میں اس بات کا بھی بڑا دخل تھا کہ مسلمانوں میں اپنے مذہبی مرکز میں بسنے کی خواہش اتنی نہ رہی جتنی خواہش انہیں دارالحکومت میں بسنے کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنیاد چھوٹی رہی اور عمارت بڑی ہوگئی۔ اور چھوٹی بنیاد پر بڑی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر انسان کے اندر بعض خوبیاں

بھی ہوتی ہیں اور بعض برائیاں بھی۔ اگر وہ بعض غلطیاں کرجاتا ہے تو وہ بعض اچھی باتیں بھی کرتا ہے۔ ہٹلر جو جرمنی کا سابق لیڈر تھا اور جس نے اپنی قوم کی ترقی کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ اگر اس کے اندر اسلام ہوتا تو وہ یقیناً بہت بڑا آدمی ہوتا مگر بوجہ اس کے کہ اس کی تربیت کرنیوالا مذہب نہیں تھا۔ وہ بہت سی غلطیوں کا شکار ہوا۔ اور وہ قوم کو ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے اُسے تنزل میں دھکیلنے کا موجب ہوگیا۔ وہ چونکہ انجنیئر تھا اس لئے تعمیر سے تعلق رکھنے والی باتیں اُس کیلئے زیادہ نصیحت کا موجب ہوا کرتی تھیں۔ اُس نے اپنی کتاب "مائنے کامف" میں جس میں وہ اپنا پروگرام پیش کرتا ہے لکھا ہے اور اس بات پر لمبی بحث کی ہے کہ یورپ میں اگر کوئی قوم بڑھنے کا حق رکھتی ہے تو وہ صرف جرمن قوم ہے اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ جو بڑی عمارت ہو وہ بڑی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔ تم اگر چار فٹ چوڑی بنیاد رکھو اور اس پر چھ فٹ چوڑی دیوار بنا دو تو دیوار گر جائیگی۔ لیکن اگر دس فٹ بنیاد رکھو اور تین فٹ چوڑی دیوار بناؤ تو وہ زیادہ مضبوط ہوگی۔ مضبوط عمارتیں بنانے کے لئے ضروری ہے کہ بنیادیں چوڑی رکھی جائیں۔ سَو مربع فٹ میں عمارت کھڑی کرنی ہو تو سوا سَو مربع فٹ میں بنیاد رکھنی چاہیئے۔ چنانچہ دیکھ لو اہرام مصر ہزاروں سال سے کھڑے ہیں۔ جس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مثلث شکل میں بنائے گئے ہیں۔ اُن کی چوٹی صرف چند مربع گز کی ہے لیکن بنیاد ہزاروں مربع گز میں ہے۔ یہ عمارتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی سینکڑوں سال قبل کی بنی ہوئی ہیں اور کسی نے اُن کی مرمت تک نہیں کی۔ لیکن وہ اب تک قائم ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مثلث شکل میں بنائی گئی ہیں۔ نیچے بنیادیں پچاس پچاس ایکڑ زمین میں ہیں۔ اور اوپر چوٹی صرف چند مربع گز کی ہے۔ بوجہ توازن کے ساتھ قائم رہتا ہے اور عمارتیں گرتی نہیں۔ ہٹلر کہتا ہے کہ جرمن اور ملکوں سے بڑا ہے۔ اسکی آبادی آٹھ کروڑ ہے۔ انگلینڈ کی آبادی چار کروڑ ہے۔ سپین کی آبادی چار کروڑ ہے۔ فرانس کی آبادی چار کروڑ ہے۔ اٹلی کی آبادی چار کروڑ ہے۔ اگر یہ ممالک پھیلنا شروع کریں تو چار کروڑ سے اوپر نکل کر انکی طاقت کمزور ہو جائیگی اور باہر کی آبادیاں اُن سے طاقتور ہونے لگیں گی۔ لیکن جرمن کی بنیاد بڑی ہے اور اس کا خیال تھا کہ اس بنیاد کو بڑا کرنے کے لئے روس کے بھی چند حصّے لے لئے جائیں تاکہ دوسرے ممالک کو جب فتح کیا جائے تو وہ اس کے حصّے بن سکیں اس پر غالب نہ آسکیں۔ مگر یہ گُر مسلمانوں نے نہیں پہچانا۔ حالانکہ قرآن کریم نے انہیں یہ گُر بتا دیا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف خانہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھوائی اور دوسری طرف حکم دیدیا کہ لوگ چاروں طرف سے یہاں آئیں اور حج کریں۔ اسی طرح عمرہ کا حکم دیا اور اس طرح انہیں سال کے سارے حصوں میں مکہ آنے کی طرف توجہ دلائی۔ اسی طرح مدینہ کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر جگہ کے رہنے والے اپنے نمائندے مدینے بھیجا کریں۔ تا وہ یہاں رہ کر دینی تعلیم حاصل کریں۔ مگر مسلمانوں نے اس گُر کو نہ سمجھا اور ان کا ہر سیاسی مرکز مذہبی مرکز سے زیادہ آباد رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا کثیر طبقہ سیاسی مرکز کی طرف جاتا تھا اور مذہبی مرکز کمزور رہتا تھا۔ میرے نزدیک اسلام کو اتنا نقصان اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا جتنا نقصان قاہرہ دمشق اور بغداد نے پہنچایا یا جتنا نقصان اصفہان اور دہلی نے پہنچایا۔ یا جتنا نقصان بخارا اور مرو نے پہنچایا۔ ان شہروں نے لوگوں کی توجہ مذہبی مراکز سے ہٹا کر اپنی طرف کرلی۔ اگر سب سے بڑے شہر مکہ اور مدینہ ہوتے تو یہ خرابی پیدا نہ ہوتی۔ یونیورسٹیاں بغداد میں بنیں۔ حالانکہ اُن کا صحیح مقام مدینہ تھا۔ جامعہ ازہر قاہرہ میں بنا۔ حالانکہ اس کا صحیح مقام مکہ تھا۔ پس

جو قوم اپنی روحانیت اور علمی طاقت کو پھیلانا چاہتی ہے اُس کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کا مرکز زیادہ سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو۔ اسی امر کی طرف حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ میں اشارہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم ہمیشہ اپنی توجہ مکہ کی طرف رکھو اور وہاں کے رہنے والوں کی اصلاح کی کوشش کرتے رہو۔ کیونکہ مکہ مرکزِ حج اور عمرہ اور دوسرے دینی اغراض و مقاصد کے لئے جمع ہونے کی جگہ ہے۔ اگر وہاں فساد ہوا یا لوگ اچھے نہ رہے تو وہاں آنے والے بھی بُرا اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ درحقیقت مرکز جتنا زیادہ مضبوط ہو اسی قدر جماعت کی تنظیم مضبوط ہوتی ہے اور جماعت روحانی لحاظ سے بھی ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ پس باہر کے لوگوں کو مرکز کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ اور مرکز والوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہیئے۔ اور ہمیشہ نیکی اور روحانیت میں ترقی کرنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ۔ اس کے بعد فرماتا ہے۔ ہمارے ان احکام کی غرض یہ ہے کہ کفار کو کوئی ایسی دلیل نہ مل جائے جس کی وجہ سے تمہیں ان کے مقابلہ میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔ بے شک روحانی لوگوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں اگر لوگ اعتراض کرتے ہیں تو بے شک کریں ہمیں ان کے اعتراضوں کی کیا پروا ہے مگر جو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہوتے ہیں اُن کے لئے یہ بڑی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ ہم پر فلاں اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح وہ بعض دفعہ بزدل ہو کر ملحد ہو جاتے ہیں۔ اُن کو فرمایا۔ اچھا ہم تمہارے سپرد یہ کام کرتے ہیں۔ تم اسے محنت کے ساتھ سرانجام دو۔ تاکہ دشمنوں کی طرف سے تم پر کوئی الزام باقی نہ رہے۔ یہ الزام پانچ وجوہ کی بنا پر لگایا جا سکتا تھا۔

اوّل یہود کی کتب میں لکھا تھا کہ آنے والا موعود دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکہ کو فتح کریگا۔ اگر مسلمان مکہ فتح نہ کرتے تو یہود کہہ سکتے تھے کہ یہ پیشگوئی اس نبی کے ذریعہ پوری نہیں ہوئی۔ اسلئے ہم اسے کس طرح مان لیں۔ (۲) پھر وہ یہ بھی اعتراض کر سکتے تھے کہ اس بارہ میں خود قرآن کریم کی پیشگوئیاں بھی غلط گئیں۔ مثلاً قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کہا تھا۔ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (قصص آیت ۸۶) یعنی وہ خدا جس نے تجھ پر یہ قرآن فرض کیا ہے اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ تجھے اس مقام کی طرف ضرور لوٹا کر لائیگا۔ جس کی طرف لوگ حج اور عمرہ کے لئے بار بار لوٹ کر آتے ہیں۔ پس اگر مکہ فتح نہ ہوتا تو مخالفینِ اسلام کو اس اعتراض کا موقعہ ملتا کہ علاوہ تورات کی پیشگوئی کے خود قرآن کریم کی وہ پیشگوئیاں بھی پوری نہ ہوئیں جو فتح مکہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ (۳) اگر تحویلِ قبلہ نہ ہوتی تو یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس نبی کے لئے دُعا کی تھی اس کا تعلق تو بیت اللہ سے ضروری تھا اور اُس نے اس گھر کی آبادی کے لئے آنا تھا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک غیر جگہ پر بیٹھا ہے اور کعبہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر ہم یہ کیونکر سمجھیں کہ وہ دعائے ابراہیمی کا مصداق ہے۔ (۴) اگر مکہ فتح نہ ہوتا تو لوگ اعتراض کر سکتے تھے کہ اس نبی کی غرض تو توحید پھیلانا تھی مگر خانہ کعبہ میں تو تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے ہیں پھر یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوئی کہ وہ اس گھر کو پاک کریگا۔ (۵) اگر مکہ فتح نہ ہوتا تو يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ والی پیشگوئی کے پورا نہ ہونے پر بھی اعتراض ہوتا اور کہا جاتا کہ اس رسول نے تو مکہ کے لوگوں کی اصلاح کرنی تھی پھر یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوئی؟ غرض اگر فتح مکہ یا اصلاحِ مکہ نہ ہوتی تو دشمن کے لئے کئی قسم کے اعتراضات کا موقعہ تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ حکم دیدیا کہ تم مکہ فتح کرو۔ اور یہ خیال رکھو کہ وہاں کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ ورنہ دشمن کے ہاتھ میں ایسی دلیل آ جائیگی جس کا تم کوئی جواب نہیں دے سکوگے۔ ہاں اگر تم مکہ فتح کر لو تو پھر اُسکا منہ بند ہو جائیگا اور وہ تم پر کوئی اعتراض نہیں کر سکیگا۔

إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۔ یہ استثناء متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی ۔ اگر متصل مانا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تم مکہ کو فتح کرو تاکہ لوگوں کی طرف سے تم پر کوئی الزام نہ رہے سوائے اُن لوگوں کے جو ظالم ہیں یعنی وہ لوگ تو پھر بھی شرارتوں میں حصّہ لیتے رہیں گے ۔ اور باتیں بناتے رہیں گے مگر ان کی وہ باتیں قابلِ اعتناء نہیں ہونگی ۔ اور اگر حجّت کے معنے غلبہ کے کئے جائیں تو پھر یہ استثناء منقطع ہوگا ۔ اور اس کے معنے یہ ہونگے کہ جو لوگ ان میں سے ظالم ہیں تم اُن سے مت ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ہی ڈرو کیونکہ تمہارے غلبہ کی وجہ سے وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے ۔

(۲) عربی زبان میں اِلَّا کے معنے وَلٰکِنْ کے بھی ہوتے ہیں ۔ جیسے کہتے ہیں مَالَكَ عَلَيَّ حُجَّةٌ اِلَّا اَنْ تَظْلِمَنِيْ یعنی تجھے میرے خلاف کسی قسم کی کوئی حجّت حاصل نہیں ہاں اگر تو مجھ پر ظلم کرے تو یہ علیحدہ بات ہے ۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یوں ہونگے کہ فتح مکہ کے بعد لوگوں کے ہاتھ میں کوئی حجّت تو نہیں رہیگی لیکن اگر وہ پھر بھی اعتراض کریں گے تو ظلماً ہی کریں گے ورنہ اس میں کوئی معقولیت نہیں ہوگی ۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے اِلَّا واوِ عاطفہ کے معنے بھی دیتا ہے اور مابعد کو پہلے کے ساتھ شریک کرتا ہے اِس لحاظ سے اس کے معنے یہ ہونگے کہ وَلَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۔ یعنی فتح مکہ کے ذریعہ مخالفین اسلام پر ایسی حجّت ہو جائیگی کہ ظالموں کے مُنہ بھی بند ہو جائیں گے اور وہ بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکیں گے ۔

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ ۔ فرماتا ہے یہ حکم میں نے اس غرض کے لئے بھی دیا ہے تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کردوں ۔ اس جگہ نعمت سے مراد اسلام ہے اور اُس کے اتمام سے مراد اُسے مستحکم طور پر قائم کر دینا ہے

یہ پروگرام بھی فتح مکہ کی اغراض میں سے تھا ۔ چنانچہ جونہی مکہ فتح ہؤا ۔ تمام عرب سے وفود آنے شروع ہو گئے ۔ اور صلح کا ہاتھ بڑھانے لگے ۔ آخر اسی فتح کے نتیجہ میں سارا عرب مسلمان ہو گیا ۔ اور پھر عربوں نے ایک قلیل ترین مدت میں ساری دنیا میں اسلام پھیلا دیا ۔ اور وہ نعمتِ اسلام جو خدا تعالٰے نے بنی نوع انسان کے لئے نازل فرمائی تھی دنیا میں مستحکم طور پر قائم ہو گئی ۔

پھر فرمایا وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ فتح مکہ کا ایک فائدہ تمہیں یہ بھی ہوگا کہ تم ہدایت پا جاؤ گے یعنی تمہاری قوم داخلِ اسلام ہو جائیگی اور اللہ تعالٰی اس کے لئے ہدایت کے دروازے کھول دے گا ۔ ورنہ بلحاظ افراد تو فتح مکہ سے پہلے ہی کئی لوگ ایمان لا چکے تھے ۔ مگر باقی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر اس نبی نے مکہ فتح کر لیا تو یہ اور اس کا مذہب سچا ہے اور اگر یہ مکہ فتح نہ کر سکا تو جھوٹا ہوگا ۔ چنانچہ جب فتح مکہ ہوئی تو عرب کی تمام اقوام سمجھ گئیں کہ اسلام سچا مذہب ہے ۔ اور اسلام قبول کرنے کے لئے دُور دُور سے وفود آنے شروع ہو گئے ۔ حتّٰی کہ اشد ترین دشمنوں میں سے بھی بعض فتح مکہ کے بعد بیعت میں داخل ہو گئے اس کی بیّن مثال ہمارے سامنے ہندہ کی ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے شدید ترین دشمنوں میں سے تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو سزا کے طور پر قتل کرنے کا حکم دیا تھا اُن میں وہ بھی شامل تھی ۔ مگر وہ بڑی ہوشیار عورت تھی ۔ گھر میں چھپ کر بیٹھ گئی اور باہر نہ نکلی جب عورتوں کی بیعت ہونے لگی تو چونکہ اُس وقت تک پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا ۔ اس لئے اُس نے بھی چادر اوڑھ لی اور اُن کے ساتھ شامل ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کیلئے آگئی ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم نہ تھا کہ ان عورتوں میں ہندہ بھی موجود ہے ۔ آپ نے بیعت لیتے وقت یہ فقرہ فرمایا ۔ کہ کہو ہم شرک نہیں کرینگی ۔ اس پر ہندہ جھٹ بول اٹھی کہ یا رسول اللہ ! کیا اب بھی ہم شرک کر سکتی ہیں ۔ آپ اکیلے تھے اور مقابل پر آپ کی ساری قوم

اور تمام عرب مع اپنے بُتوں کے تھے جن سے وہ بزعم خود مدد لیتے تھے۔ لیکن آپ نے اکیلے ہونے کے باوجود اپنے ایک معبود کی مدد سے مکّہ فتح کر لیا۔ اب کیسے ممکن ہے کہ ہم شرک کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سُنکر فرمایا۔ کیا ہِندہ ہے۔ ہِندہ فوراً بول اٹھی کہ یا رسول اللہ! اب آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ اب مَیں آپ کی بیعت کر چکی ہوں۔ غرض فتح مکّہ ایک ایسا نشان تھا کہ جس کو دیکھتے ہوئے ہِندہ جیسی شدید دشمن عورت نے بھی سمجھ لیا کہ اب سچائی بالکل عیاں ہو گئی ہے۔

دوسری وجہ اقوام عرب کے اسلام قبول کرنے کی یہ تھی کہ عرب کے لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ مکّہ کو کوئی جھوٹے مذہب والا آدمی فتح نہیں کر سکتا اور اگر کوئی کوشش کریگا تو تباہ ہو جائیگا اور اس کی تائید میں اُن کے سامنے ایک تازہ واقعہ بھی موجود تھا۔ اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے پہلے یمن کے گورنر ابرہہ نے مکّہ فتح کرنے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود ایک کثیر فوج اپنے ساتھ رکھنے کے ناکام رہا۔ اور آخر اس کی فوج میں ایسی وبا پھیلی کہ تمام فوج تباہ ہو گئی اور وہ ناکامی اور نامرادی کی حالت میں واپس چلا گیا۔ غرض عرب کے رہنے والے چونکہ قریب کے زمانہ میں اس بات کا تجربہ کر چکے تھے کہ بیت اللہ کی اللہ تعالیٰ حفاظت کر رہا ہے اور کوئی شخص اسے بزور فتح نہیں کر سکتا۔ اس لئے جب آپ نے مکّہ والوں کو مغلوب کر لیا تو اس کامیابی نے انہیں یقین دلا دیا کہ یہ شخص سچا ہے اور اس کا مذہب بھی سچا ہے اور وہ جوق در جوق آپ پر ایمان لے آئے۔ بخاری کی ایک حدیث جو حضرت عمرو بن سلمہ سے مروی ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے لوگ فتح مکّہ کے منتظر تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ كَانَتِ الْعَرَبُ تَلَوَّمُ بِإِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُولُونَ اُتْرُكُوهُ وَقَوْمَهُ فَإِنَّهُ إِنْ ظَهَرَ عَلَيْهِمْ فَهُوَ نَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّا كَانَتْ وَقْعَةُ اَهْلِ الْفَتْحِ بَادَرَ كُلُّ قَوْمٍ بِإِسْلَامِهِمْ (بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح) یعنی عرب لوگ فتح مکّہ کا انتظار کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اے لوگو! اس نبی اور اس کی قوم کو چھوڑ دو۔ اگر یہ نبی ان لوگوں پر غالب آگیا تو پھر یہ ضرور سچا ہے۔ چنانچہ جب مکّہ فتح ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم پر غالب آگئے تو ہر قوم نے دوڑتے ہوئے اسلام کو قبول کر لیا۔ اور وفود در وفود لوگ بیعت میں داخل ہو گئے۔

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ تمہاری قوم کا اسلام لانا فتح مکّہ کے ساتھ وابستہ ہے جب مکّہ فتح ہو گیا تو تمہاری ساری قوم اسلام میں داخل ہو جائیگی۔ پھر جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ فتح مکّہ کے نتیجہ میں تمہیں اپنے رشتہ دار اور دوست سب مل جائینگے اور آپس کی لڑائیاں اور تفرقہ دور ہو جائیگا۔ گویا تین قسم کے انعامات تم پر نازل ہونگے :-

اوّل۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ۔ تمہیں فتح مکّہ کے بعد ذہنی طور پر اطمینان حاصل ہو جائے گا۔ اور دشمن کا مونہہ ہر قسم کے اعتراضات سے بند ہو جائیگا۔

دوم۔ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ۔ یہ مادی انعام ہے کہ تمہیں حکومت مل جائیگی۔ بادشاہت تمہارے ہاتھ میں آ جائیگی۔ اور اسلام مستحکم طور پر پہلے عرب اور پھر عرب سے نکل کر ساری دنیا میں قائم ہو جائے گا۔

سوم لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ اس میں قلبی انعام کا ذکر کیا کہ رشتہ داروں کی جدائی کی وجہ سے جو تمہارے دلوں میں بے اطمینانی اور اضطراب ہے وہ بھی دور ہو جائیگا۔ اور تمہاری قوم بھی اسلام میں داخل ہو جائیگی۔ غرض بتایا کہ یہ تین قسم کے انعامات تمہیں ملیں گے۔ کیونکہ وہ لوگ جو روحانیت میں اعلیٰ مقام نہیں رکھتے بالعموم پوچھا کرتے ہیں کہ اگر

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا

(اُسی طرح) جس طرح ہم نے تم میں تمہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سُناتا ہے۔

وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ

اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے

ہم نے فلاں کام کیا تو ہمیں کیا ملے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تین قسم کے انعامات تمہیں اس کے بدلہ میں ملیں گے۔ اور پہلے گروہ کو اس گروہ کے ساتھ اس لئے شامل کر لیا گیا ہے کہ یہ انعامات انہیں بھی ملنے والے تھے۔ ورنہ وہ کسی بدلہ کے لئے کام نہیں کرتے۔ اور نہ انہیں انعامات کی کوئی لالچ ہوتی ہے۔ وہ صرف اس لئے کام کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ پس یہ تکرار نہیں بلکہ ایک زائد مضمون بیان کرنے کے لئے اِسے دہرایا گیا ہے۔ اور یہ آیت بھی اپنے اندر فتح مکّہ کا ہی مضمون رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ سورۃ فتح میں فتح مکّہ کی جو اغراض بتائی گئی ہیں وہی اِس جگہ بھی بیان کی گئی ہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ (سورۃ فتح آیت ۲-۳)

یعنی ہم نے تجھے ایک کھلی کھلی فتح بخشی ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ تیرے متعلق کئے گئے وہ گناہ بھی جو پہلے گذر چکے ہیں ڈھانک دے گا اور جو ابھی تک ہوئے نہیں لیکن آئندہ ہونے کا امکان ہے اُن کو بھی ڈھانک دے گا۔ اور تجھ پر اپنی نعمت پوری کرے گا اور تجھے سیدھا راستہ دکھائے گا۔ اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ فتح مکّہ کی تین اغراض ہیں۔ اوّل دشمن کے اعتراضوں کو دُور کرنا۔ جیسے فرمایا۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ اِس جگہ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے اعتراضات ہی مراد ہیں۔ کیونکہ کبھی غیر کے خیال کو بھی دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ میرا قصور یہ ہے یعنی تمہارے خیال میں میرا قصور یہ ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ (شعراء ع ۲) اُن کے نزدیک مَیں نے ایک گناہ کیا ہے۔ پس لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کا مطلب یہ ہے کہ اِس پیشگوئی کے پورا ہونے سے دشمن جو تم پر اعتراض کیا کرتا تھا کہ جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اِس پر اللہ تعالیٰ پردہ ڈال دیگا اور وہ الزام دُور ہو جائیگا۔ اور صرف اِسی وقت نہیں بلکہ آئندہ بھی یہ دلیل ہمیشہ تجھ پر اعتراض کرنے والوں کے مُنہ بند کرتی رہے گی۔

فتح مکّہ کی دوسری غرض اتمامِ نعمت بتائی ہے اور تیسری غرض يَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا میں یہ بتائی کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت میں ترقی عطا فرمائیگا۔

یہی تین اغراض اِسجگہ بھی بیان فرمائی گئی ہیں اور کہا گیا ہے کہ تم مکّہ کو فتح کرو تاکہ دشمنوں کا تم پر کوئی

مَّا لَمْ تَكُونُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ؕ

جو تم (پہلے) نہیں جانتے تھے۔ ۶۶ھ

الزام نہ رہے۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ سورۃ فتح اور ان آیات کے تقابل سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی مضمون بیان کیا گیا ہے اور دونوں میں فتح مکّہ پر نعمت دینا اور اُس کے فوائد کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۶۶ھ حل لغات :۔ کَمَا کے ایک معنے تو وہ ہیں جو عام طور پر کئے جاتے ہیں یعنی "جیسا کہ" یہ مشابہت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے ایک دوسرے معنی لِمَا کے بھی ہیں یعنی "اسلئے" (محیط) جیسے ایک شاعر کہتا ہے ؎

لَا تَشْتُمِ النَّاسَ كَمَا لَا تُشْتَمُ

یعنی تو لوگوں کو گالی نہ دے اِس لئے کہ وہ تجھ کو گالی نہ دیں۔

تفسیر :۔ کَمَا کے معنے اگر "جیسا کہ" کے سمجھے جائیں تو اس آیت کے یہ معنے بنتے ہیں کہ جس نعمت کا پیچھے ذکر ہوا ہے اُس کا ہم تم پر ویسے ہی اتمام کریں گے جیسا کہ ہم نے تم میں اپنے اس رسول کو جو دعائے ابراہیمی کا موعود ہے بھیجکر اپنے احسان کو مکمل کیا ہے۔

درحقیقت ابراہیمی دُعا کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ تو اُن میں رسول بھیجنے کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ اور دوسرا حصّہ ایک پاکیزہ اور مقدس جماعت تیار کرنے کے متعلق تھا۔ ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ مطلب نہ تھا کہ رسول تو آجائے مگر قوم بے شک گمراہ ہی رہے یا رسول تو آجائے مگر قوم کو تقدیس حاصل نہ ہو۔ پس ضروری تھا کہ ابراہیمی دُعا کو پورا کرنے کے لئے جہاں رسول بھیجا گیا وہاں دُعا کے دوسرے حصّوں کو بھی پورا کیا جاتا اور ایک ایسی پاکیزہ جماعت قائم کی جاتی جو خدا تعالیٰ کے دین کے لئے ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ رہنے والی ہو۔

اور اگر کَمَا بمعنے لِمَا ہو تو اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ ہم نے یہ حکم تمہیں اس لئے دیا ہے کہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا ہے جو تمہیں میں سے ہے اور اُس کا کام یہ ہے کہ وہ تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے۔ اور اس طرح تم کو پاک کرتا اور مدارج عالیہ کی طرف بڑھاتا ہے اور تم کو شریعت سکھاتا ہے۔ اور پھر وہ احکامِ شریعت کی باریک در باریک حکمتوں اور پوشیدہ اسرار سے واقف کرتا ہے۔ اور صرف وہی تعلیم نہیں دیتا جو پہلے صحیفوں میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایسی تعلیم دیتا ہے جو تم لوگوں کو معلوم ہی نہیں تھی۔ پس تم لوگ میرا ذکر کرو تاکہ میں بھی تمہیں اپنے دربار میں جگہ دوں اور میرے انعامات پر جو اس رسول کے ذریعے تم پر کئے گئے ہیں شکر بجا لاتے رہو اور میری ناشکری نہ کرو۔

یُوں تو دنیا کے تمام مذاہب کی ابتدا انبیاءؑ کی ذات سے ہی ہوئی ہے لیکن کوئی مذہب بھی ایسا نہیں جس نے ایسے نبی کو پیش کیا ہو جو تمام امورِ دینیہ کی حکمتوں کو بیان کرنے کا مدعی ہو اور جسے تمام بنی نوع انسان کیلئے اُسوہ حسنہ کے طور پر پیش کیا گیا ہو۔ عیسائیت جو سب سے قریب کا مذہب ہے وہ تو مسیح کو ابن اللہ قرار دے کر اس قابل ہی نہیں چھوڑتی کہ اُس کے نقشِ قدم پر کوئی انسان چلے کیونکہ انسان خدا جیسا نہیں ہو سکتا۔ باقی رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سو تورات انہیں اُسوہ حسنہ کے طور پر پیش نہیں کرتی۔ نہ تورات اور انجیل حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو مذہبی حکمتوں کے بیان کرنیکا ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ لیکن قرآن کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کَمَا

کے متعلق فرماتا ہے یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ کہ یہ نبی تمہیں احکامِ الٰہیہ اور اس کی حکمتیں بتاتا ہے۔ پس اسلام ممتاز ہے اس بات میں کہ اس کا نبی دنیا کے لئے اُسوۂ حسنہ بھی ہے اور جبر سے اپنے احکام نہیں منواتا بلکہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اپنے اتباع کے ایمانوں کو مضبوط کرنے اور اُن کے جوش کو زیادہ کرنے کے لئے یہ بھی بتاتا ہے کہ اُس نے جو احکام دیئے ہیں اُن کے اندر ملّت افرادِ ملّت اور باقی نوعِ انسان کے لئے کیا کیا فوائد مخفی ہیں۔ یہ وہی دعائے ابراہیمی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے مگر اس میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں دو فرق ہیں جنہیں ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کے الفاظ یہ تھے کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (سورۃ بقرۃ آیت ۱۳۰) یعنی اے خدا! تو ان میں انہی سے ایک رسول بھیج جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سُنائے۔ انہیں کتاب کی تعلیم دے اِن پر احکامِ الٰہیہ کی حکمت واضح کرے۔ اور اِن کے نفوس کا تزکیہ کرے۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے تلاوتِ آیات پھر تعلیم کتاب پھر تعلیم حکمت اور پھر تزکیہ کو رکھا تھا۔ مگر یہاں پہلے تلاوتِ آیات پھر تزکیہ پھر تعلیم کتاب وحکمت کو بیان کیا گیا ہے۔ پس طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ دعائے ابراہیمی کی ترتیب اس اصول پر مبنی ہے کہ دنیا میں جب بھی خدا تعالیٰ کا کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ تلاوتِ آیات سے کام لیتا ہے یعنی اس وحی کو پیش کرتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔ اور اُن معجزات اور نشانات کو پیش کرتا ہے جو اُس کی تائید میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہوتے ہیں اس کے بعد آہستہ آہستہ احکام نازل ہوتے ہیں تو اُن احکام کی حکمتیں بیان کی جاتی ہیں اور آخر معجزات ونشانات دیکھنے دلائل وبراہین پر غور کرنے اور اُن کی حکمتوں کو سمجھ لینے کے بعد اللہ تعالےٰ اُس کی جماعت کو ایک تقدس عطا فرماتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ دوسروں پر غالب آجاتی ہے۔ مگر یہاں اللہ تعالےٰ نے ایک دوسری ترتیب کو مدِّنظر رکھا ہے۔ یعنی ایمانیات اور روحانیات سے تعلق رکھنے والی باتوں کو اُس نے پہلے لے لیا ہے اور علوم ظاہری سے تعلق رکھنے والی باتوں کو بعد میں بیان کر دیا ہے۔ تزکیہ چونکہ قلب سے تعلق رکھتا ہے اور تلاوت آیات بھی ایمان سے تعلق رکھتی ہے اس لئے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو لے لیا جو ایمانیات اور رُوحانیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ معرفت کے لحاظ سے سب سے پہلی چیز یہی ہے کہ انسان کو ایسی آنکھیں عطا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے نشانات کا مشاہدہ کرنے والی ہوں۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ ان نشانات کا مشاہدہ اُس کے اندر ایسا تزکیہ پیدا کر دے کہ اس کا دل خدا تعالیٰ کا عرش بن جائے۔ اور صفاتِ الٰہیہ اس کے آئینۂ قلب میں منعکس ہو جائیں۔ جب معرفت کا نور انسانی قلب کو ایسا جلا بخشتا ہے کہ اُس میں کوئی نفسانی کدورت اور آلائش باقی نہیں رہتی تو اس وقت وہ خدا کی صفات کا مظہر ہو جاتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہاں تلاوتِ آیات کے بعد تزکیۂ نفوس کو دوسرے امور پر مقدم رکھا ہے۔ تزکیہ کے بعد تعلیم کتاب اور حکمت کا ذکر فرمایا ہے جو ظاہری علوم سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور انہیں آخر میں رکھ کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ احکام اور اُن کی حکمتیں اصل مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود تزکیۂ نفس اور اللہ تعالیٰ کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا نبی کسی شخص کو آواز دے اور وہ جسے بلایا گیا ہو اُس وقت نماز بھی پڑھ رہا ہو تو اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اُسی وقت نماز توڑ دے اور خدا تعالیٰ کے نبی کی

خدمت میں حاضر ہو جائے کیونکہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا کامل
مظہر ہوتا ہے اور اُس کی آواز گویا خدا کی آواز ہوتی ہے۔ مجھے
یاد ہے ایک دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک شخص کو
آواز دی۔ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ اُس نے نماز
توڑ دی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ لوگوں نے اعتراض
کیا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص
نماز پڑھ رہا ہو اور خدا کا نبی اُسے بلائے تو وہ نماز بھی
توڑ سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ عنہ کو
بھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک دفعہ ایسی حالت
میں آواز دی جبکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے تو آپ نے بھی نماز
توڑ دی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے
حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ استدلال قرآن کریم کی اس
آیت سے کیا تھا کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ
وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (سورہ انفال آیت ۲۵)
یعنی اے مومنو! تم اللہ اور اس کے رسول کی بات سُننے کے لئے
فوراً حاضر ہو جایا کرو جبکہ وہ تمہیں زندہ کرنے کیلئے پکارے۔
غرض نماز اصل مقصود نہیں اور نہ ہی روزہ اور حج اور زکوٰۃ
وغیرہ مقصود ہیں۔ یہ سب ذرائع ہیں خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے۔
اور یہ سب ذرائع ہیں نفسِ انسانی کو ہر قسم کی روحانی آلائشوں سے
پاک کرنے کے۔ اگر کسی کا دل پاک نہیں تو خواہ زبان سے وہ
ہزار بار کتاب اللہ پر ایمان لانیکا دعویٰ کرے اس کا یہ دعویٰ
ایک رائی کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتا۔

تزکیہ کے بعد تعلیم کتاب اور حکمت میں بھی تعلیم کتاب کو
اس لئے مقدم رکھا گیا ہے کہ اعلیٰ ایمان والا شخص صرف یہ
دیکھتا ہے کہ آیا اُس کے محبوب نے فلاں کام کرنے کو کہا ہے
یا نہیں۔ اگر کہا ہو تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس کام کو اختیار کر
لیتا ہے۔ لیکن جو اعلیٰ ایمان نہیں رکھتا وہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے
یہ بتاؤ کہ اس کام کی غرض کیا ہے اور اس میں حکمت کیا ہے
جب تک مجھے اس کی حکمت نہ بتائی جائیگی میں عمل نہیں کرونگا

غرض ایک سچے اور مخلص مومن کیلئے صرف یہی کافی ہوتا ہے کہ
اُس کا رب اُسے حکم دے رہا ہے۔ وہ خدا کی آواز سُنتا
اور اُس کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ لیکن فلسفی حکمت کا سُراغ
لگاتا ہے اور جب تک اُس کا دماغ تسلّی نہ پائے اس کا دل
مطمئن نہیں ہوتا۔ ایک ماں کو اس کے بچہ کی خدمت کے لئے
اگر صرف دلائل دیئے جائیں اور کہا جائے کہ اگر تم خدمت
نہیں کرو گی تو گھر کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور یہ ہوگا
اور وہ ہوگا تو یہ دلائل اُس پر ایک منٹ کے لئے بھی اثر انداز
نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر خدمت کرتی ہے تو صرف اس جذبۂ
محبت کے ماتحت جو اس کے دل میں کام کر رہا ہوتا ہے۔
اسی لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ
ایمان العجائز ہی انسان کو ٹھوکروں سے بچاتا ہے۔ ورنہ
وہ لوگ جو عِلم و حجت سے کام لیتے ہیں اور قدم قدم پر
کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں حکم کیوں دیا گیا ہے
اور فلاں کام کرنے کو کیوں کہا گیا ہے وہ بسا اوقات ٹھوکر
کھا جاتے ہیں۔ اور اُن کا رہا سہا ایمان بھی ضائع ہو جاتا
ہے۔ لیکن کامل الایمان شخص اپنے ایمان کی بنیاد مشاہدہ پر
رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے دلائل کو تو سُن لیتا ہے مگر اُن کے
اعتراضات کا اثر قبول نہیں کرتا کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنی
روحانی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوتا ہے۔ منشی اروڑے خان
صاحب جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی تھے
اُن کا ایک لطیفہ مجھے یاد ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے
بعض لوگوں نے کہا کہ اگر تم مولوی ثناء اللہ صاحب کی ایک دفعہ
تقریر سُن لو تو تمہیں پتہ لگے کہ مرزا صاحب سچے ہیں یا نہیں
وہ کہنے لگے میں نے ایک دفعہ اُن کی تقریر سُنی۔ بعد میں لوگ
مجھ سے پوچھنے لگے۔ اب بتاؤ کیا اتنے دلائل کے بعد بھی
مرزا صاحب کو سچا سمجھا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ میں نے تو
مرزا صاحب کا مونہہ دیکھا ہوا ہے۔ اُن کا مونہہ دیکھنے کے
بعد اگر مولوی ثناء اللہ صاحب دو سال تک بھی میرے سامنے

تقریر کرتے ہیں۔ تب بھی اُن کی تقریر کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ جھوٹے کا مونہہ تھا۔ بے شک مجھے اُن کے اعتراضات کے جواب میں کوئی بات نہ آئے میں تو یہی کہونگا۔ کہ حضرت مرزا صاحب سچے ہیں۔ غرض حکمت کا معلوم ہونا ایک کامل مومن کے لئے ضروری نہیں ہوتا کیونکہ اُس کا ایمان عقل کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اِسی لئے اُسے احکام کی حکمت سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہاں جس کا ایمان صرف دلائل کی حد تک ہو اُسے حکمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ غرض ایمان کامل مشاہدہ کی بنا پر ہوتا ہے اور ایمان ناقص حکمت کی بنا پر۔ کامل الایمان لوگوں کے لئے تو تلاوتِ آیات اور تزکیہ ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ آیات کی حکمت اور اُس کی غرض معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ وہ نبی کی آواز کافی سمجھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے لئے دیوانہ وار کام شروع کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے کہ آپ نے دوران تقریر میں فرمایا۔ بیٹھ جاؤ۔ کیونکہ اُس وقت کناروں پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ اُس وقت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ گلی میں تھے۔ اور مسجد کی طرف آ رہے تھے جونہی یہ آواز آپ کے کان میں پہنچی آپ وہیں بیٹھ گئے اور پھر گھسٹتے گھسٹتے دروازہ کی طرف چل پڑے۔ یہ اچنبھے کی بات تھی کسی نے انہیں بچوں کی طرح گھسٹتے دیکھ کر کہا۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تو یہ تھا کہ اندر والے بیٹھ جائیں یہ مطلب تو نہیں تھا کہ گلی میں چلنے والے بھی بیٹھ جائیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ کہ اگر وہاں پہنچتے پہنچتے میری جان نکل جاتی تو میں خدا تعالیٰ کو کیا جواب دونگا کہ خدا تعالیٰ کے رسول کی طرف سے ایک آواز آئی تھی جس پر میں نے عمل نہ کیا۔ اب بظاہر یہ بات حکمت کے خلاف نظر آتی ہے مگر عشق کا رنگ ہی اَور ہوتا ہے۔ عاشق حکمتوں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ جو کچھ محبوب کہے اُسے ماننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ تو یاد رکھنا چاہیئے کہ حکمت تابع ہے تعلیم کے اور تعلیم تابع ہے تزکیہ کے اور تزکیہ تابع ہے آیات اللہ کے۔ اصل خدا تعالیٰ کی ذات ہے پھر اُس کا مقام ہے جو خدا نما ہو۔ پھر اُس سے اُتر کر وہ ذرائع ہیں جو انسان کو خدا نما بنانے والے ہیں۔ پھر اُن سے اُتر کر وہ محرکات ہیں جو لوگوں کو عمل کی ترغیب دلاتے ہیں۔ پس یہ ترتیب چھوٹے بڑے درجہ کے لحاظ سے ہے۔ لیکن دُعائے ابراہیمی میں اس ترتیب کو مدّنظر رکھا گیا ہے جس سے انسان ترقی کرتا ہے۔ چنانچہ پہلے اُسے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد فرائض بتائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فرائض کی حکمتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اور پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ جو لوگ ان باتوں پر عمل کریںگے انہیں تزکیہ حاصل ہو جائیگا۔

دُعائے ابراہیمی اور اس آیت میں دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں دُعا کے بعد کہا تھا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور اس جگہ ہے وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عزیز و حکیم صفات کے واسطہ سے دُعا کی تھی کہ جو کچھ میں مانگ رہا ہوں اپنے خیالات کے مطابق مانگ رہا ہوں۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُس وقت کی ضرورت کیا ہوگی۔ پس تُو اپنی طاقت اور حکمت سے کام لے کر جس چیز کی اُسوقت ضرورت ہو وہ دیجیئو۔ لیکن یہاں خدا تعالیٰ نے وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ فرما کر اِس دُعا کی قبولیت کا ذکر کر دیا۔ کہ ابراہیمؑ نے عزیز اور حکیم دو صفات کے واسطہ سے جو دعا مانگی تھی وہ پوری ہو گئی۔ اور نہ صرف یہ نبی وہ کام کر رہا ہے جو ابراہیمؑ نے کہے بلکہ ایسے رنگ میں کر رہا ہے کہ پہلے کسی نبی نے نہیں کئے۔ کیونکہ اِس زمانہ کی ضرورت ایسی ہی اعلیٰ درجہ کی تعلیم چاہتی تھی۔ پس دُعائے ابراہیمی کامل طور پر پوری ہو گئی۔

وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ رسول تم کو وہ کچھ سکھاتا ہے جو

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۳﴾ ع ۱۸ / ۲

پس (جب میں اسقدر فضل کرنیوالا ہوں تو) تم مجھے یاد رکھو۔ میں (بھی) تمہیں یاد کرتا رہونگا۔ اور میرے شکرگذار بنو اور میری ناشکری نہ کرو ؎۹۷

تم پہلے نہ جانتے تھے یعنی اس کی تعلیم صرف اُنہی اچھی تعلیمات پر مشتمل نہیں جو پہلی کُتب میں پائی جاتی ہیں بلکہ اس سے زائد اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو پہلے دنیا کو معلوم نہیں تھیں۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ اس امر کو محکمات اور متشابہات کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ سورۃ آل عمران میں فرماتا ہے کہ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (سورۃ آل عمران آیت ۸) یعنی تجھ پر جو کتاب نازل کی گئی ہے اس کی بعض آیتیں تو محکم ہیں جو اس کتاب کی جڑ ہیں۔ اور کچھ اور ہیں جو متشابہ ہیں۔ اس میں متشابہات سے مراد ▬ باتیں ہی ہیں جو پہلی تعلیموں سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً روزہ رکھنا۔ یہ حکم اپنی ذات میں متشابہ ہے کیونکہ یہ تعلیم پہلے بھی پائی جاتی تھی۔ اسی طرح قربانیوں کا حکم بھی متشابہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (سورۃ ▬ ع ۵) یعنی دنیا کی ہر قوم کے لئے ہم نے قربانی کا ایک طریق مقرر کیا تھا تاکہ وہ اُن جانوروں پر جو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بخشے ہیں اللہ کا نام لیں اور انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کریں۔ غرض قرآن کریم کی کچھ تعلیمیں تو ایسی ہیں جو پچھلی تعلیموں سے ملتی ہیں اور لازماً ملنی چاہئیں۔ مثلاً پہلے نبیوں نے کہا تھا کہ سچ بولا کرو۔ تو کیا قرآن یہ کہتا کہ سچ نہ بولا کرو جھوٹ بولا کرو؟ پس اس میں لازماً کچھ ایسی تعلیمیں ہیں جو پہلی تعلیموں سے ملتی ہیں۔ اور انہی کا نام متشابہات رکھا گیا ہے۔ لیکن کچھ تعلیمیں ایسی بھی ہیں جن میں اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں ایک یگانہ اور منفرد حیثیت رکھتا ہے اور وہی محکمات ہیں۔ اگر وہ تعلیمیں بھی جو موسیٰؑ اور عیسٰیؑ لائے محکم ہوتیں تو پھر قرآن کریم کے نزول کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پس يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ میں قرآن کریم کی اسی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ صرف وہی تعلیم نہیں دیتا جو پہلے صحیفوں میں پائی جاتی ہے بلکہ ایسی تعلیم بھی دیتا ہے جو اُن سے زائد ہے اور جو تمہیں پہلے معلوم نہیں تھی۔

۹۷ تفسیر - ذکر کے معنے یاد کرنے کے ہوتے ہیں لیکن ہر یاد ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی بلکہ الگ الگ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے۔ جس کے اندر طاقت نہیں ہوتی اُس کی یاد صرف تمنّا اور خواہش اور التجاء کا حکم رکھتی ہے۔ جیسے ایک شخص کا رشتہ دار دُور گیا ہُوا ہو۔ اور وہ اُس کو یاد کرے تو چونکہ اُس میں طاقت نہیں ہوتی کہ اُس کو بُلا سکے۔ خواہ بسبب احتیاج کے خواہ بسبب مصالح کے اس لئے یہ یاد صرف التجاء اور خواہش ہی ہوگی۔ یا ایک بچّہ جو گہوارے میں پڑا ہُوا اپنی ماں کو یاد کرتا اور روتا ہے تو اُس کی یاد بھی صرف اس تمنّا اور خواہش تک ہی محدود ہوتی ہے کہ اُس کی ماں اُس کے پاس آئے۔ اور اسے اپنی گود میں اُٹھالے۔ لیکن ایک یاد ایسے شخص کی ہوتی ہے جس میں کچھ طاقت تو ہوتی ہے لیکن پوری طاقت نہیں ہوتی۔ ایسا شخص اپنے مقصد کے حصول کے لئے کچھ کوشش بھی کرتا ہے۔ جیسے بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اُس وقت اپنی ماں کو یاد کرتا ہے تو وہ اپنی ماں سے ملنے کی صرف خواہش ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اس کے لئے کوشش بھی کرتا ہے۔ پھر ایک یاد وہ ہے جو بادشاہ کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور ▬ اپنی رعایا کے کسی فرد کو یاد کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اُس کی یاد التجاء نہیں ہوتی بلکہ ایک زبردست طاقت ہوتی ہے جس کے ذریعہ ▬ دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اُس کی یاد عملاً پوری ہو جاتی ہے۔ غرض جب ایک ادنیٰ آدمی

بڑے کو یاد کرے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ بڑا اُسے اپنے پاس بُلالے۔ سو یہ التجاء ہوتی ہے۔ لیکن جب بڑا آدمی ادنیٰ کو یاد کرے تو اس کے معنے اس کو بُلانے کے ہوتے ہیں کیونکہ اُس کے اندر ایک طاقت ہوتی ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (حٰمٓ آیت ۳۲) یعنی جنت میں جو کچھ تمہارا جی چاہیگا تم کو ملیگا اور جو کچھ تم مانگوگے وہ تم کو عطا کیا جائیگا۔ یہ خواہش بھی ایک طاقت اور قوت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ ادھر خواہش پیدا ہوگی اور اُدھر اللہ تعالیٰ اُس خواہش کو پورا کرنے کا سامان پیدا فرما دیگا۔ دنیا میں اگر کسی کو کہا جائے کہ بادشاہ سلامت تمہیں یاد کرتے ہیں تو کیا مجال ہے کہ وہ فوراً اپنا کام نہ چھوڑ دے اور بادشاہ کی ملاقات کے لئے نہ چل پڑے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں نہ گیا تو میری خیر نہیں۔ پس اس یاد میں ایک زبردست کشش اور طاقت ہوتی ہے اور جسے یاد کیا جاتا ہے وہ اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ پس اگر بادشاہ کی یاد عام یاد کے علاوہ معنی رکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد کے بھی اور معنے ہو سکتے ہیں۔ پس فَاذْكُرُونِي کے یہ معنے ہیں کہ تم میرے ملنے کی خواہش کرو مجھے یاد رکھو اور میرے قرب کے حصول کے لئے کوشش کرو اور جب تم ایسا کروگے تو أَذْكُرْكُمْ میں بھی تمہیں یاد کرونگا جس کے یہ معنے ہیں کہ تم میری طرف کھنچے چلے آؤگے میرے قرب کے دروازے تمہارے لئے کھل جائینگے۔ دنیا میں جب ایک معمولی بادشاہ بھی اس طرح یاد نہیں کرتا کہ وہ دوسرے کا نام لینا شروع کردے تو خدا تعالیٰ کی یاد کے یہ معنے کس طرح ہو سکتے ہیں کہ وہ اس کے نام کا وظیفہ پڑھنے لگ جائے۔ پس أَذْكُرْكُمْ کے یہ معنے ہیں کہ تم ہمارے حضور کھنچے چلے آؤگے اور ہمارے مقربین میں شامل ہو جاؤگے۔ یہ مراد نہیں کہ ہم تمہارا نام لینے لگ جائیں گے۔ عربی زبان میں بھی کہتے ہیں۔ کہ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ يَذْكُرُكَ یعنی امیرالمومنین آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ پُرانے زمانہ میں جب کسی کو پیغام دینا ہوتا تھا تو یہی الفاظ کہتے تھے۔ اور اس سے یہ مراد نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہے۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ تم فوراً اُٹھکے حضور پہنچ جاؤ۔ پس فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کے یہ معنے ہیں کہ تم میرا قرب حاصل کرنے کی پوری کوشش کرو۔ جب تمہاری محبت اپنے کمال کو پہنچ جائیگی تو اس کے نتیجہ میں میں بھی تمہیں اپنا قرب دے دونگا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بندہ کا ذکر عموماً تین قسم کا ہوتا ہے۔ اوّل کسی اچھی یا بُری بات کو دیکھکر خدا تعالیٰ کو یاد کر لینا۔ جیسے گناہ کی تحریک ہو تو أَسْتَغْفِرُ اللهَ کہنا۔ کوئی مصیبت پہنچے تو إِنَّا لِلَّهِ کہنا۔ خوشی کی خبر ملے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہنا۔ دوم دوسرے کی بات سُن کر اللہ تعالیٰ کو یاد کر لینا۔ جیسے کسی مصیبت زدہ کا واقعہ سُنا تو اُس کے لئے دُعا کی اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے اپنے فضل سے ہمیں اِس قسم کے مصائب سے بچا رکھا ہے۔ سوم خدا تعالیٰ کے متعلق باتیں کرنا۔ یعنی اپنی مجالس میں خدا تعالیٰ کے نام اور کام کے متعلق گفتگو کرنا۔ دشمنوں کے اعتراضات کا جواب دینا۔ اُس کے نام کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کرنا۔ اور بار بار اللہ تعالیٰ کے احسانات کا ذکر کرنا تاکہ اس کے نتیجہ میں (۱) خدا تعالیٰ کی صفات انسان کے دل پر نقش ہوں (۲) اور پھر وہ مٹیں نہیں بلکہ ہمیشہ قائم رہیں (۳) اور انسان کے ہر قول و عمل سے انکا ظہور ہو۔

پھر ذکر کے ایک معنے چونکہ عزت اور شہرت کے بھی ہوتے ہیں اس لئے أَذْكُرْكُمْ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں گے اور اس کے احکام پر عمل کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی انہیں عزت اور شہرت عطا فرمائیگا۔ اور آخرت میں بھی انہیں اپنے لازوال قرب سے نوازے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ صبر اور دُعا کے ذریعہ سے (اللہ کی) مدد مانگو۔ اللہ (تعالیٰ) یقیناً صابروں کے ساتھ ہوتا ہے ۶۸

پھر فرماتا ہے۔ وَاشْكُرُوْا لِيْ۔ تم میرا شکر کرو۔ یعنی تمہیں صرف اِس بات پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیئے کہ تم خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہو بلکہ تمہارا یہ کام بھی ہے کہ تم گذشتہ انعامات پر اُس کا شکر ادا کرتے رہو اور تمہارے اعمال اور تمہاری عبادات ان انعامات پر مبنی ہوں جو ہم پہلے تم پر کر چکے ہیں۔

وَلَا تَكْفُرُوْنِ اور ہم نے جو تم پر انعامات نازل کئے ہیں انکی ناقدری مت کرو۔ حدیثوں میں آتا ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایکدفعہ عورتوں کی نسبت فرمایا کہ وہ دوزخ میں مردوں کی نسبت زیادہ جائینگی۔ عورتوں نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؐ نے فرمایا اِس کی یہ وجہ ہے کہ تم میں ناشکری کا مرض زیادہ پایا جاتا ہے۔ ناشکری کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں اُن کو موقعہ اور محل پر استعمال نہ کیا جائے۔ خدا تعالیٰ نے کان اِس لئے دیئے ہیں کہ خدائے رحمٰن کی باتیں سُنی جائیں لیکن لوگ ان کو گناہ کی باتیں سُننے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ آنکھیں اُن کو اِس لئے دی گئی ہیں کہ وہ ان کے ذریعہ علم و عرفان حاصل کریں۔ مگر کوئی ان کے ذریعہ یہ دیکھتا ہے کہ فلاں کے پاس اتنی دولت کیوں ہے؟ اور کوئی کسی اور ناجائز جگہ پر انکو استعمال کرتا ہے۔ اِسی طرح زبان ان کو اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اُس سے اچھی گفتگو کریں۔ اور خدا تعالیٰ کا ذکر کریں مگر اُسے بُری اور ناپسندیدہ باتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گالیاں دیتے ہیں چغلخوری کرتے ہیں غیبت کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور اِس طرح خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کرتے ہیں۔ پس فرمایا کہ تم میری نعمتوں کی قدر کرو۔ اور جو انعامات میں نے تم پر کئے ہیں اُن کو عظمت کی نگاہ سے دیکھو اور یہ اقرار کرو کہ ہم ان انعامات کو صحیح طور پر استعمال کرینگے۔ ان کا غلط استعمال کر کے خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی بے حرمتی نہیں کرینگے۔

۶۸ حل لغات

:- اَلصَّبْرُ۔ صبر کے اصل معنے تو رُکنے کے ہیں۔ مگر اس لفظ کے استعمال کے لحاظ سے اِس کے مختلف معانی ہیں۔ چنانچہ اس کے ایک معنے تَرْكُ الشَّكْوٰى مِنْ اَلَمِ الْبَلْوٰى لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ یعنی جب کوئی مصیبت اور ابتلاء وغیرہ انسان کو پہنچے اور اسے تکلیف ہو تو خدا تعالیٰ کے سوا دوسروں کے پاس اس کی شکایت نہ کرنا صبر کہلاتا ہے۔ ہاں اگر وہ خدا تعالیٰ کے حضور اپنی بے کسی کی شکایت کرتا ہے تو یہ صبر کے منافی نہیں۔ چنانچہ لُغت کی کتاب اقرب الموارد میں لکھا ہے۔ اِذَا دَعَا اللّٰهَ الْعَبْدُ فِيْ كَشْفِ الضُّرِّ عَنْهُ لَا يُقْدَحُ فِيْ صَبْرِهٖ جب بندہ خدا تعالیٰ سے اپنی مصیبت کے دُور کرنے کے لئے دُعا کرتا ہے تو اُس پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اُس نے بے صبری دکھائی ہے۔ کلیات ابی البقاء میں لکھا ہے کہ صبر انسان کی ایک اعلیٰ درجہ کی صفت ہے اور مختلف حالات میں اِس کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں۔ اَمَّا فِي الْمُحَارَبَةِ فَشَجَاعَةٌ اگر لڑائی میں انسان استقامت سے کام لے اور مشکلات سے نہ گھبرائے تو اُسے شجاعت کہتے ہیں۔ وَفِيْ اِمْسَاكِ النَّفْسِ عَنِ الْفُضُوْلِ اَيْ عَنْ طَلَبِ مَا يَفْضُلُ عَنْ قِوَامِ الْمَعِيْشَةِ فَقَنَاعَةٌ وَعِفَّةٌ اور اگر ضروریات زندگی سے زائد چیزوں کے متعلق انسان اپنی خواہشات کو ترک کر دے اور نفس کو روک لے تو اُسے قناعت اور عفت کہتے ہیں۔ چونکہ صبر کے اصل معنے رُکنے کے ہوتے ہیں اس لئے محققین لُغت نے لکھا ہے کہ اَلصَّبْرُ صَبْرَانِ صَبْرٌ عَلٰى مَا تَهْوٰى وَصَبْرٌ عَلٰى مَا تَكْرَهُ۔ یعنی صبر کی دو قسمیں ہیں۔ جس چیز کی انسان کو

اَلصَّبْرُ

خواہش ہو اُس سے باز رہنا بھی صبر کہلاتا ہے۔ اور جس چیز کو ناپسند کرتا ہو لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ آجائے۔ اُس پر شکوہ نہ کرنا بھی صبر کہلاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث سے ثابت ہے۔ صبر اصل میں تین قسم کا ہوتا ہے۔ (۱) پہلا صبر تو یہ ہے کہ انسان جزع فزع سے بچے۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ (لقمان آیت ۱۸) یعنی جو کچھ تکلیف پہنچے اسپر تو صبر سے کام لے یعنی جزع فزع نہ کر (۲) دوسرے نیک باتوں پر اپنے آپ کو روک رکھنا۔ یعنی نیکی کو مضبوط پکڑ لینا۔ اِن معنوں میں لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا۔ (سورۃ دہر آیت ۲۵) یعنی اپنے رب کے حکم پر قائم رہ اور انسانوں میں سے گنہگار اور ناشکرگذار کی اطاعت نہ کر۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسقدر احکام قربِ الٰہی کے حصول کے لئے دیئے گئے ہیں اُن پر استقلال سے قائم رہنا اور اپنے قدم کو پیچھے نہ ہٹانا بھی صبر کہلاتا ہے (۳) تیسرے معنے اِس کے بدی سے رُکے رہنے کے ہیں۔ ان معنوں میں یہ لفظ اس آیت میں استعمال ہُوا ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (سورۃ حجرات آیت ۶) یعنی اگر وہ تجھے بُلانے کے گناہ سے باز رہتے اور اس وقت تک انتظار کرتے جب تک کہ تو باہر نکلتا تو یہ اُن کے لئے بہت اچھا ہوتا مگر اب بھی وہ اصلاح کریں تو بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور باربار رحم کرنے والا ہے۔ زیرِ تفسیر آیت میں چونکہ کوئی قرینہ نہیں اس لئے یہاں تینوں معنے مراد لئے جائیں گے۔ اور اِس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ہر ایک کام کے دو ذرائع ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی اور ایک رُوحانی اور دونوں ذریعوں کو استعمال کرنے سے کامیابی ہوتی ہے۔ پس تم دونوں ذریعوں کو استعمال کرو۔ یعنی (۱) خدا تعالیٰ کی راہ میں جو تکالیف پہنچیں اُن کو بہادری سے برداشت کرو (۲) جو ذرائع کسی کام کے حصول کے لئے مقرر ہیں اُن کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے میں کوشاں رہو۔ (۳) جو باتیں اِس کام میں روک ہوتی ہوں۔ اُن سے بچنے کی کوشش کرتے رہو۔ دوسرا ذریعہ رُوحانی بتایا کہ دُعا کرو اور عبادت میں لگ جاؤ۔

الصّلٰوۃ

اَلصَّلٰوۃ: صلوٰۃ کے اصل معنے عبادتِ الٰہی کے ہیں لیکن چونکہ نماز بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اِس لئے نماز کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔ (۲) صلوٰۃ کا لفظ دُعا کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (۳) دین کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں (۴) رحمت کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں (۵) استغفار کو بھی صلوٰۃ کہتے ہیں۔ (۶) حُسنِ ثنا کے معنوں میں بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے (۷) صلوٰۃ کے معنے درود بھیجنے کے بھی ہوتے ہیں (صبر اور صلوٰۃ کی مزید تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ بقرہ ۴۶)

تفسیر:۔ اِس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ سے مراد وہی جنگیں ہیں جن کا فتح مکہ کے ساتھ تعلق تھا۔ کیونکہ صبر اور صلوٰۃ کا تعلق تکلیفوں کے وقت سے ہی ہوتا ہے۔ پہلے یہود کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف کے موقعہ پر فرمایا تھا کہ صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اِس کی مدد مانگو (بقرۃ آیت ۴۶) اب فتح مکہ کے ذکر پر فرماتا ہے کہ جنگ میں تمہیں تکلیفیں تو بے شک ہونگی اور تمہارے اقربا بھی شہید ہونگے لیکن اس تکلیف پر بزدلی نہ دکھانا بلکہ استقلال سے قربانیاں کرتے چلے جانا اور تکالیف کے مواقع پر اپنے خدا سے صبر اور دُعا کے ذریعے مدد مانگنا۔

اِس آیت میں یہ عظیم الشان مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان کے لئے کسی تکلیف پر رونا یا اس کے دل میں دُکھ کا احساس پیدا ہونا منع نہیں۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اور تم اُن کو محسوس بھی کرو گے لیکن میں تمہیں اس درد کا علاج یہ بتاتا ہوں کہ صبر اور دُعا کو کام میں لاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ قطعی طور پر کسی تکلیف کو محسوس ہی نہ کرو۔ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نواسہ فوت ہونے لگا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ بھی روتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے میرا دل سخت نہیں بنایا۔ غرض درد کا احساس منع نہیں۔
ہاں ہمت ہار کر کام چھوڑ دینا اور جزع فزع کرنا منع ہے۔ اِسی لئے فرمایا کہ تکالیف تو ہونگی اور تلوار تو چلے گی اور تمہاری گردنیں بھی کٹیں گی۔ لیکن ان پر صبر سے کام لینا۔ اور استقلال سے اپنے کام میں لگے رہنا۔ ہم تمہیں یہ نہیں کہتے کہ تمہیں غم کا احساس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ ایک طبعی جذبہ ہے جو رد کا نہیں جا سکتا۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ان قربانیوں میں استقلال سے حصہ لو۔ اور اپنے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آنے دو۔ مگر پھر فرمایا کہ یہ تو دنیوی تدابیر ہیں۔ تمہارا اصل کام یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو۔ اور دعاؤں سے اُس کی مدد چاہو۔ جب تک تم خدا تعالیٰ پر کامل توکّل نہیں کرو گے۔ اور اُس سے دُعائیں کرنا اپنا معمول نہیں بناؤ گے اُس وقت تک تمہیں فتح حاصل نہیں ہو گی۔ دیکھو ایک نادان اور کم عقل بچّہ بھی جب اُسے کوئی ڈراتا ہے تو فوراً اپنی ماں کے پاس بھاگ جاتا ہے اور ماں خواہ کتنی ہی کمزور ہو۔ وہ اُس کے پاس جا کر اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتا ہے۔ اِسی طرح ایک مومن پر بھی جب کوئی دشمن حملہ کرتا ہے تو اُس کی پناہ صرف خدا تعالیٰ کا ہی وجود ہوتا ہے۔ اِسی لئے صلوٰۃ کا تعلق روحانی ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ سے ہے۔ اور صبر کا تعلق جسمانی ہونے کے لحاظ سے انسانی تدابیر سے ہے۔ صبر میں جبری طور پر خدا تعالیٰ کی محبت کا اظہار ہوتا ہے اور صلوٰۃ میں عشقیہ طور پر خدا تعالیٰ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ مشکلات اور مصائب ہم خود پیدا نہیں کرتے بلکہ دشمن مشکلات اور مصائب لاتا ہے اور ہم انہیں برداشت کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو نہیں چھوڑتے لیکن نماز اور دُعا طوعی عبادت ہے۔ نماز ہمیں کوئی جبرًا نہیں پڑھاتا۔ بلکہ ہم خود پڑھتے ہیں۔ پس صبر میں ہم جبری طور پر خدا تعالیٰ کی محبت کا ثبوت دیتے ہیں اور صلوٰۃ میں طوعی طور پر اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اور جب یہ دونوں چیزیں مل جاتی ہیں تو محبت کامل ہو جاتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا فیضان جاری ہو جاتا ہے۔

صبر کے جو معنے اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) اے مومنو! جب تم پر خدا تعالیٰ کی راہ میں مصائب اور مشکلات آئیں تو تم گھبرایا نہ کرو اور نہ اُن پر شکوہ کا اظہار کیا کرو۔ (۲) اے مومنو! جو باتیں خدا تعالیٰ کے قرب میں روک ہیں تم اُن سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہا کرو۔ (۳) اے مومنو! جب تم کو وہ احکام دیئے جائیں جن کے ذریعہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے تو تم ان پر عمل کرنے میں سستی نہ دکھایا کرو۔ بلکہ استقلال سے اُن پر عمل کیا کرو۔

یہ تین باتیں رُوحانی مدارج کے حصول کے لئے ممد ہیں تم ان باتوں کو مدّ نظر رکھو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو جو کام تمہارے سامنے ہیں اُن کے پورا کرنے میں تمہیں کامیابی ہوگی اور تمہارا مقصد تمہیں حاصل ہو جائیگا۔ اِسی طرح صلوٰۃ کے معنوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ (۱) اے مومنو! تم نماز کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی مدد حاصل کرو۔ (۲) اے مومنو! تم دُعاؤں کے ذریعہ اس کی مدد حاصل کرو۔ (۳) اے مومنو! دین پر استقلال کے ساتھ قائم ہو جانے کے ذریعہ سے اس کی مدد حاصل کرو۔ (۴) اے مومنو! تم خدا تعالیٰ کی مخلوق پر رحم اور شفقت کر کے اس کی مدد حاصل کرو۔ (۵) اے مومنو! تم خدا تعالیٰ کے حضور استغفار اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے اس کی مدد حاصل کرو۔ (۶) اے مومنو! تم خدا تعالیٰ کے رسول پر درود بھیج کر اُس کی

مدد حاصل کرو۔ گویا یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد کے حصول کے ذرائع ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ تم اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہا کرو۔ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ گُر بتایا ہے کہ مدد کس طریق سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ فرماتا ہے وہ ذرائع یہ ہیں کہ ایک تو دین کے راستہ میں جو مشکلات اور مصائب پیش آئیں اور جو قربانیاں تمہیں کرنی پڑیں اُن سے گھبرایا نہ کرو۔ دوسرے ان امور سے جن سے اللہ تعالیٰ تم کو روکتا ہے رُکے رہو۔ تیسرے وہ قربانیاں جو قربِ الٰہی کے حصول کے لئے ضروری ہیں ان کو ترک نہ کرو۔ اور ان پر استقلال اور دوام اختیار کرو۔ چوتھے دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قربانیوں کے بہترین نتائج پیدا کرے اور اُنکو قبول فرماتے ہوئے تمہیں غلبہ بخشے۔ پانچویں غرباء سے ہمدردی اور شفقت کا سلوک کرو تا مخلوقِ خدا کو آرام پہنچانے کی وجہ سے خدا تعالیٰ بھی تم سے خوش ہو۔ چھٹے خدا تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی طلب کرتے رہو۔ ساتویں انبیاء پر درود بھیجا کرو۔ کیونکہ اُن کے ذریعے سے ہی تم کو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کی توفیق ملی ہے۔ آٹھویں خدا تعالیٰ کے دین پر استقلال کے ساتھ قائم رہنے کی کوشش کیا کرو۔ نویں عبادت پر مضبوطی سے قائم رہو۔ یہ سب امور خدا تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے بیان فرمائے ہیں۔ پس جو شخص چاہتا ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کی مدد اور نصرت حاصل ہو اس کیلئے ان نو باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ بندے کا صرف اپنے مونہہ سے خدا تعالیٰ کو یہ کہنا کہ الٰہی میری مدد کر کوئی معنے نہیں رکھتا۔ مدد حاصل کرنے کے لئے پہلے ان ذرائع پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جو شخص گھبرا کر مایوس ہو جاتا ہے اور پھر یہ امید رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اُس کی مدد کے لئے آسمان سے نازل ہونگے وہ اُس کی مدد حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ اُمید رکھتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اس کے لئے نازل ہونگے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص قربانیوں سے ہچکچاتا اور خدا تعالیٰ کی عاید کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص دُعا نہیں کرتا اور خدا تعالیٰ کے حضور عاجزانہ طور پر گڑگڑاتا نہیں اور اس کے باوجود اس کی معجزانہ تائید کا امیدوار رہتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص دین کے معاملے میں غیرت سے کام نہیں لیتا اور اس کی ترقی میں ممد نہیں ہوتا وہ دشمنوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص غرباء اور مساکین پر شفقت نہیں کرتا اور اُن کی مشکلات کو دُور کرنے میں ہاتھ نہیں بٹاتا وہ اپنی مشکلات کے وقت خدا تعالیٰ کی تائید حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر درود نہیں بھیجتا۔ اُن کے لئے دُعائیں نہیں کرتا اور اُن کے احسانات کے شکریہ کا احساس اپنے دل میں نہیں رکھتا وہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ جو شخص عبادت اور خدمتِ دین کے لئے اپنی ساری عمر وقف نہیں کرتا وہ قربِ الٰہی کے اعلیٰ مدارج پانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ پھر باوجود ان سب باتوں پر عمل کرنے کے جو شخص یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور اپنے عمل پر اِتراتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ لوگ مُنہ سے تو کہہ دیتے ہیں کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ لیکن یہ نہیں جانتے کہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہنے کے ساتھ کن کن باتوں کی ضرورت ہے۔ وہ ڈاکخانہ میں روپے منی آرڈر کرانے کے لئے جاتے ہیں تو منی آرڈر فارم ساتھ لے کر جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب تک منی آرڈر فارم پُر نہیں کیا جائیگا روپیہ پوسٹ نہیں ہو سکتا۔ یا وہ ڈاکخانہ میں خط ڈالنے جاتے ہیں تو

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُن کے متعلق (یہ) مت کہو کہ [illegible] مُردہ ہیں۔

بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

(وہ مُردہ) نہیں بلکہ زندہ ہیں مگر تم نہیں سمجھتے۔ ۶۹ھ

سرٹیفکیٹ نکالتے ہیں ورنہ [illegible] بیرنگ کر دیا جاتا ہے۔ مدرسہ میں داخل ہونیکے وقت وہ فارم پُر کرتے ہیں جو داخلہ کیلئے محکمہ تعلیم کی طرف سے منظور ہوتا ہے۔ امتحان کے لئے یونیورسٹی کا فارم پُر کرتے ہیں۔ اور اُس میں ذرا سی غلطی ہونے سے بھی اُن کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔ اور وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں کام خراب نہ ہو جائے۔ مگر خدا تعالیٰ سے بغیر کوئی فارم پُر کرنے کے اور بغیر کسی شرط پر عمل کرنے کے یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ حضور اپنے ملائکہ کی فوج بھیجکر ہماری مدد کیجیئے۔ حالانکہ وہ نہیں جانتے کہ یہاں بھی ایک فارم کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ فارم پُر کر کے اُس پر دستخط نہ کئے جائیں۔ اُسوقت تک خدا تعالیٰ کی نصرت شامل حال نہیں ہو سکتی اور وہ صبر اور صلوٰۃ کا فارم ہے۔ جب تک صبر اور صلوٰۃ کے فارم پر دستخط نہ کروگے تب تک خدا تعالیٰ کی مدد تمہیں حاصل نہیں ہو سکے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ اسجگہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کے لفظ کو اُڑا دیا ہے اور صرف مَعَ الصّٰبِرِيْنَ کے الفاظ رکھے ہیں۔ مَعَ الْمُصَلِّيْنَ نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صابر کا لفظ اپنے اندر استقلال کے [illegible] رکھتا ہے اور صابر کا لفظ صرف صبر کا قائم مقام نہیں بلکہ صبر اور صلوٰۃ دونوں کا قائم مقام ہے۔ پس اس کے صرف یہ معنے نہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بلکہ اسکے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ صبر و صلوٰۃ دونوں پر استقلال کے ساتھ قائم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔ کیونکہ دُعا بھی وہی قبول ہوتی ہے جو استقلال سے کی جائے۔ پس اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے کے یہ معنے ہیں کہ اگر صبر اور صلوٰۃ کے ذرائع کو استقلال سے استعمال کروگے تو کامیاب ہو جاؤگے۔

اِس آیت میں اُن لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے جو کچھ عرصہ تکلیف برداشت کرتے اور یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تو ہماری سنتا ہی نہیں۔ ہم تو اُسے پکار پکار کر تھک گئے اب دعا کرنیکا کیا فائدہ۔ اور بعض لوگوں کو تو اس قدر ٹھوکر لگتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کے ہی منکر ہو جاتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ کہہ کر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اسی کو حاصل ہوگی جو مشکلات کے وقت استقامت دکھائیگا اور صبر اور صلوٰۃ کے ذرائع کو استقلال سے استعمال کرتا چلا جائیگا۔

۶۹ھ حل لغات

۱۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ۔ جب قَالَ کے بعد صلہ کے طور پر لام آئے تو اُس کے معنے خطاب کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب قَالَ لِفُلَانٍ کہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اُس نے فلاں کو کہا۔ اسی طرح قَالَ لِفُلَانٍ کے یہ بھی معنے ہوتے ہیں کہ اُس کے حق میں کہا۔ پس اس آیت میں دونوں معنے ہیں۔ یہ بھی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں مارے جاتے ان کو مُردہ مت کہو اور یہ بھی کہ تم اُن کے بارہ میں یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ اس آیت میں اَمْوَاتٌ سے پہلے اور بَلْ کے بعد دونوں جگہ هُمْ محذوف ہے پس جملہ یوں ہوگی هُمْ اَمْوَاتٌ بَلْ هُمْ اَحْيَآءٌ۔

اَمْوَاتٌ کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ بقرۃ ۲۹ھ

تَشْعُرُوْنَ :- دیکھیں حل لغات سورۃ بقرہ ۵۔

تفسیر :- اِس آیت میں خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونیوالوں کو اِس لئے زندہ کہا گیا ہے۔ کہ اہلِ عرب میں یہ رواج تھا کہ جو لوگ مارے جائیں اور اُن کا بدلہ لے لیا جائے اُن کے لئے تو ".." اَحْیَاء کا لفظ استعمال کرتے تھے اور اُن کو زندہ کہتے تھے۔ لیکن جن مقتولوں کا بدلہ نہ لیا جائے ".." انہیں اَمْوَاتٌ یعنی مُردے کہا کرتے تھے۔ یہ محاورہ اُن میں اِس لئے رائج ہُوا کہ عربوں میں یہ مشہور تھا کہ جو شخص مارا جائے اور اس کا بدلہ نہ لیا جائے اُس کی رُوح اُلّو کی شکل میں آکر چیختی رہتی ہے اور جب اس کا بدلہ لے لیا جائے تب وہ آرام کرتی ہے۔ اِس سے اُن میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس مقتول کا بدلہ لے لیا جائے وہ زندہ ہوتا ہے۔ اور جس کا بدلہ نہ لیا جائے وہ مردہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی معنوں میں ایک شاعر حارث بن حلزہ نے کہا ہے کہ ؎

اِنْ نَبَشْتُمْ مَا بَيْنَ مِلْحَةَ فَالصَّاقِبِ
فِيْهَا الْاَمْوَاتُ وَالْاَحْيَاءُ

(سبعہ معلقات قصیدہ ۷)

اِس میں شاعر فریقِ مخالف کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم بڑے شریف اور معزز ہو مگر ایسا ہرگز نہیں تم ملحہ اور صاقب کے درمیان جہاں ہمارے اور تمہارے درمیان جنگ ہوئی تھی جاؤ اور وہاں قبریں کھود کر دیکھو تو اُن میں تمہیں کچھ مردے دکھائی دیں گے اور کچھ زندہ۔ یعنی تم نے اپنی قوم کے مقتولوں کا بدلہ نہیں لیا۔ اس لئے ".." مُردہ ہیں۔ مگر ہمارے جو آدمی نکلیں گے ".." بزبانِ حال بتاتے جائیں گے کہ وہ زندہ ہیں۔ کیونکہ اُن کا بدلہ لے لیا گیا ہے۔ اُن میں اس بارہ میں اتنی غیرت تھی کہ اگر کسی مقتول کا بدلہ نہ لیا جاتا تو وہ اُسے حد درجہ کی بے غیرتی سمجھتے تھے کیونکہ اُن میں یہ روایت چلی آتی تھی کہ جس مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے اُس کی رُوح اُلّو بن کر رات دن چیختی رہتی ہے اور جب اُسکا بدلہ لے لیا جائے تب وہ نجات پاتی ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ تم ہمارے باپ دادوں کی قبریں کھود کر دیکھو اور اُن سے پوچھو کہ ان کا بدلہ لے لیا گیا ہے یا نہیں۔ ہم نے انکی بجائے دشمن قبیلہ کے کئی کئی اشخاص مار دیئے ہیں۔ پس ہمارے باپ دادا مرے نہیں بلکہ ".." زندہ ہیں۔ اگر اُن میں کچھ لوگ مرے ہوئے نظر آئیں تو وہ ہمارے باپ دادا نہیں ہونگے بلکہ تمہارے باپ دادا ہونگے۔ غرض جس مقتول کا بدلہ لے لیا جائے اہلِ عرب کے محاورہ کے مطابق وہ زندہ ہوتا ہے۔ اِس لحاظ سے اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جو مسلمان شہید ہو گئے ہیں تم انہیں مردہ مت کہو۔ وہ خدا تعالیٰ کے زندہ سپاہی ہیں۔ اور خدا تعالیٰ ان کا ضرور بدلہ لے گا۔ چنانچہ اگر ایک صحابیؓ مارا گیا تو اُس کے مقابلہ پر مشرکوں کے پانچ پانچ آدمی مارے گئے۔ اور ہر جنگ میں کفار مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہلاک ہوئے۔ سوائے جنگِ اُحد کے کہ اس میں بہت سے مسلمان مارے گئے تھے مگر اُن کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ نے دوسری جنگوں میں لے لیا۔

دوسرے معنے محاورہ میں اِس کے یہ ہوتے ہیں کہ جس شخص کا کام جاری رکھنے والے لوگ پیچھے باقی ہوں اُس کی نسبت بھی کہتے ہیں۔ مَا مَاتَ کہ وہ مرا نہیں۔ اور مردہ اُسے کہتے ہیں جو مرے اور اُس کا کوئی اچھا اور نیک قائم مقام نہ ہو۔ چنانچہ عبد الملک بادشاہ نے زہری کے ایک مدرسہ کا معائنہ کیا تو اس مدرسہ کے طلباء میں اصمعی بھی تھے جو بہت بڑے مشہور نحوی گذرے ہیں۔ بادشاہ نے اصمعی کا امتحان لیا۔ اور اُس سے کوئی سوال پُوچھا تو اصمعی نے اس کا نہایت معقول جواب دیا۔ بادشاہ نے اس کا جواب سُنکر خوش ہو کر زہری سے کہا کہ مَا مَاتَ مَنْ خَلَفَ مِثْلَكَ کہ وہ شخص نہیں مرا جس نے ایسے لوگ پیچھے چھوڑے ہوں جیسا کہ تُو نے چھوڑے ہیں۔ اِس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ یہ لوگ مردہ نہیں

کہلا سکتے کیونکہ جس کام کے لئے انہوں نے جان دی ہے اُس کے چلانے والے لوگ موجود ہیں۔ اور ایک کے مرنے پر دو دو اُسکی جگہ لینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ پس اُن کے متعلق یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اچھے قائم مقام پیدا کر دیئے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنی تعداد میں پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ مردہ تو وہ ہوتا ہے جس کا بعد میں کوئی اچھا قائم مقام نہ ہو مگر ان کے تو بہت سے قائم مقام پیدا ہو گئے ہیں اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا کہ ہم ان میں سے ایک ایک کی جگہ کئی کئی قائم مقام پیدا کرتے چلے جائیں گے اور وہ قوم کبھی مرتی نہیں جس کے افراد اپنے شہداء کی جگہ لیتے چلے جائیں۔ جو قوم اپنے قائم مقام پیدا کرتی چلی جاتی ہے وہ خواہ کتنی بھی چھوٹی ہو اُسے کوئی مار نہیں سکتا۔ پس فرماتا ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مسلمان مارے گئے ہیں۔ مسلمان مرے نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ اگر اُن میں سے ایک مرتا ہے تو دوسرا اسکی جگہ لے لیتا ہے۔ اگر جنگ بدر میں کچھ مسلمان مارے گئے تو اُحد میں اس سے زیادہ کھڑے ہوگئے۔ اُحد میں کچھ تکلیف پہنچی اور کچھ مسلمان مارے گئے تو غزوہ خندق میں اس سے زیادہ کھڑے ہوگئے۔ اور غزوہ خندق کے مقابلہ میں فتح مکہ کے موقعہ پر زیادہ لوگ آئے۔ اور اگر فتح مکہ کے موقعہ پر انکو کچھ نقصان پہنچا تو جنگ تبوک میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے کہیں زیادہ تعداد لے گئے۔ غرض ہر قدم پر پہلے سے زیادہ قربانی کرنے والے لوگ اُن میں موجود ہوتے تھے۔ اور جو قوم قربانی کے اس مقام پر پہنچ جاتی ہے اُسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ اور ایسی قوم وہی ہوتی ہے جسے خدا تعالیٰ خود کھڑا کرتا ہے۔

تیسرے معنے محاورہ میں اس کے یہ ہوتے ہیں کہ وہ رنج و غم سے آزاد ہیں۔ یعنی جس کا آخری حال یہ ہوا کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا گیا۔ اُسے اگلے جہان میں کیا دُکھ پہنچنا ہے۔ پس چونکہ وہ خوش و خرم ہیں اور اس زندگی سے اعلیٰ زندگی پا چکے ہیں اسلئے انکو مردہ نہ کہو۔ کیونکہ موت غم کی حالت پر دلالت کرتی ہے۔ ورنہ قرآن کریم سے ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی تو کافر و مومن سب کو ملیگی پس اُن کو مُردہ نہ کہنے سے یہ منشاء ہے کہ مردہ کہنے میں دُکھ کا مفہوم پایا جاتا ہے حالانکہ وہ سُکھ میں ہیں۔ اور اُن کو خدا تعالےٰ کی طرف سے انعامات مل رہے ہیں پھر انہیں مردہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ شہید کو ایک اعلیٰ حیات مرنے کے بعد ہی مل جاتی ہے۔ جبکہ دوسرے لوگوں کو عرصہ تک ایک درمیانی حالت میں رہنا پڑتا ہے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہید تین دن کے اندر اندر زندہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کمال کو حاصل کر لیتا ہے جسے دوسرا شخص ایک لمبے عرصے میں حاصل کرتا ہے۔ پس فرماتا ہے۔ ان لوگوں نے مر کر فوراً وہ زندگی حاصل کر لی ہے جس میں رُوح کو کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ عام زندگی میں تو سب لوگ شریک ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ ابوجہل کو بھی وہ زندگی حاصل ہوگئی۔ اگر وہ زندگی اُسے حاصل نہیں تو وہ جہنم میں کیسے جائیگا۔ پس زندگی تو مومن اور کافر دونوں کو حاصل ہوگی۔ لیکن شہید چونکہ خدا تعالیٰ کی خاطر اپنی زندگی دے دیتا ہے۔ اس لئے اُسے مرنے کے بعد ہی ایک اعلیٰ حیات مل جاتی ہے۔

پھر اس آیت میں شہید کو زندہ قرار دینے کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے میں مومن کو صرف یہی خدشہ ہوتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو اعمال صالحہ سے محروم رہ جاؤں گا۔ مثلاً ایک شخص کی عمر چالیس سال ہے۔ اگر ساٹھ سال تک وہ اور زندہ رہتا تو اس عرصہ میں وہ اور بہت سی نیکیاں کر سکتا تھا۔ پس موت کے راستہ میں صرف یہی ایک خیال اس کے لئے روک بن سکتا ہے ورنہ اگر وہ صحیح طور پر آخرت کو مقدم کرتا ہے تو کوئی دنیوی خیال اس کے راستہ میں روک بن ہی نہیں سکتا۔ یہی

ایک خیال ہے جو اُسے جان دینے سے روک سکتا ہے کہ اتنی مدت کی نمازوں روزوں جہاد اور تبلیغ سے محروم رہ جاؤں گا اِس شبہ کی معقولیت کو اللہ تعالیٰ نے بھی تسلیم کیا ہے اور پھر اس کا جواب بھی دیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ۔ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والوں کو مُردہ مت کہو وہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ یعنی شہید کے اعمال کبھی ختم نہیں ہو سکتے وہ زندہ ہے اور اس کے اعمال ہمیشہ بڑھتے رہتے ہیں جس نے خدا کے لئے اپنی جان قربان کر دی اور خدا نے نہ چاہا کہ اُس کے اعمال ختم ہو جائیں۔ کوئی دن نہیں گذرتا کہ تم نمازیں پڑھو اور اُن کا ثواب تمہارے نام لکھا جائے اور شہید اُن سے محروم رہے۔ کوئی رمضان نہیں گذرتا کہ تم اُسکے روزے رکھو اور اُن کا ثواب تمہارے نام لکھا جائے اور شہید اس سے محروم رہے۔ کوئی حج نہیں کہ تم تکلیف اٹھا کر اس کا ثواب حاصل کرو اور شہید اس ثواب سے محروم رہے۔ غرض وہ لوگ وہی برکتیں حاصل کر رہے ہیں جو تم کر رہے ہو۔ اور اس طرح خدا تعالیٰ کے قرب میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں جس طرح تم بڑھتے جا رہے ہو۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فلسفۂ موت و حیات پر نہایت لطیف رنگ میں روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ شہادت کا مقام حاصل کرنے والوں کو دائمی حیات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو جس دن حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی فوجوں نے مارا ہوگا۔ وہ کس قدر خوش ہوئی ہونگی اور انہوں نے کس مسرت سے کہا ہوگا کہ لو یہ قصہ ختم ہو گیا۔ مگر کیا واقعہ میں وہ قصہ ختم ہو گیا؟ دنیا دیکھ رہی ہے کہ امام حسینؓ آج بھی زندہ ہیں۔ مگر یزید کو اس وقت بھی مردہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے رستہ میں قربان ہوتا ہے تو اُس کا خون رائیگاں نہیں جاتا بلکہ اُس کی جگہ اللہ تعالیٰ ایک قوم لاتا اور اپنے سلسلہ میں داخل کرتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں تم انہیں مردہ مت کہو کیونکہ وہ زندہ ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کو زندہ اسلئے بھی کہا کہ جب ایک شخص کی جگہ دس کھڑے ہو گئے تو وہ مرا کہاں۔ اور جب وہ مرا نہیں تو اُسے مردہ کہنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ پس اللہ تعالیٰ کے مقربین اور اس کی راہ میں شہید ہونے والے کبھی نہیں مرتے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام صلیب پر لٹکائے گئے اور پھر زندہ ہی صلیب سے اُتارے گئے۔ گو جیسا کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے بعض نے یہ بھی سمجھا کہ آپ مر گئے ہیں۔ مگر آپ کو صلیب پر لٹکانے والوں کا کیا انجام ہُوا۔ اس صلیب پر لٹکانے کے جرم میں آج بھی جب کہ اس واقعہ پر انیس سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے یہود صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں۔ حالانکہ پچاس ساٹھ سال کے بعد لوگ اپنے دادوں پڑدادوں کا نام تک بھول جاتے ہیں۔ بیسیوں آدمی ہیں جو مجھ سے ملتے ہیں اور میں اُن سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ کے دادا کا کیا نام تھا تو وہ بتا نہیں سکتے۔ اور کہتے ہیں پتہ نہیں کیا نام تھا اور اگر دادا کا نام لوگ جانتے بھی ہوں تو سو سال پہلے کے آباء کو تو لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک جانتا ہے مگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مارنے کی کوشش پر انیس سَو سال گذر گئے اور آج تک یہودیوں کو پھانسیاں مل رہی ہیں۔ اسی طرح مکہ کے جن اکابر نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنا چاہا۔ کیا آج دنیا میں ان لوگوں کا کوئی نام لیوا ہے؟ اُحد کے مقام پر ابوسفیان نے آواز دی تھی اور کہا تھا۔ کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ اور جب اس کا جواب نہ ملا تو اُس نے کہا۔ ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مار ڈالا ہے۔ پھر اُس نے آواز دی۔ کیا تم میں ابوبکرؓ ہے؟ اور جب اس کا بھی جواب نہ ملا۔ تو اُس نے کہا۔ ہم نے ابوبکرؓ کو بھی مار ڈالا ہے۔ پھر اُس نے پُوچھا کیا تم میں عمرؓ ہے؟ جب اس کا بھی جواب نہ ملا تو اُس نے کہا۔ ہم نے عمرؓ کو

بھی مار ڈالا ہے۔ لیکن آج جاؤ اور دنیا کے کناروں پر اس آواز دینے والے کے ہمنوا کفار کے سردار ابوجہل کو بلاؤ اور آواز دو۔ کہ کیا تم میں ابوجہل ہے۔ تو تم دیکھو گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر تو کروڑوں آوازیں بلند ہونا شروع ہو جائیں گی اور ساری دنیا بول اُٹھے گی کہ ہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود ہیں۔ کیونکہ آپ کی نمائندگی کا شرف ہمیں حاصل ہے۔ لیکن ابوجہل کو بلانے پر تمہیں کسی گوشہ سے بھی آواز اٹھتی سُنائی نہیں دیگی۔ ابوجہل کی اولاد آج بھی دنیا میں موجود ہے مگر کسی کو جرأت نہیں کہ یہ کہہ سکے کہ میں ابوجہل کی اولاد میں سے ہوں۔ شاید عتبہ اور شیبہ کی اولاد بھی آج دنیا میں موجود ہو۔ مگر کیا کوئی کہتا ہے کہ میں عتبہ اور شیبہ کی اولاد ہوں۔ پس خدا تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے والے کبھی نہیں مرتے بلکہ وہ قیامت تک زندہ رہتے ہیں اور آئندہ نسلیں اُن کا نام لے لے کر اُن کیلئے دعائیں کرتی ہیں۔ اُن کی خوبیوں کو یاد رکھتی ہیں اور اُن کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اِس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تحویلِ قبلہ کے متعلق مفسرین سے جو میں اختلاف رکھتا ہوں اس میں میں حق پر ہوں۔ اگر وہاں فتح مکہ مراد نہ لی جائے بلکہ تحویلِ قبلہ مراد لیں تو اس آیت کا یہاں کوئی تعلق ہی معلوم نہیں ہوتا۔ نماز اور قبلہ کے ذکر میں شہداء کا ذکر کیسے آگیا۔ جنگ کے ساتھ شہداء کا ذکر قابلِ تسلیم بھی ہے۔ لیکن تحویل قبلہ کے ساتھ اس کا ذکر بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ پس یہ آیت اس بات کی تائید کرتی ہے کہ پہلی آیت وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ سے مراد فتح مکہ ہی ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اگر فتح مکہ کی غرض سے تمہیں لڑائیاں کرنی پڑیں تو گھبرانا نہیں کیونکہ اس میں تمہاری زندگی ہے اور جو لوگ مارے جائیں اُن کو مردہ مت کہو۔ کیونکہ وہ زندہ ہیں اور جو لوگ اپنی نادانی سے اُن کو مُردہ کہتے ہیں اُن کے نفس میں اتنی حِس ہی نہیں کہ وہ اس کی اہمیت کو محسوس کریں۔ اِس میں اُن معترضین کا بھی جواب ہے جو کہتے ہیں کہ لڑائیوں کی اور اپنی جانوں کو قربان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو فرماتا ہے کہ تمہاری آنکھیں اس بینائی سے جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو عطا کی ہے محروم ہیں۔ تم کو کیا معلوم کہ اسلام کی فتح کی بنیاد اِنہی لوگوں کے ہاتھ سے رکھی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جاتے ہیں۔ ہاں مارے جانے والے اِس کو خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارے شہید ہونے سے اسلام کو کیا فائدہ ہوگا۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کو دیکھا کہ وہ بہت افسردہ اور غمگین کھڑے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تم کیوں غمگین ہو۔ انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میرے والد اُحد کی جنگ میں مارے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے پیچھے بہت بڑا عیال اور قرضہ چھوڑا ہے اس لئے میں افسردہ ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں خوشخبری نہ دوں کہ موت کے بعد تمہارے والد کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے جب زندہ ہو کر حاضر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے خوش ہو کر بالمشافہ کلام کیا اور فرمایا۔ اے میرے بندے تو مجھ سے جو کچھ مانگنا چاہتا ہے مانگ میں تجھے دونگا۔ انہوں نے عرض کیا حضور میری صرف اتنی ہی خواہش ہے کہ میں پھر زندہ ہو کر دنیا میں جاؤں اور آپ کی راہ میں مارا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ میں ایسا کر تو سکتا ہوں۔ مگر میں یہ قانون بنا چکا ہوں کہ جو ایک دفعہ مر جائے اُس کو دنیا میں واپس نہیں بھیجوں گا۔ (ترمذی جلد ۲ ابواب التفسیر سورۃ آل عمران) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ جو سچا ایمان لاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارا مرنا قوم کو زندہ کرنے کا موجب ہوگا اور آخرت میں بھی ہمارے لئے بہت بڑے ثواب کا موجب ہوگا اسلئے وہ موت کو کوئی خوف والی چیز نہیں سمجھتے۔ خدا تعالیٰ کی

راہ میں جان دے کر بھی زندہ ہوتے ہیں۔ اور جان نہ دینے والے
زندہ رہ کر بھی مردہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈپٹی عبداللہ آتھم کے
متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جو انذاری پیشگوئی
فرمائی تھی جب اُس کی میعاد گذر گئی۔ اور آتھم نہ مرا تو ظاہر بین
لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مرزا صاحب کی پیشگوئی
جھوٹی نکلی۔ ایک دفعہ نواب صاحب بہاولپور کے دربار
میں بھی بعض لوگوں نے ہنسی اڑانی شروع کر دی کہ مرزا صاحب
کی پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ اور آتھم ابھی تک زندہ ہے
اُسوقت دربار میں خواجہ غلام فرید صاحب چاچڑاں والے بھی بیٹھے ہوئے تھے
جن کے نواب صاحب مرید تھے۔ باتوں باتوں میں نواب صاحب
کے مونہہ سے بھی یہ فقرہ نکل گیا کہ ہاں! مرزا صاحب کی
پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ اس پر خواجہ غلام فرید صاحب
جوش میں آگئے۔ اور انہوں نے بڑے جلال سے فرمایا کہ کون
کہتا ہے آتھم زندہ ہے۔ مجھے تو اس کی لاش نظر آرہی ہے۔
اسپر نواب صاحب خاموش ہو گئے۔ تو بعض لوگ ایسے
بھی ہوتے ہیں جو بظاہر زندہ معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً
مردہ ہوتے ہیں۔ اور بعض مردہ نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً
زندہ ہوتے ہیں۔ جو لوگ خدا کی راہ میں جان دیتے ہیں وہ
درحقیقت زندہ ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ زندہ ہوتے ہیں
اُن میں سے ہزاروں روحانی نگاہ رکھنے والوں کو مردہ دکھائی
دیتے ہیں۔ کسی بزرگ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قبرستان میں
رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے اُن سے کہا کہ آپ زندوں کو
چھوڑ کر قبرستان میں کیوں آگئے ہیں۔ انہوں نے کہا مجھے
تو شہر میں سب مردے ہی مردے نظر آتے ہیں۔ اور یہاں
مجھے زندہ لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ پس روحانی مردوں اور
روحانی زندوں کو پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں۔ مگر اسجگہ
اللہ تعالیٰ نے ایک ظاہری علامت ایسی بتا دی ہے جس
سے روحانی مردوں اور زندوں کو پہچاننے میں بڑی حد تک
آسانی ہو جاتی ہے۔

وَلٰكِن لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ شعور وہ علم ہوتا ہے جو
انسان کے اندر کی طرف سے باہر کو آتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی
شخص کسی دوسرے سے کوئی بات سُنکر ایک نتیجہ قائم کرے
تو وہ شعور نہیں کہلائیگا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکیگا کہ میں نے
شعور حاصل کر لیا۔ بلکہ یہ کہیگا کہ مجھے علم ہو گیا۔ لیکن
اگر اس کے نفس کے اندر سے وہ بات پیدا ہو تو وہ کہیگا
مجھے فلاں بات کا شعور ہوا۔ چنانچہ جب ایک بچہ
بالغ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ وہ شعور کی عمر تک پہنچ گیا
حالانکہ اس کو علم پہلے بھی حاصل ہوتا ہے۔ بالوں کو شعار
اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اندر سے باہر کی طرف آتے ہیں۔
اور شعار اس لباس کو کہتے ہیں جو جسم کے ساتھ چمٹا ہوا
ہوتا ہے۔ اور شعر کو بھی اسی لئے شعر کہتے ہیں کہ اُس
کے الفاظ اندر سے باہر آتے ہیں۔ اور اس کا مضمون ایسا
ہوتا ہے جو انسان کے اندرونی احساسات کا ترجمان ہوتا
ہے۔ اور اُسے پڑھ کر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ بات
تو میرے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ غالب اسی کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ باتیں کہ
شہداء کو ایک اعلیٰ درجہ کی حیات حاصل ہے۔ یا ایک
ایک شہید کی جگہ لینے کے لئے پچاس پچاس اور سو سو آدمی
آئیں گے۔ یا وہ رنج و غم سے کلی طور پر آزاد ہیں۔ یا انکے
خون رائیگاں نہیں جائیں گے انسانی شعور سے تعلق رکھتی
ہیں۔ اگر کوئی شخص فطرتِ صحیحہ پر غور کرنے کا عادی ہو
تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز بھی قربانی کے بغیر
حاصل نہیں ہوتی۔ ماں جب تک اپنی جان کی قربانی پیش نہیں
کرتی اُسے بچہ حاصل نہیں ہوتا۔ دانہ جب تک خاک میں ملکر
اپنی جان کو نہیں کھوتا ایک سے سات سو دانوں میں

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ

اور ہم تمہیں کسی قدر خوف اور بھوک (سے) اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی کے ذریعہ (سے)

مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿۱۵۶﴾

ضرور آزمائیں گے اور (اے رسول!) تو (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سُنا دے۔ ۱۵۰

تبدیل نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی قوم زندہ نہیں ہو سکتی جب تک اُس کے افراد جانوں کو ایک بے حقیقت شئے سمجھ کر اُسے قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار نہ ہوں۔ اور کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اُس کے افراد کے دلوں میں اپنے شہداء کا پورا احترام نہ ہو۔ یہ ایک فطرتی آواز ہے جو شعور کے کانوں سے سُنی جا سکتی ہے۔ مگر جن لوگوں کو شعور حاصل نہیں۔ وہ بات بات پر اعتراض کرتے رہتے ہیں اور جب کبھی کسی مالی یا جانی قربانی کا مطالبہ کیا جائے اُن کے قدم ڈگمگانے لگ جاتے ہیں۔ اور وہ ان لوگوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں جو اپنے آپ کو قربانیوں کی آگ میں جھونکنے کے لئے آگے نکل آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نصیحت کرتا ہے کہ تم اپنے شعور سے کام لو۔ اور شہداء کو مردہ کہہ کر اُنکی بے حرمتی مت کرو۔ وہ مردہ نہیں بلکہ حقیقتاً وہی زندہ ہیں۔ کیونکہ تاریخ اُن کے نام کو زندہ رکھیگی۔ اور آئندہ آنے والی نسلیں انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گی اور ان کے کارناموں کو یاد رکھیں گی اور ہمیشہ اُن کی بلندیٔ درجات اور مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دُعائیں کرتی رہیں گی۔ تم اُسے زندہ سمجھتے ہو جو جسدِ عنصری کے ساتھ زندہ ہو۔ حالانکہ زندہ وہ ہے جس نے مر کر اپنی قوم کو زندہ کر دیا۔ اگر تمہیں شہداء بھی مُردہ نظر آتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارا شعور ناقص ہے تم اس کی اصلاح کرو اور زندگی اور موت کے سلسلہ کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

۱۵۶ حل لغات

۱۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ : بَلَاءٌ کسی کے خیر اور شر کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرنا تین اغراض کیلئے ہوتا ہے۔ اوّل اپنا علم بڑھانے کے لئے۔ جیسے اُستاد اپنے شاگرد کا اس غرض کے لئے امتحان لیتا ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ طالب علم نے اپنا سبق یاد کیا ہے یا نہیں دوم اس لئے کہ جس کو ابتلاء میں ڈالا گیا ہے۔ اُسکو معلوم ہو جائے کہ اُس کی کیسی حالت ہے کیونکہ عام لوگ خود بھی نہیں جانتے کہ فلاں بات ہم میں ہے یا نہیں۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ منافقوں کے متعلق فرماتا ہے۔ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (بقرۃ ع ۲) یعنی منافق فسادی ہیں مگر وہ اس امر کو سمجھتے نہیں کہ ہم فساد کر رہے ہیں سوم۔ اس لئے کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ اس شخص کی ایمانی حالت کیسی ہے۔ یہ مثال اعلیٰ درجہ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ سے سوال کیا تو اس کی غرض یہ تھی کہ فرشتوں کو معلوم ہو کہ آدمؑ میں کیا کیا طاقتیں ہیں۔ خدا تعالیٰ چونکہ علیم و خبیر ہے۔ اس لئے جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو پچھلے دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نہ کہ پہلے میں۔ اگر ابتلاء نہ آئے تو انسان ایمان میں ترقی نہ کر سکے۔ اور اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس کے ایمان کی کیا حالت ہے۔ (مزید تشریح کیلئے دیکھیں حل لغات سورۃ بقرۃ ۶)

ثَمَرَاتٌ

ثَمَرَات : اِس کے معنے پھلوں کے بھی ہوتے ہیں اور کوششوں کے نتائج کے بھی۔

لَنَبْلُوَنَّكُمْ

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ بشارت ایسی خبر کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے چہرہ پر اثر پڑے۔ خواہ وہ خوشی کی خبر ہو یا غم کی۔

تفسیر - اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ قسم کے ابتلاؤں کا ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنی ذات کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ان ابتلاؤں میں سے گذرے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک ابتلاء تو یہ ہوگا کہ دشمنوں کے حملوں کا خوف تمہیں لاحق ہوگا۔ ساری قومیں تمہارے خلاف کھڑی ہو جائیں گی۔ اور تم پر حملہ کریں گی۔ حکومتیں تم سے ناراض ہو جائیں گی۔ اور تمہیں مٹانے کی کوشش کرینگی۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے بزدل لوگ ڈر جاتے ہیں اور کہتے ہیں خدا جانے اب کیا ہوگا۔ اور بہت سے لوگوں کے حوصلے اس خوف کی وجہ سے پست ہو جاتے ہیں۔ اُن کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ فلاں حکومت نے ہمارے خلاف جتھہ بنا لیا ہے۔ یا پنچایت نے ہمارے خلاف فیصلہ کر دیا ہے۔

پھر اس سے ترقی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھوک کے ذریعے مومنوں کے ثبات قدم کا امتحان لیتا ہے۔ بھوک کی تکلیف سے یہ مراد ہے کہ جب خدا تعالیٰ کے مامور کی آواز پر ایک گروہ جمع ہو جاتا ہے تو لوگ اُن کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں۔ ملازمتوں سے برخواست کر دیتے ہیں۔ دوکانوں سے سودا نہیں دیتے۔ پیشہ وروں سے کام لینا بند کر دیتے ہیں گویا پہلے تو صرف دھمکیاں دیتے ہیں جن کی وجہ سے خوف لاحق ہوتا ہے کہ وہ کہیں نقصان نہ پہنچا دیں مگر بڑھ کر قدم پہ عملی رنگ میں بھوک اور افلاس کے سامان پیدا کر دیتے ہیں مثلاً یہ کہ انکو کوئی سودا نہیں دینا۔ ان کے پاس غلہ نہیں بیچنا۔ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا تو ہر قسم کے کھانے پینے کی چیزیں روک لی گئیں اور یہ بائیکاٹ کا سلسلہ ایک لمبے عرصہ تک جاری رہا۔

پھر فرماتا ہے کہ ان مصائب کا سلسلہ یہیں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ تمہارے مالوں کا لوٹنا بھی جائز قرار دے دیا جائیگا۔ گویا پہلے تو اپنے پاس سے مال و اسباب اور سودا اور غلہ وغیرہ دینا بند کیا جائیگا اور پھر مومنوں کے پاس جو کچھ اندوختہ ہوگا اُسے بھی لوٹنا جائز قرار دے دیا جائیگا۔ لیکن جب اس سے بھی کچھ نہیں بنتا تو پھر وہ مومنوں کی جانوں پر حملہ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ جان دینے سے بھی باز نہیں آتے تو اُن کی اولادوں پر حملے کرنے لگ جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے ہمارے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر بعض خبیث الطبع لوگ ایسے بھی آتے ہیں جو احمدیوں کے بچے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس ذریعہ سے جماعت کو دُکھ پہنچائیں۔ اسی طرح ثمرات کے نقصان سے یہ بھی مراد ہے کہ دشمن ان کی کوششوں میں رخنہ ڈالیں گے اور انہیں مختلف قسم کے منافع سے محروم کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ ادنیٰ درجہ کے مومنوں پر جو ابتلاء آتے ہیں۔ وہ تو اس لئے آتے ہیں کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اُن کی ایمانی حالت کیسی ہے۔ اور جو اعلیٰ درجہ کے مومنوں پر آتے ہیں وہ اس لئے آتے ہیں کہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ اُن کی کیا حالت ہے۔ عام طور پر لوگ اپنے متعلق خیال کرتے ہیں کہ انہیں ایمان میں ثبات قدم حاصل ہے مگر موقعہ آنے پر اُن سے کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے اندر یہ کمزوری ہے اور وہ اُس کو دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر ابتلاء آتا ہے تو انکو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر فلاں نقص بھی موجود ہے اور وہ اُسے دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ درجہ کے لوگوں پر ایسے ابتلاء لائے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کو معلوم ہو جائے کہ یہ کیسے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے ہیں کہ کوئی مصیبت ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کرتی۔ غرض بتایا کہ ہم تمہارے اندرونہ کو ظاہر کرنے کے لئے پانچ قسم کے ابتلاء تم پر وارد

کرینگے۔ جن میں سے ایک خوف ہوگا جو بیرونی دُکھ کا نام ہے دوسرا ابتلاء بھوک کا ہوگا۔ جو اندرونی تکلیف ہے۔ گویا بعض کو بیرونی دکھوں اور تکالیف کے ذریعہ اور بعض کو اندرونی تکلیفوں کے ذریعہ سے ہم آزمائیں گے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لڑائی کے لئے تو تیار ہو جاتے ہیں مگر بھوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ فوجوں میں سپاہی لڑتے ہیں مگر چونکہ وہ بھوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لئے انہیں چنے وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ مگر مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی وہ خدا کے لئے بھوکا رہنے کو بھی تیار ہو جاتا ہے۔ جیسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ کو باہر بھیجا تو اُن میں سے کسی نے بھی یہ نہ پوچھا کہ ہم کھائینگے کیا۔ چنانچہ وہ پتے کھا کر گذارہ کرتے تھے۔ اسی طرح ایک دفعہ انہوں نے کھجوروں کی گٹھلیاں کھا کر گذارہ کیا۔ پس فرمایا ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ تم بہادر ہو یا نہیں اور یہ بھی کہ تم بھوک برداشت کرتے ہو یا نہیں۔

پھر بعض لوگ بھوک اور خوف تو برداشت کر لیتے ہیں مگر مال کے خطرہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ بعض مال کے خطرہ کو برداشت کر لیتے ہیں مگر جان کے خطرہ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پس فرماتا ہے تمہیں مالی اور جانی نقصانات بھی برداشت کرنے پڑیں گے اور بعض دفعہ اپنی کوششوں کے نتائج سے بھی محروم رہنا پڑیگا۔ ثمرات کے کم ہونے کی مثال اُحد کی جنگ ہے۔ کہ وہ کفار سے لڑے بھی اور شہید بھی ہوئے مگر انہیں اس کا ثمرہ نہ ملا۔ اسی طرح ثمرات کے نقصان میں تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کی بربادی بھی شامل ہے۔ جو جنگ کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ غرض بتایا کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوگا کہ تم کام کروگے مگر اس کے فوائد تمہاری امیدوں کے مطابق نہیں نکلیں گے۔ مگر فرمایا۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ وہ لوگ جو ان تمام ابتلاؤں کو برداشت کریں گے اور ایمان پر مضبوطی سے قائم رہیں گے۔ اُن کو کوئی ڈر نہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر لوگ ہمیں ڈراتے ہیں تو بے شک ڈرائیں۔ اگر ہمارا مقاطعہ کرتے ہیں تو بے شک کریں۔ اگر وہ ہمیں سودا سلف نہیں دیتے تو بے شک نہ دیں۔ ہم تو خدا تعالےٰ کے رستے میں قربانیاں کرتے چلے جائیں گے۔ اسی طرح اگر وہ ہمارے مال لوٹنے پر لگے ہیں تو بے شک لوٹ لیں۔ اور پھر جب وہ اُن کی جانوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم ہمیں قتل کر کے بھی دیکھ لو۔ اور جب وہ ان کی اولادوں پر حملہ کر کے اُن کی تباہی کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اچھا تم یہ کام بھی کر کے دیکھ لو۔ ہمیں تمہارے ان کاموں کی بھی پروا نہیں۔ غرض ابتداء سے انتہا تک وہ اُن کے ہر حملہ کے مقابلہ میں قائم رہتے ہیں۔ اور یہی کہتے رہتے ہیں کہ جو کچھ تمہاری مرضی ہے کر کے دیکھ لو۔ تم ہمیں صداقت سے منحرف نہیں کر سکتے۔ جب وہ پانچوں قسم کے ابتلاؤں سے پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ اُن میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور استقلال سے اُن کو برداشت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں بشارت دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ مبارک ہو۔ تمہارے ایمان کی پختگی ثابت ہو گئی۔ تم امتحان میں پاس ہو گئے اب تم اگلی جماعت کی تیاری کرو۔

صبر سے یہ مراد نہیں کہ انسان کو غم نہ ہو بلکہ صبر سے مراد یہ ہے کہ ایسا غم نہ ہو جس سے حواس جاتے رہیں اور عقل اور قوتِ عملیہ باطل ہو جائے۔ یہ کیسی اعلیٰ درجہ کی فطرتِ انسانی کے مطابق تعلیم ہے۔ نہ غم سے روکا کہ وہ فطرتی امر ہے۔ نہ جزع فزع اور کام چھوڑ دینے کی اجازت دی کہ یہ بزدلی اور کم ہمتی کی علامت ہے۔

اس آیت سے بھی پتہ لگتا ہے کہ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں قبلہ کی طرف مُنہ کرنے کا ذکر نہ تھا بلکہ فتح مکہ کا ذکر تھا۔ ورنہ قبلہ کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مارے جانے

اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

جن پر جب (بھی) کوئی مصیبت آئے (گھبراتے نہیں بلکہ یہ) کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ۱۷۱ے

اور اِن ابتلاؤں میں پڑنے کا کیا تعلق تھا۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس آیت میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ تم نے مکہ فتح کرنا ہے۔ مگر وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ میں بتایا کہ کام آسانی سے نہیں ہوگا بلکہ تمہیں سخت تکالیف میں سے گذرنا ہوگا۔ لیکن یہ تکالیف تمہارے لئے بہتر ہونگی کیونکہ ان سے تمہارے ایمانوں کی پختگی ظاہر ہو جائیگی۔

مُصِيْبَةٌ

۱۷۱ے حل لغات:- مُصِيْبَةٌ۔ ہمارے ملک میں مصیبت ان تکلیف دہ واقعات کو کہتے ہیں جو انسان کو پیش آتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں مصیبت ایسی چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو بہرحال پہنچنے والی ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان مشکلات سے بھاگتا اور ناپسندیدہ باتوں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ اور جو چیزیں اس کی خوشی اور مسرت کا باعث ہوتی ہیں اُن کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے پس جس چیز کی طرف انسان خود بخود جائے وہ پہنچنے والی نہیں کہلا سکتی۔ لیکن جس سے انسان بھاگے اور [illegible] اُسے پکڑلے وہ پہنچنے والی کہلاتی ہے۔ اور چونکہ مصیبت سے ہر انسان بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مصیبت اسے آچمٹتی ہے۔ اس لئے عربی زبان میں ایسی چیز کو جو انسان کا پیچھا نہ چھوڑے اور اس کے پاس پہنچ کر رہے مصیبت کہتے ہیں۔ لیکن اردو میں خالص اس کے وہی معنے رہ گئے ہیں جو عربی میں ضمنی تھے اور مصیبت صرف اس بات کو کہتے ہیں جو تکلیف [illegible] ہو۔

تفسیر:- اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب مومن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو [illegible] جزع فزع کرنے کی بجائے پورے یقین اور ایمان کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہم لوٹنے والے ہیں۔ یہ وہ نمونہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں سے امید رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچے تو وہ گھبرانے اور جزع فزع کرنے کی بجائے خدا تعالیٰ پر توکّل رکھیں اور اُسی کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے سچے دل سے یہ کہیں کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ہے مگر اپنے اندر نہایت وسیع مطالب رکھتا ہے۔

(۱) اس فقرے میں دو جملے ہیں۔ ایک تو اِنَّا لِلّٰهِ ہے یعنی ہم اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اور دوسرا اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ہے۔ یعنی ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پہلا جملہ اِس مضمون پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی مالک اپنی چیز کو اپنے ہاتھوں تباہ نہیں کرتا بلکہ اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ [illegible] مالک بڑا ہی بیوقوف ہوگا جو اپنی چیز کو آپ تباہ کرنے کی کوشش کرے۔ پس اگر بندہ محض خدا کا ہو جائے اور اُسی کو اپنا حقیقی مالک سمجھے تو اس کے دل میں یہ وہم بھی نہیں آسکتا کہ وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے واپس لے لی ہے یا وہ مصائب جو مجھ پر نازل ہو رہے ہیں اُن میں میری تباہی اور بربادی مقصود ہو۔ جو مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ مَیں اللہ کا ہوں اور جس طرح ماں اپنے بچہ کو گود میں رکھتی ہے اِسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی مجھے اپنی گود میں اٹھایا ہوا ہے وہ یہ تصوّر بھی کس طرح کر سکتا ہے کہ مَیں تباہ کیا جاؤنگا۔ اور میری تکالیف مجھ سے [illegible] نہیں کی جائیں گی۔ محافظ کا تو فرض ہوتا ہے کہ [illegible] دوسرے کو ہر نقصان سے بچائے۔ پھر اللہ تعالیٰ جو تمام محافظوں سے بڑا محافظ ہے کب کسی مومن کو تباہ کر سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ جب کوئی چیز اپنے بندے سے واپس لیتا ہے

تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اس چیز کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے پہلے سے زیادہ بہتر جگہ میں رکھتا ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے عورتیں اپنے گھروں کی صفائی کرتے وقت سامان وغیرہ کو ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتی ہیں۔ تم کبھی نہیں دیکھو گے کہ عورتیں اپنی چیزوں کو اِدھر اُدھر رکھیں تو وہ رونے لگ جائیں۔ یا مثلاً زمیندار کھیت میں بیج ڈالتا ہے۔ تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیج کو ضائع کر رہا ہے مگر وہ روتا نہیں اسلئے کہ اس کا نتیجہ تباہی نہیں بلکہ ترقی ہوتا ہے۔ چنانچہ وہی بیج جب کچھ عرصہ کے بعد اُسے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شکل میں واپس ملتا ہے تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بندہ اگر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کریگا اُس میں میری بہتری ہو گی تو کبھی بھی جزع فزع اور بے صبری کا اظہار نہ کرے۔ جب انسان ایک خوبصورت عمارت بناتا اور پہلی عمارت کو توڑتا پھوڑتا ہے تو اُس پر روتا نہیں۔ بلکہ خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کپڑے کا دل اور اُس کی آنکھیں ہوتیں تو جب درزی اُسے کاٹتا تو وہ رونے کی بجائے خوش ہوتا کہ یہ مجھے اچھا بنانے لگا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے اگر انسان یہ یقین رکھے کہ خدا تعالیٰ میرا مالک ہے۔ اور وہ جو تبدیلی بھی کریگا میرے فائدہ کے لئے کریگا تو وہ جزع فزع نہیں کر سکتا۔ ہاں غم کا اظہار کرنا صبر کے خلاف نہیں ہوتا۔ شادی کے وقت لڑکیاں اپنے گھروں کو رخصت ہوتی ہیں تو ماں باپ رونے لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ جزع فزع نہیں کہلاتا۔ کیونکہ غم درحقیقت ایک قدرتی احساس ہے جو مصیبت کے وقت ہر انسان کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی علامت دل پر بوجھ ہونا اور آنکھوں میں آنسو آ جانا ہے۔ لیکن جزع فزع کرنے والا اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ خدا نے اُسے تباہ کر دیا ہے اور یہ چیز مومنانہ توکل اور ایمان کے بالکل خلاف ہے۔ پس اِنَّا لِلّٰہِ میں یہ بتایا گیا ہے کہ مصیبت یا ابتلاء کے آنے پر کافر تو یہ سمجھتا ہے کہ میں مارا گیا لیکن مومن یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بلا میں بھی میرے لئے کوئی خیر اور برکت کا پہلو پوشیدہ رکھا ہوگا۔

(۲) اِنَّا لِلّٰہِ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ مومن کو جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ جھٹ کہتا ہے کہ میرا تو اس چیز کے ساتھ صرف ایک عارضی تعلق تھا اصل تعلق تو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اُسی کی خاطر اس چیز سے بھی میرا تعلق تھا اب اگر اُس نے اپنی کسی حکمت کے باعث یہ چاہا ہے کہ میرا اس چیز سے تعلق ٹوٹ جائے تو میں اس کے فعل پر کیوں اعتراض کروں۔ اس کی مثال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ ہمارا چھوٹا بھائی مبارک احمد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ہی فوت ہو گیا تھا۔ ماں باپ کو عموماً چھوٹے بچے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اُس سے بہت اُنس تھا۔ اور پھر اس لئے بھی آپ اس سے زیادہ پیار کرتے تھے کہ وہ عموماً بیمار رہتا تھا۔ میری عمر جب وہ فوت ہوا اٹھارہ سال کے قریب تھی۔ اس کی آخری بیماری کے ایام میں اُسکا علاج کرنے میں بہت سے معالج مصروف تھے۔ مثلاً حضرت خلیفۃ المسیح اوّل رضی اللہ عنہ۔ ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین صاحب ڈاکٹر سید عبدالستار شاہ صاحب۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اُس روز صبح کی نماز پڑھ کر گھر آئے تو ساتھ ہی حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ اور ڈاکٹر صاحبان بھی آ گئے۔ اُس وقت اُسے ضعف کی شکایت تھی۔ لیکن چہرہ سے اچھی حالت معلوم ہوتی تھی ڈاکٹروں نے اُسے دیکھ کر کہا کہ اب افاقہ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ مطمئن ہو گئے۔ لیکن حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ چونکہ زیادہ تجربہ کار تھے اس لئے آپ نے فوراً معلوم کر لیا کہ بچہ کی حالت نازک ہے۔ انہوں نے گھبرا کر فوراً نبض دیکھنی شروع کر دی۔ لیکن نبض کی حرکت معلوم نہ ہوئی۔ کیونکہ جوں جوں انسان موت کے قریب ہوتا جاتا ہے اُس کی نبض

پیچھے ہٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر آپ نے اسکی بغل میں ہاتھ رکھا وہاں بھی نبض نہ ملی جب حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ نبض نہیں ملتی تو آپ نے گھبرا کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے عرض کیا کہ حضور جلدی مشک دیجیئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام ٹرنک میں سے مشک نکالنے کیلئے تشریف لیگئے تو چونکہ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے بہت زیادہ محبت تھی اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام مبارک احمد سے بہت پیار رکھتے ہیں اس لئے آپ نے جب دیکھا کہ مبارک احمد فوت ہو رہا ہے تو آپ کو اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ آپ کھڑے بھی نہ رہ سکے۔ زمین پر بیٹھ گئے اور فرمایا حضور جلدی مشک لائیے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس فقرہ سے سمجھ گئے کہ بچے کی حالت اچھی نہیں اور ویسے ہی بغیر مشک لئے واپس آگئے۔ اور فرمایا۔ کیا بچہ فوت ہو گیا ہے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہاں حضور فوت ہو گیا ہے۔ آپ نے فوراً اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا۔ اور بجائے کسی گھبراہٹ کا اظہار کرنے کے باہر کے احمدیوں کو خط لکھنے شروع کر دیئے کہ مومنوں پر ابتلاء آیا ہی کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ بلکہ اپنے ایمان کو پختہ رکھنا چاہیئے۔ اور پھر لکھا کہ مبارک احمد کی وفات کے متعلق تو اللہ تعالےٰ نے پہلے سے مجھے خبر دے دی تھی کہ یہ چھوٹی عمر میں ہی اُٹھا لیا جائیگا۔ پس اس کے فوت ہونے سے خدا تعالیٰ کی پیشگوئی پوری ہو گئی ہے۔ پھر آپ نے اس کے کتبہ کے لئے جو اشعار لکھے اُن میں سے ایک یہ بھی مصرعہ ہے کہ ؎

بلانے والا ہے سب سے پیارا اُسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

یہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ہی ایک رنگ میں مفہوم رکھتا ہے۔ غرض مومن کو جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا تو خدا سے تعلق ہے اگر میرے کسی عزیز کو خدا تعالےٰ نے اپنے پاس بلا لینا مناسب سمجھا ہے تو مجھے اسپر کیا شکوہ ہو سکتا ہے۔ اُسی کی چیز تھی اور وہی بلانے کا حق دار تھا۔ پس اِنَّا لِلّٰہِ کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں تباہ نہیں کریگا اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ ہمارا تعلق صرف خدا کی وجہ سے ہے۔ پس جس بات میں ہمارا خدا راضی ہے اس میں ہم بھی راضی ہیں۔

(۳) تیسری بات جو قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے اَنَا لِلّٰہِ نہیں فرمایا۔ بلکہ اِنَّا لِلّٰہِ فرمایا ہے تاکہ یہ اقرار صرف انفرادی رنگ میں نہ ہو بلکہ ہر انسان علیٰ وجہ البصیرت اس یقین پر قائم ہو کہ دنیا کی ہر چیز خدا تعالیٰ کی ہے اور ہمارا آپس میں محض عارضی تعلق ہے پس نہ صرف مجھے بلکہ دنیا کے کسی انسان کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے کسی فعل پر اعتراض کرے یا اس کی کسی تلخ قاش پر اپنا موہنہ بنانا شروع کر دے۔ مثنوی رومیؒ میں حضرت لقمان کے متعلق جن کو بعض لوگ نبی بھی سمجھتے ہیں ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ انہیں کسی نے ان کے والدین کی وفات کی وجہ سے غلام بنا لیا اور ایک تاجر کے پاس بیچ دیا۔ اس تاجر نے انہیں ذہین اور ہوشیار سمجھ کر ان سے غلاموں والا سلوک ترک کر دیا اور ان سے محبت کرنے لگا۔ ایک دن کسی نے اسکو تحفۃً ایک خربوزہ پیش کیا جو بظاہر بہت اچھا تھا۔ اُس نے ایک قاش کاٹ کر حضرت لقمان کو دی۔ انہوں نے چکھی تو نہایت کڑوی تھی۔ لیکن بڑے مزے سے لے کر کھانی شروع کر دی مالک نے ایک اور قاش کاٹ کر دے دی۔ حضرت لقمان نے پھر مزے لے لے کر کھائی۔ حتیٰ کہ تاجر نے یہ سمجھ کر کہ یہ بڑا میٹھا خربوزہ ہے ایک قاش خود بھی چکھی تو اُسے معلوم ہوا کہ نہایت کڑوا خربوزہ ہے۔ اس پر وہ حضرت لقمان کو خفا ہوا کہ تم نے بتایا کیوں نہیں۔ اگر تم بتاتے تو میں تمہیں اور کڑوی قاشیں تو نہ کھلاتا۔ حضرت لقمان نے کہا۔ کہ جس ہاتھ سے اتنی میٹھی قاشیں میں نے کھائی ہوئی ہیں کیا میں اتنا ہی بے شرم تھا کہ اس کی ایک دو قاشوں کو

گا دی سمجھ کر رد کر دیتا۔ تو اِنَّا لِلّٰہِ کا بھی یہی مفہوم ہے
کہ وہ خدا جس نے ہمیں اتنی بڑی نعمتیں عطا کی ہوئی ہیں اگر اُس نے
کسی حکمت کے ماتحت ایک نعمت واپس لے لی ہے۔ یا ہزاروں
خوشیوں کے ہوتے ہوئے۔ ایک مصیبت ہم پر آگئی ہے تو
کیا ہوا سب کچھ تو اُسی کا دیا ہوا ہے اگر وہ اپنی مرضی سے
ایک چیز واپس لے لیتا ہے تو اُس پر جزع فزع کرنے سے
زیادہ اور کیا حماقت ہو سکتی ہے۔

(۴) چوتھے معنے جو اس سے زیادہ اعلیٰ اور مومن کے
مقام کے مطابق ہیں وہ یہ ہیں کہ نہ صرف سب کی سب نعمتیں
اُسی کی ہیں اور وہی اُس کا حقیقی مالک ہے اگر ایک نعمت اس
نے واپس لے لی تو کیا ہوا۔ بلکہ ہمارے پاس جو کچھ باقی ہے
اگر وہ بھی ہم سے لے لینا چاہے تو ہم باقی چیزیں بھی اس کی
راہ میں دینے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ میں اس کی
بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ ایک بڑے
مخلص صحابی تھے اور مکی زندگی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
پر ایمان لائے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن سے اتنی
محبت تھی کہ اُن کی وفات کے بعد جب آپؐ کے بیٹے حضرت
ابراہیمؑ فوت ہوئے تو آپ نے انہیں فرمایا کہ جا اپنے بھائی
عثمان بن مظعونؓ کے پاس۔ گویا ان کو بھی رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنا بیٹا قرار دیا۔ وہ کسی رئیس کے بیٹے تھے انکے
والد فوت ہوگئے تو ان کے باپ کے کسی دوست نے ان کو
اپنی پناہ میں لے لیا اور اعلان کر دیا کہ یہ میرے بھائی کا بیٹا
ہے کوئی شخص اسے تکلیف نہ دے۔ چند دن تو وہ آزادانہ
طور پر پھرتے رہے اور انہیں کسی نے کوئی تکلیف نہ دی لیکن
ایک دن انہوں نے دیکھا کہ بعض کمزور مسلمانوں اور غلاموں
کو کفار سخت تکلیف دے رہے ہیں اور انہیں تپتی ریت پر
لٹا کر دکھ دے رہے ہیں۔ اُن سے یہ نظارہ برداشت
نہ ہو سکا اور فوراً گھر آکر اُس رئیس سے کہا کہ چچا مہربانی کرکے
اپنی پناہ واپس لے لو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ دوسرے
مسلمانوں کو تو لوگ سخت سے سخت سزائیں دیں اور میں مزے
سے اِدھر اُدھر پھیروں۔ چنانچہ اُس رئیس نے اپنی پناہ کا اعلان
منسوخ کر دیا۔ اسی اثناء میں لبید جو ایک بہت بڑا شاعر
تھا اور جو بعد میں مسلمان بھی ہو گیا۔ وہ مکہ میں آیا۔ اور
لوگوں نے اس کے اعزاز میں ایک مجلس مشاعرہ قائم کی حضرت
عثمان بن مظعونؓ اور وہ رئیس بھی وہیں تھے۔ اکثر شعراء نے
اپنے اپنے شعر پڑھے۔ پھر لبید کی باری آئی تو انہوں نے
یہ شعر پڑھا۔ کہ

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلُ

یعنی سُنو! کہ ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کے سوا فنا ہونیوالی ہے
ابھی انہوں نے یہ مصرع پڑھا ہی تھا کہ حضرت عثمان
بن مظعونؓ بول اُٹھے کہ خوب کہا ٹھیک کہا۔ اس پر لبید
کو غصہ آیا کہ کیا میں اِتنا ہی حقیر ہوں کہ اس چھوٹے سے بچے
کی تصدیق کا محتاج ہوں۔ اور اُس نے اہلِ مجلس کو غیرت دلائی
کہ یہ کیا بدتہذیبی ہے جو تم لوگوں نے اختیار کر لی ہے کہ ایک
بچہ مجھے داد دیتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عثمانؓ بن مظعون
کو ڈانٹا اور کہا کہ خبردار آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اس کے بعد انہوں
نے دوسرا مصرع پڑھا کہ ؎

وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلُ

یعنی ہر نعمت ایک دن زائل ہونے والی ہے۔ اس پر حضرت
عثمان بن مظعون پھر بول اُٹھے اور کہنے لگے۔ یہ درست نہیں
جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہونگی۔ لبید کو سخت غصہ آیا
اور اس نے پھر لوگوں کو غیرت دلائی کہ تم نے میری بے عزتی کی ہے
اب میں کوئی شعر نہیں پڑھونگا۔ اس پر ایک شخص کو اِتنا
جوش آیا کہ اُس نے اُٹھکر عثمان بن مظعون کے مُنہ پر ایک
مکّا مارا۔ جس کی وجہ سے اُن کی ایک آنکھ نکل گئی۔ تب
وہ پہلے رئیس جنہوں نے اُن کو پناہ دے رکھی تھی۔ وہ
بھی وہیں پاس بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ اتنی طاقت نہیں رکھتے
تھے کہ دوسروں کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں۔ اس لئے

انہوں نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ہی ڈانٹنا شروع کر دیا۔ اور جس طرح کسی غریب عورت کے بچے کو کوئی امیر آدمی کا بچہ مار جائے تو وہ اپنے بچے کو ہی ڈانٹتی ہے اور کہتی ہے کہ تُو گھر سے کیوں باہر نکلا تھا۔ اِسی طرح انہوں نے بھی حضرت عثمان بن مظعونؓ کو ڈانٹنا شروع کیا کہ تجھے مَیں نے نہیں کہا تھا کہ میری پناہ سے نہ نکلو۔ اب دیکھا اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ اِس پر حضرت عثمان بن مظعونؓ نے جواب میں کہا۔ چچا! آپ کو تو میری ایک آنکھ کے نکلنے کا افسوس ہے اور میری تو دوسری آنکھ بھی خدا تعالیٰ کے راستے میں نکلنے کے لئے تیار ہے۔

تو حقیقی مومن قربانی سے گھبراتا نہیں بلکہ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے یا اس کی کوئی قیمتی متاع ضائع ہو جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ مرنے والا اور باقی رہنے والے سب اُس کے ہی ہیں۔ پس اگر وہ اللہ کی چیز تھی اور ہم بھی اُسی کے ہیں تو اللہ تعالیٰ اگر اپنے ایک غلام کے پاس رکھوائی ہوئی امانت واپس لے گیا تو اسے شکوہ کا کیا حق ہے۔ مَیں تو سب کچھ اُس کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(۵) مگر یہ پہلا حصہ کچھ استغناء ظاہر کرتا ہے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم فرما کر دوسرا حصہ اُس کے ساتھ لگا دیا کہ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اور اس طرح اِس تعزیت کو مکمل فرما دیا۔ پہلے فرمایا تھا کہ اگر ہم تم کو کوئی انعام دیتے ہیں اور پھر وہ انعام تم سے لے لیتے ہیں تو تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ میرے محسن نے فلاں چیز مجھے دی تھی اور مَیں اس سے پانچ سال یا دس سال یا بیس سال یا تیس سال یا چالیس سال یا پچاس سال تک فائدہ اٹھاتا رہا اس کے بعد وہ اپنی امانت مجھ سے کیوں لے گیا۔ اِس بات پر اُسے شکوے کا کیا حق ہے۔ یہ تو اس کا احسان تھا کہ جتنی مدت وہ چیز اُس کے پاس رہی اس سے وہ پوری طرح فائدہ اُٹھاتا رہا۔ اب اس کے بعد فرماتا ہے کہ یاد رکھو اگر تمہارا کوئی عزیز ہم نے تم سے جُدا کر دیا ہے تو مومن کو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ دنیا سے کسی کا اُٹھ جانا دائمی جُدائی کا موجب تو نہیں ہوتا۔ اگر یہ دائمی جُدائی ہوتی اور فرض کرو کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہ ہوتی۔ تب بھی کیا خدا کا حق نہیں تھا کہ جو چیز اُس نے دی ہے وہ اُسے واپس لے لے۔ لیکن وہ زائد وعدہ یہ کرتا ہے کہ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ ایک شخص اگر خدا کی طرف گیا ہے تو ہم بھی ایک دن اُسی کی طرف چلے جائیں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کسی نے پہلے سفر طے کر لیا اور کوئی بعد میں سفر کے لئے چل پڑیگا ورنہ منزلِ مقصود سب کی ایک ہی ہے اور جب منزلِ مقصود ایک ہی ہے تو اس میں گھبراہٹ کی کونسی بات ہے۔ بچے بعض دفعہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اب کسی کی زندگی کا کیا اعتبار ہوتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک یا دو دن بھی اور زندہ رہیگا۔ نہ والدین جانتے ہیں کہ انہوں نے اِتنا عرصہ زندہ رہنا ہے۔ نہ لڑکے جانتے ہیں کہ اُنکی زندگی کب تک ہے۔ مگر باوجود اس کے جب لڑکوں کو پڑھنے کے لئے ولایت بھیجا جاتا ہے تو پانچ پانچ چھ چھ دس دس سال تک مائیں صبر کرتی ہیں۔ باپ صبر کرتے ہیں۔ اور وہ گھبراہٹ سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ آخر ہمارے بچے ایک دن آ جائیں گے۔ یا اگر کسی سفر پہ کوئی شخص پہلے چل پڑتا ہے اور دوسروں نے بھی وہیں جانا ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم چند دن کے بعد اُس سے جا ملیں گے جانا تو ہے ہی۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے یہ اقرار کرو کہ خدا نے ہم پر جو احسان کیا ہے ہم اس کے شکر گزار ہیں پھر یہ بھی سمجھ لو کہ تم سارے ایک دن خدا کے پاس جمع ہونے والے ہو اور اس کے پاس پہنچ کر اکٹھے ہو جاؤ گے۔ پس فرماتا ہے۔ جب تم سارے ایک دن اکٹھے ہونے والے ہو تو خدا کے فعل پر شکوہ یا جزع فزع کتنی بڑی نادانی ہے۔ اگر تم جزع فزع کروگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا

اپنے عزیزوں سے اُن کا اتصال کمزور ہو جائیگا۔ کیونکہ جس خدا کے اختیار میں یہ ہے کہ وہ اگلے جہان میں سب کو اکٹھا کرے اس کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ وہ اگلے جہان میں بعض کو جُدا جُدا رکھے۔ پس مومن کی اصل تعزیت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ہی ہے۔ باقی جہاں تک جسم کا تعلق ہے۔ جسم جب کٹتا ہے تو ضرور دکھ پاتا ہے۔ صحابہؓ جنگوں میں شہید ہوئے۔ اور اپنی خوشی سے شہید ہوئے۔ لیکن جہاں تک جسم کے کٹنے کا سوال ہے ان کو ضرور تکلیف ہوئی۔ پس جسم بے شک دُکھ پاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہوتا ہے اُس بندے پر جس کی رُوح خدا کے آستانہ پر جھکی رہے اور اُس سے کہے کہ اے میرے رب! مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ تونے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ یہی میں مصلحت تھی اور یہی چیز میرے لئے بہتر تھی۔ تیرا فعل بالکل درست ہے اور گو مجھے سمجھ میں نہ آئے مگر میں یہی کہتا ہوں کہ تیرا کوئی کام حکمت کے بغیر نہیں۔

(۶) پھر اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ میں ایک اور مضمون بھی بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جب کوئی رنج انسان کو پہنچتا ہے۔ تو فطرت کہتی ہے کہ میرے اندر آخر کوئی کمزوری تھی۔ تبھی تو مجھے یہ دُکھ پہنچا۔ اگر میں طاقتور ہوتا تو یہ دُکھ کیوں پہنچتا۔ اب اِس دُکھ کو کوئی طاقتور ہی دُور کر سکتا ہے۔ غرض رنج ہمیشہ اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی بیرونی طاقت مدد کرے۔ اور جب انسانی ذہن کو فطرت اِس طرف لے جاتی ہے کہ اب کوئی غیر طاقت ہی مدد کرے تو معاً اُس کا دل اِدھر مائل ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس دُکھ کو دُور کرے۔ چنانچہ اُس وقت وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا ہی ہوں اور میں اسی سے مدد مانگتا ہوں۔ اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے جو میری مدد کرے۔ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کے بے شک یہ بھی معنے ہیں کہ آخر ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے لیکن اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ اگر ہم نے لوٹنا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ اگر ہم نے گریہ وزاری کرنی ہے تو اُس کے سامنے ہی کرنی ہے۔ پس اسلام نے یہ سبق فطرت کے تقاضا کے عین مطابق دیا ہے جب کوئی دکھ پہنچتا ہے تو یہ انسان کی کمزوری کی علامت ہوتی ہے اس لئے وہ اُسے خود دُور نہیں کر سکتا۔ وہ طبعاً یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے دوست اور عزیز اس کی مدد کریں۔ مگر فرمایا۔ یاد رکھو تمہارا سب سے بڑا عزیز اور دوست خدا تعالیٰ ہے۔ تم اُس کے سامنے جھکو اور اس سے مدد طلب کرو۔ جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سبق پر عمل کرتے ہیں وہ ناکام و نامراد نہیں رہتے۔ ناکام و نامراد وہی ہوتا ہے جو غیر طبعی فعل کرتا ہے۔ مثلاً رات کو ڈاکہ پڑتا ہے تو عقلمند شخص اپنے عزیزوں اور دوستوں کے پاس جاتا ہے اور اُن سے مدد طلب کرتا ہے۔ لیکن بیوقوف انسان دوڑ کر جنگل کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ جنگل میں اُس کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسی طرح رُوحانی دنیا میں ایک عقلمند انسان تو خدا تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔ لیکن بیوقوف یونہی ہائے فلاں ہائے فلاں! کہتا رہتا ہے۔ اب صاف ظاہر ہے کہ فلاں نے کیا کرنا ہے۔ جو کچھ کرنا ہے خدا تعالیٰ نے ہی کرنا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے پاس جاتا نہیں۔ وہ اس کے پاس جاتا ہے جو کچھ نہیں کر سکتا۔ پس انسان کا فرض ہے کہ جب اُسے کوئی رنج پہنچے تو وہ فوراً اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہے۔ یعنی اگر مجھ پر مصیبت آگئی ہے تو بقول پنجابی بزرگوں کے "مُلّا کی دوڑ مسیت تک" میں نے تو خدا تعالیٰ کی طرف جانا ہے اور اُس سے مدد طلب کرنی ہے اور جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اپنی برکات سے حصہ دیتا اور اس کے مصائب کو دُور فرما دیتا ہے۔

(۷) اسی طرح وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ میں یہ لطیف مضمون بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے ربّ کی طرف سے برکتیں (نازل ہوتی) ہیں اور رحمت (بھی)

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۱۵۸)

اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں ۲۷

اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پس اگر ہم صبر سے کام لیں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس صدمہ کا بہتر بدلہ مل جائے گا پھر ہمیں کسی جزع فزع کی کیا ضرورت ہے۔ گھبراہٹ صرف اُسے ہو سکتی ہے جو یہ سمجھتا ہو کہ دُکھوں اور تکالیف کے بدلہ میں کوئی جزا مقدر نہیں۔ مگر مومن تو سمجھتے ہیں کہ جب ہم خدا تعالیٰ کے پاس جائینگے تو وہ ہمارے دکھوں کا بدلہ اپنے غیر معمولی انعامات کی شکل میں ہمیں عطا فرمائیگا۔ اور جب کوئی ایمان اور یقین کے اِس اعلیٰ مقام پر فائز ہو تو اُسے بے صبری دکھانے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صابرین کی تعریف فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ہمارے نزدیک کون لوگ صابر ہیں۔ اسلام کے نزدیک صابرین کی یہ تعریف ہے کہ جب انکو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اُن کی توجہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف پھر جاتی ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو پھر مایوسی کیسی ایک بچہ جب ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ اِسی طرح وہ بھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کی گود میں سمجھتے ہیں اس لئے کسی مصیبت کے آنے پر مایوس نہیں ہوتے۔ اور اگر صبر کے معنے بدی سے رُکنے کے سمجھے جائیں تو پھر اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ جب اُن پر کوئی ایسی تکلیف آتی ہے جس سے انسان بدی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ جیسے قحط ہے کہ اس میں لوگ چوریاں وغیرہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ تب بھی وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اور اگر صبر سے مراد نیکی پر قائم رہنا ہو تو اس کے یہ معنے ہونگے کہ جب کوئی شیطانی تحریک انہیں نیکی سے منحرف کرنا چاہے تو اُس وقت بھی وہ فوراً خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اسی سے اپنے رُوحانی پیوند کا اظہار کرتے ہیں۔

غرض یہ بظاہر ایک چھوٹا سا جملہ ہے۔ مگر اپنے اندر بڑے وسیع مطالب رکھتا ہے۔ اور جو لوگ صاحب حال ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس فقرہ کے کہنے سے جن تکالیف کا ازالہ ممکن ہو اُن کا تو ازالہ ہو جاتا ہے اور جن کا ازالہ ناممکن ہو ان کا انسان کو کسی اور رنگ میں بدلہ مل جاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی یہ سُنت ہے کہ مُردے اس دنیا میں واپس نہیں آتے۔ پس اگر کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس سنت اور فیصلہ کے ماتحت وہ زندہ ہو کر اس دنیا میں واپس نہیں آسکتا۔ لیکن اگر یہ فقرہ پورے ایمان اور اخلاص کے ساتھ کہا جائے تو کہنے والے کو کسی نہ کسی رنگ میں اس کا بدلہ ضرور مل جاتا ہے۔ اور اگر انسان کا کوئی ایسا نقصان ہو جائے جس کا بدلہ ملنا ممکن ہو مگر پھر بھی نہ ملے تو اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر خاص اس میں روک بن رہی ہے ورنہ اس کا بدلہ ضرور مل جاتا۔

صَلٰوۃ

۲۷ حل لغات۔ صَلٰوۃ : جیسا کہ اوپر حل لغات میں بتایا جا چکا ہے صَلٰوۃ کے کئی معنے ہیں۔ مگر جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے صرف مغفرت اور حسنِ ثناء کے ہوتے ہیں۔ صلوٰت کے معنے اس لئے چسپاں نہیں ہو سکتے کہ عبادت خدا تعالیٰ کی کی جاتی ہے اس کی طرف سے آتی نہیں۔ اسی طرح رحمت کے معنے بھی یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ صَلٰوۃ کے ساتھ ہی رحمت کا لفظ بھی آگیا ہے

پس اس جگہ اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ ان لوگوں کو خدا تعالیٰ کی طرف سے مغفرت حاصل ہوگی یا انہیں ثنائے جمیل عطا کی جائیگی۔

تفسیر :۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ارضی اور سماوی آفات پر سچے دل سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی مغفرت سے حصّہ دیتا ہے۔ یعنی وہ اُن کے نقصانات کا ازالہ کرتا اور انکی ناکامی کو کامیابی میں اور تکلیف کو راحت میں بدل دیتا ہے۔ اِسی طرح اُن پر اللہ تعالیٰ کا فضل حسنِ ثناء کی صورت میں نازل ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اُن کی نیک شہرت دنیا میں قائم کر دیتا ہے۔ اور لوگوں کی زبانوں پر اُن کا ذکرِ خیر جاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمانوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کتنی بڑی قربانیوں سے کام لیا تھا۔ انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں اور اولادوں کو بلا دریغ قربان کر دیا اور کسی بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پرواہ نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دشمنانِ اسلام تک بھی اُن کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ اسلام پر اعتراض کرتے ہیں مگر جب صحابہؓ کی قربانیوں کا ذکر آتا ہے تو وہ یہ تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے جو نمونہ دکھایا وہ یقیناً بے مثال تھا۔ ایک فرانسیسی مؤرخ لکھتا ہے۔ کہ مجھے سب سے زیادہ حیرت اِس بات پر آتی ہے کہ ہمیں چند آدمی پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس مدینہ کی ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد میں جس پر کھجور کی شاخوں کی چھت پڑی ہوئی تھی اور جو ذرا سی بارش سے بھی ٹپکنے لگ جاتی تھی آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب ہم اُن کے قریب پہنچ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں کہ ہم قیصر و کسریٰ کو کس طرح شکست دیں اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ چند سالوں کے اندر اندر واقعہ میں ایسا ہی ہو گیا۔ اور ان بے سر و سامان اور کمزور درویشوں نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کو پاش پاش کر دیا۔ غرض اشد ترین دشمنوں نے بھی تسلیم کر لیا کہ مسلمانوں کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور وہ اُن کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں صَلٰوۃ اور رحمۃ کو اکٹھا کرنے میں یہ حکمت ہے کہ دنیا میں حکومتوں کی طرف سے عزّت افزائی کے دو ہی طریق مقرر ہیں۔ یا تو کوئی خاص اعزاز بخشا جاتا ہے یا مادی رنگ میں کوئی انعام دیا جاتا ہے جیسے اعزازی طور پر لوگوں کو خطابات دیئے جاتے ہیں اور مادی طور پر انہیں مربعے وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ مگر گورنمنٹ کے خطابات تو بے حقیقت ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ ایک ایسے شخص کو خان بہادر کا خطاب دے دیتی ہے جو بزدل ہوتا ہے اور چوہے سے بھی ڈر جاتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی طرف سے جسے کوئی خطاب دیا جاتا ہے وہ اس کا سچ مچ اہل ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ دونوں طرف دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کے خانبہادروں کو واقعی خان بہادر سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے خان بہادروں کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ جب خدا تعالیٰ کسی کو کوئی خطاب دیتا ہے تو اس کے اوصاف بھی اس میں پیدا کر دیتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص جو احمدی تھا مگر اُس کے دماغ میں کچھ نقص تھا قادیان آیا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہنے لگا۔ کہ مجھے الہام ہوتا ہے کہ تو محمدؐ ہے تو موسیٰؑ ہے تو عیسیٰؑ ہے۔ آپ نے فرمایا کیا اس کے بعد تمہیں وہ کچھ ملتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا تھا یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ملتا تو کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ پھر یہ شیطانی الہام ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ تو یہ تمسخر نہیں کرتا کہ کسی کو کوئی خطاب دے اور اس کے اوصاف اس میں پیدا نہ کرے۔ خدا تعالیٰ تو جب کسی کو کوئی خطاب بخشتا ہے تو اس کے مطابق اُسے طاقتیں بھی دے دیتا ہے۔ یہ شیطان ہے جو تمہیں دیتا تو کچھ نہیں مگر تمہارا نام موسیٰ اور عیسیٰ اور محمدؐ رکھتا چلا جاتا ہے۔ غرض صلوٰۃ کا تعلق روحانی انعامات سے

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ

صفا اور مروہ یقیناً اللہ (تعالیٰ) کے نشانات میں سے ہیں۔ سو جو شخص اس گھر (یعنی کعبہ)

الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ

کا حج یا عمرہ کرے تو اُسے ان کے درمیان تیز چلنے پر کوئی گناہ نہیں۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (۱۵۹)

اور جو شخص خوشی سے کوئی نیک کام کرے (وہ سمجھ لے کہ) اللہ (نیک کاموں کا) قدردان (اور وہ) بہت جاننے والا ہے۔

ہوتا ہے اور رحمت کا تعلق ان مادی انعامات سے ہوتا ہے جو ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ پس بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سُنّت ہے کہ وہ ابتلاؤں میں ثابت قدم رہنے والوں کو روحانی برکات سے بھی مستفیض کرتا ہے اور انہیں مادی فوائد اور ترقیات جو ماحول سے تعلق رکھتی ہیں وہ بھی عطا کرتا ہے۔

وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ اس جگہ ہدایت سے مراد صرف صراط مستقیم پر چلنا نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر قائم ہوتے ہیں۔ یہاں یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انکو ہدایت کے راستہ پر لئے چلے گا۔ اور وہ اپنے اخلاص اور ایمان میں آگے ہی آگے بڑھتے جائینگے۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ مشکلات اور مصائب میں اللہ تعالیٰ انہیں صحیح راستہ بتاتا جائیگا۔ اور مشکلات کے ساتھ ساتھ اُن کا حل بھی انہیں نظر آتا جائیگا۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ بندہ جب سچے دل سے إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہتا ہے اور مصائب پر صبر سے کام لیتا ہے تو مومن کی یہ حالت دیکھ کر اللہ تعالیٰ بھی عرش پر بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس محبت اور اخلاص کی جزا دینے کے لئے اُسے اپنی ہدایت کی راہوں پر چلاتے ہوئے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ گویا صبر اور استقامت کے نتیجہ میں وہ منعم علیہ گروہ میں شامل ہو جاتا ہے اور وصلِ الٰہی کے دروازے اس پر کھول دیئے جاتے ہیں۔ غرض تین قسم کے انعامات کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ (۱) اوّل ہدایت کی راہوں میں ترقی (۲) دوم مشکلات میں صحیح راہنمائی (۳) سوم خدا تعالیٰ کا دائمی وصال۔ اور جن کو یہ فوائد حاصل ہوں اُن کو اپنے کسی عارضی نقصان کا خیال بھی کس طرح آسکتا ہے۔

صَفَا

۱۵۹ حل لغات:۔ صَفَا: صَفَاةٌ کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں سخت موٹے پتھر جن پر مٹی نہ ہو۔ اور کھیتی بھی نہ ہو سکے۔ صفا بیت اللہ کے پاس بڑے بڑے پتھروں کی ایک پہاڑی کا بھی نام ہے۔

مَرْوَة

اَلْمَرْوَةَ: یہ مَرْو کا مفرد ہے اور مروہ اُن سفید چھوٹے چھوٹے چمکتے ہوئے چقماقی صفت رکھنے والے پتھروں کو کہتے ہیں۔ جن سے لوگ آگ نکالتے ہیں۔ مروہ بھی ایک پہاڑی کا نام ہے جو بیت اللہ کے پاس ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ غرض صفا اور مروہ دو پہاڑیوں کا نام ہے جو خانہ کعبہ کے پاس ہیں۔ اور اب خانہ کعبہ وسیع ہو کر اُنکو آلگا ہے اور ایک دروازہ اُن میں آکر کھلتا ہے۔ اُن پر ایک بازار ہے جو سوقِ صفا کہلاتا ہے اور شہر کا حصہ ہے اور اُسی بازار میں اب سعی ہوتی ہے۔ پہلے دونوں پہاڑیاں الگ الگ تھیں لیکن اب بھرتی پڑ کر مل گئی ہیں۔ اور ایک ہی

معلوم ہوتی ہیں۔ صرف دو نشان لوگوں نے سعی کیلئے بنا رکھے ہیں جن سے سعی شروع کرنے اور ختم کرنیکا حال انسان کو معلوم ہوتا ہے۔

شَعَائِرَ: شعیرۃ کی جمع ہے۔ اس کے معنے علامت آیت اور نشان کے ہوتے ہیں اور عبادات کے مقررہ طریقوں کو بھی شعیرہ کہتے ہیں۔ یہاں علامت کے معنے مراد ہیں۔

حَجَّ: حج کے اصل معنے قصد کے ہیں۔ مگر اصطلاحِ شریعت میں اس کے معنے ذوالحجہ میں بیت اللہ جانے اور وہاں خاص احکام بجالانے کے ہیں۔

اِعْتَمَرَ:۔ اِعْتَمَرَ الْمَكَانَ کے معنے ہوتے ہیں قَصَدَهٗ وَ زَارَهٗ ۔ کسی بزرگی رکھنے والے مکان کی طرف جانے کا قصد کیا۔ اور اس کی زیارت کی۔ اسی طرح کہتے ہیں اِتَّخَذَ فَا نَادِيًا نَعْتَمِرُهٗ کہ ہم نے ایک ایسی مجلس قائم کی جس میں ہم بار بار جاتے ہیں اور ہماری آپس میں ملاقات ہوتی ہے۔ پس اعتمار کے اصل معنے کسی شہر کی زیارت یا کسی ایسے مکان کی طرف جانے کے ہیں جو اپنی بزرگی یا دوستوں کی ملاقات کے لحاظ سے قابلِ اعزاز ہو۔ لیکن شریعت میں طوافِ بیت اللہ اور صفا اور مروہ کی سعی کا نام ہے۔ اور یہ عبادت سال کے ہر حصہ میں ہوسکتی ہے۔ لیکن حج کا ایک خاص وقت مقرر ہے۔ اسی طرح حج اور عمرہ میں یہ فرق ہے کہ عمرہ میں وہیں سے احرام باندھ لیتے اور سر منڈا لیتے ہیں۔ لیکن حج میں مقررہ جگہوں سے احرام باندھنا ضروری ہوتا ہے۔

جُنَاحٌ: جَنَحَ کے معنے ہوتے ہیں مَالَ یعنی جھک گیا۔ پروں کو بھی اور بازوؤں کو بھی اسی لئے جناح کہتے ہیں۔ اور گناہ کو بھی جناح اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں انسان بدی کی طرف جھک جاتا ہے۔ گناہ کا لفظ دراصل جناح کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

يَطَّوَّفَ: طَوَّفَ حَوْلَ الشَّيْءِ وَبِهٖ کے معنے ہیں طَافَ وَاَكْثَرَ الْمَشْيَ حَوْلَهٗ اس نے کسی چیز کے ارد گرد چکر لگایا اور کثرت کے ساتھ گھوما۔ (اقرب) طَافَ يَطُوْفُ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں لکھا ہے طَافَ بِالْقَوْمِ وَعَلَيْهِمْ کے معنے ہیں اِسْتَدَارَ وَجَاءَ مِنْ نَوَاحِيْهِ اس نے چکر لگایا اور کناروں کی طرف سے اس کے پاس آیا انہی معنوں میں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جنتیوں کی نسبت فرماتا ہے يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (واقعہ آیت ۱۸) یعنی ان کے پاس بار بار نوجوان خادم ان کی خدمت کے لئے آئیں گے۔ اس جگہ صفا اور مروہ کے گرد گھومنا مراد نہیں بلکہ بار بار ان کے پاس جانا مراد ہے۔

تَطَوَّعَ کے معنے ہیں تَبَرَّعَ بِلَا قَصْدِ اُجْرَةٍ وَبِاحْتِمَالِ مَشَقَّةٍ کسی نیکی کو بغیر اجرت اور بدلہ کی خواہش کے کرنا۔ (۲) تکلیف اٹھا کر کوئی کام کرنا۔ اسی لئے والنٹیر کو عربی زبان میں مطاوع کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بغیر تنخواہ کے آنریری طور پر کام کرتا ہے۔

شَاكِرٌ: جب یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لئے آئے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ انعام نازل کرتا ہے یا حکم بجالانے پر جزا دیتا ہے۔ اور جب یہ بندہ کے لئے آئے تو اس وقت اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکرگذار ہوتا ہے۔

تفسیر:۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فرماتا ہے۔ صفا اور مروہ دونوں پہاڑیاں یقیناً اللہ تعالیٰ کے نشانات میں سے ہیں۔ یہ وہ پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان حج اور عمرہ میں خانہ کعبہ کے طواف کے بعد سعی کی جاتی ہے اور سات دفعہ چکر لگایا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ چودہ دفعہ دوڑنا چاہیئے۔ مگر یہ کمزور خیال ہے۔ اصل میں سات دفعہ ہی سعی ہے۔ اور یہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ صفا سے شروع کرکے مروہ پر جاتے ہیں اور وہاں سے صفا پر آتے ہیں۔ یہ سعی چونکہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی یادگار ہے اس لئے یہ پہاڑیاں اللہ تعالیٰ

شَعَائِرَ
حَجَّ
اِعْتَمَرَ
تَطَوَّعَ
جُنَاحَ
يَطَّوَّفَ

کا ایک بہت بڑا نشان ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ اپنی بیوی ہاجرہ اور بچے اسمٰعیل کو عرب کی بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ آؤ۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کو انہوں نے خانہ کعبہ کے پاس لاکر بسا دیا جہاں پانی کا ایک قطرہ اور گھاس کی ایک پتی تک نہ تھی۔ صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجوروں کی آپ نے انہیں دی اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ جب پانی ختم ہُوا تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو پیاس لگی۔ اور آخر شدتِ پیاس کی وجہ سے وہ تڑپنے لگ گئے حضرت ہاجرہ سے اُن کی پیاس کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ اور وہ پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑیں۔ مگر پانی نہ ملا۔ قریب ہی صفا پہاڑی تھی۔ دوڑ کر اُس پر چڑھ گئیں۔ کہ شاید کوئی شخص نظر آئے اور وہ اُس سے پانی مانگیں۔ مگر جب وہاں سے کوئی شخص دکھائی نہ دیا تو دوسری پہاڑی مروہ پر دوڑ کر چڑھ گئیں اور وہاں سے بھی کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ تو پھر صفا کی طرف آئیں اور اس طرح انہوں نے سات چکر کاٹے۔ آخری چکر میں جب مروہ پر تھیں اُن کو ایک آواز آئی۔ حضرت ہاجرہ نے پکار کر کہا کہ اے شخص جس کی یہ آواز ہے اگر تو ہماری مدد کر سکتا ہے تو کر۔ یہ آواز اللہ تعالیٰ کے ایک فرشتہ کی تھی۔ اُس نے کہا ہاجرہ جا اور دیکھ کہ اسمٰعیل کے پاؤں کے نیچے خدا تعالیٰ نے ایک چشمہ پھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ وہ واپس آئیں اور انہوں نے دیکھا کہ جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شدتِ پیاس کی وجہ سے تڑپ رہے تھے۔ وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ رہا ہے اور بڑے زور سے اُس میں سے پانی نکل رہا ہے۔ زمزم کا کنواں وہی چشمہ ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لئے معجزانہ طور پر پھوڑا گیا تھا۔ چنانچہ اسی چشمہ کی وجہ سے پھر اس قدر ترقی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں عظیم الشان شہر قائم کر دیا۔

غرض صفا اور مروہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ صبر کرتے اور استقامت کے ساتھ خدمتِ دین میں حصہ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ ہاجرہ اور اسمٰعیل کی طرح انہیں اپنے آسمانی نشانات دکھاتا اور دائمی زندگی اور غیر معمولی انعامات عطا کرتا ہے۔ اگر تم بھی صبر کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ایسے ہی انعامات سے نوازیگا اور تمہیں بھی شعائر اللہ میں داخل کر دیگا۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ چونکہ بعض لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ صفا اور مروہ پر جانا گناہ ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَا جُنَاحَ ورنہ یہ مراد نہیں کہ جاؤ یا نہ جاؤ تمہارا اختیار ہے۔ کیونکہ حج اور عمرہ میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی ضروری ہوتی ہے۔ اِسی طرح فَلَا جُنَاحَ کے یہ بھی معنے ہیں کہ طواف جائز ہے۔ کیونکہ جب اس چیز کے متعلق جسے لوگ حرام جانیں فتویٰ دیا جائے تو اُس وقت اس فقرہ کے معنے صرف اس خیال کی نفی کرنی ہوتی ہے نہ کہ اس کا جواز بتانا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی مذہب تھا کہ طواف ضروری ہے۔ چنانچہ بخاری جلد اوّل باب وجوب الصفا والمروۃ وجعل من شعائر اللہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے عروہ بن زبیر سے ایک روایت مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طواف جائز ہے ضروری نہیں۔ اِس پر انہوں نے جواب دیا کہ بِئْسَمَا قُلْتَ يَا ابْنَ اُخْتِيْ اِنَّ هٰذِهٖ لَوْ كَانَتْ كَمَا اَوَّلْتَهَا عَلَيْهِ كَانَتْ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ یعنی اے میرے بھانجے تو نے یہ بہت ہی غلط استدلال کیا ہے۔ اگر یہ بات اسی رنگ میں ہوتی جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو عبارت یوں ہوتی کہ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا اور پھر فرمایا۔ وَقَدْ سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الطَّوَافَ بَيْنَهُمَا فَلَيْسَ لِاَحَدٍ اَنْ يَّتْرُكَ الطَّوَافَ بَيْنَهُمَا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہی تھی کہ آپ صفا اور مروہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ پس کسی شخص کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اس سنت سے ثبات منع کرے

بہر حال حضرت عروہ بن زبیر جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے اُن کا یہی مذہب تھا کہ طواف ضروری نہیں۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ حضرت انسؓ عطا اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے کہ طواف ضروری نہیں۔ امام احمد بن حنبل کا یہ مذہب ہے کہ یہ ضروری تو نہیں مگر کسی شخص کو نہیں چاہیئے کہ وہ جان بوجھ کر طواف چھوڑ دے ہاں اگر بلا ارادہ چھوٹ جائے تو کوئی گناہ نہیں۔ مگر مناسب یہی ہے کہ نہ چھوڑے امام شافعی اور مالکؒ کے نزدیک صفا اور مروہ کا طواف واجب ہے اور ارکانِ حج میں سے ہے اور ثوری اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر کوئی چھوڑ دے اور بغیر طواف کئے حج پورا کرے تو اُس پر قربانی لازم ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کہنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انصار مسلمان ہونے سے پہلے منات بُت کے لئے احرام باندھا کرتے تھے جس کی مشلل کے پاس لوگ عبادت کیا کرتے تھے اور اُس زمانہ میں جو شخص احرام باندھتا وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو گناہ سمجھتا تھا جب لوگ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں دریافت کیا۔ اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم صفا اور مروہ کی سعی گناہ سمجھا کرتے تھے لیکن اب اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (بخاری کتاب الحج) پس چونکہ اُس وقت ایک جماعت ایسی تھی جو صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے کو جائز نہیں سمجھتی تھی۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ اس میں کوئی گناہ تو نہیں۔ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ کوئی گناہ نہیں باقی رہا یہ سوال کہ یہ سعی صرف جائز ہے یا واجب تو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے صرف یہ بحث اٹھائی ہے کہ جو لوگ اس کام کو غلطی اور گناہ قرار دیتے ہیں وہ درست نہیں کہتے ورنہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت سے اس کا ضروری ہونا ثابت ہے۔ پس لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کے یہ معنے نہیں ہیں کہ یہ کام اختیاری ہے کوئی کرے یا نہ کرے بلکہ درحقیقت یہ نصیحت کا ایک طریق ہے کہ جب کسی ضروری بات کی طرف انسان توجہ نہ کرے تو کہتے ہیں کہ یہ بات گناہ نہیں۔ یعنی تم نے جو ادھر توجہ نہیں کی تو شاید گناہ سمجھ کر نہیں کی حالانکہ یہ تو ضروری بات تھی۔ اِن معنوں کو سورۃ نساء کی یہ آیت بالکل حل کر دیتی ہے کہ۔ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (نساء آیت ۱۲۹) یعنی اگر کوئی عورت اپنے خاوند کے نشوز یا اعراض سے ڈرتی ہو۔ تو اگر وہ آپس میں کسی طریق پر صلح کر لیں تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں اور صلح بہت اچھی چیز ہے۔ اس آیت میں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کا بھی یہی مطلب ہے کہ میاں بیوی سوچیں کہ صلح سے رہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر عورت کے قصور کی وجہ سے مرد کو غصہ ہے۔ تو وہ چھوڑ دے اور اگر عورت کا قصور نہیں تو مرد اپنی اصلاح کرے۔ پس جس طرح اس آیت میں صلح کے متعلق فَلَا جُنَاحَ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اسی طرح فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا میں جہاں اسے ناجائز سمجھنے والوں کے خیال کی نفی کی گئی ہے وہاں لوگوں کو نصیحت بھی کی گئی ہے کہ صفا اور مروہ کا طواف کوئی گناہ کی بات نہیں یعنی تم جو ادھر توجہ نہیں کر رہے تو شاید گناہ سمجھ کر نہیں کر رہے حالانکہ یہ تو ضروری بات ہے۔

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص نیکی کے کاموں میں اس لئے حصہ لیتا ہے کہ ان کے بدلہ میں اُسے کوئی چیز مل جائے تو یہ ایک سودا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے سودا کرنا کوئی پسندیدہ فعل نہیں۔ عبادت تو انسان کو اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کے شکر کے طور پر بجا لانی چاہیئے جو اللہ تعالیٰ نے اُس پر کئے ہیں۔ نہ اس لئے کہ اگر میں نے عبادت کی تو مجھے

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى

جو لوگ اس (کلام) کو جو ہم نے کھلے نشانوں اور ہدایت پر مشتمل نازل کیا ہے ۔

مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ أُولٰٓئِكَ

بعد اس کے کہ ہم نے اُسے لوگوں کیلئے اس کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے چھپاتے ہیں ۔ ایسے ہی لوگ ہیں جنپر

يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُونَ ﴿۱۶۰﴾

اللہ لعنت کرتا ہے اور (دوسرے) لعنت کرنیوالے (بھی) لعنت کرتے ہیں ۔ ۲۴ے

کوئی انعام نہیں ملیگا ۔ عبادت کے مقابلہ میں انعام کی خواہش ایک ادنیٰ خواہش ہے ۔ اصل مقام یہی ہے کہ انسان محض اللہ تعالےٰ کی رضا اور اس کے بے پایاں احسانات کے شکر کے طور پر اپنا سر اُس کے حضور جھکائے اور رات دن اُس کی عبادت میں مشغول رہے

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا کے الفاظ سے وجوب طواف کی نفی نہیں کی گئی بلکہ مراد یہ ہے کہ عمرہ جتنی بار کرو اتنا ہی زیادہ ثواب ملیگا ۔ اسی طرح حج بھی اگر ایک سے زیادہ دفعہ کر سکو تو یہ بھی تمہارے لئے موجب ثواب ہوگا گویا اس آیت میں وجوب طواف کی نفی نہیں بلکہ یہ تحریک کی گئی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں بار بار کرنے چاہئیں ۔ اور بار بار ان مقامات مقدسہ کی زیارت کیلئے آتے رہنا چاہیئے ۔

فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۔ فرمایا تم خدا تعالیٰ سے سودا نہ کرو بلکہ اُسی پر سچا توکل رکھو ۔ وہ تمہاری نیکیوں کو کبھی ضائع نہیں کریگا اور تمہیں خود ان کی بہتر سے بہتر جزا دیگا ۔ وہ بہت قدردان اور بہت جاننے والا ہے ۔ شاکر کے ساتھ علیم کا اضافہ اس لئے فرمایا کہ انسان کو جو جزائیں ملتی ہیں اُنکی کئی اقسام ہوتی ہیں ۔ بعض جزائیں انسان کو تباہ کر دینے والی ہوتی ہیں اور بعض اس کے لئے مفید اور بابرکت ہوتی ہیں ۔ اگر کسی اندھے کو عینک لگانے کے لئے دی جائے یا کسی جذامی کو اچھے کپڑے دے دیئے جائیں تو وہ چیزیں اُن کے کسی کام نہیں آسکتیں ۔ خواہ وہ کتنی قیمتی کیوں نہ ہوں ۔ اسی لئے فرمایا میں تمہارے حالات کو خوب جانتا ہوں اُنہی کے مطابق میں تمہیں انعام دوں گا اور تمہیں ایسی جزا دونگا جو تمہیں دائمی طور پر فائدہ پہنچانیوالی ہوگی ۔

ترتیب و ربط : ۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ والی آیت بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے جو استدلال میں نے کیا تھا وہی صحیح ہے ۔ کیونکہ تحویل قبلہ کے مسئلہ سے صفا اور مروہ کے شعائر ہونیکا کوئی تعلق نہیں اور پھر مسلمان تو وہاں جا ہی نہیں سکتے تھے کہ صفا اور مروہ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ۔ دراصل اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم فتح مکہ کی کوشش کرو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے لئے حج کا راستہ کھل جائیگا ۔ اور صفا اور مروہ پر جانا بھی تمہارے لئے ممکن ہو جائیگا ۔

۲۴ے حل لغات : ۔ بَيِّنٰتٌ ۔ بَيِّنَةٌ کی جمع ہے اور بَيِّنٰتٌ اُن براہین اور نشانات کو کہتے ہیں جو اپنی صداقت پر آپ شاہد ہوتے ہیں ۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ نحل ۲۵ے)

هُدٰى وہ تعلیمات جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں ۔ اور انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچاتی ہیں ۔

لَعْنَةٌ دُور کرنے کو کہتے ہیں ۔ یعنی کسی کو دھتکار

بَيِّنٰتٌ

هُدٰى

لَعْنَةٌ

یا ہلاک کر کے دور کر دینا۔ یا اُسے پاس نہ آنے دینا۔

تفسیر:۔ لَاعِنٌ کے معنے لعنت کرنے والے کے ہوتے ہیں۔ مگر لعنت کرنے والے دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ اوّل وہ شخص جسے دوسروں پر لعنتیں ڈالنے اور بُرا بھلا کہنے کی عادت ہو۔ یہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے کیونکہ جو شخص اپنے بھائیوں پر لعنتیں ڈالنے والا ہو وہ بد اخلاق اور منافق ہوتا ہے اور قرآن کریم کے خلاف عمل کرتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کے بد اخلاق اور منافق طبع لوگ خدا تعالیٰ کا ساتھ دیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع نہیں ہوتے۔

لَاعِنٌ سے ایسا شخص بھی مراد ہو سکتا ہے جس کے سپرد اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیا ہو۔ اور وہ لوگ جن کو ایسے فرائض سپرد کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور مامورین ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے الہام پا کر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص پر لعنت پڑے گی۔ اور فلاں اُس کے غضب کا شکار ہوگا۔ پس لَاعِنُوْن سے مراد وہ ہستیاں ہیں جنہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے لعنت کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔

اَلْکِتٰب سے مراد اسجگہ قرآن کریم ہے اور النَّاس سے مُراد یہودی نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسجگہ اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جنگ کے اعلان کے ساتھ جو ابھی ہُوا نہیں بلکہ اس کی طرف اشارے ہو رہے ہیں منافقوں کی منافقت ظاہر ہو جائیگی۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ یہ دشمنِ ایمان لوگ جن کے دلوں میں منافقت ہے جب انکو قربانی کے احکام سُنائے جاتے ہیں تو وہ ایسی تعلیموں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ ان باتوں کو مخالفوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس قسم کے لوگ ہمیشہ علیحدگی میں کہا کرتے ہیں کہ مانا کہ یہ باتیں درست ہیں مگر ان کو دشمنوں کے سامنے پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے لوگوں کی طرف سے خواہ مخواہ مخالفت ہوگی۔ غرض الٰہی سلسلوں میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے احکام نازل ہوتے ہیں جن پر عمل کرنا مخالفوں کی ناراضگی کا موجب ہوتا ہے تو ایسا طبقہ جو دوسروں کی ناراضگی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے مداہنت سے کام لیکر ان کو چھپانا شروع کر دیتا ہے تاکہ نہ لوگوں کو صحیح تعلیم کا علم ہو اور نہ ان کا جذبۂ مخالفت بھڑکے۔ اِس قسم کی مداہنت کمزوری کے دَور میں نہیں ہوتی۔ بلکہ طاقت اور غلبہ کے دَور میں ہوتی ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے منافقین کا کوئی فتنہ نہیں اُٹھا لیکن جب مدنی زندگی آئی اور اسلام نے طاقت پکڑنی شروع کر دی اور یہ اعلان ہونے لگے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہو تم نے جنگ کو جاری رکھنا ہے تو جو لوگ کمزور ایمان والے تھے انہوں نے کافروں سے اپنی حفاظت کی طرح ڈالنی شروع کر دی۔ اور کفار کے پاس جا جا کر اِس رنگ میں باتیں کرنی شروع کیں کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تو بڑے اچھے آدمی ہیں۔ وہ تو نہیں چاہتے کہ لڑائی ہو مگر جوشیلی طبائع والے انکو اُکساتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لڑائی ہو جائے۔ اسی طرح بعض لوگ کلام الٰہی پر پردہ ڈالتے اور اُسے چھپاتے اور دشمنوں کو جا جا کر کہتے کہ تم تسلی رکھو۔ تم پر کوئی تباہی نہیں آ سکتی۔ حالانکہ اگر کفار کے متعلق کوئی خبر دی جائے اور ان کو یہ بتایا نہ جائے کہ تمہارے متعلق اللہ تعالیٰ نے فلاں انذاری پیشگوئی کی ہے تو پیشگوئی کی شان اور اس کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔ لیکن اگر پہلے سے کہہ دیا جائے کہ تم پر عذاب آئیگا۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم توبہ کر لو تو عذاب کے آنے پر اُن پر حجت قائم ہو سکتی ہے۔ اور عقلمندوں کے لئے ایک بہت بڑا نشان بن جاتا ہے۔ لیکن منافق محض اس لئے کہ ہمارے تعلقات خراب نہ ہو جائیں ایسی باتوں کو چھپاتے ہیں اور ڈر کے مارے ظاہر نہیں کرتے ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

برکتوں سے کلی طور پر محروم رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت کے علاوہ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے لعنت کا اختیار دیا ہوا ہے وہ بھی اُن پر لعنت ڈالیں گے۔ جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور دوسرے مامورین نے بھی اپنے دشمنوں پر لعنتیں ڈالیں۔ بلکہ اب تک لوگ اُن پر لعنتیں

إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ

ہاں! مگر جنہوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور (خدا کے احکام کو) کھول کر بیان کر دیا تو ایسے لوگوں پر

اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۱﴾

مَیں فضل کے ساتھ توجہ کروں گا۔ اور مَیں (اپنے بندوں کی طرف) بہت توجہ کرنیوالا اور بار بار رحم کرنیوالا ہوں۔ ۱۷۵

ڈالتے رہتے ہیں اور قیامت تک اُن پر لعنتیں پڑتی رہیں گی۔

بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتب میں بعض جگہ کئی کئی صفحوں میں مخالفین پر لعنت ڈالی ہے۔ اور آپ متواتر لعنت لعنت لعنت لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ خیال کرتے ہیں کہ آپ نے نعوذ باللہ انہیں گالیاں دی ہیں۔ حالانکہ آپ نے گالیاں نہیں دیں بلکہ ایک خدائی فیصلہ کا اعلان کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی رحمت سے دُور چلے گئے ہیں۔ جس طرح ایک مجسٹریٹ اگر کسی مجرم کو چھ ماہ قید کی سزا دے تو اس سزا کو درست اور قابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا شخص جسے گورنمنٹ نے فیصلہ کا کوئی اختیار نہ دیا ہو کسی مجرم کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ اُسے قید کر دیا جائے تو سب لوگ اُسے پاگل تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے انبیاء بھی رُوحانی عالم کے مجسٹریٹ ہوتے ہیں۔ اگر وہ مجرموں کو مجرم قرار نہ دیں اور اُن کے بارہ میں اپنا فیصلہ نافذ نہ کریں تو وہ خود مجرم بنتے ہیں۔ پس اُن کا کسی پر لعنت ڈالنا قانون کے تابع ہوتا ہے۔ اور ایسا کہنا اُن کے فرائضِ منصبی کے لحاظ سے ضروری ہوتا ہے لیکن دوسرے لوگ جو بلا وجہ لعنتیں ڈالتے رہتے ہیں وہ اپنی بداخلاقی اور کمینگی کا مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اُنہیں دوسروں پر لعنت ڈالنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

۱۷۵ تفسیر:۔ ہمارے ملک میں عام طور پر لوگ توبہ صرف اس بات کا نام سمجھتے ہیں کہ زبان سے ایک دو دفعہ یہ فقرہ دہرا دیا جائے کہ میری توبہ۔ اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم ایسا کہہ دیں تو ہمارے سارے گناہ بخشے گئے۔ حالانکہ صرف مُنہ سے توبہ توبہ کہہ دینا اور اپنے اعمال میں کوئی تغیّر پیدا نہ کرنا کسی انسان کو مغفرت کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ توبہ درحقیقت تین باتوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اوّل زبان سے اپنے قصور کا اعتراف کرنا۔ دوم اپنی غلطی کے متعلق دل میں ندامت پیدا ہونا۔ سوم جو قصور کیا ہے اس کا عملاً ازالہ کرنا۔ گویا جس مقام پر انسان غلطی کرنے سے پہلے کھڑا ہو اُسی مقام پر وہ رجوع کر کے آ جائے۔ اس قسم کی توبہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے جو انسانی رُوح میں واقع ہوتا ہے کیونکہ انسان کے دل میں اپنے گناہوں سے شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت اور روحانیت کے حصول کی خواہش پیدا ہوتا۔ اُس کے دل کا اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے ہوئے پگھل جانا۔ اس کی سفلی خواہشات پر ایک موت کا وارد ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے اُس نے اپنے آپ کو خدا کیلئے صلیب پر لٹکا لیا۔ اور اپنی پہلی زندگی پر موت وارد کر لی۔ عیسائی لوگ جو اسلامی توبہ کی حقیقت سے ناواقف ہیں بالعموم اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے توبہ کا دروازہ کھول کر گناہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ حالانکہ اسلام جس توبہ کو پیش کرتا ہے وہ مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک انسان زبان سے اپنے قصور کا اقرار اور دل سے اپنے فعل پر ندامت کا اظہار نہ کرے اور آئندہ اس سے مجتنب رہنے کا پختہ عہد کرتے ہوئے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ

جن لوگوں نے انکار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے ایسے لوگوں پر یقیناً اللہ کی اور

وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦٢﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ

فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔ اُس میں (پڑے) رہیں گے نہ (تو) اُن (پر) سے

عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿١٦٣﴾

عذاب ہلکا کیا جائیگا اور نہ انہیں (سانس لینے کی) مہلت دی جائیگی۔ ۱۶ ع

گذشتہ قصور کا ازالہ بھی نہ کرے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسی توبہ گناہ پر دلیری پیدا کر دیتی ہے۔ گناہ پر دلیری تو اُن کا یہ عقیدہ پیدا کرتا ہے کہ ہمارے تمام گناہ مسیح نے اٹھا لئے ہیں۔ اب ہمیں کسی فکر کی ضرورت نہیں لیکن وہ توبہ جسے اسلام پیش کرتا ہے اور جو گذشتہ افعال کے کلّی ترک اور آئندہ کے لئے کلّی طور پر نیکی کے راستہ کو اختیار کرنے اور خدا تعالیٰ کی طرف صدقِ دل سے رجوع کرنے کا نام ہے وہ گناہ پر دلیری پیدا نہیں کرتی بلکہ گناہ کو بیخ و بُن سے اکھیڑ دیتی ہے اور انسان کو ایک نیا رُوحانی انسان بنا دیتی ہے۔ اِس قسم کی توبہ کرنیوالوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو پوری طرح خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور دل میں ندامت پیدا کرتے اور اپنے گناہ کو دُور کرتے ہیں اور پھر یہیں تک بس نہیں کرتے بلکہ اَصْلَحُوْا وہ دوسروں سے بھی عیوب دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا ان میں اتنا تغیّر پیدا ہو جاتا ہے اور انہیں بدیوں سے اتنا بُغض ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی ہی اصلاح نہیں کرتے بلکہ دوسروں کی بدیوں کو بھی دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں وَبَيَّنُوْا اور نہ صرف اپنے گرد و پیش کی اصلاح کرتے ہیں بلکہ علی الاعلان دُنیا کے سامنے اس بات کو پیش کرتے ہیں کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے اور اسی میں دنیا کی نجات ہے فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ فرماتا ہے جب کوئی شخص ایسی توبہ کرتا ہے تو میں بھی فضل کے ساتھ اُس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

توبہ کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے رجوع برحمت ہونے اور فضل نازل کرنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب بندے کیلئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنی ندامت کا اظہار کرنے اور جرم کا اقرار کرنے اور خدا تعالیٰ کی طرف جھک جانے کے ہوتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اپنے جرم کا اقرار کر کے ندامت کا اظہار کریں اور خدا کی طرف رجوع کریں اور دوسروں کی بھی اصلاح کریں اور اسلام پر پوری مضبوطی سے قائم ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کے قصور کو معاف کر کے میں پھر انکو اُس مقام پر لا کھڑا کرتا ہوں جہاں وہ پہلے ہوتے ہیں۔ اور پھر میں اپنے پُرانے طریق پر اُن کے لئے تفضلوں کا سلسلہ شروع کر دیتا ہوں کیونکہ میں بڑا شفقت کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہوں۔

۱۶۲ تفسیر:- فرماتا ہے۔ اِن توبہ کرنے والوں کے بالمقابل جو لوگ کفر کی حالت میں ہی مر گئے۔ اُن پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہوگی۔ اِسی طرح ملائکہ اور سارے انسانوں کی لعنت ہوگی۔

اِس جگہ اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ سارے انسانوں کی اُن پر لعنت ہوگی اِس میں اور پہلی آیت میں جس لعنت کا ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ فرق ہے کہ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے صرف خاص لوگوں کو لعنت کرنے کی اجازت

دی تھی۔ کیونکہ وہاں لعنت سے مراد اُن کی تباہی کی پیشگوئی
تھی جو اللہ تعالےٰ کے انبیاء ہی کیا کرتے ہیں۔ مگر یہاں اُن کے
متعلق پیشگوئی کرنا مقصود نہیں کیونکہ یہاں لعنت کرنیوالوں
میں سب لوگوں کو شامل کر لیا گیا ہے۔ اور سارے کے سارے
لوگ تباہی کی پیشگوئیاں نہیں کیا کرتے۔ پس یہاں وہ
لعنت مراد ہے جو فطرتی طور پر انسان کے دل سے اُٹھتی
ہے۔ مثلاً اگر ایک چور کے سامنے بھی اگر چوری کا ذکر ہو
تو وہ فوراً کہہ اُٹھتا ہے کہ چور بہت بُرے ہوتے ہیں حالانکہ
وہ خود اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے
کہ اُس کی فطرت اسے بُرا قرار دیتی ہے۔ اسی طرح یہاں
لعنت کرنے سے یہ مراد ہے کہ کفار کے افعال پر ہر ایک
شخص خواہ نیک ہو خواہ بد فطرتی طور پر لعنت کرتا ہے بلکہ
ایک مجرم خواہ اپنی ذات کو بُرا نہ کہے مگر جرم کو ضرور بُرا
کہے گا اور اسی کا نام لعنت ہے۔ خدا اور ملائکہ صفت انسان
تو علی الاعلان لعنت کرتے ہیں لیکن باقی دنیا فطری اور
اصولی طور پر لعنت کرتی ہے۔ جیسے کوئی قوم جھوٹ کو
اچھا نہیں سمجھتی۔ کوئی قوم غیبت چوری اور قتل وغیرہ کو
اچھا نہیں سمجھتی۔ ہاں انفرادی طور پر اگر کوئی ان کا ارتکاب
کرے تو خود اس کا اپنا نفس اسے شرمندہ کرتا ہے اور
کہتا ہے کہ تم نے بے ایمانی کا ارتکاب کیا ہے۔ اسجگہ
اسی قسم کی لعنت مراد ہے کہ خواہ اپنے فعل کو وہ بُرا نہ کہیں مگر
دوسروں کے اُسی قسم کے فعل کو دیکھ کر وہ ضرور بُرا کہتے ہیں
چنانچہ کسی سے پُوچھ کر دیکھ لو وہ یہی کہیگا کہ جھوٹ بُرا ہے
غیبت بُری ہے چوری بُری ہے قتل بُرا ہے ظلم بُرا ہے
حالانکہ بعض دفعہ وہ خود ان جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی
طرح کوئی قوم بحیثیت قوم اندھیرے میں چھپ کر کسی کو
مار ڈالنے کو اچھا نہیں سمجھتی۔ کوئی قوم بحیثیت قوم چوری
کو اچھا فعل نہیں سمجھتی۔ کوئی قوم بحیثیت قوم غیبت کو
اچھا خیال نہیں کرتی۔ اسی طرح وہ افراد جو اِس قسم کے
کاموں کو کرتے وقت انہیں اچھا خیال کرتے ہیں وہ بھی دوسرے
موقعہ پر انہیں بُرا اور ناجائز سمجھتے ہیں۔ غرض یہ لعنت ایسی ہے
جو کبھی نہیں مٹتی۔ کیونکہ انسانی فطرت اس کی ممد ہوتی ہے

پھر فرماتا ہے خٰلِدِیْنَ فِیْہَا۔ یہ قانون ایسا ہے جو
ہمیشہ قائم رہیگا۔ کئی فلسفے اور تہذیبیں بدل گئیں مگر
یورپ آج بھی یہی کہتا ہے کہ جھوٹ بُرا ہے۔ ظلم بُرا ہے
چوری بُری ہے۔ غیبت بُری ہے۔ یہ لعنت قائم ہے اور
ہمیشہ قائم رہیگی۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ بھی یہی کہتا ہے
یورپین فلسفہ بھی یہی کہتا ہے۔ غرض یہ ایک نہ مٹنے والا
اصل ہے۔ اس میں کبھی تغیر نہیں آسکتا۔ کل اگر کوئی اور
تہذیب آئیگی تو وہ بھی یہی کہے گی۔ اس کے خلاف کوئی بات
نہیں کہہ سکتی۔

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ

فرماتا ہے کہ جب منکرینِ انبیاء کا پیمانۂ عمل لبریز ہو جاتا ہے
تو اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ آسمانی عذاب میں جکڑے
جاتے ہیں۔ اور یہ عذاب ایسا ہوتا ہے کہ نہ تو اسے ہلکا کیا جاتا
ہے اور نہ انہیں ڈھیل دی جاتی ہے۔ ہاں عذاب کے آنے سے
پہلے پہلے اُن کے لئے موقعہ ہوتا ہے کہ وہ توبہ کریں۔ لیکن
اگر وہ اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں
اور انکار پر کمربستہ رہیں اور خدائی نشانات کی تضحیک
کرتے رہیں تو ایک دن عذاب الٰہی کے کوڑے اُن پر برسنے
شروع ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اُن کی چیخ و پکار بالکل عبث
ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو وہ لوگ جنہوں نے خدا تعالیٰ کے
فرستادوں کا مقابلہ کیا۔ ہزاروں سال گذرنے کے باوجود
آج بھی اُن پر لعنت پڑ رہی ہے۔ نمرود کو ہلاک ہوئے ہزاروں
سال گذر گئے۔ فرعون کو سمندر میں ڈوبے ہزاروں سال گذر
گئے۔ وہ فقیہی اور فریسی جنہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام
کو صلیب پر لٹکایا تھا اُن پر بھی دو ہزار سال گذر گئے۔ ابوجہل
کو جنگِ بدر میں ہلاک ہوئے بھی چودہ سو سال ہو گئے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۴﴾ ع

۱۹ ع ۳

اور تمہارا معبود (اپنی ذات میں) واحد معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے۔ ۱۶۴

مگر آج بھی ہر شریف انسان نمرود کا نام لیتا ہے تو اُس پر لعنت ڈالتا ہے۔ فرعون کا نام لیتا ہے تو اس پر لعنت ڈالتا ہے۔ فقیہیوں اور فریسیوں کا ذکر آتا ہے تو اُن پر لعنت ڈالتا ہے۔ ابوجہل کا ذکر آتا ہے تو اُس پر لعنت ڈالتا ہے حضرت عثمانؓ کو شہید کرنیوالوں کا ذکر آتا ہے تو اُن پر لعنت ڈالتا ہے۔ اور پھر اگلے جہان میں جو انہیں عذاب دیا جا رہا ہے اُس کا تو تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ غرض یہ عذاب برابر جاری ہے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرستادوں کا مقابلہ کیا۔

۱۶۴ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ تمہارا خدا تو ایک ہی خدا ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اور پھر وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ ایسی کامل صفات رکھنے والے خدا پر ایمان رکھتے ہوئے تمہیں اپنے دشمنوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری حفاظت کیلئے تمہارا خدا موجود ہے۔ پس تم اسی پر توکل رکھو اور اُسی سے مدد مانگتے رہو۔ وہ تمہارے دشمن کو تم پر کبھی غالب نہیں آنے دیگا۔ اور خواہ تمہاری کشتی مشکلات کے بھنور میں کتنے بھی چکر کھائے پھر بھی وہ تمہیں اس میں سے نکال کر ساحلِ کامیابی پر پہنچا دیگا۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ مَیں نے رؤیا میں دیکھا کہ مَیں بہشتی مقبرہ سے ایک کشتی پر آ رہا ہوں اور میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔ راستہ میں کثرت سے پانی ہے اور ایک طغیان سا آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم پُل والی جگہ کے قریب پہنچے۔ جہاں پہلے صرف دو لکڑیاں لوگوں کے آنے جانے کے لئے رکھی رہتی تھیں تو وہاں مَیں کیا دیکھتا ہوں کہ کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے اور چکر کھانے لگی ہے۔ اس سے سب لوگ جو کشتی میں بیٹھے تھے ڈرنے لگے۔ جب ان کی حالت مایوسی تک پہنچ گئی تو یکدم پانی میں سے ایک ہاتھ نکلا جس میں ایک تحریر تھی اور اُس میں لکھا تھا کہ یہاں ایک پیر صاحب کی قبر ہے۔ اُن سے درخواست کرو تو کشتی بھنور میں سے نکل جائیگی۔ مَیں نے کہا۔ یہ تو شرک ہے مَیں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں خواہ ہماری جان چلی جائے۔ مَیں جوں جوں انکار کرتا گیا چکر بڑھتے گئے۔ اس پر میرے ساتھیوں میں سے بعض نے کہا کہ اس میں کیا حرج ہے۔ اور انہوں نے پیر صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر بغیر میرے علم کے پانی میں ڈال دیا جب مجھے اس کا علم ہوا تو مَیں نے جوش سے کہا کہ یہ شرک ہے اور مَیں نے فوراً پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اور کود کر وہ کاغذ پکڑ لیا اور اُسے باہر لے آیا۔ اور جونہی مَیں نے ایسا کیا کشتی بھنور میں سے نکل گئی۔ پس مومن پر خواہ کتنی بھی مشکلات آئیں اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ پر توکّل رکھے اور اُس کے سوا کسی اور کا خوف اپنے دل میں نہ پیدا ہونے دے۔

یہاں سوال ہو سکتا تھا کہ اچھا اگر وہی ایک معبود ہے تو ہمیں کیا معلوم کہ وہ ہم سے کیا معاملہ کریگا۔ اسلئے فرمایا کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ وہ ہمیشہ محبت کا ہی معاملہ کرتا ہے اور بندہ کو نہیں چھوڑتا۔ سوائے اس کے کہ بندہ اُسے خود چھوڑ دے۔ وہ پہلے بغیر کسی عمل کے انسان پر اپنے بے انتہا فضل نازل کرتا ہے اور جب بندہ ان سامانوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو رحیمیت کے ماتحت اُس پر مزید احسان کرتا ہے۔ اور یہ سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے رحمٰن و رحیم ہونے کی مثال درحقیقت اُس بوڑھے کے کھجور لگانے کی سی ہے جس نے بادشاہ سے دو تین دفعہ کئی ہزار روپیہ انعام کے طور پر لے لیا تھا۔ بادشاہ کا خزانہ تو محدود تھا اس لئے وہ مُنہ پھیر کر چلا گیا۔ مگر ہمارے خدا کا خزانہ

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ

آسمانوں اور زمین کی پیدائش رات اور دن کے آگے پیچھے آنے

وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ

اور اُن کشتیوں میں جو انسانوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر سمندر میں چلتی ہیں۔

النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ

اور اُس پانی میں جسے اللہ (تعالیٰ) نے بادل سے اُتارا

فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن

پھر اس کے ذریعہ زمین کو اُس کے مرنے کے بعد زندہ کیا اور اُس میں ہر ایک قسم کے

محدود نہیں۔ ہمارا بادشاہ تو خود کہتا ہے کہ مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔ اور پھر مانگتے چلے جاؤ تاکہ میں تمہیں دیتا چلا جاؤں۔ غرض اللہ تعالےٰ بے انتہا فضل کرنیوالا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اس کے خزانے غیر محدود ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم پھر کام کرو تو میں پھر تمہیں انعام دونگا۔ پھر کرو تو میں پھر دونگا۔ اور ہمیشہ تمہیں اپنے انعامات سے حصّہ دیتا چلا جاؤں گا۔

اسجگہ اِلٰهُكُمْ سے جو شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید کسی اور کا خدا بھی ہوگا یا کئی خدا ہوتے ہونگے اس کا ازالہ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ سے کر دیا۔ اور الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ سے اُس کی کامل صفات بیان کرکے عقلاً بھی کسی اور اِلٰہ کی ضرورت نہ رہنے دی۔

ترتیب و ربط:- اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ ابراہیمی دُعا کے مطابق ہم نے تمہارا مُنہ بیت اللہ کی طرف کر دیا۔ اور پھر فتح مکہ پر اس نے خاص طور پر زور دیا اور بتایا کہ لوگ فتح مکہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ فتح ہونے پر وہ اسلام میں جوق در جوق داخل

ہو جائیں گے۔ اور چونکہ جنگوں میں کئی قسم کی تکالیف پیش آتی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے صبر کی تلقین کی اور دُعائیں مانگنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور ساتھ ہی حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کی قربانیوں کی مثال بیان کرکے اس حقیقت کو واضح کیا کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انکو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ پھر حج اور عمرہ اور صفا اور مروہ کے طواف کا ذکر کرکے اسطرف اشارہ فرمایا۔ کہ ہم نے جو تمہیں حج کا حکم دیا ہے۔ تو ضرور ہے کہ وہ وقت آئے کہ جس میں تم آسانی سے حج کر سکو۔ اور صفا اور مروہ کا طواف کر سکو۔ غرض ان آیات میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ مکہ ایک دن ضرور فتح ہوگا کیونکہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں۔ اُس وقت کفار مسلمانوں کو بیت اللہ کے قریب بھی نہیں آنے دیتے تھے۔ بلکہ اس کے کئی سال بعد بھی کفار نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو طواف نہیں کرنے دیا۔ مگر بتایا کہ ایک وقت آئیگا کہ مکہ پر تمہارا قبضہ ہوگا اور تمہیں حج اور عمرہ میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑیگا۔ اور پھر آخر میں فرمایا کہ

كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ

جانور پھیلائے۔ اور ہواؤں کے اِدھر اُدھر پھیلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان

السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

مسخر ہیں (یقیناً) اس قوم کے لئے جو عقل سے کام لیتی ہے کئی (قسم کے) نشان ہیں۔ ۲۸

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں لو وہ رحمٰن اور رحیم ہے پس تمہیں اُسی سے تعلق رکھنا چاہیئے۔ اور دشمنوں کی کثرت کو دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی توحید کو دنیا میں قائم کریگا اور تمہیں اپنی رحمانیت اور رحیمیت کے نظارے دکھائیگا۔

۲۸ حل لغات:۔ اِخْتِلَافٌ۔ یہ اِخْتَلَفَ کا مصدر ہے۔ اور اِخْتَلَفَ زَیْدٌ عَمْرًا کے معنے ہیں کَانَ خَلِیْفَتَهٗ یعنی زید عمرو کا قائم مقام ہوا۔ وَجَعَلَهٗ خَلْفَهٗ اُسے اپنے پیچھے کیا۔ اسی طرح اس کے ایک معنے ہیں اَخَذَهٗ مِنْ خَلْفِهٖ۔ اُسے پیچھے سے پکڑا۔ (اقرب)

مفردات امام راغب میں لکھا ہے۔ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ کے معنے ہیں فِيْ مَجِيْءِ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا خَلْفَ الْاٰخَرِ وَتَعَاقُبِهِمَا۔ یعنی رات اور دن کا ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنا۔ (مفردات)

اَلْفُلْكُ کے معنے ہیں اَلسَّفِيْنَةُ۔ کشتی (اقرب) یہ لفظ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی۔ اسی طرح یہ لفظ واحد اور جمع دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں دونوں کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک جگہ آتا ہے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (الصافات آیت ۱۴۱) یہ واحد کی مثال ہے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ (یونس آیت ۲۳) اس میں فُلک کی طرف ھُمْ جو جمع کی ضمیر ہے پھیری گئی ہے گویا یہاں یہ لفظ جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

اِخْتِلَافٌ

اَلْفُلْكُ

تفسیر:۔ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ یعنی تمہارا معبود اپنی ذات میں اکیلا اور واحد خدا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور وہ بے انتہا کرم کرنیوالا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت اور رحیمیت کے مختلف نظارُں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ہستی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے وہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کی طرف بنی نوع انسان کو توجہ دلاتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اس پیدائش میں عقلمند قوم کے لئے بڑے بھاری نشان ہیں۔ یعنی اگر وہ سوچیں اور غور سے کام لیں تو اس امر کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کا انسانی زندگی کے ساتھ تعلق نہ ہو۔ اور یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے صرف اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ انسان کی کسی کوشش اور عمل کا اس میں دخل نہیں۔ چنانچہ دیکھ لو۔ ہوا اور پانی اور سورج اور چاند اور ستارے انسان کے کسی عمل کے نتیجہ میں اسے نہیں ملے بلکہ محض اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رحمانیت کے ظہور کے طور پر ان کو بنی نوع انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو انسان ایک لمحہ کیلئے بھی دنیا میں زندہ نہ رہ سکتا۔ پھر آسمانوں اور زمین میں اگر ایک معین قانون کام نہ کر رہا ہوتا اور ایک غیر متبدل نظام جاری نہ ہوتا۔ تب بھی انسانی زندگی بے کار ہو کر رہ جاتی۔

مگر اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کی ہر چیز انسان کے فائدہ کیلئے بنائی وہاں اُس نے ہر چیز کو ایک قانون کا بھی پابند بنا دیا تاکہ انسان بغیر کسی خطرہ کے ترقی کر سکے۔ اور زمین اور آسمان کی ہر چیز اس کی خدمت میں مصروف رہے۔ اس حقیقت کو ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (سورۃ الملک آیت ۴،۵) یعنی بہت برکت والا ہے وہ خدا جس نے سات آسمان درجہ بدرجہ بنائے۔ اور تو رحمٰن خدا کی پیدائش میں کوئی رخنہ نہیں دیکھتا۔ تو اپنی آنکھ کو ادھر ادھر پھیر کر اچھی طرح دیکھ۔ کیا تجھے خدا کی مخلوق میں کسی جگہ بھی کوئی نقص نظر آتا ہے۔ پھر بار بار اپنی نظر کو چکر دے آخر وہ تیری طرف ناکام ہو کر لوٹ آئیگی۔ اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔ یعنی اُسے نظامِ عالم میں کوئی بھی خلافِ قانون بات یا نقص نظر نہیں آئیگا۔ غرض کارخانۂ عالم کا ایک معیّن قانون سے وابستہ ہونا اور زمین و آسمان اور سورج اور چاند اور ستاروں کا اس قانون کے ماتحت ہمیشہ چلتے چلے جانا اور کبھی اس میں کوئی انحراف واقع نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ اس کائنات کو بنانے والا یقیناً ایک خدا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ بنانے والے ہوتے جیسا کہ عیسائی تین خداؤں کے قائل ہیں تو ایک ہی قانون ہر جگہ کام کرتا دکھائی نہ دیتا بلکہ اس میں ضرور کوئی نہ کوئی رخنہ واقع ہو جاتا۔ پس آسمانوں اور زمین کی پیدائش کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہستی کا ثبوت بھی پیش کر دیا اور اپنی وحدانیت کا بھی اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ رحمٰن ہے یعنی اپنی مخلوق پر بے انتہا کرم کرنیوالا اور انہیں ایسے انعامات سے فیضیاب کرنے والا ہے۔ جن میں بندوں کی کسی کوشش یا عمل کا دخل نہیں۔ اسی طرح آسمانوں اور زمین کی پیدائش اس کی صفت رحیمیت کا بھی ثبوت ہے کیونکہ دنیا میں جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بہتر سے بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے زمین میں ہل چلایا ہو اور بیج ڈالا ہو اور پانی دیا ہو اور نگرانی کی ہو اور پھر اُسے ایک دانہ کے بدلہ میں کئی کئی سو دانے نہ ملے ہوں۔ یا کسی نے صحیح محنت کی ہو اور وہ اپنی محنت کے پھل سے محروم رہا ہو۔ یہ دونوں صفات پہلو بہ پہلو چل رہی ہیں۔ رحمانیت کا بھی ظہور ہو رہا ہے اور رحیمیت کا بھی ظہور ہو رہا ہے۔ اور ہر چیز اپنے وجود سے خدا تعالیٰ کی طرف انگلی اُٹھا کر اُس کی ہستی کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہستی کا علم ایسا ہے جو دوسری چیزوں کے علم اور معرفت کے بعد حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ کلّی علم ہے۔ بعض چیزیں اپنی ذات میں نظر آنے والی ہوتی ہیں۔ اُن کے دیکھنے سے انسان کو اُن کا علم ہو جاتا ہے۔ مثلاً بچہ کے سامنے اگر ہم انگلی رکھیں اور قطع نظر اس سے کہ وہ اس قسم کی تفصیلات معلوم کرے کہ اُس انگلی کے پیچھے ایک پنجہ ہے اور اس پنجہ کے پیچھے ایک بازو ہے۔ اور اس بازو کے پیچھے ایک کندھا ہے۔ وہ کندھا گردن کے واسطہ سے سر سے ملتا ہے اور اس سر میں ایک دماغ ہے جس کے حکم سے ان چیزوں نے حرکت کی ہے اور پھر یہ انگلی میرے سامنے آئی ہے۔ وہ یہ سمجھ لیگا کہ اتنی لمبی اور اتنی موٹی ایک چیز میرے سامنے آگئی ہے۔ پس انگلی کا علم باقی علم کی ضرورت کا پابند نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم کلّی علم کے طور پر ہے۔ اور جب تک جزئیات کا علم نہ ہو اُس وقت تک کلّی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم خدا تعالیٰ تک اُس کی مخلوقات کے ذریعے سے پہنچتے ہیں اور پھر اس میں بھی تکمیل کے بعد تکمیل اور وسعت کے بعد وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک چیز کے علم کے بعد دوسری چیز کا

علم حاصل ہوتا ہے اور دوسری چیز کے بعد تیسری چیز کا۔ اور تیسری کے بعد چوتھی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مخلوق کی جزئیات کا علم ہوتے ہوتے انسان خدا تعالیٰ تک معرفت پیدا کرتا جاتا ہے۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی اگر غور کرے تو اس کے لئے بھی خدا تعالیٰ کی ہستی کی دلیل موجود ہے۔ جیسے ایک اعرابی سے کسی نے پوچھا کہ تم خدا کو کیوں مانتے ہو تو وہ ہنس پڑا کہ میں اتنا پاگل تو نہیں ہوں کہ خدا کو بھی نہ پہچان سکوں۔ بکریوں کی مینگنیاں راستہ میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں تو میں ان کو دیکھ کر سمجھ لیتا ہوں کہ یہاں سے بکری گذری ہے۔ اونٹ کا پاخانہ پڑا ہوا ہو تو اسے دیکھ کر میں سمجھ لیتا ہوں کہ ادھر سے اونٹ گذرا ہے تو کیا اتنی وسیع دنیا کو دیکھ کر میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک خدا موجود ہے جو اس ساری دنیا کا خالق اور اس نظام کا پیدا کرنیوالا ہے۔ یہ ایک بسیط علم ہے جس پر فلسفیوں نے اعتراض کیا ہے کہ آخر اتفاقات بھی تو ہوتے ہیں۔ اس لئے خالی زمین و آسمان کی پیدائش اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ ان کا کوئی خالق ہے۔ بعض چیزیں اتفاقاً بھی ہو جاتی ہیں اور تمام لوگ کہتے ہیں کہ یہ اتفاقی بات ہے۔ قرآن مجید نے فلسفیوں اور منکرینِ یورپ کے اس اعتراض کی تردید میں یہ دلیل دی ہے کہ خالی اس دنیا کا وجود بیشک خدا تعالیٰ کے خالق ہونے کی مکمل دلیل نہیں اور تم اسکو اتفاقی کہہ سکتے تھے مگر اس تمام عالم میں ایک ترتیب کا پایا جانا اور ہر چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جوڑ موجود ہونا۔ اور ہر چیز اور اس کے ذرہ ذرہ میں حکمت کا پایا جانا یہ سب کچھ اتفاقی نہیں۔ بلکہ اس دنیا کی ترتیب اور ہر چیز کا دوسری چیز کے ساتھ جوڑ اور ہر ذرہ کی حکمت یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اس سارے نظام اور ساری دنیا کا پیدا کرنیوالا خدا موجود ہے جس نے حکمت کے ماتحت اس ساری دنیا کو پیدا کیا ہے۔ اُس نے انسان کی آنکھ پیدا کی جس میں دیکھنے کی طاقت رکھی تو اس کے مقابل میں سورج کے اندر روشنی پیدا کی جس کے ذریعہ سے انسان دیکھتا ہے۔ ناک پیدا کی جس سے انسان سونگھتا ہے تو اُسکے مقابل میں خوشبو پیدا کی۔ کان پیدا کیا جس سے انسان سُنتا ہے تو اس کے مقابل میں ہوا میں یہ خصوصیت رکھی کہ وہ جنبش کرتی ہے اور اس کے ذریعہ سے کان تک آواز پہنچتی ہے۔ اب کیا دیکھنے کے لئے آنکھ اگر اتفاقاً پیدا ہو گئی تو اُس کے مقابل میں سورج کی روشنی بھی اتفاقاً پیدا ہو گئی؟ سونگھنے کے لئے اگر ناک اتفاقاً پیدا ہو گئی تو کیا اس کے مقابل میں خوشبو بھی اتفاقاً پیدا ہو گئی؟ اگر سُننے کیلئے کان اتفاقاً پیدا ہو گئے تو کیا اس کے مقابل میں ہوا کے اندر بھی جنبش کر کے کانوں تک آواز پہنچانے کی قابلیت اتفاقاً پیدا ہو گئی؟ پس ان چیزوں کے اندر اگر کوئی جوڑ نہ ہوتا۔ کوئی ترتیب نہ ہوتی اور کوئی حکمت نہ ہوتی تو انکو اتفاق کہا جا سکتا تھا لیکن دنیا کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جس میں کوئی ترتیب نہ ہو کوئی ذرہ ایسا نہیں جس میں حکمت نہ ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں جس کا کسی دوسری چیز سے جوڑ اور وابستگی نہ ہو تو ہم کس طرح مان لیں کہ یہ دنیا کی ساری چیزیں اور یہ سارے کا سارا نظام خود بخود اور اتفاقی ہے۔ مگر یہ دلیل اُسی صورت میں فائدہ دے سکتی ہے جب انسان بڑا ہو اور ان چیزوں پر غور کرے۔ آنکھوں سے دیکھے۔ دل و دماغ سے سوچے۔ اِدھر ان چیزوں پر نگاہ ڈالے اُدھر اپنے دل کے جذبات پر غور کرے۔ سورج اور چاند کی روشنی کو دیکھے۔ ہوا اور اس کے اثرات پر غور کرے۔ گرمی اور سردی کے اثرات کو دیکھے۔ سبزیوں اور ترکاریوں کے پیدا ہونے اور اُن کی خاصیتوں پر غور کرے جب تک وہ ان چیزوں پر غور کرنے اور ان سے نتیجہ نکالنے کی اہلیت نہیں رکھتا اُسوقت تک وہ خدا تعالیٰ تک کس طرح پہنچ سکتا ہے؟ یہ بات خلافِ عقل ہے کہ ایک بچہ ان تمام چیزوں پر غور کر کے اس نتیجہ تک پہنچ جائے

کہ ایک خدا موجود ہے۔ بچہ تو سب سے پہلے اپنی ماں سے روشناس ہوتا ہے اور اُسی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ پھر جب اُس کو پتہ لگتا ہے کہ ماں کو بھی سب چیزیں باپ ہی لاکر دیتا ہے تو پھر وہ باپ سے محبت کرتا ہے۔ بڑا ہو کر جب اپنی گلی کے بچوں سے کھیلتا ہے تو پھر اُن سے محبت کرتا ہے۔ اگر اس کا کوئی دوست نہ ملے تو رونے لگ جاتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ میرے دوست کو بلاؤ اسکے بغیر میرا گذارہ نہیں۔ پھر کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں کا شوق پیدا ہوتا ہے تو اُن سے محبت کرتا ہے۔ اگر اُس کی مرضی کے مطابق کھانا نہ ملے یا مرضی کے مطابق کپڑا نہ ملے تو روٹھ جاتا ہے کہ میرا اس کے بغیر گذارہ نہیں۔ پھر اور بڑا ہوتا ہے تو سیر و شکار سے محبت کرتا ہے اور ان چیزوں کے بغیر اپنی زندگی بے لطف سمجھتا ہے۔ غرض یہ چیزیں ایک ایک کرکے اُسکے سامنے آتی ہیں اور ہر ایک کے متعلق وہ یہی اندازہ لگاتا ہے کہ اس کے بغیر میرا گذارہ نہیں۔ گویا وہی اس کا خدا ہوتا ہے۔ مگر پھر آہستہ آہستہ ان چیزوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے پہلے ماں سے محبت ہوتی ہے تو اُسی کو اپنا خدا سمجھتا ہے۔ پھر باپ سے محبت ہوتی ہے تو اسی کو اپنا خدا سمجھتا ہے۔ پھر بھائیوں اور دوستوں سے محبت ہوتی ہے تو اُن کو اپنا خدا سمجھتا ہے پھر کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں سے محبت ہوتی ہے تو اُن کو اپنا خدا سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب عاقل و بالغ ہو جاتا ہے تو پھر اگر اس پر خدا کا فضل ہو جائے اچھا اُستاد مل جائے جو اُسے علم سکھائے اور ماں باپ بھی اچھی طرح تربیت کرنے والے ہوں تب وہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر حقیقی خدا کی طرف آجائیگا اور سمجھ لیگا کہ یہ سب نقلی خدا تھے جن کو میں نے اپنی خواہشات کے ماتحت سب کچھ سمجھ رکھا تھا۔ اصل خدا تو وہ ہے جو ان سب کا پیدا کرنیوالا ہے غرض پہلے غیر اللہ کی محبت انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کا سارا انحصار انہی پر ہے لیکن ایک ایک کرکے پھر انکو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ پہلے ماں کی گود کو ہی سب کچھ سمجھتا ہے اور اس سے الگ ہونے میں اپنی ہلاکت سمجھتا ہے۔ پھر بڑا ہوتا ہے تو بھائیوں اور دوستوں سے محبت کرنے لگتا ہے اور اپنی زندگی کا تمام سُکھ اور راحت انہیں کے ساتھ کھیلنے میں سمجھتا ہے۔ جب اُن کے ساتھ مل کر کھیل رہا ہو تو ماں کے بلانے پر بھی نہیں جاتا۔ اس کی ساری خوشی کھیلنے میں ہوتی ہے۔ پھر اور بڑا ہوتا ہے تو سیر و شکار سے محبت ہوتی ہے۔ پھر صحن اور گلی میں کھیلنے کو بھول جاتا ہے اور اس کی ساری خوشیاں سیر و شکار میں مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اگر اُس کو ان چیزوں سے روکا جائے تو اس میں اپنی ہلاکت سمجھتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ آپ ہی آپ ان سب کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بلوغت کو پہنچ جاتا ہے تو غور و فکر کے بعد خدا کی حقیقی شکل اس کو نظر آجاتی ہے اور ان تمام چیزوں کو لغو سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی ترتیب طبعی کے ماتحت مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے ایک ستارہ کو چمکتا ہوا دیکھا تو اس کو اپنا خدا سمجھ لیا۔ پھر چاند کو دیکھا کہ ستارہ سے بڑا اور اس سے زیادہ روشن ہے تو اس کو اپنا خدا سمجھ لیا۔ پھر سورج کو دیکھا کہ ستارے اور چاند دونوں سے بہت بڑا اور بہت زیادہ روشن ہے تو اس کو اپنا خدا سمجھ لیا۔ مگر جب ایک ایک کرکے سب چھپ گئے تو آپ نے فرمایا۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام ع) یعنی میں نے تمام کج راہوں سے بچتے ہوئے اپنی توجہ اس خدا کی طرف پھیر دی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ اور آخر میں آپ خدا تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ واقعہ تو درست نہیں مگر مفسرین کا دماغ اس بات تک صحیح پہنچا ہے کہ انسانی دماغ بغیر الہام کے جب ہدایت پاتا ہے تو ادنیٰ سے اعلیٰ تک جاتا ہے۔ بچے کے

نزدیک ابتداء میں اُس کی ماں ہی سب کچھ ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں
میں اُس کا خدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کو ماں کی بھی خبر نہیں ہوتی
وہ سب سے پہلے پستان ہی کو خدا سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا
ہے کہ مجھے اِس سے دودھ ملتا ہے اگر پستان نہ ملے تو روتا
ہے۔ پھر ماں کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے۔ پھر باپ
کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے۔ پھر بھائی سے محبت
کرتا ہے۔ پھر ساتھ کھیلنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ گلی اور
محلے والوں سے محبت کرتا ہے۔ پھر دوسری ضروریات کھانے
پینے اور پہننے کی چیزوں سے محبت کرنے لگتا ہے اور ان
میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے مقام پر اپنا مقصود سمجھتا ہے۔ مگر
آہستہ آہستہ ان سب کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک
کہ یہ چیزیں اسے خدا تک پہنچا دیتی ہیں۔ اگر سال یا چھ مہینے
کے بچے کے اندر بولنے اور سمجھنے کی طاقت ہوتی اور اُسے کہا
جاتا کہ تو بڑا ہو کر اپنی ماں کی گود کو چھوڑ دیگا تو وہ اس
بات سے اتنا ہی حیران ہوتا جتنا کہ ایک سائنسدان اس
بات سے حیران ہوتا کہ اُسے کہا جائے آگ جلاتی نہیں بلکہ
بجھاتی ہے۔ یا سورج روشنی نہیں دیتا۔ یا چاند کی
روشنی مکتسب نہیں بلکہ آپ ہی آپ ہے۔ غرض جس طرح
ایک سائنسدان ان اوپر کی باتوں سے حیران ہوگا وہ بچّہ
بھی اگر اس کو یہ بات سمجھائی جاسکتی کہ ایک دن وہ اپنی
ماں کی گود سے اُتر جائیگا اور اس کی رغبت اپنی ماں سے کم ہو جائیگی
حیران ہوتا۔ اگر سات آٹھ سال کے بچّے کو یہ بات کہہ دی جائے
کہ بڑا ہو کر تو ایک عورت سے شادی کرے گا اور اس سے تیری
رغبت زیادہ ہو جائیگی اور تو اپنی ماں کو چھوڑ دیگا تو وہ
کہیگا کہ میں ایسا پاگل تو نہیں ہوں کہ اپنی ماں کو چھوڑ دوں
وہ اور ہونگے جو ایسا کرتے ہیں میں تو کبھی اس طرح نہیں کرونگا
پس یہ ایک فطرتی چیز ہے کہ انسان مختلف وقتوں میں مختلف
چیزوں سے رغبت کرتا ہے اور جس وقت وہ اس چیز سے رغبت
کر رہا ہوتا ہے اسوقت وہ یہ وہم بھی نہیں کر سکتا کہ ایک دن
میں اس چیز کو چھوڑ دونگا۔ اور جب بڑا ہوتا ہے تو پھر اس
بات کا اسے خیال بھی نہیں آتا کہ کسی وقت میں اس چیز
سے رغبت رکھتا تھا اور اس کے بغیر اپنی زندگی حرام سمجھتا
تھا۔ یہی معنے اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ہیں کہ پہلے
انسان غیر اللہ کی طرف توجہ کرتا ہے جو بظاہر غیر اللہ کا
راستہ ہے مگر اللہ تک پہنچنے کا اصل راستہ یہی ہے۔
اگر بچّہ کے اندر پستان کی محبت نہ ہوتی تو اس کے اندر
ماں کی محبت بھی کبھی نہ ہوتی۔ اگر بچّہ کو ماں سے محبت نہ
ہوتی تو اس کو باپ سے بھی کبھی محبت نہ ہوتی۔ اگر بچہ کو
باپ سے محبت نہ ہوتی تو اس کو بھائی اور بہنوں سے بھی
کبھی محبت نہ ہوتی۔ اگر بچہ کو بھائی بہنوں سے محبت نہ
ہوتی تو اس کو دوستوں اور ساتھ کھیلنے والوں سے بھی
کبھی محبت نہ ہوتی۔ اور اگر اس کو اپنے اپنے وقت پر
ان اشیاء سے رغبت نہ ہوتی تو سچی بات یہ ہے کہ وہ خدا
کو بھی اپنے وقت پر نہ پا سکتا۔ بات یہ ہے کہ انسان
اپنی فطرت میں جو خلا محسوس کرتا ہے اُس کو پُر کرنے کیلئے
وہ مختلف وقتوں میں مختلف چیزوں سے رغبت کرتا ہے
کہ شاید یہ چیز میری ضرورت کو پورا کردے۔ جب اُس چیز
سے اس کی تسلی نہیں ہوتی تو پھر دوسری چیز سے رغبت کرتا ہے
کہ شاید اس چیز سے میری ضرورت پوری ہو جائے۔ پھر جب
اُس چیز سے بھی اُس کا خلا پُر نہیں ہوتا تو تیسری چیز سے
رغبت کرتا ہے کہ شاید یہاں میرا مقصد مل جائے۔ جب اس
سے بھی اسے طمانیت حاصل نہیں ہوتی تو پھر چوتھی چیز سے
رغبت کرتا ہے کہ شاید یہی میرا مقصود ہو۔ یہاں تک کہ
ایک ایک کرکے ان تمام چیزوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے اور
آخر خدا تک جا پہنچتا ہے۔ اور جب اس کو اللہ مل جاتا ہے
تو اُس کو پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس مقام سے نہیں ہلتا
قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ
الْمُنْتَهٰی (نجم آیت ۴۳) کہ ان تمام چیزوں میں سے

جو غیر اللہ ہیں کیونکہ ایک دن انسان اپنی منزلِ مقصود یعنی خدا تک جا پہنچتا ہے۔ اور وہ فوراً ہی اس منزل پر نہیں پہنچ جاتا بلکہ راستہ میں کئی چیزیں آتی ہیں جن کو بچپن کی وجہ سے خدا سمجھ لیتا ہے مگر آہستہ آہستہ اُن سب کو چھوڑتا چلا جاتا ہے اور ہر چیز اس کی انگلی پکڑ کر اُس کو خدا کے قریب کر دیتی ہے۔

زیرِ تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم نظامِ عالم پر غور کرو تو تمہیں ذرہ ذرہ میں خدا تعالیٰ کا وجود نظر آئیگا۔ اور تمہیں اقرار کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان اور اُن کے درمیان جس قدر اشیاء پیدا کی ہیں ان تمام کو حق و حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے یعنی اُن کی پیدائش بلا وجہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے کوئی بہت بڑا مقصد کام کر رہا ہے۔ اور چونکہ وہ مقصد اِس دنیا میں پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسانی زندگی اِسی دنیا تک محدود نہ ہو تاکہ وہ اِس نظام کی عظمت کے مطابق اس اعلیٰ مقام کو حاصل کرے جس کے لئے اُس کی پیدائش معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اگر انسان کی زندگی صرف اِس دُنیا تک ختم ہو جانے والی ہوتی تو اس کے لئے اتنا بڑا نظام جاری کرنا جس کے اسرار کو علوم کی انتہائی ترقی کے باوجود ابھی تک سائنسدان بھی معلوم نہیں کر سکے ایک لغو اور خلافِ عقل فعل قرار پاتا ہے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۴۶ء میں جب ہم نے قادیان میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے افتتاح کے لئے ڈاکٹر سر شانتی سروپ صاحب بھٹناگر ڈائرکٹر سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ گورنمنٹ آف انڈیا کو بلوایا تو انہوں نے تقریر کرتے ہوئے یہی کہا کہ آج سائنسدان کے غرور کا سر استقدر نیچا ہو چکا ہے کہ وہ ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سائنس اُن اشیاء کی بھی مناسب تشریح کر سکتی ہے جو ظاہری طور پر ہمیں نظر آتی ہیں۔ اور جب زمین و آسمان میں اس قدر اسرار پائے جاتے ہیں کہ سائنس اپنی تمام ترقی کے باوجود ابھی مادیات میں سے بھی ایک بہت چھوٹے سے حصے کی تشریح کر سکی ہے۔ تو پھر اس وسیع کائنات کو جس وجود کیلئے ایک خادم کے طور پر پیدا کیا گیا ہے اس کی پیدائش کو عبث قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ رات اور دن کے آگے پیچھے آنے میں بھی عقلمند لوگوں کے لئے بڑے بھاری نشان ہیں۔ اِس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے پھر اپنی رحمانیت کا ثبوت پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور سورج اور چاند اور ستارے وغیرہ بنائے۔ اِسی طرح اُس نے اپنی رحمانیت کے ماتحت یہ بھی انتظام کیا ہوا ہے کہ رات اور دن کا ایک تسلسل جاری ہے۔ اور ہر رات کے بعد ایک دن کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر رات نہ آتی تو انسان اپنی طاقتوں کو کھو بیٹھتا۔ اور اگر دن نہ چڑھتا تو انسانی زندگی بے کار ہو کر رہ جاتی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے ماتحت رات اور دن بنا دیئے تاکہ انسان اپنی نیند پوری کر کے قویٰ میں تازگی حاصل کرے اور دن بھر کام کر کے اپنے آپ کو مفید وجود بنائے۔ رات اور دن کی طرف توجہ دلا کر اللہ تعالیٰ نے رُوحانی رنگ میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے مادی ظلمت کو دُور کرنے کیلئے انتظام کر رکھا ہے رُوحانی طور پر بھی ظلمت اور نور کا ایک سلسلہ جاری ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے سامان پیدا کر رکھے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں رُوحانی ظلمتیں کافور ہوتی رہتی ہیں۔ اِن سامانوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ ملائکہ انسانی قلوب میں نیک تحریکات کرتے رہتے ہیں اور انہیں ظلمات سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب بنی نوع انسان کی اکثریت ظلمت میں گرفتار ہو جائے اور ملکی تحریکات اُن پر اثر نہ کریں اور شیطان اُن پر تسلط جمالے تو اسوقت

اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور ماموروں کے ذریعہ اُن کی ظلمتوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ لوگ رُوحانی عالم کے آفتاب و ماہتاب ہوتے ہیں اور اُن پر ایمان لانے والے ستاروں کی طرح دنیا کی ہدایت کا موجب بنتے ہیں۔ غرض اِخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں اللہ تعالیٰ نے رحمانیت کے اِس فیضان کی طرف توجہ دلائی ہے جس کے ذریعہ ملائکہ اور انبیاء اور ماموروں اور مجددین اور اولیاء وغیرہ بنی نوع انسان کو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتے ہیں اور دنیا کو تباہ ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں

وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ جیسے کشتیوں اور جہازوں کے بغیر تم سمندروں میں نہ ایک طرف کا مال دوسری طرف پہنچا سکتے ہو اور نہ وہاں سے کوئی مال اپنے استعمال کیلئے لا سکتے ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے رُوحانی دنیا میں بھی بعض ایسے وجود بنائے ہیں جو لوگوں کے لئے کشتی کا کام دیتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے فیضان لاتے ہیں اور تمہیں زمین سے اُٹھا کر خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں۔ پھر جس طرح وہی شخص سمندری طوفانوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جو کشتی میں سوار ہو۔ اسی طرح رُوحانی بلاؤں اور آفات سے بھی وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اپنے زمانہ کے رُوحانی نجات دہندہ کی کشتی میں سوار ہو۔

وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ میں اسطرف اشارہ فرمایا۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ زمین کو حیاتِ تازہ بخشنے کے لئے آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگوں کی رُوحانی تشنگی فرو کرنے کے لئے آسمان سے ہی وحی نازل کیا کرتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ لوگ جسمانی بارش کو تو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جب آسمان سے وحی الٰہی کی بارش نازل ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ سے وحی الٰہی کی بارش سے فائدہ اٹھانے اور نہ اٹھانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ دنیا میں تین قسم کے آدمی پائے جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی مثال اچھی زمین کی طرح ہوتی ہے۔ جو نرم ہو۔ پانی کو اپنے اندر جذب کرنے کی قابلیت رکھتی ہو اور پھر اچھی کھیتی اُگا سکتی ہو۔ جب بارش نازل ہوتی ہے تو وہ زمین بارش کے پانی کو سمیٹ لیتی اور اُسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور پھر زمین سے کھیتی نکلتی اور لوگوں کے کام آتی ہے گویا وہ خود بھی پانی پیتی ہے اور باقی لوگوں کے لئے بھی غذا مہیا کرتی ہے۔ اور دوسری قسم کے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی مثال اس زمین کی طرح ہوتی ہے۔ جو سخت ہو لیکن اپنے اندر نشیب رکھتی ہو۔ جب پانی گرتا ہے تو وہ اس زمین میں جمع ہو جاتا ہے اور گو ایسی زمین خود پانی نہیں پیتی لیکن چونکہ وہ پانی کو جمع کر لیتی ہے اس لئے وہ پانی جانور پیتے ہیں۔ آدمی استعمال کرتے ہیں اور اپنے کھیتوں کو اس پانی سے سیراب کرتے ہیں۔ لیکن ایک تیسری قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی مثال اس سخت اور پتھریلی زمین کی طرح ہوتی ہے جو نہ صرف سخت اور پتھریلی ہو بلکہ سطح اور ہموار بھی ہو۔ اُس میں کوئی گڑھا نہ ہو۔ جب آسمان سے پانی نازل ہوتا ہے تو نہ وہ آپ پانی پیتی ہے کیونکہ وہ سخت اور پتھریلی ہوتی ہے اور نہ پانی جمع کرتی ہے کیونکہ وہ سطح اور ہموار ہوتی ہے۔ پھر فرمایا۔ پہلی مثال تو اس شخص کی ہے جو عالم باعمل ہو۔ وہ دین حاصل کرتا ہے اور نہ صرف خود اس کے احکام پر عمل کرتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور ان کو عامل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا وہ عالم بھی ہوتا ہے اور عامل بھی ہوتا ہے۔ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا ہے اور معلّم بھی ہوتا ہے۔ لیکن تیسری قسم کا آدمی نہ عامل ہوتا ہے اور نہ معلّم ہوتا ہے۔ نہ خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ دوسری مثال بوجہ اس کے کہ دونوں مثالوں سے حل ہو جاتی ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی۔ مگر ہر شخص ادنیٰ غور سے

سمجھ سکتا ہے کہ دوسری مثال اُس شخص کی ہے جو معلّم تو ہے مگر عامل
نہیں۔ وہ دین سیکھتا ہے اُس کے احکام سُنتا ہے اس کی تعلیموں
سے واقفیت رکھتا ہے مگر خود دیندار نہیں ہوتا۔ ایسا شخص چونکہ
خدا اور اُس کے رسول کی باتیں دوسروں تک پہنچاتا رہتا ہے
اس لئے وہ بھی ایک مفید وجود ہوتا ہے۔ گو ذاتی طور پر وہ اس سے
فائدہ نہیں اٹھاتا۔ بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
تین قسم کے انسانوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ
انبیاء کے آنے پر بھی تین گروہ دنیا میں نظر آتے ہیں۔ یعنی کچھ
تو ایسے لوگ ہوتے ہیں جو ان کی تعلیموں پر عمل کرتے اور وحی الٰہی
کی بارش سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے
ہیں جو اعراض سے کام لیتے اور انبیاء کا انکار کر دیتے ہیں۔
اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو دین کو سمجھتے تو ہیں مگر اپنی غفلت اور
سُستی کی وجہ سے اُس پر عمل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ
مادی بارش کا ذکر فرما کر اس طرف توجہ دلائی ہے۔ کہ جس طرح
تم بارش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہو۔ اسی طرح
تمہارا فرض ہے کہ تم اس رُوحانی بارش سے بھی فائدہ اُٹھاؤ
جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوئی ہے
اور ان پتھروں کی طرح مت بنو جو بارش کا کوئی قطرہ اپنے
اندر جذب نہیں کرتے۔ پھر جس طرح آسمان سے بارش برستی ہے
تو زمین کی اندرونی تہوں میں جو پانی مخفی ہوتا ہے اُس میں
بھی جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کنوؤں کا پانی بھی چڑھ آتا
ہے۔ اسی طرح انبیاء پر جب وحی الٰہی کی بارش نازل ہوتی
ہے تو عوام الناس کو بھی کثرت کے ساتھ خوابیں آنی شروع
ہو جاتی ہیں اور اُن کی توجہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف پھر جاتی ہے
چنانچہ اس زمانہ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام
کی صداقت میں ہزارہا لوگوں کو خوابیں آئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ
اگر اس قسم کی خوابیں اکٹھی کی جائیں تو ایک بہت بڑی کتاب
بن سکتی ہے۔

اسی طرح وحی الٰہی کے فیضان کے دائرہ کو اللہ تعالیٰ نے
اس رنگ میں بھی وسیع کر دیتا ہے کہ جو لوگ انبیاء پر ایمان
نہیں لاتے اللہ تعالیٰ اُن کے دماغوں میں بھی ایک نئی روشنی
پیدا کر دیتا ہے اور ان کی عقلیں تیز ہو جاتی ہیں۔ اُن کا فکر بلند
ہو جاتا ہے۔ انکی فراست ترقی کر جاتی ہے اور اُن کی دماغی صلاحیتیں
زیادہ تیزی سے اُبھرنے لگتی ہیں۔

پھر فرماتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے نشانوں میں سے ایک یہ
بھی نشان ہے کہ وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٍ۔ اُس نے
زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں۔ اس میں مادی جانوروں
کے علاوہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جو انبیاء
کے آنے سے پہلے مردہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن میں
رُوحانی زندگی کی کوئی رمق تک نظر نہیں آتی۔ لیکن جب آسمانی
صُور پھونکا جاتا ہے تو اُس وقت ایسے مردہ بھی زندہ ہو
جاتے ہیں۔ اور لولے لنگڑے بھی چلنے پھرنے لگ جاتے ہیں۔
پھر یہ لوگ جو مختلف ملکوں اور مختلف قوموں اور مختلف
رنگوں اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف علوم
و فنون اور مختلف قابلیتوں کے مالک ہوتے ہیں نبی کی آواز
پر لبیک کہنے کے بعد دین کی اشاعت کے لئے دنیا میں چاروں
طرف پھیل جاتے ہیں اور اپنی تبلیغی جد وجہد سے لاکھوں بلکہ
کروڑوں لوگوں کو دین کی طرف کھینچ لاتے ہیں جو اس کے دین
کی رونق اور تازگی کا موجب بنتے ہیں۔ ان معنوں کے لحاظ سے
دَآبَّةٍ سے اُن مومنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو زمین کی
روحانی رونق اور آبادی کا باعث ہوتے ہیں اور جن سے
موجودہ اور آئندہ نسلیں ہزاروں قسم کے مادی اور رُوحانی
فوائد اُٹھاتی ہیں۔

وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ
السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ رحیمیت کا
ثبوت پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ صفتِ رحمانیت کے ماتحت
اللہ تعالیٰ کے جس قدر فیضان ہیں اُن میں تو کافر بھی برابر کے
شریک ہیں۔ لیکن رحیمیت کے دائرہ میں جب مومن اور کافر

مقابلہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تائید مومنوں کو کامیاب کرتی اور کفار کو انکے ارادوں میں ناکام کردیتی ہے۔ اس جگہ استعارہ کے طور پر ہواؤں سے وہ ہوائیں مراد ہیں جو خاص خاص وقتوں میں چلا کرتی ہیں بخصوصاً وہ ہوائیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے چلیں اور جنہوں نے آپ کے انوار کو ساری دنیا میں پھیلا دیا مثلاً جنگِ بدر کے موقعہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ریت اور کنکریوں کی ایک مٹھی پھینکی تو اسی وقت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسی تیز ہوا چلی جس نے مومنوں کی تائید کی۔ اور کفار کو ایسا بے دست و پا کر دیا کہ تھوڑی دیر میں ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اور کفار کے بڑے بڑے لیڈر خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ اور ان کے مسلح اور آزمودہ کار سپاہی میدان سے منہ پھیر کر بھاگ نکلے۔

پھر غزوۂ احزاب میں بھی ایسا ہی ہوا اور خدا تعالیٰ نے آپ کی تائید میں ہوا چلائی اور کفار بدحواس ہوکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ایک رات سخت آندھی چلی جس نے قناطوں کے پردے توڑ دیئے۔ چولھوں پر سے ہنڈیاں گرادیں۔ اور بعض قبائل کی آگیں بجھ گئیں۔ مشرکین عرب میں یہ رواج تھا کہ وہ ساری رات آگ جلائے رکھتے تھے اور اس کو نیک شگون سمجھتے تھے۔ اور جس کی آگ بجھ جاتی تھی وہ خیال کرتا تھا کہ آج کا دن میرے لئے منحوس ہے۔ اور وہ اپنا خیمہ اٹھا کر لڑائی کے میدان سے پیچھے ہٹ جاتا تھا جن قبائل کی آگ بجھی انہوں نے اس رواج کے مطابق اپنے خیمے اٹھائے اور پیچھے کو چل پڑے۔ انکو دیکھ کر اردگرد کے قبائل نے سمجھا کہ شاید یہود نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر شبخون مار دیا ہے۔ اور ہمارے آس پاس کے قبائل بھاگ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی جلدی جلدی اپنے ڈیرے سمیٹے اور میدان سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ابوسفیان اپنے خیمہ میں آرام سے لیٹا تھا کہ اس واقعہ کی خبر اسے بھی جا پہنچی وہ گھبرا کر اپنے بندھے ہوئے اونٹ پر چڑھ بیٹھا اور اس کو ایڑیاں مارنی شروع کر دیں۔ آخر کسی نے اسے توجہ دلائی کہ وہ یہ کیا حماقت کر رہا ہے۔ اس پر اس کے اونٹ کی رسیاں کھولی گئیں اور وہ بھی اپنے ساتھیوں سمیت میدان سے بھاگ گیا۔

پھر ہواؤں کی طرح بارشیں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تائید میں برسیں۔ اور بادلوں نے بھی آپ کا ساتھ دیا۔ چنانچہ جنگِ بدر کے موقعہ پر جبکہ صحابہؓ کو پانی کی سخت ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے بارش نازل کر دی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو پانی بھی مل گیا اور ان کی زمین بھی جو ریتلی تھی اور میدان جنگ بننے والی تھی سخت ہو گئی۔ ادھر کافروں کی زمین جو سخت تھی بارش کی وجہ سے ایسی خراب ہو گئی کہ وہ اس پر پھسلنے لگ گئے۔ اسی طرح مدینہ میں آپ کی دعا کی برکت سے ایک دفعہ کئی دن بارش ہوتی رہی لیکن جب وہ بارش تکلیف کی صورت اختیار کرنے لگی اور مومنوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا تو آپ ہی کی دعا کی برکت سے وہ رکی اور مدینہ سے ہٹ کر اردگرد کے علاقہ پر برسنے لگ گئی۔

اسی طرح جب مکہ والوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شدید مخالفت کی اور بار بار عذاب کا مطالبہ کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان پر ویسا ہی سات سالہ قحط نازل فرمائے جیسا کہ اس نے یوسف کے زمانہ میں نازل کیا تھا۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ کی اس بددعا کی وجہ سے حجاز میں ایسا شدید قحط پڑا کہ لوگوں کو مردار اور ہڈیاں اور چمڑے تک کھانے پڑے اور ان کی صحتیں اس قدر کمزور ہو گئیں کہ انہیں ہر وقت آنکھوں کے سامنے دھواں سا نظر آتا تھا۔ اور یہ عذاب پورے سات سال تک ممتد رہا۔ آخر لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے درخواست کی کہ مضر یعنی قبائلِ حجاز کے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تکلیف کو دور کرے۔ چنانچہ آپ نے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ (میں) سے (اللہ کے) ہمسر بناتے ہیں۔ وہ اُن سے اللہ کی محبت کی طرح

كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى

محبت کرتے ہیں۔ اور جو لوگ مومن ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ (ہی) سے محبت کرتے ہیں۔ اور جو لوگ (اس) ظلم کے مرتکب

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ

ہوئے (ہیں) اگر وہ (اس گھڑی کو) جب وہ عذاب کو (سامنے) دیکھیں گے (کسی طرح اب) دیکھ لیتے (تو جان لیتے) کہ سب

جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۶﴾

قوت اللہ ہی کو ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب (دینے) والا ہے۔ ۱۷۹

اَنْدَادًا

دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے بارشیں نازل فرمائیں اور قحط دُور ہُوا۔ بلکہ ایک روایت میں ذکر آتا ہے کہ خود ابوسفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُس نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیری قوم ہلاک ہو گئی۔ دُعا کر کہ اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف کو دُور کرے۔ چنانچہ آپ نے دُعا فرمائی اور یہ عذاب دُور ہُوا (بخاری جلد ۲ کتاب تفسیر سورۃ دُخان) یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوائیں بھی مسخر کر دی تھیں۔ اور بادل بھی مسخر کر دیئے تھے۔ اور کامل مومنوں کے لئے بھی وہ ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ بے شک ہوائیں ہمیشہ چلتی رہتی ہیں اور بارشیں ہمیشہ برستی رہتی ہیں مگر بدر اور احزاب کی ہواؤں نے بتا دیا کہ وہ مومنوں کے لئے بشارت اور کافروں کے لئے عذاب تھیں۔ اسی طرح بارشیں بھی بے شک عام طور پر ہوتی رہتی ہیں مگر بدر اور مدینہ کی بارشوں نے بتا دیا کہ وہ مسخر شدہ تھیں۔ اور مسخر شدہ بارشیں اور ہوائیں ہمیشہ مومنوں کی تائید اور کفار کی تذلیل کے لئے جاری ہوتی ہیں اور ایسے امور تقدیر خاص کے ماتحت جاری ہوتے ہیں۔

۱۷۹ حل لغات :- اَنْدَادًا : یہ نِدٌّ کی جمع ہے۔ اور اَلنِّدُّ کے معنے ہیں اَلْمِثْلُ وَلَا يَكُوْنُ اِلَّا مُخَالِفًا نِدٌّ مثل کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ ہمیشہ مدّمقابل کے لئے بولا جاتا ہے۔ يُقَالُ مَالَهٗ نِدٌّ اَىْ مَالَهٗ نَظِيْرٌ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی ند نہیں یعنی اس کا کوئی نظیر نہیں۔ اس کی جمع انداد آتی ہے۔

یہاں اِذْ۔ حِیْنَ کے معنے میں استعمال ہُوا ہے اور حین کے معنے وقت کے ہیں۔

اِسی طرح اسجگہ لَوْ کی جزاء محذوف ہے جو کہ يَعْلَمُوْا ہے۔ معنے اس طرح ہونگے کہ اگر یہ ظالم لوگ اس گھڑی کو جس میں اُن پر عذاب نازل ہوگا دیکھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ سب قوت اللہ ہی کے لئے ہے۔

تفسیر :- قرآن کریم میں مشرکوں کے معبودوں کیلئے چار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں (۱) نِدّ (۲) شریک (۳) اِلٰہ (۴) ربّ۔ اور یہ چاروں نام چار قسم کے شرکوں پر دلالت کرتے ہیں۔ نِدّ شریک فی الجوہر کو کہتے ہیں یعنی

ایسی ہستی کو جس کی محض عبادت ہی مدنظر نہ ہو بلکہ جیسے خدا تعالیٰ کی ذات ہے ویسے ہی اس چیز کو از روئے ذات سمجھا جائے۔ اور شریک وہ ہے جسے کاموں میں شریک باری تعالیٰ قرار دیا جائے خواہ بعض صفات میں یا کل صفات میں۔ خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے۔ اور اِلٰہ یعنی معبود کا لفظ جب خدا تعالیٰ مشرکوں کی نسبت استعمال کرے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ یہ لفظ بھی نِد سے وسیع ہے کیونکہ عام طور پر وہ بھی اِلٰہ قرار دیئے جاتے ہیں جو خدا تعالیٰ کے شریک فی الجوہر تسلیم نہیں کئے جاتے۔ جیسے ہندوؤں وغیرہ کے دیوتا ہیں۔ اور ربّ ان ہستیوں کو کہا جاتا ہے جن کی ہر ایک بات بلا تمیز خیر و شر مان لی جائے۔ بغیر اس کے کہ لوگ ان کی عبادت کریں یا انہیں خدا تعالیٰ کی صفات میں شریک قرار دیں۔ ان چاروں قسم کے شرکوں کی مثالیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ نِد قرار دینے والی وہ مسیحی اقوام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دیتی ہیں۔ وہ انہیں صفاتِ الوہیت کی وجہ سے خدا قرار نہیں دیتیں۔ بلکہ اس وجہ سے خدا قرار دیتی ہیں کہ اُن کے نزدیک وہ ازلی ابدی ہیں۔ یعنی وہ انہیں شریک فی الجوہر ہونے کے لحاظ سے خدا مانتی ہیں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ خدائی کی وہ تمام صفات جو ذات کے لحاظ سے خدا تعالیٰ میں موجود ہونی ضروری ہیں انہیں بھی پائی جاتی ہیں۔ یا جیسے پارسی لوگ دو الگ الگ خداؤں کے قائل ہیں۔ یزدان کو وہ روشنی کا خدا سمجھتے ہیں اور اہرمن کو تاریکی کا خدا قرار دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو بعض ہستیوں کو صرف شریک قرار دیتے ہیں۔ یعنی بعض کاموں پر انہیں متصرف تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اُن کی پرستش نہیں کرتے۔ گویا انہیں صرف شریک فی الصفات مانتے ہیں۔ جیسا کہ عرب کے لوگ تھے۔ وہ جنات وغیرہ کو حکم اور تصرف میں تو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے۔ مگر انہیں معبود یا ربّ یا نِدّ خیال نہیں کرتے تھے صرف اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ فلاں وادی میں جیسے وہ سید الوادی قرار دیتے تھے جن متصرف ہے۔ اور وہ اُس میں آتا جاتا ہے۔ وہ اس کا ادب بھی کرتے تھے اور خدا تعالیٰ کی طرح اس سے ڈرتے بھی تھے لیکن اس کی عبادت نہیں کرتے تھے۔

اِلٰہ یعنی معبود کا لفظ نِدّ سے وسیع ہے۔ چنانچہ کئی لوگ ایسے ہیں جو بعض ہستیوں کو معبود تو سمجھتے ہیں اور اُن کی عبادت بھی کرتے ہیں مگر انہیں خدا تعالیٰ کا شریک فی الجوہر تسلیم نہیں کرتے۔ جیسے ہندو اپنے دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں مگر اُن کو متصرف یا شریک فی الجوہر قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح اُن میں ماں باپ کی عبادت بھی پائی جاتی ہے مگر اُن کو شریک یا ربّ یا نِدّ نہیں سمجھا جاتا۔ چوتھا نام ربّ ہے اور گو اس کے اصل معنے پیدا کر کے کمال تک پہنچانے والے کے ہیں۔ مگر اصطلاح مذاہب میں ہر ایک مربّی اور سردار کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اس سے ایسے لوگ مراد ہوتے ہیں جن کی ہر ایک بات بلا تمیز خیر و شر مان لی جائے۔ جیسے گم گشتہ اقوام میں پیروں فقیروں کے متعلق اعتقاد رکھا جاتا ہے۔ اسلام اجتہادی مسائل میں دوسروں کی اطاعت جائز قرار دیتا ہے لیکن جس شخص کی خدا اور انبیاء کے حکم کے خلاف نصوص صریحہ میں اطاعت کی جائے وہ گویا ربّ سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (توبہ آیت ۳۱) یعنی یہود نے اپنے احبار اور راہبوں کو خدا کے سوا اپنا ربّ بنا لیا ہے۔

ان چاروں الفاظ میں سے اِلٰہ اور ربّ کے الفاظ تو خدا تعالیٰ کے لئے بھی استعمال کرلئے جاتے ہیں لیکن نِد اور شریک کے الفاظ صرف معبودانِ باطلہ کے لئے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ جہاں نِد کا لفظ استعمال ہوگا وہاں شریک فی الجوہر مراد ہوگا۔ (اگر جوہر میں مشابہت نہ ہو تو وہ چیز مثل کہلائیگی نِد نہیں)

اور جس جگہ شریک کا لفظ استعمال ہوگا وہاں شریک فی الصفات
مراد ہوگا خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے۔ اور جہاں
الٰہ یعنی معبود کا لفظ ہوگا وہاں صرف عبادت کو مدنظر رکھا
جائیگا۔ خواہ انہیں خدا کا شریک فی الجوہر تسلیم نہ کیا جائے۔
اور جہاں ربّ کا لفظ استعمال ہوگا۔ وہاں ایسی ہستیاں مراد
ہونگی جن کی ہر ایک بات خیر و شر کی تمیز کے بغیر مان لی جائے
اور خدا اور اس کے رسول کے احکام کی پرواہ نہ کی جائے
قرآن کریم میں ان سب اقسام کے شرک کا ذکر اس آیت میں
کیا گیا ہے کہ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ
سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ
بِهٖ شَيْــًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔
(آل عمران آیت ۶۵) یعنی تو کہہ دے کہ اے اہل کتاب کم سے
کم ایک ایسی بات کی طرف تو آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے
درمیان مشترک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا
اور کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں
اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم آپس میں ایک دوسرے کو ربّ
نہ بنایا کریں۔ لیکن اگر اس دعوتِ اتحاد کے بعد بھی وہ
لوگ پھر جائیں تو تم ان سے کہدو کہ تم گواہ رہو کہ ہم خدا تعالیٰ
کے فرمانبردار ہیں۔ اس آیت میں (۱) لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ
(۲) وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا (۳) وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا
بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فرما کر الٰہ یعنی معبود اور
شریک اور ربّ تینوں اقسامِ شرک کی نفی تو صراحتاً کی گئی
ہے۔ مگر ندّ کی ضمنی طور پر نفی کی گئی ہے۔ کیونکہ ندّ ان تینوں کے
کے اندر شامل ہے۔ یعنی جو ندّ ہوگا۔ وہ بغیر عبادت اور شرک
فی الصفات اور اطاعتِ کاملہ کے نہیں ہوگا۔ اور جب غیر اللہ
کی عبادت اور شرک فی الصفات اور ربّ بنانے کو گناہ قرار
دے دیا گیا تو ندّ کی خود بخود نفی ہوگئی۔ لیکن اسکے علاوہ لَا
نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ سے بھی ندّ کی نفی ہو جاتی ہے۔

غرض اسلام توحید کے جس بلند ترین مقام پر بنی نوع انسان
کو پہنچانا چاہتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان نہ تو کسی کو
خدا تعالیٰ کا شریک فی الجوہر سمجھے۔ نہ کسی کو اس کے کام میں شریک
قرار دے۔ خواہ اس کی عبادت کی جائے یا نہ کی جائے۔ نہ غیر اللہ
میں سے کسی کی پرستش کی جائے۔ اور نہ خدا اور اُس کے انبیاء
کے احکام کے خلاف کسی کی اس طرح اطاعت کی جائے جس
طرح خدا تعالیٰ کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں
توحیدِ حقیقی کے منافی ہیں۔

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ کے دو معنے ہیں۔ ایک تو
یہ کہ وہ ان انداد سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ
سے کرنی چاہیئے۔ دوسرے جتنی محبت انہیں خدا تعالیٰ سے
کرنی چاہیئے اتنی ہی وہ اپنے انداد سے بھی کرتے ہیں۔ اس
میں یہ بتایا گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ خدا تعالیٰ سے بھی
محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں خدا تعالیٰ سے
کوئی حقیقی محبت نہیں پائی جاتی۔ پہلے معنے کے لحاظ سے تو دونوں
سے اُن کی محبت یکساں معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دوسرے معنے کو
مدنظر رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا خدا تعالیٰ سے
محبت کا دعویٰ محض ایک لاف زنی ہے۔ ورنہ ان دونوں
محبتوں میں بڑا بھاری فرق ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کے بھی دو معنے ہیں
ایک تو یہ کہ مومن مشرکوں کی نسبت خدا تعالیٰ سے زیادہ
محبت کرتے ہیں۔ یعنی جو محبت مشرکوں کو خدا تعالیٰ سے ہے
اُس سے بہت زیادہ محبت مومن اپنے خدا سے کرتے ہیں۔
یا مشرک اپنے بتوں سے جو محبت کرتے ہیں اُس سے بہت
زیادہ محبت مومن خدا تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ اور دوسرے
معنے یہ ہیں کہ مومن خدا تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں سے
جو محبت کرتے ہیں اُن تمام چیزوں کی محبت کی نسبت وہ
خدا تعالیٰ سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اور اگر دونوں
محبتوں کا مقابلہ ہو جائے تو خدا تعالیٰ کی محبت کا پہلو ہمیشہ

بھاری ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر اس محبت کی ان الفاظ میں تشریح فرمائی ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (توبہ آیت ۲۴) یعنی کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں یا تمہارے خاوند اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے بگڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ خدا اور اس کے رسول سے اور خدا کے راستہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ پیارے ہیں تو تم کو خدا سے کوئی محبت نہیں۔ تب تم اللہ تعالیٰ کے عذاب کا انتظار کرو۔ اور خدا تعالیٰ ایسے نافرمانوں کو کبھی اپنا راستہ نہیں دکھاتا۔ یعنی کامل محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان اس کی خاطر ہر ایک چیز کو قربان کر دے۔ اگر اس بات کے لئے وہ تیار نہیں تو منہ کی باتیں اس کیلئے کچھ بھی مفید نہیں۔ یوں تو ہر شخص کہہ دیتا ہے کہ مجھے خدا سے محبت ہے اور اُس کے رسول سے محبت ہے بلکہ مسلمان کہلانے والا کوئی بھی شخص نہیں ہوگا جو یہ کہتا ہو کہ مجھے خدا اور اس کے رسول سے محبت نہیں ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس قول کا اثر اس کے اعمال پر ایک جو روح پیدا ہو اُسکے اقوال پر کیا پڑتا ہے۔ وہ لوگ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنے آپ کو سرشار بتاتے ہیں اور آپ کی تعریف میں نعتیں پڑھتے اور سُنتے رہتے ہیں بلکہ بعض تو خود بھی نعتیں کہتے ہیں۔ آپ کے احکام کی فرمانبرداری کی طرف اُن کو کچھ بھی توجہ نہیں ہوتی وہ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اس سے ملنے کیلئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کا کوئی عزیز آ جائے تو وہ سو کام چھوڑ کر اس سے ملنے کے لئے جاتا ہے۔ اپنے دوستوں اور پیاروں کی ملاقات کا موقعہ ملے تو پھولا نہیں سماتا۔ حکام کے حضور شرف باریابی حاصل ہو تو اس کی گردن فخر سے اونچی ہو جاتی ہے لیکن لوگ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور نماز کے قریب بھی نہیں جاتے۔ یا نماز پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ کبھی پڑھی کبھی نہ پڑھی۔ یا اگر باقاعدہ بھی پڑھی تو ایسی جلدی جلدی پڑھتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ سجدہ سے انہوں نے کب سر اٹھایا اور کب دوبارہ سجدہ کیا۔ جس طرح مرغا چونچیں مار کر دانہ اٹھاتا ہے اسی طرح وہ بھی سجدہ کر لیتے ہیں نہ خشوع ہوتا ہے نہ خضوع۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے روزہ کا بدلہ اپنے آپ کو قرار دیا ہے۔ مگر لوگ خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہوئے اس کا دامن پکڑنے کے لئے نہیں جاتے۔ اور اُس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ کی محبت ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن لوگوں کے حقوق دباتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ بہتان باندھتے ہیں غیبتیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے عشق کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا مطالعہ اور اُس پر غور کرنے کی توفیق انکو نہیں ملتی۔ غرض محبت کا دعویٰ اور شے ہے۔ اور حقیقی محبت اور شے ہے۔ قرآن کریم بتاتا ہے کہ انسان اُس وقت تک کبھی سچا مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ عملاً خدا تعالیٰ سے ایسی محبت نہ کرے کہ اس کے مقابلہ میں نہ ماں باپ کی محبت ٹھہر سکے۔ نہ بیٹوں کی محبت ٹھہر سکے۔ نہ بھائیوں کی محبت ٹھہر سکے۔ نہ بیویوں کی محبت ٹھہر سکے نہ قبیلہ اور قوم کی محبت ٹھہر سکے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ (بخاری جلد اوّل کتاب الایمان) یعنی جس شخص میں یہ تین باتیں پائی جائیں اس کے متعلق سمجھ لو کہ اُسے حلاوتِ ایمان حاصل ہو گئی ہے۔ اوّل یہ کہ خدا اور اُس کا رسول اس کی نگاہ میں تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہو۔ دوم انسان دوسرے سے محض اللہ کیلئے محبت کرے سوم۔ ایمان لانے کے بعد وہ کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہی

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا

(اور کاش کہ وہ لوگ اسوقت کو دیکھ لیتے) جب وہ لوگ جن کی فرمانبرداری کی جاتی تھی اُن لوگوں سے جو فرمانبردار تھے الگ ہو جائینگے اور

الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۷﴾

عذاب کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے۔ اور اُن کے (شرک کی وجہ سے نجات کے) سب ذریعے منقطع ہو جائینگے۔ ۱۸۰

ناپسند کرے جیسے آگ میں ڈالاجانا۔

وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آج تو یہ لوگ اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں اور بتوں کو خدا تعالیٰ کا شریک قرار دے رہے ہیں لیکن اگر یہی لوگ اُسوقت کا نظارہ اپنے ذہنوں میں لا سکیں جب وہ عذاب کو دیکھینگے تو انہیں سب کچھ بھول جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا کوئی معمولی گناہ نہیں۔ اس وقت تو یہ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں لیکن اگر یہ اُسوقت کا تصوّر کر سکیں جب ان پر اپنے معبودوں کی بے بضاعتی روشن ہو جائیگی تو وہ ایسا کبھی نہ کریں۔ جیسا کہ فتح مکّہ کے موقعہ پر تمام کفار نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ بُت کے معبود اُن کے کسی کام نہ آئے۔ بلکہ وہ توڑ پھوڑ کر پھینک دیئے گئے اور بیت اللہ کو خدائے واحد کی عبادت کے لئے پاک کر دیا گیا۔

تَبَرَّأَ

إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اخروی عذاب کی بھی تفصیل بیان فرمائی ہے جو کفار کو ملیگا اور بتایا ہے کہ انہیں تمثیلی طور پر سانپ اور بچھو اور اسی قسم کی اور خوفناک چیزیں نظر آئیں گی جو درحقیقت انہی کے اعمال کی ایک شکل ہونگی۔ کیونکہ دنیا میں انہوں نے سانپوں کی طرح لوگوں کو ڈسا اور بچھوؤں کی طرح نیش زنی سے کام لیا اور درندوں کی طرح لوگوں کو چیر پھاڑا۔ اس لئے خدا تعالیٰ ان کی سزا کیلئے سانپوں اور بچھوؤں کو ہی اُن پر مسلّط کر دیگا اور انہیں اپنے اعمال کی سزا دیگا۔

اَلْاَسْبَابُ

یہ آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے پہلی آیت سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ دونوں آیات ایک ہی مضمون کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ باوجود ان دلائل کے جو حق و باطل میں فرق کرنیوالے ہیں اور باوجود اس کے کہ دنیا کا ذرّہ ذرّہ خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت دے رہا ہے اور باوجود اس کے کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ کی تقدیر خاص کو بھی دیکھ رہے ہیں جو مومنوں کے حق میں جاری ہے پھر بھی یہ لوگ خدا تعالیٰ کے ند قرار دے رہے ہیں۔ اور اُن سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ سے کرنی چاہیئے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ تباہ ہونے والے ہیں۔

۱۸۰ حل لغات:۔ تَبَرَّأَ باب تفعّل سے ماضی کا صیغہ ہے اور اس کے معنے ہیں تَخَلَّصَ یعنی اُس نے چھٹکارا حاصل کر لیا (اقرب) اور اَلتَّبَرِّي مصدر کے معنے ہیں اَلتَّفَصِّي مِمَّا يُكْرَهُ مُجَاوَرَتُهُ یعنی ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا حاصل کرنا (مفردات) پس آیت کے معنے یہ ہیں کہ معبودانِ باطلہ یا وہ ہستیاں جنہیں خدا تعالیٰ کا شریک قرار دیا جاتا ہے عبادت کرنے والوں کو ناپسندیدہ قرار دینگے۔ اور اپنے آپ کو پاک ٹھہرائیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو ایسے اعمال کرنے والوں کے ساتھ نہ تھے۔

اَلْاَسْبَابُ: سَبَبٌ کی جمع ہے اور اَلسَّبَبُ کے معنے ہیں مَا يُتَوَصَّلُ بِهٖ اِلٰى غَيْرِهٖ۔ وہ چیز جس کے ذریعہ سے غیر تک پہنچا جائے۔ اسی طرح اس کے معنے رستہ۔ محبت اور قرابت کے بھی ہیں۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ جن کو یہ لوگ ند قرار دیتے ہیں وہ بھی اس وقت کہہ اُٹھیں گے

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا

اور جو لوگ (ائمۂ کفر کے) فرمانبردار تھے کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک دفعہ (پھر دنیا میں) واپس جانا (نصیب) ہوتا تو ہم بھی ان (ائمۂ کفر) سے

تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۗ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ

الگ ہو جاتے جس طرح (آج) یہ ہم سے الگ ہو گئے۔ اس طرح اللہ انہیں بتائے گا کہ انکے اعمال (کا نتیجہ صرف) حسرتیں ہیں (جو) اُن (کے دلوں)

عَلَيْهِمْ ۗ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۸﴾

پر (وبال ہو کر پڑیں گی) اور وہ (دوزخ کی) آگ سے ہرگز نہیں نکل سکیں گے ؁۸۱

کہ خدایا! ہمارا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس طرح ان سے اپنی برأت اور نفرت کا اظہار کرینگے اور خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۔ اور ان کی نجات کے تمام ذرائع منقطع ہو جائیں گے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ باء بمعنے عَنْ بھی آتی ہے۔ اور باء بمعنے سبب بھی آتی ہے۔ اور باء تعدیہ کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے یعنی فعل لازم کو متعدی بنانے کیلئے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ پہلی صورت میں عَنْ کے مفہوم کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اُن کے اسباب اُن سے کٹ جائیں گے یعنی وہ چیزیں جو اُن کے پاس تھیں اور جن کی نسبت وہ خیال کیا کرتے تھے کہ ہم ان کی وجہ سے خدا تعالیٰ تک پہنچ جائینگے یا وہ قرابتیں اور محبتیں جو رشتہ داری کی وجہ سے انہیں حاصل تھیں وہ سب کی سب کٹ جائینگی اور اُن کے تمام سہارے جاتے رہیں گے۔

دوسرے معنوں کے معنے سبب لینے کی صورت میں یہاں ایک محذوف ماننا پڑے گا اور عبارت یوں ہوگی کہ وَتَقَطَّعَتْ بِسَبَبِ كُفْرِهِمُ الْاَسْبَابُ کہ ان کے کفر کی وجہ سے اُن کے تمام ذرائع کامیابی جاتے رہیں گے۔ اور وہ تباہ ہو جائیں گے۔

تیسری صورت میں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ جن چیزوں کو وہ خدا تعالیٰ کے وصال کا ذریعہ قرار دیتے ہیں یا وہ ضائع جن کو وہ خدا تعالیٰ تک پہنچانیوالا سمجھتے ہیں وہ ان کو کاٹ دیں گے اور اُن کی تباہی کا موجب بن جائیں گے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (انعام آیت ۱۵۴) کہ تم مختلف راستوں کے پیچھے نہ پڑو۔ ورنہ وہ تمہیں صحیح راستہ سے منحرف کر دینگے اور تمہیں اِدھر اُدھر لے جاکر تباہ کر دینگے۔

؁۸۱ حل لغات: كَرَّةً: اَلْكَرَّةُ بِالْفَتْحِ

اَلْمَرَّةُ یعنی کرّۃ کے معنے ایک دفعہ کے ہیں (اقرب)

اَلْكَرُّ (مصدر) اَلْعَطْفُ عَلَى الشَّيْءِ کسی چیز کی طرف لوٹنا (مفردات) پس آیت کے معنے یہ ہونگے کہ وہ کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک دفعہ اور لوٹنے کا موقعہ مل جائے۔

تفسیر:۔ فرمایا۔ اس دنیا میں تو تم خدا تعالیٰ کے شریک بناتے اور اس کے ند قرار دیتے ہو مگر وہاں جاکر تمہارا یہ حال ہوگا کہ تم واپس اس دنیا میں آنے کی خواہش کروگے اور کہو گے کہ ہم تو خیال کرتے تھے کہ یہ معبود ہمارے کام آئینگے مگر انہوں نے تو موقعہ پر آکر دھوکا دے دیا۔ اس لئے ہمیں ایک بار پھر دنیا میں لوٹایا جائے تاکہ ہم بھی اُن سے ایسا ہی

كَرَّةً

بے وفائی کا سلوک کر سکیں۔

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ فرماتا ہے۔ ہم اُن کے اعمال انہیں اس حال میں دکھائیں گے کہ وہ حَسَرَات ہونگے۔ یعنی اعمال انہیں حسرتیں ہی حسرتیں نظر آئیں گے۔ اور وہ حسرتیں ایسی ہونگی کہ جن کا وبال انہیں پر پڑیگا بعض حسرتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا غیروں پر اثر پڑتا ہے۔ مگر فرماتا ہے ایسی حسرتیں ہونگی جن کا اثر خود انہیں پر پڑے گا دوسروں پر نہیں۔ اسجگہ اگر حَسَرَاتٍ کو حال قرار دیا جائے تو رَاٰی سے مراد رؤیت عینی ہوگی۔ اور اگر حَسَرَاتٍ کو مفعول قرار دیا جائے تو رؤیت علمی مراد ہوگی اور معنے یہ ہونگے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کہیں گے کہ اگر ہمیں مبلّغ بنا کر دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم وہاں جاکر شور برپا کر دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔

وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ دوزخی آگ سے نکالے نہیں جائیں گے۔ کیونکہ اسجگہ خدا تعالیٰ کے سلوک کا ذکر نہیں بلکہ ان کی اپنی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ خود اپنی ذاتی جدوجہد اور کوشش سے اس میں سے نکل نہیں سکیں گے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے اگر ہم کہیں کہ بیمار ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اور پھر اسے دوسرے دن ہسپتال لے جایا جائے۔ تو کوئی شخص یہ نہیں کہیگا کہ کل تو تم نے یہ کہا تھا کہ بیمار ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اور آج تم اُسے ہسپتال داخل کرا آئے ہو کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں تھا کہ غیر بھی اُسے وہاں نہیں لیجا سکتے اسی طرح اس آیت میں جس چیز کی نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود دوزخ سے نہیں نکل سکیں گے۔ یعنی اگر وہ اپنے زور کے ساتھ نکلنا چاہیں گے تو نہیں نکل سکیں گے۔ چنانچہ اس کی وضاحت قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہو جاتی ہے کہ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (سجدہ آیت ۲۱) یعنی جب کبھی وہ دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کرینگے تو پھر اُسی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے اور انہیں کہا جائیگا کہ اب دوزخ کا عذاب چکھو جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ پس اسجگہ جس چیز کی نفی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود اس عذاب سے نکل نہیں سکیں گے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ خدا تعالیٰ بھی انہیں دوزخ سے نہیں نکالے گا۔ اور انہیں دائمی عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

دراصل اس بارہ میں بھی مومنوں اور کافروں میں بہت بڑا فرق رکھا گیا ہے۔ مومنوں کے لئے تو جنّت حق قرار دیا گیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ آیت ۱۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور ان کے اموال اس وعدہ کے ساتھ خرید لئے ہیں کہ اُن کو جنّت ملے گی۔ گویا یہ ایک سودا ہے جو اُن کا خدا تعالیٰ سے ہو چکا۔ یوں تو کسی کا بھی خدا تعالیٰ پر کوئی ذاتی حق نہیں۔ مگر جس حق کو خدا تعالیٰ خود تسلیم کرے وہ تو حق ہی سمجھا جائیگا۔ مگر کافروں کے لئے فرمایا کہ اگر وہ دوزخ کی تکالیف کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس میں سے نکلنا چاہیں گے تو نہیں نکل سکیں گے۔ عربی زبان میں جو باء تاکید کے لئے آتی ہے اس کے معنے ہرگز کے ہوتے ہیں۔ پس اسجگہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ میں تاکید کے معنے پائے جاتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی ذاتی جدوجہد کے ساتھ جہنم میں سے ہرگز نکل نہیں سکیں گے۔ ہاں جب خدا تعالیٰ چاہے گا تو انہیں دوزخ سے نکال لے گا۔ جیسا کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ جہنم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب کہ اُس میں کوئی بھی نہیں رہے گا۔ اور ہوا اُس کے دروازوں کو کھٹکھٹائے گی۔ (کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۲۴۵)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (۱۶۹)

اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اُس میں سے جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے (اُسے) کھاؤ۔ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو یقیناً وہ تمہارا کھلا (کھلا) دشمن ہے۔ ۵۸۲

۵۸۲ حل لغات:- طَيِّبًا۔ طَابَ سے صفت مشبہ ہے۔ اور طَيِّبٌ کے معنے ہیں اَلْحَلَالُ۔ حلال۔ اور جب مَالٌ طَيِّبٌ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں ایسا مال جو شرعی لحاظ سے حلال ہو (اقرب)

پھر لکھا ہے وَاَصْلُ الطَّيِّبِ مَا تَسْتَلِذُّهُ الْحَوَاسُّ وَمَا تَسْتَلِذُّهُ النَّفْسُ۔ اور درحقیقت طیّب اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسانی حواس لذیذ قرار دیں اور جس سے انسان کا دل لطف اندوز ہو۔ پس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ ایسی چیزیں کھاؤ جو شرعی لحاظ سے حلال ہوں اور ظاہری لحاظ سے بھی تم انہیں لذیذ اور پسندیدہ سمجھو۔

خُطُوَاتٌ کے معنے ہیں طُرُقٌ وَسُبُلٌ رستے اور طریق۔ اس کا مفرد خُطْوَةٌ ہے جس کے معنے مَا بَيْنَ الْقَدَمَيْنِ کے ہیں یعنی دو قدموں کے درمیان کی جگہ اور فاصلہ (اقرب)

تفسیر:- اس رکوع سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیمی پیشگوئی کے اس دوسرے پہلو کو بیان کرنا شروع کیا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ یعنی وہ نبی انہیں شریعت اور اُس کے اسرار سے آگاہ کرے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن مجید نے سب سے پہلے حلال اور طیّب کھانے کی تعلیم کو لیا ہے۔ کیونکہ انسانی اعمال اُس کی ذہنی حالت کے تابع ہوتے ہیں اور ذہنی حالت غذا سے متاثر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اُس میں سے حلال اور طیّب اشیاء کا استعمال کرو۔ یعنی تم صرف یہی نہ دیکھا کرو کہ جو کچھ تم کھا رہے ہو وہ حلال ہے یا نہیں بلکہ یہ بھی دیکھ لیا کرو کہ وہ طیّب بھی ہے یا نہیں۔ اگر کسی چیز کا کھانا تمہارے مناسب حال نہ ہو خواہ اس لحاظ سے کہ وہ تمہاری صحت کے لئے مُضر ہو یا اس لحاظ سے کہ ملکی اور قومی حالات کی وجہ سے تمہیں اُس کے کھانے کی عادت نہ ہو یا اس وجہ سے کہ تمہاری طبیعت اُس سے انقباض محسوس کرتی ہو۔ تو تم محض یہ دیکھ کر کہ شریعت نے اسے حلال قرار دیا ہے اُسے مت کھاؤ۔ کیونکہ تمہارے لئے کھانے میں صرف حرام و حلال کا امتیاز مدّنظر رکھنا ہی ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تم ایسی چیزوں کا انتخاب کیا کرو جو تمہاری طبیعت اور تمہارے ماحول اور تمہارے معمول کے مطابق ہوں اور جن کا کوئی مضر اثر تم پر پڑنے کا امکان نہ ہو۔ مثلاً نزلہ اور زکام اور کھانسی میں ترش اشیاء کا استعمال کھانسی کو اور بھی بڑھا دیتا ہے اب اگر کوئی شخص کھانسی میں ترش میوے استعمال کرتا ہے یا اسہال میں گوشت روٹی استعمال کرتا ہے یا جگر کی خرابی میں قابض اور نفاخ غذاؤں کا استعمال کرتا ہے تو خواہ یہ چیزیں حلال ہی کیوں نہ ہوں اس وجہ سے کہ وہ اس کے لئے طیّب نہیں ہیں ان کا استعمال اسے نقصان پہنچائیگا۔ پس اسجگہ طیّب کو حلال کے ساتھ لگا کر بتایا ہے کہ صرف حلال کھانا ہی مومن کا کام نہیں بلکہ

طَيِّبًا

خُطُوَاتٌ

إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى

وہ تمہیں صرف بدی اور بے حیائی اور اس (بات) کی کہ تم اللہ (تعالیٰ) کے متعلق جھوٹ باندھ کر وہ

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۷۰﴾

بات کہو جو تم نہیں جانتے تلقین کرتا ہے۔ ۸۳

یہ دیکھنا بھی اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ چیز طیب ہو یعنی گندی اور سڑی ہوئی نہ ہو۔ مضرِ صحت نہ ہو۔ جو ساتھ کھانا کھانے والے لوگ ہوں اُن کی طبائع کے خلاف نہ ہو۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ۔ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ یعنی ایسا نہ کرو کہ جس طرف شیطان جا رہا ہے اُسی طرف تم بھی چلنا شروع کر دو۔ وہ تمہارا دشمن ہے اور دشمن سے ہمیشہ دُور رہنا چاہیئے نہ کہ اُس کی پیروی کرنی چاہیئے۔

کھانے پینے کے ذکر کے بعد شیطان کا ذکر کر کے اِس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اگر تم حلال اور پھر حلال میں سے بھی طیب رزق چھوڑ دو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم شیطان کے پیچھے چل پڑو گے۔ کیونکہ انسان جو کچھ کھاتا ہے اس سے جسم تیار ہوتا ہے اور ناجائز یا مضر اشیاء کے استعمال سے تیار شدہ جسم یقیناً انسان کو بدی کی طرف لے جائیگا نیکی کی طرف نہیں لے جا سکتا۔

۸۳ حل لغات :۔ إِنَّمَا : اِنَّ کے ساتھ مَا زائدہ ہے لغت میں لکھا ہے إِذَا أُدْخِلَ عَلَيْهِ مَا يَبْطُلُ عَمَلُهٗ وَيَقْتَضِيْ اِثْبَاتَ الْحُكْمِ وَنَفْيَهٗ عَمَّا عَدَاهُ۔ جب اِنَّ پر مَا داخل ہو جائے تو اس کا عمل باطل ہو جاتا ہے اور بعد میں مذکور چیز کے لئے کسی بات کو ثابت کرنے اور باقی (غیر مذکور) چیزوں سے اس بات کی نفی کرنے کا مقتضی ہوتا ہے۔ (مفردات)

اَلسُّوْٓءُ : كُلُّ مَا يَغُمُّ الْاِنْسَانَ مِنَ الْاُمُوْرِ الدُّنْيَوِيَّةِ وَالْاُخْرَوِيَّةِ وَمِنَ الْاَحْوَالِ النَّفْسِيَّةِ وَالْبَدَنِيَّةِ وَالْخَارِجِيَّةِ۔ یعنی اَلسُّوْٓءُ سے مراد وہ تمام غمزدہ کر دینے والی تکالیف ہیں جو انسان کو دنیوی اور اُخروی امور نیز رُوحانی اور جسمانی اور دوسرے حالات کی وجہ سے زندگی میں پیش آتی ہیں۔ (مفردات)

اَلْفَحْشَآءُ :۔ اَلْفَحْشَآءُ وَالْفَاحِشَةُ مَا يَشْتَدُّ قُبْحُهٗ مِنَ الذُّنُوْبِ وَالْبُخْلُ فِيْ اَدَاءِ الزَّكٰوةِ وَقِيْلَ كُلُّ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔ یعنی فحشاء اور فاحشہ سے مراد سخت بُرائی والا گناہ۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنا۔ اور بعض کے نزدیک ہر وہ کام ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہو۔ (اقرب)

اَلْفُحْشُ وَالْفَحْشَآءُ وَالْفَاحِشَةُ مَا عَظُمَ قُبْحُهٗ مِنَ الْاَفْعَالِ وَالْاَقْوَالِ۔ فحش۔ فحشاء اور فاحشہ سے ہر ایسا قول یا فعل مراد ہے جو بہت ہی بُرا ہو (مفردات)

تفسیر :۔ شیطان کے پیچھے چلنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ ذاتی طور پر انسان کو مختلف قسم کی بُرائیوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جیسے بدظنی ہے یا جھوٹ ہے یا کینہ ہے یا جہالت ہے یا سُستی اور غفلت ہے یا بُزدلی ہے یا تکبّر ہے یا بے غیرتی ہے یا ناشکری ہے یہ وہ بُرائیاں ہیں جن سے صرف نفس کی اپنی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور جن کی طرف سوء کے لفظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن جب انسان اپنی اصلاح نہیں کرتا۔ تو دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فحشاء یعنی ایسی بدیاں کرواتا ہے،

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ

اور جب اُن سے کہا جائے کہ اس (کلام) کی جو اللہ نے اتارا ہے پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ (نہیں) ہم تو اسی (طریق)

مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا

کی پیروی کرینگے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا۔ بھلا اگر اُن کے باپ دادے کچھ بھی عقل نہ رکھتے اور نہ

يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧١﴾

راہ راست پر چلتے ہوں (تو پھر بھی وہ ایسا ہی کرینگے)۔ ۸۴ء

جن کا دوسرے لوگوں پر بھی اثر پڑتا ہے جیسے خیانت اور تہمت اور ظلم اور دھوکا اور قتل اور چوری اور مارپیٹ اور گالی اور ناواجب طرفداری اور رشوت وغیرہ ایسے جرائم ہیں جو دوسروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر وہ بدیوں میں اور زیادہ بڑھاتا ہے اور آخر انسان کو خدا کے مقابلہ میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یا انسان کے اندر ایسی بے حیائی پیدا کر دیتا ہے کہ اُسے دوسروں کے سامنے بھی برائیوں کے ارتکاب میں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا۔ اور وہ برملا خدائی احکام کے خلاف لب کشائی شروع کر دیتا ہے یا پھر افتراء پردازی شروع کر دیتا ہے۔ گویا پہلے تو وہ ایسی بدیاں کرواتا ہے جن کا ضرر صرف اس کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ پھر غیرت انسانی مٹتی ہے تو ایسی بدیاں کرواتا ہے جن سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوں۔ پھر اور ترقی کرکے اُس کی زبان سے ایسی باتیں نکلواتا ہے جو خدا تعالیٰ کی ہتک کرنے والی اور اُسکا مضحکہ اڑانے والی ہوتی ہیں۔ اور اس طرح وہ درجہ بدرجہ انسان کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ غرض شیطان کبھی یک دم بڑے گناہ پر انسان کو آمادہ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے وساوس کی یہ ترتیب ہوتی ہے کہ وہ پہلے چھوٹی بدی کا حکم دیتا ہے۔ پھر بے حیائی پر آمادہ کرتا ہے۔ اور پھر خدا پر جھوٹ باندھنے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ گویا چھوٹی نافرمانی سے شروع کرکے اُسے انتہا تک لے جاتا ہے۔

۸۴ء **تفسیر:**۔ اس آیت میں بتایا کہ شیطان کی پیروی کرنے کا ایک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ اگر لوگوں کو خدا تعالیٰ کی بات ماننے کے لئے کہا جائے تو ان کی عقل ایسی ماری جاتی ہے کہ وہ کہدیتے ہیں ہم تو اپنے باپ دادا کی بات مانیں گے اور اُنہی کے پیچھے چلیں گے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت فرمایا تو مکہ والوں نے آپ کا شدید مقابلہ کیا۔ وہ لوگ آخر کیوں مقابلہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ کیا ہم اس مذہب کو چھوڑ دیں جس پر ہمارے آباؤ اجداد قائم تھے۔ گویا وہ کسی چیز کے ذاتی حسن کو نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ صرف حسنِ اضافی اُن کے پیش نظر تھا اور باوجود اس کے کہ وہ جاہلانہ باتیں تھیں اُن لوگوں نے ان کیلئے اپنا مال اور اپنے عزیزوں اور اقرباء تک قربان کر دیئے تاکہ وہ چیزیں جو ان کی ہیں بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ اگر تمہارے باپ دادا بیوقوف ہوں تو کیا پھر بھی تم وہی کچھ کرو گے جو وہ کرتے چلے آئے ہیں یعنی تمہارے باپ دادا تو اپنی بیوقوفی کی وجہ سے تباہ ہوئے تھے کیا تم بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل کر تباہ ہونا چاہتے ہو۔

ہمارے سلسلہ میں بھی لوگوں کے داخل ہونے میں سب سے بڑی روک یہی ہے کہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ کیا وہ باتیں جنہیں پہلے لوگ سالہا سال سے مانتے چلے آئے ہیں ہم انہیں چھوڑ دیں

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ

اور اُن لوگوں کا حال جنہوں نے کفر کیا ہے اس شخص کے حال کے مشابہ ہے جو اُس چیز کو پکارتا ہے جو سوائے پکار اور آواز کے کچھ نہیں

نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

سُنتی۔ (یہ لوگ) بہرے گونگے اور اندھے ہیں اس لئے سمجھتے نہیں۔ ۸۵

یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔ غرض اس آیت میں مخالفین اسلام کا سب سے بڑا اعتراض یہ بیان فرمایا ہے کہ ہم تو اسی طریق کی پیروی کرینگے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا تھا۔ اِس جگہ قَالُوْا سے یہ مراد نہیں کہ وہ مُنہ سے بھی ایسا کہتے ہیں۔ بہت لوگ مُنہ سے بھی کہتے ہیں لیکن بہت ہیں جو مُنہ سے نہیں کہتے مگر پھر بھی ان کے انکار کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ اور قول کا لفظ ان معنوں میں عربی زبان میں استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں اِمْتَلَأَ الْحَوْضُ وَ قَالَ قَطْنِیْ یعنی حوض بھر گیا اور اُس نے زبانِ حال سے یہ کہا کہ بس بس۔ اِس آیت میں بھی اِسی محاورہ کے مطابق قول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مخالفین اسلام کے اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ اتنا تو سوچیں کہ اگر اُن کے باپ دادے ایسے ہوں کہ وہ کچھ بھی عقل نہ رکھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں تو کیا پھر بھی یہ اُن کے پیچھے چلتے چلے جائیں گے یعنی کسی کی اتباع دو ہی طرح ہوتی ہے یا تو وہ بڑا عقلمند ہو اور یا پھر خدا تعالیٰ سے اُس نے ہدایت پائی ہوئی ہو۔ لیکن اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو تو کیا پھر بھی اُس کی اتباع کی جاتی ہے؟ اور تمہارے باپ دادوں کی تعلیم ان دونو امور سے خالی ہے نہ عقل کے مقابلہ میں ٹھہرتی ہے اور نہ آسمانی شہادت اُس کی تائید میں ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ لوگ اپنے باپ دادا سے دین کے بارے میں تو اختلاف نہیں کرنا چاہتے لیکن دنیوی امور کے بارہ میں وہ روزانہ اُن سے اختلاف کرتے ہیں۔ ہزارہا مثالیں اس امر کی پائی جاتی ہیں کہ دنیوی امور میں لوگوں نے اپنے باپ دادا کی اقتدا نہیں کی بلکہ انہوں نے صرف یہ دیکھا کہ اُن کا فائدہ کس امر میں ہے۔ وہ روزانہ ریلوں میں چڑھتے ہیں اور کبھی یہ نہیں کہتے کہ ہمارے باپ دادا تو گدھوں پر سوار ہوتے تھے ہم ریل گاڑیوں پر کیوں سوار ہوں اسی طرح عقلی اور علمی باتوں میں اُن کی پیروی نہیں کرتے بلکہ نئی روشنی کے علوم سے فائدہ اُٹھاتے اور اُن کے پیچھے چلتے ہیں۔ مگر دین کا معاملہ ہو تو اُن کے باپ دادے بڑے عقلمند بن جاتے ہیں۔ حالانکہ خود اُن کا عمل اس طریق کے خلاف گواہی دے رہا ہوتا ہے مگر ایسی صاف اور موٹی بات بھی جب اُنکے سامنے رکھی جاتی ہے تو وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے اور صداقت سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔

۸۵ حل لغات :۔ يَنْعِقُ : نَعَقَ سے مضارع کا صیغہ ہے۔ اور نَعَقَ الرَّاعِیْ بِغَنَمِهٖ کے معنے ہیں صَاحَ بِهَا وَ زَجَرَهَا۔ چرواہے نے اپنی بکریوں کو آواز دی اور اُن کو ڈانٹا۔ اور جب نَعَقَ الْغُرَابُ کہیں تو معنے ہونگے صَاحَ کوّے نے کائیں کائیں کی۔ اور نَعَقَ الْمُؤَذِّنُ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَهٗ بِالْاَذَانِ۔ مؤذن نے اذان کے لئے اپنی آواز بلند کی۔ (اقرب)

نِدَآءً : اَلنِّدَآءُ کے معنے ہیں رَفْعُ الصَّوْتِ وَ ظُهُوْرُهٗ۔ آواز کا بلند اور واضح ہونا۔ (اقرب)

تفسیر :۔ زیر تفسیر آیت ایک تمثیلِ مرکب ہے جس میں حذفِ مضاف سے کام لیا گیا ہے اور دَاعِیْ کا لفظ اِس میں محذوف ہے۔ یعنی اصل عبارت یوں ہے کہ

يَنْعِقُ

نِدَآءً

مَثَلُ دَاعِي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ یعنی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جو کفار کے داعی ہیں۔ آپ کی مثال اُس شخص کی طرح ہے جو جانوروں کو اپنی طرف بلانے کے لئے آواز دیتا ہے۔ مگر وہ جانور اُس کی آواز کے سوا اور کچھ نہیں سُنتے۔ گویا یہ کفار بھی رات اور دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام سُنتے ہیں اور صبح و شام انہیں وحی الٰہی سُنائی جاتی ہے۔ ہر وقت اُن کے کانوں میں نیکی اور تقویٰ اور خدا ترسی کی باتیں ڈالی جاتی ہیں مگر یہ لوگ جانوروں کی طرح الفاظ تو سُنتے ہیں اور آواز تو اُن کے کانوں میں پڑتی ہے لیکن اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اپنی پُرانی ڈگر پر چلتے چلے جاتے ہیں۔

اِس تمثیل میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کفار کے لئے ایک داعی کے طور پر ہیں۔ اور کفار آپ کے لئے ریوڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپؐ ان کو اپنی طرف بلاتے ہیں اور آپؐ کی دُعا اور ندا بھی وہ سنتے ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ گویا جانوروں کو بُلانے والے کا سا حال ہمارے نبی کا ہوتا ہے کہ اس کی بات کو یہ لوگ سمجھتے نہیں۔ اس تشریح پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مشبّہ اور مشبّہ بہ کے کل اجزاء میں مطابقت ہونی ضروری ہوتی ہے مگر وہ یہاں موجود نہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ تمثیلِ مرکب میں مشبہ اور مشبہ بہ کے تمام افراد میں مطابقت نہیں دیکھی جاتی بلکہ صرف اتنی بات دیکھی جاتی ہے کہ آیا اُن میں کسی خاص بات میں مشابہت پائی جاتی ہے یا نہیں اور اگر ہو تو تشبیہ درست سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ سیبویہ کا یہی قول ہے کہ مرکب تمثیل میں تمام اجزاء مشبّہ کا مشبّہ بہ کے اجزاء کے مطابق ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کے صرف بعض اجزاء کی مطابقت ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔

اِن معنوں پر ایک اَور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کفار کی مثال بھیڑ بکریوں کی سی ہے تو بھیڑ بکریاں تو داعی کی آواز سُنتی ہیں۔ اور کفار بھی سُنتے ہیں۔ پھر اُن کو صُمٌّ کیوں کہا گیا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ صُمٌّ سے یہاں یہ مراد نہیں کہ وہ جسمانی طور پر بہرے ہیں۔ بلکہ یہ مُراد ہے کہ اُن کے کان حق بات سُننے سے قاصر ہیں اور صُمٌّ کے بعد بُكْمٌ اور عُمْيٌ کا لفظ اس مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح بُكْمٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ حق بات کہہ نہیں سکتے اور عُمْيٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ حق بات کو دیکھ نہیں سکتے اِسی طرح صُمٌّ سے مراد یہ ہے کہ وہ حق بات کو سُن نہیں سکتے گویا وہ آواز تو سُنتے ہیں لیکن اُس کی حقیقت نہیں سمجھتے اور نہ اس کے مطابق اپنے اندر تغیّر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس جہاں سُننے کا ذکر ہے وہاں یہ مراد ہے کہ وہ صرف الفاظ سُنتے ہیں اور جہاں نہ سُننے کا ذکر ہے وہاں حقیقت کا سُننا مراد ہے اور حقیقت کے سمجھنے کی نفی سے دُعا اور نداء کے سُننے کی نفی نہیں ہو سکتی اور یا پھر صُمٌّ سے ایسے لوگ مراد ہیں جن سے کسی فائدہ کی اُمید نہ کی جاتی ہو کہ یہ معنے بھی لُغتًا ثابت ہیں۔ چنانچہ اقرب الموارد جو لُغت کی مشہور کتاب ہے اُس میں لکھا ہے اَلْاَصَمُّ اَيْضًا الرَّجُلُ لَا يُطْمَعُ فِيْهِ یعنی ایسے شخص کو بھی اصمّ کہتے ہیں جس سے کسی بھلائی کی اُمید نہ کی جا سکے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اِن کفار کی مثال جانوروں کی طرح ہے جن کو بُلانے والا اپنی طرف بُلاتا ہے اور جانور بلانے والے کی آواز سُن کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ گو اِس کے الفاظ کا مطلب اور مفہوم نہیں سمجھتے۔ اِسی طرح یہ لوگ بھیڑ چال کے طور پر ایک دوسرے کی اتباع کرتے ہیں اور یہ کبھی غور نہیں کرتے کہ کہنے والا کیا کہتا ہے اور آیا اس پر عمل کرنا اُن کے لئے مفید ہے یا مضر۔ وہ صرف اتنا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سردار یا ہمارے لیڈر نے فلاں بات کہی ہے یا ہماری قوم یا برادری ایسا کہتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی عقل و فہم اور تدبّر کے تمام دروازے بند کر لیتے ہیں اور اندھادھند

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں کھاؤ۔

اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ پس اُن کی مثال جانوروں کی سی ہے کہ دوسرے کی بات سُن کر یہ لوگ اس پر غور کرنے کے عادی نہیں بلکہ اندھی تقلید کے خُوگر ہیں۔ گویا اُن کے کان بھی ہیں مگر یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ انہیں جس طرف بلایا جا رہا ہے وہ ہلاکت اور بربادی کی جگہ ہے یا امن اور سلامتی کا مقام ہے۔ اُن کی زبانیں بھی ہیں مگر دلیری سے حق بات کہنے کی جرأت کھو بیٹھی ہیں۔ اور اُن کی آنکھیں بھی ہیں مگر سلامتی کی راہ اُن کو دکھائی نہیں دیتی۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ ان کفّار کی مثال اُس شخص کی طرح ہے جو چیختا اور چلّاتا اور بتوں کو اپنی مدد کے لئے بلاتا ہے۔ اور اس کا بلانا دو طرح ہے ایک دُعا کے ذریعہ سے۔ دوسرا نداء کے ذریعہ سے۔ نداء ایسی آواز کو کہتے ہیں جو سُنی جائے یا نہ سُنی جائے اور دُعا اُس آواز کو کہتے ہیں جو سُنی جائے۔ فرماتا ہے وہ بُت جن کو یہ لوگ اپنی مدد کے لئے پکارتے ہیں۔ وہ نہ اُن کی دُعا سُنتے ہیں نہ نداء۔ گویا ان کفّار کا کام محض دُعا اور نداء ہی ہے ورنہ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سُنتے۔ نہ دُعا سُنتے ہیں نہ نداء سُنتے ہیں۔ اس لئے اُن کے بلانے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ اس صورت میں اِلَّا کو زائدہ تسلیم کرنا پڑیگا اور یا پھر یہ فقرہ اس طرح ہوگا کہ۔ لَا یَسْمَعُ اِلَّا هُوَ یَدْعُوْا دُعَآءً وَّ نِدَآءً۔ یعنی وہ بُت تو کچھ نہیں سنتے مگر وہ پکارنے والا برابر دُعائیں کئے چلا جاتا ہے اور آوازیں دیتا چلا جاتا ہے۔ ان معنوں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ چیختے چلّاتے ہیں تو پھر وہ بُكْمٌ کیسے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بُكْمٌ کے یہ معنے ہیں کہ وہ حقیقت کا اپنی زبان سے اقرار کرنے کے لحاظ سے گونگے ہیں۔ اور اس کی دلیل صُمٌّ اور عُمْیٌ کے الفاظ ہیں جیسے صُمٌّ سے ایسے لوگ مراد ہیں جن کے کان حق بات کے سُننے سے بہرے ہیں اور عُمْیٌ سے مراد حق کو نہ دیکھنے والے لوگ ہیں اسی طرح بُكْمٌ سے مراد وہ لوگ ہیں جو روحانی نقطۂ نگاہ سے گونگے ہیں۔ اور جو سچائی کا برملا اظہار کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اگر یہاں صرف بُكْمٌ کا لفظ ہوتا تو اعتراض درست ہوتا۔ لیکن صُمٌّ اور عُمْیٌ کے الفاظ نے صحیح معنے واضح کر دیئے۔

ترتیب و ربط:۔ اس آیت کا آیت ماقبل سے پہلے معنوں کے لحاظ سے یہ تعلق ہے کہ پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے فرمایا تھا وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا کہ جب انہیں خدا تعالیٰ کی طرف بلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا اُس کی اتباع کرو تو وہ اُسے سُنکر اعراض اختیار کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اُسی طریق کی اتباع کرینگے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں دعوتِ حق دینا ایسا ہی ہے جیسے جانوروں کو اپنی طرف بلانا۔ یہ لوگ بھی آپ کی آواز سُنتے ہیں مگر سمجھتے نہیں کہ اس آواز پر لبیک کہنا کس قدر ضروری ہے اور وہ اپنے باپ دادا کے طریق پر چلتے چلے جاتے ہیں۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا پہلی آیت سے یہ تعلق ہے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور اگر تم (واقعہ میں) اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو اسکا شکر (بھی ادا) کرو۔ ۸۶؎

کہ یہ لوگ اپنے باپ دادا کے پیچھے چلنے کے تو بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن ان کے باپ دادا اپنے بتوں کو پکارتے اور آوازیں دیتے تھک گئے اور کچھ بھی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ ہم اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کرینگے ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بتوں کو بلائے اور اس کا بلانا بالکل بیکار ثابت ہو اور اُسے کوئی جواب نہ ملے۔ پس ان لوگوں کا بھی اپنے بتوں کے سامنے چیخنا چلانا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔

۸۶؎ **تفسیر:** جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے اسلامی شریعت نے صرف حلال چیزوں کے کھانے کا ہی حکم نہیں دیا بلکہ حلال میں سے بھی طیّب اشیاء کے استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اور یہ اسلام کی ایسی امتیازی خصوصیت ہے جس میں کوئی اور مذہب اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اُس نے حلال کے مقابلہ میں صرف حرام کا درجہ ہی نہیں رکھا بلکہ اس سے اتر کر اس نے بعض چیزوں کو مکروہ بھی قرار دیا ہے۔ اور مومنوں کے لئے اُن کا استعمال ناپسند فرمایا ہے گویا چار مختلف مدارج ہیں جن کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اوّل طیّب دوم حلال سوم حرام چہارم مکروہ۔ حلال ترقی کرتے کرتے طیّب تک پہنچ جاتا ہے اور حرام گرتے گرتے مکروہ تک آ جاتا ہے۔ غرض اسلام اور دیگر مذاہب میں یہ فرق ہے کہ دوسرے مذاہب صرف حلال حرام تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں اور اسلام حلال اور حرام کے علاوہ بعض چیزوں کو طیّب یا مکروہ بھی قرار دیتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ کونسی چیزیں بعض حالات میں حلال ہو جاتی ہیں گو اصل میں حرام ہوں اور کونسی چیزیں بعض حالات میں حرام ہو جاتی ہیں گو اصل میں حلال ہوں اور اس طرح مختلف اشیاء کو قائم کرنا ایک مستقل باب گناہ اور نیکی کے امتیاز کیلئے کھول دیتا ہے مثلاً ہماری شریعت میں لوگوں کو ایذاء دینے سے منع کیا گیا ہے۔ اب اگر حلال چیز سے کسی وقت دوسروں کو ایذاء پہنچ جائے تو اُسوقت اُس کا استعمال کرنا بھی حرام ہو جائیگا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مَنْ اَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ يَعْنِي الثُّوْمَ فَلَا يَاْتِيَنَّ الْمَسَاجِدَ۔ (مسلم جلد اوّل کتاب المساجد) یعنی جو شخص کچے لہسن کا استعمال کرے اُسے چاہیئے کہ مسجد میں نہ آئے۔ ایک دوسری حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ بھی بیان فرمائی ہے کہ فَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ تَاَذّٰى مِمَّا تَاَذّٰى مِنْهُ الْاِنْسُ کہ ملائکہ بھی اُن چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جن سے انسان تکلیف محسوس کرتے ہیں (مسلم جلد اوّل کتاب المساجد) اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ لہسن کھانا جائز ہے۔ پھر بھی مساجد میں آنے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے لہسن اور پیاز وغیرہ کا کھانا ممنوع قرار دے دیا۔ اور ایسے شخص کو نماز باجماعت سے بھی روک دیا۔ ورنہ نماز تو کسی صورت میں بھی چھٹی نہیں جا سکتی۔ اگر مسجد میں نماز نہیں پڑھے گا تو بہرحال اُسے گھر پر نماز پڑھنی پڑے گی۔ لیکن اس وجہ سے کہ دوسروں کے لئے دُکھ اور تکلیف کا موجب نہ بنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا شخص اجتماعی عبادت سے الگ رہے تاکہ مومنوں کو تکلیف نہ ہو۔ غرض یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ اُس نے نہ صرف حلّت و حرمت کے مسائل بیان کئے بلکہ اُس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کھانے کی چیزوں میں سے ادنیٰ درجہ حلال کا ہے اور حرام چیزوں میں سے ادنیٰ درجہ کراہت کا ہے۔ پس مومنوں کو حلال اور حرام پر ہی نظر نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ انہیں تقویٰ کی باریک راہیں اختیار کرتے ہوئے حلال میں سے بھی طیّب چیزوں کو

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ

اُس نے تم پر صرف مُردار - خون - سؤر کے گوشت کو اور اُن چیزوں کو جنہیں اللہ کے سوا کسی اور سے

وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا

نامزد کر دیا ہو حرام کر دیا ہے ۔ مگر جو شخص (اِن اشیاء کے استعمال پر) مجبور ہو جائے اور وہ نہ تو قانون کا مقابلہ کرنیوالا ہو

عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۴﴾

اور نہ حد سے آگے نکلنے والا ہو اُس پر کوئی گناہ نہیں ۔ اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۔ ۵۸۷

اختیار کرنا چاہیئے اور حرام چیزیں تو الگ رہیں مکروہ چیزوں کے پاس پھٹکنے سے بھی احتراز کرنا چاہیئے ۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حلال کی بجائے صرف طیّب کا لفظ رکھا ہے جس کی یہ وجہ ہے کہ یہاں خاص طور پر مومنوں کو مخاطب کیا گیا ہے یعنی اعلیٰ درجہ کے مومنوں کو ۔ ورنہ اس رکوع کے شروع میں بھی یٰۤاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا میں اَلنَّاسُ سے مراد مومن ہی تھے کیونکہ کفار کو قرآن کریم مسائل تفصیلی میں حکم نہیں دیتا لیکن وہاں اَلنَّاسُ سے ادنیٰ درجہ کے مومن مراد تھے جو طبعی خواہشات کی طرف جھکنے والے تھے ۔ اسی لئے وہاں ان کی کمزوریوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ حکم دیا کہ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا یعنی جو کچھ حلال اور طیّب ہے کھاؤ ۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ وہ صرف طیّبات تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھ سکتے بلکہ خالص حلت و حرمت کے دائرہ کے اندر ہی رہنا چاہیں اور زیادہ پابندیاں اپنے لئے برداشت نہ کر سکیں ۔ لیکن یہاں خاص درجہ کے مومنوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے حکم دیا کہ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ تم صرف وہ طیّبات استعمال کرو جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے حکم کے نتیجہ میں فرمایا تھا کہ تم شیطان کے پیچھے چلنے سے بچ جاؤ گے ۔ لیکن یہاں یہ فرمایا کہ اگر تم صرف طیّبات ہی استعمال کرو گے تو اس کے نتیجہ میں تم اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لا سکو گے یعنی تمہیں ایسے نیک اعمال کی توفیق ملے گی جو تمہاری روح کو اللہ تعالیٰ کے آستانہ کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے ۔ جیسے دوسرے مقام پر وضاحتاً فرمایا کہ یٰۤاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (مومنون آیت ۵۲) یعنی اے ہمارے رسولو ! تم طیّبات کھاؤ اور مناسب حال اعمال بجا لاؤ ۔ گویا اسلام نے انسانی اعمال اور اخلاق پر غذا کے اثرات کو واضح طور پر تسلیم فرمایا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اس نقطہ کو ہمیشہ مدّنظر رکھیں ۔ اور غذائی معاملات میں طیّبات کو ترجیح دیا کریں تا کہ اُن کے اخلاق بھی متوازن رہیں اور اُن میں ناواجب اونچ نیچ کا کوئی پہلو دکھائی نہ دے ۔ غرض یہاں اعلیٰ درجہ کے ایمان کے مناسب حال کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ فرمایا ۔ اور جب انسان طیّبات پر حصر کر لیگا تو نہ صرف یہ کہ وہ منہیات سے بچ جائیگا بلکہ وہ صالحات کی بھی توفیق پائیگا ۔ پس اعلیٰ درجہ کے مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر حلال بھی نہ کھائے بلکہ خاص طور پر طیّب کو مدّنظر رکھے ۔ یا پھر اس آیت میں صرف طیّب کو اسلئے بیان کر دیا کہ حلال اسی میں آ جاتا ہے ۔

اَلْمَیْتَۃُ

۵۸۷ حل لغات :- اَلْمَیْتَۃُ

اَلْمَیْتَۃُ مَا لَمْ تَلْحَقْہُ الذَّکٰوۃُ ۔ وَالْحَیَوَانُ الَّذِیْ یَمُوْتُ حَتْفَ اَنْفِہٖ (اقرب) اَلْمَیْتَۃُ مَیْتٌ کا

مؤنث ہے۔ اور مَیْتَۃٌ سے مراد ہر ایسی چیز ہے جو بغیر کسی بیرونی سبب کے مرے اور اُسے ذبح نہ کیا جائے۔ (اقرب)

اور شریعت اسلام کے نزدیک اُسے بھی مُردار ہی کہتے ہیں جو ذبح نہ ہو خواہ ایسا جانور خود بخود مر جائے یا کوئی دوسرا اُسے مار دے۔

دَمٌ کے معنے خون کے ہیں۔ اور اس سے مراد دمِ مسفوح ہے جو ذبح کرنے سے بہ جاتا ہے۔ اندر کا خون مراد نہیں۔

اُضْطُرَّ: ضَرَّ سے باب افتعال کا ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اِضْطُرَّ اِلَیْہِ کے معنے ہیں اَحْوَجَہٗ وَاَلْجَأَہٗ فَاضْطُرَّ بِصِیْغَۃِ الْمَجْھُوْلِ اَیْ اُلْجِئَ (اقرب) اضطرار کسی شخص کو ایسے کام پر مجبور کر دینے کو کہتے ہیں جو اس کے لئے باعث ضرر ہو یا اُسے ناپسند ہو۔ یہ مجبوری خواہ بیرونی ہو جیسے تہدید و تخویف یا اندرونی ہو جیسے قدرتی مطالبات اور طبعی حوائج یعنی بھوک وغیرہ۔ ان دونوں میں سے کسی قسم کی مجبوری کے ماتحت انسان کام کرے تو اُسے اضطرار کہتے ہیں۔

بَاغٍ: بَغْیٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اَلْبَغْیُ کے معنے ہیں (۱) اَلظُّلْمُ۔ ظلم (۲) اَلْجُرْمُ وَالْجِنَایَۃُ قصور (۳) اَلْعِصْیَانُ۔ نافرمانی (۴) کُلُّ مُجَاوَزَۃٍ وَاِفْرَاطٍ عَلَی الْمِقْدَارِ الَّذِیْ ھُوَ حَدُّ الشَّیْءِ فَھُوَ بَغْیٌ۔ کسی مقررہ حد سے تجاوز کرنا بھی بغی ہے (اقرب)

اور اَلْبَاغِیْ سے مراد ہے (۱) اَلطَّالِبُ۔ چاہنے والا۔ (۲) اَلظَّالِمُ ظالم (۳) وَالْعَاصِیْ عَلَی اللّٰہِ وَالنَّاسِ۔ اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ اور لوگوں کی مخالفت میں کھڑا ہو جائے۔

عَادٍ: حد سے گزر جانے والا۔ یعنی جو قانون پر عمل کرتے کرتے کچھ زیادتی یا کمی کر دے۔

اِثْمٌ: اس جگہ اس کے معنے سزا کے ہیں۔ سبب کو مسبب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ سزا کا سبب گناہ ہوتا ہے۔ (۲) اِثْمٌ کے معنے گناہ کے بھی ہو سکتے ہیں۔

اُھِلَّ: اَھَلَّ سے فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے اور اَھَلَّ الْھِلَالُ وَاُھِلَّ (مجہولاً) کے معنے ہیں ہلال ظاہر ہو گیا (۲) اَھَلَّ الْقَوْمُ الْھِلَالَ رَفَعُوْا اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رُؤْیَتِہٖ۔ لوگوں نے ہلال پر آواز بلند کی (چاند کو ہلال اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے دیکھنے پر آواز بلند کی جاتی ہے) (۳) اور اَھَلَّ الصَّبِیُّ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَہٗ بِالْبُکَاءِ یعنی بچہ رونے لگا۔ (۴) اور جب اَھَلَّ الرَّجُلُ کہیں تو معنے ہونگے نَظَرَ اِلَی الْھِلَالِ آدمی نے ہلال دیکھا (۵) اور اَھَلَّ الشَّھْرُ کے معنے ہیں ظَھَرَ ھِلَالُہٗ نئے مہینے کا ہلال نکلا (۶) اَھَلَّ السَّیْفُ بِفُلَانٍ کے معنے ہیں قَطَعَ فِیْہِ تلوار نے اُسے کاٹ دیا۔ (۷) اَھَلَّ الْعَطْشَانُ کے معنے ہیں رَفَعَ لِسَانَہٗ اِلٰی لُھَاتِہٖ لِیَجْتَمِعَ لَہٗ رِیْقُہٗ یعنی پیاسے نے اپنی زبان تھوک سے تر کرنے کے لئے حلق کے قریب کی۔ (۸) اَھَلَّ اللّٰہُ السَّحَابَ کے معنے ہیں خدا تعالیٰ نے بادل برسایا (۹) اَھَلَّ الشَّھْرَ کے ہیں رَاَی الْھِلَالَ چاند دیکھا۔ (۱۰) اَھَلَّ الْمُلَبِّیْ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَہٗ بِالتَّلْبِیَۃِ یُقَالُ اَھَلَّ الْمُحْرِمُ بِالْحَجِّ وَالْعُمْرَۃِ لَبّٰی وَرَفَعَ صَوْتَہٗ۔ محرم نے حج اور عمرہ کے لئے تلبیہ کیا اور آواز بلند کی۔ (۱۱) اَھَلَّ فُلَانٌ بِذِکْرِ اللّٰہِ کے معنے ہیں رَفَعَ صَوْتَہٗ بِہٖ عِنْدَ نِعْمَۃٍ اَوْ رُؤْیَۃِ شَیْءٍ یُعْجِبُہٗ فلاں شخص نے کوئی نعمت دیکھکر ذکر الٰہی کے لئے اپنی آواز بلند کی۔ (۱۲) اَھَلَّ بِالتَّسْمِیَۃِ عَلَی الذَّبِیْحَۃِ کے معنے ہیں قَالَ بِسْمِ اللّٰہِ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا۔ وَمَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کے معنے ہیں نُوْدِیَ عَلَیْہِ بِغَیْرِ اسْمِ اللّٰہِ عِنْدَ ذَبْحِہٖ۔ جو جانور خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا جائے (اقرب)

تفسیر:۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ شریعت اسلامیہ میں جن اشیاء کے کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ وہ دو قسم کی ہیں۔ اوّل حرام دوم ممنوع۔ لغۃً تو حرام کا لفظ دونوں قسموں پر حاوی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے

دَمٌ اِضْطُرَّ بَاغٍ عَادٍ اِثْمٌ اُھِلَّ

اِس آیت میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا ہے یعنی مردار
خون۔ سؤر کا گوشت اور وہ تمام چیزیں جنہیں اللہ تعالیٰ
کے سوا کسی اور کے نام سے نامزد کر دیا گیا ہو۔ اِن کے
سوا بھی شریعت میں بعض اور چیزوں کے استعمال سے
روکا گیا ہے لیکن وہ چیزیں اشیاءِ ممنوعہ کی فہرست میں تو
آئیں گی۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق حرام نہیں ہونگی جیسے
حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نَھٰی عَنْ کُلِّ
ذِیْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَعَنْ کُلِّ ذِیْ مِخْلَبٍ
مِنَ الطَّیْرِ (مسلم جلد ۲ کتاب الصید والذبائح) یعنی آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کچلیوں والے درندے اور پنجوں والے
پرندے کو کھانا ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث
میں آتا ہے کہ نَھٰی عَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْاِنْسِیَّۃِ یعنی
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے پالتو گدھوں کا گوشت کھانے
سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم جلد ۲ کتاب الصید والذبائح)
یہ احکام اس آیت یا دوسری آیات کے مضمون کے
مخالف نہیں ہیں۔ کیونکہ جس طرح اوامر کئی قسم کے ہیں بعض
فرض ہیں بعض واجب ہیں اور بعض سنت ہیں۔ اِسی طرح نہی
بھی کئی اقسام کی ہے۔ ایک نہی محرّمہ ہے اور ایک نہی
مانعہ ہے اور ایک نہی تنزیہی ہے۔ پس حرام چار اشیاء
ہیں۔ باقی ممنوع ہیں اور ان سے بھی زیادہ وہ ہیں جن کے
متعلق نہی تنزیہی ہے۔ یعنی بہتر ہے کہ انسان اُن سے بچے۔
حرام اور ممنوع میں وہی نسبت ہے جو فرض اور واجب میں
ہے۔ پس جن اشیاء کو قرآن کریم نے حرام کہا ہے انکی حرمت
زیادہ سخت ہے اور جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
منع کیا ہے وہ حرمت میں اُن سے نسبتاً کم ہیں۔ اور جیسا کہ میں
نے بتایا ہے احکام میں اُن کی مثال فرض اور واجب اور
سنت کی سی ہے۔ حرام تو بمنزلہ فرض کے ہے اور منع بمنزلہ
واجب کے جس طرح فرض اور واجب میں فرق اُنکی سزا
کے لحاظ سے کیا جاتا ہے اِسی طرح جن اشیاء کی حرمت
قرآن کریم میں آئی ہے اگر انسان اُن کو استعمال کرے گا
تو اُس کی سزا زیادہ سخت ہوگی۔ اور جن سے آنحضرت
صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اُن کے استعمال سے
اُس سے کم درجہ کی سزا ملے گی۔ لیکن بہرحال دونوں جرم
قابلِ گرفت اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوں گے
حرام فعل کا ارتکاب کرنے سے انسان کے ایمان پر اثر پڑتا ہے
اور اُس کا نتیجہ لازماً بدی ہوتی ہے۔ لیکن دوسری چیزوں
کے استعمال کا نتیجہ لازماً بدی اور بے ایمانی کے رنگ میں
نہیں نکلتا۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمانوں میں سے بعض ایسے
فرقے جو اِن اشیاء کو مختلف تاویلات کے ذریعے جائز
سمجھتے اور انہیں کھا لیتے ہیں جیسے مالکی اِن کا اثر انکے
ایمان پر نہیں پڑتا۔ اور اُن میں بے ایمانی اور بدی پیدا
نہیں ہوتی۔ بلکہ گذشتہ زمانہ میں تو اُن میں اولیاء اللہ
بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن خنزیر کا گوشت یا مردار
کھانے والا کوئی شخص ولی اللہ نظر نہیں آئیگا۔ پس
حرمت کے بھی مدارج ہیں اور اِن چاروں حرام چیزوں کے
سوا باقی تمام ممنوعات ہیں جن کو عام اصطلاح میں
حرام کہا جاتا ہے۔ ورنہ قرآنی اصطلاح میں حرام
نہیں ہیں۔ دراصل ایک حرمت ایسی ہے جو صرف لُغتاً
حرمت کہلاتی ہے اس لحاظ سے ہر وہ چیز جس سے
کسی دوسرے کو منع کر دیا جائے حرام کہلائیگی۔ جیسے
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی منع کی ہوئی چیزیں ہیں۔
لیکن قرآنی اصطلاح میں صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں۔
اِس آیت میں مردار کھانے سے اللہ تعالیٰ نے اس لئے
روکا ہے کہ مردار کا خون بہت سی زہروں پر مشتمل ہوتا
ہے۔ اور مُردار کی نسبت اغلب گمان یہی ہوتا ہے کہ
وہ بیماری سے یا زہر سے یا زہریلے جانوروں کے کاٹے
سے مرا ہو۔ یا بالکل بوڑھا ہو کر مرا ہو۔ اور یہ سب
حالتیں ایسی ہیں کہ اِن میں جانور کا گوشت استعمال کرنے

قابل نہیں رہتا۔ اور اگر گر کر یا کسی اور صدمہ سے مرا ہو تب
بھی قاعدہ ہے کہ سخت صدمہ کا اثر فوراً خون میں زہر
پیدا کر دیتا ہے۔ پس درحقیقت کھانے کے قابل صرف وہی
گوشت ہوتا ہے جو ذبح کئے ہوئے جانور کا ہو۔ ورنہ
اُس کا لازماً بد اثر ہوگا۔ اور یہ چیز صرف خیالی نہیں بلکہ
موجودہ طب نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ خواہ کوئی جانور
عمر طبعی پا کر بوجہ بڑھاپا ہونے کے مرے یا کسی اونچے مقام
سے گر کر ہلاک ہو یا کسی صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے یا
کسی بیماری کا شکار ہو اُس کے خون میں کئی قسم کے
خطرناک جراثیم اور کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میڈیکل
جیورس پروڈنس MIDICAL JURISPRUDENCE
جو ڈاکٹری کی ایک مشہور کتاب ہے اس میں لکھا ہے کہ
مردہ کے گوشت میں بہت جلد کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جن
سے ایسے زہر پیدا ہوتے ہیں جنہیں CADAVERICE
PTOMAINES یا AL-KALIDES
کہتے ہیں۔ یہ زہر سخت مہلک ہوتے ہیں اور ان کا اثر
کچلا اور ایٹروپین کے مشابہ ہوتا ہے (صفحہ ۵۲۲)
اسی طرح خون بھی مختلف قسم کی زہروں پر مشتمل
ہوتا ہے اور صحت کیلئے سخت مضر چیز ہے۔ فزیالوجی والے
لکھتے ہیں کہ خون انسانی بدن میں ایک ایسے گڑھے کی طرح
ہوتا ہے جس میں بے حد مچھلیاں اور مینڈک اور کیڑے ہر وقت
اپنی غذا بھی اُس سے لیتے ہوں اور اپنا فضلہ بھی اُسی
میں پھینکتے ہوں۔ کیونکہ اُس میں بے انتہا سیلز تیر رہے
ہیں اور ہر وقت اُسے خراب کر رہے ہیں۔ یہ خون کا ہی
کام ہے کہ وہ ٹشوز سے مردہ مادہ کو ان آرگنز تک
لے جاتا ہے جو اُسے خون سے صاف اور علیحدہ کرتے ہیں
پس خون مختلف قسم کے زہروں اور ردّی مادوں سے
بھرا ہوا ہوتا ہے اور جسم کے اندر خدا تعالیٰ نے اس کے
صاف کرنے کے لئے کئی سامان بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن جب وہ
جسم سے باہر آ جائے تو اُس کے زہر اُس کے اندر ہی رہ جاتے
ہیں اور اس کا استعمال صحت کیلئے سخت مضر ہوتا ہے۔
اور چند منٹ میں خراب ہو جاتا ہے بلکہ ہوا کے کیڑے بلکہ
بہت جلد نشو و نما پا جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ گوشت جس سے
خون دھویا جائے دیر تک رہتا ہے بہ نسبت اس کے
جسے خون لگا ہوا ہو۔ پس خون کا بد اثر بھی ظاہر ہے۔

خنزیر کے گوشت کا اثر بھی انسان کے جسم اور
اُس کے اخلاق پر نہایت بُرا پڑتا ہے۔ جسم پر تو اُس کا
اس طرح گندہ اثر پڑتا ہے کہ اس کے گند اور کیچڑ میں
رہنے اور گندی ذہنیت کو پسند کرنے کے سبب سے
اس کے گوشت سے کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔
چنانچہ مسٹر JONATHAN NICHOLSON اپنی
کتاب SWINE FLESH میں لکھتے ہیں:۔

IT IS EXCEPTIONAL EVIDENCE AGAINST THE HATEFUL HOG WHEN WE SAY TAPE WORM, SCROFULA, CANCER AND ENEYSTER TRICHINA ARE UNKNOWN AMONG STRICT JEWS. THEY NEVER TOUCH THE HOG FLESH

یعنی سؤر کے گوشت کے متعلق ایک غیر معمولی عجیب
شہادت یہ ہے کہ کدو دانے اور سل کا مادہ یہودیوں
کے اندر اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سؤر کا گوشت
نہیں کھاتے۔ اگر ان کی یہ بات پورے طور پر تسلیم نہ بھی
کی جائے تب بھی اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ سؤر خور
قوموں میں یہ بیماریاں زیادہ ہوتی ہیں۔

سؤر کے گوشت سے ایک مہلک بیماری پیدا
ہوتی ہے جسے "TRICHINOSIS" کہتے ہیں۔

اِس میں پہلے ہیضہ کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر بخار
ہو جاتا ہے۔ پھر بدن میں درد شروع ہو جاتا ہے اور
آخر میں نمونیا ہو جاتا ہے۔ میڈیکل جیورس پروڈنس
میں لکھا ہے کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔
اِسی طرح سؤر کے گوشت سے آنتوں میں کیڑے
پڑ جاتے ہیں جو کدو دانہ کے مشابہ ہوتے ہیں اور سالہا
سال تک رہتے ہیں۔ ڈاکٹر الیف ٹیلر ایم۔ ڈی۔ ایف
آر۔ سی۔ پی اپنی کتاب "پریکٹس آف میڈیسن" میں لکھتے
ہیں کہ سؤر میں یہ بیماری پاخانہ کھانے سے پیدا ہوتی
ہے۔ لیکن اِن ضرروں سے بھی بڑھ کر بلکہ اصل باعث
اِس کی حرمت کا وہ خرابیاں ہیں جو اخلاق میں پیدا
ہوتی ہیں۔ صرف سؤر ہی ایک ایسا جانور ہے جس میں
نر کو نر پر پھاندنے کی عادت ہے۔ پس وہ لوگ جو سؤر
کا گوشت کھانے کے عادی ہیں اُن میں بھی دیوّثی بڑھ
جاتی ہے اور حیا کا مادہ کم ہو جاتا ہے۔
پھر اُس میں شجاعت بھی نہیں ہوتی بلکہ تہوّر کی
عادت ہوتی ہے جس وقت اُسے غصہ آ جائے وہ آگے
پیچھے نہیں دیکھتا بلکہ سیدھا حملہ کرتا ہے اور اسی عادت
کی وجہ سے شکاری اُسے جلد مار لیتا ہے۔ جب شکاری
اُسے گولی مارتا ہے تو وہ غصہ میں سیدھا حملہ کرتا
ہے اور اِس طرح جلدی گِر جاتا ہے۔ اِسی طرح جو قوم
سؤر کا گوشت کھانے والی ہوگی اُس میں بھی شجاعت
نہیں پائی جائیگی بلکہ تہوّر پایا جائیگا۔
بانیٔ سلسلہ احمدیہ اپنی مشہور تصنیف
"اسلامی اصول کی فلاسفی" میں خنزیر کی حرمت کا ذکر
کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔
"ایک نکتہ اِس جگہ یاد رکھنے کے
قابل ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو
حرام کیا گیا ہے خدا نے ابتداء سے اِس کے
نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے
کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور آر سے
مرکب ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ میں اِس کو
فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ خنز کے
معنے بہت فاسد۔ آر کے معنے دیکھتا ہوں
پس اِس جانور کا نام جو ابتداء سے خدا
تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے وہی اسکی
پلیدی پر دلالت کرتا ہے اور عجیب اتفاق
یہ ہے کہ ہندی میں اِس جانور کو سؤر
کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی سو اور آر سے
مرکب ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ میں اسکو
بہت بُرا دیکھتا ہوں۔ ...... اور
یہ معنے جو اس لفظ کے ہیں یعنی بہت فاسد
اِس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ اِس بات
کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا
نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیوث
ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر
ہے کہ قانونِ قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے
پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بدن
اور رُوح پر پلید ہی ہو۔ کیونکہ ہم ثابت
کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی رُوح
پر ضرور اثر ہے۔ پس اس میں کیا شک ہے
کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا جیسا
کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی
یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اِس جانور کا گوشت
بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کرتا ہے اور
دیوثی کو بڑھاتا ہے۔"
(اسلامی اصول کی فلاسفی)
چوتھی چیز جسے حرام قرار دیا گیا ہے وہ ہے

جو شرک کے طور پر ذبح کی جائے اور اُس کے قربان کرنے
کا باعث خدا تعالیٰ کے سوا اور ہستیوں کی خوشنودی حاصل کرنے
کی خواہش ہو۔ چونکہ اِس میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی ہتک
کی جاتی ہے اور اُس کی صفات دوسری ہستیوں کو دی جاتی
ہیں اسلئے اس کو استعمال کرنا انسان کو بے غیرت بناتا ہے
بلکہ درحقیقت ایسے جانور کو کھانا دلی ناپاکی اور بے غیرتی
کی علامت ہے۔ پس اسلام نے اس کو بھی حرام قرار دیا ہے۔
یہ حرمت اس کے طبعی نقصانات سے نہیں بلکہ دینی نقصانات
کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ جو شخص کسی ایسے جانور کا گوشت
کھاتا ہے جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو وہ اس بات
کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ اُسے خدا تعالیٰ کی توحید سے
کوئی محبت نہیں۔ وہ بظاہر خدا تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ
کرتا ہے مگر اپنے باطن میں اُس نے اور بھی کئی بُت چھپا رکھے
ہیں جن کی وہ پرستش کرتا ہے۔ پس اس کا کھانا اس کے دل
کو ناپاک کرتا اور اُسے مشرکوں کا ہمرنگ بنا دیتا ہے۔

عیسائی لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اسلام نے
تورات کی نقل کرتے ہوئے اِن اشیاء کو حرام قرار دیا ہے
کسی حکمت کی وجہ سے ان کو حرام قرار نہیں دیا۔ مگر ان کا
یہ خیال بالکل غلط ہے۔ کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں
جن کو تورات نے حرام کیا ہے مگر قرآن نے حرام نہیں کیا
مثلاً اونٹ کو تورات میں حرام قرار دیا گیا ہے (احبار باب ۱۱
آیت ۴) لیکن اسلام میں اس کا کھانا جائز ہے۔ اگر کہو
کہ عربوں کی خاطر اُسے حرام نہیں کیا گیا۔ تو میں کہتا ہوں کہ
خرگوش کو بھی تورات میں حرام کیا گیا ہے (احبار باب ۱۱
آیت ۶) لیکن اسلام میں اُس کا کھانا بھی جائز ہے۔ اگر
اونٹ عربوں کی خاطر حلال کیا گیا تھا تو خرگوش کو حلال
قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ پھر اگر یہ احکام تورات
کی ہی نقل ہوتے تو چاہیئے تھا کہ تورات کے تمام احکام
کو نقل کر لیا جاتا۔ مگر قرآن کریم نے اس کے بہت سے احکام کو
چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً تورات نے مردار کھانے والے کے لئے
یہ سزا مقرر کی ہے کہ وہ ناپاک ہو جائیگا اور کپڑے دھونے
کے بعد بھی شام تک ناپاک رہیگا (احبار باب ۱۱ آیت ۳۹-۴۰)
لیکن قرآن کریم نے اس بے معنی بات کو چھوڑ دیا ہے۔ پس
یہ کہنا کہ قرآن نے تورات کی نقل کی ہے واقعات کے لحاظ
سے بالکل غلط بات ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ تورات نے تو حرمت کی کوئی وجہ
بیان نہیں کی لیکن قرآن کریم حرمت کی وجہ بھی بتاتا ہے۔
چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ
اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً
اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ
فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ
بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام آیت ۱۴۶)
یعنی تو اُن سے کہدے کہ جو کچھ میری طرف نازل کیا گیا ہے
مَیں تو اُس میں اُس شخص پر جو کسی چیز کو کھانا چاہے سوائے
مردار یا بہتے ہوئے خون یا سؤر کے گوشت کے کوئی چیز
حرام نہیں پاتا۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک چیز نجس ہے
یا مَیں فسق کو حرام پاتا ہوں۔ یعنی اس چیز کو جس پر
خدا تعالیٰ کے سوا کسی اَور کا نام لیا گیا ہو۔ لیکن جو
شخص اس کے کھانے پر مجبور ہو جائے بغیر اس کے کہ
وہ شریعت کا مقابلہ کرنے والا ہو یا حد سے نکلنے والا
ہو یعنی وہ جان بوجھ کر ایسے موقعہ پر نہ گیا ہو یا کھاتے
وقت ضرورت سے زیادہ نہ کھائے تو وہ یاد رکھے کہ تیرا رب
یقیناً بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے یعنی
ایسا شخص اگر ان کھانوں کو کھالے تو اللہ تعالیٰ اُس کو
اُن کے بد اثرات سے بچا لیگا۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ
نے بتایا ہے کہ مُردہ اور بہا ہُوا خون اور سؤر کا گوشت
حرام کرنے کی وجہ ان کا تکلیف دہ ہونا ہے کیونکہ رجس
کے معنے گند اور عذاب کے ہوتے ہیں۔ پس مراد یہ ہے کہ

یہ چیزیں گندی ہیں اور انسان کے لئے رُوحانی اور جسمانی طور پر موجب دکھ ہیں۔

اس کے علاوہ سورۃ مائدہ آیت ۴ اور سورۃ نحل آیت ۱۱۶ میں بھی حلال اور حرام اشیاء کا ذکر ہے اور سب میں یہی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ سوائے سورۃ مائدہ کے کہ وہاں مَیْتَۃ کی تشریح کرکے بتایا ہے کہ اس میں گلا گھونٹا ہوا یا لاٹھی سے مارا ہوا بھی شامل ہے۔ اسی طرح بلندی سے گر کر مرنے والا جانور یا سینگ لگنے سے مرا ہوا جانور یا وہ جانور جسے کسی درندے نے کھا لیا ہو وہ بھی مردار کے حکم میں شامل ہے۔

اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کو اس نے علیحدہ بیان کیا ہے کہ اگرچہ اس سے ظاہری طور پر کوئی نقصان معلوم نہیں ہوتا مگر اس کے استعمال کرنے سے رُوحانی رنگ میں یہ بُرا نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے اندر اباحت اور بے دینی پیدا ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ سے اس کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ پس بائبل نے تو بغیر کوئی حکمت واضح کرنے کے بعض چیزوں کو حرام قرار دے دیا۔ مگر قرآن کریم نے حرام کرنے کی وجہ بھی بتلائی ہے پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلت و حرمت کے مسائل تورات سے نقل کرلئے گئے ہیں۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ میں پہلی شرط تو یہ رکھی کہ یہ استثنٰی صرف اس شخص کے لئے ہے جو مضطر ہو جائے اور اضطرار کے معنے کسی شخص کو کسی ایسے کام پر مجبور کر دینے کے ہیں جو اس کے لئے باعثِ ضرر ہو یا جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اور یہ مجبوری دو قسم کی ہوتی ہے ایک بیرونی تہدید و تخویف اور ایک اندرونی جیسے ہیجانِ جذبات اور مطالباتِ نیچر وغیرہ (مفردات راغب) دوسری شرط یہ رکھی کہ وہ باغی یعنی سرکش اور قانون شکن نہ ہو۔ تیسری شرط یہ رکھی کہ وہ عادی یعنی حد سے گذرنے والا نہ ہو۔ باغی کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی اپنے کسی عیسائی دوست کے گھر میں بیٹھا ہوا ہو اور وہ بے تکلفی سے گھر والوں سے کہے کہ مجھے کچھ کھانے کیلئے دو اور وہ سؤر کا گوشت سامنے رکھ دیں تو وہ اُسے بے تکلف کھانے لگ جائے۔ یہ بغاوت اور نافرمانی ہوگی۔ سؤر کا گوشت کھانا صرف اُسی وقت جائز ہوگا جب وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو اور اُسے کھانے کے لئے سؤر کے گوشت کے سوا اور کوئی چیز کھانے کی میسر نہ آ رہی ہو۔ کیونکہ اُس وقت اس کے استعمال میں نقصان کم اور عدمِ استعمال میں نقصان زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وَلَا عَادٍ فرما کر بتا دیا کہ مضطر کو بھی کُلّی طور پر اجازت نہیں دی گئی کہ وہ پیٹ بھر کر کھانا کھائے بلکہ صرف اتنا کھانے کی اجازت دی گئی ہے جس سے اُس کی زندگی قائم رہ سکے۔ اگر وہ ان حدود کا خیال رکھیگا تو اُس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس خیال سے کہ آج تو پہلی مرتبہ سؤر کا گوشت کھانے کا موقعہ ملا ہے خوب سیر ہو کر کھائے تو یہ ناجائز ہوگا بہر حال اضطرار تاویلی نہیں بلکہ حقیقی ہونا چاہیئے۔ تب ان چیزوں کا استعمال اُس کے لئے جائز ہوگا۔

آخر میں فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایسی مجبوری کی حالت میں کھانے والے پر کوئی گناہ نہیں تو بخشنے کے کیا معنے ہوئے۔ کیونکہ اگر ایسی حالت میں کھانا بھی گناہ ہے تو پھر فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی دوسری آیات سے پتہ لگتا ہے کہ انسان سے جو کمزوریاں سرزد ہوتی ہیں وہ بھی اُس کی کسی مخفی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ چونکہ اس جگہ ایسے لوگوں کا ذکر کیا جا رہا تھا جنہیں مجبوری کی حالت میں لحم خنزیر وغیرہ استعمال کرنے کی اجازت دی گئی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ تمہارا اس حالت کو پہنچنا بتاتا ہے کہ تم تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز نہیں تھے ورنہ خدا تعالیٰ تمہیں اس حالت سے بچا لیتا اور تمہارے رزق کے لئے غیب سے کوئی اور صورت پیدا فرما دیتا۔ آخر آج تک اُمتِ محمدیہ میں لاکھوں اولیاء اللہ گذرے ہیں کیا کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ولی کے متعلق بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اُس پر ایسا فاقہ آیا کہ وہ مُردار یا سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گیا۔ اگر نہیں تو پھر ایسے شخص کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ اُس سے اپنی پہلی زندگی میں کوئی نہ کوئی قصور ایسا ضرور سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں اُسے یہ دن دیکھنا پڑا کہ وہ مومن کہلاتے ہوئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں سے ہوتے ہوئے سؤر کا گوشت کھانے پر مجبور ہو گیا۔ بے شک ایسی حالت میں اُس کا بقدر ضرورت چند لقمے لے لینا اور موت سے اپنے آپ کو بچا لینا جائز ہے لیکن چونکہ اُس کی یہ حالت کسی مخفی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوگی اس لئے اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے اعمال کا جائزہ لے کر اپنی گذشتہ کمزوریوں پر ندامت کے آنسو بہائے۔ خدا تعالیٰ کے حضور توبہ اور استغفار سے کام لے اور دُعا کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی کمزوریوں کو معاف فرمائے اور اُن پر پردہ ڈالے اور اُسے اپنی مغفرت کے دامن میں لے لے۔ اگر وہ سچے دل سے ایسا کریگا تو وہ اللہ تعالیٰ کو غفور اور رحیم پائے گا۔ اور آئندہ اس قسم کے حالات میں مبتلا ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ ہے۔ انہیں جنگ میں پکڑ کر اور قید کر کے قیصر کے پاس بھیجا گیا۔ اُس نے چاہا کہ انہیں قتل کر دے۔ مگر اُس کے مصاحبوں نے کہا کہ قتل نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مسلمان بھی ہمارے قیدیوں کو قتل نہیں کرتے اور اگر عمرؓ کو پتہ لگ گیا کہ اُن کے ایک آدمی کو قتل کیا گیا ہے تو وہ اس کا سختی سے انتقام لیں گے۔ قیصر نے کہا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اسے ایسی سزا دوں جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ اس پر انہوں نے کہا۔ اسے سؤر کا گوشت کھلانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے اُس صحابیؓ کو چند دن بھوکا رکھا اور پھر سؤر کا گوشت کھانے کو دیا اُس نے کھانے سے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ اُسے کھانے پر مجبور کر رہے تھے کہ قیصر کے سر میں شدید درد شروع ہو گئی جس کا اُن سے کوئی علاج نہ ہو سکا۔ اُس کے مصاحبوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ اس شخص کو تکلیف دینے کی وجہ سے ہے۔ آخر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے خلیفہ کو دُعا کے لئے لکھا جائے۔ اور چونکہ ایسی صورت میں اُن کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ ایک مسلمان پر وہ ایسی سختی کریں۔ ورنہ دُعا مشکل تھی۔ اِس لئے وہ مجبور ہو کر اُسے کھانا دینے لگ گئے۔ پس جو لوگ ایمان میں پختہ ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اُن پر ایسا موقعہ ہی نہیں لاتا کہ انہیں حرام چیز کھانی پڑے خدا تعالیٰ خود ان کے لئے ہر قسم کی خیر و برکت کے سامان مہیا کر دیتا ہے۔

اِس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر کسی موقعہ پر انتہائی مجبوری کی وجہ سے مردار یا سؤر کا گوشت استعمال کر لیا جائے تو جن زہریلے اثرات کی وجہ سے شریعت نے اِن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ بہر حال ایک مومن کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اِن نتائج کا تدارک اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان غفور اور رحیم خدا کا دامن مضبوطی سے پکڑ لے اور اُسے کہے کہ اے خدا میں نے تو تیری اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لئے اِس زہریلے کھانے کو کھا لیا ہے لیکن اب تو ہی فضل فرما اور اُن مہلک اثرات سے میری رُوح اور جسم کو بچا جو اُس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی حکمت کے باعث آخر میں اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ کہا گیا ہے

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ

جو لوگ اس (تعلیم) کو جو اللہ نے (الہٰی) کتاب (میں) نازل کی ہے چھپاتے ہیں اور

یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ

اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت لیتے ہیں وہ یقیناً اپنے پیٹوں میں صرف

بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ

آگ ڈالتے ہیں اور قیامت کے دن اللہ نہ اُن سے کلام کریگا

وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ ۚۖ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱۷۵﴾

اور نہ اُن کو پاک قرار دے گا اور اُن کے لئے دردناک عذاب (مقدر) ہے۔ ۵۸۸

تاکہ انسان مطمئن نہ ہو جائے بلکہ بعد میں بھی وہ اُس کی تلافی کی کوشش کرتا رہے اور خدا تعالیٰ سے اُسکی حفاظت طلب کرتا رہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غالباً شریعت کی اسی رخصت کو دیکھتے ہوئے ایک دفعہ فرمایا کہ اگر کسی حاملہ عورت کی حالت ایسی ہو جائے کہ مرد ڈاکٹر کی مدد کے بغیر اُس کا بچہ پیدا نہ ہو سکتا ہو اور وہ ڈاکٹر کی مدد نہ لے اور اُسی حال میں مر جائے تو اس عورت کی موت خود کشی سمجھی جائیگی۔ اسی طرح اگر انسان کی ایسی حالت ہو جائے کہ وہ بھوک کے مارے مرنے لگے اور وہ سؤر یا مردار کا گوشت کسی قدر کھالے تو اُسپر کوئی گناہ نہیں۔

۵۸۸ تفسیر: فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو اس عظیم الشان تعلیم کو چھپاتے ہیں جسے خدا نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے۔ اور اس کے بدلہ میں دنیوی فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ انڈیلتے ہیں۔ یہ آیت حلت و حرمت کے مسائل کے بیان کرنے کے معاً بعد ذکر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت تم پر حرام ہے اور جس طرح غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہؤا جانور کھانا تمہارے لئے گناہ ہے اسی طرح یاد رکھو کہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو چھپانا اور دنیوی مال و جاہ یا عہدوں کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے دینا۔ اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ دینا بھی مُردار اور سؤر کا گوشت کھانے سے کم نہیں۔ جس طرح وہ حرام خوری ہے اسی طرح یہ بھی حرام خوری ہے کہ انسان دین سے واقف ہوتے ہوئے کلمۂ حق کہنے سے احتراز کرے۔ اور ڈرے کہ اگر میں نے اپنے عقیدہ کو نہ چھپایا یا خدا اور اس کے رسول کے احکام کا برملا اظہار کر دیا تو میری ملازمت جاتی رہے گی یا میری تجارت ماری جائیگی یا میرے دوستوں کے حلقہ میں میری عزت کم ہو جائیگی۔ فرماتا ہے جو لوگ صحیح علم رکھنے کے بعد بھی منافقت سے کام لیتے ہیں اور دنیوی مفاد کو دینی مفادات پر ترجیح دیتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ اپنے پیٹوں میں انگارے ڈال رہے ہیں۔

مَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ۔ اس آیت میں بُطُوْن کا لفظ تاکید کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور فِيْ بُطُوْنِهِمْ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کے بطون کے اندر آگ کا عذاب پیدا کیا جائے گا۔ یعنی انہیں اندرونی عذاب دیا جائیگا جو بیرونی عذاب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کو ایک شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے کہ ؎

دُخُوْلُ النَّارِ لِلْمَهْجُوْرِ خَيْرٌ
مِنَ الْهَجْرِ الَّذِيْ هُوَ يَتَّقِيْهِ
لِاَنَّ دُخُوْلَهٗ فِي النَّارِ اَدْنٰى
عَذَابًا مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ فِيْهِ

یعنی ایک مہجور انسان جو اپنے محبوب کے فراق میں نالہ و فریاد کر رہا ہو اُس کا آگ میں داخل ہو جانا اُس جدائی کی آگ سے زیادہ آسان ہوتا ہے جس سے وہ بچنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس کا آگ کے اندر داخل ہونا اس سے کم تکلیف دہ ہے کہ آگ اُس کے اندر داخل ہو جائے۔ اور وہ اس کے رگ و ریشہ کو جلا کر راکھ کر دے۔ اِسی محاورہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ آگ میں داخل کئے جائیں گے بلکہ فرمایا کہ وہ آگ اپنے پیٹوں میں ڈال رہے ہیں۔

- - - - - - - - - - یعنی وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے ایک اندرونی جہنم تیار کر رہے ہیں۔ گویا اس آیت میں سبب کی جگہ مسبب استعمال ہوا ہے۔

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ پھر فرماتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے قیامت کے دن کلام تک نہیں کرے گا۔ یہ ایک عظیم الشان نکتہ تھا۔ جسے افسوس کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے فراموش کر دیا۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے نہیں بولیگا۔ حالانکہ قیامت کا دن وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کافروں سے بھی کلام کرے گا۔ جیسا کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (قصص آیت ٦٦) یعنی اُس دن خدا تعالیٰ کفار کو پکارے گا اور کہیگا تم نے میرے رسولوں کے پیغام کا کیا جواب دیا تھا۔ پس قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کا کفار سے بھی کلام کرنا ثابت ہے تو بعض لوگوں سے اُس کا مُنہ پھیر لینا اور اُن سے کلام تک نہ کرنا بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے شدید ناراض ہوگا۔ اور وہ نہیں چاہیگا کہ اُن سے زجر کے رنگ میں بھی کلام کرے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا کلام نہ کرنا اُس کی ناراضگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر اس زمانہ کے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کلام نہ کرنا نعوذ باللہ ایک بڑی نعمت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل امتِ محمدیہ کو حاصل ہوئی۔ حالانکہ خیرِ اُمت کی علامت یہ ہونی چاہیئے تھی کہ اللہ تعالیٰ اِس نعمت کا دروازہ اُن پر زیادہ سے زیادہ کھولتا اور پہلی قوموں سے بھی زیادہ انہیں شرفِ مکالمہ و مخاطبہ عطا فرماتا۔ مگر انہوں نے زحمت کو رحمت سمجھ لیا اور خدا تعالیٰ سے دُوری کو ایک انعام سمجھ کر اُسے حرزِ جان بنا لیا۔

اِس آیت کا ایک یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے محبت کا کلام نہیں کریگا۔ اور یہ عام محاورہ ہے۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں کہ مَیں تم سے بات نہیں کرونگا۔ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ مَیں تم سے دوستانہ کلام نہیں کرونگا پس اِس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس روز اُن سے دوستانہ کلام نہیں کریگا۔ بلکہ اُس کا کلام ایسا ہی ہوگا جیسے ایک جج کسی مجرم کو سزا کا حکم سُناتے وقت کلام کرتا ہے۔ مگر بہر حال خواہ کوئی معنے لئے جائیں خدا تعالیٰ کا ترکِ گفتگو اُس کی ناراضگی کی نشانی ہے۔ مگر مسلمان بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کا اُمتِ محمدیہ پر یہ انعام

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی اور مغفرت چھوڑ کر

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۶﴾

عذاب اختیار کر لیا ہے۔ پس آگ (کے عذاب) پر اُن کی برداشت تعجب انگیز ہے۔ ۸۹

متمثل ہوا کہ اُس نے اُن سے کلام کرنا ترک کر دیا۔ اور وحی اور الہام کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔

پھر فرمایا وَلَا يُزَكِّيْهِمْ۔ چونکہ اسلام کی رُو سے کفار کو دوزخ میں ڈالنے کی غرض یہی ہے کہ اُن کا تزکیہ ہو۔ اس لئے وَلَا يُزَكِّيْهِمْ کے یہ معنے نہیں کہ وہ انہیں پاک نہیں کریگا۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک قرار نہیں دے گا۔

ترتیب و ربط:۔ ان آیات میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ساتھ ہی یہود کو بھی مدّ نظر رکھا گیا ہے چنانچہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ میں اُن کے اس اعتراض کو دُور کیا گیا ہے کہ یہ نبی اُن چیزوں کو کیوں حلال کرتا ہے جو شریعت موسویہ میں حرام تھیں۔ اگر یہ اُن پیشگوئیوں کا مصداق ہے تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ اعتراض قلّتِ تدبّر کا نتیجہ ہے بعض احکام کسی خاص وقت کے مناسب حال تھے اُن کو دوام کا رنگ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے یہود میں اونٹ حرام تھا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت حلال تھا۔ پس جس طرح موسیٰؑ سے قبل بعض چیزیں حلال تھیں اور کئی انبیاء تک اُن کو استعمال کرتے رہے مگر بعد میں اُن کو حرام کر دیا گیا۔ اسی طرح موسوی شریعت کے بعد بھی خدا تعالیٰ اختیار رکھتا تھا کہ وہ بعض حرام سمجھی جانے والی چیزوں کو حلال کر دیتا۔ پس اِس پر اعتراض کرنا نادانی کی علامت ہے۔

۸۹ حل لغات:۔ اِشْتَرٰى اور اَلضَّلٰلَةُ کی حل لغات کے لئے دیکھیں تفسیر سورۃ بقرہ حل لغات ۱۸؎ نیز اَلْهُدٰى کی حل لغات کے لئے دیکھیں سورۃ بقرہ حل لغات ۳؎ و حل لغات ۵؎۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی اور مغفرت کی بجائے عذاب کو اختیار کر لیا ہے۔ پس آگ کے عذاب پر اُن کی برداشت تعجب انگیز ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان پر کوئی جبر نہیں کیا بلکہ اُسے نیکی اور بدی کے اختیار کرنے پر کامل مقدرت بخشی ہے۔ اور پھر انبیاء کے ذریعہ اُس نے بنی نوع انسان کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا ہے۔ اب یہ انسان کا اختیار ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی عطا کردہ عقل اور اُس کے کلام سے فائدہ اٹھا کر ہدایت کی راہ اختیار کرے یا شیطان کے پیچھے چل کر ضلالت کو اختیار کرلے۔ اگر وہ ضلالت کو ہدایت پر ترجیح دیتا ہے تو اُس کے نتائج بھی طبعی طور پر اُسے عذاب کی صورت میں برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اس جسارت اور نابینائی پر تعجب کا اظہار کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ جب انہوں نے مغفرت پر عذاب کو ترجیح دی ہے تو ان کی عذاب کو برداشت کرلینے کی جرأت بڑی تعجب انگیز ہے۔

اس آیت کے متعلق یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ بھی تعجب کا اظہار کیا کرتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ الَّذِيْنَ

یہ (عذاب) اِس سبب سے ہوگا کہ اللہ نے اِس کتاب کو (مشتمل) برحق اُتارا ہے اور جن لوگوں نے اِس

اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۷﴾ لَيْسَ الْبِرَّ

کتب کے بارہ میں اختلاف کیا ہے وہ یقیناً پرلے درجہ کی عداوت میں (مبتلا) ہیں ۹۰ تمہارا مشرق اور مغرب

ع ۲۱/۵

اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ

کی طرف منہ پھیرنا کوئی بڑی نیکی نہیں ہے نیکی کامل نیک

الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ

وہ شخص ہے جو اللہ ، روز آخرت ملائکہ

الْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى

(الٰہی) کتاب اور سب نبیوں پر ایمان لایا - اور اُس (یعنی اللہ) کی محبت کی وجہ سے رشتہ داروں

کہ بعض اوقات کلام میں حقیقی تعجب مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے یہ بتلانا مقصود ہوتا ہے کہ یہ کیسی بےوقوفی کر رہے ہیں کیا یہ بھی کوئی ایسی چیز تھی جسے اپنے اوپر وارد کرکے وہ صبر کرتے۔ پس فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ واقعہ میں بڑے صبر کرنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ اُن کے صبر کی تعریف کر رہا ہے۔ یا اُن کے صبر پر تعجب کا اظہار کر رہا ہے بلکہ یہ تعریض ہے اور اس سے لوگوں کو یہ بتلانا مقصود ہے کہ ان بیوقوفوں کی موجودہ حالت بتلاتی ہے کہ یہ لوگ عذاب پر بہت ہی صبر کرنیوالے ہیں۔ نہ یہ کہ عذاب پر وہ واقعہ میں صبر کرینگے کیونکہ معمولی عذاب بھی انسان کی قوت برداشت سے باہر ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر مَا کو استفہامیہ قرار دیا جائے۔ تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ کس چیز نے انہیں آگ پر صبر کرنیوالا بنا دیا ہے۔ اور اگر مَا کو نافیہ قرار دیا جائے تو پھر اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ مَآ اَصْبَرَهُمُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ۔ اللہ تعالیٰ انہیں آگ پر صبر نہ دے۔ یعنی خوب سزا دے اور وہ سزا اُن کو اچھی طرح محسوس ہو۔

۹۰ حل لغات :- شِقَاقٌ : شَاقَّ کا مصدر ہے۔ اور شَاقَّهٗ کے معنے ہیں خَالَفَهٗ وَعَادَاهُ۔ وَحَقِيْقَتُهٗ اَنَّ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا فِىْ شِقٍّ غَيْرِ شِقِّ صَاحِبِهٖ یعنی اُس نے اُس کی مخالفت اور دشمنی کی۔ اور اس کے حقیقی معنے یہ ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کی مخالف جانب سے آیا۔ (اقرب)

شِقَاقٌ

تفسیر :- فرماتا ہے۔ یہ عذاب انہیں اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بڑے بھاری احسانات سے کام لیتے ہوئے انہیں ایک ایسا قانون بخشا تھا جس کا ایک ایک حرف صداقت پر مشتمل ہے۔ مگر ان لوگوں نے انتہا درجہ کی عداوت اور دشمنی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اُسے

وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَ

اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کو اور سوالیوں کو نیز

فِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ

غلاموں (کی آزادی) کے لئے (اپنا) مال دیا۔ اور نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کو ادا کیا اور اپنے عہدوں کو

بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ

جب بھی کوئی عہد کریں پورا کرنیوالے اور (خاصکر) تنگی اور بیماری میں

وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ

اور جنگ کے وقت برداشت سے کام لینے والے (کامل نیک ہیں) ۔ یہی لوگ ہیں جو (اپنے قول کے) سچے نکلے ۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

اور یہی لوگ کامل متقی ہیں ۔ ۱۹۵

ٹھکرا دیا۔ اور خدائی پیغام کے منکر بن گئے ۔

شِقَاقٍ بَعِیْدٍ سے ایسی عداوت مراد ہے جو اپنی شدت میں انتہا درجہ تک پہنچی ہوئی ہو اور جس کا سلسلہ ایک طویل مدت تک بھی منقطع نہ ہو ۔

۱۹۵ حل لغات

:- اَلْبِرُّ : اَلصِّلَةُ وَالطَّاعَةُ وَالصِّدْقُ ۔ بِرّ کے معنے صلہ رحمی اطاعت اور سچائی کے ہیں (اقرب)

مفرداتِ امام راغب میں لکھا ہے۔ اَلْبِرُّ : اَلتَّوَسُّعُ فِیْ فِعْلِ الْخَیْرِ۔ پھر لکھا ہے ۔ بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّهٗ اَیْ تَوَسَّعَ فِیْ طَاعَتِهٖ فَمِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی اَلثَّوَابُ وَ فِی الْعَبْدِ الطَّاعَةُ ۔ یعنی بِرّ کے معنے ہیں نیکی میں وسعت اختیار کرنا۔ چنانچہ بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّهٗ کے معنے ہیں بندہ نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں وسعت اختیار کی۔ بِرّ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد ثواب دینا ہے اور اگر بندے کی طرف منسوب ہو تو اس سے مراد اطاعت کرنا ہے ۔

اَلْبَاْسَآءُ کے معنے ہیں اَلشِّدَّةُ شدت (۲) اِسْمٌ لِلْحَرْبِ جنگ (۳) اَلْمَشَقَّةُ وَالضَّرْبُ مشقت اور مار ۔

اَلضَّرَّآءُ کے معنے ہیں (۱) اَلزَّمَانَةُ ۔ قحط (۲) اَلشِّدَّةُ سختی و مصیبت (۳) اَلنَّقْصُ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ مال اور افراد میں کمی (۴) نَقِیْضُ السَّرَّآءِ یہ سَرَّآء یعنی فراخی کا الٹ ہے ۔ (اقرب)

اَلْبَاْسُ :کے معنے ہیں (۱) اَلْفَقْرُ مالی مشکلات ۔ (۲) اَلْعَذَابُ عذاب (۳) اَلشِّدَّةُ فِی الْحَرْبِ جنگ کی سختی ۔ (۴) اَلْقُوَّةُ قوت ۔ قرآن کریم میں آتا ہے ۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا جس میں بڑی قوت ہے ۔

تفسیر :- اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نیکی اور

اَلْبَاْسَآءُ
اَلْبِرُّ
اَلْبَاْسُ

تقوٰی کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ لوگوں کے سامنے پیش
کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ حقیقی نیکی کس چیز کا نام ہے۔ اگر
غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں نیکی اور
تقوٰی کے متعلق بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور مختلف
جماعتوں اور مختلف قوموں اور مختلف زمانہ کے لوگوں کے
نزدیک نیکی کی تعریف مختلف رہی ہے۔ غرباء نیکی کی کچھ اور
تعریف کرتے ہیں اور اُمراء کچھ اَور کرتے ہیں۔ پھر ممالک کے
لحاظ سے بھی نیکی کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہندوستان
میں حاجی بڑے نیک شمار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک
شخص خواہ صوم و صلوٰۃ اور دوسرے احکام شرعی کا کتنا ہی
پابند کیوں نہ ہو لوگ اُس کے مقابلہ میں حاجی کو ترجیح دینگے
خواہ اُس نے سفرِ حج میں اپنے اوقات فضول اور لغو طور پر
ہی ضائع کئے ہوں۔ اور حج کرنے کے بعد بھی اپنے اندر کوئی
تغیّر پیدا نہ کیا ہو۔ اور صوم و صلوٰۃ کا بھی چنداں پابند نہ
ہو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ
ایک ریل کے سٹیشن پر ایک نابینا بڑھیا بیٹھی تھی کہ ایک شخص نے
اُس کی چادر اُٹھا لی۔ بڑھیا کو جب پتہ لگا کہ چادر غائب ہے
تو اُس نے آواز دیکر کہا۔ کہ بھائی حاجی! مجھ غریب کی چادر
کیوں لی ہے۔ میرے پاس تو اَور کوئی کپڑا نہیں۔ میں تو سردی
سے ٹھٹھر کر مر جاؤں گی۔ وہ چادر تو اُس شخص نے لاکر رکھ
دی مگر پُوچھا کہ تجھے کس طرح پتہ لگا کہ میں حاجی ہوں۔ بڑھیا
نے جواب دیا کہ ایسے کام حاجی ہی کیا کرتے ہیں۔ اب دیکھو
وہ عورت اُس سے واقف نہ تھی اور نہ اُسکی آنکھیں سلامت
تھیں مگر اُس نے پہچان لیا کہ ایسی سنگدلی حاجی میں ہی
پائی جاسکتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے پھر بھی عام طور پر
ہمارے ملک میں حاجیوں کو بڑا نیک سمجھا جاتا ہے۔ لیکن
عرب میں جاؤ تو وہ لوگ حج کو نیکی قرار نہیں دینگے۔ بلکہ ان
میں نیکی سخاوت کو سمجھا جائیگا۔ وہ لوگ اگر کسی کی نیکی
کی تعریف کرینگے تو کہینگے کہ فلاں شخص بڑا نیک ہے
کیونکہ بڑا سخی ہے۔ اسی طرح اب یورپ میں اسلام پھیلے تو وہاں
روزے کو بڑی نیکی سمجھا جائیگا کیونکہ وہ لوگ کثرت سے
کھانے پینے والے ہیں۔ پس جب اُنکو کھانے پینے سے رُکنا
پڑے گا تو وہ حج اور زکوٰۃ اور نماز وغیرہ احکام شرعی کی
بجاآوری کو اعلیٰ نیکی قرار دینے کی بجائے صرف روزہ رکھنے کو
سب سے بڑی نیکی قرار دینگے۔ پھر ہمارے ملک میں یہ بھی بڑی
نیکی خیال کی جاتی ہے کہ کوئی شخص نماز کا پابند ہو۔ ایسے
شخص کے متعلق بھی لوگ کہتے ہیں کہ بڑا نیک ہے کیونکہ نماز کا
پابند ہے۔ لیکن صحابہؓ کے نزدیک کسی شخص کی نیکی کا معیار
محض پابندیٔ نماز نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ نیکی کے اس اعلیٰ مقام
پر کھڑے تھے جہاں صرف پابندیٔ نماز کو بڑی نیکی قرار دینا
ایسی ہی بات تھی جیسے کہا جائے فلاں شخص بڑا بہادر ہے
کیونکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا ہے یا فلاں شخص بڑا
تیز نظر ہے کیونکہ اُس کی ماں جو اس کے پاس بیٹھی تھی اُسے
اُس نے پہچان لیا ہے۔ یا فلاں شخص کا معدہ بڑا ہی مضبوط
ہے کیونکہ اس نے ایک چنا ہضم کر لیا۔ پس جیسا کہ بہادری
تیز نظری اور مضبوطیٔ معدہ کے یہ معیار نہایت مضحکہ خیز
ہیں اسی طرح صحابہؓ کے نزدیک کسی شخص کی نیکی کا معیار
محض پابندیٔ نماز مضحکہ خیز تھا۔ کیونکہ وہ لوگ دین کے لئے
بڑی بڑی قربانیاں اور سخت آزمائشوں کو نیکی سمجھتے تھے اور
جس شخص میں یہ باتیں زیادہ پاتے تھے اُس کو نیک سمجھتے تھے
پس نیک اور نیکی کی تعریف ہر زمانہ ہر ملک اور ہر قوم میں
جُدا جُدا اور مختلف رہی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے کہ مشرق اور مغرب کی طرف مُنہ پھیرنا کوئی نیکی نہیں۔ اگر
کوئی شخص قبلہ کی طرف مُنہ کرکے نماز پڑھتا ہے اور اُس کی نماز
میں اخلاص نہیں جو حقیقی نماز میں ہوتا ہے تو اُسے قبلہ
کی طرف مُنہ کرکے بھی کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ نیکی مُنہ
کے کسی طرف پھیر لینے کا نام نہیں۔ بلکہ نیکی نام ہے اُس
کیفیت کا جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے اور ظاہری حرکات

اُسی کیفیت کا ایک نشان ہیں۔ پس اگر ان ظاہری حرکات میں وہ چیز نہیں جس کا دل سے تعلق ہے تو یہ ظاہری حرکات کچھ چیز نہیں۔ محض قبلہ کی طرف رُخ کرنا یا نماز پڑھنا یا روزہ رکھنا یا حج کرنا یہ تمام باتیں دلی کیفیت نہ ہونے کے باعث ہیچ ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ وہ ہتھیار ہیں جو بغیر اس قلبی کیفیت کے گند اور ناکارہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک شخص کے پاس تلوار تو ہو مگر گند ہو یا ہتھیار تو ہوں مگر زنگ خوردہ ہوں پس جس طرح ہتھیاروں کی قیمت اُن کی تیزی اور صفائی سے وابستہ ہے اسی طرح ان اعمال کی قدر و قیمت خدا تعالیٰ کی نظر میں اُسی وقت ہوتی ہے جبکہ اُن کے ذریعے خدا تعالیٰ کی رضا جوئی مقصود ہو۔

اِس آیت میں نیکی کی علامات بیان کی گئی ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک حقیقی نیکی کیا چیز ہے فرماتا ہے مشرق و مغرب کی طرف مُنہ کرنا نیکی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اخلاص اور سوز و گداز کی کیفیت بھی ہونی چاہیئے اگر اس کے نتیجہ میں دُعاؤں اور ذکرِ الٰہی کی عادت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی مخلوق سے ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اس کے نتیجہ میں یتیموں اور غریبوں اور بیکسوں کی محبت ترقی نہیں کرتی تو محض مشرق و مغرب کی طرف مُنہ کر لینا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مشرق و مغرب کی طرف مُنہ پھیرنے کا اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ چند رکوع قبل اِس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (آیت ۱۱۶) یعنی اے مسلمانو! بے شک آج تم کمزور سمجھے جاتے ہو لیکن یاد رکھو مشرق و مغرب سب اللہ کا ہی ہے۔ ہم ایک دن ان لوگوں سے حکومت چھین کر تمہیں مشرق و مغرب کا حکمران بنا دینگے۔ اور تم جس طرف بھی اپنے لشکر لیکر نکلو گے تم اللہ کے وجود کو جلوہ گر پاؤ گے۔ یعنی قدم قدم پر تمہیں فتوحات نصیب ہونگی اور قدم قدم پر خدا تعالیٰ تمہارے لئے اپنے نشانات ظاہر فرمائیگا۔ پس چونکہ مسلمانوں کی دنیوی فتوحات کی پہلے پیشگوئی کی جا چکی ہے جس کے مطابق انہوں نے مشرق و مغرب کا حکمران بننا تھا۔ اور جب کسی قوم کو دنیوی فتوحات حاصل ہو جائیں تو اس بات کا شدید خطرہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں دنیا کی طرف ہی نہ جھک جائے اور خدا تعالیٰ سے مخلصانہ تعلق جو اُس کی فتوحات کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے اس کو نظر انداز نہ کر دے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے اِس آیت میں مسلمانوں کو اُن کی اعتقادی اور عملی اصلاح کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ یعنی کامل نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق و مغرب کے ملکوں پر اپنا تسلّط جما لو اور فتوحات پر فتوحات حاصل کرتے چلے جاؤ۔ بیشک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا بھاری انعام ہے مگر کامل نیکی صرف مادی فتوحات کا نام نہیں بلکہ نام ہے اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر اور ملائکہ پر اور قرآن کریم پر اور تمام نبیوں پر سچے دل سے ایمان لانیکا اور کامل نیکی نام ہے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں اور غلاموں کی آزادی کیلئے اپنے اموال خرچ کرنے کا۔ اسی طرح کامل نیکی نام ہے نمازیں قائم کرنیکا اور زکوٰۃ دینے کا اور اپنے عہدوں کو پورا کرنے کا۔ اور مالی مشکلات اور بیماریوں اور جنگ میں صبر اور استقامت سے کام لینے کا۔ پس بے شک دنیوی فتوحات بھی حاصل کرو مگر اس بات کو مت بھولو کہ صرف ملکوں پر غلبہ حاصل کرنا تمہارا مقصود نہیں بلکہ تمہارا مقصد اللہ تعالیٰ سے کامل تعلق پیدا کرنا اور اس کی مخلوق کی سچی خدمت کرنا ہے اور یہی وہ غرض ہے جو ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے رہنی چاہیئے

اِس کے بعد فرماتا ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اِس حصّۂ آیت کا لفظی ترجمہ یہ بنتا ہے کہ "نیکی وہ ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا" لیکن ظاہر ہے کہ یہ معنے درست نہیں۔ اَلْبِرَّ اسم ہے اور اس کے بعد ایسی خبر آنی چاہیئے جو اس کے مطابق ہو۔ لیکن مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اس کے مطابق نہیں۔ اِس لئے یہاں بعض الفاظ محذوف سمجھے جائیں گے۔ چنانچہ نحویوں نے اِس کی تین توجیہات کی ہیں۔ اوّل مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں مَنْ سے پہلے بِرٌّ کا لفظ محذوف ہے۔ اور اصل عبارت یوں ہے کہ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ یعنی کامل نیکی تو اس شخص کی نیکی ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر سچے دل سے ایمان لایا۔ عربی زبان میں بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ مضاف کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسے سورۂ یوسف میں آتا ہے وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ اس کے لفظی معنے یہ ہیں کہ بستی سے پوچھو۔ حالانکہ بستی سے کوئی نہیں پوچھا کرتا بلکہ بستی والوں سے پوچھا کرتا ہے۔ پس جس طرح وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ سے مراد وَاسْئَلْ اَهْلَ الْقَرْيَةِ ہے اور اس جملہ میں اهل کا لفظ محذوف ہے۔ اِسی طرح مَنْ اٰمَنَ سے پہلے بِرٌّ کا لفظ محذوف ہے (سیبویہ جلد اوّل ص۱۰۸)

دوسری صورت یہ ہے کہ اَلْبِرَّ کو مصدر سمجھ کر اس کے معنے اسم فاعل کے کئے جائیں اور عبارت کا مفہوم یہ نکالا جائے کہ وَلٰكِنَّ الْبَارَّ مَنْ اٰمَنَ یعنی بڑا نیک اور محمد رسول اللہ کا کامل متبع وہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر اور کتب سماویہ پر اور سارے نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور اپنے مال کو باوجود تنگی کے اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے غریبوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے

تیسری صورت یہ ہے کہ اَلْبِرَّ کے لفظ سے پہلے ذُوْ کا کلمہ محذوف سمجھا جائے اور عبارت یوں ہو کہ وَلٰكِنَّ ذَا الْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ یعنی کامل نیکی رکھنے والا وہ شخص ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ گویا اس آیت کے مفہوم کو تین صورتیں واضح کرتی ہیں اور آیت کے اگلے حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں صورتیں ہی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہیں۔ کیونکہ اس آیت کے بعد وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ کے الفاظ آتے ہیں۔ اور اَلْمُوْفُوْنَ حالتِ رفع میں ہے اور اَلصّٰبِرِيْنَ حالتِ نصب میں۔ اگر اَلْبَارَّ مَنْ اٰمَنَ یا ذَا الْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ والی ترکیب صحیح سمجھی جائے تو اَلْمُوْفُوْنَ مرفوع نہیں آسکتا۔ اور اگر بِرُّ مَنْ اٰمَنَ صحیح سمجھا جائے تو اَلصّٰبِرِيْنَ حالتِ نصبی میں استعمال نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت دو مختلف کلمات کو دو صورتوں میں استعمال کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ یہاں تینوں صورتیں ترکیب کے لحاظ سے درست ہیں اور تینوں معنے ہی خدا تعالیٰ کے منشا کے مطابق ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیکی کے لئے پہلی شرط جو کسی صورت میں بھی بدل نہیں سکتی یہ ہے کہ انسان کو ایمان باللہ حاصل ہو۔ کبھی کوئی زمانہ ایسا نہیں آسکتا جس میں یہ کہا جا سکے کہ ایمان باللہ کی اب ضرورت نہیں رہی۔ دوسرے یوم آخرت پر ایمان ہو۔ یہ حکم بھی کبھی نہیں بدل سکتا۔ تیسرے ملائکہ پر ایمان ہو یہ صداقت بھی ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور چلی جائیگی۔ چہارم کتاب یعنی وحیٔ الٰہی پر ایمان ہو۔ الکتٰب کا لفظ اللہ تعالیٰ نے واحد رکھا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ کسی ایک کتاب پر بھی ایمان لانا کافی ہے بلکہ الکتاب سے مراد یہ ہے کہ وہ ساری وحیٔ الٰہی پر ایمان لانے والا ہو۔ خواہ کسی پہلے زمانہ میں نازل ہو چکی ہو۔ یا آئندہ نازل ہو۔ پنجم اُسے نبیوں پر ایمان ہو۔ یہ پانچوں نیکیاں ایسی ہیں جن کے بغیر کبھی کوئی شخص رُوحانیت کا ادنیٰ سے ادنیٰ مقام بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اعمال کی طرف توجہ کی ہے اور سب سے پہلے مال خرچ کرنے کا ذکر فرمایا ہے مگر اس کے لئے بھی صرف اٰتَى الْمَالَ نہیں فرمایا کیونکہ اگر انسان ناجائز طور پر مال خرچ کر دے تو یہ نیکی نہیں بلکہ بدی ہے۔ اسلئے اٰتَى الْمَالَ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے عَلٰى حُبِّهٖ رکھا اور حُبِّهٖ کی ضمیر مال کی طرف جا سکتی ہے اور اِیتَآءِ مال کی طرف بھی جا سکتی ہے اور اُس شخص کی طرف بھی جا سکتی ہے جسے مال دیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ پہلی صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّ الْمَالِ یعنی باوجود مال کی محبت کے وہ اُسے خدا تعالیٰ کی راہ

میں خرچ کرے۔ دوسری صورت میں اِس کے یہ معنے ہیں کہ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّ اِیْتَاءِ الْمَالِ۔ یعنی وہ اپنا مال چٹّی سمجھ کر نہ دے بلکہ اُسے صدقہ و خیرات دینے کا شوق ہو۔ اور وہ اس نیکی میں ایک لذّت محسوس کرتے ہوئے اپنا مال پیش کرے۔ تیسری صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ جسے مال دے اُسے ذلیل سمجھ کر نہ دے بلکہ اپنا بھائی سمجھ کر دے۔ اِسی طرح اُس کی عادات بگاڑنے کے لئے نہ دے بلکہ اِس لئے دے کہ وہ اُسے اچھے کاموں میں لگائے۔ اور ترقی کرے۔ چوتھی صورت میں اِس کے یہ معنے ہیں کہ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّ اللّٰهِ وہ اللہ کی رضا اور اُس کی محبت کے حصول کے لئے مال دے کوئی دنیوی مفاد یا شہرت اس کے پیچھے کام نہ کر رہی ہو۔ اِن چار شرائط کے ساتھ مال خرچ کرنا کبھی ناپسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ یا یوں سمجھ لو کہ یہ مال خرچ کرنے کے چار مدارج ہیں پہلا درجہ ادنیٰ ہے جس کی طرف قریب کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ دوسرا درجہ اس سے اعلیٰ ہے۔ تیسرا درجہ اس سے بھی اعلیٰ ہے اور چوتھا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے دل میں مال کی محبت ہو اور پھر بھی وہ اُسے خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ نیک کاموں میں روپیہ خرچ کرنے کی اُسے عادت ہو گئی ہو اور اس کا مزہ اُس نے چکھا ہوا ہو جس کی وجہ سے وہ خود دلی شوق اور محبت سے اِس قسم کی نیکیوں کی تلاش میں رہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ جسے مال دیا جائے اُسے اپنا بھائی سمجھ کر دیا جائے تاکہ وہ اُسے اچھے کاموں میں لگائے اور ترقی کرے۔ لیکن پھر اس سے بھی اوپر ایک اَور درجہ ہے اور وہ یہ کہ اُس کے اِس اِنفاق میں خالص اللہ تعالیٰ کی محبت کام کر رہی ہو۔ وہ اِس وجہ سے مال خرچ نہ کرے کہ اُسے مال خرچ کرنے کی عادت ہو چکی ہے یا اُسے اپنے غریب بھائیوں سے محبت ہے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی محبّت اور اُس کی رضا اُس کے پیشِ نظر ہو اور اُس کی خوشنودی کے حصول کے لئے وہ دوسروں سے حسنِ سلوک کرے۔ یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اور اسے صوفیاء نے اتنا بڑھایا ہے کہ اُن میں سے بعض نے یہاں تک کہا ہے کہ ہمیں نہ جنّت کی ضرورت ہے نہ دوزخ کی بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی ضرورت ہے۔ اگر خدا تعالیٰ دوزخ میں پڑنے سے ملتا ہو تو ہم اس میں بھی جانے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بہت بلند مقام ہے۔ کیونکہ اس مقام پر سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی چیز انسان کے سامنے نہیں رہتی صرف خدا ہی خدا رہ جاتا ہے اور اس کا حُسن انسان پر اس قدر مستولی ہو جاتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور چیز اُسے نظر ہی نہیں آتی۔

اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ خدا کی محبت کے لئے کہاں خرچ کرے۔ سو اس کی تشریح بھی کر دی اور بتایا کہ (۱) وہ قرابت والوں کو دے اس لئے کہ انسان پر اُن کا بڑا حق ہوتا ہے۔ مثلاً ماں باپ ہیں جو بچوں کی پرورش اور ان کی نگہداشت کے لئے اتنی بڑی قربانیاں کرتے ہیں جن کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ اِسی طرح دوسرے رشتہ دار اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ اگر وہ حاجت مند ہوں تو اُن کی امداد کی جائے اور اُن کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ (۲) پھر فرمایا کہ وہ یتامیٰ کو دے چونکہ اُن کی خبرگیری کرنیوالا کوئی نہیں ہوتا اِس لئے اُن کے حقوق کو مدّنظر رکھنے کی تعلیم دی (۳) تیسرے نمبر پر مساکین کو رکھا جن کے پاس اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مال بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال بھی دراز نہیں کرتے۔ گویا وہ اس آیت کے مصداق ہوتے ہیں کہ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ وہ غربت کے باوجود اپنے اندر اخلاقی بلندی رکھتے ہیں اور اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے دوسروں سے مانگنے کی ذلت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ (۴) چوتھے نمبر پر مسافر کو رکھا۔ اِس کے لئے اللہ تعالیٰ نے غربت کی شرط نہیں لگائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں غریب مسافروں کی امداد کرنا ضروری ہوتا ہے وہاں اگر کسی آسودہ حال مسافر

کی مدد کرنی پڑے تو اُس سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ممکن ہے وہ مالدار تو ہو مگر راستہ میں اس کا مال ضائع ہو گیا ہو۔ اگر ایسا ہو تو بطور حق بھی لے سکتا ہے اور کوئی چیز گرو رکھ کر بھی اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ اسی طرح حکومت کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ ملکی اور غیر ملکی مسافروں اور سیاحوں کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور اُن کی مشکلات کو دُور کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد پانچویں نمبر پر سائل کو رکھا۔ اس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ غریب اور مفلس ہے تو اُسے ابن السبیل کے بعد کیوں رکھا ہے سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے سوال کرنا پسندیدہ قرار نہیں دیا بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ جس شخص کے پاس ایک وقت کا کھانا ہے اور پھر بھی وہ سوال کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایک سائل کو دیکھا جس کی جھولی آٹے سے بھری ہوئی تھی اور پھر بھی وہ لوگوں سے مانگتا پھرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور آپ نے اُس سے آٹا چھین کر اونٹوں کے آگے ڈال دیا اور فرمایا۔ اب مانگ۔ آپ کی اس سے غرض یہ تھی کہ وہ لوگوں کے لئے بار نہ بنے بلکہ خود کام کرے اور دوسروں سے مانگ کر کھانے کی ذلّت سے بچے۔ پس چونکہ اسلام نے مانگ کر کھانا ناپسند کیا ہے اس لئے یہ بتانے کے لئے کہ سوال کرنا ایک ناپسندیدہ امر ہے سائل کو سب سے آخر میں رکھا۔ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق پیدا ہوں اور بجائے اس کے کہ لوگ سوال کرتے پھریں۔ وہ خود لوگوں کی ضروریات کا پتہ لگا کر اُن کو پورا کیا کریں تاکہ اُن کے لئے سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

وَفِي الرِّقَابِ ۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں پر روپیہ خرچ کرنے کا ذکر کیا ہے جو قید میں پڑے ہوئے ہوں۔ اِس جملہ میں ایک مضاف محذوف ہے جو فَكِّ کا لفظ ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے کہ وَفِي فَكِّ الرِّقَابِ۔ اس گروہ کو پیچھے رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں زیادہ تر غیر مذاہب کے ہی قیدی ہو سکتے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ اقرب کا حق دوسروں سے مقدم ہوتا ہے۔ ابن السبیل کو تو مہمان کے طور پر رکھا ہے کہ خواہ وہ کافر ہو اُسے بھی دو۔ مگر قیدی تو ایسے ہی لوگ ہونگے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑائی کے لئے آئے ہونگے۔ اس لئے فِي الرِّقَابِ کو بعد میں رکھا۔ لیکن یہ بھی اسلام کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وہ اُسی شخص کے متعلق جو مسلمانوں کو مارنے کے لئے آیا تھا کہتا ہے کہ اسے روپیہ دے کر آزاد کرا دو۔ اسی طرح فِي الرِّقَابِ میں قرضدار اور ضامن کو امداد دینا بھی شامل ہے۔ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہر قسم کے صدقات دیئے لیکن غلام آزاد کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں جب حج کے لئے مکہ گیا تو آپ نے مجھے فرمایا کہ اگر سو دو سو روپیہ میں کوئی غلام مل جائے تو میری طرف سے آزاد کر دینا۔ مگر مجھے کوئی غلام نہ ملا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی بھی توفیق عطا فرما دی۔ چنانچہ مرزا محمد اشرف صاحب محاسب صدر انجمن احمدیہ کی روایت ہے کہ حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ نے دو غلام آزاد کروا دیئے تھے۔

پھر فرماتا ہے وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ کامل نیک وہ شخص ہے جس نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ دی۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے وسیع معنے ہیں۔ مگر شریعت نے ان کو اپنی ایک مخصوص اصطلاح بھی بنا لیا ہے۔ اس جگہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے اصطلاحی نماز اور زکوٰۃ ہی مراد ہے۔ جن میں سے ایک خدا اور انسان کے تعلقات کو استوار کرتی اور دوسری انسان اور انسان کے باہمی تعلقات میں رابطہ قائم کرتی ہے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ صرف مال خرچ کرنے سے تم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں کر سکتے بلکہ تمہارے لئے یہ بھی

ضروری ہے کہ تم نمازیں قائم کرو۔ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ گویا حقوق اللہ
اور حقوق العباد کو جب تک ایک منظم رنگ میں ادا نہ کیا جائے
اُس وقت تک انسان نیکی کا اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا
وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ ۔ نیکی اور تقویٰ کا اعلیٰ
مقام جن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے ان کی ایک علامت یہ بھی
ہوتی ہے کہ وہ معاہدات کی پابندی کرتے ہیں اور اگر لوگ اُن پر
سختی کریں یا ظلم سے کام لیں تو وہ صبر سے کام لیتے ہیں۔ گویا
ایک طرف تو وہ اسلامی تمدن کو قائم کرنے کی پوری کوشش
کرتے ہیں اور کبھی بدعہدی یا دھوکا بازی سے کام نہیں لیتے
اور دوسری طرف اگر مذہبی قومی اور ملکی ضروریات کے لئے انہیں
سختیاں بھی برداشت کرنی پڑیں تو وہ استقلال کے ساتھ
ان کو برداشت کرتے ہیں اور استقامت کا اعلیٰ نمونہ دکھاتے
ہیں۔ اس جگہ عہد سے مراد صرف زبانی عہد ہی نہیں بلکہ تمدن
سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مسائل بھی اس میں شامل
ہیں۔ کیونکہ تمدن دنیا میں ایک دوسرے کے حقوق کی اسی
رنگ میں حفاظت ہوتی ہے کہ ہر شخص سے یہ امید کی جاتی
ہے کہ وہ اپنے دائرہ سے تجاوز نہ کرے اور دوسروں کے حقوق
کو سلب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اور جب وہ ایسا کرتے
ہیں تو تمدن کو قائم کرنے والے سمجھے جاتے ہیں اور اگر اس کے
خلاف عمل کریں تو فتنہ و فساد پیدا کرنے والے قرار پاتے
ہیں۔ اسلام چونکہ صلح و آشتی اور محبت کی فضا پیدا کرنا
چاہتا ہے اس لئے اُس نے کامل الایمان لوگوں کی یہ علامت
بیان فرمائی ہے کہ وہ معاہدات کی سختی سے پابندی کرتے
ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بتایا کہ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ۔ وہ فقر و فاقہ اور تنگیوں میں بھی صبر سے کام لیتے
ہیں اور جسمانی دکھوں اور مصائب میں بھی صبر کام لیتے ہیں۔ اس جگہ اَلْبَاْسَآءِ سے
مالی مشکلات اور ضَرَّآءِ سے جسمانی مشکلات اور امراض وغیرہ
مراد ہیں۔ اور بَاْس سے شدتِ حرب مراد ہے۔ گویا
ادنیٰ سے اعلیٰ ابتلاؤں کی طرف ترقی کی ہے اور بتایا ہے کہ
وہ کسی حالت میں بھی صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔
یہ لڑائیاں جن کا اس جگہ ذکر کیا گیا ہے دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ ایک
وہ جو بھائیوں بھائیوں میں ہوں اور دوسری وہ جو غیروں سے
ہوں۔ اگر آپس میں جھگڑا ہو تو وہ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ
الضَّرَّآءِ کے مطابق اپنے حقوق کو خود چھوڑنے کے لئے تیار
ہو جاتے ہیں اور پیچھے ہو کر چھوٹوں کا سا تذلل اختیار کرتے ہیں
لیکن اگر غیروں سے ہو تو وہ بھاگتے نہیں بلکہ دلیری کے ساتھ
اُن کا مقابلہ کرتے اور قیام امن کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ
تک بہا دیتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا۔ فرماتا ہے۔ یہی وہ لوگ
ہیں جنہوں نے صدق و وفا کا نمونہ دکھایا۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ مصائب اور دکھوں سے نجات پانے
والے ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت اس لئے بیان کی کہ انسان کو
سب سے زیادہ تکلیف اپنے حقوق کو پامال ہوتے دیکھ
کر ہوتی ہے۔ دوسرے سے حسن سلوک کو تو وہ احسان سمجھتا
ہے مگر جب کوئی شخص اُسے دکھ پہنچاتا ہے تو وہ اپنی ہتک
محسوس کرتا ہے۔ پس چونکہ یہ اُن کی غیر معمولی قربانی تھی کہ
انہوں نے خدا کے لئے دوسروں کے مظالم سہے اسلئے فرمایا
کہ ایسے لوگوں کو میں خصوصیت کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ یہ
سچے اور راستباز لوگ ہیں جو مجھ پر ایمان لائے ہیں۔ یعنی
انہوں نے اپنے ایمان کو عملی طور پر سچا کر کے دکھا دیا ہے۔
اور یہی وہ لوگ ہیں جو مصائب سے بچنے والے ہیں۔ کیونکہ
مصائب اگر آسمانی ہوں تو اُن کا علاج یہ ہوتا ہے کہ لوگ
خدا تعالیٰ پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت کریں۔ اور اگر
تمدنی مصائب ہوں تو ان کا علاج یہ ہوتا ہے کہ تمدنی
قوانین کو مدنظر رکھیں۔ اور یہ لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالےٰ
کے احکام پر بھی عمل کرنے والے ہیں اور تمدنی خرابیوں سے بھی
بچنے والے ہیں۔ پس یہ لوگ دنیا میں کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر مقتولوں کے بارہ میں برابر کا بدلہ لینا فرض کیا گیا ہے۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ

آزاد (قاتل) آزاد (مقتول) کے بدلہ میں۔ غلام (قاتل) غلام (مقتول) کے بدلہ میں۔ عورت (قاتل) عورت (مقتولہ) کے بدلہ میں (قصاص کی

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ

مستحق) ہے۔ جس (قاتل) کو اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (مقتول کا وارث بقیہ تاوان کو عرف) مناسب طور پر

وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

وصول کر سکتا ہے اور (قاتل پر) عمدگی کے ساتھ (بقیہ تاوان) اُس کو ادا کر دینا واجب ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور

وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

رحمت ہے۔ پھر جو شخص اس (حکم) کے بعد بھی زیادتی کرے اُس کے لئے دردناک عذاب (مقدر) ہے۔ ۹۲

جو قوم ذلیل یا ہلاک ہوگی وہ یا تو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر ہلاک ہوگی یا تمدنی قوانین کو نظر انداز کر کے اپنی ہلاکت مول لے گی۔

۹۲ حل لغات:- اَلْقِصَاصُ: اَنْ يُّفْعَلَ بِهٖ مِثْلَ مَا فَعَلَهٗ مِنْ قَتْلٍ اَوْ قَطْعٍ اَوْ ضَرْبٍ اَوْ جَرْحٍ (لسان) عربی زبان میں قصاص کے معنے یہ ہیں کہ کسی شخص سے وہی سلوک کیا جائے جو اُس نے قتل یا قطع یا ضرب یا زخم کرنے کی صورت میں دوسرے سے کیا ہے۔

تاج العروس میں لکھا ہے۔ اَلْقِصَاصُ اَلْقَتْلُ بِالْقَتْلِ وَالْجُرْحُ بِالْجُرْحِ کہ قصاص اس چیز کا نام ہے کہ قتل کے مقابلہ میں قتل اور زخم کے مقابلہ میں زخم کیا جائے۔

تَخْفِيْفٌ کے معنے (۱) سہولت اور (۲) معافی کے ہیں۔

تفسیر:- بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے قتل کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے صرف بائبل کے تتبع میں کیا ہے۔ خود اصولی رنگ میں اس بارہ میں کوئی ہدایت نہیں دی۔ اُن کے نزدیک یہودیوں کو جو یہ کہا گیا تھا کہ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (مائدہ آیت ۴۶) یعنی جان کے بدلہ میں جان۔ اور آنکھ کے بدلہ میں آنکھ۔ اور ناک کے بدلہ میں ناک۔ اور کان کے بدلہ میں کان اور دانت کے بدلہ میں دانت اور زخموں کے بدلہ میں زخم برابر کا بدلہ ہیں۔ اس حکم کو قرآن کریم نے اسجگہ دُہرا دیا ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ میرے نزدیک بنی نوع انسان کی مذہبی۔ سیاسی۔ تمدنی اور عائلی زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والا کوئی مسئلہ بھی ایسا نہیں جسے اسلام نے پوری وضاحت کے ساتھ بیان نہ کیا ہو۔ بیشک وہ پہلے مذاہب کی تعلیم کا بھی بعض مقامات پر ذکر کرتا ہے مگر نفس مسئلہ پر وہ پہلے خود روشنی ڈالتا ہے اور اس کے متعلق ایک جامع

اَلْمَآئِدَۃ

تَخْفِیْفٌ

اور کامل تعلیم لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ
غیر مذاہب والوں پر حجت تمام کرنے یا انہیں شرمندہ کرنے
کے لئے اُن کی تعلیموں کو بھی اُن کے سامنے پیش کرتا ہے۔
تاکہ اُن کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہو کہ مذہب کی طرف
اپنے آپ کو منسوب کرتے ہوئے انہوں نے اُس کے احکام
کو کس طرح پس پشت پھینک رکھا ہے۔ اسجگہ بھی قصاص
کی بنی نوع انسان کو جو تعلیم دی گئی ہے یہ یہودیوں کی
اتباع میں نہیں دی گئی بلکہ ان احکام کے سلسلہ میں دی گئی ہے
جو اکیسویں رکوع سے دئے جارہے ہیں۔ چنانچہ دیکھو پچھلی
آیات میں بتلایا گیا تھا کہ کامل الایمان لوگوں کی علامات یہ
ہوتی ہیں کہ وہ بَاْسَآءِ میں بھی صبر کرتے ہیں اور ضَرَّآءِ
میں بھی صبر کرتے ہیں اور حِیْنَ الْبَاْسِ بھی صبر کرتے ہیں یعنی
خواہ اُن پر مالی مشکلات آئیں اور فقر و فاقہ تک اُن کی نوبت
پہنچ جائے تب بھی وہ جادۂ استقامت پر قائم رہتے ہیں
اور خواہ جسمانی مشکلات آئیں اور بیماریاں اُنکو گھیر لیں تب
بھی وہ صبر کرتے ہیں۔ اور خواہ لڑائیوں میں مارے جائیں
تب بھی وہ دشمن سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اسپر سوال پیدا
ہوتا تھا کہ آخر یہ صبر کا سلسلہ کب تک چلیگا۔ کیا لوگ ہمیں
مارتے ہی چلے جائیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔ اور اگر ایسا
ہو تو ہماری زندگی کی کیا صورت ہوگی؟ اس لئے فرمایا۔ کہ
تمہارا کام تو یہی ہے کہ تم صبر کرو۔ لیکن کچھ اور لوگ جن کے
سپرد حکومت کا نظام کیا گیا ہے۔ اُن کا فرض ہے کہ ایسے
ظالموں سے بدلہ لیں۔ اور انہیں کیفر کردار تک پہنچائیں چنانچہ
كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى میں انہی لوگوں کو
مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ تم پر قصاص فرض کیا گیا
ہے اسجگہ "تم" سے صرف حکام مراد ہیں جو لاء
اینڈ آرڈر یعنی نظم و ضبط کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ عام لوگ
مراد نہیں۔ اور کُتِبَ کہہ کر بتایا ہے کہ حکام کا فرض ہے کہ
وہ قصاص لیں۔ حکام کو یہ اختیار نہیں کہ وہ معاف کر دیں۔
الصَّابِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ
میں تو عوام مخاطب تھے مگر كُتِبَ عَلَيْكُمُ میں صرف حکام
سے خطاب کیا گیا ہے کہ وہ قصاص لیں۔ اور فِي الْقَتْلٰى
کہہ کر تصریح کر دی گئی ہے کہ اس میں جروح شامل نہیں۔
اور درحقیقت یہی وہ آیت ہے جس میں قتل کی سزا کے متعلق
اسلامی تعلیم بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قتل کی سزا
قتل ہے۔ اور یہ عام حکم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فِي الْقَتْلٰى
فرمایا ہے کہ مقتولوں کے متعلق یہ حکم ہے یہ کوئی سوال نہیں کہ
وہ مقتول کون ہو۔ اور کس قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ اس
آیت کے سوا قتل عمد کی دنیوی سزا کا ذکر قرآن کریم کی کسی اور
آیت میں نہیں ہے۔ پس یہی آیت ہے جس پر اسلامی فقہ
کی بنیاد ہے۔ اور اس میں مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی
امتیاز نہیں کیا گیا۔ نہ اس میں یہ ذکر ہے کہ کس کس آلہ سے
قتل کرنے والے کی سزا قتل ہے بلکہ خواہ کسی آلہ سے کوئی
شخص قتل کرے اُس کو قتل کیا جائیگا۔ بلکہ حدیثوں سے
تو یہاں تک ثابت ہے کہ ایک قتل کے کیس میں بعض دفعہ
ایک سے زیادہ افراد کو بھی مارا گیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ
صنعاء میں ایک شخص کو کئی لوگوں نے مل کر قتل کر دیا۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب کو جو تعداد میں سات
تھے قتل کروا دیا۔ اور فرمایا کہ اگر سارا شہر قتل میں شریک
ہوتا تو میں سب کو قتل کرا دیتا۔ (طحاوی) اسی طرح حضرت
عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ
مُسْلِمٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ
اِلَّا بِاِحْدٰى ثَلَاثٍ اَلثَّيِّبُ الزَّانِيْ وَالنَّفْسُ
بِالنَّفْسِ وَالتَّارِكُ لِدِيْنِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ
(مسلم کتاب القصاص) یعنی صرف تین گناہ ایسے ہیں جن کی
بنا پر مسلمان کو قتل کرنا جائز ہے۔ اوّل شادی شدہ شخص
ہو اور پھر زنا کرے۔ دوم کوئی شخص قاتل ثابت ہو جائے۔
سوم۔ جو شخص اسلام کو چھوڑ کر جماعت مسلمہ سے الگ ہو جائے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہئیے کہ صحیح مسلم میں تو صرف یہی الفاظ بیان کئے گئے ہیں مگر نسائی میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ رَجُلٌ یَخْرُجُ مِنَ الْاِسْلَامِ یُحَارِبُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَرَسُوْلَهٗ فَیُقْتَلُ اَوْ یُصَلَّبُ اَوْ یُنْفٰی مِنَ الْاَرْضِ۔ (نسائی جلد ۲ کتاب تحریم الدم باب الصلب) یعنی وہ شخص جو اسلام کو چھوڑ کر مسلمانوں سے جنگ شروع کر دے۔ اُس کے متعلق جائز ہے کہ اُسے قتل کر دیا جائے یا صلیب پر لٹکا دیا جائے یا اُسے جلا وطن کر دیا جائے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ عورت مرد کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ جو بھی قتل کریگا اُسے قتل کیا جائیگا۔ اور جان کے بدلہ جان لی جائیگی اسی طرح مسند احمد بن حنبل۔ بخاری۔ نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ یَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی کافر معاہد کو مار دے وہ جنّت کی خوشبو نہیں سونگھیگا۔ اور یہی سزا قرآن کریم میں ایک مسلمان کے قاتل کی بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا۔ (نساء آیت ۹۴) یعنی جو شخص کسی مومن کو دیدہ دانستہ قتل کر دے اُس کی سزا جہنم ہوگی وہ اس میں دیر تک رہتا چلا جائیگا۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا اور اُسے اپنے قرب سے محروم کر دیگا اور اُس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کریگا۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ ابو جعفر طحاوی اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں لکھتے ہیں۔ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُتِیَ بِرَجُلٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ قَدْ قَتَلَ مُعَاهِدًا مِّنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ فَاَمَرَ بِهٖ فَضَرَبَ عُنُقَهٗ وَقَالَ اَنَا اَوْلٰی مَنْ وَفٰی بِذِمَّتِهٖ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مسلمان لایا گیا۔ جس نے ایک معاہد کافر کو جو اسلامی حکومت کی رعایا بن چکا تھا قتل کر دیا تھا۔ آپ نے اُس کے قتل کئے جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں عہد پورا کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ عہد کی نگہداشت رکھنے والا ہوں (نیل الاوطار جلد [illegible] صفحہ ۲۸۳)۔ اسی طرح طبرانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت روایت کی ہے کہ ایک مسلمان نے ایک ذمّی کو قتل کر دیا تو آپ نے اس مسلمان کے قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک حدیث میں آتا ہے۔ کہ لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ کہ کوئی مومن کسی کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائیگا۔ مگر ساری حدیث دیکھنے سے بات حل ہو جاتی ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ فِیْ عَهْدِهٖ۔ اس حدیث کا یہ دوسرا فقرہ کہ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ فِیْ عَهْدِهٖ اس کے معنوں کو حل کر دیتا ہے۔ اگر اس کے یہ معنے ہوں کہ کافر کے بدلہ میں مسلمان نہ مارا جائے تو پھر ذُوْ عَهْدٍ کے یہ معنے کرنے ہونگے کہ وَلَا ذُوْ عَهْدٍ بِکَافِرٍ کہ کسی ذو عہد کو بھی کافر کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے۔ حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ پس یہاں کافر سے مراد محارب کافر ہے نہ کہ عام کافر۔ تبھی فرمایا کہ ذمّی کافر بھی محارب کافر کے بدلہ میں نہیں مارا جائیگا۔

اب ہم صحابہؓ کا طریق عمل دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ بھی غیر مسلم کے مسلم قاتل کو قتل کی سزا ہی دیتے تھے چنانچہ طبری جلد ۵ صفحہ ۴۳ میں قماذبان ابن ہرمزان اپنے والد کے قتل کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ ہرمزان ایک ایرانی رئیس اور مجوسی المذہب تھا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے قتل کی سازش میں شریک ہونیکا شبہ اُس پر کیا گیا تھا۔ اس پر بلا تحقیق جوش میں آکر عبید اللہ بن عمرؓ نے اُن کو قتل کر دیا۔ وہ کہتا ہے۔ کَانَتِ الْعَجَمُ

بِالْمَدِيْنَةِ يَسْتَرُوْحُ بَعْضُهَا اِلٰى بَعْضٍ فَمَرَّ فَيْرُوْزُ بِاَبِيْ وَمَعَهُ خَنْجَرٌ لَهُ رَأْسَانِ فَتَنَاوَلَهُ مِنْهُ. وَ قَالَ مَا تَصْنَعُ بِهٰذَا فِيْ هٰذِهِ الْبِلَادِ فَقَالَ اَبُسُّ بِهٖ فَرَاٰهُ رَجُلٌ فَلَمَّا اُصِيْبَ عُمَرُ قَالَ رَاَيْتُ هٰذَا مَعَ الْهُرْمُزَانِ دَفَعَهُ اِلٰى فَيْرُوْزَ فَاَقْبَلَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَقَتَلَهُ فَلَمَّا وُلِّيَ عُثْمَانُ دَعَانِيْ فَاَمْكَنَنِيْ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ يَا بُنَيَّ هٰذَا قَاتِلُ اَبِيْكَ وَاَنْتَ اَوْلٰى بِهٖ مِنَّا فَاذْهَبْ فَاقْتُلْهُ فَخَرَجْتُ بِهٖ وَمَا فِي الْاَرْضِ اَحَدٌ اِلَّا مَعِيْ اِلَّا اَنَّهُمْ يَطْلُبُوْنَ اِلَيَّ فِيْهِ فَقُلْتُ لَهُمْ اَلِيْ قَتْلُهُ قَالُوْا نَعَمْ وَ سَبُّوْا عُبَيْدَ اللّٰهِ فَقُلْتُ اَفَلَكُمْ اَنْ تَمْنَعُوْهُ قَالُوْا لَا وَ سَبُّوْهُ فَتَرَكْتُهُ لِلّٰهِ وَلَهُمْ. فَاحْتَمَلُوْنِيْ فَوَاللّٰهِ مَا بَلَغْتُ الْمَنْزِلَ اِلَّا عَلٰى رُءُوْسِ الرِّجَالِ وَاَكُفِّهِمْ۔ اِس کا ترجمہ یہ ہے کہ ایرانی لوگ مدینہ میں ایک دوسرے سے ملے جُلے رہتے تھے (جیسا کہ قاعدہ ہے کہ دوسرے ملک میں جاکر وطنیت نمایاں ہو جاتی ہے) ایک دن فیروز (قاتلِ عمرؓ خلیفہ ثانی) میرے باپ سے ملا اور اُس کے پاس ایک خنجر تھا جو دونوں طرف سے تیز کیا ہُوا تھا۔ میرے باپ نے اس خنجر کو پکڑ لیا اور اس سے دریافت کیا کہ اِس ملک میں تو اِس خنجر سے کیا کام لیتا ہے (یعنی یہ ملک تو امن کا ملک ہے اِس میں ایسے ہتھیاروں کی کیا ضرورت ہے) اُس نے کہا کہ میں اس سے اونٹ ہنکانے کا کام لیتا ہوں۔ جب وہ دو تو آپس میں باتیں کر رہے تھے اُسوقت کسی نے اُنکو دیکھ لیا اور جب حضرت عمرؓ مارے گئے تو اُس نے بیان کیا کہ میں نے خود ہرمزان کو یہ خنجر فیروز کو پکڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اِس پر عبید اللہ (حضرت عمرؓ کے چھوٹے بیٹے) نے جاکر میرے باپ کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا اور عبید اللہ کو پکڑ کر میرے حوالے کر دیا۔ اور کہا کہ اے میرے بیٹے! یہ تیرے باپ کا قاتل ہے اور تو ہماری نسبت اس پر زیادہ حق رکھتا ہے۔ پس جا اور اس کو قتل کر دے۔ میں نے اُس کو پکڑ لیا اور شہر سے باہر نکلا۔ راستہ میں جو شخص مجھے ملتا میرے ساتھ ہو جاتا لیکن کوئی شخص مقابلہ نہ کرتا۔ وہ مجھ سے صرف اتنی درخواست کرتے تھے کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ پس میں نے سب مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا کہ کیا میرا حق ہے کہ میں اِسے قتل کر دوں۔ سب نے جواب دیا کہ ہاں تمہارا حق ہے کہ اِسے قتل کر دو اور عبید اللہ کو بھلا بُرا کہنے لگے کہ اس نے ایسا بُرا کام کیا ہے پھر میں نے دریافت کیا کہ کیا تم لوگوں کو حق ہے کہ اِسے مجھ سے چھڑا لو انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں اور پھر عبید اللہ کو بُرا بھلا کہا۔ کہ اِس نے بلا ثبوت اس کے باپ کو قتل کر دیا۔ اِس پر میں نے خدا اور ان لوگوں کی خاطر اس کو چھوڑ دیا۔ اور مسلمانوں نے فرطِ مسرت سے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور خدا تعالیٰ کی قسم میں اپنے گھر تک لوگوں کے سروں اور کندھوں پر پہنچا اور انہوں نے مجھے زمین پر قدم تک نہیں رکھنے دیا۔ اِس روایت سے ثابت ہے کہ صحابہؓ کا طریقِ عمل بھی یہی رہا ہے کہ [illegible] غیر مسلم کے مسلم قاتل کو سزائے قتل دیتے تھے۔ اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خواہ کسی ہتھیار سے کوئی شخص مارا جائے وہ مارا جائیگا۔ اِسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل کو گرفتار کرنے والی اور اس کو سزا دینے والی حکومت ہی ہے۔ کیونکہ اس روایت سے ظاہر ہے کہ عبید اللہ بن عمرؓ کو گرفتار بھی حضرت عثمانؓ نے کیا اور اس کو قتل کے لئے ہرمزان کے بیٹے کے سپرد بھی انہوں نے ہی کیا۔ نہ ہرمزان کے کسی وارث نے اُس پر مقدمہ چلایا اور نہ اُس نے گرفتار کیا۔

اسجگہ اس شبہ کا ازالہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کو سزا دینے کے لئے آیا مقتول کے وارثوں کے سپرد کرنا چاہیئے جیسا کہ حضرت عثمانؓ نے کیا یا خود حکومت کو سزا دینی چاہیئے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ

معاملہ ایک جزوی معاملہ ہے اسلئے اِسکو اسلام نے ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق عمل کرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ قوم اپنے تمدن اور حالات کے مطابق جس طریق کو زیادہ مفید دیکھے اختیار کر سکتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ دونوں طریق ہی خاص خاص حالات میں مفید ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى۔ آزاد آزاد کے بدلہ میں۔ غلام غلام کے بدلہ میں اور عورت عورت کے بدلہ میں قتل کی جائے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ آزاد مقتول کے بدلہ میں کسی آزاد کو ہی قتل کیا جائے خواہ اُس کا قاتل کوئی غلام ہی ہو۔ اور غلام مقتول کے بدلہ میں کسی غلام کو ہی قتل کیا جائے خواہ اس کا قاتل کوئی حُر ہو اور عورت مقتول کے بدلہ میں کسی عورت کو ہی قتل کیا جائے خواہ اس کا قاتل کوئی مرد ہو۔ کیونکہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی میں حکم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ درحقیقت یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور جملہ مستانفہ اس لئے آتا ہے کہ پہلے جملہ میں جو سوال مقدر ہو اس کو جدا کئے بغیر نئے جملہ میں جواب دیا جائے اور بغیر عطف کے اس کو بیان کیا جائے (شرح مختصر معانی مؤلفہ ابن یعقوب و بہاؤ الدین جلد ۳ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۴۲) اسجگہ بھی یہ جملہ ایک سوالِ مقدر کے جواب کیلئے لایا گیا ہے۔ اور اس میں عرب کی اُن رسوم کا قلع قمع کیا گیا ہے جو اُن میں عام طور پر رائج تھیں۔ اور وہ سوال مقدر یہ ہے کہ کیا اس حکم سے عرب کا پہلا طریق موقوف ہو جائیگا؟ سو فرمایا کہ ہاں اور اُس کی چند مثالیں بیان کر دیں کہ یہ سب موقوف ہیں۔ چنانچہ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى میں اُن کی صرف چند مثالیں بیان کی گئی ہیں نہ کہ کل رسوم۔ گویا ھَلُمَّ جَرًّا کی طرح کا یہ فقرہ ہے اور مراد یہ ہے کہ اس حکم کے ذریعہ وہ تمام امتیاز مٹا دیئے گئے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ عربوں میں بعض خاندانوں کو بڑا سمجھا جاتا تھا اور بعض کو چھوٹا۔ بعض کو آزاد سمجھا جاتا تھا اور بعض کو غلام۔ اور جب کسی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تو وہ لوگ یہ دیکھا کرتے تھے کہ آیا مجرم غلام ہے یا آزاد۔ اور اگر غلام ہے تو کسی بڑے آدمی کا غلام ہے یا چھوٹے کا۔ مرد ہے یا عورت اعلیٰ خاندان میں سے ہے یا ادنیٰ خاندان میں سے۔ امیر ہے یا غریب۔ اور سزا میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھا جاتا اور آزاد مردوں اور عورتوں کو وہ سزائیں نہ دی جاتیں جو غلام مردوں اور عورتوں کو دی جاتی تھیں۔ اسی طرح اعلیٰ خاندانوں کے افراد کو سزائیں نہیں دی جاتی تھیں جو ادنیٰ خاندانوں کے افراد کو دی جاتی تھیں۔ چونکہ اسلام نے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی میں یہ عام حکم دے دیا تھا کہ ہر ایک شخص جو قتل کیا جائے اُس کا قاتل لازماً قتل ہو خواہ عورت مرد کو مارے یا مرد عورت کو مارے۔ خواہ آزاد غلام کو مارے یا غلام آزاد کو مارے۔ خواہ ایک شخص کو جماعت مارے اور خواہ کافر معاہد کو مسلمان مارے اس لئے طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آئندہ قصاص کیا پہلے طریق پر بھی جو جاہلیت میں رائج تھا لیا جائیگا یا نہیں۔ سو اس کا جواب دیا کہ نہیں اور ہرگز نہیں۔ وہ امتیازات اب مٹائے جاتے ہیں۔ اور اس کیلئے صرف تین مثالیں دے دیں۔ باقی مثالیں اس نے چھوڑ دی ہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں قاعدہ ہے کہ اگر کسی جگہ تین مثالیں بیان ہوں تو اس جگہ ھَلُمَّ جَرًّا ساتھ مل جاتا ہے اور سب مثالیں انہی تین مثالوں میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ اسجگہ بھی تین مثالوں سے مراد ہر قسم کی مثال ہے۔ اور یہ ہدایت دی گئی ہے کہ خواہ قاتل حُر اور مقتول عبد ہو یا قاتل مرد اور مقتول عورت ہو یا قاتل عورت اور مقتول مرد ہو جو بھی قتل کرے اُسے قتل کی سزا دو۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ آپ نے ایک عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کیا (مسلم جلد ۲ کتاب القصاص و نیل الاوطار جلد ۶ صفحہ ۲۸۹) اسی طرح غلام کے بدلہ میں آزاد کے مارے جانیکا حکم دیا۔ جیسے سمرۃ ابن جندب کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا۔ کہ مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ وَمَنْ جَدَعَهٗ جَدَعْنَاهُ یعنی جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اُسے اس کے بدلہ میں قتل کریں گے اور جو شخص اپنے غلام کے ہاتھ پاؤں کاٹیگا۔ ہم اُس کے بدلہ میں اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے (ابن ماجہ ابواب الدیات باب ہل یقتل الحرّ بالعبد)

اس کے بعد فرماتا ہے۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ یعنی اگر کسی مقتول کے وارث کسی مصلحت کے ماتحت قاتل کو اُس کے جرم کا کچھ حصہ معاف کر دیں تو ان کو اختیار ہے۔

بعض لوگ اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ حکومت کو قاتل کے گرفتار کرنے یا اس کو سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں بلکہ یہ تمام اختیار مقتول کے ورثاء کو حاصل ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس جگہ صرف یہ بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء احسان کے طور پر قاتل کو معاف کر دیں تو حکومت کو اُن کی خواہش کا احترام کرنا چاہیئے اس حقِ معافی کے سوا رشتہ داروں کا کوئی تعلق قاتل کے ساتھ نہیں۔ قاتل کو گرفتار کرنا یا اُس پر مقدمہ چلانا حکومت ہی کا کام ہے۔ اور اُسی کے ذمہ ہے جیسا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى میں حکومت کے ذمہ دار افسران کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ قتل کے واقعات کی چھان بین کریں اور مجرم کو قرار واقعی سزا دلوائیں۔

اسلام نے مقتول کے وارثوں کو عفو کا جو اختیار دیا ہے اُس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بعض دفعہ نقصانات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو اُس کے وارث ہی قتل کروا دیں اور پھر قاتل کو معاف کر دیں۔ یہ شبہ ایک معقول شبہ ہے۔ مگر اسلام نے اس قسم کے خدشات کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ اور گو ایک طرف اُس نے دو مخالف خاندانوں میں صلح کرانے کے لئے عفو کی اجازت دی ہے مگر دوسری طرف ایسی ناجائز کارروائیوں کی بھی روک تھام کر دی ہے۔ چنانچہ عفو کے ساتھ اُس نے اصلاح کی شرط لگا دی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ عفو اُسی وقت جائز ہوتا ہے جب اس کے نتیجہ میں اصلاح کی اُمید ہو۔ اگر عفو باعثِ فساد ہے تو ایسا عفو ہرگز جائز نہیں۔ اور حکومت باوجود وارثوں کے عفو کر دینے کے اپنے طور پر سزا دے سکتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا ایک واقعہ جو طبری نے لکھا ہے بتاتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس احتیاط پر عمل ہوتا چلا آیا ہے وہ واقعہ اس طرح ہے کہ عدل بن عثمان بیان کرتے ہیں۔ رَأَيْتُ عَلِيًّا عَمَّ خَارِجًا مِنْ هَمْدَانَ فَرَاٰى فِئَتَيْنِ يَقْتَتِلَانِ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا ثُمَّ مَضٰى فَسَمِعَ صَوْتًا يَا غَوْثًا بِاللّٰهِ فَخَرَجَ يَحُضُّ نَحْوَهٗ حَتّٰى سَمِعْتُ خَفْقَ نَعْلِهٖ وَهُوَ يَقُوْلُ اَتَاكَ الْغَوْثُ فَاِذَا رَجُلٌ يُلَازِمُ رَجُلًا فَقَالَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِعْتُ مِنْ هٰذَا ثَوْبًا بِتِسْعَةِ دَرَاهِمَ وَشَرَطْتُ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يُعْطِيَنِيْ مَغْمُوْزًا وَلَا مَقْطُوْعًا وَكَانَ شَرْطُهُمْ يَوْمَئِذٍ فَاَتَيْتُهٗ بِهٰذِهِ الدَّرَاهِمِ لِيُبَدِّلَهَا لِيْ فَاَبٰى فَلَزِمْتُهٗ فَلَطَمَنِيْ فَقَالَ اَبْدِلْهُ فَقَالَ بَيِّنَتَكَ عَلَى اللَّطْمَةِ فَاَتَاهُ بِالْبَيِّنَةِ فَاَقْعَدَهٗ ثُمَّ قَالَ دُوْنَكَ فَاقْتَصَّ فَقَالَ اِنِّيْ قَدْ عَفَوْتُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ اِنَّمَا اَرَدْتُّ اَنْ اَحْتَاطَ فِيْ حَقِّكَ ثُمَّ ضَرَبَ الرَّجُلَ تِسْعَ دُرَّاتٍ وَقَالَ هٰذَا حَقُّ السُّلْطَانِ۔ یعنی میں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمدان سے باہر مقیم تھے کہ اسی اثناء میں آپ نے دو گروہوں کو آپس میں لڑتے ہوئے دیکھا۔ اور آپ نے اُن میں صلح کرا دی لیکن ابھی تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ آپ کو کسی شخص کی آواز آئی۔ کہ کوئی خدا کے لئے مدد کو آئے۔ پس آپ تیزی سے اُس آواز کی طرف دوڑے حتّٰی کہ آپ کے جوتوں کی آواز بھی آ رہی تھی اور آپ کہتے چلے جاتے تھے کہ "مدد آگئی مدد آگئی"۔ جب آپ اُس جگہ کے قریب پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی دوسرے سے لپٹا ہوا ہے۔ جب اُس نے آپ کو دیکھا تو عرض کیا کہ اے امیر المومنین! میں نے اس شخص کے پاس ایک کپڑا نو درہم کو بیچا تھا اور شرط یہ تھی کہ کوئی روپیہ مشکوک یا کٹا ہوا نہ ہو۔

اور اس نے اس کو منظور کر لیا تھا۔ لیکن آج جو مَیں اس کو بعض ناقص روپے دینے کے لئے آیا۔ تو اُس نے بدلنے سے انکار کر دیا۔ جب مَیں پیچھے پڑا تو اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ آپ نے مشتری سے کہا کہ اِس کو روپے بدل دے۔ پھر دوسرے شخص سے کہا کہ تھپڑ مارنے کا ثبوت پیش کر۔ جب اُس نے ثبوت دے دیا تو آپ نے مارنے والے کو بٹھا دیا اور اُسے کہا کہ اس سے بدلہ لے۔ اُس نے کہا۔ اے امیرالمومنین! مَیں نے اِس کو معاف کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ تُو نے تو اِس کو معاف کر دیا مگر مَیں چاہتا ہوں کہ تیرے حق میں احتیاط سے کام لوں۔ معلوم ہوتا ہے وہ شخص سادہ تھا اور اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اور پھر اس شخص کو سات کوڑے مارے اور فرمایا۔ اِس شخص نے تو تجھے معاف کر دیا تھا۔ مگر یہ سزا حکومت کی طرف سے ہے۔

غرض اسلام نے مظلوم کو یا بصورت مقتول اُس کے ورثاء کو مجرم کا جرم معاف کر دینے کی تو اجازت دی ہے مگر ساتھ ہی حکومت کو بھی اختیار دیا ہے کہ اگر وہ یہ محسوس کرے کہ مظلوم کم فہم ہے یا ظالم کو معاف کر دینے سے اُس کی دلیری اور شوخی اور بھی بڑھ جائیگی یا مقتول کے ولی اپنے نفع نقصان کو یا پبلک کے نفع نقصان کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا خود شریک جرم ہیں تو اُس صورت میں باوجود اُن کے معاف کر دینے کے خود مجرم کو سزا دے اور اس سے بہتر اور کونسی تجویز دنیا میں امن اور صلح کے قیام کی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک طرف مجرموں کو معاف کر دینے سے خطرات بڑھ جاتے ہیں تو دوسری طرف ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص جرم تو کر لیتا ہے مگر بعد میں وہ خود بھی سخت پشیمان ہوتا ہے اور اُس کے رشتہ داروں کی بھی ایسی نازک حالت ہوتی ہے کہ رحم کا تقاضا ہوتا ہے کہ اُسے چھوڑ دیا جائے۔ اور خود جن لوگوں کے خلاف وہ جرم ہوتا ہے وہ بھی یا اُن کے ولی بھی چاہتے ہیں کہ اُس سے درگذر کریں۔ ایسی صورت میں دونوں کے تقاضا کو پورا کرنے کیلئے موجودہ تمدن نے کوئی علاج نہیں رکھا۔ صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے تیرہ سو سال پہلے سے ساتویں صدی کے تاریک تمدن میں ایسے اعلیٰ درجہ کے تمدن کی بنیاد رکھی جس کی نظیر بیسویں صدی کا دانا مدبّر بھی پیش نہیں کر سکتا۔ لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے عفو سے کام لینا حاکم کا کام نہیں بلکہ مقتول کے اولیاء اور ورثاء کا کام ہے۔ ہاں اگر حاکم مجاز دیکھے کہ عفو اپنے اندر مضرّات کے بعض پہلو رکھتا ہے تو وہ معافی کو کالعدم بھی قرار دے سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کے واقعہ سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ لیکن اگر وہ شخص جسکا حق ہے قصاص سے معاف نہ کرنا چاہے تو حکّام کا فرض ہے کہ وہ لازماً قصاص لیں۔ مِنْ اَخِيْهِ کہکر اِس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بعض اوقات دشمنی اور عداوت اور بُغض سے قتل نہیں ہوتا بلکہ کسی وقتی جوش اور اشتعال کے نتیجہ میں بھی قتل ہو جاتا ہے اس لئے اَخِيْ کہہ کر قاتل کے لئے رحم کی تحریک کر دی کہ آخر وہ تمہارا بھائی ہے۔ اگر اُس سے نادانستہ طور پر غلطی ہو گئی ہے تو تم جانے دو۔ اور اُسے معاف کر دو۔ اِدھر قاتل کو بھی شرمندہ کیا کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو نے اپنے بھائی کو قتل کیا ہے۔

شَيْءٌ اِسجگہ نکرہ کے طور پر استعمال ہُوا ہے۔ اور عربی زبان میں نکرہ تعظیم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور تحقیر کے لئے بھی۔ پس فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ سے مراد کُلّی معافی بھی ہو سکتی ہے اور جُزوی بھی یعنی قتل نہ کرنا اور دیت لے لینا یا دیت میں بھی کمی کر دینا جائز ہے اور قتل نہ کرنا اور دیت بھی نہ لینا جائز ہے۔ دونوں صورتوں میں سے جو بھی کوئی چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اور اگر بعض ورثاء معاف کر دیں اور بعض نہ کریں تو قاتل کو قتل کی سزا نہیں دی جائیگی۔ جیسے مقتول کے دو بیٹے ہوں۔ اُن میں سے ایک معاف کر دے اور دوسرا نہ کرے تو قاتل قتل نہیں ہوگا لیکن اگر حاکم سمجھے کہ چونکہ وارث ہی شرارت سے مروانے والے ہیں

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۸۰)

اور اے عقلمندو! تمہارے لئے (اس) بدلہ لینے میں زندگی (کا سامان) ہے (اور یہ حکم اسلئے ہے) تاکہ تم بچ جاؤ۔ ۹۳

اِس لئے وہ معاف کرتے ہیں تو حاکم معاف نہیں کرے گا۔ بلکہ انہیں سزا دیگا۔ اور وارثوں کی شرارت ثابت ہو جانے کی وجہ سے ان کی وراثت کا حق بھی زائل ہو جائیگا۔

فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ میں یہ بتایا کہ دیت لینے والے کو چاہیئے کہ مناسب رنگ میں دیت وصول کرے یعنی اگر قاتل یکدم ادا نہیں کر سکتا تو وصول کرنے میں سختی نہ کرے بلکہ اُسے کچھ مہلت دے دے۔ اور دیت دینے والے کو چاہیئے کہ وہ ادا کرنے میں سُستی یا شرارت نہ کرے بلکہ تکلیف اٹھا کر بھی دیت ادا کردے اور کسی نا واجب تاخیر یا شرارت سے کام نہ لے۔

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ۔ فرمایا یہ تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے آسانی پیدا کردی گئی ہے اور اس ذریعہ سے اُس نے تمہارے لئے اپنی رحمت کا سامان مہیا کیا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اسے مدّنظر رکھو اور خدا تعالیٰ کے اس احسان کی قدر کرو۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فرماتا ہے کہ اگر اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کریگا اور اعتدٰی سے کام لیگا تو اس کے لئے دردناک عذاب مقدر ہے۔ یعنی اگر مقتول کے ورثاء دیت بھی لے لیں اور موقعہ پا کر دوسرے کو بھی قتل کردیں تو وہ کسی رحم کے مستحق نہیں ہونگے بلکہ انہیں لازماً سزا دی جائیگی۔ یعنی حکومت دوسرے فریق کو انہیں معاف کرنے کی اجازت بھی نہیں دیگی تاکہ اس قسم کی وحشیانہ حرکات قومی اخلاق کو نہ بگاڑیں اور لوگوں کے اندر قانون کا احترام قائم ہو۔

۹۳ حل لغات:- اَلْاَلْبَابُ جمع ہے۔ اس کا مفرد لُبٌّ ہے اور لُبٌّ کے معنے مغز کے ہیں۔ لیکن مراد عقل ہے۔

تفسیر:- فرماتا ہے۔ اے عقلمندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔ اسے کبھی نہ چھوڑنا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے والا تو مر گیا۔ اب اگر اس کے قاتل کو قتل کر دیا جائیگا۔ تو مقتول تو زندہ نہیں ہو سکتا پھر قصاص میں حیات کس طرح ہوئی؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر قاتل کو قتل نہ کیا جائے تو بالکل ممکن ہے کہ کل وہ کسی دوسرے کو قتل کردے اور پرسوں کسی اور کو مار ڈالے۔ اسلئے فرمایا کہ قصاص میں زندگی ہے۔ یعنی اگر قاتل سے قصاص نہ لیا جائیگا تو وہ تم میں سے کسی نفس کی زندگی کا خاتمہ کردے گا۔ لیکن اگر قاتل کو موت کی سزا دی جائے تو آئندہ قتل کے جرم کم ہو جائیں گے اور اس طرح کئی لوگوں کی جانیں بچ جائینگی۔

پھر اس رنگ میں بھی قصاص حیات کا موجب ہے کہ جب قاتل کو سزا مل جاتی ہے تو رشتہ داروں کے دلوں میں سے بُغض اور کینہ نکل جاتا ہے اور مقتول کی عزت قائم ہو جاتی ہے۔ اگر قاتل کو سزا نہ ملے تو رشتہ داروں کے دلوں میں بُغض اور کینہ رہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے آدمی کو قتل کرکے اس کی ذلّت کی گئی ہے۔ پس قصاص مقتول کی عزت قائم کرنے کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے علاوہ میرے نزدیک اس آیت میں موجودہ زمانہ کے متعلق ایک پیشگوئی بھی پائی جاتی ہے۔ عرب تو قصاص کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ یہاں تک کہ اگر باپ مارا جائے تو وہ پوتے سے بھی اس کا بدلہ لیتے تھے۔ پس یہ ہدایت صرف اُن کو نہیں ہو سکتی۔ بلکہ درحقیقت یہ آئندہ زمانہ کے لئے پیشگوئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے۔ کہ ایک وقت آنے والا ہے جبکہ قصاص کو اڑانے کی تلقین کی جائیگی۔ اُس وقت تم مضبوطی سے اس تعلیم پر قائم رہنا

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ

جب تم میں سے کسی پر موت (کا وقت) آجائے تو تم پر بشرطیکہ وہ (یعنی مرنے والا) بہت سا مال چھوڑے -

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨١﴾

والدین اور قریبی رشتہ داروں کو (امر) معروف کی وصیت کرجانا فرض کیا گیا ہے۔ (یہ بات) متقیوں پر واجب ہے۔ ۵۹۴

جیسے آجکل بعض یورپین ممالک میں اس قسم کی تحریکات وقتاً فوقتاً اٹھتی رہتی ہیں کہ موت کی سزا منسوخ ہونی چاہیئے - خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے عقلمندو! ان تحریکات کو کبھی قبول نہ کرنا - ورنہ اس کے بہت سے مفاسد ظاہر ہونگے - اور تمہاری جانوں کی کوئی قیمت باقی نہیں رہے گی -

آخر میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ ہم نے یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ تم قتل سے بچو - اور اس زندگی کو پاؤ جو قصاص کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے - اگر تم قصاص کو چھوڑ دوگے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا تمدن درہم برہم ہو جائیگا - پس تم اس بات سے بچو کہ تمہارا تمدن ٹوٹ جائے اور تمہارا نظام درہم برہم ہو جائے اور تمہاری جانوں اور مالوں کی کوئی قیمت باقی نہ رہے -

پھر اس کے علاوہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کے ایک اور معنے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سمجھائے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ان الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی کی تمہیں اس لئے ضرورت ہے کہ تم اور تقویٰ حاصل کر لو - گویا بتایا کہ بے فائدہ جان گنوانا اس لئے قابلِ احتراز ہے کہ یہ دنیا دار العمل ہے اسمیں رہنے سے آخرت کا توشہ انسان جمع کر لیتا ہے - پس اس کی حفاظت بھی ضروری ہے تاکہ تم تقویٰ حاصل کر سکو - غرض ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے وجہ بتا دی کہ مومن باوجود آخرت پر ایمان رکھنے کے زندگی کی کیوں قدر کرتا ہے -

۵۹۴ حل لغات :- خَيْرًا ، مفردات میں لکھا ہے۔ وَقَوْلُهُ تَعَالٰى اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اَیْ مَالًا وَقَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ وَيُقَالُ لِلْمَالِ خَيْرٌ حَتّٰى يَكُوْنَ كَثِيْرًا وَ مِنْ مَكَانٍ طَيِّبٍ - یعنی اس آیت میں خَيْرًا سے مراد مال ہے اور بعض علماء کے نزدیک مال کو خَیْرٌ اُس وقت کہیں گے جب وہ زیادہ ہو اور نیک ذرائع سے کمایا ہوا ہو- (مفردات)

تفسیر :- اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے متعلق مرنے والے کو جو وصیت کرنے کا حکم دیا ہے اس کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسی وصیت ہے جس کی تعلیم دی گئی ہے جبکہ شریعت نے خود احکامِ وراثت کو سورۃ نساء میں تفصیلاً بیان کر دیا ہے اور ان کے نزول کے بعد رشتہ داروں کے نام وصیت کرنا بے معنی بن جاتا ہے - سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ وصیت کے احکام چونکہ دوسری آیات میں نازل ہو چکے ہیں - اس لئے یہ آیت منسوخ ہے اب اس پر کسی عمل کی ضرورت نہیں - مگر ہمارے نزدیک قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ نہیں - قرآنی آیات کی منسوخی کا عقیدہ محض قلتِ تدبر کی بنا پر ظہور میں آیا ہے - جب مسلمانوں کو کسی آیت کا مفہوم پوری طرح سمجھ میں نہ آیا تو انہوں نے کہدیا کہ وہ منسوخ ہے - اور اس طرح کئی کئی سو آیات تک انہوں نے منسوخ قرار دے دیں - اگر وہ سمجھتے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف قابلِ عمل ہے تو ہر آیت پر غور کرتے - اور اگر اسے حل کرنے سے قاصر رہتے تو خدا تعالیٰ کے حضور جھکتے اور اس سے دعائیں کرتے کہ وہ

خَيْرًا

اُن کی مدد کرے اور اپنے کلام کی حقیقت سمجھنے کی انہیں توفیق عطا فرمائے۔ اور اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اُن کی رہنمائی کے سامان پیدا فرما دیتا اور انہیں مشکل آیات کا حل نظر آجاتا۔ مگر انہوں نے بدقسمتی سے یہ آسان رستہ اختیار کر لیا کہ جس آیت کا مطلب سمجھ میں نہ آیا اُسے منسوخ قرار دے دیا۔ یہی طریق انہوں نے یہاں بھی اختیار کر لیا ہے مگر اس آیت کے جو معنے ہم کرتے ہیں۔ اگر اس کو مدِّنظر رکھا جائے تو یہ حکم بڑا ہی پُرحکمت نظر آتا ہے اور اسے منسوخ قرار دینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ درحقیقت یہاں وصیت کا لفظ صرف عام تاکید کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربین کے متعلق تو وصیت کرنے کا حکم دیا ہے مگر اولاد کو ترک کر دیا ہے۔ حالانکہ قلبی تعلق کے لحاظ سے اولاد کا ذکر بھی ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ یہ بات بتاتی ہے کہ یہاں مال کی تقسیم کا مسئلہ بیان نہیں کیا جا رہا بلکہ ایک عام تاکید کی جا رہی ہے اور اولاد کی بجائے والدین اور اقربین کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس آیت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہ حکم جنگ اور اس کے مشابہ دوسرے حالات کے متعلق ہے۔ چنانچہ اس سے چند آیات پہلے وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ میں لڑائی کا ذکر آچکا ہے۔ اسی طرح آگے چل کر وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ میں پھر جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور چونکہ جنگ میں بالعموم نوجوان شامل ہوتے ہیں جن کے ہاں یا تو اولاد ہوتی ہی نہیں یا چھوٹی عمر کی ہوتی ہے۔ اسلئے والدین اور اقربین کے حق میں وصیت کرنے کا حکم دیا۔ اور اولاد کا ذکر چھوڑ دیا۔ اور یہ ہدایت فرمائی کہ جب کسی شخص کی موت کا وقت قریب آجائے یا وہ کسی ایسے خطرناک مقام کی طرف جانے لگے۔ جہاں جانے کا نتیجہ عام حالات میں موت ہوا کرتا ہے اور پھر اُس کے پاس مال کثیر بھی ہو تو اُسے چاہیئے کہ وہ وصیت کر دے کہ اُس کی جائیداد احکامِ الٰہیہ کے مطابق تقسیم کی جائے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اور یہ تاکید بجائے اس کے کہ کسی اَور کو کی جائے اپنے رشتہ داروں کو کرے۔ اور اگر مال کا کوئی حصہ صدقہ کرنا ہو تو اس کا بھی اظہار کر دے۔ مَیں سمجھتا ہوں اگر مسلمان اس تعلیم پر عمل کرتے تو وہ رواج جو شرعی تقسیمِ وراثت کے خلاف اُن میں جاری رہا کبھی جاری نہ ہوتا۔ جس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ ہو وہاں تو کسی رواج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن ایسے ممالک جہاں رواج کا سوال پیدا ہو وہاں اس امر کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ مرنے والا اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں یہ وصیّت کر جائے کہ اُن میں معروف کے مطابق جائداد تقسیم کی جائے ورنہ اُس کا مال رواجی مستحقوں کو مل جائیگا اور اصل مستحقین محروم رہ جائیں گے۔ رہا یہ سوال کہ معروف کیا ہے؟ سو ایک تو احکامِ وراثت معروف ہیں اُن پر عمل کرنے کی تاکید ہونی چاہیئے۔ دوسرے بعض حقوق ایسے ہیں جو احکامِ وراثت سے باہر ہیں۔ اور جن کو قاعدہ میں تو بیان نہیں کیا گیا مگر مذہبی اور اخلاقی طور پر انہیں پسند کیا گیا ہے اور اُن کے لئے شریعت نے ⅓ تک وصیت کر دینے کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ مثلاً اگر وہ چاہے تو کچھ روپیہ غرباء کی بہبودی کے لئے وقف کر دے اور اُس کی اپنے رشتہ داروں کو تاکید کر جائے۔

اَلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے ورثاء کافر ہوں تو اُن کیلئے حسنِ سلوک کی وصیت کر جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں وصیت کے بغیر کافر والدین یا دوسرے قریبی رشتہ داروں کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اگر وہ دیکھے کہ انہیں کچھ مال دے دینے سے فائدہ ہوگا تو اُن کے متعلق تاکید کر دے کہ فلاں فلاں شخص کو میرے مال میں سے اس قدر حصہ ضرور دیدیا جائے اور اگر دیکھے کہ وہ اس روپیہ کو اسلام کے خلاف خرچ کرینگے

تو نہ دے ۔ کافر والدین یا اقربین کے لئے ورثہ نہیں رکھا گیا ۔ ہاں وصیت کی گنجائش رکھی گئی ہے ۔ تاکہ اگر وہ اسلام کے خلاف اپنے مال کو استعمال کرنے والے ہوں تو انہیں مال نہ پہنچ سکے اور اگر جائز طور پر مدد کے مستحق ہوں تو ان کی مدد کی جاسکے ۔

اس آیت کا تیسرا مطلب یہ ہے کہ مرنے والا اپنے پوتوں اور اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے لئے بھی کچھ وصیت کرجائے تاکہ اُن کی مدد ہو جائے ۔ اور شریعت کے کسی حکم کی بھی خلاف ورزی نہ ہو ۔ کیونکہ اسلامی قانون کی رُو سے اگر دادا کی زندگی میں اس کا بیٹا فوت ہو جائے تو پوتوں اور پوتیوں کو وراثت سے حصہ نہیں ملتا پس ایسی صورت میں اگر وہ اپنی جائیداد کے ⅓ حصہ میں سے اپنے پوتوں پوتیوں یا بھائیوں کے بیٹوں کو کچھ روپیہ دینا چاہے تو وہ ایسا کرسکتا ہے ۔

(۴) جن ممالک میں اپنے اپنے قانون رائج ہیں وہاں دو صورتیں ہیں ۔ بعض تو ایسی جگہیں ہیں جہاں مرنے کے وقت کی وصیت کو ہی معتبر سمجھا جاتا ہے ۔ جیسے روس کا ملک ہے اور بعض جگہیں ایسی ہیں جہاں مرنے والے کی وصیت پر عمل نہیں ہوتا بلکہ حکومت نے جو قانون مقرر کیا ہوا ہو اس کے مطابق ورثہ تقسیم ہوتا ہے ۔ اگر ایسے ممالک ہوں جہاں مرنے والے کی وصیت تسلیم کی جاتی ہے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جن ورثاء کو رواج کے مطابق ورثہ نہیں مل سکتا انہیں وصیت کی وجہ سے شریعت کے مطابق حصہ مل جائیگا اور اسلامی تعلیم اُن ممالک میں بھی زندہ ہو جائیگی جن میں گو اسلامی حکومت نہیں مگر وہ مرنے والے کی وصیت پر عمل کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔ اور جہاں اسلامی قانون کے مطابق ورثہ تقسیم نہ ہوسکتا ہو وہاں خواہ جائز ورثاء کو ورثہ نہ مل سکے پھر بھی اس کے نتیجہ میں مسلمان اس گناہ سے بچ جائیں گے جو اس حکم کی خلاف ورزی کے ساتھ وابستہ ہے اور صرف وصیت تبدیل کرنے والے گنہگار قرار پائیں گے ۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وصیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی وارث کو جس کا شریعت نے حصہ مقرر کردیا ہے اُس کے حق سے زیادہ دے دے ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس سے بڑی سختی سے منع فرمایا ہے ۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے ۔
اِنَّ اللّٰہَ اَعْطٰی کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ فَلَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ (ترمذی) اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کا حق مقرر کردیا ہے ۔ اس لئے کسی وارث کے لئے جس کا اللہ تعالیٰ نے حصہ مقرر کردیا ہے وصیت نہیں ہوسکتی ۔ پس یہ آیت نہ منسوخ ہے نہ بلا ضرورت ۔ بہت دفعہ مرنے کے بعد ورثاء میں تقسیم مال پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور بعض دفعہ غیر رشتہ دار بھی کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں اتنا روپیہ دینے کا اس نے وعدہ کیا تھا ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہدایت دے دی کہ مرنے والے کو وصیت کردینی چاہیئے تاکہ کوئی جھگڑا نہ ہو اور یہ سوال نہ اُٹھے کہ مرنے والے نے علاوہ رشتہ داروں کے اوروں کے حق میں بھی وصیت کی ہے ۔ اور یہ وصیت رشتہ داروں کے سامنے ہونی چاہیئے ۔

اس آیت میں مال کے لئے خیر کا لفظ استعمال فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نیک ذرائع سے کمایا ہوا مال ہی درحقیقت مال ہے ۔ اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم ہمیشہ جائز طور پر کماؤ ۔ اور حلال مال جمع کرنے کی کوشش کرو ۔ اگر ناجائز ذرائع اختیار کروگے تو پھر وہ مال خیر نہیں رہیگا بلکہ شر بن جائیگا ۔

اسی طرح اِنْ تَرَکَ خَیْرًا میں یہ نصیحت فرمائی کہ انسان اپنا تمام مال آخر پچھلوں کے لئے ہی چھوڑ جاتا ہے اور خود خالی ہاتھ دنیا سے اُٹھ جاتا ہے ۔ اور جب حالت یہ ہے تو اُسے سوچنا چاہیئے کہ وہ کیوں ناجائز مال کمائے جسے دوسرے کھائیں اور وہ خود دوزخ میں جائے ۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اِنْ تَرَکَ خَیْرًا کے الفاظ استعمال

فَمَنْ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ

مگر جو شخص اس (وصیت) کو اس کے سُننے کے بعد بدل دے۔ تو اُس کا گناہ صرف انہی پر ہوگا جو

يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ

اسے بدل دیں۔ اللہ یقیناً خوب سُننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے ۹۵ پھر جو شخص کسی وصیت کرنیوالے سے

مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ

طرفداری یا گناہ (کے سرزد ہونے) کا خوف کرے اور انکے درمیان صلح کرا دے۔ تو اُس پر کوئی

عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۳﴾ ع

گناہ نہیں۔ اللہ یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۹۶

۲۲ ع ۶

خوانخواہ نصیحت کی ہے کہ ناجائز ذرائع سے کما کر اپنے پچھلوں کیلئے مال نہ چھوڑو بلکہ جائز ذرائع سے کماؤ۔ ورنہ ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا مال تو تمہارا ہے ہی نہیں۔ تم نے اُس کی وصیت کیا کرنی ہے۔

۹۵ تفسیر: فرمایا۔ اگر کوئی شخص وصیت کرے اور بعد میں کوئی دوسرا شخص اس میں تغیر و تبدل کردے تو اس صورت میں تمام تر گناہ اس شخص کی گردن پر ہے جس نے وصیت میں ترمیم و تنسیخ کی۔ یہ تغیر دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ لکھانے والا تو کچھ اور لکھائے۔ مگر لکھنے والا شرارت سے کچھ اور لکھ دے۔ یعنی لکھوانے والے کی موجودگی میں ہی اُس کے سامنے تغیر و تبدل کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وصیت کرنیوالے کی وفات کے بعد اُس میں تغیر و تبدل کردے یعنی وصیت میں جو کچھ کہا گیا ہو اس کے مطابق عمل نہ کرے بلکہ اُس کے خلاف چلے۔ ان دونوں صورتوں میں اس گناہ کا وبال صرف اُسی پر ہوگا جو اُسے بدل دے۔ (اِثْمُهٗ میں سبب مسبب کی جگہ استعمال کیا گیا ہے اور مراد گناہ نہیں بلکہ گناہ کا وبال ہے) یہ الفاظ بتلاتے ہیں کہ اس میں کسی قرآنی حکم کی طرف اشارہ ہے اور وہ حکم وراثت کا ہی ہے۔ ورنہ اس کا کیا مطلب کہ بدلنے کا گناہ بدلنے والوں پر ہوگا۔ وصیت کرنیوالے پر نہیں ہوگا۔ کیونکہ اگر اس وصیت کی تفصیلات شرعی نہیں تو بدلنے والے کو گناہ کیوں ہو۔ اُس کے گنہگار ہونیکا سوال تبھی ہو سکتا ہے جبکہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی ہو رہی ہو۔ اور ▪ اسی طرح ہو سکتی ہے کہ مرنے والا تو یہ وصیت کر جائے کہ میری جائیداد احکام اسلام کے مطابق تقسیم کی جائے لیکن وارث اس کی وصیت پر عمل نہ کریں۔ ایسی صورت میں وصیت کرنے والا تو گناہ سے بچ جائیگا لیکن وصیت تبدیل کرنے والے وارث گنہگار قرار پائیں گے۔

جَنَفًا

۹۶ حل لغات: جَنَفًا: جَنَفَ کا مصدر ہے۔ اور جَنَفَ فِی الْوَصِیَّةِ کے معنے ہیں مَالَ وَجَارَ یعنی اُس نے وصیت کرتے ہوئے ناانصافی کی اور عدل کے راستے ہٹ گیا۔ (اقرب)

تفسیر: اب بتایا کہ اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ موصی کی وصیت میں کوئی نقص ہے اور خوف ہو کہ اُس سے فتنہ پیدا ہوگا۔ تو وہ ورثاء کو جمع کرکے اگر ان کے درمیان صلح کرا دے تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر (بھی) روزوں کا رکھنا (اسی طرح) فرض کیا گیا ہے جس طرح

جب اُس نے شریعت کے مطابق اپنی جائیداد تقسیم کرنے کی ہدایت کی ہے تو ورثاء کو نقصان پہنچنے کا احتمال کس طرح ہو سکتا ہے کیونکہ شریعت پر عمل کرنے کے باوجود وصیّت کرنے کی صورت میں بعض نقصانات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص ⅓ حصّہ کی وصیت کر دے اور باقی وارث اتنے ہوں کہ بقیہ مال میں سے اُن کو بہت کم حصہ ملتا ہو تو ایسی صورت میں اگر وصیت کرنے والے اور ان رشتہ داروں کے درمیان جن کو نقصان پہنچے یا جن کے نظر انداز کئے جانے کا امکان ہو صلح کرا دی جائے یا وہ شخص جن کے حق میں وصیّت ہے اُن کو باہمی سمجھوتے سے اِس بات پر راضی کر لیا جائے کہ باوجود وصیّت کے وہ ایک دوسرے کو اُس کا حق ادا کر دینگے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اسے چاہیئے کہ وصیت کرنے والے اور اُس کے محبوب یا مبغوض ورثاء میں صلح کرا دے تاکہ کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وصیت کرتے وقت اگر وصیت کرنے والا کسی فریق کو نقصان پہنچا رہا ہو اور جسے وصیت لکھوائی جا رہی ہو وہ سمجھتا ہو کہ بعض ورثاء سے اُس کی اَن بَن ہے۔ اور اس ناراضگی کی وجہ سے یہ ایسی وصیّت کر رہا ہے تو اُسے سمجھا دے۔ اور مرنے والے اور اُس کے وارثوں میں صلح کرا دے تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ سے یہ دھوکا نہیں کھانا چاہیئے کہ اِس قسم کی اصلاح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں بلکہ صرف ایک منفی نیکی ہے جس میں انسان کے گنہگار ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ الفاظ اس فعل کو صرف ایک منفی نیکی قرار دینے کے لئے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے فرمایا تھا کہ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ یعنی جو شخص وصیت کو اُس کے سُننے کے بعد بدل دے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حضور گنہگار ہوگا۔ پس چونکہ اس سے پہلے وصیت میں تبدیلی کرنا اللہ تعالیٰ نے گناہ کا موجب قرار دیا تھا اس لئے لازماً یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ بعض محتاط طبیعتیں کہیں اس طرف مائل نہ ہو جائیں کہ وصیت میں غلطی واقع ہونے کے باوجود پھر بھی اسکو تبدیل نہیں کرنا چاہیئے تاکہ یہ تبدیلی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب نہ ہو۔ پس اِس قسم کے خدشات کے ازالہ کیلئے اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیت میں بتا دیا کہ اگر واقعہ میں کوئی غلطی واقع ہو گئی ہو تو اس کو دُور کر دینا ہرگز کوئی گناہ کی بات نہیں۔ بلکہ ایک ایسی نیکی ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے فضل کا مستحق بنا دیگی۔ چنانچہ آخر میں إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو وصیّت کرنے والے کو تسلّی دی کہ اگر وہ اپنی غلطی کی اصلاح کر لے تو اللہ تعالیٰ اُسے معاف کر دے گا اور دوسری طرف رَحِيمٌ فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص مداخلت کر کے وصیّت کے نقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کریگا اور اُسے اپنے فضلوں کا مورد بنائیگا۔ پس غَفُورٌ کا لفظ اُن وصیّت کرنے والوں کو بشارت دیتا ہے جو اپنی غلطی کی اصلاح کر لیں۔ اور

كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

اُن لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں تاکہ تم روحانی اور اخلاقی کمزوریوں سے بچو ۹۷

رَحِيْمٌ کا لفظ ان لوگوں کے مورد انعام ہونے پر دلالت کرتا ہے جو وصیت کی کسی غلطی کو درست کرنے کی کوشش کریں۔

۹۷ حل لغات: ۔ تَتَّقُوْنَ : اِتَّقٰی سے مضارع جمع مخاطب کا صیغہ ہے۔ اور تَقْوٰی کے معنے ہیں جَعْلُ النَّفْسِ فِيْ وِقَايَةٍ مِمَّا يُخَافُ .... وَفِيْ تَعَارُفِ الشَّرْعِ حِفْظُ النَّفْسِ عَمَّا يُؤْثِمُ (مفردات) یعنی اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے ایک ڈھال کے پیچھے محفوظ کر لینا جن سے خوف محسوس کیا جاتا ہے۔ اور شرعی نقطہ نگاہ سے تَقْوٰی سے مراد گناہوں سے بچنا ہے۔ مزید تشریح کیلئے دیکھیں حل لغات سورۃ بقرۃ ۳ع۔

تفسیر: ۔ فرماتا ہے۔ اے مومنو! تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزے رکھنے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح پہلی اُمتوں پر روزے رکھنے فرض کئے گئے تھے۔

دنیا میں بعض تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں جو منفرد ہوتی ہیں۔ اکیلے انسان پر آتی ہیں اور وہ اُن سے گھبراتا ہے شکوہ کرتا ہے کہ میں ان تکالیف کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن بعض تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں جن میں سارے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ان تکالیف پر جب کوئی انسان گھبراتا یا شکوہ کا اظہار کرتا ہے تو لوگ اُسے یہ کہہ کر تسلی دیا کرتے ہیں کہ میاں یہ دن سب پر آتے ہیں۔ اور کوئی شخص یہ امید نہیں کر سکتا کہ وہ ان تکلیفوں سے بچ جائے۔ مثلاً موت ہے۔ موت ہر انسان پر آتی ہے۔ دنیا میں کوئی احمق سے احمق انسان بھی ایسا نہیں مل سکتا جو کہے کہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ مجھ پر موت نہ آئے۔ موت اس پر ضرور آئے گی چاہے جلدی آجائے یا دیر میں۔ پس كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ کہہ کر خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ روزے ایسی نیکی۔ ثواب اور قربانی ہیں جن میں سارے ہی ادیان شریک ہیں۔ اور انہوں نے خدا تعالیٰ کے اس حکم کو پورا کیا ہے۔ پھر کتنے افسوس کی بات ہے کہ .. نیکی اور تقویٰ جس کے حصول کے لئے ساری قومیں کوشش کرتی رہی ہیں تم اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ کوئی نیا حکم ہوتا اگر روزے صرف تم پر ہی فرض ہوتے تو تم دوسرے لوگوں سے کہہ سکتے تھے کہ تم اسے کیا جانو۔ تم نے تو اس کا مزہ ہی نہیں چکھا۔ لیکن وہ لوگ جو اس دروازہ میں سے گذر چکے ہیں۔ اور جو اس بوجھ کو اٹھا چکے ہیں انہیں تم کیا جواب دوگے۔ لازماً مسلمانوں پر حجت اُنہی احکام میں ہو سکتی ہے جو پہلی قوموں کو بھی دیئے گئے اور انہوں نے ان احکام کو پورا کیا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے مسلمانو! تم ہوشیار ہو جاؤ۔ ہم تم پر روزے فرض کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی تمہیں بتا دیتے ہیں کہ روزے پہلی قوموں پر بھی فرض کئے گئے تھے۔ اور انہوں نے اس حکم کو اپنی طاقت کے مطابق پورا کیا تھا اگر تم اس حکم کو پورا کرنے میں سستی دکھاؤ گے تو وہ قومیں تم پر اعتراض کریں گی۔ اور کہیں گی کہ ہمیں بھی خدا تعالیٰ نے روزوں کا حکم دیا تھا اور ہم نے اُسے پورا کیا۔ اب تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں تو تم اس حکم کو صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ غرض مسلمانوں کی غیرت اور ہمت بڑھانے کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ روزے صرف تم پر ہی فرض نہیں کئے گئے بلکہ پہلی قوموں پر بھی فرض کئے گئے تھے۔ اور اُن قوموں نے اپنی طاقت کے مطابق اس حکم کو پورا کیا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روزوں کی شکل میں اختلاف تھا اور وہ اختلاف آج تک نظر آتا ہے۔ کہیں اس قسم

کے روزے ہوا کرتے تھے جنہیں وصال کہتے ہیں کہ درمیان میں سحری نہ کھانا۔ اس قسم کے روزوں میں صرف شام کے وقت روزہ کشائی کی جاتی اور دوسری سحری نہ کھا کر متواتر آٹھ پہر روزہ رکھا جاتا۔

کہیں ایسے روزے ہوتے کہ روزہ کشائی بھی نہ ہوتی اور تین تین چار چار یا پانچ پانچ دن متواتر روزہ رکھا جاتا۔ ایسے روزے بھی پائے جاتے ہیں جن میں لوگوں کو ہلکی غذا کھانے کی اجازت دی گئی ہے مگر ٹھوس غذاؤں سے منع کیا گیا ہے۔ جیسے ہندوؤں یا عیسائیوں میں روزے ہوتے ہیں۔

ہندوؤں کے روزوں کے متعلق تو عام طور پر مشہور ہے کہ ان کا روزہ یہ ہوتا ہے کہ آگ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے۔ اس کے علاوہ اگر وہ کئی سیر آم۔ کیلے اور نارنگیاں وغیرہ کھا جائیں تو اُن کے روزہ میں فرق نہیں آتا۔ روٹی اور سالن کو چھوڑ کر باقی جو چیز چاہیں کھائیں۔

پھر اس سے بھی آسان روزے رومن کیتھولک عیسائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ آخر انہوں نے بھی کسی مذہبی روایت کی بنا پر ہی یہ روزے رکھنے شروع کئے ہونگے۔ یا کسی حواری سے کوئی بات پہنچی ہوگی۔ اُن کا روزہ یہ ہوتا ہے۔ کہ گوشت نہیں کھاتا۔ اگر وہ آلو اُبال کر یا کدو کا بھرتہ بنا کر اس کے ساتھ روٹی کھالیں تو اُن کا روزہ نہیں ٹوٹتا البتہ اگر گوشت کی بوٹی اُن کے معدہ میں چلی جائے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پس روزوں کے متعلق بھی مختلف اقوام میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ اور اپنے اپنے زمانہ میں ان احکام میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بھی پوشیدہ ہونگی۔ مثلاً جو قومیں کثرت سے گوشت کھانے والی ہوں وہ اُن اخلاق سے رفتہ رفتہ محروم ہو جاتی ہیں جو سبزی کے استعمال کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کے لئے انہیں یہ بتانے کے لئے کہ سبزی بھی غذا میں ضروری ہوتی ہے اگر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا ہو کہ ہفتہ میں کم از کم ایک دن تم پر ایسا آنا چاہیئے جب تم گوشت نہ کھاؤ۔ تو یہ نہایت پُرحکمت روزہ ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نے ہماری غذا کے متعلق یہ ایک عام حکم دے دیا ہے کہ گوشت بھی کھاؤ اور سبزیاں بھی کھاؤ۔ آگ پر پکی ہوئی چیزیں بھی استعمال کرو۔ اور جنہیں آگ نے نہ چھوا ہو وہ بھی استعمال کرو۔ غرض ہماری غذا میں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی احتیاطیں جمع کر دی ہیں۔ لیکن پہلی قوموں کے لئے ممکن ہے اس قسم کی احتیاطیں ناقابلِ برداشت پابندیاں ہوں۔ اور اُن کے اخلاق کی اصلاح کے لئے اس قسم کے روزے تجویز کئے گئے ہوں۔ مثلاً .. قومیں جو جنگلی ہوتی ہیں اور جن کا شکار پر گذارہ ہوتا ہے .. ایک عرصہ تک گوشت کھانے کی وجہ سے ایسے اخلاق سے عاری ہو جاتی ہیں جو سبزی کھانے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیدیا گیا ہو کہ وہ ہفتہ میں ایک دن گوشت کھانا چھوڑ دیں تو یقیناً یہ روزہ اُن کے لئے بہت مفید تھا۔ پس پہلی قوموں میں روزے تو تھے مگر شکل وہ نہ تھی جو اسلام میں ہے۔ پس كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں جو مشابہت پہلے لوگوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ صرف فرضیت کے لحاظ سے ہے یعنی کَمَا کُتِبَ سے یہ مراد نہیں کہ .. ویسے ہی روزے رکھتے تھے جیسے مسلمان رکھتے ہیں یا اتنے ہی روزے رکھتے تھے جتنے مسلمان رکھتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اُن پر بھی روزے فرض تھے۔ اور تم پر بھی فرض کئے گئے ہیں گویا صرف فرضیت میں مشابہت ہے نہ کہ تفصیلات میں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں "روزہ" کے ماتحت لکھا ہے کہ:-

IT WOULD BE DIFFICULT TO NAME ANY RELIGIOUS SYSTEM OF ANY DESCRIPTION IN WHICH IT IS WHOLLY UNRECOGNISED

یعنی دنیا کا کوئی باقاعدہ مذہب ایسا نہیں جس میں روزہ کا حکم نہ ملتا ہو۔ بلکہ ہر مذہب میں روزوں کا حکم موجود ہے چنانچہ اس بارہ میں سب سے پہلے ہم یہودی مذہب کو دیکھتے ہیں۔ تورات میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طُور پر گئے تو انہوں نے چالیس دن رات کا روزہ رکھا اور ان ایام میں انہوں نے کچھ کھایا نہ پیا۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"سو وہ (یعنی موسیٰ) چالیس دن اور چالیس رات وہیں خداوند کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی۔ نہ پانی پیا۔"

(خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

اسی طرح احبار باب ۱۶ آیت ۲۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو ایک روزہ رکھنا یہود کے لئے ضروری قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل ہمیشہ یہ روزے رکھتے رہے اور انبیاء بنی اسرائیل بھی اس کی تاکید کرتے رہے۔ زبور میں حضرت داؤدؑ فرماتے ہیں:۔

"میں نے تو ان کی بیماری میں جب وہ بیمار تھے ٹاٹ اوڑھا اور روزے رکھ رکھ کر اپنی جان کو دُکھ دیا۔"

(زبور باب ۳۵ آیت ۱۳)

یسعیاہ نبی فرماتے ہیں:۔

"دیکھو تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ جھگڑا رگڑا کرو اور شرارت کے مُکّے مارو پس اب تم اس طرح کا روزہ نہیں رکھتے ہو کہ تمہاری آواز عالمِ بالا پر سُنی جائے۔"

(یسعیاہ باب ۵۸ آیت ۴)

دانی ایل فرماتے ہیں:۔

"میں نے خداوند خدا کی طرف رُخ کیا اور میں منّت اور مناجات کرکے اور روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور راکھ پر بیٹھ کر اُس کا طالب ہوا۔"

(دانی ایل باب ۹ آیت ۳)

یوایل نبی فرماتے ہیں:۔

"خداوند کا روزِ عظیم نہایت خوفناک ہے۔ کون اُس کی برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن خداوند فرماتا ہے اب بھی پورے دل سے اور روزہ رکھ کر اور گریہ وزاری و ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ اور اپنے کپڑوں کو نہیں بلکہ دلوں کو چاک کرکے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو۔ کیونکہ وہ رحیم و مہربان قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔"

(یوایل باب ۲ آیت ۱۱ تا ۱۳)

یہودیت کے بعد عیسائیت کو دیکھا جائے تو اُس میں بھی روزوں کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ کے متعلق انجیل بتاتی ہے کہ انہوں نے چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ رکھا متی میں لکھا ہے:۔

"اور چالیس دن اور چالیس رات فاقہ کرکے آخر کو اُسے بھوک لگی۔" (متی باب ۴ آیت ۲)

اسی طرح حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو ہدایت دی کہ:۔

"جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اُداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا مُنہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ اُن کو روزہ دار جانیں میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور مُنہ دھو تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ

جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دیگا۔" (متی باب ۶ آیت ۱۶ تا ۱۸)

اسی طرح ایک دفعہ جب حواری ایک بد رُوح کو نہ نکال سکے تو

"اُس کے شاگردوں نے تنہائی میں اُس سے پوچھا کہ ہم اسے کیوں نہ نکال سکے تو اُس نے اُن سے کہا کہ یہ قسم دُعا اور روزہ کے سوا کسی اَور طرح نہیں نکل سکتی۔[1]"

(مرقس باب ۹ آیت ۲۸ - ۲۹)

بد رُوح نکالنا حواریوں کی ایک اصطلاح تھی۔ بیماریوں اور مختلف قسم کی خرابیوں کو دیو کہا کرتے تھے اور حضرت مسیحؑ ناصری کے پاس آکر درخواست کیا کرتے تھے کہ یہ دیو نکال دیں۔ اُن کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ بیماریاں یا خاص قسم کی دماغی خرابیاں دُور کر دی جائیں۔ اِس قسم کے بعض بیمار تھے جن کا حضرت مسیحؑ ناصری نے علاج کیا اور وہ اچھے ہو گئے۔ اور جب ایک موقعہ پر حواری ایک بد رُوح کو نہ نکال سکے تو آپ نے فرمایا۔ کہ یہ دیو روزوں اور دعاؤں کے بغیر نہیں نکلتے۔ یعنی کمالاتِ رُوحانیہ کا حصول روزوں اور دعاؤں کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہی مسیحؑ ناصری جنہوں نے یہ کہا تھا کہ بڑی بڑی بیماریاں روزوں اور دعاؤں کے بغیر نہیں نکل سکتیں۔ اُنہی کی اُمت آج روزوں سے اتنی بے خبر ہے اور وہ اتنا کھاتے ہیں کہ شاید الشیائی ہفتہ بھر میں بھی اتنا نہیں کھاتے جتنا وہ ایک دن میں کھا جاتے ہیں۔ پس انہوں نے روزہ کیا رکھنا ہے وہ تو روزوں کے قریب بھی نہیں جاتے۔ سال بھر میں صرف تین دن ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ روزہ رکھتے ہیں۔ لیکن ہندوؤں کی طرح جیسے وہ روزہ میں صرف چولھے کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاتے۔ مثلاً وہ پھلکا نہیں کھائینگے لیکن دو دو سیر دودھ پی جائیں گے۔ عیسائی بھی صرف چند چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں باقی سب کچھ کھاتے رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ روزے ہو گئے۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ یہودیوں میں سے تھے اور یہودیوں میں روزہ بڑا مکمل ہوتا ہے۔ اور پھر حضرت مسیحؑ خود مانتے ہیں کہ کئی قسم کے دیو یعنی رُوحانی یا جسمانی بیماریاں ایسی ہیں جو روزہ رکھنے والے کی دُعا سے دُور ہوتی ہیں اس کے بغیر نہیں ہوتیں۔

یہودیت اور عیسائیت کے بعد ہندو مذہب کو دیکھا جائے تو اُن میں بھی کئی قسم کے برت پائے جاتے ہیں اور ہر قسم کے برت کے متعلق الگ الگ شرائط اور قیود ہیں جن کا تفصیلی ذکر اُن کی کتاب "دھرم سندھو" میں پایا جاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں بھی ہندو اور جین مت کے روزوں کا ذکر کیا گیا ہے اور زرتشتی مذہب کے متعلق بھی لکھا ہے کہ زر [illegible] نے اپنے پیروؤں کو روزے رکھنے کی تلقین کی تھی۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۹ زیر لفظ FASTING

غرض روزہ رُوحانی ترقی کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمام مذاہب میں مشترک طور پر نظر آتا ہے۔ اور تمام اُمتیں روزوں سے برکتیں حاصل کرتی رہی ہیں۔ بلکہ آجکل تو ایک نئی قسم کا روزہ نکل آیا ہے کہ اگر کسی سے جھگڑا ہوا تو کھانا پینا چھوڑ دیا۔ گاندھی جی نے انگریز کے مقابلہ میں اس قسم کے کئی مرن برت رکھے تھے۔ بہر حال مذاہب کی ایک لمبی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے جس کی اہمیت مذہبی دنیا میں ہمیشہ تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جس صورت اور جس شکل میں اسلام نے اِس کو پیش کیا ہے وہ باقی مذاہب سے نرالی ہے۔ اسلام میں روزوں کی یہ صورت ہے کہ ہر بالغ عاقل کو برابر ایک مہینہ کے روزے رکھنے

---

[1] یہ آیت موجودہ اناجیل میں سے نکال دی گئی ہے۔

کا حکم ہے سوائے اس صورت کے کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اُسے
بیماری کا یقین ہو یا سفر پر ہو یا بالکل بوڑھا اور کمزور ہو گیا
ہو - ایسے لوگ جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں اُن کے لئے
حکم ہے کہ وہ دوسرے اوقات میں روزہ رکھیں - اور جو بالکل
معذور ہو گئے ہوں اُن کے لئے کوئی روزہ نہیں -

روزہ کی صورت یہ ہے کہ پو پھٹنے سے لیکر سورج کے
غروب ہونے تک انسان کوئی چیز نہ کھائے نہ پیئے نہ کم نہ
زیادہ اور نہ مخصوص تعلقات کی طرف توجہ کرے - پو پھٹنے سے
پہلے وہ کھانا کھالے تاکہ اُس کے جسم پر غیر معمولی بوجھ نہ
پڑے - اور غروب آفتاب پر روزہ افطار کرے - صرف
شام کو ہی کھانا کھا کر متواتر روزے رکھنا ہماری شریعت
نے ناپسند کیا ہے -

یہاں جگہ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ کے متعلق
ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صرف کسی قوم میں کسی رواج کا پایا
جانا یا پہلوں میں کسی دستور کا ہونا اس امر کی دلیل نہیں
ہوسکتا کہ آئندہ نسلیں بھی ضرور اس کا لحاظ رکھیں بیسیوں
باتیں ایسی ہیں جو پہلے لوگوں میں موجود تھیں لیکن دراصل
غلط تھیں - اور بیسیوں باتیں ایسی ہیں جو آج لوگوں میں پائی
جاتی ہیں حالانکہ وہ بھی غلط ہیں پس محض اس وجہ سے کہ پہلی
قومیں کوئی عبادت کرتی رہی ہیں یہ نتیجہ نکالنا کہ آئندہ بھی
وہ کی جائے صحیح نہیں - قرآن کریم نے اس اعتراض کے وزن
کو قبول کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ
پہلی اُمتوں میں روزہ کا وجود اُس کی فضیلت کی کوئی دلیل ہے
بلکہ اس کے صرف یہ معنے ہیں کہ تم پر ہی کوئی زائد بوجھ نہیں
ڈالا گیا - بلکہ پہلوں پر بھی یہ بوجھ ڈالا گیا تھا - پس یہ
روزوں کی فضیلت کی دلیل نہیں بلکہ روزوں کی اہمیت کی
دلیل ہے - روزوں کی فضیلت اور اُس کے فوائد پر لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ کے الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے
کہ روزے تم پر اس لئے فرض کئے گئے ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
تاکہ تم بچ جاؤ - اس کے کئی معنے ہوسکتے ہیں - مثلاً ایک معنی
تو یہی ہیں کہ ہم نے تم پر اس لئے روزے فرض کئے ہیں تاکہ تم
اُن قوموں کے اعتراضوں سے بچ جاؤ جو روزے رکھتی رہی
ہیں - جو بھوک اور پیاس کی تکلیف برداشت کرتی رہی ہیں -
جو موسم کی شدت کو برداشت کرکے خدا تعالیٰ کو خوش کرتی
رہی ہیں - اگر تم روزے نہیں رکھوگے تو وہ کہیں گی ہمارا دعویٰ
ہے کہ ہم باقی قوموں سے روحانیت میں بڑھ کر ہیں لیکن ..
تقویٰ تم میں نہیں جو دوسری قوموں میں پایا جاتا تھا - غرض
اگر اسلام میں روزے نہ ہوتے تو باقی مسلمان دوسری قوموں
کے سامنے ہدفِ ملامت بنے رہتے - عیسائی کہتے - یہ بھی
کوئی مذہب ہے اس میں روزے تو ہیں ہی نہیں جن سے
قلوب کی صفائی ہوتی ہے - جن کے ساتھ روحانی ساکھ بنتی
ہے - جن کے ذریعہ انسان بدی سے بچتا ہے - یہودی کہتے
کہ ہم نے سینکڑوں سال روزے رکھے لیکن مسلمانوں میں
روزے نہیں - اسی طرح زرتشتی ہندو اور دوسری سب قومیں
کہتیں - اسلام بھی کوئی مذہب ہے - اس میں روزے نہیں -
ہم روزے رکھتے ہیں اور اس طرح خدا تعالیٰ کو خوش کرتے
ہیں - غرض ساری دنیا مسلمانوں کے مقابلہ میں آجاتی اور
کہتی مسلمانوں میں روزے کیوں نہیں - پس فرمایا اے مسلمانو!
ہم تم پر روزے فرض کرتے ہیں - لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ
تم دشمن کے اعتراضات سے بچ جاؤ - اگر اسلام میں روزہ
نہ ہوتا یا تم روزے نہ رکھتے تو غیر مذاہب والے تم پر
جائز طور پر اعتراض کرتے اور تم اُن کی نگاہوں میں حقیر ہو جاتے -
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ میں دوسرا اشارہ اس امر کی طرف
کیا گیا ہے کہ اس ذریعہ سے خدا تعالیٰ روزہ دار کا محافظ
ہو جاتا ہے - کیونکہ اِتَّقَاءٌ کے معنے ہیں ڈھال بنانا - وقایہ
بنانا - نجات کا ذریعہ بنانا - پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے
کہ تم پر روزے رکھنے اس لئے فرض کئے گئے ہیں تاکہ تم خدا تعالیٰ
کو اپنی ڈھال بنا لو اور ہر شر سے اور ہر خیر کے فقدان سے

محفوظ رہو۔ ضعف دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کو کوئی شر پہنچ جائے اور دوسرے یہ کہ کوئی نیکی اُس کے ہاتھ سے جاتی رہے۔ جیسے کسی کو کوئی مار بیٹھے تو یہ بھی ایک شر ہے۔ اور یہ بھی شر ہے کہ کسی کے ماں باپ اُس سے ناراض ہو جائیں۔ حالانکہ اگر کسی کے والدین ناراض ہو کر اُس کے گھر سے نکل جائیں تو بظاہر اس کا کوئی نقصان نظر نہیں آتا۔ بلکہ اُن کے کھانے کا خرچ بچ سکتا ہے۔ لیکن ماں باپ کی رضامندی ایک خیر اور برکت ہے اور جب وہ ناراض ہو جائیں تو انسان ایک خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اِتّقاء اِن دونوں باتوں پر دلالت کرتا ہے اور متّقی وہ ہے جسے ہر قسم کی خیر مل جائے اور وہ ہر قسم کی ذلّت اور شر سے محفوظ رہے۔

اِس سے آگے پھر شر کا دائرہ بھی ہر کام کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص گاڑی میں سفر کر رہا ہے تو اُس کا شر سے محفوظ رہنا یہی ہے کہ اُسے کوئی حادثہ پیش نہ آئے۔ اور وہ بحفاظت منزلِ مقصود پر پہنچ جائے۔

اِسی طرح روزے کے سلسلہ میں بھی ایسے ہی خیر و شر مراد ہو سکتے ہیں جن کا روزے سے تعلق ہو۔ روزہ ایک دینی مسئلہ ہے۔ یا بلحاظ صحتِ انسانی دنیوی امور سے بھی کسی حد تک تعلق رکھتا ہے۔ پس لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے یہ معنے ہوئے کہ تا تم دینی اور دنیوی شرور سے محفوظ رہو۔ دینی خیر و برکت تمہارے ہاتھ سے نہ جاتی رہے یا تمہاری صحت کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ کیونکہ بعض دفعہ روزے کئی قسم کے امراض سے نجات دلانے کا بھی موجب ہو جاتے ہیں۔

آجکل کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بڑھاپا یا ضعف آتے ہی اس وجہ سے ہیں کہ انسان کے جسم میں زائد مواد جمع ہو جاتے ہیں اور اُن سے بیماری یا موت پیدا ہوتی ہے۔ بعض نادان تو اس خیال میں اِس حد تک ترقی کر گئے ہیں کہ کہتے ہیں جس دن ہم زائد مواد کو فنا کرنے میں کامیاب ہو گئے اُس دن موت بھی دنیا سے اُٹھ جائیگی۔ یہ خیال اگرچہ احمقانہ ہے تاہم اِس میں کوئی شُبہ نہیں کہ تھکان اور کمزوری وغیرہ جسم میں زائد مواد جمع ہونے ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور روزہ اس کے لئے بہت مفید ہے۔ مَیں نے خود دیکھا ہے کہ صحت کی حالت میں جب روزے رکھے جائیں تو دورانِ رمضان میں بے شک کچھ کوفت محسوس ہوتی ہے۔ مگر رمضان کے بعد جسم میں ایک نئی قوت اور تروتازگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ فائدہ تو صحتِ جسمانی کے لحاظ سے ہے مگر رُوحانی لحاظ سے اِس کا یہ فائدہ ہے کہ جو لوگ روزے رکھتے ہیں خدا تعالیٰ اُن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے۔ اِسی لئے روزوں کے ذکر کے بعد خدا تعالیٰ نے دعاؤں کی قبولیت کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ مَیں اپنے بندوں کے قریب ہوں اور اُن کی دعاؤں کو سُنتا ہوں۔ پس روزے خدا تعالیٰ کے فضل کو جذب کرنے والی چیز ہیں اور روزے رکھنے والا خدا تعالیٰ کو اپنی ڈھال بنا لیتا ہے جو اُسے ہر قسم کے دُکھوں اور شرور سے محفوظ رکھتا ہے۔

پھر روزے کے ذریعہ دُکھوں سے انسان اِس طرح بھی بچتا ہے کہ (۱) جب ■■ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے لئے تکلیف میں ڈالتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس کے گناہوں کی سزا سے اُسے بچا لیتا ہے۔ (۲) جب وہ فاقے رہ کر بھوک کی تکلیف محسوس کرتا ہے تو اپنے غریب بھائیوں کی خبر گیری کرتا ہے اور اُن کا ہلاکت سے بچنا خود اُسے بھی ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔ کیونکہ بعض افرادِ قوم کے بچنے سے آخر ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے دنوں میں بہت کثرت سے صدقہ و خیرات کیا کرتے تھے۔ احادیث میں آتا ہے کہ رمضان کے دنوں میں آپ تیز چلنے والی آندھی کی طرح صدقہ کیا کرتے تھے۔ اور درحقیقت یہ قومی ترقی کا ایک بہت بڑا گر ہے کہ انسان اپنی چیزوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ تمام قسم کی تباہیاں اُسی وقت

آتی ہیں جب کسی قوم کے افراد میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اُن کی چیزیں اُنہی کی ہیں دوسروں کا اُن میں کوئی حق نہیں اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا حق اُنہیں کو ہے جن کو وہ چیزیں دی گئی ہیں ۔ دنیا کے نظام کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ میری چیز دوسرا استعمال کرے ۔ اور رمضان اس کی عادت ڈالتا ہے ۔ روپیہ ہمارا ہے ۔ کھانے پینے کی چیزیں ہماری ہیں ۔ مگر حکم یہ ہے کہ دوسروں کو ان سے فائدہ پہنچاؤ ۔ اور کھلاؤ ۔ کیونکہ اس سے دنیا کے تمدن کی بنیاد قائم ہوتی ہے ۔ پھر روزوں کے ذریعہ انسان ہلاکت سے اس طرح بھی محفوظ رہتا ہے کہ روزے انسان کے اندر مشقت برداشت کرنے کا مادہ پیدا کرتے ہیں ۔ اور جو لوگ ہر قسم کی مشقت برداشت کرنے کے عادی ہوں مشکلات کے آنے پر ہمت نہیں ہارتے بلکہ دلیری سے اُنکا مقابلہ کرتے اور کامیابی حاصل کرتے ہیں ۔

دنیوی گورنمنٹوں میں بھی ایک ریزرو فوج ہوتی ہے ۔ جو سال میں ایک یا دو مہینے کام کرتی ہے اور جب جنگ کا موقعہ آتا ہے تو چونکہ اس کو مشق کروائی ہوئی ہوتی ہے اسلئے فوراً اُسے بلوا لیا جاتا ہے ۔ چونکہ عام طور پر تمام مسلمان بارہ مہینے روزے نہیں رکھتے اور نہ ہی تہجد پڑھتے ہیں اس لئے رمضان میں خصوصیت کے ساتھ ہدایت فرما دی کہ تمام مسلمان اس ماہ میں روزوں کی مشق کریں جس طرح فوج جو مشق کرتی رہتی ہے دشمن کی فوج سے شکست نہیں کھاتی اسی طرح جس قوم کے لوگ متقی اور نیک ہوتے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کے لئے ہر ایک چیز کو چھوڑنے والے ہوتے ہیں شیطان کی مجال نہیں ہوتی کہ اُن کو زک دے سکے یہی وجہ ہے کہ جب تک تمام مسلمان روحانی سپاہی تھے شیطان نے اُن پر کوئی حملہ نہیں کیا لیکن جب خال خال رہ گئے تو اُس وقت اُن پر حملہ کیا گیا ۔ اور شیطان نے اُن کے دل میں طرح طرح کے وسوسے ڈال کر اُن کو تباہ کر دیا ۔

پس روزے قوم میں قربانی کی عادت پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں ۔ دین کی خدمت کے لئے بالعموم مومنوں کو گھروں سے نکلنا پڑتا ہے ۔ اور تبلیغی جہاد میں کھانے پینے کی تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ غرباء کو تو ایسی تکالیف برداشت کرنے کی عادت ہوتی ہے مگر امراء کو اس کی عادت نہیں ہوتی ۔ پس روزوں کے ذریعہ اُن کو بھی بھوک اور پیاس کی برداشت کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ جس دن خدا تعالیٰ کی طرف سے آواز آئے کہ اے مسلمانو ! آؤ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو ۔ تو وہ سب اکٹھے اُٹھ کھڑے ہوں اور خدا تعالیٰ کی راہ میں بغیر کسی قسم کا بوجھ محسوس کئے اپنے آپ کو پیش کر دیں ۔

پس روزوں کا یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے کہ اس کے ذریعہ نیکی کیلئے مشقت برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے انسان دنیا میں کئی قسم کے کام کرتا ہے ۔ وہ محنت و مشقت بھی کرتا ہے ۔ وہ آوارگی بھی کرتا ہے ۔ وہ اِدھر اُدھر بھی پھرتا ہے وہ گپیں بھی ہانکتا ہے ۔ بالکل فارغ نہ انسانی دماغ رہتا ہے ۔ نہ اُس کا جسم ۔ کچھ نہ کچھ کام انسان ضرور کرتا رہتا ہے ۔ مگر بعض لغو کام ہوتے ہیں ۔ بعض مضر اور بعض مفید اور بعض بہت ہی اچھے ۔ لیکن رمضان انسان کو ایک ایسے کام کی عادت ڈالتا ہے جس کے نتیجہ میں اُسے نیک کاموں میں مشقت برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے ۔ انسانی زندگی کی راحت اور آرام کی چیزیں کیا ہوتی ہیں ۔ یہی کھانا پینا سونا اور جنسی تعلقات ۔ تمدن کا اعلیٰ نمونہ جنسی تعلقات ہیں ۔ جن میں دوستوں سے ملنا اور عزیزوں سے تعلقات رکھنا بھی شامل ہے ۔ مگر جنسی تعلقات میں سب سے زیادہ قریبی تعلق میاں بیوی کا ہے ۔ پس انسانی آرام انہی چند باتوں میں مضمر ہے کہ وہ کھاتا ہے ۔ وہ پیتا ہے ۔ وہ سوتا ہے ۔ اور وہ جنسی تعلقات قائم رکھتا ہے ۔ کسی صوفی نے کہا ہے کہ تصوف کی جان کم بولنا ۔ کم کھانا ۔ اور کم سونا ہے ۔ اور رمضان اس تصوف کی ساری جان کا نچوڑ اپنے اندر رکھتا ہے

کم سونا آپ ہی اِس میں آجاتا ہے۔ کیونکہ رات کو تہجد کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے۔ کم کھانا بھی ظاہر بات ہے کیونکہ سارا دن فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جنسی تعلقات کی کمی بھی ظاہر ہے۔ پھر کم بولنا بھی رمضان میں آجاتا ہے۔ اِس لئے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا۔ روزہ یہ نہیں کہ انسان اپنا مُنہ کھانے پینے سے بند رکھے بلکہ روزہ یہ ہے کہ تُو لغو باتیں بھی نہ کرے۔ پس روزہ دار کے لئے بیہودہ باتوں سے بچنا لڑائی جھگڑے سے بچنا اور اِسی طرح کی اَور لغو باتوں سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اِس طرح کم بولنا بھی رمضان میں آگیا۔ گویا کم کھانا۔ کم بولنا۔ کم سونا اور جنسی تعلقات کم کرنا یہ چاروں باتیں رمضان میں آگئیں۔ اور یہ چاروں چیزیں نہایت ہی اہم ہیں۔ اور انسانی زندگی کا ان سے گہرا تعلق ہے۔ پس جب ایک روزہ دار ان چاروں آرام و آسائش کے سامانوں میں کمی کرتا ہے تو اُس میں مشقت برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کے ہر دَور میں مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا اور کامیابی حاصل کرتا ہے۔

پھر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں ایک اَور فائدہ یہ بتایا کہ روزہ رکھنے والا برائیوں اور بدیوں سے بچ جاتا ہے۔ اور یہ غرض اِس طرح پوری ہوتی ہے کہ دنیا سے انقطاع کی وجہ سے انسان کی رُوحانی نظر تیز ہو جاتی ہے اور وہ اُن عیوب کو دیکھ لیتا ہے جو اُسے پہلے نظر نہ آتے تھے۔ اِسی طرح گناہوں سے انسان اِس طرح بھی بچ جاتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے۔ روزہ اس چیز کا نام نہیں کہ کوئی شخص اپنا مُنہ بند رکھے اور سارا دن نہ کچھ کھائے اور نہ پیئے بلکہ روزہ یہ ہے کہ مونہہ کو کھانے پینے سے ہی نہ روکا جائے بلکہ اُسے ہر روحانی نقصان دہ اور ضرر رساں چیز سے بھی بچایا جائے نہ جھوٹ بولا جائے۔ نہ گالیاں دی جائیں۔ نہ غیبت کی جائے۔ نہ جھگڑا کیا جائے۔ اب دیکھو زبان پر قابو رکھنے کا حکم تو ہمیشہ کے لئے ہے لیکن روزہ دار خاص طور پر اپنی زبان پر قابو رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایک مہینہ تک اپنی زبان پر قابو رکھتا ہے تو یہ امر باقی گیارہ مہینوں میں بھی اُس کیلئے حفاظت کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور اِس طرح روزہ اُسے ہمیشہ کے لئے گناہوں سے بچا لیتا ہے۔

پھر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں روزوں کا ایک اَور فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اِس کے نتیجہ میں تقویٰ پر ثباتِ قدم حاصل ہوتا ہے اور انسان کو رُوحانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ روزوں کے نتیجہ میں صرف امراء ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں کرتے بلکہ غرباء بھی اپنے اندر ایک نیا روحانی انقلاب محسوس کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے وصال سے لطف اندوز ہوتے ہیں غرباء بیچارے سارا سال تنگی سے گذارہ کرتے ہیں۔ اور بعض دفعہ انہیں کئی کئی فاقے بھی آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے ذریعہ انہیں توجہ دلائی ہے کہ وہ ان فاقوں سے بھی ثواب حاصل کر سکتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے لئے فاقوں کا اتنا بڑا ثواب ہے کہ حدیث میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اُجْزٰی بِہٖ۔ یعنی ساری نیکیوں کے فوائد اور ثواب الگ الگ ہیں لیکن روزہ کی جزاء خود میری ذات ہے۔ اور خدا تعالیٰ کے ملنے کے بعد انسان کو اَور کیا چاہیئے۔ غرض روزوں کے ذریعہ غرباء کو یہ نکتہ بتایا گیا ہے کہ ان تنگیوں پر بھی اگر وہ بے صبر اور ناشکرے نہ ہوں اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں جیسا کہ بعض نادان کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے کیا دیا ہے کہ نمازیں پڑھیں اور روزے رکھیں تو یہی فاقے اُن کے لئے نیکیاں بن جائیں گی۔ اور ان کا بدلہ خود خدا تعالیٰ ہو جائیگا۔ پس اللہ تعالیٰ نے روزوں کو غرباء کے لئے تسکین کا موجب بنایا ہے تاکہ وہ مایوس نہ ہوں اور یہ نہ کہیں کہ ہماری فقر و فاقہ کی زندگی کس کام کی۔ اللہ تعالیٰ نے روزہ میں

انہیں یہ گُر بتایا ہے کہ اگر وہ اس فقر و فاقہ کی زندگی کو خدا تعالیٰ کی رضاء کے مطابق گذاریں تو بھی انہیں خدا تعالیٰ سے مل سکتی ہے۔ دنیا میں اس قدر لوگ امیر نہیں جتنے غریب ہیں اور تمام دینی سلسلوں کی ابتداء بھی غرباء سے ہی ہوئی ہے اور انتہا بھی غرباء پر ہی ہوئی۔ بلکہ قریبًا تمام انبیاء بھی غرباء میں سے ہی ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی بڑے آدمی نہ تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی بڑے آدمی نہ تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی کوئی امیر کبیر نہ تھے۔ آپ کی جائیداد کی قیمت قادیان کے ترقی کرنے کے باعث بڑھ گئی۔ ورنہ اس کی قیمت خود آپ نے دس ہزار روپیہ لگائی تھی۔ اور اتنی مالیت کی جائیداد سے کونسی بڑی آمد ہوسکتی ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام بھی بڑے آدمی نہ تھے۔ اگرچہ انبیاء کو اللہ تعالیٰ بعد میں بڑا بنا دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ بعد میں فضل کے طور پر ہوا۔ ابتداء میں تمام سلسلوں کے بانی غریب ہی ہوئے امراء اور بادشاہ نہیں ہوئے۔ بیشک درمیانی طبقہ کے لوگوں میں سے بھی بعض دفعہ انبیاء ہوتے رہے لیکن بادشاہ صرف چند ایک ہی ہوئے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام یا حضرت سلیمان علیہ السلام۔ مگر یہ بھی ایسے نہیں ہیں کہ کسی سلسلہ کے بانی ہوں۔ پھر دنیا کی اسی فیصدی آبادی غریب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی کثرت کی دلجوئی رمضان کے ذریعہ کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ مت سمجھو کہ فاقہ کش کو خدا تعالیٰ نہیں مل سکتا اگر ایسا ہوتا تو رمضان کے نتیجہ میں کیوں ملتا۔ پس وہ غرباء جو سمجھتے ہیں کہ ان کی عمر رائیگاں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رمضان کے ذریعہ بتایا ہے کہ وہ انہی فاقوں میں سے گذر کر اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے فیوض حاصل کرسکتے ہیں بشرطیکہ فاقہ میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کو نہ بھولیں اور اس کے متعلق اپنی زبان پر کوئی حرفِ شکایت نہ لائیں۔ اس کے مقابلہ میں روزہ امیر لوگوں کے لئے تقویٰ کے حصول کا ذریعہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب ایک انسان جس کے پاس کھانے پینے کے تمام سامان موجود ہوتے ہیں محض اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے اپنے آپ کو فاقہ میں ڈالتا ہے اور خدا تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے کچھ نہیں کھاتا۔ اور جو حلال چیزیں خدا تعالیٰ نے اُسے دی ہیں انہیں بھی استعمال نہیں کرتا۔ اُس کے گھر میں گھی۔ گوشت۔ چاول وغیرہ کھانے کی تمام ضروریات موجود ہوتی ہیں۔ مگر وہ خدا تعالیٰ کے لئے انہیں ترک کر دیتا ہے تو اس کے دل میں خود بخود یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جب میں نے حلال چیزوں کو بھی خدا تعالیٰ کی رضاء کے لئے چھوڑ دیا ہے تو میں ان چیزوں کی کیوں خواہش کروں جنہیں خدا تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہُوا ہے۔ اِس طرح اُس کے اندر ضبطِ نفس کی قوت پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے قدم کو نیکیوں کے میدان میں بڑھاتا چلا جاتا ہے

روزوں کا ایک رُوحانی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے انسان خدا تعالیٰ سے مشابہت اختیار کر لیتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نیند سے پاک ہے۔ انسان ایسا تو نہیں کرسکتا کہ وہ اپنی نیند کو بالکل چھوڑ دے۔ مگر وہ اپنی نیند کے ایک حصّہ کو روزوں میں خدا تعالیٰ کے لئے قربان ضرور کرتا ہے۔ سحری کھانے کے لئے اُٹھتا ہے۔ تہجد پڑھتا ہے۔ عورتیں جو روزہ نہ بھی رکھیں وہ سحری کے انتظام کے لئے جاگتی ہیں۔ کچھ وقت دعاؤں میں اور کچھ نماز میں صرف کرنا پڑتا ہے اور اِس طرح رات کا بہت کم حصّہ سونے کے لئے باقی رہ جاتا ہے اور کام کرنے والوں کے لئے تو گرمی کے موسم میں دو تین گھنٹے ہی نیند کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ اِس طرح انسان کو اللہ تعالیٰ سے ایک مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کھانے پینے سے پاک ہے۔ انسان کھانا پینا بالکل تو نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر پھر بھی رمضان میں اللہ تعالیٰ سے وہ ایک قسم کی مشابہت ضرور پیدا کر لیتا ہے۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ سے خیر ہی خیر ظاہر ہوتا ہے اسی طرح انسان کو بھی روزوں میں خاص طور پر نیکیاں کرنے کا حکم ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے۔ جو شخص غیبت چغلخوری اور بدگوئی وغیرہ بُری باتوں
سے پرہیز نہیں کرتا اس کا روزہ نہیں ہوتا۔ گویا مومن بھی کوشش کرتا
ہے کہ اُس سے خیر ہی خیر ظاہر ہو۔ اور وہ غیبت اور لڑائی جھگڑے
سے بچا رہے۔ اس طرح وہ اُس حد تک خدا تعالیٰ سے مشابہت
پیدا کر لیتا ہے جس حد تک ہو سکتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر چیز
اپنی شکل کی طرف دوڑتی ہے۔ فارسی میں ضرب المثل ہے کہ

"کند ہمجنس با ہم جنس پرواز"

پس روزہ کا ایک روحانی فائدہ یہ ہے کہ انسان کا خدا تعالیٰ
سے اعلیٰ درجہ کا اتصال ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ خود اس کا
محافظ بن جاتا ہے۔

پھر روزوں کا روحانی رنگ میں ایک یہ بھی فائدہ ہے
کہ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا الہام انسانی قلب پر نازل ہوتا
ہے اور اُس کی کشفی نگاہ میں زیادہ جِلا اور نُور پیدا ہو جاتا ہے
درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ
کی کوئی عادت تو نہیں مگر اس میں عادت سے ایک مشابہت
ضرور پائی جاتی ہے۔ انسان کی طرح اُس کی آنکھیں تو نہیں مگر
وہ بصیر ضرور ہے۔ اُس کے کان نہیں مگر وہ سمیع ضرور ہے
اسی طرح گو اس کی کوئی عادت نہیں پائی جاتی مگر اس میں یہ
بات ضرور پائی جاتی ہے کہ جب وہ ایک کام کرتا ہے تو
اُسے دوہراتا ہے۔ انسان میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔
بعض لوگوں کو ہاتھ یا پَیر ہلانے کی عادت ہوتی ہے۔ اور
وہ انہیں بار بار ہلاتے ہیں۔ اور عادت کے یہی معنے ہوتے
ہیں کہ کوئی بات بار بار کی جائے۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ
میں بھی ہے کہ جب وہ ایک خاص موقعہ پر اپنا فضل نازل
کرتا ہے تو اس موقعہ پر بار بار فضل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی
اِس صفت کے ماتحت چونکہ رمضان کے مہینہ میں قرآن کریم
نازل ہُوا تھا۔ اس لئے اگر اس رسولؐ کی اتباع کی جائے جس
پر قرآن کریم نازل ہُوا تو اللہ تعالیٰ کی عادت سے مشابہت
رکھنے والی صفت کے ماتحت ان لوگوں کو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی اقتداء کی وجہ سے دنیا سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور دنیا
میں رہتے ہوئے بھی اس سے تعلقات نہیں رکھتے۔ کھانے پینے
اور سونے میں کمی کرتے ہیں۔ بے ہودہ گوئی وغیرہ سے پرہیز
کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے الہام سے نوازتا اور اُن پر رؤیا صادقہ
اور کشوفِ صحیحہ کا دروازہ کھول دیتا ہے اور اسرارِ غیبیہ سے
مطلع کرتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا
بھی ایک الہام ہے کہ

پھر بہار آئی خدا کی بات پھر پوری ہوئی

اس میں بھی وہی عادت والی بات بیان کی گئی ہے۔ خدا تعالیٰ
نے ایک دفعہ بہار میں اپنی رحمت کی شان دکھائی تھی اس لئے
جب پھر موسم بہار آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کہتی ہے
کہ اب کے میرے بندے کیا کہیں گے اس لئے ہم پھر اپنی شان
دکھاتے ہیں۔ اور اگر بندے اس سے فائدہ اٹھائیں تو اگلی
بہار میں پھر وہی انعام نازل ہوتا ہے۔ غرض کلام الٰہی کو اگر
درخت تصوّر کر لیا جائے تو جو صفتِ الٰہی عادت کے مشابہ
ہے وہ ہر رمضان میں اسے جھنجھوڑتی ہے اور اس سے مومنوں
کو تازہ بتازہ پھل حاصل ہوتے ہیں۔

پھر روزوں سے اس رنگ میں بھی رُوحانیت ترقی کرتی
ہے کہ جب انسان خدا تعالیٰ کے لئے کھانا پینا ترک کرتا ہے تو
اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے لئے اُسکی راہ میں
مرنے کو تیار ہے۔ اور جب وہ اپنی بیوی سے مخصوص تعلقات
قطع کرتا ہے تو اس بات پر آمادگی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ
خدا تعالیٰ کے لئے اپنی نسل کو بھی قربان کر دینے کیلئے تیار
ہے۔ اور جب وہ روزوں میں ان دونوں اقسام کے نمونے
پیش کر دیتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی لقاء کا مستحق ہو جاتا ہے
اور خدا تعالیٰ سے تعلق قائم ہونے اور روحانیت کے مضبوط
ہو جانے کی وجہ سے وہ شخص ہمیشہ کیلئے گمراہی سے محفوظ
ہو جاتا ہے۔

پھر رمضان کے ذریعہ استقلال کی عادت بھی ڈالی جاتی

ہے کیونکہ یہ نیکی متواتر ایک عرصہ تک چلتی ہے۔ انسان دن میں کئی کئی مرتبہ کھانے کا عادی ہوتا ہے۔ غرباء اور امراء شہری اور دیہاتی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق عام ایام میں کئی دفعہ کھاتے پیتے ہیں۔ مگر رمضان میں تمام کھانے سمٹ سمٹا کر صرف دو بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جہاں دوسرے ایام میں وہ ساری رات سوئے رہتے ہیں وہاں رمضان کے ایام میں انہیں تہجد اور سحری کے لئے اُٹھنا پڑتا ہے اور دن کو بھی قرآن کریم کی تلاوت میں اپنا کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ غرض رمضان کے ایام میں اپنی عادت کی بہت کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ قربانی ایک دن نہیں دو دن نہیں بلکہ متواتر ایک مہینہ تک بغیر ناغہ کے کرنی پڑتی ہے پس روزوں سے استقلال کا عظیم الشان سبق ملتا ہے۔ اور درحقیقت بغیر مستقل قربانیوں کے کوئی شخص خدا تعالیٰ کو نہیں پا سکتا کیونکہ حقیقی محبت جوش دلانے سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ وہ عارضی ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقی محبت استقلال سے تعلق رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو معلوم ہوا کہ آپ کی ایک بیوی نے چھت سے ایک رسّہ میں لٹکا رکھا ہے کہ جب نماز پڑھتے پڑھتے انہیں اونگھ آنے لگے تو اُس کا سہارا لے لیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کوئی عبادت نہیں۔ عبادت وہی ہے جسے انسان بشاشت سے ادا کر سکے۔ اور جس کے نتیجہ میں ایسا ملال پیدا نہ ہو جو اس کے دوام اور استقلال کو قطع کرنے کا موجب بن جائے۔

اسی طرح روزوں کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مومنوں کو ایک مہینہ تک اپنے جائز حقوق کو بھی ترک کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ انسان گیارہ مہینے حرام چھوڑنے کی مشق کرتا ہے مگر بارھویں مہینہ میں وہ حرام نہیں بلکہ حلال چھوڑنے کی مشق کرتا ہے یعنی روزوں کے علاوہ دوسرے ایام میں ہم یہ نمونہ دکھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے لئے ہم کس طرح حرام چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر روزوں کے ایام میں ہم یہ نمونہ دکھاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے لئے کس طرح حلال چھوڑ سکتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حلال چھوڑنے کی عادت پیدا کئے بغیر دنیا میں حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں اکثر فساد اس لئے نہیں ہوتے کہ لوگ حرام چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ اکثر فساد اس لئے ہوتے ہیں کہ لوگ حلال کو بھی ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو ناجائز طور پر کسی کا حق دبائیں مگر وہ لوگ دنیا میں بہت زیادہ ہیں جو لڑائی اور جھگڑے کو پسند کریں گے مگر اپنا حق چھوڑنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہونگے۔ سینکڑوں پاگل اور نادان دنیا میں ایسے ہیں جو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے دنیا میں عظیم الشان فتنہ و فساد پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ دنیا کا امن برباد ہو رہا ہے۔ حالانکہ اگر وہ ذاتی قربانی کریں تو بہت سے جھگڑے اور فساد مٹ سکتے ہیں اور نہایت خوشگوار امن قائم ہو سکتا ہے۔ پس رمضان کا مہینہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ تم صرف حرام ہی نہ چھوڑو بلکہ خدا تعالیٰ کے لئے اگر ضرورت پڑ جائے تو حلال یعنی اپنا حق بھی چھوڑو تاکہ دنیا میں نیکی قائم ہو اور خدا تعالیٰ کا نام بلند ہو۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی عبادتیں اپنے اندر کئی قسم کے سبق رکھتی ہیں۔ بعض سبق ایسے ہوتے ہیں جو ہر عبادت سکھاتی ہے اور بعض سبق ایسے ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ عبادتوں کی نسبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعض سبق ایسے ہیں جو ساری عبادتوں کی مجموعی حالت سے پیدا ہوتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ عالم میں بھی یہ نقشہ نظر آتا ہے کہ اس کا ہر فرد اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے۔ پھر دو افراد مل کر اپنے اندر حقیقت رکھتے ہیں۔ پھر دو سے زیادہ افراد مل کر ایک حقیقت پیدا کرتے ہیں۔ پھر سارا عالم اپنے اندر ایک حقیقت رکھتا ہے یہی حال عبادتوں کا ہے۔ اور جس طرح قانونِ قدرت میں

ایک ترتیب اور ربط موجود ہے۔ اسی طرح عبادتوں میں بھی ربط ہے۔ مگر یہ بات صرف شریعت اسلامیہ میں ہی پائی جاتی ہے باقی شرائع میں نہیں۔ ان میں نماز۔ زکوٰۃ اور روزہ کی قسم کی عبادتیں ہیں۔ مگر ان کا آپس میں کوئی ربط نہیں۔ وہ ایسی ہی ہیں جیسے بکھری ہوئی اینٹیں۔ لیکن شریعت اسلامیہ کو اگر دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس کا ہر حکم اپنے اندر حقیقت رکھتا ہے۔ پھر سلسلے کے سارے احکام مل کر اپنے اندر ایک اور حکمت رکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال نماز اور روزہ ہے۔ نماز اپنی ذات میں ایک سبق رکھتی ہے اور روزہ بھی اپنی ذات میں ایک سبق رکھتا ہے۔ مگر پھر نماز اور روزہ مل کر ایک اور سبق رکھتے ہیں۔ اگر نماز نہ ہوتی صرف روزے ہوتے تو یہ سبق رہ جاتا۔ اور اگر روزے نہ ہوتے صرف نماز ہی ہوتی تب بھی یہ سبق رہ جاتا۔ بیشک روزے اپنی ذات میں مفید ہیں اور نماز اپنی ذات میں مفید ہے جس طرح اسلام کی ساری عبادتیں اپنی اپنی ذات میں مفید ہیں لیکن نماز اور روزہ مل کر ایک نیا سبق دیتے ہیں۔ جس کا میں اس موقعہ پر ذکر کر رہا ہوں۔

نماز کا اصل مقام طہارت ہے جسے وضو کی حالت کہتے ہیں۔ اسی لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص وضو کرکے نماز کے لئے بیٹھ جاتا ہے وہ نماز ہی کی حالت میں ہوتا ہے۔ نماز اس حالت کا انتہائی مقام ہے۔ ورنہ اصل نماز مومن کی وہ قلبی کیفیت ہے جو وضو سے تعلق رکھتی ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وضو کی کیا حقیقت ہے؟ وضو کے ذریعہ جو فعل ہم کرتے ہیں وہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ کوئی چیز جسم سے خارج نہ ہو خواہ وہ پیشاب یا خانہ کے رنگ میں خارج ہو خواہ مرد عورت کے تعلقات کے ذریعہ سے خارج ہو یا اور ایسے رنگوں سے خارج ہو جن سے طہارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ غرض وضو کا مدار کسی چیز کے جسم سے نہ نکلنے پر ہے

اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نماز کی طہارت کا مدار اس امر پر ہے کہ کوئی چیز جسم سے خارج نہ ہو۔ لیکن روزہ کی طہارت کا مدار اس امر پر ہے کہ کوئی چیز جسم کے اندر داخل نہ ہو۔ بیشک روزہ میں مرد و عورت کے تعلقات سے بھی روکا گیا ہے۔ مگر یہ اس لئے ہے کہ روزہ کی حالت میں انسان کی کلی توجہ اور طرف نہ ہو۔ ورنہ روزہ کا اصل مدار کسی چیز کے جسم میں داخل نہ ہونے پر ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ روزہ کا مدار اس امر پر ہے کہ کوئی چیز جسم میں داخل نہ ہو۔ اگر صرف نماز ہی ہوتی اور وضو صرف ظاہری صفائی ہوتا تو کہا جاتا کہ اس سے مراد صرف ہاتھ منہ اور پاؤں کا دھونا ہے۔ اسی طرح اگر روزہ ہوتا اور کوئی چھوٹی موٹی چیز کھائی جاتی تو کہا جا سکتا تھا کہ روزہ سے مراد فاقہ کرانا ہے۔ لیکن جسم سے کچھ خارج ہونے سے وضو کا باطل ہو جانا اور کسی چیز کے جسم میں داخل ہونے سے روزہ کا ٹوٹ جانا بتاتا ہے کہ کسی چیز کے خارج ہونے کا نماز سے اور کسی چیز کے اندر داخل ہونے کا روزہ سے تعلق ہے۔ اور ان دونوں کو ملا کر یہ لطیف بات نکلتی ہے کہ انسان طہارت میں اُس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ دو احتیاطیں نہ کرے۔ یعنی بعض چیزیں اپنے جسم سے نکلنے نہ دے اور بعض چیزیں داخل نہ ہونے دے۔ اگر ہم ان دو باتوں کا لحاظ رکھیں کہ بعض چیزوں کو جسم سے نکلنے نہ دیں اور بعض کو داخل نہ ہونے دیں تو طہارت کامل ہو جاتی ہے۔ نماز اور روزہ سے مجموعی طور پر انسان کو یہ گر سکھایا گیا ہے کہ ہر انسان کو یہ امر مدنظر رکھنا چاہیئے کہ بعض چیزوں کے جسم سے نکلنے کی وجہ سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے ان کو نکلنے نہ دے اور بعض چیزوں کے جسم میں داخل ہونے کی وجہ سے وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ انہیں داخل نہ ہونے دے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی گندی چیزیں

ہیں جن کا نکلنا روحانیت کے لحاظ سے مضر ہوتا ہے۔ دُنیا میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ گند کا نکلنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ کیا ایسے گند بھی ہیں جن کا نہ نکلنا اچھا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہمیں قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گند ایسے بھی ہیں جن کا نہ نکلنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کی طبیعت میں غصہ زیادہ ہے۔ اگر کسی موقعہ پر اُسے سخت غصہ آگیا مگر وہ اُسے نکلنے نہیں دیتا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ نیک اور متقی انسان کو بھی غصہ آجاتا ہے مگر وہ اُسے روک لیتا ہے۔ جیسے نماز کے وقت اس بات کا لحاظ رکھ لیتا ہے کہ اُس وقت ایسی چیزیں ظاہر نہ ہوں جو وضو کو باطل کر دیں بعض کیفیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ روک دینے سے کم نکلتی ہیں اور اگر انہیں نکلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو بڑھ جاتی ہیں غصہ بھی ایسی ہی کیفیات میں سے ہے۔ ہمارے ہاں محاورہ بھی یہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اب تو آپ نے غصہ نکال لیا ہے اب جانے دو۔ یعنی گالی گلوچ یا مار پیٹ کے ذریعہ سے غصہ کا اظہار کر لیا ہے۔ لیکن اگر وہ اُسے دبا لیتا اور روک لیتا تو وہ اُس کے لئے نیکی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر کسی کے دل میں کوئی بُرا خیال پیدا ہو مگر وہ اُسے روک لے اور اُس پر عمل نہ کرے تو یہ اس کے لئے نیکی ہو جاتی ہے غرض قلب کے بعض ایسے حالات ہوتے ہیں کہ اگر انہیں ظاہر کیا جائے تو طہارت باطل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ان کو دل ہی میں رکھیں تو نیکی بن جاتی ہے۔ یہ سبق نماز سے حاصل ہوتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی چیز جسم میں داخل نہ ہونے دی جائے اس کی مثال جھوٹ استہزاء چغلخوری اور غیبت وغیرہ کی باتیں ہیں۔ ان کا نہ سننا بھی نیکی ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی باتیں انسان کو روحانیت سے عاری کر دیتی ہیں پس اخلاقِ فاضلہ مکمل کرنے کے لئے ان دونوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ بعض قسم کے گندوں کو باہر نکلنے دیا جائے اور بعض کو اندر داخل نہ ہونے دیا جائے روزہ ہمارے لئے یہ سبق رکھتا ہے کہ ہم ان تمام ناپاک اور گندی باتوں سے بچیں جن کو اپنے اندر داخل کرنے سے ہماری روحانیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کے قرب سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس سوال کا جواب کہ روزے صرف رمضان کے مہینہ میں ہی کیوں رکھوائے جاتے ہیں۔ سارے سال پر ان کو کیوں نہ پھیلا دیا گیا یہ ہے کہ جب تک تواتر اور تسلسل نہ ہو صحیح مشق نہیں ہو سکتی۔ ہر مہینہ میں اگر ایک دو دن کا روزہ رکھ دیا جاتا تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک وقت کے کھانے میں تو بعض اوقات سیر وغیرہ کے باعث بھی دیر ہو جاتی ہے یا بعض اوقات اور مصروفیتوں کے باعث بھی کھانا نہیں کھایا جا سکتا۔ مگر کیا اس سے بھوک اور پیاس کو برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے؟ حکومت بھی فوجیوں سے متواتر مشق کراتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر مہینہ میں ایک دن اُن کی مشق کے لئے رکھ دے۔ غرض جو کام کبھی کبھی کیا جائے اُس سے مشق نہیں ہو سکتی۔ مشق کے لئے مسلسل کام کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پورے ایک ماہ کے روزے مقرر فرما دیئے تا کہ مومنوں کو خدا تعالیٰ کے لئے بھوکا پیاسا رہنے اور رات کو عبادت کے لئے اُٹھنے اور دن کو ذکرِ الٰہی اور تلاوتِ قرآن کرنے کی عادت ہو اور اُن کی رُوحانی صلاحیتیں ترقی کریں۔

غرض رمضان کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص برکات اور خاص رحمتیں لے کر آتا ہے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کے انعام اور احسان کے دروازے ہر وقت ہی کھلے رہتے ہیں اور انسان جب چاہے اُن سے حصہ لے سکتا ہے صرف مانگنے کی دیر ہوتی ہے ورنہ اس کی طرف سے دینے میں دیر نہیں لگتی کیونکہ خدا تعالیٰ اپنے بندہ کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ ہاں بندہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر بعض دفعہ دوسروں کے دروازہ پر چلا جاتا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگِ بدر کے بعد ایک عورت کو دیکھا

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ

(سوتم روزے رکھو) چند گنتی کے دن - اور تم میں سے جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو

فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ

تو (اُسے) اور دنوں میں تعداد (پوری کرنی) ہوگی - اور اُن لوگوں پر جو اس کی (یعنی روزہ کی) طاقت رکھتے ہوں ایک

طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن

مسکین کا کھانا دینا (بطور فدیۂ رمضان کے) واجب ہے ، - اور جو شخص پوری فرمانبرداری سے کوئی نیک کام کریگا تو یہ اسکے لئے بہتر ہوگا - اور اگر

تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۱۸۵)

تم علم رکھتے ہو (تو سمجھ سکتے ہو کہ) تمہارا روزے رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے - ۹۸

کہ وہ پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر پھر رہی تھی - اُسے جو بچہ بھی نظر آتا وہ اُسے اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیتی اور پیار کرکے چھوڑ دیتی - آخر اسی طرح تلاش کرتے کرتے اُسے اپنا بچہ مل گیا اور وہ اُسے لے کر اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئی - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب کرکے فرمایا - اس عورت کو اپنا بچہ ملنے سے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اللہ تعالیٰ کو اپنے گمشدہ بندہ کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے - سو اُس رحیم و کریم ہستی سے تعلق پیدا کرنا کوئی مشکل امر نہیں - ہر گھڑی رمضان کی گھڑی ہو سکتی ہے اور ہر لمحہ قبولیت دُعا کا لمحہ بن سکتا ہے - اگر دیر ہوتی ہے تو بندہ کی طرف سے ہوتی ہے - لیکن یہ بھی اس کے احسانات میں سے ہی ہے کہ اُس نے رمضان کا ایک مہینہ مقرر کر دیا - تاکہ وہ لوگ جو خود نہیں اٹھ سکتے اُن کو ایک نظام کے ماتحت اٹھنے کی عادت ہو جائے - اور اُن کی غفلتیں اُن کی ہلاکت کا موجب نہ ہوں -

پس یاد رکھو کہ روزے کوئی مصیبت نہیں ہیں - اگر یہ کوئی دکھ کی چیز ہوتی تو انسان کہہ سکتا تھا کہ میں دکھ میں کیوں پڑوں - لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے روزے دکھوں سے بچانے اور گناہوں سے محفوظ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کی لقاء حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں - اور گو بظاہر یہ ہلاکت کا باعث معلوم ہوتے ہیں - کیونکہ انسان فاقہ کرتا ہے - جاگتا ہے - بے وقت کھانا کھاتا ہے جس سے معدہ خراب ہو جاتا ہے اور پھر ساتھ ہی اس کے یہ احکام بھی ہیں کہ صدقہ و خیرات زیادہ کرو - اور غرباء کی پرورش کا خیال رکھو مگر یہی قربانیاں ہیں جو اُسے خدا تعالیٰ کا محبوب بناتی ہیں - اور یہی قربانیاں ہیں جو قومی ترقی کا موجب بنتی ہیں -

۹۸ تفسیر :- فرماتا ہے - چند گنتی کے دن ہیں جن میں روزے رکھنا تم پر فرض کیا گیا ہے - ہاں جو تم میں سے بیمار یا مسافر ہو اُس کے لئے اور دنوں میں اس تعداد کا پورا کرنا ضروری ہوگا -

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ اور فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کے الفاظ صاف طور پر بتاتے ہیں کہ یہ روزے جن کا حکم دیا جا رہا ہے نفلی نہیں بلکہ واجب ہیں - اسی لئے فرمایا کہ اگر کوئی بیمار یا مسافر ہو تو اُسے بہر حال بعد میں اس تعداد کو پورا کرنا ہوگا - وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب

رمضان کے دنوں میں مَیں بیمار تھا یا سفر پر گیا ہُوا تھا تو اب رمضان کے بعد مَیں کیوں روزے رکھوں۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ میں رمضان المبارک کے روزوں کا ذکر نہیں بلکہ صرف عام طور پر روزے رکھنے کا ذکر ہے وہ غلطی پر ہیں۔ اگر ان کی یہ بات صحیح ہو تو فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا۔ اوّل تو أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرض ایسے ہی روزوں کا ذکر کیا جارہا ہے جن کے لئے شریعت کی طرف سے بعض ایام مقرر ہیں۔ دوسرے أَيَّامٍ أُخَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایام کسی خاص مہینہ سے متعلق ہیں پس کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ سے عام نفلی روزے مراد لینا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

پھر اس بارہ میں اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے کہ جو شخص بیمار یا مسافر ہو اُسے بیماری اور سفر کی حالت میں روزہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ اَور دنوں میں اس کمی کو پورا کرنا چاہئے مَیں نے اپنے تجربہ کی بنا پر یہ بات دیکھی ہے کہ رمضان کے بارہ میں مسلمانوں میں افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ کئی تعلیمیافتہ لوگوں کو مَیں نے دیکھا ہے کہ وہ رمضان کی برکات کے قائل ہی نہیں اور بغیر کسی بیماری یا عذرِ شرعی کے روزہ کے تارک ہیں۔ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو سارا اسلام روزہ میں ہی محدود سمجھتے ہیں۔ اور ہر بیمار۔ کمزور۔ بوڑھے۔ بچے حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے بھی یہی اُمید رکھتے ہیں کہ وہ ضرور روزہ رکھے خواہ بیماری بڑھ جائے یا صحت کو نقصان پہنچ جائے۔ یہ دونوں افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اسلام کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ وہ انسان کو اس راستہ سے ہٹا دے جو اُس کی کامیابی کا ہے۔ اگر تو شریعت چٹی ہوتی یا جرمانہ ہوتا تو بے شک ہر شخص پر خواہ وہ کوئی بوجھ اُٹھا سکتا یا نہ اٹھا سکتا اُس کا اُٹھانا ضروری ہوتا۔ جیسے حکومت کی طرف سے جرمانہ کر دیا جائے تو اُس وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس پر جرمانہ کیا گیا ہے اُس میں ادا کرنے کی استطاعت بھی ہے یا نہیں بلکہ جس پر جرمانہ ہو اُسے خواہ گھر بیچنا پڑے بھوکا رہنا پڑے جرمانہ کی رقم ادا کرنا اُس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام چٹی نہیں بلکہ وہ انسان کے اپنے فائدہ کے لئے ہیں۔ اور اُن پر عمل کرنے سے خود انسان کو ہی آرام میسر آتا اور اُس کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ جن مذاہب نے شریعت کو چٹی قرار دیا ہے اُن کے ماننے والوں کے لئے تو ضروری ہے کہ خواہ کچھ ہو وہ اپنے مذہبی احکام کو ضرور پورا کریں۔ لیکن جس مذہب کے احکام کی غرض محض انسانی فائدہ ہو اُس میں نفع و نقصان کا موازنہ ہوتا ہے اور جو صورت زیادہ مفید ہو اُسے اختیار کر لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے بعض احکام کے سلسلہ میں بعض شرائط مقرر کر دی ہیں تاکہ اگر وہ شرائط کسی میں پائی جائیں تو وہ اس حکم پر عمل کرے اور اگر نہ پائی جائیں تو نہ کرے۔ یہ شرائط صرف جسمانی عبادت کے لئے ہی نہیں بلکہ مالی عبادت کے لئے بھی ہیں۔ جیسے زکوٰۃ ہے اور وطنی قربانی اور اتصال و اتحاد کی کوشش کے لئے بھی ہیں جیسے حج ہے۔ اِسی طرح اَور جتنے مسائل اسلام سے تعلق رکھتے ہیں اور جتنے احکام فرض ہیں اُن سب کیلئے یہ شرط ہے کہ جب انسان کو طاقت ہو انہیں ضرور ادا کرے لیکن جب اُس کی طاقت سے بات بڑھ جائے تو وہ معذور ہے۔ اگر حج انسان کے مالدار ہونے اور امن و صحت کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر زکوٰۃ کے لئے یہ شرط ہے کہ ایک خاص مقدار میں کسی کے پاس ایسا مال ہو جو اُس کی ضروریات سے ایک سال بڑھا رہے۔ اگر نماز کے لئے یہ شرط ہے کہ جو کھڑا نہ ہو سکے بیٹھ کر اور جو بیٹھ نہ سکے لیٹ کر نماز ادا کرے تو رمضان کے لئے بھی یہ شرط ہے کہ اگر انسان مریض ہو۔ خواہ اُسے مرض لاحق ہو چکا ہو یا ایسی حالت میں ہو جس میں

روزہ رکھنا اُسے یقینی طور پر مریض بنا سکتا ہو جیسے حاملہ ہے یا دودھ پلانے والی عورت ہے یا ایسا بوڑھا شخص ہے جس کے قویٰ میں انحطاط شروع ہو چکا ہے یا اتنا چھوٹا بچہ ہے جس کے قویٰ نشوونما پا رہے ہیں تو اُسے روزہ نہیں رکھنا چاہیئے۔مسافر اور بیمار کا روزہ رکھنا ایسا ہی لغو ہے جیسے حائضہ کا روزہ رکھنا۔کون نہیں جانتا کہ حائضہ کا روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں بلکہ بے وقوفی اور جہالت ہے یہی حال بیمار اور مسافر کا ہے۔اس کے لئے بھی روزہ رکھنا نیکی نہیں۔اسی طرح وہ بوڑھا جس کے قویٰ مضمحل ہو چکے ہوں اور روزہ اُسے زندگی کے باقی اشغال سے محروم کر دیتا ہو۔اُس کے لئے بھی روزہ رکھنا نیکی نہیں۔پھر وہ بچہ جس کے قویٰ نشوونما پا رہے ہیں اور آئندہ پچاس ساٹھ سال کے لئے وہ طاقت کا ذخیرہ اپنے اندر جمع کر رہا ہے۔اس کے لئے بھی روزہ رکھنا نیکی نہیں ہو سکتا۔مگر جس میں طاقت ہے اور جو رمضان کا صحیح معنوں میں مخاطب ہے۔وہ اگر روزہ نہیں رکھتا تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ شریعت نے چھوٹی عمر کے بچوں کو روزہ رکھنے سے منع کیا ہے لیکن بلوغت کے قریب انہیں کچھ روزے رکھنے کی مشق ضرور کرانی چاہیئے۔مجھے جہاں تک یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مجھے پہلا روزہ رکھنے کی اجازت بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں دی تھی۔لیکن بعض بے وقوف چھ سات سال کے بچوں سے روزے رکھواتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس کا ثواب ہوگا۔یہ ثواب کا کام نہیں بلکہ ظلم ہے۔کیونکہ یہ عمر نشوونما کی ہوتی ہے۔ہاں ایک عمر وہ ہوتی ہے کہ بلوغت کے دن قریب ہوتے ہیں اور روزہ فرض ہونے والا ہی ہوتا ہے اُس وقت اُنکو روزہ کی ضرور مشق کرانی چاہیئے۔حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اجازت اور سنّت کو اگر دیکھا جائے تو بارہ تیرہ سال کے قریب کچھ کچھ مشق کرانی چاہیئے۔اور ہر سال چند روزے رکھوانے چاہئیں۔یہاں تک کہ اٹھارہ سال کی عمر ہو جائے جو میرے نزدیک روزہ کی بلوغت کی عمر ہے۔مجھے پہلے سال صرف ایک روزہ رکھنے کی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اجازت دی تھی۔اِس عمر میں تو صرف شوق ہوتا ہے۔اِس شوق کی وجہ سے بچے زیادہ روزے رکھنا چاہتے ہیں مگر یہ ماں باپ کا کام ہے کہ انہیں روکیں۔پھر ایک عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں چاہیئے کہ بچوں کو جرأت دلائیں کہ وہ کچھ روزے ضرور رکھیں۔اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے رہیں کہ وہ زیادہ نہ رکھیں۔اور دیکھنے والوں کو بھی اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے کہ یہ سارے روزے کیوں نہیں رکھتا۔کیونکہ اگر بچہ اس عمر میں سارے روزے رکھیگا تو آئندہ نہیں رکھ سکیگا۔اِسی طرح بعض بچے خلقی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں۔میں نے دیکھا ہے بعض لوگ اپنے بچوں کو میرے پاس ملاقات کے لئے لاتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ اس کی عمر پندرہ سال ہے حالانکہ وہ دیکھنے میں سات آٹھ سال کے معلوم ہوتے ہیں۔میں سمجھتا ہوں ایسے بچے روزہ کے لئے شاید اکیس سال کی عمر میں بالغ ہوں۔اس کے مقابلہ میں ایک مضبوط بچہ غالباً پندرہ سال کی عمر میں ہی اٹھارہ سال کے برابر ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ میرے عین الفاظ ہی کو پکڑ کر بیٹھ جائے کہ روزہ کی بلوغت کی عمر اٹھارہ سال ہے تو نہ وہ مجھ پر ظلم کریگا اور نہ خدا تعالیٰ پر بلکہ اپنی جان پر آپ ظلم کریگا۔اِسی طرح اگر کوئی چھوٹی عمر کا بچہ پورے روزے نہ رکھے اور لوگ اُس پر طعن کریں تو وہ اپنی جان پر ظلم کرینگے۔

بہر حال ان باتوں میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔جہاں شریعت روکتی ہے وہاں رُک جانا چاہیئے۔اور جہاں حکم دیتی ہے وہاں عمل کرنا چاہیئے۔مگر مسلمان اِس وقت اعتدال کو ترک کر بیٹھے ہیں۔اُن میں یا تو وہ لوگ ہیں جو روزہ ہی نہیں رکھتے اور یا وہ لوگ ہیں جو روزہ کے ایسے پابند ہیں کہ بیماری اور سفر میں بھی اسے ضروری سمجھتے ہیں۔اور

بعض تو اس میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں سے بھی روزے رکھواتے ہیں اور اگر وہ توڑنا چاہیں تو توڑنے نہیں دیتے ۔ ایسے کئی واقعات ہوئے ہیں کہ سات سات آٹھ آٹھ سال کے بچوں نے روزے رکھے تو ماں باپ نے اُن کی نگرانی کی کہ وہ روزہ توڑ نہ دیں یہاں تک کہ وہ مر گئے ۔ بے شک روزہ کا ادب و احترام اُن کے دلوں میں پیدا کرنا ضروری ہے اور انہیں بتانا چاہیئے کہ اگر وہ سارا دن روزہ نہیں رکھ سکتے تو روزہ رکھیں ہی نہیں ۔ لیکن یہ کہ اگر وہ رکھ لیں تو پھر توڑیں نہیں خواہ مرنے لگیں نہایت ظالمانہ فعل ہے اور اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے۔ غرض ایک طرف تو مسلمانوں میں ایسے لوگ ہیں جو روزہ کے بارہ میں اس قدر سختی کرتے ہیں اور دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو روزوں کی ضرورت ہی کے قائل نہیں بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اسی خیال کا ہے ۔ مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں میں نے اخبارات میں پڑھا تھا ۔ کہ ایک شخص ٹرکی یا مصر سے یہاں آیا ۔ وہ تقریریں کرتا پھرتا تھا کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس زمانہ میں ہوتے تو ضرور روزہ کی شکل بدل دیتے ۔ اس لئے ہمیں بھی بدل دینی چاہیئے ۔ کیونکہ وہ زمانہ اَور تھا اور یہ اَور ہے ۔ اور اس کی صورت وہ یہ پیش کرتا تھا کہ روزہ کی حالت میں روٹی نہ کھائی جائے بلکہ صرف کچھ کیک اور بسکٹ وغیرہ کھائے جائیں ۔ غرض ایک طبقہ افراط کی طرف چلا گیا ہے تو دوسرا تفریط کی طرف ۔ حالانکہ اسلام ایک وسطی مذہب ہے اور وہ جہاں بیمار اور مسافر کو اجازت دیتا ہے کہ وہ بیماری اور سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھیں وہاں ہر بالغ اور باصحت مسلمان پر یہ واجب قرار دیتا ہے کہ وہ رمضان کے روزے رکھے اور ان مبارک ایام کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور تسبیح و تحمید اور قرآن کریم کی تلاوت اور دعاؤں اور ذکر الٰہی میں بسر کرے تاکہ اُسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو ۔

بہرحال روزہ کے بارہ میں شریعت نے نہایت تاکید کی ہے ۔ اور جہاں اس کے متعلق حد سے زیادہ تشدد ناجائز ہے وہاں حد سے زیادہ نرمی بھی ناجائز ہے ۔ پس نہ تو اتنی سختی کرنی چاہیئے کہ جان تک چلی جائے اور نہ اتنی نرمی اختیار کرنی چاہیئے کہ شریعت کے احکام کی ہتک ہو اور ذمہ داری کو بہانوں سے ٹال دیا جائے ۔ میں نے دیکھا ہے کئی لوگ محض کمزوری کے بہانہ کی وجہ سے روزے نہیں رکھتے اور بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ اگر روزہ رکھا جائے تو پیچش ہو جاتی ہے ۔ حالانکہ روزہ چھوڑنے کے لئے یہ کوئی کافی وجہ نہیں کہ پیچش ہو جایا کرتی ہے ۔ جبتک پیچش نہ ہو انسان کے لئے روزہ رکھنا ضروری ہے ۔ جب پیچش ہو جائے تو پھر بے شک چھوڑ دے ۔ اسی طرح بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں روزہ رکھنے سے ضعف ہو جاتا ہے مگر یہ بھی کوئی دلیل نہیں ۔ صرف اُس ضعف کی وجہ سے روزہ چھوڑنا جائز ہے جس میں ڈاکٹر روزہ رکھنے سے منع کرے ۔ ورنہ یوں تو بعض لوگ ہمیشہ ہی کمزور رہتے ہیں تو کیا وہ کبھی بھی روزہ نہ رکھیں میں اڑھائی تین سال کا تھا جب مجھے کالی کھانسی ہوئی تھی ۔ اُسی وقت سے میری صحت خراب ہے ۔ اگر ایسے ضعف کو بہانہ بنانا جائز ہو تو میرے لئے تو شاید ساری عمر میں ایک روزہ بھی رکھنے کا موقع نہیں تھا ۔ ضعف وغیرہ جسے روزہ چھوڑنے کا بہانہ بنایا جاتا ہے اُسی کی برداشت کی عادت ڈالنے کے لئے تو روزہ رکھایا جاتا ہے ۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے کہ نماز بدی اور بے حیائی سے روکتی ہے ۔ اس پر کوئی شخص کہے کہ میں نماز اس لئے نہیں پڑھتا کہ اس کی وجہ سے بدی کرنے سے رُک جاتا ہوں ۔ پس روزہ کی تو غرض ہی یہی ہے کہ کمزوری کو برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو ورنہ یوں تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں اس لئے روزہ نہیں رکھتا کہ مجھے بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے ۔ حالانکہ اس قسم کی

تکالیف کی برداشت کی عادت پیدا کرنے ہی کے لئے روزہ مقرر کیا گیا ہے۔ جو شخص روزہ رکھتے کیا وہ چاہتا ہے کہ فرشتے سارا دن اُس کے پیٹ میں کباب ٹھونستے رہیں۔ وہ جب بھی روزہ رکھے گا اُسے بھوک اور پیاس ضرور برداشت کرنی پڑے گی۔ اور کچھ ضعف بھی ضرور ہوگا۔ اور اسی کمزوری اور ضعف کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کرنے کے لئے روزہ رکھایا جاتا ہے۔ بے شک روزہ کی اور بھی حکمتیں ہیں۔ جیسے ایک حکمت یہ ہے کہ روزہ رکھنے سے غرباء اور فاقہ زدہ لوگوں کی اعانت کی طرف توجہ پیدا ہو جاتی ہے مگر بہرحال روزہ اس لئے نہیں رکھایا جاتا کہ انسان کو کوئی تکلیف ہی نہ ہو اور وہ کوئی ضعف محسوس نہ کرے بلکہ اس لئے رکھایا جاتا ہے کہ اُسے ضعف برداشت کرنے کی عادت پیدا ہو۔ پس ضعف کے خوف سے روزہ چھوڑنا ہرگز جائز نہیں۔ سوائے اس کے کہ کوئی بوڑھا ہو چکا ہو یا ڈاکٹر اس کے ضعف کو بھی بیماری قرار دے چکا ہو۔ ایسی صورت میں بے شک روزہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ مگر ضعف کے متعلق ظاہری ڈیل ڈول اور صورت سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے۔ بعض لوگ بظاہر موٹے تازے ہوتے ہیں اور چلتے پھرتے بھی ہیں لیکن دراصل وہ بیمار ہوتے ہیں۔ اور اُن کے لئے روزہ رکھنا جائز نہیں ہوتا۔ بالخصوص جن لوگوں کو دل کی بیماری ہو۔ ایسے لوگوں کے لئے بھوک پیاس کا برداشت کرنا سخت خطرناک ہوتا ہے۔ پس کمزوری یا ضعف کا فیصلہ بظاہر دیکھنے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں بہت سے ڈاکٹر بھی دیانت داری سے کام نہیں لیتے۔ ذرا کوئی شخص دو چار بار جھک کر سلام کر دے تو جو چاہے ڈاکٹر سے لکھوا لے ظاہر ہے کہ ایسے سرٹیفکیٹ کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے لیکن اگر حقیقی طور پر ڈاکٹر کسی کو مشورہ دے کہ اُس کیلئے روزہ رکھنا مضر ہے تو گو وہ بظاہر تندرست بھی نظر آئے اُس کے لئے روزہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ بیمار اور مسافر کے لئے روزہ جائز نہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا :-

"جو شخص مریض اور مسافر ہونے کی حالت میں ماہِ صیام میں روزہ رکھتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے صریح حکم کی نافرمانی کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا ہے کہ بیمار اور مسافر روزہ نہ رکھے۔ مرض سے صحت پانے اور سفر کے ختم ہونے کے بعد روزے رکھے۔ خدا کے اس حکم پر عمل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ نجات فضل سے ہے نہ کہ اپنے اعمال کا زور دکھا کر کوئی نجات حاصل کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مرض تھوڑی ہو یا بہت اور سفر چھوٹا ہو یا لمبا۔ بلکہ حکم عام ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ مریض اور مسافر اگر روزہ رکھیں گے تو اُن پر حکم عدولی کا فتویٰ لازم آئیگا۔"

(فتاویٰ حضرت مسیح موعود علیہ السلام صفحہ ۱۳۲-۱۳۳)

پھر فرماتا ہے۔ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کو بڑی دقت پیش آئی ہے۔ اور انہوں نے اس کے کئی معنے کئے ہیں۔ یہ دقت زیادہ تر اس وجہ سے پیش آئی ہے کہ يُطِيقُونَهُ میں جو ہٗ کی ضمیر استعمال ہوئی ہے اُس کے مرجع کی تعیین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض نے اس کا مرجع صوم کو قرار دیا ہے اور بعض نے فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ کو۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مشکل کو "الفوز الکبیر" میں اس طرح حل کیا ہے کہ يُطِيقُونَهُ میں ہٗ کی ضمیر فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ کی طرف گئی ہے۔ اس پر یہ اعتراض پڑتا تھا کہ یہ اضمار قبل الذکر ہے یعنی ضمیر پہلے آگئی ہے اور مرجع بعد میں ہے۔ حالانکہ مرجع پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ اس کا جواب

انہوں نے یہ دیا ہے کہ فدیہ کا مقام چونکہ نحواً مقدم ہے یعنی
وہ مبتدا ہے اس لئے اُس کی ضمیر اس کے ذکر سے پہلے آسکتی ہے۔
دوسرا اعتراض یہ پڑتا تھا کہ فِدْیَۃٌ مؤنث ہے اور
ضمیر مذکر۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ فدیہ طَعَامُ
مِسْكِيْنٍ کا قائم مقام ہے اور وہ مذکر ہے۔ اس لئے فدیہ کی
طرف بھی مذکر کی ضمیر پھر سکتی ہے۔ اس بناء پر انہوں نے اس کے
یہ معنے کئے ہیں کہ اُن لوگوں پر جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے
ہوں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دینا واجب ہے۔ اُن کے
نزدیک اس آیت میں صدقۃ الفطر کی طرف اشارہ ہے۔ جو
اسلام میں نماز عید سے پہلے ادا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے
تاکہ غرباء بھی عید کی خوشی میں شریک ہوسکیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ کئے جاتے ہیں کہ مومنوں میں سے
جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں ■ روزوں کے ساتھ ساتھ
ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ بھی دے دیا کریں۔ لیکن رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور احادیث سے چونکہ یہ بات ثابت
نہیں کہ روزہ دار فدیہ بھی دے اس لئے یہ معنے تسلیم نہیں کئے
جاسکتے۔ اس کے علاوہ عقلی طور پر یہ معنے اس لئے بھی ناقابلِ
قبول ہیں کہ فدیہ تو اُس پر ہونا چاہیئے جو روزہ نہ رکھ سکے
جو شخص باقاعدہ روزے رکھ رہا ہے اُس پر فدیہ کیسا؟ ہاں اگر
کوئی شخص اس شکریہ میں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عبادت کے
بجالانے کی توفیق بخشی ہے روزہ رکھ کر ایک مسکین کو کھانا
بھی دے دیا کرے تو ■ زیادہ ثواب کا مستحق ہے کیونکہ اُس نے
روزہ بھی رکھا اور ایک مسکین کو کھانا بھی کھلایا۔ مگر بہرحال وہ
ایک زائد نیکی ہوگی۔ قرآن کریم کسی کو اس بات کا پابند قرار نہیں دیتا
کہ وہ روزہ بھی رکھے اور ایک مسکین کو کھانا بطور فدیہ بھی کھلائے۔

(۳) مفسرین نے اس آیت کے ایک معنے یہ کئے ہیں کہ
یُطِيْقُوْنَهٗ سے پہلے لَا محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے
کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ۔ اور ہٗ کی ضمیر کا مرجع ■
صوم کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو روزہ رکھنے کی طاقت
نہ رکھتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیا کریں
وہ کہتے ہیں کہ اس جگہ لَا اُسی طرح محذوف ہے جس طرح آیت
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا (نساء آیت ۱۷۷) میں
تَضِلُّوْا سے پہلے بھی لَا محذوف ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں
کہ اللہ تعالیٰ یہ باتیں اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔
گو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں لَا مقدر نہیں بلکہ ایک مضاف
محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہے کہ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
مَخَافَةَ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے لئے یہ باتیں تمہارے
گمراہ ہو جانے کے خدشہ کی بناء پر بیان کرتا ہے۔

(۴) بعض نے اس آیت کا یوں حل کیا ہے کہ عربی زبان میں
اَطَاقَ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ کسی شخص نے کام تو کیا مگر بہت
مشکل اور مصیبت سے گویا جب کوئی شخص اپنے نفس کو انتہائی
مشقت میں ڈالے بغیر کوئی کام سرانجام دینے کی اپنے اندر
طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے اَطَاقَ کا لفظ استعمال
کیا جاتا ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ
سے وہ لوگ مراد ہیں جو روزہ سے سخت تکلیف اٹھاتے ہیں
اور جن کی بدنی طاقت بالکل زائل ہو جاتی ہے بلکہ بعض دفعہ
غشی تک نوبت پہنچ جاتی ہے جیسے بوڑھے یا دل کے مریض یا
اعصابی کمزوری کے شکار یا حاملہ اور مرضعہ۔ ایسے لوگ جو
بظاہر تو بیمار نظر نہیں آتے لیکن روزہ رکھنے سے بیمار ہو جاتے
ہیں اُن کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزے رکھنے کی بجائے ایک
مسکین کا کھانا بطور فدیہ اپنی طرف سے دیدیا کریں۔ ان معنوں
کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ علامہ قرطبی نے يُطِيْقُوْنَ
کی ایک قرأت يُطَوَّقُوْنَ بھی بیان کی ہے۔ یعنی جو لوگ
صرف مشقت سے روزہ نبھا سکتے ہیں۔ اور جن کی صحت
روزہ رکھنے سے غیر معمولی طور پر خراب ہو جاتی ہے وہ بیشک
روزے نہ رکھیں ہاں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دیدیا کریں۔

میرے نزدیک چونکہ اَطَاقَ بابِ اِفعال میں سے ہے
اور بابِ افعال کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ سلب کے

معنے دیا ہے اس لئے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کے یہ معنے
ہونگے کہ وہ لوگ جن کی طاقت کمزور ہوگئی ہے یعنی قریبًا ضائع
ہوگئی ہو وہ بیشک روزہ نہ رکھیں مگر چونکہ اُنکا روزہ نہ رکھنا محض اجتہادی
امر ہوگا مرض ظاہر کے نتیجہ میں نہیں ہوگا بلکہ صرف متوقع کمزوری کے نتیجہ میں
ہوگا۔ اور اجتہاد میں غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ اس لئے اُن کو چاہیئے
کہ اپنی اجتہادی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لئے اگر اُنکو فدیہ
دینے کی طاقت ہو تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ اُن دنوں
میں دے دیا کریں تاکہ اُن کی غلطی کے امکان کا کفارہ ادا ہوتا رہے۔

(۵) ایک اور معنے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے
مجھ پر کھولے ہیں وہ یہ ہیں کہ يُطِيْقُوْنَهٗ میں ہٗ کی ضمیر
روزہ کی طرف پھرتی ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی
بیماری شدید ہے یا جن کا سفر پُرمشقت ہے وہ تو بہرحال
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کے مطابق دوسرے ایام میں
روزے رکھیں گے۔ لیکن وہ لوگ جو کسی معمولی مرض میں مبتلا
ہیں یا کسی آسانی سے طے ہونے والے سفر پر نکلے ہیں اگر وہ
طاقت رکھتے ہوں تو ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ بھی دے
دیا کریں۔ اس وجہ سے کہ ممکن ہے انہوں نے روزہ چھوڑنے
میں غلطی کی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بیمار سمجھتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ
کے نزدیک اُن کی بیماری ایسی نہ ہو کہ وہ روزہ ترک کر سکیں۔
یا وہ اپنے آپ کو مسافر سمجھتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُن کا
سفر سفر ہی نہ سمجھا گیا ہو۔ پس چونکہ اُن کی رائے میں غلطی کا
ہر وقت امکان ہے اس لئے ایسے بیماروں اور مسافروں کو
چاہیئے کہ اُن میں سے جو لوگ روزہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ
دوسرے ایام میں فوت شدہ روزوں کو پورا کرنے کے علاوہ
ایک مسکین کو کھانا بھی دے دیا کریں۔ تاکہ اُن کی اس غلطی کا
کفارہ ہو جائے۔ اور اگر يُطِيْقُوْنَهٗ میں ہٗ کی ضمیر کا مرجع فِدْيَةٌ
طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کو ہی قرار دیا جائے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ
صاحبؒ نے لکھا ہے تو پھر بجائے اس کے کہ اس حکم کو صدقۃ الفطر
پر محمول کیا جائے۔ اس آیت کا فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ سے تعلق ہوگا اور
اس کے یہ معنے ہونگے کہ اگرچہ مریض اور مسافر کو یہ اجازت
ہے کہ وہ اور دنوں میں روزہ رکھیں لیکن اُن میں سے وہ
لوگ جن کو آسودگی حاصل ہو اور وہ ایک شخص کو کھانا کھلا
سکتے ہوں۔ انہیں چاہیئے کہ ایک مسکین کا کھانا۔ بطور فدیۂ
رمضان دے دیا کریں۔ اگر طاقت نہ ہو تو پھر تو فدیۂ رمضان
دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر طاقت ہو
تو خواہ وہ بیمار ہوں یا مسافر انہیں ایک مسکین کا کھانا بطور
فدیۂ رمضان دینا چاہیئے۔ اگر روگ عارضی ہو اور وہ بعد میں
دُور ہو جائے تو روزہ تو بہرحال رکھنا ہوگا۔ فدیہ دیدینے
سے روزہ اپنی ذات میں ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ یہ محض اس
بات کا فدیہ ہے کہ ان مبارک ایام میں وہ کسی جائز شرعی عذر
کی بنا پر باقی مسلمانوں کے ساتھ مل کر یہ عبادت ادا نہیں
کر سکے۔ آگے یہ عذر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عارضی اور
ایک مستقل۔ فدیہ بشرطِ استطاعت اِن دونوں حالتوں میں
دینا چاہیئے۔ پھر جب عذر دُور ہو جائے تو روزہ بھی رکھنا
چاہیئے۔ غرضیکہ خواہ کوئی فدیہ بھی دے دے۔ بہرحال سال
دو سال یا تین سال کے بعد جب بھی اُسکی صحت اجازت دے
اُسے پھر روزے رکھنے ہونگے۔ سوائے اس صورت کے کہ
پہلے مرض عارضی تھا اور صحت ہونے کے بعد وہ ارادہ ہی کرتا
رہا کہ آج رکھتا ہوں کل رکھتا ہوں کہ اس دوران میں اس کی
صحت پھر مستقل طور پر خراب ہو جائے۔ باقی جو بھی کھانا کھلانے
کی طاقت رکھتا ہو اگر وہ مریض یا مسافر ہے تو اُس کیلئے
ضروری ہے کہ رمضان میں ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے
اور دوسرے ایام میں روزے رکھے۔ یہی حضرت مسیح موعود
علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مذہب تھا اور آپ ہمیشہ فدیہ بھی دیتے
تھے اور بعد میں روزے بھی رکھتے تھے اور اِسی کی دوسروں
کو تاکید فرمایا کرتے تھے۔

اِس آیت میں جو اَلَّذِيْنَ کا لفظ استعمال ہُوا ہے یہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ

رمضان کا مہینہ وہ (مہینہ) ہے جس کے بارہ میں قرآن (کریم) نازل کیا گیا ہے۔ (وہ قرآن) جو تمام انسانوں کیلئے ہدایت (بنا کر بھیجا گیا) ہے

بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ

اور جو کھلے دلائل اپنے اندر رکھتا ہے (ایسے دلائل) جو ہدایت پیدا کرتے ہیں اور اسکے ساتھ ہی (قرآن میں) الٰہی نشانات بھی ہیں۔ اسلئے تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو

فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

(اس حال میں) دیکھے (کہ نہ مریض ہو نہ مسافر) اُسے چاہیئے کہ وہ اسکے روزے رکھے۔ جو شخص مریض ہو یا سفر میں ہو تو اس پر اور دنوں میں تعداد

کا بدل یعنی قائم مقام ہو سکتا ہے۔ اول ان مومنوں کا جن کا ذکر يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ میں کیا گیا ہے دوم اُن لوگوں کا جن کا ذکر فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ میں ہے۔ اگر اسے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا بدل سمجھا جائے تو اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ وہ لوگ جو ضعف کی وجہ سے روزے سے سخت تکلیف اُٹھاتے ہیں اور اپنے نفس پر بڑی مشقت برداشت کرتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ روزہ رکھنے کی بجائے ایک مسکین کا کھانا بطور فدیہ دے دیا کریں۔ اور اگر دوسرا بدل ہیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ وہ مریض اور مسافر جو فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دے دیں اور پھر دوسرے دنوں میں روزے بھی رکھیں۔ کیونکہ بعض امراض ایسی ہوتی ہیں یا بعض سفر ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ آیا اس میں روزہ ترک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؛ حدیث میں آیا ہے کہ مشکوک اشیاء بھی محارم ہی کے نیچے ہوتی ہیں۔ کیونکہ جو مشکوک تک پہنچتا ہے وہ آہستہ آہستہ محارم تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ پس اگر یہ دونوں باتیں مشکوک ہوں تو ایسے مسافر اور مریض کو چاہیئے کہ فدیہ دے دے اور رخصت سے فائدہ اٹھائے اور بعد میں روزے بھی رکھ لے۔ اس میں ایسے بیماری والا جس کی بیماری مشتبہ ہو یا ایسا سفر والا جس کا سفر مشتبہ ہو مراد ہیں۔ ان میں سے جو لوگ طاقت رکھتے ہوں اُن پر فدیہ دینا لازم ہے۔ کیونکہ ممکن ہے انہوں نے اپنے اجتہاد میں غلطی کی ہو۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہی مذہب تھا کہ ایسے لوگ دوسرے ایام میں روزہ رکھیں۔ اور رمضان کے دنوں میں فدیہ دیں

پھر فرماتا ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ جو شخص پوری بشاشت اور شوق کے ساتھ نیکی کا کوئی کام کرتا ہے تو خواہ وہ ابتداء میں تکلف کے ساتھ ہی ایسا کرے اور اُسے اپنے نفس پر ایک رنگ میں بوجھ ہی محسوس ہو تب بھی اس کا نتیجہ اس کے لئے اچھا نکلیگا۔ یعنی وہ نیکی اس کیلئے بہترین نتائج پیدا کرنے والی ثابت ہوگی۔ عربی زبان میں تَطَوَّعَ کا لفظ اُس وقت استعمال ہوتا ہے جب اپنے نفس پر بوجھ ڈال کر کسی حکم کی اطاعت کی جائے۔ اور تکلف سے بشاشت کا اظہار کیا جائے۔ پس فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو شخص پورے شرح صدر کے ساتھ کسی نیکی میں حصہ نہ لے سکے اُسے چاہیئے کہ کم از کم اپنے نفس پر بوجھ ڈالتے ہوئے ہی اس میں حصہ لے اور اپنے چہرہ پر تکلف سے بشاشت پیدا کرے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اُس کے لئے خیر اور برکت کے رستے کھول دیگا۔ یعنی نیکیوں میں ترقی کرتے کرتے اُسے ایسا مقام میسر آجائیگا

مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ وَلِتُكْمِلُوا

(پوری کرنی واجب) ہوگی۔ اللہ (تعالیٰ) تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا (یہ حکم اس نے اسلئے دیا ہے کہ تم تنگی میں نہ پڑو) اور تاکہ

الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

تم تعداد کو پورا کر لو۔ اور اس (بات) پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اُس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ اور تاکہ تم (اُس کے) شکر گذار ہو۔ ۹۹

کہ نیکی اُس کی غذا بن جائیگی اور نیک تحریکات پر عمل اس کے لئے ویسا ہی آسان ہو جائیگا جیسے اعلیٰ درجہ کے مومنوں کیلئے آسان ہوتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ تَطَوَّعَ کے معنے محاورہ میں غیر واجب کام کے نفلی طور پر کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اور امام راغب نے اپنی مشہور کتاب مفردات میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ جو شخص نفلی طور پر کوئی نیک کام کرے گا تو یہ اس کے لئے بہت بہتر ہوگا۔ یعنی رمضان میں روزے رکھنے یا ایک مسکین کو کھانا کھلانے کا حکم تو ہم نے دے دیا ہے لیکن اگر کوئی شخص ثواب کی نیت سے اس میں کوئی زیادتی کرنا چاہے تو اُسے اس کا اختیار ہے۔ مثلاً وہ اختیار رکھتا ہے کہ ایک کی بجائے دو مساکین کا کھانا بطور فدیہ دے دے۔ یا وہ اختیار رکھتا ہے کہ روزہ بھی رکھے اور حصول ثواب کے لئے ایک مسکین کو کھانا بھی کھلاتا رہے۔ یا رمضان کے روزوں کے علاوہ نفلی طور پر دوسرے ایام میں بھی روزے رکھے۔ یہ سب حصول ثواب کے ذرائع ہیں جن میں ہر مومن اپنی اپنی طاقت کے مطابق حصہ لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔

پھر فرمایا۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ۔ اس کے بعض لوگ یہ معنے کرتے ہیں کہ اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ اگر یہ معنے ہوتے تو اِنْ تَصُوْمُوْا کہنا چاہیئے تھا نہ کہ اَنْ تَصُوْمُوْا۔ اس کے صحیح معنے یہ ہیں کہ اگر تم علم رکھتے ہو تو سمجھ سکتے ہو کہ روزہ رکھنا تمہارے لئے بہر حال بہتر ہے۔ یعنی ہم نے جس حکم کے لئے یہ تمہید اُٹھائی ہے وہ کوئی معمولی حکم نہیں بلکہ ایک غیر معمولی خیر اور برکت رکھنے والا حکم ہے اس لئے تمہارا فرض ہے کہ تم اسے پوری توجہ سے سُنو اور اس پر عمل کرو۔

هُدًى

۹۹ حل لغات:۔ هُدًى: یہ مصدر ہے اور فاعل کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی لوگوں کو ہدایت دینے والا۔ (مزید تشریح کے لئے دیکھیں حل لغات سورۃ بقرہ ۳)

بَيِّنٰتٍ

بَيِّنَاتٍ۔ جمع ہے اس کا مفرد اَلْبَيِّنَةُ ہے۔ جس کے معنے ہیں اَلدَّلَالَةُ الْوَاضِحَةُ عَقْلِيَّةً كَانَتْ اَوْ مَحْسُوْسَةً یعنی واضح دلیل خواہ وہ عقلی ہو یا حس سے تعلق رکھتی ہو۔ (مفردات)

تفسیر:۔ رمضان کا مہینہ اُن مقدس ایام کی یاد دلاتا ہے جن میں قرآن کریم جیسی کامل کتاب کا دنیا میں نزول ہوا۔ وہ مبارک دن۔ وہ دنیا کی سعادت کی ابتداء کے دن۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اُسکی برکت کے دروازے کھولنے والے دن جب دنیا کی گھناؤنی شکل اُس کے بدصورت چہرے اور اس کے اذیت پہنچانے والے اعمال سے تنگ آکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں جاکر اور دنیا سے مُنہ موڑ کر اور اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر صرف اپنے خدا کی یاد میں معروف رہا کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ دنیا سے اِس طرح بھاگ کر وہ اپنے فرض کو ادا کرینگے جسے ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے

انہیں پیدا کیا ہے۔ اپنی تنہائی کی گھڑیوں میں اپنی جدائی کے اوقات میں اور اپنی غور و فکر کی ساعات میں رمضان کا مہینہ آپ پر آگیا۔ اور جہاں تک معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے چوبیسویں رمضان کو وہ جو دنیا کو چھوڑ کر علیحدگی میں چلا گیا تھا اُسے اُس کے پیدا کرنے والے اُس کی تربیت کرنے والے اُس کو تعلیم دینے والے اور اُس سے محبت کرنے والے خدا نے حکم دیا کہ جاؤ اور جاکر دنیا کو ہدایت کا راستہ دکھاؤ۔ اور بتایا کہ تم مجھے تنہائی میں اور غارِ حرا میں ڈھونڈتے ہو مگر میں تمہیں مکّہ کی گلیوں اور اُن کے شور و شغب میں ملوں گا۔ جاؤ اور اپنی قوم کو پیغام پہنچا دو کہ میں نے تم کو ادنیٰ حالت میں پیدا کر کے اور پھر ترقی دے کر اس لئے دنیا میں نہیں بھیجا کہ کھاؤ پیو اور مر جاؤ اور کوئی سوال تم سے نہ کیا جائے۔

آپ اس آواز کو سُنکر حیران رہ گئے۔ آپ نے جبرائیل کو حیرت سے دیکھ کر کہا کہ مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ ۔ مَیں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ یعنی اس قسم کا پیغام مجھے عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ الفاظ میرے مُنہ سے مکّہ والوں کے سامنے زیب دینگے۔ کیا میری قوم ان کو قبول کرے گی اور سُنے گی۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو متواتر حکم دیا گیا کہ جاؤ اور پڑھو۔ جاؤ اور پڑھو۔ جاؤ اور پڑھو۔ تب آپ نے اِس آواز پر اس ارشاد کی تعمیل میں تنہائی کو چھوڑا اور جلوت اختیار کی۔ مگر وہ کیسی مجلس تھی۔ وہ ایسی نہ تھی کہ جس میں ایک دوست بیٹھ کر دوسرے دوست کے سامنے اپنے شکوے بیان کرتا ہے۔ وہ ایسی مجلس نہ تھی جس میں دوست اپنے دوست کے خوش کرنے والے حالات سُنتا اور اُس سے لطف اٹھاتا ہے۔ وہ ایسی مجلس تھی جس میں انسان اپنی ذہنی کوفت اور تھکان دُور کرتا ہے۔ وہ قصوں کہانیوں والی مجلس نہ تھی شعر و شاعری کی مجلس نہ تھی۔ وہ ایسی مجلس نہ تھی جس میں مباحثات اور مناظرے ہوتے ہیں بلکہ وہ مجلس ایسی تھی جس میں ایک طرف سے متواتر اور پیہم اخلاص کا اظہار ہوتا تھا تو دوسری طرف سے متواتر اور پیہم گالیاں۔ دُشنام۔ ڈراوے اور دھمکیاں ملتی تھیں۔ وہ ایسی مجلس تھی جس میں ایک دفعہ جانے کے بعد دوسرے دن جانے کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ وہ ایسی گالیاں اور ایسے ارادے اور ایسی دھمکیاں ہوتی تھیں کہ ایک طرف اُن کے دینے والے سمجھتے تھے کہ اگر اِس شخص میں کوئی حِس باقی ہے تو کل اس کے مُنہ سے ایسی بات ہرگز نہیں نکلے گی۔ وہ خوش ہوتے تھے کہ آج ہم نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان بند کر دی اور دوسری طرف جب خدا تعالےٰ کا سورج چڑھتا تو خدا تعالےٰ کا یہ عاشقِ صادق خدا تعالیٰ کا پیغام مکّہ والوں کو پہنچانے کے لئے پھر نکل کھڑا ہوتا۔ پھر تمام دن وہی گالیاں وہی دھمکیاں اور وہی ڈراوے ہوتے تھے اور اسی میں شام ہو جاتی۔ مگر جب رات کا پردہ حائل ہوتا تو وہ سمجھتے کہ شاید آج یہ خاموش ہو گیا ہو گا۔ مگر وہ جس کے کانوں میں خدائی آواز گونج رہی تھی۔ مکّہ والوں سے دب کر کیسے خاموش ہو جاتا اگر تو اُس کی رات سوتے گزرتی تو بے شک اس پیغام کو بھول جاتا۔ مگر جب اُس کے سونے کی حالت جاگنے ہی کی ہوتی تو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ وہ سبق جو دہرایا نہ جائے بیشک بھول سکتا ہے مگر جب آپ کی یہ حالت تھی کہ جونہی سرہانے پر سر رکھا وہی اِقْرَأْ کی آواز آنی شروع ہو جاتی تو آپ کس طرح اس پیغام کو بھول جاتے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رمضان ہی میں یہ آواز آئی اور رمضان ہی میں آپ نے غارِ حرا سے باہر نکل کر لوگوں کو یہ تعلیم سُنانی شروع کی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ یعنی رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اُترا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ یعنی قرآن لیلۃ القدر میں اُتارا گیا ہے۔

رَمَضَان رَمَضٌ سے نکلا ہے جس کے معنے عربی زبان میں جلن اور سوزش کے ہیں۔ خواہ وہ جلن دھوپ کی ہو خواہ بیماری کی۔ اس لئے رَمَضَان کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا موسم جس میں سختی کے اوقات اور ایام ہوں۔ اور

اِدھر فرمایا۔ ہم نے اسے رات کو اتارا ہے۔ اور رات تاریکی اور مصیبت پر دلالت کرتی ہے۔ پس اِن دونوں آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ الہام کا نزول تکالیف اور مصائب کے ایّام میں ہُوا کرتا ہے۔ جب تک کوئی قوم مصائب اور شدائد سے دوچار نہیں ہوتی جب تک اُس کے دن راتیں نہیں بن جاتے جب تک بھوک اور پیاس کی شدّت سے تکلیف نہیں اُٹھاتی جب تک انسانی جسم اندر اور باہر سے مصیبت نہیں اُٹھاتا اُس وقت تک خدا تعالیٰ کا کلام اُس پر نازل نہیں ہو سکتا۔ اور اس ماہ کے انتخاب میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو یہی بتایا ہے کہ اگر تم اپنے اوپر الہام الٰہی کا دروازہ کھولنا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ تکالیف اور مصائب میں سے گذرو اِس کے بغیر الہامِ الٰہی کی نعمت تمہیں میسّر نہیں آسکتی۔ پس رمضان کلامِ الٰہی کو یاد کرانے کا مہینہ ہے۔ اِسی لئے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اِس مہینہ میں قرآن کریم کی تلاوت زیادہ کرنی چاہیئے۔ اور اِسی وجہ سے ہم بھی اس مہینہ میں درسِ قرآن کا انتظام کرتے ہیں۔ دوستوں کو چاہیئے کہ اِس مہینہ میں زیادہ سے زیادہ تلاوت کیا کریں اور قرآن کریم کے معانی پر غور کیا کریں تاکہ اُن کے اندر قربانی کی رُوح پیدا ہو جس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ بہر حال یہ مہینہ بتاتا ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا فتح کرے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غارِ حرا کی علیحدگیوں میں جائے۔ دنیا چھوڑے بغیر نہیں مل سکتی۔ پہلے اِس سے علیحدگی اختیار کرنی ضروری ہوتی ہے اور پھر وہ قبضہ میں آتی ہے۔ مگر وہ قبضہ جسے الٰہی قبضہ و تصرف کہتے ہیں۔ ایک دنیوی قبضہ ہوتا ہے جیسے دجّال کا ہے۔ اس کے ملنے کا بیشک یہی طریق ہے کہ اپنے آپ کو دنیا کیلئے وقف کر دیا جائے لیکن جو شخص خدا تعالیٰ کا ہو کر اس پر قبضہ کرنا چاہے وہ اُسی صورت میں کر سکیگا جب اُسے چھوڑ دیگا دیکھو۔ ابوجہل نے دنیا کے لئے کوشش کی اور اُسے حاصل کیا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے چھوڑ دیا اور پھر بھی وہ آپ کو مل گئی۔ بلکہ ابوجہل سے زیادہ ملی۔ ابوجہل زیادہ سے زیادہ مکہ کا ایک رئیس تھا۔ مگر آپ اپنی زندگی میں ہی سارے عرب کے بادشاہ ہو گئے اور آج ساری دنیا کے شہنشاہ ہیں۔ غرض جو دنیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ابوجہل کو کہاں حاصل ہوئی۔ مگر ابوجہل کو جو کچھ حاصل ہُوا وہ دنیا کمانے سے ملا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ ملا دنیا چھوڑنے سے ملا۔ پس روحانی جماعتوں کو دنیا چھوڑ دینے سے ملتی ہے اور دنیوی لوگوں کو دنیا کمانے سے ملتی ہے۔ اور رمضان ہمیں توجہ دلاتا ہے کہ اگر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو ضروری ہے کہ پہلے شدائد اور مصائب قبول کرو۔ راتوں کی تاریکیاں قبول کرو۔ اور اِن چیزوں سے مت گھبراؤ۔ کیونکہ یہی قربانیاں تمہاری کامیابی کا ذریعہ ہیں۔

غرض رمضان ایک خاص اہمیت رکھنے والا مہینہ ہے۔ اور جس شخص کے دل میں اسلام اور ایمان کی قدر ہوتی ہے اِس مہینہ کے آتے ہی اپنے دل میں ایک خاص حرکت اور اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی کپکپاہٹ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کتنی ہی صدیاں ہمارے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان گذر جائیں۔ کتنے ہی سال ہمیں اور انکو آپس میں جُدا کرتے چلے جائیں کتنے ہی دنوں کا فاصلہ ہم میں اور ان میں حائل ہوتا چلا جائے لیکن جس وقت رمضان کا مہینہ آتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان صدیوں اور سالوں کو اِس مہینہ نے لپیٹ لپاٹ کر چھوٹا سا کر کے رکھ دیا ہے اور ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی قریب نہیں چونکہ قرآن خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس لئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام فاصلہ کو رمضان نے سمیٹ سماٹ کر ہمیں خدا تعالیٰ کے قریب پہنچا دیا ہے۔ وہ بُعد جو ایک انسان کو خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ وہ بُعد جو ایک مخلوق کو اپنے خالق سے ہوتا ہے

وہ بُعد جو ایک کمزور اور نالائق ہستی کو زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے خدا سے ہوتا ہے وہ یوں سمٹ جاتا ہے وہ یوں مٹ جاتا ہے وہ یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے سورج کی کرنوں سے رات کا اندھیرا۔ یہی وہ حالت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ. جب رمضان کا مہینہ آئے۔ اور میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں کہ میں انہیں کس طرح مل سکتا ہوں تو تُو انہیں کہہ دے کہ رمضان اور خدا میں کوئی فرق نہیں۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں خدا اپنے بندوں کے لئے ظاہر ہوا۔ اور اُس نے چاہا کہ پھر اپنے بندوں کو اپنے پاس کھینچ کر لے آئے۔ اس کلام کے ذریعہ جو حبل اللہ ہے جو خدا کا وہ رستہ ہے جس کا ایک سرا خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا مخلوق کے ہاتھ میں۔ اب یہ بندوں کا کام ہے کہ وہ اس رستہ پر چڑھ کر خدا تک پہنچ جائیں

اب میں بتاتا ہوں کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔

اوّل اسجگہ فِیْ تعلیلیہ ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے بارہ میں قرآن کریم اُتارا گیا ہے۔ یعنی رمضان المبارک کے روزوں کی اس قدر اہمیت ہے کہ ان کے بارہ میں قرآن کریم میں خاص طور پر احکام نازل کئے گئے ہیں۔ اور جس حکم کے بارہ میں قرآنی وحی نازل ہو اُس کے متعلق ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کتنا اہم اور ضروری ہوگا۔ فِیْ کے یہ معنے لُغت سے بھی ثابت ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں تَكَلَّمْتُ مَعَكَ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ میں نے تجھ سے اس امر کے متعلق گفتگو کی۔ اِسی طرح قرآن کریم میں بھی اس کی مثال پائی جاتی ہے۔ سورۂ یوسف میں امْرَاَةُ الْعَزِيْزِ کے متعلق آتا ہے کہ اُس نے کہا فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ (یوسف آیت ۳۳) یہ وہ شخص ہے جس کے بارہ میں تم نے مجھے ملامت کی ہے۔ اِسی طرح حدیث میں آتا ہے۔ عُذِّبَتِ امْرَاَةٌ فِيْ هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا (بخاری جلد ۲ کتاب المساقاۃ) ایک عورت کو ایک بلّی کی وجہ سے عذاب دیا گیا کیونکہ اُس نے اُسے بغیر کھلائے پلائے باندھ دیا تھا یہاں تک کہ وہ مر گئی۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ رمضان ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن کریم کے نزول کا آغاز ہوا۔ چنانچہ حدیثوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ قرآن کریم کا نزول رمضان کے مہینہ میں شروع ہوا۔ اور گو تاریخ کی تعیین میں اختلاف ہے لیکن محدثین عام طور پر ۲۴ تاریخ کی روایت کو مقدم بتاتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامہ زرقانی دونوں نے اس روایت کو ترجیح دی ہے کہ قرآن کریم رمضان کی ۲۴ تاریخ کو اُترنا شروع ہوا تھا۔ (زرقانی شرح مواہب اللدنیہ جلد اوّل صفحہ ۲۰۷ و بحر محیط جلد ۲ صفحہ ۳۹)

تیسرے معنے اِس کے یہ ہیں کہ رمضان میں پورا قرآن اُتارا گیا۔ جیسے احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ اِنَّ جِبْرِيْلَ كَانَ يُعَارِضُنِيَ الْقُرْاٰنَ فِيْ كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً وَ اِنَّهٗ عَارَضَنِيَ الْاٰنَ مَرَّتَيْنِ (زرقانی شرح مواہب اللدنیہ جلد ۸ صفحہ ۲۵۰ و صفحہ ۲۹۳) یعنی جبریل ہر سال رمضان کے مہینہ میں تمام قرآن کریم کا میرے ساتھ ایک دفعہ دور کیا کرتے تھے۔ مگر اس سال انہوں نے دو دفعہ دور کیا ہے جس سے میں سمجھتا ہوں کہ اب میری وفات کا وقت قریب ہے اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں بھی قرآن کریم نازل ہوا ہے مگر رمضان المبارک کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں جس حد تک قرآن کریم نازل ہو چکا ہوتا تھا جبریل اس کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر دَور کیا کرتے تھے۔ گویا دوسرے الفاظ میں دوبارہ تمام قرآن کریم آپ پر نازل کیا جاتا۔ بخاری کتاب بدء الوحی

میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ وَكَانَ اَجْوَدَ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيْلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْاٰنَ فَلَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ۔ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے اور زیادہ تر سخاوت آپ رمضان میں فرمایا کرتے تھے جبکہ جبریل آپ سے ملتے تھے۔ اور جبریل رمضان کے مہینہ میں ہر رات آپ سے ملا کرتے تھے اور تمام قرآن کریم کا آپ کے ساتھ مل کر دَور کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بارش لانے والی ہوا سے بھی اپنے جود وکرم میں بڑھ جاتے تھے۔

اِن حوالجات سے ثابت ہے کہ ابتدائے نزولِ قرآن بھی رمضان کے مہینہ میں ہُوا اور پھر ہر رمضان میں جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا جبریلؑ دوبارہ نازل ہو کر اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مل کر دہراتے تھے۔ اِس روایت کو مدّنظر رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ سارا قرآن کریم ہی رمضان میں نازل ہُوا۔ بلکہ کئی حصّے متعدد بار نازل ہوئے یہاں تک کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد اگر ۲۳ رمضان آئے تو بعض آیات ایسی تھیں جو ۲۳ بار نازل ہوئیں بعض ۲۲ بار نازل ہوئیں۔ بعض ۲۱ بار اور بعض ۲۰ بار۔ اِسی طرح جو آیات آخری سال نازل ہوئیں وہ بھی دو دفعہ دہرائی گئیں۔ کیونکہ جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ آپ کی حیاتِ طیبہ کے آخری سال میں جبریل علیہ السلام نے دو دفعہ قرآن کریم آپ کے ساتھ دہرایا اور یہ بات قرآن کریم سے ثابت ہے کہ ملائکہ جو بھی کام کرتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ اِس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جبریل علیہ السلام کا رمضان میں آپ کے ساتھ مل کر قرآن کریم کا دَور کرنا نزول نہیں کہلا سکتا کیونکہ فرشتہ اُترتا ہی اُسی وقت ہے جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو اور اسلامی زبان میں اُس کے لئے نزول کی اصطلاح ہی استعمال ہوتی ہے۔ پس اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اس مہینہ میں تمام قرآن کا نزول ہوا۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ رمضان اسلامی نام ہے اس مہینے کا پہلا نام زمانۂ جاہلیت میں ناتق ہُوا کرتا تھا (فتح البیان)

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى۔ چونکہ هُدًى اور بَيِّنٰتٍ دونوں قرآن کریم کا حال ہیں۔ اِس لئے اِس کے معنے یہ ہوئے کہ یہ قرآن ایسا ہے کہ اوّل تو وہ هُدًى ہے یعنی لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہے دوم اِس میں ہدایت کے دلائل ہیں۔ یعنی وہ یونہی لوگوں کو نہیں کہتا کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو بلکہ وہ دلائل بھی دیتا ہے۔ اور لِلنَّاسِ کا لفظ رکھ کر بتایا کہ یہ تمام دنیا کے لوگوں کے لئے ہدایت کا موجب ہے صرف بعض لوگوں کے لئے نہیں۔ وَالْفُرْقَانِ اور پھر اس میں ایسے دلائل ہیں جو حق اور باطل میں امتیاز کر دیتے ہیں۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ میں بتایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے رمضان کا مبارک مہینہ نصیب کرے اور وہ ان دنوں میں سفر میں بھی نہ ہو اور اُس کی صحت بھی اچھی ہو اُسے چاہیئے کہ وہ پورے مہینہ کے مسلسل روزے رکھے اور اپنے لئے خیر اور برکت کے زیادہ سے زیادہ سامان جمع کرے اور ان مبارک ایام کو سستی اور غفلت میں ضائع نہ کرے۔

پھر فرماتا ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔ یعنی ہم نے رمضان میں روزے اِس لئے مقرر کئے ہیں کہ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ تم ایمان لاؤ اور پھر اپنی زندگی تنگیوں میں بسر کرو۔ حالانکہ

بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ ان دنوں مومنوں کو اپنے نفس پر زیادہ تنگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ درحقیقت اس آیت میں عظیم الشان نکتہ بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے بھوکا رہنا یا دین کیلئے قربانیاں کرنا انسان کے لئے کسی نقصان کا موجب نہیں بلکہ سراسر فائدہ کا باعث ہوتا ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ رمضان میں انسان بھوکا رہتا ہے وہ قرآن کریم کی تکذیب کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم بھوکے تھے ہم نے رمضان مقرر کیا تاکہ تم روٹی کھاؤ۔ پس معلوم ہوا کہ روٹی وہی ہے جو خدا کھلاتا ہے اور اصل زندگی اسی سے وابستہ ہے کہ انسان خدا کے لئے قربانی کرے اور پھر جو کچھ ملے اُسے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوا کھائے۔ اس کے سوا جو روٹی ہے وہ دراصل کھانے والے کیلئے رُوحانی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے۔ پس مومن کا فرض ہے کہ جو لُقمہ بھی اس کے مُونہہ میں جائے اس کے متعلق پہلے دیکھ لے کہ وہ کس کے لئے ہے اگر تو وہ خدا کے لئے ہے تو وہی روٹی ہے اور اگر نفس کے لئے ہے تو وہ روٹی نہیں بلکہ پتھر ہیں اسی طرح جو کپڑا خدا کے لئے پہنا جائے وہی لباس ہے اور جو نفس کے لئے پہنتا ہے وہ ننگا ہے۔ دیکھو کیسے لطیف پیرایہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جبتک تم خدا کے لئے تکالیف اور مصائب برداشت نہ کرو تم کبھی سہولت حاصل نہیں کر سکتے۔ اس سے اُن لوگوں کے خیال کا بھی ابطال ہو جاتا ہے جو بقول حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام رمضان کو موٹے ہونے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگوں کے لئے رمضان ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گھوڑے کیلئے خوید۔ وہ ان دنوں خوب گھی۔ مٹھائیاں اور مرغن اغذیہ کھاتے ہیں اور اس طرح موٹے ہو کر نکلتے ہیں جس طرح خوید کے بعد گھوڑا۔ یہ چیز بھی رمضان کی برکت کو کم کرنے والی ہے۔ اسی طرح افطاری میں تنوع اور سحری میں تکلفات بھی نہیں ہونے چاہئیں اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ سارا دن بھوکے رہے ہیں اب پُرخوری کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ افطاری کے لئے کوئی تکلفات نہ کرتے تھے۔ کوئی کھجور سے کوئی نمک سے بعض پانی سے اور بعض روٹی سے افطار کر لیتے تھے۔ ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم اس طریق کو پھر جاری کریں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے نمونہ کو زندہ کریں۔

پھر فرماتا ہے وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم گنتی پوری کرو۔ مفسرین نے اس کے یہ معنے کئے ہیں اور مَیں خود بھی کبھی کبھی یہ معنے کیا کرتا ہوں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہینہ بھر کے روزے مقرر کرنے کی وجہ بتائی ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا مہینہ اس لئے مقرر کیا ہے تا دن پورے ہو جائیں۔ اگر یونہی حکم دے دیتا کہ روزے رکھو تو کوئی دس رکھ لیتا کوئی بیس رکھ لیتا اور کوئی رکھتا ہی چلا جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک مہینہ مقرر کر دیا تاکہ روحانی تکمیل کے لئے جس مدت کی ضرورت ہے اس کو تم پورا کر لو۔ یہ معنے بھی اپنی جگہ درست ہیں مگر اسکا ایک یہ مطلب بھی ہے کہ اصل زندگی انسان کی وہی ہے جو نیکی میں گذرے عمر کا وہ حصہ جو دنیا کے لئے گذر جاتا ہے ضائع چلا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے روزے اسلئے رکھے ہیں تاکہ تم اپنی حقیقی عمر پوری کر لو۔ جو لوگ دنیا حاصل کرنے میں ہی مصروف رہتے ہیں وہ قرآنی اصطلاح کے مطابق زندہ نہیں بلکہ مُردہ ہوتے ہیں۔ اور مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى کے مطابق جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ اگلے جہاں میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ہم نے روزے اس لئے مقرر کئے ہیں تا تم دنیا میں اپنی مقررہ عمر گذار لو۔ چونکہ بنی نوع انسان کے لئے کھانا پینا لازمی ہے۔ اس لئے سارا سال تو روزے نہیں رکھے جا سکتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس اصل کے مطابق کہ ایک نیکی کا ثواب کم سے کم دس گنا ملتا ہے ایک ماہ کے روزے مقرر کر دئے اور اس طرح رمضان سارے سال کے روزوں کا قائم مقام ہو گیا۔

گویا جس نے اِس مہینہ میں روزے رکھ لئے اُس نے سارے سال کے روزے رکھ لئے اور اس طرح اس کی زندگی واقعی زندگی ہوگئی۔

پھر فرماتا ہے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ یہ روزے اس لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ اُس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کی فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے شَهْرُ کے مقابلہ میں وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ کے الفاظ رکھ دیئے۔ اور بتایا کہ اگر ہم ایک مہینہ مقرر نہ کرتے تو کوئی کم روزے رکھتا اور کوئی زیادہ اور اس طرح وہ رُوحانی ترقی جو مہینہ بھر کے روزوں کے نتیجہ میں حاصل ہوسکتی ہے اُسے وہ حاصل نہ کرسکتے۔

اِس کے بعد اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کے مقابلہ میں وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ کے الفاظ رکھ کر بتایا کہ ہم نے کوئی اور مہینہ اس لئے مقرر نہیں کیا کہ نزولِ قرآن کو یاد کرکے اس ماہ میں تمہارے دل میں خاص جوش پیدا ہو سکتا ہے۔ جب رمضان کا مہینہ آئیگا تو لازماً تمہیں یہ خیال بھی آئیگا کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں ہم پر خدا تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل قرآن کریم جیسی مقدس کتاب کی شکل میں نازل ہوا ہے اور تمہارا دل خود بخود اس مہینہ میں خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کی طرف متوجہ ہو جائیگا۔

پھر وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ دن اس لئے ہیں کہ تا اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر تم اس کی تکبیر کرو۔ یہ نہیں کہ تم شکوہ کرو کہ ہمیں بھوکا رکھا۔ بلکہ یہ سمجھو کہ بڑا احسان کیا کہ روزہ جیسی نعمت ہمیں عطا کی۔ یہاں مومن کا نقطہ نگاہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ اُسے قربانی کا جو موقعہ بھی ملے وہ اُسے اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتا ہے۔ اور جس قوم کا یہ نقطۂ نگاہ ہو جائے۔ اُسے کوئی تباہ نہیں کرسکتا۔ وہ ضرور کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ ایسی قوم حقیقی معنوں میں زندہ قوم ہو جاتی ہے۔ جب ایک شخص کے دل میں یہ خیال ہو کہ مجھ پر جو دینی ذمہ داریاں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرے گا۔ اور جو شخص خدا تعالیٰ کی بڑائی کرے خدا تعالیٰ اُس کی بڑائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تمہیں جو کوئی تحفہ دے تم اُسے اُس سے بہتر تحفہ دو۔ اور جب ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے تو کیونکر ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ایسا نہ کرے۔ انسان اُسکی خدمت میں تحفہ پیش کرے اور وہ اُس سے بہتر تحفہ اُسے نہ دے۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کی بڑائی کرتا ہے خدا تعالیٰ اُس کی بڑائی کرتا ہے مگر شرط یہی ہے کہ تکبیر صرف مُنہ سے نہ ہو۔ جس تکبیر سے وہ خوش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ گالیاں کھاؤ۔ ماریں کھاؤ۔ پتھر کھاؤ اور پھر بھی خدا تعالیٰ کی تکبیر کرو کہ اُس نے ہمیں یہ مواقع عطا کئے ہیں۔ گویا حقیقی تکبیر یہی ہے کہ جتنا زیادہ ظلم ہو۔ اتنا ہی زیادہ انسان خدا تعالیٰ کی طرف جھکے اور کہے کہ مجھ پر اس کے کتنے احسان ہو رہے ہیں جب اس پر کوئی مصیبت نازل ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی تکبیر کرے اور اس کی بڑائی بیان کرے ایسے شخص کی تکبیر کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ یقیناً اس کو بڑھاتا ہے اور اُس کی بڑائی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ ورنہ صرف مُنہ کی تکبیریں اس کے کسی کام نہیں آسکتیں۔

اِس کے بعد فرمایا وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یہ روزے ہم نے اِس لئے مقرر کئے ہیں تاکہ تم اس کے شکر گذار بنو۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کے مقابل میں رکھ کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ سہولت ہم نے اس لئے رکھی ہے کہ تم شکر گذار بنو کہ خدا تعالیٰ نے مدارج عالیہ کے حصول کے لئے

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اور (اے رسول) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو (تو جواب دے کہ) میں (ان کے) پاس (ہی) ہوں جب دُعا کرنیوالا مجھے پکارے تو میں اُس کی دعا

اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

قبول کرتا ہوں۔ سو چاہیئے کہ وہ (یعنی دُعا کرنیوالے بھی) میرے حکم کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تا وہ ہدایت پائیں۔ ۱۰۰

ہمارے لئے کس قدر سہولتیں رکھ دی ہیں اور تمہاری جبینِ نیاز ہمیشہ اُس کے حضور جھکی رہے۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین احکام دیئے ہیں اور تین ہی حکمتیں بیان فرمائی ہیں۔ تین احکام تو یہ دیئے کہ (۱) مہینہ کے روزے رکھو (۲) رمضان میں رکھو (۳) مریض اور مسافر کو ان دنوں میں رخصت ہے۔ اس کے مقابل میں تین ہی حکمتیں بیان فرمائیں (۱) کہا تھا کہ ایک مہینہ کے روزے رکھو اس کے لئے فرمایا کہ اگر ہم روزے مقرر نہ کرتے تو لوگ کم و بیش رکھتے اور اس طرح وہ تعداد پوری نہ ہوتی جو روحانی ترقی کے لئے ضروری ہے (۲) کہا تھا کہ رمضان میں روزے رکھو۔ اس پر کوئی کہہ سکتا تھا کہ رمضان کو کیوں مقرر کیا ہے جس مہینہ میں کوئی چاہتا روزے رکھ لیتا۔ اس لئے فرمایا کہ اس مہینہ میں قرآن کریم کا نزول یاد آکر خدا تعالیٰ کو یاد کرنے کا جوش پیدا ہوگا اور اس مبارک مہینہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت اور ذکرِ الٰہی کی طرف تمہیں زیادہ توجہ پیدا ہوگی (۳) کہا تھا کہ بعض کے لئے رخصت ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان آسانیوں کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا جذبہ تمہارے دلوں میں پیدا ہو کہ خدا تعالیٰ کو ہمارا کتنا خیال ہے اُس نے ہمارے فائدہ کے لئے حکم دیا۔ اور اس میں بھی ہمارے لئے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ یہ عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کے مقابلہ میں فرمایا کہ یہ تخفیف اور سہولت اس لئے ہے کہ تم خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اُس کی محبت سے اپنے سینہ و دل کو منور کرو۔ اسی طرح لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ رمضان ہم نے اس لئے اُتارا ہے کہ تم شکر گذار بنو۔ یعنی ہر تکبیر کے بعد شکر کرو کہ خدا نے اپنی تکبیر کی توفیق دی اور پھر اس بات کا شکر کرو کہ خدا نے اپنے شکر کی توفیق دی۔ اور پھر شکر کی توفیق ملنے پر شکر کرو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے شکر کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائیگا کہ انسان ہر وقت اُس کے دروازہ پر گرا رہے گا۔ اور اُس غلام کی طرح ہو جائیگا جو کسی صورت میں بھی اپنے آقا کو نہیں چھوڑتا۔

۱۰۰ حل لغات :۔ اُجِيْبُ : اَجَابَ سے مضارع متکلم کا صیغہ ہے اور اَلْاِجَابَةُ کے معنے ہیں۔ اَلْعَطِيَّةُ مِنَ اللّٰهِ وَالطَّاعَةُ مِنَ الْعَبْدِ (مفردات) یعنی اجابت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو تو بخشش کرنے یا دینے کے معنے ہوتے ہیں۔ اور اگر بندے کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنے اطاعت کے ہیں۔ پس اُجِيْبُ کے معنے ہوئے۔ میں سُنکر بدلہ دیتا ہوں یا اسے قبول کرتا ہوں۔

وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ : اٰمَنَ بِهٖ کے معنے ہیں (۱) اُسے مان لیا (۲) اس کی صفات کو تسلیم کر لیا۔ پس وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کے یہ معنے ہوئے کہ (۱) وہ مجھے مانیں اور (۲) میری صفات کو تسلیم کریں۔

لَعَلَّكُمْ : لَعَلَّ مِنْ اَخَوَاتِ اِنَّ۔ لَعَلَّ اِنَّ کے اخوات میں سے ہے۔ وَذَكَرَ بَعْضُ الْمُفَسِّرِيْنَ اَنَّ لَعَلَّ مِنَ اللّٰهِ وَاجِبٌ (مفردات) اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے آئے تو اس کے معنے

اُجِيْبُ

وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ

لَعَلَّكُمْ

یقین کے ہوتے ہیں۔ نیز نَعِقُ کی مزید تشریح کے لئے دیکھیں
حل لغات سورۃ بقرۃ ع۲۲ ۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اے میرے رسول! جب میرے
بندے میرے متعلق تجھ سے سوال کریں اور پُوچھیں کہ ہمارا خدا
کہاں ہے۔ جیسے عاشق پوچھتا پھرتا ہے کہ میرا محبوب کہاں
ہے۔ تو تُو انہیں کہہ دے کہ تم گھبراؤ نہیں مَیں تو تمہارے
بالکل قریب ہوں۔ یہاں عِبَادِیْ سے مراد عاشقانِ الٰہی
ہی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح عاشق ہر جگہ
دوڑا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا معشوق کہاں ہے۔ اسی طرح
جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پُوچھیں تو تُو انہیں
کہہ دے کہ گھبراؤ نہیں مَیں تمہارے قریب ہی ہوں۔ کیونکہ
اللہ تعالیٰ اپنے عشاق کے دل کو توڑنا نہیں چاہتا۔

پھر فرماتا ہے۔ میرے قریب ہونیکا ثبوت یہ ہے کہ
اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ جب کوئی شخص کامل
تڑپ اور سوز و گداز کے ساتھ مجھ سے دُعا کرتا ہے تو مَیں
اُس کی دُعا کو قبول کر لیتا ہوں۔ اور یہ ثبوت ہوتا ہے اس
بات کا کہ مَیں قریب ہوں۔ اگر مَیں بعید ہوتا تو مَیں اُس کی
سجدے کی آہستہ آواز کو بھی کیسے سُن سکتا۔ اور اگر مَیں بعید
ہوتا تو اس کی گوشۂ تنہائی میں بیٹھے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر یا
قیام کی صورت میں آہستہ آواز والی دُعا کیسے سُن لیتا۔ میرا
اس دُعا کو سُن لینا بتاتا ہے کہ مَیں اُس کے قریب ہوں۔

دوسری جگہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ اسی حقیقت کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ
مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ یعنی پاس ہونا تو الگ رہا جو انسان
کی رگ جان ہے ہم اُس سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ اسکے معنے یہ
ہیں کہ وہ پاس ہی نہیں بلکہ انسان کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے
کہ پاس بیٹھنے والا صرف وہ آواز سنتا ہے جو مُنہ سے کہی جائے اور جو اندر
بیٹھا ہو وہ وہ بات سنتا ہے جو دل سے کہی جائے۔ گویا خدا تعالیٰ نے
لفظ قریب کی دوسری جگہ تشریح کر دی کہ قریب کا مفہوم
یہ ہے کہ حبل الورید یعنی رگِ جان سے بھی میں زیادہ قریب
ہوں اور مَیں ہر پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہوں خواہ
وہ زبان سے کی گئی ہو یا دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی ہو کیونکہ
میرا اس سے تعلق ایسا قریب ہے کہ مَیں اس کے دل میں بیٹھا
ہُوا ہوں۔

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم نے تو بڑے اضطراب
سے دُعائیں کی تھیں مگر وہ قبول نہیں ہوئیں۔ پھر یہ آیت
کس طرح درست ثابت ہوئی۔ اس کا ایک جواب تو
یہ ہے کہ بے شک اَلدَّاعِ کے ایک معنے ہر پکارنے
والے کے بھی ہیں۔ مگر اس کے ایک معنے ایسے پکارنے والے
کے بھی ہیں جس کا اوپر ذکر ہو رہا ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ وہ
بندے جو مجھے ملنے کے اضطراب میں اور سب کچھ بھول جاتے
ہیں اور مجھ سے صرف میرا قرب اور وصال چاہتے ہیں۔ مَیں اُن کی
دُعا کو سُنتا اور انہیں اپنے قرب میں جگہ دیتا ہوں اسی لئے
اللہ تعالیٰ نے یہاں وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فرمایا
ہے۔ یعنی وہ میرے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ اس میں
روٹی کا کہیں ذکر نہیں۔ نوکری کا کہیں ذکر نہیں بلکہ صرف
عَنِّيْ فرمایا ہے۔ عَنِ الْخُبْزِ یا عَنِ الْوَظِيْفَةِ نہیں
فرمایا۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کا قرب مانگے اور وہ اُسے
نہ ملے اُسے تو بے شک اعتراض ہو سکتا ہے لیکن دوسروں
کے لئے اس میں کوئی اعتراض کی گنجائش نہیں۔

پھر اس آیت کی عبارت ایسی ہے کہ اس سے اضطراب
اور گھبراہٹ کی طرف خاص طور پر اشارہ پایا جاتا ہے بعض
مضامین الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتے لیکن وہ عبارت میں
نہاں ہوتے ہیں اور یہی حالت یہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ جب میرے بندے میری طرف دوڑتے ہیں۔
اُن کے اندر ایک اضطراب اور عشق پیدا ہوتا ہے اور وہ چلاتے
ہیں کہ ہمارا خدا کہاں ہے تو تُو اُن سے کہدے کہ مَیں تمہاری
طرح کے پکارنے والے کی پکار کو کبھی رد نہیں کرتا بلکہ اُسے

ضرور سنتا اور قبول کرتا ہوں۔ ایک دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ مضمون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ یعنی وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی ذات ہی کی قسم ہے کہ ہم ضرور اُن کو اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخش دیتے ہیں اِس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مذہب اور علم کے آدمی کو اپنا رستہ دکھلانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس کے لئے کوشش کرے۔ اور اُس کی دُعا کو وہ ضرور سُن لیتا ہے۔ باقی دعاؤں کی قبولیت میں وہ انسانی مصالح کو بھی مدّنظر رکھتا ہے بعض دفعہ انسان جو چیز مانگتا ہے خدا تعالیٰ کے علم میں وہ اس کے لئے مہلک ہوتی ہے۔ پھر بعض دفعہ ملازمت ایک ہوتی ہے اور اُسے مانگنے والے دو ہوتے ہیں۔ اب ایک ملازمت دو کو تو نہیں مل سکتی ▪ لازماً ایک ہی کو ملے گی۔ مگر وہ چیز جس کے بانٹنے کے باوجود اُس میں کوئی کمی نہیں آسکتی وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے باقی تمام اشیاء محدود ہیں۔ اگر ایک چیز کے دو مانگنے والے سامنے آجائیں تو وہ لازماً زیادہ حقدار کو دی جائیگی یا اگر وہ مضر ہو تو گو اس کا کوئی اور حقدار نہ ہو مگر پھر بھی وہ اپنے مومن بندہ کو نہیں دیگا۔ کیونکہ وہ دوست سے دشمنی کیونکر کر سکتا ہے اور کیسے ممکن ہے کہ جس چیز کے متعلق وہ جانتا ہے کہ آگ ہے ▪ اپنے دوست کو دیدے۔ غرض سب دعاؤں کی قبولیت میں روکیں ہوتی ہیں مگر ایک دُعا ہے جس کے قبول ہونے میں کوئی روک نہیں اور جس کے لینے میں کوئی بُرائی نہیں۔ دُنیا کی ہر چیز میں بُرائی ہوسکتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ بعض نماز پڑھنے والوں کے لئے بھی ہلاکت ہے مگر خدا تعالیٰ کو مانگنے میں کوئی ویل نہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خدا تعالیٰ کسی سے اس لئے نہ ملے کہ وہ ہلاکت میں نہ پڑے یا اس لئے نہ ملے کہ خدا تعالیٰ کے وجود میں کمی نہ آجائے۔ جس طرح ہوا ہر ایک کے ناک میں جاتی ہے مگر اُس میں کمی نہیں ہوتی اسی طرح خدا تعالیٰ ہر بندہ کو مل سکتا ہے اور پھر بھی اُس میں کمی نہیں ہوتی۔ سورج کی شعاعوں سے سب مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔ مگر اُن میں کوئی کمی نہیں آتی۔ چاند کی شعاعوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔ تم چاندنی روشنی میں گھنٹوں بیٹھ کر لطف اٹھاؤ مگر اُس کا نور پھر بھی اُتنے کا اُتنا ہی رہیگا۔ یہی حال خدا تعالیٰ کا ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ تو اُن سے بھی کامل ہے۔ اِن چیزوں میں بھی ممکن ہے کوئی خفیف سی کمی ہو جاتی ہو۔ مگر خدا تعالیٰ میں اتنی بھی نہیں ہوتی۔ اِسی لئے وہ اپنے بندوں سے کہتا ہے کہ تم میری طرف آؤ۔ پھر تم دیکھوگے کہ تم کس طرح تیزی سے قدم مارتے ہوئے اس راستہ پر چل پڑوگے جس سے خدا تعالےٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور باوجودیکہ وہ غیر مرئی ہے تم اُس کو پالوگے اور اُس کا وصل حاصل کرلوگے۔ درحقیقت اگر غور کیا جائے تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی رُوحانی ترقی اور بندوں اور خدا کے باہمی اتصال کے لئے تین تغیّرات کا ذکر فرمایا ہے جن کے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔

سب سے پہلا تغیّر جو کسی انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں خدا تعالےٰ سے ملوں اور اس کا قرب حاصل کروں۔ مگر ظاہر ہے کہ صرف خواہش کا پیدا ہونا اُسے خدا تعالےٰ کے دربار تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ ضروری ہوتا ہے کہ اُسے کوئی ایسا ہادی اور رہنما میسّر آئے جو اُسے اس مقصد میں کامیابی کا طریق بتلائے۔ اور اُس کی مشکلات کو دُور کرے۔ اسلام اس فطرتی تقاضا کی اہمیّت کو تسلیم کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ بیشک اِن لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش تو پیدا ہوگئی ہے کہ انہیں خدا ملنا چاہیئے لیکن اب دوسرا تغیر ان میں یہ بھی پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ تجھ سے پُوچھیں۔ یعنی ہدایت پانے اور خدا تعالےٰ کو تلاش کرنے کے لئے انہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف جانا چاہیئے۔ اور آپ سے اپنے محبوب حقیقی کا پتہ دریافت کرنا چاہیئے جس طرح بیمار کی تندرستی کے لئے ایک تو اس بات کی

ضرورت ہوتی ہے کہ وہ سمجھ لے کہ وہ بیمار ہے۔ اور دوسرے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس ڈاکٹر کے پاس جائے جو اعلیٰ درجہ کا تجربہ کار ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کو پانے کیلئے بھی ضروری ہے کہ نہ صرف خدا تعالیٰ کو پانے کی سچی خواہش انسان کے دل میں پیدا ہو بلکہ وہ اس خواہش کے حصول کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار اختیار کرے جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچانے والے ہیں۔

پھر تیسری بات جو قرب الٰہی کے لئے ضروری ہے اور جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کا سوال عَنِّیْ ہو۔ یعنی ان کی غرض محض خدا تعالیٰ کو پانا ہو۔ لوگ کئی اغراض کے ماتحت مذہب میں داخل ہوتے ہیں۔ بعض لوگ محض ایک جماعت میں منسلک ہونے کیلئے داخل ہوتے ہیں۔ بعض اخلاقِ فاضلہ کے حصول کے لئے داخل ہوتے ہیں۔ بعض معاشرت یا تمدن کے خیال سے داخل ہوتے ہیں مگر فرمایا ان کا سچے مذہب میں داخل ہونا محض خدا تعالیٰ کے وصال اور اس کے قرب کے حصول کے لئے ہو۔ کوئی اور خواہش اس کے پیچھے کام نہ کر رہی ہو۔ ہاں اگر دوسرے فوائد ضمنی طور پر حاصل ہو جائیں تو اور بات ہے۔ لیکن اصل غرض محض خدا تعالیٰ کا حصول ہونا چاہیئے۔

پھر عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب اِذَا کے بعد فَ آتی ہے تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ پہلے کام کے نتیجہ میں فلاں بات پیدا ہوئی۔ اسجگہ بھی اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کے یہ معنے ہیں کہ جب یہ تین باتیں جمع ہو جائیں۔ یعنی سوال کرنے والے سوال کریں کہ ہمیں خدا تعالیٰ کی ضرورت ہے۔ پھر تجھ سے سوال کریں فلاسفروں اور سائنسدانوں سے سوال نہ کریں عیسیٰ یا موسیٰ سے سوال نہ کریں بلکہ تیرے پاس آئیں قرآن کے پاس آئیں یا تیرے خلفاء کے پاس آئیں اور پھر وہ میری ذات کے متعلق سوال کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں ان کے قریب ہو جاتا ہوں اور انہیں اپنا چہرہ دکھا دیتا ہوں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب سورۃ قٓ میں جو کہ مکی سورۃ ہے۔ خدا تعالیٰ یہ فرما چکا تھا کہ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (قٓ آیت ۱۷) ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں تو پھر سورۃ بقرۃ میں جو مدنی سورۃ ہے یہ فرمانے کی کیا ضرورت تھی کہ جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے سوال کریں تو تو ان کو یہ جواب دے دے کہ میں قریب ہوں۔ جب مکی آیت کے ذریعہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ خدا تعالیٰ بہت ہی قریب ہے تو پھر یہ سوال ہی کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس آیت کے نازل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور اگر کوئی سوال کرتا بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُسے یہ فرما سکتے تھے کہ خدا تعالیٰ تو بتا چکا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ لیکن قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا کلام بلا ضرورت نہیں ہوا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں خدا تعالیٰ کا سوال بیان کرنا اور پھر اس کا جواب دینا کوئی اور حکمت رکھتا ہے۔ اور یہاں جو قریب کا لفظ استعمال ہوا ہے اُس سے وہ قرب اور بُعد مراد نہیں جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق تو اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اگر یہاں بھی یہی مراد ہوتی تو پھر یہ کیوں فرماتا کہ جب لوگ تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو یہ جواب دیجیو۔ پس معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں جو قریب کہا گیا ہے وہ بھی کوئی اور معنے رکھتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ان دونوں آیتوں میں خدا تعالیٰ نے ایک عجیب فرق رکھا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرب اور بُعد ہمیشہ نسبت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک چیز ہمارے قریب ہوتی ہے مگر وہی دوسرے سے بعید ہوتی ہے۔ پس قریب اور بعید ایک نسبتی چیز ہے۔ جب ہم ایک چیز کو قریب کہتے ہیں تو ایک نسبت سے کہتے ہیں حالانکہ دوسری

نسبت سے وہی چیز بعید ترین ہو سکتی ہے۔ سورۃ قٓ میں جو
اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ
مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ
کہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے دل میں جو
وسوسہ ہوتا ہے اس کو بھی جانتے ہیں اور ہم اس کی رگ جان
سے بھی قریب تر ہیں۔ تو اس میں اِلَيْهِ کی نسبت سے اَقْرَبُ
فرمایا ہے۔ لیکن آیت وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ
فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ میں قَرِيْبٌ کا لفظ کسی نسبت سے نہیں
فرمایا۔ بلکہ بلانسبت فرمایا ہے اور اس کی کوئی حدبندی نہیں
کی۔ اس عدمِ حدبندی میں ایک لطیف نکتہ ہے اور وہ
یہ کہ انسان جو اپنی ضرورت خدا تعالیٰ کے حضور پیش کرتا ہے
وہ مختلف اوقات میں مختلف اشیاء کے متعلق ہوتی ہے
کبھی تو وہ انسانوں کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی حیوانوں کے
متعلق۔ کبھی جانداروں کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی بے جانوں
کے متعلق۔ کبھی خدا تعالیٰ کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی ملائکہ کے
متعلق۔ کبھی اس دنیا کے متعلق ہوتی ہے اور کبھی اگلے جہان
کے متعلق۔ کبھی اس زمین پر رہنے والی چیزوں کے متعلق ہوتی
ہے اور کبھی آسمان کی چیزوں کے متعلق۔ غرض انسان کی
مختلف احتیاجیں ہیں اور ایسی وسیع ہیں کہ جن کی کوئی
حدبندی نہیں ہو سکتی۔ لیکن انسان کی فطرت میں یہ بات
داخل ہے کہ جب اُسے کسی چیز کی طلب ہوتی ہے تو اُس کے
حاصل کرنے کے متعلق وہ کوئی ایسا ذریعہ تلاش کرتا ہے جو
قریب ہو پھر قریب کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ایک یہ بھی قریب
ہے کہ کوئی ذریعہ جلدی سے میسر آجائے۔ چنانچہ ہر انسان
اپنا مدعا حاصل کرنے کے لئے جو ذریعہ قریب دیکھتا ہے اسکو
لے لیتا ہے۔ اور بعید کو چھوڑ دیتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ
قریب ایک اور رنگ میں بھی ہوتا ہے یعنی وہ ذریعہ جو مدعا
اور منزلِ مقصود کے قریب تر پہنچا دے۔ انسان اس ذریعہ
کو اختیار کرتا ہے اور دوسروں کو چھوڑ دیتا ہے۔ غرض
بہت سے قرب ہیں جن کا کسی چیز میں پایا جانا ہر انسان دیکھتا
ہے۔ اور جب وہ سارے قرب کسی میں پا لیتا ہے تو اس
کو اپنے مدعا کے حصول کے لئے چن لیتا ہے۔ اسی لئے
اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ
عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ کہ انسان اپنے مختلف مقاصد کے
لئے کوشش کرتا ہے اور اُن کے لئے دیکھتا ہے کہ کونسا
ذریعہ اختیار کروں جس سے جلد کامیاب ہو جاؤں۔ جب
انسان ذرائع کو سوچتے سوچتے یہاں تک پہنچے کہ میں دعا
کروں تو اس کو کہدو کہ اللہ قریب ہے۔ قَرِيْبٌ اِلَيْهِ
نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نہ صرف اس انسان کے
قریب ہے بلکہ ہر ایک چیز کے قریب ہے اور وہ مدعا حاصل
کرنے کا سب سے قریب ترین ذریعہ ہے۔ یوں قریب
ہونا اور بات ہے لیکن جس مقصد کو حاصل کرنا ہو اُسکے قریب
کر دینا اور بات ہے۔ غرض خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہارے
بھی قریب ہوں اور وہ مقصد جسے تم حاصل کرنا چاہتے ہو
اُس کے بھی قریب ہوں۔ گویا اس آیت میں قربِ مکان کا ذکر
نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حصولِ مدعا کے لئے جتنے
قربوں کی ضرورت ہے وہ سب خدا تعالیٰ میں موجود ہیں
مثلاً ایک شخص ولایت میں بیٹھا ہوا روپیہ کا محتاج ہے
وہ وہاں سے ہمیں مدد کے لئے لکھتا ہے۔ اگر ہم اُسے
روپیہ بھیجیں تو کئی دنوں کے بعد اُسے ملیگا۔ لیکن اگر ہم اس کے
لئے دعا کریں تو ممکن ہے کہ ادھر ہمارے مُنہ سے اُس کیلئے
دعا نکلے اور اُدھر اللہ تعالیٰ اس کا کوئی انتظام کر دے۔
تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قریب ہوں۔ اگر کوئی مدد
حاصل کرنا چاہتے ہو تو مجھ سے کہو۔ اور خدا تعالیٰ کے حضور
حاضر ہونے کے لئے نہ ہاتھ ہلانے کی ضرورت ہے نہ پاؤں
سے چلنے کی۔ دل ہی دل میں انسان حاضر ہو سکتا ہے۔
کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قریب ہوں۔ پھر
وہ انسان ہی کے قریب نہیں بلکہ جس مدعا اور مقصد کو

حاصل کرتا ہو اُس کے بھی قریب ہے۔ اِدھر انسان یہ کہتا ہے کہ الٰہی فلاں چیز مجھے مِل جائے اور اُدھر وہ چیز خواہ لاکھوں میل کے فاصلہ پر ہو خدا تعالیٰ اُس پر اُسی وقت قبضہ کر لیتا ہے کہ یہ ہمارے فلاں بندہ کے لئے ہے۔ کیونکہ جس طرح خدا تعالیٰ اس بندہ کے قریب ہے اسی طرح اس چیز کے بھی قریب ہے۔ غرض کامیابی کے حصول کے لئے یہ ذریعہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مفید ہے۔

پھر اِنِّی قَرِیْبٌ کہہ کر ایک اور لطیف مضمون کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے اور وہ یہ کہ اگر میں تمہیں نظر نہیں آتا تو یہ نہ سمجھ لینا کہ میں تم سے دُور ہوں میں تو تمہارے بالکل قریب ہوں اور اسی وجہ سے تمہیں نظر نہیں آتا۔ کیونکہ صرف وہی چیز تمہیں نظر نہیں آتی جو زیادہ دُور ہو بلکہ وہ چیز بھی نظر نہیں آتی جو زیادہ قریب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے اندر کی آواز کو نہیں سُن سکتا۔ کانشنس اور ضمیر کی آواز آتی ہے مگر کان اُسے نہیں سُن سکتے۔ اِس لئے کہ آواز بھی دُور کی سُنائی دیتی ہے۔ جب ہم کوئی آواز سُنتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ یہ آواز باہر سے ہو کر آئی ہے۔ کیونکہ کان کا پردہ قدرتی طور پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ ہوا کا زور کان کے پردہ پر پڑتا ہے۔ تو اُس سے ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ ارتعاش کی لہریں یعنی وائی بریشنز (VIBRATIONS) پیدا ہوتی ہیں اور یہی وائی بریشنز دماغ میں جاتی ہیں اور دماغ ان کو الفاظ میں بدل ڈالتا ہے۔ یہی وائی بریشن ہیں جو ریڈیو کے والوز میں پڑتی ہیں اور ریڈیو اُن کو الفاظ میں بدل ڈالتا ہے۔ انسانی بناوٹ میں ریڈیو کان ہے اور اعصاب دماغی والوز ہیں۔ اُن کے ذریعہ جو حرکات دماغ میں منتقل ہوتی ہیں وہ وہاں سے آواز بن کر سُنائی دیتی ہیں۔ پس آواز کے معنے ہی باہر والی چیز کے ہوتے ہیں۔ جب آواز آتی ہے تو اس کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ یہ باہر سے آئی ہے۔ کیونکہ آواز آتی ہی باہر سے سکتی ہے۔ اندرونی آواز جو سُنائی دیتی ہے مثلاً پیٹ میں گُڑ گُڑ کی آواز آتی ہے تو دراصل اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ وائی بریشن باہر اثر ڈالتی ہیں اور ہم وہ آواز سُن لیتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جو اندر کی آواز ہوتی ہے اُسے تم نہیں سُن سکتے۔ کیونکہ وہ تمہارے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ غرض جس طرح تم بہت بعید کی چیز کو نہیں دیکھ سکتے اور بہت قریب کی چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اِسی طرح تم بعید کی آواز کو بھی نہیں سُن سکتے اور قریب کی آواز کو بھی نہیں سُن سکتے۔ جن لوگوں کو اس کا علم نہیں وہ اِس پر تعجب کریں تو کریں۔ ورنہ یہ سب کچھ حرکات پر مبنی ہوتا ہے۔ جو کچھ تم سُنتے ہو وہ بھی حرکات ہیں جن کو کان آواز میں بدل ڈالتے ہیں اور جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ بھی حرکات ہیں۔ جن کو آنکھیں شکل میں تبدیل کر ڈالتی ہیں۔ جو چیز تمہارے سامنے کھڑی ہوتی ہے وہ تصویر نہیں ہوتی بلکہ وہ فیچرز (FEATURES) یعنی نقش ہوتے ہیں جو آنکھوں کے ذریعہ دماغ میں جاتے ہیں اور وہ انہیں تصویر میں بدل ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل ریڈیو سیٹ کے ذریعہ تصویریں بھی باہر جانے لگ پڑی ہیں۔ اِن حرکات کے متعلق قاعدہ ہے کہ تمام حرکات خواہ وہ کان کی ہوں یا آنکھ کی ایک حدبندی کے اندر ہوتی ہیں یعنی ایک درجہ اُن کا اعلیٰ ہوتا ہے اور ایک ادنیٰ ہوتا ہے۔ اِن دونوں کے درمیان جو چیز ہوتی ہے اُسے آنکھ دیکھ سکتی ہے اور جو چیز اُس حدبندی سے دُور ہو اُسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور جو اس حدبندی کے نیچے ہو اُس کو بھی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ اِسی طرح جو آواز اس حدبندی کے اندر ہوگی اُسے کان سُن لے گا اور جو آواز اس حدبندی سے دُور ہوگی اُسے کان نہیں سُن سکیگا اور جو آواز اس حدبندی سے نیچے ہو اُسے بھی کان نہیں سُن سکتا۔

جَوّ میں بہت سی آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں جیسے

بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز۔ یا اجرامِ فلکی کے آپس میں ٹکرانے کی آواز۔ لیکن وہ اتنی شدید ہوتی ہیں کہ ہم اُن کی شدت کی وجہ سے انہیں نہیں سُن سکتے۔ جس طرح کان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ ایسی آواز سُن سکے جو اُس کی طاقت سے باہر ہو۔ یا وہ ایسی آواز سُن سکے جو اس کی طاقت سے کم ہو اسی طرح جو نظارہ آنکھ کی طاقت سے زیادہ ہو وہ آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور جو نظارہ اس کی طاقت سے کم ہو وہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ پس اِنِّیْ قَرِیْبٌ کہکر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مجھ کو نہ دیکھنے کی یہ وجہ نہیں کہ مَیں تم سے دُور ہوں۔ مَیں تم سے دُور نہیں بلکہ تمہارے اتنا قریب ہوں کہ تم مجھے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے دیکھ بھی نہیں سکتے اور نہ تم میری آواز سُن سکتے ہو۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہی نہیں تو پھر وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کہنے کا کیا مطلب ہوا؟ کیونکہ انسان پوچھتا تو اس کے متعلق ہے جو اُسے نظر آتا ہو۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ کبھی سوال مبہم بھی ہوتا ہے۔ جیسے رات کو کوئی شخص سفر پر جا رہا ہو اور اُسے خطرہ محسوس ہو تو وہ آواز دیتا ہے کہ کوئی ہے؟ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ اُسے کوئی انسان نظر آ رہا ہوتا ہے بلکہ وہ اس خیال سے آواز دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں ہو تو آئے اور اُس کی مدد کرے۔ اور جنگل میں تنہائی اور اندھیرے کی وجہ سے جو گھبراہٹ اُس پر طاری ہے وہ دُور ہو جائے۔ اسی طرح اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب دنیا میں انسان تنہائی محسوس کرے اور سمجھے کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے اور خدا تعالیٰ جو غیر مرئی ہے اس کے متعلق وہ کہے کہ اگر کوئی خدا ہے تو آئے اور میری مدد کرے تو خدا تعالیٰ کہتا ہے تم میرے اُس بندے کو بتا دو کہ مَیں موجود ہوں اور پھر زیادہ دُور بھی نہیں بلکہ مَیں تمہارے قریب ہی ہوں۔ دُنیا میں پاس رہنے والا شخص بھی بعض اوقات مدد نہیں کرتا۔ بعض دفعہ تو وہ مدد کا ارادہ ہی نہیں کرتا اور کہتا ہے مرتا ہے تو مرے مجھے اس کی مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور بعض اوقات وہ اپنے اندر زیادتی کرنے والے کے خلاف مدد کرنے کی طاقت نہیں پاتا۔ جیسے کوئی شیر گاؤں میں آ جائے اور کسی پر حملہ آور ہو تو دوسرے لوگ بجائے اس کی مدد کرنے کے بھاگ جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی بندہ گھبرا کر آواز دے اور کہے کہ کوئی ہے؟ تو وہاں خدا موجود ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے بندے نے اگرچہ مبہم طور پر آواز دی ہے کہ شاید کوئی موجود ہو تو وہ بول پڑے۔ لیکن میں اس کی مبہم پکار کو بھی اپنی طرف منسوب کر لیتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے ہی بُلا رہا ہے۔ مَیں بھول جاتا ہوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے خیالی طور پر کہہ رہا ہے۔ مَیں اس وقت اگر مگر کو چھوڑ دیتا ہوں اور فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑتا ہوں۔ اس لئے اگر کوئی میرے متعلق سوال کرے تو اُسے بتا دو کہ مَیں قریب ہی ہوں۔ دُور نہیں۔ بے شک دنیا میں بعض دفعہ کوئی دوسرا شخص قریب بھی ہوتا ہے تو پھر بھی وہ مدد کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔ یا اس کی مدد کی طاقت نہیں رکھتا لیکن مَیں تو یہ ارادہ کر کے بیٹھا ہوں کہ اس کی مدد کروں گا۔ اور پھر میرے اندر اس کی مدد کرنے کی طاقت بھی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ صرف مسلمانوں ہی کی دُعائیں نہیں سُنتا بلکہ خواہ کوئی ہندو ہو یا عیسائی۔ سکھ ہو یا آریہ۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے حضور سچے دل سے گڑگڑاتے اور اپنی حالت زار پیش کر کے اس کی مدد چاہے تو خدا تعالیٰ اُس کی دُعا کو سُنتا اور اُسے قبول کرتا ہے۔ بے شک وہ ایک سچے مسلمان کی دُعائیں دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ قبول کرتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ اُس نے اپنی رحمت کا دروازہ دنیا کی باقی قوموں اور افراد کے لئے بند کر رکھا ہے۔ بلکہ ہر شخص جو اُس کے دروازہ پر جاتا ہے

اور اُس کے حضور گِر جاتا ہے خدا تعالیٰ اس پر رحم کرتا ہے۔ اور اُس کی حاجات کو پورا فرماتا ہے۔ واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ جب کوئی پکارنے والا اپنی مدد کے لئے مجھے آواز دیتا ہے تو میں اُسکی پکار کا ضرور جواب دیتا ہوں۔ اور اُسے اپنی بارگاہ سے کبھی خالی ہاتھ واپس نہیں کرتا۔

پھر فرماتا ہے فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي۔ جب میں تمہاری باتیں سنتا ہوں اور تمہاری دُعائیں قبول کرتا ہوں تو تمہیں بھی ایسا بن جانا چاہیئے کہ تمہاری دُعائیں قبول ہوں۔ یہ مت خیال کرو کہ میں ہر ایک دُعا کو سُنتا ہوں۔ میرے احکام کے خلاف جو دُعائیں ہونگی یا میرے مقرر کردہ قانون کے خلاف ہونگی یا اخلاقی نظام کے خلاف ہونگی۔ میں انہیں کیسے سُن سکتا ہوں۔ کیا میں انہیں قبول کرکے اپنے رسول کو ہلاک کردوں۔ یا کیا میں انہیں قبول کرکے اخلاقی نظام کو توڑ ڈالوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دُعا بھی سُنی جائیں تو چاہیئے کہ تمہاری دُعا میرے نظام کے خلاف نہ ہو۔ تمہاری دُعا دین کے خلاف نہ ہو۔ تمہاری دُعا اخلاقی نظام کے خلاف نہ ہو۔

کہتے ہیں ایک عرب حج کے لئے گیا تو وہ خانہ کعبہ میں کھڑے ہوکر ایک دُعا کر رہا تھا اور ایسی گندی تھی کہ اُسے سُنکر پولیس نے اس کو قید کرلیا۔ وہ دُعا یہ کر رہا تھا کہ اے خدا! تو ایسا کر کہ میری محبوبہ کا خاوند اُس سے ناراض ہو جائے اور مجھے مل جائے۔ گویا نعوذ باللہ خدا تعالیٰ بھی اس کی بدکاری میں شریک ہو جائے۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک چور نے بیان کیا کہ میں جب سیندھ لگانے لگتا ہوں تو دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں تاکہ چوری سے پہلے اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرلوں اور مجھے اس کام میں کامیابی حاصل ہو۔ اخبارات میں عموماً اشتہارات چھپتے رہتے ہیں کہ ایسے تعویذ ہیں جن کو پاس رکھنے سے تم جس عورت کو چاہو بلا سکتے ہو۔ اُس تعویذ کے اثر سے وہ عورت خود بخود تمہارے پاس آجائیگی۔ اور پھر کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ ہے اُسے خدا تعالیٰ کا کلام آتا ہے۔ اُس نے یہ تعویذ تیار کئے ہیں۔ یہ دین کے ساتھ تمسخر ہے۔ خدا تعالیٰ بدکاریوں میں کبھی شریک نہیں ہوتا۔ کہنے والے بیشک ایسا کہتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي۔ اگر میں نے کہا ہے کہ میں پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہوں تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں ہر ایک پکار کو سُن لیتا ہوں جس پکار کو میں سُنتا ہوں اس کے لئے دو شرطیں ہیں۔ اوّل میں اُس کی پکار کو سُنتا ہوں جو میری بھی سنے (۲) میں اُسکی پکار سُنتا ہوں جسے مجھ پر یقین ہو۔ مجھ پر بدظنی نہ ہو۔ اگر دُعا کرنے والے کو میری طاقتوں اور قوتوں پر یقین ہی نہیں تو میں اس کی پکار کو کیوں سُنوں۔ پس قبولیت دعا کے لئے دو شرطیں ہیں۔ جس دُعا میں یہ دو شرطیں پائی جائیں گی وہی قبول ہوگی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اَلدَّاعِ فرمایا ہے جس کے معنے ہیں ایک خاص دعا کرنے والا۔ اور اس کے آگے شرائط بتا دیں۔ جو اَلدَّاعِ میں پائی جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وہ میری سُنے اور مجھ پر یقین رکھے۔ یعنی وہ دُعا میرے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق ہو۔ جائز ہو ناجائز نہ ہو۔ اخلاق کے مطابق ہو۔ سنت کے مطابق ہو۔ اگر کوئی شخص ایسی دُعائیں کرے گا تو میں بھی اس کی دُعاؤں کو سُنوں گا۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ اے اللہ! میرا فلاں عزیز مرگیا ہے تو اُسے زندہ کردے تو یہ دُعا قرآن کے خلاف ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے خلاف ہے جب اُس نے قرآن کی ہی نہیں مانی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں مانی تو خدا اُس کی بات کیوں مانے۔ پس فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تمہیں چاہیئے کہ تم میری باتیں مانو اور مجھ پر یقین رکھو اگر تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے تو میں تمہاری دُعا کیسے

سُن سکتا ہوں؟ پس قبولیت دُعا کے لئے دو شرطیں ہیں۔ اوّل فَلْيَسْتَجِيْبُوْالِيْ تم میری باتیں مانو (۲) وَلْيُؤْمِنُوْابِيْ اور مجھ پر یقین رکھو۔ جو لوگ اِن شرائط کو پورا نہیں کرتے وہ دیندار نہیں۔ وہ میرے احکام پر نہیں چلتے اس لئے مَیں بھی یہ وعدہ نہیں کرتا کہ مَیں اُن کی ہر دُعا سُنوں گا۔ بیشک مَیں اُن کی دُعاؤں کو بھی سُنتا ہوں مگر اس قانون کے ماتحت اُن کی ہر دُعا کو نہیں سُنتا۔ لیکن جو شخص اس قانون پر چلتا ہے اور پھر دعائیں بھی کرتا ہے مَیں اس کی ہر دُعا کو سُنتا ہوں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ بازار میں چند بنئے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ کیا کوئی ایک پاؤ تِل کھا سکتا ہے۔ وہ ایک پاؤ تِل کھانا بہت بڑا کام سمجھتے تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا جو ایک پاؤ تِل کھائے اُس کو مَیں پانچ روپے انعام دوں گا۔ پاس سے ایک زمیندار گذر رہا تھا اُس نے جب سُنا کہ پاؤ تِل کھانے پر شرط لگی ہوئی ہے تو اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اُس نے خیال کیا کہ بھلا ایک پاؤ تِل کھانا کونسی بڑی بات ہے جس پر انعام دیا جائے۔ ضرور اس کے ساتھ کوئی اور شرط ہوگی۔ وہ آگے بڑھا اور پوچھا شاہ جی: تِل سلّیاں سمیت کھانے نے کہ بغیر سلّیاں تے؟" یعنی پھلیوں سمیت تِل کھانے ہیں یا الگ کئے ہوئے بیج کھانے ہیں۔ اُس زمیندار کے نزدیک تو پاؤ تِل کھانا کوئی چیز نہ تھی بلکہ وہ سب بنئے تھے جو آدھا چھٹکا کھانے کے عادی تھے۔ جب اُس نے یہ کہا کہ شاہ جی کیا تِل پھلیوں سمیت کھانے ہیں تو اُس بنئے نے کہا۔ چوہدری صاحب آپ جائیے ہم تو آدمیوں کی باتیں کرتے ہیں۔

اِسی طرح اللہ تعالیٰ جہاں یہ کہتا ہے کہ مَیں پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہوں۔ وہاں بھی وہ آدمیوں کا ہی ذکر کرتا ہے۔ جانوروں کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ ہر پکارنے والے کی پکار کو نہیں سُنتا۔ وہ صرف اُس شخص کی پکار کو سُنتا ہے جسے یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ پر ہی سب ذمہ داری نہیں بلکہ مجھ پر بھی کچھ ذمہ داری ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ اے خدا! فلاں کی لڑکی مجھے اُدھال کر لا دے یا فلاں کا مال مجھے دے دے یا میرے فلاں دشمن کی جان نکال دے تو خدا تعالیٰ اپنے آپ کو اِن دُعاؤں کا مخاطب نہیں سمجھتا پس فرمایا فَلْيَسْتَجِيْبُوْالِيْ مَیں اُس دُعا کو سُنتا ہوں جس کا کرنے والا پورے طور پر میرے احکام پر عمل کرے اور پھر اُسے مجھ پر پورا یقین بھی ہو۔ اور جو ایسا کرتے ہیں وہ غلط دُعائیں مانگتے ہی نہیں کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ ایسی دُعائیں مانگتے تھے کہ اے خدا فلاں کا مال ظلماً طور پر ہمیں دیدے۔ پس خدا تعالیٰ بھی یہاں انسانوں کا ذکر کرتا ہے حیوانوں کا نہیں اور فرماتا ہے کہ مَیں دُعائیں سُنتا ہوں لیکن اس کے لئے دو شرطیں ہیں اوّل دُعا کرنے والا پورے طور پر میرے احکام پر عمل کرے۔ دوم اُسے مجھ پر یقین بھی ہو۔ جب اُسے مجھ پر یقین ہوگا۔ تو اس کا اعتماد بھی دعا کی قبولیت کے لئے اکسائیگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ سب سے زیادہ کس کیلئے دُعائیں کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا مَیں سب سے زیادہ اس شخص کے لئے دُعا کرتا ہوں جو مجھے آکر کہے کہ میرے لئے کوئی دُعا کرنے والا نہیں آپ میرے لئے دُعا کریں۔ جب وہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے حالانکہ وہ میرا واقف بھی نہیں ہوتا تو مَیں اس پر اعتماد کیوں نہ کروں۔ پس فرمایا۔ وَلْيُؤْمِنُوْابِيْ جو مجھ پر یقین رکھتا ہے اور میرے منشا کے مطابق دُعا کرتا ہے مَیں اُس کی دُعا کو قبول کرتا ہوں۔ لیکن جسے یقین نہ ہو اور وہ میرے منشاء کے مطابق دُعا نہ کرتا ہو تو اُس کی دُعا قبول نہیں ہو سکتی۔ اِسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ کرتی ہے کہ لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحِمٍ۔

مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ۔ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْتِعْجَالُ قَالَ يَقُوْلُ قَدْ دَعَوْتُ وَ قَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ اَرَ يُسْتَجَابُ لِيْ فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذٰلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَآءَ (مسلم جلد ۲ کتاب الذکر والدعا) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے جب تک کہ وہ قطع رحم اور گناہ کے متعلق نہ ہوں۔ مگر اس صورت میں نہیں کہ وہ جلدی کرے۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! جلدی سے کیا مراد ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ میں نے بڑی دُعا کی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری دُعا قبول نہیں ہوئی۔ پھر وہ دُعا سے تھک جاتا ہے اور دُعا چھوڑ بیٹھتا ہے۔ غرض دُعا کی قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور یقین رکھے اور مایوسی اس کے قریب بھی نہ پھٹکے

پھر فرماتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ اس کے نتیجہ میں یقیناً وہ کامیاب ہونگے۔ رشد کے معنے ہوتے ہیں رستہ دکھائی دینا۔ پس لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ انہیں وہ رستہ مل جائیگا جو انہیں کامیابی تک پہنچا دیگا۔ لَعَلَّ کے معنے عام طور پر شاید کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس جگہ اس کے معنے شاید کے نہیں۔ یہاں یہ لفظ کلام الملوک کے طور پر استعمال ہُوا ہے۔ اور اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارا شاید بھی یقینی ہوتا ہے۔ چنانچہ بالعموم حکام کہہ دیتے ہیں کہ اگر تم درخواست کرو تو حکومت غور کرے گی۔ لفظ شک کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اصل وعدہ ہوتا ہے کہ ہم ضرور ایسا کر دیں گے۔ لُغت والے بھی لکھتے ہیں کہ جب لَعَلَّ کا لفظ خدا تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اُس وقت اس کے معنے یقین کے ہوتے ہیں (مفردات راغب) پس لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ کے یہ معنے ہیں کہ ابھی تک تو مجھے اُن تک آنا پڑتا ہے مگر جب وہ یہ مقام حاصل کرلیں گے تو پھر ان کے اندر یہ طاقت پیدا ہو جائیگی کہ وہ خود مجھ تک آسکیں گے۔ چنانچہ پہلے اِنِّیْ قَرِیْبٌ کہہ کر بتایا تھا کہ میں اُن کے پاس آتا ہوں۔ مگر يَرْشُدُوْنَ کہہ کر بتایا کہ بندہ میں ترقی کرتے کرتے ایک قسم کی الوہیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ پہلے اسکی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے نابینا آدمی کے پاس اُس کا دوست بیٹھا رہے۔ مگر پھر یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جیسے بینا کے سامنے اس کا محبوب بیٹھا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عبادت کرتے وقت ہر انسان کو یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ وہ خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ یا کم سے کم وہ یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ اب خدا تعالیٰ کے دیکھنے کے یہی معنے ہیں کہ وہ اس کے قریب ہو جاتا ہے۔ ورنہ دیکھ تو وہ عرش سے بھی رہا ہے۔ درحقیقت اس میں یہی بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندہ کے اسقدر قریب آجاتا ہے کہ انسان یہ یقین کرنے لگ جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے بلکہ اس سے ترقی کرکے وہ اس مقام کو بھی حاصل کر لیتا ہے جس میں وہ خود بھی خدا تعالیٰ کو دیکھنے لگ جاتا ہے اور اعلیٰ درجہ کے کمالات روحانیہ تک پہنچ جاتا ہے۔

چونکہ اس آیت سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی روزوں کا ذکر ہے اس لئے اس آیت کے ذریعہ مومنوں کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یوں تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی اپنے بندوں کی دُعائیں سُنتا اور اُن کی حاجات کو پورا فرماتا ہے لیکن رمضان المبارک کے ایام قبولیتِ دُعا کے لئے مخصوص ہیں۔ اس لئے تم ان دنوں سے فائدہ اُٹھاؤ اور خدا تعالیٰ کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔ ورنہ اگر رمضان کے مہینہ میں بھی تم خالی ہاتھ رہے تو تمہاری بدقسمتی میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

دنیا میں ہر کام اپنے وقت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے اگر اُسوقت وہ کام کیا جائے تو جیسے اعلیٰ درجہ کے نتائج اُسوقت مرتب ہوتے ہیں وہ دوسرے وقت میں نہیں ہوتے

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ ؕ هُنَّ

تمہیں روزہ رکھنے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانے کی اجازت ہے ۔ وہ تمہارے لئے ایک (قسم کا)

لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ

لباس ہیں اور تم اُن کے لئے (ایک قسم کا) لباس ہو ۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اپنے

تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَ عَفَا عَنْکُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ

نفسوں کی حق تلفی کرتے تھے اس لئے اُس نے تم پر فضل سے توجہ کی اور تمہاری (اس حالت کی) اصلاح کر دی ۔ سو اب

بَاشِرُوْهُنَّ وَ ابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ ۪ وَ کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا

تم (بلا تامّل) اُن کے پاس جاؤ ۔ اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) نے تمہارے لئے مقدر کیا ہے اُس کی جستجو کرو ۔ اور کھاؤ اور پیؤ ۔

تمام غلّے اور ترکاریاں ہونے کا ایک خاص وقت ہوتا ہے اگر اُس وقت کو مدّ نظر نہ رکھا جائے تو کچھ بھی نہیں ہوتا ۔ مگر وہ وقت جادو یا ٹونے کی طرح نہیں ہوتا کہ اُس کے آنے سے کوئی خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے ۔ اس لئے وہ کام ہو جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جس وقت کسی کامیابی کے سامان مہیّا ہو جاتے ہیں تو وہی اُس کے کرنے کا وقت ہوتا ہے ۔ اگر گیہوں کا دانہ ایک خاص وقت میں بونے سے اُگتا ہے ۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت اس میں کوئی خاص بات پیدا ہو جاتی ہے ۔ بلکہ اس کے اُگنے کیلئے جو سامان ضروری ہوتے ہیں وہ اس وقت مہیّا ہو جاتے ہیں ۔ اگر وہی سامان کسی دوسرے وقت مہیّا ہو سکیں تو اُس وقت بھی وہ ضرور اُگ آئیگا ۔ تو تمام کاموں کیلئے ضروری سامان مہیّا ہونیکا ایک وقت مقرر ہے ۔ اسی طرح دُعا کے لئے بھی وقت مقرر ہیں ۔ ان وقتوں میں کی ہوئی دُعا بھی بہت بڑے نتائج پیدا کرتی ہے ۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِتَّقُوْا دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ ۔ مظلوم کی بد دعا سے ڈرو کیونکہ جب وہ ہر طرف مصائب ہی مصائب دیکھتا اور خدا تعالیٰ کے سوا کوئی سہارا نہیں پاتا تو اُس کی تمام تر توجہ خدا تعالیٰ

کی طرف پھر جاتی ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے آگے گر پڑتا ہے اور اُس وقت وہ جو بھی دُعا کرتا ہے قبول ہو جاتی ہے کیونکہ دُعا کے قبول ہونے کے سامانوں میں سے ایک اعلیٰ درجہ کا سامان یہ بھی ہے کہ انسان کی ساری توجہ ہر طرف سے ہٹ کر خدا تعالیٰ ہی کی طرف ہو جائے ۔ چونکہ مظلوم کی یہی حالت ہوتی ہے اسلئے اس کیلئے بھی یہ ایک موقعہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح دُعا کے قبول ہونے کے اوقات بھی ہیں ۔ لیکن وہ ظاہری سامانوں کی حد بندیوں کے نیچے نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانی قلوب کی خاص حالتوں اور کیفیات سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں وہی انسان محسوس کر سکتا ہے جس پر وہ حالت وارد ہو ۔ مگر دُعا کی قبولیت کا ایک اور وقت بھی ہے جس کے معلوم کرنے کیلئے باریک قلبی کیفیات سے واقف ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ وقت رمضان کا مہینہ ہے ۔ یہ آیت خدا تعالیٰ نے روزوں کے ساتھ بیان کی ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ اس کا روزوں سے بہت گہرا تعلق ہے ۔ اور اس کے روزوں کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ یہی ہے کہ جس طرح مظلوم کی ساری توجہ محدود ہو کر ایک ہی طرف

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ

یہاں تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر

الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ

آنے لگے۔ اس کے بعد (صبح سے) رات تک روزوں کی تکمیل کرو۔ اور جب تم مساجد میں معتکف ہو

اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ

تو اُن کے (یعنی عورتوں کے) پاس نہ جاؤ۔ یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اس لئے تم ان کے قریب (بھی) مت جاؤ۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ وَ

اللہ (تعالیٰ) اسی طرح لوگوں کے لئے اپنے نشانات بیان کرتا ہے تاکہ وہ (ہلاکتوں سے) بچیں۔ ۱۰۱

یعنی خدا تعالیٰ کی طرف لگ جاتی ہے۔ اسی طرح ماہِ رمضان میں مسلمانوں کی توجہ خدا تعالیٰ کی طرف ہو جاتی ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی پھیلی ہوئی چیز محدود ہو جائے تو اس کا زور بہت بڑھ جاتا ہے جیسے دریا کا پاٹ جہاں تنگ ہوتا ہے وہاں پانی کا بڑا زور ہوتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے مہینہ میں [illegible] اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو دعا کی قبولیت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس مہینہ میں مسلمانوں میں ایک بہت بڑی جماعت ایسی ہوتی ہے جو راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ پھر سحری کیلئے سب کو اُٹھنا پڑتا ہے اور اس طرح ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عبادت کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اسوقت لاکھوں انسانوں کی دُعائیں جب خدا تعالیٰ کے حضور پہنچتی ہیں تو خدا تعالیٰ انکو ردّ نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں قبول فرماتا ہے۔ اُس وقت مومنوں کی جماعت ایک کرب کی حالت میں ہوتی ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ اُن کی دُعا قبول نہ ہو۔ درد اور کرب کی حالت کی دُعا ضرور سُنی جاتی ہے جیسے یونسؑ کی قوم کی حالت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ نے انکو بخش دیا اور اُن سے عذاب ٹل گیا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ سب اکٹھے ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور جُھک گئے تھے۔

پس رمضان کا مہینہ دُعاؤں کی قبولیت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں دُعا کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قَرِيْبٌ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اگر وہ قریب ہونے پر بھی نہ مل سکے تو اور کب مل سکیگا۔ جب بندہ اُسے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیتا ہے اور اپنے عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ اب وہ خدا تعالیٰ کا در چھوڑ کر اور کہیں نہیں جائیگا تو اللہ تعالیٰ کے فضلوں کے دروازے اُس پر کھل جاتے ہیں اور اِنِّىْ قَرِيْبٌ کی آواز خود اُس کے کانوں میں بھی آنے لگتی ہے جس کے معنے سوائے اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اور جب کوئی بندہ اس مقام تک پہنچ جائے تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس نے خدا کو پالیا۔

۱۰۱ حل لغات:- رَفَثُ : اَلرَّفَثُ كَلَامٌ مُتَضَمِّنٌ لِمَا يُسْتَقْبَحُ ذِكْرُهٗ مِنْ ذِكْرِ الْجِمَاعِ وَ دَوَاعِيْهِ وَ جُعِلَ كِنَايَةً عَنِ الْجِمَاعِ

رَفَثٌ

یعنی رَفَثَ کا لفظ جماع اور اُسکے محرکات کے لئے کنایۃً استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات)

لِبَاسٌ لَّكُمْ : لِبَاسٌ کے معنے اصل میں ستر کے ہیں

لِبَاسٌ

یعنی ڈھانپنے والی چیز۔ مگر قرآن کریم نے اس کے اور معنے بھی بتائے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں لباس کے دو کام بتائے گئے ہیں فرماتا ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَ رِیْشًا (اعراف آیت ۲۷) یعنی اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا ہے جو تمہارے ننگ کو ڈھانکتا اور تمہیں زینت بخشتا ہے۔ لباس کا تیسرا کام ایک اور جگہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ (نحل آیت ۸۲) اس نے تمہارے لئے گرمی سردی کے ضرر سے بچانے کے لئے سرابیل بنائے ہیں۔ پس لباس کا تیسرا کام گرمی سردی کے ضرر سے بچانا ہے۔

تَخْتَانُوْنَ

تَخْتَانُوْنَ: خَانَ یَخُوْنُ سے باب افتعال ہے۔ اور جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے۔ اور اِخْتَانَهٗ اِخْتِیَانًا کے معنے ہیں اُؤْتُمِنَ فَلَمْ یَنْصَحْ وَ خَانَ الْعَهْدَ نَقَضَهٗ۔ یعنی اِخْتَانَ کے معنے ہیں۔ امانت کا حق ادا نہ کیا۔ اور عہد کو توڑا (اقرب)

عَفَا عَنْکُمْ

عَفَا عَنْکُمْ: عَفَا عَنْهُ وَلَهٗ ذَنْبَهٗ وَعَنْ ذَنْبِهٖ صَفَحَ عَنْهُ وَ تَرَكَ عُقُوْبَتَهٗ وَهُوَ یَسْتَحِقُّهَا وَ اَعْرَضَ عَنْ مُؤَاخَذَتِهٖ۔ یعنی عَفَا کے معنے ہیں (۱) اس کا قصور معاف کر دیا اور اس سے مواخذہ نہ کیا۔ (۲) اور عَفَا اللّٰهُ عَنْ فُلَانٍ کے معنے ہیں مَحَا ذُنُوْبَهٗ اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ مٹا دیئے۔ (اقرب) (۳) وَ قَدْ یُسْتَعْمَلُ عَفَا اللّٰهُ عَنْکُمْ فِیْمَا لَمْ یَسْبِقْ بِهٖ ذَنْبٌ وَلَا یُتَصَوَّرُ۔ عَفَا کا لفظ بعض دفعہ ایسے امور کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس نے نہ کوئی گناہ کیا ہو اور نہ اس کے متعلق گناہ کا خیال ہو سکتا ہو۔ (اقرب)

بَاشِرُوْهُنَّ

بَاشِرُوْهُنَّ: باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے۔ اور بَاشَرَ الْاَمْرَ کے معنے ہیں تَوَلَّاهُ بِنَفْسِهٖ اس نے خود کوئی کام کیا۔ وَبَاشَرَهُ النَّعِیْمُ: اَحَاطَ عَلَیْهِ حَتّٰی کَاَنَّهٗ مَسَّ بَشَرَتَهٗ۔ اور بَاشَرَهُ النَّعِیْمُ کے معنے ہیں اُسے اس کثرت سے نعمتیں حاصل ہوئیں کہ اس کے چہرے کو چھونے لگیں۔ (اقرب) اور اَلْمُبَاشَرَةُ کے معنے ہیں اَلْاِفْضَاءُ بِالْبَشَرَتَیْنِ۔ ہم صحبت ہونا (مفردات)

کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ

کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ۔ کَتَبَ لَهٗ میں عام طور پر لام فائدہ کے لئے آتا ہے اور کتابت کے معنے مقدر کر دینے اور فرض کر دینے کے ہیں۔ اس جگہ مقدر کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مِنَ

مِنَ کے معنے اس جگہ امتیاز کے ہیں۔

عَاکِفُوْنَ

عَاکِفُوْنَ: عَاکِفٌ عَکَفَ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور عَاکِفُوْنَ جمع کا صیغہ ہے۔ اور عَکَفَ کے معنے ہیں اَلْاِقْبَالُ عَلَی الشَّیْءِ وَ مُلَازَمَتُهٗ عَلٰی سَبِیْلِ التَّعْظِیْمِ لَهٗ۔ یعنی کسی چیز کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا۔ اور اس کے ساتھ اس کی تعظیم کی خاطر تعلق قائم رکھنا یا اسمیں رہنا۔ پس عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ کے معنے ہیں مسجدوں کو لازم پکڑنے والے اور ان میں بیٹھے رہنے والے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ روزوں کی راتوں میں تمہارے لئے اپنی عورتوں سے بے تکلف ہونا جائز ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے لباس ہو۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لباس کے تین کام بتائے گئے ہیں۔ اول ننگ ڈھانکنا۔ دوم زینت کا موجب ہونا۔ سوم۔ سردی گرمی کے ضرر سے انسانی جسم کو بچانا۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَ رِیْشًا (اعراف آیت ۲۷) یعنی اے آدم کی اولاد ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے جو تمہارے ننگ کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لئے زینت کا موجب بھی ہے۔ اسی طرح سورۃ نحل میں فرماتا ہے۔ وَ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ (نحل آیت ۸۲) یعنی اس نے تمہارے لئے کئی قسم کی قمیصیں بنائی ہیں جو تمہیں گرمی سردی سے بچاتی ہیں۔

اور بعض قمیصیں یعنی زرہیں ایسی بھی ہیں جو انہیں آپس کی جنگ کی سختی سے بچاتی ہیں۔ پس هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ فرماتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے ہمیشہ لباس کا کام دیں۔ یعنی (۱) ایک دوسرے کے عیب چھپائیں۔ (۲) ایک دوسرے کیلئے زینت کا موجب بنیں (۳) پھر جس طرح لباس سردی گرمی کے ضرر سے انسانی جسم کو محفوظ رکھتا ہے اُسی طرح مرد و عورت سُکھ دُکھ کی گھڑیوں میں ایک دوسرے کے کام آئیں۔ اور پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے کی دلجمعی اور سکون کا باعث بنیں۔ غرض جس طرح لباس جسم کی حفاظت کرتا ہے اور اُسے سردی گرمی کے اثرات سے بچاتا ہے۔ اسی طرح انہیں ایک دوسرے کا محافظ ہونا چاہیئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثال دیکھ لو۔ انہوں نے شادی کے معاً بعد کس طرح اپنا سارا مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تاکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اور آپ پورے اطمینان کے ساتھ خدمتِ خلق کے کاموں میں حصہ لیتے جائیں۔ یہ اہلی زندگی کو خوشگوار رکھنے کا کتنا شاندار نمونہ ہے جو انہوں نے پیش کیا۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ

فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ تم اپنے نفسوں کے حقوق کو تلف کیا کرتے تھے اور اُن کا پورا حق ادا نہیں کرتے تھے۔ پس اُس نے تم پر اپنے فضل سے توجہ کی اور تمہاری اس حالت کی اصلاح کر دی۔

یہ حق تلفی جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے درحقیقت اُس والہانہ عشق کی وجہ سے تھی جو صحابہؓ کے دلوں میں عبادت اور ذکر الٰہی کے متعلق پایا جاتا تھا۔ انہوں نے جب رمضان کی برکات کا مشاہدہ کیا اور دیکھا کہ خدا تعالیٰ ان دنوں میں آسمان سے اُتر آتا ہے اور بندوں پر اپنے انوار اور برکات کی بارش نازل کرتا ہے تو انہوں نے چاہا کہ وہ رمضان کی راتیں بھی ذکر الٰہی اور عبادت میں بسر کریں۔ اور جنسی تعلقات سے بالا رہیں۔ اسی طرح کھانے پینے کے متعلق بھی بعض ناواجب قیود انہوں نے اپنے اوپر عاید کر رکھی تھیں۔ چنانچہ بخاری میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت کے نزول سے قبل صحابہؓ میں سے جب کوئی شخص افطاری سے قبل سو جاتا تو آنکھ کھلنے پر وہ نہ رات بھر کچھ کھاتا اور نہ اگلے دن کھاتا یہاں تک کہ پھر دوبارہ شام کا وقت آجاتا۔ ایک دفعہ ایک انصاری جو روزہ دار تھے انہوں نے افطاری کے قریب اپنی بیوی سے کچھ کھانے کے لئے مانگا۔ اُس نے کہا کہ گھر میں تو کچھ نہیں مگر کہیں سے کچھ مانگ لاتی ہوں۔ اتنے میں انہیں نیند آگئی اور وہ سو گئے۔ بیوی باہر سے کھانا لے کر آئی تو چونکہ وہ سو چکے تھے اس لئے پُرانے دستور کے مطابق وہ کچھ کھا نہیں سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ ساری رات بھوکے رہے اور اگلے دن بھی اُن کا روزہ ہی رہا۔ بارہ بجے کے قریب وہ شدتِ ضعف کی وجہ سے بیہوش ہو گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ اسی طرح یہ آیت نازل ہوئی کہ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بخاری جلد اول کتاب الصوم) درحقیقت یہ پابندیاں یہود کی بعض رسوم کا نتیجہ تھیں۔ یہود میں یہ رواج تھا کہ وہ ایٹونمنٹ ڈے یعنی یوم کفارہ کا جب روزہ رکھتے تو ایک صبح سے دوسری صبح تک نہ کچھ کھاتے نہ پیتے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۲۷۸) اُن کو دیکھ کر مسلمانوں کو بھی خیال پیدا ہُوا کہ شاید جب آدمی سو جائے

تو اس کے بعد وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ اسی طرح مرد و عورت کے اختلاط کے متعلق ان کا خیال تھا کہ سارا رمضان جائز نہیں بعض خیال کرتے تھے کہ جس وقت کھانا منع ہو وہ بھی منع ہے ان خیالات کی وجہ سے اگر کوئی سو جاتا تو کھانا نہ کھاتا اور اپنی بیوی کے پاس بھی نہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ بیفائدہ تکلیف ہے اس کی کچھ ضرورت نہیں صرف وہی پابندی انسان کے لئے خیر و برکت کا موجب ہوتی ہے جو الٰہی منشاء کے مطابق ہو۔ ورنہ بلا ضرورت اپنے آپ کو مختلف قیدوں اور پابندیوں میں جکڑتے چلے جانا درست نہیں ہوتا۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فرمایا کہ اب ہم نے تم پر رحم کر دیا ہے۔ اور تمہارے لئے آسانی بہم پہنچا دی ہے اس لئے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور پہلے سے بھی زیادہ شوق اور مستعدی کے ساتھ نیک کاموں میں حصہ لو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مومن بندے خدا تعالیٰ کی رضاء کے لئے اپنے آپ کو کسی مشقت میں ڈالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور وہ کسی نہ کسی شکل میں انسان کے لئے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ گویا اُن کے اخلاص کا انہیں وہیں نقد فائدہ دے دیتا ہے۔

پھر فرماتا ہے فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔ كَتَبَ عَلَيْهِ اور كَتَبَ لَهٗ میں فرق ہے۔ كَتَبَ عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں اُس پر فرض کیا گیا۔ اور كَتَبَ لَهٗ کے معنے ہوتے ہیں اُس کے لئے کوئی انعام مقرر کیا گیا ہے یا کوئی حق مقرر کیا گیا ہے (یا استعارۃً تقدیر مقرر کے معنوں میں سمجھا جاتا ہے) پس اس آیت کے یہ معنے ہوئے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارا حق مقرر کیا ہے اسکو چاہو یعنی جن باتوں کو اللہ تعالیٰ نے جائز کیا ہے یا جن سے نہیں روکا اُن کو بے شک کرو۔ وہ تمہارا حق ہیں۔ اُنکو چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یا یہ کہ جو اولاد اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے اُس کی جستجو کرو یعنی جو طریق اولاد حاصل کرنیکا اُس نے مقرر کر رکھا ہے اُسکے مطابق عمل کرو۔

اسی طرح وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے یہ بھی مراد ہے کہ اس مقدس مہینہ میں جو کچھ برکات خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر کر رکھی ہیں اُن کے حصول کے لئے پوری کوشش کرو۔ پہلا طریق جو حقوق نفس کو تلف کرنے والا تھا اس کے نتیجہ میں ممکن تھا کہ تمہارے جسم کو کوئی نقصان پہنچ جاتا اور تم زیادہ محنت اور مشقت نہ کر سکتے۔ مگر اب جبکہ ہم نے اس کی تلافی کر دی ہے اور تمہارے جسم کو بے جا کوفت سے بچا لیا ہے تمہارا فرض ہے کہ تم کمرِ ہمت باندھ کر خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اُن درجاتِ عالیہ کی تلاش کرو جن کو خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدّر کر رکھا ہے۔

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔ فرماتا ہے تم اُس وقت تک کھاؤ پیو جب تک کہ تمہیں صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہؓ نے غلطی سے سیاہ اور سفید دھاگے اپنے پاس رکھنے شروع کر دیئے اور انہوں نے خیال کیا کہ ہمیں اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے جب تک کہ ہمیں سفید اور سیاہ دھاگے میں فرق نظر نہ آنے لگے۔ چنانچہ حدیثوں میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عدیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے سیاہ اور سفید دو دھاگے اپنے تکیہ کے نیچے رکھ دیئے ہیں تاکہ جب سیاہ اور سفید دھاگے میں فرق نظر آنے لگے تو مجھے معلوم ہو جائے کہ اب کھانا پینا چھوڑ دینا چاہیئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی یہ بات سُنکر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تمہارا تکیہ بہت چوڑا ہے کہ

اُس کے نیچے خیط ابیض اور خیط اسود دونوں آگئے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اِس سے مراد تو صرف رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے۔ ظاہری دھاگے مراد نہیں ہیں (مسلم کتاب الصیام)

اِسی طرح بعض اور صحابہؓ بھی سفید اور سیاہ دھاگے اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور وہ اُس وقت تک کھاتے پیتے رہتے تھے جب تک کہ اُن دونوں میں انہیں فرق نظر نہ آجاتا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مِنَ الْفَجْرِ کے الفاظ نازل فرمائے تب انہیں معلوم ہوا کہ خیط ابیض اور خیط اسود سے سفید اور سیاہ دھاگا مراد نہیں بلکہ اس سے صبح صادق اور صبح کاذب کا فرق مراد ہے۔

پنجاب میں بھی بعض زمیندار رمضان کی راتوں میں سفید اور سیاہ دھاگا اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ اور چونکہ دھاگا اچھی روشنی میں نظر آتا ہے مدھم روشنی میں نظر نہیں آتا اِس لئے وہ کافی روشنی ہونے تک کھاتے پیتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کی نظر چونکہ کمزور ہوتی ہے اس لئے ممکن ہے ▪ دن چڑھنے کے بعد بھی اس آیت کی رُو سے کھانے پینے کا جواز ثابت کریں کیونکہ انہیں سورج کی روشنی میں ہی اس فرق کا پتہ لگ سکتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خیط ابیض اور خیط اسود کے الفاظ استعارۃً استعمال فرمائے ہیں اور مراد یہ ہے کہ صرف اس وہم کی بنا پر کھانا پینا ترک نہیں کر دینا چاہیئے کہ ممکن ہے صبح ہوگئی ہو۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ صبح صادق اور صبح کاذب میں امتیاز ہو جائے اور پو پھٹ جائے۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ۔ اس جگہ لیل سے گہری تاریکی مراد نہیں بلکہ صرف سورج غروب ہونے کا وقت مراد ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ (مسلم کتاب الصیام) کہ جب تک لوگ سورج غروب ہوتے ہی روزہ افطار کرتے رہیں گے اُس وقت تک وہ خیر پر قائم رہیں گے یعنی احکام اسلامی کی حقیقی رُوح اُن میں زندہ رہے گی۔

ورنہ جب لوگ رسوم یا وہم سے کام لینے لگتے ہیں تو فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں اور اُن کے اوہام انہیں دُور دراز کاموں میں اُلجھا دیتے ہیں۔ اور اُن کی حالت بالکل اس شخص کی سی ہو جاتی ہے۔ جو نماز کی نیّت باندھتے ہوئے اپنے وہم میں اِس حد تک بڑھ گیا تھا کہ پہلے تو امام کو انگلی مار مار کر کہتا کہ پیچھے اس امام کے اور پھر رفتہ رفتہ اُس نے امام کو دھکّے دینے شروع کر دیئے۔ اِسی طرح جن لوگوں کا وہم بڑھ جاتا ہے وہ پہلے تو سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ مگر چونکہ ابھی سُرخی باقی ہوتی ہے اس لئے اُن کی تسلّی نہیں ہوتی اور وہ زیادہ انتظار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب گہری تاریکی چھا جائے تب افطاری کرتے ہیں۔ یہ طریق شریعت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ کا حکم دیا ہے۔ اور لیل کا وقت سورج ڈوبنے سے لیکر سورج نکلنے تک ہے۔ یہ مراد نہیں کہ جب تک اچھی طرح تاریکی نہ چھا جائے اُس وقت تک تم روزہ افطار ہی نہ کرو۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ۔ اِس کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ آیا اعتکاف کی وجہ سے مباشرت ممنوع قرار دی گئی ہے یا مسجد کی حرمت کی وجہ سے۔ میرے نزدیک اعتکاف کی وجہ سے مباشرت سے نہیں روکا گیا بلکہ مسجد کے احترام کی وجہ سے روکا گیا ہے جس کی طرف وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ مباشرت کی نفی اعتکاف کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ مساجد کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مباشرت مَس کو بھی کہتے ہیں اور احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایسی حالت میں جبکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتکاف میں بیٹھے ہوتے تھے آپ کا سر بھی پانی سے دھو دیتی تھیں اور بالوں کی کنگھی بھی کر دیا کرتی تھیں (بخاری ابواب الاعتکاف)

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى

اور تم اپنے (بھائیوں کے) مال آپس میں (مل کر) جھوٹ (اور فریب) کے ذریعہ سے مت کھاؤ۔ اور نہ اُن (اموال) کو اس غرض سے

الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ

حکام کی طرف کھینچ لے جاؤ تا تم لوگوں کے مالوں کا کوئی حصہ جانتے بوجھتے ہوئے

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝١٨٩ ع

ناجائز طور پر ہضم کر جاؤ۔ ۱۰۲؎

۲۳ ع ۷

پس اسجگہ مباشرت کی نہی سے محض مخصوص تعلقات یا اُس کے مبادی مراد ہیں جسم کو چھونا مراد نہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں۔ تم اُن کے قریب بھی مت جاؤ تاکہ غلطی سے تمہارا قدم اللہ تعالیٰ کے محارم میں نہ جا پڑے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ صحابہؓ کو اِس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ دیکھو حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور بھی ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص اِن مشتبہ امور سے بچا اُس نے اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچانے کے لئے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ لیکن جو شخص ان مشتبہ امور میں جا پڑا وہ اُس چرواہے کی مانند ہے جو رکھ کے آس پاس اپنا ریوڑ چرا رہا ہے۔ اور قریب ہے کہ اُس کا ریوڑ رکھ کے اندر چلا جائے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِيْ اَرْضِهٖ مَحَارِمُهٗ۔ کان کھول کر سُنو کہ ہر بادشاہ کی ایک رکھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی رکھ اُس کی حرام کردہ چیزیں ہیں (بخاری کتاب الایمان باب فضل من استبرأ لدینہٖ) پس محارم اللہ تعالیٰ کی رکھ ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی انسان اُن کے قریب جائے تو اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ اُس کا قدم ڈگمگا جائے اور وہ ناجائز امور کا مرتکب ہو کر خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بن جائے۔ پس اصل تقویٰ یہی ہے کہ انسان حدود اللہ کے قریب جانے سے بھی بچے تاکہ شیطان اُس کے قدم کو ڈگمگا نہ دے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ اِس میں آیات سے مراد احکامِ الٰہیہ ہیں۔ اور فرماتا ہے کہ اِن احکام کی اصل غرض تمہارے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ پس تمہیں چاہیئے کہ تم ہمیشہ تقوی اللہ کو ملحوظ رکھو اور نہ صرف اللہ کی حدود کو نہ توڑو بلکہ شبہات سے بھی پرے رہنے کی کوشش کرو۔ مبادا تمہارا قدم پھسل جائے اور تم تقویٰ سے دُور چلے جاؤ۔

۱۰۲؎ **حل لغات۔** تَاْكُلُوْا: اَكَلَ کے معنے کھانے کے ہوتے ہیں۔ لیکن جب غذا کے سوا اور چیزوں کے لئے یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہلاک کرنے یا فنا کر دینے کے ہوتے ہیں۔

تَاْكُلُوْا

تُدْلُوْا: اَدْلٰی سے جمع مخاطب کا صیغہ ہے اور اَدْلٰی اِدْلَاءً کے معنے ہیں اَرْسَلَ الدَّلْوَ فِی الْبِئْرِ اُس نے کوئیں میں ڈول ڈالا۔ اور اَدْلٰی فُلَانٌ لِفُلَانٍ کے معنے ہیں۔ قَالَ قَبِيْحًا اُس نے کسی کے متعلق بُری بات کہی اور اَدْلٰی بِحُجَّتِهٖ کے معنے ہیں اُس نے اپنی دلیل پیش کی اور اَدْلٰی اِلَيْهِ بِمَالٍ کے معنے ہیں۔ اُس نے اُسے مال دیا۔ (اقرب)

تُدْلُوْا

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ

تجھ سے چاندوں کے بارہ میں سوال کرتے ہیں۔ تو کہدے کہ یہ لوگوں (کے عام کاموں) اور حج کیلئے وقت معلوم کرنیکا آلہ ہیں

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ

اور اعلیٰ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کے پچھواڑے سے داخل ہو بلکہ

تُدْلُوْا بِهَآ اصل میں لَا تُدْلُوْا بِهَآ کے معنوں میں ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ (۱) ایک دوسرے کے مال حکام کے پاس نہ لے جاؤ۔ یعنی جھوٹے مقدمات بناکر اُن کے مال نہ لو (۲) حاکموں کو بطور رشوت مال نہ دو۔

تفسیر:۔ اپنے مال کو تو انسان کھایا ہی کرتا ہے پس لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ ایک دوسرے کے مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ انسان دوسرے کا مال کئی طرح کھاتا ہے۔ اوّل جھوٹ بول کر۔ دوم ناجائز ذرائع سے چھین کر۔ سوم سود کے ذریعہ سے۔ چہارم رشوت لیکر یہ سب امور باطل میں داخل ہیں۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ میں بتایا کہ جس طرح آپس میں ایک دوسرے کا مال کھانا ناجائز ہے۔ اسی طرح تم حکام کو بھی روپیہ کا لالچ نہ دو تاکہ اس ذریعہ سے تم دوسرے کا مال کھاسکو۔ اس آیت میں افسران بالا کو رشوت دینے کی ممانعت کی گئی ہے اور اُسے حرام اور ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے معنے اس آیت کے یہ ہیں کہ اپنے مالوں کو حکام کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ کے ذریعہ کھا جاؤ۔ یعنی اُن کے متعلق جھوٹے مقدمات دائر نہ کرو۔ اور یہ نہ سمجھو کہ اگر حاکم انصاف کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے تمہیں کسی کا حق دلا دے گا تو وہ تمہارے لئے جائز ہو جائیگا۔ کیونکہ دنیوی عدالتوں سے بالا ایک آسمانی عدالت بھی ہے اور جب اُس نے اپنے قانون میں ایک چیز کو ناجائز قرار دے دیا ہے تو دنیا کی کوئی عدالت خواہ اُسے جائز بھی قرار دے دے وہ بہر حال ناجائز اور حرام ہی رہے گا۔

چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایکدفعہ فرمایا فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِحَقِّ اَخِيْهِ شَيْئًا فَلَا يَاْخُذْهُ۔ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ۔ (بخاری جلد ۴ کتاب الاحکام) یعنی اگر میں کسی شخص کے لئے اُس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا غلط فیصلہ کردوں تو اُسے چاہیئے کہ وہ اس کے لینے سے انکار کر دے کیونکہ میں اس کے لئے آگ کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

اسی طرح بخاری اور مسلم میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت آتی ہے کہ اَنَّهٗ سَمِعَ خُصُوْمَةً بِبَابِ حُجْرَتِهٖ فَخَرَجَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ وَاِنَّمَا يَاْتِيْنِي الْخَصْمُ وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ اَنْ يَّكُوْنَ اَبْلَغَ مِنْ بَعْضٍ فَاَحْسِبُ اَنَّهٗ صَادِقٌ فَاَقْضِيَ لَهٗ بِذٰلِكَ فَمَنْ قَضَيْتُ لَهٗ بِحَقِّ مُسْلِمٍ فَاِنَّمَا هِيَ قِطْعَةٌ مِّنَ النَّارِ فَلْيَاْخُذْهَا اَوْ يَتْرُكْهَا۔ (بخاری کتاب الاحکام) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے مکان کے دروازہ پر کسی جھگڑے کی آواز سنی آپ شور سُن کر باہر تشریف لے آئے اور لوگوں سے فرمایا کہ دیکھو میں بھی ایک انسان ہوں۔ میرے پاس مقدمات والے آتے ہیں تو ممکن ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہو۔ اور میں اس کی باتوں کی وجہ سے خیال کروں

الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٩٠﴾

کامل نیک وہ شخص ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور (تم) گھروں میں انکے دروازوں سے داخل ہُوا کرو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ ۲۰۴؎

کہ وہی سچا ہے اور مَیں اُس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ پس اگر مَیں کوئی ایسا فیصلہ کر دوں تو جس شخص کیلئے مَیں کسی مسلمان کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ کروں اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو مَیں نے اُسے دیا ہے اور اُسے اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اُس آگ کے ٹکڑہ پر قبضہ کر لے اور چاہے تو اُسے چھوڑ دے۔

اَلْاَهِلَّةُ

۲۰۴؎ **حل لغات**: اَلْاَهِلَّةُ۔ هِلَالٌ کی جمع ہے۔ وَقِیْلَ یُسَمّٰی هِلَالًا لِلَیْلَتَیْنِ اَوْ اِلٰی ثَلَاثٍ اَوْ اِلٰی سَبْعٍ۔ اور ہلال دو راتوں کے چاند کو کہتے ہیں۔ اسی طرح تین اور سات راتوں کے چاند کو بھی ہلال کہا گیا ہے۔ (اقرب الموارد)

مَوَاقِیْتُ

مَوَاقِیْتُ: مِیْقَاتٌ کی جمع ہے اور اَلْمِیْقَاتُ کے معنے ہیں۔ اَلْوَقْتُ۔ وقت۔ وَقِیْلَ اَلْوَقْتُ الْمَضْرُوْبُ لِلشَّیْءِ۔ اور کہا گیا ہے کہ میقات سے مراد وہ خاص وقت بھی ہے جو کسی کام کے لئے مقرر کیا جائے۔ وَالْمَوْعِدُ الَّذِیْ جُعِلَ لَهٗ وَقْتٌ۔ اور میقات اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے لئے کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو۔ وَقَدْ یُسْتَعَارُ لِلْمَوْضِعِ الَّذِیْ جُعِلَ وَقْتًا لِلشَّیْءِ۔ اور وہ خاص جگہ جہاں کوئی خاص کام وقت مقررہ پر کیا جائے۔ اُسے بھی میقات کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر:۔ صحابہ کرامؓ نے جب دیکھا کہ کس طرح رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ اُنکے قریب آجاتا اور اُن کی دُعاؤں کو قبول فرماتا ہے۔ تو اُن کے دلوں میں شوق پیدا ہُوا کہ وہ باقی مہینوں کے بارہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے سوال کریں تاکہ وہ اُن کی برکات سے بھی مستفیض ہو سکیں۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ لوگ تجھ سے چاندوں کے بارہ میں سوال کرتے ہیں تو انہیں کہدے کہ ھِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ یہ لوگوں کے لئے وقت کا اندازہ کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ یعنی ہر قمری مہینہ اس لئے مقرر نہیں کیا گیا کہ اس کے ساتھ شریعت کے کسی خاص حکم کا تعلق ہے بلکہ ان مہینوں کا چاند کے ساتھ اس لئے تعلق رکھا گیا ہے کہ ان کے ذریعہ گذشتہ یا آئندہ کام کا وقت پہچانا جاتا ہے۔ اور پھر لِلنَّاسِ فرما کر بتایا کہ عوام کے فائدہ کے لئے ہی چاند کے مہینے کام دیتے ہیں۔ ورنہ وہ حساب جس کی سورج کی گردش پر بنیاد ہے اُس سے صرف علمی طبقہ ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے عام لوگ اس سے فائدہ اُٹھانے کی استعداد نہیں رکھتے۔

پھر فرمایا وَالْحَجِّ۔ قمری مہینوں کا دوسرا فائدہ حج سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی بوجہ اس کے کہ حج کا فریضہ قمری مہینہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ یہ عبادت سارے سال میں چکر لگاتی رہتی ہے اور مختلف طبائع کے لوگ اور گرم سرد ملک کے رہنے والے اپنی اپنی طبیعت اور اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اگر حج کسی شمسی مہینہ میں مقرر کر دیا جاتا تو لازماً ہر سال ایک ہی مہینہ میں ہوتا۔ اور کئی لوگوں کے لئے حج کا فریضہ ادا کرنا ناممکن ہو جاتا۔ مگر اب حج کی عبادت سارے سال میں چکر لگاتی رہتی ہے۔ اور ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق بیت اللہ کا سفر

کرکے حج کی برکات سے مستفیض ہو سکتا ہے۔

هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اسلام کے نزدیک چاند ہی وقت کا اندازہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی دوسری آیات میں سورج کو بھی وقت کا اندازہ کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (یونس آیت ۶) یعنی وہ خدا ہی ہے جس نے سورج کو اپنی ذات میں ایک روشن وجود بنایا ہے اور چاند کو نُور بنایا ہے جو سورج سے اکتسابِ نور کر رہا ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کی ہم نے منازل مقرر کر دی ہیں تاکہ تمہیں سالوں کی گنتی اور حساب معلوم ہوا کرے۔

پھر سورہ انعام میں فرماتا ہے۔ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (انعام آیت ۹۷) یعنی خدا صبح کو ظاہر کرنے والا ہے اور اُس نے رات کو سکون اور آرام کا موجب اور سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا اور یہ فیصلہ ایک غالب اور علم رکھنے والے خدا کا ہے۔

اسی طرح سورۂ رحمٰن میں فرماتا ہے اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (رحمٰن آیت ۶) سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ یعنی اُنکی حرکات قانون سے آزاد نہیں بلکہ ایک معیّن اور مقررہ قانون کے مطابق ہیں۔ اور اسی مقررہ قانون کا یہ نتیجہ ہے کہ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ زمین کی روئیدگی اور سبزہ سب اپنے اُگنے نشوونما پانے اور پھل لانے میں سورج اور چاند کے پیچھے چلتے ہیں اور اُن سے متأثر ہوتے ہیں۔

اِن آیاتِ قرآنیہ سے واضح ہے کہ تاریخ اور حساب کے ساتھ سورج اور چاند دونوں کا تعلق ہے۔ اور یہ علوم کبھی ظاہر نہیں ہو سکتے تھے اگر سورج اور چاند کا وجود نہ ہوتا۔ اگر سورج اور چاند نہ ہوتے تو دنوں اور سالوں کا اندازہ ہی نہ ہو سکتا۔ اس لئے کہ اندازہ اور فاصلہ معلوم کرنے کیلئے کسی مستقل چیز کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جیسے پٹواری حساب لگاتے ہیں تو کہتے ہیں فلاں زمین فلاں کنوئیں سے اتنے کرم کے فاصلے پر ہے۔ یا فلاں درخت سے اتنے کرم کے فاصلے پر ہے۔ پس چونکہ کسی مستقل چیز کے بغیر فاصلہ کا معلوم کرنا ناممکن ہوتا ہے اس لئے اگر سورج اور چاند نہ ہوتے تو سالوں اور دنوں کا اندازہ بھی نہ ہو سکتا۔

اسلام نے اپنی عبادات میں سورج اور چاند دونوں سے وقت کے اندازے کئے ہیں۔ مثلاً دن بھر کی نمازوں کے اوقات اور روزہ کی ابتداء اور اُس کی افطاری وغیرہ کا تعلق شمسی نظام کے ساتھ ہے۔ لیکن جہاں عبادات کسی خاص مہینہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہاں قمری نظام سے کام لیا گیا ہے جیسے رمضان اور ایامِ حج کے لئے قمری مہینوں کو اختیار کیا گیا ہے تاکہ دونوں عبادتیں سال کے ہر حصہ میں چکر کھاتی رہیں۔ اور ایک مومن فخر کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ اُس نے سال کے ہر حصہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے۔ مثلاً رمضان کا انحصار چونکہ قمری مہینوں پر ہے۔ اس لئے ۳۶ سال میں ایک دَور ختم ہو جاتا ہے اور رمضان کبھی جنوری میں آجاتا ہے کبھی فروری میں کبھی مارچ میں اور کبھی اپریل میں اس طرح سال کے ۳۶۰ دنوں میں سے ہر دن ایسا ہوتا ہے جس میں انسان نے روزہ رکھا ہوتا ہے۔ لیکن اگر شمسی مہینوں پر روزے مقرر ہوتے تو اگر ایک دفعہ جنوری میں روزے آتے تو پھر ہمیشہ جنوری میں ہی روزے رکھنے پڑتے اور اس طرح عبادات کو وسعت حاصل نہ ہوتی۔ پس عبادت کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے اور اس غرض کے لئے کہ انسان اپنی زندگی کے ہر لحظہ کے متعلق کہہ سکے کہ وہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گذارا ہے۔ عبادت کا انحصار قمری مہینوں پر رکھا گیا ہے۔ لیکن سال کے اختتام یا اُس کے شروع ہونے کے لحاظ سے انسانی دماغ سورج سے

زیادہ تسلی پاتا ہے۔ بہرحال قمری اور شمسی دونوں نظام حساب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے وہ چاند کے مہینوں سے ہی زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیونکہ شمسی نظام سے تعلق رکھنے والے حسابات اُن کی علمی استعداد سے بالا ہوتے ہیں۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا

کہتے ہیں اسلام سے پہلے عربوں کا دستور تھا کہ جب وہ حج کے لئے احرام باندھ لیتے اور اس دوران میں انہیں گھر آنے کی ضرورت پیش آتی تو وہ دروازوں سے آنے کی بجائے گھروں کی پُشت سے دیوار پھاند کر آتے تھے (بخاری کتاب التفسیر) ہو سکتا ہے کہ یہ آیت اِسی کے متعلق ہو کہ تم ایسا نہ کرو مگر میرے نزدیک چونکہ اس آیت سے پہلے گھروں کی پشت سے داخل ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے اس آیت کے یہ معنٰی نہیں کہ تم گھروں میں اُن کی پشت سے داخل نہ ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام کو سرانجام دینے کے جو صحیح طریق مقرر کئے گئے ہیں تم اُن سے کام لو ورنہ تمہیں کامیابی حاصل نہ ہوگی۔ چنانچہ دیکھ لو اس سے پہلے یہ سوال بیان کیا گیا ہے کہ رمضان میں تو ہم نے مشقت برداشت کی اور خدا تعالیٰ ہمیں مل گیا۔ اب ہمیں بتایا جائے کہ باقی مہینوں میں ہم نفس کشی کے لئے کیا کریں اور کون کون سے طریق اختیار کریں۔ خدا تعالیٰ نے بتایا کہ تمہاری خواہش تو نیک ہے مگر یہ یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا یہ ذریعہ نہیں کہ زیادہ تکلیف اٹھاؤ بلکہ حقیقی ذریعہ یہ ہے کہ جو طریق ہم نے نیکی میں ترقی کرنے کے تمہیں بتائے ہوئے ہیں تم اُن پر عمل کرو۔ تمہیں خود بخود اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائیگا۔ اور اگر تم ایسا نہ کرو تو تمہاری مثال ایسی ہی ہو گی جیسے کوئی آقا اپنے ملازم کو بلائے اور وہ دیر کر کے آئے تو پُوچھے تم دیر کر کے کیوں آئے ہو۔ اس پر وہ کہدے کہ دروازے سے نہیں آیا بلکہ دیوار پھاند کر آیا ہوں اور مجھے دیوار پھاندنے میں بہت دیر لگ گئی تھی اس لئے میں جلدی نہیں پہنچ سکا۔ اگر وہ یہ جواب دے تو کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ اس جواب سے اس کا آقا خوش ہو جائیگا۔ اور اُسے انعام دیگا۔ اور کہیگا کہ چونکہ یہ دیوار پھاند کر آیا ہے اور اس نے بڑی مشقت برداشت کی ہے اس لئے اِسے ترقی دی جائے۔ اسی طرح خواہ مخواہ مشقت اٹھا کر اپنی طرف سے نئی نئی راہیں ایجاد کرنا اور اُن پر اپنا وقت ضائع کرنا اور اپنے قویٰ کو نقصان پہنچانا کوئی نیکی نہیں۔ نیکی یہ ہے کہ لوگ اپنے اعلیٰ آقا کی آواز پر لبیک کہیں اور اس راستہ کو اختیار کریں جو شریعت نے اُن کے لئے قائم کر دیا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ طریق جو میں نے تمہیں بتائے ہوئے ہیں اگر اُن کے ذریعہ تم میرے پاس آؤ گے تو مجھ تک پہنچ سکو گے اور اگر اور ذرائع عمل میں لاؤ گے اور اُن میں تمہیں محنت بھی زیادہ کرنی پڑے تو یہ زیادہ محنت کرنا تمہیں خدا تعالیٰ تک نہیں پہنچا سکیگا۔ جیسا کہ ہندوؤں میں بعض لوگ اُلٹے لٹکے رہتے ہیں۔ بعض اپنے ہاتھ کھڑے رکھ کر خشک کر لیتے ہیں۔ مگر انہیں خدا تعالیٰ کی کوئی رضا حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلہ میں مسلمان بھی عبادتیں کرتے ہیں جو مشقت میں اُن سے بہت کم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی وہ رضائے الٰہی کو حاصل کر لیتے ہیں۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی فیج اعوج کے دَور میں بڑی بڑی مشقتیں اپنے نفس پر وارد کیں اور وہ غلط راستہ پر چلنے لگے۔ بیسیوں قسم کی چلّہ کشیاں تھیں جو انہوں نے اختیار کر لیں اور بیسیوں قسم کے ذکر تھے جو انہوں نے خود ہی ایجاد کر لئے۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو اِن مشقتوں میں ڈالنے کی بجائے قرآن کریم کے احکام پر عمل کرتے تو وہ قرب الٰہی کی اُن منازل کو دنوں میں طے کر لیتے جنہیں وہ سالوں میں بھی طے نہ کر سکے۔ بلکہ اِن ریاضتوں کے نتیجہ میں اُن میں سے کئی مسلول اور مدقوق ہو کر مر گئے۔ کئی دیوانے ہو گئے اور کئی مرگی کا شکار ہو گئے۔

وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِس میں بتایا کہ کامیابی ہمیشہ ابواب ہی کے ذریعہ

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں - اور کسی پر زیادتی نہ کرو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۱﴾

(اور یاد رکھو) کہ اللہ (تعالیٰ) زیادتی کرنیوالوں سے ہرگز محبت نہیں کرتا۔۱۰۵

آنے سے ہوا کرتی ہے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے اور دروازوں میں سے داخل ہونے کی بجائے دیواریں پھاند کر اندر داخل ہونا چاہتے ہو تو تمہیں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً لڑائی کے زمانہ میں اگر تم ہتھیاروں سے کام لینا نہ سیکھو اور جنگی فنون کی تربیت نہ لو بلکہ یونہی سینہ تان کر دشمن کے سامنے چلے جاؤ۔ تو تم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر چھوٹی سے چھوٹی تلوار بھی تمہارے پاس ہو یا تمہیں لاٹھی چلانا ہی آتا ہو تو تم قوم کے لئے مفید وجود بن سکتے ہو۔ پس کامیابی کے لئے اُن ذرائع اور اسباب کو استعمال کرنا ضروری ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ اُسے ناکامی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر وَاتَّقُوا اللّٰہَ کہکر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ذرائع اور اسباب کو نظر انداز کرنا اللہ تعالیٰ کے قانون اور اُس کے نظام کی ہتک کرنا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر چیز کے حصول کے جو طریق اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہوئے ہیں اُنہی کے مطابق چلو اپنے پاس سے نئے نئے طریق وضع نہ کرو۔ مثلاً رمضان کے مہینہ میں بیشک روزے رکھنا ایک بڑی نیکی ہے لیکن اگر اسی پر قیاس کرتے ہوئے کوئی شخص کسی اور مہینہ میں بھی تیس تیس روزے رکھنے شروع کر دے اور سمجھے کہ وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کو راضی کر لیگا۔ تو وہ ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی دروازہ سے داخل نہ ہو بلکہ نقب لگا کر داخل ہو اور اندر جا کر کہے کہ دیکھیئے میں کیسی مشقت اٹھا کر آپ تک پہنچا ہوں۔ ایسے شخص کی کوئی تعریف نہیں کر سکتا بلکہ ہر شخص اُسے ملامت کرے گا اور اُس کے فعل کو قابلِ مذمت قرار دیگا۔

۱۰۵ تفسیر:۔ اب اللہ تعالیٰ نے دینی جنگوں کے احکام بیان کرنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ اس پہلی آیت میں ہی اللہ تعالیٰ نے وہ تمام شرائط بیان کر دی ہیں جن کو مذہبی جنگوں میں ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ اے مسلمانو! اُن کفار سے جو تم سے جنگ کر رہے ہیں تم بھی محض اللہ تعالیٰ کی خاطر جس میں تمہارے اپنے نفس کا غصہ یا نفس کی طمع شامل نہ ہو جنگ کرو اور یاد رکھو کہ جنگ میں بھی کوئی ظالمانہ فعل نہیں کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو بہرحال پسند نہیں کرتا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ جس جنگ کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے وہ صرف وہی ہے جو اوّل فی سبیل اللہ ہو۔ یعنی ذاتی لالچوں، ذاتی حرصوں۔ ملک کے فتح کرنے کی نیت یا اپنے رسوخ کو بڑھانے کی نیت سے نہ ہو بلکہ محض خدا تعالیٰ کیلئے ہو یعنی ان مشکلات کو دُور کرنے کے لئے ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اور اس کے دین کے راستہ میں پیدا کی گئی ہوں۔ اگر وہ دینی جنگ نہیں تو اُسے فی سبیل اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ مسیحی مصنف فی سبیل اللہ کے الفاظ سے دھوکہ کھاتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد زبردستی مسلمان بنانے کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کے معنے تو یہ ہیں کہ صرف وہی جنگ جائز ہے جو خدا تعالیٰ کے منشاء کے مطابق اور اُس کی رضا چاہنے کے لئے ہو۔ چنانچہ اسی قسم کے الفاظ اسی سورۃ کی آیت نمبر ۲۶۳ میں بھی استعمال کئے گئے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لا
لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ
یَحْزَنُوْنَ۔ یعنی جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ
کرتے ہیں اور پھر خرچ کرنے کے بعد نہ کسی رنگ میں احسان جتاتے
ہیں اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں اُن کے رب کے پاس اُن
کے اعمال کا بدلہ محفوظ ہے اور نہ تو انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا
اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ اِس آیت میں جو فی سبیل اللہ کے الفاظ
استعمال کئے گئے ہے انہی کی تشریح آیت نمبر ۲۶۶ میں اِن الفاظ
میں کی گئی ہے کہ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ
یعنی وہ لوگ اپنے اموال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے
لئے خرچ کرتے ہیں۔

اِسی طرح لسان العرب جو لغت کی مشہور کتاب ہے۔
اُس میں لکھا ہے۔ کہ کُلُّ مَا اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْخَیْرِ فَھُوَ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَیْ مِنَ الطُّرُقِ اِلَی اللّٰہِ۔ یعنی ہر نیکی جس کا
اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستوں میں سے ایک
راستہ ہے جو انسان کو خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتا ہے۔ اور نہایہ
میں لکھا ہے۔ وَسَبِیْلُ اللّٰہِ عَامٌّ یَقَعُ عَلٰی کُلِّ عَمَلٍ خَالِصٍ
سُلِکَ بِہٖ طَرِیْقُ التَّقَرُّبِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی بِاَدَاءِ الْفَرَائِضِ
وَالنَّوَافِلِ وَاَنْوَاعِ التَّطَوُّعَاتِ۔ یعنی سبیل اللہ ایک
عام اصطلاح ہے جس کا اطلاق ہر ایسے عمل نیک پر ہوتا ہے
جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اُس کی خوشنودی حاصل
کی جاتی ہو۔ خواہ فرائض کی ادائیگی کے ذریعہ ہو یا نوافل یا
دوسری نیکیوں میں حصہ لینے کے ذریعہ ہو۔

پس قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے یہ معنے نہیں کہ تم دوسروں
کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے جنگ کرو۔ بلکہ اس کے معنے
یہ ہیں کہ جب کوئی قوم دین کے بارہ میں تم سے جنگ کرے اور
تمہارا مقدس مذہب تم سے زبردستی چھڑانا چاہے تو اُس وقت
تمہارا فرض ہے کہ تم محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور دینی
مشکلات کو دُور کرنے کے لئے دشمن سے جنگ کرو۔ پس اِس میں
کفّار کو زبردستی مسلمان بنانے کا کوئی ذکر نہیں بلکہ کفار کے اُس
جبر کو دُور کرنے کا ذکر ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے لئے مذہبی
آزادی تک باقی نہیں رہی تھی۔

دوسری شرط اللہ تعالیٰ نے اِس میں یہ بیان کی ہے
کہ لڑائی صرف اُنہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ
میں ہتھیار اُٹھا چکے ہوں۔ جیسا کہ یُقَاتِلُوْنَکُمْ کے الفاظ
اِسپر شاہد ہیں۔

تیسری شرط جو یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں بیان کی گئی ہے
یہ ہے کہ تمہارے لئے صرف انہی سے جنگ کرنا جائز ہے جو
تم سے لڑتے ہیں۔ یعنی جو لوگ باقاعدہ سپاہی نہیں اور
لڑائی میں عملاً حصہ نہیں لیتے جیسے بچے بوڑھے عورتیں وغیرہ
اُن کو مارنا یا اُن سے لڑائی کرنا جائز نہیں گویا سول آبادی
کو لڑائی کے دائرہ سے کلیتہً باہر رکھا گیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس تعلیم کی جو تشریح
فرمائی ہے وہ اُن احکام سے ظاہر ہے جو آپ اُسوقت دیتے
تھے جب آپ کسی کو کمانڈر بنا کر جنگ پر بھجواتے تھے۔
چنانچہ مسلم جلد ۲ کتاب الجہاد میں لکھا ہے کہ رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی لشکر یا دستۂ فوج کا کسی کو
افسر بنا کر بھجواتے تھے تو آپ اُسے اور دوسرے مسلمانوں کو
نصیحت فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو اور
پھر فرماتے اُغْزُوْا بِسْمِ اللّٰہِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اللہ تعالیٰ
کا نام لے کر اور اللہ تعالیٰ کی خاطر جنگ کے لئے جاؤ۔
قَاتِلُوْا مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ اُس شخص کے ساتھ جنگ کرو جو
اللہ تعالیٰ کا کفر اختیار کرے۔ اِس کے یہ معنے نہیں کہ
تم کافر سے لڑو بلکہ اِس کے معنے یہ ہیں کہ جس شخص سے تمہاری لڑائی
ہے اگر وہ مسلمان ہو جائے تو پھر تم نے اُس سے لڑنا نہیں
نہیں لڑائی کی صرف اُس وقت تک اجازت ہے جب کفر باللہ
کی شرط موجود ہے۔ اگر کسی شخص نے لڑائی تو شروع کی مگر جب
تمہارا لشکر پہنچا تو اُس نے کہدیا کہ میں اسلام اختیار کرتا ہوں

تو بس لڑائی ختم ہو جائیگی - وَلَا تَغُلُّوْا اور قطعی طور پر خیانت
سے کام نہ لو - وَلَا تَغْدِرُوْا اور بد عہدی نہ کرو۔ دھوکہ بازی
سے کام نہ لو۔ اگر تم اپنے دشمن سے کوئی وعدہ کرو تو بعد میں اُسے
کسی بہانہ سے توڑنے کی کوشش نہ کرو - وَلَا تُمَثِّلُوْا اور
تم مثلہ نہ کرو۔ یعنی کفار اپنی رسم کے مطابق اگر مسلمان مقتولین کے
ناک کان بھی کاٹ دیں تو بھی تم اُن کے مُردوں کے ساتھ یہ
سلوک نہ کرو - وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا اور کسی نابالغ بچے
کو نہ مارو کیونکہ وہ جنگ میں شامل نہیں ہوا - سیرتِ حلبیہ
میں اس کے علاوہ بعض اور نصائح بھی درج ہیں - اُس میں لکھا
ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو جنگ پر جاتے
وقت یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ لَا تَقْتُلُوْا امْرَءَةً -
کسی عورت کو نہیں مارنا - وَلَا كَبِيْرًا فَانِيًا اور کسی بڈھے
شخص کو بھی نہیں مارنا - وَلَا مُعْتَزِلًا بِصَوْمَعَةٍ اور
عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی نہیں مارنا۔ کیونکہ
گو وہ ایک ایسی قوم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جو تمہاری مخالف
ہے مگر وہ خدا کا نام لیتے ہیں - پھر فرماتے وَلَا تَقْرَبُوْا
نَخْلًا - کسی کھجور کے درخت کے قریب بھی نہ جانا یعنی کھجور کو
نقصان پہنچانے کا خیال بھی نہ کرنا - کیونکہ اس سے اُن کے
رزق پر اثر پڑتا ہے اور تمہارا حملہ اُن کے حملے کو دُور کرنے کی
نیّت سے ہے اُن کو مستقل تباہ کرنے کی غرض سے نہیں -
وَلَا تَقْطَعُوْا شَجَرًا بلکہ کوئی درخت بھی نہ کاٹنا کیونکہ وہ
غریبوں اور مسافروں کو سایہ دینے کے کام آتا ہے اور تم
لڑنے کے لئے جا رہے ہو اسلئے نہیں جا رہے کہ وہ قوم سایہ
سے بھی محروم ہو جائے - وَلَا تَهْدِمُوْا بِنَاءً - اسی طرح
عمارتوں کو مت گراؤ - قلعہ کا انہدام ایک علیحدہ چیز ہے -
وہ جنگ کے حملے کو روکنے کے لئے ہوتا ہے - مگر یہ جائز نہیں کہ
کسی ملک کے باشندوں کو بے گھر کر دیا جائے اور اُن کے
مکانوں کو گرا دیا جائے یا انہیں آگ لگا دی جائے - اسی طرح
آپ کی دوسری ہدایات میں ہے کہ ملک میں ڈر اور ہراس پیدا
نہ کیا جائے - دنیوی حکومتیں جب کسی ملک میں داخل ہوتی ہیں تو
اندھا دھند مظالم شروع کر دیتی ہیں - محض اس لئے کہ حکومت
کا رُعب قائم ہو جائے - مگر اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا -
اسی طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مفتوحہ
ممالک میں جاؤ تو ایسے احکام جاری کرو جن سے لوگوں کو
آسانی ہو تکلیف نہ ہو - اور فرمایا جب لشکر سڑکوں پر چلے - تو
اس طرح چلے کہ عام مسافروں کا راستہ نہ رُکے - ایک صحابیؓ
کہتے ہیں ایک دفعہ لشکر اس طرح نکلا کہ لوگوں کے لئے اپنے
گھروں سے نکلنا اور راستہ چلنا مشکل ہو گیا - اس پر آپ نے
منادی کروائی کہ جس نے مکانوں کو بند کیا یا راستہ روکا اُس کا
جہاد جہاد نہیں رہیگا -

غرض اسلام کہتا ہے کہ تم کو جنگ میں عورتوں کے مارنے
کی اجازت نہیں تمکو بچوں کے مارنے کی اجازت نہیں - تم کو
بڈھوں کے مارنے کی اجازت نہیں - تم کو بد عہدی کرنیکی اجازت
نہیں - تم کو دھوکا دینے کی اجازت نہیں - تم کو مقتولین کے
ناک کان کاٹنے کی اجازت نہیں - تم کو پادریوں اور پنڈتوں
اور گیانیوں کو مارنے کی اجازت نہیں - تم کو کوئی باغ اور درخت
کاٹنے کی اجازت نہیں - تم کو کوئی عمارت گرانے کی یا اُسے آگ
لگانے کی اجازت نہیں اور اگر کبھی ان ہدایات کی خلاف ورزی
ہوئی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے سخت ناراضگی کا اظہار
فرمایا - عرب کے دستور کے مطابق عورتیں بھی لڑائی میں شامل
ہوتی تھیں اور چونکہ وہ دوسروں کو قتل کرتی تھیں لازماً وہ
خود بھی قتل کی جاتی تھیں مگر ایک موقعہ پر ایک لڑائی کے بعد جب
ایک عورت کی نعش آپ نے دیکھی تو آپ کے چہرے پر غم اور غصہ
کے آثار ظاہر ہوئے اور آپ نے فرمایا - اسلام اس کو پسند
نہیں کرتا - یہ فعل اسلامی تعلیم کے خلاف ہوا ہے (بخاری جلد ۲
کتاب الجہاد والسیر) اُحد کی جنگ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک تلوار پیش کی اور فرمایا یہ تلوار میں اس شخص کو دونگا
جو اس کا حق ادا کرنے کا وعدہ کرے - بہت سے لوگ اُس

تلوار کو لینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ آپ نے ابو دجانہؓ انصاری کو وہ تلوار دی۔ لڑائی میں ایک جگہ مکہ والوں کے کچھ سپاہی ابو دجانہؓ پر حملہ آور ہوئے جب آپ اُن سے لڑ رہے تھے تو آپ نے دیکھا کہ ایک سپاہی سب سے زیادہ جوش کے ساتھ لڑائی میں حصہ لے رہا ہے۔ آپ نے تلوار اُٹھائی اور اس کی طرف لپکے لیکن پھر اُس کو چھوڑ کر واپس آگئے۔ آپ کے کسی دوست نے پوچھا۔ آپ نے اُسے کیوں چھوڑ دیا۔ آپ نے جواب میں کہا۔ میں جب اُس کے پاس گیا تو اُس کے مُنہ سے ایک ایسا فقرہ نکلا جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے۔ اُن کے ساتھی نے کہا۔ بہرحال وہ سپاہیوں کی طرح فوج میں لڑ رہی تھی۔ پھر آپ نے اُسے چھوڑا کیوں؟ ابو دجانہؓ نے کہا۔ میرے دل نے برداشت نہ کیا کہ میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی تلوار کو ایک کمزور عورت پر چلاؤں۔ غرض آپ عورتوں کے ادب اور احترام کی ہمیشہ تعلیم دیتے تھے جس کی وجہ سے کفار کی عورتیں زیادہ دلیری سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی تھیں۔ مگر پھر بھی مسلمان ان باتوں کی برداشت کرتے چلے جاتے تھے۔ صرف ایک ہی عورت تھی جس نے شروع سے لیکر آخر تک اسلام کے خلاف جنگوں میں حصہ لیا اور مسلمان شہداء کے ناک اور کان کاٹ لینے میں بہت مشہور تھی یعنی ہندہ۔ فتح مکہ کے وقت آپ نے صرف اس کے قتل کا حکم دیا مگر باقی عورتوں کے ساتھ آئی اور مسلمان ہو گئی۔ اور پھر آپ نے اُسے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ آپ نے فرمایا۔ توبہ نے اُس کے سارے گناہوں کو دھو دیا ہے۔

چوتھی شرط وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ کے الفاظ میں یہ بیان فرمائی کہ باوجود دشمن کے حملہ میں ابتداء کرنے کے لڑائی کو صرف اس حد تک محدود رکھنا چاہیئے جس حد تک دشمن نے محدود رکھا ہے اور اُسے وسیع کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ نہ علاقہ کے لحاظ سے اور نہ ذرائع جنگ کے لحاظ سے اور فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حد سے زیادہ گذر جانے والوں سے محبت نہیں کرتا یا یوں کہو کہ جو لوگ حد سے گذر جانے والے ہوں وہ کبھی خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شخص طبعی طور پر خدا تعالیٰ سے محبت کر ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ حق کا مطالبہ کرنے میں حد سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً کسی کو غصہ آ گیا۔ اور اُس نے دوسرے کو تھپڑ مار دیا تو اب یہ ایک غلطی تو ہے جس کی اُسے سزا ملنی چاہیئے۔ مگر یہ سزا اتنی ہی ہو سکتی ہے کہ ہم اُسے بلائیں اور ڈانٹ دیں کہ تم نے فلاں کو تھپڑ کیوں مارا۔ لیکن بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس شخص سے قصور سرزد ہوا ہو جب تک اُس کا قیمہ نہ کرلیں اُن کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ اور پھر یہیں تک بس نہیں کرتے بلکہ چاہتے ہیں کہ جب وہ اگلے جہان میں پہنچے تو وہاں بھی خدا اس کو دوزخ میں ڈالے اور اُسے ایسا عذاب دے جو کسی اَور کو نہ دیا گیا ہو۔ حالانکہ خدا بڑا رحیم و کریم ہے وہ حد سے گذرنے والوں سے محبت نہیں کرتا اور نہ حد سے گذرنے والا خدا تعالیٰ سے محبت کر سکتا ہے۔ اس زمانہ میں بڑی بڑی طاقتیں اس بات کی مدعی ہیں کہ انہوں نے عدل و انصاف کو کمال تک پہنچا دیا ہے مگر ان کی حالت یہ ہے کہ لڑائی میں ہر قسم کے جھوٹ اور ظلم اور دھوکا اور فریب سے کام لیتی ہیں اور جب تک دشمن کو پیس نہ لیں ان کے دل کی آگ ہی نہیں بجھتی کہیں گیسیں استعمال کی جاتی ہیں تو کہیں قیدیوں کو پکڑ کر لڑائی کے وقت اپنے آگے رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اور کئی ظالمانہ طریق اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ بھی اعتداء میں داخل ہے کہ دشمن کا لباس پہن کر یا اس کا نشان دکھا کر حملہ کر دیا جائے یا صلح کے بہانہ سے حملہ کیا جائے یہ تمام امور ناجائز اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں۔ بہرحال اوپر کی دونوں آیات سے مندرجہ ذیل چھ امور کا استنباط ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ مستنبط ہوتی ہے کہ غیر شرعی طریق سے جائز کام بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ

اور جہاں بھی اُن (ناحق لڑنے والوں) کو پاؤ انہیں قتل کرو۔ اور تم (بھی) انہیں اس جگہ سے نکال دو جہاں سے

اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ

انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ اور (یہ) فتنہ قتل سے (بھی) زیادہ سخت (نقصان دہ) ہے۔ اور تم اُن سے

جن میں داخل ہونیکا تم کو ہر وقت اور پورا اختیار ہے اُن میں بھی اگر تم دیواریں پھاند پھاند کر داخل ہو تو یہ امر خدا تعالیٰ کے نزدیک نیکی نہیں سمجھا جائیگا۔ اس مثال سے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لئے ایک رستہ بنایا ہے۔ اگر تو انسان اس رستہ سے اس کام کو کرتا ہے تو اس کا کام نیکی قرار دیا جائیگا۔ لیکن اگر کام نیک ہو مگر اس کے کرنے کا طریق غلط ہو تو پھر وہ عمل نیک نہیں رہے گا۔ مثلاً نماز ایک نیکی ہے لیکن اگر کوئی شخص بغیر وضو کے نماز پڑھے یا پہلے نماز پڑھ لے بعد میں وضو کرے یا بے وقت نماز پڑھے تو باوجود اس کے کہ نماز پڑھے گا جو ایک عبادت ہے اللہ تعالیٰ کو خوش نہیں کر سکیگا بلکہ ایک بدی کا مرتکب ہوگا۔ بعینہٖ اسی طرح اظہارِ غضب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غیرت کو ایک نیکی قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود بھی نہایت غیرت مند ہے اور وہ بُری باتوں پر اظہارِ غضب بھی کرتا ہے۔ لیکن غیرت کے جائز موقعہ پر بھی اگر کوئی شخص غیرت کا اظہار غلط طریق پر کرے اور شریعت جس موقعہ پر غضب کی اجازت دیتی ہے غضب کو اسی موقعہ پر ظاہر کرے لیکن اس کا طریق بدل دے تو یہ گناہ ہو جائیگا۔ مثلاً شریعت اظہارِ غیرت یا اظہارِ غضب کا یہ طریق بتلائے کہ اس جگہ سے مومن اُٹھ جائے مگر مومن اس جگہ سے بجائے اُٹھ جانے کے لڑنے لگے تو شریعت اس مومن کو بھی گنہگار قرار دے گی۔

دوسری بات جو اس آیت سے مستنبط ہوتی ہے یہ ہے کہ نیکی تقویٰ کا نام ہے۔ یعنی نیک کام کو نیک راہ سے بجا لانا۔ پس مومن کا فرض ہے کہ ہر گھر میں اس کے دروازہ سے داخل ہو

یعنی ہر نیک کام کے لئے خدا تعالیٰ نے جو طریق تجویز کیا ہے اُس طریق سے اس کام کو کرے۔ جو شخص اس طریق سے کام نہ کرے وہ نیک نہیں کہلا سکتا۔

تیسری بات جو مذکورہ بالا آیات سے مستنبط ہوتی ہے یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اوپر کے بتائے ہوئے راستہ میں ہے بلکہ خود انسان کی کامیابی بھی اسی راہ پر چلنے میں ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی یہ حکم ہم نے یونہی نہیں دیئے۔ تمہاری ترقی اور کامیابی بھی اسی طریق سے وابستہ ہے۔ کامیابی کا اس امر کے ساتھ وابستہ ہونا ایک ظاہر امر ہے۔ جو راستے کسی عمارت میں داخل ہونے کے ہوں جب انسان اُن راستوں سے داخل ہو تبھی بغیر کسی تکلیف کے اپنے مدعا کو پا سکتا ہے۔ اگر ان راستوں کو چھوڑ کر دیواریں پھاندنی شروع کر دے تو اُس کی تکلیف بڑھ جائیگی اور اس کی حماقت کی بھی لوگ شکایت کرنے لگیں گے۔

چوتھی بات اس آیت سے یہ مستنبط ہوتی ہے کہ کسی شخص پر جارحانہ حملہ کرنا خلافِ شریعت ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ یہ تو تمہارے لئے جائز ہے کہ اگر کوئی تم پر قاتلانہ حملہ کرے تو تم اپنا بچاؤ کرو۔ لیکن تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم خود کسی پر جا کر حملہ کرو۔

پانچواں استنباط ان آیات سے یہ ہوتا ہے کہ دفاع بھی وہ جائز ہے جو مقررہ حدود کے اندر ہو۔ یعنی دفاع میں بھی انسان پوری طرح آزاد نہیں۔ اس کے لئے بھی قیود اور شرائط

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ

مسجد حرام کے قرب (وجوار) میں (اُس وقت تک) جنگ نہ کرو جب تک وہ (خود) تم سے اُس میں جنگ (کی ابتداء) نہ کریں۔ اور اگر وہ

فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۲﴾

تم سے (وہاں بھی) جنگ کریں تو تم بھی انہیں قتل کرو۔ اِن کافروں کی یہی سزا ہے۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۳﴾

پھر اگر وہ باز آجائیں تو یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے ۱۰۶

ہیں اور اُن قیود اور شرائط سے آزاد ہو کر جو دفاع کیا جائے وہ بھی ناجائز اور حرام ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کو تھپڑ مارے تو جس شخص کو تھپڑ مارا گیا ہے اس کے لئے یہ درست نہ ہوگا کہ اس تھپڑ کی سزا کے لئے دوسرے شخص کا سر پھوڑ دے۔

چھٹی بات اِس آیت سے یہ مستنبط ہوتی ہے کہ اگر کوئی اُن قیود کو توڑے تو باوجود مظلوم ہونے کے خدا تعالیٰ کی نظروں سے وہ گر جائیگا۔ کیونکہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ اگر تم دفاع میں بھی اعتداء سے کام لو اور خدا تعالیٰ کی مقررہ قیود کو نظر انداز کر دو تو تم اللہ تعالیٰ کی محبت کھو بیٹھو گے اور اُس کی نصرت تم سے جاتی رہے گی۔

۱۰۶ **حل لغات**:۔ اَلْفِتْنَةُ کے معنے ہیں (۱) اَلْعَذَابُ۔ عذاب (۲) اَلْاِبْتِلَاءُ۔ ابتلاء (۳) اِخْتِلَافُ النَّاسِ فِی الْآرَاءِ وَمَا يَقَعُ بَيْنَهُمْ مِنَ الْقِتَالِ۔ وہ لڑائی جو اختلافِ آراء کی وجہ سے لوگوں میں پیدا ہو (اقرب)

تفسیر:۔ مخالفین اسلام کے نزدیک اِس آیت میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جہاں کوئی کافر ملے اُسے مار ڈالو۔ مگر اس میں ہرگز یہ نہیں کہا گیا کہ جہاں کوئی کافر ملے اُسے تہ تیغ کر دو۔ بلکہ اس جگہ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ کے حکم کے ماتحت صرف وہ کفار آتے ہیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے اور جنہوں نے مسلمانوں سے عملاً جنگ شروع کر دی تھی ایسے لوگوں کے ساتھ لڑائی جاری رکھنے میں نہ اخلاقاً کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ شرعاً۔ اور حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ میں اِس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جہاں کہیں بھی تمہاری اور ان کی جنگ کے ذریعہ سے مٹھ بھیڑ ہو جائے وہاں تم اُن سے جنگ کرو۔ یہ نہیں کہ اِکا دُکا ملنے پر حملہ کرتے پھرو۔ بلکہ تمہاری جنگ صرف باقاعدہ فوج کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ خواہ فوج ہو جس نے مقابلہ میں ابتداء کی ہے یا اُسی فوج کا کوئی دوسرا حصہ ہو جو اس کی مدد کر رہا ہو۔

پھر فرمایا وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ اور تم بھی انہیں اس جگہ سے نکال دو جس جگہ سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اِن الفاظ میں یہ پیشگوئی مخفی تھی کہ ایک زمانہ میں مسلمان ایسی طاقت حاصل کریں گے کہ وہی مقام جہاں سے انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس میں مسلمانوں کو فاتحانہ طور پر داخل کرے گا۔ اور یا تو مسلمان کفار کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے اور یا کفار مسلمانوں کی منتیں کرتے اور اُن کے آگے ہاتھ جوڑتے دکھائی دینگے۔ اِسی غلبہ کی طرف سورۃ توبہ میں بھی بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ مشرکینِ مکہ کہتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ تو

یہ ہے کہ میں کی نبی ہوں جس کی پیشگوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔ مگر یہ تو مکہ چھوڑ کر مدینہ چلا گیا ہے۔ پھر یہ پیشگوئی کس طرح پوری ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ اب خدا تعالیٰ نے عرب کو فتح کر کے جس کے بغیر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں نہیں آسکتے تھے اس اعتراض کو دُور کر دیا ہے اور آپؐ اور آپؐ کے ساتھی اس الزام سے بری ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ۔ تم ملک عرب میں چار مہینے تک پھر کر دیکھ لو اور جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے یعنی اس سفر کے نتیجہ میں تمہیں اقرار کرنا پڑے گا کہ اسلام عرب کے کونہ کونہ پر غالب آچکا ہے۔ اور تمہارے تمام اعتراضات غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ پس أَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ میں اسی غلبہ کی پیشگوئی ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ جس طرح انہوں نے تم کو ظالمانہ طور پر ملک سے نکالا ہے اسی طرح تم بھی اُن کا تصرف وہاں سے ہٹا دو۔ اسجگہ أَخْرِجُوهُمْ سے اُن کا نکالنا مراد نہیں۔ بلکہ اُن کے تصرف کو مٹانا مراد ہے۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین مکہ کو وہاں سے نکالا نہیں بلکہ اُن کی اولاد کو خود آپ نے مکہ میں رہنے کی اجازت دی۔ چنانچہ ابوجہل جو سب سے بڑا مشرک اور دشمن اسلام تھا فتح مکہ کے موقعہ پر اُس کے بیٹے عکرمہ نے بھاگ کر ایبے سینیا جانے کا ارادہ کیا۔ اور وہ مکہ سے چلا بھی گیا۔ مگر اُس کی بیوی نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے اجازت حاصل کر لی اور وہ مکہ میں آزادانہ طور پر رہنے لگ گیا۔ پس چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل نے اس کی تشریح کر دی ہے اس لئے أَخْرِجُوهُمْ میں کفار کے جبری نکالنے کا کوئی حکم نہیں۔ بلکہ وہاں سے اُن کا تصرف دُور کرنے کا ذکر ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کو نکالنے کا حکم ہے جو شریر ہوں اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں جاری رکھنے والے ہوں۔ اور ایسے لوگوں کو دنیا کی ہر حکومت نکالتی ہے اور اسمیں کسی قسم کا حرج نہیں سمجھتی۔

وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ پھر فرماتا ہے یاد رکھو قتل اور لڑائی کی نسبت دین کی وجہ سے کسی کو فتنہ میں ڈالنا زیادہ خطرناک گناہ ہے۔ پس تم ایسا طریق مت اختیار کرو۔ کیونکہ یہ بے دین لوگوں کا کام ہے۔

اسجگہ فتنہ سے مراد وہی دورِ آزمائش ہے جس میں سے مسلمان گذر رہے تھے۔ اور جس کا اس سے پہلے ان الفاظ میں ذکر آچکا ہے کہ کفّار بلا وجہ محض دینی اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کو مارتے اور انہیں اپنے گھروں سے نکالتے ہیں۔ فرماتا ہے دین کی وجہ سے لوگوں کو دُکھ دینا اور انہیں اُنکے گھروں سے نکالنا دنیوی لڑائیوں اور عام سیاسی جنگوں کی نسبت کہ جن میں قومی حقوق وغیرہ کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ بہت زیادہ ہولناک جرم ہے۔ کیونکہ دنیا دین کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

اور یہ بھی کہ فتنہ یعنی مومنوں کی تعذیب۔ اس غرض سے کہ وہ اپنے دین کو چھوڑ دیں قتل سے بڑھ کر ہے۔ کیا بلحاظ اس کے کہ دین کے معاملہ میں جان کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور کیا بلحاظ اسکے کہ ایسے ظلم کا نتیجہ نہایت خطرناک فساد ہوتا ہے اور ذہنی آزادی جاتی رہتی ہے اور دلوں میں بغض پیدا ہو جاتا ہے پس فرمایا کہ اُن کو قتل کرنا کوئی ظلم نہیں کیونکہ قتال تو قتال سے ہی جائز ہو جاتا ہے اور یہ لوگ تو قتال سے بڑھ کر مذہبی دست اندازی اور مذہب کی خاطر تعذیب سے بھی کام لیتے ہیں۔ جو قتال سے بڑھ کر ہے۔

پھر اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ میں اسطرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ بیشک قتل ایک بہت بُرا فعل ہے مگر فتنہ پیدا کرنا اس سے بھی زیادہ بُری چیز ہے کیونکہ اس سے لاکھوں بلکہ کروڑوں جانیں ضائع چلی جاتی ہیں۔ قتل کرنے سے تو صرف ایک یا چند جانیں ضائع ہوتی ہیں لیکن ایک فتنہ پرداز شخص بعض دفعہ ایسی بات کر دیتا ہے جس سے قومیں آپس میں لڑ پڑتی ہیں اور جماعتوں میں تفرقہ اور شقاق

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ

اور تم اُن سے اُسوقت تک جنگ کرو کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے - اور دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے ۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

پھر اگر وہ باز آجائیں (تو یاد رکھو کہ) ظالموں کے سوا کسی پر گرفت (جائز) نہیں۔ ۱۰۷

پیدا ہو جاتا ہے۔ فتنہ باز لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو معمولی بات کہی تھی مگر ان کا ایک معمولی بات کہنا درا صل ایک زہر ہوتا ہے جس کا اثر دُور دُور تک اتر جاتا ہے اور پھر اس سے خطرناک لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں جن سے لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ بیشک فتنہ شروع میں چھوٹا نظر آتا ہے مگر اس کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے قتل سے بھی منع کیا ہے مگر فتنہ سے اس سے بھی زیادہ زور کے ساتھ منع کیا ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ عام طور پر قتل سے تو بچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر فتنہ سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ جب تک لوگ یہ نہ سمجھیں کہ فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر بُرا فعل ہے اُسوقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ - اب فرماتا ہے کہ تم مسجد حرام کے پاس اُن سے اُسوقت تک جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ خود جنگ کی ابتداء نہ کریں کیونکہ اس طرح حج اور عمرہ کے راستہ میں روک پیدا ہوتی ہے - فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ہاں اگر وہ خود ایسی جنگ کی ابتداء کریں تو پھر تم مجبور ہو اور تمہیں جواب دینے کی اجازت ہے - كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ - اور جو لوگ عقل اور انصاف کے احکام کو ردّ کر دیتے ہیں اُنکے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرنا پڑتا ہے۔

اس آیت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ اس امر کو مدِّنظر رکھنا چاہیئے کہ مذہبی عبادتوں اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں روکیں پیدا نہ ہوں۔ اگر دشمن کسی ایسی جگہ پر جنگ کی طرح نہ ڈالے جہاں جنگ کرنے سے مذہبی عبادتوں میں رخنہ پیدا ہوتا ہو تو مسلمانوں کو بھی اس جگہ جنگ نہیں کرنی چاہیئے ۔ لیکن اگر دشمن خود مذہبی عبادت گاہوں کو لڑائی کا ذریعہ بنائے تو پھر مجبوری ہے ۔

اِس آیت میں اسطرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ عبادتگاہوں کے ارد گرد بھی لڑائی نہیں ہونی چاہیئے ۔ کجا یہ کہ عبادتگاہوں پر براہ راست حملہ کیا جائے یا ان کو مسمار کیا جائے ۔ یا اُن کو توڑا جائے۔ ہاں اگر دشمن خود عبادت گاہوں کو لڑائی کا قلعہ بنالے تو پھر اُن کے نقصان کی ذمہ داری اُسپر ہے مسلمانوں پر نہیں ۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ہاں اگر انہیں ہوش آجائے اور وہ اس بات سے رُک جائیں تو اللہ تعالےٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی اگر دشمن مذہبی مقامات میں لڑائی شروع کرنے کے بعد اس کے خطرناک نتائج کو سمجھ جائے اور مذہبی مقام سے نکل کر دوسری جگہ کو میدان جنگ بنالے تو مسلمانوں کو اس بہانہ سے اُن کے مذہبی مقاموں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیئے کہ اسجگہ پر پہلے ان کے دشمنوں نے لڑائی شروع کی تھی بلکہ فوراً ان مقامات کے ادب اور احترام کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے حملہ کا رُخ بدل دینا چاہیئے ۔

۱۰۷ تفسیر:- فرماتا ہے چونکہ کفار تم سے لڑائی شروع کر چکے ہیں اسلئے تم بھی اُس وقت تک لڑائی جاری رکھو جب تک کہ دین میں دخل اندازی کرنے کے طریق کو وہ چھوڑ نہ دیں - اور یہ تسلیم نہ کرلیں کہ دین کا معاملہ صرف اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس میں جبر کرنا کسی انسان کے لئے جائز نہیں۔ اگر وہ یہ طریق اختیار کرلیں اور دین میں دخل اندازی سے باز آجائیں تو فوراً لڑائی بند کر دو کیونکہ سزا صرف ظالموں کو دی جاتی ہے اور اگر وہ اس قسم کے ظلم سے

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ

حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ میں ہے۔ اور سب (ہی) عزت والی چیزوں (کی ہتک) کا بدلہ لیا جاتا ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى

اس لئے جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اُس پر (اُسکی) زیادتی کا جس قدر کہ اُس نے تم پر زیادتی کی ہو

باز آ جائیں تو پھر اُن سے لڑائی کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے اَلْفِتْنَةُ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ مگر اسجگہ صرف فِتْنَةٌ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں فتنۂ کفار اور قتال کا مقابلہ کرنا تھا۔ پس معرفہ لانا ضروری تھا اور اسجگہ مقابلہ نہ تھا پس نکرہ لایا گیا تاکہ عظمتِ فتنہ پر دلالت کرے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تم اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک کہ یہ عظیم الشان فتنہ دُور نہ ہو جائے۔

بعض لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ تم یہاں تک لڑو کہ کفر باقی نہ رہے۔ لیکن یہ معنے غلط ہیں۔ اسجگہ فتنہ سے مراد کفر نہیں بلکہ دین میں دخل اندازی ہے جس کا سورۃ الحج کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۚ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (سورۃ حج آیت ۴۰، ۴۱) یعنی اِس لئے کہ مسلمانوں پر ظلم کیا گیا اُن مسلمانوں کو جن سے دشمن نے لڑائی شروع کر رکھی ہے آج جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یقیناً اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ ہاں ان مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جن کو ان کے گھروں سے بغیر کسی جرم کے نکال دیا گیا۔ اُن کا صرف اتنا ہی جرم تھا (اگر یہ کوئی جرم ہے) کہ وہ کہتے تھے اللہ ہمارا رب ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض ظالم لوگوں کو دوسرے عادل لوگوں کے ذریعہ سے ظلم سے روکتا نہ رہے تو گرجے عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں خدا تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ظالموں کے ہاتھ سے تباہ ہو جائیں۔ پس دنیا میں مذہب کی آزادی قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ مظلوموں کو اور ایسی قوموں کو جن کے خلاف دشمن پہلے جنگ کا اعلان کر دیتا ہے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ لڑائی صرف اُس وقت تک جاری رکھنی چاہیئے جب تک فتنہ باقی رہے۔ یعنی لوگ تبدیلِ مذہب کے لئے ایک دوسرے کو مجبور کرتے رہیں۔ اگر یہ حالات بدل جائیں مذہبی دست اندازی ختم ہو جائے اور دین کے معاملہ کو صرف ضمیر کا معاملہ قرار دیا جائے تو خواہ دشمن حملہ میں ابتداء کر چکا ہو سوائے دفاع کے اس کے ساتھ لڑائی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہؓ کرام نے بھی اس آیت کے یہی معنے سمجھے ہیں۔ چنانچہ بخاری میں آتا ہے کہ ایک شخص اس زمانہ میں جبکہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے درمیان جنگ جاری تھی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس آکر کہنے لگا کہ آپ حضرت علیؓ کے زمانہ کی جنگوں میں کیوں شامل نہیں ہوتے حالانکہ قرآن کریم میں صاف حکم موجود ہے کہ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ انہوں نے جواب دیا کہ فَعَلْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ الْاِسْلَامُ قَلِيْلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِيْ دِيْنِهٖ. اِمَّا قَتَلُوْهُ وَ اِمَّا يُعَذِّبُوْهُ حَتّٰى كَثُرَ الْاِسْلَامُ

عَلَيْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

بدلہ لے لو ۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ اللہ یقیناً متقیوں کے ساتھ (ہوتا) ہے ۔ ۱۰۸

اِعْتَدُوْا

فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ ۔ (بخاری کتاب التفسیر) یعنی ہم نے یہ حکم رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پورا کر دیا ہے ۔ جبکہ اسلام بہت قلیل تھا اور آدمی کو اُس کے دین کی وجہ سے فتنہ میں ڈالا جاتا تھا یعنی یا تو اُسے قتل کیا جاتا تھا یا عذاب دیا جاتا تھا ۔ یہاں تک کہ اسلام پھیل گیا ۔ پھر کسی کو فتنہ میں نہیں ڈالا جاتا تھا ۔ اِس سے صاف معلوم ہُوا کہ اُن کے نزدیک فتنہ نہ رہنے سے یہ مراد ہے کہ لوگ دینی معاملات میں جبر و اکراہ سے کام نہ لیں اور محض دین قبول کرنے کی وجہ سے نہ کسی کو قتل کریں ۔ اور نہ کسی قسم کا اور عذاب دیں ۔ اگر یہ معنے نہ ہوتے تو فَاِنِ انْتَهَوْا کیوں آتا ۔ کیونکہ یہ تو لوگوں کے بتائے ہوئے معنوں کے خلاف پڑتا ہے اور ہمارے معنوں کے مطابق ہے ۔

وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ کے الفاظ نے بھی مذکورہ بالا حصہ کی تشریح کر دی اور بتا دیا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دین کا اختیار کرنا اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو جائے اور اس کے متعلق کسی اور کا ڈر نہ ہو ۔ گویا دین کے اختیار کرنے کے بارے میں ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہو جائے ۔ اور اگر لوگ مسلمان ہونا چاہیں تو بغیر کسی خوف کے ہو سکیں ۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں جبر کی تعلیم نہیں دی گئی ۔ اگر جبر کی تعلیم ہوتی اور اُس وقت تک جنگ جاری رکھنا ضروری ہوتا جب تک تمام لوگ مسلمان نہ ہو جائیں تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کبھی مشرکوں سے صلح کے معاہدات نہ کرتے ۔ پس یہ کہنا کہ اِس آیت کے معنے یہ ہیں کہ مشرکوں سے اُس وقت تک لڑائی جاری رکھو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور کفر اور شرک مٹ نہ جائے بالکل غلط ہے ۔

اَلْحَرَامُ

۱۰۸ حل لغات : ۔ اَلْحَرَامُ کے معنے ہیں اَلْمَمْنُوْعُ مِنْهُ ۔ جس چیز سے روکا گیا ہو (مفردات)

اِعْتَدُوْا عَلَيْهِ : عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ کسی فعل کے بدلہ کے لئے بھی وہی لفظ بولا جاتا ہے جو اس فعل کے لئے بولا جائے ۔ چنانچہ صاحب مفردات نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اَیْ قَابِلُوْهُ بِحَسْبِ اِعْتِدَائِهٖ وَ تَجَاوَزُوْا اِلَيْهِ بِحَسْبِ تَجَاوُزِهٖ ۔ یعنی اس کے معنے یہ ہیں کہ اُسکی زیادتی کے مقابلہ میں اُس کی زیادتی کے مطابق ہی سلوک کرو ۔

اس کا مفصل ذکر اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (بقرہ آیت ۱۶) میں گذر چکا ہے ۔ اسجگہ بھی جُرم کیلئے جو لفظ بولا گیا ہے وہی سزا کے لئے لایا گیا ہے ۔ پس اس کے معنے ظلم کے نہیں بلکہ ظلم کی سزا کے ہیں ۔

تفسیر : ۔ اس میں بتایا کہ اگر کفار حرمت والے مہینوں یعنی ذوالقعدہ ۔ ذوالحجہ ۔ محرّم اور رجب کا پاس کریں تو تم بھی کرو ۔ اور اگر وہ نہ کریں ۔ تو تمہارے لئے مجبوری ہے تم بھی مقابلہ میں اس وقت تک جنگ کر سکتے ہو جب تک کہ وہ اس سے باز نہ آجائیں ۔

وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۔ اِس میں اصولی طور پر تعلیم دی کہ جن چیزوں میں حرمت پائی جاتی ہے اُن میں بھی قصاص کا طریق اختیار کیا جا سکتا ہے ۔ یہ نہیں کہ کسی چیز کی حرمت قصاص کو بالکل باطل کر دے ۔ چنانچہ آگے اس کی تشریح کر دی اور صاف طور پر فرمایا کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ یعنی اگر وہ تم پر زیادتی کریں اور تمہارے مقدس مقامات کا پاس نہ کریں تو تمہارے لئے بھی جائز ہے کہ تم اُن کی شرارت اور زیادتی کے مطابق انہیں سزا دو ۔ اور ان کے کسی مقام کی تقدیس کی پروا نہ کرو کیونکہ انہوں نے خود حرمت کو توڑا ہے ۔ مگر ساتھ ہی فرمایا کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

وَ اَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَ اَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (۱۹۶)

اور اللہ کے راستے میں (مال و جان) خرچ کرو۔ اور اپنے ہی ہاتھوں (اپنے آپ) کو ہلاکت میں مت ڈالو اور احسان سے کام لو اللہ (تعالیٰ) احسان کرنے والوں سے یقیناً محبت کرتا ہے۔ ۱۰۹

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جائز حد سے تجاوز نہ کرو۔ اور اس حقیقت کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یعنی حرمات کی ہتک کا بدلہ لینے کی تو تمہیں اجازت ہے۔ مگر تقویٰ کا بلند مقام یہ ہے کہ تم اس حکم کو اپنے سامنے رکھو کہ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ یعنی جو شخص دشمن کو معاف کر دے۔ اور اس کی معافی کے نتیجہ میں دوسرے کی اصلاح ہوتی ہو تو وہ یقیناً ایک مستحسن کام کرتا ہے۔ اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں بعض دفعہ جزائے جرم کے لئے بھی وہی لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے جو نفس جرم کے متعلق استعمال ہوا ہو۔ اسی قاعدہ کے مطابق یہاں فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْكُمْ کہا گیا ہے جس کے لفظی معنے تو یہ ہیں کہ جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ تم پر کی گئی ہے۔ مگر مراد زیادتی کا بدلہ لینا ہے (اسکی تفصیل کیلئے دیکھیں تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۱۵۶)

۱۰۹ تفسیر۔ اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاں کوئی تکلیف پیش آتی ہے وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے والی بات ہے ہم اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں۔ حالانکہ اس کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ جہاں موت کا ڈر ہو وہاں سے مسلمان کو بھاگ جانا چاہیئے اور اُسے بزدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب دشمن سے لڑائیاں ہو رہی ہوں تو اس وقت اپنے مالوں کو خوب خرچ کرو۔ اگر تم اپنے اموال کو روک لوگے تو اپنے ہاتھوں اپنی موت کا سامان پیدا کر دو گے۔ چنانچہ احادیث میں حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے مروی ہے کہ انہوں نے اس وقت جب کہ وہ قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے کہا کہ یہ آیت ہم انصار کے بارہ میں نازل ہوئی تھی اور پھر انہوں نے بتایا کہ پہلے تو ہم خدا تعالیٰ کے رستہ میں اپنے اموال خوب خرچ کیا کرتے تھے۔ لیکن جب خدا تعالیٰ نے اپنے دین کو تقویت اور عزت دی اور مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا تو قُلْنَا هَلْ نُقِیْمُ فِیْٓ اَمْوَالِنَا وَنُصْلِحُهَا (ابو داؤد جلد اوّل کتاب الجہاد) ہم نے کہا کہ اگر اب ہم اپنے مالوں کی حفاظت کریں اور اُسے جمع کریں تو یہ اچھا ہوگا۔ اس وقت یہ آیت اُتری کہ اللہ تعالیٰ کے رستہ میں اپنے اموال خرچ کرنے سے دریغ نہ کرو۔ کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تم اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہو۔ پس اپنے مالوں کو جمع نہ کرو۔ بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے رستہ میں خوب خرچ کرو۔ ورنہ تمہاری جانیں ضائع چلی جائیں گی۔ دشمن تم پر چڑھ آئیں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

وَاَحْسِنُوْا اور اپنے فرائض کو عمدگی سے ادا کرو یا اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مالی وسعت عطا فرمائی ہے تو اپنے نادار اور غریب بھائیوں کے اخراجات بھی برداشت کرو۔ اور نیکی کی نئی سے نئی راہیں تلاش کرتے رہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا

اور حج اور عمرہ کو اللہ (کی رضا) کے لئے پورا کرو۔ پھر اگر تم (کسی سبب سے حج اور عمرہ سے) روکے

اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى

جاؤ تو جو قربانی میسّر آئے (ذبح کرو) اور جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر (نہ) پہنچ جائے

يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ

اپنے سر نہ مونڈو۔ اور جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا

بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ

اپنے سر کی بیماری کی وجہ) سے اُسے تکلیف (پہنچ رہی) ہو (اور وہ سر منڈوالے) اُس پر (اس وجہ سے) روزوں یا صدقہ

اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ وقفۃ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ

یا قربانی کی قسم سے کچھ فدیہ (واجب) ہوگا۔ پھر جب تم امن میں آجاؤ۔ تو اُس وقت جو شخص عمرہ کا فائدہ (ایسے) حج کے ساتھ (ملا کر)

نیکی کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

پھر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غرباء کی امداد کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ تم زکوٰۃ اور عُشر وغیرہ مقررہ ٹیکس بھی دو مگر اس کے علاوہ ہم تم سے بعض طوعی ٹیکس بھی مانگتے ہیں۔ چنانچہ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ ہمیشہ غرباء کی امداد کے لئے روپیہ دیتے رہو۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ اور اپنے نفسوں کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ یعنی اے مالدارو! اگر تم اپنے زائد مال خوشی سے نہ دوگے تو وہ تو زائد ہی ہیں تم کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچیگا۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کروگے تو ہلاک ہو جاؤگے۔ یہ الفاظ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے زارِ روس کے ساتھ ہونے والے واقعات کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اگر ایسا نہ کروگے تو جو کچھ زارِ روس اور روسی امراء یا فرانس کے امراء کا حال ہوا وہی تمہارا ہوگا۔ آخر عوام ایک دن تنگ آکر لوٹ مار پر اُتر آئیں گے۔ اور شاہپوری محاورہ کے مطابق دُعائے خیر پڑھ دیں گے۔ حضرت خلیفۃ اوّل رضی اللہ تعالیٰ عنہ اِس محاورہ کی تشریح یہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے علاقے میں کچھ مدت پہلے زمیندار بنیئے سے قرض لیتے جاتے تھے اور بنیا بھی دیتا چلا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو انہیں اِس کا احساس نہ ہوتا۔ مگر جب سب علاقہ اُس بنیئے کا مقروض ہو جاتا اور زمینداروں کی سب آمد اس کے قبضہ میں چلی جاتی تو یہ دیکھ کر اُس علاقے کا کوئی بڑا زمیندار تمام چودھریوں کو اکٹھا کرتا اور کہتا کہ بتاؤ اِس بنیئے کا قرض کتنا ہے۔ وہ بتاتے کہ اتنا قرض ہے۔ اِس پر وہ دریافت کرتا کہ اچھا پھر اس قرضے کے اُترنے کا کوئی ذریعہ ہے یا نہیں۔ وہ جواب دیتے کہ ہمیں تو کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ اِس پر وہ کہتا کہ اچھا تو پھر "دُعائے خیر پڑھ دو"۔ چنانچہ وہ سب دُعائے خیر پڑھ دیتے۔ اور اس کے بعد ہتھیار لے کر بنیئے کے مکان

إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ

اٹھائے تو جو قربانی بھی آسانی سے مل سکے (کردے) اور جو (کسی قربانی کی بھی توفیق)

لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ

نہ پائے (اس پر) تین دن کے روزے ہے تو حج (کے دنوں) میں واجب ہونگے اور

سَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ

سات (روزے) جب (اے مسلمانو!) تم (اپنے گھروں کو واپس (لوٹ) آؤ۔ یہ پورے دس ہوئے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي

یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

مسجد حرام کے پاس رہنے والے نہ ہوں۔ اور تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سمجھ لو کہ

کی طرف چل پڑتے اور اُسے قتل کر دیتے اور اُس کے بیوی بچے سب جلا دیتے۔

اللہ تعالیٰ اس آیت میں ایسی ہی حالت کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ دیکھو ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس زائد مال ہو تو اُسے خدا تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر دیا کرو۔ اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی بے شک کماؤ تو خوشی سے مگر اس دولت کو اپنے گھر میں جمع نہ رکھا کرو۔ ورنہ کسی دن لوگ تمہارے خلاف اُٹھ کھڑے ہونگے۔ اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَأَحْسِنُوْا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم تمہیں یہ حکم دیتے ہیں کہ تم نیکی کرو۔ اور وہ اس طرح کہ تم خود اپنی ضرورتوں کو کم کر کے اور مال بچا کر خدا تعالیٰ کی راہ میں دے دیا کرو۔ مگر یاد رکھو کہ یہ عمل تم لوگوں سے ڈر کر نہ کرو بلکہ خوشی سے کرو۔ اگر تم ڈر کر کرو گے تو غریبوں کی مدد تو ہو جائے گی مگر خدا تعالیٰ خوش نہیں ہوگا۔ لیکن اگر خوشی سے یہ قربانی کرو گے تو غریب بھی خوش ہونگے۔ تم بھی ہلاکت سے بچ جاؤ گے اور خدا تعالیٰ بھی تم پر خوش ہوگا۔

پھر فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ پھر ہماری کمائی کا صلہ ہم کو کیا ملا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا صلہ مال سے زیادہ ملیگا۔ اور وہ تمہارے پیدا کرنیوالے خدا کی محبت ہے۔ تمہاری دنیا کے ساتھ تمہاری عاقبت بھی درست ہو جائیگی۔

یہ معنے تو سیاقِ کلام کے لحاظ سے ہیں لیکن اس کے ایک معنے صرف اس ٹکڑۂ آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ہیں کہ عبادات میں یا کھانے پینے میں یا محنت و مشقت میں یا صفائی و طہارت میں کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۱۹۷)

اللہ کی سزا یقیناً سخت (ہوتی) ہے۔ ۲۱۰

جس کا نتیجہ تمہاری صحت یا تمہاری جان یا تمہاری عقل یا تمہارے اخلاق کے حق میں بُرا نکلے۔ تَهْلُكَة کا لفظ جو اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے استعمال کیا ہے اس کے معنے کسی ایسے فعل کے ہوتے ہیں جس کا انجام ہلاکت ہو۔ اور نتیجہ بُرا نکلے۔ پس اس لفظ کے استعمال کرنے سے قرآن کریم نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ اسلام دین یا عزت یا تمدن کی حفاظت کے لئے انسان کو اپنی جان خطرہ میں ڈالنے سے نہیں روکتا بلکہ ایسے کاموں سے روکتا ہے جن کا کوئی نیک نتیجہ برآمد ہونے کی امید نہ ہو۔ اور جن میں انسان کی جان یا کسی اور مفید شے کے بلا وجہ برباد ہونیکا خطرہ ہو۔

۲۱۰ تفسیر:۔ یہاں سے حج اور عمرہ کے احکام کا آغاز ہوتا ہے۔ حج اسلامی ارکان میں سے ایک اہم رُکن ہے۔ اور ہر شخص جو بیت اللہ کا حج کرنا چاہے۔ اُس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ میقات پر پہنچنے کے بعد احرام باندھے۔ میقات اُن مقامات کو کہتے ہیں جہاں پہنچنے پر اسلامی ہدایات کے مطابق حاجیوں کو احرام باندھنا پڑتا ہے۔ مدینہ منورہ کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذوالحلیفہ شام کی طرف سے آنے والوں کے لئے جُحفہ۔ عراق کی طرف سے آنے والوں کے لئے ذاتِ عرق۔ نجد کی طرف سے آنیوالوں کے لئے قرن المنازل اور یمن کی طرف سے آنے والوں کیلئے یلملم میقات مقرر ہیں۔ پاکستان سے جانے والوں کے لئے یلملم ہی میقات ہے اور حاجیوں کو جہاز میں ہی احرام باندھنا پڑتا ہے۔ جو لوگ ان میقات کے اندر رہتے ہوں انہیں احرام کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی اپنی جگہوں سے ہی احرام باندھ سکتے ہیں۔ احرام کا طریق یہ ہے کہ انسان حجامت بنوا کر غسل کرے۔ خوشبو لگائے۔ اور اس کے بعد سِلے ہوئے کپڑے اتار کر ایک چادر تہہ بند کے طور پر کمر سے باندھ لے اور دوسری چادر جسم کے اوپر اوڑھ لے۔ سر کو ننگا رکھے اور دو رکعت نفل پڑھے اور اس کے بعد اپنے اوقات کا اکثر حصہ تکبیر و تلبیہ اور تسبیح و تحمید میں بسر کرے اور بار بار لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ کہتا رہے۔ ہر نماز کے بعد خصوصیت کے ساتھ بلند آواز کے ساتھ تلبیہ کہنا چاہیے۔ محرم کیلئے سِلے ہوئے کپڑے یعنی قمیص شلوار پاجامہ یا کوٹ وغیرہ پہننا۔ سر کو ڈھانپنا۔ جرابیں پہننا۔ خوشبو لگانا۔ خوشبودار رنگوں سے رنگے ہوئے کپڑے پہننا۔ سر منڈوانا ناخن اتارنا۔ جوئیں نکالنا یا انکو مارنا۔ جنگل کے کسی جانور کا شکار کرنا۔ شکار کے جانور کو ذبح کرنا۔ کسی کو شکار کے لئے کہنا یا کسی شکاری کی مدد کرنا۔ شہوانی تعلقات قائم کرنا یا شہوانی گفتگو کرنا۔ فحش کلامی کرنا یا فحش اشعار پڑھنا فسق و فجور اور لڑائی جھگڑے میں حصہ لینا۔ یہ سب امور ناجائز ہوتے ہیں۔ البتہ محرم غسل کر سکتا ہے۔ کپڑے دھو سکتا ہے اور دریائی جانور کا شکار بھی کر سکتا ہے۔ محرم عورت کے لئے بھی ان ہدایات کی پابندی ضروری ہے۔ البتہ اُسے بے سلے کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں۔ اُسے اپنا معمولی لباس یعنی قمیص پاجامہ اور دوپٹہ ہی رکھنا چاہیے۔ البتہ وہ برقعہ نہیں اوڑھ سکتی۔

جب حاجی حدودِ حرم میں داخل ہو (یعنی مکہ معظمہ اور اُس کے اردگرد کے علاقہ میں جو حرم کہلاتا ہے) تو وہ آدابِ حرم کو ملحوظ رکھے۔ اور جب بیت اللہ پر پہلی مرتبہ نظر پڑے تو اللہ تعالیٰ کے حضور فوراً دُعا کیلئے اپنے ہاتھ

اُٹھا دے کیونکہ وہ قبولیتِ دُعا کا خاص وقت ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب بیت اللہ کے پاس پہنچے تو حجرِ اسود سے خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرے۔ طواف کرتے ہوئے اگر ممکن ہو تو ہر دفعہ حجرِ اسود کو بوسہ دینا چاہیئے۔ اور اگر ممکن نہ ہو تو صرف ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کر دینا بھی کافی ہے۔ طواف سے فارغ ہونے کے بعد دو رکعت نفل پڑھے اور پھر صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ چکر لگائے صفا سے مروہ تک ایک چکر شمار ہو گا اور مروہ سے صفا تک دوسرا۔ پھر مکہ معظمہ میں ٹھہر کر ایامِ حج کا انتظار کرے جب ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ ہو تو وہ مکہ سے منیٰ چلا جائے اور وہاں پانچوں نمازیں پڑھے۔ پھر وہاں دوسری صبح نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد عرفات کی طرف ایسے وقت میں چلے کہ وہاں بعد زوال داخل ہو اور ظہر و عصر کی نمازیں وہاں جمع کر کے ادا کرے اور سورج کے ڈوبنے تک عرفات میں ہی رہے اور دعاؤں اور عبادت میں اپنا وقت گزارے اس کے بعد مزدلفہ مقام میں آئے۔ جہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کر کے پڑھے اور وہاں رات بھر عبادت اور دُعاؤں میں بسر کرے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سورج نکلنے سے پہلے مشعر الحرام پر جا کر دُعا کرے۔ اور وہاں سے سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہو کر منیٰ پہنچے اور وہاں جا کر جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں مارے اور ہر دفعہ کنکر پھینکنے کے ساتھ ساتھ تکبیر کہے۔ مگر یہ کام سورج نکلنے کے بعد کرے۔ یہاں سے فارغ ہو کر قربانی کرے۔ سر منڈوائے اور پھر اُسی دن شام تک یا اگلے دن مکہ مکرمہ جا کر خانہ کعبہ کا طواف کرے۔ افضل یہ ہے کہ اُسی دن شام تک جا کر کعبہ کا طواف کر آئے۔ پھر دوسرے دن منیٰ میں واپس آ جائے اور بعد زوال جمرۃ الدنیا۔ جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ العقبہ پر سات سات پتھر مارے۔ اسی طرح تیسرے دن اور پھر چوتھے دن بھی جو ایامِ تشریق کہلاتے ہیں یعنی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں ذوالحج کو تیرھویں تاریخ کو منیٰ سے واپس آ جائے۔ اور بیت اللہ کا طواف الوداع کرے۔ جو شخص یہ تمام مناسک بجا لائے وہ فریضۂ حج ادا کر لیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے حضور سُرخرو ہو جاتا ہے۔

عمرہ بھی یہی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حرم کے اندر رہنے والا ہو تو وہ حرم سے اور اگر باہر کا ہو تو میقات سے احرام باندھے۔ خانہ کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے اور پھر حلق یا قصر کر دے۔ اور اگر قربانی کرنا چاہے تو قربانی بھی کر دے۔ لیکن عمرہ میں قربانی لازمی نہیں ہوتی۔ حج اور عمرہ میں یہ فرق ہے کہ عمرہ کے لئے کسی خاص وقت یا مہینہ کی قید نہیں بلکہ وہ سال کے ہر حصہ میں ہو سکتا ہے۔ جبکہ حج صرف شوال۔ ذوالقعدہ اور ذوالحج میں ہی کیا جا سکتا ہے ترمذی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عمرہ کے متعلق پوچھا کہ اَوَاجِبَۃٌ؟ کیا عمرہ واجب ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ لَا وَاِنْ تَعْتَمِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ عمرہ واجب تو نہیں۔ لیکن اگر تم عمرہ کرو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ۔

اس میں بتایا کہ اگر حج یا عمرہ کرنے والا کوئی شخص بیماری کی وجہ سے یا جنگ کی وجہ سے یا کسی اَور وجہ سے راستہ میں ہی روک دیا جائے اور وہ مکہ مکرمہ جا کر حج یا عمرہ نہ کر سکے تو پھر جو قربانی بھی میسّر آئے اُسے دے دینی چاہیئے اور اُس وقت تک احرام نہیں کھولنا چاہیئے جب تک کہ قربانی محلّہٗ نہ پہنچ جائے۔ یعنی اس جگہ پر جہاں قربانی نے ذبح ہونا ہے۔ ابن القاسم کا قول ہے کہ اگر قربانی ساتھ ہو تب قربانی دے ورنہ نہیں۔ اور جمہور کا قول ہے کہ جس جگہ روکا جائے وہیں قربانی کر دے اور سر منڈوا دے

جو سب سے آخری عمل ہے اس کے بعد احرام کھول دیا جاتا
ہے (بحر محیط جلد ۲ صفحہ ۷۳) امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک
بھی محلّہ سے مراد وہی جگہ ہے جہاں حاجی کو روک دیا
گیا ہو لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرم ہے۔

میرے نزدیک یہ جھگڑا فضول ہے۔ کیونکہ اگر تو
جنگ ہو اور دشمن نے اُسے روکا ہو تو وہ اُس کی قربانی
کو آگے کیسے جانے دیگا۔ ایسی صورت میں وہ جہاں روکا
جائے وہیں قربانی کرکے حلق کر دے۔ لیکن اگر بیماری کے
سبب سے حاجی کو روکا گیا ہو اور قربانی آگے بھجوا سکتا
ہو تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قربانی کے حرم پہنچنے تک
سر نہ منڈوائے اور کوشش کرے کہ وہ حرم کے اندر ہی
ذبح ہو۔ اس کے بعد حلق کر دے۔ ضمنی طور پر اس آیت میں اس
بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا کہ ایک وقت آنے والا ہے
جب مسلمانوں کو بیت اللہ کی زیارت سے جبراً روک دیا جائیگا
لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُن کو کفار پر فتح عطا
فرمائیگا۔ اور وہ امن سے حج بیت اللہ کر سکیں گے۔ چنانچہ صلح
حدیبیہ میں ایسا ہی ہوا۔ باوجود اس کے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ
وآلہٖ وسلم صرف طواف کی نیت سے تشریف لے گئے تھے۔ قریش
نے اطلاع ملنے پر چیتوں کی کھالیں پہن لیں اور اپنی بیویوں اور بچوں
کو ساتھ لے لیا اور قسمیں کھائیں کہ وہ مر جائیں گے مگر آپ کو
مکہ میں داخل نہیں ہونے دینگے۔ آخر یہ معاہدہ طے پایا کہ اس
سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے جائیں اور اگلے
سال آکر طواف کریں۔ چنانچہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
اور تمام صحابہؓ واپس چلے گئے مگر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا
کہ مکہ فتح ہو گیا۔ اور مسلمان آزادی کے ساتھ آنے جانے لگے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔ فرماتا ہے۔
اگر کوئی شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف
ہو جس کی وجہ سے اُسے سر منڈوانا پڑے۔ جیسے اُس کے
سر میں جوئیں پڑ جائیں یا پھوڑے نکل آئیں تو وہ سر منڈوا
سکتا ہے۔ مگر اس صورت میں اسے صیام یا صدقہ یا قربانی
کا فدیہ دینا پڑے گا۔ قرآن کریم نے فدیہ کی تینوں اقسام کو
غیر معیّن رکھا ہے۔ مگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے
ایک ارشاد سے اس کی تعیین ہو جاتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے
کہ کعب بن عجرہؓ ایک صحابی تھے۔ اُن کے سر میں جوئیں پڑ گئیں
اور اُن کی اتنی کثرت ہو گئی کہ جوئیں اُن کے منہ پر گرتی تھیں
وہ کہتے ہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھکر
فرمایا۔ اے کعب! تجھے ان جوؤں کی وجہ سے بہت تکلیف
ہے۔ تو سر منڈوا دے اور صُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ اَوْ
اَطْعِمْ سِتَّةَ مَسَاكِيْنَ اَوْ اُنْسُكْ شَاةً۔ تو فدیہ
کے طور پر تین دن کے روزے رکھ لے یا چھ مسکینوں کو کھانا
کھلا دے یا ایک بکری کی قربانی دے دے۔

میرے نزدیک اس آیت میں جو فدیہ کی ترتیب ہے
امارت اور غربت کے لحاظ سے ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص غریب
ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے۔ اگر متوسط درجہ کا ہو
تو چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے اور اگر مالدار ہو تو قربانی دیدے۔
بہر حال قربانی مقدم ہے اور اس کے بعد صدقہ ہے اور اُس کے
بعد روزے ہیں۔ اور یہ ترتیب درجہ کی بلندی کے لحاظ سے
ہے۔ یعنی ادنیٰ فدیہ یہ ہے کہ تین دن کے روزے رکھے۔ اس
سے اعلیٰ فدیہ یہ ہے کہ چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اور اُس
سے اعلیٰ فدیہ یہ ہے کہ ایک قربانی دے دے۔ اور یہ حکم محصر
کیلئے نہیں بلکہ محصر اور غیر محصر دونوں کے لئے ہے۔ محصر کا حکم
مَحِلَّهٗ تک ختم ہو گیا ہے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ فرماتا ہے جب جنگ ختم
ہو جائے یا دوسری روکاوٹیں دُور ہو جائیں تو اُس کے بعد
جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر فائدہ اٹھائے اور قران یا
تمتع کرے تو جو قربانی بھی آسانی سے میسر آسکے کر دے۔

حج اور عمرہ کے الگ الگ ادا کرنے کا ذکر تو پہلے آ چکا ہے۔ اب دونوں اکٹھے ادا کرنے کا ذکر فرماتا ہے۔ میرے نزدیک اسجگہ تمتع سے اصطلاحی تمتع مراد نہیں بلکہ قِران اور تمتع دونوں مراد ہیں۔ اور تمتع کے معنے لغوی ہیں یعنی فائدہ اُٹھانے۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ مکہ مکرمہ میں لوگ چار رنگ میں جاتے ہیں۔ اوّل صرف حج کے لئے۔ دوم صرف عمرہ کے لئے۔ سوم تمتع کے لئے۔ چہارم قِران کے لئے۔ تمتع اور قِران دونوں میں قربانی واجب ہے۔ لیکن حج اور عمرہ میں نہیں۔ اسی طرح عمرہ تو سال کے دوران میں ہر وقت ہو سکتا ہے اور حج سال میں صرف ایک ہی دفعہ مقررہ ایام میں ہو سکتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص صرف عمرہ کے لئے جائے یا صرف حج کے لئے جائے اور عمرہ کی نیت نہ ہو تو یہ امر اس کے حالات پر منحصر ہے کہ وہ قربانی کرے یا نہ کرے۔ لیکن قِران جس میں عمرہ اور حج دونوں کی نیت ہوتی ہے اس میں قربانی واجب ہوتی ہے۔ قِران یہ ہے کہ ابتداء میں انسان میقات سے احرام باندھ کر حج اور عمرہ دونوں کی اکٹھی نیت کرے اور مکہ معظمہ پہنچ کر عمرہ کے احکام بجا لائے اور جب تک حج سے فارغ نہ ہو احرام نہ کھولے۔ بعض کے نزدیک اُسپر ایک سعی اور ایک طواف ہے اور بعض کے نزدیک دو طواف اور دو سعی۔ اور جب لوٹنا چاہے تو طواف وداع کرے۔ اس میں عمرہ کے بعد اُس وقت تک احرام نہیں کھولا جاتا جب تک کہ حج نہ ہو جائے۔ حج کرنے کے بعد احرام کھولا جاتا ہے۔ لیکن اگر تمتع کی نیت سے جائے تو اشہر الحج میں عمرہ کی نیت کر کے میقات سے احرام باندھے اور مکہ میں داخل ہو پہلے طواف کرے پھر سعی کرے۔ پھر حلق یا قصر کرے اور جب عمرہ ہو چکے تو احرام کھول دے اور ذوالحج کی آٹھویں تاریخ کو حج کے لئے پھر نیا احرام باندھے اور حج کرے۔ اس میں بھی قربانی واجب ہے۔ اس میں عمرہ کرنے کے بعد احرام کھول دیا جاتا ہے اور حج کے لئے نئے سرے سے احرام باندھا جاتا ہے۔ غرض قِران اور تمتع دونوں میں قربانی واجب ہے۔ لیکن اکیلے عمرہ یا حج میں واجب نہیں بلکہ مستحب ہے۔ اور اگر ان میں سے کسی کی نیت کر کے جائے اور کسی وجہ سے روکا جائے تو اُس پر قربانی واجب ہوگی اور جب تک قربانی ذبح نہ ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ سر نہ منڈوائے۔ ہاں اگر قربانی مکہ مکرمہ میں پہنچ سکتا ہو تو بھجوا دے اور پھر جب تک قربانی وہاں پہنچ نہ جائے اس وقت تک سر نہ منڈائے۔

غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمتع اور قِران کی خصوصیات جو خالی حج اور خالی عمرہ کے مقابلہ میں ہیں بیان فرمائی ہیں۔ اور فَاِذَآ اَمِنْتُمْ کے الفاظ اس لئے بڑھائے ہیں کہ اس حکم کو پہلے حکم کا حصہ نہ سمجھ لیا جائے۔ اس حکم کو احصار کے ذکر کے بعد اس لئے بیان کیا کہ اس صورت میں بلا احصار قربانی ہونی چاہیئے اور حج اور عمرہ میں احصار سے قربانی ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ اسلئے اس کو احصار کے ذکر کے بعد بیان کیا۔ اسجگہ تمتع اور قِران کی یہ خصوصیات بیان کی گئی ہیں کہ ان میں قربانی ضروری ہوگی خواہ احصار نہ ہی ہوا ہو۔ اور جسے اس کی توفیق نہ ہو وہ جیسا کہ اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ تین دن کے روزے حج میں اور سات رجوع کے روزے واپس آکر رکھے۔

فرماتا ہے فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ (۱) بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ تین دن کے روزے ذوالحج کی ساتویں۔ آٹھویں اور نویں تاریخ کو رکھے جائیں (۲) حضرت امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر ان ایام میں روزے نہیں رکھیگا تو اُسپر قربانی بھی واجب ہوگی۔ (۳) بعض کہتے ہیں کہ یہ روزے چونکہ قربانی کے بدلہ میں ہیں اس لئے حج کے بعد رکھنے چاہئیں۔ (۴) بعض کہتے ہیں کہ یہ روزے واپسی سے پہلے مکہ میں ہی رکھنے چاہئیں (۵) بعض نے احرام عمرہ اور احرام حج کے درمیانی عرصہ میں روزے رکھنے کو کہا ہے۔ (بحر محیط جلد ۲ ص ۷۶)

میرے نزدیک یہ روزے ایام تشریق یعنی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں ذوالحجہ کو رکھنے چاہئیں اور فِي الْحَجِّ

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ

حج (کے مہینے سب کے) جانے بوجھے ہوئے مہینے ہیں - پس جو شخص ان میں حج (کا ارادہ) پختہ کرلے (اُسے یاد رہے کہ)

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَ

حج (کے ایام) میں نہ تو کوئی شہوت کی بات - نہ کوئی نافرمانی اور نہ کسی قسم کا جھگڑا کرنا (جائز) ہوگا - اور

سے مراد اسجگہ فِیْ اَیَّامِ الْحَجِّ ہے - باقی سات روزے گھر پر بھی رکھے جا سکتے ہیں - اس جگہ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کا فقرہ اس لئے زائد کیا گیا ہے کہ وَ سَبْعَةٍ کی جگہ اَوْ نہ سمجھ لیا جائے اور غلطی سے یہ معنے نہ کر لئے جائیں کہ وہاں رکھے تو تین رکھے اور گھر رکھے تو سات رکھے - اس لئے اللہ تعالےٰ نے آخر میں تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ فرما کر بتا دیا کہ صرف تین یا سات روزے رکھنا مراد نہیں بلکہ پورے دس روزے رکھنے مراد ہیں یا یہ الفاظ تاکید کے لئے استعمال کئے گئے ہیں - اور تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کے یہ معنے ہیں کہ یہ روزے ثواب یا قربانی کے قائم مقام ہونے کے لحاظ سے کامل فدیہ ہیں -

ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فرماتا ہے یہ حکم یعنی تمتع کا صرف باہر کے لوگوں کے لئے ہے کیونکہ اُن کو آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے - مکہ والے تو ہر وقت عمرہ کر سکتے ہیں اُن کے لئے تمتع یا قران نہیں ہے -

اس آیت کے بارہ میں مفسرین میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے (۱) بعض کہتے ہیں کہ قربانی نہ ملنے کی صورت میں روزوں کا حکم صرف آفاقیوں کے لئے ہے مکہ والوں کے لئے نہیں - کیونکہ وہ تو اپنے شہر میں ہی قربانی مہیا کر سکتے ہیں - یہ امام شافعی کا مذہب ہے - (۲) بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت روزوں کے متعلق ہے یعنی روزوں کا حکم اہل مکہ کے لئے نہیں بلکہ صرف باہر والوں کے لئے ہے - گویا انہوں نے صیام کو ذٰلِكَ کے ماتحت رکھا ہے - مگر میرے نزدیک یہ دونوں درست نہیں کیونکہ اس صورت میں مکہ والوں کو سہولت رہتی ہے

(۳) امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ اس سے تمتع اور قران والے احکام مراد ہیں جنکا ذکر فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ میں آچکا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ تمتع اور قران اہل مکہ کے لئے جائز نہیں - میرے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کے معنے زیادہ درست ہیں اور عقل بھی انہی کی تائید کرتی ہے - کیونکہ مکہ والے تو ہر وقت عمرہ کر سکتے ہیں -

اس کے بعد حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں بھی اختلاف ہے کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں (۱) حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے تمام اہل حرم مراد ہیں - (۲) عطاء کہتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہر جہت سے مواقیت کے اندر رہتے ہیں - (۳) زہری کہتے ہیں کہ ایک یا دو دن کے سفر تک رہنے والے مراد ہیں (۴) بعض کہتے ہیں کہ اس سے صرف اہل مکہ مراد ہیں اور یہی معنے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتے ہیں -

آخر میں فرمایا - وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو - یعنی حج کی عبادت محض اس غرض کے لئے ہے کہ تمہارے دلوں میں تقویٰ پیدا ہو - اور تم ماسوی اللہ سے تنفر ہٹا کر صرف اللہ تعالےٰ کو ہی اپنی ڈھال بنا لو - اگر حج بیت اللہ یا عمرہ سے کسی کو یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا کوئی مخفی کبر اس کے سامنے آگیا ہے اُسے چاہیئے کہ خلوت کے کسی گوشہ میں اپنے خدا کے سامنے اپنے ماتھے کو زمین پر رکھ دے اور جس قدر خلوص بھی اُس کے دل میں باقی رہ گیا ہو اُس کی مدد سے گریہ و زاری کرے کہ کم سے کم

مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ

نیکی (کا) جو (کام) بھی تم کرو گے اللہ (ضرور) اُس (کی قدر) کو پہچان لے گا۔ اور زادِ راہ (ساتھ) لو اور (یاد رکھو کہ)

خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۸﴾

بہتر زادِ راہ تقویٰ ہے اور اے عقلمندو! میرا تقویٰ اختیار کرو۔ ۱۱۱؎

گریہ و زاری کی شکل بنائے اور خدا تعالیٰ کے حضور جُھک کر کہے کہ اے میرے خدا! لوگوں نے بیج بوئے اور اُن کے پھل تیار ہونے لگے وہ خوش ہیں کہ اُن کے اور اُن کی نسلوں کے فائدہ کے لئے رُوحانی باغ تیار ہو رہے ہیں۔ پر اے میرے ربّ میں دیکھتا ہوں کہ جو بیج مَیں نے لگایا تھا اُس میں سے تو کوئی روئیدگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ نہ معلوم میرے کبر کا کوئی پرندہ اُسے کھا گیا یا میری دحشت کا کوئی درندہ اُسے پاؤں کے نیچے مسل گیا۔ یا میری مخفی شامتِ اعمال ایک پتھر بن کر اس پر بیٹھ گئی اور اُس میں سے کوئی روئیدگی نکلنے نہ دی۔ اے خدا! اب مَیں کیا کروں کہ جب میرے پاس کچھ تھا مَیں نے بے احتیاطی سے اُسے اِس طرح خرچ نہ کیا کہ نفع اٹھاتا۔ مگر آج تو میرا دل خالی ہے۔ میرے گھر میں ایمان کا کوئی دانہ نہیں کہ مَیں بو دُوں۔ اے خدا! میرے اس ضائع شدہ بیج کو پھر مہیا کر دے اور میری کھوئی ہوئی متاعِ ایمان مجھے واپس عطا کر۔ اور اگر میرا ایمان ضائع ہو چکا ہے تو تُو اپنے خزانے سے اور اپنے ہاتھ سے پنے اِس دھتکارے ہوئے بندہ کو ایک رحمت کا بیج عطا فرما تا کہ مَیں اور میری نسلیں تیری رحمتوں سے محروم نہ رہ جائیں اور ہمارا قدم ہمارے سچے اور اعلیٰ قربانی کرنیوالے بھائیوں کے مقام سے پیچھے ہٹ کر نہ پڑے بلکہ تیرے مقبول بندوں کے کندھوں کے ساتھ ساتھ ہمارے کندھے ہوں۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ میں اس طرف توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ہمیشہ خائف رہو اور اپنے تمام کاموں کی تقوی اللہ پر بنیاد رکھو ورنہ تمہارا پہلا ایمان بھی ضائع ہو جائیگا اور تم خدا تعالیٰ کی ناراضگی کے مورد بن جاؤ گے۔

۱۱۱؎ حل لغات:۔ رَفَثَ: مصدر ہے اور لانفیٔ جنس کے بعد واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ رَفَثَ سے مراد ہر ایسا کلام ہے جس کے اندر کوئی ایسی بات پائی جائے جسے عرف میں بُرا سمجھا جاتا ہو۔ (۲) ایسی بات جس کے اندر جماع یا اُس کے متعلقات کا ذکر ہو۔ (۳) جب اس کے بعد اِلٰی صلہ ہو تو اس وقت کنایہ کے طور پر اس کے معنے جماع کے لئے جاتے ہیں (مفردات) اور طبری نے کہا ہے۔ اَلرَّفَثُ:۔ اَللَّغْوُ مِنَ الْكَلَامِ (بحر محیط) رفث لغو اور بے ہودہ گفتگو کو بھی کہتے ہیں۔ *(حاشیہ: ۱ رَفَثَ)*

فُسُوْقَ: فَسَقَ کا مصدر ہے اور فسوق کے معنے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو ترک کر دینا (۲) نافرمانی (۳) سچے راستہ سے دوسری طرف جُھک جانا۔ (اقرب) *(حاشیہ: ۲ فُسُوْقَ)*

جِدَالَ: باب مفاعلہ سے مصدر ہے اور اس کے معنے جھگڑا کرنے کے ہیں۔ *(حاشیہ: ۲ جِدَالَ)*

زَادَ: جس چیز کو انسان بطور سفر خرچ اپنے ساتھ لے لے۔ *(حاشیہ: ۳ زَادَ)*

اِتَّقُوْنِ: امر جمع کا صیغہ ہے جو وَقٰی سے باب افتعال کے مضارع کے صیغہ سے بنا ہے۔ اِتِّقَاءٌ (مصدر) جب اللہ تعالیٰ کے لئے آئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کا مفعول ہو تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لینا۔ *(حاشیہ: اِتَّقُوْنِ)*

(حاشیہ: رفتا الفرض علیھم [illegible])

تفسیر:- اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ حج کے بارہ میں قرآن کریم نے کوئی نیا حکم نہیں دیا بلکہ اسی حکم کو قائم رکھا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس وجہ سے حج کے مہینے بھی سب لوگوں کو معلوم ہیں یعنی شوال۔ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ گو امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ذوالحجہ کے صرف دس دن اشہرالحج میں شامل ہیں۔ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ جو شخص ان مہینوں میں حج کو اپنے اوپر فرض کرکے چل پڑے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ اپنی زبان کو پاک رکھے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جو جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عشقیہ اشعار پڑھنا اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ایام حج میں جاہلیت کے اشعار پڑھے تھے۔ یہ روایت اگرچہ قرآن کریم کے اس واضح حکم کی موجودگی میں درست تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اگر مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے ایسا کیا تھا تو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے کس غرض کے ماتحت جاہلیت کے اشعار پڑھے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے دوران گفتگو میں کسی دلیل کے لئے پڑھے ہوں۔ اور سننے والوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ وہ شوقیہ طور پر اس قسم کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ بہرحال اس قسم کا کلام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اور ان دنوں کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اُسکی عبادت میں صرف کرنا چاہیئے۔ مگر اس ممانعت کے یہ بھی معنے نہیں کہ رفث۔ فسوق اور جدال دوسرے دنوں میں جائز ہے۔ بلکہ اس ممانعت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی ہے کہ اگر کچھ عرصہ تک انسان اپنے نفس پر دباؤ ڈال کر ایسے کام چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُسے دوسرے دنوں میں بھی اُن کو چھوڑنے کی توفیق مل جاتی ہے۔ کیونکہ مشق ہونے کی وجہ سے اس کے لئے سہولت پیدا ہو جاتی ہے بعض دفعہ بشری کمزوریوں کی وجہ سے انسان ایک لمبے وقت کے لئے کسی کام کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اُس کے اندر استعداد پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے کچھ وقت کے لئے اس کام سے روک دیا جائے۔ جب کچھ عرصہ تک رُکا رہتا ہے تو اُس کی ضبط کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ اور آہستہ آہستہ وہ کلی طور پر اس کام کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو چاہیئے کہ رمضان کے مہینہ میں اپنی کمزوریوں میں سے کسی ایک کمزوری پر غالب آنے کی کوشش کرے۔ اور مہینہ بھر اس سے بچتا رہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ رمضان کے بعد بھی اُسکی مدد کریگا۔ اور آگے ہمیشہ کے لئے اس بدی پر غالب آنے کی توفیق عطا فرمادیگا۔

یہاں رفث۔ فسوق اور جدال تین گناہوں کے چھوڑنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ رفث مرد و عورت کے مخصوص تعلقات کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ بدکلامی کرنا۔ گالیاں دینا۔ گندی باتیں کرنا۔ قصے سنانا۔ لغو اور بے ہودہ باتیں کرنا جسے پنجابی میں گپیں مارنا کہتے ہیں۔ یہ تمام امور بھی رفث میں ہی شامل ہیں۔ اور فسوق وہ گناہ ہیں جو خدا تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن میں انسان اس کی اطاعت اور فرمانبرداری سے باہر نکل جاتا ہے۔ آخر میں جدال کا ذکر کیا ہے جو تعلقات باہمی کو توڑنے والی چیز ہے۔ ان تین الفاظ کے ذریعہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے تین اصلاحوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا ہے (۱) اپنی ذاتی اصلاح کرو۔ اور اپنے دل کو ہر قسم کے گندے اور ناپاک میلانات سے پاک رکھو۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے اپنا مخلصانہ تعلق رکھو (۳) انسانوں سے تعلقات محبت کو استوار رکھو۔ گویا یہ صرف تین بدیاں ہی نہیں جن سے روکا گیا ہے بلکہ تین قسم کی بدیاں ہیں جن سے باہر کوئی بدی نہیں رہتی۔ کیونکہ بدی یا تو اپنے نفس سے تعلق رکھتی ہے یا خدا تعالیٰ سے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

تمہارے لئے (یہ) کوئی گناہ (کی بات) نہیں کہ (حج کے ایّام میں) اپنے رب سے کوئی (اور) فضل بھی مانگ لو -

تعلق رکھتی ہے اور یا پھر مخلوق سے تعلق رکھتی ہے - اور روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی ذاتی اصلاح کے بعد حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں بھی سرگرم رہے -

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ - فرماتا ہے تمہیں ان باتوں کے چھوڑنے میں کئی قسم کی دقتیں پیش آئیں گی - مثلاً کسی شخص کو گالی دے دی جائے تو اس کیلئے صبر کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے - لیکن اگر تم خدا کے لئے اِن پابندیوں کو اپنے اوپر عائد کر دگے اور نیکیوں میں حصّہ لوگے تو تم جو بھی نیک کام کروگے - اللہ تعالیٰ اُسے ضرور ظاہر کر دیگا - خدا تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ نیکی کو پوشیدہ نہیں رہنے دیتا - گو بعض صورتوں میں نیکیوں پر پردہ بھی پڑا رہتا ہے - مگر آخر کار نیکی ظاہر ہو کر رہتی ہے - اور دشمن بھی اس کو محسوس کئے بغیر نہیں رہتا - رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفوں کو ہی دیکھ لو - وہ آپؐ کو گالیاں دیتے تھے مگر ابوسفیان ہرقل کے سامنے آپؐ کا کوئی عیب بیان نہ کر سکا - صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ اب ایک عہد ہم میں اور اُس میں ہوا ہے - معلوم نہیں وہ اُسے پورا کرتا ہے یا نہیں - تو فرمایا - کہ تم جو نیکی بھی کروگے خدا تعالیٰ اُسے ضرور ظاہر کر دے گا - اور لوگوں پر تمہارے اچھے کردار اور بلند اخلاق کا گہرا اثر پڑے گا -

وَتَزَوَّدُوْا - فرمایا - جب تم سفر کے لئے نکلو تو ہمیشہ اپنے ساتھ زادِ راہ لے لیا کرو - اسجگہ تَزَوَّدُوْا سے دونوں زاد مراد ہو سکتے ہیں - یہ بھی کہ آمد و رفت اور کھانے پینے کے اخراجات کا انتظام کر لیا کرو - اور یہ بھی کہ نیکی اور تقویٰ کا زاد ساتھ لو - چونکہ اس سے پہلے وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے نیکیوں اور حسنات میں ترقی کرنے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی اِس لئے تَزَوَّدُوْا کہہ کر بتایا کہ حج اور عمرہ کا ثواب تو بہت بڑا ہے - مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ تم زیارت کعبہ کے شوق میں خالی ہاتھ اپنے گھروں سے نکل پڑو ہو اور لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے وہاں پہنچو - تمہارا کام یہ ہے کہ تم پہلے زادِ راہ کا انتظام کرو - اور جب آمد و رفت اور رہائش اور کھانے پینے وغیرہ کے تمام اخراجات کا انتظام ہو جائے تو اس کے بعد سفر کے لئے نکلو - فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى اور یاد رکھو کہ بہتر زاد وہ ہے جس سے تم سوال اور گناہ سے بچو -

افسوس ہے اِس زمانہ میں مسلمانوں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کو اسباب سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ اپنے تمام معاملات خدا تعالیٰ پر چھوڑ دینے چاہئیں - مگر یہ قطعی غلط اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہے - اس لئے یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ جب تم سفر کے لئے نکلو تو ضروری سامان اور زادِ راہ سے کبھی غفلت اختیار نہ کرو -

لیکن تَزَوَّدُوْا کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم تقویٰ کا زاد لو - اور چونکہ تقویٰ کا زاد مخفی تھا اسلئے اسے ذٰلِكَ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى کے الفاظ میں کھول کر بیان کر دیا اور بتایا کہ تقویٰ سب سے بہتر زاد ہے جو آخرت کے سفر میں تمہارے کام آنے والا ہے - انہی معنوں میں بانیٔ سلسلۂ احمدیہ نے اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "وقت تھوڑا ہے اسکا عمر کا پیالہ - تیز قدم اٹھاؤ کہ شام نزدیک ہے - جو کچھ پیش کرنا ہے [illegible] بار بار دیکھ لو ایسا نہ ہو کہ کچھ رہ جائے اور زیاں کاری کا موجب ہو یا سب گندی اور کھوٹی متاع

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ

پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرو۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ

اور جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے (اُس کے مطابق) اُسے یاد کرو۔ اور اِس سے پہلے

لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۹﴾

تم یقیناً گمراہوں میں سے تھے ۱۱۲

ہو۔ جو شاہی دربار میں پیش کرنے کے لائق نہ ہو۔ (کشتیٔ نوح)

چونکہ اِس سے پہلے حج کا ذکر آچکا ہے اسلئے فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى فرما کر اللہ تعالیٰ نے اِس طرف توجہ دلائی ہے کہ اب حج سے تمہاری ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے تمہیں تقویٰ کا پہلے سے بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیئے جیسے صاف کپڑوں والا چھوٹے سے چھوٹے داغ اور دھبّے سے بھی بچنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

پھر فرماتا ہے وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ اے عقلمند اگر تم اپنے بچاؤ کا سامان کرنا چاہتے ہو تو میری طرف جھکو۔ اور صرف مجھے ہی اپنی حفاظت کا ذریعہ بناؤ۔ باقی تمام ذرائع اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہیں۔

۱۱۲ حل لغات: ۔ كَمَا کے معنے "جس طرح" کے بھی ہوتے ہیں ۔ اور "اسلئے" کے بھی ۔ چنانچہ سیبویہ کہتا ہے كَمَا اِنَّهٗ لَا يَعْلَمُ تَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهُ کہ چونکہ وہ نہ جانتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا گناہ معاف کر دیا۔

كَمَا

اِنْ یہ اِنَّ سے مخففہ ہے اور اس کے معنے قریباً "گو" کے ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اِنْ نافیہ ہے یہ فرّاء کا قول ہے ۔ کسائی کہتا ہے کہ اِنْ کے معنے قَدْ کے بھی ہوتے ہیں اور اسجگہ اس کے معنے قَدْ کے ہی ہیں۔

اِنْ

تفسیر: ۔ فرماتا ہے ۔ تمہارے لئے یہ کوئی گناہ کی بات نہیں کہ حج کے ایام میں تم اپنے ربّ سے کوئی اور فضل بھی مانگ لو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فضل سے مراد اسجگہ تجارت ہے ۔ اور میرے نزدیک بھی یہ درست ہے ۔ مگر فضل سے صرف تجارت مراد لینا ایک وسیع مضمون کو محدود کر دینا ہے ۔ درحقیقت آج اسلام کو جس بہت بڑی مصیبت کا سامنا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں چاروں طرف کفر غالب ہے اور مسلمان جمود اور بے حسّی کا شکار ہیں ان کے دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اسلام کی اشاعت کے لئے اس جنون سے کام لیں جس جنون سے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے کام لیا تھا اور اسلام کو تھوڑے عرصہ میں ہی تمام معلوم دنیا میں غالب کر دیا تھا ۔ پس حج کے ذکر کے ساتھ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ فرما کر میرے نزدیک اِس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اِس عظیم الشان اجتماع سے بعض دوسرے فوائد بھی حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اللہ تعالیٰ کا وہ فضل تلاش کرو جس کے نتیجہ میں مسلمان قعرِ مذلت سے نکل کر بامِ عروج پر پہنچ جائیں ۔ اور اسلام کی اشاعت کے لئے مختلف ممالک کے بااثر اور ممتاز افراد کے ساتھ مل کر ایسی سکیمیں سوچو جن کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا فضل نازل ہو جائے اور اسلام دنیا پر غالب آجائے ۔ غرض اُس فضل کو تلاش کرنا جس کے

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ

اور جہاں سے لوگ (واپس) لوٹتے رہے ہیں وہیں سے تم بھی (واپس) لوٹو اور اللہ (تعالیٰ) سے مغفرت طلب کرو۔

نتیجہ میں اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارا فرض قرار دیا ہے۔ اور یہ جو فرمایا ہے کہ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم خدا تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ یہ کلام کا ایک طریق ہے جس کا مقصد کسی اہم نیکی کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے اسی طریق کلام کو اسجگہ استعمال کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے اچھے موقعہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے فضلوں کی تلاش نہ کرنا کیا کوئی گناہ کی بات ہے کہ تم اسے چھوڑ رہے ہو۔ یعنی اس عظیم الشان اجتماع کے موقعہ کو جبکہ دنیا کے چاروں کناروں سے لوگ یہاں جمع ہیں غنیمت جانو اور اسے اپنے ہاتھ سے نہ جانے دو۔

یہ لَا جُنَاحَ بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ لَا جُنَاحَ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا میں لَا جُنَاحَ کا استعمال کیا گیا ہے۔

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔ فرمایا جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعر الحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ عرفات مکہ سے شمال مشرق کی طرف قریباً نو میل کے فاصلہ پر ایک وسیع میدان ہے۔ جہاں ۹ ذوالحجہ کو تمام حاجی جمع ہوتے ہیں۔ یہاں ٹھہرنا اور عبادت کرنا اتنا اہم ہے کہ اگر کوئی شخص حج کے اور تمام مناسک ادا کرے مگر عرفات کے میدان میں نہ پہنچ سکے تو اس کا حج ہی نہیں ہوتا۔ اور مشعر الحرام مزدلفہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم عرفات میں عبادت کر چکو اور وہاں سے واپس لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس جو مزدلفہ میں ایک پہاڑی ہے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طریق تھا کہ آپ یہاں بھی دُعا کیا کرتے تھے۔ مگر اب عام طور پر لوگ اسجگہ دُعا نہیں کرتے بلکہ اس جگہ کا پتہ لگانے میں بھی دقت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم نے اس کا پتہ لگانے کی بڑی کوشش کی مگر نہ لگا۔ اور یونہی دُعا کر کے چل پڑے۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ کوئی بڑی پہاڑی نہیں بلکہ ٹیلہ سا ہے۔ چونکہ وہاں ایسے کئی ٹیلے ہیں اور مجمع بھی بہت ہوتا ہے اسلئے اس کا آسانی سے پتہ نہیں لگ سکتا۔

اس آیت میں اَفَضْتُمْ کا لفظ استعمال فرما کر اس امر کا بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تم عرفات سے واپس لوٹو تو تمہارے قلوب اللہ تعالیٰ کی برکات اور اس کے انوار سے اس طرح معمور ہونے چاہئیں جیسا کہ ایک برتن اپنے کناروں تک پانی سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور پھر اسی حالت میں جبکہ ساقیٔ کوثر کی روحانی شراب سے تمہارے جام لبالب بھرے ہوئے ہوں تم مشعر الحرام کے پاس پہنچو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ گویا روحانی انعامات کی وہ بارش جو عرفات میں تم پر نازل ہوئی ہے وہ تمہیں بہاتی ہوئی مشعر الحرام کی طرف لے جائے۔ اور تمہیں اپنے محبوب کے قدموں تک پہنچا دے۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ اس کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ اُذْكُرُوْهُ ذِكْرًا كَمَا هَدٰىكُمْ اُس کا اس طرح ذکر کرو جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اُس کا ذکر کرو کیونکہ اُس نے تم کو ہدایت دی ہے۔ ان معنوں کے لحاظ سے اسجگہ كَمَا کا استعمال ایسا ہی ہے جیسا كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ (حجر آیت ۹۱) میں کیا گیا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ میں اِنْ مخففہ ہے اور اس کے معنے "گو" کے ساتھ ملتے ہیں۔ فرّاء نے کہا ہے

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٠٠﴾ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ

اللہ یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنیوالا ہے۔ ۱۱۳۵ پھر جب تم اپنی عبادتیں پوری کر چکو تو

کہ اس کے معنے نفی کے ہیں۔ اور لام کے معنے اِلَّا کے ہیں۔ یعنی "تم اس ہدایت سے پہلے نہ تھے مگر گمراہ"۔ کسائی نے کہا ہے کہ اس کے معنے قَدْ کے ہیں اور لام زائد ہے۔ یعنی تم ضرور اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے۔

۱۱۳۵ حل لغات :۔ اَفِيْضُوْا : اَفَاضَ يُفِيْضُ سے امر کا صیغہ ہے اور اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ کے معنے ہیں دَفَعْتُمْ مِنْهَا بِكَثْرَةٍ تَشْبِيْهًا بِفَيْضِ الْمَآءِ۔ یعنی تم وہاں سے کثرت سے چل پڑو۔ یہ معنے پانی کے کثرت سے بہنے کے ساتھ بطور تشبیہ کے ہیں۔ (مفردات راغب)

تفسیر :۔ اس آیت کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ افاضہ تو ہو چکا۔ پھر یہ کونسا نیا افاضہ ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی عرفات سے تو لوٹ آئے۔ پھر اور کہاں سے لوٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ ثُمَّ کے معنے "اور" کے ہیں۔ اور اس بات کو اسلئے دہرایا ہے کہ پہلے اسپارہ میں کوئی حکم نہ تھا بلکہ صرف اظہار واقعہ کیا گیا تھا۔ اب حکم دیا کہ جہاں سے دوسرے لوگ واپس لوٹتے رہے ہیں وہیں سے تم بھی لوٹو۔ اور یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ قریش اور اُن کے ساتھیوں کا طریق تھا کہ وہ مزدلفہ سے آگے عرفات میں نہیں جاتے تھے۔ بلکہ مزدلفہ ہی سے واپس چلے آتے تھے۔ اور اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے تھے کہ عرفات حدودِ حرم سے باہر ہے اس لئے ہم وہاں نہیں جائیں گے بلکہ مزدلفہ میں مشعر الحرام کے پاس ہی ٹھہریں گے جو حرم کے اندر ہے۔ اور کہتے کہ ہم حرم کے باشندے ہیں اس لئے ہم حرم سے باہر نہیں جا سکتے۔ لیکن دوسرے قبائل عرفات میں جا کر حج کرتے تھے۔ اس لئے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جس طرح دوسرے لوگ عرفات میں جاتے اور پھر وہاں سے واپس آتے ہیں اسی طرح تم بھی وہاں جاؤ اور جس طرح وہ عرفات سے واپس آتے ہیں اسی طرح تم بھی واپس آؤ۔ لیکن اگر ثُمَّ کے معنے "پھر" یا "تب" کے کئے جائیں۔ تو اس صورت میں اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ پھر تم مزدلفہ سے لوٹو جہاں سے سب لوگ واپس لوٹتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ قریش اور بنو کنانہ جو حُمس یعنی بڑے پکے دیندار کہلاتے تھے وہ بھی یہیں سے واپس چلے جاتے تھے۔

مزدلفہ سے لوٹنے کے متعلق یہ حکم ہے کہ تمام حاجی نماز پڑھ کر اور دُعا کر کے سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے چلیں اور منیٰ میں سورج نکلنے کے بعد پہنچ جائیں۔ جہاں رمیٔ جمار کی جاتی ہے۔ قربانیاں دی جاتی ہیں اور احرام کی حالت ختم ہو جاتی ہے۔

یہ آیت چکڑالویوں پر بھی حجت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے خود اسجگہ کا نام نہیں بتایا۔ پس تفسیر کیلئے سنّت کا تفحص بھی ضروری ہے۔ پھر فرماتا ہے۔ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ تم ان مناسک کے ساتھ ساتھ استغفار بھی کرتے رہو کیونکہ حج ایک بہت بڑا ابتلاء بھی ہے۔ مجھ سے کئی لوگوں نے بیان کیا کہ ہم نے حج کیا اور ہمارا دل پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے بیان کیا کہ حج کے دنوں میں تو بڑا جوش ہوتا ہے مگر بعد میں دل پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حج میں ظاہر پر اتنا زور ہے کہ اُس کے مقابلہ میں باطن بہت حد تک پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہاں حجرِ اسود کو بوسہ دیتے ہیں۔ صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگاتے ہیں۔ بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ منیٰ میں تین ٹیلوں پر جو اب برجیوں کی شکل میں ہیں کنکر پھینکتے ہیں۔ اس لئے اگر ساتھ ساتھ استغفار نہ ہو تو دل پر زنگ

اَفِيْضُوْا

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ

(گزشتہ زمانہ میں) اپنے باپ دادوں کو یاد کرنے کی طرح اللہ کو یاد کرو۔ یا (اگر ہو سکے تو اس سے بھی) زیادہ (دلبستگی سے) یاد کرو

النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو (یہی) کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس دنیا میں (آرام) دے۔ اور اُن کا آخرت

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠١﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي

میں کچھ بھی حصہ نہیں ہوتا۔ اور اُن میں سے کچھ (ایسے بھی ہوتے) ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں (اس) دنیا (کی زندگی)

الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠٢﴾

النصف

میں (بھی) کامیابی دے اور آخرت میں (بھی) کامیابی (دے) اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ ۲۱۱۴

گم جاتا ہے۔ اسی طرح وہاں پانچ پانچ گھنٹے بیٹھ کر عبادت کرنی پڑتی ہے۔ ہزاروں کے مجمع میں مَیں نے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جو دُعا کرتا ہو۔ لوگ حج صرف اسقدر سمجھتے ہیں کہ خطیب جب کھڑا ہو تو اس کے ساتھ رومال ہلا دیں۔ مگر مجھے خدا تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی اور مَیں نے وہاں کثرت سے دُعائیں کیں۔ تو چونکہ یہ نماز کی طرح ایک معین عبادت نہیں اس لئے لوگ اس کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ شریعت نے صرف ظاہر بتا دیا ہے اور باطن کو انسان پر چھوڑ دیا ہے۔ مگر وہاں یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اکثر لوگ جانتے ہی نہیں کہ ہم نے یہاں دُعا یا عبادت کرنی ہے۔ پس فرماتا ہے۔ حج کے ایّام میں تمہیں استغفار کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ حج میں ظاہر زیادہ نمایاں ہے اور باطن جو جوہرِ عبادت ہے مخفی ہے۔ اگر انسان باطن کی طرف توجہ نہ کرے اور صرف ظاہر پر عمل کرکے سمجھ لے کہ اُس نے شریعت کی اصل غرض کو پورا کر دیا ہے۔ تو اس کا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

۲۱۱۴ **حل لغات**:۔ اَوْ کے معنے "یا" کے بھی

اَوْ

ہوتے ہیں اور یہ لفظ اظہار ترقی کے لئے بھی آتا ہے۔ اسی طرح اَوْ کا لفظ کسی چیز کو حقیر ظاہر کرنے کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اَشَدَّ

اَشَدَّ۔ یہ ذکر کی صفت ہے جو بطور حال پہلے بیان کر دی گئی ہے۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق حج بیت اللہ کا فرض ادا کر چکو تو خدا تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔ اہلِ عرب میں دستور تھا کہ جب وہ حج سے فارغ ہو جاتے تو تین دن منیٰ میں مجالس منعقد کرکے اپنے باپ دادوں کے کارنامے بیان کرتے اور اپنے اپنے قبیلہ کی بہادری شہرت اور سخاوت کی تعریف میں قصیدے پڑھتے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لوگ تو اپنے باپ دادوں کی تعریف میں قصائد پڑھا کرتے تھے۔ مگر ہم تمہیں یہ ہدایت دیتے ہیں۔ کہ جب تم مناسکِ حج کو ادا کر چکو تو تم خدا تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو۔ یعنی جس طرح ایک چھوٹا بچہ جو اپنی ماں سے جدا ہوتا ہے روتا اور چلاتا ہوا کہتا ہے کہ مَیں نے اپنی امّاں کے پاس جانا ہے اسی طرح تم بھی بار بار خدا تعالیٰ کا ذکر کرو حتّٰی کہ اُس کی محبت تمہارے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے۔ خدا تعالیٰ نے ایک

وراء الوراء ہستی ہے اُس کا حُسن براہ راست انسان کے سامنے نہیں آتا بلکہ کئی واسطوں کے ذریعہ سے آتا ہے۔ اگر اُس کے حسن کو الفاظ میں بیان کیا جائے اور پھر ہم اُس پر غور کریں اور سوچیں تو آہستہ آہستہ معنوی طور پر اس کی شکل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اگر تم مالک کا نام لو اور اس کی مالکیت کو ذہن میں لاؤ۔ قدوس کا نام لو اور اس کی قدوسیت کو ذہن میں لاؤ ستار کا نام لو اور اُس کی ستاریت کو ذہن میں لاؤ۔ غفور کا نام لو اور اُس کی غفوریت کو ذہن میں لاؤ۔ تو یہ لازمی بات ہے کہ آہستہ آہستہ خدا تعالیٰ کی ایک مکمل تصویر تمہارے سامنے آجائیگی۔ اور محبت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ یا تو کسی کا وجود سامنے ہو یا اس کی تصویر سامنے ہو۔ حضرت مسیح موعودؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ایک شعر میں اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

دیدار گر نہیں ہے تو گفتار ہی سہی
حسن و جمالِ یار کے آثار ہی سہی

یعنی اگر محبوب خود سامنے نہیں آتا تو اُس کی آواز تو سُنائی دے اور اُس کے حُسن کی کوئی نشانی تو نظر آئے۔ پس ربّ۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین۔ ستار۔ غفار۔ قدوس۔ مہیمن۔ سلام۔ جبار۔ قہار اور دوسری صفاتِ الٰہیہ کو جب ہم اپنے ذہن میں بٹھا لیتے ہیں تو خدا تعالیٰ کی ایک تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اُس کے نتیجہ میں ہمارے دلوں میں اُس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض صفاتِ الٰہیہ کے بار بار دُہرانے اور تواتر سے دُہرانے کے نتیجہ میں چونکہ خدا تعالیٰ کی ایک تصویر کھنچتی ہے اور اس تصویر کی وجہ سے ہی ہمارے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح بچوں کے دل میں اپنے ماں باپ کی ملاقات کا اشتیاق ہوتا ہے۔ اسی طرح تمہارا بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہی رُوحانی تعلق ہونا چاہیئے۔ گویا تمہارا چین اور تمہارا آرام صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ ہی وابستہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اسی پر تمہاری رُوحانی زندگی کا مدار ہے۔ اور حج کے بعد ذکر الٰہی کی طرف توجہ دلا کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ تمہارا خدا تعالیٰ سے اب ایک روحانی پیوند قائم ہو چکا ہے۔ پس جس طرح ایک بچہ اپنے ماں باپ کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی کے دن بسر کرتا ہے اور ان کے اخلاق و عادات اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح تم بھی خدا تعالیٰ کی صفات کا آئینہ بنو اور اُسی کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی کے دن بسر کرو۔

پھر فرماتا ہے۔ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ہم نے پہلے تو تمہیں یہ ہدایت دی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو مگر ہمارا یہ حکم صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو رُوحانیت میں ابھی اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچے۔ ورنہ جو لوگ اپنے ماں باپ کی محبت میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہاتھ پوشیدہ دیکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ماں باپ کے تعلق کو بالکل ہیچ سمجھتے ہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ وہ خدا تعالیٰ کا ایسے رنگ میں ذکر کریں کہ اُنکے دنیوی تعلقات میں اس کی کوئی مثال دکھائی نہ دے اور ماں باپ کا ذکر اس کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہو جائے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔ فرماتا ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ سے صرف دنیا ہی مانگتے ہیں۔ جیسے عیسائی ہیں۔ وہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ "ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے۔" (متی باب ۶ آیت ۱۱) انہیں حرام و حلال سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ انہیں کسی چیز کے مفید یا مضر ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اُن کا مطمح نظر محض دنیا طلبی ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا کے ساتھ حَسَنَةً کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جس میں یہ اشارہ ہے کہ ایسے لوگ صرف دنیا پر جان دیتے ہیں۔ حالانکہ خالی دنیوی عزت جس کے ساتھ اخروی عزت نہ ہو ایک لعنت ہوتی ہے جیسے یہود کو آجکل خالی دنیوی عزت ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح

عیسائیوں کو صرف دنیوی عزت ملی ہوئی ہے مگر اُخروی عزت سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔ اسی لئے فرمایا کہ وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یعنی ہم انہیں دنیا تو دے دیتے ہیں مگر اُخروی انعامات میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری طرف خالی اُخروی عزّت بھی ایک بے ثبوت چیز ہوتی ہے۔ ثبوت والی چیز وہی ہوتی ہے جس میں دین اور دنیا دونوں اکٹھے ملیں۔ اسی لئے فرمایا کہ ایک اور گروہ ایسا ہے جو یہ دعا کرتا رہتا ہے کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ یعنی الٰہی ہمیں دنیا میں بھی عزت بخش اور آخرت میں بھی ہمارے مقام کو بلند کر۔ اگر ہمیں دنیا ملے تو ہم اُسے اپنی ذات کے لئے استعمال نہ کریں بلکہ تیرے دین کی شوکت ظاہر کرنے کے لئے استعمال کریں اور تیری رضا اور خوشنودی کے لئے اُسے صرف کریں۔ اگر ایسا ہو تو پھر انسان کو دنیا میں بھی عزّت ملتی ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور بھی اس کا مرتبہ بڑھتا ہے۔ یہ دُعا جو اسلام نے ہمیں سکھائی ہے بظاہر بہت چھوٹی سی دعا ہے لیکن ہر قسم کی انسانی ضرورتوں پر حاوی ہے۔ انسان کہتا ہے رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے رب ہم کو اس دنیا میں حسنہ دے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے حسنہ کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے یہ درست نہیں۔ حسنات کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے تھا جس کے معنے بہت سی نیکیوں کے ہیں مگر یہ اعتراض عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اگر یہاں حسنات کا لفظ ہوتا تو اسکے معنے یہ ہوتے کہ ہمیں کچھ اچھی چیزیں ملیں۔ لیکن حسنہ کے یہ معنے ہیں کہ ہمیں جو کچھ ملے خیر ہی ملے۔ پس رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً کے یہ معنے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! دنیا میں ہم کو جو کچھ دے حسنہ دے۔ روٹی دے تو حلال ہو طیب ہو پچنے والی ہو۔ کپڑا دے تو حلال دے طیّب دے۔ ضرورت کے مطابق دے۔ ننگ ڈھانکنے والا دے۔ پسندیدہ دے۔ بیوی دے تو ایسی دے جو ہمدرد ہو۔ ہم خیال ہو۔ دیندار ہو محبّت کرنے والی ہو۔ نیکی میں تعاون کرنے والی ہو۔ بچّے پیدا کرنے والی ہو۔ ان بچّوں کی نیک تربیت کرنے والی ہو۔ مکان دے تو مبارک ہو۔ وہ بیماریوں والا گھر نہ ہو۔ سِل دق اور ٹائیفائیڈ کے جراثیم اُس میں نہ ہوں۔ کوئی چیز ایسی نہ ہو جو صحت پر بُرا اثر کرنے والی ہو۔ کوئی ہمسایہ ایسا نہ ہو جو دکھ دینے والا ہو۔ وہ ایسے محلّہ میں نہ ہو جہاں کے رہنے والے بُرے ہوں۔ وہ ایسے شہر میں نہ ہو جسے تو میرے لئے اچھا نہ سمجھتا ہو۔ ہمیں حاکم دے تو ایسے دے جو رحمدل ہوں۔ تقویٰ سے کام لینے والے ہوں انصاف سے کام لینے والے ہوں۔ ماتحتوں سے محبت کرنے والے ہوں۔ ہمیں اُستاد دے تو ایسے دے جو علم رکھنے والے اور اچھا پڑھانے والے ہوں۔ وہ شوق سے پڑھائیں وہ ظالم نہ ہوں۔ خرابیاں پیدا کرنے والے اور دوسروں کو ورغلانے والے نہ ہوں۔ دوست دے تو ایسے دے جو خیر خواہ ہوں۔ محبت کرنے والے ہوں۔ مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ خوشی میں شریک ہونے والے ہوں۔ دکھوں میں ہاتھ بٹانے والے ہوں۔ غرض رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے ربّ! دنیا میں ہم کو وہ چیز دے جو حسنہ ہو۔ پس یہاں حسنات کی بجائے حسنہ کا لفظ رکھ کر اُس کے مفہوم کو خدا تعالیٰ نے وسیع کر دیا ہے۔ اور جب مومن یہ دُعا کرتا ہے تو دوسرے الفاظ میں وہ یہ کہتا ہے کہ خدایا مجھے ہر وہ چیز دے جو میری ضرورت کے مطابق ہو اور پھر وہ چیز ایسی ہو جو نہایت اچھی ہو۔ مگر اچھی چیز کے لئے اور الفاظ بھی استعمال ہو سکتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے وہ الفاظ استعمال نہیں کئے بلکہ حسنہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے یہ لفظ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں پر دلالت کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز اپنے فوائد اور خوبیوں کے لحاظ سے اچھی ہو مگر ظاہری صورت کے لحاظ سے اچھی نہ ہو مثلاً کسی شخص کی بیوی بڑی بااخلاق ہو۔ مگر فرض کرو۔ وہ لنگڑی ہے یا اندھی ہے یا بہری ہے تو وہ حسنہ نہیں کہلائیگی حسنہ وہی بیوی کہلائیگی جس کے اخلاق

بھی اچھے ہوں شکل بھی اچھی ہو۔ ظاہر بھی اچھا ہو اور باطن بھی اچھا ہو۔ تو حسنہ کا لفظ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں پر دلالت کرتا ہے۔ اور مومن اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا مجھے جو چیز بھی دے وہ ایسی ہو جو ظاہری اور باطنی دونوں خوبیاں رکھتی ہو۔

پھر فرمایا وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً آخرت میں بھی ہمیں وہ چیز دے جو حسنہ ہو۔ یعنی وہ بھی ظاہر و باطن میں ہمارے لئے اچھی ہو۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ آخرت میں تو ہر چیز اچھی ہوتی ہے۔ وہاں کی چیزوں کے لئے حسنہ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بات غلط ہے۔ آخرت میں بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جو باطن میں اچھی ہیں مگر ظاہر میں بُری ہیں۔ مثلاً دوزخ ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ انسان کی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ پس ایک لحاظ سے وہ اچھی چیز ہے۔ مگر ایک لحاظ سے وہ بُری بھی ہے۔ پس جب آخرت کے لئے خدا تعالیٰ نے حسنہ کا لفظ رکھا تو اس لئے کہ تم یہ دعا کرو کہ الٰہی ہماری اصلاح دوزخ سے نہ ہو بلکہ تیرے فضل سے ہو۔ اور آخرت میں ہمیں وہ چیز نہ دیجئو جو صرف باطن میں ہی اچھی ہو۔ جیسے دوزخ باطن میں اچھا ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ مگر ظاہر میں بُرا ہے۔ کیونکہ وہ عذاب ہے۔ آخرت میں حسنہ صرف جنت ہے۔ جس کا ظاہر بھی اچھا ہے اور جس کا باطن بھی اچھا ہے۔

پھر فرمایا۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ ہم کو عذاب نار سے بچا۔ اس سے مراد وہی عذاب نار نہیں جو مرنے کے بعد ملے گا۔ یہ عذاب نار دنیا کے ساتھ بھی تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ دنیا اور آخرت دونوں کے ساتھ تعلق رکھنے والی دعاؤں کے بعد وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کہا گیا ہے۔ پس وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کے معنے یہ ہیں کہ ہمیں دنیا کے عذاب نار سے بھی بچا اور آخرت کے عذاب نار سے بھی محفوظ رکھ۔ ہم دیکھتے ہیں دنیا میں کئی لوگ عذاب نار میں گرفتار ہوتے ہیں۔ انہیں کئی قسم کے دُکھ ہوتے ہیں۔ تکلیفیں ہوتی ہیں۔ حسرتیں ہوتی ہیں۔ قسم قسم کے مصائب ہوتے ہیں۔ مگر جب انسان اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے اور اُس سے کہتا ہے کہ خدایا مجھے عذاب نار سے بچا۔ تو خدا تعالیٰ اُسے اُس عذاب سے بچا لیتا ہے تب وہ چیزیں جو پہلے اُس کے لئے نار تھیں جنت بن جاتی ہیں۔

اسی طرح اس سے مراد آخرت کا عذاب بھی ہے جس سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھلائی ہے۔ بظاہر یہ ایک مختصر سی دعا ہے۔ مگر بڑی جامع اور وسیع دعا ہے۔

عَذَابَ النَّارِ کے لحاظ سے دنیا کی لڑائی بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ کیونکہ لڑائی بھی آگ کا ہی عذاب ہے۔ پس جو شخص یہ دعا کرے گا کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وہ گویا خدا تعالیٰ کے بیان فرمودہ الفاظ میں یہ دعا کرے گا۔ کہ الٰہی دنیا میں مجھ پر کوئی ساعت ایسی نہ آئے جو بُری ہو۔ لڑائی مجھ سے دُور رہے اور یہ آگ کا عذاب میرے قریب نہ پہنچے۔

اگر کوئی سپاہی لڑائی میں شامل ہو اور وہ یہ دعا کرے۔ تو اُس کی دعا کے یہ معنے ہونگے۔ کہ اِس لڑائی کے بد اثرات سے مجھے بچا۔ بندوق کی گولی آئے تو وہ مِس کر جائے۔ میرے دائیں نکل جائے یا بائیں نکل جائے۔ اوپر نکل جائے یا نیچے نکل جائے۔ بہرحال وہ مجھے نہ لگے۔ اور میں اس سے محفوظ رہوں۔ پس یہ ایک جامع دعا ہے جو اسلام نے سکھائی ہے۔ اور جسے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ

یہی (وہ لوگ) ہیں جن کے لئے اُن کی (نیک) کمائی کے سبب سے (ثواب کا) ایک بہت بڑا حصّہ (مقدّر) ہے اور

سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ

اللہ (بہت) جلد حساب چکا دیتا ہے۔ ۱۱۵؎ اور (ان) مقررہ دنوں میں اللہ (تعالیٰ) کو

مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ

یاد کرو۔ پھر جو شخص جلدی کرے (اور) دو دنوں میں (ہی واپس چلا جائے) تو اُسے کوئی گناہ

عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ

نہیں اور جو پیچھے رہ جائے اُسے (بھی) کوئی گناہ نہیں (یہ وعدہ) اُس شخص کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے

۱۱۵؎ تفسیر:۔ کسب کے معنے محنت کرکے کسی چیز کو حاصل کرنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن اسجگہ کَسَبُوْا کا لفظ اوپر والی دُعا کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کمایا۔ اس سے اُن کو حصّہ ملے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسب کا لفظ زبان یا دل کے فعل پر بھی بولا جاتا ہے اور مراد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی نعماء طلب کرتے رہتے ہیں ▪▪ اپنے اپنے اخلاص اور ایمان کے مطابق خدا تعالیٰ سے اجر پائیں گے۔

وَ اللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اور بدی کی جزا میں کوئی دیر نہیں لگتی بلکہ ادھر عمل سرزد ہوتا ہے اور ادھر اس کی جزا ظاہر ہو جاتی ہے یعنی انسان کا ہر عمل اس کے جوارح پر فوراً اثر ڈال دیتا ہے۔ یہ مضمون قرآن کریم میں کئی جگہ بیان ہوا ہے اور حدیثوں میں بھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص بُرا کام کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نشان پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ نہیں کرتا اور اس کے بد اعمال بڑھتے چلے جاتے ہیں تو یہ سیاہ نقطے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کا سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور جب کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو ایک سفید نقطہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ اور جب اس کے بعد وہ متواتر نیک اعمال بجا لاتا ہے تو یہ سفید نقطے بڑھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُس کا سارا دل منور ہو جاتا ہے۔

سَرِیْعُ الْحِسَابِ میں اللہ تعالیٰ کی اسی سنّت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ ہر کام کا اثر فوراً انسان کے دل پر پڑ جاتا ہے۔ اور یہ بھی ایک قسم کا حساب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لیا جاتا ہے۔ تازہ تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسانی حرکت ایسی نہیں جو فضا میں محفوظ نہ ہو جاتی ہو۔ پس عمل اور اُسکی جزا یہ دو توام بھائی ہیں کہ ایک کے ساتھ دوسرا بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

اور تم اللہ (تعالیٰ) کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور جان لو کہ (ایک دن) تم سب کو اکٹھا کر کے اُس کے حضور لے جایا جائیگا۔ ۲۱۶

۲۱۶ تفسیر:۔ اس آیت میں جن مقررہ دنوں میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا خصوصیت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے وہ ایام تشریق ہیں یعنی ۱۱-۱۲-۱۳ ذوالحجہ یا ایام منیٰ ہیں۔ جو دسویں تاریخ سے شروع ہوتے ہیں اور ۱۳ رکو ختم ہو جاتے ہیں۔

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ فرماتا ہے جو شخص جلدی کرے اور دو دنوں میں ہی واپس چلا جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ دراصل دسویں ذوالحجہ کے بعد رمی الجمار کے لئے تین دن رکھے گئے ہیں۔ مگر اجازت ہے کہ کوئی شخص دو دن کے بعد بھی لوٹ آئے۔ اس بارہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب تو یہ ہے کہ ایام تشریق کے تیسرے دن صبح کے وقت جا سکتا ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ دوسرے دن رمی الجمار کے بعد بھی جا سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اگر عصر کا وقت آجائے تو نہیں جا سکتا۔ اس سے پہلے جا سکتا ہے۔ گویا اُس سے تیسرے دن کی رمی معاف ہوگئی۔ پھر بعض نے کہا کہ جس نے تعجیل کی نیت کی۔ اُسے چاہیئے کہ وہ یوم النحر کو رمی کرے۔

پھر فرماتا ہے۔ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى۔ اور جو شخص پیچھے رہ جائے یعنی تیسرے دن رمی کر کے جائے۔ اُسے بھی کوئی گناہ نہیں۔ اور یہ وعدہ اُس شخص کے لئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ لِمَنِ اتَّقٰى کا تعلق تعجیل کے ساتھ ہے۔ مگر میرے نزدیک اس کا تعلق نہ تعجیل کے ساتھ ہے نہ تاخیر کے ساتھ بلکہ لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کے ساتھ ہے۔ ورنہ جو گنہگار ہے وہ تو گنہگار ہی ہے اس کے متعلق لَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کہنا تو درست ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ نفیٔ اِثْم صرف ایسے شخص کے لئے ہے جو متقی ہو۔ یعنی اگر وہ کسی اور طرح گنہگار نہیں تو اس تعجیل یا تاخیر سے گنہگار نہیں ہوتا۔

آخر میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ ان مناسک کی اصل غرض یہ ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تمہارا بیت اللہ کا طواف کرنا حجرِ اسود کو بوسہ دینا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا۔ مزدلفہ منیٰ عرفات اور مشعر الحرام میں اللہ تعالیٰ کا بکثرت ذکر کرنا۔ اور رمی الجمار کرنا۔ یہ سب اس غرض کے لئے ہے کہ تمہارے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی سچی محبت پیدا ہو اور تم سمجھو کہ ایک دن تم اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور اکٹھے ہونے والے ہو۔ پس اگر تم نے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط رکھا اور اُس کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کیا اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کیا تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور ہاجرہؑ کو برکت دی تھی۔ اُسی طرح تمہیں بھی برکت عطا فرمائیگا اور تمہاری نسلوں کو بھی اپنی دائمی حفاظت اور پناہ میں لے لیگا۔ پس تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ اور اس دن کو یاد رکھو جب تم سب کو اپنے اعمال کی جواب دہی کیلئے خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا پڑیگا۔

حج کے احکام تو ختم ہو گئے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جگہوں میں جانے اور وہاں چکر لگانے کی کیا حکمتیں ہیں؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ میرے نزدیک اس کی ظاہری حکمتوں میں سے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ (آل عمران آیت ۹۷) کہ سب سے پہلا گھر جو تمام دنیا کے فائدہ کے لئے بنایا گیا تھا وہ ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے۔ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں بنایا بلکہ یہ آدم کے زمانہ سے

چلا آتا ہے (خواہ وہ کوئی آدم ہو)۔ پس مَثَابَةً لِّلنَّاسِ میں پیشگوئی تھی کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اسے ساری دنیا کو اکٹھا کرنے کے لئے بنایا ہے اس لئے تمام لوگوں کو اسجگہ جمع کیا جائیگا چنانچہ اسی غرض کے لئے حج کی خاص تاریخیں مقرر کر دی گئیں۔ تاکہ ان تاریخوں میں وہاں ساری دنیا کے لوگ جمع ہو سکیں گویا دوسرے الفاظ میں تمام دنیا کو اکٹھا کرنے اور جہان بھر کے نقباء اور علماء کو جمع کرنے اور عالم اسلامی میں عالم گیر اخوت اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے مائدۂ روحانی پر لوگوں کو ایک عظیم الشان دعوت دی ہے تاکہ قومی اور ملکی منافرت درمیان سے اُٹھ جائے اور باہمی تعلقات وسیع ہو جائیں۔ اور ایک دوسرے کی محبت ترقی کرے۔ اور یہ خیال کہ ہم فلاں قوم سے ہیں اور ہمارا غیر فلاں قوم سے ہے مٹ جائے۔ میرے نزدیک منٰی میں لوگوں کے تین دن اسی لئے فارغ رکھے گئے ہیں کہ وہاں لوگ ذکر الٰہی اور عبادت میں اپنا وقت گذارنے کے علاوہ آپس میں ایک دوسرے سے ملیں اور حالات معلوم کریں۔ قادیان اور ربوہ میں بھی لوگ مختلف اوقات میں آتے رہتے ہیں۔ مگر وہ تعلقات نہیں بڑھتے جو جلسہ سالانہ کے ایام میں بڑھتے ہیں۔ اگر حج سے یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے تو میرے نزدیک وہ تفرقے اور شقاق مٹ سکتے ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کو کمزور کر رکھا ہے۔ اور اُن کے درمیان اختلافِ عقائد کے باوجود زبردست اتحاد پیدا ہو سکتا ہے غرض حج گو ایک مذہبی عبادت ہے مگر اس میں رُوحانی فوائد کے علاوہ یہ ملی اور سیاسی غرض بھی ہے کہ مسلمانو کے ذی اثر طبقہ میں سے ایک بڑی جماعت سال میں ایک جگہ جمع ہو کر تمام عالم کے مسلمانوں کی حالت سے واقف ہوتی رہے۔ اور ان میں اخوت اور محبت ترقی کرتی رہے اور انہیں ایک دوسرے کی مشکلات سے آگاہ ہونے اور آپس میں تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خوبیوں کو اخذ کرنے کا موقعہ ملتا رہے۔ گو افسوس ہے کہ اس غرض سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حج سے یہی غرض تھی تو پھر مکہ مکرمہ میں ہی تمام مسلمانوں کا اجتماع کافی تھا عرفات منٰی اور مزدلفہ میں جانے کی کیا غرض ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ عرفات منٰی اور مزدلفہ میں جمع کرنے کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ شہر میں اجتماع کی صورت نہیں ہو سکتی اور نہ لوگوں کا آپس میں صحیح رنگ میں میل جول ہو سکتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو کھلے میدانوں میں جمع ہونے کا حکم دیدیا تاکہ وہاں لوگ آسانی سے ایک دوسرے سے مل سکیں۔ چونکہ جگہ بھی کھلی ہوتی ہے اور وقت بھی فارغ ہوتا ہے۔ اس لئے ایک دوسرے کو ملنے کا مدعا خوب اچھی طرح پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ خدا تعالیٰ نے مزدلفہ منٰی اور عرفات کو اس شرف کے لئے اس لئے چُنا ہے کہ عرفات ساحل سمندر کی طرف ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اسی راستہ سے حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیل علیہ السلام کو چھوڑنے کے لئے شام سے تشریف لائے تھے۔ اور عرفات وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی اُن پر تجلّی ظاہر ہوئی۔ اور مزدلفہ وہ مقام ہے جہاں آپ سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اس قربانی کے بدلہ میں تجھے بہت بلند درجات عطا کئے جائیں گے۔ اور منٰی وہ مقام ہے جہاں حضرت ہاجرہؓ گھبرائی ہوئی پہنچی تھیں مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میں خدا کے حکم سے تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں تو انہوں نے کہا کہ اِذًا لَّا يُضَيِّعُنَا۔ اگر یہ بات ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی ضائع نہیں کرے گا اور وہ واپس چلی گئیں۔ گویا شیطان ہمیشہ کے لئے مار دیا گیا۔ اس لئے یہاں شیطان کو کنکر مارے جاتے ہیں۔

پھر حج بیت اللہ کی ایک غرض شعائر اللہ کا احترام

اور ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں قائم کرتا ہے۔ شعائر اللہ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے نشانات میں سے ہیں۔ چونکہ دنیا میں کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا ذہن صرف ظاہر سے باطن کی طرف منتقل ہُوا کرتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حج بیت اللہ میں اُن کے سامنے ایسے نشانات رکھدیئے جو خدا تعالیٰ کو یاد دلانے والے اور اُسکی محبت دلوں میں تازہ کرنے والے ہیں۔ حج دراصل اس عظیم الشان قربانی کی یاد تازہ کرتا ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو بیت اللہ کے قریب ایک وادیٔ غیر ذی زرع میں انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ کر سرانجام دی تھی بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ چونکہ وہ اپنے بچے حضرت اسمٰعیلؑ کی گردن پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہوگئے تھے اسلئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یادگار حج کی صورت میں قائم کردی۔ حالانکہ اگر یہ درست ہوتا تو چونکہ یہ واقعہ شام میں ہُوا تھا۔ اس لئے حج کا اصل مقام شام ہوتا نہ کہ حجاز اور لوگ وہاں جمع ہوکر خدا تعالیٰ کی یاد کرتے اور کہتے ابراہیمؑ نے کس قدر قربانی کی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے حج کے لئے مکہ مکرمہ کو چنا اور منیٰ اور مزدلفہ اور عرفات میں جانا اور وہاں مناسکِ حج بجالانا ضروری قرار دیا۔ پس میرے نزدیک حج کا تعلق آپکا چھری پھیرنے کیلئے تیار ہوجانیوالے واقعہ سے نہیں بلکہ اس واقعہ سے ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ایک ایسی وادی میں لاکر پھینک دیا۔ جہاں پانی کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ اور کھانے کے لئے ایک دانہ تک نہ تھا جب انسان حج کے لئے جاتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے یہ نقشہ آجاتا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرنے والے بچائے جاتے ہیں۔ اور اُن کو اللہ تعالیٰ غیر معمولی عزت دیتا ہے۔ اور حج کرنے والے کے دل میں بھی خدا تعالیٰ کی محبت بڑھتی اور اُس کی ذات پر یقین ترقی کرتا ہے پھر وہ اپنے آپ کو اس گھر میں دیکھ کر جو ابتدائے دنیا سے خدا تعالیٰ کی یاد کے لئے بنایا گیا ہے۔ ایک عجیب روحانی تعلق اُن لوگوں سے محسوس کرتا ہے جو ہزاروں سال پہلے سے اس رُوحانی سلک میں پروئے چلے آتے ہیں جس میں ہر شخص پیدا ہوا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی یاد اور اُس کی محبت کا رشتہ جو سب کو باندھے ہوئے ہے خواہ وہ پُرانے ہوں یا نئے۔ اسی طرح بیت اللہ کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کا نقشہ انسانی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور اُسے احساس ہوتا ہے کہ کس طرح خدا تعالیٰ نے غیر معمولی طور پر چاروں طرف سے لوگوں کو اس گھر کے گرد جمع کر دیا ہے۔ جب انسان بیت اللہ کو دیکھتا ہے اور اُس پر اُسکی نظر پڑتی ہے تو اُس کے دل پر ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ اور وہ قبولیت دُعا کا ایک عجیب وقت ہوتا ہے۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب مَیں نے حج کیا تو مَیں نے ایک حدیث پڑھی ہوئی تھی کہ جب پہلے پہل خانہ کعبہ نظر آئے تو اُس وقت جو دعا کی جائے وہ قبول ہوجاتی ہے۔ فرمانے لگے۔ اُس وقت میرے دل میں کئی دعاؤں کی خواہش ہوئی لیکن میرے دل میں فوراً خیال پیدا ہُوا کہ اگر مَیں نے یہ دعائیں مانگیں اور قبول ہوگئیں۔ اور پھر کوئی اور ضرورت پیش آئی تو پھر کیا ہوگا۔ پھر تو نہ حج ہوگا اور نہ یہ خانہ کعبہ نظر آئیگا۔ کہنے لگے۔ تب مَیں نے سوچ کر یہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کروں کہ یا اللہ! مَیں جو دُعا کیا کروں وہ قبول ہُوا کرے۔ تاکہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے۔ مَیں نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے یہ بات سُنی ہوئی تھی جب مَیں نے حج کیا۔ تو مجھے بھی وہ بات یاد آگئی۔ جونہی خانہ کعبہ نظر آیا۔ ہمارے ناناجان نے ہاتھ اُٹھائے کہنے لگے دُعا کرلو۔ وہ کچھ اور دُعائیں مانگنے لگ گئے۔ مگر مَیں نے تو یہی دُعا کی کہ یا اللہ! اِس خانہ کعبہ کو دیکھنے کا مجھے روز روز کہاں موقعہ ملے گا۔ آج عمر بھر میں مسرت کے ساتھ موقع ملا ہے۔ پس میری تو

یہی دُعا ہے کہ تیرا اپنے رسول سے وعدہ ہے کہ اس کو پہلی
دفعہ حج کے موقعہ پر دیکھ کر جو شخص دعا کریگا وہ قبول ہوگی
میری دُعا تجھ سے یہی ہے کہ ساری عمر میری دُعائیں قبول
ہوتی رہیں۔ چنانچہ اُس کے فضل اور احسان سے میں برابر یہ
نظارہ دیکھ رہا ہوں کہ میری ہر دُعا اس طرح قبول ہوتی ہے
کہ شاید کسی اعلیٰ درجہ کے شکاری کا نشانہ بھی اس طرح
نہیں لگتا۔

اسی طرح بیت اللہ کے گرد چکر لگاتے وقت جب
انسان دیکھتا ہے کہ ہزاروں لوگ اس کے گرد چکر لگاتے
ہیں اور ہزاروں ہی اس کے گرد نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ تو
اُس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ مَیں دنیا سے کٹ کر
خدا تعالیٰ کی طرف آگیا ہوں۔ اور میرا بھی اب یہی کام ہے
کہ مَیں اُس کے حضور سر بسجود رہوں۔ پھر سعی بین الصفا
المروۃ میں حضرت ہاجرؓہ کا واقعہ انسان کے سامنے آتا
ہے اور اُس کا دل اس یقین سے بھر جاتا ہے کہ انسان اگر
جنگل میں بھی خدا تعالیٰ کے لئے ڈیرہ لگا دے تو خدا تعالیٰ
اُسے کبھی ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کے لئے خود اپنے پاس سے
سامان مہیا کرتا اور اُسے معجزات اور نشانات سے
حصہ دیتا ہے۔ پھر وہاں جتنے مقام شعائرُ کا درجہ
رکھتے ہیں اُن کے بھی ایسے نام رکھ دیئے گئے ہیں کہ
جن سے خدا تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے
لوگ منیٰ میں جاتے ہیں۔ یہ لفظ اُمْنِیَّۃ سے نکلا ہے جس کے
معنے آرزو اور مقصد کے ہیں۔ اور اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ
لوگ اسجگہ محض خدا کو ملنے اور شیطان سے کامل نفرت اور
علیحدگی کا اظہار کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ پھر عرفات ہے۔
جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اب ہمیں خدا
تعالیٰ کی پہچان اور اُس کی معرفت حاصل ہوگئی ہے اور ہم اُس
سے مل گئے ہیں۔ اس کے بعد مزدلفہ ہے جو قرب کے معنوں پر
دلالت کرتا ہے اور جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے
کہ وہ مقصد جس کی ہم تلاش کر رہے ہیں وہ ہمارے قریب آ
گیا ہے۔ اسی طرح مشعر الحرام جو ایک پہاڑی ہے محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مخلصانہ عقیدت اور ابراہیم کے
جذبات ہمارے دلوں میں پیدا کرتی ہے کیونکہ یہ وہ مقام ہے
جہاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خاص طور پر دعائیں
فرمایا کرتے تھے۔ پھر مکہ مکرمہ ایسی جگہ ہے جہاں سوائے
چند درختوں اور اذخر گھاس کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ ہر جگہ
ریت ہی ریت اور کنکر ہی کنکر ہیں۔ اور کچھ چھوٹی چھوٹی
گھاٹیاں ہیں۔ غرض وہ ایک نہایت ہی خشک جگہ ہے۔ نہ
کوئی سبزہ ہے نہ باغ۔ دنیا کی کشش رکھنے والی چیزوں میں سے
وہاں کوئی بھی چیز نہیں۔ پس وہاں جانا صرف اللہ تعالیٰ
کے لئے اور اُس کے قرب اور رضاء کے لئے ہی ہو سکتا ہے
اور یہی غرض حج بیت اللہ کی ہے۔ پھر احرام باندھنے میں بھی ایک
خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کو
یوم الحشر کا اندازہ ہو سکے۔ کیونکہ جیسے کفن میں دو چادریں
ہوتی ہیں۔ احرام میں بھی دو ہی ہوتی ہیں۔ ایک جسم کے اوپر کے
حصہ کے لئے اور دوسری نیچے کے حصہ کے لئے۔ پھر سر بھی
ننگا ہوتا ہے۔ اور عرفات وغیرہ میں یہی نظارہ ہوتا ہے۔
جب لاکھوں آدمی اس شکل میں وہاں جمع ہوتے ہیں۔ تو حشر
کا نقشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یوں معلوم
ہوتا ہے کہ گویا ہم خدا تعالیٰ کے سامنے ہیں اور کفن میں
لپٹے ہوئے ابھی قبروں سے نکل کر اُس کے سامنے حاضر ہوئے
ہیں۔ پھر حج بیت اللہ میں حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ حضرت
ہاجرہؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات زندگی انسان
کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس کے اندر ایک نیا
ایمان اور عرفان پیدا ہوتا ہے۔ یوں تو اور قوموں نے بھی اپنے
بزرگوں کے واقعات تصویری زبان میں کھینچنے کی کوشش کی ہے
جیسے ہندو دسہرہ میں اپنے پُرانے تاریخی واقعات دہراتے ہیں
گر مسلمانوں کے سامنے خدا تعالیٰ نے اُن کے آباؤ اجداد کے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اور بعض آدمی ایسے (بھی ہوتے) ہیں جن کی باتیں (اس) دُنیا کی زندگی کے متعلق تجھے (بہت) پسندیدہ معلوم ہوتی ہیں اور وہ (باستکبرتے و قت)

وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۵﴾

اللہ کو اُس (اخلاص) پر جو اُنکے دل میں ہے گواہ ٹھہراتے (جاتے) ہیں۔ حالانکہ وہ (حقیقت میں) سب جھگڑالوؤں سے زیادہ جھگڑالو ہوتے ہیں ۔ ۱۱ے

تاریخی واقعات کو ایسی طرز پر رکھا ہے کہ اُس سے پُرانے واقعات کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے۔ اور آئندہ پیش آنے والے حادثہ یعنی قیامت کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ اِسی طرح رمی الجمار کی اصل غرض بھی شیطان سے بیزاری کا اظہار کرنا ہے اور ان جمار کے نام بھی جمرۃ الدنیا۔ جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ العقبیٰ اسلئے رکھے گئے ہیں کہ انسان اس امر کا اقرار کرے کہ وہ دنیا میں بھی اپنے آپ کو شیطان سے دُور رکھے گا اور عالم برزخ اور عالم عقبیٰ میں بھی ایسی حالت میں جائیگا کہ شیطان کا کوئی اثر اُس کی رُوح پر نہیں ہوگا۔ اِسی طرح ذبیحہ سے اِس طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار رکھے اور جب بھی اُس کی طرف سے آواز آئے وہ فوراً اپنا سر قربانی کے لئے جھکا دے اور اُس کی راہ میں اپنی جان تک دینے سے بھی دریغ نہ کرے۔ پھر سات طواف سات سعی اور سات ہی رمی ہیں۔ اِس سات کے عدد میں رُوحانی مدارج کی تکمیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہ اِس کے بھی سات ہی درجے ہیں جن کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ سورۂ مومنوں میں ان درجات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اِسی طرح حجر اسود کو بوسہ دینا بھی ایک تصویری زبان ہے۔ بوسہ کے ذریعہ انسان اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ میں اس وجود کو جس کو میں بوسہ دے رہا ہوں اپنے آپ سے جدا رکھنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے جسم کا ایک حصّہ بن جائے۔ غرض حج ایک عظیم الشان عبادت ہے جو ایک سچے مومن کے لئے ہزاروں برکات اور انوار کا موجب بنتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آجکل مسلمان صرف رسمی رنگ میں یہ فریضہ ادا کرنے کی وجہ سے اسکی برکات سے پوری طرح متمتع نہیں ہوتے۔

اَلَدُّ الْخِصَامِ

۱۱ے حل لغات : اَلَدُّ الْخِصَامِ : اَلَدُّ لَدَّ يَلِدُّ سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور اَلَدُّ کے معنے ہیں اَلشَّدِيْدُ الْخُصُوْمَةِ ۔ وہ دشمن جو دشمنی میں بہت بڑھا ہُوا ہو۔ خِصَامٌ یہ مصدر ہے جس کے معنے مجادلہ یعنی جھگڑے کے ہیں۔

تفسیر: - فرماتا ہے۔ دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں کہ جب وہ کسی مجلس میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرتے ہیں تو تم سمجھتے ہو واہ وا یہ کتنے عقلمند اور سمجھدار ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے سارے علوم پر حاوی ہیں اور اُنکی عقل کو کوئی پہنچ نہیں سکتا اور پھر وہ اپنی دینداری کے متعلق اتنا یقین لوگوں کو دلاتے ہیں کہ کہتے ہیں خدا کی قسم ہمارے دل میں جو نیکیاں بھری ہوئی ہیں اُنکو کوئی نہیں جانتا ہم سے مشورہ لیا جائے تو ہم یُوں کر دیں وُوں کر دیں۔ مگر فرماتا ہے حقیقت کیا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ بدترین دشمن جو تمہارے ہو سکتے ہیں۔ وہ اُن سے بھی زیادہ جھگڑالو اور خطرناک ہوتا ہے۔ ... ہوتا تمہارے ساتھ ہے وہ مسلمان کہلاتا ہے اور جب کسی مجلس میں بیٹھ جاتا ہے تو ساری مجلس پر چھا جاتا ہے اور اپنی دینداری اور تقویٰ پر قسمیں کھاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا دل تو قوم کے لئے گھلا جا رہا ہے۔ جب دیکھنے والا اسے دیکھتا ہے اور سُننے والا اُس کی باتیں سُنتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ قطب الاقطاب بیٹھا ہے

وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ

اور جب حاکم ہو جاتے ہیں تو فساد (پیدا) کرنے ... اور کھیتی (باڑی) اور

الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۶﴾

مخلوق کو ہلاک کرنے کی غرض سے (سارے) ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں - حالانکہ اللہ (تعالیٰ) فساد کو پسند نہیں کرتا - ۱۱۸

گر فرماتا ہے - دنیا میں تمہارے یہودی بھی دشمن ہیں - عیسائی بھی دشمن ہیں اور قومیں بھی دشمن ہیں مگر یہ اُن سے بھی بڑا اور خطرناک دشمن ہوتا ہے - بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کا ایک مجسمہ ہے لیکن معاملہ برعکس ہوتا ہے - وہ کوئی دینی نکتے بیان نہیں کرتا بلکہ دنیوی امور کے متعلق ایسی باتیں کرتا ہے جو بظاہر تو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر درحقیقت اُن کی تہہ میں منافقت کام کر رہی ہوتی ہے - اور پھر اس کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا گواہ ہے میرے دل میں تو اخلاص ہی اخلاص ہے اور میں تو محض اپنے دوستوں کی خیر خواہی اور بھلائی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوں - فرماتا ہے - تم ایسے شخص کی چکنی چپڑی باتوں سے کبھی دھوکا نہ کھاؤ - اور جب بھی تمہیں کوئی ایسا شخص نظر آئے - فوراً لاحول پڑھ کر اس سے علیحدہ ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ تمہارے سامنے ایک شیطان بیٹھا ہے جو قسمیں کھا کھا کر اور اپنی خیر خواہی کا لوگوں کو یقین دلا دلا کر انہیں دھوکا اور فریب دے رہا ہے -

۱۱۸ حل لغات: - تَوَلّٰی : وَلِیَ سے باب تفعّل ہے اور اَلتَّوَلِّیْ کے معنے ہیں اَلْاِنْصِرَافُ بِالْبَدَنِ اَوِ الْقَوْلِ - بدن کے ساتھ پھر جانا یعنی پیٹھ پھیر لینا - مرتد ہو جانا یا اپنی بات سے پھر جانا - حاکم اور والی بن جانا -

اَلْحَرْثُ : کے معنے ہیں مَا یَسْتَنْبِتُ بِالْبَذْرِ وَ النَّوٰی وَالْغَرْسِ - یعنی جو چیز بیج گٹھلی یا پودے سے اُگائی جائے (اقرب)

نَسْل کے معنے ہیں (۱) عقب یعنی اولاد - بیٹے بیٹیاں - (۲) مخلوق (۳) اگلی نسل یعنی صرف بیٹوں تک ہی نہیں بلکہ دس دس بیس بیس پشتوں تک جو اولاد چلتی ہے - اُسے بھی نسل ہی کہتے ہیں -

تفسیر: - فرمایا - ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں بادشاہت مل جاتی ہے یعنی وہ خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ طاقتوں سے کام لے کر حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ رعایا اور ملک کی خدمت کریں بجائے اس کے کہ لوگوں کے دلوں میں سکینت اور اطمینان پیدا کریں وہ ایسی تدابیر اختیار کرنی شروع کر دیتے ہیں جن سے قومیں قوموں سے - قبیلے قبیلوں سے اور ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے لڑنے جھگڑنے لگ جاتے ہیں اور ملک میں طوائف الملوکی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے - اسی طرح ▪▪ ایسے طریق اختیار کرتے ہیں جن سے ملک کی تمدنی اور اخلاقی حالت تباہ ہو جاتی ہے اور آئندہ نسلیں بیکار ہو جاتی ہیں حرث کے لغوی معنے تو کھیتی کے ہیں مگر یہاں حرث کا لفظ استعارۃً وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے - اور بتایا گیا ہے کہ جتنے ذرائع ملک کی تمدنی حالت کو بہتر بنانے والے ہوتے ہیں ان ذرائع کو اختیار کرنے کی بجائے وہ ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے تمدن تباہ ہو - اقتصاد برباد ہو - مالی حالت میں ترقی نہ ہو - اس طرح وہ نسلِ انسانی کی ترقی پر تبر رکھ دیتے ہیں - اور ایسے قوانین بناتے ہیں جن سے آئندہ پیدا ہونے والی نسلیں اپنی طاقتوں کو کھو بیٹھتی ہیں - اور

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ

اور جب انہیں کہا جائے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو (اپنی) عزت (کی پچ) انہیں گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے

فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۷﴾

پس اس (قسم کے لوگوں) کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ یقیناً بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ ۱۱۹ھ

ایسی تعلیمات جن کو سیکھ کر وہ ترقی کر سکتی ہیں ان سے محروم رہ جاتی ہیں۔

پھر فرماتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا۔ اس لئے ایسے بادشاہ اور حکمران خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مغضوب ہیں اور وہ ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک وہی بادشاہ صحیح معنوں میں بادشاہ کہلا سکتا ہے جو لوگوں کے لئے ہر قسم کا امن مہیا کرے۔ ان کی اقتصادی حالت کو درست کرے اور اُنکی جانوں کی حفاظت کرے۔ کیا بلحاظ صحت کا خیال رکھنے کے اور کیا بلحاظ اس کے کہ غیر ضروری جنگیں نہ کرے اور اپنے ملک کے افراد کو بلاوجہ مرنے نہ دے۔ گویا ہر قسم کے امن اور جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسلام کے نزدیک حکومت پر عاید ہوتی ہے۔ اور وہ اس امر کی پابند ہے کہ ملک کی ترقی اور رعایا کی بہبودی کا ہمیشہ خیال رکھے۔

۱۱۹ھ حل لغات :- اِتَّقِ : وَقٰى يَقِيْ سے باب افتعال کا امر کا صیغہ ہے۔ اس کے اصل معنے یہ ہیں کہ انسان اُس چیز سے جو سامنے سے آ رہی ہو بچنے کے لئے ہٹ جائے مگر یہ معنے اسجگہ چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ انسان خدا تعالےٰ سے نہیں بچ سکتا۔ خواہ وہ کسی جگہ چلا جائے۔ بہرحال دوسرے معنے ہی لینے پڑیں گے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنا لے۔

اَخَذَتْهُ : اَلْاَخْذُ کے معنے ہیں حَوْزُ الشَّيْءِ وَتَحْصِيْلُهٗ ..... وَتَارَةً بِالْقَهْرِ۔ کسی چیز کو زبردستی لے لینا یا حاصل کرنا یا پکڑ لینا (اقرب) اور اَخَذَتْهُ بِكَذَا کے معنے ہیں حَمَلَتْهُ عَلٰى كَذَا۔ اُسے کسی کام پر اکسا دیا یا اُس کی ترغیب دی۔

اَلْعِزَّةُ : وَرُبَّمَا اسْتُعِيْرَتِ الْعِزَّةُ لِلْحَمِيَّةِ وَالْاَنَفَةِ الْمَذْمُوْمَةِ۔ وَمِنْهُ فِي الْقُرْاٰنِ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ (اقرب) یعنی بعض اوقات عِزَّة کا لفظ بطور استعارہ جھوٹی غیرت اور پچ کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ کے معنے یہ ہوئے کہ جھوٹی قومی غیرت نے اُسے گناہ کی خاطر گھیر لیا یا اُسے گناہ پر آمادہ کر دیا۔

جَهَنَّمُ : دَارُ الْعِقَابِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔ یعنی جہنم موت کے بعد سزا کی جگہ کا نام ہے (اقرب) جہنّم کے لئے قرآن کریم میں اور بھی کئی لفظ آتے ہیں۔ جیسے جَحِيْم۔ سَعِيْر۔ سَقَرْ۔ لَظٰی وغیرہ

مِهَاد - وہ جگہ جہاں انسان تھک کر آرام کرے۔ جیسے بستر وغیرہ۔

تفسیر :- فرماتا ہے۔ جب اُسے کہا جائے کہ تم اللہ تعالےٰ سے ڈرو۔ تم تو دو کوڑی کے بھی آدمی نہیں تھے۔ تمہیں تو جو کچھ ملا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے احسان کی وجہ سے ملا ہے۔ تو اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ اُسے اپنی جھوٹی عزت کی پچ گناہوں پر اور زیادہ دلیر کرتی ہے۔ اس کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ اُس کے پہلے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰۸)

اور بعض آدمی ایسے (بھی) ہوتے ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان کو (ہی) بیچ ڈالتے ہیں - اور اللہ (اپنے ایسے مخلص) بندوں پر بڑی شفقت کرنیوالا ہے۔ ۱۲۰

گناہوں اور شامت اعمال کی وجہ سے ہتکِ عزت کا جنون اُس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اور اُسے ہدایت سے اور زیادہ دُور پھینک دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اپنی عزت کی پچ اُسے گناہوں کے لئے پکڑ لیتی ہے یعنی اس سے اور زیادہ گناہوں کا ارتکاب شروع کرا دیتی ہے۔ فرماتا ہے۔ یہاں ممکن ہے تم لوگوں کو فریب دے لو لیکن آخر جہنم تمہارا ٹھکانہ ہے۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ - اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ جہنم بے شک اگلے جہان میں ہے۔ لیکن ایک جہنم ایسے انسانوں کے لئے اِس جہان میں بھی پیدا کر دیا جاتا ہے۔ جب شریف انسان مقابلہ میں کھڑے ہو جائیں تو انہیں ایسا جواب مِل جاتا ہے کہ یہی دنیا اُن کے لئے جہنم بن جاتی ہے افسوس ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ صرف اس لئے اپنی اصلاح نہیں کر سکتے کہ جب انہیں اُن کی غلطی بتائی جائے اور کہا جائے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ تو اپنی ہتکِ عزت کے خیال سے وہ دیوانہ ہو کر بجائے نصیحت سے فائدہ اٹھانے کے ناصح کا مقابلہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کسی میں کوئی غلطی یا نقص دیکھے بازار میں کھڑے ہو کر اُسے تنبیہ کرنا شروع کر دے۔ سمجھانا ہمیشہ علیحدگی میں چاہیئے۔ اور سمجھانے والے کو اپنی حیثیت اور قابلیت بھی دیکھنی چاہیئے کہ وہ جس شخص کو سمجھانا چاہتا ہے اُسے سمجھانے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ تاکہ اُس کا اُلٹا نتیجہ نہ نکلے غرض جہاں غلطی کرنے والوں کو برداشت کی طاقت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے اور سمجھانے والے کی بات کو ٹھنڈے دل سے سُننا چاہیئے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ سمجھانے والا احتیاط سے کام لے۔ یہ نہ ہو کہ وہ جس کو چاہے لوگوں میں ذلیل کرنا شروع کر دے۔ اس مثال کو حج کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ حج کی بڑی غرض قومی تفرقوں کو مٹا کر اتفاق و اتحاد اور محبت و یگانگت کے تعلقات کو بڑھانا ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا میں لڑتے جھگڑتے اور فساد پیدا کرتے رہتے ہیں۔ انہیں متوجہ کیا گیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ساری دنیا کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے تو انہیں بھی چاہیئے کہ وہ اتفاق و اتحاد قائم رکھیں اور اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے کینے اور بغض چھوڑ دیں۔ درحقیقت صحیح معنوں میں حج کرنے والا صرف وہی شخص کہلا سکتا ہے جو اس قسم کے فتنہ و فساد سے مجتنب رہے۔ لیکن جو شخص فساد کرتا اور بنی نوع انسان کو دُکھ پہنچاتا ہے۔ وہ اپنے عمل سے اس وحدت اور مرکزیت کو نقصان پہنچاتا ہے جس کو قائم کرنے کے لئے اسلام نے حج بیت اللہ کا حکم دیا ہے۔

۱۲۰ حل لغات :- يَشْرِيْ : شَرٰى سے مضارع کا صیغہ ہے اور شَرٰى کے معنے خریدنے اور بیچنے دونوں کے ہوتے ہیں۔ (اقرب)

يَشْرِيْ

رَءُوْفٌ : رَءُوْفٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ رَءُوْفٌ رَأْفَةٌ سے ہے اور رأفت کے معنے تکلیف کو دیکھ کر اس کے دُور کرنے کی طرف توجہ کرنے کے ہیں۔ رأفت اور رحمت دونوں ہم معنے لفظ ہیں مگر رحمت وسیع ہے اور رأفت قدرے محدود ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر اُسے چھڑانا۔ پس رؤف کے معنے ہوئے

رَءُوْفٌ

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ص وَلَا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم سب کے سب فرمانبرداری (کے دائرہ) میں آجاؤ۔ اور

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ط اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۲۰۹)

شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وہ یقیناً تمہارا کھلا (کھلا) دشمن ہے۔ سے ۱۲۱

تکلیف میں دیکھکر چھڑانے والا۔ رحمت دُکھ سُکھ دونوں کے لئے ہوتی ہے۔ مگر رأفت ہمیشہ دُکھ پر ہی ہوتی ہے۔ گویا رحمت عام ہے اور رأفت خاص۔

تفسیر:- اِس مثال میں بتایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ اُسے بھی خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جان کو بھی قربان کرنے پر تیار رہتے ہوں وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کیلئے کب کوئی قدم اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ مثال دیکر اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تمہیں بھی آخر الذکر گروہ کا سا طریق اختیار کرنا چاہیئے اور نہ صرف فتنہ و فساد سے مجتنب رہنا چاہیئے بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دینا چاہیئے۔

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑی شفقت کرنے والا ہے۔ اُس کی شفقت کا تقاضا ہے کہ تم بھی فتنہ و فساد سے بچو۔ اور اپنی زندگیوں کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کرو تاکہ تم بھی رؤف بالعباد خدا کے مظہر بن جاؤ۔

سے ۱۲۱ حل لغات:- اَلسِّلْمُ کے معنے ہیں اَلصُّلْحُ۔ اَلسَّلَامُ وَالْاِسْلَامُ (اقرب) یعنی (۱) صلح (۲) امن کو قائم کرنا (۳) اسلام۔

اَلسِّلْمُ

كَآفَّةً۔ کَفَّ کے معنے ہیں جمع کرنا۔ روکنا۔ پس كَآفَّةً کے معنے جمع کرنے والے یا روکنے والے کے ہیں۔

كَآفَّةً

تفسیر:- فرماتا ہے۔ اے مومنو! تم سارے کے سارے پورے طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ اور اس کی اطاعت کا جوا اپنی گردنوں پر کامل طور پر رکھ لو۔ یا اے مسلمانو تم اطاعت اور فرمانبرداری کی ساری راہیں اختیار کرو۔ اور کوئی بھی حکم ترک نہ کرو۔ اِس آیت میں كَآفَّةً اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا بھی حال ہو سکتا ہے اور اَلسِّلْمِ کا بھی۔ پہلی صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ یعنی تمہارا کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو اطاعت اور فرمانبرداری کے مقام پر کھڑا نہ ہو۔ یا جس میں بغاوت اور نشوز کے آثار پائے جاتے ہوں۔ دوسری صورت میں اس کے یہ معنے ہیں کہ تم پورے کا پورا اسلام قبول کرو۔ یعنی اس کا کوئی حکم ایسا نہ ہو جس پر تمہارا عمل نہ ہو۔ یہ قربانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر مومن سے چاہتا ہے کہ انسان اپنی تمام آرزوؤں تمام خواہشوں اور تمام اُمنگوں کو خدا تعالیٰ کے لئے قربان کر دے اور ایسا نہ کرے کہ جو اپنی مرضی ہو وہ تو کرلے اور جو نہ ہو وہ نہ کرے۔ یعنی اگر شریعت اس کو حق دلاتی ہو تو کہے میں شریعت پر چلتا ہوں اور اُسی کے ماتحت فیصلہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر شریعت اس سے کچھ دلوائے اور ملکی قانون نہ دلوائے تو کہے کہ ملکی قانون کی رُو سے فیصلہ ہونا چاہیئے۔ یہ طریق حقیقی ایمان کے بالکل منافی ہے۔ چونکہ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ مسلمانوں میں بعض ایسے کمزور لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو قومی ترقی اور رفاہیت کے دور میں فتنہ و فساد پر اُتر آتے ہیں۔ اور وہ بھول جاتے ہیں کہ ہماری پہلی حالت کیا تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں کیا کچھ عطا کر دیا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ

اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس کھلے (کھلے) نشان آئے ڈگمگا گئے تو

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۱۰﴾

جان لو کہ اللہ یقیناً غالب (اور) حکمت والا ہے۔ ۱۲۲ے

مسلمانوں کو نصیحت فرماتا ہے کہ بے شک تم مومن کہلاتے ہو مگر تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف مونہہ سے اپنے آپ کو مومن کہنا تمہیں نجات کا مستحق نہیں بنا سکتا۔ تم اگر نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ اوّل ہر قسم کی منافقت اور بے ایمانی کو اپنے اندر سے دُور کرنے کی کوشش کرو۔ اور قوم کے ہر فرد کو ایمان اور اطاعت کی مضبوط چٹان پر قائم کر دو۔ دوّم صرف چند احکام پر عمل کر کے خوش نہ ہو جاؤ۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے تمام احکام پر عمل بجا لاؤ۔ اور صفاتِ الٰہیہ کا کامل مظہر بننے کی کوشش کرو۔

پھر فرماتا ہے وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ تم شیطان کے پیچھے نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس آیت میں خطوات کا لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ شیطان ہمیشہ قدم بقدم انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ کبھی یکدم کسی انسان کو بڑے گناہ کی تحریک نہیں کرتا۔ بلکہ اسے بدی کی طرف صرف ایک قدم اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور جب وہ ایک قدم اُٹھا لیتا ہے تو پھر دوسرا قدم اُٹھانے کی تحریک کرتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اور قدم بقدم اُسے بڑے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے پس فرماتا ہے۔ ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں کہ تمہارا صرف چند احکام پر عمل کر کے خوش ہو جانا اور باقی احکام کو نظر انداز کر کے سمجھ لینا کہ تم سچے مسلمان ہو ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ اگر تم اسی طرح احکامِ الٰہیہ کو نظر انداز کرتے رہے تو رفتہ رفتہ جن احکام پر تمہارا اب عمل ہے۔ ان احکام پر بھی تمہارا عمل جاتا رہیگا۔ پس اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہو۔ اور شیطانی وساوس سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرو۔

۱۲۲ے تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اگر تم اپنی اصلاح نہیں کرو گے۔ اور طاقت اور قوت حاصل کرنے کے بعد بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کی بجائے اُن پر ظلم کرنا شروع کر دو گے۔ اور انہیں مالی اور جسمانی نقصانات پہنچاؤ گے تو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تمہارے سر پر ایک غالب خدا موجود ہے جو تمہیں سزا دینے کی بھی طاقت رکھتا ہے اور تم سے تمہارا اقتدار بھی چھین سکتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ سے ڈرو جو ایک دم میں تمہیں بادشاہ سے گدا اور امیر سے فقیر بنا سکتا ہے اور تمہاری عزت کو ذلت سے بدل سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی حکیم کہہ کر بتایا کہ اس کا کوئی فعل ظالمانہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہر کام کے پیچھے بڑی بڑی حکمتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ پس اس کی سزا بھی ظالمانہ نہیں ہوتی بلکہ انسانی اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔ اگر لوگ اپنی زندگی چھوڑ دیں۔ اور خدا تعالیٰ سے سچا تعلق پیدا کر لیں۔ اور بنی نوع انسان کی خدمت اپنا شعار بنا لیں اور سچائی اور راستی اور دیانت اور امانت کو اختیار کر لیں۔ اور ہر قسم کا کھوٹ اپنے دلوں میں سے نکال دیں اور پاک باطن اور نیک دل اور با اخلاق اور خدا ترس بن جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحم کرتا اور اُنکی تضرعات کو سنتا اور اُن کی ناکامیوں اور ذلتوں کو کامیابیوں اور عزتوں میں بدل دیتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

۲۱۱ (لوگ) اس کے سوا کس (بات) کا انتظار کررہے ہیں کہ اللہ (تعالیٰ) اُن کے پاس بادلوں کے سایوں میں آئے اور فرشتے بھی (آئیں)

وَقُضِىَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۲۱۱

۲۵ ع ۹

اور بات کا فیصلہ کردیا جائے۔ اور تمام امور اللہ ہی کی طرف پھیرے جاتے ہیں [۱۲۳]

سَلْ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ

(ذرا) بنی اسرائیل سے پوچھو (تو) کہ ہم نے انہیں کتنے کھلے کھلے نشان دیئے

بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا

تھے اور جو شخص اللہ کی (کسی) نعمت کو بعد اس کے کہ وہ اُسے حاصل ہوجائے

۱۲۳ تفسیر: - اس میں بتایا کہ یہ کفار جو مسلمانوں کی مخالفت کررہے ہیں اور منافق جو اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں اور اسلام کی تباہی کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بظاہر تو اس بات کے منتظر ہیں کہ کب وہ دن آئے کہ اسلام دنیا سے مٹ جائے اور خدائے واحد کی حکومت پر شیطانی طاقتیں غلبہ حاصل کریں۔ لیکن درحقیقت اپنے عمل سے وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے پاس بادلوں کے سایوں میں آئے۔ یعنی اپنی مخفی تدبیر سے ان کی ہلاکت اور بربادی کے سامان پیدا کردے۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ آسمان سے اُس کے فرشتے نازل ہوں جو انہیں کچل کر رکھ دیں۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی ایسا نشان ظاہر ہو جس کے نتیجہ میں یہ روز روز کے جھگڑے مٹ جائیں اور خدا تعالیٰ کا آخری فیصلہ ایک چمکتے ہوئے نشان کی صورت میں سب کو نظر آجائے۔ اور آخر ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ خدا ان کی آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوگا اور اُن کی ہلاکت کی ساعت اُن کے سروں پر منڈلانے لگے گی۔ چنانچہ جنگِ بدر میں خدا تعالیٰ نے بادلوں میں سے ہی اپنا چہرہ ظاہر کیا۔ یعنی ابھی جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ بارش ہوئی جس سے کفار کو شدید نقصان اور مومنوں کو جنگی لحاظ سے عظیم الشان فائدہ پہنچا اور پھر مومنوں کی مدد اور کفار پر رُعب طاری کرنے کے لئے ملائکہ بھی دلوں پر نازل ہوئے۔ بلکہ جنگِ بدر میں کئی کفار نے ملائکہ کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا۔ اور قُضِيَ الْاَمْرُ کے ماتحت عرب کے سردار چُن چُن کر مارے گئے۔ یہاں تک کہ وہ بھی جسے وہ سید الوادی کہتے تھے دو انصاری لڑکوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور مکہ میں ایسا کہرام مچا کہ کوئی گھر نہ تھا جس میں ماتم نہ پڑا ہو۔ اور گو یہود پر اس کا براہ راست کوئی اثر نہیں پڑا مگر اس جنگ کے نتیجہ میں ہی اُن کی شرارتیں ظاہر ہوئیں۔ اور آخر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں ہلاک ہوگئے۔ غرض اُن کا مُنہ مانگا نشان انہیں مل گیا۔ اور اُن کی شوکت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی اور پھر یہی سلوک بعد میں پیدا ہونے والے دشمنوں سے بھی ہوتا رہا اور خدا تعالیٰ انہیں اپنی قہری تجلی کے جلوے بار بار دکھاتا رہا یہاں تک کہ اسلام دنیا پر غالب آگیا۔

جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۲﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ

(اور وہ اس حقیقت کو سمجھ چکا ہو) بدل ڈالے تو (وہ یاد رکھے کہ) اللہ (بھی) سخت سزا دینے والا ہے۔ ۱۲۴؎ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا

كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

ہے انہیں دنیوی زندگی خوبصورت کرکے دکھائی گئی ہے۔ اور وہ اُن لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں ٹھٹھا کرتے ہیں۔ اور

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ

(اس کے بالمقابل) جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے وہ (ان) کفار پر قیامت کے دن غالب ہونگے۔ اور اللہ

۱۲۴؎ **تفسیر**:۔ میں ترتیب مضمون کو بیان کرتے ہوئے اوپر بتا چکا ہوں کہ اس جگہ یہود مخاطب ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس پیشگوئی پر بحث ہو رہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے متعلق تھی۔ اور آپ کو اس پیشگوئی کا مصداق ثابت کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اسی تسلسل میں اللہ تعالیٰ نے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں فتح مکہ کی پیشگوئی کی۔ یہ پیشگوئی اس وقت کی گئی تھی جبکہ مکہ پر کفار کا غلبہ اور حکومت تھی اور مسلمان مدینہ میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے الہام کے ذریعے بتایا کہ ایک وقت آئیگا جب تم مکہ فتح کر لوگے اور تمہارے لئے حج بیت اللہ کے راستے بالکل کھل جائیں گے۔ پھر اسی ضمن میں صلح حدیبیہ کی بھی پیشگوئی کی کیونکہ بتایا کہ اگر تمہیں عمرہ سے روکا جائے تو تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ گویا پہلے سے پیشگوئی کر دی کہ تمہیں ایک زمانہ میں عمرہ کرنے سے بھی روکا جائیگا۔

اسی طرح مَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں یہ اشارہ مخفی تھا کہ مکہ ایک دن تمہارے لئے گھر کے طور پر بننے والا ہے۔ غرض ان آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ مکہ کے دروازے تمہارے لئے کھلنے والے ہیں۔ اور تم اس میں امن سے داخل ہوگے۔ چنانچہ فتح مکہ سے پہلے ہی فرما دیا کہ فَاِذَا اَمِنْتُمْ جب تم امن میں آجاؤ تو ایسا کرو۔

اب ان پیشگوئیوں کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم ان سے پوچھو کہ ہم نے انہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے کس قدر کھلے نشانات دکھائے ہیں اور یہ جو ہم نے فتح مکہ کی پیشگوئی کی ہے یہ بھی ایک زبردست نشان ہے جس سے ثابت ہو جائیگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ پس وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی عظیم الشان نعمت یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی ناقدری کرتے ہوئے اسے مٹانے کے لئے کھڑے ہیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سخت سزا دیگا۔ چنانچہ فتح مکہ کے ساتھ ہی یہود کی بھی انتہائی ذلت ہوئی اور وہ بھی تباہ ہوتے چلے گئے۔

اس آیت کا ایک یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے یہود کو پہلے بھی بہت سی نعمتیں عطا فرمائی تھیں جن کی انہوں نے ناشکری کی۔ مثلاً سب سے بڑی نعمت تو ان پر یہی نازل ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے متواتر انبیاء ان میں مبعوث فرمائے

يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۳﴾ كَانَ النَّاسُ

جسے پسند کرتا ہے اُسے بے حساب دیتا ہے۔ ۱۲۵ سب لوگ

أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ

ایک ہی (خیال کے) تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبشر اور

مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ

منذر بنا کر بھیجا اور اُن کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی تاکہ وہ (یعنی اللہ) لوگوں کے

لیکن یہود نے ہمیشہ اُن کی تکذیب کی اور اُن کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ بعض انبیاء کو انہوں نے جان سے بھی مار ڈالا۔ یہ خدا تعالیٰ کی نعمت کی ایک عظیم الشان ناشکری تھی جو اُن سے ظاہر ہوئی۔ اسی طرح عیسائیوں نے جو یہود کی ایک شاخ ہیں اس قدر ناشکری کی کہ شریعت کو لعنت قرار دے دیا۔ غرض یہود کی اِن متواتر سرکشیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتِ نبوت اُن سے واپس لے لی کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا الٰہی سنّت کے مطابق وہ نعمتیں اس سے چھین لی جاتی ہیں اور اُسے رنج و غم اور حسرت و یاس کے لمبے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

۱۲۵ تفسیر:۔ فرمایا۔ یہ لوگ ابھی اس پیشگوئی کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ دنیا اپنی تمام دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی ہے اور طاقت اور دولت کے نشہ نے اِن کی نگاہوں کو ایسا تیز کر رکھا ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں ہم مسلمانوں سے کہاں شکست کھا سکتے ہیں بلکہ وہ ان پیشگوئیوں پر مسلمانوں سے تمسخر کرتے اور ان کا مضحکہ اُڑاتے ہیں اور انہیں طعنے دیتے ہیں کہ ہمیں تو نقد مل رہا ہے۔ تمہارا انعام کہاں ہے مگر ایک دن ان کو معلوم ہو جائیگا کہ ہم کس طرح مسلمانوں کو غلبہ عطا کرتے اور کفّار کو نیچا دکھاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جب قیامت کا دن آئیگا تو متقی لوگ ان کفّار پر غالب ہونگے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کا نظارہ اُس قیامت کے دن بھی ہوگا جو مرنے کے بعد آنے والا ہے جبکہ کفّار دوزخ میں جائیں گے اور مومن جنّت میں اور وہ ہمیشہ کے لئے فوق ہو جائیں گے کیونکہ آخرت میں مقابلہ تو ہے نہیں کہ دوزخی جنتیوں پر کسی قسم کی فوقیت لے جا سکیں۔ مگر اُس قیامت کے دن سے لوگ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے اور نہ اسے حجّت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اس آیت میں اس غلبہ کو بطور دلیل صداقت پیش کیا گیا ہے۔ پس اِس آیت میں یوم قیامت سے مراد وہی دن ہے جس دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی اور کفّار کو شکست جس دن دنیا نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ وہ جو اکیلا اور بے یار و مددگار تھا اور قوم کے ظلموں کا نشانہ بنا ہوا تھا وہ تو حاکم ہو گیا اور جو ملک کے بادشاہ اور حکمران تھے محکوم اور ذلیل ہو گئے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا کے الفاظ میں مومنوں کو بھی اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کفّار پر حقیقی غلبہ حاصل

بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِیْهِ

درمیان ان باتوں کے متعلق جن میں انہوں نے اختلاف پیدا کر لیا تھا فیصلہ کرے ۔ اور (ہوا یہ کہ) خود انہی لوگوں نے

اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ

جنہیں وہ (کتاب) دی گئی تھی اس کے بعد کہ اُن کے پاس کھلے (کھلے) نشان آ چکے تھے آپس کی سرکشی (اور فساد)

بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا

کی وجہ سے اس (یعنی کتاب) کے بارہ میں اختلاف کیا ۔ پس اللہ (تعالیٰ) مومنوں کو اپنے حکم سے اس صداقت تک

کرنے کے لئے سب سے بڑی چیز جس کی تمہیں ضرورت ہے وہ تقویٰ ہے ۔ بیشک ایمان بھی ایک قیمتی دولت ہے لیکن اگر اس ایمان کے مطابق عمل نہیں تو وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتا ۔

وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ میں بغیر حساب کے الفاظ کفار کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ہیں ۔ اور جب کوئی چیز بے حساب ملے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بدلہ سے بہت زیادہ ہے ۔ حساب کرکے تو جتنا کسی کا حق بنتا ہے اتنا ہی دیا جاتا ہے مگر بغیر حساب کے اسی صورت میں دیا جاتا ہے جب حق سے زیادہ دیا جائے ۔ پس ان الفاظ میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ مومنوں کو ان کے بدلے سے بہت بڑھ چڑھ کر انعام ملیگا ۔ دوسرے اس میں کفار کو بتایا کہ تم کو جو کچھ ملا ہے اس کے متعلق تو تم سے پوچھا جائے گا کہ کس کس طرح خرچ کیا ہے ۔ لیکن ان کو اس طرح ملے گا کہ ان سے حساب بھی نہیں لیا جائیگا ۔ گویا تم کو تو ملازموں کی طرح ملا ہے اور تم اس میں خیانت کرکے سزا کے مورد بنتے ہو ۔ لیکن ان کو ہدیہ کے طور پر ملیگا ۔ اور اس میں تصرف کا ان کو اختیارِ کامل ہوگا ۔ دراصل سلوک دو قسم کا ہوتا ہے ایک دوستانہ اور دوسرا ملازمانہ ۔ چونکہ دوستی میں غیریت باقی نہیں رہتی اس لئے فرمایا کہ ہم مومنوں کو بغیر حساب دینگے اور ان سے ایسا سلوک کرینگے جو ایک دوست دوست سے کرتا ہے ۔ چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار آدمی بغیر حساب کے جنّت میں داخل ہونگے لیکن جس کے ساتھ غیریت کا معاملہ ہو اس سے سختی کے ساتھ حساب لیا جاتا ہے ۔ اور حساب ہی کے مطابق اسے معاوضہ دیا جاتا ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم میں کفار کے متعلق یہ الفاظ کہیں استعمال نہیں ہوئے کہ انہیں بغیر حساب دیا جائیگا بلکہ اُن کے متعلق جہاں بھی آیا ہے یہی آیا ہے کہ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک دفعہ فرمایا مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ یعنی وہ شخص جس کا سختی سے حساب لیا گیا وہ تباہ ہوا ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات سُنی تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ کیا قرآن میں یہ نہیں آتا کہ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومنوں کا بھی حساب ہوگا ۔ آپ نے فرمایا ۔ حساب سے مراد یہ ہے کہ پوری طرح حساب لیا جائے ۔ ورنہ مومن کا حساب تو محض سرسری ہوگا ۔ (بخاری کتاب الرقاق) پس مومنوں کو جو کچھ ملے گا بغیر حساب کے ہی ملے گا ۔

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ

لے گیا جس کے بارہ میں دوسروں نے اختلاف سے کام لیا تھا ۔ اور اللہ جسے پسند کرتا ہے

يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۴)

سیدھی راہ پر چلا دیتا ہے ۔ ۱۲۶

اسی طرح بغیر حساب کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ختم ہونے والا انعام ملیگا ۔ اور چونکہ یہ آیت اس دنیا کے غلبہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اس لئے وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اُن کی قربانیوں سے بہت زیادہ اجر عطا فرمائیگا ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی غلامی میں اس دنیا میں جو کچھ ملا بے حساب ہی ملا ۔ بے شک اُن کی قربانیوں کی چمک بھی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ہے ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جو انہیں دینی اور دنیوی رنگ میں غیر معمولی اجر عطا فرمایا وہ اُن کی قربانیوں سے بہت زیادہ تھا ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو مادی رنگ میں انہیں تختِ شاہی پر بٹھا دیا اور دوسری طرف روحانی رنگ میں انہیں ایسی برکات سے نوازا کہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا دائمی سرٹیفکیٹ انہیں حاصل ہو گیا ۔

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ میں کفار کے اس شبہ کا بھی ازالہ کیا گیا ہے کہ یہ مٹھی بھر مسلمان ہم پر کس طرح غالب آسکتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ جب کسی قوم پر اپنے انعامات نازل کرنا چاہتا ہے تو اسے بے حساب انعام دیا کرتا ہے ۔ بے شک تم حساب کی رو سے یہی سمجھتے ہو کہ ایک شخص دو پر غالب نہیں آسکتا ۔ مگر اللہ تعالیٰ کا سلوک مسلمانوں سے اس سے بالکل مختلف ہو گا ۔ ان کا ایک شخص تمہارے دو پر ہی نہیں بلکہ ان کا ایک آدمی تمہارے دس آدمیوں پر بھی غالب آجائیگا ۔ اور فتح و کامیابی کا پرچم لہراتے ہوئے واپس لوٹے گا ۔

۱۲۶ تفسیر :- اس آیت کے متعلق بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اور لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے ۔ آیا یہ کہ لوگ ایک اُمت تھے یعنی سب نیک تھے پھر نبی آئے اور اختلاف ہو گیا ۔ یا یہ کہ لوگ بد تھے اور پھر نبی آئے ۔ میرے نزدیک اس کے یہی معنے ہیں کہ لوگ بد تھے اور نبی آئے ۔ اس کی دلیل قرآن کریم سے تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ نبی لوگوں کی خرابی پر ہی بھیجتا ہے خود اس آیت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ لوگ بد تھے ۔ کیونکہ فرمایا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ نبی بشارتیں اور انذار لے کر آئے ۔ اور انذار کا ساتھ ہونا بتاتا ہے کہ خدا سے دُور لوگ موجود تھے ۔ دوسرا ثبوت اسی آیت سے یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ وہ نبی اس لئے آئے کہ جس بات میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اُس میں فیصلہ کریں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسائل کے متعلق اختلاف موجود تھا پس یہ بھی دلیل ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً سے یہ مراد نہیں کہ لوگ نیک تھے ۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً کیوں کہا ۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں آتا ہے کہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کفر بھی ایک ہی ملت ہے ۔ یعنی اصل الاصول کفر کا یہی ہے کہ خدا سے لوگوں کو دُور

کی جائے۔ جس طرح اسلام بھی ملّتِ واحدہ ہے یعنی سب اسلامی اُمتیں ایک ہیں۔ کیونکہ اُن کے اصول ایک ہیں۔ گو تفصیلِ شرائع میں اختلاف ہو۔ پس مِلَّةً واحدہ کہنے سے مراد انکا اتفاق یا باہمی محبت بتانا مدنظر نہیں بلکہ یہ مدنظر ہے کہ سب کافر ہی کافر تھے نیک لوگ اُن میں نہ تھے کیونکہ کفر کے مقابلہ میں دوسری جماعت درحقیقت مومنوں کی ہی ہوتی ہے۔ کافر آپس میں خواہ کتنے ہی مختلف الخیال ہوں پھر بھی اصل غرض جو خدا کا قرب پانا ہے اس کے متعلق سب کا ایک ہی رویہ ہوتا ہے اور سب اپنے اپنے دائرہ میں ایک ہی کام کر رہے ہوتے ہیں یعنی خدا سے لوگوں کو دُور کر دینا۔

یا یہ کہ کَانَ کے معنے "تھے" کے نہیں بلکہ "ہیں" کے ہیں۔ اور اس کا یہ مطلب ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اُمَّةً وَّاحِدَةً بنایا ہے۔ یعنی دوسرے حیوانات بھی اُمت ہیں مگر اُمتِ واحدہ نہیں ہیں۔ انسان مدنی الطبع ہے اور اسکو آپس میں مل کر رہنا پڑتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ اختلاف اور شقاق پیدا ہوتا ہے۔ بڑی نعمت کے ساتھ بڑے خطرات بھی ہوتے ہیں کیونکہ ایک دوسرے کی بدیاں بھی انسان اخذ کرتا ہے۔ جب تمدن کے یہ نقائص بڑھ جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نبی بھیجتا ہے جو اختلاف کو دُور کر دیں اور ملنے جلنے کی وجہ سے جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور ضد کی وجہ سے لوگ اپنا اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اس کی وہ اصلاح کریں۔ اگر کہا جائے کہ یہ معنے ہوتے تو چاہیئے تھا کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَتَشَاجَرُوْا وَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ فَا نے اس امر پر دلالت کر دی ہے کہ پچھلی بات پہلی بات کے نتیجہ میں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اُمَّةً وَّاحِدَةً ہونے کا نتیجہ نبیوں کی بعثت نہیں ہے۔ اس لئے یہاں لازماً مقدر تسلیم کرنا پڑیگا اور فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ اُس مقدر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ اللہ تعالیٰ نے اَلْکُتُبَ نہیں کہا بلکہ اَلْکِتٰبَ کہا ہے جس میں جنس کتاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہر نبی کو کوئی نہ کوئی کتاب ضرور دی جاتی ہے۔ خواہ نئی ہو یا پُرانی۔ یہ نہیں کہ ہر ایک کو الگ الگ کتاب ملے۔ بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر نبی کو الگ الگ کتاب دی جاتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی اس مضمون کی تائید نہیں کرتی اگر اَنْزَلَ کے لفظ سے یہ استدلال کیا جائے کہ ہر نبی پر کتاب اُتری ہے تو یہ لفظ تو قرآن میں غیر انبیاء کے لئے بھی استعمال ہُوا۔ پھر وہاں بھی یہی مراد لینی پڑے گی کہ انہیں بھی کتاب ملی تھی حالانکہ اسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ جیسے قرآن کریم میں آتا ہے وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران آیت ۷۳) یعنی اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مومنوں پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اُس پر دن کے ابتدائی حصہ میں تو ایمان لے آؤ۔ اور اُس کے پچھلے حصہ میں اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ذریعہ سے وہ بھی مرتد ہو کر اپنے دین کو چھوڑ دیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ جو کچھ نازل ہُوا مومنوں پر نازل نہیں ہُوا تھا بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہُوا تھا۔ پس اَنْزَلَ کا لفظ یہ ثابت نہیں کرتا کہ ہر نبی پر مستقل طور پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے۔ اور نہ اَلْکِتٰبَ کا لفظ اُن کے دعویٰ کو ثابت کرتا ہے۔ اگر ہر نبی صاحبِ کتابِ جدید ہوتا تو اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ کی بجائے اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكُتُبَ کہنا چاہیئے تھا مگر خدا تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا کیونکہ نبی تو لاکھوں آئے مگر لاکھوں کتابیں نازل نہیں ہوئیں۔

درحقیقت اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہر نبی جب بھی مبعوث ہُوا ہے تو کسی نہ کسی کتاب کے ساتھ مبعوث ہوا ہے

یعنی وہ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کی کتاب کو دنیا میں قائم کرے۔ یہاں اس امر کا کوئی ذکر نہیں کہ ہر نبی کو کوئی نئی کتاب دی گئی تھی۔ بلکہ صرف کتاب دیئے جانے کا ذکر ہے۔ اور کتاب پُرانی بھی ہو سکتی ہے اور نئی بھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک دوسرے مقام پر بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد متواتر انبیاء آتے رہے۔ مگر اُن کا کام صرف یہ تھا کہ وہ تورات کی ترویج کریں۔ اور اُس کے احکام پر لوگوں سے عمل کروائیں۔ پس یہ عقیدہ کہ ہر نبی ضرور کوئی نئی کتاب لاتا ہے نہ صرف قرآن کریم کے خلاف ہے بلکہ انبیاء کی ایک لمبی تاریخ بھی اس عقیدہ کو واضح طور پر ردّ کرتی ہے۔

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ میں يَحْكُمَ کی ضمیر غائب کا مرجع اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ اور رسول اور کتاب بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے یا رسول فیصلہ کرے یا کتاب فیصلہ کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے آنے سے پہلے بھی لوگوں میں اختلافات موجود ہوتا ہے جسے خدا یا اس کا رسول یا اُس کی کتاب آکر دُور کرتے ہیں۔ یہ ایک غلط خیال ہے جو لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے کہ انبیاء کے آنے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ اختلاف پیدا نہیں کرتے بلکہ اختلاف جو واقعہ ہو چکا ہوتا ہے اُسے مٹا کر وحدت پیدا کرتے ہیں۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ سے پھر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف درحقیقت بعد میں ہی ہوا۔ پہلے اُن میں کوئی اختلاف نہ تھا مگر یہ درست نہیں۔ کیونکہ مَا اخْتَلَفَ فِيهِ کے بعد إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ رکھ کر بتا دیا ہے کہ یہ اختلاف ہے جو کتاب کے بارہ میں ہے۔ کیونکہ أُوتُوهُ نے بتا دیا ہے کہ یہ کتاب کا ذکر ہے۔ پس اس آیت میں پہلے اختلاف کا ذکر نہیں بلکہ ایک اور اختلاف کا ذکر ہے جو نبیوں کی آمد سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلا اختلاف تو وہ تھا کہ جس کے باوجود اُن کو أُمَّةً وَاحِدَةً کہا تھا۔ لیکن اب صداقت کے متعلق اختلاف پیدا ہوا اور دلائل کے آنے کے بعد پیدا ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس اختلاف کا تو پہلے ذکر ہی نہیں۔ پھر اس آیت کا یہاں کیا جوڑ ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت ایک سوالِ مقدر کا جواب ہے جو پہلی آیت لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ سے پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ اگر نبیوں کی بعثت کی غرض اختلاف کو مٹانا تھا تو پھر اُن کی بعثت کا کیا فائدہ ہوا انہوں نے تو آکر اور اختلاف پیدا کر دیا اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ یہ اختلاف اور پہلا اختلاف مختلف ہیں۔ پہلا اختلاف ایسا تھا کہ جیسے مختلف بیماریاں ہوں اور دوا نہ ہو۔ اور دوسرا ایسا ہے کہ بیمار کو دوا دی جائے اور وہ نہ پیئے۔ پس پہلا اختلاف مجبوری کا تھا اور اُس کی تلافی ضروری تھی اور یہ اختلاف حق کے مقابلہ میں پیدا ہوا ہے۔ بہرحال اب حق تو ...... آ گیا ہے جس کو اگر لوگ چاہیں تو مان لیں۔ پس پہلا اختلاف خرابی ہی خرابی پیدا کرتا تھا اور یہ اختلاف ایسا ہے کہ اس میں ہدایت کی اُمید ہے کیونکہ حق موجود ہے۔ اب اگر اختلاف ہے تو صرف ضد کی وجہ سے ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف صرف إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ کو ہے۔ یعنی اس تعلیم سے جو ہم نے بھیجی ہے صرف اُن لوگوں کو اختلاف ہے جن کی طرف وہ کتاب آئی ہے یا تعلیم یا نبی آیا ہے۔ جو دوسرے لوگ ہیں اُن کو اس سے کوئی اختلاف نہیں اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اختلاف اُس نبی یا اُس کتاب یا اس تعلیم کے نتیجہ میں نہیں ہے کیونکہ اگر فی الواقعہ وہ تعلیم جو ہم نے بھیجی ہے یا نبی جو بھیجا ہے اختلاف کا موجب ہوتے تو جو لوگ بے تعلق ہیں مثلاً غیر اقوام جو اُن کی مخاطب نہیں یا بعد میں آنے والے لوگ وہ کیوں اُن کی تعلیم کی تحریف کرتے۔ واقعہ میں اگر دیکھا جائے تو نبیوں کی مخالفت کا زمانہ جب گذر جاتا ہے۔ تو لوگ

اُن کی تعلیم کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ جیسے اب مسیحؑ کی تعلیم کی لوگ تعریف کرتے ہیں۔ ابراہیمؑ اور موسٰیؑ اور زرتشتؑ کی تمام اقوام تعریف کرتی ہیں۔ حالانکہ اُس کتاب کی لوگ مخالفت کرتے ہیں جس میں وہ مخاطب ہوں۔ پس معلوم ہُوا کہ اصل وجہ تعلیم یا نبی نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بات ہوتی ہے کہ ہم اس کی اطاعت کس طرح کریں۔ یا ان احکام کو مان کر ہمارے آرام میں خلل آئیگا۔ جب دوسرے لوگ مخاطب ہوں تو خوب تعریف کرتے ہیں کہ واہ وا! کیا اچھی تعلیم ہے۔

تیسری بات بَغْیًا بَیْنَھُمْ میں یہ بیان فرمائی کہ یہ اختلاف بھی درحقیقت اس کتاب کی وجہ سے نہیں پیدا ہُوا بلکہ درحقیقت پہلے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ نبی آنے سے پہلے جو سرکشی اور عداوت آپس میں لوگوں کی پیدا ہو چکی تھی وہی اس تعلیم کی مخالفت پر لوگوں کو آمادہ کر رہی ہے۔ یا یہ سوال ہے کہ اس نبی کو ہم کیونکر مان لیں؛ یا یہ کہ فلاں نے اِسے مان لیا ہے۔ اب ہم کس طرح مان لیں۔ یا یہ فلاں عقیدہ کی جو ہمارے دشمنوں کا ہے تائید کرتا ہے۔ اس کو مان لیں تو اُن کے سامنے ہماری نظریں نیچی ہو جائیں۔ جیسے حنفی کہتے ہیں کہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے وہابیوں کی فلاں فلاں باتوں کی تائید کی ہے اِس لئے ہم انہیں نہیں مانتے۔ اِسی طرح وہابی کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے حنفیوں کی بعض باتوں کی تائید کی ہے اس لئے ہم آپ کو قبول نہیں کر سکتے۔ پس نبی کو نہ ماننے کی وجہ وہ عداوت ہوتی ہے جو اس نبی کے آنے سے پہلے اُن میں موجود ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی کے آنے کے بعد ایک جماعت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو ماننے والی اور اس کے احکام پر عمل کرنے والی ہوتی ہے۔ اِس لئے گو اس کے آنے سے بھی اختلاف نظر آتا ہے لیکن رُوحانی نگاہ رکھنے والا جانتا ہے کہ نبی کے آنے سے اختلاف کی قوت کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے دُور رہنے والے لوگ گھٹ جاتے ہیں اور ایک بڑی جماعت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جو خدائے واحد کی پرستار ہوتی ہے۔ غرض اختلاف اس کتاب کے سبب سے نہیں بلکہ پہلے اختلاف کے باعث لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں جو ان لوگوں کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ یا یہ کہ وہ بَغْیًا بَیْنَھُمْ ہے۔ یعنی ساری کی ساری اُنہی کے قبضہ میں ہے۔ ہمارے رسولوں اور اُس کے اتباع میں اس کا کوئی حصہ نہیں وہ اس اختلاف کا باعث ہے۔ اس سے الزام اور بھی سخت ہو جاتا ہے کہ بغی کرتے ہیں باوجود اِس کے کہ دوسری طرف سے اُن کی خیر خواہی اور ترقی کے سامان ہو رہے ہیں۔

فَھَدَی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِہٖ - اِس میں چوتھا جواب دیا ہے کہ اختلاف کا الزام نبیوں پر نہیں آسکتا اور وہ یہ کہ اُن کے آنے سے پہلے تو دیکھو کہ کوئی بھی حق کا ماننے والا نہ تھا۔ مگر اب ایک پارٹی تو حق کو مانتی ہے۔ پس اختلاف درحقیقت مٹ گیا پیدا نہ ہُوا۔ کیونکہ پہلے مثلاً ایک لاکھ آدمی خدا تعالیٰ کے متعلق اٹکل پچو باتیں بنا رہے تھے۔ اب ایک ہزار نے مان لیا اور ننانوے ہزار نے نہ مانا تو اختلاف کم ہُوا یا زیادہ۔ ایک ہزار آدمی اس خیالی اختلاف سے نکل کر یقین اور وثوق کے مقام پر آکھڑے ہوئے جہاں سے اللہ تعالیٰ کے جلال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ پس اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ..... مومنوں کو اس چیز کی طرف ہدایت دی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا یعنی جس کا ذکر وَمَا اخْتَلَفَ فِیْہِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْہُ میں ہُوا تھا۔ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ مِنَ الْحَقِّ میں فِیْہِ کی جو ضمیر ہے اَلْحَقّ اُس کی صفت ہے۔ یعنی اُس چیز کی طرف جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور جس کی صفت یہ ہے کہ وہ حق ہے یا حق میں سے ہے۔ یا مِنْ بیان کے لئے ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہدایت کی اُس چیز کی طرف جس کی نسبت لوگوں نے اختلاف کیا تھا حالانکہ وہ حق تھی۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ باوجود اس کے کہ تم پر ابھی اُن لوگوں کی (سی تکلیف کی) حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے

الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ

گذرے ہیں تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ انہیں تنگی بھی پہنچی اور تکلیف بھی۔

وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ

اور انہیں خوب خوف دلایا گیا تاکہ (اُس وقت کا) رسول اور اُس کے ساتھ (کے) ایمان لانے والے کہہ اُٹھیں کہ

مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ﴿۲۱۵﴾

اللہ کی مدد کب آئیگی؟ یاد رکھو۔ اللہ کی مدد یقیناً قریب ہے۔ ۱۲۷ھ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ پہلے ہی مومن تھے تو هَدَى اللّٰهُ کے کیا معنے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی پچھلی بات کا ذکر کرتے ہوئے موجودہ نام لے لیا کرتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ یہ بادشاہ جب پیدا ہوا تو یوں ہوا۔ حالانکہ پیدائش کے وقت بادشاہ نہیں ہوتا۔ یا کہتے ہیں یہ عالم جب سکول میں پڑھنے گیا۔ پس اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اُن کا موجودہ نام ہے جس کو پُرانے واقعہ کو دہراتے وقت قائم رکھا۔ تاکہ اُن کا احترام قائم رہے اور اُن کی طرف کفر کسی وقت بھی منسوب نہ ہو۔ یا یہ کہ استعداد مخفی جو اُن کے اندر تھی اس کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہیں اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا کہا گیا ہے۔ یعنی وہ جو مومن بننے والے تھے اور اس کے لئے سامان بہم پہنچا رہے تھے۔

مَسَّتۡهُمۡ

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِهٖ میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ جب لوگوں نے کتاب الٰہی کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن سب وعدوں کو جو اس نبی کے ذریعہ سے اپنی قوم کے متعلق تھے مٹھی بھر مومنوں کے حق میں پورا کر دیا اور مومنوں کو وہ کامیابیاں دے دیں جو سب قوم کے لئے مقدر تھیں۔ اسی کی طرف

بَاۡسَآء

ضَرَّآء

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں بھی اشارہ ہے کہ ہر شخص کے دو گھر ہیں ایک جنت میں اور ایک دوزخ میں جب کوئی ظلم کرے تو اللہ تعالیٰ ظالم کا جنت کا گھر مومن کو اور اس کا دوزخ کا گھر کافر کو دے دیتا ہے۔ کفار نے چونکہ بلا وجہ کتاب الٰہی کی مخالفت کی اور اس کے سبب سے مومنوں کو سخت دُکھ برداشت کرنے پڑے خدا تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ وہ انعامات جو ساری قوم کے لئے مقدر تھے وہ مٹھی بھر مسلمانوں کو دے دیئے جائیں اور باقی قوم کو بوجہ ظالم ہونے کے اُن سے محروم کر دیا جائے۔

۱۲۷ھ حل لغات

:- مَسَّتۡهُمۡ : مَسَّ الشَّيۡءَ کے معنے ہیں تَمَسَّهٗ وَاَفۡضٰى اِلَيۡهِ بِيَدِهٖ مِنۡ غَيۡرِ حَائِلٍ کسی چیز کو بغیر کسی درمیانی روک کے اُس نے چھوا (اقرب)

بَاۡسَآء : کے معنے ہیں اَلشِّدَّةُ سختی وَاِسۡمٌ لِلۡحَرۡبِ وَالۡمَشَقَّةِ وَالضَّرۡبِ - اور بَاۡسَآء کے لفظ کا اطلاق جنگ اور مشقت اور جسمانی تکالیف پر بھی ہوتا ہے۔

ضَرَّآءُ کے معنے ہیں اَلزَّمَانَةُ وَالشِّدَّةُ قحط۔ اَلنَّقۡصُ فِي الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ - مالی اور جانی نقصان۔

تفسیر: - اِس آیت میں اُن ابتلاؤں کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں پر آنے والے تھے۔ چونکہ اس سے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ جب دنیا پر ضلالت چھا جاتی ہے تو اُس وقت خدا تعالےٰ کی طرف سے کوئی نبی آتا ہے جس کی لوگ مخالفت کرتے ہیں۔ اِس لئے اب فرماتا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ بغیر ابتلاؤں کے تم ترقی کر جاؤ گے۔ تمہاری ترقی ابتلاؤں کے آنے پر ہی موقوف ہے جیسا کہ پہلوں کی ترقی کا باعث بھی ابتلاء ہی ہوئے۔ چنانچہ اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ انہیں مالی مشکلات بھی پیش آئیں اور جانی بھی اور وہ سر سے پاؤں تک ہلا دیئے گئے اور اُن پر اسقدر ابتلاء آئے کہ آخر اُس وقت کے رسول اور مومنوں کو دُعا کی تحریک پیدا ہوگئی اور وہ پکار اُٹھے کہ اے خدا۔ تیری مدد کہاں ہے۔ اِس آیت کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور اُس کے پاک بندے بھی کسی وقت اللہ تعالےٰ کی مدد سے ایسے مایوس ہو جاتے ہیں کہ اُنہیں مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کہنا پڑتا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ جس مایوسی کا تصوّر بادی النظر میں پیدا ہوتا ہے۔ اُس سے انبیاء اور اُن پر ایمان لانے والے کلیۃً پاک ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّهُ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (یوسف آیت ۸۸) کہ صرف کافر ہی خدا تعالےٰ کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب مَتٰى کا لفظ بولیں تو اس سے مراد مایوسی نہیں ہوتی بلکہ تعیین کے لئے ایک درخواست ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں بات کے لئے ایک وقت مقرر فرما دیا جائے۔ ایسا ہی اسجگہ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کے یہ معنے نہیں کہ وہ مایوسی کا شکار ہوکر ایسا کہتے ہیں بلکہ درحقیقت ان الفاظ میں وہ یہ درخواست کرتے ہیں کہ الٰہی اس بات کی تعیین فرما دی جائے کہ وہ مدد کب آئیگی۔ گویا مزید اطمینان کے لئے وہ آنے والی نصرت کے وقت کی تعیین کروانا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی مدد جلد نازل ہو۔ یہ دُعا کا ایک مؤثر طریق ہے۔ اور اِس میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ اُن پر اسقدر ابتلاء آئے کہ وہ ہلا دیئے گئے اور اُن میں دُعا کی تحریک پیدا ہوگئی۔ اور ابتلاؤں کی بڑی غرض بھی یہی ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو جب مومنوں کو دعا کی تحریک ہوتی ہے تو خدا تعالےٰ آسمان سے اپنی نصرت نازل فرما دیتا ہے۔ اور اُن کے مصائب کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

مگر اس کے علاوہ حَتّٰى کے معنے "كَيْ" کے بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ معنے کُتبِ نحو اور قرآن کریم سے ثابت ہیں مغنی اللبیب میں لکھا ہے۔ وَمُرَادِفَةٌ كَيِ التَّعْلِيْلِيَّةِ حَتّٰى یعنی حَتّٰى کے معنے اُس کَيْ کے مترادف بھی ہوتے ہیں جو کسی بات کی وجہ بیان کرنے کے لے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اُس حَتّٰى سے پہلے جو بات ہوتی ہے وہ بعد میں آنے والی بات کے لئے بطور سبب کے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں دوسری جگہ بھی حَتّٰى ان معنوں میں آیا ہے۔ چنانچہ سورہ منافقون میں آتا ہے۔ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوا (آیت ۸) یعنی جو لوگ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہیں اُن پر خرچ نہ کرو۔ تاکہ وہ بھاگ جائیں۔ نحوی اس کی یہ مثال بھی دیتے ہیں کہ اَسْلِمْ حَتّٰى تَدْخُلَ الْجَنَّةَ یعنی فرمانبرداری کر تاکہ تو جنت میں داخل ہو جائے۔ اِن معنوں کے لحاظ سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ زلزلہ جو کفار کے ہاتھوں سے ہم نے پیدا کیا اُس کی غرض ہی یہ تھی کہ ہمارے بندے ہم سے مانگیں اور ہم اُن کو دیں۔ پس مانگنے کی طرف توجہ پھیرنے اور اپنی قوت فضل کو ظاہر کرنے کے لئے اُس وقت تک ہم چُپ رہے جبتک کہ انکے دل میں دُعا کی زور سے تحریک نہ ہوئی۔ اور یہ تحریک ہم نے خود کروائی تاکہ ایک طرف اُن کے دلوں میں اللہ تعالےٰ کی محبت بڑھے اور دوسری طرف جب اللہ تعالیٰ

کی نصرت معجزانہ طور پر آئے تو اُن کے ایمان بڑھیں اور کفار
میں سے جو غور کرنے والے ہوں انہیں ہدایت حاصل ہو چنانچہ
فرماتا ہے کہ جب یہ غرض پوری ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ
فرما دیتا ہے کہ لو اب ہماری مدد آگئی ۔

ابتلاؤں کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ
انسان کی ہمت دیکھ کر ابتلاء ڈالتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ وہ
ایسے ابتلاء انسان پر ڈالے جن کے برداشت کرنے کی اس
میں طاقت ہی نہ ہو ۔ ہاں انسان ایسے ابتلاؤں میں ضرور ڈالا
جاتا ہے جن کے متعلق وہ غلطی سے خیال کر لیتا ہے کہ میں انکو
برداشت نہیں کر سکوں گا ۔ لیکن اُس کا یہ خیال درست نہیں ہوتا
وہ ان کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہے ۔ اسی لئے خدا تعالیٰ
نے فرما دیا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یعنی
خدا تعالیٰ کسی پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جس کے اُٹھانے کی اُس
میں طاقت نہ ہو ۔ بوجھ ہمیشہ وہی ڈالا جاتا ہے جسکے اُٹھانے
کی انسان میں طاقت ہوتی ہے ۔ سوائے اس کے کہ کسی قوم کو
تباہ کرنے کا منشا ہو ۔ ورنہ جو ابتلاء کسی جماعت کی ترقی
کے لئے ہوتے ہیں وہ طاقت برداشت سے باہر نہیں ہوتے
ہاں مومن بعض دفعہ خیال کر لیتا ہے کہ وہ اس کی طاقت سے
بالا ہیں ۔ مگر یہ اس کی غلطی ہوتی ہے ۔ جب مومن ایک ابتلاء
کو برداشت کر لیتا ہے تو اُسے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا ایمان
کتنا مضبوط ہے ۔ پھر اور رنگ میں اُس پر ابتلاء آتا ہے اور وہ
اُسے بھی برداشت کر لیتا ہے اور اس کے دل میں کسی قسم کا
شکوہ پیدا ہونے کی بجائے شکر و امتنان کا جذبہ پیدا ہوتا ہے
کہ خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے اتنی طاقت دی کہ میں نے
اُسے برداشت کر لیا تب اس کا ایمان اور بھی پختہ ہو جاتا ہے
اور وہ اُس سے بڑے بڑے ابتلاء برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جاتا
ہے ۔ غرض جوں جوں انسان دلیر ہوتا جاتا ہے آگے بڑھتا جاتا
ہے ۔ اِس طرح ایک تو اُسے اپنے ایمان کی پختگی کا پتہ لگ جاتا
ہے ۔ دوسرے قربانیوں کے میدان میں اُسے دوسروں سے آگے
بڑھنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور وہ ترقی کر جاتا ہے ۔

غرض ابتلاء کے دو فائدے ہوتے ہیں ۔ اوّل یہ کہ انسان
کو اپنی حالت کا پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اُس کی
جان کس قدر تکلیف اُٹھا سکتی ہے ۔ دوسرے اُس میں آگے
قدم بڑھانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے ۔ ان ابتلاؤں کا آنا
ایسا ضروری ہے کہ نبیوں کی کوئی جماعت ایسی نہیں ہوئی جس
پر ابتلاء نہ آئے ہوں ۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ وہ جنت جس کی وسعت کا اندازہ
بھی تم نہیں لگا سکتے تمہیں یونہی مل جائیگی یا وہ دنیوی کامیابیاں
جن کا تمہیں وعدہ دیا جا رہا ہے بغیر قربانیوں کے تمہیں مل جائینگی
اور تم پر وہ حالت نہیں گذرے گی جو پہلوں پر گذرتی رہی ۔
ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ۔ وہ حالت ضرور آئیگی ۔ اس لئے یہ
مت خیال کرو کہ تم آسانی سے کامیاب ہو جاؤ گے جبتک تم
ان حالتوں میں سے نہیں گذرو گے جن میں سے پہلے لوگ گذرے
اُس وقت تک تمہیں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ انہیں بڑی
بڑی تکالیف پہنچی تھیں جسمانی بھی اور مالی بھی ۔ انہیں اپنی
جائیدادیں چھوڑنی پڑیں ۔ رشتہ داروں کو ترک کرنا پڑا ۔
فاقے کرنے پڑے ۔ ماریں کھائیں ۔ قتل ہوئے ۔ غرض وہ
کئی رنگ میں ہلائے گئے ۔ جس طرح زلزلہ سے عمارت کبھی
دائیں طرف جھکنے لگتی ہے اور کبھی بائیں طرف اسی طرح
دیکھنے والے اُن کے متعلق یہی سمجھتے تھے کہ یہ اب گرے کہ گرے
حتّٰی کہ اُن کی تکالیف بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئیں
کہ دشمن نے یہ خیال کر لیا کہ اب یہ گر ہی گئے ہیں ۔ اُسوقت
اللہ تعالیٰ کے رسول اور مومنوں نے دُعائیں کرنی شروع
کیں کہ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۔ اے خدا ! ابتلاء اب اس حد
تک پہنچ گئے ہیں کہ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ
آپ کی مدد آئے اور ہمیں کامیابی عطا کرے ۔

مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کے لفظی معنے چونکہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ
کی مدد کب آئیگی ۔ اس لئے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اُن کو خدا تعالیٰ کی مدد کے متعلق نعوذ باللہ شبہ پیدا ہوگیا تھا۔ کہ شاید وہ آئے یا نہ آئے۔ اِس لئے انہوں نے کہا کہ خدایا تیری مدد کب آئیگی۔ مگر یہ صحیح نہیں اوّل تو مَسَّتْهُمْ میں مَسّ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ عملاً ان کو مشکلات پہنچیں اور دوسرے یہ کہ مشکلات دل پر اثر کرنے والی نہیں تھیں صرف سطحی تھیں اُن کے دل مضبوط تھے۔ پس جب مشکلات کے باوجود وہ بہادر دل تھے۔ تو اُن کے متعلق کسی مایوسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے سوال کبھی التجاء کا رنگ بھی رکھتا ہے۔ انسان کسی سے پوچھتا ہے کہ یہ بات آپ کب کرینگے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نہیں کرینگے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ کر دیں۔ اسی طرح مجسٹریٹ سے جب پوچھا جاتا ہے کہ میری باری کب آئے گی تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ کبھی نہیں آئیگی۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آ جائے۔

بدر کے موقعہ پر جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعا کی کہ اے خدا! اگر یہ مختصر سا گروہ بھی ہلاک ہوگیا تو دنیا میں تیری عبادت کون کریگا۔ تو اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ خدا تعالیٰ پر یقین نہیں تھا بلکہ اس رنگ میں دُعا کر کے آپؐ نے خدا تعالیٰ کی غیرت کو برانگیختہ کیا۔ اسی طرح حضرت مسیح ناصری علیہ السلام نے جب صلیب پر لٹکتے وقت کہا کہ ایلی ایلی لما سبقتنی یعنی اے خدا! چاہیئے تو یہ تھا کہ اس مصیبت کے وقت تو میری مدد کے لئے آتا لیکن تُو تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ تو آپ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ مصیبت کے وقت انہیں واقعہ میں چھوڑ گیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرا دل گھبرا رہا ہے آپ جلدی میری مدد کے لئے آ جائیں۔ پس اس رنگ میں جب دُعا کی جاتی ہے تو قبولیتِ دُعا عدمِ یقین کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ کو غیرت دلانے کے لئے ہوتی ہے۔ اسی طرح جب مومن کہتے ہیں مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ اے خدا! تیری مدد اور نصرت کب آئیگی تو خدا تعالیٰ کہتا ہے سُنو۔ میری مدد آ پہنچی۔ چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فتح مکہ کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ والوں کو خیال تک بھی نہیں تھا کہ آپ اُن پر حملہ آور ہونگے۔ ابوسفیان خود آپ سے مدینہ میں مل کر آ رہا تھا۔ جب لوگوں نے آپ کا لشکر دیکھا تو بعض نے کہا کہ یہ لشکر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہوگا۔ اِس پر ابوسفیان نے کہا۔ تم پاگل تو نہیں ہوگئے میں ابھی مدینہ سے آ رہا ہوں۔ وہاں کوئی لشکر تیار نہیں تھا۔ مگر اگلے ہی چار پانچ منٹ میں مسلمان اُس کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ابوسفیان کو گرفتار کر لیا اور دوسرے دن مکہ فتح ہوگیا۔ غرض خدا تعالیٰ کی نصرت اچانک آتی ہے اور مومنوں کو کامیاب کر دیتی ہے۔ عیسائیوں نے تین سو سال تک بڑے بڑے مصائب برداشت کئے لیکن ایک دن انہوں نے سُنا کہ روم کا بادشاہ عیسائی ہوگیا ہے اور آئندہ سے ملک کا مذہب عیسائیت ہوگا۔ اور اس اعلان کے ساتھ ہی اُنکے تمام مصائب ختم ہوگئے۔

غرض مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ میں یہ بتایا ہے کہ مومن دُعائیں کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ الٰہی ابتلاء بڑھ گئے ہیں۔ اب تیری مدد آ جائے۔ اِس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ۔ سُنو! خدا کی مدد قریب ہی ہے یعنی جب ابتلاء تمہاری ترقیات کے لئے آئیں تو پھر تمہیں تباہ ہونے کا ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر تمہارے نفسوں میں خرابی ہے اور تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ تمہیں سزا دینا چاہتا ہے تو پھر یقیناً تمہارے لئے مدد نہیں آئیگی۔ لیکن اگر تمہارے نفسوں میں کوئی خرابی نہیں۔ تمہارا ایمان مضبوط ہے تم تقویٰ کی راہ پر قدم مار رہے ہو۔ وساوس پر تمہیں قابو حاصل ہے۔ تو ابتلاء تمہارے لئے خوف وخطر کا باعث نہیں ہو سکتے۔ درحقیقت ایک سچے مومن پر جب ابتلاء آتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اِس ابتلاء کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی مدد بھی

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ

وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو کہدے (کہ) جو اچھا مال بھی تم دو ■ (تمہارے)

فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ

ماں باپ قریبی رشتہ داروں یتیموں مسکینوں اور

ابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۶﴾

مسافر کا (پہلا) حق ہے اور جو نیک کام بھی تم کرو اللہ اُسے یقیناً اچھی طرح جانتا ہے۔ ۱۲۸ے

آرہی ہے۔ مولانا رومؒ نے اِسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے کہ

؎ ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است
زیر آں گنج کرم بنہادہ است

یعنی جب کسی قوم پر کوئی آزمائش کا وقت آتا ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے اُس کے نیچے انعامات کا ایک بہت بڑا خزانہ مخفی ہوتا ہے۔

پس ابتلاء کسی خطرہ کا موجب نہیں ہوتے بلکہ ابتلاء کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اور ترقی عطا کرے گا۔ ڈر اور خوف صرف اپنے نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس ہمیشہ اپنے نفس پر غور کرتے رہنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ آیا ہمارے میں کوئی ایسی بات تو پیدا نہیں ہوگئی جو تباہی کا باعث بن جائے۔ اگر اس میں وساوس پیدا نہیں ہوتے اگر ایمان مضبوط ہے اور دل شکر اور امتنان کے جذبات سے پُر ہے تو انسان کو خوش ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ابتلاء بہت بڑے انعامات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ابتلاء آنے پر دل میں وساوس پیدا ہوں اور ایمان میں کمزوری محسوس ہو تو سمجھ لو کہ یہ ابتلاء ترقی کا باعث نہیں بلکہ ہلاکت کا باعث ہے۔ غرض اصل اور حقیقی ایمان وہی ہوتا ہے جو ابتلاؤں میں سے گذرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی کے نتیجہ میں ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

۱۲۸ے تفسیر:۔ چونکہ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ پہلے لوگوں پر بھی مالی اور جانی مشکلات آئی تھیں اور وہی اُن کی قومی ترقی کا باعث ہوئیں۔ جیسا کہ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اسلئے جب صحابہؓ نے یہ بات سُنی تو اُن کے دل بھی ان قربانیوں کے لئے بے تاب ہوگئے اور انہوں نے بے اختیار ہوکر روحانی ترقیات کے حصول کے لئے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اگر قومی ترقی کے لئے مالی قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں بھی بتایا جائے کہ ہم کیا خرچ کریں تاکہ ہمارا قدم بھی عشق کے میدان میں کسی دوسرے سے پیچھے نہ رہے۔ دوسرا سوال جانی قربانیوں کے متعلق ہو سکتا تھا۔ سو اس کا جواب كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ میں دیا گیا ہے جس سے قرآن کریم کی نہایت اعلیٰ درجہ کی ترتیب پر روشنی پڑتی ہے۔

اِس آیت کے متعلق لوگ عام طور پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ سوال کچھ ہے اور جواب کچھ ہے۔ پوچھا تو یہ گیا ہے کہ کیا خرچ کریں؟ اور جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جو کچھ بھی اپنے اموال میں سے خرچ کرو۔ وہ فلاں فلاں کو دو۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلتِ تدبّر کی وجہ سے ہے سوال کا جواب آیت میں موجود ہے۔ جب اُس نے فرما دیا کہ جو کچھ بھی تم اچھے مال سے خرچ کرو تو اس میں سائل کا

جواب مکمل آگیا۔ اوّل یہ کہ کوئی حد بندی نہیں۔ جتنے کی توفیق
ہو اتنا خرچ کرو۔ دوم یہ کہ اس امر کا لحاظ رکھو کہ جو خرچ کرو
وہ طیّب مال ہو۔ جو لوگ حرام کماتے ہیں اور اُس میں سے خدا تعالیٰ
کی راہ میں خرچ کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے گناہ کا کفارہ کر دیا
وہ غلطی پر ہیں۔ خدا تعالیٰ ایسے ہی مال کو قبول کرتا ہے جو
اچھا ۔ ۔ ۔ ۔ ہو۔ سوم یہ کہ صرف حلال نہیں دینا بلکہ طیّب
دینا ہے۔ یعنی جس مال کو قبول کرنا اُس شخص پر گراں نہ گذرے
جس کو مال دیا جائے۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ خیر کے معنے
مال کے ہیں۔ اچھے مال کے معنے کہاں سے نکالے گئے ہیں۔
تو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر کے اصل معنے بہترین شے
کے ہیں ۔ اور مال کو اسی صورت میں خیر کہتے ہیں جب کہ
وہ طیّب ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ مفرداتِ راغب
میں ہے ۔ وَقَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ لَا يُقَالُ لِلْمَالِ
خَيْرٌ حَتّٰى يَكُوْنَ كَثِيْرًا وَ مِنْ مَكَانٍ طَيِّبٍ یعنی
مال کو خیر اسی صورت میں کہیں گے جبکہ وہ زیادہ ہو اور
پاک ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ اور خود طیّب ہو۔ پس
خیر کہنے سے یقیناً قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے
کہ طیّب اموال میں سے خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔
اگر کہا جائے کہ اگر کوئی شخص حرام کماتا ہو لیکن صدقہ طیّب مال
سے دے تو کیا یہ اس حکم کے مطابق ہو گا۔ تو اس کا جواب
یہ ہے کہ تھوڑی سی گندگی بھی بہت سی پاکیزہ شے کو
گندہ کر دیتی ہے۔ پس اگر کوئی شخص رشوت لیتا یا چوری
کرتا یا ظلم سے دوسرے کا مال لیتا ہے تو خواہ اس قسم کا
مال تھوڑا ہو اس کا سب مال گندہ ہو جائیگا اور وہ اس
حکم کو پورا کرنے والا نہ ہو گا۔ غرض سوال کا مکمل جواب اسی
آیت میں آگیا۔ ہاں اس سے زائد مضمون بھی بتا دیا گیا کہ
اگر خرچ کرو تو کہاں کہاں خرچ کرو۔ گویا اس طرف اشارہ
کیا کہ خرچ کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ صحیح جگہ خرچ کرنا
مشکل ہے۔ پس جو خرچ کرو۔ احتیاط سے کرو اور مستحقین کو
دو۔ یہ قرآنی کمال ہے کہ وہ مختصر الفاظ میں وسیع مضمون
بیان کر دیتا ہے۔ دیکھو یہاں کتنے مختصر لفظوں میں سوال کا
جواب بھی دے دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ مال حلال دو (طیّب
میں حلال کا مفہوم بھی شامل ہے) اور یہ بھی کہ حلال مال طیّب
بھی ہو۔ یہ نہیں کہ ٹوٹی ہوئی جوتی جو کسی کام کی نہیں دیدی
بے شک وہ اس کا مال ہے۔ بے شک اس کا دینا اُسے
حلال ہے مگر وہ طیّب نہیں کیونکہ جسے دی گئی ہے اُس کے
کام کی نہیں۔ یا مثلاً ایک بھوکا کھانا مانگنے آیا ہے۔ گھر
میں کھانا تیار ہے۔ مگر اُسے آٹا دے دیا۔ یہ مال بھی ہے
حلال بھی ہے۔ مگر بھوکے کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔
طیّب یہ ہے کہ خود کم کھائے اُسے پکا ہوا کھانا دے جسے
وہ فوراً کھا سکے۔ یہ سب کچھ بتا کر یہ بھی بتا دیا کہ فلاں
فلاں جگہ مال خرچ کرنا زیادہ مناسب ہے۔ سبحان اللہ
کیا معجزانہ اعجاز ہے۔ قرآن مجید میں ایسی مثالیں اور
بھی ہیں کہ سوال کا جواب دے کر زائد مضمون بتا دیا ہے۔
خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اِس قسم کا کلام فرماتے
تھے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ سمندر کے پانی کے بارہ میں
کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا۔ هُوَ الطَّهُوْرُ مَاءُهٗ وَ
الْحِلُّ مَيْتَتُهٗ ۔ اِس کا پانی پاک ہے اور اُس کا مردہ
حلال ہے۔ یعنی سمندری جانور کے لئے ذبح کرنے کی شرط
نہیں۔ جیسے مچھلی۔ اب دیکھو۔ یہاں سوال کا جواب
بھی دیا ہے اور زائد مضمون بھی بتا دیا ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کیا خرچ کرنے کے
الفاظ سے صدقہ کے اقسام کا دریافت کرنا بھی مراد ہو
سکتا ہے۔ یعنی ہمارا خرچ کرنا کس کس موقعہ اور کن کن
لوگوں کے لئے ہو۔ اور اس جگہ غالباً یہی مراد ہے۔ کیونکہ
کَیْفَ کے متعلق سوال آگے آتا ہے۔ مَاذَا سے سوال کبھی کسی
چیز کے متعلق کیا جاتا ہے اور کبھی اُسکی صفات کے متعلق۔ نحوی لکھتے ہیں کہ صفات
کے متعلق صرف ذوی العقول کے بارہ میں سوال کیا جاتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا

جنگ کرنا تم پر فرض کیا جاتا ہے (اور یہ اس حالت میں (فرض کیا جاتا ہے) کہ وہ تمہیں ناپسند ہے۔ اور بالکل ممکن ہے کہ تم کسی شے کو

شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ

ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی شے کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے

شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

۲۶ ع ۱۰

دوسری چیز کی نسبت بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ حل ۱۲۹

لیکن یہ حدبندی بلا وجہ معلوم ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اس جگہ پوچھنے والا یہ نہیں پوچھتا کہ صدقہ کس چیز کا ہو۔ بلکہ یہ پوچھتا ہے کہ صدقہ کی صفات کیا ہوں۔ سو اللہ تعالیٰ نے جواب دے دیا کہ معیّن نہیں ہر اچھی چیز خرچ کرو۔ یعنی طیّب مالی سے ہو اور جتنی توفیق ہو اس قدر دیا جائے اور ساتھ ایک بات زائد بتادی کہ تم اپنے ایمان یا اپنی حالت کے ماتحت جو کچھ خرچ کرو۔ یہاں یہاں خرچ کرو۔

پھر فرمایا وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کے لئے تم کسی ایک نیکی پر حصر نہ کرو۔ بلکہ ہر قسم کی نیکیاں بجا لاؤ۔ اور ہر خیر اور برکت کا دروازہ اپنے اوپر کھولنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ تمہارے سامنے ایک لامتناہی زندگی ہے جس میں تمہاری رُوح نے قرب الٰہی کی باریک در باریک راہوں پر چلنا ہے۔ پس کسی ایک یا چند نیکیوں پر اکتفاء نہ کرو۔ بلکہ خیر میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ اور اس امر پر یقین رکھو کہ ایک علیم ہستی تمہاری ہر حرکت اور سکون کو دیکھ رہی ہے۔ وہ تمہیں دنیا و آخرت میں اس کا بہترین اجر دیگی۔

حل ۱۲۹ تفسیر: — اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہؓ لڑائی کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ وہ نعوذ باللہ بُزدل تھے۔ بلکہ اُنکی ناپسندیدگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ مومن صلح پسند ہوتا ہے لہٰذا اُس کی پہلی کوشش یہی ہوتی ہے کہ لڑائی نہ ہو اور صلح سے فیصلہ ہو جائے اور اگر وہ اپنے دشمن سے لڑتا ہے تو مجبورًا لڑتا ہے۔ صحابہؓ بھی دل سے صلح جُو تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اگر کشت و خون کے بغیر یہ فتنہ دب سکے تو دب جائے مگر انہیں مجبورًا لڑائی لڑنی پڑی۔ پس یہ صحابہؓ کی تعریف ہے نہ کہ اُن کی مذمت۔ یہ اُن کی بُزدلی نہیں بلکہ یہ قابلِ تعریف امر ہے کہ باوجود دشمنوں کی شرارتوں کے وہ یہی چاہتے تھے کہ اگر صلح سے فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ تم تو نہیں چاہتے تھے کہ لڑو۔ حالانکہ دشمن تم پر ظلم پر ظلم کر رہا تھا۔ اور تمہیں مار رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ دشمن بغیر لڑائی کے باز آنے والے نہیں۔ اس لئے اب ان کی اصلاح کا یہی ذریعہ ہے کہ ان سے لڑا جائے اور انہیں انکے کئے کا مزا چکھایا جائے۔

عیسائیوں نے اس آیت سے دھوکا کھاتے ہوئے اعتراض کیا ہے کہ مسلمان چونکہ لڑائی سے ڈرتے تھے اس لئے معلوم ہوا کہ وہ بُزدل اور ڈرپوک تھے۔ مگر صحابہؓ کو بُزدلی کا طعنہ دینے والے عیسائی یہ نہیں دیکھتے کہ اُن کے اپنے حواری کیسے بہادر اور دلیر تھے اور انہوں نے مسیح کی گرفتاری کے وقت کیسی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انجیل گواہ ہے کہ کوئی ایک حواری بھی ایسا نہیں نکلا جس نے دلیری سے مسیح کا ساتھ دیا ہو بلکہ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ

یہ (لوگ) تجھ سے حرمت والے مہینہ کے بارہ میں یعنی اس میں جنگ کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تو کہدے (کہ) اس میں جنگ کرنا

كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

بڑی (خرابی کی) بات ہے۔ اور اللہ کے راستہ سے روکنا اور اس کا (یعنی اللہ کا) اور عزت والی مسجد کا انکار کرنا اور

وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ

اُس کے باشندوں کو اُس میں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک (اس سے بھی) بڑی بات ہے۔ اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی

بلکہ حواری نے تو آپ پر تین دفعہ لعنت کی اور باقی سب اُس انتہائی نازک گھڑی میں آپ کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایسے باایمان اور دلیر حواریوں کو مقدس قرار دینے والے عیسائی اگر صحابہؓ پر اعتراض کریں تو اُن کی عقل پر تعجب آتا ہے۔ پھر عیسائیوں کی یہ ایک عجیب علامت ہے کہ صحابہؓ کے لڑائی پر جانے کا ذکر ہو تو بھی اعتراض کرتے ہیں اور نہ جانے کا ذکر ہو تب بھی اعتراض کرتے ہیں۔ جہاں غنیمت کا ذکر آتا ہے وہاں کہنے لگ جاتے ہیں کہ مسلمان بڑے لالچی تھے۔ مال کی لالچ کے لئے لڑتے تھے اور اس موقعہ پر لکھتے ہیں کہ وہ بڑے بزدل تھے۔ لڑائی سے ڈرتے تھے حالانکہ اگر اُن کی لڑائی لوٹ مار کے شوق کے لئے تھی تو پھر کراہت کیسی۔ اور اگر کراہت تھی تو پھر شوق کیسا۔ اصل بات یہ ہے کہ غلط معنے کر کے انسان اضداد میں پھنس جاتا ہے۔ بات وہی ہے جو مَیں نے بتائی ہے کہ مومن صلح پسند ہوتا ہے۔ اسے اگر مجبور کیا جائے تو وہ لڑتا ہے ورنہ وہ یہی پسند کرتا ہے کہ لوگوں کی جانیں ضائع نہ ہوں۔

پھر فرماتا ہے۔ عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

درحقیقت انسانی علم اور سمجھ نہایت ہی محدود ہے اور ان دونوں کے محدود ہونے کی وجہ سے انسان بعض دفعہ ایک بات کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ اُس کے لئے مضر ہوتی ہے اور بعض دفعہ وہ ایک بات کو اپنے لئے مضر خیال کرتا ہے حالانکہ وہ اس کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اور دونوں کے پیچھے یا تو جذبۂ محبت کا ناجائز استعمال کام کر رہا ہوتا ہے یا جذبۂ نفرت کا ناجائز استعمال کام کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی بعض دفعہ تو شدید محبت کی وجہ سے وہ کسی چیز کے مضرات کو نہیں دیکھ سکتا اور بعض دفعہ شدید نفرت کی وجہ سے وہ دوسری چیز کے حسن کو دیکھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اور وہ یقینی طور پر کسی امر کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ آیا وہ میرے لئے مفید ہے یا مضر۔ اس حالت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض دفعہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو لیکن حقیقتاً وہ تمہارے لئے مفید ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ تم ایک چیز کو مفید خیال کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے مضر ہوتی ہے۔ تم کبھی کسی چیز سے فوائد حاصل کرنے کے لئے سامان مہیا کرتے ہو لیکن پھر بھی نتیجہ خراب نکلتا ہے جس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ بعض ایسے سامان جن سے اچھا نتیجہ نکل سکتا تھا تمہاری نظر سے مخفی رہے۔ پس جبکہ انسان کی ایسی حالت ہے کہ اُس کی اُمید کے مطابق ہر وقت اچھے نتیجے نہیں نکلتے بلکہ بعض اوقات بُرے نتائج نکل آتے ہیں تو وہ کیا کرے۔ سو اُس کا علاج یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور گرے اور عاجزی سے یہ دعا کرے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ

بڑا (گناہ) ہے - اور یہ لوگ - اگر ان کی طاقت میں ہو - تو تم سے لڑتے ہی چلے جائیں تاکہ تمہیں تمہارے دین سے

دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ

پھرا دیں - اور تم میں سے جو (بھی) اپنے دین سے پھر جائے - (اور) پھر

فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي

کفر کی ہی حالت میں مر بھی جائے - تو (وہ یاد رکھے کہ) ایسے لوگوں کے اعمال اس دنیا میں (بھی) اور

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٨﴾

آخرت میں (بھی) اکارت جائیں گے - اور ایسے لوگ دوزخ (کی آگ میں پڑنے) والے ہیں - وہ اس میں (دیر تک) رہیں گے - ۱۳۰؁

سے خدا مجھ کو ہر امر میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی صحیح اور سیدھا راستہ دکھا تا میں غلطیوں سے محفوظ رہوں - اور اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کو نہ دیکھے بلکہ محبت اور نفرت کے جذبات سے بالا ہو کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی نگاہ رکھے اور اس سے دعائیں کرتا رہے کہ وہ اسے سیدھا راستہ دکھائے اور اپنی نیت اور ارادہ کو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے تابع کر دے - تب اس کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہوگی اور خیر اور برکت کے دروازے اس کے لئے کھولے جائیں گے -

آخر میں وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کہہ کر بتایا کہ تم تو نہیں جانتے لیکن خدا تعالیٰ تمام حالات کو جانتا ہے یعنی تم کفار سے لڑائی کرنا رحم کے خلاف سمجھتے ہو - حالانکہ بعض دفعہ شریر کو سزا دینا اس کی اصلاح کے لئے ضروری ہوتا ہے اور اس کو چھوڑ دینا خود اس کے لئے اور دوسرے لوگوں کے لئے مضر ہوتا ہے - پس چونکہ یہ لوگ اب بغیر جنگ کے باز آنے والے نہیں - اس لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے -

---

۱۳۰؁ **تفسیر** :- فرمایا - یہ عزت والے مہینوں یعنی محرم - رجب - ذیقعدہ اور ذوالحج کے متعلق تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ آیا ان میں لڑائی کرنا جائز ہے ؟ یہ سوال کس طرح پیدا ہوا ؟ اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے تو اس کے بعد بھی مکہ والوں کے جوشِ غضب میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی بلکہ انہوں نے مدینہ والوں کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ چونکہ تم نے ہمارے آدمیوں کو اپنے ہاں پناہ دی ہے - اس لئے اب تمہارے لئے ایک ہی راہ ہے کہ یا تو تم ان سب کو قتل کر دو - یا مدینہ سے باہر نکال دو ورنہ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم مدینہ پر حملہ کر دینگے اور تم سب کو قتل کر کے تمہاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے اور پھر انہوں نے صرف دھمکیوں پر ہی اکتفاء نہ کیا بلکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں - رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان ایام میں یہ کیفیت تھی کہ بسا اوقات آپؐ ساری ساری رات جاگ کر بسر کرتے تھے - اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم رات کو ہتھیار باندھ کر سویا کرتے تھے

تاکہ رات کی تاریکی میں دشمن کہیں اچانک حملہ نہ کر دے۔ ان حالات میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو مدینہ کے قرب وجوار میں بسنے والے قبائل سے معاہدات کرنے شروع کر دیئے اور دوسری طرف ان خبروں کی وجہ سے کہ قریش حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں آپؐ نے ۲ سنہ ہجری میں حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ نخلہ بھجوایا۔ اور انہیں ایک خط دیکر ارشاد فرمایا کہ اِسے دو دن کے بعد کھولا جائے۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے دو دن کے بعد خط کھولا تو اُس میں لکھا تھا کہ تم نخلہ میں قیام کرو۔ اور قریش کے حالات کا پتہ لگا کر ہمیں اطلاع دو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس دوران میں قریش کا ایک چھوٹا سا قافلہ جو شام سے تجارت کا مال لے کر واپس آ رہا تھا وہاں سے گذرا۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے ذاتی اجتہاد سے کام لے کر اُن پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں کفار میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا اور دو گرفتار ہوئے۔ اور مالِ غنیمت پر بھی مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ جب انہوں نے مدینہ میں واپس آکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپؐ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میں نے تمہیں لڑائی کی اجازت نہیں دی تھی اور مالِ غنیمت کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور اُن کے ساتھیوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ ابھی رجب شروع نہیں ہوا۔ حالانکہ رجب کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ خیال کرتے رہے کہ ابھی ۳۰ جمادی الثانی ہے۔ رجب کا آغاز نہیں ہوا۔ بہرحال عمرو بن الحضرمی کا ایک مسلمان کے ہاتھوں مارا جانا تھا کہ مشرکین نے شور مچانا شروع کر دیا کہ اب مسلمانوں کو ان مقدس مہینوں کی حرمت کا بھی پاس نہیں رہا جن میں ہر قسم کی جنگ بند رہتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں اسی اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ بے شک ان مہینوں میں لڑائی کرنا سخت ناپسندیدہ امر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ ہے

لیکن اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے لوگوں کو روکا جائے۔ اور خدا تعالیٰ کی توحید کا انکار کیا جائے۔ اور مسجد حرام کی حرمت کو باطل کیا جائے۔ اور اس کے باشندوں کو بغیر کسی جرم کے محض اسلئے کہ وہ خدائے واحد پر ایمان لائے تھے اپنے گھروں سے نکال دیا جائے۔ تمہیں ایک بات کا تو خیال آگیا مگر تم نے یہ نہ سوچا کہ تم خود کتنے بڑے جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو اور خدا اور اس کے رسول کا انکار کر کے اور مسجد حرام کی حرمت کو باطل کر کے اور اس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال کر کتنے ناپسندیدہ افعال کے مرتکب ہوئے ہو جب تم خود ان قبیح حرکات کے مرتکب ہو چکے ہو۔ تو تم مسلمانوں پر کس مونہہ سے اعتراض کرتے ہو۔ ان سے تو صرف نادانستہ طور پر ایک غلطی ہوئی ہے۔ مگر تم تو جانتے بوجھتے ہوئے یہ سب کچھ کر رہے ہو۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ علامہ ابوالبقاء کے نزدیک بغیر اعادۂ جار کے جر جائز نہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ یہ متعلق ہے فعل محذوف کا اور پورا جملہ یہ ہے وَصَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ کشاف نے بھی صَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے ہی معنے کئے ہیں۔ لیکن بعض کے نزدیک اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف بِہٖ پر ہے اور ضمیر مجرور پر عطف بلا اعادہ جار کے برخلاف قول بصریوں کے جائز ہے۔ اہل عرب میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے کہتے ہیں۔ مَافِيْهَا غَيْرُهٗ وَ فَرَسِهٖ۔ یعنی اس گھر میں اس کے اور اسکے گھوڑے کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس مثال میں فَرَسِهٖ کا عطف ضمیر مجرور پر کیا گیا ہے۔

پھر فرمایا۔ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔ فتنہ قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اسجگہ فتنہ سے دینی فتنہ مراد ہے جس کا لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے ہجرت کی ہے اور اللہ (تعالیٰ) کے

عَنْ دِیْنِکُمْ میں ذکر آتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو مرتد کرنے اور انہیں اسلام سے منحرف کرنے کی سازشوں کا نام فتنہ رکھا گیا ہے اور اُسے قتل سے بھی بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ کفار تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے تاکہ اگر ان کو طاقت ہو تو تم کو اپنے دین سے مرتد کر دیں۔ یعنی گو تمہارا مرتد کر دینا اُنکی طاقت سے باہر ہے مگر کفار کی غرض تم سے لڑنے کی یہی ہے کہ اگر اُن کا بس چلے تو تمہیں مرتد کر دیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار اپنے ارادوں میں تو خدا تعالےٰ کے فضل سے ناکام رہے اور مسلمانوں پر فتح نہ پا سکے مگر اِکّا دُکّا آدمی جو اُن کے قبضہ میں آ گیا انہوں نے اپنی طرف سے اُس کو مرتد کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ بلالؓ۔ ابو جندلؓ اور یاسرؓ کی مثالیں اس امر پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔ انہی جبرًا مرتد کرنے کی کوششوں کے متعلق فرماتا ہے کہ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ قتل اور لڑائی کی نسبت دین کی وجہ سے کسی کو دُکھ میں ڈالنا بہت زیادہ خطرناک گناہ ہے۔

پھر فرماتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے منحرف ہو جائیں اور کفر کی حالت میں ہی مر جائیں۔ ایسے لوگوں کے اعمال اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اکارت چلے جائیں گے۔

حَبِطَتْ کے متعلق بعض لوگ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب کسی شخص نے کوئی عمل کر لیا۔ تو وہ ضائع کس طرح ہو گیا؟ اس اعتراض کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُن کا ذہن حَبِطَتْ کے اصل معنوں کی طرف نہیں جاتا۔ حَبِطَتْ کے اصل معنوں کا پتہ قرآن کریم کے ایک دوسرے مقام سے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ فاطر میں فرماتا ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ۔ (فاطر آیت ۱۱) یعنی جو شخص عزت چاہتا ہے اُسے چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرے۔ کیونکہ تمام عزتیں خدا تعالےٰ کے ہاتھ میں ہیں اور اُسی کی طرف پاکیزہ رُوحیں صعود کرتی ہیں اور عمل صالح یعنی ایمان کے مطابق عمل ان کو بلند کرتا ہے۔ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال کے ضائع نہ ہونے کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ اعمال خدا تعالےٰ کے حضور قبولیت کا جامہ پہن لیتے ہیں اور انسان کو اللہ تعالےٰ کا تقرب بنا دیتے ہیں۔ پس حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ کے یہ معنے ہیں کہ چونکہ اُن کے اعمال خدا تعالیٰ کے لئے نہیں تھے اِس لئے وہ انہیں قبول نہیں کرے گا۔ اور اُن کی روحوں کا صعود آسمان کی طرف نہیں ہوگا۔

اِسی طرح حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ کے یہ بھی معنے ہیں کہ خواہ ایمان لانے کے بعد کسی شخص کو اسلام کی بڑی بھاری خدمت کی توفیق ملی ہو پھر بھی اگر اُس کا انجام کفر پر ہوا ہے تو اُس کی پہلی دینی خدمات بھی رائیگاں چلی جائیں گی کیونکہ اُس نے اپنے عمل سے اُن خدمات کو باطل قرار دے دیا۔ اور آخرت میں بھی اس کے وہ اعمال اس کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ کیونکہ اس کا خاتمہ اچھا نہ ہوا۔

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ اور یہی لوگ دوزخ کی آگ میں پڑنے والے ہونگے۔ کیونکہ دنیا میں بھی انہوں نے

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ

راستہ میں جہاد کیا ہے۔ ایسے لوگ یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور اللہ (تعالیٰ)

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۹﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ

بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ ۱۳۱ھ وہ تجھ سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں۔

اپنے ارتداد سے فتنے اور فساد کی آگ کو بھڑکایا تھا۔

۱۳۱ھ تفسیر:۔ چونکہ گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کا ذکر کیا تھا جو ارتداد کی حالت میں ہی اس دُنیا سے اُٹھ جائیں اور بتایا تھا کہ ایسے لوگوں کی اسلام کو مٹانے کی کوششیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی۔ اس لئے اب اللہ تعالیٰ ان کے مقابلہ میں اُن لوگوں کا ذکر فرماتا ہے جن کو ارتداد کے بعد توبہ کی توفیق مل جائے۔ اور وہ پھر اسلام میں داخل ہو جائیں چونکہ ارتداد کا داغ ایک نہایت ہی بدنما داغ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کے لئے صرف ایمان لانا کافی قرار نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ ایسے لوگوں کی توبہ اُس وقت قبول ہو گی جب ایمان لانے کے بعد وہ ہجرت اختیار کریں یعنی بزدلی اور اخفائے ایمان جیسی گندی عادتوں کو کلی طور پر ترک کر دیں یا اُس علاقہ سے نکل جائیں جہاں دینی معاملات میں جبر سے کام لیا جاتا ہو۔ اور پھر دین کی راہ میں ایک ننگی تلوار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مالی اور جانی جہاد کریں۔ اگر وہ ایسا کرینگے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کو غفور اور رحیم پائیں گے۔

تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک دفعہ حضرت عمرؓ حج کے لئے مکہ تشریف لے گئے۔ تو حج کے بعد آپ کی ملاقات کے لئے لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ انہی ملاقاتیوں میں مکہ کے رؤسا اور سرداران قریش کے بعض لڑکے بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کو بڑی عزت سے بٹھایا۔ اور اُن سے مختلف باتیں پوچھتے رہے۔ اتنے میں ایک غلام صحابی آیا۔ وہی غلام جو ابتدائے اسلام میں ان رؤسائے عرب اور سرداران قریش کے باپ دادوں کی جوتیاں کھایا کرتے تھے جنہیں وہ گلیوں میں گھسیٹتے اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مار مار کر زخمی کر دیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن نوجوانوں سے کہا۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں وہ پیچھے ہٹ گئے۔ وہ صحابی قریب ہو کر حضرت عمرؓ سے باتیں کرنے لگ گئے۔ اتنے میں ایک اور صحابی آ گیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر اُن نوجوانوں سے کہا۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کے لئے جگہ چھوڑ دو۔ یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ جوتیوں تک جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر وہ مجلس سے اُٹھ کر باہر آ گئے۔ اور ایسی حالت میں آئے کہ اُنکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ کیا کبھی یہ خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہم کسی زمانہ میں اس قدر ذلیل ہو جائیں گے کہ وہ لوگ جو ہماری جوتیاں اُٹھانا اپنے لئے فخر کا موجب سمجھا کرتے تھے مجلس میں ایک ایک کر کے ہم سے آگے بٹھائے جائیں گے اور ہمیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائیگا۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ہم جوتیوں تک جا پہنچیں گے۔ گویا وہ جو ذلیل تھے معزز ہو گئے اور ہم جو معزز تھے ذلیل ہو گئے۔ یہ تمام نوجوان اگرچہ

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُهُمَآ

تو کہہ دے (کہ) ان (کاموں) میں بڑا گناہ (اور نقصان) ہے۔ اور لوگوں کیلئے ان میں (کئی ایک) منفعتیں (بھی) ہیں۔ اور

اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ

ان کا گناہ (اور نقصان) انکے نفع سے بہت بڑا ہے۔ اور وہ (لوگ) تجھ سے (یہ بھی) پوچھتے ہیں کہ وہ (یعنی سائل) کیا خرچ کریں

ایماندار تھے مگر غصہ اور جوش میں اُنکی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔ لیکن اُن میں سے ایک نوجوان جس کا ایمان زیادہ مضبوط تھا وہ کہنے لگا۔ بھائی تم نے بات تو ٹھیک کہی مگر اس کا ذمہ دار کون ہے۔ اور کس نے ہمارے باپ دادا سے کہا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیں۔ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی تھی۔ اِس لئے آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم مجلس میں پیچھے ہٹا دیئے گئے۔ مگر وہ جنہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی۔ جنہوں نے اپنی جانیں اور اپنے اموال آپ کی راہ میں قربان کر دیئے تھے اُن میں سے گو بہت سے مارے گئے مگر اب بھی جو باقی ہیں اُن کا حق ہے کہ اُن کی عزت کی جائے۔ اور اُن کو ہم سے زیادہ ادب کے مقام پر بٹھایا جائے۔ انہوں نے کہا یہ بات تو درست ہے۔ مگر کیا اب اِس ذلت کو مٹانے کا کوئی ذریعہ نہیں یا کیا کوئی ایسی قربانی نہیں جو اس گناہ کا کفارہ ہو سکے؟ پھر اُسی نے کہا۔ چلو حضرت عمرؓ کے پاس ہی چلیں اور انہی سے اسکا علاج دریافت کریں۔ چنانچہ وہ پھر آپ کے مکان پر گئے۔ اور دستک دی۔ مجلس اُسوقت تک برخواست ہو چکی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اندر بلا لیا۔ اور کہا۔ کس طرح آنا ہوا۔ انہوں نے کہا آج جو سلوک ہمارے ساتھ ہوا ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ میں معذور تھا کیونکہ اُس وقت جو لوگ میرے پاس آئے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی تھے اور میرے لئے ضروری تھا کہ میں اُنکی عزت و تکریم کرتا۔ انہوں نے کہا۔ ہم اِس بات کو خوب سمجھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اپنے لئے بہت بڑی ذلت مول لے لی۔ مگر کیا کوئی ایسا طریق نہیں جس سے یہ ذلت کا داغ ہماری پیشانیوں سے مٹ سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کا کام اہلِ عرب کے انساب کو یاد رکھنا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اِن نوجوانوں کے باپ دادا کو کتنی بڑی عزت اور وجاہت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ اسلام کی دشمنی کے زمانہ میں بھی اگر وہ کسی مسلمان کو پناہ دے دیتے تھے تو کسی شخص کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس مسلمان کو دُکھ پہنچا سکے اِس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے یہ واقعات آئے اور اس کا تصور کر کے اُن پر رقت طاری ہو گئی اور بات کرنا آپ کیلئے مشکل ہو گیا۔ اور غلبۂ رقت میں آپ نے صرف اپنا ہاتھ اُٹھایا۔ اور شمال کی طرف جہاں شام میں اُن دنوں عیسائیوں سے لڑائی ہو رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس کا علاج صرف وہاں ہے یعنی اب اس ذلت کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اِس جہاد میں شامل ہو کر اپنی جانیں دے دو۔ پھر خود بخود لوگ اِن باتوں کو بھول جائیں گے۔ چنانچہ اُسی وقت وہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ سات نوجوان تھے جو

قُلِ الْعَفْوَ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ

تو کہدے کہ جتنا تکلیف میں نہ ڈالے۔ اِسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لئے بیان کرتا ہے۔

لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۲۰﴾

تاکہ تم سوچ سے کام لو۔ ۱۳۲

اِس ذلّت کو دُور کرنے کے لئے جہاد میں شامل ہوئے۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھران نوجوانوں میں سے ایک بھی زندہ مکّہ کی طرف واپس نہیں آیا۔ سب اسی جنگ میں شہید ہوئے جس طرح اِن نوجوانوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرکے رضاءِ الٰہی حاصل کی تھی۔ اِسی طرح ارتداد کے بعد اسی صورت میں توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ جب زبان سے ایمان کا اظہار کیا جائے اور عمل سے ہجرت اختیار کی جائے۔ خواہ حقیقی رنگ میں یا معنوی رنگ میں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کی راہ میں کفّار سے جہاد کیا جائے۔ یہی وہ ذرائع ہیں جن سے وہ رحمتِ الٰہی کے مورد بن سکتے ہیں۔

۱۳۲ حل لغات:۔ اَلْخَمْرُ :۔ اَلْخَمْرُ اِسْمٌ لِّکُلِّ مُسْکِرٍ خَامِرٍ الْعَقْلَ (اقرب) خمر ہر ایک نشہ دینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ جو عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔

اَلْمَیْسِرِ : یَسَرَ سے مَفْعِلٌ کا صیغہ ہے اور اَلْمَیْسِرِ کے معنے ہیں اَللَّعِبُ بِالْقِدَاحِ (۱) تیروں سے جُوا کھیلنا۔ (اَوْھُوَ النَّرْدُ اَوْ کُلُّ قِمَارٍ) اَوْھُوَ الْجُزُوْرُ الَّتِیْ کَانُوْا یَتَقَامَرُوْنَ عَلَیْھَا (اقرب) (۲) نرد یعنی شطرنج اور چوپٹ کو بھی میسر کہتے ہیں۔ (۳) ہر قسم کا جُوا بھی میسر کہلاتا ہے۔ (۴) میسر ان اونٹوں کو بھی کہتے ہیں جن پر لاٹری ڈالتے تھے۔

اَلْاِثْمُ : اَلْاَفْعَالُ الْمُبْطِئَۃُ عَنِ الْخَیْرِ۔ وہ کام جو نیکیوں سے روک دیں اُن کو اِثْمٌ کہتے ہیں۔ (۲) اِثْمٌ کا لفظ کبھی سزا اور تکلیف اور دُکھ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اپنے نتیجہ کے اعتبار سے تکلیف وغیرہ کے معنے دیتا ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے کہ کبھی سبب کو مسبب کی جگہ استعمال کرلیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اسے دوسری جگہ اِن معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا (فرقان آیت ۶۹) اسجگہ یَلْقَ اَثَامًا کے یہ معنے ہیں کہ جو شخص یہ کام کریگا وہ سزا پائیگا۔

۲ اَلْعَفْوَ

اَلْعَفْوُ : خِیَارُ الشَّیْءِ وَاَطْیَبُہٗ۔ بہتر سے بہتر اور پاک سے پاک چیز۔ (۲) مَا یَفْضُلُ عَنِ النَّفَقَۃِ وَلَا عُسْرَ عَلٰی صَاحِبِہٖ فِیْ اِعْطَائِہٖ۔ جو کسی کے خرچ سے بچ رہے اور دینے والے کو اس کے دینے میں تنگی محسوس نہ ہو۔ (۳) عَفْوُ الْمَالِ۔ وہ مال جو بغیر سوال کے دیا جائے۔ کہتے ہیں اَعْطَیْتُہٗ عَفْوًا یا اَعْطَیْتُہٗ عَفْوَ الْمَالِ۔ میں نے اُسے بغیر مانگے دیا۔ (اقرب)

اَلْخَمْرُ

اَلْمَیْسِرِ

تفسیر:۔ فرماتا ہے کہ لوگ تجھ سے شراب اور جُوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ جائز ہیں یا ناجائز۔ تو اُن سے کہدے کہ شراب اور جُوئے میں کچھ خرابیاں ہیں اور کچھ فوائد۔ لیکن خرابیاں فوائد کی نسبت زیادہ ہیں۔ یہ کیا ہی لطیف جواب اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اُن کے سوال پر انہیں فوری طور پر منع نہیں کیا کہ تم شراب نہ پیو اور جُوا نہ کھیلو۔ بلکہ فرمایا کہ اِن میں فوائد تھوڑے ہیں اور نقصانات زیادہ۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اِس جواب میں اصولی طور پر

اِثْمٌ

خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ قاعدہ بیان فرما دیا ہے کہ اگر کسی کام میں فائدہ زیادہ ہو اور نقصان کم تو اُسے اختیار کر لیا کرو۔ اور اگر نقصان زیادہ ہو اور فائدہ کم تو اُسے کبھی اختیار نہ کیا کرو۔ بالخصوص ایسا کام تو کبھی اختیار نہ کرو جس میں اِثْمٌ کَبِیْرٌ ہو۔ اِثْمٌ کے معنے گناہ کے بھی ہیں اور اِثْمٌ کے معنے نیکیوں سے محرومی کے بھی ہیں۔ گویا انسان کو کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے جس کے نتیجہ میں اُسے گناہ ہو۔ یا جس کے نتیجہ میں وہ نیکیوں سے محروم ہو جائے۔ خواہ اُس میں بظاہر کچھ فوائد بھی دکھائی دیتے ہوں۔

پھر مَنَافِعُ لِلنَّاسِ فرما کر اسلام نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ خواہ تمہاری نگاہ میں کوئی چیز کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اس کی خوبیوں سے کلّی طور پر انکار نہ کرو۔ جب شراب اور جُوئے جیسی چیزیں بھی فوائد سے خالی نہیں تو دوسری ضرر رساں چیزوں کو تم فوائد سے خالی کیوں سمجھتے ہو۔ بے شک تمہارا فرض ہے کہ تم اُن کے ضرر سے بچو۔ اور آئندہ نسلوں کو بچاؤ لیکن تمہاری بینائی ایسی نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ کسی چیز کا صرف تاریک پہلو ہی دیکھے بلکہ ہر چیز کا تاریک اور روشن دونوں پہلو تمہارے سامنے رہنے چاہئیں اور حُسن کا اقرار کرنے میں تمہیں کبھی بخل سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمان اس بارہ میں خود آ آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے۔ حالانکہ عرب کے رہنے والے شراب پینے کے اِس قدر عادی تھے کہ وہ اِس پر فخر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک عرب شاعر کہتا ہے۔

سے اَلَا ھُبِّیْ بِصَحْنِكِ فَاصْبَحِیْنَا
وَلَا تُبْقِیْ خُمُوْرَ الْاَنْدَرِیْنَا

یعنی اے میری محبوبہ تو بیدار ہو۔ اور اپنے بڑے پیالے میں ہم کو صبوحی پلا۔ اور اس قدر پلا کہ علاقہ شام کے اندر شہر کے شراب فروشوں کی شراب میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے سب کی سب ہمیں پلا دے۔ اِسی طرح جنگوں کے موقعہ پر وہ خصوصیت سے شراب کا زیادہ استعمال کیا کرتے تھے تاکہ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر لڑیں۔ اور عاقبت اندیشی کا خیال اُن میں نہ رہے۔ مگر ایسے ماحول میں رہنے کے باوجود انہوں نے خود پوچھا کہ یا رسول اللہ! شراب اور جُوئے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ ابھی شراب اور جُوئے کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہنے کے بعد وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ چیزیں قربِ الٰہی میں روک ہیں۔ اور ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا کوئی واضح حکم نازل ہونا چاہیئے۔ پس یہ سوال خود اپنی ذات میں صحابہ کرامؓ کی پاکیزگیٔ اُن کی بلندیٔ اخلاق اور اُن کے اعلیٰ کردار کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ شراب اور جُوا یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے روکنے کے لئے دنیا میں بڑی بڑی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ مگر اسلام کے سوا اور کوئی مذہب ان کو روک نہیں سکا۔ صرف اسلام ہی ہے جسے اِس میدان میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ شراب کے متعلق اسلامی تعلیم کی حقیقت آشکار کرنے کے لئے ہم پہلے دیگر مذاہب کی تعلیم کو جو وہ شراب کے متعلق دیتے ہیں بیان کرتے ہیں اور سب سے پہلے اسی مذہب کا ذکر کرتے ہیں جو سب سے قدیم مذہب ہونے کا مدعی ہے یعنی ویدک مذہب۔ ہندو مذہب کی شراب کے متعلق جو تعلیم ہے اس کے لئے ہمیں زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں۔ اِس مذہب کی بنا ویدوں پر ہے اور وید خود اس مسئلہ پر کافی سے زیادہ روشنی ڈالتے ہیں۔ ویدوں پر خصوصاً رگوید پر جو چاروں ویدوں میں سے اہم ہے ایک اجمالی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ شراب نہ صرف

جائز ہے بلکہ اسکا استعمال بعض موقعوں پر ضروری اور موجب ثواب بتایا گیا ہے اور ہند کے رِشی اسے ایک مقدس اور پاک چیز قرار دیتے ہیں۔ وید کے منتر یکے بعد دیگرے ہماری آنکھوں کے سامنے اس سنجیدہ کوشش کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں جو ہندوستان کا برگزیدہ پجاری اپنے پرماتما کی توجہ کو کھینچنے کے لئے شراب کو پیش کرکے کرتا ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان کے پجاری کی پُوجا میں شراب کا دوسری چیزوں کی نسبت بہت زیادہ دخل تھا۔ وہ سوم کا رس نہ صرف خود پیتا ہے بلکہ اُس کے ساتھ بہت سی پوجا کی چیزوں کو بھی نہلاتا ہے۔ اور اِندر اور دوسرے دیوتاؤں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اُنکے سامنے بھی اسے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح اتھروید میں اشونی کمار دیوتاؤں کی پوجا کے وقت جو منتر پڑھنے کے لئے بتائے گئے ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایام کا ہندو پجاری اِس چیز کو ایسا متبرک سمجھتا تھا کہ صرف خود ہی شراب کو استعمال نہ کرتا تھا بلکہ اپنے دیوتا سے بھی اس کے استعمال کی درخواست کرتا تھا۔ چنانچہ کانڈ ۹ ادھیائے ۱ منتر ۱۷ میں لکھا ہے:۔

” اے اشونی کمارو! پہاڑوں میں،
جنگلوں میں، جنگلی جڑی بوٹیوں میں جو
مدھو (شراب) ہے اسوقت (یعنی یگیہ کی
تقریب پر) جو کشید کی جاتی ہے۔ اُسکا رس
میرے اور آپ کے لئے ہو۔“

اِس منتر میں تو صرف دیوتا سے شراب کے استعمال کی درخواست ہی کی گئی ہے۔ مگر بلور کے بنائے ہوئے نیتر کی پوجا کے وقت اس سے بھی زیادہ یہ کام کیا جاتا ہے کہ اسے شراب سے غسل دیا جاتا ہے۔ گویا عملاً اسے شراب پلائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اتھروید کا یہ منتر پڑھا جاتا ہے کہ:۔

”اے بلور کے بنائے ہوئے نیتر! آپ
ہمارے مہمان ہو کر ہمارے گھر میں رہیگا اور
ہم آپ کو گھی شراب شہد اور میٹھے میٹھے
اِسی طرح کے کھانے دیتے ہیں۔ آپ ہماری
ہمیشہ بھلائی سوچتے رہا کریں۔ جیسے باپ
اپنی اولاد کے لئے بہتری سوچتا رہتا ہے۔“

(اتھروید کانڈ ۱۰ ادھیائے ۶ منتر ۲۶ و ۲۷)

یہ دو منتر تو اس امر پر روشنی ڈالتے ہیں کہ قدیم ہند کا پجاری پوجا کے وقت اپنے دیوتا سے شراب پینے کی درخواست کرتا ہے اور خود شراب پیتا اور بلور کے نیتر کو شراب میں غوطہ دیتا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ وضاحت اسی وید کے کانڈ ۱۰ ادھیائے ۱۰ اور منتر ۱۰ میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتا خود بھی اپنی کامیابی کی خوشی میں شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

”اپنے دشمنوں کو قابو کرکے فتح حاصل
کرنے کے لئے اِندر نے شراب کے پیالے
پیئے۔“

اِس زمانہ میں آریہ مت کے بعض ممبروں نے سوم کے رس اور اِسی قسم کے اور الفاظ کی تشریح کرتے وقت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وید میں شراب کا کوئی ذکر نہیں بلکہ گلو وغیرہ کے رس کا ذکر ہے۔ مگر جب ہم تمام کی تمام ہندو قوم کا طریقِ عمل دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ ہندو قوم کا میل جول کسی ایسی قوم سے جو شراب کی سخت عادی ہو کبھی لمبے عرصے تک اور پورے طور پر نہیں رہا جس سے خیال ہوسکے کہ دوسروں سے یہ عادات انہوں نے اخذ کرلی ہیں تو ہم کو ان تاویلات کے ماننے میں بہت کچھ تأمل ہوتا ہے۔ مگر جب ہم اتھروید کے کانڈ ۱۸ انوواک ۱ سوکت ۱ منتر ۴۸ کو دیکھتے ہیں تو ہے ان تاویلات کا قبول کرنا ہمارے لئے بالکل ناممکن ہوجاتا،

کیونکہ اس میں ہم یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ:۔

"یہ سوم بہت ہی لذیذ اور خوش ذائقہ ہے اور
کچھ میٹھا بھی اور کچھ تیز و ترش بھی ہے پینے
سوم کو پینے والے اندر دیوتا کے مقابلہ پر جنگ
میں کوئی دشمن نہیں ٹھہر سکتا۔"

ان حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندو مذہب پورے طور پر شراب کے استعمال کی اجازت دیتا ہے اور بعض عبادات میں اس کا استعمال ضروری قرار دیتا ہے۔ ہندوؤں کا تمدن بھی اس نتیجہ کی تصدیق کرتا ہے اور ان کی تاریخ بھی اسکی صحت پر شاہد ہے۔

ایرانی مذہب کی تعلیم:۔ دوسرا قدیم مذہب ایرانیوں کا مذہب ہے۔ ایرانی قوم ایک مسلسل اور لمبی تاریخ رکھتی ہے بلکہ تازہ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تعجب نہیں اسکا تمدن ویدک تمدن سے بھی پرانا ہو۔ اس قوم کے مذہب قدیم وجدید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں شراب جائز تھی۔ زردشتی مذہب کی واقفیت رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ زردشت کسی جدید مذہب کا بانی نہ تھا بلکہ اس نے قدیم ایرانی مذہب کو جو مرور زمانہ سے بہت کچھ بگڑ گیا تھا، دوبارہ زندہ کیا تھا۔ پس ایرانی مذہب کا فتویٰ شراب کے متعلق معلوم کرنے کے لئے ہمیں زردشت کی بعثت سے پہلے اور بعد دونوں زمانوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ گو تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی لوگ شراب بکثرت استعمال کرتے تھے مگر مذہبی طور پر وہ اس کو کیسا سمجھتے تھے اس کا پتہ ہمیں زردشتی کتب سے ہی ملتا ہے۔ چنانچہ پہلوی کتب میں زردشت کی پیدائش کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے والد پوروشاسپ کو فرشتہ نے ایک شراب کا گلاس دیا جس کے پینے کے قریب زمانہ میں ہی اس کی بیوی دوغدو نامی حاملہ ہوئی اور ایک ایسا لڑکا جنی جس نے مشرقی تاریخ میں ایک نیا انقلاب پیدا کرنا تھا۔

ایک مقدس انسان کی پیدائش کے لئے فرشتہ کا شراب کا گلاس انکے والد کو پلانا ایک ایسا واقعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کے زمانہ سے پہلے بھی شراب کا استعمال مذہباً نہ صرف جائز بلکہ مستحسن تھا۔

زردشت نے ایرانی مذہب میں جو اصلاح کی اس کی رو سے بھی شراب کا استعمال ایک مستحسن امر قرار دیا گیا۔ چنانچہ افرنگن کی دعائیں جو زردشتی مذہب کے پادریوں کے پڑھے جانے کے لئے مخصوص ہیں ان کے پڑھے جانے کے وقت جو رسوم ادا کی جاتی ہیں ان میں بھی شراب کا دخل ہے۔ دستور ان دعاؤں کے پڑھنے کے وقت ایک قالین پر جسے زمین پر بچھایا ہوا ہوتا ہے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے سامنے دھات کی تھالی یا کسی پودہ کے پتہ پر اس موسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ میوہ جات اور پھول رکھے جاتے ہیں اور ساتھ ہی برتنوں میں تازہ دودھ اور شراب اور تازہ پانی اور شربت پڑا ہوتا ہے۔ غرض ایرانی مذہب کے مطابق بھی شراب کا استعمال ایک مستحسن اور پسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔ اور بعض مذہبی رسوم کی ادائیگی کے وقت شراب کا استعمال یا اس کا پاس رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔

شراب اور بائیبل:۔ تیسرا قدیم مذہب اسرائیلی مذہب ہے۔ یہ مذہب بھی ہندو مذہب اور زردشتی مذہب کی طرح اپنا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے شروع کرتا ہے گو اس مذہب کی بنیاد حضرت موسیٰؑ نے رکھی ہے۔ مگر یہ ایک مسلسل سلسلہ تاریخ کے ذریعہ ابوالبشر آدم علیہ السلام سے اپنا تعلق جا ملاتا ہے۔ اس مذہب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کا استعمال ابتدائے آفرینش سے برابر چلا آیا ہے اور نہ صرف یہ کہ اسے کبھی برا نہیں سمجھا گیا بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی اسے استعمال کرتے رہے ہیں۔ بائیبل کی کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۲۰ تا ۲۲ میں لکھا ہے:۔

"اور نوح کھیتی باڑی کرنے لگا۔ اور اس نے

ایک انگور کا باغ لگایا - اور اُس کی مے پی کر
نشہ میں آیا - اور اپنے ڈیرے کے اندر آپکو
ننگا کیا - اور کنعان کے باپ حام نے اپنے
باپ کو ننگا دیکھا - اور اپنے دو بھائیوں کو
جو باہر تھے خبر دی - تب سم اور یافث نے
ایک کپڑا لیا اور اپنے دونوں کاندھوں پر دھرا
اور پچھلے پاؤں جاکر اپنے باپ کی برہنگی کو
چھپایا - "

یہ تو حضرت نوحؑ کا حال ہے - جو پہلے نبی ہیں جن کی
تاریخ ایک حد تک . . . . . محفوظ ہے - اور جن کے بعد
تاریخ ایک حد تک تفصیلی رنگ اختیار کر لیتی ہے - آپ کے
بعد دوسرا اہم بالشان زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے
اُن کی نسبت ہم بائبل کے باب ۱۴ آیت ۱۸ میں پڑھتے
ہیں کہ ملک صدق سالم کے بادشاہ نے اُن کی دعوت میں
روٹی اور مے پیش کی تھی - اسی طرح حضرت لوطؑ کی
نسبت پیدائش باب ۹ آیت ۳۲ و ۳۵ میں لکھا ہے کہ
لوطؑ کی لڑکیوں نے اپنے باپ کو مے پلائی جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نہ صرف شراب منع نہ سمجھی جاتی
تھی بلکہ ضروریات زندگی میں سے خیال کی جاتی تھی - کیونکہ
یہ واقعہ عذاب کے بعد کا ہے - جس وقت کہ حضرت لوطؑ اپنی
دونوں لڑکیوں سمیت جنگل میں ایک غار میں رہتے تھے -
اُس وقت اُن کے پاس شراب کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ بائبل
کے بیان کے مطابق اس وقت کے طرز معاشرت کے ماتحت
انہوں نے ان چند ضروری اشیاء میں جو وہ برباد ہونے
والی بستی سے لیکر نکلے تھے شراب کا شامل کرنا بھی ضروری
خیال کیا تھا - بنو اسرائیل میں نبوت کے منتقل ہونے میں
بھی شراب کا بہت کچھ دخل ہے - کیونکہ جیسا کہ بائبل
کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ابتداءً بڑے لڑکے ہی وارث
ہوا کرتے تھے اور انہی کی نسل سے شجرہ چلایا جاتا تھا -

چنانچہ اس طریق کے مطابق حضرت اسحاقؑ نے بھی اپنے
بڑے لڑکے عیسو کو برکت دینی چاہی . . . . مگر جیسا کہ
پیدائش باب ۲۷ سے معلوم ہوتا ہے حضرت یعقوبؑ کی
والدہ نے اُنکو کھانا پکا کر دیا - اور انہوں نے لذیذ کھانا
کھلاکر اور عمدہ شراب پلا کر (آیت ۲۵) اور اپنے آپ کو
عیسو ظاہر کرکے اُن سے اپنے حق میں دعا کروالی - اور
اس طرح نبوت عیسو کے خاندان سے نکل کر یعقوب یعنی
اسرائیل کے خاندان میں آگئی - پس بنی اسرائیل اپنی روحانی
ترقیات میں ایک حد تک مے کے بھی ممنون ہیں -

پھر نہ صرف یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت
اسحاقؑ نے خود ہی مے پی - بلکہ حضرت یعقوب کے حق میں بھی
جن کو وہ اپنا بڑا لڑکا عیسو خیال کر رہے تھے یہ دعا کی
کہ خدا تجھے اناج اور مے کی زیادتی بخشے (آیت ۲۸) جس
کے ذریعے انہوں نے بنی اسرائیل کے لئے ہمیشہ
شراب کا استعمال ضروری قرار دیدیا کیونکہ اگر وہ
شراب کا استعمال ترک کر دیں - تو یہ دعا باطل جاتی ہے
حضرت اسحاقؑ کی اس دعا کو حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنی وفات
کے وقت کی دعا سے اور تقویت دے دی - کیونکہ انہوں نے
اپنے بیٹے یہودا اور اُس کی اولاد کے حق میں خبر دی ہے -
کہ اُنکی آنکھیں شراب کے نشہ سے سرخ رہیں گی - (پیدائش
باب ۴۹ آیت ۱۲) اس زمانہ کے بعد بنی اسرائیل کی تاریخ
میں سب سے بڑا اور اہم زمانہ حضرت موسیٰؑ کا . . . . ہے -
حضرت موسیٰؑ یہودی مذہب کے بانی ہیں - اور اپنے سے پہلے
سب شریعتوں کے ناسخ ہیں - گو جہاں انہوں نے ایسے بہت
سے قانون اور رواج جو اُن سے پہلے بنی اسرائیل میں رائج
تھے موقوف کئے ہیں - شراب کے متعلق پہلے حکم کو تبدیل نہیں کیا
بلکہ انہوں نے بھی شراب کو خداوند کا چڑھاوا قرار دے کر
اس کو مقدس کیا ہے - کیونکہ جیسا کہ گنتی باب ۱۸ آیت ۱۲ سے
معلوم ہوتا ہے اچھی سے اچھی شراب کا حضرت ہارونؑ اور

اُن کی اولاد کے لئے جن کو کہانت کا عہدہ سپرد کیا گیا تھا وعدہ کیا گیا ہے اور بنی اسرائیل کا فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ عمدہ شرابیں خدا تعالیٰ کے نام پر معبد پر چڑھائیں جنہیں کاہن استعمال کریں۔

یہ وعدے جو اوپر بیان ہوئے ہیں صرف حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کے لئے ہیں۔ مگر دوسرے بنی اسرائیل کو بھی خالی نہیں چھوڑا۔ بلکہ اُن کے لئے بھی حضرت موسیٰؑ سے خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ خدا تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرینگے اور شریعت کی پابندی کرینگے تو ان کے رحم کے پھل اور ان کی زمین کے پھل اور اُن کے غلہ اور اُنکی مَے اور اُن کے تیل اور اُن کی گائیوں کی بڑھتی اور اُن کی بھیڑوں کے گلّوں میں اس زمین پر جس کی بابت اُس نے اُن کے باپ دادوں سے قسم کر کے کہا کہ تجھکو دونگا برکت بخشیگا۔ (استثنا باب ۷ آیت ۱۳) اس حوالہ کے علاوہ تورات میں اور بھی کئی جگہ بنی اسرائیل کے لئے شراب کی کثرت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور حضرت مسیحؑ کی آمد تک جس قدر انبیاء اور سلاطین گذرے ہیں عموماً سب کے ذکروں میں شراب کا پایا جانا گویا ان کی تمام تاریخ سے شراب کا استعمال نہایت کثرت سے ثابت ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد مذہبی دنیا میں عظیم الشان تبدیلی کر دینے والی ہستی جس کے بعد نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی تغیرِ عظیم پیدا کرنے والا انسان مبعوث نہیں ہوا حضرت مسیحؑ ہیں۔ اس وقت ان کے ماننے والوں کو دنیا میں ایک خاص مرتبہ اور عزت حاصل ہے۔ اور اُن کی تعلیم کو وہ نہایت کامل اور مکمل ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی شراب کے متعلق جو کچھ فتویٰ دیا ہے وہ اس کی تقدیس کا ہی ہے۔ انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ شراب کو بُرا نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود اس کو استعمال کرتے تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ معجزانہ طور پر شراب بنا کر لوگوں کو پلاتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کا خود شراب استعمال کرنا تو متی باب ۲۶ آیت ۲۹ سے ثابت ہے۔ جہاں لکھا ہے کہ مسیح نے حواریوں سے کہا کہ

> "میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیونگا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں۔"

اور اُن کا معجزانہ طور پر شراب بنانا اور دوسروں کو پلانا یوحنا باب ۲ آیت ۳ تا ۱۰ سے ثابت ہوتا ہے۔ ان آیات کا مضمون یہ ہے:-

> "اور جب مَے گھٹ گئی۔ یسوع کی ماں نے اُس سے کہا کہ ان کے پاس مَے نہ رہی۔ یسوع نے اُس سے کہا۔ کہ اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام میرا وقت ہنوز نہیں آیا۔ اُس کی ماں نے خادموں کو کہا۔ جو کچھ وہ تمہیں کہے سو کرو۔ اور وہاں پتھر کے چھ مٹکے طہارت کے لئے یہودیوں کے دستور کے مطابق دھرے تھے اور ہر ایک میں دو یا تین من کی سمائی تھی۔ یسوع نے انہیں کہا۔ مٹکوں میں پانی بھرو۔ سو انہوں نے ان کو لبالب بھرا پھر اُس نے انہیں کہا کہ اب نکالو۔ اور مجلس کے سردار پاس لے جاؤ۔ اور وے لے گئے۔ جب میر مجلس نے وہ پانی جو مَے بن گیا تھا چکھا اور نہیں جانا کہ یہ کہاں سے تھا مگر چاکر کہ جنہوں نے وہ پانی نکالا تھا جانتے تھے تو میر مجلس نے دولہا کو بلایا اور اُسے کہا کہ ہر شخص پہلے اچھی مَے خرچ کرتا ہے اور ناقص اسوقت کہ جب پی کے چھک گئے۔ پر تُو نے اچھی مَے اب تک رکھ چھوڑی ہے۔"

مذکورہ بالا حوالہ جات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائے عالم سے لیکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تمام کے تمام مذاہب شراب کے

جواز کا فتویٰ دیتے چلے آئے ہیں بلکہ اس کا استعمال بعض مذہبی رسوم میں بھی واجب رکھا جاتا ہے اور اسے متبرک اور مفید شے قرار دیا جاتا ہے۔ ان مذاہب کی موجودگی اور ان کے رسوخ کے وقت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ نے ان تمام مذاہب کی تعلیم کے خلاف اللہ تعالیٰ کا یہ حکم اپنے پیرووں کو سنایا کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ یعنی لوگ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ شراب اور جُوئے کے متعلق کیا حکم ہے؟ تو کہدے کہ ان میں نقصان بھی بہت ہے اور لوگوں کے لئے منافع بھی ہیں اور ان کا ضرر ان کے نفع سے زیادہ ہے۔

قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں شراب کو منع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (مائدہ آیت ۹۱ تا ۹۳) یعنی اے مومنو شراب اور جُوا اور چڑھاوے کی جگہیں اور لاٹری شیطانی کاموں میں سے ہیں۔ سو ان سے بچو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ شیطان سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتا کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے عداوت اور بغض پیدا کردے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اور نماز سے تم کو روک دے۔ پس کیا تم باز رہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اور ہمیشہ چوکس رہو۔ اور اگر تم باوجود سمجھانے کے پھر جاؤ تو خوب یاد رکھو کہ ہمارے رسول کا فرض صرف یہی ہے کہ تم لوگوں تک حق کو پہنچا دے۔

ان آیات میں شراب کو قطعی طور پر منع کر دیا گیا ہے اور ایک مسلمان کے لئے اس چیز کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔

میں بتا چکا ہوں کہ جس وقت یہ حکم اسلام نے دیا ہے اُس وقت تک تمام مذاہب شراب کو نہ صرف یہ کہ بُرا نہیں قرار دیتے تھے بلکہ اس کے استعمال کو بالعموم اچھا سمجھتے تھے اور بعض مذاہب کی رسوم میں اس کا استعمال واجب تھا۔ ایسے موقعہ پر اسلام کا شراب کو منع فرمانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ دنیا اس حکم کی خوبی کو سمجھنے کے لئے ابھی تیار نہ تھی بلکہ اس زمانہ کی طب بھی شراب کو ایک نہایت ہی مقوی اور اعلیٰ درجہ کی شے قرار دیتی تھی اور اس کا پینا صحتِ جسمانی کے لئے نہایت مفید قرار دیا جاتا تھا۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے اسلام نے شراب کو منع فرمایا۔ اور قطعی طور پر اس کا استعمال ناجائز قرار دے دیا۔ اور یونہی بلا وجہ نہیں بلکہ دلائل کے ساتھ اور دلائل دیتے وقت بھی تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ اس کے استعمال کو منع کرتے وقت یہ بھی اقرار کیا کہ اس میں فوائد بھی ہیں۔ ممکن ہے بعض فلسفیوں نے اس کے استعمال کو بعض حالات میں ناپسند کیا ہو لیکن جس رنگ میں اسلام نے اس مسئلہ کو حل کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔ مثلاً جینی مَت جو درحقیقت مذہب نہیں ہے بلکہ ایک فلسفہ ہے اس میں بھی شراب کی ممانعت کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ مگر کس بنا پر؟ کسی عقلی بنا پر نہیں۔ کسی علمی بنا پر نہیں۔ کسی مدلل پیرایہ میں نہیں بلکہ اس لئے کہ شراب کے تیار کرنے میں بہت سے کیڑوں کی جان جاتی ہے۔ اور چونکہ جان کا ہلاک کرنا جینی اصول کے ماتحت ناجائز ہے۔ اس لئے شراب کا استعمال باکمال پیرووں کو نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ممانعت درحقیقت نہ تو کلی ممانعت ہے اور نہ شراب پر بذاتہٖ نظر ڈال کر اور اس بات کو مدنظر رکھ کر کہ شراب کا

اثر اس کے استعمال کرنے والوں پر کیا پڑیگا اس کا حکم دیا
گیا ہے بلکہ صرف اس لئے کہ شراب کا استعمال جینی فلسفہ
کے اس مرکزی اصل کے خلاف تھا کہ جیو ہتیا کسی طرح
نہیں ہونی چاہیئے ۔ اس کا استعمال ناپسند کیا گیا ہے ۔
غرض اسلام تمام مذاہب میں سے بلکہ تمام تعلیموں میں
سے شراب کے منع کرنے اور بادلائل طور پر منع کرنے میں
منفرد ہے ۔ اور ایسے وقت میں اس نے شراب سے اپنے
پیروؤں کو منع کیا ہے جبکہ لوگ ابھی اس مناہی کے حکم کو
پورے طور پر سمجھنے کے بھی قابل نہیں تھے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے
ہیں کہ باوجود اس کے کہ قرآن کریم نے صاف بتا دیا تھا کہ
شراب کے نقصانات اس کے منافع سے زیادہ ہیں مسلمان
اطباء اپنی کتب میں برابر شراب کی تعریفیں اور خوبیاں بیان
کرتے رہے اور اس کثرت سے بیان کرتے رہے کہ انکی کتب کو
پڑھ کر حیرت آتی ہے ۔ چنانچہ میں اسجگہ صرف موجز کی کسی قدر
عبارت مختصراً بیان کر دیتا ہوں جو ایک عام درسی کتاب
ہے ۔ اس کتاب کا مسلمان مصنف شراب کے وصف کو یوں
بیان کرتا ہے :۔

" اور چاہیئے کہ مجلس شراب کے اردگرد منظر
لذیذ ہو ۔ پھول ہوں ۔ پیارے دوست ہوں
عمدہ خوشبوئیں ہوں ۔ دل خوش کن راگ ہو
اور ہر غم پہنچانے والی اور دل کو تنگ کرنیوالی
چیز کو دور کر دینا چاہیئے ۔ مثلاً بغل کی بو ۔
بوسیدہ لباس ۔ غم و غصہ اور شراب نہا کر اور
عمدہ کپڑے پہن کر اور سر اور داڑھی کے بال
کھلے چھوڑ کر اور ناخن کٹوا کر پینی چاہیئے اور
یہ بھی چاہیئے کہ جس مقام پر شراب پی جائے
وہ ہوادار اور کھلا ہو ۔ اور جاری پانی کے
کنارے پر ہو ۔ اور اس وقت لطیفہ گو دوست
ساتھ ہوں کیونکہ شراب نفسانی قوتوں کو
تحریک کرتی ہے اور تمام شہوات کو ابھارتی ہے
پس جب کوئی قوت اپنے مطلب کو نہیں پاتی
تو تکلیف محسوس کرتی ہے اور منقبض ہو جاتی ہے
پس نفس شراب کی طرف پورے شوق سے راغب
نہیں ہوتا ۔ اور نہ پورے طور پر اسے ہضم کرتا
ہے ۔ پس شراب کا نفع کم ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات
شراب کا پینا بیکار جاتا ہے ۔ اور شراب پینے
سے نفع کی نسبت نقصان زیادہ ہو جاتا ہے "

شراب کی نسبت یہ رائے ساتویں صدی ہجری کے
ایک مصری مسلمان مصنف کی ہے ۔ اور اس سے قیاس کیا
جا سکتا ہے کہ باوجود سات سو سال کی علمی ترقی کے مسلمان
بھی شراب کی مضرت کو علمی طور پر سمجھنے سے قاصر رہے ہیں ۔
اور اس وقت تک کی تحقیقات سے مجبور ہو کر لکھتے رہے
ہیں کہ شراب کا نفع اس کی مضرتوں سے زیادہ ہے حالانکہ
قرآن شریف صاف فرما چکا تھا کہ اس کا نقصان اس کے
نفع سے زیادہ ہے ۔ غرض قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو
سال پہلے جو تعلیم شراب کے متعلق تمام مذاہب کے برخلاف
دی تھی اور جس طرح دی تھی وہاں انسانی عقل نہیں پہنچ
سکتی تھی ۔ حتّٰی کہ باوجود قرآن کریم کے بیان کے خود مسلمان
اطباء علمی طور پر شراب کی مضرت کو ثابت نہیں کر سکے اور
انکو مجبوراً اس امر کا اقرار کرنا پڑا کہ شراب ایک نہایت
ہی نفع رساں شے ہے ۔

زمانہ پر زمانہ گذرتا گیا اور صدی کے بعد صدی آتی
گئی مگر شراب کے متعلق وہی تحقیق رہی جو ہزاروں سال سے
چلی آتی تھی کہ شراب ایک عمدہ شے ہے ۔ بلکہ یوں کہنا
چاہیئے کہ اس تحقیق کی اور بھی تصدیق ہوتی گئی ۔ اور اگر
کسی علم کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کے کلام کی تکذیب
کر سکے تو کہا جا سکتا ہے کہ علم طب نہایت دلیری سے
قرآن کریم کے اس ارشاد کی تکذیب صدیوں تک کرتا رہا ۔

یونانی طبّ کے دَور ختم ہونے اور طبِّ جدید کے دَور کے شروع ہونے پر اور ہزاروں تحقیقاتوں کو تو ردّی کر کے پھینک دیا گیا۔ لیکن شراب کی خوبیوں کے اظہار پر پہلے سے بھی زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اگر طبِّ قدیم تندرست آدمی کی صحت کے قیام اور کمزور کی طاقت بڑھانے کے لئے شراب کے استعمال کو مفید قرار دیتی تھی تو طبِّ جدید نے بعض خطرناک قسم کے مریضوں کا علاج ہی برانڈی تجویز کیا اور اس کے فوائد پر اس قدر زور دیا جانے لگا کہ کوئی ہسپتال مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا جس میں برانڈی کی چند بوتلیں نہ رکھی گئی ہوں۔ اور شراب کو آبِ حیات قرار دیا جانے لگا۔ اور بعض لوگ علی الاعلان کہنے لگے کہ جب تک شراب کو اسلام جائز نہ قرار دے دنیا کا اسلام کی طرف جھکنا ناممکن امر ہے۔ مگر باوجود اِن تمام تحقیقاتوں اور طبعی شہادتوں کے قرآن کریم کا یہ فیصلہ روشن حروف میں چمک رہا تھا کہ شراب کی مضرّتیں اُس کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ اور باوجود زمانہ کی ناموافق رائے کے کوئی شخص اِس فیصلہ کو بدل نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم خدا کا کلام اور آخری شریعت ہے جس کے بعد کوئی اور شریعت نہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ شراب کی مضرّتیں صرف جسمِ انسانی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا اثر اخلاق پر بھی پڑتا ہے اور بہت پڑتا ہے جیسا کہ خود قرآن کریم نے سورۂ مائدہ میں اس کی طرف اِن الفاظ میں اشارہ بھی فرمایا ہے کہ شیطان تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے عداوت اور بُغض پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر کتنے لوگ ہیں جو کھانے پینے کی چیزوں کے ان اثرات کی طرف جو اخلاق پر ہوتے ہیں توجہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اور اِس زمانہ میں تو ایک بہت بڑی مشکل یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ تمدّن اور تہذیب کی خرابی اور زوال اور انحطاط کے باعث وہ قوم جو شراب سے مجتنب ہے اپنے اخلاق میں بہت ہی گر گئی تھی۔ پس مقابلہ کیا جاتا تو کس طرح اور چند مثالوں سے کبھی کوئی مسئلہ پوری طرح صاف نہیں ہو سکتا۔ جو امر قوموں سے تعلق رکھتا ہو اس کے حل کرنے کے لئے قوموں کی ہی مثالیں درکار ہوتی ہیں۔ اور ان کا بہم پہنچانا ناممکن ہو رہا تھا۔ پس علمی طور پر علمِ طبّ کے ذریعے ہی اس پر روشنی پڑتی تھی اور اس مسئلہ کا پورے طور پر فیصلہ ہو سکتا تھا۔

قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کا ایک ایک لفظ جس قدر معانی پر دلالت کرتا ہے ان تمام معانی کی صداقت خدا تعالیٰ خود ظاہر کرتا ہے۔ اور زور آور حملوں سے ثابت کرتا ہے۔ ہاں بعض معانی کی صداقت ہمیشہ سے ثابت چلی آتی ہے۔ تاکہ ہر زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ حجت ہو۔ اور بعض معانی کی صداقت وہ آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں ثابت کرتا ہے تا معلوم ہو کہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے اور کسی انسان کا اس کی تالیف میں دخل نہیں کیونکہ اس میں وہ باتیں ہیں جو اس زمانہ کے علوم سے تعلق نہیں رکھتیں۔ شراب کے حکم کے متعلق بھی یہ دونوں پہلو اختیار کئے گئے تھے۔ اس کی اخلاقی مضرّتیں تو ہر زمانہ میں ثابت کی جا سکتی تھیں۔ گو لوگ اس کی طرف پوری توجہ کریں یا نہ کریں۔ اور گو بعض زمانوں میں بہ نسبت دوسرے زمانوں کے اُن کا ثابت کرنا زیادہ مشکل ہو۔ لیکن شراب پینے کی چیز ہے اور پینے کی چیزوں کا پہلا اثر جسمِ انسانی پر پڑتا ہے اور ان اشیاء کے متعلق طبعاً لوگوں کی توجہ بھی ایسے ہی اثرات کے معلوم کرنے کی طرف پھرتی ہے۔ پس اس حکم کی اہمیت اور خوبی اُسی وقت پورے طور پر منکشف ہو سکتی تھی جبکہ اس کے جسمانی اثرات کی مضرّتیں بھی روزِ روشن کی طرح ثابت ہوں۔ اور پھر اس کے نفع سے زیادہ ثابت ہوں۔ اِس اظہارِ حقیقت کا بھی آخر وقت آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو بعض ایسی ایجادوں کی توفیق دی

جن کے ذریعہ سے انسان نہایت باریک اعصاب اور ریشوں
پر مختلف ادویات اور اغذیہ اور تغیرات موسم اور احساسات
کا جو اثر ہو سکتا ہے اُسے معلوم کرنے کے قابل ہو گیا ۔ ان
ایجادوں نے جہاں اور عظیم الشان تغیرات پیدا کئے وہاں شراب
کے متعلق بھی قدیم علمی تحقیقات کی غلطی کو ثابت کر دیا ۔ اور
اکثر علماءِ طب کو اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ اس کے ضرر
اس کے نفعوں سے زیادہ ہیں ۔ اس قدیم اور مستحکم خیال کے
بدل دینے کا فخر علم النفس کے ایک ماہر کریپلین کو حاصل ہے،
جس نے اپنے بعض ہم خیالوں کی مدد سے کوشش کر کے اس
امر کو ثابت کر دیا کہ شراب کی چھوٹی سے چھوٹی مقدار کے
ایک ہی دفعہ کے استعمال سے بھی انسانی دماغ کے باریک
ریشوں اور اعلیٰ درجہ کے علمی مرکزوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے
اسی طرح ہاج نے بھی الکوہل کے اس اثر کے متعلق تجربات
کئے جو پٹھوں پر پڑتا ہے ۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ شراب
کے استعمال سے برداشت اور ذکاوت اور صبر کی قوتوں کو
نہایت سخت نقصان پہنچتا ہے ۔ مسٹر الیگزنڈر برائس ایم۔ڈی
ڈی۔پی۔ایچ جو ماہر علم الاغذیہ ہیں شراب کے متعلق اپنی
تحقیقات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :۔

"اس میں کچھ شبہ اب باقی نہیں رہا کہ
شراب درحقیقت ایک نہایت سخت زہر ہے
جو باریک ریشوں کو تباہ کر دیتا ہے ۔ پہلے تو
یہ اپنا خواب آور اثر ظاہر کرتا ہے ۔ اور
آہستہ آہستہ تحلیل کرنا شروع کر دیتا ہے ۔
خصوصاً اعصاب کو سخت نقصان پہنچاتا
ہے ۔ درحقیقت اس کا حق نہیں کہ اسے مقوی
ادویہ میں شامل کیا جائے ۔ کیونکہ یہ صرف
ایک ایسی دوائی ہے جو ایک عارضی تحریک
کر دیتی ہے مگر اس کے بعد ایک طویل عرصہ
تک ضعف رہتا ہے ۔ تقریباً تمام سمجھدار ڈاکٹروں
کی رائے اب یہی ہو گئی ہے کہ صحت میں اس
کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ۔ اور اگر بیماری کے
علاج میں اس کا فائدہ بالکل مشتبہ نہ سمجھا
جائے تو بھی یہ بات تو متحقق ہے کہ یہ
اس قابل ہے کہ اس کی جگہ عموماً دوسری ایسی
دوائیں استعمال کی جائیں جو اس سے کم ضرر رساں
ہیں ۔"

ان انکشافات کا اثر لازمی طور پر علم طب پر پڑنا تھا
اور پڑا ۔ چنانچہ ۱۹۰۰ء سے برابر علم طب کے ماہروں کی
توجہ اس طرف پھرنی شروع ہو گئی کہ شراب کے استعمال
کو کم کیا جائے ۔ چنانچہ ایڈنبرگ کے ایک ہسپتال میں
جہاں ۱۸۹۱ء میں فی مریض اوسطاً نو روپیہ کی شراب خرچ
ہوتی تھی ۱۹۰۰ء میں کل ۱۲ آنے کی خرچ ہوئی ۔ اس تجربہ
کی کامیابی نے ان کی توجہ کو اور بھی کھینچا اور ۱۹۰۹ء میں
سر تھامس فریزر نے جو بہت بڑے ڈاکٹروں میں سے ہیں اپنے
زیر علاج مریضوں کو ایک ماشہ شراب بھی استعمال نہیں
کرائی ۔ اور اب بہت سے ہسپتال اس قسم کے تجارب
کر رہے ہیں اور سوائے چند شدید بیماریوں ۔ مثلاً نمونیا
خناق اور محرقہ کے بہت کم استعمال کی جاتی ہے ۔ اور
تندرستوں کے لئے بھی اس کا استعمال اب مضر سمجھا
جاتا ہے ۔ غرض قرآن کریم کے فیصلہ کے تیرہ سو سال بعد
دنیا پر اب آکر روشن ہوا ہے کہ شراب کے ضرر اس کے
فوائد سے بہت زیادہ ہیں ۔ اور علمی طور پر یہ بات تحقیق
کو پہنچ گئی ہے ۔ اور اب وہ لوگ جو اچھی بات کے
قبول کرنے کے لئے کسی رسم یا عادت یا خیال یا اصول
کی پرواہ نہیں کرتے اپنی غلطی کی اصلاح کی فکر کر رہے
ہیں ۔ وہ لوگ اپنی کوشش میں کامیاب ہونگے یا عادات
رسم اور پرانے مذہبی خیالات غالب آئیں گے ۔ اللہ تعالیٰ
ہی جانتا ہے ۔ مگر یہ بات ظاہر ہے کہ یہ جدوجہد اور

جدید علمی تحقیق اس امر کو روزِ روشن کی طرح ثابت کر رہی ہے
کہ قرآن کریم کی تعلیم باقی تمام مذاہب کی تعلیموں پر ایک
زبردست فوقیت رکھتی ہے۔ حتّٰی کہ اس کے بعض احکام
کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے جو وہ تمام دیگر مذاہب کے
برخلاف دیتا ہے۔ دنیا کو تیرہ سو سال کی تحقیق کی ضرورت
پیش آتی ہے۔ اور اس لمبی تحقیق کے بعد ہزار ہا دھکّے
کھا کر وہ اسی نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ جو حکم اسلام نے دیا
تھا وہی درست اور صحیح تھا۔

اَب مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شراب کے معاملہ
میں نہ صرف بلحاظ تعلیم کے اسلام کو دیگر ادیان پر
تفوق حاصل ہے بلکہ بلحاظ تاثیر کے بھی دیگر ادیان پر
اور تمام اخلاقی تحریکوں پر اسے تفوق حاصل ہے۔ جن
لوگوں نے شرابیوں کی حالت کا کبھی غور سے مطالعہ کیا
ہے اور ایسے لوگوں سے اُن کو واسطہ پڑا ہے جنہیں شراب
کی عادت ہو چکی ہو۔ وہ اس امر کو خوب اچھی طرح جانتے
ہیں کہ شراب کی عادت جن لوگوں کو پڑ جاتی ہے اُن کے لئے
اُس کا چھوڑنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ دوسرے نشوں
کے برخلاف شراب میں ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ
جن لوگوں کو اس کی سخت عادت پڑ جاتی ہے اُن کو اس
سے ایک قسم کا جنون سا لگاؤ ہو جاتا ہے جو ورثہ کے
طور پر اُن کی اولاد میں بھی منتقل ہو جاتا ہے اور ایسے لوگ
جب تک شراب میں مخمور نہ رہیں۔ اُن کو چین نہیں آتا
اور اس کے حاصل کرنے کے لئے سخت سے سخت جرم سے
بھی پرہیز نہیں کرتے۔ پس شراب کی عادت کا چھڑا دینا
کوئی معمولی بات نہیں۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ صرف اسلام
ہی ایک مذہب ہے جس نے نہایت عمدگی سے اور
دلائل کے ساتھ شراب کی ممانعت اپنے پیروؤں کو
کی ہے۔ اور باقی سب ادیان نہ صرف یہ کہ شراب کے
استعمال سے اپنے پیروؤں کو روکتے نہیں بلکہ اُن میں سے
بعض مذاہب نے اس کا استعمال مذہبی رسوم کے اندر
داخل کر رکھا ہے۔ لیکن مَیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں
کہ باوجود اس اجازت کے بلکہ بعض صورتوں میں حکم کے
اِن مذاہب کے بڑے بڑے آدمیوں نے شراب کی مضرتوں
کو دیکھ کر یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اگر شراب کا استعمال
اِسی طرح جاری رہا تو اُن کی قومیں کیا بلحاظ صحت و
تندرستی کے اور کیا بلحاظ اخلاق و آداب کے بہت
گر جائیں گی۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ
ابتدائے عالم سے ہی ایسے لوگ ہوتے چلے آئے ہیں جو
یہ تحریک کرتے رہے ہیں کہ شراب کا استعمال کم کیا جائے۔
اور اعتدال کو ہر حالت میں مدِّنظر رکھا جائے۔ تمام مشرقی
ممالک کی تاریخ (اور یہی ممالک پرانے زمانہ میں تہذیب و
تمدّن کے جھنڈے کو بلند کرنے والے تھے) اس بات پر
شاہد ہے کہ قدیم سے قدیم زمانہ سے ہندوستان۔ ایران
چین۔ فلسطین۔ مصر۔ یونان اور کالڈیا کے علماء مذہبی
فلاسفر اور مقنّن بدمستی سے دُور کرنے کی کوشش کرتے
رہے ہیں۔ لیکن ان کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہی کہ
اگر بعض آدمیوں نے کچھ مدت کے لئے شراب کا استعمال
کم کر دیا تو کچھ عرصہ کے بعد پھر تمام کا تمام ملک اِس
"آبِ حیات" سے اپنی رُوح کو تازہ کرنے کیلئے دوڑ
پڑا۔ امریکہ کو ہی دیکھ لو۔ امریکہ میں شراب نوشی کے
انسداد کے لئے حکومت نے کتنی کوششیں کیں لیکن چونکہ
ایمان ان لوگوں کے دلوں میں نہیں تھا بلکہ ممانعتِ شراب
کے پیچھے صرف ایک قانون کام کر رہا تھا اس لئے یہ تحریک
ناکام رہی۔ ہزارہا موتیں صرف اس وجہ سے واقع ہوئیں
کہ لوگ شراب پینے کے شوق میں سپرٹ پی لیتے اور سپرٹ
میں چونکہ زہریلی چیزوں کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے کئی
اندھے ہو جاتے اور کئی مر جاتے۔ پھر امریکہ میں نصف
سے زیادہ ایسے لوگ تھے جو باہر سے ناجائز طور پر

شرابیں منگواتے اور پیتے۔ گورنمنٹ کا قانون تھا کہ ڈاکٹر
کے سرٹیفکیٹ کے بغیر کسی شخص کو شراب نہیں مل سکتی
اس قانون کی وجہ سے ہزاروں ڈاکٹروں کی آمدنیاں
پہلے سے کئی گنا بڑھ گئیں وہ فیس لیکر سرٹیفکیٹ
دے دیتے کہ فلاں شخص کا معدہ کمزور ہے یا اور کوئی
ایسی بیماری ہے اسے پینے کیلئے شراب ملنی چاہیئے۔ غرض
ہزاروں ڈاکٹروں کا گذارہ محض اسی قسم کے سرٹیفکیٹوں
پر ہو گیا اور باوجود شراب نوشی کے خلاف قانون بن
جانے کے لوگ کئی قسم کے حیلوں سے کوشش کرتے کہ
کسی طرح قانون شکنی کریں۔ غرض کسی ملک میں کسی مدبّر
کسی مقنّن کسی واعظ اور کسی فلاسفر کی کوشش کا یہ
نتیجہ نہیں نکلا کہ لوگوں نے واقعہ میں شراب کم کر دی
ہو۔ اور وہ اس عہد پر قائم رہے ہوں۔ اگر ایک جماعت
نے اس کا استعمال کم کر دیا تو دوسری نے اُس کی کسر
پوری کر دی۔ شراب بہرحال اپنے مرکز پر قائم رہی اور
اسے کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

اب آؤ اور اس کے مقابلہ میں اس تاثیر کو دیکھو
جو انسدادِ شراب نوشی کے متعلق اسلام کو حاصل ہے۔
اسلام اُس وقت دنیا میں آیا جبکہ علم و سائنس کا رواج
دنیا میں بہت کم تھا۔ یونانی علوم اپنی ترقی کی انتہا کو
پہنچکر مسیحی پادریوں کی سعی سے گوشۂ گمنامی میں جا بیٹھے
تھے اور سوائے معدودے چند آدمیوں کے دوسرے لوگ
اُن سے ناواقف تھے۔ خصوصاً ایشیائے کوچک پر جسکا
اِن علوم کی ترقی میں خاص حصّہ تھا سخت اندھیرا چھایا
ہوا تھا۔ ہندوستانی فلسفہ بھی تنزل پر تھا۔ ایران بھی
اخلاقی اور علمی طور پر انحطاط کی طرف قدم زن تھا۔ اور
عربوں کی حالت تو سخت ناگفتہ بہ تھی۔ حجازی عربوں
میں پڑھنا لکھنا ہی بہت بڑا علم تھا۔ اور اس فن کے واقف
بھی چند آدمیوں سے زیادہ نہ تھے۔ علم الاخلاق اُنکے ہاں
وہی تھا جو اُن کے شاعروں نے اپنے شعروں میں نظم کیا
اور علم طب اُن کے ہاں وہی تھا جو اُن کی بڑی بوڑھیاں
بطور صدری نسخوں کے یکے بعد دیگرے ایک دوسری کو سناتی
چلی آتی تھیں۔ اور وہ علم الاخلاق جس کی طرف اُنکے شاعروں
نے راہنمائی کی ہے یہی ہے کہ شراب انسان کے اخلاق کو
اعلیٰ کرتی ہے۔ اور اُسے دلیر اور سخی بناتی ہے اور یہی دو
خصائل ہیں جن کی عرب پرواہ کرتا تھا۔ اُس کے نزدیک
تمام علم الاخلاق انہی دو صفات میں مرکوز تھا۔ اور ان کا
علم طب بھی انکو یہی ہدایت کرتا تھا کہ ہر مرض کا علاج
شراب کا جام ہے۔ پس عرب اپنے علوم کے لحاظ سے
شراب سے متنفر نہیں بلکہ اس کا دلدادہ تھا۔ ہر عرب
شراب کا عادی تھا۔ اور عادی بھی ایسا کہ اُنکے روزمرّہ
کے شغلوں میں سے سب سے بڑا شغل ہی شراب نوشی تھا۔
عرب کے شعروں کو پڑھو۔ شراب کے ذکر سے اُن کی کوئی
نظم خالی نظر نہیں آتی۔ عرب کا مشہور شاعر طرفہ جو اپنی
زبان کی خوبی اور مضامین کی بلندی کی وجہ سے عرب کا
دوسرے نمبر کا شاعر سمجھا جاتا ہے لکھتا ہے:۔

وَاِنْ تَبْغِنِیْ فِیْ حَلْقَةِ الْقَوْمِ تَلْقَنِیْ
وَاِنْ تَقْتَنِصْنِیْ فِی الْحَوَانِیْتِ تَصْطَدِیْ
كَرِیْمٌ یُرَوِّیْ نَفْسَهٗ فِیْ حَیَاتِهٖ
سَتَعْلَمُ اِنْ مِتْنَا غَدًا اَیُّنَا الصَّدِیْ

یعنی اگر تو میری تلاش قوم کی مجلس شوریٰ میں کرے تو
تو مجھے وہاں پا لیگا یعنی میں باوجود نوعمر ہونیکے قوم کا
معتمد ہوں (یہ صرف بیس سال کی عمر میں مارا گیا تھا) اور
اگر تو مجھے شراب کی دکانوں پر تلاش کرے تو وہاں بھی
مجھے پائیگا۔ یعنی دو ہی مقام ہیں جہاں میں مل سکتا ہوں
اپنی دانائی کی وجہ سے قوم کی مجلس شوریٰ میں مجھے جانا پڑتا
ہے۔ اور اپنی شراب نوشی کی وجہ سے شراب خانوں پر میرا
پھیرا رہتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔ میں وہ شریف النفس

ہوں کہ اپنے نفس کو مَیں نے اس زندگی میں سیراب کر دیا ہے۔ اور اگر اے دوستو ہم مرجائیں تو تم کو بعد مُردن معلوم ہو جائیگا کہ کون پیاسا ہے یعنی مَیں اس قدر شراب پینے والا ہوں کہ مرنے کے بعد بھی نشہ میں ہی اٹھوں گا۔ طرفہ کی یہ باتیں باتیں ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اِس پر عمل پیرا بھی تھا۔ چنانچہ عرب کے بادشاہ عمرو بن ہند نے جب اس کے بعض اشعار پر جو اُس نے بادشاہ کی ہجو میں کہے تھے ناراض ہوکر عین اُس کے عنفوانِ شباب میں اس کے قتل کا حکم اپنے والیٔ بحران کو لکھا۔ اور اُس نے طرفہ سے دریافت کیا کہ وہ اپنے لئے بہترین طریقہ موت کا چُنے۔ تو اِس نے یہ پسند کیا کہ اس کے پاس بہت سی شراب رکھدی جائے۔ اور اسی کو پیتے وقت اس کی رگوں کا خون نکال کر اُسے قتل کر دیا جائے۔

اِسی طرح عرب کا ایک شاعر ابومحجن ثقفی اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

إِذَا مِتُّ فَادْفِنِّيْ إِلٰى اَصْلِ كَرْمَةٍ
تُرَوِّي عِظَامِيْ بَعْدَ مَوْتِيْ عُرُوْقُهَا
وَلَا تَدْفِنَنِّيْ فِي الْفَلَاةِ فَإِنَّنِيْ
اَخَافُ إِذَا مَا مِتُّ اَنْ لَّا اَذُوْقَهَا

یعنی جب مَیں مرجاؤں تو مجھے انگور کے درختوں کے پاس دفن کیجیو تا کہ اس کی جڑیں میری ہڈیوں کو سیراب کرتی رہیں اور مجھے جنگل میں دفن نہ کیجیو۔ تا ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد میں شراب سے محروم رہ جاؤں۔ (کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ)

شعراء کے کلام کے علاوہ لغتِ عرب بھی عرب کے شراب پر شیدائی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ عربی زبان میں شراب کے نام اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ انکو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور کسی زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ تمدن عرب بھی اس بات کا شاہد ہے کہ عرب شراب نوشی میں نہ صرف کامل تھا بلکہ باقی تمام دنیا سے بڑھا ہُوا تھا۔ کیونکہ عرب میں شراب کشید کرنے کا طریق بہت قدیم زمانہ میں دریافت کرلیا گیا تھا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے :-

"معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگوں کو شراب کے کشید کرنے کا طریق معلوم تھا اور تاریخی زمانوں میں عرب لوگ شراب کے کشید کرنے کا کام کیا کرتے تھے۔"

اِس تاریخی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب قدیم زمانہ میں شراب بنانے اور اس کے استعمال کرنے میں سب سے آگے تھے۔ بلکہ [illegible] دنیا کے لئے کشید کردہ شراب کی جو خمیرسے تیار کردہ شراب سے زیادہ سخت اور زیادہ عادی بنا دینے والی ہے اکیلی منڈی بنا ہُوا تھا یہ ملک تھا جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اور یہ قوم تھی جس سے شراب چھڑانے کا انہوں نے ارادہ کیا۔ اس ارادہ کے پورا کرنے کیلئے انہوں نے کیا تدابیر اختیار کیں۔ اور ان کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہ ایک حیرت انگیز تاریخی واقعہ ہے جس پر تمام عقلیں دنگ ہیں اور کل دانا انگشت بدنداں۔ اس شراب کے نشہ میں مخمور رہنے والی قوم اور شراب کو اپنا ایک ہی دل لگی کا ذریعہ سمجھنے والی جماعت میں ایک دن محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نکلتے ہیں۔ اور مختصر اور صاف لفظوں میں خدا تعالیٰ کا یہ حکم سُنا دیتے ہیں۔ کہ شراب کے نقصانات چونکہ اس کے نفع سے زیادہ ہیں اس لئے اللہ تعالےٰ نے آئندہ کے لئے اس کو حرام کر دیا ہے۔ پس ہر ایک مسلمان کو چاہیئے کہ اس سے پرہیز کرے۔ اور اس کا بنانا۔ بیچنا۔ پینا اور پلانا ترک کر دے۔ اور اِس حکم کو سُنکر وہ شراب کے شیدائی اپنا سر نیچا کر لیتے ہیں۔ اور ایک شخص کے مُنہ سے بھی اِس کے خلاف

آواز نہیں نکلتی۔ ہر ایک اُن میں سے شرح صدر سے اس حکم کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اس وقت کے بعد شراب کا گلاس کسی ایک فرد کے مُنہ کے قریب بھی نہیں جاتا۔ وہ لوگ مہلت نہیں مانگتے۔ قلت وکثرت کا سوال نہیں اُٹھاتے۔ کیونکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جس چیز کی زیادتی حرام ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ ان کو لیکچروں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ شراب کی بُرائیاں ذہن نشین کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اسلام نے اُن کے ذہنوں کو ایسی جلا دے دی تھی کہ حق بات کی طرف توجہ دلانا اُن کیلئے کافی ہوتا تھا۔ اور تعصب اور خود بینی سے انکو اس قدر دُور کر دیا تھا کہ اپنی غلطیاں خود بخود اُن کی آنکھوں کے سامنے آجاتی تھیں۔ پس کسی لیکچرار کے لیکچر یا میجک لنٹرن کی تصاویر کی اُن کو ضرورت نہ تھی۔ اُن کے لئے صرف ایک اشارہ کافی تھا۔ ایک لفظ بس تھا۔ اور سب معاملہ آپ ہی آپ اُنکے لئے واضح ہو گیا۔ اُن کا اپنا نفس اُن کے لئے لیکچرار تھا اور گوشہ ہائے دماغ میجک لنٹرن کے پردے جن پر وہ عقل کی آنکھوں کے ساتھ خوب اچھی طرح اِن بدمستیوں کے نظاروں کو دیکھ سکتے تھے جو شراب نوشی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ جھوٹی تصویروں کے محتاج نہ تھے۔ سچا نقشہ اُن کی رہنمائی کے لئے کافی تھا۔ اسلام کے اس دو حرفہ حکم کا جو اثر شراب نوشی پر ہُوا۔ اُس کی بہترین مثال ذیل کا واقعہ ہے۔ جو مسلم۔ مسند احمد بن حنبلؒ اور ابن جریر کی روایات سے ماخوذ ہے۔

حضرت انسؓ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام میں سے تھے اور مدینہ کے رہنے والے تھے۔ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن ابو طلحہؓ کے مکان پر مجلس شراب لگی ہوئی تھی اور بہت سے دوست جمع تھے۔ میں شراب پلا رہا تھا۔ دَور پر دَور چل رہا تھا۔ اور نشہ کی . . . وجہ سے اُن کے سر جھکنے لگے تھے۔ کہ اتنے میں گلی میں کسی نے آواز دی کہ شراب حرام کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اُٹھ کر دریافت کرو کہ یہ بات درست بھی ہے یا نہیں۔ مگر بعض دوسروں نے کہا کہ نہیں پہلے شراب بہا دو پھر دیکھا جائے گا۔ اور مجھے حکم دیا کہ میں شراب کا برتن توڑ کر شراب بہا دوں۔ چنانچہ میں نے ایک سونٹا مار کر وہ گھڑا جس میں شراب تھی توڑ دیا اور اس کے بعد وہ لوگ کبھی شراب کے نزدیک نہیں گئے۔

اِس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اثر لوگوں کے دلوں پر کیا تھا۔ مجلس شراب میں جبکہ لوگ نشہ میں ہیں۔ ایک شخص کے خبر دینے پر بلا تحقیق شراب کا بہا دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کی اہمیت کو وہ اقوام زیادہ سمجھ سکتی ہیں جو شراب کی عادی ہیں۔ کیونکہ جب دُور سے دیکھنے والے ان کی اس حالت کو عجیب حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو خود اُن کے دل ضرور اس حالت کی خصوصیت کو اچھی طرح محسوس کرتے ہونگے۔ اس واقعہ کو دوسرے مذاہب اور دوسرے تمدنوں اور قوانین کے اثرات کے ساتھ ملا کر دیکھو کہ کیا دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نہیں؟ آج جبکہ سائنس اور علومِ طبعیہ شراب کی مضرت کو ثابت کر رہے ہیں اور شراب کے ترک کرنے میں ملکی بہبودی اور مالی فراخی کی بھی اُمید ہے۔ پھر بھی لوگ شراب چھوڑنے کیلئے تیار نہیں لیکن عرب کا مخمور مسلم ایک راستہ پر چلنے والے کی اکیلی آواز سُنکر کہ شراب حرام کی گئی ہے شراب کے مٹکوں کو توڑ کر مدینہ کی گلیوں میں شراب ہی کا دریا بہا دیتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

دوسری چیز جس سے اِس آیت میں روکا گیا ہے وہ جُوا ہے۔ جُوا بھی اہلِ عرب کی گھٹی میں رچا ہُوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے جب کوئی بڑی دعوت کرنی ہوتی تو اس کے اخراجات کے لئے یہ انتظام کرتے کہ تمام امراء مل کر جُوا کھیلتے اور جو ہار جاتا اس پر اُس خرچ کی ذمہ داری ڈال دی جاتی۔ اِسی طرح جنگوں کے موقعہ پر وہ قرعہ اندازی سے کام لیتے اور

جس امیر آدمی کا نام نکلتا اُس کا فرض قرار دیا جاتا کہ وہ لڑنے والوں کے کھانے پینے کا انتظام کرے۔ اور انکو شراب مہیا کرکے دے۔ گویا یہ جنگی اخراجات پورا کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی مسلمانوں کو منع فرمادیا کیونکہ جس طرح شراب جسم اور اخلاق اور روحانیت کو تباہ کرنے والی چیز ہے اسی طرح جُوا بھی اخلاق اور تمدّن کو تباہ کرنے والی چیز ہے۔ جُوئے کا عادی انسان اگر جیتتا ہے تو اور ہزاروں گھروں کی بربادی کا موجب ہو کر۔ پھر جُوئے باز میں زمین اور روپیہ لٹانے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی جوئے باز ایسا ہو گا جو روپیہ کو سنبھال کر رکھتا ہو۔ بالعموم جوئے باز بے پرواہی سے اپنے مال کو لٹاتے ہیں اور ایک طرف تو اَور لوگوں کو برباد کرتے ہیں اور دوسری طرف اپنے مال سے فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ روپیہ کمانے میں انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر جُوا عقل اور فکر کو بھی کمزور کر دیتا ہے۔ اور جُوئے باز عادتاً ایسی چیزوں کے تباہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے جنہیں کوئی دوسرا عقلمند تباہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ جب شراب سے جو سپاہیوں میں تہوّر پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا اور جُوئے سے جو لوٹ مار کا طریق تھا اور جس سے وہ لوگ جنگی اخراجات پورا کیا کرتے تھے۔ روک دیا گیا تو بجائے اس کے کہ اُن کے دلوں میں کوئی انقباض پیدا ہوتا انہوں نے قربانیوں کی راہ میں ایک اور قدم آگے بڑھایا۔ اور جائز ذرائع سے کمائے ہوئے اموال کے متعلق بھی یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ انہیں خدا تعالیٰ کی راہ میں کس نسبت سے خرچ کرنا چاہیئے۔ چونکہ پہلے بھی ایک ایسا ہی سوال گذر چکا ہے۔ اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہاں اقسام صدقہ کے متعلق سوال تھا اور یہاں کمیّت کے متعلق سوال ہے یعنی جب جُوا بھی منع کر دیا گیا تو اُن کے دلوں میں سوال پیدا ہوا کہ اب لازماً ہمیں زیادہ قربانی کی ضرورت ہوگی۔ سو ہم کیا خرچ کریں۔ کیا سب کچھ یا کسی اور نسبت سے۔ گویا جس حد تک ہمیں اپنے اموال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے چاہئیں اُس پر روشنی ڈالی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں صرف ایک لفظ عفو استعمال فرمایا ہے جس کے ایک معنے اس مال کے ہیں جو ضروری اخراجات سے بچ جائے۔ اور جس کے دینے سے انسان کو کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہو۔ دوسرے معنے عَفْوٌ کے خِیَارُ الشَّیْءِ وَ اَطْیَبُهٗ کے ہیں یعنی سب سے اچھی اور پاکیزہ شے اور تیسرے معنے عَفْوٌ کے بغیر مانگے دینے کے ہیں۔ مفسّرین نے اس آیت کے کئی معنے لکھے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسجگہ جہاد میں اموال خرچ کرنے کا حکم ہے۔ صدقات مراد نہیں۔ گویا ان کے نزدیک زیر تفسیر آیت کے یہ معنے ہیں کہ جب جہاد درپیش ہو تو اپنی ضروریات سے زائد مال تمام کا تمام جہاد کے لئے دے دو۔ دوسرے معنے اس کے یہ کئے جاتے ہیں کہ یہاں جہاد کا نہیں بلکہ صدقات کا ذکر ہے اور پھر عَفْوٌ کے لحاظ سے اس کے کئی معنے کرتے ہیں۔ (۱) بعض کہتے ہیں کہ عفو کے معنے ضرورت سے زائد مال کے ہیں۔ چنانچہ ابتدائے اسلام میں سال بھر کے نفقہ سے جو کچھ بچ رہتا اس کے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا مسلمانوں کو حکم تھا۔ مگر آیت زکوٰۃ کے نازل ہونے پر یہ حکم موقوف ہو گیا۔ گویا اُن کے نزدیک یہ آیت اب منسوخ ہو چکی ہے۔ (۲) دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ کے متعلق حکم ہے اور مجملاً بیان ہوا ہے۔ اس کی تفصیل دوسری جگہوں سے معلوم ہوتی ہے۔ (۳) ایک اور جماعت عفو کے معنے اس مال کے کرتی ہے جس کا خرچ کرنا بوجھ معلوم نہ ہو۔ (۴) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے درمیانی خرچ کے ہیں۔ یعنی نہ بالکل کم خرچ کرو اور نہ حد سے زیادہ۔ (۵) پھر بعض نے کہا ہے کہ عفو کے معنے بہتر اور پاک مال کے ہیں۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اچھے اور پاک مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہیں کہ پرانی اشیاء یا دوسروں کے اموال اکٹھا کر دے دو۔ (۶) بعض نے کہا ہے۔

کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ و خیرات خوب دل کھول کر کرو۔

جس جماعت نے اس آیت کے یہ معنے کئے ہیں کہ جو ضرورت سے زائد بچے اُسے خرچ کر دو۔ اُس نے بھی اسے یا تو جہاد پر چسپاں کیا ہے۔ یا منسوخ قرار دیا ہے۔ اور وہ اس بات پر مجبور بھی تھے۔ کیونکہ وہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے عمل اور اُمتِ اسلامیہ کے طریق کو اس کے خلاف دیکھتے تھے۔ احادیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں کہ اپنے اخراجات نکال کر باقی سارا مال تقسیم کر دینا اسلامی حکم نہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ يَجِيْئُ اَحَدُكُمْ بِمَالِهٖ كُلِّهٖ يَتَصَدَّقُ بِهٖ وَ يَجْلِسُ يَتَكَفَّفُ النَّاسَ اِنَّمَا الصَّدَقَةُ عَنْ ظَهْرِ غِنًى (کشاف) یعنی تم میں سے بعض لوگ اپنا سارا مال صدقہ کے لئے لے آتے ہیں اور پھر لوگوں کے آگے سوال کیلئے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ صدقہ صرف زائد مال سے ہوتا ہے۔ اسی طرح فرماتے ہیں۔ لَاَنْ تَذَرَ وَرَثَتَكَ اَغْنِيَاءَ خَيْرٌ مِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً يَتَكَفَّفُوْنَ النَّاسَ (ترمذی) یعنی اگر تو اپنے ورثاء کو دولتمند چھوڑ جائے تو یہ زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ تو انکو غریب چھوڑ جائے۔ اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دو ثلث مال کے تقسیم کر دینے کی اجازت چاہی مگر آپ نے انہیں منع فرمایا۔ پھر انہوں نے آدھا مال تقسیم کرنا چاہا۔ تو اس سے بھی منع فرمایا۔ پھر انہوں نے تیسرے حصہ کے تقسیم کر دینے کی اجازت چاہی تو اس حصہ کی آپ نے اجازت دے دی مگر ساتھ ہی فرمایا۔ اَلثُّلُثُ وَ الثُّلُثُ كَثِيْرٌ یعنی تیسرے حصہ کی وصیت کر دو گو ثلث بھی کثیر ہے۔ غرض یہ خیال کہ اسلام کا یہ حکم ہے کہ جو مال ضرورت سے زائد بچے اُسے تقسیم کر دینا چاہیئے۔ بالکل خلاف اسلام اور خلاف عملِ صحابہؓ ہے جن میں سے بعض کی وفات پر لاکھوں . . . روپیہ ان کے ورثاء میں تقسیم کیا گیا۔ پھر اگر اسلام کا یہی حکم تھا تو زکوٰۃ کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جب سب مال جو ضرورت سے زائد ہو تقسیم کر دینے کا حکم ہے تو زکوٰۃ مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر ضرورت سے بچے ہوئے کی اصطلاح خود مبہم ہے۔ بعض لوگ جو کچھ ان کو مل جائے گو لاکھوں روپیہ ہی کیوں نہ ہو خرچ کر دیتے ہیں اور ضرورت سے زائد اُن کے خیال میں کوئی مال ہوتا ہی نہیں۔ پھر بعض لوگ اپنا سب مال تجارت وغیرہ میں لگائے رکھتے ہیں۔ اُن کے پاس بھی ضرورت سے زیادہ نہیں بچ سکتا۔ عقلاً بھی یہ خیال بالکل باطل ہے۔ کیونکہ جب تک ایک جماعت ایسے لوگوں کی نہ ہو جو مالدار ہوں عام ملکی ترقی نہیں ہو سکتی اور غرباء کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض روحانی لوگ اپنے اموال کو حتی الوسع غرباء کی خدمت میں خرچ کرتے ہیں اور اسے اسلام نے منع نہیں کیا بلکہ پسند کیا ہے۔ مگر یہ بات غلط ہے کہ اسلام نے اس امر کا حکم دیا ہے کہ دنیا میں مالی مساوات قائم کی جائے۔ اور ضرورت سے زیادہ مال لوگ لازماً خرچ کر دیا کریں۔ اگر یہ اصل تسلیم کیا جائے تو یہ اصل بھی مقرر کرنا پڑے گا کہ ضرورت سے مراد عام حالتِ ملکی کے مطابق اخراجات ہونگے۔ ورنہ اگر اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ ہر شخص اپنی ضرورت کا خود فیصلہ کرے تو پھر بھی مساوات نہیں رہے گی۔ کوئی شخص اعلیٰ سے اعلیٰ کھانوں اور عمدہ سے عمدہ کپڑوں اور وسیع اور کھلے اور آراستہ و پیراستہ مکانوں اور خوشنما چمنوں اور میوہ دار باغوں کے لئے روپیہ رکھ کر باقی اگر بچیگا تو غرباء میں بانٹ دیگا۔ اور غریب بیچارے معمولی لباس پہنے اور جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور ہونگے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے احکام کے مطابق ہر مسلمان حکومت کا یہ فرض ہے کہ اس کے ملک کے باشندے فاقہ سے نہ رہیں اور تن کے قابلِ ستر مقامات کیلئے کپڑا مہیا کیا کرے۔ گویا انسانی زندگی

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ

اِس جہان کے بارے میں (بھی) اور آخرت کے بارے میں بھی۔ اور یہ (لوگ) تجھ سے یتامیٰ کے بارے میں (بھی) پوچھتے ہیں۔

کی پوری طرح حفاظت کرے اس کے لئے امراء سے شریعت کے حکم کے مطابق مال لے کر غرباء پر خرچ کرتی ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ خرچ کیا جائے امراء کی اپنی مرضی پر منحصر ہے ہاں اگر زکوٰۃ دینے کے بعد بھی کوئی شخص فاقہ سے مرتا ہوا کسی کو نظر آئے تو اس کا فرض ہے کہ اُس کی جان بچانے کی پوری کوشش کرے۔ اس دعویٰ کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کیا ہے۔ آپ نے اسے اسلام کے اصولی احکام بتائے۔ اور اُن میں زکوٰۃ کا مسئلہ بھی بیان فرمایا۔ یہ سب کچھ سُن کر اُس شخص نے کہا۔ کہ میں اس سے نہ زیادہ کرونگا نہ کم۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے اس قول کو پورا کر دیا تو یہ کامیاب ہو گیا۔ اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غرباء کی مدد کے لئے زکوٰۃ سے زیادہ دینا کسی پر فرض نہیں۔ ہاں اگر کوئی زیادہ دے تو یہ اُسکی نیکی ہے۔

دراصل اس آیت میں تین قسم کے لوگوں کے لئے تین مختلف احکام دیئے گئے ہیں۔ اور یہ تینوں احکام عفو کے لفظ کے اندر شامل ہیں۔ پہلا حکم جو ادنیٰ درجہ کا ایمان رکھنے والوں کے لئے ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اسقدر خرچ کرو کہ بعد میں تمہارے ایمان میں کوئی تزلزل واقع نہ ہو اور تمہارے دین اور ایمان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ہم نے دیکھا ہے بعض لوگ جوش میں آکر بہت سارو پیہ دینی ضروریات کے لئے صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب انہیں مالی مشکلات محسوس ہوتی ہیں تو اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت دی ہے کہ جس نے کل اپنے ایمان سے ہاتھ دھونا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ آج ہی اپنا ہاتھ اتنا نہ پھیلائے کہ بعد میں یہ انفاق اس کے لئے ٹھوکر کا موجب بن جائے۔

دوسرا حکم اُن سے اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو یہ دیا کہ تمہارا جو اچھے سے اچھا مال ہے اُسے تم خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور (۳) جو لوگ اِس سے بھی اوپر درجہ کے ہیں انہیں یہ حکم دیا کہ وہ بغیر کسی کے سوال کے خود ہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال دے دیا کریں۔ گویا اُن سے کسی کو مانگنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آنی چاہیئے بلکہ انہیں خود بخود مذہبی اور قومی ضروریات کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اور ہمیشہ اس کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے رہنا چاہیئے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۔ كَذٰلِكَ میں كَ واحد کی علامت آیا ہے حالانکہ لَكُمْ بتاتا ہے کہ مخاطب بہت سے ہیں۔ اِس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ قرآن کریم میں واحد کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور مراد جمع ہوتی ہے۔ ابو حیّان کہتے ہیں وَهِيَ لُغَةُ الْعَرَبِ يُخَاطِبُوْنَ الْجَمْعَ بِخِطَابِ الْوَاحِدِ (بحر محیط جلد ۲ صفحہ ۱۵۹) یعنی یہ اہل عرب کا محاورہ ہے کہ وہ بعض دفعہ جمع کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں كَثُرَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ۔ اسی طرح کہتے ہیں فَقُلْنَا اَسْلِمُوْا اِنَّا اَخُوْكُمْ ہم نے کہا تم مسلمان ہو جاؤ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ یعنی اِخْوَانُكُمْ کہنے کی بجائے اَخُوْكُمْ کہہ دیا گیا۔ اسی طرح کہتے ہیں كُلُوْا فِيْ نِصْفِ بَطْنِكُمْ تَعِيْشُوْا تم نصف بھوک رکھ کر کھاؤ۔ تم زندہ رہو گے۔ (الصاحبی لاحمد بن فارس صفحہ ۱۸۰)

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ شرعی احکام کا چونکہ ایک اثر دنیوی زندگی پر پڑتا ہے۔ اور ایک

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ

تو کہہ دے (کہ) انکی اصلاح بہت اچھا کام ہے۔ اور اگر تم اُن سے مِل جُل کر رہو تو (اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

بھائی ہی ہیں اور اللہ فساد کرنے والے کو اصلاح کرنے والے کے مقابلہ میں خوب جانتا ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو

لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۱﴾

تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ اللہ یقیناً غالب (اور) حکمت والا ہے۔ ۱۳۳

اخروی زندگی پر۔ اس لئے ہم اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ تم اُن پر غور کر سکو۔ اور تم جو بھی قدم اٹھاؤ علیٰ وجہ البصیرت اٹھاؤ۔ اندھا دھند کسی بات کو نہ مانو۔

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۔ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کا اشارہ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ بے شک شراب اور جُوئے میں بعض قسم کے فوائد بھی ہیں مگر ان میں ضرر زیادہ ہیں۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے بھی اور دینی نقطۂ نگاہ سے بھی۔ اِسی طرح دوسرے احکام بھی تمہارے فائدہ کے لئے دیئے گئے ہیں پس تمہارا کام ہے کہ تم غور و فکر سے کام لے کر وہ راہ اختیار کرو جو دینی اور دُنیوی دونوں رنگ میں تمہیں کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والی ہو۔

۱۳۳ حل لغات :۔ اَعْنَتَ کے معنے ہیں وہ کام سپرد کرنا جس کی طاقت اور برداشت نہ ہو۔ کہتے ہیں اَعْنَتَ الرَّاكِبُ الدَّآبَّةَ اَيْ حَمَلَهَا مَالَا تَحْتَمِلُهُ (اقرب) سوار نے سواری وغیرہ کو ایسے کام پر لگایا جس کی اُسے طاقت نہ تھی۔

اَعْنَتَكُمْ

تفسیر :۔ فرماتا ہے۔ لوگ تجھ سے یتامیٰ کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تو اُن سے کہہ دے کہ اُن کی اصلاح اور ترقی کو مدّنظر رکھنا بڑا اچھا کام ہے اور اگر تم اُن سے مِل جُل کر رہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ آخر وہ تمہارے بھائی ہیں اور بھائیوں کے ساتھ مل کر رہنا بڑی اچھی بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والے کو اِصلاح کرنے والے کے مقابلہ میں خوب جانتا ہے۔

یتامیٰ کے متعلق آج دنیا میں بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ یا تو اُن پر حد سے زیادہ سختی کی جاتی ہے اور یا پھر حد سے زیادہ پیار کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ بگڑ جاتے ہیں حالانکہ نہ اُن پر زیادہ سختی کرنی چاہیئے اور نہ اِتنا پیار کرنا چاہیئے کہ خواہ وہ کچھ کریں یہ کہا جائے کہ اِسے کچھ نہیں کہنا۔ اس کا باپ مرا ہوا ہے۔ عام طور پر لوگ ان کو لاوارث پاکر یا تو حد سے زیادہ سختی کرتے ہیں یا پھر حد سے زیادہ نرمی۔ لوگ جھوٹے رحم سے کام لے کر انہیں کچھ نہیں کہتے۔ اور اس طرح وہ بچے جو یتیم رہ جاتے ہیں بگڑ جاتے اور اُن کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم ہر بات میں ان کی اِصلاح کو مدّنظر رکھو۔ اور درمیانی راہ اختیار کرو۔ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ یتامیٰ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو ان کی طرف توجہ نہیں کرتے انہیں یہ تو سوچنا چاہیئے کہ کیا یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ خود مر جائیں اور اپنے بچّوں کو یتیم چھوڑ جائیں (سورۃ نساء آیت ۱۰)

اس رنگ میں اللہ تعالیٰ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یتامیٰ کی پرورش اور اُن کی نگہداشت ایک اہم ترین فرض ہے ۔ لوگ اگر مرنے سے ڈرتے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ دیکھتے ہیں فلاں شخص مر گیا اور اس کے بچے دربدر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں ۔ یا ان بچوں کو کسی نے ملازم رکھ لیا ہے تو وہ بات بات پر اُن کو بوٹ سے ٹھوکریں مارتا اور اُن کے مونہہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے ۔ وہ روتے ہیں چیختے ہیں ۔ چلاتے ہیں مگر اُن کی آہ و زاری اُس کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی ۔ یہ حالات دیکھ کر وہ بھی موت سے گھبراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو میرے بچوں کے ساتھ بھی لوگ ایسا ہی سلوک کریں گے ۔ لیکن اگر قومی کیریکٹر ایسا اعلیٰ درجہ کا بن جائے کہ جب کوئی شخص مرے تو اس کے بچوں کے متعلق ساری قوم میں ایک زبردست جذبۂ اخوت پیدا ہو جائے اور ہر شخص کہے کہ ان بچوں کو میرے سپرد کیا جائے میں اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش کروں گا تو موت کا ڈر ہر شخص کے دل سے نکل جائے اور وہ سمجھنے لگ جائے کہ اگر میں مر گیا تب بھی میری قوم کے افراد ایسے اچھے ہیں کہ وہ میرے بچوں کی میری طرح ہی خبرگیری کریں گے ۔ اور انہیں تھپڑوں اور بوٹ کی ٹھوکروں کا نشانہ نہیں بنائیں گے ۔ پس یتامیٰ کی خبرگیری اور بیواؤں سے حسن سلوک یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو قوم میں جرأت اور بہادری پیدا کر دیتی ہیں ۔ اگر یہ چیز قوم میں موجود نہ ہو بلکہ اُس کے برعکس اُس کے افراد کا نمونہ یہ ہو کہ وہ یتامیٰ تو رکھتے ہوں مگر ملازم بنا کر بلکہ ملازموں سے بھی بدتر حالت میں اور وہ ذرا ذرا سی بات پر اُن کو تھپڑ مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہوں تو کون شخص ہے جس کا مرنے کو دل چاہے گا ۔ ہر شخص ڈرے گا ۔ ہر شخص موت سے گھبرائیگا اور سمجھیگا کہ میری موت میرے بچوں کی موت ہے ۔ میری موت میری بیوی کی موت ہے میں مروں تو کس طرح اور جان دوں تو کیوں ۔ پس ضروری ہے کہ ساری قوم کا یہ کیریکٹر بن جائے کہ جب کوئی شخص فوت ہو تو یہ سوال نہ ہو کہ کون اُس کے بچوں کی پرورش کریگا ۔ بلکہ لوگ خود دوڑتے ہوئے جائیں اور ان بچوں کو اپنے سینہ سے لگاتے ہوئے اپنے گھروں میں لے آئیں اور اپنے بچوں کی طرح بلکہ اپنے بچوں سے بھی بڑھکر اُن سے محبت اور پیار اور نرمی اور شفقت کا سلوک کریں ۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا واقعہ ہے ایک بچہ یتیم رہ گیا ۔ تو بعض صحابہؓ میں آپس میں لڑائی شروع ہو گئی ایک کہتا میں اس کی پرورش کرونگا ۔ دوسرا کہتا میں اسکی پرورش کرونگا ۔ آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ بچہ سامنے کرو ۔ اور وہ جس کو پسند کرے اُس کے سپرد کر دو ۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ اگر کوئی شخص مرنے لگتا ہے تو اُسے اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں میں سب سے بڑا فکر اور اضطراب یہی ہوتا ہے کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا ۔ کون اُن کی پرورش کرے گا ۔ کون ان کی نگہداشت کریگا کون اُن کی طرف محبت اور پیار کی نگاہ سے دیکھے گا ۔ اور جب وہ شخص مر جاتا ہے اور اُس کے بچوں کی پرورش کا سوال سامنے آتا ہے تو ایک شخص کہتا ہے میرا دل تو چاہتا ہے کہ بچہ لے لوں مگر کیا کروں مجھ پر بوجھ بڑا ہے ۔ دوسرا کہتا ہے منشاء تو میرا بھی یہی تھا مگر مشکلات بہت ہیں ۔ تیسرا کہتا ہے میں بھی یہ ثواب حاصل کرنا چاہتا تھا مگر بہت مجبوری ہے ۔ اس طرح ایک ایک کر کے ہر شخص اس بوجھ سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن صحابہؓ میں یہ بات نہیں تھی ۔ وہ بھاگتے نہیں تھے بلکہ خوشی سے اس ثواب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے جب کسی قوم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ یتامیٰ و مساکین کی خبرگیری کرنے لگ جائے ۔ اُن کا احترام افراد قوم کے دلوں میں پیدا ہو جائے ۔ اُنکی پرورش میں انہیں سکون اور راحت حاصل ہو اور وہ یتیموں کو ایسا ہی سمجھیں جیسے اُن کے اپنے بچے ہیں تو اُس وقت ایمان کے بغیر بھی وہ قوم بہادر بن جاتی ہے ۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ

اور تم مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو۔ اور ایک مومن لونڈی

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا

ایک مشرک عورت سے خواہ وہ تمہیں (کتنی ہی) پسند ہو یقیناً بہتر ہے۔ اور مشرکوں سے

اور جب اس کے ساتھ کسی کو حیات بعد الموت پر ایمان بھی ہو اور زندہ خدا پر توکل ہو تو پھر تو یہ دو چیزیں مل کر اُس کے دل کو ایسا مضبوط بنا دیتی ہیں کہ موت کا ڈر اس کے قریب بھی نہیں آتا۔ یورپین قوموں میں اگر ہمیں دلیری نظر آتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نوجوانوں کے اندر یہ احساس پایا جاتا ہے کہ اگر ہم مرگئے تو ہماری قوم یتامیٰ و بیوگان کی خبر گیری کریگی۔ یہی وجہ ہے کہ مرنے والا موت کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے اور اپنی جان کو قربان کر دیتا ہے۔ ایمان تو عمدہ چیز ہے۔ وہ زیادہ تر انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے نبی پر تازہ بتازہ ایمان لانا نصیب ہو۔ مگر قومی کیرکٹر کی اس رنگ میں مضبوطی ایمان کے بغیر بھی افراد قوم کو بہادر اور نڈر بنا دیا کرتی ہے۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ۔ فرمایا۔ اگر تم انہیں اپنے ساتھ ملا لو یعنی کھانے پینے تجارت اور دوسرے کام کاج میں ان کو اپنے ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں۔ تم ایسا کر سکتے ہو۔ مگر بھائی کہہ کر ذمہ داریاں بھی بتا دیں کہ اُن کے ساتھ وہ معاملہ ہونا چاہیئے جو ایک بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔ بڑا بھائی جس کے سپرد چھوٹے بھائیوں کی نگرانی ہوتی ہے اسی طرح کرتا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرتا ہے۔ انہیں کھلاتا پلاتا ہے اور بڑے ہونے پر اُن کا مال ان کو دے دیتا ہے۔ اسی طرح یتامیٰ کو بھائی کہہ کر توجہ دلائی کہ چھوٹے بھائیوں سے لینے کی اُمید نہ رکھو بلکہ انہیں اپنے پاس سے بھی کچھ دینا چاہیئے اور اُن کے ساتھ وہی معاملہ ہونا چاہیئے جو بھائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگر تم مصلح بن کر فساد کی بنیاد ڈالو گے۔ اور یتامیٰ کے ساتھ ناروا سلوک کرکے انہیں دُکھ پہنچاؤ گے یا ناواجب پیار کرکے انہیں خراب کر دو گے تو دونوں صورتوں میں خدا تعالیٰ کے سامنے تم جواب دہ ہوگے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایسا حکم دے دیتا جس کے نتیجہ میں تمہیں تکلیف ہوتی۔ یعنی وہ کہہ دیتا کہ یتامیٰ کا مال بھی الگ رکھو اور اُن کا خرچ بھی برداشت کرو۔ لیکن اُس نے رحم سے کام لیا اور تمہاری سہولت کو اُس نے مدنظر رکھا۔ اس سہولت کا یہ نتیجہ نہیں نکلنا چاہیئے کہ تم یتامیٰ کی تربیت کا خیال نہ رکھو یا اُن کے اموال کو غصب کرنے کی کوشش کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ اس میں عزیز اور حکیم کی صفات کا ذکر کرکے پھر دو امور کی طرف توجہ دلائی۔ ایک طرف تو اس امر کی طرف کہ یتیم میں طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے حقوق دوسروں سے لے سکے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اگر وہ عزیز نہیں تو خدا تعالیٰ تو عزیز اور غالب ہے جس طرح تم یتیم پر غالب ہو تمہارے اوپر بھی کوئی غالب ہستی ہے۔ اگر تم اس کے حقوق کو تلف کرو گے یا ناجائز سختی اور دباؤ سے کام لو گے یا اس کا مال کھاؤ گے تو خدا تعالیٰ تمہیں پکڑے گا۔ پھر فرمایا تھا کہ یتیم سے نرمی کرو اور اُس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا لو۔ اس کے متعلق فرمایا۔

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ

جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں (مشرکان عورتیں) مت بیاہو - اور ایک مومن غلام ایک مشرک (آزاد) سے (بھی) خواہ وہ تمہیں

لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى

(کتنا ہی) پسند ہو یقیناً بہتر ہے - یہ لوگ (تو) آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ (تعالیٰ) اپنے حکم کے ذریعہ سے

الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ

جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے - اور لوگوں کے لئے اپنی (معرفت کی) علامات کھول کھول کر بیان کرتا ہے

۲۷ ع ۱۱

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۲﴾

تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں - ۱۳۴ھ

کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے تمہیں بھی حکمت سے کام لینا چاہیئے - اور جس بات میں فائدہ ہو وہی اختیار کرنی چاہیئے -

ترتیب و ربط - سابقہ آیات کے ساتھ ان آیات کا ربط یہ ہے کہ جنگ کے احکام کے سلسلہ میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس کے نتیجہ میں بہت لوگ شہید ہو جائیں گے اور ان کے بچے یتیم رہ جائینگے ایسی صورت میں اُن سے کیا سلوک کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ نے زیر تفسیر آیات میں اس سوال کا جواب دیدیا - اور اسطرح تمام مضمون ایک لڑی میں پرو دیا - درحقیقت قرآنی مضامین کی ترتیب عام کتب کی ترتیب کے مطابق نہیں بلکہ طبعی ترتیب ہے اپنے مضامین میں جو ترتیب رکھتا ہے وہ اس ترتیب سے علیحدہ ہے جو انسان اپنی کتابوں میں رکھتے ہیں - قرآن کریم اس چیز کو جو سب سے پہلے بیان ہونی ضروری ہو بیان کرتا ہے اور پھر اسکے متعلق انسانی قلب میں پیدا ہونیوالے تمام وساوس اور شبہات کا ازالہ کرتا ہے - مثلاً جنگ ہے اس کے متعلق جو سوال پیدا ہونگے انکو بیان کریگا پھر ان سے جو سوال پیدا ہوگا اُس کا ذکر کریگا - اور اسمیں جن امور کی طرف انسانی ذہن منتقل ہو گا وہ بیان کرتا چلا جائیگا - اور چونکہ ایسے سوالات طبعی ہوتے ہیں اس لئے اُن کے جوابات کا قلوب پر خاص اثر پڑتا ہے - یہی طبعی ترتیب اسجگہ بھی کام لیا گیا ہے - چنانچہ جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کا ذکر کردیا جو جنگ سے براہ راست تعلق رکھنے والی چیزیں تھیں اور جب جوئے سے اخراجات جنگ پورے کرنیکے طریق سے روک دیا تو طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر یہ اخراجات کس طرح پورے ہونگے - اس کیلئے بتایا کہ ضروریات زندگی پوری کرنیکے بعد جو رقم بچ رہے - وہ خرچ کرنی چاہیئے - پھر ایک ہی لفظ عفو استعمال کرکے اس میں مختلف مدارج کا ذکر کرکے بتایا کہ ادنیٰ درجہ کونسا ہے اور اعلیٰ درجہ کونسا - اسکے بعد یتامیٰ کے حقوق کو لے لیا کیونکہ جنگ کے بعد لازماً اس سوال نے اہمیت اختیار کرلینی تھی - غرض قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ اُس نے اپنے مضامین میں ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی ترتیب رکھی ہے جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے - ادھر ایک سوال فطرت انسانی میں پیدا ہوتا ہے اور ادھر قرآن کریم میں اس کا جواب موجود ہوتا ہے -

لَا تَنْكِحُوْا

۱۳۴ھ حل لغات: - لَا تَنْكِحُوْا - نَكَحَ يَنْكِحُ سے جمع مخاطب نہی کا صیغہ ہے - اور نَكَحَ الْمَرْاَةَ کے معنے ہیں تَزَوَّجَهَا اُس نے عورت سے شادی کرلی - (اقرب)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى لا فَاعْتَزِلُوا

اور یہ لوگ تجھ سے حیض کے (ایام میں عورت کے پاس جانیکے) بارہ میں (بھی) سوال کرتے ہیں۔ تو کہدے کہ وہ ایک ضرر رساں (امر) ہے

النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ لا وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ج

اسلئے تم عورتوں سے حیض (کے دنوں) میں علیحدہ رہو۔ اور جب تک وہ پاک (وصاف) نہ ہولیں اُن کے پاس نہ جاؤ۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ مشرک عورتوں سے اُس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں یعنی اگر جنگ میں مشرک عورتیں آئیں تو تم اُن سے نکاح نہ کرو۔ ہاں اگر وہ ایمان لے آئیں تو پھر بے شک اُن سے نکاح کر سکتے ہو۔ یہ حکم بھی جنگ کے احکام کے سلسلہ میں ہی دیا گیا ہے کیونکہ ایام جنگ میں مسلمان اپنے گھروں سے بہت دُور ہوتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اُن میں سے کسی کو مشرکہ عورت سے شادی کرنے کا خیال آجائے۔

وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ میں مومن لونڈی کو حُرّہ مشرکہ سے اچھا ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ مومنہ کا تو صرف جسم ہی غلام ہوتا ہے مگر حُرّہ مشرکہ کی رُوح شیطان کی غلامی میں ہوتی ہے۔ اور جسم کی غلامی رُوح کی غلامی کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ اسی طرح حکم دیا کہ مومن عورتیں مشرکوں کے نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔

پھر فرماتا ہے کہ ہم نے یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ یہ لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں۔ یعنی جب مشرکہ عورت مسلمان کے گھر میں آئیگی۔ یا مسلمان عورت مشرک سے بیاہی جائیگی تو چونکہ میاں بیوی کے تعلقات کا ایک دوسرے پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کے یہ تعلقات انہیں دین سے منحرف کرنے والے ثابت ہونگے۔ پس مشرک عورتوں یا مردوں سے تعلقات پیدا نہ کرو۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ تمہیں خدائے واحد سے منحرف کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اس طرح تمہیں جہنّم کی طرف لے جائیں گے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہیں جنّت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ جنّت وہ جگہ ہے جہاں دلوں میں سے ہر قسم کا کینہ نکل جائیگا۔ مگر مشرک مرد اور مومن عورت یا مشرک عورت اور مومن مرد کبھی ایک نکتہ پر متحد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ توحید اور شرک دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ اور جب ان میں مذہبی عقائد اور تمدّن اور تہذیب کے لحاظ سے اتحاد ہی نہیں ہوگا۔ تو اُن کی اہلی زندگی خوشگوار کس طرح ہو سکتی ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ شرعی اصطلاح میں مشرک سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جن کی کوئی شریعت نہ ہو۔ اہلِ کتاب اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔

بِاِذْنِهٖ کا لفظ جو اسجگہ بڑھایا گیا ہے ہمیشہ ایسی صورت میں استعمال ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے اپنی طرف سے سامان پیدا کرے۔ خواہ وہ سامان تقدیرِ عام کے ماتحت ہوں یا تقدیرِ خاص کے ماتحت۔ مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ قانونِ قدرت کو توڑ کر خدا تعالیٰ کوئی کام کرتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خاص حکم سے اس کام کو سرانجام دینے کے سامان مہیا فرماتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

آخر میں يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ ہم نے قانونِ نکاح تمہارے

فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ

پھر جب وہ نہا کر پاک ہو جائیں۔ تو جدھر سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ اُن کے پاس آؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اللہ اُن سے جو اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں یقیناً محبت کرتا اور (ظاہری و باطنی) صفائی رکھنے والوں سے بھی یقیناً محبت کرتا ہے ۱۳۵

سامنے بیان کر دیا ہے۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اِس قانون کو مدّنظر رکھو اور جنگ میں بھی جبکہ دشمن کی عداوت انسان کو نابینا کر دیتی ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے ماتحت چلنے کی کوشش کرو۔

۱۳۵ حل لغات :- اَلْمَحِيْضُ۔ اَلْحَيْضُ وَوَقْتُ الْحَيْضِ وَمَوْضِعُهُ۔ المحیض کے معنے (۱) حیض (۲) ایامِ حیض اور (۳) حیض کی جگہ کے ہیں۔ (مفردات)

اَذًى : اَلْاَذٰى مَا يَصِلُ اِلَى الْحَيَوَانِ مِنَ الضَّرَرِ اذٰی کے معنے ہر ایسے ضرر کے ہیں جو کسی ذی روح کو پہنچے وَقَوْلُهٗ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَسَمّٰى ذٰلِكَ اَذًى بِاعْتِبَارِ الشَّرْعِ وَبِاعْتِبَارِ الطِّبِّ عَلٰى حَسْبِ مَا يَذْكُرُهٗ اَصْحَابُ هٰذِهِ الصِّنَاعَةِ۔ اور قرآن کریم کی آیت میں اسے اَذًى ایک تو شرعی نقطۂ نگاہ سے کہا گیا ہے دوسرے طبّی لحاظ سے بھی اسے نقصان رساں قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ تمام اطبّاء اسے بیان کرتے چلے آئے ہیں۔ (مفردات)

اِعْتِزَال کے معنے ہیں ایک طرف ہو جانا۔

تَطَهَّرْنَ - تَطَهَّرَتِ الْمَرْاَةُ کے معنے ہوتے ہیں اِغْتَسَلَتْ۔ عورت نے غسل کیا۔ (اقرب)

تفسیر :- جب مرد و عورت کا نکاح کے ذریعہ تعلق قائم ہو جائے تو اس کے بعد جوں جوں ازدواجی ذمہ داریاں سامنے آتی ہیں انسانی قلب میں مختلف قسم کے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اسجگہ اسی قسم کے ایک سوال کا ذکر کرتے ہوئے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ فرماتا ہے لوگ ایّامِ حیض کے بارہ میں تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ آیا ان ایّام میں مخصوص تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ فرماتا ہے تو انہیں کہہ دے کہ حیض تو ایک نجاست ہے۔ پس تمہیں چاہیئے کہ ان ایّام میں جنسی تعلقات سے پرہیز رکھو۔ اور اس وقت تک اس پر قائم رہو۔ جب تک کہ وہ نہا دھو کر پاک صاف نہ ہو جائیں۔

اسجگہ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ کے یہ معنے نہیں کہ ان ایّام میں عورتوں کو چھونا یا ہاتھ لگانا یا اُن کے پاس بیٹھنا بھی منع ہے۔ بلکہ اس سے صرف مخصوص تعلقات کی نفی کی گئی ہے۔ ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایّامِ حیض میں بھی اُن سے پیار کر لیتے اور انہیں اپنے پاس بٹھا لیا کرتے تھے۔

فقہاء میں اس امر کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے کہ خونِ حیض بند ہونے کے بعد مخصوص تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں یا نہانے کے بعد اور اس بارہ میں کچھ تو ایک طرف چلے گئے ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ حیض بند ہو جانے کے بعد عورت کے پاس جانا تو جائز ہو جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ نہانے دھونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا جائے۔

تطہر کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب عورت ایّامِ حیض سے فارغ ہو تو مشک

المحیض

اذٰی

اِعْتِزَال

تَطَهَّرْنَ

پانی میں حل کرکے اور اس سے روئی بھگو کر اندرونی اعضاء کی صفائی کر لیا کرے۔ اور طبی طور پر ثابت ہے کہ ایسا کیا جائے تو عورت کی صحت اور آئندہ اولاد پر اس کا نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔

فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ میں حَیْثُ ظرفِ مکان ہے اور مراد یہ ہے کہ تم عورتوں کے پاس اسی جگہ سے آؤ جس جگہ سے آنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہو گیا کہ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم دیا ہوا ہے۔ اور وہ یہی ہے جو فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اولاد حاصل کرنے کا جو طبعی طریق مقرر کر رکھا ہے اس کے مطابق عمل کرو۔ اور خدا تعالیٰ نے جو اولاد تمہارے لئے مقدر کر رکھی ہے اس کی جستجو کرو۔ گویا عورتوں سے تم ایسا ہی تعلق رکھو جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہو۔ کوئی غیر فطری طریق اختیار نہ کرو۔

يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ میں اللہ تعالیٰ نے ایک تو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر تم سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کے فوراً بعد تمہارے دل میں اس گناہ پر ندامت پیدا ہونی چاہیئے اور تمہیں اس سے توبہ کرنی چاہیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ دوسرے تواب اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو بار بار خدا تعالیٰ کی درگاہ میں جاتا اور اس سے دعائیں کرتا رہے۔ اس لحاظ سے يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے تمام کام دعاؤں سے وابستہ ہیں۔ اور قدم قدم پر وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور اس سے مدد طلب کرتے ہیں وہ بالآخر اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ گویا گناہوں پر ندامت اور توبہ کا اظہار اور ہر مشکل گھڑی میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع یہ دو ذرائع ایسے ہیں جن سے خدا تعالیٰ کی محبت کا دروازہ انسان کے لئے کھل جاتا ہے۔ اسی طرح يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ میں بھی دو امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک تو اس امر کی طرف کہ اللہ تعالیٰ صفائی رکھنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ درحقیقت نظافت پسندی انسانی تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔ جسم کو صاف رکھنا۔ منہ کو صاف رکھنا۔ کپڑوں کو صاف رکھنا اور ایسی اشیاء کا استعمال کرنا جو ناک کی قوت کو صدمہ پہنچانے والی نہ ہوں بلکہ اس کے لئے موجب راحت ہوں۔ اس تقاضا کو لوگوں نے غلطی سے نیکی اور تقویٰ کی اعلیٰ راہوں پر چلنے والوں کے طریق کے خلاف سمجھ لیا تھا۔ اور ایک ایسی راہ اختیار کر لی تھی جس کے نتیجہ میں یا تو خدا تعالیٰ کی پیدا کردہ طیب اشیاء بیکار ہو کر رہ جائیں یا خدا تعالیٰ کے بندے ان طیب اشیاء کو استعمال کرکے گنہگار قرار پائیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس بناوٹی نیکی اور جھوٹے تقویٰ کی چادر کو بھی چاک کر دیا۔ اور حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ چنانچہ آپ اکثر غسل فرماتے۔ پھر کئی امور کے ساتھ غسل آپ نے واجب قرار دے دیا چونکہ انسان اپنے گھر کے اشغال کی وجہ سے صفائی میں سستی کر بیٹھتا ہے اس لئے آپ نے خدا تعالیٰ کے حکم سے میاں بیوی کے تعلقات کے ساتھ غسل کو واجب قرار دے دیا۔ اسی طرح پانچوں نمازوں سے پہلے آپ ان اعضاء کو دھوتے جو عام طور پر گرد و غبار کا محل بنتے رہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی اس امر پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیتے۔ کپڑوں کی صفائی کو آپ پسند فرماتے۔ جمعہ کے دن دھلے ہوئے کپڑے پہن کر آنے کا حکم دیتے اور خوشبو کو خود بھی پسند فرماتے اور اجتماع کے مواقع کے لئے بھی خوشبو لگانا پسند فرماتے جہاں اجتماع ہوتا ہو چونکہ وہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں اور متعدی بیماریوں کے پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے اسلئے آپ وہاں خوشبودار مصالحہ جات جلانے اور ان جگہوں کو صاف رکھنے کا حکم دیتے۔ بدبودار اشیاء سے پرہیز فرماتے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ

تمہاری بیویاں تمہارے لئے (ایک قسم کی) کھیتی ہیں۔ اسلئے تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی کے پاس آؤ۔ اور

قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ

اپنے لئے (کچھ) آگے بھیجو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تم اُس کے

مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۴﴾

روبرو ہونے والے ہو۔ اور تو مومنوں کو (اُس دن کے بارے میں) خوشخبری دے۔ ۱۳۶

اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے کہ بدبودار اشیاء کھا کر اجتماع کی جگہوں میں آئیں۔ غرض جسم کی صفائی۔ لباس کی پاکیزگی۔ اور ناک کے احساس کا آپ پورا خیال رکھتے۔ اور دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیتے۔ ہاں یہ ضرور فرماتے کہ جسم کی صفائی میں اسقدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ رُوح کی صفائی کا خیال ہی نہ رہے۔ اور لباس کی پاکیزگی کا اس قدر خیال نہ رکھو کہ ملک و ملّت کی خدمت سے محروم ہو جاؤ اور غریب لوگوں کی صحبت سے احتراز کرنے لگو۔ اور کھانے میں اس قدر احتیاط نہ کرو کہ ضروری غذائیں ترک ہو جائیں ہاں یہ خیال رکھو کہ اہلِ مجلس کو تکلیف نہ ہو تاکہ اچھے شہری بنو۔ اور لوگ تمہاری صحبت کو ناگوار نہ سمجھیں بلکہ اسے پسند کریں اور اس کی جستجو کریں۔ غرض لوگوں نے تو کہا کہ صفائی اور خوشبو سے بچو کہ وہ جسم کو پاک مگر دل کو ناپاک کرتی ہے لیکن اسلام نے کہا يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ خدا تعالیٰ ظاہری اور باطنی صفائی رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے گویا اسلام نے اپنے اس اعلان سے عیسائیوں اور ہندوؤں کے ان تمام فرقوں کا ردّ کر دیا جن میں بزرگانِ دین کے لئے پاک و صاف رہنا اور خوشبو کا استعمال بالکل حرام سمجھا جاتا تھا اور جن میں گندے اور بدبودار لباس کا استعمال اور ناخن نہ کٹوانا اور جسم کی میل نہ اتارنا بزرگی کی ایک بہت بڑی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اسلام نے اس نظریہ کو باطل قرار دیتے ہوئے بتایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہی لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف بار بار رجوع کرنے والے بھی ہوں اور اُنکا جسم اور لباس بھی صاف ستھرا ہو اور وہ ہر قسم کی غلاظت سے دور رہنے والے ہوں۔ ان معنوں کے لحاظ سے يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ کہکر اس طرف توجہ دلائی کہ خدا تعالیٰ کو یہی پسند ہے کہ جب عورتیں غسل کرلیں تب اُن کے ساتھ صحبت کی جائے اس سے پہلے ان کے پاس جانا يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ کے خلاف ہے۔

مُتَطَهِّر کے دوسرے معنے تکلف کیساتھ پاکیزگی اختیار کرنیوالے کے ہیں۔ اس لحاظ سے يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اسکے ہم جنس بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں تم ان کی نقل کرنے کی کوشش کرو۔ تم حیّ نہیں بن سکتے لیکن تم بیمار کا علاج کر کے حیّ کی نقل تو کر سکتے ہو۔ تم مُمیت نہیں بن سکتے لیکن تم بدی کا خاتمہ کر کے ممیت کی نقل تو کر سکتے ہو۔ تم خالق نہیں بن سکتے لیکن تم اچھی اولاد پیدا کر کے خالق کی نقل تو کر سکتے ہو۔ پس فرمایا اگر تم میری محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو تم میری نقل کرنا شروع کرو اور میری صفات کو اپنے اندر پیدا کرو اسکے نتیجہ میں مَیں تم سے محبت کرنے لگ جاؤنگا۔

۱۳۶ حل لغات: - اَنّٰى کے معنے اَيْنَ - مِنْ اَيْنَ اور كَيْفَ کے ہیں۔ یعنی "جہاں" - "جہاں سے" - "جب" اور "جس طرح" (اقرب)

تفسیر:- اس آیت میں عورت کو کھیتی قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ (۱) تم اپنی کھیتی کو پھلدار بنانے کی کوشش کرو۔ اسی کی طرف رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی اشارہ فرماتی ہے کہ تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ فَاِنِّیْ مُکَاثِرٌ بِکُمُ الْاُمَمَ (ابوداؤد و نسائی کتاب النکاح) یعنی تم ایسی عورتوں کے ساتھ شادی کیا کرو جو زیادہ اولاد پیدا کرنے والی اور اپنے خاوندوں کے ساتھ محبت کرنے والی ہوں۔ کیونکہ میں دوسرے نبیوں کی اُمتوں کے مقابل پر اپنی امت کی کثرت پر قیامت کے دن فخر کرونگا۔

(۲) عورتوں سے ایسا سلوک کرو کہ نہ اُن کی طاقت ضائع ہو۔ اور نہ تمہاری۔ اگر کھیتی میں بیج زیادہ ڈال دیا جائے تو بیج خراب ہو جاتا ہے۔ اور اگر کھیتی سے پے درپے کام لیا جائے تو کھیتی خراب ہو جاتی ہے۔ پس ہر کام ایک حد کے اندر کرو۔ جس طرح عقلمند انسان سوچ سمجھ کر کھیتی سے کام لیتا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی نکل آیا کہ بعض حالات میں برتھ کنٹرول بھی جائز ہے۔ چنانچہ کھیتی میں سے اگر ایک فصل کاٹ کر معًا دوسری بو دی جائے تو دوسری فصل اچھی نہیں ہوتی۔ اور تیسری اس سے بھی زیادہ خراب ہوتی ہے اسلام نے اولاد پیدا کرنے سے روکا نہیں بلکہ خود فرمایا ہے کہ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ تم اپنی عورتوں کے پاس اس لئے جاؤ کہ آگے نسل چلے اور تمہاری یادگار قائم رہے لیکن ساتھ ہی بتا دیا کہ کھیتی کے متعلق خدا تعالیٰ کے جس قانون کی تم پابندی کرتے ہو اسی کو اولاد پیدا کرنے میں بھی مدنظر رکھو۔ اگر عورت کی صحت مخدوش ہو یا بچہ کی پرورش اچھی طرح نہ ہوتی ہو تو اس وقت اولاد پیدا کرنے کے فعل کو روک دو۔

(۳) یہ بھی بتایا کہ عورت سے ایسا تعلق رکھو جس کے نتیجہ میں اولاد پیدا ہو۔ اس سے خلافِ وضعِ فطرت فعل کی ممانعت نکل آئی۔ چونکہ قرآن کریم خدا تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے وہ بات کو اسی حد تک ننگا کرتا ہے جس حد تک اخلاق کو کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو۔ لوگ اَنّٰی شِئْتُمْ سے غلط استدلال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ کہہ کر تو خدا تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ تمہاری کھیتی ہے اب جس طرح چاہو سلوک کرو۔ لیکن یہ نصیحت یاد رکھو کہ اپنے لئے بھلائی کا سامان ہی پیدا کرنا۔ ورنہ اس کا خمیازہ بھگتو گے۔ لوگ جب اپنی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں تو لڑکے والوں سے عموماً کہا کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی بیٹی تمہیں دیدی ہے۔ اب جیسا چاہو اُس سے سلوک کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تم بے شک اسے جوتیاں مارا کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمہاری چیز ہے اسے سنبھال کر رکھنا۔ پس اَنّٰی شِئْتُمْ کا مطلب یہ ہے کہ عورت تمہاری چیز ہے اگر خراب سلوک کروگے تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے بھی بُرا ہو گا اور اگر اچھا سلوک کروگے تو اچھا ہوگا۔ مگر لوگوں نے بیوقوفی سے اَنّٰی شِئْتُمْ کا یہ مطلب لے لیا کہ "اَنھّے واہ" یعنی اندھا دھند کرو۔ آریوں نے خصوصیت سے اس آیت پر اعتراض کیا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کے تعلقات کے بارہ میں اپنے متبعین کو غیر فطری طریق اختیار کرنے کی اجازت دی ہے حالانکہ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اَنّٰی شِئْتُمْ کے یہ معنے نہیں کہ اب خلاف وضع فطری فعل بھی تمہارے لئے جائز ہو گیا ہے۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب تمہاری بیویاں تمہارے لئے کھیتی کی حیثیت رکھتی ہیں تو اب تمہارا اختیار ہے کہ تم جس طرح چاہو اُن سے سلوک کرو۔ یعنی چاہو تو اپنی کھیتی کو تباہ کر لو اور چاہو تو اس سے ایسے فوائد حاصل کرو جن سے دنیا میں بھی تم نیک نامی حاصل کرو اور آخرت میں بھی اپنی روح کو خوش کر سکو۔

دنیا میں کوئی احمق زمیندار ہی ہوگا جو ناقص بیج استعمال کرے یا بیج ڈالنے کے بعد کھیتی کی نگرانی نہ کرے۔ اور

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا

اور تم نیک سلوک کرنے تقویٰ کرنے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کرنے (کے معاملات) میں

وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ اور اللہ خوب سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ ۱۲۷

اچھی فصل حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مگر عورتوں کے معاملہ میں بالعموم اس اصول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نہ تو جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے بیج کی صحیح طور پر حفاظت کی جاتی ہے نہ عورت کی صحت اور اُسکی ضروریات کا خیال رکھا جاتا ہے اور نہ بچوں کی صحیح رنگ میں تربیت کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مردوں کی صحت کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور عورت کی صحت بھی برباد ہو جاتی ہے اور بچے بھی قوم کا مفید وجود ثابت نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بنی نوع انسان کو اسی اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ جس طرح تم اپنی کھیتی کی حفاظت کرتے ہو اور اعلیٰ درجہ کی فصل پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہو اسی طرح تمہارا فرض ہے کہ تم عورت کی بھی حفاظت کرو اور آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور پر توجہ دو تاکہ تمہاری کھیتی سے ایسا روحانی غلہ پیدا ہو جو دنیا کے کام آئے اور انہیں ایک نئی زندگی بخشے۔

وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ میں بتایا کہ تم وہ کام کرو جس کا آئندہ نتیجہ تمہارے لئے اچھا نکلے۔ یعنی طبی لحاظ سے بھی اور نسلی لحاظ سے بھی۔ یہ حصہ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ کے مشابہ ہے اور مراد یہ ہے کہ آج کے بچے کل کے باپ بننے والے ہیں۔ اس لئے تم ایسی اولاد پیدا کرو جو تمہارے نام کو روشن کرنے والی ہو اور آخرت میں بھی تمہاری عزت اور نیک نامی کا موجب ہو۔

اسی طرح اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا بھی ایک کھیتی ہے جس سے آخرت میں کام آنے والا غلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ اس کھیتی کی طرف بھی اپنی نگاہ رکھو اور ایسے اعمال بجا لاؤ کہ جس طرح ایک دانہ سے سات بالیں اور ہر بال میں سو سو دانہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح تمہارا ایک ایک عمل خدا تعالیٰ کے ہزاروں ہزار انعامات کو تمہاری طرف کھینچ لانے والا ہو۔

۱۲۷ حل لغات:۔ عُرْضَةٌ: مَا يُجْعَلُ مُعْرَضًا لِلشَّيْءِ۔ عُرضہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے کسی دوسری چیز کا نشانہ بنا لیا جائے۔ اسی طرح عُرضہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جسے ضرورت کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیا جائے۔ کہتے ہیں اَلْبَعِيْرُ عُرْضَةٌ لِلسَّفَرِ سفر پیش آئے تو اونٹ عُرضہ بن جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اُس کے ذریعہ سفر کی تکلیف کو دُور کیا جاتا ہے (مفردات) اسی طرح عُرْضَةٌ حِيْلَةٌ فِي الْمُصَارَعَةِ کُشتی کے داؤ پیچ کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

عُرْضَةٌ

اَيْمَانٌ: جمع ہے اس کا مفرد يَمِيْنٌ ہے۔ اور يَمِيْنٌ کے معنے ہیں (۱) دائیں جہت یا دایاں حصہ جسم (۲) قسم (۳) برکت (۴) قوت (اقرب) اور محاورہ میں اس شے کو بھی کہتے ہیں جس کے بارہ میں قسم کھائی جائے۔

اَيْمَانٌ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرۃؓ سے فرمایا۔ اِذَا حَلَفْتَ عَلٰى يَمِيْنٍ فَرَاَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا فَاْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ وَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ یعنی جب تو کسی چیز کے بارہ میں قسم کھائے اس کیلئے آپ نے لفظ یمین

استعمال فرمایا) اور اس کے بعد اس سے اچھا کام تجھے سُوجھ
جائے تو تُو وہ کام جو بہتر ہے اختیار کر اور اپنی قسم کا
کفارہ دے دے۔ (کشاف)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا
نشانہ نہ بناؤ۔ یعنی جس طرح ایک شخص نشانہ پر بار بار
تیر مارتا ہے اسی طرح تم بار بار خدا تعالیٰ کی قسمیں نہ کھایا
کرو۔ کہ ہم یوں کر دینگے اور دوں کر دینگے۔

اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ

یہ ایک نیا اور الگ فقرہ ہے۔ جو مبتدا ہے خبر محذوف
کا۔ اور خبر محذوف اَمْثَلُ وَاَوْلٰی ہے۔ یعنی بِرُّكُمْ
وَتَقْوٰكُمْ وَاِصْلَاحُكُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَمْثَلُ وَاَوْلٰی
اس کے معنے یہ ہیں کہ تمہارا نیکی اور تقوٰی اختیار کرنا اور
اصلاح بین الناس کرنا زیادہ اچھا ہے۔ صرف قسمیں
کھاتے رہنا کہ ہم ایسا کر دینگے کوئی درست طریق نہیں۔
تمہیں چاہیئے کہ قسمیں کھانے کی بجائے کام کر کے دکھاؤ۔
پہلے قسمیں کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ زجاج جو مشہور نحوی
اور ادیب گذرے ہیں۔ انہوں نے یہی معنے کئے ہیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو روک
نہ بناؤ اُن چیزوں کے لئے جن پر تم قسم کھاتے ہو یعنی
بِرّ کرنا تقوٰی کرنا اور اصلاح بین الناس کرنا۔ اس صورت
میں یہ تینوں اَیْمَان کا عطفِ بیان ہیں اور اَیْمَان کے
معنے قسموں کے نہیں بلکہ اُن چیزوں کے ہیں جن پر قسم
کھائی جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے
نیک کام کی قسم نہ کھا لیا کرو۔ تاکہ یہ کہہ سکو کہ کیا کروں
چونکہ میں قسم کھا چکا ہوں اس لئے نہیں کر سکتا۔ مثلاً
کسی ضرورت مند نے روپیہ مانگا تو کہہ دیا کہ میں نے تو
قسم کھائی ہے کہ آئندہ میں کسی کو قرض نہیں دوں گا۔
علامہ ابو حیان کہتے ہیں کہ اس فقرہ کو اَیْمَان کا عطف
بیان بنانے کی بجائے بدل بنانا اچھا ہے۔ کیونکہ
عطفِ بیان اکثر اَعْلام (یعنی کسی چیز کا معیّن نام) ہوتے
ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں اس کے معنے یہ ہیں کہ
اگر کوئی نیکی اور تقوٰی اور اصلاح بین الناس کے کام کیلئے
تمہیں کہے تو تم یہ نہ کہو کہ میں نے تو قسم کھائی ہوئی ہے
میں یہ کام نہیں کر سکتا۔

تیسرے معنے یہ ہیں کہ اس ڈر سے کہ تمہیں نیکی کرنی
پڑے گی خدا تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ اس
صورت میں اَنْ تَبَرُّوْا مفعول لِاَجْلِہٖ ہے اور اس سے
پہلے کَرَاهَةَ مقدر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اگر اچھی باتیں
نہ کرنے کی قسمیں کھاؤ گے تو ان خوبیوں سے محروم ہو جاؤ گے
اس لئے نیکی تقوٰی اور اصلاح بین الناس کی خاطر اس
لغو طریق سے بچتے رہو۔ درحقیقت یہ سب معنے
آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ صرف عربی عبارت کی مشکل کو
مختلف طریق سے حل کیا گیا ہے۔ جس بات پر سب مفسرین
متفق ہیں وہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ
یہ نہ کرو کہ خدا تعالیٰ کو اپنی قسموں کا نشانہ بنا لو۔
یعنی اُٹھے اور قسم کھالی۔ یہ ادب کے خلاف ہے اور
جو شخص اس عادت میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ بسا اوقات
نیک کاموں کے بارہ میں بھی قسمیں کھا لیتا ہے کہ میں
ایسا نہیں کرونگا۔ اور اس طرح یا تو بے ادبی کا اور یا
نیکی سے محرومی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ بعض اچھے
کاموں کے متعلق قسمیں کھا کر خدا تعالیٰ کو ان کے لئے
روک بنا لو۔ ان معنوں کی صورت میں داؤ پیچ والے معنے
خوب چسپاں ہوتے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ
صدقہ و خیرات سے بچنے کے لئے چالیں چلتے ہیں اور داؤ
کھیلتے ہیں اور بعض خدا تعالیٰ کی قسم کو جان بچانے کا ذریعہ
بناتے ہیں۔ گویا دوسرے سے بچنے اور اُسے پچھاڑنے
میں جو داؤ استعمال کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک خدا تعالیٰ
کی قسم بھی ہوتی ہے۔ پس فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کو

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

اللہ (تعالیٰ) تمہاری قسموں میں (سے) لغو (قسموں) پر تم سے مؤاخذہ نہیں کرے گا - ہاں جو (گناہ) تمہارے دلوں نے

بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

(بالارادہ) کمایا اُس پر تم سے مؤاخذہ کرے گا - اور اللہ بہت بخشنے والا (اور) بُردبار ہے - ۱۳۸ ؎

ایسے ذلیل حیلوں کے طور پر استعمال نہ کیا کرو - میرے نزدیک سب سے اچھی تشریح علامہ ابوحیان کی ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے احسان اور نیکی وغیرہ کے آگے روک بناکر کھڑا نہ کر دیا کرو -

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ میں بتایا کہ اگر تمہیں نیکی اور تقویٰ اور اصلاحِ بین الناس کے کام میں مشکلات پیش آئیں تو خدا تعالیٰ سے ان کا دفعیہ چاہو اور ہمیشہ دعاؤں سے کام لیتے رہو - کیونکہ یہ کام دعاؤں کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے - اور پھر یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے - اگر تم اُس کی طرف جھکو گے تو وہ اپنے علم میں سے تمہیں علم عطا فرمائیگا - اور نیکی اور تقویٰ کے بارہ میں تمہارا قدم صرف پہلی سیڑھی پر نہیں رہیگا بلکہ علمِ لدنی سے بھی تمہیں حصہ دیا جائیگا -

۱۳۸ ؎ حلِ لغات: حَلِيْمٌ حِلْمٌ سے ہے اور اس کے معنے صبر کرنے والے کے بھی ہوتے ہیں اور اسی طرح اس کے معنے بُردبار کے بھی ہیں یعنی جس میں طیش نہ ہو - یونہی جوش میں آکر اندھا دھند کام نہ کرتا ہو - حِلْمٌ جہالت اور بیوقوفی کے مخالف معنے بھی دیتا ہے - اور علم اور سمجھ کے بھی - نیز اس کے معنے عقل کے بھی ہیں - (اقرب)

تفسیر: - فرماتا ہے - اللہ تعالیٰ لغو قسموں پر تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کریگا - اس جگہ لغو قسموں سے تین قسم کی قسمیں مراد ہیں - اوّل عادت کے طور پر قسمیں کھانا - یعنی ہر وقت وَاللّٰہ - بِاللّٰہ - تَاللّٰہ کہتے رہنا - دوم ایسی قسم جس کا کھانے والا یقین رکھتا ہو کہ وہ درست ہے لیکن اس کا یقین غلط ہو - مثلاً کسی شخص کے متعلق قسم کھانا کہ وہ وہاں ہے حالانکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے آنے کے بعد وہاں سے چلا گیا ہو - سوم ایسی قسم جو شدید غصہ کے وقت کھائی جائے - جب ہوش و حواس ٹھکانے نہ ہوں یا حرام شئے کے استعمال یا فرض و واجب عمل کے ترک کے متعلق کسی وقتی جوش کے ماتحت قسمیں کھا لینا - یہ سب قسمیں لغو ہیں اور ان کے توڑنے پر کوئی کفارہ نہیں - چونکہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قسموں سے روکا تھا اس لئے اب بتایا کہ مؤاخذہ صرف ایسی قسموں پر ہوگا جن کو لغو قرار نہ دیا جا سکے - مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ چونکہ مؤاخذہ نہیں ہوگا اس لئے اب کسی احتیاط کی بھی ضرورت نہیں جیک رات دن لغو قسمیں کھاتے رہو - کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے متعلق یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (مومنون آیت ۴) مومن لغو باتوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں - پس لغو قسمیں کھانے والا یقیناً غلطی یا گنہگار ہے اور اُسے اپنے گناہ پر توبہ اور ندامت کا اظہار کرنا چاہیئے - ہاں اُن کے توڑنے پر کسی کفارہ کی ضرورت نہیں - اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے لَا يُؤَاخِذُكُمْ کے الفاظ بیان فرمائے ہیں - یعنی اگر وقتی جوش کے ماتحت ایسی قسم کھائی جائے تو گناہ نہ ہوگا ہاں اگر جان بوجھ کر کوئی شخص ایسی قسم کھائے تو اُسے یقیناً گناہ ہوگا -

حَلِيْمٌ

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ

جو لوگ اپنی بیویوں کے متعلق قسم کھا کر اُن سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن کے لئے (صرف) چار مہینے تک انتظار کرنا (جائز) ہے۔

بعض لوگوں نے لَا يُؤَاخِذُ کے معنے لَا بَاْسَ بِهٖ یا لَا حَرَجَ فِيْ ذٰلِكَ کے کئے ہیں کہ اِس میں کوئی حرج نہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ یہاں پر ایک تو مؤاخذہ کی نفی کی ہے اور دوسرے لغو قسموں سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ میں گذشتہ تینوں قسموں کی نفی کر دی گئی ہے کیونکہ قسم عادتاً ہو یا غصہ اور بے احتیاطی سے ہو ان میں سے کوئی قسم بھی عمداً نہیں ہوتی بلکہ بعض وقت تو انسان کو پتہ بھی نہیں لگتا اور وہ قسم کھا جاتا ہے۔ پس کسبِ قلب سے مراد یہی ہے کہ عمداً قسم کھائی جائے۔ ایک واقعہ کے متعلق وہ سمجھتا ہو کہ یُوں ہے مگر پھر اس کے خلاف قسم کھا جائے۔ ایسی قسم کا کفارہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (مائدہ آیت ۹۰) یعنی قسم توڑنے کا کفارہ دس مساکین کو متوسط درجہ کا کھانا کھلانا ہے۔ ایسا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا اُن کے لئے لباس مہیا کرنا ہے۔ یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ لیکن جسے اس بات کی توفیق نہ ہو اُس پر تین دن کے روزے واجب ہیں۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھانے کے بعد انہیں توڑ دو۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا قرآن کریم کی قسم کھانا جائز ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ملکی رواج کو مدِّنظر رکھ کر قرآن کریم کی قسم کھائی جائے تو میرے نزدیک جائز ہے۔ کیونکہ مدِّمقابل پر قرآن کریم کی قسم کھانے سے غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔

يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے دل میں بداخلاقی کے خیالات آتے ہیں۔ مثلاً اپنے بھائی کی نسبت بدظنی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ یا تکبّر یا حسد یا نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس خیال کو دبا لیتا ہے تو اس کا یہ خیال یا جذبہ بداخلاقی نہیں سمجھا جائیگا۔ کیونکہ ایسا شخص درحقیقت بداخلاقی کا مقابلہ کرتا ہے اور تعریف کا مستحق ہے۔ اسی طرح جس شخص کے دل میں ایک آنی خیال نیکی کا آئے یا آنی طور پر حسنِ سلوک کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو لیکن وہ اس کو بڑھنے نہ دے تو ایسا شخص بھی صاحب اخلاق نہیں سمجھا جائیگا گو اُس کے اِس وقتی جذبہ کو بھی قابلِ تعریف قرار دیا جائیگا۔ کیونکہ اخلاق وہ ہیں جو انسان کے ارادہ کا نتیجہ ہوں لیکن مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اچھے یا بُرے خیالات ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں بلا ارادہ پیدا ہو جاتے اور اُسی وقت زائل ہو جاتے ہیں۔ اس نکتہ کو قرآن کریم نے اِن الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ اللہ تعالیٰ تم کو صرف اُن خیالات پر پکڑے گا جو ارادہ اور فکر کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ نہ اُن پر جو اچانک پیدا ہو جاتے ہیں اور تم ان کو فوراً اپنے دل سے نکال دیتے ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں کہ اچانک بدخیال پیدا ہونے پر جو شخص اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیتا ہے اور اُس پر عمل نہیں کرتا۔ ایسا شخص نیکی کا کام کرتا ہے۔

فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۲۷) وَاِنْ عَزَمُوا

پھر اگر وہ اس عرصہ میں صلح کے خیال کی طرف لوٹ آئیں تو اللہ یقیناً بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اور اگر وہ طلاق کا فیصلہ

الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲۲۸)

کرلیں۔ تو اللہ تعالیٰ بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے ۳۹؎

اور اجر کا مستحق ہے۔ آپ فرماتے ہیں وَاِنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً (بخاری) اگر کسی شخص کے دل میں بُرا خیال پیدا ہو اور وہ اُس کو دبالے اور اس کے مطابق عمل نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے حق میں ایک پوری نیکی لکھے گا۔ یعنی بدخیال کے دبانے کی وجہ سے اُس کو نیک بدلہ ملیگا۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ میں غفور کے لفظ سے بتا دیا کہ اگر تم ایسی قسموں سے اجتناب کروگے اور توبہ کروگے تو ہم تمہیں بخش دیں گے۔ اور حلیم کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ہم نے لغو قسموں پر اس لئے گرفت نہیں کی کہ اگر ہم ان قسموں پر گرفت کرنا شروع کر دیں تو تمہارا بچنا مشکل ہو جائے۔

۳۹؎ حل لغات :- اِیْلَاء : اَیْ یُوْلِیْ اِیْلَاءً : قسم کھانا۔ یہ اَلَا سے نکلا ہے جس کے معنے کسی کام میں کمی یا تاخیر کرنے کے ہیں۔ اور اِیْلَاء قرآن کریم کے محاورہ میں اُس قسم کو کہتے ہیں جو اس بات پر کھائی جائے کہ مرد اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہ رکھے گا (مفردات) چونکہ اس قسم میں عورت کے حق کا اتلاف ہے اس لئے اسے اِیْلَاء کہا گیا۔

فَآءُوْا : فَاءَ يَفِيْءُ فَيْئًا : لوٹ آیا۔ فَاءَ الْاَمْرَ اَیْ رَجَعَ اِلَيْهِ (اقرب) اس بات کی طرف لوٹ آیا۔ فَاءَ کا لفظ نیک امور کی طرف لوٹنے کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات) اصل میں اس کے معنے تعاون اور امداد باہمی کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور سایہ کو بھی فَيْء کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ سورج کے ساتھ اِدھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے ان دونوں معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے فَاءَ بالعموم اچھے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔

تفسیر :- ایلاء کے معنے قسم کے ہیں لیکن اصطلاحی طور پر کسی شخص کا قسم کھا کر اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لینا ایلاء کہلاتا ہے۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ بعض لوگ اپنی بیویوں کو طلاق تو نہ دیتے لیکن قسم کھا لیتے تھے کہ ہم اُن سے تعلق نہیں رکھیں گے۔ اور اس قسم کے ذریعہ وہ اپنے خیال میں بیوی کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داریوں سے آزاد ہو جاتے تھے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں قسم کو پورا کرنے کی ذمہ داری خدا تعالیٰ کی طرف سے عائد ہوتی ہے اور بندوں کی ذمہ داری سے مقدم ہے۔ پس جب کہ خدا تعالیٰ کی قسم روک بن گئی تو اُن کے خیال کے مطابق عورت کے حقوق کا ادا نہ کرنا کوئی گناہ نہ رہا۔ یہ گندہ خیال اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم بیویوں سے تعلق نہیں رکھیں گے۔ لیکن انہیں طلاق بھی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص ایسا کر بیٹھے تو اُسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اُسے چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس عرصہ میں وہ صلح کرے تو بہتر ورنہ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے پھر قاضی طلاق کا فیصلہ کر دیگا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت کو معلّقہ چھوڑنے کے خلاف

اِیْلَاء

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا

اور جن عورتوں کو طلاق مل جائے وہ تین (بار) حیض (آنے) تک اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ اور اگر نہیں

يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ

اللہ (پر) اور روز آخرت پر ایمان ہے تو (انہیں معلوم رہے کہ) جو کچھ اللہ (تعالیٰ) نے اُن کے رحموں میں پیدا

اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ

کر رکھا ہے اُن کے لئے اُس کا چھپانا جائز نہیں۔ اور اگر اُن کے خاوند

فیصلہ فرمایا ہے۔ مرد زیادہ سے زیادہ مدّت نکاح میں چار ماہ تک کے لئے عورت سے علیحدہ رہنے کا عہد کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص چار ماہ سے زائد عرصہ کے لئے قسم کھائے تو عورت کا حق ہے کہ خلع کرالے۔ ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کا حکم آگے مذکور ہے۔ لیکن عورت کو خلع کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے ایلاء کرے مثلاً دس دن کیلئے ایلاء کیا اور پھر رجوع کر لیا۔ پھر دس دن کیلئے نیا ایلاء کیا اور پھر رجوع کر لیا۔ تب بھی اس کے لئے مجموعی طور پر چار ماہ کی ہی مدت مقرر ہے۔ اگر وہ چار ماہ کے بعد ایلاء کرے گا تو ایلاء ناجائز ہوگا۔ اور عورت علیحدگی کی حقدار ہوگی۔ بعض لوگ عورت کو دُکھ دینے کے لئے تھوڑی تھوڑی مدت مقرر کرتے رہتے ہیں تاکہ نہ چار ماہ ختم ہوں اور نہ عورت علیحدہ ہو مگر ان کا یہ خیال غلط ہے اس قسم کی ایلاء کی مدت بھی صرف چار ماہ ہی ہے۔ جب ایام قطع تعلق کا مجموعہ چار ماہ ہو جائیگا تو لازماً عورت علیحدگی کی حق دار ہوگی۔ فقہاء کا اس آیت کے احکام کی تفصیلات میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر مدّت گذر جائے اور مرد عورت سے نہ مباشرت کرے اور نہ زبان سے رجوع کرے تو قاضی دونوں میں علیحدگی کروا دیگا۔ یہ امام مالکؒ کا قول ہے۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ چار ماہ کے ختم ہونے سے پہلے رجوع ضروری ہے۔ اگر چار ماہ کے اندر رجوع نہ کرے تو اس مدت کے گذرنے کے بعد عورت کو خود بخود طلاق ہو جائیگی افضل قول یہی ہے۔ لیکن محتاط امام مالکؒ کا فتویٰ ہے امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک چار ماہ گذرنے پر اگر کوئی شخص رجوع نہ کرے تو اُسے قاضی مجبور کرے گا کہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ یہ بھی قریباً امام مالکؒ کے قول سے ملتا ہے۔ اگر مرد دونوں باتوں سے کوئی بھی نہ کریگا تو قاضی اس کی طرف سے طلاق دلا دیگا۔ امام نخعیؒ کا قول ہے کہ یہ رجوع پوشیدہ جائز نہیں نہ اشارہ سے بلکہ قول سے ہونا چاہیئے۔ اور گواہوں کی موجودگی اس کے لئے ضروری ہے۔ غرض قرآن کریم عورت کو کَالْمُعَلَّقَةِ چھوڑنے سے منع کرتا ہے۔ اور جو چھوڑے اسے مجبور کرتا ہے کہ یا صلح کرے یا اُسے طلاق دے دے۔

غفور کے لفظ سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ بغیر کسی جائز عذر کے اس قسم کی قسم کھانا اور عورت کو دق کرنا گناہ کی بات ہے۔ تمہیں ایسے فعل سے توبہ کرنی چاہیئے اور عورت کو دق نہیں کرنا چاہیئے۔

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ میں بتایا کہ اگر مرد طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ بھی سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ

باہمی اصلاح کا ارادہ کرلیں تو وہ اس (مدت) کے اندر (اندر) انکو (اپنی زوجیت میں) واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔ اور

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ

جس طرح اُن پر (یعنی عورتوں پر) کچھ ذمہ داریاں ہیں (ویسے ہی) مطابق دستور انہیں بھی (کچھ حقوق) حاصل ہیں۔ ہاں مردوں کو

۲۸ ع ۱۲

عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۹﴾ ع

اُن پر ایک طرح کی فوقیت حاصل ہے۔ اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔ ۱۴۰

سَمِیْعٌ کے لفظ سے ڈرایا کہ اگر وہ اپنی بیوی سے ناانصافی کریگا۔ تو اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس کے بد نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ اُس کی بیوی کی فریاد کو سُننے والا ہے اور عَلِیْمٌ میں بتایا کہ جو خیالات تمہارے دلوں کے اندر ہیں اللہ تعالےٰ ان کو بھی خوب جانتا ہے اور انہی کے مطابق تم سے معاملہ کریگا۔ اس لئے تم اپنے معاملات میں ہوشیار رہو۔ تم دنیا کو تو دھوکا دے سکتے ہو مگر خدا تعالیٰ کو نہیں۔

چونکہ اس جگہ عورت سے حُسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص قسم کھا لیتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے حسنِ سلوک نہیں کرونگا تو یہ قسم بھی اس پہلی قسم ہی کی طرح ہوگی۔ جس کا ذکر لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا میں کیا گیا ہے۔

۱۴۰ تفسیر: اب اللہ تعالیٰ طلاق کے مسائل بیان فرماتا ہے اور اس بارہ میں سب سے پہلی ہدایت یہ دیتا ہے کہ جن عورتوں کو اُن کے خاوند طلاق دے دیں۔ انہیں اپنے آپ کو تین قروء تک روکے رکھنا چاہیئے۔

قُرُوْء سے کیا مراد ہے؟ اس بارہ میں اُمتِ محمدیہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ خلفاء اربعہ یعنی حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ اس سے حیض مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور امام ابوحنیفہؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ لیکن حضرت عائشہؓ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت زید بن ثابتؓ۔ حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اس سے طُہر مراد ہے۔ حضرت محی الدین ابن عربیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ خواب میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اہلِ عرب تو قُرء سے حیض بھی مراد لیتے ہیں اور طُہر بھی۔ اللہ تعالےٰ کا اس سے کیا منشاء ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دونوں کو صحیح قرار دیا ہاں ترجیح آپ نے طُہر کو دی۔ (فتوحات مکیہ جلد ۴۔ باب ۵۷۰ صفحہ $\frac{۲۰۹}{۲۱۰}$)

عدت کی حکمت بالکل واضح ہے۔ اس عرصہ میں خاوند کو سوچنے اور غور کرنے کا کافی وقت مل جاتا ہے۔ اور اگر اس کے دل میں اپنی بیوی کی کچھ بھی محبت ہو تو وہ رجوع کر سکتا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ میں عورت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر وہ حاملہ ہو تو مرد کو بتا دے۔ کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی وجہ سے پھر آپس میں محبت قائم ہو جاتی ہے اور میاں بیوی میں صلح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ میں ذٰلِكَ

کا اشارہ مدتِ تربّص کی طرف ہے۔ اور اللہ تعالےٰ نے بتایا ہے
کہ اگر عدّت کے دوران خاوند اپنی عورت سے دوبارہ تعلقات
قائم کرنا چاہے تو اس میں کسی کو روک نہیں بننا چاہیئے۔ اس
ہدایت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر عورت کے رشتہ دار
کہہ دیا کرتے ہیں کہ چونکہ خاوند نے اپنی بیوی سے اچھا سلوک
نہیں کیا اور اُسے ایک دفعہ طلاق دے دی ہے اس لئے
اب ہم اس سے تعلق قائم رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے کہ عورت کے رشتہ داروں کو میاں بیوی کے
تعلقات میں روک نہیں بننا چاہیئے۔ اگر خاوند اپنی غلطی کو
محسوس کرتے ہوئے رجوع کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی اور کی
نسبت اُس عورت کا زیادہ حقدار ہے اور وہ عدّت میں
اپنی عورت کو واپس لوٹا سکتا ہے۔

پھر وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
میں عام قانون بتایا کہ مردوں اور عورتوں کے حقوق بحیثیت
انسان ہونے کے برابر ہیں جس طرح عورتوں کے لئے ضروری
ہے کہ وہ مردوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ اسی طرح مردوں
کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق ادا کریں۔
اور اس بارہ میں کسی قسم کا ناواجب پہلو اختیار نہ کریں۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عورتوں
کے کوئی حقوق تسلیم ہی نہیں کئے جاتے تھے بلکہ انہیں مالوں
اور جائیدادوں کی طرح ایک منتقل ہونے والا ورثہ خیال کیا
جاتا تھا۔ اور اُن کی پیدائش کو صرف مرد کی خوشی کا موجب
قرار دیا جاتا تھا حتیٰ کہ مسیحی جو اپنے آپ کو حقوقِ نسواں
کے بڑے حامی کہتے ہیں اُن کے پاک نوشتوں میں بھی عورت
کی نسبت لکھا تھا۔

" البتہ مرد کو اپنا سر ڈھانکنا نہ چاہیئے
کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اُس کا جلال ہے
مگر عورت مرد کا جلال ہے۔ "
(۱۔ کرنتھیوں باب ۱۱ آیت ۷)

اسی طرح لکھا تھا۔
" اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے۔"
(۱ تمطاؤس باب ۲ آیت ۱۲)

صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورتوں
کی انسانیت کو نمایاں کرکے دکھایا۔ اور رسول کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم ہی وہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے عورتوں
کے بلحاظ انسانیت برابر کے حقوق قائم کئے۔ اور وَلَهُنَّ
مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ کی تفسیر لوگوں کے
اچھی طرح ذہن نشین کی۔ آپ کے کلام میں عورتوں کے
ساتھ حسنِ سلوک اور اُن کے حقوق اور اُن کی قابلیتوں کے
متعلق جس قدر ارشادات پائے جاتے ہیں اُن کا دسواں حصہ
بھی کسی اور مذہبی پیشوا کی تعلیم میں نہیں ملتا۔ آج ساری
دنیا میں یہ شور مچ رہا ہے کہ عورتوں کو اُن کے حقوق دینے
چاہئیں اور بعض مغرب زدہ نوجوان تو یہاں تک کہہ دیتے
ہیں کہ عورتوں کو حقوق عیسائیت نے ہی دیئے ہیں حالانکہ
عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں اسلام نے جو وسیع تعلیم
دی ہے عیسائیت کی تعلیم اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔

عربوں میں رواج تھا کہ ورثہ میں اپنی ماؤں کو بھی تقسیم
کرلیتے تھے۔ مگر اسلام نے خود عورت کو وارث قرار دیا۔
بیوی کو خاوند کا۔ بہن کو باپ کا اور بعض صورتوں میں
بہن کو بھائی کا بھی۔

غرض فرمایا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ یعنی انسانی
حقوق کا جہاں تک سوال ہے عورتوں کو بھی ویسا ہی حق
حاصل ہے جیسے مردوں کو۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں
اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں اور عورتوں کو یکساں احکام
دیئے ہیں اسی طرح انعامات میں بھی انہیں یکساں شریک
قرار دیا ہے۔ اور جن نعماء کے مرد مستحق ہونگے اسلامی
تعلیم کے ماتحت قیامت کے دن وہی انعامات عورتوں کو
بھی ملیں گے۔ غرض اللہ تعالےٰ نے نہ اس دنیا میں اُنکی

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ

ایسی طلاق (جس میں رجوع ہو سکے) دو دفعہ (ہو سکتی) ہے۔ پھر (یا تو) مناسب طور پر روک لینا ہوگا یا حسن سلوک کے ساتھ

بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

رخصت کر دینا ہوگا۔ اور تمہارے لئے اس (مال) کا جو تم انہیں پہلے دے چکے ہو کوئی حصہ بھی (واپس) لینا جائز

شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ

نہیں سوائے اس (صورت) کے کہ ان (دونوں) کو اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ سو اگر

کوئی حق تلفی کی ہے اور نہ اگلے جہان میں انہیں کسی انعام سے محروم رکھا ہے۔ ہاں آپ نے اس بات کا بھی اعلان فرمایا کہ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ یعنی حقوق کے لحاظ سے تو مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں لیکن انتظامی لحاظ سے مردوں کو عورتوں پر ایک حقِ فوقیت حاصل ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک مجسٹریٹ انسان ہونے کے لحاظ سے تو عام انسانوں جیسے حقوق رکھتا ہے اور جس طرح ایک ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کو بھی ظلم اور تعدی کی اجازت نہیں اسی طرح مجسٹریٹ کو بھی نہیں۔ مگر پھر بھی وہ بحیثیت مجسٹریٹ اپنے ماتحتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اور اُسے قانون کے مطابق دوسروں کو سزا دینے کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمدنی اور مذہبی معاملات میں مرد و عورت دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ لیکن مردوں کو اللہ تعالیٰ نے قوام ہونے کی وجہ سے فضیلت عطا فرمائی ہے لیکن دوسری طرف اسنے عورتوں کو استمالتِ قلب کی ایسی طاقت دیدی ہے جس کی وجہ سے وہ بسا اوقات مردوں پر غالب آجاتی ہیں۔ بنگالہ کی جادوگر عورتیں تو جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے مردوں پر جادو سا کر دیتی ہیں۔ پس جہاں مرد کو عورت پر ایک رنگ میں فوقیت دی گئی ہے۔ وہاں عورت کو استمالتِ قلب کی طاقت عطا فرما کر مرد پر غلبہ دے دیا گیا ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات عورتیں مردوں پر اس طرح حکومت کرتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب کاروبار انہی کے ہاتھ میں ہے۔ دراصل ہر شخص کی الگ الگ رنگ کی حکومت ہوتی ہے۔ جہاں تک احکام شرعی اور نظام کے قیام کا سوال ہے اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت دے دی ہے۔ مثلاً شریعت کا یہ حکم ہے کہ کوئی لڑکی اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی۔ یہ حکم ایسا ہے جو اپنے اندر بہت بڑے فوائد رکھتا ہے۔ یورپ میں ہزاروں مثالیں ایسی پائی جاتی ہیں کہ بعض لوگ دھوکے باز اور فریبی تھے مگر اس وجہ سے کہ وہ خوش وضع نوجوان تھے انہوں نے بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے شادیاں کر لیں اور بعد میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ لیکن ہمارے ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ رشتہ کی تجویز کے وقت باپ غور کرتا ہے۔ والدہ غور کرتی ہے۔ بھائی سوچتے ہیں۔ رشتہ دار تحقیق کرتے ہیں اور اس طرح جو بات طے ہوتی ہے وہ بالعموم ان نقائص سے پاک ہوتی ہے جو یورپ میں نظر آتے ہیں۔ یورپ میں تو یہ نقص اس قدر زیادہ ہے کہ جرمنی کے سابق شہنشاہ کی بہن نے اسی نادانی کی وجہ سے ایک باورچی سے شادی کر لی۔ اسکی وضع قطع

خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

تمہیں (یعنی ملت اسلامیہ یا اسلام پر ایمان رکھنی والی حکومت کو یہ) اندیشہ ہو کہ وہ (دونوں) اللہ کی (مقرر کردہ) حدوں کو قائم نہیں رکھ سکینگے

فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ

تو وہ (یعنی عورت) جو کچھ بطور فدیہ دے اسکے بارہ میں ان (دونوں میں کسی) کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اسلئے تم ان سے

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ﴿۲۳۰﴾

باہر نہ نکلو۔ اور جو لوگ اللہ کی (مقرر کردہ) حدوں سے باہر نکل جائیں تو (سمجھ لو کہ) وہی لوگ (اصل) ظالم ہیں۔ ۱۴۱

بھیجتی تھی۔ اور اُس نے مشہور یہ کر دیا تھا کہ وہ روس کا شہزادہ ہے۔ جب شادی ہوگئی تو بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو کسی باورچی کا کام کیا کرتا تھا۔ یہ واقعات ہیں جو یورپ میں کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ ان واقعات سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے مردوں کے قوام ہونے کے متعلق جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ شریعت کا اس سے یہ منشا نہیں کہ عورتوں پر ظلم ہو یا اُن کی کوئی حق تلفی ہو بلکہ شریعت کا اس امتیاز سے یہ منشا ہے کہ جن باتوں میں عورتوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے اُن میں عورتوں کو نقصان سے محفوظ رکھا جائے۔ اسی وجہ سے جن باتوں میں عورتوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا اُن میں اُن کا حق خدا تعالیٰ نے خود ہی انہیں دے دیا ہے۔ پس قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنے اندر بہت بڑی حکمتیں اور مصالح رکھتا ہے۔ اگر دنیا ان کے خلاف عمل کر رہی ہے تو وہ کئی قسم کے نقصانات بھی برداشت کر رہی ہے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام کے خلاف عمل پیرا ہونا کبھی نیک نتائج کا حامل نہیں ہو سکتا۔

آخر میں وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ یاد رکھو عورتوں پر جو فوقیت ہم نے تمہیں دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اُن کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔ اور ان کے حقوق کو پامال کرنا شروع کر دو۔ دیکھو تم پر بھی ایک حاکم ہے جو عزیز ہے۔ یعنی اصل حکومت خدا تعالیٰ کی ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ مرد اس حکومت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اور حکیم کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ضبط ونظم کے معاملات میں جو اختیار ہم نے مردوں کو دیا ہے یہ سراسر حکمت پر مبنی ہے ورنہ گھروں کا امن برباد ہو جاتا۔

چونکہ میاں بیوی نے مل کر رہنا ہوتا ہے اور نظام اُس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ ایک کو فوقیت نہ دی جائے اس لئے یہ فوقیت مرد کو دی گئی ہے اور اس کی ایک وجہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ یہ بیان فرمائی ہے کہ چونکہ مرد اپنا روپیہ عورتوں پر خرچ کرتے ہیں اس لئے انتظامی امور میں انہیں عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ (نساء آیت ۳۵)

۱۴۱ تفسیر: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ سے مراد یہ ہے کہ ایسی طلاق جس میں خاوند کو رجوع کا حق حاصل ہے صرف دو دفعہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ عورت کو تنگ کرنے کے لئے اسے بار بار طلاق دیتا رہے۔ اور جب عدت ختم ہونے کا وقت قریب آئے تو رجوع کر لے احکام دینیہ کے ساتھ یہ ایک ناپاک تمسخر ہے جس کی اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

احادیث میں صراحتاً ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ لَا أُطَلِّقُكِ أَبَدًا وَلَا آوِيكِ أَبَدًا یعنی نہ تو میں تجھے کبھی طلاق دونگا اور نہ اپنے گھر میں بساؤنگا۔ عورت نے پوچھا۔ وَكَيْفَ ذٰلِكَ یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ اِس پر اُس نے کہا أُطَلِّقُ حَتّٰى إِذَا دَنَا أَجَلُكِ رَاجَعْتُكِ میں تجھے طلاق دونگا۔ اور جب تیری عدت ختم ہونے کے قریب پہنچے گی تو رجوع کر لونگا۔ اگلی دفعہ پھر ایسا کرونگا اور پھر رجوع کر لونگا۔ اِسطرح نہ تجھے بساؤنگا اور نہ علیحدہ ہونے دونگا۔ وہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُس نے اس واقعہ کا آپ سے ذکر کیا۔ اِس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی وہ طلاق جس میں مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے صرف دو دفعہ ہے اس سے زیادہ نہیں (تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان جلد ۲ صفحہ ۹۲) اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دو طلاقوں تک تو مرد کو رجوع کا حق حاصل رہتا ہے۔ لیکن تیسری طلاق کے بعد اُسے رجوع کا کوئی حق نہیں رہتا۔ اور یہ دو طلاقیں بھی بیک وقت نہیں دی جاسکتیں بلکہ یکے بعد دیگرے دی جاتی ہیں جس کی طرف مَرَّتٰنِ کا لفظ اشارہ کرتا ہے جس کے معنے مَرَّةً بَعْدَ مَرَّةٍ کے ہیں یعنی ایک ہی دفعہ طلاقیں نہ دی جائیں بلکہ باری باری دی جائیں اور ہر طلاق کی مدت جیسا کہ اوپر کی آیت میں گذر چکا ہے تین قروء ہے خواہ وہ ہر مہینے میں ایک طلاق دے یا شروع میں ایک دفعہ دے۔ اس سے طلاق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ فقہاء نے ہر مہینے طلاق دینے کی طرف اس لئے توجہ دلائی ہے کہ اس طرح بار بار انسان کو رجوع کرنے کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے۔ میرے نزدیک خواہ انسان ایک دفعہ طلاق دے یا ہر مہینے طلاق دے وہ ایک ہی طلاق سمجھی جائیگی۔ اور عدت گذرنے کے بعد پھر خاوند نکاح کرسکیگا۔ اِس قسم کی طلاقیں صرف دو جائز ہیں۔ یعنی طلاق دینا اور عدت کے بعد دوبارہ نکاح کرلینا۔ اگر دو ہو جائیں تو اس کے بعد پھر اگر وہ تیسری مرتبہ طلاق دے دے تو ایسے شخص کے لئے اس عورت سے دوبارہ نکاح جائز نہیں جبتک کہ وہ باقاعدہ اور شرعی نکاح دوسرے شخص سے نہ کر چکی ہو جو حقیقی نکاح ہے حلالہ نہیں۔ کیونکہ حلالہ کا وجود اسلام میں نہیں ملتا۔ غرض اَلطَّلَاقُ سے مراد وہ طلاق ہے جس کی عدت گذر چکی ہے وہ طلاق نہیں جسپر عدت نہ گذری ہو۔ اس میں رجوع ہو سکتا ہے جس پر عدت گذر چکی ہو اس میں دو دفعہ نکاح ہو سکتا ہے۔ تیسری دفعہ نہیں۔

بیشک بعض محدثین اور بعض فقہاء کے اقوال اس کے خلاف نظر آتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ بالکل واضح ہیں اور اس سے پہلی آیت وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ أَرْحَامِهِنَّ۔ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوْٓا إِصْلَاحًا۔ واضح کرتی ہے کہ زمانۂ طلاق تین قروء تک جاتا ہے اِس عرصہ میں انسان بغیر نکاح کے رجوع کرسکتا ہے اور اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے چند آیات بعد کی آیت وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ بتاتی ہے کہ طلاق کی مدت گذر جانے کے بعد خاوند دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔ درمیانی آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ اس پہلی قسم کی طلاق کی طرف اشارہ کرتی ہے اور پہلی قسم کی طلاق یہی ہے کہ تین قروء تک رجوع جائز ہے اور تین قروء کے بعد نکاح جائز ہے۔

غرض آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ بتاتی ہے کہ ایسی طلاق دو دفعہ ہوسکتی ہے۔ جس کے صاف معنے یہ ہیں کہ طلاق کے بعد عدت گذر جانے کی صورت میں خاوند کو دو دفعہ دوبارہ نکاح

کا حق حاصل ہے مگر ایسے دو واقعات کے بعد اگر پھر انسان طلاق دیدے تو اُس کو نکاح کا حق حاصل نہیں رہتا بلکہ اُسے عرصہ عدت میں رجوع کا بھی حق حاصل نہیں۔ پھر یہ حق اُسکو تبھی حاصل ہوگا جبکہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے باقاعدہ نکاح کرے اور وہ مرد اس کو کسی وجہ سے طلاق دیدے۔

فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ میں بتایا کہ ان دو طلاقوں کے بعد یا تو عورت کو معروف طریق کے مطابق اپنے گھروں میں بسا لو اور یا پھر حسنِ سلوک کے ساتھ رخصت کر دو۔

تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کے متعلق رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی ایک تشریح احادیث میں بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ابن ابی حاتم نے ابی رزین سے روایت کی ہے کہ جَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَءَيْتَ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ۔ اَيْنَ الثَّالِثَةُ قَالَ اَلتَّسْرِيْحُ بِاِحْسَانٍ یعنی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آیا۔ اور اُس نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ! دو طلاقیں تو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ تیسری کہاں سے آئی؟ آپ نے فرمایا۔ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ جو آیا ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کو آپ نے تیسری طلاق قرار دیا ہے۔

اسجگہ احسان کا لفظ رکھ کر اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ عورت کو رخصت کرتے وقت اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً اُس کے حق سے زائد مال اُسے دیدیا جائے اور اُسے عزت کے ساتھ روانہ کیا جائے۔ بعض صحابہؓ کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دی تو انہیں دس دس ہزار روپیہ تک دے دیا۔

پھر فرمایا وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا۔ تمہارے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اگر کوئی مال یا جائداد تم انہیں دے چکے ہو تو طلاق کے بعد ان سے واپس لے لو۔

یہ آیت بالصراحت بتاتی ہے کہ طلاق کے بعد عورت سے زیورات اور پارچات وغیرہ واپس نہیں لئے جا سکتے۔ نہ مال واپس لیا جا سکتا ہے۔ نہ کوئی جائداد جو اُسے دی جا چکی ہو واپس لی جا سکتی ہے۔ بلکہ مرد اگر مہر ادا نہ کر چکا ہو تو طلاق کی صورت میں وہ مہر بھی اُسے ادا کرنا پڑیگا۔ لیکن اس کے بعد ایک استثنیٰ رکھا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ صورت پیدا ہو تو پھر جائز ہے۔ چنانچہ فرمایا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ سوائے اس کے کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ خدا تعالیٰ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکینگے یعنی مرد عورت کے حقوق ادا نہ کر سکیگا اور عورت مرد کے حقوق ادا نہ کر سکے گی۔ اس صورت میں اس کا حکم اور ہے۔ جو فَاِنْ خِفْتُمْ سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔ یعنی اس صورت میں اگر تمہاری رائے بھی یہی ہو کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو نقصان پہنچائینگے یعنی قضا نے بھی دیکھ لیا کہ فی الواقعہ دونوں کا قصور ہے صرف مرد ہی کا قصور نہیں ہے بلکہ عورت بھی قصوروار ہے تو اس صورت میں اگر عورت سے کچھ دلوا کر ان میں جدائی کروا دی جائے جسے اصطلاحاً خلع کہتے ہیں تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس آیت میں تَاْخُذُوْا کی ضمیر اور طرف گئی ہے اور خِفْتُمْ کی ضمیر اور طرف حالانکہ جملہ ایک ہی ہے۔ یعنی تَاْخُذُوْا سے مراد خاوند ہیں۔ اور خِفْتُمْ سے مراد محکمہ قضاء سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ اسے اصطلاح میں اِنْتِشَارِ ضمائر کہتے ہیں۔ اور نحوی اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ غرض فَاِنْ خِفْتُمْ میں بتایا کہ اگر حکام اس بات کا فیصلہ کریں کہ ..... عورت راضی نہیں اور اس کی نارضامندی کی وجہ سے مرد بھی عدل نہ رکھ سکیگا تو عورت اگر کچھ دینا چاہے تو مرد کو اجازت ہے کہ لیکر

اُسے طلاق دے دے۔ چنانچہ اس کے متعلق احادیث میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جس سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔ بخاری اور نسائی میں آتا ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی (یعنی عبداللہ بن ابی بن سلول کی بیٹی) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اُس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اپنے خاوند سے اس قدر نفرت ہے کہ اگر وہ مجھ سے حسنِ سلوک بھی کرے۔ تب بھی مَیں اس کی طرف توجہ نہیں کر سکتی اور سوائے اس نفرت کے مجھے اس سے اور کوئی شکایت نہیں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے خاوند کو بلایا۔ اور اُس سے دریافت فرمایا کہ تم نے اسے کچھ دیا ہُوا ہے اُس نے عرض کیا کہ ایک باغ ہے جو مَیں نے اِسے دیا ہُوا ہے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عورت کو فرمایا اَتَرُدِّیْنَ عَلَیْہِ حَدِیْقَتَہٗ کہ کیا تو اس کا باغ اسے واپس کر سکتی ہے؟ قَالَتْ نَعَمْ اُس نے کہا ہاں یا رسول اللہ! مَیں باغ واپس کر دوں گی۔ فَاَمَرَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ یَّاْخُذَ الْحَدِیْقَۃَ وَلَا یَزِیْدَ عَلَیْھَا (نسائی) اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُسے حکم دیا کہ وہ اس سے اپنا باغ واپس لے لے اور اس سے زیادہ کچھ نہ لے۔ دوسری روایت میں ذکر آتا ہے کہ اُس عورت نے کہا۔ یا رسول اللہ! مَیں تو زیادہ دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ اَمَّا الزِّیَادَۃُ فَلَا۔ کہ زیادہ ہرگز نہیں بعض روایتوں میں آتا ہے کہ یہ جمیلہ بنت سہیل کا واقعہ ہے۔ بہرحال رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ باغ اس سے واپس کروا دیا اور عورت کو طلاق دلوا دی اور مرد کو اس سے زیادہ لینے کی اجازت نہ دی۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ صرف خاوند کا مال اسے واپس دلوایا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

اسجگہ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا دو وجوہ کی بنا پر کہا گیا ہے۔ اوّل اس لئے کہ اس سے پہلے لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا فرما کر عورت سے مال لینا گناہ قرار دیا تھا۔ پس چونکہ یہ شبہ پڑتا تھا کہ کہیں اس صورت میں بھی مال لینا گناہ نہ ہو۔ اسلئے فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فرما کر اس شبہ کو دُور کر دیا اور بتلا دیا کہ اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں۔ دوسرے فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا اس لئے فرمایا کہ عورت کا کچھ دیکر مرد سے آزاد ہونا اس کے جدائی کے شوق پر دلالت کرتا ہے اور یہ گناہ ہے۔ جیسا کہ ابن جریر نے ثوبان سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اَیُّمَا امْرَاَۃٍ سَاَلَتْ زَوْجَھَا الطَّلَاقَ مِنْ غَیْرِ بَاْسٍ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْھَا رَائِحَۃَ الْجَنَّۃِ (جلد ۲ صفحہ ۲۶۵) یعنی جو عورت بغیر کسی معقول وجہ کے اپنے خاوند سے طلاق مانگے۔ اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ سو فرمایا کہ اگر کوئی حقیقی مجبوری پیش آ جائے تو اس صورت میں اس کی درخواست تفریق موجب گناہ نہیں ہوگی۔ اسی طرح مرد کا عورت سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑنا اس کے لالچ پر دلالت کرتا ہے اور یہ بھی گناہ ہے۔ پس چونکہ دونوں طرف گناہ کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے بتایا کہ قاضی کی تحقیق کے بعد اس طریق پر جُدائی مناسب سمجھی جائے اور ایک تیسرا شخص فیصلہ کر دے کہ یہی طریق مناسب ہے تو پھر دونوں کو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا۔ فرماتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور تمہارا فرض ہے کہ تم ان حدود سے اپنا قدم باہر مت رکھو۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس حکم کی یہاں تک خلاف ورزی کی کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اگر ایک مجلس میں اکٹھی تین طلاقیں بھی دے دی جائیں۔ تب بھی طلاق بتہ واقع ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ سوال خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں پیش ہوا اور آپ سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ایک ہی طلاق سمجھی جائیگی؟ تو آپ نے فرمایا - یہ ایک ہی طلاق ہے - چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ طَلَّقَ رُكَانَةُ زَوْجَتَهُ ثَلَاثًا فِي مَجْلِسٍ وَاحِدٍ فَحَزِنَ عَلَيْهِ حُزْنًا شَدِيْدًا فَسَأَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ طَلَّقْتَهَا قَالَ طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا فِيْ مَجْلِسٍ وَاحِدٍ قَالَ اِنَّمَا تِلْكَ طَلْقَةٌ وَاحِدَةٌ فَارْجِعْهَا - (ابو داؤد باب نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث) یعنی ایک شخص رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دیں اس کے بعد رکانہ کو اپنے اس فعل پر شدید صدمہ محسوس ہوا جب یہ معاملہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تُو نے اپنی بیوی کو کس طرح طلاق دی تھی - اس نے کہا - میں نے اسے ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دی تھیں - آپ نے فرمایا - یہ ایک ہی طلاق ہے - اس لئے تم رجوع کر لو - اسی طرح نسائی میں محمود بن لبید سے روایت ہے کہ اُخْبِرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلٍ طَلَّقَ امْرَاَتَهُ ثَلَاثَ تَطْلِيْقَاتٍ جَمِيْعًا فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اَيُلْعَبُ بِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ. (نسائی باب الثلاث المجموعة وما فیه من التغلیظ) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دی ہیں - اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بہت ناراضگی کا اظہار کیا اور فرمایا - ابھی تو میں تم میں موجود ہوں - کیا میری موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلتا ہے - اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِيْ اَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيْهِ اَنَاةٌ فَلَوْ اَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَاَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ (مسلم باب طلاق الثلاث) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سال تک ایک وقت میں تین طلاقیں ایک ہی طلاق تسلیم کی جاتی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے یہ دیکھکر کہ لوگ طلاقوں کو ایک معمولی بات سمجھنے لگ گئے ہیں اور انہوں نے ایک ایسے معاملہ میں جس میں انہیں بہت غور اور سوچ بچار سے کام لینے کا حکم تھا جلد بازی شروع کر دی ہے وقتی طور پر یہ فیصلہ فرما دیا کہ آئندہ اگر کسی نے اکٹھی تین طلاقیں دیں تو اس کی تین طلاقیں ہی متصور ہونگی -

امام ابن قیم نے اعلام الموقعین جلد ۲ صفحہ ۲۴ تا ۲۶ میں اس مسئلہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے - بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بھی اسلامی تعلیم سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ رواج ہے کہ معمولی معمولی جھگڑوں پر لوگ اپنی بیویوں سے کہہ دیتے ہیں کہ تمہیں تین طلاق - تمہیں تین ہزار طلاق - تمہیں تین کروڑ طلاق تمہیں تین ارب طلاق - حالانکہ اسلام نے اس بیوقوفی کی اجازت نہیں دی - اور پھر آجکل کے وہ لوگ جو شریعت کے پورے واقف نہیں کہہ دیتے ہیں کہ تین دفعہ یکدم طلاق دینے کے بعد عورت سے دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا - حالانکہ یہ طلاق شرعی لحاظ سے ایک ہی طلاق ہے اور عدت گذرنے کے بعد عورت سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے - لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اس قسم کے واقعات کثرت سے ہونے لگے تو آپ نے فرمایا کہ اب اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بیک وقت ایک سے زیادہ طلاقیں دیگا تو میں سزا کے طور پر اس کی بیوی کو اس پر ناجائز قرار دے دونگا - جب آپ پر یہ سوال ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ایسا حکم نہیں دیا - پھر آپ نے ایسا کیوں کیا ہے تو آپ نے فرمایا - رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا یہ منشاء تھا کہ اس قسم کی طلاقیں رُک جائیں۔ مگر چونکہ تم لوگ اس قسم کی طلاق دینے سے رُکتے نہیں اس لئے میں سزا کے طور پر اس قسم کی طلاق کو جائز قرار دے دونگا۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اور آپ کا ایسا کرنا ایک وقتی مصلحت کے ماتحت تھا۔ اور صرف سزا کے طور پر تھا مستقل حکم کے طور پر نہیں تھا۔ بہرحال طلاق ایک ایسی چیز ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَبْغَضُ الْحَلَالِ قرار دیا ہے یعنی جائز اور حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ مکروہ اور ناپسندیدہ چیز۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی میں انسان کے لئے جو چیزیں ضروری اور لازمی ہیں اور جن کے ذریعہ انسان آرام اور سکینت حاصل کر سکتا ہے وہ میاں بیوی کے تعلقات ہیں۔ میاں بیوی کے تعلقات سے جو سکون اور آرام انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ اُسے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان دو وجودوں کو ایک دوسرے کے لئے مودت اور رحمت کا موجب قرار دیا ہے۔ اسی طرح بائیبل میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم کے لئے حوا پیدا کی تاکہ وہ آدم کے لئے آرام اور سکون کا موجب ہو۔ یعنی حوا کے بغیر آدم کے لئے تسکین اور آرام کی صورت اور کوئی نہ تھی۔ لیکن یہی دو وجود جو ایک دوسرے کے لئے تسکین اور آرام اور راحت کا موجب ہیں کبھی کبھی انہیں لڑائی اور جھگڑے کا موجب بنا لیا جاتا ہے۔ اور راحت اور سکون کی بجائے انسان کے لئے اس کا مدمقابل یعنی خاوند کے لئے بیوی اور بیوی کے لئے خاوند دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف دینے کا موجب بن جاتا ہے۔ ہزاروں خاوند ایسے ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بدترین عذاب ہوتے ہیں۔ اور ہزاروں بیویاں ایسی ہیں جو اپنے خاوندوں کے لئے بدترین عذاب ہوتی ہیں۔ ایسے مواقع کے لئے اسلام کا حکم ہے کہ مرد عورت کو طلاق دے دے یا عورت مرد سے خلع کرا لے۔ لیکن طلاق اور خلع سے پہلے اسلام نے کچھ احکام بیان کئے ہیں جن کو مدنظر رکھنا مرد اور عورت اور قاضیوں کا فرض قرار دیا گیا ہے تاکہ طلاق یا خلع عام نہ ہو جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :- اِنَّ اَبْغَضَ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ یعنی حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز خدا تعالیٰ کے نزدیک طلاق ہے۔ جب طلاق حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے تو ایک مومن جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہے وہ اس چیز کے کس طرح قریب جا سکتا ہے جس کے متعلق وہ سمجھتا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ ہر کام جو جائز ہے ضروری نہیں کہ اُسے کیا بھی جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بنارس۔ کلکتہ مدراس یا بمبئی وغیرہ جانا حلال ہے۔ لیکن کتنے ہیں جو ان جگہوں میں گئے ہیں اگر حلال کے یہی معنے ہیں کہ اسے ضرور کیا جائے۔ تو پھر تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جن لوگوں کے پاس ان شہروں میں جانے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ وہ اپنی جائیدادیں بیچ ڈالتے اور اس حلال کام کو ضرور سرانجام دیتے۔ لیکن لوگوں کا اس پر عمل نہ کرنا بتاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو بات حلال ہے ضروری نہیں کہ اُس پر عمل بھی کیا جائے۔ بلکہ مناسب موقعہ اور محل کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے اگر ایک حلال کام کے کرنے سے ناپسندیدگی کے سامان پیدا ہوتے ہوں۔ تو اس کام سے بہرحال اجتناب کیا جائیگا۔ مثلاً پیاز کھانا حلال ہے۔ لیکن مسجد میں پیاز کھا کر جانا منع ہے۔ کیونکہ وہاں لوگوں کو اُس کی بُو سے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کے لئے یہ حلال ہے کہ وہ سبز رنگ کا کپڑا پہنے یا اودے رنگ کا کپڑا پہنے یا زرد رنگ کا کپڑا پہنے۔ لیکن اگر کسی کا دوست کہے کہ یہ زرد رنگ کا کپڑا خرید لو۔ تو وہ کہتا ہے مجھے زرد رنگ اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ اُس کے نزدیک حلال وہ چیز ہے جو اُس کی پسند کے مطابق ہو اور اس کی طبیعت کو اچھی لگتی ہو۔

کھانے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کا حکم ہے کہ حلال اور طیّب
چیزیں کھاؤ۔ لیکن بعض لوگ بینگن نہیں کھاتے بعض لوگ
کدو کو پسند نہیں کرتے۔ اگر اُن سے پُوچھا جائے کہ آپ
بینگن کیوں نہیں کھاتے تو وہ کہتے ہیں ہمیں پسند نہیں یا دوسرے
شخص سے پوچھا جائے کہ آپ کدو کیوں نہیں کھاتے تو وہ
کہتا ہے کہ میری بیوی اس کو ناپسند کرتی ہے۔ اسی طرح
جو لوگ مکان تیار کرتے ہیں وہ اپنے مذاق اور طبیعت
کے مطابق مکان بناتے ہیں۔ کوئی ایک منزلہ مکان بناتا ہے
کوئی دو منزلہ اور کوئی سہ منزلہ۔ کوئی مکان میں باغیچہ لگانا
پسند کرتا ہے اور کوئی بغیر باغیچہ کے رہنے دیتا ہے۔ اب
یہ ساری چیزیں حلال ہوتی ہیں۔ لیکن وہ سب پر عمل
نہیں کرتا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ہر
حلال بات پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ لیکن جب بیوی کو
طلاق دینے کا معاملہ پیش آجائے تو یہ کہتے ہوئے کہ
بیوی کو طلاق دینا جائز ہے فوراً بے سوچے سمجھے اسے
طلاق دے دی جاتی ہے۔ حالانکہ بعض حلال چیزیں انسان
اپنے نفس کی خاطر بعض اپنے دوستوں کی خاطر اور بعض
سوسائٹی کی خاطر ہمیشہ چھوڑتا رہتا ہے درحقیقت ایسے
موقعہ پر ایک مومن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس حلال
کو خدا تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ چونکہ
یہ کام میرے خدا کو پسند نہیں اس لئے میں یہ کام نہیں
کرتا تا میرا خدا مجھ پر ناراض نہ ہو۔ پس رُشد و ہدایت
یہ نہیں کہ طلاق کو عام کیا جائے۔ بلکہ رُشد و ہدایت یہ
ہے کہ طلاق سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ حلال کے معنے
یہ ہیں کہ چاہو تو کر سکتے ہو۔ یہ قانون کے لحاظ سے منع نہیں
لیکن تمہیں دوسروں کے خیالات دوسروں کے جذبات۔
دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کے پیار کو بھی ملحوظ رکھنا
چاہیئے جس حلال پر عمل کرنے سے دوسروں کے خیالات۔ دوسروں
کے جذبات۔ دوسروں کی ہمدردی اور دوسروں کے پیار
کا خون ہوتا ہو۔ وہ حلال نہیں بلکہ ایسا حلال ایک جہت
سے حلال ہے اور دوسری جہت سے حرام ہے۔ جب لوگ
اپنے دوستوں کی ناراضگی اور قوم کی ناراضگی کا خیال رکھتے
ہیں تو کیا خدا تعالیٰ کی ناراضگی ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان
کو بے پرواہ ہو جانا چاہیئے۔ کیا خدا تعالیٰ کا وجود ہی
ایسا کمزور ہے کہ جس کی ناراضگی انسان کے لئے قابلِ اعتناء
نہیں۔ جب دنیوی اور سفلی عشق رکھنے والے لوگ اپنے
محبوب کی چھوٹی سے چھوٹی خفگی سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور
اُس کو ناراض ہونے کا موقعہ نہیں دیتے۔ تو ایک مومن
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث پڑھ کر یا سُن
کر کہ اِنَّ اَبْغَضَ الْحَلَالِ عِنْدَ اللّٰہِ الطَّلَاقُ کس طرح
آسانی سے یہ جرأت کر سکتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی
کرے۔ جب شریعت کہتی ہے کہ تم اس اَبْغَضُ الْحَلَال
کو اختیار کرنے سے پرہیز کرو تو ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ
ایسے امور میں کمی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس بات کو
میاں بیوی کے تعلقات کی کشیدگی کے وقت بھول نہ جائے۔
یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ طلاق اور خلع درحقیقت
ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ اگر مرد عورت کو چھوڑتا ہے تو
وہ طلاق ہو جائیگی اور اگر عورت میاں سے یہ مطالبہ کرے
کہ وہ اُسے آزاد کر دے تو وہ خلع کہلائیگا اور خلع بھی
اَبْغَضُ الْحَلَال کے ماتحت ہی آئیگا۔ جہاں تک نسوانی
حقوق کا سوال ہے۔ خلع کا مسئلہ مسلمان بالکل بھول چکے
تھے جس کی وجہ سے عورتوں کے لئے ازحد مشکلات کا
سامنا تھا۔ احمدیت نے اُن کے اس حق کو قائم کیا اور
عورتوں کو اُن تکالیف سے نجات دی جو ان حقوق کی
عدم موجودگی کی وجہ سے اُن کو پہنچتی تھیں۔ لیکن ساتھ
ہی اس حدیث کے مضمون کو بھی لوگوں کے سامنے بوضاحت
بیان کیا کہ ان دونوں رستوں کو اختیار کرنا اللہ تعالیٰ
کے نزدیک اَبْغَضُ الْحَلَال ہے۔ قرآن کریم کا حکم ہے کہ

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا

پھر اگر (اوپر کی بیان کردہ دو طلاقوں کے گذر جانے کے بعد بھی خاوند) اُسے تیسری طلاق دیدے تو وہ عورت اس کے لئے جائز نہ ہوگی جبتک

غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ

کہ وہ اسکے سوا کسی (دوسرے) خاوند کے پاس نہ جائے۔ لیکن اگر وہ (بھی) اُسے طلاق دیدے تو ان دونوں کو بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ ... اللہ کی

اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ

(مقرر کردہ) حدوں کو قائم رکھ سکیں گے آپس میں دوبارہ رجوع کر لینے پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ)

اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۱﴾

حدیں ہیں جنہیں وہ علم والے لوگوں کے لئے کھول کر بیان کرتا ہے۔ ۱۴۲

جب میاں بیوی میں کوئی جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کو دُور کرنے کے لئے حکم مقرر کئے جائیں۔ جو کوشش کریں کہ اُن کی رنجش دُور ہو جائے اور وہ پہلے کی طرح پیار اور محبت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ لیکن اگر ایسے ہی حالات پیدا ہو جائیں کہ صلح کی کوئی صورت نہ ہو سکے تو پھر خلع کی صورت میں قاضی کے سپرد یہ معاملہ کیا جائے اور وہ اس کا فیصلہ کرے۔ بہرحال یہ امر اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ ذرا ذرا سی بات پر خلع اور طلاق تک نوبت پہنچا دینا نہایت افسوسناک امر ہے اور یہ اتنا بھیانک اور ناپسندیدہ طریق ہے کہ ہر شریف آدمی کو اس سے نفرت ہونی چاہیئے۔

۱۴۲ تفسیر: پہلے فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ میں دو صورتیں بیان کی تھیں۔ اب طلاق والی صورت کو علیحدہ بیان کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے کہ اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو اس صورت میں وہ عورت اس مرد کے لئے جائز نہیں ہوگی ہاں اگر وہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی کرے

اور پھر دوسرا بھی اُسے طلاق دیدے یا فوت ہو جائے اور پھر وہ پہلا شخص اور یہ عورت یقین رکھتے ہوں کہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے تو پھر اُن دونوں کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ طَلَّقَ رَجُلٌ اِمْرَاَتَهٗ ثَلَاثًا۔ فَتَزَوَّجَهَا رَجُلٌ ثُمَّ طَلَّقَهَا قَبْلَ اَنْ يَّدْخُلَ عَلَيْهَا فَاَرَادَ زَوْجُهَا الْاَوَّلُ اَنْ يَّتَزَوَّجَهَا فَسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ فَقَالَ لَا حَتّٰى يَذُوْقَ الْاٰخِرُ مِنْ عُسَيْلَتِهَا مَا ذَاقَ الْاَوَّلُ (مسلم کتاب الطلاق) یعنی ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور پھر اس کی بیوی نے ایک اور شخص سے نکاح کر لیا۔ مگر اس نے بھی شادی سے قبل اسے طلاق دے دی۔ اس پر اس کے پہلے خاوند نے چاہا کہ وہ دوبارہ اس عورت سے نکاح کر لے اور اسکے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ اس عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں۔ جب تک دوسرا خاوند اس سے صحبت نہ کرے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مقررہ مدت (کی آخری حد) کو پہنچ جائیں تو یا تو انہیں مناسب طور پر روک لو

أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا ج وَ

یا انہیں مناسب طور پر رخصت کر دو۔ اور انہیں تکلیف دینے کے لئے (اس نیت سے) کہ (بعد میں پھر) اُن پر زیادتی کرو مت روک رکھو۔ اور

مَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ز

جو شخص ایسا کرے تو (سمجھو کہ) اُس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا ہے۔ اور تم اللہ (تعالیٰ) کے احکام کو محلِ تمسخر نہ بناؤ۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتٰبِ وَ

اور تم پر جو اللہ کا انعام ہوا ہے (اُسکو) یاد رکھو۔ اور (اسے بھی یاد رکھو) جو اُس نے اُتارا ہے یعنی کتاب اور

الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا

حکمت (کو)، کہ وہ اُس کے ذریعہ سے تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور جان لو

أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۲﴾

کہ اللہ ہر ایک بات کو خوب جانتا ہے۔ ۱۴۳

۲۹ ع ۱۳

اور پھر کسی وجہ سے اُسے طلاق نہ دیدے وہ پہلے کیلئے جائز نہیں ہو سکتی۔ غرض دوسرے خاوند کا ہم صحبت ہونا شرط ہے اسکے بغیر وہ پہلے خاوند کے عقد میں نہیں آسکتی۔ مسلمانوں نے اپنے تنزل کے دور میں جہاں اور بہت سی خلافِ اسلام رسوم اپنے اندر داخل کر لی تھیں وہاں انہوں نے حلالہ جیسی گندی رسم بھی اپنے اندر جاری کر لی۔ یعنی انہوں نے طلاقِ بتّہ کے بعد عورت کو اپنے پہلے خاوند کے نکاح میں لانے کا یہ نرالا ڈھنگ نکالا کہ مطلّقہ عورت سے کسی غیر شخص کا صرف ایک رات کیلئے نکاح کر دیا جاتا اور وہ اُس سے ہم صحبت ہوتا اور صبح اٹھ کر [illegible] اس عورت کو طلاق دیدیتا تاکہ وہ اپنے پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کر سکے۔ گویا اس نکاح کا ڈھونگ صرف اس لئے رچایا جاتا کہ پہلے خاوند سے اس کا نکاح کیا جا سکے۔ مگر اسلام اس طریق کو ناجائز قرار دیتا ہے اور حلالہ کرنے اور کروانے والوں پر لعنت ڈالتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ (ترمذی باب فی المحلل والمحلل لہ) یعنی اللہ تعالیٰ حلالہ کرنیوالے پر بھی اور جس کیلئے حلالہ کیا گیا ہو اس پر بھی لعنت ڈالتا ہے پس حلالہ کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں اسلامی قانون یہی ہے کہ تین طلاق کے بعد عورت کسی اور مرد سے باقاعدہ شادی کرے اور اپنی زندگی اسکے گھر میں گذارے پھر اگر کسی وجہ سے وہ بھی طلاق دیدے یا وفات پا جائے تو عورت اپنے پہلے خاوند سے نئے مہر اور ولی کی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ اسکے بغیر نہیں۔

۱۴۳ حل لغات:- هُزُوًا مصدر ہے اور اسکے معنے ہنسی کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں یا تو مصدر بمعنے

هُزُوًا

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدّت کو پُورا کریں۔ تو تم انہیں جب کہ وہ نیک طریق پر باہم رضامند ہو جائیں اپنے

اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ

خاوندوں کے ساتھ نکاح کر لینے سے مت روکو۔ یہ (وہ بات) ہے کہ جس کی تم میں سے ہر اس شخص کو جو اللہ پر اور روزِ آخرت

كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ

پر ایمان لاتا ہے نصیحت کی جاتی ہے۔ (اور سمجھ لو کہ) یہ بات تمہارے حق میں سب سے زیادہ برکت والی اور سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ۱۴۴؎

مفعول ہے یعنی جس سے ہنسی کی جائے۔ یا مصدر مبالغہ کیلئے ہے کیونکہ بعض اوقات مصدر مبالغہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یا حذفِ مضاف ہے۔ یعنی ہنسی کا مقام۔

تفسیر:۔ اس آیت میں طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ سے مراد طلاق رجعی ہے اور بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ کے دو معنے ہیں۔ (۱) میعاد کے ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا۔ (۲) مدّت کا ختم ہو جانا۔ اسجگہ پہلے معنے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب دوسری طلاق کے بعد عدت ختم ہونے لگے تو تمہیں رجوع کا اختیار ہے۔ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ میں دوبارہ اس مسئلہ پر زور دیا کہ عورتوں سے دو ہی قسم کے سلوک کرنیکا حکم ہے۔ یا تو انہیں مناسب رنگ میں اپنے پاس رکھ لو۔ یا مناسب رنگ میں رخصت کر دو۔ یہ نہ ہو کہ تم اس نیّت کے ساتھ رجوع کرو کہ بعد میں پھر اسے دُکھ دینے کا ایک موقعہ تمہارے ہاتھ آ جائیگا۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ اور جو شخص عورت کو دُکھ دینے کیلئے ایسا کریگا۔ وہ بظاہر تو اپنی بیوی کو دُکھ دے رہا ہوگا لیکن درحقیقت اپنی جان پر ظلم کر رہا ہوگا۔ اس لحاظ سے بھی کہ اس سے تمدّن میں ابتری پیدا ہوگی اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ عورت پر ظلم کرکے اپنی شقاوتِ قلبی

کا ثبوت لوگوں کے لئے مہیا کریگا۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ۔ فرمایا دوسری قوموں کو تو یہ تعلیم نصیب ہی نہیں ہوئی۔ تمہیں یہ پاک تعلیم دی گئی ہے جس کی بات بات حکمت پر مبنی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اس پر عمل کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ۔ کہ اس نے دوسری قوموں کی طرح تمہیں ٹھوکریں کھانے سے بچا لیا ہے۔ اگر تم نے اس بابرکت تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا اور تم بھی اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے تو تم سے زیادہ بدقسمت اور کون ہوگا۔ تمہیں چاہیئے کہ تم ان احکام اور ہدایات پر عمل کرو اور وہ طریق اختیار نہ کرو جو تقویٰ کے خلاف ہو۔

تَعْضُلُوْهُنَّ

۱۴۴؎ **حل لغات:** تَعْضُلُوْهُنَّ:۔ عَضَلَ عَلَيْهِ عَضْلًا کے معنے ہیں ضَيَّقَ عَلَيْهِ وَحَبَسَهٗ وَمَنَعَهٗ۔ (اقرب) یعنی کسی پر ناواجب تنگی ڈالنا۔ اس کو روکے رکھنا اور اسے دوسرے کاموں سے منع کر دینا۔ ان معنوں کے لحاظ سے لَا تَعْضُلُوْهُنَّ کا ترجمہ یہ ہوگا۔ کہ ان کو تنگ مت کرو۔ یا بند نہ کرو۔ یا روکو نہیں۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ (یہ ہدایت) اُن کے لئے (ہے) جو

اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ

دودھ پلانے (کے کام) کو (اس کی مقررہ مدت تک) پورا کرنا چاہیں۔ اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ حسبِ دستور اُن (دودھ

وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

پلانے والیوں) کا کھانا اور ان کی پوشاک ہے۔ کسی شخص پر اُس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی۔

اَزْکٰی

اَزْکٰی کے معنے اَنْفَعُ کے بھی ہیں اور (۲) زیادہ پاکیزہ کے بھی ہیں۔

تفسیر:۔ اس آیت میں بَلَغْنَ کے وہ معنے نہیں جو پہلے بیان ہوئے ہیں بلکہ اس جگہ میعاد کے ختم ہونے کے معنے ہیں۔ اور اَجَل سے حرمت والی مدّت مراد ہے۔ کہ جب وہ عدّت پوری کریں اور آزادی کے زمانہ میں آجائیں فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ میں ازواج کے متعلق اختلاف ہوا ہے۔ (۱) بعض کہتے ہیں کہ اِس سے پہلا خاوند مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس سے صلح کرلے۔ اِس مفہوم کو مدّنظر رکھتے ہوئے طَلَّقْتُمْ سے مراد طلاق رجعی ہوگی تین طلاقیں مراد نہ ہونگی (۲) بعض کہتے ہیں کہ خاوند سے مراد آئندہ ہونے والا خاوند ہے۔ اس صورت میں طَلَّقْتُمْ سے مراد طلاق بائن ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ پہلے بائن طلاق کا ذکر ہوچکا ہے اس لئے اب یہاں خاوند سے مراد نیا خاوند ہے۔ پہلا خاوند نہیں۔ مگر میرے نزدیک دونوں معنے ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں دونوں قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کسی جھگڑے کے بعد اُن کے خاندان کی مستورات دوبارہ اپنے پہلے خاوندوں کے گھروں میں بسنا چاہیں تو وہ روک بن کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اب اس مرد سے تعلق قائم رکھنا ہماری غیرت کے خلاف ہے یا کہتے ہیں کہ آگے ہی بہت بدنامی ہو چکی ہے۔ اب کب تک طلاقیں ہوتی چلی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیحت فرمائی ہے کہ ایسے مرد اور ایسی عورتیں جب آپس میں دوبارہ نکاح پر راضی ہوجائیں تو عورتوں کے رشتہ دار انہیں بدنامی وغیرہ کے خیال سے یا خاوند کے پچھلے اعمال پر ناراضگی کے سبب اپنے سابق خاوندوں سے نکاح کرنے سے روکیں نہیں۔

اس کے مقابل میں بعض لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیکر بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اور اگر وہ کسی اور جگہ نکاح کرنا چاہیں تو اس میں سو سو روڑے اٹکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور عورت کی بُرائیاں دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بھی متنفّر ہوجائیں اور عورت کے نکاح میں روک واقع ہوجائے۔ رؤساء بالعموم ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ وہ طلاق بھی دے دیتے ہیں اور عورتوں کو اور جگہ نکاح بھی نہیں کرنے دیتے۔ پس فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ سے یہ بھی مراد ہے کہ دوسرے نکاح کے متعلق عورتوں کے راستہ میں روکیں مت ڈالو۔ اور یہ بھی کہ اگر طلاق رجعی کی مدّت ختم ہوجانے کے بعد عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کے ذریعے پھر تعلق قائم کرنا چاہے تو اس کے رشتہ داروں کو روک نہیں بننا چاہیئے۔ گویا لَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ

کسی والدہ کو اپنے بچے کے ذریعہ سے دُکھ نہ دیا جائے۔ اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے دُکھ دیا جائے) اور وارث پر بھی، ایسا ہی (کرنا لازم)

ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ

ہے۔ اور اگر وہ دونوں آپس کی رضامندی اور باہمی مشورہ کے ساتھ دودھ چھڑانا چاہیں تو (اس میں) اُن پر کوئی گناہ نہیں۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ

اور اگر تم اپنے بچوں کو (کسی دوسری عورت سے) دودھ پلوانا چاہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں جب تم وہ (معاوضہ)

مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾

جو تم نے دینا کیا ہے مناسب طور پر ادا کر دو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے یقیناً دیکھتا ہے۔ ۱۴۵

سے یہ مراد نہیں کہ وہ عورت خود بخود جس سے چاہے بغیر ولی کی وساطت کے نکاح کر لے۔ ولی کا ہونا بہرحال ضروری ہے، خواہ اگر ولی نہ مانیں تو حکومت کی معرفت نکاح کر لے۔

اسجگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کے ولی کسی حد تک بھی عورت کو روک سکتے ہیں۔ یا کسی مرحلہ پر بھی انہیں یہ حق حاصل نہیں۔ اِس کے متعلق امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک دو موقعوں تک تو اولیاء روک ڈال سکتے ہیں لیکن اگر وہ انکار ہی کرتے چلے جائیں اور کسی سے بھی اُس کی شادی نہ ہونے دیں تو یہ اُن کے لئے جائز نہیں ہو گا۔ گویا ایک دو خواہشمندوں سے روکنا تو احتیاط میں شامل سمجھا جائیگا۔ لیکن ان کو اتنا وسیع اختیار نہیں ہو گا کہ جہاں اور جب بھی وہ عورت نکاح کرنا چاہے اُسے روک دیں۔ (۲) بعض کہتے ہیں کہ اگر بڑا ولی اجازت نہ دے تو دوسرے ولی کے ذریعے وہ اپنا نکاح کرا سکتی ہے (۳) بعض کہتے ہیں کہ بلا جائز ولیوں یا سلطان کے نکاح جائز نہیں اور یہی درست ہے۔ ہاں اگر ولی کسی صورت میں بھی رضامند نہ ہوں تو وہ حاکم وقت اور قاضی کے ذریعہ کسی دوسری جگہ جہاں وہ اجازت دے نکاح کرا سکتی ہے یا قاضی کی معرفت اولیاء پر دباؤ ڈال سکتی ہے کہ وہ روکیں نہ ڈالیں۔

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ میں بتایا کہ یہ قانون تمہارے لئے دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے بڑا مفید اور بابرکت ہے یعنی تمدنی نقطۂ نگاہ سے بھی اس قانون کی متابعت تمہارے لئے مفید ہے۔ اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ قانون تمہارے اندر پاکیزگی کی روح پیدا کرنے والا ہے۔

۱۴۵ حل لغات: — تَسْتَرْضِعُوْٓا: اِسْتَرْضَعَ تَسْتَرْضِعُ کے معنے ہیں طَلَبَ مُرْضِعَةً اُس نے کسی دودھ پلانیوالی عورت کو طلب کیا۔ اور اِسْتَرْضَعَ وَالِدَهٗ کے معنے ہیں والدنے اپنے بچہ کو کسی اور سے دودھ پلوا لیا۔ اور اِسْتَرْضَعَتِ الْمَرْاَةُ الطِّفْلَ کے معنے ہیں اِتَّخَذَتْ مُرْضِعَةً لَهَا۔ اُس نے دودھ پلانے کیلئے دایہ کو رکھ لیا۔

تفسیر: — چونکہ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ سے یہ دھوکا لگ سکتا تھا کہ دو سال تک رضاعت ضروری ہے اس لئے لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ فرما کر بتا دیا کہ اس کم

مدت بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں دو سال سے زیادہ کی
نفی بھی کر دی گئی ہے کیونکہ کاملین کا لفظ بتاتا ہے کہ
دو سال سے زیادہ دودھ پلانا جائز نہیں۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ
میں کھانے اور کپڑے سے مراد تمام اخراجات ہیں نہ کہ صرف
روٹی اور لباس۔ اور معروف سے مراد باپ کی مقدرت ہے
کہ امیر اپنی طاقت کے مطابق دے اور غریب اپنی طاقت
کے مطابق۔ اس جگہ عام دودھ پلانے والی عورتوں کا ذکر
نہیں بلکہ ماؤں کا ذکر ہے۔ اور یہ ذکر طلاق کے ضمن میں کیا
گیا ہے۔ کہ اگر دودھ پلانے والی عورت کو طلاق دی جائے
تو بچہ کی خاطر عورت کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچے کو دودھ
مقررہ مدت تک پلائے اور اس کے بدلہ میں خاوند پر فرض
ہے کہ عام مزدور عورت کی طرح نہیں بلکہ اپنی توفیق کے مطابق
اُسے خرچ دے کیونکہ یہ امر عورت کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے
والا ہوگا کہ ایک طرف تو اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ طلاق
کے بعد بھی بچہ کو دودھ پلاتی رہے۔ اور دوسری طرف
اُسے ایسی حالت میں رکھا جائے جو پہلی حالت سے ادنیٰ ہو
اور اُس کے لئے ذلّت کا موجب ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی
لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا کہہ کر اس طرف اشارہ
فرما دیا کہ مرد سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی طاقت سے
زیادہ خرچ کرے۔ یہ بھی نامناسب ہے۔ اور عورت سے
یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ایک نوکر کی طرح طلاق کے بعد ایک عرصہ
گھر میں گزار دے۔ یہ بھی نامناسب ہے۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا کے یہ معنے بھی ہو
سکتے ہیں کہ ماں اپنے بچہ کی وجہ سے باپ کو ضرر نہ دے
اور یہ بھی کہ ماں اپنے بچے کی وجہ سے ضرر نہ دی جائے
اس آیت میں مرد اور عورت دونوں کو یہ نصیحت کی گئی ہے
کہ بچہ کو ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کا ذریعہ نہ بناؤ
بہت سے نادان اس حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں جس کا
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو بچے ہلاک ہو جاتے ہیں یا اُن کی
تربیت خراب ہوتی ہے۔ اس قسم کا فعل درحقیقت قتل
اولاد کے مشابہ ہے۔ اور قرآن کریم نے اس سے روک کر
آئندہ اولادوں پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کا عطف وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ
لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ پر ہے۔ اس میں
اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب حق قائم کیا ہے جو تمدّن کی
صورت ہی بدل دیتا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اگر باپ مر
جائے تو باپ کے جو ورثاء ہوں۔ اُن پر بچہ کو دودھ پلانے
والی عورت کا خرچ ہوگا۔ گویا ورثہ کے ساتھ بوجھ بٹانے
کا کام بھی اُن کے سپرد کر دیا۔ خواہ انہیں ترکہ ملا ہو یا
نہ ملا ہو۔ تھوڑا ہو یا بہت۔ چنانچہ فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذٰلِكَ۔ وارث پر بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ
باپ پر یعنی باپ کا وارث خواہ لڑکا ہو خواہ کوئی قریبی
رشتہ دار اس پر یہ خرچ واجب ہوگا۔ یعنی اس کا پرورش
کرنا احسان کے طور پر نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک حق کے طور پر
ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر واجب کیا گیا ہے۔
اور یہ بھی مطلب ہے کہ اس بچہ کے حصہ میں سے خرچ دیا
جا سکتا ہے۔ بہرحال اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمدّن
کی ایک نئی بنیاد رکھی ہے۔ کہ کمزور بچوں کی تربیت بطور
حق ورثاء پر ڈال دی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جب
دودھ پلایا جا چکے تو پھر وہ بچوں کو لاوارث چھوڑ دیں
بلکہ اس حق کو بلوغت تک ممتد کرنا پڑے گا اور اُن کا فرض
ہوگا کہ وہ بچہ کے کھانے اور لباس کے اخراجات کے علاوہ
اس کے تعلیمی اخراجات بھی بالغ ہونے تک پورے کریں اور
اُس کی اعلیٰ درجہ کی تربیت مدّنظر رکھیں تاکہ وہ قوم کا ایک
مفید وجود بن سکے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ خرچ نسبتی
طور پر تمام ورثاء پر پڑے گا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صرف
سب سے بڑھ کر حق وارثت رکھنے والا شخص اس کا ذمہ دار ہوگا

خواہ اُسے ترکہ میں سے کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے متعلق دودھ پلانے یا چھڑانے کا فیصلہ قرآن کریم نے نہ مرد کے اختیار میں رکھا ہے نہ عورت کے اختیار میں بلکہ دونوں کو مشترکہ اختیار دیا ہے۔ شاید تمام شرائع کی تاریخ میں یہ منفرد مثال ہے کہ اِس طرح اہلی معاملات میں میاں بیوی کو ایک مقام پر کھڑا کر کے برابر کے اختیار دیئے گئے ہیں۔ ہاں یہ شرط ضرور ہے کہ دودھ پلانے کی جو مدّت قرآن کریم نے مقرر کی ہے اس سے زیادہ دیر تک دودھ پلانے پر نہ خاوند مجبور کر سکتا ہے۔ نہ عورت زور دے سکتی ہے۔ جب طلاق کے بعد بھی عورت کے جذبات کا اس قدر خیال رکھنے پر خاوند کو مجبور کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ جو عورت نکاح میں ہو اِن امور میں اُس کے جذبات کا خیال رکھنا اسلام کے نزدیک کس قدر ضروری ہوگا۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں بتایا کہ بچوں کو دوسروں سے دودھ پلوانا حقوقِ پدری کے خلاف نہیں نہ حقوقِ مادری کے خلاف کہ اس کو گناہ سمجھو گناہ تب ہوگا اگر بلا اجرت دینے کے ظلماً کسی سے یہ کام لو۔ کیونکہ اس صورت میں تم نے دو گناہ کئے ایک تو دوسرے کا مال لینے کا اور ایک بچہ کے حقوق ادا نہ کرنے کا۔ انہی معنوں سے لَا جُنَاحَ کے معنے حل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کے حقوق بطور حق کے ہیں اور اُن میں کمی کرنا موجبِ گناہ ہوتا ہے۔

اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ کے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو بظاہر ایک بے معنی فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لفظی معنے یہ بنتے ہیں کہ جب تم دے دو جو تم دے چکے ہو۔ حالانکہ جو معاوضہ ایک دفعہ دے دیا گیا ہو اس کے دوبارہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس مشکل کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرضعہ کی مزدوری پہلے دینی ضروری ہے مگر میرے نزدیک اس سے مزدوری پہلے دینا ثابت نہیں کیونکہ سَلَّمَ کے معنے صرف سپرد کرنے کے ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے معنے راضی ہونے کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ عربی زبان میں سَلَّمَ بِهٖ کے معنے ہوتے ہیں رَضِيَ وہ اس سے راضی ہو گیا۔ قرآن کریم میں بھی یہ لفظ اِن معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (سورة نساء آیت ۶۶) یعنی تیرے رب کی قسم جب تک وہ ہر اُس بات میں جس کے متعلق اُن میں جھگڑا ہو جائے تجھے حَکَم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس سے وہ اپنے نفوس میں کسی قسم کی تنگی محسوس نہ کریں اور پورے طور پر راضی نہ ہو جائیں اُس وقت تک وہ ہرگز مومن نہیں ہونگے۔ اِن معنوں کو مدّنظر رکھتے ہوئے اِذَا سَلَّمْتُمْ کے یہ معنے ہونگے کہ جب تم دودھ پلانے والیوں کو مناسب حق دینے پر رضامند ہو جاؤ اور تمہاری نیت یہ ہو کہ تم اتنی رقم بہرحال دے دو گے تو پھر کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں۔ گویا اِتیان بالمعروف پر باہم رضامند ہو جانے کے بعد اگر کسی اَور سے دودھ پلوا لو تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ ان معنوں کے لحاظ سے اُجرت کا پہلے دینا ضروری نہیں۔ مگر اُجرت کا پہلے مقرر ہو جانا بہرحال ضروری ہے۔ لیکن اگر سَلَّمْتُمْ کے معنے سپرد کرنے کے بھی لئے جائیں تب بھی اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ پہلے اُجرت سپرد کرو تب دودھ پلوانا جائز ہوگا بلکہ یہاں ایک قاعدہ بیان ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اُجرت سپرد

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ

اور تم میں سے جن لوگوں کی رُوح قبض کر لی جاتی ہے۔ اور وہ (اپنے پیچھے) بیویاں چھوڑ جاتے ہیں (چاہیئے کہ) وہ (یعنی بیویاں)

بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ

اپنے آپ کو چار مہینے (اور) دس (دن) تک روک رکھیں۔ پھر جب وہ اپنا

اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ

مقررہ وقت پورا کریں وہ اپنے متعلق مناسب طور پر جو کچھ (بھی) کریں

نہ کروگے تو گناہ ہوگا۔ گویا اِذَا سَلَّمْتُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ کے ساتھ ہے نہ کہ تَسْتَرْضِعُوْا کے ساتھ۔ مگر سَلَّمْتُمْ کے معنے حل کرنے کے بعد بھی یہ سوال قائم رہتا ہے کہ اس جگہ اٰتَيْتُمْ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنے ہیں "تم نے دے دیا ہے" یا "تم دے چکے ہو"۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ جب تم اس حق پر رضا مند ہو جاؤ جو تم دے چکے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بے معنے فقرہ بن جاتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ عربی زبان میں کبھی ماضی کا صیغہ قطعی فیصلہ پر دلالت کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (سورہ مائدہ آیت) جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اپنے مونہوں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لیا کرو۔ حالانکہ وضو نماز کے لئے کھڑے ہونے سے پہلے کیا جاتا ہے۔ نہ کہ کھڑے ہوتے وقت پس یہاں یہی مراد ہے کہ جب تم نماز کا پختہ ارادہ کر لو تو پہلے وضو کر لیا کرو۔ اور یہی اٰتَيْتُمْ کے معنے ہیں۔ کہ جو کچھ تم اُسے دینے کا پختہ فیصلہ کر چکے ہو۔ اگر اس کے یہ معنے نہ کئے جائیں تو آیت کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ پہلا روپیہ جو تم اُسے دے چکے ہو وہ اُسے پھر دے دو۔ یعنی اگر پہلے سو روپیہ دے چکے تھے تو پھر اور سو روپیہ دیدو حالانکہ اِسے کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ درحقیقت اس کے یہی معنے ہیں کہ اگر تم اپنے بچّوں کو کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ تم نے اُسے جو کچھ دینے کا پختہ فیصلہ کیا ہے اس پر پورے طور پر قائم ہو جاؤ اور اس میں کسی قسم کی حیل وحجت سے کام نہ لو۔

اِس آیت میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ حق الخدمت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے ادا کرنے کا انسان ایسا عہد کرے کہ گویا ادا کر ہی دیا ہے اور بالمعروف کہہ کر اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حق الخدمت ادا کرنے میں معروف کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے یعنی معاوضہ ملک کی اقتصادی حالت کے مطابق ادا کیا جائے۔ اِس قدر کم نہ ہو کہ اُس وقت کی اقتصادی حالت کے مطابق اُس سے دودھ پلانے والی عورت کا گذارہ ہی نہ ہو سکے۔ اِسی طرح بالمعروف میں

اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۵﴾

اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں - اور جو تم کرتے ہو اللہ (تعالیٰ) اس سے واقف ہے۔ ۱۴۶ل

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ

عورتوں سے نکاح کی درخواست کے متعلق جو بات تم اشارۃً (اُن سے) کہو یا اپنے دلوں میں رکھو (اس پر تمہیں

اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ

کوئی گناہ نہیں - اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تمہیں ضرور اُن کا خیال آئیگا - لیکن تم

لَّا تُوَاعِدُوْھُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَ

اُن سے خفیہ طور پر (کوئی) معاہدہ نہ کرلو- ہاں یہ (اجازت ہے) کہ تم اُن سے کوئی مناسب بات کہدو - اور

اِس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر تمہاری مالی حالت عام لوگوں سے اچھی ہو تو نہ صرف پہلی حدبندی کو مدِّنظر رکھو بلکہ اس سے زائد یہ امر بھی مدِّنظر رکھو کہ ایسا حق الخدمت ادا کرو- جو تمہاری اپنی مالی حالت کے مطابق ہو- گویا کم سے کم حق الخدمت تو وہ ہو جو اس زمانہ کے حالات کے مطابق گذارہ کے لئے کافی ہو- لیکن اگر ہو سکے تو اس سے زیادہ دو اور صرف زمانہ کے حالات کے مطابق ہی نہ دو بلکہ اپنی مالی حالت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ایسا معاوضہ دو جو تمہارے حالات کے مطابق ہو-

۱۴۶ حل لغات:- يَتَرَبَّصْنَ میں مبتدا محذوف ہے- یعنی حُكْمُ اَزْوَاجِهِمْ اَنْ يَّتَرَبَّصْنَ لَوْ اَزْوَاجُهُمْ يَتَرَبَّصْنَ- یعنی حُكْمُ اَزْوَاجِهِمْ مبتدا ہے جو محذوف ہے اور اَنْ يَّتَرَبَّصْنَ اس کی خبر ہے-

تفسیر:- اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر چار ماہ دس دن کی عدت گذرنے کے بعد عورتیں اپنے مستقبل کے متعلق کوئی قدم اٹھائیں۔ تو مردوں پر تو کوئی گناہ نہ ہوگا لیکن عورتوں پر گناہ ہوگا کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ یعنی عورتوں کو اپنے گھروں سے ایک سال تک کوئی شخص نکالنے کا مجاز نہیں- لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں کہ ایسی صورت میں عورتوں پر گناہ ہے- کیونکہ اسی آیت میں اس کے بعد بِالْمَعْرُوْفِ کا لفظ آیا ہے جس سے صاف ثابت ہے کہ اگر وہ نکاحِ ثانی کریں تو یہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایک پسندیدہ اور قابلِ ستائش فعل ہے- اگر گناہ ہوتا تو بِالْمَعْرُوْفِ کے الفاظ استعمال نہ کئے جاتے- کیونکہ معروف کے معنے رائج الوقت قانون یا فطرتی جذبہ یا عقلِ عامہ کے مطابق کسی کام کے کرنے کے ہوتے ہیں- اور جو کام قانون کے مطابق ہو یا فطرتی جذبہ کے مطابق ہو یا انسانی عقل اس کا تقاضا کرتی ہو اس کام کو کوئی دانا شخص برا قرار نہیں دے سکتا- درحقیقت یہ آیت ان لوگوں کے لئے زجر ہے جو بیوہ عورتوں کو نکاحِ ثانی سے روکتے ہیں- فرماتا ہے اگر وہ نکاح کریں تو کیا

يَتَرَبَّصْنَ

لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ

جب تک (عدّت کا) حکم اپنی میعاد کو (نہ) پہنچ جائے (اس وقت تک) تم نکاح کرنے کا پختہ ارادہ

اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

نہ کرلو۔ اور جان لو کہ تمہارے دلوں میں جو (کچھ بھی) ہے اللہ (تعالیٰ) اُسے جانتا ہے۔

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۶﴾ ع

۳۰ ع ۱۴

پس تم اس (بات) سے ڈرو۔ اور جان لو کہ اللہ (تعالیٰ) بہت بخشنے والا (اور) بُردبار ہے۔ ۱۲۷ے

تم پر کوئی گناہ ہے یعنی ہرگز کوئی گناہ نہیں۔ پھر تم انہیں نکاح سے کیوں روکتے ہو۔ وہ اپنے نفوس کے متعلق جو کچھ فیصلہ کریں اس کا وہ حق رکھتی ہیں۔ ہاں اس میں یہ اشارہ ضرور پایا جاتا ہے کہ اگر وہ کوئی غیر معروف کام کریں اور حکام و اولیاء انہیں نہ روکیں تو یہ گناہ ہوگا۔

بیوہ کے لئے چار ماہ دس دن کی مدت مقرر کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس عرصہ میں جنین میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُسے حمل کا یقینی طور پر علم ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ضروری ہوتا ہے کہ وہ نکاح کے لئے وضع حمل تک انتظار کرے۔

عَرَّضْتُمْ

۱۲۷ے حل لغات:۔ عَرَّضْتُمْ: عَرَّضْتَ لَهٗ وَعَرَّضْتُ بِهٖ تَعْرِيْضًا کے معنے ہیں اِذَا قُلْتَ قَوْلًا وَاَنْتَ تَعْنِيْهِ فَالتَّعْرِيْضُ ضِدُّ التَّصْرِيْحِ مِنَ الْقَوْلِ (اقرب) یعنی تعریض ایسے کلام کو کہتے ہیں جو تصریح کے مخالف ہو۔ اور صرف اشارۃً ایسی بات کہی جائے جس کا اصل مفہوم کہنے والا ہی سمجھتا ہو۔

صاحب مفردات لکھتے ہیں۔ اَلتَّعْرِيْضُ كَلَامٌ لَهٗ وَجْهَانِ مِنْ صِدْقٍ وَكِذْبٍ اَوْ ظَاهِرٍ وَبَاطِنٍ یعنی تعریض ایسے کلام کو کہتے ہیں جس کے صدق اور کذب یا ظاہر اور باطن کے لحاظ سے دو مفہوم سمجھے جا سکیں۔

تَعْزِمُوْا

تَعْزِمُوْا: عَزَمَ الْاَمْرَ وَعَلَيْهِ کے معنے ہیں عَقَدَ الضَّمِيْرَ عَلَيْهِ۔ کسی بات کا پختہ ارادہ کرلیا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم ان عورتوں سے نکاح کے سلسلہ میں کوئی بات اشارۃً کہہ دو۔ مثلاً کسی بیوہ سے کہہ دیا کہ مشورہ سے کام کرنا بہتر ہوگا۔ آپ کو اگر کوئی ضرورت محسوس ہو تو میں ہمدردانہ مشورہ کے لئے حاضر ہوں۔ اب لفظ مشورہ عام ہے خواہ اپنے لئے ہو یا کسی اور کے لئے۔ اس طرح بات بھی مخفی رہتی ہے اور اشارۃً اس کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ارادۂ نکاح کو اپنے دل میں مخفی رکھنا بھی جائز ہے۔ تاوقتیکہ چار ماہ اور دس دن کی میعاد نہ گذر جائے۔

لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا میں عورتوں سے خفیہ معاہدۂ نکاح کی کلی ممانعت کرتے ہوئے قولِ معروف کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر قولِ معروف سے شادی کی درخواست مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے ہمدردی اور غمخواری کا اظہار کرو تاکہ اس پر یہ اثر ہو کہ یہ شخص میرا خیرخواہ ہے۔ اور میں اس سے ضرورت پر مفید مشورہ لے سکتی ہوں۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اُسے صاف طور پر

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو اُسوقت بھی طلاق دے دو جبکہ تم نے انکو چھوا تک نہ ہو -

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ

یا مہر نہ مقرر کیا ہو - اور (چاہیئے کہ اس صورت میں) تم انہیں مناسب طور پر کچھ سامان دو - (یہ امر)

نکاح کے لئے کہہ دیا جائے ایسا کہنا ہرگز جائز نہیں - چنانچہ فرماتا ہے - وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ تم دونوں مل کر اس امر کا فیصلہ نہ کر لو کہ عدّت کے بعد ہم آپس میں نکاح کریں گے - اِس سے پہلے اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ میں تو مردوں کو سمجھایا کہ وہ شادی کے متعلق عورتوں کے سامنے پورا اظہار نہ کریں - ہاں اگر وہ دل میں نیّت رکھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں - مگر اسجگہ عورتوں کو بھی منع کر دیا ہے کہ اگر وہ مردوں کی بات کو سمجھ جائیں تو فوراً ہاں نہ کر دیں - بلکہ وہ بھی خاموش رہیں اور اپنے ارادہُ نکاح کا اُن کے سامنے اظہار نہ کریں - اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر اس لئے کیا ہے کہ عام طور پر لوگ ایسے امور میں احتیاط سے کام نہیں لیتے اور نفسانی جوشوں سے دب جاتے ہیں - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عدّت کے اندر تمہارا نکاح کے متعلق آپس میں کوئی فیصلہ کر لینا قطعی طور پر ناجائز ہے -

اِس کے بعد فرماتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے - اللہ تعالیٰ اُسے خوب جانتا ہے - پس تم اس سے ڈرو - اور سمجھ لو کہ کسی اور کو پتہ ہو یا نہ ہو - خدا تعالیٰ کو تو پتہ ہے - اس لئے تم چوکس رہو اور احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہ کرو -

یا یہ کہ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ میں دوسرا حکم ہے اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ میں لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا کے حکم کے سلسلہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم اُن سے کوئی مخفی معاہدہ نہ کرو - کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل کی باتوں تک کو جانتا ہے -

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ کا یہ مطلب نہیں کہ اگر ان احکام کی خلاف ورزی ہو جائے تو تم خدا تعالیٰ کو غَفُوْرٌ اور حَلِيْمٌ پاؤ گے - بلکہ اس میں لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ کی حکمت بتائی ہے - کہ چونکہ خدا تعالیٰ پردہ پوش ہے اور وہ انسان کی کمزوری سے واقف ہے - اس لئے اُس نے صرف چار ماہ دس دن کی عدّت مقرر کی ہے - زیادہ سخت احکام اُس نے نہیں دیئے - اور حلیم کہہ کر بتایا کہ اللہ تعالیٰ دانا ہے - وہ جانتا ہے کہ اس غرض کے لئے کس قدر انتظار کرنا ضروری ہے - اگر اس قسم کے احکام نہ دیئے جاتے تو تمدّن میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتیں اور سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جاتا - پس اس خیال سے کہ نکاح تقویٰ کا ایک ذریعہ ہے - جلدی نہ کرو - خدا تعالیٰ اس امر کو بہتر سمجھتا ہے کہ تمہارے لئے کس قدر دیر مناسب ہے +

قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (۲۳۷)

دولت مند پر اُس کی طاقت کے مطابق (لازم ہے) اور نادار پر اُس کی طاقت کے مطابق (ہم نے ایسا کرنا) نیکو کاروں پر واجب کر دیا ہے۔ ۱۴۸

الْمُوْسِعُ

۱۴۸ حل لغات: — اَلْمُوْسِعُ : اَوْسَعَ سے اسم فاعل ہے۔ اور اَوْسَعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں صَارَ ذَا سَعَةٍ وَغِنًى وہ آدمی وسعت والا ہو گیا۔ یا غنی ہو گیا۔ اور اَوْسَعَ اللّٰهُ عَلَى فُلَانٍ کے معنے ہیں اَغْنَاهُ خدا تعالیٰ نے اُسے غنی کر دیا۔ (اقرب)

الْمُقْتِرِ

اَلْمُقْتِرِ : اَقْتَرَ سے اسم فاعل ہے۔ اور اَقْتَرَ عَلَى عِيَالِهٖ کے معنے ہیں قَلَّ مَالُهٗ وَافْتَقَرَ اُس کا مال کم ہو گیا اور وہ محتاج ہو گیا۔ اور اَقْتَرَ اللّٰهُ رِزْقَهٗ کے معنے ہیں ضَيَّقَهٗ وَقَلَّلَهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کا مال کم کر دیا اور اُسے تنگ دست کر دیا۔

تفسیر: — اب طلاق کے متعلق اللہ تعالیٰ بعض اور احکام بیان فرماتا ہے۔ طلاق کی پہلی صورت تو یہ تھی کہ میاں بیوی میں کوئی شدید اختلاف پیدا ہوا اور طلاق واقع ہو گئی۔ مگر بعض ایسی بھی صورتیں ہوتی ہیں کہ میاں بیوی ابھی اکٹھے بھی ہونے نہیں پاتے کہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ مثلاً نکاح کے معاً بعد ایسے گواہ مل گئے جنہوں نے ایسی گواہیاں دیں جن سے نکاح کی حرمت ثابت ہو گئی۔ یا کم سے کم نکاح کی کراہت پیدا ہو گئی۔ مثلاً ادھوری گواہی ایسی مل گئی کہ یہ عورت خاوند کی رضاعی بہن ہے۔ پس گو وہ ادھوری گواہی ہو مگر خاوند کے دل میں کراہت تو پیدا ہو جائے گی۔ اور اس قسم کی گواہیاں بعض دفعہ نکاحوں کے بعد مل جاتی ہیں۔ پس ایک صورت تو یہ ہے جس میں چھونے سے بھی پہلے طلاق دینے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح کے بعد دونوں خاندانوں کے بعض اکابر جن کو پہلے اس تعلق کا علم نہ ہوا ہو فیصلہ دے دیں کہ چونکہ آپس کے تعلقات ایسے ہیں کہ تم دونوں آپس میں نباہ نہیں کر سکو گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ عورت کو طلاق دے دو۔ اور وہ چھونے سے پہلے اُسے طلاق دے دے۔

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً سے پتہ لگتا ہے کہ ایسا نکاح جس میں کوئی مہر مقرر نہ کیا گیا ہو وہ بھی جائز ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اسلامی فقہاء نے تصریح کی ہے خواہ مہر کی تعیین نہ کی گئی ہو یہ ضرور سمجھا جائیگا۔ کہ مہر مقرر ہے اور اُس کی تعیین مہر بالمثل سے کی جائیگی۔ یعنی اسی حیثیت کے خاندان کے دوسرے افراد کو دیکھا جائیگا کہ اُن کا کیا مہر ہے۔ اور وہی مہر اس عورت کا قرار دیا جائیگا۔

اِس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ ہدایت دیتا ہے۔ کہ مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ۔ اگر تم عورتوں کو اُن کے چھونے سے پہلے طلاق دے دو یا ایسی صورت میں طلاق دو کہ تم نے اُن کا مہر مقرر نہ کیا ہو تو دونوں صورتوں میں تمہارا فرض ہو گا کہ تم اُن سے حسن سلوک کرو۔ اور انہیں مناسب رنگ میں کچھ سامان دے دو۔ مالی وسعت رکھنے والا اپنی طاقت کے مطابق اس کام میں حصہ لے اور تنگدست اپنے حالات کو مدّ نظر رکھ کر حصہ لے۔ اور یہ صرف طوعی نیکی نہیں بلکہ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ نیکی اور تقویٰ سے کام لینے والوں پر ہم نے یہ واجب کر دیا ہے کہ وہ عورتوں کو حسن سلوک کے ساتھ رخصت کریں۔

احادیث میں آتا ہے کہ ایک انصاری نے ایک عورت سے شادی کی۔ مگر اس کا مہر مقرر نہ کیا۔ ثُمَّ طَلَّقَهَا قَبْلَ اَنْ يَمَسَّهَا۔ پھر مجامعت سے قبل اُسے طلاق دیدی۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ

اور اگر تم انہیں قبل اس کے کہ تم نے انہیں چھوا ہو طلاق دیدو لیکن مہر مقرر کر دیا ہو

لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَ

تو (اس صورت میں) جو مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا آدھا (انکے سپرد کرنا) ہوگا۔ سوائے اس (صورت) کے کہ وہ (یعنی عورتیں)

الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ

معاف کردیں یا وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح (کا) باندھنا ہو۔ اور تمہارا معاف کردینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۸﴾

اور تم آپس میں (معاملہ کرتے وقت) احسان کو نہ چھوڑا کرو۔ (اور یاد رکھو) کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ (اُسے) یقیناً دیکھتا ہے۔ ۱۴۹

۱۴۹ تفسیر :۔ پہلے یہ بتایا تھا کہ اگر مہر مقرر نہ ہو اور طلاق کی ضرورت پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیئے۔ اب یہ بتاتا ہے کہ اگر مہر تو مقرر ہو چکا ہو مگر میاں بیوی کا تعلق قائم نہ ہوا ہو اور طلاق کی نوبت آجائے۔ تو کیا کرنا چاہیئے۔ فرماتا ہے۔ ایسی صورت میں طلاق دیتے وقت تمہیں نصف مہر ادا کرنا پڑے گا۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ مَسّ سے کیا مراد ہے۔ (۱) بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد میاں بیوی کا آمنے سامنے ہو جانا یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھنا مراد ہے مخصوص تعلقات مراد نہیں (۲) لیکن بعض کہتے ہیں کہ مَسّ سے مراد مخصوص تعلقات ہیں۔ کیونکہ چھونا محاورہ کے طور پر صحبت کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک واقعہ سے ہو جاتی ہے۔

جب عرب فتح ہوا اور اسلام پھیلنے لگا تو کندہ قبیلہ کی ایک عورت جس کا اسماء یا امیمہ نام تھا اور وہ جونیہ یا بنت الجون بھی کہلاتی تھی اُس کا بھائی لقمان

جب یہ معاملہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم نے احسان کے طور پر اسے کوئی چیز بھی دی ہے۔ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ مَتِّعُوْهَا بِقَلَنْسُوَتِكَ اگر تمہارے پاس اَور کوئی چیز نہیں تو اپنی ٹوپی ہی اُتار کر اس کے حوالے کردو۔ (تفسیر بحر محیط جلد ۲ صـ۲۳۳)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا کس قدر حکم ہے۔ کہ اگر اَور کوئی چیز نہ ہو تو مرد کو چاہیئے کہ اپنی ٹوپی یا پگڑی ہی اُتار کر اُسے دے دے اور خالی ہاتھ نہ جانے دے۔

لیکن اگر اس بارے میں کوئی جھگڑا پیدا ہو تو چونکہ قرآن کریم نے اصولی طور پر فیصلہ فرما دیا ہے کہ جھگڑے کی صورت میں اولی الامر کی طرف رجوع کیا کرو۔ اس لئے اختلاف کی صورت میں قاضی کے پاس فیصلے کے لئے جانا چاہیئے جو حالات دیکھ کر فیصلہ دے گا کہ خاوند نے اپنی حیثیت کے مطابق عورت کو اُس کا حق ادا کیا ہے یا نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی قوم کی طرف سے بطور وفد حاضر ہوا اور اس موقعہ پر اُس نے یہ بھی خواہش کی کہ اپنی ہمشیرہ کی شادی رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے کردے اور بالمشافہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بھی کردی کہ میری ہمشیرہ جو پہلے ایک رشتہ دار سے بیاہی ہوئی تھی اب بیوہ ہے نہایت خوبصورت اور لائق ہے آپ اس سے شادی کریں۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو چونکہ قبائلِ عرب کا اتحاد منظور تھا آپ نے اُس کی یہ دعوت منظور کرلی اور فرمایا کہ ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی پر نکاح پڑھ دیا جائے۔ اُس نے کہا۔ یا رسول اللہ! ہم معزز لوگ ہیں مہر تھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اِس سے زیادہ میں نے اپنی کسی بیوی یا لڑکی کا مہر نہیں باندھا۔ جب اُس نے رضامندی کا اظہار کردیا تو نکاح پڑھا گیا اور اُس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کسی آدمی کو بھیج کر اپنی بیوی منگوا لیجیئے۔ آپ نے ابا اسیدؓ کو اس کام پر مقرر کیا۔ وہ تشریف لے گئے۔ جونیہ نے اُن کو اپنے گھر بلایا تو آپ نے کہا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر حجاب نازل ہو چکا ہے۔ اِس پر اُس نے دوسری ہدایات دریافت کیں۔ جو آپ نے بتا دیں۔ اور اونٹ پر بٹھا کر مدینہ لے آئے۔ اور ایک مکان میں جس کے گرد کھجوروں کے درخت بھی تھے لا کر اتارا۔ اُس کے ساتھ اُس کی دایہ بھی اُس کے رشتہ داروں نے روانہ کی تھی جسطرح ہمارے ملک میں ایک بے تکلف نوکر ساتھ جاتی ہے تاکہ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ چونکہ یہ عورت حسین مشہور تھی۔ اور یُوں بھی عورتوں کو دلہن دیکھنے کا شوق ہوتا ہے مدینہ کی عورتیں اس کو دیکھنے گئیں۔ اور اس عورت کے بیان کے مطابق کسی عورت نے اُس کو سکھا دیا کہ رُعب پہلے دن ہی ڈالا جاتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے پاس آئیں تو کہہ دیجیو کہ میں آپ سے

اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ اِس پر وہ تیرے زیادہ گرویدہ ہو جائیں گے۔ اگر یہ بات اس عورت کی بنائی ہوئی نہیں تو کچھ تعجب نہیں کہ کسی منافق نے اپنی بیوی یا اور کسی رشتہ دار کے ذریعہ یہ شرارت کی ہو۔ غرض جب اس کی آمد کی اطلاع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تو آپ اس گھر کی طرف تشریف لے گئے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ احادیث میں لکھا ہے کہ فَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَبِي نَفْسَكِ لِي قَالَتْ وَهَلْ تَهَبُ الْمَلِكَةُ نَفْسَهَا لِلسُّوْقَةِ قَالَ فَاَهْوٰى بِيَدِهٖ يَضَعُ يَدَهٗ عَلَيْهَا لِتَسْكُنَ فَقَالَتْ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ فَقَالَ قَدْ عُذْتِ بِمَعَاذٍ۔ ثُمَّ خَرَجَ عَلَيْنَا فَقَالَ يَا اَبَا اُسَيْدٍ اُكْسُهَا رَازِقِيَّتَيْنِ وَاَلْحِقْهَا بِاَهْلِهَا (بخاری کتاب الطلاق) جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے تو آپ نے اُسے فرمایا۔ کہ تُو اپنا نفس مجھے ہبہ کردے اُس نے جواب دیا کہ کیا ملکہ بھی اپنے آپ کو عام آدمیوں کے سپرد کیا کرتی ہے؟ ابو اُسید کہتے ہیں کہ اِس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس خیال سے کہ اجنبیت کی وجہ سے گھبرا رہی ہے اُسے تسلّی دینے کے لئے اس پر اپنا ہاتھ رکھا۔ آپ نے اپنا ہاتھ ابھی رکھا ہی تھا کہ اُس نے یہ نہایت ہی گندہ اور نامعقول فقرہ کہہ دیا کہ میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں۔ چونکہ نبی خدا تعالیٰ کا نام سُنکر ادب کی رُوح سے بھر جاتا ہے اور اُس کی عظمت کا متوالا ہوتا ہے۔ اُس کے اِس فقرہ پر آپ نے فوراً فرمایا کہ تُو نے ایک بڑی ہستی کا واسطہ دیا ہے اور اس کی پناہ مانگی ہے جو بڑا پناہ دینے والا ہے اِس لئے میں تیری درخواست کو قبول کرتا ہوں۔ چنانچہ آپ اُسی وقت باہر تشریف لے آئے اور فرمایا۔ اے ابا اسیدؓ! اِسے دو چادریں دے دو اور اسے اِس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دو۔ چنانچہ اس کے بعد اُسے مہر

حصہ کے علاوہ بطور احسان دو رازقی چادریں دینے کا آپ نے حکم دیا تاکہ قرآن کریم کا حکم وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ پورا ہو ۔ جو ایسی عورتوں کے متعلق ہے جن کو بلا صحبت طلاق دے دی جائے ۔ اور آپ نے اُسے رخصت کر دیا ۔ اور ابو اسیدؓ ہی اُس کو اُس کے گھر پہنچا آئے ۔ اُس کے قبیلہ کے لوگوں پر یہ بات نہایت شاق گذری اور انہوں نے اُس کو ملامت کی مگر وہ یہی جواب دیتی رہی کہ یہ میری بدبختی ہے ۔ اور بعض دفعہ اُس نے یہ بھی کہا کہ مجھے دھوکا دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تیرے پاس آئیں تو تم پرے ہٹ جانا ۔ اور نفرت کا اظہار کرنا ۔ اس طرح اُن پر تمہارا رعب قائم ہو جائیگا ۔ معلوم نہیں یہ وجہ ہوئی یا کوئی اور بہرحال اُس نے نفرت کا اظہار کیا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس سے علیحدہ ہو گئے اور اُسے رخصت کر دیا ۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مَسّ سے مراد صرف چھونا نہیں بلکہ مخصوص تعلقات کا قائم ہو جانا ہے ۔ ورنہ لغوی معنوں کے لحاظ سے تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا ۔ اور آپ اُسے چھو چکے تھے ۔

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ کے متعلق بھی اختلاف ہوا ہے کہ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے کون مراد ہے ۔ بعض کہتے ہیں اس سے خاوند مراد ہے کیونکہ نکاح ہو جانے کے بعد اُس کی گرہ خاوند کے ہاتھ میں ہوتی ہے ۔ اس صورت میں خاوند کا عفو کرنا یہ ہوگا کہ وہ نصف مہر کی بجائے سارا مہر دیدے لیکن بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد عورت کے ولی ہیں اور ان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اگر چاہیں تو نصف مہر بھی نہ لیں ۔ اُن کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ اس طرح ہوتی ہے کہ کسی عورت کا نکاح اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ولی اجازت نہ دیں ۔ بعض لوگوں نے اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے خاوند مراد نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ اس نے تو مہر دینا ہے اور دینے کو معاف کرنا نہیں کہتے ۔ لیکن ان کا یہ اعتراض عربی زبان سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے ۔ اس لئے کہ عفو کے معنے زیادہ دینے کے بھی ہوتے ہیں ۔ چنانچہ عربی زبان میں کہتے ہیں عَفَا فُلَانٌ الشَّعْرَ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے بال بڑھائے ہیں ۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اِعْفُوا اللُّحٰى اور اس کے معنے ہیں ۔ ڈاڑھیاں بڑھاؤ ۔ پھر عرب کے رسم و رواج سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مہر پہلے دے دیا کرتے تھے ۔ پس خاوند کا عفو کرنا یہ ہوگا کہ وہ باقی نصف واپس نہ لے ۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یہ ہوئے کہ طلاق دیتے وقت یا تو کچھ بڑھا کر [illegible] یا یہ کہ آدھا جو تم دے چکے ہو وہ بھی واپس نہ لو ۔ اور پہلے لوگ یہ دونوں معنے مراد لیتے آئے ہیں ۔ چنانچہ قاضی شریح کہتے ہیں اَنَا اَعْفُوْا عَنْ مُهُوْرِ بَنِيْ مُرَّةَ وَاِنْ كَرِهْنَ کہ میں اپنی قوم بنی مرہ کی عورتوں کا مہر معاف کر دونگا ۔ اگرچہ وہ ناپسند ہی کرتی رہیں ۔ (بحر محیط جلد ۲ صفحہ ۲۳۶) دراصل یہاں عورت کی کراہت یا عدم کراہت کا کوئی سوال نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر عورت اس قابل نہ ہو کہ معاف کر سکے ۔ مثلاً ایسی بالغ نہ ہو جس کو مال پر تصرف حاصل ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اگر ولی عفو کا اعلان کر دے تو یہ عورت کا ہی اعلان سمجھا جائیگا ۔ اس کے متعلق عورت سے الگ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی ۔

اسی طرح جبیر بن مطعم ایک صحابی ہیں ۔ اُن کا ایک عورت سے نکاح ہوا جب انہوں نے اسے طلاق دی تو جو کچھ مہر تھا اُسے دے دیا اور پھر اس سے بھی زیادہ دیا ۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۹﴾

تم (تمام) نمازوں کا اور (خصوصاً) درمیانی نماز کا پورا خیال رکھو۔ اور اللہ کے لئے فرمانبردار ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔ ۱۵۰ـــہ

اور کہا اَنَا اَحَقُّ بِالْعَفْوِ کہ میں عفو کرنے کا زیادہ حقدار ہوں گویا زیادہ دینے کو انہوں نے عفو قرار دیا۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى میں مرد عورت ولی سب مراد ہیں۔ اور یہ قاعدہ بتایا گیا ہے کہ ایسے موقعوں پر اپنا حق چھوڑنا بہ نسبت اپنا حق طلب کرنے کے زیادہ افضل ہوتا ہے۔ اور تقویٰ کا یہی تقاضا ہوتا ہے۔ مگر افسوس ہے، کہ لوگ اس کا خیال نہیں رکھتے اور ہمیشہ اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کرتے اور اس پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ دوسرے پر احسان کرنے کی طرف اپنا قدم نہیں بڑھاتے حالانکہ اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرماتا ہے کہ تمہارا معاف کر دینا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے یعنی عورت یہ خیال کرے کہ میں اپنے خاوند کے ہاں آباد تو ہوئی نہیں۔ اگر اسے مہر معاف کر دوں تو کیا حرج ہے۔ اسی طرح مرد یہ خیال کرے کہ گو یہ عورت میرے ہاں آباد نہیں ہوئی لیکن میری طرف منسوب تو ہوئی ہے اس لئے میں ہی کچھ زیادہ دے دوں۔ اسی طرح ولی کو چاہیئے کہ وہ ایسے رنگ میں فیصلہ کرائے کہ کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں نسیان کے معنے بھولنے کے نہیں بلکہ چھوڑنے کے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ آیت ۶۷) انہوں نے اللہ کو چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کو ترک کر دیا۔ اور فضل سے مراد ایسا فعل ہے جس سے انسان دوسرے پر فضیلت حاصل کرلے۔ پس لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں اللہ تعالیٰ نے یہ نصیحت فرمائی ہے کہ آپس میں معاملہ کرتے وقت تم میں سے ہر فرد کو ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ نیکی اور احسان اور مروّت میں ایک دوسرے پر فضیلت لے جائے اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔ وہ تمہاری نیکی ضائع نہیں کرے گا بلکہ تمہیں اس کا اچھے سے اچھا بدلہ دیگا۔ پس چاہیئے کہ تم ان احکام کو ملحوظ رکھو اور ان پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرو۔

۱۵۰ـــہ حل لغات: اَلْقُنُوْتُ کے معنے ہیں اَلطَّاعَةُ اطاعت۔ اَلْقِيَامُ فِي الصَّلٰوةِ نماز کے لئے کھڑا ہونا۔ اَلدُّعَاءُ دُعا۔ اَلْخُشُوْعُ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ وَسُكُوْنُ الْاَطْرَافِ وَتَرْكُ الْاِلْتِفَاتِ مِنْ هَيْبَةِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کامل عجز و انکسار اور ادب اور سکون اور ماسوی اللہ کو بھلا کر کام کرنا۔ (اقرب)

تفسیر: شادی بیاہ کے ذکر کے سلسلہ میں اب اللہ تعالیٰ نمازوں کا ذکر فرماتا ہے۔ کیونکہ بالعموم شادی کی وجہ سے لوگ نمازوں میں بہت کچھ سست ہو جاتے ہیں وہ اول تو رات کو زیادہ دیر بیدار رہتے ہیں جس کی وجہ سے تہجد اور فجر کی باجماعت نماز میں ان سے غفلت ہو جاتی ہے اور پھر دن کو بھی گھریلو مصروفیات انہیں نمازوں کی طرف توجہ کرنے نہیں دیتیں۔ پس چونکہ شادی کے سلسلہ میں عبادت میں بہت کچھ نقص واقع ہو جاتا ہے کیونکہ انسان کے مشاغل بڑھ جاتے ہیں کیا بلحاظ آپس کے تعلقات کے اور کیا بلحاظ بچوں کی دیکھ بھال کے اور کیا بلحاظ سامانِ خورد و نوش وغیرہ مہیا کرنے کے اسی طرح طہارت کے نقائص بھی پیدا ہو جاتے ہیں اس لئے فرمایا کہ تمہاری گھریلو مصروفیات بے شک بڑھ جائیں

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

اور اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل یا سوار ہونے کی حالت میں (ہی نماز پڑھ لو) پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو اللہ کو یاد کرو

تمہیں مزدوری کمانے کے لئے پہلے سے زیادہ تگ و دو کرنی پڑے گی اور تمہاری توجہ میں یکسوئی نہیں رہے گی۔ مگر دیکھنا تم نمازوں میں سستی نہ کرنا خصوصاً نماز وسطیٰ کا ہمیشہ خیال رکھنا۔

یہ نماز وسطیٰ کونسی ہے اس کے متعلق لوگوں میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ (۱) بعض نے اسے تہجد کی نماز قرار دیا ہے۔ اور میرا خیال بھی نماز تہجد کی طرف ہی جاتا ہے۔ جو شام اور صبح کے درمیان آتی ہے (۲) بعض کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے وہ نماز مراد ہے جو کام کے درمیان آجائے۔

اس کے علاوہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عصر کی نماز کو بھی صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ترمذی اور بخاری میں سمرۃؓ سے روایت آتی ہے کہ جنگِ احزاب میں جب کفار نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو عصر کی نماز سے روکا تو آپ نے فرمایا۔ خدا ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھرے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے روک دیا ہے۔ (بخاری کتاب تفسیر القرآن) مگر میرے نزدیک ان حدیثوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے وہی نماز مراد ہے جو کام کے درمیان آجائے کیونکہ جنگِ احزاب میں بھی عصر کی نماز دوران جنگ میں آگئی تھی۔ اور ممکن ہے اسی وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صلوٰۃ وسطیٰ قرار دیا ہو۔

وسطیٰ کے معنے افضل و اعلیٰ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے جس نماز کو انسان زیادہ مشاغل ترک کرکے پڑھے وہی نماز اس کے لئے صلوٰۃ وسطیٰ ہوگی اور اس کے لئے زیادہ برکات اور انوار کی حامل ہوگی۔ اس مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے اوپر کے معنوں کی تائید ہوتی ہے۔

میرے نزدیک حَافِظُوْا میں ایک اور امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ حَافِظُوْا باب مفاعلہ سے ہے جس میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ پس اس میں خدا تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اب نکاح کے بعد تم آپس میں میاں بیوی بن گئے ہو۔ تم دونوں مل کر نمازوں کے متعلق ایک دوسرے کی نگرانی کرو خصوصاً نماز وسطیٰ یعنی تہجد کے متعلق۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ اگر تہجد کی نماز کے لئے خاوند کی آنکھ کھلے تو وہ بیوی کو جگا دے اور اگر وہ نہ اُٹھے تو پانی کا ایک ہلکا سا چھینٹا اس کے منہ پر مارے۔ اور اگر بیوی کی آنکھ کھلے تو وہ میاں کو جگا دے اور اگر وہ نہ اُٹھے تو وہ بھی پانی کا ایک ہلکا سا چھینٹا اس کے منہ پر مارے۔ جب تہجد کی نماز کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر تاکید فرمائی ہے تو اور نمازوں کی نگہداشت کا حکم خود بخود واضح ہو گیا۔ پس گو محافظت کے معنے عام طور پر نگرانی کے ہوتے ہیں مگر در اصل اس میں وہ خاصہ ملحوظ ہے جو باب مفاعلہ کا ہے اور جس کی رُو سے اس کا یہ مطلب ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی نگرانی کریں۔ اور عبادت میں ایک دوسرے کے لئے ترقی کا موجب بنیں۔

قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ کے معنے یہ ہیں کہ نماز میں تمہارا خیال کسی اور طرف نہ ہو بلکہ پورے خلوص اور اطاعت اور تبتّل تام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے صحابہؓ بعض دفعہ نماز میں آپس میں بات چیت بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر پھر اس

كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۴۰﴾ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ

کیونکہ اُس نے تمہیں (وہ کچھ) سکھایا ہے جو تم (پہلے) نہ جانتے تھے۔ ۳۵۱ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں

مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ

اور بیویاں چھوڑ جائیں وہ اپنی بیویوں کے حق میں ایک سال تک فائدہ پہنچانے یعنی اُنکو

حکم کے نتیجہ میں انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

۳۵۱ تفسیر: ۔ اِس آیت میں نماز کی اہمیت پر زیادہ زور دینے کیلئے فرمایا میاں بیوی کے تعلقات کیا چیز ہیں۔ اگر تمہارے پیچھے تمہیں پکڑنے کیلئے کوئی دشمن آرہا ہو اور تم بھاگ رہے ہو تو خواہ تم سوار ہو یا پیادہ تو بھی تم نماز کو نہ چھوڑ و۔ بلکہ اسی حالت میں ہی پڑھ لو۔ گویا نماز میں غفلت اور سستی کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ حتیٰ کہ سخت خطرہ کی حالت میں بھی جو صلوٰۃ الخوف کے خطرہ سے بھی بڑھ کر ہو جو عین جنگ میں ہوتی ہے تمہارے لئے یہ جائز نہیں کہ تم نماز چھوڑ دو۔ بلکہ جس حالت میں بھی ہو نماز ادا کرو۔ چنانچہ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اُن سے صلوٰۃ خوف کے متعلق سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے اس کا طریق بتایا۔ اور پھر فرمایا کہ اگر اس سے بھی زیادہ خوف کی حالت ہو تو پھر پیدل یا سوار جس حالت میں بھی ہو تم نماز پڑھ لو۔ اور حضرت نافع جو اس کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ بات رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے ہی سُنی ہے (بخاری کتاب تفسیر القرآن) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس آیت میں صلوٰۃ خوف والی حالت سے بھی زیادہ خطرہ والی حالت مراد لی ہے۔ صلوٰۃ خوف میں تو باقاعدہ ایک امام کی اقتداء میں نماز ادا کی جاتی ہے (سورۃ نساء آیت ۱۰۳) مگر یہ حالت ایسی ہے جس میں اتنی مہلت بھی نہ مل سکے اور دوڑتے اور بھاگتے ہوئے

نماز پڑھنی پڑے۔ مثلاً اسلامی فوج کا ایک سپاہی دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لئے گیا تھا۔ اس کا دشمن کو علم ہو گیا۔ وہ گھوڑے کو دوڑاتا ہوا واپس آرہا ہے اور پچاس ساٹھ سپاہی اُس کے تعاقب میں ہیں کہ راستہ میں نماز کا وقت آگیا۔ اب اگر وہ ٹھہر جاتا ہے یا گھوڑے سے اُتر کر نماز پڑھنے لگ جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پکڑا جائیگا اور اسلامی لشکر اُن معلومات سے محروم رہ جائیگا جن کو مہیا کرنے کے لئے اُسے بھجوایا گیا تھا۔ پس چونکہ اس کا جان بچا کر اسلامی لشکر میں پہنچنا ضروری ہے اس لئے اسے اجازت ہوگی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتا چلا جائے جس طرح بیمار آدمی لیٹے لیٹے نماز پڑھ لیتا ہے۔ یا بعض دفعہ اشاروں میں ہی نماز پڑھ لیتا ہے۔ اسی طرح اُسے بھی اجازت ہوگی کہ جس طرح چاہے نماز پڑھ لے۔ مثلاً گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے نماز کے کلمات دہراتا جائے۔ رکوع کا وقت آئے تو ذرا سا سر جھکائے اور ایک دو دفعہ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ کہہ دے۔ ذرا اور سر جھکا دے تو اسے سجدہ سمجھ لے۔ اس طرح جلدی جلدی نماز پڑھ کر فارغ ہو جائے۔ ایسی حالت میں باوجود اس کے کہ اُس کی ایک ٹانگ گھوڑے کے ایک طرف ہوگی اور دوسری ٹانگ دوسری طرف پھر بھی اس کی نماز ہو جائیگی۔ اور اگر اس کا مُنہ قبلہ کی طرف نہیں ہوگا تب بھی نماز ہو جائے گی۔ ہاں اگر موقعہ مل سکے تو نماز شروع کرتے ہوئے قبلہ کی طرف مُنہ کر لیا جائے۔ پھر خواہ کسی طرف مُنہ ہو جائے۔ غرض خوف کے وقت نماز کو اپنی مقررہ شکل سے بدل کر پڑھنا جائز ہے۔

غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا

(مگروہ) یہ نہ نکالنے کی وصیت کرجائیں۔ پھر اگر وہ (خودبخود) چلی جائیں تو وہ اپنے متعلق جو پسندیدہ بات کریں

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۴۱)

اُس کا تمہیں کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔ ۱۵۲

چاہے انسان گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لے۔ چاہے اشارے سے پڑھ لے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص دشمن کے سامنے بندوق تانے کھڑا ہو۔ اور نماز کا وقت آجائے۔ ایسی صورت میں اُس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بندوق بھی سنبھالے رکھے دشمن پر فائر بھی کرتا جائے اور نماز کی عبارتیں بھی دہراتا جائے۔ بلکہ یہ نماز خوف کی حالت میں شہروں میں رہتے ہوئے بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ مثلاً فرض کرو ایک ملک کی دوسرے ملک سے لڑائی ہو جاتی ہے اُس وقت سرحدی شہروں یا دیہات میں رہنے والے جو لوگ ہونگے اُن کے لئے جائز ہوگا کہ اگر زور کا حملہ ہو تو وہ کھڑے کھڑے نماز کی عبارتیں دہراتے جائیں اور ساتھ ہی دشمن پر گولیاں برساتے جائیں۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ ہاں جب خوف کی حالت جاتی رہے اور تم امن میں آجاؤ تو پھر تمہیں اسی طرح نماز پڑھنی چاہیئے جس طرح قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ میں حکم دیا گیا ہے یعنی خاموشی اور بغیر غیر ضروری حرکت کے۔ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ کے معنے ہیں جسطرح اس نے تم کو سکھایا ہے یا اس لئے یاد کرو کہ اس نے تمہیں وہ کچھ سکھایا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔ ان الفاظ میں قرآن کریم نے دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پیش کیا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو وہ روحانی علوم سکھائے گئے ہیں جو اس سے پہلے اور کسی مذہب کی الہامی کتاب نے بیان نہیں کئے۔

۱۵۲ تفسیر:- وَصِيَّةً مصدر ہے اور اس سے پہلے يُوْصُوْنَ محذوف سمجھا جائیگا۔ یعنی وہ وصیت کر جائیں۔ مَتَاعًا دوسرا مصدر ہے اس سے پہلے بھی يُمَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا محذوف ہے۔ اور معنے یہ ہیں کہ اپنے بیویوں کے حق میں وصیت کرجائیں کہ بعد میں وہ لوگ جن کے ہاتھ میں وصیت کا اجراء ہے انہیں ایک سال تک فائدہ پہنچائیں۔ اس کے بعد غَيْرَ اِخْرَاجٍ کے الفاظ ہیں۔ جو بدل ہیں مَتَاعًا کا پس معنے یہ ہوئے کہ فائدہ پہنچانے سے ہماری مراد یہ ہے کہ اُن کو گھروں سے نہ نکالیں۔ بلکہ باوجود اس کے کہ مکان کسی اور وارث کے حصہ میں آیا ہو بیویوں کو ایک سال تک اُس میں رہنے کا حق حاصل ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ عورت خود بھی مکان سے نہیں جاسکتی۔ عورت عدت کے بعد اپنی مرضی سے اور اپنے فائدہ کے لئے جانا چاہے تو جاسکتی ہے۔ سال بھر کی شرط صرف عورت کے آرام اور فائدہ کے لئے لگائی گئی ہے اور اس سے وارثوں کو پابند کیا گیا ہے۔ عورت پر پابندی صرف ایام عدت تک گھر میں رہنے کی ہے بعد میں اس حکم سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا اس کے اختیار میں ہے۔

یہ امر کہ اس ایک سال میں عدت شامل ہے یا نہیں۔ اس بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک جس بات میں عورت کا فائدہ ہو اُسے تسلیم کرنا چاہیئے اور وہ صورت یہی ہے کہ عدت کے بغیر ایک سال تک عورت کو گھر میں رہنے دیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اِس حکم کی

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۲﴾

اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے انہیں بھی (اپنے) حالات کے مطابق کچھ سامان دینا ضروری ہے۔ یہ بات ہم نے) متقیوں پر واجب کر دی ہے۔

۳۱ ع ۱۵

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ ع

اِسی طرح اللہ (تعالیٰ) اپنے احکام تمہارے (فائدہ کے) لئے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ ۱۵۳ ف

پابندی نہ تو مرنے والے کے رشتہ دار کرتے ہیں اور نہ عورتیں۔ اگر تو عورت کے بچے ہوں تو پھر تو رشتہ دار کچھ عرصہ تک صبر کرتے ہیں لیکن اگر بچے نہ ہوں تو چند ماہ کے بعد ہی مرنے والے کے رشتہ دار مکان اور جائداد کی تقسیم کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس مکان میں ایک سال تک عورت کو رہنے دینا ضروری ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت احکام میراث کے ذریعہ منسوخ ہوگئی ہے مگر یہ بالکل غلط ہے۔ بیوہ کا اپنے خاوند کی جائداد میں جو حصہ رکھا گیا ہے اُسکے ساتھ اسکا کوئی تعلق نہیں یہ ایک الگ حکم ہے جس میں جائیداد کے حصہ کے علاوہ عورت کیلئے سال بھر کے نان و نفقہ اور رہائش کا انتظام ضروری قرار دیا گیا ہے۔

فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ میں بتایا کہ ہمارا یہ منشاء نہیں کہ تم ایک سال تک اُنکو پکڑ کر رکھو بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف سے ایک سال کے عرصہ تک انہیں کھلی اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے گھر میں رہیں ہاں اگر وہ سال کے اندر ہی مکان چھوڑ دیں تو تم انہیں جانے دو۔ عدت میں تو خود ان کا نکلنا بھی ممنوع ہے لیکن اس کے بعد اُن کا خود نکلنا گناہ نہیں پس اس آیت کو آیت عدت سے منسوخ سمجھنا بھی غلطی ہے۔ یہ اُن سے نیک سلوک کرنے کا ایک زائد حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ فوراً اُن کا نیا گھر بنانا یا نکاح کرنا مشکل ہوتا ہے چار ماہ دس دن تک تو وہ خود نہیں نکل سکتیں۔ اسکے بعد ایک سال مزید تک اُنکو نکالا نہیں جا سکتا ہاں وہ خود چاہیں تو نکل سکتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے

فعل کو معروف کہا ہے۔

معروف کا لفظ قرآن کریم میں بہت دفعہ آیا ہے۔ یہ عرف سے نکلا ہے اور اس کے معنے ہیں پہچانا ہوا۔ مفردات امام راغب میں لکھا ہے۔ اَلْمَعْرُوْفُ اِسْمٌ لِكُلِّ فِعْلٍ يُعْرَفُ بِالْعَقْلِ وَالشَّرْعِ حُسْنُهٗ یعنی معروف ہر اُس فعل کو کہتے ہیں جس کی خوبی عقل و شرع سے پہچانی جائے۔ پس جب کوئی فعل شرع کے لحاظ سے معروف ہو تو وہ مطابق قانون فعل کہلائیگا۔ اور جب عقل عامہ سے اُس کی خوبی پہچانی جائے تو اُسے مطابق دستور کہیں گے کیونکہ جس امر کی خوبی ہر انسان پہچانتا ہے اس کا رواج بنی نوع انسان میں پایا جاتا ہے اور جب کسی امر کی خوبی کسی خاص فرد کی عقل سے پہچانی جائیگی تو اُسے مناسب حال یا مطابق حال کہیں گے کیونکہ افراد کے ساتھ انہی نیکیوں کا تعلق ہوتا ہے جو خاص اُن کے حالات سے متعلق ہوں۔

پس معروف کے معنے قانون یا قومی رواج کے مطابق کے ہوتے ہیں لیکن اسجگہ اس کے معنے پسندیدہ اور بہتر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ عدت کے بعد عورتیں نکاح کرلیں خواہ اپنے والدین یا دوسرے رشتہ داروں کے ہاں چلی جائیں یا کوئی ملازمت اختیار کرلیں تم پر کوئی اعتراض نہیں۔ تمہیں اس حکم کی رُو سے یہ نہیں چاہیئے کہ انہیں روکو۔

۱۵۳ ف تفسیر:۔ طلاق کے مضمون کو ختم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مطلقات سے حسن سلوک کے حکم کو پھر دہرایا ہے۔ چونکہ عام طور پر مطلقات سے ناراضگی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ

کیا تجھے اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو موت سے بچنے کے لئے جبکہ وہ ہزاروں (کی تعداد میں) تھے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ

اس پر اللہ نے انہیں کہا کہ تم مر جاؤ۔ اس کے بعد اُس نے انہیں زندہ کر دیا۔ اللہ لوگوں پر یقیناً (بڑا) فضل

عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۴﴾

کرنے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ ۱۵۴

ہوتی ہے اس لئے فرمایا۔ تمہیں اُن سے اچھا سلوک کرنا چاہیئے اور پچھلی آیتوں پر اس کا عطف کر کے یہ بھی بتا دیا کہ مطلّقہ عورتوں کو بھی اگر عرصۂ عدّت سے زیادہ گھر میں رہنے کی ضرورت ہو تو رہنے دیا جائے اور اُن کو بھی اُن کے مناسب حال فائدہ پہنچانا چاہیئے۔ یہ متقیوں پر حق قرار دیا گیا ہے۔ پس مطلّقہ عورت سے بھی بے مروّتی نہیں کرنی چاہیئے اور اُس کو عدّت کے فوراً بعد گھر سے نہیں نکال دینا چاہیئے۔ بلکہ بطریق احسان اُسے موقعہ دینا چاہیئے تاکہ وہ اطمینان سے نقل مکانی کا انتظام کر سکے۔

مسلمانوں پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مطلّقہ عورتوں سے مہر کے علاوہ حسن سلوک کرنے کا بھی ارشاد فرماتا ہے اور مسلمان عورتوں کے مہر تک بھی کھا جاتے ہیں۔ اگر اس حکم پر عمل کیا جائے تو کس قدر فساد اور جھگڑے دُور ہو جائیں۔ اور طلاق جو صرف مجبوری میں حلال ہے اس تلخی کے پیدا کرنے کا موجب نہ ہو جس کا موجب وہ اب ہو رہی ہے۔ بلکہ دونوں فریق محسوس کریں کہ مجبوری سے علیحدگی اختیار کی گئی ہے۔ ورنہ آپس میں کوئی تلخی یا بدمزگی نہیں ہے۔

پھر فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے فائدہ کے لئے اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم خطاؤں اور کمزوریوں سے بچو۔ اٰيَةٌ کے عام معنے علامت کے ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں کہیں خدا تعالیٰ نے اپنی طرف توجہ دلانے والی باتوں کو۔ کہیں ایمان کی طرف راہنمائی کرنے والی باتوں کو۔ کہیں عذاب سے بچانے والی باتوں کو اور کہیں تمدّن کا صحیح راستہ بتلانے والی باتوں کو آیات کہا ہے۔ اسجگہ آیات سے وہ احکام مراد ہیں جو صحیح تمدّن کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ شریعت کے بیان کرنے میں یہ امر ہر جگہ مدّنظر رکھا گیا ہے کہ تمام ضروری امور کے متعلق تعلیم آ جائے اور ایسے رنگ میں بیان کر دی جائے کہ بنی نوع انسان بدیوں اور کمزوریوں سے بچ جائیں جس پر تَعْقِلُوْنَ کا لفظ دلالت کرتا ہے۔

۱۵۴ تفسیر:۔ فرماتا ہے کیا تجھے ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو موت سے بچنے کے لئے اپنے گھروں سے ایسی حالت میں نکلے تھے جبکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ اگر تم موت سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم مر جاؤ۔ چنانچہ اُس موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر انہیں زندہ کر دیا۔

یہ لوگ کون تھے جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر کی وجہ سے نکلے اور جن کو خدا تعالیٰ نے کہا کہ مر جاؤ؟ اور پھر یہ کون لوگ تھے جنہیں موت کے بعد اللہ تعالیٰ نے

حیات عطا فرمائی۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ بنی اسرائیل تھے جو موت کے ڈر کی وجہ سے ملک مصر سے نکلے تھے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس آیت میں جتنی باتیں بیان کی ہیں وہ سب کی سب بنی اسرائیل کے واقعات میں دکھائی دیتی ہیں۔ موت کے ڈر کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے کہ وَاِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ (بقرہ آیت ۵۰) یعنی اُس وقت کو یاد کرو جبکہ ہم نے تم کو فرعون کی قوم سے اس حالت میں نجات دی کہ وہ تمہیں بدترین عذاب دے رہی تھی۔ وہ تمہارے لڑکوں کو قتل کر دیتی تھی اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتی تھی۔ اور گھروں سے نکلنے کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ کہ:۔ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ۔ (شعراء آیت ۵۳) یعنی ہم نے موسیٰؑ کی طرف وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات نکال کر لے جا۔ اور میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ تمہارا پیچھا کیا جائیگا۔

وَھُمْ اُلُوْفٌ والی علامت بھی بنی اسرائیل پر ہی چسپاں ہوتی ہے۔ کیونکہ جب وہ مصر سے نکلے تو اُس وقت وہ صرف چند ہزار ہی تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پیدائش باب ۴۶ آیت ۲۷ میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں آئے تو صرف ۷۰ تھے۔ لیکن تورات ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ۲۱۵ سال کے بعد موسیٰ کے زمانہ میں ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ عورتوں اور بچوں کو نکال کر چھ لاکھ کے قریب پہنچ گئے۔ چنانچہ خروج باب ۱۲ آیت ۳۷ میں لکھا ہے:۔

"اور بنی اسرائیل نے رعمسیس سے سکات تک پیدل سفر کیا۔ اور بال بچوں کو چھوڑ کر وہ کوئی چھ لاکھ مرد تھے۔"

اسی طرح گنتی باب ۱ آیت ۴۶ میں اُن کی تعداد چھ لاکھ تین ہزار پانچ سو پچاس بتائی گئی ہے۔ اگر مردوں کی تعداد کو ملحوظ رکھ کر عورتوں اور بچوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل تعداد ۲۵ لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے مگر ۲۱۵ سال کے عرصہ میں ستر آدمیوں کا ۲۵ لاکھ تک پہنچ جانا بالکل عقل کے خلاف بات ہے اور پھر واقعہ کے بھی خلاف ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب مصر سے کنعان کی طرف ہجرت کی تو وہ چالیس سال تک جنگلوں میں رہے تو کیا پچیس لاکھ آدمیوں کی روٹی کا انتظام چالیس سال تک اُن جنگلوں میں ہو سکتا تھا۔ بے شک بائیبل میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے لئے آسمان سے بٹیر اتارے اور زمین میں ترنجبین پیدا کر دی۔ لیکن بائیبل کے بیان کے مطابق یہ خوراک سارے عرصہ کیلئے مہیا نہیں ہوئی تھی۔ پھر دوسرے عرصہ میں اتنے آدمیوں کے لئے خوراک کہاں سے لاتے تھے۔ پھر بائیبل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایک چشمہ سے پانی بھی پی لیتے تھے۔ اب کیا کوئی عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک ایک چشمہ سے پچیس لاکھ آدمی سیراب ہو سکتا ہے؟

دراصل اس بیان میں سخت مبالغہ سے کام لیا گیا ہے حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل جو فرعون کے ظلم سے ڈر کر بھاگے تھے اُن کی تعداد صرف چند ہزار تھی۔ وہ پچیس لاکھ یہودی فلسطین کے چھوٹے چھوٹے قبائل سے ڈر کس طرح سکتے تھے۔ فلسطین کی آبادی تو اپنی شان و شوکت کے زمانہ میں بھی ۲۵-۳۰ لاکھ سے زیادہ نہیں بڑھی بلکہ اس زمانہ میں بھی تقسیم سے پہلے اُس کی آبادی اٹھارہ لاکھ کے قریب تھی۔ پُرانے زمانہ میں جبکہ خوراک ادھر اُدھر پہنچانے کے سامان مفقود تھے غیر زرعی علاقوں میں بڑی آبادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پس موسیٰؑ کے وقت میں یقیناً سارے فلسطین کی آبادی چند ہزار افراد پر مشتمل ہوگی۔ چنانچہ بنی اسرائیل اور اُن کے دشمنوں کی لڑائیوں میں ہمیشہ سینکڑوں اور ہزاروں افراد کا ہی پتہ لگتا ہے۔ اگر موسیٰؑ کے ساتھ ۲۵ لاکھ آدمی فلسطین میں آئے تھے تو سفر

کا زمانہ تو الگ رہا حکومت کے زمانہ میں بھی ان کی خوراک کا انتظام نہ ہو سکتا تھا اور لڑائی کا تو ذکر ہی کیا ہے یہ لوگ تو اپنے کندھوں کے دھکوں سے ہی ان چند ہزار افراد سے فلسطین کو خالی کرا سکتے تھے جو اُن سے پہلے وہاں بس رہے تھے۔ پس وَهُمْ اُلُوْفٌ میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بنی اسرائیل ہی ہیں[1]۔

چوتھی بات اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ تم مر جاؤ۔ اس امر کا ذکر بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (مائدہ آیت ۲۷) یعنی جب موسیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے بنی اسرائیل نے لڑائی کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہیں اب اس ملک سے چالیس سال کے لئے محروم کر دیا گیا ہے۔ وہ زمین میں سرگردان پھرتے رہیں گے پس تو باغی لوگوں پر افسوس نہ کر۔

پانچویں بات یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں موت کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (بقرۃ آیت ۵۶، ۵۷) یعنی اُس وقت کو بھی یاد کرو جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ! ہم تیری بات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک ہم اللہ تعالیٰ کو آمنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ اس پر تمہیں ایک مہلک عذاب نے پکڑ لیا اور تم اپنی آنکھ سے اپنے فعل کا انجام دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہاری ہلاکت کے بعد تمہیں اس لئے اٹھایا کہ تم شکر گزار ہو۔

میرے نزدیک اس آیت میں نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً سے مراد اُن کا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ آیت ۲۵) والا جملہ ہے۔ اس کے بعد انہیں چالیس سال کی سزا ملی۔ جو صاعقہ تھی۔ غرض اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ سے مراد بنی اسرائیل ہی ہیں جو فرعون کے متواتر مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ اُن کے لڑکے مارے جاتے تھے اور قومی زندگی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو ملک مصر سے بچا کر لایا۔ اور اُس نے فلسطین کا اُن سے وعدہ کیا۔ اور حکم دیا کہ دشمن سے لڑو اور فتح حاصل کرلو۔ مگر وہ اپنی نادانی سے کہہ اُٹھے کہ یٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (مائدہ آیت ۲۵) یعنی اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ اس میں موجود ہیں ہم اُس سرزمین میں کبھی داخل نہیں ہونگے۔ اس لئے تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور اُن سے جنگ کرو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر موت نازل کی۔ یعنی وہ چالیس سال تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد رہے۔ اس کے بعد اُن کی اگلی نسل جب جوان ہوئی اور اُس نے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت قربانیوں سے کام لیا تو خدا تعالیٰ نے انکو زندہ کر دیا۔ یعنی کنعان کے دروازے اُن کے لئے کھل گئے اور حکومت پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ اسی کی طرف ثُمَّ اَحْيَاهُمْ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اسی کی طرف ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ میں اشارہ تھا۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ جب وہ اپنے گھروں سے موت کے خوف سے نکلے اور انہوں نے چاہا کہ وہ زندگی

---

[1] مزید تفصیل کیلئے دیکھیں تفسیر کبیر سورۃ مریم تا انبیاء صفحہ ۲۴۲ تا صفحہ ۲۵۰

حاصل کریں تو اُن کی اِس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں جو تدبیر بتائی وہ یہ تھی کہ تم اپنے لئے موت اختیار کرو - ایک ایسی قوم جو موت سے بچنے کے لئے گھروں سے نکلی تھی - اُسے قدرتی طور پر یہ علاج بہت عجیب نظر آیا - وہ لوگ جنہوں نے اپنا وطن خواہ وہ اختیار کردہ ہی ہو - املاک خواہ تھوڑے ہی ہوں - اپنی عزت یا رتبہ خواہ قلیل ہی ہو - اپنے جلیس اور ہم صحبت دوست اور وہ ملک جس کی وہ زبان سمجھتے تھے صرف اسلئے کہ انہیں زندگی ملے اور وہ موت سے بچ سکیں کُلّی طور پر چھوڑ دیا - وہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے ماتحت ایک ایسے ملک کی طرف چلے گئے جہاں کی زبان وہ نہیں جانتے تھے جہاں اُنکی کوئی جائیداد نہیں تھی - جہاں کے لوگ اُن کی دیانت سے اور یہ لوگ انکی دیانت سے واقف نہ تھے - جہاں کے لوگوں کی نگاہ میں اُن کے چھوٹے بڑے میں کوئی تمیز نہ تھی - یہ قربانی کوئی معمولی قربانی نہ تھی - یہ قربانی صرف اس لئے کی گئی تھی کہ انہیں جان بہت پیاری تھی ورنہ وہ اس ملک کو چھوڑتے ہی کیوں - مگر جب وہ وہاں پہنچے تو خدا تعالیٰ سے انہوں نے سوال کیا کہ وہ زندگی کہاں ہے جس کا ہمیں وعدہ دیا گیا تھا - اللہ تعالیٰ نے فرمایا - تم موت قبول کرو - پھر زندہ ہو جاؤ گے - لوگ حیران ہوئے کہ یہ ہمیں کیا کہا جا رہا ہے - کیونکہ جو پیالہ فرعون انہیں پلا رہا تھا - وہی اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا - فرعون نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ مر جائیں مگر انہوں نے کہا ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور ہم خدا تعالیٰ سے فریاد کرینگے لیکن جب انہوں نے خدا تعالیٰ سے فریاد کی تو وہاں سے بھی اُن کو یہی جواب ملا کہ مر جاؤ - انہیں دونوں جگہوں سے موت ہی کا پیالہ ملا - وہ حیران تھے کہ فرعون کو دوست سمجھیں یا خدا تعالیٰ کو دشمن - فرعون انہیں زندہ کرنا چاہتا تھا یا خدا تعالیٰ انہیں مارنا چاہتا ہے - کیونکہ دونوں پیالوں پر موت لکھی ہوئی تھی - وہ گھبرائے - اُن میں سے کمزور دل نے کہا کہ ہم تو موت سے بچنے کے لئے آئے تھے - اگر یہی پیالہ ہمیں پینا ہوتا تو وہیں کیوں نہ پی لیتے اتنی تکالیف برداشت کرنے کی کیا ضرورت تھی - ہم اس پیالہ کو پینے کیلئے تیار نہیں - ہم سے دھوکا کیا گیا ہے - اگر موت ہی ہمیں ملنی تھی تو کیوں ہم سے زندگی کا وعدہ کیا گیا تھا - اتنی اُمیدیں دلانے کے بعد ہمیں قوم میں کیوں شرمندہ کرایا - وہ ہنسیں گے کہ بیوقوف موت سے بھاگے تھے وہاں بھی موت ہی نصیب ہوئی - وہ اس مشکل کو حل نہ کر سکے سوائے اِس کے کہ اُن میں سے کمزوروں نے کہا کہ ہم یہ پیالہ پینے کے لئے تیار نہیں - عزت کی زندگی جس کا ہم سے وعدہ تھا وہ ہمیں دو - یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی - فرعون انہیں تباہ کرنا چاہتا تھا - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے کہا - تمہارے سب لڑکے مارے جائیں گے اور لازماً لڑکیاں غیروں سے بیاہی جائیں گی اور تمہاری نسل مٹ جائیگی اور غیروں کی نسل جاری ہو جائیگی - تم اس موت سے بچو - اور ذلت کی زندگی برداشت نہ کرو - خدا تعالیٰ نے بتایا ہے کہ حیات کا پیالہ تمہارے لئے کنعان کی سرزمین میں تیار ہے - چنانچہ انہوں نے گھر بار چھوڑا - مال جو اٹھایا نہ گیا وہیں چھوڑا عزت سے ہاتھ دھوئے - ایک باقاعدہ حکومت کا آرام کھویا - وہ نکلے اور چل پڑے -

خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَھُمْ اُلُوْفٌ وہ چند ہزار تھے جو اپنے گھروں سے نکلے - اُن میں بہت سی عورتیں اور بچے بھی ہونگے - عام طور پر صرف پانچواں حصہ بالغ مرد ہوتے ہیں - پھر اُن میں کچھ بوڑھے بھی ہونگے - متمدن اقوام میں چھ فیصدی مرد جنگ کے قابل ہوتے ہیں - اور غیر متمدن قوموں میں سولہ فیصدی - اگر وہ پچاس ہزار بھی ہوں تو اُن میں سے زیادہ سے زیادہ آٹھ ہزار لڑائی کے قابل مرد ہونگے - اور وہ بھی ناتجربہ کار -

پتھیرے بھلا کیا جانیں کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا لاؤ ملک جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس پر ایک زبردست قوم کے لوگ جن کے چہرے خون سے بھرے ہوئے تھے۔ انہیں اگر دائیں طرف عرب کے جنگجوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تو بائیں طرف یونانیوں سے۔ تہذیب کے گہوارہ میں پلی ہوئی تین قومیں یونانیوں ایرانیوں اور مصریوں سے انہیں واسطہ پڑتا۔ وہ تینوں کے طریق کار سے واقف تھے۔ وہ خود بھی مہذب اور بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے قریباً دس گنا تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جنگجو اور خونخوار قوم دکھا کر کہا کہ اس قوم کو مارو۔ پھر حکومت تمہارے ہاتھ آجائیگی۔ بنی اسرائیل پر حیرت کا اظہار کرنا آسان ہے لیکن ذرا سوچو۔ تمہارا ایک دوست تمہاری دعوت کرے۔ وقت مقررہ پر وہ تمہیں بلا کر لے جائے۔ اور جب وہ بازار میں پہنچے تو ایک بڑے ہوٹل میں چلا جائے جہاں ہر ایک چیز پانچ چھ گنا قیمت پر ملتی ہو اور کہے کہ یہ ہوٹل ہے اس میں آپ آٹھ دس روپے خرچ کر کے کھانا کھا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک ایسا مکان بھی ہے جہاں سے کھانوں کی خوشبو آرہی ہے آپ اس کے اندر گھس جائیں مالک مکان کا سر لٹھ سے پھوڑ دیں اور کھانا لے لیں۔ اس جواب کو سنکر تمہاری کیا حالت ہوگی۔ تم اس کو ذلیل کرنے والا تمسخر خیال کرو گے اور اس دوست سے ناراض ہو جاؤ گے۔ شاید تم میں سے جوشیلے ایسے دوست پر چڑھ ہی کر بیٹھیں۔ یہی حالت یہاں ہوئی سینکڑوں میل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس وعدہ پر کہ وہاں انہیں بادشاہت ملے گی لائے۔ مگر وہاں پہنچکر انہیں کہہ دیا کہ کنعان پر قابض قوم کو مار دو اور اُن سے حکومت چھین لو۔ اُس جہالت کو دیکھ کر جو بنی اسرائیل میں اُس وقت پھیلی ہوئی تھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس جواب پر سر پیٹ لیا ہوگا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھتے ہونگے کہ تم نے وعدے کیا کئے تھے۔ اور اب کہہ کیا رہے ہو۔ وہ کہتے ہونگے کہ وہیں ہمیں کیوں نہ کہہ دیا کہ فرعون کا سر اڑا دو اور اس سے حکومت چھین لو وہاں پر تو ہم یہ کر بھی سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارے آدمی فرعون کے گھروں میں کام کرتے تھے۔ وزراء ہمارے واقف تھے اور کئی سہولتیں ہمیں میسر تھیں۔ لیکن یہاں پر زبان اور ہے اس لئے ہم جاسوسی بھی تو نہیں کر سکتے۔ وہ ذرائع ہمیں یہاں میسر نہیں ان لوگوں کو مارنا بھلا کونسا آسان کام تھا کہ تم ہمیں وہاں سے نکال لائے اور یہاں آکر کہہ دیا کہ ان کو مارو۔ اور ملک پر قبضہ کر لو۔ یہ خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا۔ لیکن خدا تعالیٰ انہیں نظر نہ آتا تھا۔ ورنہ وہ اُس سے ہی جھگڑا کرتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں نظر آتے تھے اس لئے اُنہی کو وہ مخاطب کرتے تھے اور بظاہر حالات انہوں نے شرافت سے ہی کام لیا۔ ورنہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حملہ آور ہوتے کہ تم نے ہمارے ساتھ نعوذ باللہ دھوکا کیا ہے۔ بائیبل میں آتا ہے کہ وہ رو دیئے پیٹے اور بچوں کی طرح روٹھ گئے۔

قرآن کریم فرماتا ہے۔ انہوں نے کہا۔ اے موسیٰ!
اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔
(مائدہ آیت ۲۵) ہمارے مد مقابل ایک تجربہ کار اور جنگجو قوم ہے۔ اُن کے پاس اسلحہ بھی ہم سے زیادہ ہے وہ اپنے وطن میں ہیں اور راستوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا تعاقب کیسے کریں وہ محفوظ قلعوں میں ہیں اور ہم جنگلوں میں۔ تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں بادشاہت دو گے اس لئے ہم تو ہاتھ نہیں اٹھائیں گے اور یہیں بیٹھے رہیں گے۔ تم اور تمہارا خدا جاؤ اور ملک فتح کر کے ہمیں دے دو۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے جو وعدہ کیا تھا اُسے انہوں نے لفظاً پورا نہیں کیا۔

لیکن جب ہم اس واقعہ کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اس کی شکل ہی بدل جاتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ کی فتح پر انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا اے انصار! کیا تم نے یہ کہا ہے کہ خون تو ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے اور مال غنیمت مہاجرین میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا حضور ہم میں سے ایک نوجوان نے نادانی سے ایسا کہہ دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہم نے بے در پایا۔ ہم نے اُسے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اُس کے بھائی اُس کے خون کے پیاسے تھے۔ ہم اس کے آگے پیچھے لڑے۔ دنیا میں اُس کی بات کوئی نہ سُنتا تھا ہم نے لوگوں تک اُس کا پیغام پہنچایا۔ پھر جب فتح ہوئی تو اُس نے مال اپنی قوم میں تقسیم کر دیا اور ہمیں کچھ نہ دیا۔ لیکن اگر تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں قرب الٰہی حاصل کرایا۔ تقویٰ جیسی نعمت دی۔ خدا تعالیٰ کی محبت دی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسے فتح دی۔ اور خدائی فوجوں نے مکہ فتح کیا۔ مکہ اُس کا پیدائشی مقام تھا اور مہاجرین کا وطن۔ انہیں توقع تھی کہ مکہ فتح کر کے وہ اپنے گھروں پر قبضہ کر لیں گے مگر مکہ مکرمہ والے تو چند اونٹ لے گئے اور ہم اپنے ساتھ رسول اللہ کو لے آئے۔ یہی دونوں رُخ یہاں ہیں۔

اگر حکومت کے رنگ میں کوئی تغیر خدا تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اور وہ ایسی ہی حکومت پسند کرتا جیسی فرعون کی تھی تو فرعون سے حکومت چھین کر بنی اسرائیل کو کیوں دینا چاہتا۔ خدا تعالیٰ تو ایسی قوم کو بادشاہت دینا چاہتا تھا جو اخلاق کی خوشنما حکومت قائم کرتی۔ خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کو ایسی زندگی نہیں دینا چاہتا تھا جو ختم ہو جاتی۔ ایسی زندگی تو چمار بھی دیتا ہے جبکہ وہ بچہ پیدا کرتا ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ انہیں ایسی زندگی دینا چاہتا تھا جو کوئی اور نہیں دے سکتا تھا۔ خدا تعالیٰ انہیں اخلاق فاضلہ کی ہمیشہ کی زندگی دینا چاہتا تھا جو فرعون انہیں نہیں دے سکتا تھا۔ اور ایسی زندگی بغیر تربیت اور قربانی کی عادت کے انہیں نہیں مل سکتی تھی۔ خدا تعالیٰ انہیں اپنے تازہ نشانوں کے ساتھ زندہ کرنا چاہتا تھا تا اُن میں سے ہر ایک دس دس کے مقابل میں کھڑا ہو۔ پھر خدا تعالیٰ اُن کو فتح دیتا تو وہ ایک زندہ نشان دیکھتے جس سے اُن کی اصلاح ہوتی اور اس طرح اُن کو حقیقی زندگی ملتی۔ گویا پیالے دونوں موت کے تھے۔ لیکن فرعون کے پیالہ میں شربت بھی موت کا تھا اور خدا تعالیٰ کے پیالہ میں زندگی کا۔ یہ فرق تھا جسے وہ سمجھ نہ سکے۔ اگر وہ فرعون کا پیالہ پی لیتے تو ہمیشہ کے لئے انہیں موت ملتی۔ لیکن وہ خدا تعالیٰ کا پیالہ پی لیتے تو وقتی موت ہوتی جس کے بعد ہمیشہ کے لئے انہیں زندگی مل جاتی۔ مگر انہوں نے اس فرق کو نہ سمجھا اور خدا تعالیٰ کا پیش کردہ موت کا پیالہ پینے سے بھی اسی طرح انکار کر دیا جس طرح فرعون کا پیالہ پینے سے انکار کیا تھا۔ تب خدا تعالیٰ نے انہیں فرمایا مُوْتُوْا تم اپنے ہاتھ سے موت لینے سے انکار کرتے ہو اب ہم خود تمہیں موت دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے فرعون کی دی ہوئی موت اور اپنی دی ہوئی موت میں فرق رکھا۔ وہ لوگ گھر سے تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد کر کے ہی نکلے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ عرصہ کی موت کے بعد انہیں پھر زندگی دے دی اور اس طرح اس وعدہ کو پورا کر دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے قومی جدوجہد کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ دُعائے ابراہیمی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار کام بتائے گئے تھے۔ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (بقرۃ آیت ۱۳۰)

اوّل آیاتِ الٰہی سُنانے کا کام ۔ دوم تعلیم کتاب کا کام ۔ سوم
تعلیم حکمت کا کام ۔ چہارم تزکیہ نفوس کا کام ۔ یہ آیت
یُعَلِّمُهُمُ الْحِكْمَةَ کے ماتحت ہے ۔ یہاں قوموں کی ترقی
کے ذرائع بیان کئے گئے ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسجگہ مثال
دے کر بتایا ہے کہ قومیں کس طرح ترقی کیا کرتی ہیں ۔ جب
بھی کسی قوم کو موت کا ڈر ہو تو اُس کا یہی علاج ہے کہ
یا تو وہ اپنے ہاتھ سے موت قبول کرے یا خدا تعالےٰ کے
ہاتھ سے موت قبول کرے ۔ اپنے ہاتھ سے موت قبول
کرنے میں کئی آسانیاں ہوتی ہیں ۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام
فرمایا کرتے تھے کہ جب تم اپنے ہاتھ سے ابتلاء لو تو تم اُسے
کم کرسکتے ہو ۔ جیسے سردی میں وضو کے لئے پانی کی ٹھنڈک
کو تم دُور کرسکتے ہو ۔ اسی طرح جنگ میں تم بخوشی موت
قبول کرتے ہو لیکن تم اس سے بچاؤ کے لئے تلوار ہاتھ میں
پکڑ لیتے ہو اور بدن پر زرہ پہن لیتے ہو تاکہ جہاں تک ہو
سکے موت کے اثر کو کم کردو ۔ اگر تم زخمی ہو تو علاج کرا
سکتے ہو ۔ لیکن خدا تعالیٰ کی دی ہوئی موت سے تم کوئی بچاؤ
نہیں کرسکتے ۔ خدا تعالیٰ کا قانون کام کرتا چلا جاتا ہے اور
وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس طرح تکلیف کم ہوگی یا زیادہ
مثلاً ہیضہ یا طاعون کی وبائیں بلا لحاظ مارتی چلی جاتی ہیں
لیکن تم خود ایک چیز کی تکلیف کو کم کرسکتے ہو ۔ مثلاً کانٹا
چبھ جائے تو تم اسے اپنے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش
کرتے ہو ۔ کیونکہ دوسرے سے تمہیں یہ توقع نہیں ہوسکتی
کہ وہ اس تکلیف کو کم کرنے کی ویسی ہی کوشش کرے گا
جیسی تم کرسکتے ہو ۔ پس جب قوم کی موت آتی ہے تو
اس کا علاج زندہ رہنا نہیں بلکہ موت قبول کرنا ہوتا ہے ۔

دنیا میں تین قسم کی قومیں ہوتی ہیں ۔ ایک تو وہ
جو موت کو خود قبول کرلیتی ہیں اور بعد میں انہیں ہمیشہ کے
لئے زندگی مل جاتی ہے ۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھی تھے ۔ صحابہؓ کے سامنے موت پیش ہوئی اور
انہوں نے اُسے قبول کرلیا ۔ جس کے نتیجہ میں انہیں ہمیشہ
کی زندگی مل گئی ۔ جنگِ بدر کے موقعہ پر تمام صحابہؓ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے تھے ۔ کیونکہ رسول کریم
صلے اللہ علیہ وسلم نے بعض مصالح کی بنا پر انہیں جنگ
کی خبر نہیں دی تھی گو آپ کو اس کا علم تھا ۔ مگر جب
رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جاکر لڑنے
کا ارادہ فرمایا ۔ تو آپؐ نے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا ۔
اور فرمایا ۔ اے لوگو ! مجھے مشورہ دو کہ اب کیا کرنا چاہئیے
اس پر مہاجرین کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ
مشورہ کا کیا سوال ہے ۔ ہم لڑنے کے لئے حاضر ہیں مگر جب
کوئی مہاجر بیٹھ جاتا آپ پھر فرماتے کہ اے لوگو ۔ مجھے
مشورہ دو ۔ جب آپؐ نے بار بار یہ الفاظ دہرائے ۔ تو
انصار سمجھ گئے کہ آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے چنانچہ
ایک انصاری کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ
یا رسول اللہ ! آپؐ کی مراد شاید ہم انصار سے ہے ۔ آپؐ
نے فرمایا ۔ ہاں ۔ اُس نے کہا ۔ یا رسول اللہ ! شاید آپ کا
اشارہ اُس معاہدہ کی طرف ہے جو ہجرت کے وقت ہم نے
آپ سے کیا تھا ۔ کہ مدینہ کے اندر رہ کر تو ہم دشمن کا
مقابلہ کرینگے مگر مدینہ سے باہر آپ کی حفاظت کے ذمہ دار
نہیں ہونگے ۔ آپؐ نے فرمایا ۔ تم ٹھیک سمجھے میرا اشارہ
اسی طرف ہے ۔ اُس نے کہا یا رسول اللہ ! بیشک ہمارا
یہ معاہدہ تھا کہ ہم مدینہ سے باہر نہیں لڑیں گے ۔ لیکن
یا رسول اللہ ! وہ ابتدائی زمانہ تھا ۔ اب خدا کا نور ہم
نے خود اُترتے دیکھ لیا ہے ۔ اب یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ
میدانِ جنگ میں جائیں اور ہم نہ جائیں ۔ ہم اُن انصار کی
طرف سے بھی جو علم نہ ہونے کی وجہ سے مدینہ میں رہ
گئے ہیں حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ بھی یہاں
موجود ہوتے تو ضرور آپ کے ساتھ جنگ میں شامل ہوتے
پھر اُس نے کہا ۔ یا رسول اللہ ! اب معاہدات کا کیا سوال ،

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۵﴾

اور تم اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ بہت سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ ۱۵۵ؔ

آپ ہمیں حکم دیں کہ سمندر میں گھوڑے ڈال دو تو ہم سمندر میں گھوڑے ڈالنے کیلئے بھی تیار ہیں اور اگر لڑائی ہوئی تو یا رسول اللہ ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے اور آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور کوئی شخص آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ ہماری لاشوں کو روندتا ہوا نہ گذرے۔ یہ فقرہ صحابہؓ کو اسقدر پسند تھا کہ ایک صحابی جو چودہ یا اٹھارہ جنگوں میں شریک ہوئے کہا کرتے تھے۔ کہ باوجود اس کے کہ مجھے اتنی جنگوں میں شمولیت کا فخر حاصل ہے میرے نزدیک اُس صحابی کا یہ فقرہ میری ساری لڑائیوں سے بہتر تھا۔ کاش یہ میرے مُنہ سے نکلتا۔

غرض ایک تو یہ قوم تھی جنہوں نے بخوشی موت کو قبول کیا اور اُس کے مطابق اس سے سلوک ہُوا۔ دوسری قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی کا وعدہ کیا۔ اور اُس نے وعدہ کے ایفاء کا لفظاً مطالبہ کیا انہوں نے کہا تم ہم کو زندگی دینے کے وعدہ پر لائے تھے تم نے ہمیں بادشاہت دینے کا وعدہ کیا تھا تم وہ ملک لے کر ہمیں دے دو۔ ہم لڑ کر ملک لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں موت دیدی اور چالیس سال تک اُس ملک سے محروم کر دیا۔ مگر چونکہ زندگی کا وعدہ بھی تھا۔ اس نے پھر زندگی بھی دیدی لیکن اُسوقت جب کہ وہ نسل جس نے خود موت لینے سے انکار کر دیا تھا بیابانوں میں ہلاک ہو چکی تھی۔ خدا تعالیٰ نے اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ کہنے والوں کے بچوں کو جنہوں نے یہ فقرہ نہیں کہا تھا۔ اُٹھایا اور زندگی کا وعدہ اُن کے زمانہ میں پورا کر دیا۔ چنانچہ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ میں اِسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

تیسری قسم کی قوم وہ ہوتی ہے جس سے کوئی وعدہ نہیں ہوتا۔ یہ قوم جب موت کے مونہہ میں آتی ہے تو اُس سے سلوک اُس کی اپنی ہمت کے مطابق ہوتا ہے کبھی اپنی کوشش سے ایسی قوم بچ جاتی ہے اور کبھی ہلاک ہو جاتی ہے۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ایک عجیب نکتہ بتایا ہے کہ غلام قوم اور مغلوب لوگ کبھی زندگی نہیں پا سکتے جب تک کہ پہلے اپنے لئے موت کو اختیار نہ کرلیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ میں بھی یہ بتایا کہ خدا تعالیٰ جو مجاہدات بتاتا ہے وہ قومی ترقی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ مگر لوگ اُن پر شور مچا دیتے ہیں کہ ہم مر گئے۔ بوجھوں میں دب گئے حالانکہ فائدہ اُن کا اپنا ہوتا ہے۔

۱۵۵ؔ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اے اُمّتِ محمدیہ تم اُس قوم کی حالت کو دیکھو جسے موسیٰ علیہ السلام مصر سے اسلئے نکال کر لائے تھے کہ اسے ایک ملک کی حکومت حاصل ہو۔ لیکن جب انہیں اپنے دشمنوں سے جو اُن کے ملک پر قابض تھے لڑنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں اس ملک کی حکومت سے چالیس سال تک کے لئے محروم کر دیا اور وہ جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر مر گئے۔ غرض باوجود اس کے کہ موت اُن کو اپنے گھروں میں بھی آنی تھی انہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں موت کا پیالہ پینے سے انکار کر دیا اور تباہ ہو گئے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں اس قوم کے حالات سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے کبھی انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ جو قوم موت سے ڈرتی ہے وہ دنیا میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتی کیونکہ

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ

کیا کوئی ہے جو اللہ کو (اپنے مال کا) ایک اچھا ٹکڑا کاٹ کر دے تاکہ وہ اُسے اُس کیلئے بہت بہت

لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ؕ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۶﴾

بڑھائے۔ اور اللہ (کی یہی سنت ہے کہ وہ بندہ کا مال) لیتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ اور آخر تمہیں اُسی کی طرف لوٹایا جائیگا۔ ۱۵۶

موت سے ڈرنا ہی اُسے موت کا شکار بنادیتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ میں بتایا کہ بے شک تم کمزور اور بے سروسامان ہو۔ اور تمہارا دشمن بڑا تجربہ کار اور سارے سامان سے مسلح ہے مگر اللہ تعالیٰ سمیع ہے وہ تمہاری دعاؤں کو سُنے گا۔ اور وہ علیم ہے یعنی ان مشکلات کو بھی جانتا ہے جو تمہیں پیش آئیں گی۔ اِس لئے تم اس پر بھروسہ رکھو وہ تمہاری دعاؤں کو سُنیگا اور تمہیں دشمن کے مقابلہ میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائیگا۔

۱۵۶ حل لغات

:۔ یُقْرِضُ: اَقْرَضَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس کے معنے قرض دینے کے بھی ہیں اور کاٹ کر الگ کر دینے کے بھی۔ چنانچہ اَقْرَضَہٗ کے یہ بھی معنے ہیں کہ قَطَعَ لَہٗ قِطْعَۃً اُس کے لئے ایک ٹکڑہ کاٹ کر الگ کردیا۔ اور یہ بھی کہ اَعْطَاہُ قَرْضًا اُسے قرض دیا۔ (اقرب)

لسان العرب میں لکھا ہے۔ اَلْقَرْضُ: اَلْقَطْعُ وَ ھُوَ مَا اَسْلَفَہٗ مِنْ اِحْسَانٍ اَوْ مِنْ اِسَاءَۃٍ یعنی ہر وہ عمل جسے انسان اپنے آگے بھیجے خواہ وہ نیک ہو یا بد اُسے قرض کہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس سے مراد مال ہی ہو۔ چنانچہ اُمیّہ کا شعر ہے ؎

کُلُّ امْرِئٍ سَوْفَ یُجْزٰی قَرْضَہٗ

حَسَنًا اَوْ سَیِّئًا مَدِیْنًا مِثْلَ مَادَانَ

یعنی ہر شخص کو اُس کے قرض کا بدلہ ملیگا خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا اور [illegible] اپنے کئے کی جزا و پائیگا۔

اَلْقَرْضُ کُلُّ اَمْرٍ یُتَجَازٰی بِہٖ مِنَ النَّاسِ۔ ہر ایسا فعل جس کا انسان کو بدلہ دیا جائے قرض کہلاتا ہے قَرَضْتُہٗ کے معنے ہیں جَازَیْتُہٗ۔ میں نے اُسے بدلہ دیا تَقُوْلُ الْعَرَبُ لَکَ عِنْدِیْ قَرْضٌ حَسَنٌ وَ قَرْضٌ سَیِّئٌ۔ عرب کہتے ہیں کہ تیرا میرے ساتھ اچھا معاملہ، میں نے اس کا بدلہ دینا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہتے ہیں کہ تیرا معاملہ میرے ساتھ بُرا ہے میں نے اس کا بدلہ دینا ہے۔ وَاَصْلُ الْقَرْضِ مَا یُعْطِیْہِ الرَّجُلُ اَوْ یَفْعَلُہٗ لِیُجَازٰی عَلَیْہِ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَقْرِضُ مِنْ عَوَزٍ وَلٰکِنَّہٗ یَبْلُوْ عِبَادَہٗ۔ اصل قرض یہ ہے کہ انسان کسی کو کوئی چیز دے یا ایسا کام کرے جس کا اُسے بدلہ دیا جائے۔ کہتے ہیں خدا تعالیٰ عوض کے بدلہ میں نہیں لیتا بلکہ وہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ لبید کہتا ہے ؎

وَاِذَا جُوْزِیْتَ قَرْضًا فَاجْزِہٖ

اِنَّمَا یُجْزَی الْفَتٰی لَیْسَ الْجَمَلُ

کہ جب تجھے قرض دیا جائے تو تُو اس کا بدلہ دے۔ کیونکہ بہادر آدمی ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اونٹ نہیں دیا کرتے۔ یعنی تُو ایسا نہ بن کہ لوگ تجھ سے معاملہ کریں تو تُو ان سے اچھا معاملہ نہ کرے۔

اسی طرح کہتے ہیں۔ اَلْقَرْضُ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی مَنْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا اِسْمٌ لَیْسَ بِمَصْدَرٍ وَلَوْ کَانَ مَصْدَرًا لَکَانَ اِقْرَاضًا وَلٰکِنَّ الْقَرْضَ کُلُّ مَا یُلْتَمَسُ عَلَیْہِ الْجَزَاءُ کہ قرض کا لفظ اس آیت میں

یُقْرِضُ

اسم ہے نہ کہ مصدر۔ اگر مصدر ہوتا تو اِقْرَاض ہونا چاہیئے
تھا۔ مگر یہاں قَرْض ہے جس کے معنے ہیں ہر وہ چیز جس پر
انسان بدلہ چاہے۔

اخفش کہتا ہے۔ يُقْرِضُ اللهَ : يَفْعَلُ فِعْلًا
حَسَنًا فِيْ اِتِّبَاعِ اَمْرِهٖ يُقَالُ لِكُلِّ مَنْ فَعَلَ اِلَيْهِ
خَيْرًا لَقَدْ اَحْسَنْتَ قَرْضِيْ کہ یہ محاورہ ہے کہ جس
آدمی سے اچھا سلوک کیا جائے۔ وہ کہتا ہے تو نے مجھے اچھا
قرض دیا ہے یعنی اچھا معاملہ کیا ہے یا یوں کہتے ہیں کہ
لَقَدْ اَقْرَضْتَنِيْ قَرْضًا حَسَنًا اَيْ اَدَّيْتَ اِلَيَّ خَيْرًا
تو نے مجھے قرضہ حسنہ دیا ہے یعنی میرے ساتھ بڑی نیکی
کی ہے۔ ان معنوں کی رُو سے زیر تفسیر آیت کا مفہوم یہ
ہوگا کہ (۱) کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت
کرے ایسی صورت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اُس کی جزاء
کی امید رکھے (۲) کون ہے جو اپنے مال کا ایک حصّہ کاٹ کر
اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے۔ گویا دونوں معنوں کی رُو
سے غرض یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ کی اتباع کرے اور اپنے
مال کا ایک حصّہ کاٹ کر اس کی راہ میں خرچ کرے۔

اَضْعَاف

اَضْعَافٌ: ضِعْفٌ کی جمع ہے۔ اور ضِعْفٌ
کے معنے عربی زبان میں کئی ہیں۔ (۱) محض بڑھا دینا (۲)
جتنی چیز ہو اتنی ہی اور بڑھا دینا یعنی دوگنا کر دینا۔
(۳) کہتے ہیں کہ یہ کم از کم افزائش ہے بڑی حد مقرر نہیں
کی جا سکتی خواہ اُسے کروڑ گنا بڑھا دیا جائے۔ کروڑ گنا
بھی اضعاف میں داخل ہے۔ یہ جملہ ہے تو سوالیہ مگر
تحریض کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کی اصل عبارت یوں ہوگی
اَيُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا فَيُضَاعِفَهٗ لَهٗ یا هَلْ مِنْ
مُقْرِضٍ فَيُضَاعِفَهٗ۔

تفسیر:۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے
اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ تم میں سے کون ہے جو اپنے
مال کا ایک عمدہ حصّہ کاٹ کر اللہ تعالیٰ کو دیدے
تاکہ وہ اُسے خود دینے والے کے فائدہ کے لئے بڑھائے
اور اُسے ترقی دیتا چلا جائے۔ اس آیت میں نہایت
لطیف پیرایہ میں مومنوں کو خدا تعالیٰ کے لئے اپنے
اموال خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے
کہ اول تو ہم تم سے سارا مال نہیں مانگتے بلکہ اس کا صرف
ایک حصہ مانگتے ہیں۔ اور پھر مانگتے بھی اس لئے ہیں کہ تم ایک روپیہ
دو تو تمہیں اس کا دس گنا اجر دیا جائے خدا تعالیٰ کی محبت
اور اُس کی رضا حاصل کرنیکا اس سے زیادہ سہل اور آسان طریق
اور کیا ہو سکتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان جب خدا تعالیٰ کے
لئے اپنا مال خرچ کرے تو اسے تین باتیں خاص طور پر ملحوظ
رکھنی چاہئیں۔ اول اُس کے دل میں صدقہ و خیرات کرتے
وقت کوئی انقباض پیدا نہ ہو۔ بلکہ وہ پوری بشاشت
اور خوش دلی کے ساتھ اُس میں حصّہ لے۔ دوم جسے
کوئی چیز دی جائے اُس پر احسان نہ جتایا جائے اور
نہ اس کے نتیجہ میں اس پر کوئی ناواجب بوجھ ڈالا جائے
بلکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس نیکی کی توفیق
دے کر درحقیقت مجھ پر احسان کیا ہے۔ سوم۔ جو چیز
دی جائے وہ اپنے مال کا بہترین حصّہ ہو۔ یہ تینوں
امور مندرجہ ذیل آیتوں سے مستنبط ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ منافقوں کے متعلق فرماتا ہے :۔ وَلَا
يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (توبہ آیت ۵۴)
وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں کراہت اور ناپسندیدگی کے
ساتھ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے :۔
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ
لَا يُتْبِعُوْنَ مَا اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى (بقرہ آیت ۲۶۳)
مومن وہ ہیں جو اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ
کرنے کے بعد نہ تو کسی رنگ میں دوسروں پر احسان جتلاتے
ہیں اور نہ انہیں کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں۔ پھر

فرماتا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (آل عمران آیت ۹۳) تم کامل نیکی کا مقام ہرگز نہیں پا سکتے۔ جب تک کہ تم اپنی پسندیدہ اشیاء میں سے خرچ نہ کرو۔

پس مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم میں سے کوئی ہے جو اپنے مال کا اچھے سے اچھا ٹکڑا الگ کرکے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے جس کے دیتے وقت نہ تو اس کے دل میں انقباض پیدا ہو اور نہ اس کے بعد دوسروں پر احسان جتلائے یا اُن کے لئے کسی قسم کی تکلیف کا موجب بنے۔ اور یقیناً یاد رکھو کہ جو لوگ ایسا کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں اس نیکی کا بہتر سے بہتر اجر عنایت فرمائیگا۔ اور اُن کا ایک ایک عمل اُن کے لئے ہزاروں گنا برکات کا موجب ہوگا۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا، بظاہر تو ایک سوال ہے مگر اس کی غرض لوگوں کو تحریص و ترغیب دلانا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ کیا کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرے اور خدا تعالیٰ اُس کے مال کو بڑھائے اور اُسے اپنے قرب میں جگہ دے۔

اس آیت کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندوں کو قرضِ حسنہ دیا کرو۔ یعنی اس کے بندوں سے حُسنِ سلوک کرو اور جو غریب ہیں اُن کی مدد کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو کسی نے نہیں دینا بندوں ہی کو دینا ہوتا ہے بعض دفعہ بندوں کو دینے کا نام بھی خدا تعالیٰ کو دینا رکھا جاتا ہے۔ جیسے حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ بعض لوگوں سے کہیگا کہ اے ابن آدم مَیں بیمار ہوا لیکن تُو نے میری عیادت نہ کی۔ مَیں بھوکا رہا اور مَیں نے کھانا بھی مانگا مگر تُو نے مجھے کھانا نہ کھلایا مَیں پیاسا رہا اور تجھ سے پانی بھی مانگا مگر تُو نے مجھے پانی نہ پلایا۔ اس کے بعد حدیث میں آتا ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ سے پوچھیگا کہ اے اللہ! تو کب بیمار ہُوا۔ کہ مَیں نے تیری عیادت نہ کی۔ تُو نے کب مجھ سے پانی مانگا کہ مَیں نے تجھے پانی نہ پلایا۔ تُو نے کب مجھ سے کھانا مانگا کہ مَیں نے تجھے نہ کھلایا۔ اس پر خدا تعالیٰ فرمائیگا کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا مگر تُو نے اُس کی بیمار پُرسی نہ کی میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تُو نے اُسے کھانا نہ کھلایا۔ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا مگر تُو نے اُسے پانی نہ پلایا۔ (مسلم جلد ۲ کتاب البر والصلۃ والآداب باب فی فضل عیادۃ المریض)

پس خدا تعالیٰ کو قرض دینے کا ایک یہ بھی مفہوم ہے کہ اُس کے بندوں سے نیک سلوک کیا جائے اور اُن کی مالی پریشانیوں کو دُور کرنے میں حصّہ لیا جائے۔ عیسائیوں نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ اس حدیث کے الفاظ بعینہٖ انجیل میں بھی آئے ہیں۔ وہاں لکھا ہے:۔

"تب بادشاہ انہیں جو اس کے داہنے ہیں کہیگا۔ اے میرے باپ کے مبارک لوگو! اس بادشاہت کو جو دُنیا کی بنیاد ڈالنے سے تمہارے لئے تیار کی گئی میراث میں لو کیونکہ مَیں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا مَیں پیاسا تھا۔ تم نے مجھے پانی پلایا۔ مَیں پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں اُتارا مَیں ننگا تھا۔ تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری عیادت کی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ اُس وقت راستباز اُسے جواب میں کہیں گے۔ اے خداوند کب ہم نے تجھے بھوکا دیکھا اور کھانا کھلایا۔ پیاسا دیکھا اور پانی پلایا کب ہم نے تجھے پردیسی دیکھا اور اپنے گھر میں اُتارا یا ننگا دیکھا اور کپڑا پہنایا

ہم کب تجھے بیمار یا قید میں دیکھ کر تجھ پاس آئے۔ تب بادشاہ اُن سے جواب میں کہے گا۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک کے ساتھ کیا۔ تو میرے ساتھ کیا۔ تب وہ بائیں طرف والوں سے بھی یہی کہیگا۔ اے ملعونو! میرے سامنے سے اُس ہمیشہ کی آگ میں جاؤ۔ جو شیطان اور اس کے فرشتوں کیلئے تیار کی گئی۔ کیونکہ میں بھوکا تھا پر تم نے کھانے کو نہ دیا۔ پیاسا تھا تم نے مجھے پانی نہ پلایا۔ پردیسی تھا تم نے مجھے اپنے گھر میں نہ اتارا۔ ننگا تھا تم نے مجھے کپڑا نہ پہنایا۔ بیمار اور قید میں تھا تم نے میری خبر نہ لی۔ تب وے بھی اُسے جواب میں کہیں گے۔ اے خداوند کب ہم نے تجھے بھوکا یا پیاسا یا پردیسی یا ننگا یا بیمار یا قید میں دیکھا اور تیری خدمت نہ کی۔ تب وہ انہیں جواب میں کہیگا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک کے ساتھ نہ کیا تو میرے ساتھ بھی نہ کیا۔"

(متی باب ۲۵ آیت ۳۵ تا ۴۵)

انجیل کے اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ بندوں کو دینا خدا تعالیٰ کو دینا کہلاتا ہے پس مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ سے مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ عِبَادَ اللّٰہِ مراد ہے۔ گویا یہاں ایک مضاف محذوف ہے جو عِبَادَ اللّٰہِ ہے۔ اور چونکہ اس سے پہلے وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے

اس لئے اس کے معنے یہ ہیں کہ لڑائیوں کے ایام میں بعض کو مالی نقصان پہنچیں گے۔ تم کو چاہیئے کہ انہیں قرض دیکر اُن کے حالات درست کرو۔ یہ قرض گویا تم خدا تعالیٰ کو دوگے۔ اور یاد رکھو کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے لئے ایک دانہ بھی خرچ کرتا ہے خدا تعالیٰ اُسے بڑھاتا ہے اور اتنا بڑھاتا ہے کہ کسی کو اس کی اُمید بھی نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھو۔ انہوں نے اپنا ایک بیٹا خدا تعالیٰ کے لئے قربان کیا اور خدا تعالیٰ نے اُنکو اس کے بدلہ میں اتنی اولاد دینے کا وعدہ دیا جس کا آسمان کے ستاروں کی طرح شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خدا تعالیٰ کے لئے ایک بے آب و گیاہ جنگل میں رہنا منظور کیا۔ جس کے بدلہ میں اُن کو یہ مرتبہ ملا کہ اوّلین و آخرین کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی نسل میں سے پیدا ہوئے۔ پس فرماتا ہے کہ تم یہ مت گمان کرو کہ تمہاری قربانیاں ضائع چلی جائیں گی۔ خدا تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں تمہارے لئے جو انعام مقرر کیا ہے وہ تمہارے وہم و گمان سے بھی بالا ہے۔

فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اَضْعَافًا کس طرح آ سکتا ہے۔ یہاں تو ضِعَافًا آنا چاہیئے تھا۔ اس کا بعض نے یہ جواب دیا ہے کہ چونکہ تعدّد انواع کی طرف اشارہ کرنا مدّنظر تھا اس لئے اَضْعَافًا رکھا گیا ہے۔ ضِعَافًا سے تو صرف یہی مراد ہو سکتا تھا کہ وہ اُسے کئی گُنے بڑھا کر بڑھائیگا۔ مگر اَضْعَافًا میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بڑھائیگا بھی اور یہ زیادتی کئی قسم کی ہوگی۔ پس تعدادِ انواع کے اظہار کے لئے ضِعَافًا کی بجائے اَضْعَافًا جمع لائی گئی ہے۔

وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ میں ایک تو اس امر

وقف لازم

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى

کیا تجھے بنی اسرائیل کے اُن سرکردہ لوگوں کا حال نہیں معلوم ہوا ۔ جو موسیٰ کے بعد گذرے ہیں ۔

إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ

جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے کوئی (شخص) بادشاہ (بنا کر) کھڑا کیجیئے تاکہ ہم (اسکے ماتحت ہو کر)

اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ

اللہ کی راہ میں جنگ کریں ۔ اُس نے کہا (کہیں) ایسا تو نہیں ہوگا کہ اگر تم پر جنگ فرض کی جائے

کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح تمہارے دوسرے بھائیوں پر مصیبت آئی ہے اسی طرح تم پر بھی آسکتی ہے ۔ کیونکہ تنگی اور کشائش کے دَور بدلتے رہتے ہیں اس لئے اُن کی مدد کرنا تمہارا اوّلین فرض ہے ۔

دوسرے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں پہلے جملہ کی مزید تشریح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرض لینے کا کیا مطلب ہے ۔ فرمایا ۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت ہے کہ وہ پہلے اپنے بندوں کا مال لیتا ہے اور پھر اُس کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے ۔ پس جب تک بندہ قربانی نہ کرے اُس وقت تک خدا تعالیٰ کا وہ خاص فضل بھی نازل نہیں ہوتا جس کی طرف يَبْصُطُ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے ۔ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ تنگی بھی لاتا ہے اور کشائش بھی پیدا کرتا ہے اور جب دونوں اس کے اختیار میں ہیں تو پھر جو بھی اس کے احکام پر چلیگا اُس کے لئے وہ بسط پیدا کریگا اور جو اس کی نافرمانی کریگا اس کیلئے وہ قبض یعنی عذاب کی صورت پیدا کر دیگا ۔

اسی طرح اس کے ایک معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ دنیا میں انسان کی دو ہی حالتیں ہوتی ہیں یا تو قبض کی حالت ہوتی ہے یا بسط کی ۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دفعہ ایک صحابیؓ حاضر ہوئے ۔ اور انہوں نے کہا ۔ یا رسول اللہ ! مَیں تو منافق ہوں ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ تم تو مومن ہو تم اپنے آپ کو منافق کیوں سمجھتے ہو ۔ اس صحابیؓ نے کہا یا رسول اللہ ! مَیں جب تک آپ کی مجلس میں بیٹھا رہتا ہوں یُوں معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ اور جنّت میرے سامنے ہیں ۔ اور خشیت الٰہی کا زور ہوتا ہے ۔ لیکن جب میں اپنے گھر جاتا ہوں تو وہ حالت قائم نہیں رہتی ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ یہی تو خالص ایمان ہے ۔ پھر آپ نے فرمایا ۔ اگر انسان ایک ہی حالت پر رہے تو وہ مر نہ جائے ۔ غرض قبض و بسط دونوں حالتیں انسان پر آتی رہتی ہیں اگر انسان کی ہر وقت ایک ہی قسم کی حالت رہے تو اگر جسمانی طور پر نہیں تو دماغی طور پر وہ یقیناً مر جائیگا اور پاگل ہو جائیگا ۔ مجنونوں اور عقلمندوں میں یہی فرق ہوتا ہے کہ مجنون پر ایک ہی حالت ہمیشہ طاری رہتی ہے ۔ اور عقلمندوں پر اُتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے ۔ مجنون ایک ہی قسم کے خیالات میں مبتلا رہتا ہے لیکن عقلمند شخص کے خیالات ایک قسم کے نہیں رہتے ۔ غرض قبض و بسط کی حالتیں انسان کے ساتھ لازم کر دی گئی ہیں ۔

اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

تو تم جنگ نہ کرو۔ انہوں نے کہا (ایسا نہیں ہوگا) اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں گے

وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ

حالانکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکالا گیا ہے اور اپنے بچوں سے (جُدا کیا گیا ہے)۔ مگر جب اُن پر جنگ

الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۷﴾

فرض کی گئی تو ان میں سے ایک قلیل (سی) جماعت کے سوا (باقی) سب پھر گئے۔ اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ۱۵۷؎

کبھی اس کے اندر بسط کی لہر پیدا ہوتی ہے اور وہ دین کیلئے سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حساب کرنے بیٹھ جاتا ہے کہ میں کتنی قربانی کر سکتا ہوں۔ یہ حساب کرنیوالی حالت قبض کی حالت ہوتی ہے اور جب کوئی شخص سب کچھ دینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے اور اس میں خوشی محسوس کرتا ہے تو وہ بسط کی حالت ہوتی ہے پس فرمایا کہ تم دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرو۔ کیونکہ تنگی بھی عارضی چیز ہے اور فراخی بھی عارضی۔ اور چونکہ سوال ہو سکتا تھا کہ اگر خدا تعالیٰ کے پاس ہمارا مال بڑھتا رہتا ہے تو اس کا ہمیں کیا فائدہ؟ اس لئے فرمایا کہ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ اصل گھر تو تمہارا وہی ہے۔ پس جو کچھ تم ہمارے پاس بھیجتے ہو ہم اُسے بڑھاتے رہتے ہیں۔ جب تم آؤ گے تو خدا تعالیٰ نے تمہارا مال بہت بڑھا رکھا ہو گا۔ اور وہ تمہیں مل جائیگا۔ جیسے کوئی ملازم باہر جاتا ہے تو روپیہ اپنے گھر بھیجتا رہتا ہے اور اس کی بیوی اُسے جمع کرتی رہتی ہے۔ مگر خدا تعالیٰ صرف جمع ہی نہیں کرتا بلکہ اُسے بڑھاتا بھی رہتا ہے پس اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں بتایا کہ آخر ایک دن تم نے خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ جہاں ایک دائمی زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ پس عارضی چیزوں کی وجہ سے اپنی دائمی زندگی کو نقصان مت پہنچاؤ اور جس قدر بھی نیکی میں حصہ لے سکتے ہو لو۔

قرآن کریم کا کمال دیکھو کہ اس میں انفس اور اموال کی ترتیب کیسے عجیب طور پر رکھی گئی ہے۔ چونکہ جنگ میں سب سے پہلے سپاہی کا وجود ضروری ہوتا ہے جو قوم اور ملت کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا حکم دیکر مومنوں سے اُن کی جان کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد دوسرا سوال خزانہ کی مضبوطی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کوئی قوم میدانِ جہاد میں نکلتی ہے تو ملک کے خزانہ پر جنگی اخراجات کا غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے اور اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ جنگ زیادہ دیر تک نہیں لڑی جا سکتی۔ اِسی حکمت کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے دوسرے نمبر پہ مالی قربانیوں کی تحریک فرما دی اور اس طرح قومی اور مذہبی استحکام کے لئے جان اور مال کی قربانیوں کو ایک بنیادی حیثیت دے کر ان کی طبعی ترتیب بھی قائم کر دی کہ پہلا درجہ جانی قربانیوں کا ہے اور دوسرا درجہ مالی قربانیوں کا۔

۱۵۷؎ **حل لغات**:۔ مَلَأٌ: اس کے اصل معنے بھر دینے کے ہیں۔ کہتے ہیں۔ مَلَأَ الْاِنَاءَ بِالْمَاءِ اُس نے برتن کو پانی سے بھر دیا۔ مُلِئَ رُعْبًا اُس کا دل خوف سے بھر گیا۔ اَلْمَلَأُ کے معنے ہیں۔ سردارانِ قوم۔ بڑے آدمی۔ کیونکہ جب مجلس میں بڑا آدمی آجاتا ہے تو کہتے ہیں۔ اب مجلس بھر گئی ہے۔ اب کسی کی

مَلَأٌ ۳

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ط

اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت (یعنی جدعون) کو بادشاہ بنا کر (اس کام کیلئے) کھڑا کیا ہے۔

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ

انہوں نے کہا۔ اسے ہم پر حکومت کس طرح مل سکتی ہے جبکہ ہم اس کی نسبت حکومت کے زیادہ حقدار ہیں۔

مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ط قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ

اور اسے مالی فراخی بھی (کوئی ایسی زیادہ) عطا نہیں ہوئی۔ اُس نے کہا کہ اللہ نے اسے تم پر یقیناً

ضرورت نہیں رہی۔ غرباء خواہ پچاس بیٹھے ہوئے ہوں جب تک بڑا آدمی نہ آجائے تب تک یہی کہتے ہیں کہ ابھی رونق نہیں ہوئی۔ اور اس وقت تک کام بھی شروع نہیں کرتے جبتک کہ وہ آنہ جائے۔ اس لئے مَلَأٌ بڑے لوگوں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے وجود سے لوگوں کی مجلس کو بھر دیتے ہیں۔ اسی طرح اُن کے خوف یا محبت کی وجہ سے بھی لوگوں کے دل بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

هَلْ عَسَيْتُمْ: عَسٰی بعض جگہ تو امکان کیلئے آتا ہے اور بعض جگہ توقع کے لئے۔ جب یہ لفظ خدا تعالےٰ کے لئے استعمال ہو تو امکان کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یعنی اس امر کو بعید مت سمجھو۔

مَالَنَا: یہ عربی زبان کا محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کیا ہوگیا ہے۔

تفسیر:۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کرکے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ تم خدا کے لئے موت قبول کرنے سے کبھی انکار نہ کرنا اب ایک اور واقعہ بیان فرماتا ہے جو بنی اسرائیل کے سرداروں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے کہ انہوں نے دشمن سے لڑائی کرنے کے لئے ایک بادشاہ بنائے جانے کی اپنے نبی کے سامنے درخواست پیش کی اور کہا کہ دشمن کی طرف سے ہم پر متواتر ظلم کیا جا رہا ہے ہمیں اپنے مکانوں اور جائیدادوں سے بے دخل کیا گیا ہے اور ہمیں اپنے بچوں سے بھی جُدا کر دیا گیا ہے۔ اب ہم پر ایک بادشاہ مقرر کیا جائے تاکہ ہم خدا تعالےٰ کے راستہ میں جہاد کریں۔

یہاں مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی کے الفاظ سے فوراً بعد مراد نہیں کیونکہ فوراً بعد حضرت یوشعؑ ہوئے تھے جو نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ اور یہ واقعہ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائیگا کئی سو سال بعد ہوا۔

عَسَيْتُمْ

هَلْ عَسَيْتُمْ میں اس نبی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ اس بات کا امکان ہے کہ اگر تم پر جنگ فرض کی گئی تو تم انکار کر دو۔ چنانچہ اس نے کہا کہ تم پہلے اپنے دلوں کو ٹٹول لو ایسا نہ ہو کہ لڑائی فرض کی جائے اور تم انکار کرکے گنہگار بنو۔

مَالَنَا

وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں اپنے گھروں سے بھی نکالا گیا اور اپنے بیٹوں سے بھی جُدا کیا گیا۔ یعنی ہماری زمینوں اور مکانات پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور ہمارے بیٹے بھی قتل کئے گئے یا مکانات کے ساتھ بیٹے بھی انہوں نے چھین لئے۔ اور جب ہم نے اللہ تعالےٰ کے راستہ میں اس قدر تکالیف برداشت کی ہیں تو اب ہم لڑائی کرنے سے کیوں انکار کرینگے۔

عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ

فضیلت دی ہے۔ اور اسے علمی اور جسمانی لحاظ سے (تم سے زیادہ) فراخی عطا کی ہے۔ اور اللہ جسے پسند کرتا ہے اُسے

مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۸﴾

اپنا ملک عطا کرتا ہے۔ اور اللہ کشائش دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ ۱۵۸؎

ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بعد کے زمانہ کی بات ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تو بنی اسرائیل کی یہ حالت تھی کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اے موسیٰ: تُو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور دشمنوں سے لڑتے پھرو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن اس موقعہ پر انہوں نے یہ جواب نہیں دیا۔ بلکہ کہا کہ ہم جہاد میں کیوں شامل نہیں ہیں گے جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے بھی نکالا گیا اور اپنے بچوں سے بھی علیحدہ کیا گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب لڑائی کا وقت آیا تو جیسا کہ اگلی آیات سے واضح ہے اُن میں سے بہت سے لوگ متزلزل ہو گئے۔ مگر بہر حال انہوں نے شروع میں لڑنے سے انکار نہیں کیا بلکہ خود خواہش کی کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے۔ تاکہ دشمن کے مظالم کا انسداد ہو۔ یہ بات بتاتی ہے کہ ان آیات میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے بہت بعد کا ہے۔ ورنہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تو انہوں نے لڑنے سے کلّی طور پر انکار کر دیا تھا۔ مگر یہاں انہوں نے انکار نہیں کیا بلکہ اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ہم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے تاکہ ہم خدا تعالیٰ کے راستہ میں اپنے دشمنوں سے لڑائی کریں۔

۱۵۸؎ تفسیر:۔ بنی اسرائیل نے جب درخواست کی کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کیا جائے جس کی کمان میں ہم دشمنوں سے جنگ کریں تو اُن کا خیال تھا کہ انہی میں سے کسی کو بادشاہ مقرر کر دیا جائیگا۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ اُن کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ اس لئے ان کی منشاء کے خلاف ایک شخص کو بادشاہ مقرر کر دیا ..... اس پر اُن کی مخفی ایمانی کمزوری ظاہر ہو گئی اور انہوں نے اعتراض کرنے شروع کر دیئے کہ اِسے کیوں بادشاہ بنا دیا گیا ہے اور پھر انہوں نے اپنے اس اعتراض کو تقویت دینے کے لئے کہا۔ (۱) ہمارے مقابلہ میں اِسے کوئی ظاہری وجاہت حاصل نہیں۔ ہم اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ ادنیٰ خاندان میں سے ہے اس لئے بادشاہت ہمارا حق تھا نہ کہ اس کا۔ (۲) یہ مالی لحاظ سے غربت میں مبتلا ہے حالانکہ بادشاہت کے لئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس ہم اِسے بادشاہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ۔ اُن کے نبی نے پہلی بات کا تو یہ جواب دیا کہ اس کے انتخاب میں خدائی ہاتھ ہے اور بڑائی اِسی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ایک شخص کو دوسروں کے مقابلہ میں چن لیتا ہے اور پھر اُسے مخالفت کے باوجود کامیاب کر دیتا ہے۔ اِسی طرح طالوت کو خدا تعالیٰ نے تم میں سے چن لیا ہے اور اس طرح اُسے بزرگی اور برتری حاصل ہو گئی ہے۔

دوسرا سوال اُن کا یہ تھا کہ وہ مالدار نہیں اس کے جواب میں بتایا کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ خدا تعالیٰ نے اُسے علمی لحاظ سے بہت فراخی عطا فرمائی ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ

اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا۔ کہ اُس کی حکومت کی دلیل یہ (بھی) ہے کہ تمہیں (ایک)

التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا

تابوت ملے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین (ہوگی) اور اُس چیز کا بقیہ ہوگا جو

علم کے لفظ سے اِس طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا میں مال علم کے ذریعہ ہی کمایا جاتا ہے اور علم اسے تم سے بہت زیادہ حاصل ہے ورنہ بیوقوف آدمی تو اپنے باپ دادا کی کمائی کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ پس خدا تعالیٰ نے اسے جو علم بخشا ہے اس کے ذریعہ وہ بہت کچھ مال کما لیگا۔ اِسی طرح اس کی علمی برتری کا ذکر کرکے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ صرف دولت کی وجہ سے کوئی حکومت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے تنظیمی صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور حکومتی اوصاف کا بھی پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ تمام باتیں اسے تم سے زیادہ حاصل ہیں۔ اسے حکومت کرنے کا ڈھب بھی آتا ہے اور سیاسیات سے بھی خوب واقف ہے۔ اس لئے صرف مالی کمزوری دیکھ کر اعتراض نہ کرو۔ اِس کے اندر جو مخفی جوہر ہیں وہ اپنے وقت پر ظاہر ہونگے۔

پھر جسم کے لحاظ سے بتایا کہ تم لڑائی کرنا چاہتے تھے۔ اِس کا جسم بھی خوب مضبوط ہے اور اُسکی جسمانی طاقتیں اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اس میں ہمت اور استقلال اور ثبات اور شجاعت کا مادہ پایا جاتا ہے۔ پس اس سے زیادہ اور کون موزوں ہو سکتا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ وہ موٹا تازہ ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ مضبوط اور دلیر ہے اور اُس میں قوتِ برداشت اور قربانی کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ کہا کرتے ہیں اَلْمَرْءُ بِاَصْغَرَیْهِ بِقَلْبِهٖ وَلِسَانِهٖ۔ یعنی انسان کی تمام طاقت اُس کی دو چھوٹی سی چیزوں پر موقوف ہے ایک دل پر اور ایک اُس کی زبان پر۔ اور یہی سچے خلفاء کی علامت ہوتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ نہ تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ لوگ زکوٰۃ نہیں دیتے تو جانے دیں۔ اسوقت اُن سے جنگ کرنا مسلمانوں کیلئے کمزوری کا باعث ہوگا۔ مگر جب اپنی خلافت کا زمانہ آیا تو کتنے بڑے بڑے کام کئے۔ دراصل ہمت و استقلال اور استقامت ایک بہت بڑا نشان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے سچے خلفاء کو عطا کیا جاتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ میں بتایا کہ اگر تمہارے سوال صحیح بھی مان لئے جائیں تو بھی تمہارا کوئی حق نہیں کہ اعتراض کرو۔ کیونکہ فیصلہ ہمیشہ مالک ہی کیا کرتا ہے اور جب ملک خدا کا ہے تو وہ جسے چاہے دے اِس میں کسی کو چون وچرا کی کیا مجال ہے۔ جب ہم مالک کی اجازت سے ملک اُس کے سپرد کرتے ہیں تو پھر تم کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؛ دنیا میں یہ تسلیم شدہ اصل ہے کہ اگر کسی چیز کی ملکیت کے بارہ میں اختلاف ہو جائے تو اس بارہ میں اصل مالک کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ پس جب خدا نے اُسے اِس غرض کے لئے منتخب فرما لیا ہے اور اصل حکومت خدا تعالیٰ ہی کی ہے تو تمہارا کیا حق ہے کہ تم اعتراضات کرو۔ اِن الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے پھر کوئی سوال کرنا تھا کہ اچھا اگر اسے علم دیا گیا ہے تو وہ کونسا

تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ

موسیٰ کے متعلقین اور ہارونؑ کے متعلقین نے (اپنے پیچھے) چھوڑا۔ فرشتے اُسے اٹھائے ہوئے ہونگے۔ اگر

فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

تم مومن ہو تو (اس) بات) میں تمہارے لئے یقیناً ایک (بڑا) نشان ہے۔ ۱۵۹

۳۲ ع ۶

علم ہے یا کونسی استقامت ہے جو اس نے دکھائی۔ اس لئے پہلے ہی اس کا جواب دیدیا کہ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ۔ یعنی آراء میں تو ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے مگر جو مالک ہو اس کی رائے مقدم سمجھی جاتی ہے۔ پھر خدا تعالیٰ تمہاری رائے کے پیچھے کیوں چلے خصوصاً جبکہ وہ واسع اور علیم ہے۔ اس میں بتایا کہ اگر تم مال کے متعلق کہو کہ اس کے پاس نہیں تو ہم واسع ہیں ہم اسے وسعت دے دینگے۔ اگر کہو کہ یہ حکومت کرنیکا اہل نہیں تو ہم خوب جانتے ہیں کہ بادشاہت کا اہل کون ہے۔ پس اگر تم نے لڑنا ہی ہے تو جاؤ خدا سے لڑو۔ خدا کا ملک تھا اس نے جسے چاہا دے دیا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیاء چونکہ کامل شریعت لیکر نہیں آئے تھے اس لئے جب اصلاح خلق کیلئے الہام کی ضرورت ہوتی تھی تو کسی نبی کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اور اُسے نبوت کا مقام براہِ راست حاصل ہوتا تھا۔ اور جب نظام میں خلل واقع ہوتا تو کسی کو بادشاہ بنا دیا جاتا۔ گویا چونکہ لوگوں کو ابھی اس قدر ذہنی ارتقاء حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے جدوجہد کرسکتے اس لئے نہ صرف انبیاء کو اللہ تعالیٰ براہِ راست مقام نبوت عطا فرماتا بلکہ ملوک بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی مقرر کئے جاتے تھے۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے وہ انتخابی نہیں ہوتے تھے بلکہ یا تو ورثہ کے طور پر وہ حکومت حاصل کرتے تھے یا نبی انہیں خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت بادشاہ مقرر کر دیتے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ایک کامل تعلیم لیکر آئے تھے اور آپ کی قوم زیادہ اعلیٰ درجہ کی تھی اس لئے آپ کے بعد مستقل انبیاء کی ضرورت نہ رہی اور اس کے ساتھ ہی ملوکیت کی ادنیٰ صورت کو بھی اُڑا دیا گیا۔ اور اُسکی ایک کامل صورت پیدا کر دی گئی۔ اور انتخاب کو پہلی شرط قرار دیا گیا۔ اس طرح قومی حقوق کو محفوظ کیا گیا۔ جو پہلے بادشاہوں کی صورت میں محفوظ نہ تھا۔

۱۵۹ حل لغات: بَقِيَّةٌ : یہ لفظ ایسی چیز پر بولا جاتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو۔ چنانچہ جب کہیں فُلَانٌ بَقِيَّةُ قَوْمِهٖ تو اس کے معنے ہوتے ہیں هُوَ مِنْ خِيَارِهِمْ ۔ وہ قوم کے شرفاء اور اچھے لوگوں میں سے ہے۔

قرآن کریم میں بھی یہ لفظ اِن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا (مریم آیت ۷۷) یعنی اچھے اور نیک اعمال خدا تعالیٰ کے حضور ثواب حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی اور انجام کے لحاظ سے بھی سب سے بہتر شے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ عقل پر بھی بولا گیا ہے جیسے آتا ہے۔ فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِى الْاَرْضِ (ھود آیت ۱۱۷)

بَقِيَّةٌ

یعنی کیوں ان قوموں میں سے جو تم سے پہلے زمانہ میں تھیں
ایسے عقل مند لوگ نہ نکلے جو لوگوں کو ملک میں بگاڑ پیدا
کرنے سے روکتے۔ چونکہ عقل بھی خیر ہی کے معنے رکھتی
ہے اور انسان کے لئے مفید ہوتی ہے اور وہ اس کے ذریعہ
سے باقی رہتا ہے۔ اس لئے اُسے بھی بقیہ کہتے ہیں۔

تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ - ترکہ سے
مراد عام طور پر ورثہ ہوتا ہے۔ لیکن ترکہ سے مراد دوسروں
کی اعلیٰ صفات کا حامل ہونا بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ
قرآن کریم میں آتا ہے۔ يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ
يَعْقُوْبَ (مریم آیت ۷) یعنی اے خدا! مجھے اپنے پاس
سے وارث دے جو میرا بھی وارث ہو اور سارے بنی اسرائیل
کا بھی۔ سارے بنی اسرائیل کا وارث تو وہ ظاہری طور پر
نہیں ہو سکتا تھا۔ پس مراد یہی ہے کہ آلِ یعقوب کی جو
نیکیاں ہیں وہ اس میں بھی پیدا ہوں اور وہ ان کا وارث
ہو۔ اس لحاظ سے اس آیت کے معنے یہ ہونگے کہ جو نیک
دستور پہلے لوگ چھوڑ گئے ہیں اُن کا وارث ہو۔

تَحْمِلُهٗ: حَمَلَهٗ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں اَغْرَاهُ
اُسے کسی کام پر اُکسایا۔ اسی طرح اس کے معنے اٹھانے
کے بھی ہیں۔

تفسیر:- گذشتہ آیات میں اس زمانہ کے
نبی نے طالوت پر اعتراض کرنے والوں کو یہ جواب دیا
تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ یعنی مخفی طاقتوں کو
اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اور جب اُس نے طالوت کو چنا
ہے۔ تو یقیناً وہ تم سے افضل ہے۔ دوسرے دولت
کے زور سے بادشاہت نہیں ہوتی بلکہ علم اور قربانی کی
طاقت سے ہوتی ہے۔ سو ان دونوں باتوں میں وہ تم
سے بڑھا ہوا ہے۔ وہ تم سے زیادہ علوم جانتا ہے اور
خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے جسم کو انتہائی ابتلاؤں میں
ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ اب اس آیت میں بتایا گیا ہے
کہ اُن کے نبی نے انہیں کہا کہ اِس انتخاب کے منجانب اللہ
ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسا تابوت ملیگا
جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینت ہوگی اور اُس
چیز کا بقیہ ہوگا جسے موسیٰؑ اور ہارونؑ کی آل نے اپنے
پیچھے چھوڑا۔ اور فرشتے اُسے اُٹھائے ہوئے ہونگے۔

تَرَكَ

مفسرین نے تابوت سے مراد بنی اسرائیل کا وہ
خاص صندوق لیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس
کے اندر تورات کا اصل نسخہ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کے
تبرکات محفوظ تھے۔ اور بنی اسرائیل سفر و حضر میں اُسے
اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ اُسے بڑا متبرک
سمجھتے تھے۔

بائبل میں بھی اس تابوت کا ان الفاظ میں ذکر
آتا ہے:-

"وے شطیم کی لکڑی کا ایک صندوق
بناویں جس کی لمبائی اڑھائی ہاتھ اور
چوڑائی ڈیڑھ ہاتھ اور اونچائی ڈیڑھ
ہاتھ ہووے۔" (خروج ۲۵/۱۰)

تَحْمِلُهٗ

مگر تعجب ہے قرآن کریم تو کہتا ہے کہ اس تابوت کو
فرشتے اٹھائے ہوئے ہونگے۔ مگر بائبل بتاتی ہے
کہ ایک دفعہ دشمن نے ایسا حملہ کیا کہ وہ یہ تابوت
بھی اٹھا کر لے گئے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

"اور جب لوگ لشکر گاہ میں پھر آئے
تھے تب اسرائیل کے بزرگوں نے کہا کہ
خداوند نے ہم کو فلستیوں کے سامنے
کیوں شکست دی۔ آؤ ہم خدا کے عہد
کا صندوق سیلا سے اپنے پاس لے آئیں
تاکہ وہ ہمارے درمیان ہو کے ہم کو ہمارے
دشمنوں کے ہاتھوں سے رہائی دیوے۔

سوانہوں نے سیلا میں لوگ بھیجے تاکہ وہ ربّ
الافواج کے عہد کے صندوق کو جو کروبیوں کے
درمیان دھرا رہتا ہے وہاں سے لے آویں اور
عیلی کے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس خدا کے
عہد کے صندوق پاس وہاں حاضر تھے۔ اور
جب خداوند کے عہد کا صندوق لشکرگاہ
میں آپہنچا۔ تو اسرائیلی خوب للکارے۔
ایسا کہ زمین لرز گئی اور فلستیوں نے جو
للکارنے کی آواز سُنی تو بولے کہ ان عبرانیوں
کی لشکرگاہ میں کیسی للکارنے کی آواز ہے۔ پھر
انہوں نے معلوم کر لیا کہ خداوند کا صندوق
لشکرگاہ میں آپہنچا۔ سو فلستی ڈر گئے کہ
انہوں نے کہا۔ خدا لشکرگاہ میں آیا ہے۔ اور
بولے ہم پر واویلا ہے اس لئے کہ اِس سے پہلے
ایسا کبھی نہ ہُوا۔ ہم پر واویلا ہے۔ ایسے
خدائے قادر کے ہاتھ سے ہمیں کون بچائیگا۔ یہ
وہ خدا ہے جس نے مصریوں کو میدان میں ہر
ایک قسم کی بلا سے مارا۔ اے فلستیو: تم مضبوط
ہو اور مردانگی کرو۔ تاکہ تم عبرانیوں کے بندے
نہ ہو جیسے کہ وے تمہارے بندے بنے بلکہ
مرد کی طرح بہادری کرو اور لڑو۔ سو فلستی
لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور
ہر ایک اپنے اپنے خیمے کو بھاگا۔ اور وہاں
نہایت بڑی خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرئیلی
پیادے مارے پڑے۔ اور خدا کا صندوق
لُوٹا گیا۔" (۱۔سموایل باب ۴ آیت ۳ تا ۱۱)

سو اگر تو یہاں تابوت سے مراد وہی تابوت ہو۔ تو
وہ ان کے لئے کسی خوشی کا موجب نہیں ہو سکتا تھا۔ اور
نہ ہی اُس سے اُن کو کوئی تسلّی ہو سکتی تھی کیونکہ اُس کی
موجودگی میں وہ شکست کھا چکے تھے۔ حالانکہ اس سے
پہلے اُن کو تابوت پر اس قدر یقین تھا کہ جب اُن کے سب سے
بڑے کاہن کو معلوم ہُوا کہ تابوت دشمنوں کے ہاتھوں
میں چلا گیا ہے تو وہ گر پڑا اور وہیں مر گیا۔ لیکن قرآن کریم
نے جس تابوت کا ذکر کیا ہے اُس کے متعلق کہا ہے کہ وہ
اُن کے لئے تسکین کا موجب ہوگا۔ پس یہ تابوت وہ
نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اِس تابوت سے یقیناً کچھ اَور مراد ہے
اِس غرض کے لئے جب ہم لغت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم
ہوتا ہے کہ تابوت کے عام معنے تو صندوق کے اور
کشتی کے ہوتے ہیں (اقرب) لیکن استعارۃً اُسے دل کے
معنے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جس کی تائید اس امر سے
ہوتی ہے کہ عربی زبان میں انسانی قلب کو بَيْتُ الْحِكْمَةِ
اور وِعَاءُ الْحِكْمَةِ اور صُنْدُوْقُ الْحِكْمَةِ کہنے کے
علاوہ تَابُوْتُ الْحِكْمَةِ بھی کہتے ہیں (مفردات راغب)
اِسی طرح لسان العرب کا یہ حوالہ بھی اِس کی تائید کرتا
ہے کہ مَا اَوْدَعْتُ تَابُوْتِيْ شَيْئًا فَفَقَدْتُهٗ میں نے
اپنے تابوت یعنی دل میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی کہ بعد
میں اُسے گم کر دیا ہو۔ یعنی میں مستقل مزاج ہوں۔ جو
بات دل میں بیٹھ گئی سو بیٹھ گئی۔ نیز تاج العروس میں لکھا
ہے۔ اَلتَّابُوْتُ اَلْاَضْلَاعُ وَمَا تَحْوِيْهِ كَالْقَلْبِ
وَالْكَبِدِ وَغَيْرِهِمَا تَشْبِيْهًا بِالصُّنْدُوْقِ الَّذِيْ
يُحْرَزُ فِيْهِ الْمَتَاعُ۔ یعنی تابوت کے معنے پسلیوں والے
حصّہ جسم کے ہیں جس میں دل اور جگر وغیرہ اعضاء ہیں۔
اور اِس حصّہ جسم کو تابوت اِس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی
صندوق کی طرح ہوتا ہے جس میں سامان محفوظ رکھا جاتا
ہے۔ اور کسی علمی یا ایمانی یا راز کی بات کو تابوت میں رکھنے
کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ گویا وہ سینہ میں لکھی گئی ہے۔
اور ایسی محفوظ ہو گئی ہے جیسے کوئی چیز صندوق میں رکھ
دی جائے۔ وَفِيْ اَحْكَامِ الْاَسَاسِ اَلتَّابُوْتُ: اَلْقَلْبُ

اور کتاب احکام الاساس میں بھی تابوت کے معنے دل کے لکھے ہیں
اسی طرح مفردات میں لکھا ہے ۱۔ قِيلَ عِبَارَةٌ عَنِ الْقَلْبِ
وَالسَّكِينَةِ وَعَمَّا فِيهِ مِنَ الْعِلْمِ ۔ یعنی کبھی لفظ
تابوت کو استعارۃً دل کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے
الفاظِ قرآنیہ صاف دلالت کر رہے ہیں کہ اس جگہ تابوت سے
مراد دل ہے ۔ کیونکہ فرماتا ہے ۔ اس تابوت میں تمہارے رب
کی طرف سے سکینت ہے ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ سکینت دل
میں ہوتی ہے نہ کہ صندوقوں میں ۔ اسی طرح اس تابوت کے متعلق
فرماتا ہے تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ فرشتے اُسے اٹھائے ہوئے
ہونگے ۔ اگر تابوت سے ظاہری صندوق مراد لیا جائے تو یہ
قرآنی تعلیم کے خلاف ہوگا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ
اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ قُلْ لَّوْ كَانَ
فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا
عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔ (بنی اسرائیل آیت ۹۵-۹۶)
یعنی مخالفین کو ہدایتِ الٰہی پر ایمان لانے سے صرف یہ بات
روکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بشر رسول کیوں بھیجا ہے ۔ تو کہہ
کہ اگر زمین میں فرشتے امن سے چلتے پھرتے تو ہم فرشتوں کو
رسول بنا کر بھیجا کرتے ۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ ملائکہ اس
طرح لوگوں میں چلتے پھرتے نہیں ہیں جس طرح انسان چلتے پھرتے
ہیں ۔ پس چونکہ ظاہری تابوت کی صورت میں ماننا پڑتا ہے
کہ فرشتے اُسے اُٹھا کر ساتھ ساتھ لئے پھرتے تھے ۔ اور
یہ قرآنی تعلیم کے خلاف ہے ۔ اس لئے تابوت سے مراد
اسجگہ دل ہی ہیں جنہیں فرشتے اٹھاتے تھے اور ہمت بڑھاتے
تھے ۔ کیونکہ حَمَلَهٗ عَلٰى كَذَا کے معنے اَغْرَاهُ کے ہیں
یعنی اکسانا اور جوش دلانا (اقرب) پس معنے یہ ہوئے کہ
اتباعِ طالوت کو فرشتے قربانیوں پر آمادہ کریں گے ۔ اور
اُن کی نصرت ہر شخص کے ساتھ ہوگی ۔ چنانچہ مؤرخین کا
اس بات پر اتفاق ہے کہ طالوت کا لشکر بہت ہی کم تھا
اور ایسے قلیل التعداد لشکر کا کثیر افواج پر غالب آنا سوائے
خاص نصرتِ الٰہی اور ملائکہ کی تائید کے ناممکن تھا ۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ ملائکہ سے فیوض حاصل کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے کہ
اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ خلفاء سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا
جائے اور اُن کی اطاعت کی جائے ۔ چنانچہ اس جگہ طالوت
کے انتخاب میں خدائی ہاتھ کا ثبوت یہی پیش کیا گیا ہے
کہ تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے نئے دل ملیں گے جن میں سکینت
کا نزول ہوگا ۔ اور خدا تعالیٰ کے ملائکہ اُن دلوں کو اٹھائے
ہوئے ہونگے ۔ گویا طالوت کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کے
نتیجہ میں تم میں ایک تغیرِ عظیم واقع ہو جائیگا ۔ تمہاری
ہمتیں بلند ہو جائیں گی ۔ تمہارے ایمان اور یقین میں اضافہ
ہو جائیگا ۔ ملائکہ تمہاری تائید کے لئے کھڑے ہو جائیں گے
اور تمہارے دلوں میں استقامت اور قربانی کی رُوح پھونکتے
رہیں گے ۔ پس سچے خلفاء سے تعلق رکھنا ملائکہ سے تعلق
پیدا کر دیتا اور انسان کو انوارِ الٰہیہ کا مہبط بنا دیتا ہے ۔

اب بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ
کا حل کرنا باقی رہ گیا ۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ بَقِيَّةٌ
کے معنے جیسا کہ حلِ لغات میں بتایا جا چکا ہے اعلیٰ شے
کے ہوتے ہیں ۔ پس بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ
هٰرُوْنَ سے مراد وہ اخلاقِ فاضلہ ہیں جو حضرت موسیٰؑ
اور حضرت ہارونؑ کے متبعین اور آپ کے مقربین سے ظاہر
ہوتے تھے ۔ اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے دل
اُن خوبیوں کے وارث ہونگے جو آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارون
نے چھوڑی ہیں ۔ یہ ویسا ہی فقرہ ہے جیسے حضرت زکریاؑ
نے دُعا کرتے ہوئے کہا تھا کہ الٰہی مجھے ایک ایسا لڑکا
عطا فرما يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (مریم ع ۱)
جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث ہو ۔ اور مطلب یہ تھا
کہ اُن کے اخلاقِ حسنہ اور خوبیوں کا وارث ہو نہ یہ کہ

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ

پھر جب طالوت اپنی فوجوں کو لے کر نکلا تو اُس نے کہا کہ اللہ (تعالیٰ) ایک ندی کے ذریعے سے یقیناً

بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ

تمہارا امتحان لینے والا ہے۔ پس جس نے اُس (نہر) میں سے (پیٹ بھر کر پانی) پی لیا وہ مجھ سے (وابستہ) نہیں (رہیگا) اور جس نے

لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً

اُس سے نہ چکھا وہ یقیناً مجھ سے (وابستہ) ہوگا۔ سوائے اس کے جس نے اس میں سے (فقط) اپنے ہاتھوں سے ایک چلو بھر لیا

بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا

(اس پر کوئی الزام نہ ہوگا) پھر (ہوا یہ کہ) اُن میں سے چند ایک کے سوا (باقی سب نے) اس میں سے (پانی) پی لیا۔ پھر جب وہ خود

جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ

اور (نیز) وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اُس ندی سے پار اُتر گئے (تو) انہوں نے کہا کہ آج ہم میں

اُن کی جائیداد کا وارث ہو۔ کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو وفات پائے قریباً ایک سو پشت گزر چکی تھی۔ غرض بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ سے یہ مراد ہے کہ طالوت کے ساتھیوں میں وہی اخلاق فاضلہ اللہ تعالیٰ پیدا کر دے گا جو آل موسیٰؑ اور آل ہارون میں تھے۔ آل موسیٰ و آل ہارون سے یہ مراد نہیں کہ ان دونوں کی الگ الگ اُمتیں تھیں۔ یہ بات تو بالبداہت باطل ہے ایک قوم میں اور ایک وقت میں اور ایک شریعت پر عمل کرنے والی دو اُمتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ اس کا مطلب اہل یعنی اقارب سے ہے اور مراد یہ ہے کہ ان دونوں نبیوں کی اولادوں میں جو خوبیاں تھیں وہ ان میں بھی آجائیں گی۔ اگر کہو کہ اہل میں خوبی ہونا ضروری نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ بَقِيَّةٌ کے لفظ نے بتا دیا ہے کہ اس جگہ خوبیاں مراد ہیں۔ دوسرے بائیبل کی کتاب

خروج باب ۴۰ آیت ۱۲ تا ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ ہارون کو مقدس لباس پہنایا جائے اور نہ صرف اس کی عزت افزائی کی جائے بلکہ اُس کی تمام اولاد کی عزت کرنا بھی بنی اسرائیل پر فرض قرار دیا جائے۔ اور عبادت گاہوں کا انتظام اُن کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

"جیسے اُن کے باپ کو مسح کرے۔ ویسے ہی اُن کو بھی مسح کرنا۔ تاکہ وہ میرے لئے کاہن کی خدمت کو انجام دیں۔ اور ان کا مسح ہونا اُن کے لئے نسل در نسل ابدی کہانت کا نشان ہوگا۔"

پس بے شک ہر اہل میں خوبیوں کا موجود ہونا ضروری نہیں مگر موسیٰؑ اور ہارونؑ کے متعلقین اور اُن کے خاص متبعین میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجہ کے اخلاق یقینی طور پر ودیعت

لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ

جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی بالکل طاقت نہیں (مگر) جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ وہ (ایک دن)

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً

اللہ سے ملنے والے ہیں انہوں نے کہا۔ کہ بہت سی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب

كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

آچکی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے (پس ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں) [۱۶۰]

کر دیئے تھے۔ اور طالوت کے خدائی انتخاب کا یہ ثبوت بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو روحانیت آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ میں رکھی تھی اور جن بلند اخلاق اور کردار کا انہوں نے مظاہرہ کیا تھا وہی تقویٰ اور وہی روحانیت اور وہی بلند اخلاق طالوت کے ساتھیوں میں بھی پیدا کر دی جائیگی اور یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ جس شخص کی انہوں نے متابعت اختیار کی ہے وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ ہے۔

۱۶۰ حل لغات :۔ اِغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ غرفہ کا لفظ چونکہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ یَدٌ بمعنی ہاتھ رکھ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے معنے محدود ہوگئے ہیں۔ پس اِغْتَرَفَ غُرْفَةً کے معنے اسجگہ صرف چلّو بھر لینے کے ہی ہیں۔

كَمْ : یہ لفظ اسجگہ کثرت کے اظہار کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یعنی کتنے ہی ایسے گروہ ہیں جو قلیل ہونے کے باوجود دوسروں پر غالب آئے۔ لیکن بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ضروری نہیں کہ اس سے کثرت مراد ہو بلکہ کسی قدر تعداد کا پایا جانا بھی کافی ہے خواہ ایسے گروہوں کی تعداد تھوڑی ہی ہو۔

فِئَةٌ جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ فَاءَ سے نکلا ہے جس کے معنے جھکنے کے ہیں۔ چونکہ جماعت بھی ایک دوسرے کی مدد پر بھروسہ کرتی ہے۔ اور اس کے افراد بھی ایک دوسرے کی طرف جھکتے ہیں۔ اگر ایک کو دُکھ ہو تو وہ دوسرے پر اعتماد کرتا ہے اس لئے اسے فِئَةٌ کہتے ہیں۔

تفسیر :۔ جب طالوت اپنے لشکر کو لے کر جالوت کے مقابلہ میں نکلے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا ایک نہر کے ذریعے پھر امتحان لیا۔ تاکہ جو کمزور ایمان والے ہیں وہ الگ ہو جائیں اور صرف وہی لوگ دشمن کے مقابلہ میں صف آرا ہوں جو کامل الایمان ہوں اور جن کی تائید میں ملائکہ کام کر رہے ہوں۔ نہر کا ترجمہ ندی کیا گیا ہے لیکن ہاء کی زبر سے جب یہ لفظ ہو تو اس کے دو معنے ہوتے ہیں۔ ندی بھی اور فراخی اور وسعت بھی (مفردات) اس آیت میں یہ دونوں معنے لگ سکتے ہیں۔ اگر فراخی اور وسعت کے معنے لئے جائیں تو آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے ذریعہ سے فوجیوں کو اس امر کی اطلاع دی کہ تمہارا امتحان مال و دولت کی فراخی سے لیا جائیگا۔ اگر تم مال و دولت کے پیچھے پڑ گئے تو خدا تعالیٰ کا کام نہ ہو سکیگا۔ اور اگر تم مال و دولت سے متاثر نہ ہوئے تو تم کو کامیابی ہوگی۔ اس صورت میں فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ وغیرہ الفاظ مجازی معنوں میں سمجھے جائینگے لیکن چونکہ ظاہری رنگ میں بھی طالوت کے ساتھیوں کا ایک نہر کے ذریعہ سے امتحان لیا گیا تھا۔ اس لئے ظاہری معنے

اِغْتَرَفَ

كَمْ

فِئَةٌ

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں (کے مقابلہ) کے لئے نکلے تو انہوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم پر قوتِ برداشت

صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

نازل کر اور (میدانِ جنگ میں) ہمارے قدم جمائے رکھ - اور (ان) کافروں کے خلاف ہماری مدد کر -

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

پھر (وہ جنگ میں کود پڑے اور) انہوں نے اللہ کے ارادہ کے مطابق انہیں شکست (دے) دی - اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا -

پینے میں بھی کوئی حرج نہیں -

چونکہ جنگ میں جلدی اور تیز حرکت کی ضرورت ہوتی ہے - اور پیٹ کا پانی سے بھر لینا تیز حرکت سے انسان کو محروم کر دیتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ ہلکے پیٹ رہو اور پانی کم پیو - تاکہ جنگ میں عمدگی سے کام کر سکو - مگر اکثر لوگوں نے اس حکمت کو نہ سمجھا اور خوب پیٹ بھر کر پانی پیا - اور بہت تھوڑی سی تعداد نے جو بائبل کے بیان کے مطابق صرف تین سو تھی جنگی ضرورتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یونہی چند گھونٹ پانی پیا تاکہ لڑائی کے وقت وہ اچھی طرح کام کر سکیں - اللہ تعالیٰ نے اُنکی قربانیوں کا بدلہ دینے کے لئے اور اُن کے اخلاص کی قدر کرنے کے لئے فیصلہ کیا کہ صرف انہیں کے ہاتھ پر فتح ہو اور حکم دیا کہ انہی تین سو کو جنگ میں شامل کیا جائے - باقی کو نہیں - چنانچہ انہی تین سو کو طالوت نے جنگ میں شامل کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی -

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً

بِاِذْنِ اللّٰهِ میں بتایا گیا ہے کہ کتنی ہی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل کے ماتحت بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آجایا کرتی ہیں - اس غلبہ کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُن میں قربانی اور ایثار کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اُسے مفید کاموں میں صرف کرنے کے عادی ہوتے ہیں - اُن میں دیانت بھی ہوتی ہے - صداقت بھی ہوتی ہے - محنت کی عادت بھی ہوتی ہے پھر اُن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں - ان کے ارادے پختہ ہوتے ہیں اور اُن کے مقابل میں جو لوگ کھڑے ہوتے ہیں - وہ ان اوصاف سے خالی ہوتے ہیں - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلیل غالب آجاتے ہیں اور کثیر مغلوب ہو جاتے ہیں -

حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک آدمی جس میں ایثار کا مادہ ہوتا ہے درجنوں پر بھاری ہوتا ہے - پاگل کو ہی دیکھ لو - لوگ اس کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے ہیں - حالانکہ اکیلا ہوتا ہے - اسکی وجہ یہی ہے کہ لوگ ڈرتے ہیں کہ انہیں چوٹ نہ آجائے - ان کو زخم نہ لگ جائے - اور وہ اپنی طاقت کو صرف ایک حد تک استعمال کرتے ہیں لیکن پاگل کے لئے چوٹ اور زخم بلکہ موت کا بھی کوئی سوال نہیں ہوتا - اس لئے وہ اپنی طاقت اس حد تک استعمال کرتا ہے جس حد تک ایک سمجھدار انسان استعمال کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا - اور وہ اکیلا ہونے کے باوجود دوسروں پر غالب آجاتا ہے - اسی طرح اگر کسی جماعت کے افراد میں قربانی اور ایثار کا مادہ ہو اور وہ دین کے لئے اپنے اندر مجنونانہ

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ

اور اللہ نے اُسے حکومت اور حکمت بخشی ۔ اور جو کچھ اُسے (یعنی اللہ کو) منظور تھا اس کا علم اُسے (یعنی داؤد کو)

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ

عطا کیا ۔ اور اگر اللہ انسانوں کو (شرارت سے) نہ ہٹاتے رکھتا یعنی بعض (انسانوں) کو بعض کے ذریعہ سے (نہ روکتا) تو زمین

الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

تہ و بالا ہو جاتی ۔ لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنیوالا ہے (اس نے اس فساد کو روک دیا ہے) ۱۶۱

رنگ رکھتے ہوں اور وہ اپنی محنت اور قربانی کو اس حد تک پہنچا دیں کہ جس حد تک پہنچانے سے دوسرے لوگ گھبراتے ہوں تو پھر ان کے ٹیک ایک آدمی کے مقابلہ میں دس دس پندرہ پندرہ بلکہ بیس بیس آدمی بھی ہیچ ہو جاتے ہیں ۔ جنگِ بدر میں ایسا ہی ہوا ۔ غزوۂ خندق میں بھی ایسا ہی ہوا اور مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت اپنے سے کئی گنا بڑی جماعت پر غالب آگئی ۔

۱۶۱ **حل لغات:** بَرَزَ: کے معنے ہیں خَرَجَ ۔ باہر نکلا ۔ (اقرب) اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ۔ فَرَغَ کے معنے ہیں ۔ بہا دیا ۔ انڈیل دیا ۔ پس اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا کے معنے یہ ہونگے کہ ہمیں صبر میں سے وافر حصہ دے یعنی ایسا ہو کہ ہم کامل طور پر صبر کرنے والے ہوں ۔ اور ہماری کسی حرکت سے جزع فزع ظاہر نہ ہو ۔

اُنْصُرْنَا: نَصَرَ الْمَظْلُوْمَ کے معنے ہوتے ہیں اَعَانَهٗ اُس نے مظلوم کی مدد کی ۔ اور نَصَرَ فُلَانًا عَلٰى عَدُوِّهٖ کے معنے ہیں نَجَّاهُ مِنْهُ وَخَلَّصَهٗ وَاَعَانَهٗ وَقَوَّاهُ عَلَيْهِ ۔ اسے دشمن سے نجات دی ۔ اُس کے پنجے سے چھڑایا ۔ اُس کی مدد کی اور اُسپر غلبہ بخشا (اقرب)

تفسیر: ـــ فرماتا ہے جب مقابلہ ہوا تو طالوت اور اُس کے ساتھیوں نے جالوت اور اُس کے لشکر کو اللہ تعالیٰ کے اِذن کے ماتحت شکست دیدی ۔

مفردات میں لکھا ہے کہ اِذن کے معنے اجازت اور علم کے ہوتے ہیں ۔ نیز لکھا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ میں اذن سے مراد اُس کی مشیت اور حکم ہے ۔ اِسی طرح لکھا ہے کہ اذن میں مشیت کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے جو علم کیلئے ضروری نہیں ۔ ہاں اذن میں رضا کا ہونا ضروری نہیں صرف مشیت کا ہونا ضروری ہے ۔ اسجگہ اذن سے مراد مشیت ہی ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے منشاء اور اس کے ارادہ کے مطابق طالوت نے جالوت کو شکست دے دی ۔

یہ کیا واقعہ ہے جس کا گذشتہ رکوع سے ذکر چلا آرہا ہے ۔ اس بارہ میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے یہاں تک کہ عیسائیوں نے بھی اعتراض کیا ہے کہ قرآن نے دو مختلف زمانوں کے واقعات کو اکٹھا بیان کر دیا ہے ۔ پُرانے مفسرین کا خیال تھا کہ اس کا مصداق ساؤل ہے جو ایک بادشاہ تھا جسے سموائیل نبی کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا ۔ اور جالوت اُس کے دشمنوں میں سے تھا ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بائبل میں ساؤل کے قدوقامت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے ۔

اُنْصُرْنَا

اور لکھا ہے کہ :-

"بنی اسرائیل کے درمیان اُس سے خوبصورت
کوئی شخص نہ تھا۔ وہ ایسا قد آور تھا کہ
لوگ اُس کے کندھے تک آتے تھے۔"
(۱۔ سموایل باب ۹ آیت ۲)

اور یہ بھی ذکر آتا ہے کہ وہ ایک ادنیٰ قبیلہ کے ساتھ تعلق رکھتا تھا۔ (۱۔ سموایل باب ۹ آیت ۲۱)۔ مگر بائیبل سے ہی ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ ساؤل سے ناراض ہوا اور اُس نے بنی اسرائیل کی بادشاہت اُس سے چھین لی۔ (۱۔ سموایل باب ۱۵ آیت ۲۶)

اسی طرح بائیبل سے یہ بھی ثابت ہے کہ ساؤل نے فلستیوں کے مقابلہ میں شکست فاش کھائی اور انہوں نے اُس کے تین بیٹوں کو مار ڈالا۔ اور وہ خود بھی خودکشی کرکے مرگیا۔ (۱۔ سموایل باب ۳۱ آیت ۱ تا ۵)

حالانکہ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ فرشتے اس کی مدد کرتے تھے۔ گویا اُسے فتح پر فتح حاصل ہوتی تھی۔ پس اگر ساؤل کو ہی اس کا مصداق قرار دیا جائے تو قرآنی علامات اس پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ میں نے جب اس واقعہ پر غور کیا تو مجھے وہ معنے پسند آئے جس پر دشمنوں نے اپنی نادانی سے اعتراض کیا ہے۔ اُن کا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کریم نے دو علیحدہ علیحدہ زمانوں کے واقعات کو ملا کر بیان کر دیا ہے۔ اور مفسرین نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ داؤد اور جالوت اور طالوت کا ایک ہی زمانہ ثابت کریں۔ ساؤل پر وہ اس واقعہ کو اس لئے بھی چسپاں کرتے ہیں کہ وہ لمبے قد کا تھا اور دشمن کے ایک بڑے پہلوان کا نام جاتی جولیت (یعنی جالوت) تھا۔ (۱۔ سموایل باب ۱۷ آیت ۴) مگر میرے نزدیک کسی شخص کی تعیین کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ واقعات پر یکجائی نظر ڈالی جائے۔

قرآن کریم میں اس واقعہ کے متعلق پہلی بات یہ بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ہم اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے علیحدہ کئے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم جس کا یہاں ذکر ہے اپنے گھروں سے نکالی گئی تھی۔ دوم اُن پر ایک ایسا شخص بادشاہ بنایا گیا تھا جو کسی اعلیٰ خاندان یا شاہی نسل میں سے نہیں تھا۔ سوم وہ ایسا شخص تھا جس کی اللہ تعالیٰ مدد کرتا تھا اور جس کے ساتھی بھی منصور من اللہ تھے اور اُن کے پاس ایک تابوت تھا۔ چہارم۔ ایک نہر کے ذریعہ اُن کی آزمائش ہوئی تھی۔ پنجم اُن کی اور اُن کے دشمنوں کی تعداد میں بڑا بھاری فرق تھا۔ اُن کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑی تھی اور پھر اس آزمائش کی وجہ سے اس کی جماعت اور بھی کم ہوگئی۔ ششم باوجود اس کے کہ اُس کی فوج دشمن کی فوج سے کم تھی وہ دشمن پر غالب آیا۔

ان میں سے بعض باتیں بیشک ساؤل پر بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ مثلاً ساؤل کے مقرر کرنے میں ایک نبی کا دخل تھا۔ ساؤل کو اپنے دشمنوں پر فتوحات بھی حاصل ہوئیں۔ ساؤل کے ایک دشمن کا نام جالوت بھی تھا۔ مگر میرے نزدیک اس میں جو باتیں دوملی ہیں اور جن کی وجہ سے ساؤل کی بجائے کسی اور شخص کی تلاش ہمارے لئے ضروری ہے وہ یہ ہیں :-

اوّل۔ اس میں مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی کے الفاظ آتے ہیں۔ میرا ذہن ان الفاظ سے اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس میں کسی ایسے زمانہ کا ذکر ہے۔ جہاں سے بنی اسرائیل کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ورنہ داؤد کے ذکر سے بنی اسرائیل تو وہ آپ ہی ثابت ہو جاتے ہیں۔ پھر مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ پس درحقیقت یہ الفاظ اُن کی قومی تاریخ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔

دوم۔ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اُسے ہمیشہ فتح ہی حاصل ہوتی تھی مگر ساؤل کو تو شکستیں

بھی ہوئیں اور پھر اس کا انجام نہایت حسرتناک ہوا۔ حالانکہ قرآن کریم کے بیان کے مطابق ضروری ہے کہ اس کا مصداق ہمیشہ فتح پاتا رہا ہو۔

سوم۔ اِنَّ اللّٰہَ مُبْتَلِیْکُمْ بِنَهَرٍ آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی ایک نہر کے ذریعہ آزمائش کی گئی تھی مگر ساؤل کے زمانہ میں کسی نہر کے ذریعہ لوگوں کا امتحان لئے جانے کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں آتا۔ پس ہمیں اُس شخص کی تلاش کے ساتھ نہر کے واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بائبل ایک نہر کا ذکر ضرور کرتی ہے اور یہ بھی کہتی ہے کہ اس کے ذریعہ ایک قوم کی آزمائش کی گئی۔ ان کو صاف طور پر کہا گیا تھا کہ تم اس سے پانی نہ پیو۔ مگر اکثر لوگوں نے پانی پی لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی پینے والے پیچھے رہ گئے اور نہ پینے والے حملہ کر کے دشمن پر غالب آ گئے۔ گویا قرآنی بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے مگر ساؤل کے زمانہ میں بائبل ایسا کوئی واقعہ بیان نہیں کرتی۔

عیسائیوں نے اس واقعہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جدعون کا واقعہ ہے اور جدعون اور داؤد میں دو سو سال کا فاصلہ ہے۔ مگر قرآن نے اِن دونوں واقعات کو ملا کر بیان کر دیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک قرآن کریم کا یہ کہنا کہ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ داؤد نے جالوت کو قتل کیا غلط ہے۔ کیونکہ داؤد اور جالوت میں دو سو سال کا فرق تھا اور اِس لحاظ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ داؤد جالوت کو قتل کر سکتے۔ میرے نزدیک جدعون کا واقعہ جو بائبل نے بیان کیا ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ واقعہ میں صرف اِس قدر فرق ہے کہ بائبل نے یہ نہیں بتایا کہ اُسے کسی نبی نے مقرر کیا تھا۔ بلکہ اس میں صرف اتنا لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے پاس ایک نبی بھیجا جس نے انہیں کہا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ "تم اِن اموریوں کے دیوتاؤں سے جن کے ملک میں بستے ہو مت ڈرنا پر تم نے میری بات نہ مانی۔" (قضاۃ باب ۶ آیت ۱۰)

اور پھر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ جدعون کو خدا تعالیٰ کا فرشتہ دکھائی دیا اور اُس نے کہا کہ اُٹھ اور مدیانیوں کے ہاتھ سے بنی اسرائیل کو چھڑا۔ (قضاۃ باب ۶ آیت ۱۵) باقی تمام واقعات جو قرآن کریم نے بیان کئے ہیں بائبل میں بھی موجود ہیں۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا زمانہ ۱۴۵۱ قبل مسیح ہے۔ اور جدعون کا واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ۱۲۴۹ قبل مسیح میں ہوا۔ گویا اِن دونوں میں دو سو سال کا فاصلہ ہے۔ اور انسائیکلوپیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے کہ اس وقت جب بنی اسرائیل مصر سے آئے کنعان میں وہ ایک قوم نہیں بنے بلکہ الگ الگ قبیلوں نے جُدا جُدا زمینوں میں اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ اُس وقت اُن میں کوئی بادشاہت نہیں تھی۔ بلکہ دو سو سال تک اُن میں کوئی بادشاہت قائم نہیں ہوئی۔ نہ اُن میں فوجیں تھیں اور نہ اُن کا کوئی بادشاہ تھا پھر بائبل میں ۱۲۵۶ قبل مسیح کے متعلق لکھا ہے :-

"بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی۔ تب خداوند نے انہیں سات برس تک مدیانیوں کے قبضہ میں کر دیا۔ اور مدیانیوں کا ہاتھ بنی اسرائیل پر قوی ہوا اور مدیانیوں کے سبب بنی اسرائیل نے اپنے لئے پہاڑوں میں کھوہ اور غار میں مضبوط مکان بنائے۔"

(قاضیوں باب ۶ آیت ۱، ۲)

یہ واقعہ بعینہٖ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَآئِنَا سے ملتا جلتا ہے۔ آگے لکھا ہے :-

"جب بنی اسرائیل کچھ بوتے تھے تو مدیانی اور عمالیقی اور اہلِ مشرق اُن پر چڑھ آتے تھے

اور اُن کے مقابل ڈیرے لگا کر غزہ تک
کھیتوں کی پیداوار کو برباد کر ڈالتے۔ اور
بنی اسرائیل کے لئے نہ تو کچھ معاش نہ بھیڑ بکری
نہ گائے بیل نہ گدھا چھوڑتے۔"
(قاضیوں باب ۶ آیت ۴)

اِس کے بعد لکھا ہے :۔

"بنواسرائیل مدیانیوں کے سبب نہایت
مسکین ہوئے۔ اور بنی اسرائیل خداوند کے
آگے چلّائے۔" (قاضیوں باب ۶ آیت ۶)

"اور جب بنی اسرائیل مدیانیوں کے سبب
سے خداوند سے فریاد کرنے لگے تو خداوند نے
بنی اسرائیل پاس ایک نبی بھیجا جس نے انہیں
کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے
کہ مَیں تم کو مصر سے چھڑا لایا۔ اور مَیں تمہیں
غلاموں کے گھر سے نکال لایا۔ اور مَیں نے مصریوں
کے ہاتھ سے اور اُن سب کے ہاتھ سے جو تمہیں
ستاتے تھے چھڑایا اور تمہارے سامنے سے
انہیں دفع کیا اور ان کا ملک تم کو دیا اور
مَیں نے تم کو کہا کہ خداوند تمہارا خدا مَیں ہوں
سو تم ان اموریوں کے معبودوں سے کہ جن کے
ملک میں بستے ہو مت ڈرو۔ پر تم میری آواز کے
شنوا نہ ہوئے۔" (قاضیوں باب ۶ آیت ۸ تا ۱۰)

اِس حوالہ میں ایک نبی کا ذکر تو ہوا ہے مگر یہ ذکر نہیں کہ
اُس نبی نے کوئی بادشاہ مقرر کیا ہو۔ صرف اتنا ذکر ہے کہ

"پھر خداوند کا فرشتہ آیا۔۔۔۔ اور اُس
وقت جدعون مے کے کولھو کے پاس گیہوں
جھاڑ رہا تھا۔ کہ مدیانیوں کے ہاتھ سے
انہیں بچاوے۔ سو خداوند کا فرشتہ اُسے
دکھائی دیا اور اُس سے کہا کہ خداوند تیرے
ساتھ ہے۔ اے بہادر پہلوان! جدعون نے
اُسے کہا۔ اے مالک میرے! اگر خداوند ہمارے
ساتھ ہے تو ہم پر یہ سب حادثے کیوں پڑے
اور کہاں ہیں اُس کی وے سب قدرتیں جو ہمارے
باپ دادوں نے ہم سے بیان کیں اور کہا۔
کیا خداوند ہم کو مصر سے نہیں نکال لایا۔ لیکن
اب خداوند نے ہم کو چھوڑ دیا۔ تب خداوند
نے اُس پر نگاہ کی اور کہا۔ کہ اپنی اس قوت
کے ساتھ جا کہ تُو بنی اسرائیل کو مدیانیوں کے
ہاتھ سے رہائی دیگا۔ کیا مَیں تجھے نہیں بھیجتا
اور اُس نے اُسے کہا۔ اے میرے مالک! مَیں
کس طرح بنی اسرائیل کو بچاؤں۔ دیکھ کہ میرا
گھرانا منسی میں حقیر ہے اور مَیں اپنے باپ
دادوں کے گھرانے میں سب سے چھوٹا ہوں
تب خداوند نے اُسے فرمایا کہ مَیں تیرے ساتھ
ہونگا۔ اور تُو مدیانیوں کو ایک ہی آدمی کی
طرح مار لیگا۔"
(قضاۃ باب ۶ آیت ۱۱ تا ۱۶)

قرآن کریم میں بھی جُنُود کا لفظ آتا ہے اور بائبل
بھی بتاتی ہے کہ وہاں مدیانی۔ عمالیقی اور مشرقی تین
قومیں موجود تھیں۔ پھر لکھا ہے :۔

"تب خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ
لوگ ہنوز زیادہ ہیں۔ سو تو انہیں پانی پاس
نیچے لا کہ وہاں میں تیری خاطر انہیں آزماؤنگا۔"
(قضاۃ باب ۷ آیت ۴)

"سو وہ اُن لوگوں کو پانی پاس نیچے لایا۔
اور خداوند نے جدعون کو فرمایا کہ جو شخص
پانی چپڑ چپڑ کر کے کتے کی مانند پیوے تو ہر ایک
ایسے کو علیحدہ رکھ۔ اور ویسے ہر ایک کو بھی

جو اپنے گھٹنوں پر جھک کے پیوے۔ سو جنہوں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ کے پاس لا کے چپڑ چپڑ کر کے پیا۔ وہ گنتی میں تین سو مرد تھے ..... تب خداوند نے جدعون کو کہا کہ میں ان تین سو آدمیوں سے جنہوں نے چپڑ چپڑ کر کے پیا تجھے رہائی بخشونگا۔ اور مدیانیوں کو تیرے ہاتھ میں کر دونگا۔ اور باقی سب لوگوں میں ہر ایک کو اُس کے مکان پر پھر جانے دو۔ تب اُن لوگوں نے اپنا توشہ اور اپنے نرسنگے ہاتھوں میں اُٹھائے اور باقی سب بنی اسرائیل میں سے ہر ایک کو اُس کے خیمے میں بھیجا اور اُن تین سو کو اپنے پاس رکھا۔ اور مدیانیوں کا لشکر اُس کے نیچے وادی میں تھا۔"

(قضاۃ باب ۷ آیت ۴ تا ۸)

آخر میں مدیانیوں سے نجات پانے کا ذکر ہے۔ اور وہ اس طرح کہ جدعون کے ساتھ تین سو آدمی رہ گئے جن کو ساتھ لے کر وہ لڑا اور فتح حاصل کی۔ یہ سارا واقعہ قرآن کریم سے حرف بحرف ملتا ہے۔ اور اس کی بخاری کی ایک روایت سے بھی تائید ہوتی ہے۔ براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں کہ كُنَّا أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَتَحَدَّثُ أَنَّ عِدَّةَ أَصْحَابِ بَدْرٍ عَلٰى عِدَّةِ أَصْحَابِ طَالُوْتَ الَّذِيْنَ جَاوَزُوْا مَعَهُ النَّهْرَ وَلَمْ يُجَاوِزْ مَعَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ بِضْعَةَ عَشَرَ وَثَلَاثُ مِائَةٍ۔ یعنی ہم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے تھے کہ بدر والوں کی تعداد طالوت کے ساتھیوں کی تعداد کے مطابق تھی جو اس کے ساتھ نہر سے گذرے تھے اور اُن کے ساتھ تین سو دس سے کچھ اوپر مومن تھے۔ (بخاری کتاب المغازی باب عدۃ اصحاب بدر)

اسجگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو اس کا نام طالوت آیا ہے اور بائیبل کے حوالہ میں جدعون نام آیا ہے۔ ان میں مطابقت کس طرح ہے۔ سو پہلے میں جدعون کو لیتا ہوں۔

یہ عجیب بات ہے کہ جدعون کے لفظ کے بھی وہی معنے ہیں جو عربی زبان میں طالوت کے ہیں۔ جدعون کے معنے عبرانی زبان میں کاٹ کر نیچے گرا دینے کے ہیں۔ یا تراشنے یا کلہاڑے سے کاٹ دینے کے ہیں۔ پس جدعون ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنے مخالف کو کاٹ ڈالتا اور زمین پر گرا دیتا ہے۔ بائیبل میں جدعون کو زبردست سورما اور بہادر پہلوان کے نام سے پکارا گیا ہے (دیکھو قضاۃ باب ۶ آیت ۱۱) اور طالوت جو جدعون کا صفاتی نام ہے اس کے بھی یہی معنے ہیں۔ کیونکہ طَالَ کے معنے دوسروں سے بلند اور بڑائی والا ہو جانے کے ہیں۔ پس طالوت کے معنے ہیں جو دوسرے سے درجہ اور بڑائی میں اونچا ہو گیا تھا اور دوسروں کو اُس نے نیچا کر دیا تھا۔ گویا اس نام میں بتایا گیا ہے کہ پہلے تو وہ ادنیٰ اور معمولی درجہ کا آدمی تھا مگر پھر بڑا ہو گیا اور خدا تعالیٰ نے اس کو اونچا کر دیا۔ اور اس قسم کے صفاتی نام قرآن کریم میں بعض اور جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرماتا ہے۔ وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (جن آیت ۲۰) یعنی جب اللہ تعالیٰ کا بندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی طرف بلانے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو مکہ کے لوگ اُس پر جھپٹ کر آ گرتے ہیں۔ اسجگہ عبد اللہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ آپ کا نام محمد تھا (صلی اللہ علیہ وسلم) پس جس طرح عبد اللہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صفاتی نام ہے۔ اسی طرح طالوت بھی جدعون کا صفاتی نام ہے اور دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔

اب صرف جالوت کا لفظ تحقیق طلب رہ گیا۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ جالوت بھی ایک صفاتی نام ہے جو کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ ایک گروہ کا نام ہے۔ جس کا کام ملک میں فساد کرنا اور ڈاکے ڈالنا تھا۔ جالوت کو انگریزی زبان میں گولیتھ کہتے ہیں۔ اور گولیتھ کے معنے انگریزی میں destroyers, spirits, running ravaging. کے ہیں۔ یعنی تباہی اور بربادی ڈھانے اور لوٹ مار مچانے والی رُوحیں۔ جو اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی ہوں۔ اور جائل جو اصل میں جالوت ہے اُس قوم کو کہتے ہیں جو ہر طرف قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا بازار گرم کرنے والی ہو۔ بائیبل سے بھی ثابت ہے کہ جدعون کا دشمن ایک آوارہ گرد گروہ تھا جو ملک میں فساد پھیلاتا پھرتا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ وہ لوگ جب حملہ کرتے تھے تو سب کچھ برباد کر دیتے تھے۔ پس یہاں جالوت سے کوئی ایک شخص مراد نہیں بلکہ ایک گروہ مراد ہے جس نے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ بائیبل بتاتی ہے کہ جدعون نے اُن کو شکست دی اور اُس کے بعد ستر سال تک اُس کی حکومت رہی یعنی چالیس سال تک وہ خود حکومت کرتا رہا اور تیس سال تک اُس کا بیٹا۔ اور اُس کے نتیجہ میں متحدہ قومیت کی رُوح یہود میں ترقی کر گئی۔

اِس کے بعد فرماتا ہے۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا۔ یہاں جدعون کے واقعہ کے تسلسل میں ایک نیا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ جدعون کے واقعہ سے بہت کچھ ملتا ہے جدعون کے وقت فلسطینیوں نے اسرائیل کو فلسطین سے نکالنے کی بے شک کوشش کی تھی۔ اور جدعون نے اُن کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ لیکن وہ ابتدائی کوششیں تھیں جو حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں آ کر ختم ہوئی۔ اور انہوں نے دشمن کو کلّی طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ پس اس واقعہ کو مشابہت مضمون کی وجہ سے اس کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ پہلا جدعون کا واقعہ ہے۔ اور یہ داؤدؑ کا واقعہ ہے اور دونوں میں دو سو سال کا فاصلہ ہے۔

اب صرف ایک سوال حل طلب رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بائیبل کی رُو سے تو داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا تھا (۱ سموایل باب ۱۷ آیت ۵۰ و ۵۱) لیکن قرآن کریم نے جدعون کے واقعہ میں بھی جالوت کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ تو انہوں نے کہا۔ اے ہمارے ربّ! ہم پر قوّتِ برداشت نازل کر اور ہمارے قدموں کو ثبات بخش اور کفّار کے خلاف ہماری تائید اور نصرت فرما۔

اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ جالوت ایک صفاتی نام ہے۔ اور اس سے مراد ایسا گروہ ہے جو ملک میں فساد کرتا پھرے اور چونکہ جدعون کا دشمن بھی ایک آوارہ گرد گروہ تھا جو ملک میں فساد پھیلاتا پھرتا تھا اور حضرت داؤد علیہ السلام نے ملک میں امن قائم کرنے کے لئے جس دشمن کا مقابلہ کیا وہ بھی آوارہ گرد اور فسادی تھا۔ اس لئے دونوں کے دشمنوں کو صفاتی لحاظ سے جالوت کہا گیا ہے اور ان دونوں کا اکٹھا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ جدعون کے ہاتھ سے تو دشمن کو صرف شکست ہوئی تھی مگر داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں اُن کی کلّی تباہی ہوئی اور آپ نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ گویا دشمن کے مقابلہ کی ابتداء جدعون سے ہوئی اور اُسکا انتہاء داؤدؑ پر ہوا۔ اسی لئے قرآن کریم میں قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۳﴾

یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں ہم تجھے پڑھ کر سناتے ہیں اس حالت میں کہ تو حق پر (قائم) ہے اور تو یقیناً رسولوں میں سے ہے۔ ۱۶۲؎

کے الفاظ آئے ہیں۔ کہ داؤد نے جالوت کا خاتمہ کر دیا۔ اور طالوت اور اُس کے ساتھیوں کے متعلق صرف هَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی انہوں نے اپنے دشمنوں کو شکست دی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ جدعون نے ۱۲۵۶ قبل مسیح میں مخالفوں کو شکست دی اور ۱۱۶۱ قبل مسیح تک اُسکی اور اس کے بیٹے کی حکومت رہی۔ اس کے بعد ۱۰۵۰ قبل مسیح میں بنی اسرائیل کا کنعان پر داؤد کے ذریعے قبضہ ہوا۔ غرض جدعون اور داؤد کے اکٹھا ذکر کرنے اور ان دونوں کے واقعات کو ملا کر بیان کرنے کی یہی وجہ ہے کہ جدعون وہ پہلا شخص ہے جس نے بنی اسرائیل کے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اور یہود میں متحدہ قومیت کی رُوح پھونکی۔ اور داؤد علیہ السلام آخری شخص ہیں جن کے ہاتھوں دشمن کی کلّی تباہی ہوئی غرض جدعون پہلا نقطہ ہے اور داؤد آخری نقطہ۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ میں بتایا کہ اگر ہم شریروں کا بعض دوسرے انسانوں کے ذریعے قلع قمع نہ کرتے تو دنیا میں فساد برپا ہو جاتا۔

یہ اس لئے فرمایا کہ جدعون اور داؤد دونوں کی جنگیں مذہبی تھیں۔ کیونکہ اُن کے دشمن اُن کی عبادت گاہیں گرا کر اُن کی جگہ اپنی عبادتگاہیں بنا دیتے تھے۔ جیسا کہ جدعون کے متعلق قاضیوں باب ۶ اور داؤد کی نسبت ۲۔ سموایل سے ثابت ہے۔

چونکہ اسلام کو بھی مذہبی جنگوں کا سامنا کرنا تھا اس لئے اللہ تعالےٰ نے جدعون اور داؤد کے واقعات پیش کر کے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ اب تم بھی کھڑے ہو جاؤ اور شریروں کا مقابلہ کرو۔ اور دنیا میں نیکی اور تقویٰ پھیلاؤ۔ کیونکہ بحر و بر میں فساد برپا ہو چکا ہے۔ اور اس امر کو یاد رکھو کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے جدعون اور داؤد کو مدد دی تھی اسی طرح اب اس کی معجزانہ نصرت تمہارے لئے ظاہر ہو گی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا تباہ ہو جائے اور امن کبھی قائم نہ ہو۔

۱۶۲؎ **تفسیر:**— فرماتا ہے طالوت اور داؤد کے واقعات ہم نے قصہ کے رنگ میں بیان نہیں کئے بلکہ یہ پیشگوئیاں ہیں جن کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی یہی واقعات پیش آنے والے ہیں اور ان کو بھی وہی نصرت اور تائید حاصل ہو گی جو پہلے انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھی۔ اور اس طرح دنیا پر ظاہر ہو جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تعالےٰ کے سچے فرستادہ اور اس کے برگزیدہ رسول ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ

یہ (مذکورہ بالا) رسول وہ ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی تھی ۔ اُن میں سے

مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا

بعض ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور اُن میں بعض کے (فقط) درجات بلند کئے ۔ اور

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

عیسیٰ ابن مریم کو ہم نے کھلے کھلے دلائل دیئے تھے اور رُوح القدس کے ذریعہ سے اُسے طاقت بخشی تھی ۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْ

اور اگر اللہ چاہتا تو جو لوگ اُن کے بعد (آئے) تھے وہ کھلے (کھلے) نشانوں

بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

کے آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن (تعجب ہے کہ) انہوں نے (باوجود اس کے) اختلاف کیا۔ چنانچہ

مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟

اُن میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کر دیا ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے (جھگڑتے)

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝۲۵۴ ع ۳۳ ۱

لیکن اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے ۔ ۱۶۳

۱۶۳ **تفسیر** :- فرماتا ہے ۔ یہ رسول جنکا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایسے ہیں کہ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی تھی ۔ یعنی ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے حضور زیادہ بلند مقام رکھتے تھے اور بعض نسبتاً کم ۔ یہ اس لئے کہا گیا ہے کہ پچھلے انبیاء کے ذکر پر طبعی طور پر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ پہلے انبیاء تو ایک ایک قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور ان کا مقابلہ بھی صرف اپنی اپنی قوم کے افراد سے تھا ۔ کوئی عالمگیر مخالفت اُن کی نہیں ہوئی ۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ دعویٰ ہے کہ میں ساری دنیا کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔ پھر آپ ساری دنیا کے مقابلہ میں کس طرح فتح پا سکتے ہیں ۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے رسولوں میں بھی تو آپس میں درجہ اور مقام کے لحاظ سے فرق تھا ۔ یہ تو نہیں کہ سب ایک ہی درجہ رکھتے تھے ۔ آخر کمال کے بھی ہزاروں درجے ہیں اور خود انبیاء میں بھی مدارج فضیلت میں

فرق ہوتا ہے۔ پس اُن میں سے ہونے کے یہ معنے نہیں کہ اُن جیسا ہی درجہ بھی ہو۔ اور کوئی فضیلت نہ ہو۔ مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ نبی ہونے کے علاوہ بادشاہ بھی تھے۔ اور اس طرح اُن کو بعض انبیاء کے مقابلہ میں ایک ظاہری فضیلت حاصل تھی۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فضیلت عطا کی گئی۔ مگر داؤد کی فضیلت تو صرف چند نبیوں پر تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت سب انبیاء پر ہے۔ بلکہ آپ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اگر موسیٰ اور عیسیٰ بھی میرے زمانہ میں زندہ ہوتے تو وہ میری اطاعت کرتے۔

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ سے بعض لوگوں نے بالمشافہ گفتگو کرنا مراد لیا ہے۔ یعنی ایسے طریق پر کلام کرنا کہ درمیان میں جبرائیلی واسطہ نہ ہو۔ مگر میرے نزدیک مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ سے تشریعی نبی مراد ہیں اور رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ سے غیر تشریعی انبیاء مراد ہیں۔ اس لئے کہ کلام تو ہر ایک رسول سے ہوتا ہے۔ بغیر کلام کے وہ نبی کیونکر ہو سکتا ہے اور درجہ بھی ہر ایک کا بلند ہوتا ہے۔ لیکن جب مقابلہ ہو تو اس کے یہی معنے ہونگے کہ بعض کو شریعت دی اور بعض کو صرف نبوت کا درجہ دیا گیا۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اُن کو شریعت نہیں دی گئی محض نبوت عطا کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت قرآن کریم سے بھی ملتا ہے اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء آیت ۱۶۵) اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے خوب اچھی طرح کلام کیا۔

یہ کہ كَلَّمَ اللّٰهُ کے معنے شریعت کے ہیں اس کا ثبوت ایک حدیث سے بھی ملتا ہے۔ امام احمدؒ نے ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پہلے نبی آدم تھے۔ وہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ وَنَبِيٌّ كَانَ۔ کیا وہ نبی تھے؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں! نَبِيٌّ مُكَلَّمٌ (تفسیر فتح البیان جلد اول صفحہ ۳۳۳) وہ مکلّم نبی تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض نبی مکلّم نہیں ہوتے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے کلام تو سب انبیاء سے کیا ہے اس لئے اس جگہ کلام سے مراد کلام شریعت ہے۔ اور رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ کے معنے یہ ہیں کہ بعض کو شریعت نہیں دی۔ ہاں نبوت کے درجۂ رفیع پر اُن کو سرفراز فرمایا۔ جیسے دوسری جگہ فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ۔ (بقرہ آیت ۸۸) یعنی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کے بعد ہم نے اُس کی تعلیم کی اشاعت کیلئے پے درپے انبیاء بھیجے۔ یہ تمام انبیاء غیر تشریعی تھے جو موسوی شریعت کے تابع تھے۔

پھر فرماتا ہے وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے کھلے نشانات دیئے اور رُوح القدس کے ساتھ اس کی تائید کی۔ اس جگہ یہ نکتہ یاد رکھنے والا ہے کہ اس سورۃ میں چونکہ یہود مخاطب ہیں۔ اس لئے حضرت مسیحؑ کے ذکر کے ساتھ ہی اُن کی بعض صفات بھی بتا دی جاتی ہیں تاکہ دشمن پر حجت ہو۔ اس سے اُن کی کسی خاص فضیلت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مسیحیوں نے سمجھا ہے۔

اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ میں فرما کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے بلکہ انہوں نے تورات کے بعض مضامین کو نمایاں طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور رُوح القدس سے اللہ تعالیٰ نے اُن کی تائید فرمائی تھی۔ کیونکہ گو موسوی دور میں شریعت کی تکمیل ہو گئی تھی لیکن آہستہ آہستہ لوگوں کی نگاہ مغز سے ہٹ کر صرف چھلکے کی طرف آگئی۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تاکہ ایک طرف تو تورات کے احکام پر عمل کرائیں جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے:-

یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں
کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں
بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ " (متی باب ۵ آیت ۱۷)

اور دوسری طرف وہ لوگ جو بالکل اس کے چھلکے کو پکڑ کر بیٹھ گئے تھے ضروری تھا کہ اُن کی اصلاح کی جاتی۔ اور اس نکتہ کو کھول کر بیان کیا جاتا کہ ظاہری شریعت اس دنیا کی زندگی کو درست کرنے کے لئے اور باطنی شریعت کے قیام میں مدد دینے کے لئے ہے۔ ورنہ اصل چیز صرف باطنی صفائی اور پاکیزگی اور تقدس ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ کام لیا۔ انہوں نے ایک طرف تو موسوی احکام کو دوبارہ اصل شکل میں قائم کیا اور دوسری طرف جو لوگ قشر کی اتباع کرنے والے تھے انہیں بتایا کہ اس ظاہر کا ایک باطن ہے۔ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو ظاہر لعنت بن جاتا ہے۔ نمازیں بڑی اچھی چیز ہیں لیکن اگر تم صرف ظاہری نماز ہی پڑھو گے اور باطنی نہیں پڑھو گے تو وہ نماز تمہارے لئے لعنت بن جائیگی روزہ بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن اگر تم ظاہری روزہ کے ساتھ باطنی روزہ نہ رکھو گے تو یہ ظاہری روزہ لعنت بن جائیگا یہ وہی بات ہے جو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ (ماعون آیت ۵) یعنی بعض نمازیں پڑھنے والے ایسے ہیں کہ نماز اُن کے لئے ویل اور لعنت بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ پوری بات کھول کر بتادی تھی اس وجہ سے انہیں دھوکا نہ لگا۔ یہ کھول کر بتانا بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کے مطابق تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ رُوحِ حق آئے تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی بلکہ جو کچھ سُنے گی سو کہے گی (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۳) بہر حال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بات کو واضح کرنے کی وجہ سے باوجود اس کے کہ آپ نے بھی وہی بات کہی تھی جو حضرت مسیح علیہ السلام نے کہی تھی مسلمانوں کو دھوکا نہ لگا۔ اور انہوں نے شریعت کو لعنت نہ قرار دیا۔ بلکہ صرف اس عمل پر شریعت کو لعنت قرار دیا جس کے ساتھ دل کا تقدس اور اخلاص اور تقویٰ شامل نہ ہو۔ مگر مسیحیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام سے دھوکا کھایا۔ اور جب اُن کی روحانیت کمزور ہوئی تو انہوں نے اپنی کمزوری کے اثر کے ماتحت غلط تاویلوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ اور شریعت کو لعنت قرار دینے لگے اور یہ خیال نہ کیا کہ اگر وہ لعنت ہے تو حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور اُن کے حواری روزے کیوں رکھتے تھے عبادتیں کیوں کرتے تھے۔ ان امور سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ ظاہری عبادت کو لعنت نہیں سمجھتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ظاہر کے ساتھ باطن کی اصلاح نہ کی جائے تو وہ ظاہر لعنت بن جاتا ہے۔

غرض اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے یہ معنے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پاکیزگی قلب کے خاص راز ظاہر کئے گئے تھے اور قدوسیّت اور باطنی تعلیم پر زور دینے کے لئے اُن کو خاص طور پر حکم دیا گیا تھا۔ اور ظاہری احکام کی باطنی حکمتیں انہیں سمجھائی گئی تھیں۔ گویا اُن کے دَور میں تصوّف نے زمانۂ بلوغت میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا میں بتایا کہ اتنے نبیوں کے واقعات دیکھنے کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ لوگ سنبھل جاتے اور آئندہ اُن کے بارہ میں کوئی مخالفانہ رویّہ اختیار نہ کرتے۔ لیکن اس رسول کے آنے پر انہوں نے پھر اختلاف کیا۔ اور بعض تو ایمان لے آئے اور بعض نے انکار کر دیا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔ اور اگر اللہ چاہتا یعنی لوگوں کو جبراً ہدایت دینا چاہتا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ

اے ایمان دارو! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اُس میں سے اُس دن کے آنے سے

قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا

پہلے کہ جس میں نہ کسی قسم کی (خرید و) فروخت نہ دوستی اور نہ شفاعت (کارگر) ہو گی (خدا کی

شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۵﴾

راہ میں جو کچھ ہو سکے) خرچ کر لو۔ اور (اس حکم کا) انکار کرنے والے (اپنے آپ پر) ظلم کرنے والے ہیں۔ ۲۶۴ـہ

تو کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ مگر چونکہ انسان کی پیدائش کی غرض ہی یہی تھی کہ اُسے آزادانہ طور پر نیکی اور بدی میں حصہ لینے کا موقعہ دیا جائے اور اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ فرما چکا تھا کہ ہم انسان کو خیر کی بھی مقدرت دینگے اور شر کی بھی۔ اور پھر جو رستہ وہ اختیار کریگا اس کے مطابق ہم اُسے نیک یا بدجزا دیں گے۔ اس لئے وہ اس فیصلہ کے مطابق کام کرتا چلا جاتا ہے اور لوگوں کے اعتراضوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

۲۶۴ـہ حل لغات :۔ خُلَّةٌ :۔ اَلْخُلَّةُ کے معنے ہیں اَلصَّدَاقَةُ دوستی اور محبت۔ اور تَخَلَّلَتِ الْقَلْبَ کے معنے ہیں دَخَلَتْ خِلَالَهٗ وہ دوستی اور محبت جو دل کے اندر گھس کر اُس کے سوراخوں میں داخل ہو جائے۔ (مجمع البحار) اَلْخَلِيْلُ مَنْ خُلَّتُهٗ مَقْصُوْرَةٌ عَلٰى حُبِّ اللّٰهِ تَعَالٰى فَلَيْسَ فِيْهَا لِغَيْرِهٖ مُتَّسَعٌ وَلَا شِرْكَةٌ مِنْ مَحَابِّ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (مجمع البحار) خلیل اُسے کہتے ہیں جس کی محبت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ ہو اور اُس کے دل میں اُس محبت کے سوا اور کسی کی محبت نہ ہو۔ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول درج ہے کہ اِنِّيْ اَبْرَءُ اِلٰى كُلِّ ذِيْ خُلَّةٍ مِنْ خُلَّتِهٖ لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ۔ یعنی میں ہر شخص کی دوستی سے برات کا اظہار کرتا ہوں اور صرف خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ اگر دنیا میں مَیں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا۔

شَفَاعَةٌ : شَفْعٌ سے نکلا ہے اور شَفْعٌ کے معنے جفت کے ہیں۔ يُقَالُ شَفَعَ الْعَدَدَ وَشَفَعَ الصَّلٰوةَ صَيَّرَهَا شَفْعًا۔ یعنی شَفَعَ الْعَدَدَ کے معنے ہیں عدد کو جفت بنایا اور شَفَعَ الصَّلٰوةَ کے معنے ہیں نماز کو جوڑا بنا دیا۔

تفسیر :۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اسلام نے صرف زکوٰۃ اور مال غنیمت کے اموال سے ہی غرباء اور مساکین کی امداد کے لئے ایک فنڈ مقرر کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو عام طور پر بھی غریبوں اور نادار وں کے لئے صدقہ و خیرات کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ تمہارے ساتھ ترقیات کے جو وعدے کئے گئے ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہمیں اب مزید قربانیوں کی ضرورت نہیں قربانیاں تمہیں قدم قدم پر کرنی پڑیں گی اور قدم قدم پر تمہیں اپنے اموال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے پڑیں گے۔

لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ میں جس بیع کی طرف اشارہ ہے اس کا ذکر دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اِن الفاظ میں فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى

خُلَّةٌ

شَفَاعَةٌ

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ

اللہ (ذات) ہے جس کے سوا پرستش کا (اور) کوئی مستحق نہیں۔ کامل حیات والا (اپنی ذات میں) قائم (اور سب کو) قائم رکھنے والا۔ نہ اُسے اونگھ

لَا نَوْمٌ ۚ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ مَنْ

آتی ہے اور نہ نیند (کا وہ محتاج ہے) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی

ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ یَعْلَمُ مَا

اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں سفارش کرے۔ جو کچھ اُن کے سامنے

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ آیت ۱۱۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ایک بیع کی ہے اور وہ یہ کہ اُن کے مالوں اور جانوں کو جنت دیکر خرید لیا ہے۔ پس فرمایا خدا تعالیٰ تم سے یہ بیع کرتا ہے۔ مگر یہ بیع اسی دنیا میں ہوگی اُس دن نہیں ہوگی۔

وَلَا خُلَّةٌ میں بتایا کہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سوا سب خلیل جاتے رہیں گے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں تو دوسری جگہ آتا ہے۔ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (زخرف آیت ۶۸) یعنی متقیوں کے سوا تمام خلیل ایک دوسرے کے دشمن ہونگے۔ پھر جب متقیوں کی دوستی رہے گی تو لَا خُلَّةٌ کا کیا مطلب ہوا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ متقی چونکہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا خلیل سمجھتے ہیں اس لئے اُن کی دوستی خدا تعالیٰ کی دوستی میں شامل ہوگی اس کا کوئی علیحدہ وجود نہیں ہوگا جو وَلَا خُلَّةٌ کے منافی ہو۔ اصل مضمون جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ آج اگر خدا تعالیٰ کو خلیل بنانا ہے تو بنا لو ورنہ اُس دن وہ خلیل نہیں بنے گا۔ اور آج جنکو تم اپنا خلیل بنا رہے ہو اُن کی خلت اور دوستی اس دن تمہارے کسی کام نہیں آئیگی۔ بلکہ تم اُن کے دشمن بن جاؤگے۔ صرف متقی ہی ایسے ہونگے جو اپنے خلیل کے دشمن نہیں ہونگے۔ کیونکہ مومن کا خلیل خدا تعالیٰ ہوتا ہے۔ پس وَلَا خُلَّةٌ سے مراد وہ خلت ہے جو خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی دوسرے سے کی جائے۔

وَلَا شَفَاعَةٌ میں بتایا کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ تم یہیں تعلق پیدا کرلو اور اس کو اپنا ساتھی بنالو۔ ورنہ وہاں تمہیں کوئی ساتھی نہیں ملیگا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (انعام آیت ۵۲) یعنی تو اس کلام کے ذریعہ سے اُن لوگوں کو جو اس بات سے ڈرتے ہیں کہ انہیں ان کے رب کی طرف اکٹھا کرکے لے جایا جائیگا جبکہ اس کے سوا ان کا کوئی مددگار ... ہوگا اور نہ کوئی سفارشی اِس لئے ڈرا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔

اِسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ وَذَكِّرْ بِهٖۤ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا (انعام آیت ۷۱) یعنی تو اس کلام الٰہی کے ذریعہ سے نصیحت کر۔ تا ایسا نہ ہو کہ کسی جان کو اُس کے کمائے ہوئے کے سبب سے اس طرح ہلاکت میں ڈال دیا جائے کہ خدا تعالیٰ کے سوا اس کا نہ کوئی مددگار ہو اور نہ شفیع۔ اور اگر وہ ہر ایک قسم کا بدلہ بھی دیں

بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ

ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے وہ (سب ہی کچھ) جانتا ہے۔ اور وہ اُس کی مرضی کے سوا اُس کے علم کے کسی حصّہ کو

عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

(بھی) پا نہیں سکتے۔ اُس کا علم آسمانوں پر (بھی) اور زمین پر (بھی) حاوی ہے۔

وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۶﴾

اور اُن کی حفاظت اُسے تھکاتی نہیں۔ اور وہ بلند شان (رکھنے) والا (اور) عظمت والا ہے۔ ۱۶۵

تو اُن سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں خدا تعالیٰ کو ولی اور شفیع بنانے والوں کو تو اس دن شفاعت کا حق پہنچیگا لیکن دوسروں کو نہیں نہ اُنکے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔ خدا تعالیٰ کو شفیع اسلئے قرار دیا کہ اُسکی اجازت کے بغیر شفاعت نہیں ہوسکتی پس اصل شفیع وہی ہے۔ فرماتا ہے۔ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (طٰہٰ آیت ۱۱۰) یعنی اُسدن شفاعت سوائے اسکے جس کے حق میں شفاعت کرنیکی اجازت رحمٰن خدا دیگا اور جس کے حق میں بات کہنے کو وہ پسند کریگا اور کسی کو نفع نہیں دیگی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہاں شفاعت بالاذن ہوگی۔ خدا تعالیٰ کو شفیع بنانے والوں کو تو شفاعت کا حق پہنچیگا لیکن اور کسی کو خدا تعالیٰ کے اذن کے بغیر شفاعت کا حق نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء آیت ۲۹) یعنی خدا تعالیٰ اُس کو بھی جانتا ہے جو انہیں آئندہ پیش آنیوالا ہے اور جو وہ پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور وہ سوائے اسکے جس کے لئے خدا نے یہ بات پسند کی ہو کسی کیلئے شفاعت نہیں کرتے اور وہ اُس کے خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔ پھر اس آیت سے اگلی آیت میں فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (سورہ بقرہ آیت ۲۵۶) یعنی کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور کسی کی سفارش کرے۔

بیشک حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نیز انبیاء سابقین کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض امتی بھی شفاعت کرینگے۔ لیکن ان حدیثوں کے بارے میں میری تشریح یہ ہے کہ امت محمدیہ میں سے ایسے افراد کی شفاعت صرف ظلّی ہوگی اصل شفیع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہونگے۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کرینگے اور آپ اللہ تعالیٰ سے۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے بھی اسی عقیدہ کی توضیح فرمائی ہے آپ اپنی کتاب کشتی نوح میں فرماتے ہیں:

"نوعِ انسان کیلئے روئے زمین پر اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو تم کوشش کرو کہ سچی محبت اس جاہ و جلال کے نبی کے ساتھ رکھو۔ اور اس کے غیر کو اس پر کسی نوع کی بڑائی مت دو۔ تا آسمان پر تم نجات یافتہ لکھے جاؤ۔"

بہرحال جب تک کوئی انسان اللہ اور اس کے رسول سے واصل نہ ہوجائے اور اُن کو اپنا جوڑا نہ بنالے اسوقت تک اُسے کسی قسم کی شفاعت میسّر نہیں آئیگی۔

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ میں بتایا کہ یہ ظلم نہیں بلکہ ظلم کفّار نے خود اپنی جانوں پر کیا ہے۔

اَلْحَيُّ

۱۶۵ حل لغات:۔ اَلْحَيُّ: کامل حیات والا۔ اللہ تعالیٰ کے لئے جب اَلْحَيُّ آتا ہے تو الف لام کمال کے معنے دیتا ہے اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حیاتِ کاملہ

اَلْكُرْسِيُّ

رکھتا ہے یعنی ایسی حیات جو اپنے قیام میں کسی اور کی محتاج نہیں۔ نہ کسی اور نے زندگی نہیں بخشی بلکہ اس کی ذات ازلی اور ابدی طور پر زندہ ہے۔

اَلْقَيُّوْمُ

اَلْقَيُّوْمُ: قائم سے نکلا ہے جس کے معنے کھڑے ہونے کے ہیں۔ اسی سے قَيِّمٌ نکلا ہے جس کے معنے نگران اور متولی کے ہیں اور قَيِّمٌ مُسْتَقِيْمٌ کو بھی کہتے ہیں۔ اَمْرٌ قَيِّمٌ ویسا امر جس میں کوئی کجی نہ ہو بلکہ درست اور ٹھیک ہو۔
اَلْقَيُّوْمُ اور اَلْقَيَّامُ کے معنے ہیں جو اپنی ذات میں قائم ہے اور اس کی کوئی ابتدا نہیں (اقرب) اَلْقَيُّوْمُ صرف اُسی کو نہیں کہتے جو اپنی ذات میں قائم ہو بلکہ اس کے معنوں میں دوسرے کو قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا بھی شامل ہے۔ مفردات میں لکھا ہے۔ اَلْقَائِمُ: اَلْحَافِظُ بِكُلِّ شَيْءٍ وَّالْمُعْطِيْ لَهٗ مَابِهٖ قِوَامُهٗ یعنی جو اپنی ذات میں قائم ہو اور ہر چیز کا نگران ہو اور اُسے وہ طاقت عطا کرے جس سے وہ قائم رہ سکے۔ غرض اشیاء میں وہ طاقتیں پیدا کرنا جن سے اُن کے اجزاء جڑے رہتے ہیں اور اپنے مفوّضہ کاموں کو بجا لاتے ہیں قَيُّوْم سے متعلق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اَلْقَيُّوْمُ ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ خود قائم ہے بلکہ اس لئے بھی کہ دوسری سب اشیاء اس کی پیدا کردہ طاقتوں سے قائم رہتی ہیں۔ اَلْقَيُّوْمُ کی صفت اجرام فلکی میں کشش ثقل کے وجود اور خود ذرات کے ایک دوسرے سے اتصال اور ایک دوسرے سے ادغام اور ایک دوسرے کے گرد گھومنے وغیرہ افعال پر لطیف رنگ میں اشارہ کرتی ہے۔

سِنَةٌ

سِنَةٌ:۔ اَلسِّنَةُ مِنَ الْوَسَنِ۔ سِنَة کا لفظ وَسَن سے نکلا ہے اور وَسَنَ الرَّجُلُ کے معنے ہوتے ہیں اَخَذَهٗ ثِقَلُ النَّوْمِ۔ اُسے گہری نیند نے آ پکڑا جس کی علامت اونگھ ہوتی ہے۔ پس سِنَةٌ سے مراد وہ اونگھ ہے جو نیند کے غلبہ کی وجہ سے آنے لگے۔

اَلنَّوْمُ

اَلنَّوْمُ: معمولی نیند جو انسان کو بے اختیار نہ کردے۔

اَلْكُرْسِيُّ: کِرْس سے نکلا ہے جس کے معنے متفرق اجزاء کے اکٹھا ہونے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں كَرَّسْتُ بِنَاءً۔ میں نے عمارت بنائی۔ یعنی اینٹوں پر اینٹیں رکھیں۔ اور کُرْسِیّ علم کو بھی کہتے ہیں اور حکومت کو بھی (مفردات) اس لفظ کی اصل سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں اس کے معنے جمع کرنے اور اکٹھا کرنے کے ہیں۔ اور چونکہ علم بھی پراگندہ معلومات کو جمع کر لیتا ہے اور حکومت ملک کے پراگندہ اجزاء کو جمع کر لیتی ہے اس لئے اسے بھی کرسی کہتے ہیں۔

تفسیر:۔ ان آیات میں پہلی بات جس کی طرف انسان کو متوجہ کیا گیا ہے اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ہے۔ یعنی اے انسان! خدا کو دیکھ کہ صرف وہی تیرا معبود ہے اس کے سوا اور کوئی تیرا معبود نہیں ہے۔

دنیا میں ہر ایک چیز کی قدر اس کی کم یابی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً پانی ایک بہت ضروری چیز ہے مگر لوگ اُسے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس وقت اس کی ضرورت پڑے گی اُسی وقت مل جائیگا۔ ہوا صحت کے لئے کیسی ضروری چیز ہے مگر کوئی انسان اُسکو سنبھالتا نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جب اُسکی ضرورت ہوگی وہ خود ہی ناک اور مُنہ کے راستے اندر چلی جائیگی۔ لیکن یہی پانی جس کی عام طور پر قدر نہیں کی جاتی اور کوئی قیمتی چیز معلوم نہیں ہوتی ایک ایسے جنگل میں جہاں پانی کا نام و نشان نہ ہو نہایت قیمتی ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس وقت کسی کے پاس ایک گلاس پانی ہو۔ تو وہ بہت بڑی قیمت پر بھی کسی کو نہیں دیتا۔ تو ہر چیز کی قیمت اس کی ضرورت کے مطابق گھٹتی بڑھتی ہے۔ دیکھو غلّہ جس وقت زیادہ ہوتا ہے اُس وقت سستا ہوتا ہے اور جب کم ہوتا ہے تو مہنگا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر دنیا میں کئی خدا ہوتے تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ ایک نہ ملا تو اَور مل جائیگا۔ مگر فرمایا۔

صرف ایک ہی اللہ ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اُس کو چھوڑ کر کسی اور کی تلاش کروں گا تو ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ ایک ہی ہے دو نہیں۔ تین نہیں۔ چار نہیں یا ہزاروں لاکھوں نہیں۔ جب ایک ہی اللہ ہے تو اُس کو چھوڑ کر اور کہاں جاؤ گے۔ پھر ہر وقت تمہیں اس کی ضرورت ہے اور ہر لحظہ تم اس کے محتاج ہو۔ دنیا میں لوگ بعض دفعہ بادشاہوں کو ناراض کر لیتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کیا ہوا اگر یہ بادشاہ ناراض ہو گیا ہے۔ تو اس کے ملک کو چھوڑ کر دوسرے کے ملک میں چلے جائیں گے چین کا بادشاہ اگر ظالم ہے تو وہ ایران میں پناہ لے سکتا ہے ایران کا بادشاہ اگر ظالم ہے تو انگلستان میں پناہ لے سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے بھاگ کر وہ کہاں جائیگا۔ کیونکہ کوئی زمین ایسی نہیں جو خدا کی نہ ہو۔ اور کوئی حکومت ایسی نہیں جو خدا کے قبضہ میں نہ ہو۔ پھر کوئی دوسرا خدا نہیں کہ انسان اُس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ کئی خدا ہیں اور اُن کے خداؤں میں جھگڑے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ شِو نے ایک آدمی پر ناراض ہو کر اُسے مار ڈالا۔ لیکن وہ برہما خدا کا پیارا تھا اُس نے کہا ہم پیدا کرنے والے ہیں ہم اس کو زندہ کریں گے چنانچہ برہما نے اُسے زندہ کر دیا۔ مگر شِو نے اُسے پھر مار دیا۔ اور برہما نے پھر اُسے زندہ کر دیا۔ غرض شِو اُسے مارتے جاتے اور برہما زندہ کرتے جاتے۔ یہی اُن کا جھگڑا لگا رہا۔ یہ ہندوؤں کے خیالات ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تو ایسے خدا نہیں ہیں کہ ایک مارے اور دوسرا زندہ کرے۔ ایک ناراض ہو تو دوسرا راضی ہو جائے۔ دیکھو ایک ملازم اپنے آقا کو جواب دے سکتا ہے کہ میں تمہاری ملازمت نہیں کرتا کیونکہ اُسے دوسری جگہ ملازمت مل جاتی ہے۔ مگر ہم خدا تعالیٰ کو یہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ ایک ہی آقا ہے اور اُس کے سوا اور کوئی آقا نہیں۔ پھر ہمارا خدا ایک زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا آدمؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا اور نوحؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ وہ ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ وہ موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ وہ عیسیٰؑ کے زمانہ میں بھی زندہ تھا۔ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی زندہ تھا اور وہ آج بھی زندہ ہے۔ اور اگر دنیا اور ہزار سال تک قائم رہے گی تو ہزار سال تک اور اگر ایک کروڑ سال تک قائم رہے گی تو کروڑ سال تک اور اگر ایک ارب سال تک قائم رہے گی تو ایک ارب سال تک وہ اپنی زندگی کے نشانات دکھاتا چلا جائیگا۔ کیونکہ وہ حَیّ و قَیُّوم خدا ہے اور وہ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ کا مصداق ہے۔ اُسپر اونگھ اور نیند ہی نہیں آتی تو اُس کے زندہ نشانات کا سلسلہ کس طرح ختم ہو سکتا ہے۔ جب ایسے خدا سے انسان اپنا تعلق پیدا کر لیتا ہے تو اس کی ضرورتوں کا وہ آپ کفیل ہو جاتا ہے اور ہمیشہ اس کی تائید کے لئے اپنے غیر معمولی نشانات ظاہر کرتا ہے۔

ہم نے دیکھا ہے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے پاس اکثر لوگ اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ اور آپ اُن میں سے ضرورت پر خرچ کرتے رہتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے اِس طرح رزق دیتا رہتا ہے بعض دفعہ ہم نے دیکھا کہ امانت رکھوانے والا آپ کے پاس آتا اور کہتا کہ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے۔ میری امانت مجھے واپس دیدی جائے۔ آپ کی طبیعت بڑی سادہ تھی۔ اور معمولی سے معمولی کاغذ کو بھی آپ ضائع کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ جب کسی نے مطالبہ کرنا تو آپ نے ردّی سا کاغذ اٹھانا اور اُس پر اپنے گھر والوں کو لکھ دینا کہ امانت میں سے دو سو روپیہ بھجوا دیا جائے۔ اندر سے بعض دفعہ جواب آتا کہ روپیہ تو خرچ ہو چکا ہے یا اتنے روپے ہیں اور اتنے روپوں کی کمی ہے۔ آپ نے اُسے فرمانا کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ابھی روپیہ آ جاتا ہے۔ اِتنے میں ہم نے دیکھنا کہ کوئی شخص دھوتی باندھے ہوئے جونا گڑھ یا بمبئی کا رہنے

چلا آرہا ہے اور اُس نے آکر اتنا ہی روپیہ آپ کو پیش کر دیا۔

ایک دن تو لطیفہ ہوا۔ کسی نے اپنا روپیہ مانگا اُس دن آپ کے پاس کوئی روپیہ نہیں تھا۔ مگر اُسی وقت ایک شخص علاج کے لئے آگیا۔ اور اُس نے ایک پڑیہ میں کچھ رقم لپیٹ کر آپ کے سامنے رکھدی۔ حافظ روشن علی صاحبؓ کو علم تھا کہ روپیہ مانگنے والا کتنا روپیہ مانگتا ہے آپ نے حافظ صاحبؓ سے فرمایا دیکھو اس میں کتنی رقم ہے انہوں نے گنا تو کہنے لگے بس اُتنی ہی رقم ہے جتنی رقم کی حضور کو ضرورت تھی۔ آپ نے فرمایا یہ اُس کو دے دو۔

اِسی طرح آپ ایک پُرانے بزرگ کا واقعہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ایک قرضخواہ اُن کے پاس آگیا۔ اور اُس نے کہا کہ آپ نے میری اتنی رقم دینی ہے اور اس پر اتنا عرصہ گذر چکا ہے۔ اب آپ میرا روپیہ ادا کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس تو ہے نہیں جب آئیگا دیدونگا۔ وہ کہنے لگا۔ تم بڑے بزرگ بنے پھرتے ہو اور قرض لے کر ادا نہیں کرتے یہ کہاں کی شرافت ہے۔ اتنے میں وہاں ایک حلوا بیچنے والا لڑکا آگیا۔ انہوں نے اس سے کہا کہ آٹھ آنے کا حلوہ دیدو۔ لڑکے نے حلوہ دیدیا اور انہوں نے وہ حلوہ اس قارض کو کھلا دیا۔ لڑکا کہنے لگا کہ میرے پیسے میرے حوالے کیجیئے۔ وہ کہنے لگے تم آٹھ آنے مانگتے ہو اور میرے پاس تو دو آنے بھی نہیں۔ وہ لڑکا شور مچانے لگ گیا۔ یہ دیکھکر وہ قرض خواہ کہنے لگا کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ میری رقم تو ماری ہی تھی اِس غریب کی اٹھنّی بھی ہضم کر لی۔ غرض وہ دونوں شور مچاتے رہے اور وہ بزرگ اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اُس نے اپنی جیب میں سے ایک پڑیہ نکال کر انہیں پیش کی۔ اور کہا کہ فلاں امیر نے آپ کو نذرانہ بھیجا ہے۔ انہوں نے اُسے کھولا تو اُس میں روپے تو اتنے ہی تھے جتنے قرضخواہ مانگتا تھا مگر اُس میں اٹھنّی نہیں تھی۔ کہنے لگے۔ یہ میری پڑیہ نہیں اِسے واپس لے جاؤ۔ یہ سُنتے ہی اُس کا رنگ فق ہوگیا۔ اور اُس نے جھٹ اپنی جیب سے ایک دوسری پڑیہ نکالی اور کہنے لگا مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ کی پڑیہ یہ ہے۔ انہوں نے اُسے کھولا۔ تو اُس میں اتنے ہی روپے تھے جو قارض مانگ رہا تھا اور ایک اٹھنّی بھی تھی۔ انہوں نے دونوں کو بُلایا اور وہ روپے انہیں دے دیئے۔ غرض زندہ خدا اپنے بندوں کی تائید میں ہمیشہ اپنے نشانات دکھاتا رہتا ہے۔

پھر وہ اَلْقَیُّوْمُ ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اب تو میرا یہ آقا ہے لیکن پہلے میں فلاں کے پاس ملازم رہ چکا ہوں۔ اس لئے اُس کا بھی مجھ پر احسان ہے اور میرے لئے اُس کی قدر کرنا بھی ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہارا آج خدا نہیں بنا بلکہ ہمیشہ سے خدا ہوں۔ تم پر کسی کا پچھلا احسان نہیں ہے میں وہ خدا ہوں جو ہمیشہ قائم رہنے والا اور تمہیں قائم رکھنے والا ہوں۔ اس لئے تم پر میرا ہی احسان ہے کسی اور کا احسان نہیں۔

پھر فرماتا ہے لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ۔ ممکن ہے کوئی کہے کہ مان لیا خدا ایک ہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ ہے۔ اور وہی ہمارا پہلے آقا تھا اور وہی اب بھی ہے۔ مگر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ خدا کو نیند آئے اور وہ سو جائے۔ اور اس وقت اس کی جگہ اس کے درباری کام کریں۔ اس لئے انہیں بھی خوش رکھنا چاہیئے اور اُن کی بھی خوشامد کرنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تمہارا وہ خدا ہے کہ اُس کو کبھی اونگھ اور نیند نہیں آتی تم اس کو دنیوی بادشاہوں اور حاکموں کی طرح نہ سمجھو۔ جہاں تمہیں درباریوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ تمہارا خدا ایسا نہیں کہ کبھی اُسے اونگھ آئے یا وہ سو جائے۔ وہ ہر وقت جاگتا ہے اور ہر ایک بات کا خود نگران ہے۔

اس میں اللہ تعالےٰ نے کیا ہی لطیف بات بیان فرمائی ہے فرماتا ہے لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ کہ اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ ترتیب کلام کا یہ قاعدہ ہے کہ پہلے

چھوٹی باتوں کا ذکر ہوتا ہے پھر بڑی بات کا۔ اگر اس کے خلاف کیا جائے تو کلام غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص سخت بیمار نہیں تھا بلکہ وہ تو کچھ بھی بیمار نہ تھا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص کچھ بیمار نہیں تھا بلکہ وہ تو زیادہ بیمار بھی نہ تھا تو فقرہ غلط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے بڑا اور پھر چھوٹا درجہ بیان کیا جاتا ہے۔ مگر یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ حالانکہ جب اونگھ کی نفی کر دی گئی تھی تو نیند کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے۔ پھر نیند کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس میں ایک حکمت ہے۔ اور وہ یہ کہ سِنَۃٌ اس کو کہتے ہیں کہ جب سخت نیند کی وجہ سے انسان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ چنانچہ جب انسان کو بہت زیادہ نیند آئی ہوئی ہو اُس وقت اونگھ آتی ہے۔ اور جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو اونگھ نہیں آتی۔ تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ کو کبھی اونگھ نہیں آتی کہ کام کرنے کی وجہ سے وہ تھک گیا ہو۔ اور اُس پر نیند کا ایسا غلبہ ہو کہ اُسکی آنکھیں بند ہو گئی ہوں اور نہ اُسے معمولی نیند آتی ہے۔ غرض ترتیب بیان کے لحاظ سے سِنَۃٌ کا ہی پہلے ذکر آنا ضروری تھا۔ اور نوم کا بعد میں۔

پھر فرمایا۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ تمہارا آقا ایسا ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کچھ اُسی کا ہے۔ ایسی صورت میں تم اُس کے مقابلہ میں کسی اور کو اپنا آقا کس طرح بنا سکتے ہو۔ پھر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کے سوا اور کسی کی عبادت تو نہیں کرتے ہاں دوسروں کو نیازیں دیتے اور اُن سے مرادیں مانگتے ہیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے مقرب ہیں۔ اور وہ خدا تعالیٰ کے حضور ہماری شفاعت کریں گے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ ہمارے حکم کے بغیر تو کوئی شفاعت ہی نہیں کر سکتا پس تمہاری یہ امید بھی غلط ہے

اِس زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھکر اور کون ہے لیکن حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک دفعہ جب نواب محمد علی خان صاحبؓ کے لڑکے عبدالرحیم خان کیلئے جبکہ وہ شدید بیمار تھا دُعا کی تو الہام ہوا کہ "تقدیر مبرم ہے اور ہلاکت مقدر"۔ آپ کو خیال آیا کہ نواب صاحب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر قادیان آ رہے ہیں۔ اُن کا لڑکا فوت ہو گیا تو انہیں ابتلاء نہ آ جائے۔ اس لئے آپ نے خدا تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ الٰہی میں اس لڑکے کی صحت کے لئے شفاعت کرتا ہوں۔ اِس پر آپ کو بڑے زور سے الہام ہوا مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یعنی تم کون ہو جو میری اجازت کے بغیر شفاعت کرتے ہو۔ اب دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کتنے بڑے انسان تھے۔ تیرہ سو سال سے دنیا آپ کی منتظر تھی۔ مگر وہ بھی سفارش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم کون ہو کہ بلا اجازت سفارش کرو۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ جب مجھے یہ الہام ہوا۔ تو میں گر پڑا اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا اور قریب تھا کہ میری جان نکل جاتی۔ لیکن جب یہ حالت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْمُجَازُ اچھا! اب ہم شفاعت کی اجازت دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے شفاعت کی۔ اور عبدالرحیم خان اچھے ہو گئے۔ غرض جب مسیح موعود علیہ السلام جیسے انسان کو ... اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ تم کون ہو جو بلا اذن سفارش کرو تو اور لوگوں کی کیا حیثیت ہے کہ کسی کی سفارش کر سکیں۔

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذن ہوگا تب آپ سفارش کرینگے پھر کیسا نادان ہے وہ شخص جو سمجھتا ہے کہ فلاں میری سفارش کر دیگا۔

پھر ایک اَور بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ کوئی

کہہ سکتا ہے کہ ما شفاعت بلا اجازت نہیں ہو سکتی لیکن بادشاہ کے
جس طرح درباری ہوتے ہیں اور اُن کے ذریعہ بادشاہ تک
رسائی حاصل کرکے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ
کے بھی درباری ہونے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ان
احمقوں کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ دنیا کے بادشاہ کیوں درباری
رکھتے ہیں۔ وہ تو اس لئے رکھتے ہیں کہ انہیں ملک کے حالات
معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ نہیں جانتا
کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو تمہاری اگلی پچھلی
ساری باتیں جانتا ہے پھر اس کو درباری رکھنے کی کیا
ضرورت ہے۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالےٰ اُس کو بھی جانتا ہے
جو آگے ہونا ہے اور اُسے بھی جانتا ہے جو لوگ پیچھے کر
چکے ہیں۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ اُن کاموں
کو بھی جانتا ہے جو وہ کر رہے ہیں اور ان کاموں کو بھی
جانتا ہے جو انہیں کرنے چاہیئے تھے لیکن انہوں نے ترک
کر دیئے۔ پھر اُسے کیا ضرورت ہے کہ درباری رکھے۔

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا
شَآءَ ۔ پھر اس کے علوم کا کوئی شخص احاطہ نہیں کر سکتا
کسی کو اس کی حقیقت اپنی کوشش سے معلوم نہیں ہو سکتی
ہاں جس کو وہ آپ ہی بتا دے اور جس قدر بتا دے وہ
اتنا ہی جانتا ہے اس سے زیادہ نہیں۔ اس آیت میں خدا
تعالےٰ نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ خدا تعالےٰ کے علم کا
کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ
کوئی اور شخص۔ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام
نبیوں کے سردار اور اللہ تعالےٰ کے بڑے محبوب ہیں بلکہ آپکی
اتباع کرنیوالا بھی خدا تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے مگر باوجود
اس کے آپ خدا تعالیٰ کی مخلوق اور اُسی کے محتاج تھے۔
پس آپ کے اندر وہی صفات رہیں گی جو بندوں میں ہوتی ہیں
اور وہ صفات کبھی نہیں آسکتیں جو خدا نے صرف اپنے
لئے مخصوص کی ہوئی ہیں۔

لَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ
میں اس امر کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ
کے قرب کی راہیں اتنی غیر محدود ہیں کہ انہیں کلّی طور پر
طے کرنیکا کوئی انسان خیال بھی نہیں کر سکتا۔ جب کوئی
بندہ اللہ تعالےٰ کے قرب میں بڑھتا ہے اور وہ اپنے مقام
کے مطابق اس کے انوار و برکات کو اپنے اندر جذب کر
لیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے اُس پر اپنی دوسری تجلّی
ظاہر کرتا ہے۔ اور جب وہ دوسری تجلّی کو بھی برداشت
کرلیتا ہے اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اب یہ تیسری تجلّی کے
قابل ہو گیا ہے تو اس پر اپنی تیسری تجلّی ظاہر کرتا ہے۔
اور وہ خدا تعالےٰ کے قرب میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کیفیت کو ایک
نہایت ہی لطیف مثال کے ساتھ واضح فرمایا ہے۔ آپ
فرماتے ہیں کہ جو شخص دوزخ میں سب سے پیچھے رہ جائیگا۔ اللہ
تعالےٰ اُسے کہیگا کہ مانگو مجھ سے کیا مانگتے ہو۔ وہ کہیگا
بس یہی مانگتا ہوں کہ مجھے دوزخ سے نکال دیا جائے۔
اللہ تعالیٰ فرمائیگا کہ اچھا۔ اور وہ اُسے دوزخ سے
نکال لیگا جس سے اُسے بہت خوشی ہوگی۔ لیکن کچھ روز
کے بعد اُسے دُور ایک سرسبز و شاداب درخت نظر آئیگا
اور اُس کے دل میں لالچ پیدا ہوگا کہ اگر مَیں وہاں پہنچکر
اُس کے نیچے بیٹھ سکوں تو کیا اچھا ہو۔ کچھ مدت تک
تو وہ اس خیال کے اظہار سے رُکے گا۔ مگر آخر خدا تعالیٰ
سے کہیگا کہ ہے تو بڑی بات لیکن اگر آپ مجھ پر رحم
کرکے اس درخت کے نیچے بیٹھنے دیں تو بہت مہربانی
ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اُس کی بات کو مان لیگا اور اس درخت
کے نیچے اُسے پہنچا دیگا۔ آخر جب وہ اس درخت کے
نیچے کچھ عرصہ تک راحت حاصل کرلیگا تو پھر اللہ تعالےٰ
امتحان کے لئے اُس سے بہتر درخت اُس سے کچھ فاصلے پر

ظاہر کرے گا۔ اور پھر وہ لالچ کرے گا کہ وہ اُس کے نیچے بیٹھے کچھ مدت تک تو وہ اپنے نفس کی اس خواہش کو برداشت کرے گا اور کہیگا کہ میں اب اللہ تعالےٰ سے یہ سوال کس طرح کروں۔ لیکن آخر وہ درخواست کر ہی دیگا اور کہیگا کہ آئندہ اور کچھ نہ مانگونگا۔ تب خدا تعالےٰ اسے وہاں لے جائیگا۔ اور پھر وہ دُور سے جنت کا دروازہ دیکھیگا اور آخر اُس سے باہر رہنا برداشت نہیں کریگا۔ اور خدا تعالےٰ سے کہیگا کہ مجھے اس جنت کے دروازہ کے آگے تو بٹھا دے میں اندر جانے کی درخواست نہیں کرتا۔ صرف باہر بٹھا دے میں سے لطف حاصل کرونگا۔ اللہ تعالےٰ اس سے پوچھیگا کیا تو اس کے بعد تو کچھ نہیں مانگیگا۔ بندہ کہیگا نہیں۔ اِس پر اللہ تعالےٰ اُسے جنت کے دروازے پر بٹھا دے گا لیکن وہاں اسے کس طرح چین حاصل ہو سکتا ہے آخر وہ بے تاب ہو کر کہیگا کہ یا اللہ مجھے دروازہ کے اندر کی طرف بٹھا دے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے جنت کی نعماء دے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ دروازہ کے اندر بٹھا دے اِس پر اللہ تعالےٰ ہنسیگا اور کہیگا کہ میرے بندہ کی حرص کہیں ختم نہیں ہوتی۔ جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ اور جہاں چاہو رہو۔ غرضیکہ پہلے اللہ تعالیٰ ایک ہلکی سی تجلّی دکھاتا ہے اور اُسے دیکھ کر جب ملائکہ صفت انسان بے تاب ہو جاتا ہے اور دُعائیں کرتا ہے کہ خدایا تو مجھے کامل تجلّی دکھا تو پھر اللہ تعالےٰ اُسے دوسرے مقام کی پہلے ہلکی سی تجلّی دکھاتا ہے اور پھر پوری تجلّی اور یہ سلسلہ اسی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالےٰ کی ہستی غیر محدود ہے اور کوئی شخص اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

پھر فرماتا ہے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ۔ اللہ تعالےٰ کا علم آسمان اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی اسے ہر چیز کا انتہائی علم ہے۔ اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اُس کے علم سے باہر ہو۔ انسانی علم بالکل محدود ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایک چیز کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ اچھی ہے لیکن اس کا نتیجہ خراب ہوتا ہے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو میر عباس علی لدھیانوی کے متعلق ایک وقت علم دیا گیا کہ وہ نیک ہے تو آپ اُس کی تعریف فرمانے لگے۔ مگر چونکہ اُسوقت آپ کو اُس کے انجام کا علم نہیں تھا اِس لئے آپ کو پتہ نہ لگا کہ ایک دن وہ مرتد ہو جائیگا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالےٰ نے آپ کو اس کا علم دے دیا۔ غرض انسانی علم بہت ہی محدود ہے صرف خدا تعالیٰ ہی کامل علم رکھتا ہے جو سب پر حاوی ہے۔ اور کوئی شخص اس کے علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

پھر وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ میں سائنس کے اس عظیم الشان نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کائناتِ عالم کی لمبائی کا اندازہ اللہ تعالےٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اِس زمانہ میں جس حد تک علمِ ہیئت میں ترقی ہو چکی ہے اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ آج دنیا کی لمبائی کا اندازہ میلوں میں نہیں لگایا جاتا۔ مثلاً یہ نہیں کہا جاتا کہ ایک زمین سے دوسری زمین تک اتنے میل کا فاصلہ ہے بلکہ اس لمبائی کا اندازہ روشنی کی رفتار سے لگایا جاتا ہے۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ اسّی ہزار میل چلتی ہے۔ اور دنیا کی وسعت کا اندازہ اِس نور کی روشنی سے لگاتے ہیں۔ گویا یہ بھی اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (نور آیت ۳۶) کی صداقت کا ثبوت ہے۔ کیونکہ اس آیت میں بتایا گیا تھا کہ زمین و آسمان کی وسعت کا اندازہ تم کسی چیز سے نہیں لگا سکتے صرف نور اور اُس کی رفتار سے ہی لگا سکتے ہو۔ غرض جب ایک سیکنڈ میں روشنی ایک لاکھ اسّی ہزار میل چلتی ہے تو ایک منٹ میں ایک کروڑ آٹھ لاکھ میل

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر (جائز) نہیں۔ (کیونکہ) ہدایت اور گمراہی کا (باہمی) فرق خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

چلے گی۔ پھر اُسے ایک گھنٹہ کے ساتھ ضرب دو تو یہ ۶۴ کروڑ ۸۰ لاکھ میل بنتے ہیں۔ اِن میلوں کو ایک دن کی روشنی کا حساب لگانے کے لئے ۲۴ سے ضرب دیں تو یہ ۱۵ ارب ۵۵ کروڑ ۲۰ لاکھ میل رفتار بن جاتی ہے۔ اب پھر ایک سال کی رفتار کا حساب لگانے کے لئے ۳۶۰ دنوں سے ضرب دیں تو ۵۵ کھرب ۷۶ ارب ۲ کروڑ میل بنتے ہیں۔ یہ حساب صرف روشنی کے ایک سال کی لمبائی کا ہوتا ہے۔ لیکن دنیا کی لمبائی علم ہیئت والے روشنی کے تین ہزار سال قرار دیتے تھے۔ پس اِن اعداد کو تین ہزار سال سے ضرب دینی ہوگی۔ اب اسکا حاصل ضرب جو نکلے وہ حسابی لحاظ سے درحقیقت ناقابلِ اندازہ ہی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اربوں کے اوپر کا حساب درحقیقت حساب ہی نہیں سمجھا جاتا۔ مگر یہ حساب یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ جوں جوں نئے آلات دریافت ہو رہے ہیں یہ اندازے بھی غلط ثابت ہو رہے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد یہ قرار دیا گیا کہ دُنیا کی لمبائی روشنی کے چھ ہزار سال کے برابر ہے۔ مگر اس کے بعد تحقیق ہوئی کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ ہم دنیا کی لمبائی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ جس طرح بچہ کا قد بڑھتا ہے۔ اسی طرح دنیا بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اب اسکی لمبائی روشنی کے بارہ ہزار سالوں کے برابر سمجھی جاتی ہے۔
اِس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ (زمر آیت ۶۸) یعنی سب کی سب زمین اُس کی مملوکہ ہے۔ اور آسمان اور زمین دونوں قیامت کے دن اُس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہونگے۔ اور جو چیز خدا کی مٹھی میں ہو اس کا اندازہ انسان کہاں لگا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب انسان کا علم اندازے کے قریب قریب پہنچنے لگتا ہے تو خدا تعالیٰ کائنات کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ غرض اس نئے علم سے وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کی صداقت کا سائنس نے اقرار کر لیا ہے۔ اور دنیا اِس حقیقت کو تسلیم کر چکی ہے کہ زمین و آسمان کی وسعت کا اندازہ خدا تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔

وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔ پھر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا علم حاصل کرنے کے لئے تو اپنے دربار مقرر نہیں کئے۔ لیکن کام کرنے کے لئے کچھ مددگار تو ضرور مقرر کئے ہونگے تاکہ وہ اس کا ہاتھ بٹائیں۔ فرمایا اللہ کو اِس کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ سب کام خود کر رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طاقت ایسی وسیع ہے کہ کوئی چیز اُس کے قبضہ سے باہر نہیں۔ اور نہ کسی چیز کا انتظام اُس کو تھکا سکتا ہے۔

اب ایک ہی اعتراض رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مانا خدا کو علم کے لئے اور مدد کے لئے کسی کی ضرورت نہیں مگر شان و شوکت بھی تو کوئی چیز ہے اس کے اظہار کیلئے ہی اُس نے درباری مقرر کئے ہونگے۔ اِس اعتراض کو وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ کہہ کر رد فرما دیا۔ یعنی وہ بہت بڑا ہے اور کوئی چیز نہیں جو اُس کے ساتھ مل کر اُس کے رتبہ کو بڑھا سکے۔ جو چیز خدا کے ساتھ ملے گی اُس کا اپنا ہی رتبہ بڑھیگا۔ نہ کہ خدا کا۔ پس یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے شان و شوکت کے لئے درباری مقرر کئے ہونگے ٹھیک نہیں۔ وہ بہت بلند اور بڑی شان رکھنے والا ہے۔

عَلِيٌّ میں اسکی رفعت اور بلندی کی طرف اور عَظِيْمٌ میں اُس کی طاقتوں کی وسعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ خدا ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اگر ایسے خدا کے ہوتے ہوئے کوئی کسی اور طرف جائے تو کتنے بڑے افسوس

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ

پس سمجھ لو کہ جو شخص (اپنی مرضی سے) نیکی سے روکنے والے (کی بات ماننے) سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان رکھے تو اُس نے (ایک) نہایت

بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۷﴾

مضبوط قابلِ اعتماد چیز کو جو (کبھی) ٹوٹنے کی نہیں مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اللہ بہت سننے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔[۱۶۶]

کی بات ہے۔ اگر کسی شخص کو نہایت عمدہ کھانا ملے۔ اور وہ اُسے چھوڑ کر نجاست کی طرف دوڑے۔ اگر کسی شخص کو عمدہ کپڑا ملے اور وہ اُسے چھوڑ کر میلی کچیلی لنگوٹی باندھ لے تو بتاؤ کیا وہ دانا اور عقلمند کہلانے کے قابل ہوگا۔ نہیں اور ہرگز نہیں۔ دانا وہی ہے جو بہتر چیز کو پسند کرے۔ پس اللہ تعالیٰ سے بہتر اور کوئی نہیں۔

۱۶۶ حل لغات :- رُشْدٌ : رشد کے معنے ہیں صداقت پر استقلال سے قائم رہنا نیز یہ غَیٌّ کے اضداد میں سے ہے۔ (اقرب)

اَلْغَیُّ کے معنے ہیں اَلضَّلَالَۃُ۔ گمراہی۔ اَلْھَلَاکَۃُ تباہی۔ اَلْخَیْبَۃُ۔ ناکامی۔ (اقرب)

اَلطَّاغُوْتُ :- طَغٰی سے نکلا ہے جس کے معنے ہر ایسی چیز کے ہیں جو حد سے نکل جائے۔ اور سرکش ہو جائے طاغوت کے ان معنوں میں شیطان بھی شامل ہے۔ کیونکہ وہ انسان کو سرکشی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور اس میں وہ انسان بھی شامل ہیں۔ جو لوگوں کو خدا تعالیٰ سے دُور کرتے ہیں۔

اِسْتِمْسَاكٌ کے معنے پکڑنے کے ہیں۔

اَلْعُرْوَۃُ :- اَلْعُرْوَۃُ مِنَ الدَّلْوِ وَالْکُوْزِ اَلْمِقْبَضُ اَیْ اُذُنُھُمَا۔ یعنی عروہ ڈول یا لوٹے کے دستہ کو کہتے ہیں جس سے اُسے پکڑا جاتا ہے۔ اسی طرح عروہ کے معنے مَا یُوْثَقُ بِہٖ کے بھی ہیں۔ یعنی ایسی چیز جس پر اعتبار کیا جائے۔ گویا ہر ایسی چیز جس پر سہارا لیا جائے یا جس پر اعتماد کیا جاسکے وہ عروہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح عروہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو کبھی ضائع نہ ہونے والی ہو چنانچہ عروہ اس گھاس کو کہتے ہیں جو ہمیشہ ہرا رہے۔ اور عروہ کے معنے اَلنَّفِیْسُ مِنَ الْمَالِ کے بھی ہیں۔ یعنی اچھا اور بہترین مال۔ (اقرب)

تفسیر :- یہ عجیب بات ہے کہ اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ جبر سے دین پھیلانے کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اسلام اگر ایک طرف جہاد کے لئے مسلمانوں کو تیار کرتا ہے جیسا کہ اس سورۃ میں وہ فرما چکا ہے کہ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (بقرہ آیت ۱۹۱) یعنی تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ یعنی جنگ کا جو حکم تمہیں دیا گیا ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے لئے جبر کرنا جائز ہو گیا ہے۔ بلکہ جنگ کا یہ حکم محض دشمن کے شر سے بچنے اور اُس کے مفاسد کو دُور کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ اگر اسلام میں جبر جائز ہوتا تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ قرآن کریم ایک طرف تو مسلمانوں کو لڑائی کا حکم دیتا اور دوسری طرف اُسی سورۃ میں یہ فرما دیتا کہ دین کے لئے جبر نہ کرو۔ کیا اس کا واضح الفاظ میں یہ مطلب نہیں کہ اسلام دین کے معاملہ میں دوسروں پر جبر کرنا کسی صورت میں بھی جائز قرار نہیں دیتا پس یہ آیت دین کے معاملہ میں ہر قسم کے جبر کو نہ صرف ناجائز قرار دیتی ہے بلکہ جس مقام پر یہ آیت واقع ہے اس سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام جبر کے بالکل خلاف ہے۔

رُشْدٌ
اَلْغَیُّ
اَلطَّاغُوْتُ
اِسْتِمْسَاكٌ
اَلْعُرْوَۃُ

پس عیسائی مستشرقین کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ غیر مذاہب والوں کو اسلام میں داخل کرنے کا حکم دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی وہ سب سے پہلا مذہب ہے جس نے دنیا کے سامنے یہ تعلیم پیش کی کہ مذہب کے معاملہ میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہے اور دین کے بارہ میں کسی پر کوئی جبر نہیں۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی اس سے پہلے ایک جملہ مقدّر ہے جس کا یہ جواب دیا گیا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ دین کے لئے جبر جائز نہیں۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب دین ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہے تو کیوں اس کے لئے لوگوں پر جبر نہ کیا جائے۔ اور انہیں بزور اس نعمت سے متمتع نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اس سوال کے جواب میں فرماتا ہے جب گمراہی اور ہدایت ظاہر ہو گئی ہے تو اب جبر کی ضرورت نہیں۔ صرف ہدایت کا پیش کر دینا تمہارا کام ہے۔ کیونکہ جو حق بات تھی وہ گمراہی اور ضلالت کے بالمقابل پورے طور پر ظاہر ہو گئی ہے۔ غرض اس آیت میں خدا تعالیٰ نے وجہ بیان فرمائی ہے کہ کیوں اسلام کو جبر کی ضرورت نہیں۔ فرماتا ہے۔ جبر اس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی بات دلیل سے ثابت نہ ہو سکے۔ یا جس کو سمجھایا جائے۔ وہ سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ مثلاً ایک بچہ کی عقل چونکہ کمزور ہوتی ہے۔ اسلئے بسا اوقات اُسکی مرضی کے خلاف اور جبر کرنیوالے کی مرضی کے موافق کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ لیکن اُس بچہ میں جب عقل آ جاتی ہے تو پھر وہ اپنے آپ ہی سمجھ جاتا ہے اور اپنے نفع اور نقصان کو سوچ سکتا ہے۔ اس حالت میں اُس پر کوئی جبر نہیں کرتا۔ اسلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس میں ہر قسم کے دلائل کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اُسے منوانے کے لئے کسی پر جبر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسلام تو اس بات پر لعنت بھیجتا ہے کہ کسی مذہب کو بغیر سوچے سمجھے ڈر یا لالچ کی وجہ سے قبول کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○ (منافقون آیت ۲)
یعنی منافق جب تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ اور اللہ جانتا ہے کہ تو اللہ کا رسول ہے۔ مگر اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ اگر اسلام کے پھیلانے کے لئے تلوار چلانا جائز ہوتا۔ تو کیا وہ لوگ جو اسلام لے آئے تھے مگر دل میں منافق تھے اُن کا ذکر قرآن کریم ان الفاظ میں کرتا جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔ کیونکہ اُس صورت میں تو یہ لوگ گویا قرآنی تعلیم کا نتیجہ ہوتے۔ کون اُمید کر سکتا ہے کہ تلوار کے ساتھ وہ مخلص لوگوں کی جماعت پیدا کرے گا۔ پس یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ سے غیر مذاہب والوں کو اسلام میں داخل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (البقرہ آیت ۱۹۱) یعنی دین کی لڑائی اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر یہ خیال رکھنا کہ زیادتی نہ کر بیٹھو۔ پس جبکہ اسلام صرف اُن لوگوں سے دینی جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے جو دین کے نام سے مسلمانوں سے جنگ کریں اور مسلمانوں کو جبراً اسلام سے پھیرنا چاہیں اور اُن کے متعلق بھی یہ حکم دیتا ہے کہ زیادتی نہ کرو بلکہ اگر وہ باز آ جائیں تو تم بھی اس قسم کی لڑائی کو چھوڑ دو تو پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا حکم ہے کہ غیر مذاہب والوں سے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے جنگ کرو۔ اللہ تعالیٰ تو مختلف مذہبوں کے مٹانے کے لئے نہیں بلکہ مختلف مذاہب کی حفاظت کے لئے جنگ کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ

يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْاؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًاؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ (الحج آیت)

یعنی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جاتی ہے جنگ کی اس وجہ سے اجازت دی جاتی ہے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ اُن کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بلا قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا سوائے اسکے کہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ہمارا رب ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض کا ہاتھ نہ روکتا تو مسیحیوں کے معبد اور راہبوں کے خلوت خانے اور یہود کی عبادتگاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اُس کے دین کی تائید کرے گا اور اللہ تعالیٰ بہت طاقتور اور غالب ہے۔ یہ آیات کس قدر کھلے الفاظ میں بتاتی ہیں کہ مذہبی جنگیں تبھی جائز ہیں جبکہ کوئی قوم رَبُّنَا اللّٰهُ کہنے سے روکے۔ یعنی دین میں دخل دے اور چاہے کہ دوسری اقوام کے معابد گرائے جائیں اور اُن سے اُن کا مذہب چھڑوایا جائے۔ یا اُن کو قتل کیا جائے۔ ایسی صورت میں اسلام اس قوم سے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام دنیا میں بطور شاہد اور محافظ کے آیا ہے نہ کہ بطور جابر اور ظالم کے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ کفر کے معنے صرف انکار کرنے کے ہوتے ہیں خواہ وہ کسی چیز کا انکار ہو۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور بُرے معنوں میں بھی۔ اسجگہ یہ لفظ اچھے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ شیطانوں اور شیطانی لوگوں کی باتیں ماننے سے قطعی طور پر انکار کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر سچے دل سے ایمان لے آتے ہیں وہ ایک مضبوط چٹان پر قائم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں قرآن کریم میں يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ (نساء آیت ۱۵۱) بھی آتا ہے کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ پس جہاں تک اس لفظ کے ظاہر کا تعلق ہے۔ یہ نہ بُرا ہے نہ اچھا ہے۔ اصل معنے تو اس کے ڈھانپ دینے کے ہوتے ہیں۔ بدی کا ڈھانپنا بھی کفر کہلائیگا اور نیکی کا ڈھانپنا بھی کفر کہلائیگا۔ بدی کا چھپانا بھی کفر کہلائیگا اور نیکی کا چھپانا بھی کفر کہلائیگا۔ لیکن چونکہ کثرت سے قرآن کریم میں یہ لفظ نیکی کے انکار کے متعلق استعمال ہوا ہے اس لئے جب کسی قرینہ کے بغیر یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے بُرے ہی کئے جاتے ہیں جس طرح مومن کے معنے بھی ایسے ہی ہیں لیکن وہ زیادہ تر نیکی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے جب مومن کا لفظ بغیر کسی قرینہ کے استعمال ہو تو اس کے معنے ہمیشہ نیک کے ہی کئے جائیں گے۔ حالانکہ قرآن کریم میں مومن کا لفظ بھی بُرے معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ۔ (نساء آیت ۵۲) وہ بے فائدہ باتوں اور حد سے بڑھنے والوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسجگہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ میں طاغوت کا کفر کرنے سے اس کی ذات کا انکار مراد نہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ اُس کی بات نہ ماننے۔ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کا لفظ رکھا ہے جس کے معنے خدا تعالیٰ کی بات ماننے کے ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ جو شخص طاغوت کا انکار کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے وہ ایسے مضبوط کڑے کو پکڑ لیتا ہے جو کبھی ٹوٹتا ہی نہیں۔ اگر انکار کے معنے کسی شے کی ذات کے انکار کے لئے جائیں تو اس آیت کے

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ ؕ وَالَّذِيْنَ

اللہ اُن لوگوں کا دوست ہے، جو ایمان لاتے ہیں۔ وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جو

كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى

کافر ہیں اُن کے دوست نیکی سے روکنے والے (لوگ) ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف

الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۸﴾

۳۴ ع ۲

لے جاتے ہیں۔ وہ لوگ آگ (میں پڑنے) والے ہیں۔ وہ اُس میں پڑے رہیں گے۔ ۱۶۷ھ

یہ معنے ہونگے کہ ہلاکت سے وہی شخص بچتا ہے جو شیطان کے وجود کا انکار کرے اور اللہ تعالےٰ کے وجود کا اقرار کرے۔ حالانکہ یہ معنے سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم صاف طور پر خدا تعالےٰ کے وجود کا بھی اقرار کرتا ہے اور شیطان کے وجود کا بھی اقرار کرتا ہے۔ پس اقرار اور ایمان سے اس آیت میں یہی مراد ہے کہ وہ شیطان کی باتوں کو ردّ کرتا اور خدا تعالیٰ کی باتوں کو مانتا ہے ایسے شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى۔ عروہ کے معنے دستہ کے بھی ہوتے ہیں جس سے کسی چیز کو پکڑا جاتا ہے اور عروہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس پر اعتبار کیا جائے اور عروہ کے معنے ایسی چیز کے بھی ہوتے ہیں جس کی طرف انسان ضرورت کے وقت رجوع کرے۔ اور عروہ اس چیز کو بھی کہتے ہیں جو ہمیشہ قائم رہے اور کبھی ضائع نہ ہو۔ اور عروہ بہترین مال کو بھی کہتے ہیں (۱) اگر عروہ کے معنے دستہ کے لئے جائیں تو اس آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ دین کو خدا تعالیٰ نے ایک ایسی لطیف چیز قرار دیا ہے جو کسی برتن میں پڑی ہوئی ہو اور محفوظ ہو اور انسان نے اس برتن کا دستہ پکڑ کر اُسے اپنے قبضہ میں کر لیا ہو۔ (۲) پھر عُروہ کہکر اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ دین ایک ایسی چیز ہے جس کا انسان سہارا لے لیتا ہے تاکہ اُسے گرنے کا ڈر نہ رہے۔ جیسے سیڑھیوں پر چڑھنے کے لئے انسان کو رسّہ کی ضرورت پڑتی ہے اور

وہ اُسے پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح دین بھی اس رسّہ کی طرح ایک سہارا ہے۔ اسے مضبوط پکڑ لینے سے گرنے کا ڈر نہیں رہتا۔

(۳) عُروہ کہہ کر یہ بھی بتایا کہ اگر انسان اسے مضبوطی سے پکڑ لے تو وہ ہر مصیبت کے وقت اس کے کام آتا ہے۔

(۴) عروہ میں اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ صرف دین ہی انسان کے کام آنے والی چیز ہے۔ اس جہان میں بھی اور اگلے جہان میں بھی۔ باقی تمام تعلقات عارضی ہوتے ہیں اور مصیبت کے آنے پر ایک ایک کرکے کٹ جاتے ہیں۔ بیشک انسان اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی اپنا بہترین رفیق قرار دیتا ہے لیکن بسا اوقات اُن سے کمزوری یا بے وفائی ظاہر ہو جاتی ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقی تعلقات وہی ہیں جن کی بنیادیں دین اور مذہب پر استوار کی جائیں اور اُنہی میں برکت ہوتی ہے۔

۱۶۷ھ تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اللہ مومنوں کا دوست اور مددگار ہے۔ اور وہ ایمان لانے والوں کو اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔ عربی زبان کے محاورہ میں کامیابی کی طرف لے جانے کو ظلمت سے نورؔ کی طرف لے جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ کامیابی جسمانی ہو یا روحانی۔ پس اس سے مراد مومنوں کی جماعت کو ہر قسم کی روحانی اور جسمانی کامیابیوں کی طرف لے جانا اور انہیں ہر قسم کی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ

کیا تجھے اُس شخص کی خبر نہیں پہنچی جو اس (غرور کی) وجہ سے کہ اللہ نے اُسے حکومت دے رکھی تھی ابراہیمؑ سے اُس کے

الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ

رب کے متعلق بحث کرنے لگ گیا۔ (یہ اُس وقت ہوا) جس وقت ابراہیمؑ نے (اُسے) کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔

قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ

(اس پر) اُس نے کہا (کہ) مَیں (بھی) زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا (کہ اگر یہ بات ہے) تو اللہ تعالیٰ تو

ناکامیوں اور تکالیف سے نجات دلاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَـھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ۔ یہاں طاغوت سے مراد وہ لوگ ہیں جو شیطان کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اس تھوڑی بہت ہدایت سے بھی جس پر وہ قائم ہوتے ہیں دُور پھینک دیتے ہیں۔ یہ مت خیال کرو کہ کفار میں نور کہاں سے آیا۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے جب دعویٰ نہیں کیا تھا۔ اُس وقت ابوجہل ایسا بُرا نہیں تھا جیسا کہ اُس وقت تھا جب کہ وہ مارا گیا۔ بات یہ ہے کہ صداقت کے انکار سے انسان کے قلب پر زنگ لگ جاتا ہے اور ہوتے ہوتے وہ تھوڑا بہت نُور جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہ بھی جاتا رہتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے بعض صداقتیں ایسی تھیں جن کو لوگ مانتے تھے۔ مگر اب ان کا بھی انکار کر رہے ہیں۔ مثلاً سلمان خطیب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے پہلے اپنے منبروں پر کھڑے ہو ہو کر یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

موسیٰ کجا عیسیٰ کجا اس بات کا ہے سب کو غم

مگر اب اُن کی کتابوں سے یہ شعر غائب ہو گیا ہے۔ اسی طرح اُن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا اعتقاد رکھنے والے لوگ بھی موجود تھے۔ جیسا کہ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب تحذیر الناس میں صاف لکھا ہے کہ بغیر شریعت کے نبی ہو سکتا ہے۔ مگر اب سب لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں پس نبی کے آنے سے پہلے بعض لوگوں کے عقائد اچھے ہوتے ہیں مگر جب وہ نبی کا انکار کر دیتے ہیں اور انہیں اُن کے پہلے عقیدہ کی رُو سے پکڑا جاتا ہے تو وہ اپنا پہلو بچانے کے لئے اس کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص صداقت کو قبول کرتا ہے وہ روز بروز اپنے ایمان میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔

مَیں اوپر بتا چکا ہوں کہ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ میں خدا تعالےٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ہو جاتے ہیں اُن کو اللہ تعالیٰ بحیثیت قوم ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ مگر چونکہ دنیا میں انسان کو قدم قدم پر مشکلات پیش آتی رہتی ہیں جن کو دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ نے مومنوں کی کامیابی کا وعدہ کیا ہے تو پھر انہیں مشکلات کیوں پیش آتی ہیں۔ اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ وعدے قومی طور پر کئے گئے ہیں نہ کہ انفرادی طور پر۔ پس انفرادی تکالیف اور مشکلات کو اس وعدہ کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص مارا جاتا ہے لیکن اُس کے مرنے سے قوم کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ مرتا نہیں بلکہ زندہ ہوتا ہے۔ ورنہ ظاہری تکالیف

يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ

سورج کو مشرق (کی طرف) سے لاتا ہے۔ (اب) تو اُسے مغرب (کی طرف) سے

الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا

لے آ۔ اس پر وہ (کافر) مبہوت ہو (کر رہ) گیا۔ اور (یہ ہونا ہی تھا کیونکہ)

يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۹﴾ ۚ

اللہ ظالم لوگوں کو (کامیابی کی) راہ نہیں دکھاتا۔ ۱۶۸؎

کو دیکھا جائے تو حضرت امام حسین علیہ السلام بھی شہید کر دیئے گئے تھے۔ مگر وہ ناکام نہیں ہوئے بلکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور جس اصول کی خاطر انہوں نے قربانی پیش کی تھی وہ اصول آج بھی قائم ہے اور قیامت تک قائم رہیگا۔ اسی طرح بعض انبیاء بھی شہید ہوئے۔ مثلاً حضرت یحیٰ علیہ السلام کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے صاف لکھا ہے کہ وہ مارے گئے تھے۔ پس جب نبی بھی مارا جا سکتا ہے تو اور کون ہے جو اس قسم کی تکالیف سے محفوظ رہے۔ پس کسی فرد کا مارا جانا قوم کی ناکامی کی دلیل نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ بیشک مارے گئے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یزید کو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا اور امام حسینؓ کی سب عزت کرتے ہیں اور ان کا نام بڑے ادب اور احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اُن کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اوپر بتایا تھا کہ اسلام کے لئے جبر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں ممتاز ہو چکی ہے۔ اور جنگ کا حکم تمہیں اس لئے دیا گیا ہے کہ دشمن تم پر حملہ کر رہا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا کہ تمہارا انجام اچھا ہوگا اور تمہارے مخالفوں کا بُرا۔ خدا تعالےٰ تمہیں کامیاب کرے گا اور تمہارے دشمنوں کو ایسی تباہیوں سے دوچار کریگا جن سے وہ ہمیشہ غیظ و غضب کی آگ میں جلتے رہیں گے اور اپنے چاروں طرف دوزخ ہی دوزخ پائینگے جس سے نکلنے کا انہیں کوئی راستہ نظر نہیں آئیگا۔

حَاجَّ — مُلْكٌ — اِحْيَاءٌ — اِمَاتَةٌ — بُهِتَ

۱۶۸؎ حل لغات:- حَاجَّ : حَاجَّهٗ کے معنے ہیں خَاصَمَهٗ (اقرب) اُس سے جھگڑا کرنے لگ گیا۔ حَاجَّ کا لفظ قرآن کریم میں جتنی جگہ استعمال ہوا ہے بُرے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے سوائے ایک جگہ کے کہ وہاں اس کے ایک اور معنے لئے جا سکتے ہیں۔ لغت والے بھی یہی لکھتے ہیں کہ یہ لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ پس اس کے معنے ہیں کج بحثی۔ مجادلہ۔ مکابرہ۔

مُلْكٌ کے معنے بادشاہت کے بھی ہیں اور ملک کے بھی ہیں۔

اِحْيَاءٌ کے معنے ہیں زندہ کرنا۔ خوشی پہنچانا۔ نمو کی طاقت دینا۔ آباد کرنا۔

اِمَاتَةٌ کے معنے ہیں مُردہ کرنا۔ رنج پہنچانا۔ نمو کی طاقت نکال ڈالنا۔

بُهِتَ کے معنے ہیں چہرہ کا رنگ اُڑ گیا۔ گھبرا گیا۔ مُنہ بند ہو گیا اور کوئی جواب نہ بن سکا۔

تفسیر:- اس آیت کے متعلق مفسّرین کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک کافر بادشاہ میں

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ

اور کیا تو نے اُس شخص کی مثل (کوئی آدمی دیکھا ہے) جو ایک ایسے شہر کے پاس سے گذرا جسکی یہ حالت تھی کہ وہ اپنی چھتوں کے بل گرا ہوا تھا۔

قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ

(اسکو دیکھ کر) اُس نے کہا کہ اللہ (تعالیٰ) اسکی ویرانی کے بعد اُسے کب آباد کرے گا؟ اِس پر اللہ (تعالیٰ) نے اُسے

جس کا نام نمرود بیان کیا جاتا ہے ہستیٔ باریتعالیٰ پر بحث ہوئی تھی۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اُسے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تو اُس نے کہا کہ ایسا تو مَیں بھی کر لیتا ہوں چنانچہ اُس نے چند قیدی منگوائے جن میں سے بعض کو اُس نے چھوڑ دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ یہ دیکھکر حضرت ابراہیمؑ نے سمجھا کہ میری پہلی دلیل تو کارگر نہیں ہوئی اب مَیں کوئی اَور دلیل پیش کر دوں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ میرا ربّ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے لاتا ہے اگر تو بھی ربّ ہے تو اُسے مغرب سے لے آ۔ اِس پر وہ خاموش ہو گیا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام غالب آ گئے۔ مگر میرے نزدیک اُن کی یہ قیاس آرائی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح تو دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ پہلے سوال پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش ہو گئے اور دوسرے سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ پس میرے نزدیک یہ توجیہہ صحیح نہیں کیونکہ اگر یہی مراد ہوتی اور وہ ایسا ہی جھوٹا اور کذاب تھا اور اپنے آپ کو خدا بنا رہا تھا تو وہ یہ جواب بھی دے سکتا تھا کہ سورج کو مشرق سے تو مَیں ہی لا رہا ہوں۔ تم اپنے خدا کو کہو کہ وہ اُسے مغرب سے لے آئے۔ مگر اُس نے یہ نہیں کہا۔ بلکہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ وہ خاموش ہو گیا۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا یہ مطلب نہیں تھا۔ بلکہ بات دراصل کچھ اَور تھی۔ ورنہ بحث میں تو کوئی چپ ہُوا ہی نہیں کرتا۔ لوگ بیہودہ باتوں پر بھی بحث کرتے چلے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ اس امر پر بھی بحث کرتے ہیں کہ انسان کا وجود ہے یا نہیں۔ اور لوگ پھر بھی خاموش نہیں ہوتے۔ لیکن وہ خاموش ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات تھی جس کے متعلق اُس نے سمجھا کہ اگر مَیں نے اس کا جواب دیا تو مَیں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ اس لئے سوائے خاموشی کے اس کے لئے اور کوئی چارہ نہ رہا۔

جیوئش انسائیکلو پیڈیا میں اِس بحث کا ذکر اِس طرح کیا گیا ہے کہ جب

"حضرت ابراہیمؑ اُس بادشاہ کے سامنے جسکا نام نمرود تھا پیش ہوئے تو اُس نے کہا کیا تو نہیں جانتا کہ مَیں خدا ہوں اور دنیا کا حاکم ہوں اور مَیں ہی مارتا اور زندہ کرتا ہوں چونکہ اُن کا سب سے بڑا خدا سورج دیوتا سمجھا جاتا تھا اور اُسے آقا بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اُسے کہا کہ اگر تو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو کیوں سورج کو مغرب سے نکال کر مشرق کی طرف نہیں چڑھاتا۔ اگر تو خدا اور دنیا کا حاکم ہے تو مجھے بتا کہ میرے دل میں اِسوقت کیا ہے اور یہ کہ میرا آئندہ کیا حال ہوگا۔ اِس پر نمرود کی زبان بند ہو گئی اور وہ حیران رہ گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بات کو جاری رکھا۔ اور کہا کہ تو کوش کا بیٹا ہے اور اُسی طرح کا

اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ؕ قَالَ کَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ

سو سال تک (خواب میں) مارے رکھا۔ پھر اُسے اٹھایا (اور) فرمایا (اے میرے بندے) تو کتنے عرصہ تک (اس حالت میں)

لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ

رہا ہے۔ اُس نے کہا (میں اس حالت میں) ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں۔ (تب اللہ تعالیٰ نے) فرمایا (یہ بھی ٹھیک ہے) اور تو (اس حالت میں)

ایک فانی وجود ہے۔ تو اپنے باپ کو موت سے نہیں بچا سکا اور نہ خود اُس سے بچ سکتا ہے۔"

(جیوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ ابراہام)

اسی طرح طالمود میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس بحث کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن طالمود اور قرآن کریم کے بیان میں فرق ہے۔ قرآن کریم میں زندہ کرنے اور مارنے کا ذکر پہلے ہے اور سورج کی تبدیلی کا ذکر پیچھے لیکن طالمود میں سورج کی تبدیلی کا ذکر پہلے ہے اور احیاء و اماتت کا بعد میں۔ دوسرے طالمود میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود بادشاہ کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے آپ کو کہا کہ تو بتوں کی پوجا کیوں نہیں کرتا انہوں نے کہا۔ جس کو آگ جلا دیتی ہے اُن کی کیا پوجا کروں۔ اُس نے کہا۔ پھر آگ کی کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ جسے پانی بجھا دیتا ہے۔ اُس کی کیا پوجا کروں اُس نے کہا۔ پھر پانی کی کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ پانی کو تو بادل لاتا ہے۔ اُس نے کہا۔ پھر بادلوں کی کیوں نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا۔ اُن کو ہوا اُڑا لے جاتی ہے۔ اُس نے کہا۔ پھر ہوا ہی کی کر۔ انہوں نے کہا۔ انسان اس سے بھی بچاؤ کر لیتا ہے اور بچ جاتا ہے اور وہ اس پر غالب نہیں آتی۔ اُس نے کہا۔ پھر مجھے پوجو۔ کیونکہ میں انسانوں کا خدا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تمہارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔

یہ بحث جس کا طالمود میں ذکر کیا گیا ہے خود اپنی ذات میں اس امر کا ثبوت ہے کہ سورج کا ذکر پہلے نہیں ہوا بلکہ پہلے احیاء اور اماتت کا ہی ذکر ہوا ہے ورنہ سورج کے ذکر کے بعد تو بحث آگے چل ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ سورج اُن میں سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور اس کو ہر قسم کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور ترقی اور تنزل کا اصل باعث قرار دیا جاتا تھا۔ چنانچہ نیلسنز انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ "میرے ڈاک اُن کا بڑا خدا تھا جسے سورج کی شعاع یا دن کی روشنی سمجھا جاتا تھا۔ اور اُسے بنی نوع انسان کی ترقی اور تنزل کا اصل باعث قرار دیا جاتا تھا۔ (دیکھو نیلسنز انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ بیلونیا)

پھر عقلاً بھی قرآن کریم کا کلام ہی درست ثابت ہوتا ہے۔ اوّل اس لئے کہ بحث میں نیچے سے اوپر ترقی ہوتی ہے۔ پس موت اور حیات کا ذکر لازماً سورج سے پہلے ہونا چاہیئے نہ کہ بعد میں۔ دوسرے درمیان میں نمرود کے چُپ ہو جانیکا ذکر بتاتا ہے کہ یہ واقعہ سب آخر میں ہوا۔ تیسرے نمرود کے سامنے پیش تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بُتوں کے توڑنے کے جرم میں ہوئے تھے۔ اس کا یہ سوال کہ میں خدا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں بحث کے دوران میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ بے جوڑ کلام ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ بحث فِیْ رَبِّہٖ تھی۔ یعنی خدائے واحد کے بارہ میں۔

مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ

سو سال تک بھی رہا ہے۔ اب تو اپنے کھانے اور پینے (کے سامان) کی طرف دیکھ کہ وہ سڑا نہیں۔

وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ

اور اپنے گدھے کی طرف (بھی) دیکھ (اور ان دونوں کا سلامت رہنا دیکھکر سمجھ لے کہ تیرا خیال بھی اپنی جگہ درست ہے۔ اور ہمارا خیال بھی) اور ایسا ہم نے اسلئے کیا، تا تجھے لوگوں کیلئے ایک نشان بنائیں

بحث میں بادشاہ نے یہیں کہہ دیا۔ کہ دیکھ میں تجھے تباہ کردوں گا کیونکہ میں حاکم ہوں۔ آپ نے فرمایا تباہی یا آبادی تو خدا کے اختیار میں ہے۔ اس پر اُس نے اس احیاء اور اماتت کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اور کہا کہ نہیں میرے اختیار میں ہے۔ آپنے جھٹ اُس کو پہلی بحث کے مطابق پکڑا کہ پھر سورج عبث ہوا۔ اور وہ چُپ ہوگیا۔

اس واقعہ کے ناموں وغیرہ میں گو فرق ہے لیکن یہودی تاریخ میں اس واقعہ کو جس طرز پر بیان کیا گیا ہے اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہی واقعہ جس کی طرف قرآن کریم اشارہ کرتا ہے اور جس پر اَلَمْ تَرَ کے الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ اَلَمْ تَرَ کے ماتحت کسی بے نشان واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا جا سکتا۔ گو یہودی بیان حسب معمول آگے پیچھے ہوگیا ہے۔

طالمود میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نمرود سے یہ بحث کنعان میں آنے سے پہلے ہوئی تھی۔ میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے جو یہ کہا کہ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تو اس سے اُن کی مراد ظاہری موت اور حیات نہیں تھی۔ بلکہ کامیابی اور ناکامی، اور عزت اور ذلت، اور آبادی اور بربادی مراد تھی۔ چونکہ آپ سے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہو چکا تھا کہ وہ آپ کو کنعان کا ملک دیگا۔ اور آپ کی اولاد کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوگی

اس لئے آپ نے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جو احیاء اور اماتت کی صفت اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ جسکو چاہتا ہے کامیاب کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناکام کر دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے شکست دے دیتا ہے۔ اس پر اُس نے کہا اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ۔ یہ بات تو میرے اختیار میں بھی ہے کہ میں جسے چاہوں ترقی دے دوں اور جسے چاہوں ذلیل کر دوں۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے سورج اُن کا سب سے بڑا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اور بادشاہ بھی اُس کی پرستش کرتا تھا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُسے جواب میں کہا کہ خدا تعالیٰ نے تو یہ سلسلہ جاری کیا ہوا ہے کہ سورج کو مشرق سے چڑھاتا ہے اور اس طرح دنیا کو نفع پہنچاتا ہے۔ لیکن اگر دنیا کو نفع پہنچانا تیرے اختیار میں ہے تو یہ جو سورج چڑھا ہوا ہے اس کو مغرب سے مشرق کی طرف لوٹا دے۔ وہ دن کا وقت تھا اور سورج چڑھا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اسے واپس لوٹا دے یعنی اسے پیچھے کو لے جا۔ یا یہ کہا کہ اسے مغرب سے چڑھا لا گویا انہوں نے اُسے کہا کہ اس پر اپنی حکومت قائم کرکے دکھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مدعا یہ تھا کہ اگر دنیا کا نفع ونقصان تمہارے ہاتھ میں ہے تو پھر سورج کیا کرتا ہے اور اگر سورج نفع ونقصان پہنچاتا ہے تو نفع ونقصان پہنچانے اور مالک ہونے کا تمہارا دعویٰ باطل ہے۔ اس پر

إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا

اور ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم انہیں کیونکر طرح اپنی اپنی جگہ رکھ کر جوڑتے ہیں۔ پھر ہم ان پر گوشت چڑھاتے ہیں پس جب اس پر

تَبَيَّنَ لَهُ ۙ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦٠﴾

حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو گئی تو اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ (تعالیٰ) ہر ایک چیز پر قادر ہے۔ ۱۶۹

جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے وہ مبہوت ہو کر لاجواب ہو گیا۔ کیونکہ اگر وہ جواب دیتا تو یا تو وہ یہ کہتا کہ میں نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ سورج ہی پہنچاتا ہے اور ترقی اور تنزل اسی کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں۔ اور اگر وہ ایسا کہتا تو اس سے اس کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا کہ اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ۔ اور اگر وہ یہ کہتا کہ میں ہی یہ تمام کام کرتا ہوں سورج نہیں کرتا اور نفع نقصان بھی میرے ہی اختیار میں ہے سورج کے اختیار میں نہیں تو اس پر اس کی قوم دشمن ہو جاتی کیونکہ وہ سورج کی پرستش کرتی تھی بلکہ وہ خود بھی سورج کا پرستار تھا۔ اس وجہ سے وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اور خاموش ہو گیا۔

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ کا ثبوت دیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم اپنے بندوں کی مشکلات میں کس طرح ان کی مدد کرتے اور انہیں ظلمات سے نور کی طرف اور ناکامیوں سے کامیابیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

۱۶۹ حل لغات: - اَوْ كَالَّذِيْ: کاف مثال کیلئے بھی آتا ہے اور تاکید کے لئے بھی۔ اسی طرح تشبیہ اور تمثیل کے لئے بھی آتا ہے۔ یہاں پہلے معنوں کے لئے ہے۔

خَاوِيَةٌ: خَوٰى يَخْوِيْ خَوَاءً سے نکلا ہے۔ کہتے ہیں خَوَى الْبَيْتُ: سَقَطَ وَتَهَدَّمَ۔ گھر گر گیا۔ فَرَغَ وَخَلَا۔ گھر خالی ہو گیا اور ویران ہو گیا۔

بَلٰى: حرف ہے جو اضراب کے معنے دیتا ہے یعنی بات کو پھیر کر دوسری طرف لے جانا۔ یہ اضراب دو طرح کا ہوتا ہے، ایک تو انکار کی غرض سے جیسے قرآن کریم میں آتا ہے وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔ (انبیاء آیت ۲۷) یعنی مشرک کہتے ہیں کہ رحمٰن خدا نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے جن کو یہ لوگ خدا کا بیٹا کہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے معزز بندے ہیں۔ اضراب کی دوسری قسم میں ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف مضمون کو پھیرنا مقصود ہوتا ہے۔ بَلْ سے پہلے جملہ کی تردید مدنظر نہیں ہوتی۔ اس آیت میں بھی بَلٰى سے پہلے کی بات بھی درست ہے اور بعد کی بھی صرف ایک نئے مضمون کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

نُنْشِزُهَا: نَشَزَ کے معنے ہیں اِرْتَفَعَ اٹھا۔ اور اَنْشَزَهٗ کے معنے ہیں رَفَعَهٗ اسے اٹھایا یا کھڑا کیا۔ پس نُنْشِزُهَا کے معنے ہیں ہم ان کو کھڑا کرتے ہیں۔ یا ہم انہیں اٹھاتے ہیں۔

تفسیر: - مفسرین کہتے ہیں کہ یہ عزیر نبی کا واقعہ ہے۔ وہ ایک دفعہ ایک تباہ شدہ بستی کے پاس سے گذرے تو انہوں نے اس کی تباہی اور خستہ حالی کو دیکھ کر کہا کہ خدا تعالیٰ اس بستی میں رہنے والوں کو ان کی موت کے بعد کس طرح زندہ کرے گا۔ اس پر خدا تعالیٰ نے انہیں مار ڈالا اور وہ سو سال تک اسی حالت میں مردہ پڑے رہے۔ اس عرصہ میں اللہ تعالیٰ نے اس بستی کے لوگوں کو آباد کر دیا اور انہیں زندہ کر کے دکھا دیا کہ خدا تعالیٰ کیسا قادر ہے اور وہ مردوں کو کس طرح زندہ کیا کرتا ہے۔

جب وہ سو سال کے بعد زندہ ہو کر اُٹھ بیٹھے تو خدا تعالیٰ نے انہیں کہا کہ اپنے کھانے کو دیکھ کہ وہ بھی ابھی تک سڑا نہیں اور پھر اُس نے اُن کے گدھے کو بھی زندہ کر دیا اور اُس کی گلی سڑی ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا دیا۔

میرے نزدیک اگر یہ واقعہ اسی طرح ہوا ہو جس طرح مفسّرین بیان کرتے ہیں تو خود اس آیت کے مختلف ٹکڑے اِس بیان کو باطل قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ پہلی بات جو اِن معنوں کو ردّ کرتی ہے وہ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِهَا کے الفاظ ہیں۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس نبی کا سوال صرف بستی کے متعلق تھا کہ اللہ تعالیٰ اُسے کس طرح زندہ کریگا یہ سوال نہیں تھا کہ مُردے کس طرح زندہ ہونگے۔ اگر مُردوں کے زندہ ہونیکا سوال ہوتا تو کیا اُن کے سامنے روزانہ کئی لوگ مرتے نہیں تھے اور جب وہ روزانہ یہ نظارہ دیکھتے تھے کہ لوگ مر کر زندہ نہیں ہوتے تو اُس دن ایک تباہ شدہ بستی کو دیکھ کر اُن کے دل میں مُردوں کے زندہ ہونے کے متعلق کیسے سوال پیدا ہو گیا۔ اور اگر اُن کا سوال صرف بستی کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے متعلق تھا تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ بستی کے مُردہ ہونے سے اُس کا اُجڑنا اور زندہ ہونے سے اُس کا آباد ہونا ہی مراد ہوا کرتا ہے۔ مُردوں کے زندہ ہونے سے اِس سوال کا کوئی تعلق نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اَنّٰی سے مراد "کب تک" ہے یا "کیسے" ہے۔ اگر کسی سوال کرنے والے کے جواب میں "سو سال" کا لفظ بولا جائے تو اُس کے یہی معنے ہونگے کہ سائل کا سوال "کب تک" کا ہے "کیسے" کا نہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سائل تو یہ سوال کرے کہ یہ بستی کس طرح زندہ ہوگی اور جواب یہ دیا جائے کہ سو سال کے بعد زندہ ہو جائے گی۔ سو سال کے الفاظ صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ سوال کب کے متعلق ہے نہ کہ کیفیت کے متعلق۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے سو سال تک مار رکھا پھر زندہ کر دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اُن کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا۔ اگر تو حضرت عزیرؑ کی یہ غرض تھی کہ وہ دیکھیں کہ مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں تو اُن کو مار کر پھر زندہ کر دینے سے یہ غرض پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اپنی موت کے بعد وہ یہ کس طرح جان سکتے تھے کہ مُردہ کس طرح زندہ ہوا کرتا ہے۔ اور اگر اُن کی دوبارہ حیات سے اللہ تعالیٰ کا منشاء پورا ہو گیا تھا تو پھر وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا پر یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف گدھے کو ہی مار کر اور پھر اُسے زندہ کر کے انہیں اپنی قدرت کا نظارہ کیوں نہ دکھا دیا۔ خود انہیں سو سال تک کیوں مارے رکھا۔ آخر اپنی موت سے تو اِس بات کا پتہ نہیں لگتا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ یہ تو دوسرے کو دیکھ کر ہی پتہ لگتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اُن کے گدھے کو بھی مارنا تھا تو پھر اُن کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟

پھر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ اُس بستی میں سے ہی کسی ایک کو مار کر اُسے زندہ کر کے دکھا دیا جاتا۔ خود عزیرؑ کو مارنے کی کیا ضرورت تھی؟

اِسی طرح سوال یہ ہے کہ انہوں نے کونسی بات پوچھی تھی جس کا جواب یہ دیا گیا کہ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ۔ اُن کا سوال تو یہ تھا کہ بستی کس طرح زندہ ہوگی۔ مگر جواب یہ دیا گیا کہ تُو اپنے کھانے اور پینے کے سامان کی طرف دیکھ کہ وہ سڑا نہیں۔

پس اوّل تو ھٰذِہٖ کا لفظ بتلاتا ہے کہ اس جگہ لوگوں کے مرنے اور دوبارہ زندہ ہونیکا کوئی سوال نہیں بلکہ صرف شہر کی آبادی اور اُس کی دوبارہ حیات کا سوال تھا۔

دوسرے مِائَةَ عَامٍ میں بتلا دیا کہ اَنّٰی کے ساتھ "کب" کا سوال کیا گیا تھا نہ کہ "کیسے" کا۔ یعنی سوال کیفیت کے

متعلق نہ تھا بلکہ زمانہ کے متعلق تھا۔

غرض مفسرین کے بیان کردہ واقعہ پر کئی اعتراضات پڑتے ہیں۔ پہلا اعتراض تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزیر کو کیوں مارا۔ اگر وہ نبی تھا تو یہ اس کے سوال کا اچھا جواب دیا کہ اُسے سو سال تک مارے رکھا۔ اس عرصہ میں اُس کے بیوی بچے بھی مر گئے اور اُسے ایک صدی کے بعد غیر لوگوں میں زندہ کر کے بٹھلا دیا۔

اُس شخص کو مار کر زندہ کرنے کی غرض زیادہ سے زیادہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس طرح مُردوں کو زندہ کیا کرتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ پھر گدھے کو گوشت پوست چڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اِس ثبوت کے لئے تو صرف گدھے کا مر کر جینا ہی کافی تھا خود عزیر کو مارنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ سنّت اللہ کے بھی خلاف ہے کہ کسی مُردہ کو زندہ کیا جائے۔ اور پھر اگر خدا تعالیٰ نے انہیں سو سال تک مارے رکھا تو اس کے ثبوت میں یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا کہ دیکھو تمہارا کھانا سڑا نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیئے تھا کہ کھانا پینا تو الگ رہا دنیا ہی بدل چکی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تو سو سال تک واقعہ میں مرا رہا تھا۔ مگر اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

غرض ان تمام امور پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین نے اس واقعہ کو جس رنگ میں پیش کیا ہے وہ درست نہیں۔ اب مَیں اس واقعہ کی وہ حقیقت بیان کرتا ہوں جو میرے نزدیک درست ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو اُس شخص کی طرف دیکھ جو ایک بستی یا گاؤں پر سے ایسی حالت میں کہ وہ اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا گذرا اور اُس نے سوال کیا کہ الٰہی یہ بستی اپنی ویرانی کے بعد کب آباد ہوگی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے اُسے سو سال تک مارے رکھا (یعنی خواب میں) اور پھر اُسے اُٹھایا۔ اور اُس سے پُوچھا کہ تو کتنی دیر تک رہا ہے۔ اُس نے کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بات تو درست ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہم تجھے ایک اور بات بھی بتاتے ہیں کہ تو سو سال تک بھی رہا ہے۔ تیری بات کے سچا ہونیکا تو ثبوت یہ ہے کہ تو اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ وہ سڑا نہیں۔ لیکن میری بات کے سچا ہونیکا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے تجھے کشفی حالت میں سو سال کا نظارہ دکھایا ہے اور جب یہ رؤیا پورا ہوگا اس وقت لوگوں کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ تیرا خدا کے ساتھ سچا تعلق تھا۔ جب اُس پر یہ حقیقت روشن ہوگئی۔ تو اُس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اُس کے آگے یہ کچھ بھی مشکل نہیں کہ وہ ایسی اُجڑی ہوئی بستی کو اپنے فضل سے پھر دوبارہ آباد کر دے۔

حضرت خلیفۂ اوّل رضی اللہ عنہ اس بستی سے یروشلم مراد لیا کرتے تھے۔ جسے بخت نصر نے تباہ کر دیا تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ وہ آدمی جو یروشلم کے پاس سے گذرا حزقیل نبی تھا جس پر خدا تعالیٰ نے اِسبات کا انکشاف کیا کہ ایک سو سال تک یہ شہر دوبارہ آباد ہو جائیگا۔ اور میرے نزدیک یہی بات درست ہے۔

یہاں اُس بستی کے متعلق خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ گاؤں اپنی چھتوں پر گرا ہوا تھا۔ یعنی پہلے چھتیں گریں اور پھر اُن پر دیواریں گر گئیں۔ کیونکہ جو مکان عدم استعمال کی وجہ سے گریں بالعموم پہلے اُن کی چھتیں گرتی ہیں۔ کیونکہ چھتوں میں لکڑی ہوتی ہے اور لکڑی کو دیمک لگ جاتی ہے۔ جب چھتیں گر جاتی ہیں تو پھر بارش کی وجہ سے ننگی دیواریں بھی گرنے لگتی ہیں۔ اور اس صورت میں وہ دیواریں چھتوں پر آگرتی ہیں۔ اِسی حالت کو واضح کرنے کے لئے خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ ورنہ جو مکان زلزلہ وغیرہ کی قسم کے حادثات سے

گرتے ہیں اُن کی دیواریں پہلے گرتی ہیں اور چھت اُن پر آگرتی ہے۔ اِن الفاظ میں ایک لطیف اشارہ اِس بات کی طرف کیا گیا ہے کہ اس گاؤں کی ویرانی کا سبب زلزلہ وغیرہ نہ تھا بلکہ اُس کے باشندوں کا شہر چھوڑ کر چلا جانا اِسکا موجب تھا۔ بہرحال حزقیل نبی کے دل میں یروشلم کی بربادی دیکھ کر یہ سوال پیدا ہُوا کہ خدا تعالیٰ اِس بستی کو کب زندہ کرے گا۔ بستی کو زندہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ مُردہ لوگ کِس طرح زندہ ہونگے۔ بلکہ اس کا مطلب وہی ہے جو دوسری جگہ بستیوں کو زندہ کرنے کے متعلق قرآن کریم نے بیان کیا ہے فرماتا ہے:- وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا (فرقان آیت ۴۹-۵۰) یعنی ہم نے بادل سے پاک و صاف پانی اُتارا ہے۔ تاکہ اُس کے ذریعہ ہم مردہ ملک کو زندہ کریں۔ اور اِسی طرح اس پانی سے اپنے پیدا کئے ہوئے چارپایوں اور بہت سے انسانوں کو سیراب کریں۔ اِسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ وَاَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا (ق آیت ۱۲) ہم بارش کے ذریعہ مُردہ شہر کو زندہ کیا کرتے ہیں۔ پس مُردہ شہر کو زندہ کرنے کے معنے ویران شہر کو آباد اور خوشحال کرنے کے ہوتے ہیں۔ حضرت حزقیل نے بھی یہی سوال کیا کہ الٰہی یہ شہر کب آباد ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں رؤیا میں بتایا کہ سو سال کے عرصہ میں آباد ہو جائے گا۔

یہ رؤیا جس کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے حزقیل نبی کی کتاب میں بھی پائی جاتی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ حزقیل نبی کی کتاب میں سو سال کی میعاد کا ذکر نہیں۔ یہ قرآن کریم کی صداقت اور اس کے کامل ہونیکا ایک زبردست ثبوت ہے۔ کہ جو ضروری امور پچھلی کتب میں بیان نہیں ہوئے قرآن کریم نے انکو بھی بیان کر دیا ہے اور اِس طرح اُن کی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ بہرحال حزقیل باب ۳۷ میں لکھا ہے:-

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اُس نے مجھے خداوند کی رُوح میں اُٹھا لیا۔ اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی مجھے اُتار دیا اور مجھے اُن کے آس پاس چوگرد پھرایا۔ اور دیکھ وے وادی کے میدان میں بہت تھیں۔ اور دیکھ وے نہایت سوکھی تھیں۔ اور اُس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوواہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور اُن سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو! تم خداوند کا کلام سُنو۔ خداوند یہوواہ ان ہڈیوں کو یُوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں تمہارے اندر رُوح داخل کروں گا اور تم جیئو گے۔ اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا۔ اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھونگا۔ اور تم میں رُوح ڈالوں گا اور تم جیو گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی۔ اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہُوا۔ اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت اُن پر چڑھ آئے اور چمڑے کی اُن پر پوشش ہو گئی۔ پر اُن میں رُوح نہ تھی۔ تب اُس نے مجھے کہا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر۔ اے آدم زاد! اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے کہ اے سانس! تو

چاروں ہواؤں میں سے آ۔ اور اِن مقتولوں پر
پھونک کہ وے جئیں ۔ سو مَیں نے حکم
کے بموجب نبوت کی اور اُن میں رُوح آئی
اور وے جی اُٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے
ہوئے۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ تب اُس نے
مجھ سے کہا کہ اے آدم زاد یہ ہڈیاں سارے
اسرائیل ہیں ۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں
سُوکھ گئیں اور ہماری اُمید جاتی رہی۔ ہم تو
بالکل فنا ہو گئے ۔ اِس لئے تُو نبوت کر اور
اُن سے کہہ کہ خداوند یہوواہ یوں کہتا ہے
کہ دیکھ اے میرے لوگو مَیں تمہاری قبروں کو
کھولوں گا ۔ اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر
نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤنگا
اور میرے لوگ جب مَیں تمہاری قبروں کو
کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے باہر
نکالوں گا تب جانو گے کہ خداوند مَیں ہوں
اور مَیں اپنی رُوح تم میں ڈالوں گا اور تم
جیؤ گے ۔ اور مَیں تم کو تمہاری سرزمین میں
بساؤں گا۔ تب تم جانو گے کہ مَیں نے خداوند
نے کہا ۔ اور پورا کیا ۔" (حزقیل باب ۳۷)
یہ پیشگوئی ہے جو حزقیل نبی نے کی ۔ اب سوال پیدا
ہوتا ہے کہ وہ تو اُس وقت بابل میں قید تھے ۔ وہ
اِس بستی کے پاس سے کب گذرے ۔ سو اِس کا ایک
جواب تو یہ ہے کہ ہو سکتا ہے یہ گذرنا بھی خواب میں
ہی ہو ۔ جیسا کہ بائیبل کے الفاظ سے ظاہر ہے ۔
دوسرا جواب یہ ہے کہ بنوکدنضر جو بابل کا بادشاہ
تھا اُس نے ۵۸۶ قبل مسیح یروشلم پر حملہ کر کے اُسے
فتح کر لیا تھا ۔ اور اس کا ایک حصہ گرا دیا تھا ۔ وہ
وہاں کے بادشاہ اور اُس کے خاندان کے تمام افراد کو
پکڑ کر اپنے ملک میں لے گیا ۔ اِسی طرح شہر کے تمام شرفاء
اور بڑے بڑے کاریگروں کو بھی قید کر کے لے گیا ۔ اور
سوائے چند رذیل لوگوں کے وہاں کوئی باقی نہ رہا ۔
حضرت حزقیل بھی اُن قیدیوں میں ہی تھے جنہیں بنوکدنضر
نے گرفتار کیا ۔ اُن کے متعلق بحث ہوئی ہے کہ انہیں
اُس نے کیوں پکڑا ۔ اور مؤرخین نے اس کا یہ جواب دیا
ہے کہ چونکہ وہ لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ بنوکدنضر
کا مقابلہ کرو ۔ اور اپنے ملک کو نہ چھوڑو اِس لئے وہ
اُن کو بھی قید کر کے لے گیا ۔ پُرانی تاریخوں سے یہ بھی
معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ جن شہروں کو گراتے اور
ویران کرتے تھے ۔ وہاں کے قیدیوں کو وہ اُن کے
اوپر سے گذارتے تھے تا کہ انہیں اپنی ذلّت اور بیچارگی
کا احساس ہو ۔
میرے نزدیک جب وہ پکڑے گئے اور یروشلم
کے اوپر سے گذارے گئے اُس وقت انہوں نے اِس کے
متعلق خدا تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ خدایا یہ کیا ہو
گیا ہے ۔ شہر گرا دیا گیا ہے ۔ سب بڑے بڑے لوگ
قید کر کے لے جائے جا رہے ہیں ۔ ایسی خطرناک تباہی
کے بعد اب یہ شہر دوبارہ کب آباد ہوگا ۔ وَهِيَ
خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے الفاظ بھی اِسی امر پر
دلالت کرتے ہیں کہ یروشلم کے تباہ ہوتے ہی اُن کے
دل میں یہ خیال پیدا ہوا جب کہ گری ہوئی چھتیں انہیں
نظر آ رہی تھیں ۔ ورنہ بعد میں تو لوگ سامان اُٹھا
کر لے جاتے ہیں ۔ اُس وقت اُن کے دل میں یہ خیال گذرا
کہ الٰہی یہ شہر دوبارہ کب آباد ہوگا ۔ ہم تو سب قید
ہو کر جا رہے ہیں ۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے انکو سو سال
کی موت کا نظارہ دکھایا ۔ یعنی کشفی رنگ میں انہیں
ایسا محسوس ہُوا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں اور سو سال کے
بعد پھر زندہ ہوئے ہیں ۔ اور خوابوں میں ایسا ہونا

کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ انسان خواب میں مرتا بھی ہے اور مختلف قسم کے نظارے بھی دیکھتا ہے۔ حضرت حزقیل چونکہ اپنی قوم کے نبی تھے۔ اس لئے اُن پر کشفی رنگ میں موت کی کیفیت وارد کرنے سے مراد درحقیقت بنی اسرائیل کی موت تھی اور اللہ تعالیٰ اس ذریعہ سے انہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل سو سال تک غلامی اور ادبار کی حالت میں رہیں گے اس کے بعد انکو ایک نئی زندگی عطا کی جائیگی اور وہ اپنے شہر میں واپس آجائینگے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسجگہ رؤیا کا کوئی لفظ نہیں۔ مگر قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ وہ بعض دفعہ رؤیا کا تو ذکر کرتا ہے مگر رؤیا کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب بتایا کہ میں نے دیکھا ہے کہ چاند اور سورج وغیرہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں تو انہوں نے رؤیا کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ پس یہ ضروری نہیں ہوتا کہ خواب کے ذکر میں خواب کا لفظ بھی استعمال کیا جائے۔

جب وہ یہ نظارہ دیکھ چکے تو اُن کو اٹھایا گیا۔ یعنی اُن کی کشفی حالت جاتی رہی۔ اور خدا تعالیٰ نے اُن سے پُوچھا کہ کَمْ لَبِثْتَ بتا تو کتنے عرصہ تک اس حالت میں رہا انہوں نے عرض کیا لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ میں تو صرف ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں۔ محاورہ میں اس کے یہ معنے ہیں کہ اچھی طرح معلوم نہیں۔ چنانچہ یہ محاورہ قرآن کریم میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ فرماتا ہے۔ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ (مومنون آیت ۱۱۳، ۱۱۴) یعنی اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا کہ تم زمین میں کتنے سال رہے ہو۔ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے ہیں۔ تو گننے والوں سے پُوچھ لے یعنی ہم بہت تھوڑا عرصہ رہے ہیں یا ہمیں معلوم نہیں کہ کتنا عرصہ رہے۔ حضرت حزقیل کا یہ جواب ادب کے طور پر تھا۔ کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کا اس سوال سے کیا منشا ہے۔ یعنی بات تو ظاہر ہے کچھ دیر ہی سویا ہوں۔ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس بات کے علاوہ جو تیرے دل میں ہے ہم ایک اَور بات بھی بتاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ تُو سو سال تک رہا ہے۔ یہاں بَلْ میں پہلے قول کی نفی نہیں کی گئی۔ بلکہ ایک اَور بات بیان کی گئی ہے۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى (اعلیٰ) یعنی جو شخص پاک بنے گا یقیناً کامیاب ہو گا بشرطیکہ اُس نے اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھتا رہا۔ مگر اے مخالفو! تم دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت کہیں زیادہ بہتر اور دیرپا ہے۔ اس آیت میں بَلْ سے پہلے کی بات بھی درست ہے اور بعد کی بھی۔ اسی طرح اس آیت میں بَلْ کے لفظ سے حضرت حزقیل کے اس خیال کی کہ وہ دن یا دن کا کچھ حصہ اس حالت میں رہے تردید مدِّنظر نہیں بلکہ اس کے علاوہ ایک اور مضمون کی طرف اُن کے ذہن کا انتقال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک نقطۂ نگاہ سے دیکھو تو تم نے سو سال اس حالت میں گذارے ہیں۔ مگر چونکہ نبی کا قول بھی اپنی جگہ درست تھا اس لئے اس خیال سے کہ نبی خدا تعالیٰ کے قول کو مقدّم رکھ کر اپنے خیال کو غلط نہ قرار دیدے اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی فرما دیا کہ ہم تمہارے خیال کو ردّ نہیں کرتے۔ وہ بھی درست ہے۔ چنانچہ دیکھو تمہارا کھانا اچھی حالت میں ہے سڑا نہیں اور تمہارا گدھا بھی تندرست اپنی جگہ پر کھڑا ہے جس سے ثابت ہُوا کہ تمہارا خیال بھی کہ تم صرف چند گھنٹے اس حالت میں رہے ہو اپنی جگہ درست ہے۔ ورنہ جو سَو سال تک واقعہ میں مرا رہا ہو اُسے یہ نہیں کہا جاتا کہ اپنا کھانا دیکھ وہ سڑا نہیں۔ اور پھر فرمایا کہ یہ رؤیا ہم نے

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ

اور (اس واقعہ کو بھی یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے رب مجھے بتا کہ تو مُردے کس طرح زندہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ کیا تُو

تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ

ایمان نہیں لا چکا؟ (ابراہیمؑ نے) کہا۔ کیوں نہیں (ایمان تو بیشک حاصل ہو چکا ہے) لیکن اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر (میں نے یہ سوال کیا ہے)

اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ

فرمایا۔ اچھا! تُو چار پرندے لے اور اُن کو اپنے ساتھ سِدھا لے۔ پھر ہر ایک پہاڑ پر اُن میں سے ایک

جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ؕ

(ایک) حصّہ رکھ دے۔ پھر انہیں بُلا وہ تیری طرف تیزی کے ساتھ چلے آئیں گے

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ ع

۳۵ ع ۳

اور جان لے کہ اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔ ۱۷۰

اسلئے دکھائی ہے تاکہ ہم تجھے لوگوں کیلئے ایک نشان بنائیں۔ اب تُو ان مُردہ ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم ان کو کس طرح کھڑا کرتے ہیں اور ان پر گوشت پوست چڑھاتے ہیں۔

اس کشف اور الہام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری دی کہ ایک سو سال تک یہ شہر آباد ہو جائیگا۔ چنانچہ ٹھیک سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس شہر کی ترقی اور آبادی کی صورت پیدا کردی۔ یروشلم کی تباہی دو دفعہ ہوئی ہے۔ ایکدفعہ ۵۹۷ قبل مسیح میں اور دوسری دفعہ یروشلم کی بغاوت پر ۵۸۶ قبل مسیح میں۔ اسلئے سو سال دوسری تباہی سے ہی لئے جائینگے۔ کیونکہ شہر کو اسی میں برباد کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۵۱۶ قبل مسیح میں یروشلم کی دوبارہ بنیاد رکھی گئی اور تیس سال تک تعمیر جاری رہی جس کے نتیجہ میں ۴۸۹ قبل مسیح میں یروشلم صحیح طور پر آباد ہوا۔ پس درمیانی فاصلہ قریباً سو سال (۹۸ سال) کا ہی ثابت ہوتا ہے۔

وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا

کے الفاظ سیوک کے اس قول کے مطابق استعمال کئے گئے ہیں جس کا حزقیل نبی کی کتاب میں بھی ذکر آتا ہے کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے (حزقیل باب ۳۷ آیت ۱۱) اللہ تعالیٰ نے اُنکو بتایا کہ تم ایک دن پھر زندہ ہو گے اور پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت و عظمت حاصل کرو گے۔

غرض اس واقعہ کے متعلق بائبل سے رؤیا بھی مل گیا۔ بنی اسرائیل کی ہڈیوں پر گوشت کا چڑھایا جانا بھی ثابت ہو گیا۔ اسی طرح حزقیل نبی کو پکڑ کر لے جانا بھی ثابت ہو گیا اور پھر سو سال کے بعد یروشلم کا دوبارہ آباد ہونا بھی تاریخ سے ثابت ہو گیا۔ حزقیل نبی کو پہلے تو صدمہ ہوا کہ یہ کیا ہو گیا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ نے انکو بتایا کہ یہ ہمیشہ کی تباہی نہیں تو انہوں نے کہا اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ خدایا اب میری تسلی ہو گئی ہے۔ اور گو بظاہر ان حالات کا بدلنا ناممکن نظر آتا ہے مگر یہ بات یقیناً ہو کر رہے گی۔ اور خدا تعالیٰ دوبارہ اس شہر اور قوم کو ترقی عطا فرمائے گا۔

۱۷۰ حل لغات

:۔ صُرْھُنَّ : صُرْ کے ساتھ جب اِلٰی کا صلہ آجائے تو اس کے معنے اپنی طرف مائل کر لینے کے ہوتے ہیں۔ کاٹنے کے نہیں ہوتے۔ ہاں جب یہ لفظ

صُرْھُنَّ

اِلٰی کے صِلہ سے خالی ہو تو اس وقت اس کے معنے کاٹنے کے ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ صَارَ الشَّیْءَ قَطَعَهٗ۔ اُسے کاٹ دیا۔ پس صُرْهُنَّ اِلَیْكَ کے معنے ہیں۔ اُن کو اپنے ساتھ سِدھا لے۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے تم اِس واقعہ کو بھی یاد کرو جب ابراہیمؑ نے کہا تھا۔ کہ اے میرے رب! مجھے بتا کہ تو مُردے کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ کیا تو ایمان نہیں لا چکا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کے جواب میں بَلٰی کہا۔ جس سے اِس عقیدہ کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالےٰ مُردے زندہ کر سکتا ہے اور مَیں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہ ایسا کر سکتا ہے گویا انہوں نے اس کے متعلق کسی شک کا اظہار نہیں کیا بلکہ اقرار کیا کہ خدا تعالےٰ یہ کام کر سکتا ہے اور مجھے اِس پر کامل ایمان حاصل ہے۔

بَلٰی کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سے پہلے خواہ نفی ہو یا اثبات اِس سے مراد "ہاں" ہی ہوتی ہے اگر اسجگہ نَعَمْ کا لفظ ہوتا تو اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے تھے کہ ہاں مجھے ایمان نہیں ہے۔ مگر اسجگہ بَلٰی کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جس سے یہ شبہ دُور ہو گیا کیونکہ اِس کے معنے ہر صورت میں اثبات ہی کے ہوتے ہیں۔

ایمان کے بعد لٰکِن کا لفظ رکھا گیا ہے۔ جو استدراک کیلئے آتا ہے یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے ایمان تو ہے کہ خدا تعالیٰ مردے زندہ کر سکتا ہے لیکن مَیں اِس سے ایک زائد بات چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ میرے دل کو بھی اطمینان حاصل ہو جائے کہ تُو میری قوم کے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ جیسے ایک شخص جو بیمار ہو۔ اُسے ایمان تو ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ بیماروں کو اچھا کر سکتا ہے لیکن اطمینان نہیں ہو سکتا کہ اُسے بھی اچھا کریگا یہ اطمینان خدا کے بتانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یا مثلاً ہر شخص جانتا ہے کہ بھوک کے بعد لوگ سیر ہو جایا کرتے ہیں مگر کیا اِس سے ایک فاقہ زدہ کو یہ یقین ہو جائیگا کہ مجھے بھی کھانا مِل جائیگا اور مَیں سیر ہو جاؤں گا۔ پس ایمان تو امرِ غیب کے متعلق ہوتا ہے جو انسان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ اور کسی چیز کے ہونے یا ہو سکنے کے متعلق اس کے یقینِ کامل کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اطمینان کا لفظ دو چیزوں کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک شک کے مقابلہ میں۔ دوسرے کرب و اضطراب کے مقابلہ میں۔ وہ اطمینان جو شک کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ وہ یہاں مراد نہیں۔ بلکہ وہی اطمینان مراد ہے۔ جو کرب اور اضطراب کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اثباتِ ایمان موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تھا کہ خدا تعالیٰ احیاءِ موتیٰ کر سکتا ہے مگر وہ اپنی قوم کے متعلق بھی یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اُس پر الٰہی فضل نازل ہوگا اور وہ بھی زندہ قوم بن جائیگی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تو چار پرندے لے اور اُن کو اپنے ساتھ سِدھا لے۔ پھر ہر ایک پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک حصّہ رکھدے۔ پھر انہیں بُلا۔ وہ تیری طرف تیزی کے ساتھ چلے آئیں گے۔ اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور حکمت والا ہے۔

لوگ اِس آیت کے یہ معنے کرتے ہیں کہ چار پرندے پکڑ کر اُن کا قیمہ کر لے۔ اور اُن کو اپنی طرف لے لے لیکن یہ بالکل غلط اور محاورہ کے خلاف معنے ہیں۔ کیا کوئی شخص قیمہ کر کے اُسے اپنی طرف بھی لیا کرتا ہے۔ پس یہ کوئی معنے نہیں کہ قیمہ کر کے اُسے اپنی طرف لے لے۔ اِس کے یہی معنے ہیں کہ تُو اُن کو اپنے ساتھ سِدھا لے (مفردات و اقرب الموارد)

جُزْءًا کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لفظ بتلاتا ہے کہ یہاں قیمہ کرنا ہی مراد ہے۔ مگر یہ بھی غلط ہے۔

جزء کے معنے ایک پرندے کے ٹکڑے کے نہیں بلکہ چاروں پرندوں کا جزء مراد ہے جو ایک کا عدد ہے۔ اس کی مثال قرآن کریم کی اس آیت سے ملتی ہے کہ اِنَّ جَہَنَّمَ لَمَوۡعِدُہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ۔ لَہَا سَبۡعَۃُ اَبۡوَابٍ۔ لِکُلِّ بَابٍ مِّنۡہُمۡ جُزۡءٌ مَّقۡسُوۡمٌ۔ (حجر آیت ۴۴-۴۵)
یعنی جہنم سب کفار کے لئے مقررہ جگہ ہے۔ اس کے سات دروازے ہونگے اور ہر دروازہ کے لئے کفار کا ایک حصہ مقرر ہوگا۔ اسجگہ جُزۡءٌ کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔ لیکن کوئی شخص یہ معنے نہیں کرتا کہ کفار کا قیمہ کرکے اُس قیمہ کا تھوڑا تھوڑا حصہ سب دروازوں میں ڈال دیا جائیگا۔ بلکہ سب مفسرین متفق ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ کافر ایک دروازہ سے لے جائے جائیں گے اور کچھ دوسرے سے اور کچھ تیسرے سے اور کچھ چوتھے سے۔ پس سورۂ حجر کی اس آیت نے بتلا دیا کہ جب جزء کا لفظ ایک جماعت پر بولا جائے تو اس سے اس جماعت کے افراد مراد ہوتے ہیں۔ اور انہی معنوں میں جزء کا لفظ اس آیت میں استعمال ہوا ہے اور مراد ہر پرندہ کا جزء نہیں بلکہ چار کا جزء ہے اور معنے یہ ہیں کہ ہر چوٹی پر ایک ایک پرندہ رکھدے۔

یہ واقعہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ظاہری ہوتا تو اس پر بہت سے اعتراض پڑتے ہیں۔ اوّل یہ کہ احیاء موتیٰ کے ساتھ پرندوں کے سدھانے کا کیا تعلق۔ دوم۔ چار پرندے لینے کے کیا معنے؟ کیا ایک سے یہ غرض پوری نہ ہوتی تھی؟ سوم پہاڑوں پر رکھنے کا کیا فائدہ کیا کسی اور جگہ رکھنے سے کام نہ چلتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ظاہری کلام نہیں بلکہ مجازی کلام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ الٰہی احیاءِ موتیٰ کا جو کام تُو نے میرے سپرد کیا ہے۔ اُسے پُورا کرکے دکھا۔ اور مجھے بتا کہ میری قوم میں زندگی کی رُوح کس طرح پیدا ہوگی جبکہ میں بڈھا ہوں۔ اور کام بہت اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے وعدہ کیا ہے تو یہ کام ہوکر رہیگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ ہوکر تو ضرور رہیگا مگر میں اپنے اطمینان کے لئے پوچھتا ہوں کہ یہ مخالف حالات کس طرح بدلیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تو چار پرندے لیکر سدھا۔ اور ہر ایک کو پہاڑ پر رکھدے۔ پھر اُن کو بُلا۔ اور دیکھ کہ وہ کس طرح تیری طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ یعنی اپنی اولاد میں سے چار کی تربیت کر۔ وہ تیری آواز پر لبّیک کہتے ہوئے اِس احیاء کے کام کی تکمیل کریں گے یہ چار روحانی پرندے حضرت اسمٰعیل۔ حضرت اسحاق حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام ہیں۔ اِن میں سے دو کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے براہِ راست تربیت کی اور دو کی بالواسطہ پہاڑ پر رکھنے کے معنے بھی یہی تھے کہ اِن کی نہایت اعلیٰ تربیت کر کیونکہ وہ بہت بڑے درجہ کے ہونگے۔ گویا پہاڑ پر رکھنے میں اُن کے رفیع الدرجات ہونے کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ بلندیوں کی چوٹیوں تک جا پہنچیں گے۔

اسی طرح چار پرندوں کو علیحدہ علیحدہ چار پہاڑوں پر رکھنے کے یہ معنے تھے کہ یہ احیاء چار علیحدہ علیحدہ وقتوں میں ہوگا۔ غرض اس طرح احیاء قومی کا وہ نقشہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریب زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا انہیں بتا دیا گیا۔ اسی طرح بعد کے زمانہ کے لئے بھی اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی چار ترقیوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کیا تھا کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کیا تم کو میری طاقتوں پر ایمان نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ایمان تو ہے وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ۔ یہ زبان کا ایمان ہے

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ (تعالیٰ) کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ

(کے اس فعل) کی حالت اُس دانہ کی حالت کے مشابہ ہے جو سات بالیں اُگائے (اور) ہر بالی میں

سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

سَو دانہ ہو اور اللہ جس کیلئے چاہتا ہے (اس سے بھی) بڑھا (بڑھا کر) دیتا ہے۔

مَیں دیکھتا ہوں کہ آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کرتے ہیں مگر دل کہتا ہے کہ یہ طاقت میری اولاد کی نسبت بھی استعمال ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ نشان اپنے نفس میں بھی دیکھوں اِس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ تمہاری قوم چار دفعہ مُردہ ہوگی اور ہم اُسے چار دفعہ زندہ کریں گے۔

چنانچہ ایک دفعہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے زمانہ میں۔ اُن کے ذریعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوئی اور یہ مُردہ زندہ ہُوا۔ پھر حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کی آواز بلند ہوئی۔ اور یہ مُردہ زندہ ہُوا۔ پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ذریعہ وہی آواز بلند ہوئی اور اس مردہ قوم کو زندگی ملی۔ اور چوتھی بار حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ ابراہیمی آواز پھیلی اور وہی مُردہ زندہ ہُوا۔ چار دفعہ ابراہیمی نسل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آوازیں دیں اور چاروں دفعہ وہ دوڑ کر جمع ہوگئی۔

پہلا پرندہ جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بلایا اور اطمینانِ قلب حاصل کیا وہ موسوی اُمّت تھی دوسرا پرندہ عیسوی اُمت تھی۔ تیسرا پرندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلالی ظہور کی حامل اور مظہر محمدی جماعت تھی۔ اور چوتھا پرندہ آپؐ کے جمالی ظہور کی مظہر جماعت احمدیہ ہے۔ جس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کو راحت پہنچائی اور آپ نے کہا کہ واقعی میرا خدا زندہ کرنے والا ہے بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ کا بھی یہی مطلب تھا کہ حضور زبان تو اقرار کرتی ہے اور مَیں ہر روز دیکھتا ہوں کہ آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اِس کا مجھے کس طرح انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر میری اولاد ہدایت نہ پائے تو مجھے اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوسکتا۔ پس اطمینانِ قلب کے لئے مَیں نشان مانگتا ہوں۔ میری عقل وفکر۔ میرے ہوش وحواس اور میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ آپ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ مگر دل کہتا ہے کہ مَیں خود کیا تعریف کروں جب تک یہ پتہ نہ لگے کہ میری اولاد میں بھی یہ نشان ظاہر ہوگا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں بتایا کہ تمہاری اولاد کو چار دفعہ زندہ کیا جائے گا اور چار بار اُس پر خاص فضل نازل ہوگا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت۔ تیسری دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت اور چوتھی دفعہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۶۲﴾

اور اللہ وسعت دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے ۱۷۱

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر خدا تعالیٰ نے اپنا خاص فضل نازل کیا۔ اور انہیں رُوحانی لحاظ سے زندہ کردیا غرض اس میں قریب اور بعید دونوں زمانوں کے لئے پیشگوئی کی گئی تھی جو اپنے اپنے وقت میں بڑی شان سے پوری ہوئی۔ اور خدا تعالیٰ کا عزیز اور حکیم ہونا ظاہر ہوگیا۔

يُضٰعِفُ

۱۷۱ حل لغات:۔ يُضَاعِفُ: کلیاتِ ابی البقاء میں لکھا ہے کہ اَقَلُّ الضِّعْفِ مَحْصُوْرٌ وَهُوَ مِثْلُ الْوَاحِدِ وَاَكْثَرُهٗ غَيْرُ مَحْصُوْرٍ یعنی ضعف کی اقل ترین تعداد دوگنا ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ جتنی بھی ہو سب ضعف میں شمار ہوتی ہے۔

تفسیر:۔ سابقہ رکوع میں احیاءِ قومی کی تین مثالیں دی گئی ہیں۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ ایک چوتھی تمثیل بیان فرماتا ہے اور بتاتا ہے کہ اگر تم دینی کاموں کے لئے اپنے اموال خرچ کرو گے تو جس طرح ایک دانہ سے اللہ تعالیٰ سات سو دانے پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ تمہارے اموال کو بھی بڑھائیگا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ترقی عطا فرمائیگا۔ جس کی طرف وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ میں اشارہ ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے بیشک بڑی قربانیاں کی تھیں۔ مگر خدا تعالیٰ نے انکو اپنے رسول کا پہلا خلیفہ بنا کر انہیں جس عظیم الشان انعام سے نوازا اس کے مقابلہ میں اُن کی قربانیاں بھلا کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے بہت کچھ دیا مگر انہوں نے کتنا بڑا انعام پایا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی جو کچھ خرچ کیا اُس سے لاکھوں گنا زیادہ انہوں نے اسی دنیا میں پایا۔ اسی طرح ہم فرداً فرداً صحابہؓ کا حال دیکھتے ہیں۔ تو وہاں بھی خدا تعالیٰ کا یہی سلوک نظر آتا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو ہی دیکھ لو۔ جب وہ فوت ہوئے تو اُن کے پاس تین کروڑ روپیہ جمع تھا۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں وہ لاکھوں روپیہ خیرات کرتے رہے۔ اسی طرح صحابہؓ نے اپنے وطن کو چھوڑا تو اُن کو بہتر وطن ملے بہن بھائی چھوڑے تو اُن کو بہتر بہن بھائی ملے۔ اپنے ماں باپ کو چھوڑا۔ تو ماں باپ سے بہتر محبت کرنیوالے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنیوالا کبھی جزائے نیک سے محروم نہیں رہا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ کہہ کر بتایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام دینے میں بُخل تو تب ہو جبکہ خدا تعالیٰ کے ہاں کسی چیز کی کمی ہو۔ مگر وہ تو بڑی وسعت والا اور بڑی فراخی والا ہے اور پھر وہ علیم بھی ہے۔ جانتا ہے کہ وہ شخص کس قدر انعام کا مستحق ہے۔ اگر کوئی شخص کروڑوں گنا انعام کا بھی مستحق ہو۔ تو اللہ تعالیٰ اُسے یہ انعام دینے کی قدرت رکھتا ہے دنیا میں ہم روزانہ یہ نظارہ دیکھتے ہیں کہ زمیندار زمین میں ایک دانہ ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے سات سو دانے بنا کر واپس دیتا ہے۔ پھر جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرے گا کیسے ممکن ہے کہ اُس کا خرچ کیا ہوا مال ضائع ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے مال کا کم از کم سات سو گنا بدلہ مقرر ہے۔ اس سے زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں۔ اگر انتہائی حد مقرر کر دی جاتی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو محدود ماننا پڑتا۔ جو خدا تعالیٰ میں ایک نقص ہوتا اسی لئے فرمایا کہ تم خدا کی راہ میں ایک دانہ خرچ کرو گے تو کم از کم سات سو گنا بدلہ ملیگا۔ اور زیادہ کی کوئی انتہا نہیں اور نہ اُس کے انواع کی کوئی انتہا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو انجیل میں صرف اتنا فرمایا تھا کہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا

جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ کرنے

يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ

کے بعد نہ کسی رنگ میں احسان جتاتے ہیں اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں اُنکے رب کے پاس

جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں" (متی باب ۶ آیت ۲۰) لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے خزانہ میں اپنا مال جمع کر دگے تو یہی نہیں کہ اُسے کوئی چرائیگا نہیں بلکہ تمہیں کم از کم ایک کے بدلہ میں سات سو انعام ملیں گے۔ اور اس سے زیادہ کی کوئی حد بندی نہیں۔ پھر حضرت مسیحؑ کہتے ہیں۔ وہاں غلہ کو کوئی کیڑا نہیں کھا سکتا۔ مگر قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ صرف کیڑے سے ہی محفوظ نہیں رہتا بلکہ ایک سے سات سو گنا ہو کر واپس ملتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کسی انسان کی مدد کا محتاج نہیں مگر وہ اپنے بندوں پر رحم کرتے ہوئے اگر کسی کام کے کرنیکا انہیں موقع دیتا ہے تو اس لئے کہ وہ اُن کے مدارج کو بلند کرنا چاہتا ہے چنانچہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی نبی کو دنیا میں بھیجتا ہے تو اُسے نئے سرے سے ایک جماعت قائم کرنی پڑتی ہے۔ مگر اس کی ابتداء ایسی ہوتی ہے کہ دنیا اُسے دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں کر سکتی کہ وہ کامیاب ہو جائے گا لیکن خدا تعالیٰ اس کے ذریعے دنیا کے نظام کو بدل دیتا ہے۔ اُسوقت دنیا کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک زندہ خدا موجود ہے جس کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔ ایسے انبیاء کے زمانہ میں انکی قوموں اور اُمتوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ دین کی خدمت کریں۔ چونکہ وہ وقت ایک نئی دنیا کی تعمیر کا ہوتا ہے اس لئے لوگوں کو قربانیوں کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ اور وہی وقت ثواب کے حصول کا ہوتا ہے۔

اوپر کے بیان کردہ مفہوم کے علاوہ اس آیت میں غلہ کی زیادتی کے امکانات کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ بعض حالات میں یہ ممکن ہے کہ ایک دانہ سات بالیں نکالے۔ اور ہر بال میں ایک ایک سو دانہ ہو۔ یعنی ایک دانہ سات سو گنا ہو جائے۔ یا ایک من بیج سے سات سو من گندم پیدا ہو۔ اور پھر اسی پر بس نہیں اللہ تعالیٰ چاہے تو اس سے بھی زیادہ بڑھا دے۔ اس اصول کے مطابق اگر دیکھا جائے تو چونکہ ہمارے ملک میں عام طور پر فی ایکڑ تیس سیر بیج ڈالا جاتا ہے۔ اگر ایک دانہ سے سات سو دانہ تک کی پیداوار ہو تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ ایک ایکڑ سے ۲۱۰۰۰ سیر اناج پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہ ۵۲۵ من بنتے ہیں۔ گویا قرآنی اصول کے مطابق ۵۲۵ من فی ایکڑ پیداوار ہو سکتی ہے۔ بلکہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اللہ [illegible] چاہے تو اِسے بھی بڑھا سکتا ہے۔
اِسوقت لوگ [illegible] پانچ من فی ایکڑ پیداوار پر گذارہ کر رہے ہیں۔ اگر یہ پیداوار بڑھ کر سوا پانچسو من فی ایکڑ ہو جائے اور زیادتی کا جو وعدہ ہے وہ نہ بھی پورا ہو تب بھی دنیا میں اتنی گندم ہو سکتی ہے۔ جو موجودہ آبادی سے کئی گنا زیادہ آبادی کے لئے بھی کافی ہو۔ پھر ابھی کئی غیر آباد علاقے پڑے ہیں انہیں آباد کیا جائے تو پیداوار میں اَور بھی زیادتی ممکن ہے۔ مثلاً افریقہ کے بعض علاقے ہیں جو ابھی غیر آباد ہیں۔ آسٹریلیا اور کینیڈا کے علاقوں میں بھی ابھی بہت کم آبادی ہے۔ اسی طرح رُوس کے بعض

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲۶۳)

اُن (کے اعمال) کا بدلہ (محفوظ) ہے - اور نہ تو انہیں کسی قسم کا خوف ہوگا - اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ ۱۷۲ع

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ

اچھی بات (کہنا) اور (قصور) معاف کرنا اُس صدقہ سے بہتر ہے

حصوں میں بھی زمینیں خالی پڑی ہیں - اگر ان علاقوں کی طرف توجہ کی جائے اور صحیح طور پر زراعت کی جائے اور سائنس کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے تو دنیا میں پیداوار کے لحاظ سے ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہو سکتا ہے - اور آبادی میں بھی کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے -

۱۷۲ حل لغات :- اَلْمَنُّ کے معنے ہیں مَنَّ عَلٰی مَا صَنَعَ کسی پر احسان کرکے اُسے جتلانا - مثلاً کہتے ہیں اَعْطَيْتُكَ كَذَا وَ فَعَلْتُ مَعَكَ كَذَا میں نے فلاں وقت تیرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا اور تجھے یہ کچھ دیا تھا - عربوں کا محاورہ ہے کہ اَلْمَنُّ اَخُو الْمَنِّ - کہ احسان جتلانا کاٹ ڈالنے کے برابر ہے - مَنٌّ کے معنے کاٹنے کے بھی ہوتے ہیں - چنانچہ دوسرا مَنٌّ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے -

اَلْمَنُّ

اَذًى : تکلیف پہنچانا - گندی بات - گند - حدیث میں آتا ہے - اَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى یعنی جب بچہ سات دن کا ہو جائے - تو وہ نجاست وغیرہ جو اندر سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور بال اس سے دُور کر دو -

اَذًى

تفسیر :- لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى میں بتایا کہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے بعد تمہاری یہ کیفیت نہیں ہونی چاہیئے کہ تم میں تکبّر کے خیالات پیدا ہو جائیں - اور تم یہ کہنا شروع کر دو کہ ہم نے تو یہ کچھ دیا تھا - یوں مال قربان کیا تھا - یوں خدمتِ دین کی تھی - کیونکہ ایسا کرنا تمہاری نیکی کو ضائع کر دیگا - قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں اَعراب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے - يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ط اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وہ اپنے اسلام قبول کرنے کا بھی تجھ پر احسان جتاتے ہیں - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - تو ان لوگوں سے صاف صاف کہہ دے کہ لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ تم مجھ پر اپنے اسلام لانے کا احسان نہ جتاؤ - بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ - اصل حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان ہے کہ اُس نے تمہیں ایمان کا راہ دکھایا اور ایک سچے مذہب کو قبول کرنیکی توفیق بخشی - اسی طرح مالی قربانیوں کے بعد دوسروں پر احسان جتانا سخت نادانی ہے - کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اُس نے خدا کیلئے کام نہیں کیا تھا بلکہ بندوں کو ممنونِ احسان کرنے کیلئے کیا تھا - اور یہ چیز انسان کو ثواب سے محروم کر دیتی ہے - حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی ایک مقام پر اپنی جماعت کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے :-

"یہ مت خیال کرو کہ تم کوئی حصّہ مال کا دیکر یا کسی اور رنگ سے کوئی خدمت بجا لاکر خدا تعالیٰ اور اس کے فرستادہ پر کچھ احسان کرتے ہو - بلکہ یہ اُس کا احسان

يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۴﴾

جس کے پیچھے ایذا رسانی (شروع) ہو (جائے) اور اللہ بے نیاز (اور) بُردبار ہے۔ ۱۷۳

ہے کہ تمہیں اس خدمت کے لئے بلاتا ہے۔۔۔۔

پس ایسا نہ ہو کہ تم دل میں تکبّر کرو۔ اور یا یہ خیال کرو کہ ہم خدمت مالی یا کسی قسم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں بار بار تمہیں کہتا ہوں کہ خدا تمہاری خدمتوں کا ذرا محتاج نہیں ہاں تم پر یہ اس کا فضل ہے کہ تم کو خدمت کا موقعہ دیتا ہے۔۔۔۔

اگر تم اسقدر خدمت بجالاؤ کہ اپنی غیر منقولہ جائدادوں کو اس راہ میں بیچ دو پھر بھی ادب سے دُور ہو گا کہ تم خیال کرو کہ ہم نے کوئی خدمت کی ہے۔۔۔۔ یہ تمام خیالات ادب سے دُور ہیں اور جس قدر بے ادب جلد تر ہلاک ہو جاتا ہے ایسا جلد کوئی ہلاک نہیں ہوتا۔"

(تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۵۵-۵۶)

پھر اَذًی کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ ایسا بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ انسان کسی سے کوئی نیک سلوک کر کے اُسے اپنا غلام سمجھ لے اور پھر اس سے مستقل طور پر فائدہ اٹھانا شروع کر دے۔ یا چندہ دینے کے بعد کہے کہ میں نے تو اتنا چندہ دیا تھا۔ اب مجھے بھی مدد دی جائے۔ اور میری مشکلات کو دُور کیا جائے۔

لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ میں یہ خوشخبری دی کہ ایسے لوگ جو خالصۃً لوجہ اللہ قربانیاں کریں گے وہ اپنے اس اعلیٰ کردار کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی خاص حفاظت میں آجائیں گے اور انہیں اپنے ماضی کی طرف سے بھی سکون قلب عطا کیا جائیگا

اور اُن کا مستقبل بھی نہایت شاندار ہو گا۔

۱۷۳ حل لغات:۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ کے معنے ہیں کوئی بھلائی کی بات۔ مثلاً سائل کو نرمی سے ٹلا دیا جائے یا یہ کہدیا جائے کہ ہمارے پاس اس وقت کچھ نہیں۔

اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ۔ کوئی نیکی کی بات کہدینا۔

مَغْفِرَةٌ: پردہ ڈال دینا۔ کسی کا گناہ معاف کر دینا۔ کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اُس سے درگذر کرنا۔

تفسیر:۔ اس نصیحت کے بعد کہ خواہ کوئی دین کے لئے چندہ دے یا اُن لوگوں کے لئے مالی قربانی کرے جو دین کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے اور ہجرت کر کے مرکز میں آجاتے ہیں۔ یا غرباء کی اعانت کیلئے مال خرچ کرے۔ اُسے یہ نہیں چاہیئے کہ وہ انہیں طعنہ دے کہ تم ہمارے چندوں پر پلتے ہو۔ اور اس طرح اُن کو اذیّت پہنچانے کا موجب بنے۔ یا یہ کہے کہ ہم نے تم سے فلاں وقت یہ سلوک کیا تھا۔ اور اُن پر احسان جتانے لگ جائے۔ اب بتاتا ہے کہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ انسان اپنے مُنہ سے کوئی کلمۂ خیر ہی کہدیا کرے۔ مثلاً کوئی سائل آیا تو اُس سے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ضرورت کو پورا کرے اور آپ کے لئے اپنے فضل کے دروازے کھولے۔ اس طرح نرمی اور محبت کے ساتھ سائل کو ٹلا دے۔ اور اُس کے ساتھ پوری غمخواری اور اظہار ہمدردی کرے۔

اور مغفرت کا لفظ استعمال کر کے اسطرف توجہ دلائی کہ تم سے اگر کوئی شخص مدد مانگتا ہے۔ یا اپنی کوئی حاجت تمہارے سامنے پیش کرتا ہے تو تمہارا

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ

اَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ

مَغْفِرَةٌ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ

اے ایمان دارو! تم اپنے صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف دینے (کے فعل) سے اُس شخص کی طرح ضائع نہ کرلو

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

جو لوگوں کے دکھانے کے لئے مال خرچ کرتا ہے۔ اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا کیونکہ اُس کی

الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ

حالت تو اُس پتھر کی حالت کے مشابہ ہے جس پر کچھ مٹی (پڑی ہوئی) ہو اور اُس پر تیز بارش ہو۔ اور وہ

فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ

اُسے (مٹی دھو کر پھر) صاف پتھر (کا پتھر) کر دے۔ یہ (ایسے لوگ ہیں کہ) جو کچھ کماتے ہیں اسکا کوئی حصہ بھی اُنکے ہاتھ نہیں آتا

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۵﴾

اور اللہ اس قسم کے کافروں کو (کامیابی کی) راہ نہیں دکھاتا۔ ۱۷۴ھ

فرض ہے کہ تم پردہ پوشی سے کام لو۔ یہ نہ ہو کہ جگہ جگہ اسکی مالی کمزوری اور احتیاج کا ذکر کرتے پھرو۔ اسی طرح اس آیت کے یہ بھی معنے ہیں کہ امر بالمعروف یا عبادتِ لسانی یا دُعا کر دینا اور لوگوں کے گناہ معاف کر دینا اس صدقہ سے زیادہ بہتر ہیں جس کے بعد ایذار رسانی کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ یعنی ایسی نیکیاں بجالانا جو جسمانی یا عقلی ہیں تمہارے لئے زیادہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ تم ایصالِ خیر کی طرف قدم بڑھاؤ مگر کر نہ سکو۔

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ میں اس طرف اشارہ کیا کہ اگر روپیہ دے کر تم مَنّ اور اَذٰی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے۔ اسے تمہارے روپے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو کھڑا کر دیگا جو تم سے بہتر خدمت دین کرنے والے ہونگے۔ اور حَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ گو تمہاری خدمتوں سے بے نیاز ہے مگر اس کے حلم نے تقاضا کیا کہ وہ تم پر رحم کرے اور تمہیں ہلاکت سے بچائے چنانچہ اُس نے ان احکام کے ذریعے تمہاری جنت کو تمہارے قریب کر دیا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم چاہو تو اُس کی صفت غنا کے ماتحت آجاؤ۔ اور چاہو تو اُس کی صفت حلیم سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور ہر قسم کی نیکیاں محض خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے کرو۔ کوئی دنیوی منفعت اپنے سامنے نہ رکھو۔

۱۷۴ھ حل لغات:- صَفْوَانٌ کے معنے ہیں اَلصَّخْرُ الْاَمْلَسُ۔ چکنا پتھر۔

صَفْوَانٌ

صَلْدًا:- اقرب الموارد میں لکھا ہے کہ مَا لَا يُنْبِتُ شَيْئًا مِنَ الْحِجَارَةِ وَمِنَ الْاَرَضِيْنَ۔ يُقَالُ حَجَرٌ صَلْدٌ وَاَرْضٌ صَلْدٌ۔ یعنی جس پتھر یا زمین میں کچھ نہ اُگے اسے حَجَرٌ صَلْدٌ یا اَرْضٌ صَلْدٌ کہتے ہیں۔

صَلْدًا

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اے مومنو! مَنّ اور اَذیٰ کے ذریعہ اپنے صدقات کو ضائع مت کرو۔ صدقات کے ضائع کرنے سے مراد یہ ہے کہ اُن کے نتائج کو ضائع نہ کرو۔

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاء کے لئے کوئی کام کرنا خواہ کتنا ہی اچھا ہو بہت بُرا ہوتا ہے۔ مَنّ اور اَذیٰ والا صدقہ تو احسان جتانے یا تکلیف پہنچانے کے نتیجہ میں باطل ہوتا ہے مگر ریاء والے کا صدقہ تو ریاء کا خیال آتے ہی باطل ہو جاتا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَنّ و اَذیٰ والے کا صدقہ بھی ریاء الناس والے کی طرح ضائع چلا جائیگا کیونکہ گو اس شخص کے دیتے وقت ریاء مدّنظر نہ تھی مگر اس کے دل کے گوشوں میں ضرور مخفی تھی ورنہ وہ مَنّ و اذیٰ سے کیوں کام لیتا۔

اس آیت میں ریاء کی ممانعت کے ساتھ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کے الفاظ اس لئے بڑھائے گئے ہیں کہ بعض دفعہ ایمان باللہ والیوم الآخر کے ماتحت دوسروں کی تحریص کے لئے لوگوں کو دکھا کر اپنا مال خرچ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرۃ آیت ۲۷۵) یعنی جو لوگ رات اور دن پوشیدہ بھی اور ظاہر بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر محفوظ ہے۔ اور انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ بعض دفعہ دوسروں کو دکھانے کے لئے کام کرنا بھی موجب ثواب ہوتا ہے جبکہ نیت یہ ہو کہ دوسروں کو نیکی کی تحریک ہو۔ لیکن اگر یہ نیت نہ ہو بلکہ ریاء فخر و مباہات کے لئے ہو تو ایسا فعل اعمال نیک کو اُسی طرح ضائع کر دیتا ہے جس طرح ایک پتھر جس پر مٹی جمی ہوئی ہو جب اُس پر بارش پڑے تو بجائے اس کے کہ اُس پر دانہ اُگے بارش مٹی کو بہا کر لے جاتی ہے اور دانہ اُگنے کا احتمال بھی باقی نہیں رہتا۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص اعلیٰ درجہ کا کام کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی اس کا علم ہو۔ مگر کوئی تو اس لئے اس کا اظہار کرتا ہے کہ دوسروں پر فخر کرے اور کوئی اس نیت سے اظہار کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔ دیکھو قرآن کریم ادھر تو کہتا ہے کہ تم اُن لوگوں کی طرح مت بنو جو ریاء کے طور پر مال خرچ کرتے ہیں۔ مگر ادھر کہتا ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ آیت ۱۲) یعنی تمہیں خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں بخشی ہیں اُن کا لوگوں میں اظہار کرو۔ اب یہ اظہار ریاء نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ لوگ بھی ان انعامات کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ پس ہر قسم کا اظہار ریاء نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض حالات میں نیکیوں کا اظہار ریاء ہوتا ہے اور بعض دوسرے حالات میں ریاء نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ایک شخص اچھے کپڑے پہن کر اس لئے لوگوں میں جاتا ہے کہ وہ اُسے بڑا مالدار سمجھیں تو یہ ریاء ہے۔ لیکن اگر وہی شخص عید کے دن یا جمعہ کے دن عمدہ لباس پہن کر اس لئے نکلے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کی تعمیل ہو تو یہ ریاء نہیں ہوگا۔ یا مثلاً کہیں بخار پھیلا ہُوا ہو اور کسی کے پاس کونین ہو اور وہ لوگوں کو بتائے کہ میرے پاس کونین ہے تو یہ ریاء نہیں ہوگا اور کوئی نہیں کہیگا کہ یہ اپنی عقلمندی جتا رہا ہے کہ میں نے پہلے سے ہی کونین کا انتظام کر رکھا تھا بلکہ ہر شخص اُس کے اس اظہار سے خوش ہوگا اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریگا۔ پس ریاء انسان سے اُسی صورت میں گناہ ہے جب ایسے شخص کا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہ ہو۔ اور اس سے اجر لینا مقصود نہ ہو بلکہ محض لوگوں کو خوش کرنا مدّنظر ہو ورنہ ایمان باللہ والیوم الآخر

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ

اور جو لوگ اپنے مال — اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے — اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے کیلئے

تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ

خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی حالت اس باغ کی حالت کے مشابہ ہے جو اونچی جگہ پر ہو اور اس پر تیز بارش ہوئی ہو۔

فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ

جس (کی وجہ) سے وہ اپنا پھل دو چند لایا ہو۔ اور (اسکی یہ کیفیت ہو کر) اگر اس پر زور کی بارش نہ پڑے تو تھوڑی سی بارش ہی

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۶﴾

(اس کیلئے کافی ہو جائے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ۱۷۵

کے ساتھ لوگوں کو محض نیکی کی تحریص و ترغیب دلانے کیلئے اپنی بعض قربانیوں کا اظہار منع نہیں بلکہ ایک قابلِ تعریف فعل ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (بقرۃ آیت ۲۷۲) یعنی اگر تم علی الاعلان صدقے دو تو یہ بھی بہت اچھا طریق ہے اور اگر تم اپنے صدقات چھپا کر غریبوں کو دو تو یہ تمہارے نفس کے لئے زیادہ اچھا ہے۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ریاء کار کو خدا تعالیٰ اور یوم آخر پر ایمان نہیں ہوتا۔ کیونکہ احسان وہی جتلاتا ہے جسے خدا تعالیٰ پر ایمان نہ ہو۔ اگر وہ اس نعمت کو خدا تعالیٰ کی دی ہوئی سمجھے اور اسی سے اجر کی امید رکھے تو لوگوں کی واہ واہ کا وہ خواہشمند ہی کیوں ہو۔ اسی طرح اگر اسے یقین ہو کہ آخرت میں اجر ملیگا تو وہ کیوں اسی مسکین سے خدمت لیکر اپنا اجر پورا کرنا چاہے جس کی اس نے تھوڑی بہت مدد کی ہے۔ یہی حکمت ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے مَنّ اور اَذیٰ کے مقابلہ میں رِئَآءَ النَّاسِ اور لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ رکھا ہے۔ کیونکہ مَنّ رِئَاءَ النَّاسِ کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور اَذیٰ سے مراد اس پر

ابتغاء

بوجہ رکھنا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کو اپنے صدقہ اور خیرات کی خدا سے جزا ملنے کی امید نہ ہو۔ اور یوم آخر پر یقین نہ ہو۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ۔ اب اللہ تعالیٰ ایک اور تمثیل بیان فرماتا ہے کہ خرچ کرنیکو تو ایک ریاء کار بھی اپنا مال خرچ کرتا ہے مگر اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی پتھر ہو۔ اس پر کچھ مٹی پڑی ہوئی ہو۔ اور اوپر سے زور کی بارش ہو پس جائے تو بجائے دانہ اُگنے کے وہ دُھل کر صاف ہو جائیگا۔

یہی اس شخص کا حال ہے کہ جب تک صدقہ نہیں دیا تھا تب تک تو اس کی کسی قدر اچھی حالت تھی لیکن صدقہ دیکر اور پھر مَنّ و اَذیٰ سے کام لے کر یا ریاء کرکے ایک خطرناک بدی میں مبتلا ہو گیا۔ اور یہ اچھا عمل بجائے مفید ہونے کے مضر ہو گیا۔ گویا تھوڑی بہت جو فصل اُگنے کی امید تھی وہ بھی جاتی رہی۔

۱۷۵ حل لغات :- اِبْتِغَآءَ۔ یہ حال ہے۔ اور اس کے معنے ہیں چاہتے ہوئے۔ لیکن یہ مفعول لہٗ بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی چاہنے کے لیے۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ

کیا تم میں سے کوئی شخص چاہتا ہے کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ (اور) اُسے اُس میں سے ہر قسم کے پھل ملتے (رہتے) ہوں۔

تَثْبِيْتًا: یہ بھی حال ہے۔ اِس کے معنے ہیں اپنی جانوں کو مضبوط کرتے ہوئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مِنْ کے معنے لَ کے ہوں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ فَعَلْتُ ذٰلِكَ كَسْرًا مِّنْ شَهْوَتِيْ یعنی میں نے اپنی شہوت توڑنے کیلئے فلاں کام کیا۔ اِسی طرح یہاں مِنْ کے معنے ہیں کہ اپنے نفسوں کی ثابت قدمی کے لئے۔

تثبیت کے ایک معنے ہیں کسی چیز کو گاڑ دینا۔ نفس کو گاڑ دینے کے معنے یہ ہونگے کہ جس بات پر اُسے قائم کریں اُسپر وہ مضبوط ہو جائے۔ اُس میں پختگی پیدا ہو جائے، استقلال اور مردانگی آجائے۔

رَبْوَةٍ: مَا ارْتَفَعَ مِنَ الْاَرْضِ۔ زمین کا وہ حصّہ جو بلند ہو۔

وَابِلٌ: اَلْوَابِلُ الْمَطَرُ الشَّدِيْدُ الضَّخْمُ الْقَطْرِ۔ موٹے موٹے قطرات والی سخت زور کی بارش۔

اٰتَتْ: (۱) دیے (۲) لائے۔

ضِعْفَيْنِ: (۱) بڑھا چڑھا کر (۲) دوہرے دوہرے کرکے۔ بعض جگہ کسی اسم کے دُہرانے کی بجائے اُسے تثنیہ کر دیتے ہیں۔ اصل میں ضِعْفًا وَ ضِعْفًا تھا اِسکی بجائے ضِعْفَيْنِ کر دیا۔

اَلطَّلُّ: اَضْعَفُ الْمَطَرِ کمزور ہلکی بارش اَلنَّدٰى شبنم۔ اوس۔

تفسیر:— فرماتا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں انکی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو اور وہ اونچی جگہ پر ہو۔ اسجگہ رَبْوَة کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ اونچی جگہ ہمیشہ سیلاب سے محفوظ رہتی ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو نشیب زمین میں پانی ٹھہر جاتا ہے جس سے کھیتوں کو نقصان پہنچتا ہے مگر اونچی جگہ محفوظ رہتی ہے۔ ایسی جگہ پر تیز بارش ہو تو کھیتی بہت پھل دیتی ہے۔ لیکن اگر زیادہ بارش نہ ہو تب بھی تھوڑی بارش سے ہی پھل پیدا ہو جاتا ہے اور وہی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے اِس تمثیل میں بتایا کہ سچے مومن کا دل ایک باغ کی طرح ہوتا ہے جس میں نیک اعمال کے ہرے بھرے پودے کھڑے ہوتے ہیں جب وہ صدقہ و خیرات کرتا ہے تو خواہ وہ صدقہ بارش کی طرح نہ ہو بلکہ معمولی شبنم کی طرح ہو تب بھی وہ اس کے بابرکت نتائج حاصل کر لیتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے صدقات دینے والوں میں اکثر غرباء ہوتے ہیں۔ اُن کو خیال ہو سکتا تھا کہ ہمارے صدقے وابل کہاں کہلا سکتے ہیں اس لئے فرمایا کہ وابل نہیں تو طلّ بھی اس کھیتی کو بڑھا دیگی۔ گویا امیر آدمی کے صدقہ کو وابل اور غریب آدمی کے صدقہ کو لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ کے ماتحت طلّ قرار دیا ہے۔ مگر چونکہ اُن کے دل میں اخلاص اور تقویٰ ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ وہ جو کچھ خرچ کرینگے اس سے بھی اُن کی کشتِ عمل خوب ہری بھری ہو جائیگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جزا دل کے اخلاص پر مبنی ہوتی،

تَثْبِيْتًا

رَبْوَةٍ

وَابِلٌ

اٰتَتْ

ضِعْفَيْنِ

طَلٌّ

وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ

اور اسے بڑھاپے نے بھی آپکڑا ہو۔ اور اس کے چھوٹے (چھوٹے) بچے ہوں۔ پھر اس باغ پر ایک

اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ

ایسا بگولا چلے جس میں آگ (کی سی گرمی) ہو اور وہ (باغ) جل جائے (دیکھو) اللہ (تعالیٰ) تمہارے (فائدہ کے)

لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۷﴾

لئے اس طرح اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر (سے کام لیا) کرو۔ ۱۷۹

ع ۳۶ / ۴

نہ کہ مال کی مقدار اور کمیت پر۔ صحابہ کرامؓ میں دونوں قسم کے لوگ موجود تھے۔ ایک غربت کی وجہ سے تھوڑا خرچ کرنے والے۔ اور دوسرے بہت خرچ کرنے والے۔ جو لوگ تھوڑا خرچ کرنے والے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ ہماری قربانیاں تو وابل نہیں کہلا سکتیں۔ اسلئے انکی خاطر فرمایا کہ طلّ ہی سہی۔ وہ تمہیں وابل جیسا فائدہ ہی دیگی۔

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمل کی اصل حقیقت دیکھتا ہے۔ اسکی ظاہری شکل نہیں دیکھتا۔ اسلئے تھوڑا دینے والا گو دوسرے کے مقابلہ میں کم دیتا ہے۔ مگر چونکہ اسکے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ دیدیتا ہے اسلئے اس کو اس طلّ سے ہی وابل والا فائدہ پہنچ جاتا ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کی دو اغراض بیان فرمائی ہیں۔ اوّل ابتغاء مرضات اللہ دوم تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول اور قوم کی مضبوطی۔ کیونکہ صدقات کے نتیجہ میں غرباء کو ترقی کے مواقع میسر آجاتے ہیں۔ اور وہ بھی اپنی قوم کا ایک مفید جزو بن جاتے ہیں۔ جس قوم کے افراد گرے ہوئے ہوں وہ قوم کبھی یقینی طور پر مضبوط نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ گرے ہوئے افراد اس کیلئے بوجھ بن جاتے ہیں اور وہ ترقی کی طرف اپنا قدم بڑھانے سے قاصر رہتی ہے۔ اسی لئے

یورپین قومیں جنکا خدا تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں وہ بھی محض اسلئے صدقہ و خیرات کرتی رہتی ہیں کہ قوم کے غرباء کی ترقی سے خود قوم بڑھتی اور ترقی کرتی ہے۔ غرض صدقہ کی اسلام نے دو اغراض بتائی ہیں۔ اوّل اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حصول جو سب سے بڑی اور حقیقی غرض ہے۔ دوم قوم کی مضبوطی۔ کیونکہ غرباء کی مدد در حقیقت اپنی مدد ہوتی ہے۔ دوسرے معنے اسکے یہ بھی ہیں کہ جب مومن کمزور اور بے سہارا لوگوں کی امداد کے لیے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی انکی مدد کرتا اور انکی مضبوطی اور ترقی کے سامان پیدا کرتا ہے۔ اسی نکتہ کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اشارہ کرتی ہے کہ جو شخص اپنے مومن بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اُسکے مشکل اوقات میں اس کی تائید فرماتا ہے۔

(۳) پھر روحانی طور اس انفاق کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کیلئے اپنا مال خرچ کرتا ہے وہ آہستہ آہستہ دین میں مضبوط ہوجاتا ہے اسی وجہ سے میں نے اپنی جماعت کے لوگوں کو بارہا کہا ہے کہ جو شخص دینی لحاظ سے کمزور ہو وہ اگر اور نیکیوں میں حصہ نہ لے سکے تو اس سے چندہ ضرور لیا جائے کیونکہ جب وہ مال خرچ کریگا تو اس سے اسکو ایمانی طاقت حاصل ہوگی اور اسکی جرأت اور دلیری بڑھ اور وہ دوسری نیکیوں میں بھی حصہ لینے لگ جائیگا۔ یہ معنے اس صورت میں ہونگے جبکہ تَثْبِيْتًا کو حال بنایا جائے۔ اگر اسے مفعول لاجلہٖ قرار دیں تو پھر پہلے دو معنی ہی ہونگے۔

۱۷۶ حل لغات :- نَخِيْلٌ : نَخْلٌ کی جمع ہے۔

اس کے معنے کھجوریں یا کھجوروں کے باغ کے ہیں۔

اَعْنَابٌ : عنب کی جمع ہے اور اسکے معنے انگور ہیں۔

نَخِيْلٌ

اَعْنَابٌ

اَلْكِبَرُ

اِعْصَارٌ

اَلْكِبَرُ : كَبِرَ الرَّجُلُ اَوِ الدَّآبَّةُ کے معنے ہیں طَعَنَ فِي السِّنِّ - آدمی یا جانور بڑا ہو گیا -

اِعْصَارٌ ایسی ہوا کو کہتے ہیں جو زمین سے مٹی اڑاتی ہوئی ستون کی طرح آسمان کی طرف چلی جاتی ہے - ہماری زبان میں ایسی ہوا کو بگولا کہتے ہیں - یہ لفظ ہمیشہ سختی کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے - عرب لوگ کہا کرتے ہیں - اِنْ كُنْتَ رِيْحًا فَقَدْ لَاقَيْتَ اِعْصَارًا - اگر تو تیز ہوا ہے تو جس سے تجھے پالا پڑا ہے وہ بگولا ہے - گویا آج تیرا واسطہ سخت شخص سے پڑا ہے - بگولے میں سخت تیزی کی وجہ سے ایسی آگ پیدا ہو جاتی ہے جس سے جنگل کے جنگل جل جاتے ہیں -

تفسیر :- اب اللہ تعالیٰ ایک اور تمثیل کے ذریعے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے - دنیا میں اگر کسی کے پاس تھوڑا سا مال ہو اور وہ ضائع ہو جائے تو اس کا بھی اُسے افسوس ہوتا ہے - لیکن اگر کسی کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے ساتھ نہریں بہتی ہوں اور اُسے اُس باغ میں سے ہر قسم کے پھل ملتے رہتے ہوں - اور وہ خود بوڑھا ہو چکا ہو - اور اُسے زیادہ زندہ رہنے کی اُمید نہ ہو - اُس کے بچے چھوٹی عمر کے ہوں - جن سے کمائی کی اُمید نہ ہو - تو کیا اس کا دل چاہتا ہے کہ ایک بگولا اندر سے آئے - اور اُس کے باغ کو جلا دے - بگولا اس لئے فرمایا کہ ایک تو وہ سخت تیز ہوتا ہے - دوسرے اچانک آتا ہے اور اُس میں بوجہ تیزی کے آگ پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ بہت جگہ جہاں جنگل زیادہ ہوتے ہیں یہ نظارہ دیکھنے میں آتا ہے -

اگر تھوڑا سا مال ہوتا تو وہ کہہ سکتا تھا کہ خیر تھوڑا سا مال تھا اگر ضائع ہو گیا تو کوئی بڑی بات نہیں - یا اگر میرے کام آتا تو کب تک آتا آخر اس نے ختم ہی ہونا تھا - پھر اگر بوڑھا نہ ہوتا تو خیال کر سکتا تھا کہ میری زندگی میں بچے بڑے ہو جائیں گے اور وہ اپنے لئے جائیداد پیدا کر لیں گے - لیکن اگر مال بھی زیادہ ہو - خود بھی بوڑھا ہو اور پھر اس کے بچے بھی چھوٹے ہوں تو وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اُس کا مال تباہ ہو جائے اور کسی حادثہ سے اس کی تمام جائیداد جل کر فنا ہو جائے - اور اگر کسی حادثہ سے اُس کی تمام جائیداد جل کر تباہ ہو جائے تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اُسے کس قدر صدمہ ہو گا - یہی حالت قیامت کے دن اُن لوگوں کی ہو گی جنہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے اموال خرچ نہیں کئے - اس وقت اُن کے پاس کوئی مال نہیں ہو گا جسے وہ پیش کر سکیں اور نہ اولاد وغیرہ کام آئیگی اس لئے فرمایا کہ تم اپنا انجام سوچ لو - آج تم اپنے لئے سب کچھ کر سکتے ہو - مگر آخرت میں کچھ نہیں کر سکو گے - اگر آج تم اپنا مال خرچ کرو گے تو یہ مال تمہارے لئے وہاں ذخیرہ کے طور پر جمع رہے گا - اور تم اس سے فائدہ اٹھا سکو گے - ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے -

ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ کے الفاظ خاص طور پر ہوشیار کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں کہ جب تم اپنے بچوں کے لئے دنیا کی محدود زندگی میں بھی یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ ایسی بے بسی کی حالت میں رہ جائیں تو تمہاری اپنی جان جو کہ اگلے جہان میں ایک بچہ کی حالت سے بھی زیادہ نازک حالت میں ہو گی کیوں توجہ کی مستحق نہیں تم سوچو اور غور کرو کہ ایمان کی نعمت یا رضائے الٰہی جیسی نعمت جو ایسے وقت میں کام آتی ہے - جب بچہ جتنی طاقت بھی تمہارے اندر نہیں ہو گی - اور خود تمہارے کام آتی ہے اُسکو اس بے پروائی سے ضائع کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے - پس تم ابھی سے ہوشیار ہو جاؤ اور موت سے پہلے پہلے نیکیوں کا ذخیرہ جمع کر لو -

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ

اے ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اُس میں سے پاکیزہ چیزیں اور (نیز) اُس میں سے

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ

جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں حسب توفیق) خرچ کرو۔ اور ناکارہ چیز کو اور جس میں سے تم

مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ

خرچ (تو) کرتے ہو مگر خود تم سوائے اس کے کہ اس (کے قبول کرنے) میں چشم پوشی سے کام لو اسے ہرگز قبول نہیں کرتے (قصداً کیلئے)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿٢٦٨﴾

بالارادہ نہ چنا کرو۔ اور جان لو کہ اللہ (تعالیٰ) بالکل بے نیاز (اور) بہت ہی حمد کا مستحق ہے۔ ۱۷۷

اَلْخَبِيْثُ **۱۷۷ حل لغات**:۔ اَلْخَبِيْثُ: اَلنَّجِسُ۔ اَلرَّدِيُّ۔ اَلْمَكْرُوْهُ (اقرب) یعنی خبیث ہر ناپاک۔ ردّی اور ناپسندیدہ چیز کو کہتے ہیں۔

تَيَمَّمْ **تَيَمَّمُوْا**: تَيَمَّمَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں تَعَمَّدَهٗ جان بوجھ کر اور نیت اور ارادہ کے ساتھ کسی چیز کو اختیار کیا۔ پس لَا تَيَمَّمُوْا کے یہ معنے ہیں کہ تم قصداً اور ارادۃً ناکارہ چیز کو صدقہ کے لئے مت چنو۔

تُغْمِضُوْا **تُغْمِضُوْا**: اَغْمَضَ عَيْنَيْهِ کے معنے ہیں۔ اَطْبَقَ اَجْفَانَهُمَا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور اَغْمَضَ عَنِ الشَّيْءِ کے معنے ہیں تَجَاوَزَهٗ کسی چیز سے تجاوز کیا۔ اور اَغْمَضَ عَلٰى كَذَا کے معنے ہیں تَحَمَّلَهٗ وَرَضِيَ بِهٖ اُسے برداشت کرلیا اور اس پر راضی ہوگیا۔ (اقرب) جب یہ لفظ بغیر صلہ کے آئے تو اس کے معنے بند کرلینے کے ہوتے ہیں۔ اور جب عَنْ کے ساتھ آئے تو اغماض کے معنے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ تینوں معنے ہوسکتے ہیں (۱) یعنی تم اپنی آنکھیں بند کرکے لے لو (۲) یا تم اس میں تجاوز سے کام لو۔ یعنی دوسرے کی اس حرکت کو تم نظر انداز کردو۔ اور اُسے لے لو۔ (۳) یا یہ کہ تم دوسرے کی خاطر اسے برداشت کرلو۔

تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی راہ میں جو کچھ دو اُس مال میں سے دو جو تمہارا کمایا ہوا ہے اور اچھا مال ہے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کے اموال پر ناجائز تصرّف کرکے ان کو خرچ کرنے لگ جاؤ۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب اُن کے دل میں غریبوں کی امداد کا جوش پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ڈاکے ڈالنا شروع کردیتے ہیں اور پھر انہیں جو کچھ ملتا ہے اُس کا ایک بڑا حصّہ غریبوں میں تقسیم کردیتے ہیں۔ وہ لوگ جو فلسفۂ اخلاق سے واقف نہیں ہوتے بالعموم ایسے ڈاکوؤں کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں ڈاکو بڑا اچھا ہے۔ کیونکہ وہ غریبوں کی خوب مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ غریبوں کی مدد کرنے کا کوئی طریق نہیں کہ ڈاکہ ڈالا اور دوسروں کا مال چھین کر غریبوں میں تقسیم کرنا شروع کردیا۔ بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی جائز کمائی میں سے جتنا دے سکتے ہو دو اور باقی کام

خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ لوگوں کا مال لوٹ کر غرباء کی امداد کرنا تو حلوائی کی دوکان پر دادا جی کے فاتحہ کا مصداق بنتا ہے۔ اگر تمہارے نزدیک غرباء زیادہ ہیں تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ تم جتنا دے سکتے ہو دو۔ اور باقی کام خدا تعالیٰ کے سپرد کر دو۔

اس جگہ مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ سے یہ مراد نہیں کہ مومنوں کی کمائی میں کچھ پاک مال ہوتا ہے اور کچھ ناپاک اور انہیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ صرف پاک مال خرچ کیا کریں۔ ناپاک مال خرچ نہ کیا کریں۔ بلکہ یہ الفاظ مَا كَسَبْتُمْ کی صفتِ حسنہ کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ تم نے جو کچھ کمایا ہے وہ طیّب ہی ہے۔ لیکن ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ تم اس طیّب مال کا بھی جس میں ہر قسم کا مال اور علم بھی شامل ہو سکتا ہے) ایک حصہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا کرو۔ گویا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ فرما کر مومنوں کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ اُن کا مال ہمیشہ طیّب اور پاک ہی ہوتا ہے۔ ناپاک مال کی اُس میں ذرا بھی آمیزش نہیں ہوتی۔

دوسرے یہاں طیّب حرام کے مقابلہ میں نہیں بلکہ خبیث کے مقابلہ میں آیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا میں صدقہ دینے کا جو حکم دیا گیا ہے۔ وہ تب پورا ہوگا جب تم اپنے اچھے اور مرغوب مال میں سے خرچ کرو گے۔ یوں مستعمل اشیاء بھی غرباء کو دی جا سکتی ہیں۔ اور انکا دینا ہرگز منع نہیں۔ مثلاً انسان اگر کسی کو پرانا کپڑا دے دے جس سے دوسرا شخص فائدہ اٹھائے تو یہ ناجائز نہیں بلکہ یہ فعل اُسے ثواب کا مستحق بنائیگا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ میں صدقہ دینے کا جو حکم دیا ہے وہ اُس سے عہدہ برا نہیں ہوگا۔ وہ اس حکم سے اُسی وقت عہدہ برا ہوگا جب وہ اُس چیز میں سے دے جو اُس کے کام کی ہے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کا اور اچھا مال دے تاکہ اُس کی قربانی زیادہ بلند شان رکھنے والی ہو۔

پھر فرمایا۔ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ تم اُس میں سے بھی خرچ کرو۔ جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں سے نکالا ہے۔ درحقیقت دنیا میں دو ہی طرح مال حاصل ہوتا ہے۔ ایک تو تجارت اور ملازمت وغیرہ کے ذریعہ۔ دوسرے اُن ذخیروں کے ذریعہ جو خدا تعالیٰ نے زمین کے اندر رکھے ہیں۔ اور انسان کوشش کر کے اُنکو نکالتا ہے۔ جیسے کھیتوں دفینوں اور کانوں وغیرہ سے انسان کو آمدنی ہوتی ہے۔ پس مِنَ الْاَرْضِ میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو زمین سے نکلتی ہیں۔ فقط زراعت مراد نہیں۔ اِسی طرح نباتات وغیرہ بھی اِس میں شامل ہیں۔ غرض دو قسمیں بتا کر ان دونوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور بتایا کہ خواہ تم ملازمت تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کے ذریعہ روپیہ کماؤ۔ خواہ زمینی ذخائر اور معدنیات سے فائدہ اٹھاؤ۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اپنے تمام اموال کا ایک حصہ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے مطلق اَلْخَبِيْثَ کا لفظ رکھا ہے۔ اور یہ چھوڑ دیا ہے کہ وہ کس کے لئے خبیث ہو۔ اس وجہ سے اِس کے کئی معنے ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنے تو یہ ہیں کہ وہ چیز جو فی نفسہٖ بُری اور ناقابلِ استعمال ہو۔ نہ یہ کہ اضافی طور پر۔ یعنی جو چیز کسی فرد کے لئے بھی قابلِ استعمال نہ ہو وہ کسی کو نہ دو۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز دینے والے کے کام کی تو نہ ہو مگر لینے والے کے کام کی ہو۔ (۲) ایسی چیز نہ دو کہ جسے تم دینے لگے ہو وہ اُسے ناپسند کرتا ہو یا اُسے مکروہ نظر آئے۔ اِس میں بتایا کہ جسے تم کوئی چیز دو اُسکے احساسات کا بھی خیال

الشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی تلقین کرتا ہے۔ اور اللہ اپنی طرف سے ایک

مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۹﴾

بڑی بخشش اور بڑے فضل کا تم سے وعدہ کرتا ہے۔ اور اللہ بہت وسعت دینے والا (اور) بہت جاننے والا ہے۔ ۴۶۸

رکھ لیا کرو تاکہ اس کا دل میلا نہ ہو یا ایسی چیز نہ ہو جو اُسکے کام کی نہ ہو۔ (۳) تیسرے معنے تیمم کے لفظ سے یہ پیدا ہوتے ہیں کہ تلاش کرکے ناپسندیدہ اور ناکارہ چیزیں مت دو۔ یعنی یہ دیکھ کر کہ فلاں چیز تو میرے کسی کام کی نہیں اس لئے دے دو۔ درست نہیں۔

وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ فرمایا ایسی چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں مت دو کہ اگر خود تمہیں وہی چیز ملے تو تم شرم کے مارے تو لیلو مگر یوں نہیں لے سکتے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ فرماتا ہے۔ یہ صدقات تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی احتیاج نہیں۔ اگر تم اس کے راستہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہو یا اُس کے بندوں کو دیتے ہو تو درحقیقت خدا تعالیٰ کو ہی دیتے ہو۔ اس لئے تم اس کے بندوں کو صدقہ دیتے وقت خدا تعالیٰ کی عظمت کو ملحوظ رکھو۔ جب تم دنیوی لوگوں سے معاملہ کرتے وقت اُنکی شان کو ملحوظ رکھتے ہو حالانکہ وہ بہت ہی معمولی درجہ کے ہوتے ہیں۔ تو خدا تعالیٰ کی رضا کے لئے جب تم صدقہ دیتے ہو تو اُس کی شان کو کیوں ملحوظ نہیں رکھتے۔ وہ تو غنی بھی ہے اور حمید بھی۔ اُسے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ تمہیں اُس کی مدد کی ضرورت ہے۔ اور پھر وہ ہر قسم کی حمد کا مستحق ہے۔ اسلئے تم اُسکے بندوں سے اچھا سلوک کرو تا وہ بھی تم سے اچھا سلوک کرے۔

يَعِدُكُمْ

۴۶۸ حل لغات:۔ يَعِدُكُمْ: وَعَدَهٗ کے معنے اچھا وعدہ کرنے کے بھی ہوتے ہیں اور بُرا وعدہ کے بھی۔ اسی طرح اَوْعَدَ کے معنے بھی دونوں ہوتے ہیں۔ خیر کے بھی اور شر کے بھی۔ لیکن اَوْعَدَ کا کثیر استعمال شر کے متعلق ہے جبتک کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو۔ اسی طرح وعدہ کا کثیر استعمال خیر کے لئے ہے جبتک کہ کوئی قرینہ صارفہ نہ ہو۔ اور قرینہ یہ ہوتا ہے کہ ساتھ مفعول بھی بیان کر دیتے ہیں جس سے خیر یا شر کا پتہ لگ جاتا ہے (اقرب) مثلاً کہیں کہ فلاں شخص کے ساتھ دس کوڑوں کا میں وعدہ کرتا ہوں۔ تو اس صورت میں اس کے معنے شر کے ہونگے۔ یہاں چونکہ فقر کا ذکر آتا ہے اس لئے اس کے معنے شر ہی کے ہیں۔ اور وَعَدَ کے معنے ڈرانے کے ہیں۔

فَحْشَآءَ

فَحْشَآءَ: کے معنے ہیں ہر وہ بدی جو نمایاں ہو جائے۔ اسی طرح فحشاء بخل کو بھی کہتے ہیں (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔ خواہ یہ ڈرانا مالی قربانی کے متعلق ہو۔ یا جانی قربانی کے متعلق۔ یا اور سینکڑوں قسم کی قربانیوں کے متعلق۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم مال دو گے تو تمہاری ضروریات کیلئے کچھ نہیں رہے گا۔ تم تنگ دست ہو جاؤ گے اور لوگوں سے مانگتے پھرو گے۔ یا جان پیش کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسکی یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر بے حیائی کے کام ہوں تو

شیطان انسان کو بلا دریغ اپنا سارا روپیہ لٹ دینے کی ترغیب دیتا
ہے۔ گویا نیکی کی راہ میں تو وہ ایک ناصح مشفق بن کر کھڑا ہو
جاتا ہے۔ اور بدی کی راہ میں دلیری سے قدم آگے بڑھانے کی
تلقین کرتا ہے۔ غرض قربانی کرنے کو تو ایک مومن بھی کرتا ہے اور
کافر بھی۔ مگر مومن کی قربانی خدا کے لئے ہوتی ہے اور کافر کی
قربانی ایسے کاموں کے لئے ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے دُور
لے جانے والے ہوتے ہیں۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ شیطان انسان کے ساتھ
وعدہ تو راحت و آرام اور دولت و آسائش کا کرتا ہے اور
کہتا ہے کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے رستہ میں اپنا مال خرچ نہ کرو گے تو تم بڑے
مالدار ہو جاؤ گے۔ بڑی بڑی کوٹھیاں بنا لو گے اور ہر قسم کے سامان جمع
کر لو گے۔ مگر اُس کا نتیجہ فقر ہوتا ہے۔ کیونکہ جو قوم
غرباء کی طرف توجہ نہیں کرتی اور صرف اپنے عیش و آرام
کا خیال رکھتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ مردہ قوموں
کی حالت سے ظاہر ہے۔ اِسی لئے فرمایا کہ شیطان تم سے
ایسی باتوں کا وعدہ کرتا ہے جو بظاہر تو بھلی معلوم ہوتی ہیں
ان کا انجام فقر یعنی تباہی اور بربادی اور رسوائی ہوتا ہے۔

وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ اور جن کاموں کا حکم دیتا
ہے اُن کا عیب کھلا اور ظاہر ہوتا ہے۔ فحش ہر ایسی بدی
کو کہتے ہیں جس کی بُرائی ظاہر ہو ... اسی طرح فحش بخل
کو بھی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے یہ معنے ہونگے کہ وہ
تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے۔ حالانکہ بخل ایک ناپسندیدہ امر
ہے۔ اور عرب لوگ تو خصوصیت سے بخل کو سخت بُرا سمجھتے
تھے۔ یا یہ کہ وہ ہمیشہ بدی کا ہی حکم دیتا ہے۔ گویا عملاً
بھی وہ بُری بات ہوتی ہے اور عزت کے لحاظ سے بھی
نقصان دہ ہوتی ہے۔ اور یہی دو باتیں انسان کو کسی کام سے
روکتی ہیں۔ انسان یا عزت کو دیکھتا ہے یا فائدہ کو دیکھتا
ہے۔ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۔ اسکے
بالمقابل اللہ تعالیٰ مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔
یعنی تمہاری کمزوریوں کی پردہ پوشی کرنے اور عیوب کو مٹا دینے
کا اور پھر پہلے سے بھی زیادہ دینے کا۔ یہاں اگر مغفرت
کو عام رکھا جاتا تو یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اس سے
مراد بندوں کا ایک دوسرے کی کمزوری کو نظر انداز کرنا
ہے۔ مگر مَغْفِرَةً مِّنْهُ فرما کر اس طرف اشارہ کیا کہ
یہ مغفرت اس کی طرف سے ہوگی۔ اور پھر یہی نہیں کہ وہ
مغفرت کا وعدہ کرتا ہے بلکہ وہ فضل کا بھی وعدہ کرتا
ہے۔ یعنی اس بات کا بھی کہ وہ تمہیں مزید ترقی دے گا
اور تمہارے لئے اپنی برکتوں کے دروازے کھول دے گا۔

اگر پہلی آیت میں يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ کے معنے افلاس اور
محتاجی سے ڈرانے کے لئے جائیں۔ تو اس کا یہ مطلب ہوگا
کہ شیطان تو فقر کو بُرا سمجھتا ہے اور خدا گناہ کو۔ اسلئے
وہاں فقر کو پہلے رکھا اور یہاں مغفرت کو۔ اس طرح
رحمانی اور شیطانی سلسلوں میں جو اشیاء کی عظمت کا
فرق ہے اُس کو ظاہر کر دیا۔ حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ
اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ کی مثال میں اودھ کی ریاست
کی مثال سُنایا کرتے تھے۔ کہ جب انگریزوں کا اُس سے بگاڑ
شروع ہُوا تو انہوں نے ریاست کے اُن تمام لوگوں کو
جنکا روپیہ کلکتہ کے بنکوں میں جمع تھا نوٹس دے دیا
کہ اگر تم ہمارے مقابلہ میں اُٹھے تو تمہارا تمام روپیہ ضبط
کر لیا جائیگا۔ اس پر وہ اپنے فقر کے خیال سے چپ کر کے بیٹھ
گئے اور انگریز نواب کو گرفتار کر کے لے گئے۔ لیکن یورپین
اقوام چونکہ قربانی کی عادی ہیں اس لئے وہ اس قسم کی
باتوں کی پرواہ نہیں کرتیں۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم میں کروڑوں
روپیہ جرمنی کا انگریزوں کے ہاں تھا۔ اور انگریزوں کا کروڑوں
روپیہ جرمنی میں تھا۔ لیکن اس کی کوئی پرواہ نہ کی گئی اور پورے
زور سے لڑائی شروع کر دی گئی۔ تو زندہ رہنے والی قومیں
جانتی ہیں کہ روپیہ خرچ کرنے کے لئے ہی ہوتا ہے اسلئے
وہ خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ لیکن جو قومیں روپیہ

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ج وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ اور جسے حکمت عطا کی گئی ہو تو

جمع رکھتی ہیں اور غربا پر خرچ نہیں کرتیں وہ نقصان اُٹھاتی ہیں۔

یہاں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔ حالانکہ اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اور جب تم اپنے غریب بھائیوں سے بُرا سلوک کروگے تو دشمن تک کہیں گے کہ یہ لوگ بڑے پست فطرت ہیں۔ انہوں نے غریبوں کا خیال تک نہ رکھا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم صدقہ کروگے تو اُس کے نتیجہ میں تمہیں مغفرت حاصل ہوگی۔ یعنی جب تم غرباء کو اُبھاروگے تو تمہارے اپنے عیب بھی چھپ جائیں گے۔ کیونکہ وہ شخص جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو اُس میں اگر کوئی عیب بھی ہو تو لوگ اُسے چھپا لیتے ہیں۔ اور اگر یہ مطلب لیا جائے کہ وہ جن باتوں کا وعدہ کرتا ہے وہ آخر فقر پیدا کرتی ہیں تو اس آیت کے یہ معنے ہونگے کہ اللہ تعالیٰ جن باتوں کا حکم دیتا ہے اُن کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوگا کہ جب تم لوگوں کے عیوب ڈھانکو گے تو وہ تمہارے عیوب ڈھانکے گا۔ گویا اس ذریعہ سے تم خدا کے حضور میں بھی اور بندوں کی نگاہ میں بھی نیکی حاصل کروگے اور دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں بھی تمہارے مال میں زیادتی ہوگی۔ کیونکہ قومی اخراجات میں حصہ لینے یا غرباء قوم کو بڑھانے اور ترقی دینے سے قومی طاقت ترقی کرے گی۔ اور آخر تم کو مالی فائدہ بھی پہنچے گا اور اس خرچ کو بڑھا کر اللہ تعالیٰ تمہیں اگلے جہان میں جو کچھ دیگا اُسکا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں بتایا کہ اگر تم خدا تعالیٰ کے احکام کی اِتباع کروگے تو اُس کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ تمہیں بہت کچھ دیگا۔ بلکہ تم اس کے وعدۂ فضل و مغفرت کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اور نہ وعدۂ فضل کے معنوں کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہو۔ اور پھر وہ علیم ہے۔ تمہارے ہر ایک کام سے واقف ہے۔ اس سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ تمہاری اُن طریقوں سے مدد کرے گا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔

اِن آیات پر غور کرو اور دیکھو کہ ان میں الفاظ کی ترتیب کیسی اعلیٰ درجہ کی رکھی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں فقر کو پہلے رکھا ہے اور فحشاء کو بعد میں۔ دوسرے حصہ میں پہلے مغفرت کو رکھا ہے اور بعد میں فضل کو۔ حالانکہ ظاہر کے لحاظ سے فضل کو مغفرت سے پہلے رکھنا چاہیئے تھا کیونکہ یہ فقر کے مقابلہ میں ہے۔ اور مغفرت کو بعد میں رکھنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ فحشا کے مقابلہ میں ہے۔ اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک تو ظاہری ترتیب ہوتی ہے۔ اور ایک روحانی ترتیب ہوتی ہے۔ یہ ظاہری ترتیب ہے۔ یعنی شیطان پہلے فقر سے ڈراتا ہے اور پھر فحشاء کا حکم دیتا ہے جس کے نتیجہ میں پہلے کسی قوم کو ذلت پہنچتی ہے اور پھر ساری دنیا میں اُس کی بدنامی ہوتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے پہلے مغفرت کا سلوک ہوتا ہے اور پھر فضل کا۔ جب اپنی قوم کے غرباء سے اچھا سلوک کیا جائیگا۔ تو اُس کے نتیجہ میں لازماً مغفرت ہوگی۔ اور پھر اس کے بعد فضل کا نزول ہوگا۔ یہ تو اس ترتیب کی ظاہری وجہ ہے۔ روحانی وجہ یہ ہے کہ شیطان کے نزدیک عزت و آبرو کی نسبت مال زیادہ اہمیت رکھتا ہے اسلئے اُس کے ذکر میں مال کو مقدم رکھا اور عزت کو بعد میں۔ لیکن

فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ وَ مَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۷۰﴾

(سمجھو) کہ اُسے ایک بہت ہی نفع رساں چیز مل گئی - اور (یاد رہے کہ) عقلمندوں کے سوا نصیحت بھی کوئی حاصل نہیں کیا کرتا۔ ۱۷۹

وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ

اور جو کچھ بھی تم (خدا کے لئے) خرچ کرو یا جو کچھ بھی تم نذر مانو

اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۱﴾

اللہ اُسے یقیناً جانتا ہے (وہ اسکا نیک بدلہ دیگا) اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ ۱۸۰

خدا تعالیٰ کے نزدیک مال کی نسبت عزت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اسلئے اُس نے مغفرت کو پہلے رکھا اور فضل کو بعد میں یعنی پہلے نیکنامی کو مدِّنظر رکھا اور بعد میں مال کو۔ دوسرے اس میں بتایا ہے کہ سچے اور جھوٹے مذہب میں یہ فرق ہے کہ جھوٹے مذہب میں دنیا مقدم رکھی جاتی ہے اور سچے مذہب میں دین کو۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کوئی شخص ردّی چیز اس لئے دیتا ہے کہ اچھی چیز دینے سے فقر پیدا ہو جائیگا۔ اور کوئی عمدہ اور اعلیٰ چیز اسلئے دیتا ہے کہ اُسکا ایمان ترقی کرے۔

۱۷۹ حل لغات :- اَلْبَابُ: اَللُّبُّ کے معنے ہیں خَالِصُ كُلِّ شَیْءٍ ہر چیز کا خالص حصہ (۲) اَلْعَقْلُ۔ عقل (۳) اَلْخَالِصُ مِنَ الشَّوَائِبِ اَوْ مَا زَكٰى مِنَ الْعَقْلِ فَكُلُّ لُبٍّ عَقْلٌ وَلَا عَكْسَ۔ یعنی لُبّ اُس عقل کو کہتے ہیں جو خالص ہو اور ہر عقل خالص نہیں ہوتی اور نہ نقصوں سے پاک ہوتی ہے پس عقل عام ہے اور لُبّ خاص۔ ہر لُبّ عقل ہے مگر ہر عقل لُبّ نہیں کہلا سکتی۔ (۴) لُبّ مغز کو بھی کہتے ہیں۔ (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ یہ قومی ترقیات کے گر ہیں جو ہمارا رسول تم پر ظاہر کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ دعائے ابراہیم کا مصداق ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ اے خدا تو ان میں ایک ایسا رسول بھیج جو یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کا مصداق ہو۔ یعنی لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھائے اور قومی ترقی کے راز ان پر ظاہر کرے۔ پس یاد رکھو کہ حکمت کا سکھایا جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ جسے حکمت کی کوئی ایک بات بھی ملے۔ اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کثیر حاصل ہوئی ہے یعنی عمل نیک بھی اچھی شے ہے۔ مگر نیکیوں میں ترقی کرنے کے گر اور کاموں کی حکمتیں معلوم ہو جائیں تو یہ ایک بڑی خیر ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ گویا ہیروں اور جواہرات کی ایک کان مل گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام اچھی تعلیمات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ لیکن اگر اُس کے احکام کی حکمت سمجھ میں آ جائے تو انسان کا جوشِ عمل بڑھ جاتا ہے۔ اور ناواقفیت کی صورت میں سستی ترقی کرتی ہے۔ پس احکام کی حکمتوں کا علم بڑی مفید چیز ہے مگر فرماتا ہے کہ لوگ پھر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے صرف وہی لوگ جن کی نظر ذاتی فوائد پر نہیں ہوتی بلکہ ساری قوم کے فوائد پر ہوتی ہے وہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

۱۸۰ حل لغات :- نَذَرْتُمْ: نَذَرَ کے معنے ہیں (۱) اَوْجَبَ عَلٰى نَفْسِهٖ مَا لَيْسَ بِوَاجِبٍ۔ اُس نے اپنے نفس پر کوئی ایسی چیز واجب کر لی جو اُس پر واجب نہ تھی۔ (۲) اَوْجَبَ عَلٰى نَفْسِهٖ تَبَرُّعًا مِنْ عِبَادَةٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ غَيْرِ ذٰلِكَ اُس نے کوئی عبادت یا صدقہ وغیرہ اپنے اوپر فرض کر لیا۔ وَقِيْلَ النَّذْرُ: مَا كَانَ وَعْدًا عَلٰى شَرْطٍ۔ اور کہا گیا ہے کہ نذر شرطی وعدہ

اَلْبَاب

نَذَرْتُمْ

کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں ایسا کرونگا۔ (اقرب)

تفسیر: اِس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ جو خرچ بھی تم خرچ کرو اور جو نذر بھی تم نذر دو۔ مگر یہ ترجمہ اردو محاورہ کے لحاظ سے درست نہیں۔ اردو میں اس کا ترجمہ یہ ہو گا کہ "جو کچھ بھی تم خدا کے لئے خرچ کرو یا جو کچھ بھی تم نذر دو"۔ کیونکہ اردو میں جو مضمون "کرو" یا "دو" کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اُس کے اسم سے فعل بنا کر لے آتے ہیں اور اس سے وہ مضمون ادا کرتے ہیں۔ ہاں عربی کی ترکیب سے یہ زائد معنے ضرور پیدا ہو جاتے ہیں کہ جس چیز کو خرچ کیا جائے وہ خرچ کرنے کے قابل ہو۔ اور جو نذر دو وہ نذر میں پیش کرنے کے قابل ہو۔

نذر کے متعلق حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ ہاں اگر کوئی نذر مانی جائے تو پھر اُس کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ نذر کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس لئے ناپسند فرمایا ہے کہ یہ خدا تعالےٰ سے ایک قسم کا ٹھیکہ ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے ٹھیکہ کرنا کوئی پسندیدہ امر نہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اس کی بجائے صدقہ و خیرات اور دُعاؤں سے کام لے۔ ہاں اگر کوئی شخص صدقہ و خیرات اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ کوئی نذر بھی شکرانہ کے طور پر مان لے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ میں یہ استنباط حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک عمل سے کرتا ہوں۔ آپ بعض دفعہ اُن لوگوں کو جو آپ سے دُعا کیلئے عرض کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ میں دُعا کرونگا۔ آپ اپنے دل میں خدمتِ دین کیلئے کوئی رقم مقرر کرلیں جسے اس کام کے پُورا ہونے پر آپ خدا تعالےٰ کی راہ میں دیدیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکرانہ کے طور پر اگر کوئی نذر مان لی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ اُس نذر کے ساتھ ساتھ دعاؤں اور گریہ وزاری اور صدقات وخیرات سے بھی کام لیا جائے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ میں بتایا کہ تم جو کچھ اللہ تعالےٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہو یا تم کوئی منّت مانتے ہو اور اپنے اوپر واجب کر لیتے ہو اور پھر اس نذر کو پورا بھی کر دیتے ہو تو اللہ تعالےٰ اسے خوب جانتا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم نے کیا کچھ دیا۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں کتنا اخلاص اور کتنا جذبۂ ایمان کام کر رہا تھا۔ پس وہ تمہارے اخلاص کے مطابق تمہیں اجر دے گا۔ اور تمہارا انفاق رائیگاں نہیں جائیگا۔ بلکہ تمہیں بہت بڑی برکات سے حصّہ دینے والا ثابت ہو گا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ میں یہ اشارہ مخفی ہے کہ محض روپیہ خرچ کر دینا یا نذر کو پورا کر دینا کافی نہیں بلکہ دل کی نیّت کا درست ہونا بھی ضروری ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق اللہ تعالےٰ سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کسی نے نام ونمود کے لئے خرچ کیا ہے یا محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر کام کر رہا ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ کہہ کر اس طرف توجہ دلائی کہ کسی کے زیادہ دوست ہوتے ہیں اور کسی کے کم مگر ظالم ایسا ہوتا ہے کہ جب اُسے دنیوی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو جو لوگ اُسے مدد دے سکتے ہیں وہ بھی نہیں دیتے اور اُس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر رُوحانی نقطۂ نگاہ لو تو اصل مددگار خدا تعالیٰ اور اُس کے ملائکہ ہیں یا صلحاء اور اولیاء ہیں۔ مگر ظالم کو اُن میں سے کسی کی مدد میسّر نہیں آتی۔ اور وہ بے یار و مددگار رہ کر اپنے جرم کی سزا پاتا ہے۔ اسجگہ ظالم سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالےٰ کی راہ میں اپنے مال خرچ

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوهَا

اگر تم علی الاعلان صدقے دو تو یہ (بھی) بہت اچھا (طریق) ہے۔ اور اگر تم ان (یعنی صدقات) چھپا کر غریبوں

وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ

کو دو تو یہ تمہارے (نفس کے) لئے زیادہ اچھا ہے۔ اور وہ (یعنی اللہ اس کے سبب سے) تمہاری کئی بدیوں کو

سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۷۲﴾

تم سے دُور کر دے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہے۔ ۱۸۱

کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور بخل کا شکار رہتے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے مال خرچ کیا تو وہ مفلس اور کنگال ہو جائیں گے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ یہ نقطۂ نگاہ دنیوی لحاظ سے بھی غلط ہے اور روحانی لحاظ سے بھی۔ دنیا میں جو دوسروں کے لئے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اور رفاہ عامہ کے کاموں میں حصّہ لیتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر اور لوگ بھی اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یا کم سے کم اُس سے ہمدردی رکھتے اور اس کی اخلاقی مدد کرتے ہیں۔ مگر غرباء کی مدد سے ہاتھ کھینچنے والے اور دوسروں کی تکالیف میں ہمدردی اور غمخواری نہ کرنے والے خوشحالی میں تو مست رہتے ہیں مگر جب اُن پر مصائب اور آفات آتی ہیں تو لوگ اُن سے کسی قسم کی ہمدردی کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ حالانکہ ہر انسان خواہ کتنا بڑا ہو مصیبت میں دوسروں کی ہمدردی اور محبت اور اعانت کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اگر رُوحانی نقطۂ نگاہ لو تو یہ تو واضح ہی ہے کہ جس شخص نے خدا کے لئے روپیہ خرچ نہ کیا۔ یا قوم کے غرباء کی پرورش اور اُن کی بہبودی کا خیال نہ رکھا اُسے خدا اور اس کے ملائکہ کی نصرت اور اُس کے پاک بندوں کی دُعائیں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں۔ وہ ان تمام نعمتوں سے محروم رہے گا اور اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول لے گا۔

۱۸۱ حل لغات:- يُكَفِّرُ عَنْكُمْ: كَفَّرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں سَتَرَهٗ اُس پر پردہ ڈالا۔ اور كَفَّرَ اللّٰهُ لَهُ الذَّنْبَ کے معنے ہیں مَحَاهُ اُس کا گناہ مٹا دیا ہے۔ اور كَفَّرَ عَنْ يَمِيْنِهٖ کے معنے ہیں۔ أَعْطٰى عَنْهَا الْكَفَّارَةَ قسم کا کفارہ دیا۔ (اقرب) پس يُكَفِّرُ عَنْكُمْ کے معنے ہیں وہ تمہاری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گا۔ یا تمہارے گناہوں کو مٹا دیگا۔

تفسیر:- اس آیت میں صدقات کے ظاہر طور پر خرچ کرنے کے متعلق تو فرمایا کہ فَنِعِمَّا هِيَ۔ اور پوشیدہ طور پر خرچ کرنے کے متعلق فرمایا خَيْرٌ لَّكُمْ۔ نِعِمَّا هِيَ اصل میں نِعْمَ مَا هِيَ ہے۔ یہ طریق کلام مخصوص بالمدح کہلاتا ہے۔ اور اس سے مراد نِعْمَ الشَّيْءُ شَيْئًا ہوتا ہے۔ جیسے اردو زبان میں بھی کہتے ہیں کہ بس کام ہے تو یہ ہے۔ لیکن اخفاء کے لئے خَيْرٌ لَّكُمْ کے الفاظ استعمال فرمائے۔ کیونکہ اظہار کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے اور انکو بھی صدقات کی تحریک ہوتی ہے جبکہ اخفاء کا اثر صرف انسانی قلب پر پڑتا ہے اور وہ کبر اور مَنّ اور اذیٰ سے محفوظ رہتا ہے۔ گویا نِعِمَّا هِيَ میں وسعتِ دائرہ اور محدود نیکی کا ذکر کیا۔ اور خَيْرٌ لَّكُمْ میں محدود دائرہ اور اعلیٰ نیکی کا ذکر کیا۔ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ میں تو ہی چندے

يُكَفِّرُ

اور تُخْفُوْهَا میں فردی خیرات مراد ہے۔ کیونکہ اول الذکر کا فائدہ ساری قوم کو اور ثانی الذکر کا فائدہ زیادہ تر اپنے نفس کو پہنچتا ہے۔ اسی لئے اس کے ساتھ لَكُمْ کا لفظ بڑھا دیا گیا ہے۔

میں ایک اور نقطہ نگاہ سے پہلے فقرہ میں زیادہ خصوصیت پائی جاتی ہے کیونکہ پہلے فقرہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اظہارِ صدقہ کس کیلئے اچھا ہے۔ مگر دوسرے فقرہ میں لَكُمْ کہہ کر بتایا کہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر تم ظاہر طور پر صدقہ دو گے تو اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچیگا کیونکہ جب لوگ کسی کو صدقہ دیتے دیکھیں گے تو کہیں گے آؤ ہم بھی اس کی نقل کریں۔ اور انہیں بھی تحریک ہوگی کہ وہ غرباء پروری میں حصہ لیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ یعنی تم میں سے ہر ایک کی مثال ایک گڈریا کی سی ہے اور ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ بھیڑیں لگی ہوتی ہیں۔ جو اس کی نقل کرتی ہیں۔ پس اگر کوئی ظاہر طور پر صدقہ دیگا۔ تو اس کے بیٹے بھائی یا دوسرے رشتہ دار اسی طرح ملازم دوست اور آشنا وغیرہ بھی اس کی نقل میں صدقہ دینگے۔ اور یہ نیکی ترقی کریگی۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ نسل کو فائدہ پہنچے گا اور بچوں کو بھی صدقہ دینے کی عادت پڑ جائیگی۔ کیونکہ جب وہ اپنے بڑوں کو دیکھیں گے کہ وہ صدقہ دیتے ہیں۔ تو سمجھیں گے کہ یہ بھی اچھی بات ہے۔ اور اس طرح اُن کی نیک تربیت ہوگی۔ تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ بعض دفعہ لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں شخص امداد کا مستحق ہے۔ جب وہ دوسروں کو اُن کی امداد کرتے دیکھیں گے تو انہیں بھی اُن کی غربت کا علم ہو جائیگا اور ... بھی اپنے طور پر اُن کی مدد کرنے لگ جائیں گے۔

پھر فرمایا کہ اگر تم پوشیدہ دو گے تو تمہارے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے یہ طریق زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس سے ریاء پیدا نہیں ہوگا جو ظاہر طور پر دینے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس اخفاء کا ایک خاص انعام بھی بتایا کہ تم دوسروں کی کمزوری چھپاؤ گے۔ تو خدا تعالیٰ نے تم سے بھی یہی سلوک کریگا۔ چنانچہ فرمایا۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وہ تمہاری بدیوں کو تم سے دُور کر دیگا۔ اور تم کو پاک بنا دے گا۔ اس آیت میں مِنْ تبعیض کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور زائدہ بھی۔ اگر مِنْ تبعیضیہ لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ تمہارے بعض گناہ تمہاری طرف سے مٹا دیگا۔ اس لئے یہاں يُكَفِّرُ لَكُمْ نہیں فرمایا بلکہ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ فرمایا ہے۔ کیونکہ انسانی گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک انسان کے اور ایک خدا کے۔ خدا اپنے گناہ تو معاف کر دیتا ہے مگر بندوں کے نہیں۔ کیونکہ اس میں ان کی معافی کی شرط ہوتی ہے۔ گویا بتایا کہ جب تم غریبوں کی کمزوریوں اور عیبوں کو چھپاؤ گے اور ایسا طریق اختیار کرو گے کہ لوگوں پر اُن کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ بھی تمہاری بعض بدیوں کو مٹا دیگا۔ یعنی خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق جو گناہ ہونگے وہ انہیں معاف کر دیگا۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ تمہاری بدیوں کے متعلق اپنے پاس سے کفارہ دے دیگا۔ یعنی وہ لوگ جن کے تم نے گناہ کئے ہونگے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے پاس سے صلہ دیکر کہیگا کہ یہ ہمارا بندہ ہے ہم تمہیں انعام دے دیتے ہیں تم اس کے گناہ معاف کر دو۔ اس طرح وہ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے گناہ بھی معاف کرا دیگا۔ کیونکہ جب نیکی ایک خاص حد تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ انسان کی طرف سے وکیل ہو کر بندہ سے اُس کا گناہ معاف کرا دیتا اور اس کو اپنے پاس سے بدلہ دیتا ہے اور اُسکے گناہوں کا کفارہ کر دیتا ہے۔

لَیْسَ عَلَیْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ

انہیں راہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں ہے۔ ہاں اللہ (تعالیٰ) جسے چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے۔ اور

مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ

جو اچھا مال بھی تم (خدا کی راہ میں) خرچ کرو اور حقیقت یہ ہے کہ تم ایسا خرچ صرف اللہ کی توجہ چاہنے کے لئے کیا کرتے ہو سو اس کا

وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۳﴾

نفع بھی تمہاری (اپنی) جانوں ہی کو ہوگا۔ اور جو اچھا مال بھی تم خرچ کرو وہ تمہیں پورا پورا واپس کر دیا جائیگا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا۔ ۱۸۲؎

اس کے ایک یہ معنے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو خود تمہاری نظروں سے بھی چھپا دیگا۔ دراصل انسان کو خواہ کتنا ہی کہا جائے کہ اس کا گناہ معاف ہو گیا ہے پھر بھی یہ خلش اُس کے دل میں باقی رہ جاتی ہے کہ میں نے گناہ کیا اور ایک شرمندگی اُسے محسوس ہوتی ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو خود تمہاری نظروں سے چھپا دیگا یعنی خود تمہیں بھی اپنے گناہ بھلا دیگا اور تم اپنے حافظہ اور ذہن کے کسی گوشہ میں بھی اُن کا کوئی نشان نہ دیکھو گے۔ سُبحان اللہ یُکَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ کیا ہی مکمّل فقرہ ہے۔ یہ ایسا اعلیٰ درجہ کا فقرہ ہے کہ کوئی اور فقرہ اس کی بجائے رکھا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ گناہ کے متعلق کوئی پہلو ایسا نہیں جو اُس میں آ نہ گیا ہو۔

اخفش نے اس آیت میں مِنْ کو زائدہ قرار دیا ہے جو بغرض تاکید بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہونگے۔ کہ وہ تمہاری بدیاں بالکل مٹا دیگا۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ اور صدقات کو الگ الگ کیوں رکھا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ زکوٰۃ بوجہ گورنمنٹ کی معرفت وصول ہونے کے ایک قسم کا ٹیکس معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے زکوٰۃ کا دینا فرض ہے پس زکوٰۃ نہ دینا یا زائد دینا یا کم دینا انسان کے لئے ناممکن ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے۔ ایک طریق تو زکوٰۃ کا رکھا۔ تاکہ ہر مالدار کچھ نہ کچھ ضرور دے جس کے ذریعے اس کے گناہوں کا کفارہ ہو اور تاکہ غرباء کے لئے بھی کچھ نہ کچھ انتظام ضرور ہو جائے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا طریق صدقات کا رکھا۔ اور صدقہ اس لئے مقرر کیا تا مخلص اور غیر مخلص کا فرق معلوم ہو۔ اور انسان کو اپنے ہاتھ سے دینے کی مشق ہو۔ اور تا سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً دینے کا اُسے موقعہ ملے کہ سِرًّا دینا محبت کو بڑھاتا اور گناہوں کو بخشواتا اور اُن پر پردہ ڈالتا ہے۔ اور علانیۃً دینے سے دوسروں کو بھی صدقات کی تحریک ہوتی ہے۔

۱۸۲؎ تفسیر:۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اوّل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ لوگوں کو ہدایت دینا تیرے ذمہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ ہدایت کے تین معنے ہوتے ہیں اوّل راستہ دکھانا دوم راستہ تک پہنچانا سوم آگے آگے چل کر منزل مقصود تک لے جانا۔ پہلی قسم کی ہدایت تو ایسی ہے جس میں بندہ بھی شریک ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بھی دوسروں کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ لیکن آخری دو ہدایتیں ایسی ہیں۔ جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں یعنی صحیح راستہ تک پہنچانا۔ اور پھر اس راستہ پر قائم رکھتے

ہوئے منزل مقصود تک پہنچانا کسی بندہ کے اختیار میں نہیں۔ یہاں چونکہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو ہدایت پا چکے ہیں اسلئے فرمایا کہ اُن کو ہدایت پر قائم رکھنا اور انہیں منزلِ مقصود تک پہنچانا یہ تیرا کام نہیں۔ اللہ تعالےٰ جسے قائم رکھنے کے قابل سمجھتا ہے اُسے قائم رکھتا ہے اور جسے ناقابل سمجھتا ہے اُسے گرا دیتا ہے۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ جو کچھ بھی تم خَیْر میں سے خرچ کرو گے۔ اس کا فائدہ تمہاری جانوں کو ہی ہوگا۔ یہاں خَیْر کا لفظ اس لئے رکھا کہ خَیْر کے معنے مال کے بھی ہوتے ہیں اور اچھے مال کے بھی۔ یعنی ایسے مال کے جو اچھے ذرائع سے کمایا گیا ہو یا مقدار میں زیادہ ہو۔ پس خَیْر کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف توجہ دلائی کہ تم صرف اپنا مال ہی خرچ نہ کرو بلکہ یہ بھی دیکھتے رہو کہ وہ مال اچھے ذرائع سے کمایا ہُوا ہو۔ اور پھر قربانی بھی اپنی حیثیت کے مطابق ہو۔ یہ نہ ہو کہ مثلاً تنخواہ تو چار سو روپیہ ہے اور پانچ روپے چندہ دیکر سمجھ لیا کہ انفاق فی سبیل اللہ کا حق ادا ہو گیا ہے۔

پھر مال خرچ کرنے پر سوال ہوتا تھا کہ ہم نے اپنا مال تو لوگوں کو دے دیا مگر اس سے ہمیں کیا فائدہ ہُوا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ یہ بات غلط ہے کہ اس کا تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا تمہارا یہ مال خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسے زمیندار کھیت میں بیج ڈالتا ہے تو اس سے ہزاروں دانے بن جاتے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ میں اپنے دانے کیوں ضائع کروں۔ اِسی طرح تم بھی یہ مت خیال کرو۔ کہ اگر تم مال خرچ کرو گے تو اُس کا تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ اس کے نتیجہ میں قوم ترقی کریگی اور قوم کی ترقی سے فرد بھی ترقی کرتا ہے۔ دراصل ایسا خیال قلتِ تدبّر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ورنہ یورپین قومیں جنہوں نے اِس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ وہاں دولتمند گو اس بات میں بدنام ہیں کہ ▪▪ ہر وقت عیش و عشرت میں مبتلا رہتے ہیں لیکن وہ پھر بھی غرباء کو ابھارنے اور قوم کو ترقی دینے کے لئے اپنے اموال کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ خرچ کرتے رہتے ہیں اور اس طرح عیسائیت کی تقویت کا موجب بنتے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ فرماتا ہے کہ بے شک غرباء کے لئے اپنے اموال خرچ کرنا قومی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے لیکن صرف اس فائدہ کو ہی اپنا مقصد و مدعا نہ بنا لینا۔ ایک مسلمان سے ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ خرچ کریگا خالصۃً للہ اور ابْتِغَآءَ لِوَجْهِ اللّٰهِ کریگا۔ اِس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اپنے مومن بندوں کی تعریف کی ہے اور نفی کے طور پر یہ فقرہ بیان کیا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ہم مومنوں سے اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع ہی نہیں کر سکتے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کریں گے۔ یہ طریقِ کلام نہی کی نسبت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جیسے اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ میں آپ سے یہ اُمید رکھتا ہوں کہ میری واپسی تک آپ یہیں تشریف رکھیں گے۔ تو یہ فقرہ بہ نسبت اِسبات کے زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ آپ یہیں بیٹھیں۔ اور میرے آنے تک کہیں نہ جائیں۔ کیونکہ اِس طرح خود اس کے دل میں کام کرنے کی تحریک پیدا کی جاتی ہے۔ پھر وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کہکر اس امر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ بے شک مومنوں کے چندوں سے دنیوی ترقیات بھی حاصل ہوتی ہیں اور دین کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر اعلیٰ درجہ کے مومن اِس سے بالا ہوتے ہیں۔ انہیں نہ دُنیا کی ترقی مطلوب ہوتی ہے اور نہ جنّت کے انعامات ان کا اصل مقصود ہوتے ہیں بلکہ اُن کی نیکیوں کا حقیقی محرک صرف یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن سے راضی ہو جائے اور وہ انہیں محبت اور پیار کی نگاہ سے دیکھے۔

چوتھی بات اللہ تعالےٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرو گے اُس کا تمہیں پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالےٰ نے اس امر کو ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کے بعد بیان کیا ہے۔ حالانکہ جہاں یہ بتایا تھا کہ جو کچھ تم

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ

(یہ مذکورہ بالا صدقات) اُن محتاجوں کیلئے ہیں جو اللہ کی راہ میں (دوسرے کاموں سے) روکے گئے ہیں - وہ ملک میں (آزادی سے)

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

آجا نہیں سکتے (ایک) بے خبر (شخص اُن کے) سوال سے بچنے کے سبب سے انہیں غنی خیال کرتا ہے - تم اُن کی

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا

ہیئت سے پہچان سکتے ہو - وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے -

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲۷۴)

۳۷ ع ۵

اور تم جو اچھا مال بھی (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اللہ اس سے خوب واقف ہے۔ ۱۸۳

خرچ کروگے اُس کا فائدہ تمہاری جانوں کو پہنچے گا - اسی جگہ یہ بات بھی بیان کی جاسکتی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو بعد میں رکھا - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک مزید بات یہ بیان کی گئی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اُسے تو پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے مگر جو شخص دنیا کی خاطر دیتا ہے - اُسے دنیا میں تو لوگوں کی خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے مگر آخرت میں اُسے کوئی انعام نہیں ملتا -

آخر میں وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ کہہ کر ایک اور ظلم کی بھی نفی کی گئی ہے جس کا گزشتہ آیات کے تسلسل میں جنگ کے ساتھ تعلق ہے - جو قوم جنگ کے موقعہ پر اپنا مال خرچ نہ کرے وہ تباہ ہو جاتی ہے اور دوسری قوم غالب آکر اُسے اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا لیتی ہے - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم اپنا مال خرچ کروگے تو تم ہی غالب رہوگے - اور کوئی دوسری قوم تمہیں مغلوب کر کے تم پر ظلم نہیں کر سکیگی -

۱۸۳ حل لغات

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ : ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ کے معنے ہیں خَرَجَ تَاجِرًا اَوْ غَازِيًا وہ تجارت کرنے یا جنگ کرنے کے لئے نکل گیا - اور ضَرَبَ کے معنے اَسْرَعَ اور ذَهَبَ کے بھی ہیں یعنی اُس نے جلدی کی اور چلا گیا (اقرب)

التَّعَفُّفِ — اَلتَّعَفُّفُ : عَفَّ الرَّجُلُ کے معنے ہیں کَفَّ عَمَّا لَا يَحِلُّ وَلَا يَجْمُلُ قَوْلًا اَوْ فِعْلًا وَامْتَنَعَ - اُس چیز سے جو جائز اور اچھی نہیں قولی یا فعلی طور پر رُک گیا (اقرب)

مِنْ — اس جگہ مِنْ کے معنے سبب کے ہیں - جیسا کہ آتا ہے مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا ... اپنے گناہوں کے سبب سے غرق کر دیئے گئے -

سِيْمَا — سِيْمَا : کے معنے ہیں (۱) ہیئت (۲) علامت (اقرب)

اِلْحَافًا — اِلْحَافًا : اَلْحَفَ السَّائِلُ کے معنے ہیں - اَلَحَّ - سائل نے اصرار سے کام لیا - اور اَلْحَفَ فُلَانًا الثَّوْبَ کے معنے ہیں اَلْبَسَهٗ اِيَّاهُ اُسے لباس پہنا دیا گیا - پس اِلْحَاف کے معنے ہوئے پہنانا یعنی سوال پہنا دینا مراد اس سے یہ ہے کہ کسی کا پیچھا نہ چھوڑنا اور سوال کرتے چلے جانا -

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ — **تفسیر** :- لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہ ایک محذوف کی خبر ہے جو ھِیَ کا لفظ ہے -

اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ صدقہ کا حکم جو تمہیں دیا گیا ہے یہ فقراء کے لئے ہے۔ یا اسجگہ ایک فعل محذوف ہے۔ جو اِجْعَلُوْهَا ہے۔ یعنی اس صدقہ کو اُن فقراء کے لئے مخصوص کردو جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں روکے گئے ہیں۔ یہاں اُحْصِرُوْا تو فرما دیا مگر یہ نہیں بتایا کہ کون روکتا ہے یا وہ کس وجہ سے رُکتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اِسے عام رکھنا چاہتا ہے کیونکہ روکے جانے کی کئی وجوہ ہو سکتی تھیں۔ بہرحال اِس سے یہ امر یقینی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ نکمے اور سست نہیں ہوتے بلکہ کسی مجبوری کی وجہ سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ آگے وہ مجبوری بیان نہیں کی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دشمن روکنے والا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدمتِ دین کے کاموں میں رات دن معروف رہنے کی وجہ سے دنیا کمانے کے دروازے اُن پر بند ہوں۔ جیسے صحابہؓ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ عشق اور آپکی صحبت میں بیٹھنے کی تمنا اور دینِ اسلام سیکھنے کی تڑپ اِتنا کام کر رہی تھی کہ انہیں کسی اور بات کی طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ اِس کی مثال حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف تین سال قبل ایمان لائے تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں چونکہ بعد میں ایمان لایا تھا۔ اِس لئے مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ مَیں آپؐ کے دروازہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ وہ اپنا تمام وقت مسجد میں گذارتے اور قضائے حاجات کے بعد پھر وہیں آکر بیٹھ جاتے۔ اُن کو کہیں باہر جانا پسند ہی نہیں تھا تا ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرمائیں اور وہ اُسے سُن نہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تین سال کے عرصہ کی صحبت پانے کے باوجود اس قدر حدیثیں بیان کی ہیں کہ اُن سے بہت زیادہ عرصہ صحبت پانے والوں نے اتنی حدیثیں بیان نہیں کیں۔ اُن کے بھائی نے ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت کی۔ کہ یا رسول اللہ ابوہریرہ سارا دن بیکار پڑا رہتا ہے۔ آپ اسے ہدایت فرمائیں کہ وہ کوئی کام بھی کیا کرے۔ آپ نے فرمایا۔ کبھی خدا تعالیٰ دوسروں کی وجہ سے بھی رزق دے دیا کرتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اُسی کی وجہ سے خدا تعالیٰ تم کو رزق دے رہا ہو پس ایسے واقفین زندگی جنہوں نے اپنے تمام اوقات خدا اور اس کے رسول کے لئے وقف کر رکھے ہوں اور وہ کوئی تجارت وغیرہ نہ کر سکتے ہوں وہ بھی اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ میں ہی شامل ہیں۔

پھر ایک رُکنا وہ بھی ہے جس کا فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (سورۃ توبہ آیت ۱۲۲) میں ذکر آتا ہے۔ یعنی کیوں نہ ہُوا کہ ہر قوم اور جماعت کے کچھ لوگ مرکز میں دین سیکھنے کے لئے آتے اور اپنی قوم کو واپس لوٹ کر بے دینی سے ہوشیار کرتے تاکہ وہ گمراہی سے ڈریں۔ جیسا کہ اس زمانہ میں مختلف ممالک سے لوگ دین سیکھنے کے لئے احمدیت کے مرکز میں آتے اور کئی کئی سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر واپس جا کر اپنے ملک اور قوم کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا موجب بنتے ہیں۔ پس ایک رُکنا دین حاصل کرنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے آرام کے لئے نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُس کے دین کی خدمت کرنے کی وجہ سے روکے جاتے ہیں۔ وہ زمین میں پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے یعنی ہر وقت دین کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اور انہیں دینی امور میں اتنا شغف ہوتا ہے کہ معاش کے حصول کے لئے کسی اور طرف توجہ ہی نہیں کر سکتے۔ لیکن مال کی کمی کے باوجود وہ اپنے نفس کو سوال کی دناءت سے بچاتے اور خاموش رہتے ہیں۔ اور اِس وجہ سے وہ لوگ جو غور کرنے کے عادی نہیں انہیں خوشحال سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے متعلق تمہارا فرض ہے کہ تم خود اُن کی ضروریات کا خیال رکھو۔ اور

اُن کے لئے اپنے اموال کا ایک حصّہ خرچ کرو۔

اِس آیت کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ انہیں خدا تعالےٰ کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے لوگوں نے کسبِ معاش سے روک دیا ہے جیسے کئی احمدی ہیں جن کو محض قبولِ احمدیت کی وجہ سے ملازمتوں وغیرہ سے الگ ہونا پڑا یا کسبِ معاش کے ذرائع اُن پر بند کئے گئے۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ

ایسے لوگ چونکہ دستِ سوال دراز نہیں کرتے اس لئے جاہل لوگ انہیں تعفّف کی وجہ سے مالی امداد سے بالا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عزّتِ نفس نے اُن کے لبوں پر مہرِ خاموشی لگائی ہوئی ہوتی ہے۔ ورنہ وہ بعض محتاج دکھائی دینے والوں سے بھی زیادہ قابلِ امداد ہوتے ہیں اور اُن کا حق ہوتا ہے کہ اُن کی مناسب امداد کی جائے اور اُن کی پریشانیوں کو دُور کیا جائے۔ تاکہ وہ دینی خدمات کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔ مَیں نے دیکھا ہے عام طور پر لوگوں کو یہ عادت پڑی ہوئی ہے کہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے کسی نے مانگا ہے کہ ہم دیں۔ حالانکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ مومن کا یہ ذاتی فرض ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر حالات کا صحیح جائزہ لے اور دیکھتا ہے کہ کون حاجتمند ہے اور کون ہے جسے عزّتِ نفس نے سوال کرنے سے روک رکھا ہے۔

تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ میں بتایا کہ تُو انکی علامت یا شکل ہی سے انکو پہچان لیتا ہے۔ سِیْمَا کے معنے اگر شکل اور حالت کے لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ تو اُن کا چہرہ دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ وہ مالی پریشانی کا شکار ہیں۔ اور اگر علامت کے معنے لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تُو ان کا دریدہ لباس اور اُن کی پھٹی پرانی جوتی۔ اُن کی بوسیدہ پگڑی اور اُنکی سادہ طرزِ رہائش پر نظر ڈالکر پہچان لیتا ہے کہ یہ لوگ قابلِ امداد ہیں۔ اسجگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے مومنوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ ہمارا رسول تو ایسے لوگوں کو پہچان لیتا ہے پھر تم کیوں نہیں پہچانتے۔ اور کیوں اپنی آنکھیں کھول کر نہیں رکھتے۔ اس بارہ میں احادیث میں حضرت ابوہریرہؓ ہی کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک دن وہ سخت بھوکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ پاس سے گذرے تو انہوں نے اُن سے ایک آیت کا مطلب پوچھا۔ وہ بتا کر چلے گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ کیا مَیں اِن سے کم معنے جانتا ہوں کہ وہ معنے بتانے لگ گئے میرا تو یہ مطلب تھا کہ وہ شکل دیکھ کر پہچان لیں اور مجھے کچھ کھانے کو دیں۔ پھر حضرت عمرؓ پاس سے گذرے انہوں نے آپ سے بھی ایک آیت کا مطلب پوچھا۔ وہ بھی معنے بتا کر چلے گئے۔ حضرت ابوہریرہؓ پھر کہتے ہیں کہ مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ کیا ابوہریرہؓ اِن سے کم معنے جانتا ہے کہ انہوں نے آیت کے معنے بتائے اور چلے گئے اتنے میں مسجد کی ایک طرف سے کھڑکی کھلی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے پیار سے فرمایا۔ ابوہریرہ! معلوم ہوتا ہے۔ تم بھوکے ہو۔ پھر آپ نے فرمایا۔ اگر مسجد میں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوں تو اُن کو بھی بلا لاؤ۔ اُس وقت مسجد میں سات آدمی تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ انکو بلا لائے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا ایک پیالہ دیکر فرمایا کہ پہلے اِن کو پلاؤ۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں۔ میرے دل میں خیال آیا کہ بھوک تو مجھے لگی ہوئی ہے اگر انہوں نے دودھ پی لیا تو میرے لئے کیا بچیگا۔ لیکن مَیں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق ان کو باری باری دودھ پلایا۔ اور سب نے پی لیا مگر پھر بھی وہ پیالہ اسی طرح بھرا رہا۔ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ ابوہریرہ! اب تم پیو۔ آخر مَیں نے پیا اور خوب پیا۔ جب مَیں سیر ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر پیو۔ مَیں نے پھر پیا۔ آپ نے فرمایا۔ پھر پیو۔ مَیں نے پھر پیا۔ آپ نے فرمایا پھر پیو۔ آخر مَیں نے عرض کیا

کہ یا رسول اللہ! اب تو میرے ناخنوں تک دودھ کی تراوت پہنچ گئی ہے۔ اس پر آپ نے وہ پیالہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور خود پی لیا۔ یہ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ کی صداقت کا کتنا زبردست ثبوت ہے۔ غرض اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ خوبی بتائی گئی ہے کہ ہمارا رسول ایسے محتاجوں کو انکی علامتوں سے پہچان لیتا ہے۔ پس اے مسلمانو! تم بھی اُن کو پہچاننے کی کوشش کیا کرو۔

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے یہ معنے نہیں کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر لوگوں سے چمٹ کر نہیں صرف نرمی سے مانگ لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگوں سے سوال ہی نہیں کرتے۔ گویا اِلْحَاف سوال کو مقید کرنے کے لئے نہیں بلکہ سوال کی شناعت بیان کرنے کے لئے ہے یعنی وہ اِلْحَاف نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اِلْحَاف چاہتا ہے کہ انسان دائماً مَسْئُوْل عَنْہ کے ساتھ لگا رہے۔ اور وہ خدا کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ پس وہ اپنی عزت چھپانے کے لئے امراء کا سایہ بننے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ اور اس طرح دوسرے لوگوں سے جو سوالِ مجسم بن کر انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے اس سے بھی محروم رہتے ہیں۔ گویا یہ الفاظ بطور تفسیر ہیں نہ کہ بطور قید۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی یہی معنے ثابت ہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ اَوِ التَّمْرَتَانِ وَلَا اللُّقْمَةُ وَلَا اللُّقْمَتَانِ اِنَّمَا الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَتَعَفَّفُ وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ يعنى قوله لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بخاری کتاب التفسیر) یعنی مسکین وہ نہیں جسے ایک یا دو کھجوریں یا ایک لقمہ یا دو لقمے دے دیں۔ بلکہ مسکین وہ ہے جو سوال ہی نہیں کرتا۔ یہ اِلْحَاف کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تفسیر بیان فرمائی ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلٰكِنَّ الْمِسْكِيْنَ الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُّغْنِيْهِ وَلَا يُفْطَنُ بِهٖ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْاَلُ النَّاسَ۔ (بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عزوجل لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا) یعنی مسکین وہ نہیں جو لوگوں سے مانگتا پھرتا ہے اور اسے ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں مل جاتی ہیں بلکہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کوئی مال نہ ہو اور نہ لوگوں کو اُس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اُسے صدقہ ہی دے دیں اور نہ ہی وہ لوگوں سے سوال کرکے اپنی حاجت پوری کرے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسکین دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں سے سوال کرتے پھرتے ہیں۔ اور انہیں دوسروں سے مانگنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ دوسرے وہ جو لوگوں سے مانگتے نہیں بلکہ کام کرکے روزی کماتے ہیں۔ لیکن اُن کی آمد اس قدر کم ہوتی ہے کہ وہ بھی قابلِ امداد ہوتے ہیں۔ بہرحال احادیث میں سوال کرنے سے سخت روکا گیا ہے۔ اور سوائے تین آدمیوں کے اور کسی کیلئے سوال کرنا جائز نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ الْمَسْاَلَةَ لَا تَصْلُحُ اِلَّا لِثَلَاثَةٍ لِذِيْ فَقْرٍ مُّدْقِعٍ اَوْ لِذِيْ غُرْمٍ مُّفْظِعٍ اَوْ لِذِيْ دَمٍ مُّوْجِعٍ (مشکوٰۃ المصابیح) یعنی تین آدمیوں کے سوا اور کسی کے لئے سوال کرنا جائز نہیں۔ اوّل اُس کے لئے جس کو کھانے کیلئے کوئی چیز نہ ملتی ہو۔ یعنی ایسی حالت ہو گئی ہو کہ اب کسی ذریعہ سے اُس کو کھانا ملنا ناممکن ہو۔ دوم جس پر بلا اُس کے کسی قصور کے چٹی پڑ گئی ہو اور اُسے وہ ادا نہ کر سکتا ہو۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَھُمْ

جو لوگ اپنے مال رات اور دن پوشیدہ (بھی) اور ظاہر (بھی) (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کے لئے

اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر (محفوظ) ہے۔ اور نہ (تو) انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۳۸۴ؔ

سوم۔ کوئی قتل ہو گیا ہو اور اُس کی دیت ادا کرنے کی اُس میں طاقت نہ ہو۔ ایسے موقع پر اُس کے لئے سوال کرنا جائز ہے۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے معنے یہ ہوں کہ ان لوگوں کے لئے دوسروں کو سوال کرنا جائز ہے نہ کہ خود اُسکو اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ دو شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سوالی بن کر آئے۔ آپؐ نے اُن کو سرتا پا دیکھا اور فرمایا۔ اِنْ شِئْتُمَا اَعْطَیْتُکُمَا مِنْھَا وَلَا حَظَّ فِیْھَا لِغَنِیٍّ وَلَا لِقَوِیٍّ مُّکْتَسِبٍ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۶۲) یعنی اگر تم چاہو تو میں تم کو مال دے دیتا ہوں۔ مگر صدقہ کے مال میں صدقہ دینے والے آسودہ حال اور کمانے والے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح آپ نے ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ مَنْ سَأَلَ وَعِنْدَہٗ مَا یُغْنِیْہِ فَاِنَّمَا یَسْتَکْثِرُ مِنْ نَّارِ جَھَنَّمَ یعنی جو شخص دوسروں سے سوال کرے اور اس کے پاس اتنی چیز موجود ہو جو اس کے کام آسکے تو وہ جہنم کی آگ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ وَمَا یُغْنِیْہِ کفایت کرنیوالی چیز سے کیا مراد ہے۔ آپؐ نے فرمایا مَا یُغَدِّیْہِ اَوْ یُعَشِّیْہِ ایسی چیز جو اس کے صبح یا شام کے کھانے میں کام آسکے (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۸۱) غرض لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا میں بتایا کہ وہ لوگ دوسروں سے سوال ہی نہیں کرتے۔ کیونکہ خود سوال کرنا ہی اپنی ذات میں اِلحاف ہے۔

۳۸۴ؔ **تفسیر:** - اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ کے متعلق بعض اور امور بیان کئے ہیں۔ فرماتا ہے۔ ہمارے مومن بندے صدقہ کے لئے کسی خاص وقت یا خاص دن کو مخصوص نہیں کرتے بلکہ وہ رات کے وقت بھی صدقہ کرتے ہیں اور دن کے وقت بھی صدقہ کرتے ہیں۔ اور مخفی طور پر بھی صدقہ کرتے ہیں اور ظاہر طور پر بھی صدقہ کرتے ہیں۔ یہ لیل اور نہار اور سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً کا ذکر اِس لئے فرمایا کہ شریعتِ اسلامی کے نزدیک مومن پر کوئی وقت ایسا نہیں آنا چاہیئے جبکہ وہ نیکیوں میں حصہ نہ لے رہا ہو۔ چنانچہ نمازوں کی دن اور رات میں تقسیم اور روزوں اور حج کا قمری مہینہ میں رکھنا۔ یہ سب اسی غرض کے لئے ہے۔ پس دن اور رات میں سِرًّا اور علانیۃً صدقہ دینے کا ذکر کرکے بتایا کہ ہمارے مومن بندے صدقہ بھی مختلف اوقات میں دیتے ہیں تاکہ کوئی وقت صدقہ سے خالی نہ رہے اور قمری مہینوں کے لحاظ سے اُن کی یہ نیکی سارے سال میں چکر کھاتی رہے اور اس کا کوئی حصہ بھی اِس سے خالی نہ رہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے لیل کا ذکر پہلے کیا ہے اور نہار کا بعد میں اور اسی ترتیب سے سِرًّا کو پہلے رکھا ہے اور علانیۃً کو پیچھے یا یوں کہنا چاہیئے کہ لیل کے مقابل میں سِرًّا رکھا ہے اور نہار کے مقابلہ میں علانیۃً۔ اِس ترتیب میں اِس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مومنوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ بعض دفعہ رات کو

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ

جو لوگ سود کھاتے ہیں (بالکل) اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے

الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ

جس پر شیطان (یعنی مرض جنون) کا سخت حملہ ہو۔ یہ (حالت) اس وجہ سے ہے

بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ

کہ وہ کہتے رہتے ہیں کہ (خرید و) فروخت (بھی تو) بالکل سود (ہی) کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے

پوشیدہ طور پر صدقہ دیتے ہیں اور اس طرح دیتے ہیں کہ لینے والے کو بھی پتہ نہیں لگتا کہ کس نے دیا ہے تاکہ لینے والے کو شرمندگی محسوس نہ ہو اور اُن کے اپنے قلب میں بھی تکبر اور ریاء کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ پھر وہ دن کو بھی صدقہ دیتے ہیں اور ظاہر طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے دیکھ کر دوسروں کو بھی غرباء کی امداد کی تحریک ہو اور قوم ترقی کرے۔ ورنہ اپنی ذات کے لئے انہیں کسی شہرت کی تمنا نہیں ہوتی۔ غرض لَیل کی سِرًّا میں تفسیر کی گئی ہے اور نہار کی عَلَانِیَةً میں اور بتایا گیا ہے کہ ہمارے مومن بندے وقتوں کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ اور حالتوں کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح لیل و نہار سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ دُکھ اور سُکھ دونوں حالتوں میں وہ صدقہ دیتے ہیں۔ درحقیقت اگر غور سے کام لیا جائے تو اسلامی شریعت میں خدا تعالیٰ نے دو قسم کے صدقات رکھے ہیں۔ اوّل زکوٰۃ جو حکومت وصول کرتی ہے۔ یہ نظام اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ غرباء کے لئے امداد کی ایک یقینی صورت پیدا ہو جائے۔ دوم صدقہ تاکہ اس کے ذریعہ مخلص اور غیر مخلص کا پتہ چلتا ہے جو شخص مخلص ہوگا وہ تو اپنے طور پر بھی صدقہ دے گا۔ لیکن زکوٰۃ چونکہ گورنمنٹ کی معرفت وصول کی جاتی ہے اس لئے لوگوں کو ٹیکس کی طرح لازمًا ادا کرنی پڑتی ہے

اور اس میں مخلص اور غیر مخلص سب کو شامل ہونا پڑتا ہے پس اسلام نے زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ بھی رکھ دیا تاکہ لوگوں کو خود بھی اِس کا احساس رہے اور اُن میں غرباء پروری کا جذبہ ترقی کرے۔

پھر زکوٰۃ کے قیام کی ایک غرض دوسروں کے جذبات کا احترام بھی ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کا روپیہ حکومت دیتی ہے اس لئے لینے والے کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُسے کس نے دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف صدقہ آپس کے تعلقات کو بھی خوشگوار بنانے کیلئے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اِس سے محبت بڑھتی ہے۔ غرض کچھ صدقہ غرباء اور فقراء کے لئے حتمی اور قطعی طور پر مقرر کر دیا اور باقی صدقات مخلصین کے امتیاز اور اُن کے مدارج میں ترقی کے لئے رکھ دیئے۔

دنیا میں یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کھیت میں بیج نہ بویا جائے اُس وقت تک فصل نہیں ہوتی۔ اِسی اصول پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ پہلے تم اپنے پاس سے کچھ خرچ کرو۔ پھر میں تمہیں دونگا۔ بے شک خدا تعالیٰ بغیر بیج کے بھی پیدا کر سکتا ہے لیکن چونکہ خدا تعالیٰ نے ہی یہ قانون بنا دیا ہے کہ بغیر بیج کے ہم کچھ پیدا نہیں کرینگے اسلئے فرمایا کہ پہلے تم بیج ڈالو۔ پھر دیکھو گے کہ ہم اس بیج کو کس طرح بڑھاتے ہیں۔

اَلْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

(خرید و) فروخت کو جائز قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ سو (یاد رکھو کہ) جس (شخص) کے پاس اُسکے رب کی طرف سے کوئی نصیحت

فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ

(کی بات) آئے اور وہ (اُسے سُن کر خلاف ورزی سے) باز آ جائے تو جو (لین دین) وہ پہلے کر چکا ہے اُس کا نفع اُسی کا ہے اور اسکا معاملہ

فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷۶

اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو لوگ پھر (وہی کام) کریں وہ (ضرور) آگ (میں پڑنے) والے ہیں۔ وہ اس میں پڑے رہیں گے۔ ۱۸۵ؔ

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ دنیا میں بیج بونے والا کبھی ثمرات سے محروم بھی رہتا ہے۔ مثلاً فصل کو آگ لگ جاتی ہے یا چوری ہو جاتی ہے اور اس طرح اس پر خوف و حزن طاری ہو جاتا ہے۔ مگر فرمایا ہمارے ہاں ایسا نہ ہوگا۔ پھر دنیا میں تو ایک دانہ کے عوض سات سو دانے ملتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اِس سے بھی زیادہ اجر دیتا ہے۔ اور وہ غیر مقطوع انعامات سے اپنے بندوں کو نوازتا ہے۔

۱۸۵ؔ حل لغات:۔ تَخَبَّطَهُ کے معنے ہیں ضَرَبَهٗ شَدِيْدًا۔ اُسے سخت مارا اور تَخَبَّطَهُ الشَّيْطٰنُ کے معنے ہیں مَسَّهٗ بِاَذًى۔ شیطان نے اُسے سخت تکلیف پہنچائی۔

اَلْمَسُّ کے معنے ہیں اَلْجُنُوْنُ پاگل پن لِاَنَّهٗ عِنْدَ الْعَرَبِ يَعْرِضُ مِنْ مَسِّ الْجِنِّ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کے نزدیک یہ عارضہ جنّات کے چھونے کی وجہ سے لاحق ہوتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر:۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سود خوار لوگوں اور سود خوار قوموں کی حالت بیان کرتے ہوئے اُن مضرّات کا ذکر فرمایا ہے جو سود کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کے نتیجہ میں نہ صرف امراء اور غرباء کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے بلکہ دنیا کا امن بھی برباد ہو جاتا ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ اسجگہ رِبٰوا کے لفظ میں ہر قسم کا سود شامل ہے۔ اِس میں بنکوں کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ بلکہ خواہ بنک سے سود لیا جائے یا ڈاکخانہ سے یا کواپریٹو سوسائٹیز سے یا کسی فرد سے ہر صورت میں وہ ناجائز اور حرام ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے یورپین اقوام سے ڈر کر سود کی عجیب و غریب تعریفیں کرنی شروع کر دی ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام میں اس طرح کا سود لینے کی تو ممانعت ہے کہ سو روپیہ دے کر دو سو لیا جائے لیکن معمولی سود لینے کی ممانعت نہیں کیونکہ یہ سود نہیں بلکہ منافع ہے۔ اِن لوگوں کی مثال بالکل اُس کشمیری کی سی ہے جس سے کسی نے پُوچھا تھا کہ تمہارا کوئی لڑکا بھی ہے؟ اُس نے کہا۔ کوئی نہیں۔ لیکن جب وہ اُٹھا۔ تو چار لڑکے اُس کے لمبے کُرتہ کے نیچے سے نکل آئے۔ پوچھنے والے نے کہا کہ تم تو کہتے تھے کہ میرا کوئی بچہ نہیں۔ یہ چار کس کے بچے ہیں۔ اُس نے کہا۔ چار بچے بھی کوئی بچے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی کہتے ہیں کہ پانچ یا سات فیصدی سود بھی کوئی سود ہے۔ سود تو وہ ہے جو سو فیصدی ہو۔

تَخَبَّطَهُ

اَلْمَسُّ

بعض دوسروں نے یہ فتویٰ دے کر کہ غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے اس کے جواز کی ایک اور راہ نکال لی۔ پھر بعض نے یہ فتویٰ دے دیا کہ غیر مذاہب کی حکومتوں کے ماتحت جو مسلمان بستے ہیں اُن سے بھی سود لینا جائز ہے۔ آخر یہاں تک کہہ دیا گیا کہ سود وہ ہوتا ہے جو بہت بڑی رقم کی صورت میں لیا جائے اور پھر اس رقم کو معیّن نہیں کیا گیا کہ کتنی ہو۔ گویا کسی کے لئے بھی روک باقی نہ رہی۔ اور سب کیلئے سود لینا جائز ہو گیا۔ حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کو ایسی لعنت قرار دیا ہے کہ آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ سود لینے والا اور دینے والا اور اُس پر گواہی ڈالنے والا سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔

درحقیقت سود سے روکنا اسلام کے اعلیٰ ترین احکام میں سے ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں دولت جمع ہو جائے۔ اور باقی لوگ بھوکے مرتے رہیں۔ بلکہ چاہتا ہے کہ سب کو ترقی کی دوڑ میں حصہ لینے کا یکساں موقع ملے اور تمدن اپنی صحیح بنیادوں پر قائم ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر قسم کے سودی کاروبار کو بند کیا جائے۔ کیونکہ سود کا سب سے بڑا نقصان یہی ہے کہ امراء اس ذریعہ سے روپیہ حاصل کرکے ہر قسم کی تجارت اور صنعت وحرفت اپنے قبضہ میں کر لیتے ہیں اور دوسرے لوگ اُن کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔ پس سود ہی ہے جس نے اس زمانہ میں چند ہاتھوں میں دولت جمع کر دی ہے۔ اور امراء اور غرباء میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔

دراصل اگر غور سے کام لیا جائے تو سود دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو مالدار آدمی اپنا مال بڑھانے کے لئے دوسرے مالداروں سے رقم لے کر اُن کو ادا کرتا ہے۔ جیسے تاجر پیشہ لوگوں یا بینکوں کا دستور ہے۔ اور ایک وہ سود ہے جو غریب آدمی اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی صاحبِ استطاعت سے قرض لے کر اُسے ادا کرتا ہے۔ اسلام نے اِن دونوں سودوں سے منع کیا ہے۔ اس سود سے بھی روکا ہے جو تجارت یا جائیداد کو فروغ دینے کے لئے مالداروں سے روپیہ لے کر انہیں ادا کیا جاتا ہے اور اس سود سے بھی منع کیا ہے جو غریب آدمی اپنی غربت سے تنگ آ کر کسی صاحبِ استطاعت سے قرض لینے کے بعد اُسے ادا کرتا ہے۔ اور نہ صرف ایسا سود دینے سے روکا ہے بلکہ لینے سے بھی منع کیا ہے۔ اور نہ صرف سود لینے دینے سے منع کیا ہے بلکہ گواہی دینے والوں اور معاہدہ لکھنے والوں کو بھی مجرم قرار دیا ہے۔

تاجر پیشہ لوگوں کے سود کے متعلق تو جب کوئی شخص سوال کرے کہ مثلاً اُس کے پاس دس ہزار روپیہ ہے اور وہ اُس سے دس لاکھ کما سکتا ہے۔ اگر وہ بینکوں یا دوسرے افراد سے روپیہ لے کر اُسے ترقی نہ دے تو کیا کرے؟ ہم اُسے آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ صبر کرے دس ہزار روپیہ اس کیلئے کافی ہے اُسی پر گذارہ کرتا رہے۔ مگر جس وقت یہ سوال پیش کیا جائے کہ ایک غریب آدمی بھوک سے مر رہا ہے۔ کھیتی اُس کی نہیں ہوئی۔ اناج اس کے گھر میں نہیں آیا۔ بارشیں وقت پر نہیں ہوئیں۔ ایسی صورت میں اگر وہ اپنی زمین کیلئے روپیہ مانگتا ہے تو بغیر سود کے لوگ اُسے نہیں دیتے۔ اب وہ کیا کرے۔ اگر وہ بیل نہ خریدے گا تو کھیتی کا کام کس طرح کریگا یا عمدہ بیج نہ لیگا تو وہ اور اس کے بیوی بچے کہاں سے کھائیں گے۔ اُس کے لئے ایک ہی صورت ہے۔ کہ وہ روپیہ قرض لے۔ مگر جب لوگ اُسے بغیر سود کے قرض نہ دیں تو وہ کیا کرے۔ جب یہ سوال پیش کیا جاتا ہے تو اس کا جواب دینا ذرا مشکل ہو جاتا ہے اور درحقیقت یہی وہ سود ہے جس کے حالات اور کوائف سننے کے بعد

انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے کہ وہ کیا جواب دے۔ مالدار آدمی کو تو ہم فوراً یہ جواب دے سکتے ہیں کہ سود پر روپیہ مت دو۔ اگر تمہارے پاس دس ہزار روپیہ ہے تو اسی پر کفایت کرو۔ مگر ایک غریب آدمی کو ہم یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اسی حالت پر کفایت کرو۔ اُس کو تو ایک ہی جواب دیا جاسکتا ہے کہ بھوکے رہو اور مر جاؤ۔ مگر یہ کوئی ایسا معقول جواب نہیں جس سے ہمارے نفس کو تسلی ہو۔ یا سائل کے دل کو اطمینان حاصل ہو۔ پس ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اسلام نے اس کا کیا حل رکھا ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے اگر ہم اسلامی تعلیم پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک غریب آدمی تو ایسا ہوتا ہے جس کے پاس روپیہ نہیں ہوتا مگر جائیداد ہوتی ہے۔ اس کیلئے تو یہ صورت ہے کہ وہ جائیداد رہن رکھے اور روپیہ لے لے مگر ایک ایسا غریب ہوتا ہے جس کے پاس جائیداد بھی نہیں ہوتی جسے وہ رہن رکھ سکے۔ یا اگر جائیداد ہوتی ہے تو وہ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اگر وہ اُسے رہن رکھدے تو اس کا کاروبار بند ہو جاتا ہے۔ مثلاً زمیندار ہے اگر وہ اپنی زمین رہن رکھ دیتا ہے تو وہ کھیتی باڑی کہاں کریگا اپنے مکان کی چھت یا صحن میں تو وہ کر نہیں سکتا۔ ان حالات میں اسلام نے یہ رکھا ہے کہ ایک طرف تو اُس نے امراء پر ٹیکس لگا دیا جس سے غرباء کی امداد کی جاسکتی ہے اور دوسری طرف اُس نے یہ کہا ہے کہ جب ٹیکس سے بھی کسی غریب کی ضرورت پوری نہ ہو تو اس کے دوست واقف کار یا محلہ والے اُسے قرضِ حسنہ دیں۔ اور فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ کے ماتحت کشائش تک اُسے واپسی کی مہلت دیں تاکہ وہ اطمینان سے اپنی حالت درست کر سکے۔ یہ صورت ایسی ہے جس پر اُسے سود پر روپیہ لینے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ اُس کی احتیاج پوری ہو جاتی ہے۔

لوگ جو کہا کرتے ہیں کہ آجکل سود کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ صحابہؓ کے زمانہ میں جبکہ دو دو کروڑ روپیہ ایک ایک شخص کے پاس ہوتا تھا کیا سود کی کاروبار ہوا کرتا تھا۔ سود کو تو وہ حرام سمجھتے تھے۔ پس یہ غلط ہے کہ سود کے بغیر مال میں ترقی نہیں ہو سکتی۔

پھر اسلام نے اگر ایک طرف سود سے منع کیا ہے تو دوسری طرف زکوٰۃ اور وراثت کے طریق کو جاری کیا ہے۔ اس ذریعہ سے دولت کسی خاص خاندان میں جمع نہیں رہ سکتی بلکہ جو محنت کرے وہی مالدار ہو سکتا ہے۔ اور غریبوں کے راستہ میں کوئی روک نہیں رہتی۔ غرض سود کی حرمت کا مسئلہ ایک نہایت ہی حکیمانہ مسئلہ ہے اور اسلام نے اسے ایسا ناپسند کیا ہے کہ جو شخص سود لے اُس کے اس فعل کو وہ خدا تعالیٰ سے جنگ کرنے کے مترادف ٹھہراتا ہے۔ گویا اسے بغاوت کے جرم میں داخل کرتا ہے۔ اور جس طرح باغی ملک پر بادشاہ چڑھائی کرتے ہیں۔ اسی طرح سود لینے والوں کے متعلق فرماتا ہے کہ اگر تم اس سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ کیونکہ تم نے اس کی بغاوت کی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اگر سود حرام ہے تو پھر موجودہ زمانہ میں اسلام کی اس تعلیم پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ دین ایک نظام کا نام ہوتا ہے اور یہ نظام اسی صورت میں نیک نتیجہ پیدا کر سکتا ہے جب وہ اپنی مکمل صورت میں قائم ہو۔ ادھوری صورت میں اُس کی پوری شان ظاہر نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آجکل جب لوگوں کو سود کے خلاف کچھ کہا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ سود کے بغیر تو گذارہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اس سے اُن کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس زمانہ میں سوسائٹی اس قدر گندی ہو گئی ہے کہ انسان سود لینے پر مجبور ہو جاتا ہے بلکہ اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سود ہی مصیبت کے وقت کا علاج ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سود انسان کی مشکلات کا علاج نہیں بلکہ وہ ایک مرض ہے جسے انسان نے خود پیدا کیا ہے اور اسلام میں اُس کا علاج موجود ہے۔ لیکن وہ علاج ایک نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔ جبتک اس نظام کو قائم نہ کیا جائے اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا جس طرح ایک مکان کی چار دیواری اور چھت اور دروازے اور کھڑکیاں جب تک کامل نہ ہوں وہ مکان حفاظت کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کی ساری تعلیم کو قائم کیا جائے تو سود کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور سود کی مضرّتوں سے بھی دنیا نجات پا جاتی ہے۔ سود کی ضرورت مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے:۔

(۱) غریب انسان اپنے گذارہ کے لئے قرض لیتا ہے۔

(۲) تاجر صنّاع یا زمیندار اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے قرض لیتا ہے۔

(۳) ایک صاحبِ جائیداد مصیبت زدہ جس کے پاس نقد روپیہ موجود نہیں کسی ناگہانی آفت سے بچنے کے لئے قرض لیتا ہے۔

(۱) ظاہر ہے کہ غریب انسان جو آٹھ روپے کما نہیں سکتا وہ آٹھ روپے سود پر لے کر نو کہاں سے ادا کرے گا؟ چنانچہ کسانوں کی موجودہ حالت اس حماقت کو کلّی طور پر ظاہر کر رہی ہے۔ ایک مرے ہوئے انسان کو مارنا انتہا درجہ کا ظلم ہے۔ جو پہلے ہی مر رہا ہے اُس پر اَور بوجھ لاد دینے کا کیا مطلب ہُوا۔ آخر اس ظلم کے نتیجہ میں ایک اور ظلم پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب مقروض قرضہ نہیں دے سکتے تو وہ قرضے سے کلّی طور پر انکار کر دیتے ہیں۔

(۲) تاجر یا صنّاع یا زمیندار اپنے کاروبار کو وسعت دینے کے لئے قرض لیتا ہے۔ زمیندار کی صورت میں اگر یہ قرض جائیداد کی بہتری کے لئے لیا گیا ہو تو اسلام نے رہن کی صورت کو جائز رکھا ہے اس تدبیر سے ایک طرف تو لوگوں کو اتنا قرض اُٹھانے سے جسے ادا کرنا اُن کی طاقت سے باہر ہو روک دیا ہے۔ اور دوسری طرف جائز ضرورت کے پورا کرنے کا راستہ بھی کھلا رکھا ہے۔

ایک تاجر اور صنّاع کے لئے دوسرے لوگوں کو شریکِ کار کرنے کا راستہ کھلا ہے۔ اگر اُسے سود سے کاروبار بڑھانے کی اجازت دی جائے اور وہ اپنی تجارتی کوشش میں ناکام رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے لوگوں کا روپیہ ضائع جائیگا۔ اور اگر کامیاب ہو تو بے انتہا دولت ایک ہاتھ میں جمع ہو جائیگی جو انصاف اور ضروریاتِ تمدّن دونوں کے خلاف ہے۔

(۳) تیسری صورت ایسی ہے کہ جسے ایک حد تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس پر نہ وہ اعتراض پڑتا ہے جو پہلی صورت پر پڑتا تھا کہ یہ دے گا کہاں سے۔ اور نہ وہ اعتراض پڑتا ہے جو دوسری صورت پر پڑتا تھا۔ یعنی یہ کیا حق رکھتا ہے کہ سب دنیا کی دولت اپنی ذہانت سے سمیٹ کر اپنے گھر میں جمع کرے۔ کیونکہ اِس صورت میں ایک ایسا شخص قرض لیتا ہے جس کے پاس جائیداد ہے یا قابلیت کمانے کی موجود ہے۔ لیکن ایک ناگہانی آفت کی وجہ سے اُسے ایک وقت میں اتنا روپیہ دینا پڑ گیا ہے جو اُس کے پاس جمع نہیں۔ بظاہر عقل کہتی ہے کہ اُسے سود پر قرض لینے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ اُس کو سود پر روپیہ قرض دینا ظلم بھی نہیں کیونکہ یہ صاحبِ حیثیت ہے اور یہ لوگوں کے روپیہ سے کھیلتا بھی نہیں۔ کیونکہ اُس کے پاس جائیداد ہے یا وہ نوکری پیشہ ہے جو اس کے قرض کے ادا ہونے کے لئے کافی ضمانت ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کو سود کی اجازت دے کر سود کا دروازہ کھولنا زیادہ اچھا ہے یا ایسے شخص کے لئے کوئی دوسری صورت کھولنا۔ یقیناً اگر اس شخص کو اجازت ملے تو دوسری دونوں قسم کے لوگ اِسکی

مثال پر اپنے لئے بھی سود لینے کا فتویٰ دیں گے۔ اور یہ لعنت دنیا میں قائم رہے گی۔ پس اس کے لئے بھی کوئی اور ہی راستہ کھولنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔

اسلام نے ان تمام باتوں کو مدّنظر رکھ کر ایک مفصّل تعلیم دی ہے۔ اس تعلیم کا مختصر یہ ہے کہ (۱) ہر شخص کو کھانا کپڑا مکان اور علم میسر ہونا چاہیئے۔ (۲) کسی ایک شخص کے پاس بے انتہا دولت جمع نہیں ہونی چاہیئے۔ (۳) روپیہ پیسہ کسی کے پاس جمع نہیں رہنا چاہیئے بلکہ اسے چکر کھاتے رہنا چاہیئے تاکہ سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں (۴) جن کو جائز ضرورتیں پیش آئیں اُن کے پورا کرنے کا سامان کرنا حکومت اور سوسائٹی کے ذمہ ہے۔

نمبر ۲ کی شق کے ماتحت اُس نے تجارتی سود کو منع کیا ہے۔ کیونکہ بے انتہا دولت ہمیشہ سود پر روپیہ لینے سے جمع ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان دوسروں کے روپیہ سے ایک جوا کھیلتا ہے۔ اگر کامیاب ہوا تو کروڑپتی ہو گیا اور اگر ہارا تو اُس کا روپیہ تو تھا نہیں۔ قرضخواہ کیا کریں گے زیادہ سے زیادہ قید کرا دیں گے۔

اس کی دوسری شق کے ماتحت اس نے تقسیم جائیداد کا حکم دیا ہے۔ یعنی ہر شخص کی جائیداد کو اُس کے وارثوں میں تقسیم کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ یہ جائز نہیں رکھا کہ کوئی شخص صرف ایک لڑکے کو جائیداد دے دے۔ تاکہ جو کچھ بھی اس شخص نے کمایا ہے وہ ایک ہی ہاتھ میں جمع رہ کر ہمیشہ کے لئے ایک خاندان کے بعض افراد کو فوقیت نہ دے دے۔

نمبر اول کے ماتحت اس نے حکومت کو حکم دیا ہے کہ سب کیلئے کھانا کپڑا مکان وغیرہ مہیا کرے۔ اور اس کے لئے زکوٰۃ اور خراج وغیرہ کا سلسلہ جاری کیا ہے اور افراد پر صدقہ واجب کیا ہے۔

نمبر ۳ کے لئے اُس نے ورثہ اور زکوٰۃ کا سلسلہ جاری کیا ہے اور سود سے منع کیا ہے۔

اور نمبر ۴ کے لئے بھی زکوٰۃ اور صدقات کا سلسلہ اور رہن باقبضہ یا بیع سلم کا سلسلہ جاری کیا ہے۔

غرض ان اصول پر اُس نے ایک مکمل نظام تیار کیا ہے۔ اگر یہ مکمل نظام دنیا میں جاری کیا جائے اور پھر کوئی نقص رہ جائے تب تو اسلام کی تعلیم پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ ورنہ نظام تو مغربی جاری ہو اور اسلام پر اعتراض ہو کہ اُس نے سود سے منع کر کے اس کا علاج کیا بتایا ہے ایک لغو اور بیہودہ فعل ہے۔

يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے اس جگہ مسّ سے مراد جنون ہے اور جنون کے نتیجہ میں انسانی حرکات میں بے راہ روی پیدا ہو جاتی ہے اور سوچنے اور غور و فکر سے کام لینے کا مادہ اُس میں نہیں رہتا۔ پس مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے کام اس طرح ہوتے ہیں جس طرح ایسا شخص جسے جنون کی بیماری نے ستایا ہوا ہو کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح اس میں وقار نہیں ہوتا اور سرعت اور بے پرواہی ہوتی ہے یہی حال سودخواروں کا ہوتا ہے۔ اُن کے کاموں میں بھی ناواجب سرعت پیدا ہو جاتی ہے اور پرواہ اور احتیاط کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ سودی کاروبار کرنے والے لوگ ایسے فتنے پیدا کرتے رہتے ہیں جن کے نتیجہ میں لڑائی ہو۔ اور اُن کا روپیہ صرف ہو گویا جس طرح ایک مجنون نتیجہ دیکھنے کا عادی نہیں ہوتا اسی طرح سود پر روپیہ دینے والا سود پر روپیہ دیتا چلا جاتا ہے اور یہ سوچتا نہیں کہ اس کا کیا انجام ہوگا۔ اُسے صرف یہ دھت ہوتی ہے کہ کوئی فتنہ پیدا ہو اور لوگ ہم سے سودی قرضہ لیں اور اس طرح ہمارا مال بڑھے۔ پھر اس سے بڑھ کر بڑی بڑی حکومتوں کو بھی اپنی طاقت سے بڑھ کر سود پر قرض لینے کی جرأت ہو جاتی ہے۔

اور وہ عواقب سے لاپرواہ ہو کر خونریز جنگیں شروع کر دیتی ہیں۔ درحقیقت ایسی لمبی لڑائیاں جو قوموں کی قوموں کو پیس ڈالتی ہیں۔ لاکھوں عورتوں کو بیوہ اور کروڑوں بچوں کو یتیم بنا دیتی ہیں۔ جو لاکھوں بیٹوں کو برباد اور لاکھوں باپوں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں وہ تبھی جاری رہ سکتی ہیں جبکہ سود کے ذریعہ مالی حالت کو قائم رکھا جائے۔ پہلی جنگ عظیم میں سات کروڑ روپیہ یومیہ صرف گورنمنٹ انگریزی کا خرچ ہوتا تھا اور اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ جرمنی کا خرچ ہوتا تھا۔ اگر سود کا دروازہ کھلا نہ ہوتا تو جرمنی اس خرچ کو ایک سال تک بھی برداشت نہ کر سکتا۔ اور اس کا سارا اندوختہ تھوڑی مدت میں ختم ہو جاتا۔ پھر اُس نے کیا کیا۔ یہی کہ سود کے ذریعہ کئی سال تک خرچ چلاتا رہا۔ پھر لڑائی کی بنیاد بھی سود ہی کی وجہ سے پڑی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اتحادی حکومتوں نے دفاعی طور پر جنگ کی۔ لیکن جرمنی کو کس چیز نے لڑائی چھیڑنے کی جرأت دلائی۔ اِسی سود نے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر جنگ شروع ہوگئی تو سود کے ذریعہ میں جس قدر روپیہ چاہونگا حاصل کر لونگا۔ اور جنگ جاری رکھ سکونگا۔ اگر سود کا دروازہ بند ہوتا تو اس قدر عظیم الشان جنگ جاری رکھنے کا اُسے خیال ہی نہ آتا۔ اور اگر براہ راست جرمنوں پر ٹیکس پڑتے تو وہ ایک سال بھی لڑائی جاری نہ رکھ سکتے اور فوراً ملک میں شور پڑ جاتا کہ ہم اس قدر بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن سود کے ذریعہ روپیہ لے کر لوگوں کو اس بوجھ سے غافل رکھا جاتا ہے۔ جو جنگ کے لمبا کرنے کی وجہ سے ان پر پڑتا ہے۔ پس سود لڑائی کا ایک بھاری سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام جنگ کے بعد سود کا بھی ذکر فرما دیا کیونکہ سود کا جنگ کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اِس کے بعد فرماتا ہے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ اِن کا ربٰو کھانا اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ تمہارے نزدیک تو یہ دونوں برابر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان دونوں کو یکساں قرار نہیں دیتا بلکہ وہ اِن میں سے بیع کو جائز قرار دیتا ہے اور ربٰوا کو ناجائز۔ پس اس کا ایک چیز کو جائز اور دوسری کو ناجائز قرار دینا صاف بتاتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک جیسی نہیں اور خدا تعالیٰ نے جو اِس سے منع کیا ہے تو آخر کوئی حکمت ہوگی اور وہ حکمت وہی ہے جو پہلی آیت میں بیان ہو چکی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام جس تمدّن کو قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد دوسروں سے نیک سلوک کرنے اور غرباء کی ترقی پر رکھی گئی ہے۔ لیکن سود کا روبار کرنے والے حسنِ سلوک کو جانتے ہی نہیں صرف روپیہ کی زیادتی اُن کے مدّ نظر ہوتی ہے خواہ دوسرے کا گلا گھونٹ کر کی جائے۔ پس چونکہ اس ذریعہ سے دوسروں سے نیک سلوک کرنے اور غرباء کو اُبھارنے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور جنگوں کا دروازہ کھل جاتا ہے اس لئے اسلام نے اس کی کلّی طور پر ممانعت فرما دی۔ لیکن مکان یا دوکان کا کرایہ ایک علیحدہ چیز ہے۔ کرایہ اِس لئے لیا جاتا ہے۔ کہ مکان یا دوکان کے گرنے کا امکان ہو سکتا ہے اور اُس کی مرمت کے لئے مالک مکان کے پاس کچھ نہ کچھ روپیہ ہونا ضروری ہے۔ اِسی طرح تجارت بھی ایک علیحدہ چیز ہے۔ کیونکہ تجارت میں ایک شخص اپنے مال کا دوسرے کے مال سے تبادلہ کرتا ہے۔ پس بیع اور ربٰو کو ایک چیز قرار دینا نادانی ہے۔

اِس کے بعد فرماتا ہے فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ جس شخص کے پاس اُس کے رب کی طرف سے کوئی نصیحت کی بات

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ط وَاللّٰهُ

اللہ سود کو مٹائیگا اور صدقوں کو بڑھائے گا۔ اور اللہ (تعالیٰ)

لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٧﴾

ہر بڑے کافر (اور) بڑے گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔ ۱۸۶

پہنچ جائے اور وہ اسے سُنکر اس کی خلاف ورزی سے باز آ جائے تو پھر ہمارا قانون یہ ہے کہ ہم اسکی سابقہ کوتاہیوں پر اُس سے کوئی باز پرس نہیں کرتے پس تم بھی ایسے لوگوں کا معاملہ حوالہ بخدا کیا کرو۔ اور اُن کی توبہ کو قبول کر لیا کرو۔ ہاں اگر کوئی شخص توبہ کے بعد پھر وہی کام کرنے لگ جائے تو ایسا شخص ضرور سزا کا مستحق ہوگا۔

یہاں اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ کہکر اس طرف اشارہ فرمایا کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ سود اور خرید و فروخت میں کوئی فرق نہیں مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ان میں کوئی فرق نہ ہوتا اور دونوں ایک جیسے ہوتے تو خدا تعالیٰ ان میں سے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام کیوں قرار دیتا اور پھر باز آنیوالوں کو معاف کیوں کرتا۔ اور جو معافی کے بعد دوبارہ سود لینا شروع کر دیں انہیں سزا کیوں دیتا۔ یہ بات بتاتی ہے کہ بیع اور ربٰوا ایک جیسے نہیں۔ ربٰوا کا لازمی نتیجہ آگ ہے خواہ وہ لڑائی کی صورت میں بھڑک اُٹھے یا فتنہ و فساد کے رنگ میں ظاہر ہو۔ مگر بیع کا یہ نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور پھر ربٰوا کا یہ نقصان عارضی نہیں بلکہ جب تک یہ لعنت دنیا پر مستولی رہے گی فتنہ و فساد کی آگ بھی بھڑکتی رہیگی۔ اسی کی طرف هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ترتیب و ربط:۔ چونکہ گذشتہ آیات میں خدا تعالےٰ کی راہ میں مال دینے کا ذکر تھا اس لئے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ کیوں نہ سود پر روپیہ دیا جائے تاکہ غرباء کا بھی کام چل جائے اور روپیہ دینے والے بھی شوق سے روپیہ دے دیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ سود لینے والوں کی حالت تو ایسی ہوتی ہے کہ گویا اُن کو جنون ہو گیا ہے۔ یعنی وہ خون چوسنے والی جونکیں بن جاتے ہیں۔ نہ اُن میں سوچنے اور سمجھنے کی قوت رہتی ہے اور نہ ہمدردی اور مواخات کا کوئی جذبہ ہوتا ہے۔ پھر سود سے انسان کاہل اور سست ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اتنی آمدنی تو ضرور ہو جائیگی کوئی اور کام کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن اسلام یہ چاہتا ہے کہ ہر انسان محنت کرے اور اپنے آپ کو ملک اور قوم کے لئے مفید وجود بنائے۔ اسی طرح صدقات کے بعد سود کا ذکر اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑنے کو تیار ہو جائیگا وہ بیگانہ مال یعنی سود بھی آسانی سے چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔

يَمْحَقُ

۱۸۶ حل لغات:۔ يَمْحَقُ: مَحَقَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں اَبْطَلَهٗ وَمَحَاهُ اُسے باطل کر دیا اور مٹا دیا۔ اور مَحَقَ فُلَانًا کے معنے ہیں اَهْلَكَهٗ۔ اُسے تباہ کر دیا۔ اور مَحَقَ اللّٰهُ الشَّيْءَ کے معنے ہیں نَقَصَهٗ وَذَهَبَ بِبَرَكَتِهٖ۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے کم کر دیا اور اُسکی برکت کو لیگیا

يُرْبِي

يُرْبِي: اَرْبَى الشَّيْءَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ يَرْبُوْا اللہ تعالیٰ نے اُسے بڑھا دیا۔ (اقرب)

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹائیگا اور صدقات کو بڑھائیگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ترقی عطا فرمائیگا جو سود سے پرہیز کرینگے اور صدقات پر

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ

جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اور مناسب حال عمل کرتے ہیں۔ اور نماز کو قائم رکھتے ہیں

وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ

اور زکوٰۃ دیتے ہیں اُن کے لئے اُن کے رب کے پاس یقیناً اُن کا اجر (محفوظ) ہے۔ اور انہیں نہ (تو)

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۲۷۸﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ ۱۸۷؎ اے ایماندارو!

اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۷۹﴾

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور اگر تم مومن ہو تو سود (کے حساب) میں سے جو کچھ باقی ہو اُسے چھوڑ دو۔

فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے (برپا ہونیوالی) جنگ کا یقین کر لو۔

نعرہ دیں گے۔ اس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب اسلام کی تعلیم اپنی مکمل صورت میں دنیا میں قائم کی جائیگی۔ اور ربٰوا جسے مال کو بڑھانے والا قرار دیا جاتا ہے وہ مٹا دیا جائے گا۔ اور صدقات جنہیں مال کو گھٹانے والا قرار دیا جاتا ہے اُن کی بے انتہا زیادتی ہوگی۔ گویا پُرانے نظام کو بدل کر ایک نیا نظام قائم کیا جائے گا۔ اور قرآن اور اسلام کی حکومت دنیا میں قائم کی جائے گی۔ اور یہ سب کچھ خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے وقوع میں آئیگا۔

۱۸۷؎ **تفسیر:** چونکہ پیچھے صدقات پر بہت زور دیا گیا ہے اس لئے ممکن تھا کہ کوئی شخص یہ خیال کر لیتا کہ صرف صدقہ دے دینا ہی کافی ہے اسی سے نجات ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا ہے کہ ترکِ ربٰوا اور صدقات کا دینا ہی کافی نہیں بلکہ ہر قسم کے اعمالِ صالحہ کی بجا آوری اور نمازوں کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ صرف ایک پہلو پر زور دے کر تم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

اس میں اُن لوگوں کی غلطی کا ازالہ بھی کیا گیا ہے جو سمجھتے ہیں کہ جنت میں جانے کے لئے صرف منہ سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ دینا کافی ہے۔ اعمالِ صالحہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ فرمایا۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ جب تک ایمان کے ساتھ عمل صالح اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ نہ ہو اور تعلق باللہ اور شفقت علیٰ خلق اللہ کے لحاظ سے تمہارے ایمان کی تکمیل نہ ہو اُس وقت تک تمہیں نجات میسّر نہیں آسکتی۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ

اور اگر تم (سود سے) توبہ کر لو تو (کوئی اتنا نقصان نہیں کیونکہ) تمہارا راس المال تمہارے لئے وصول کرنا جائز ہے (اس صورت میں)

وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ

نہ تم (کسی پر) ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم ہوگا۔ ۱۸۸ اور اگر (کوئی) مقروض تنگ حال ہوکر آئے تو آسودگی (حاصل ہونے) تک

اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

(اُسے) مہلت دینی ہوگی۔ اور اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو جان لو کہ تمہارا (اُس شخص کو راس المال بھی صدقہ کے طور پر دیدینا سب سے اچھا ہے)

۱۸۸ **حل لغات**:- فَاْذَنُوْا : اَذِنَ بِالشَّيْءِ کے معنے ہیں عَلِمَهٗ اُسے جان لیا۔ پس فَاْذَنُوْا کے معنے ہیں تم جان لو۔ یقین کر لو۔

رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ : رَاْسُ المال اُس اصل مال کو کہتے ہیں جس پر کوئی نفع نہ ہو۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ اَقْرَضَنِيْ عَشَرَةً بِرُءُوْسِهَا اَيْ قَرْضًا لَا رِبْحَ فِيْهِ فَيَرُدُّ عَلَيْهِ رَاْسَ الْمَالِ۔ یعنی اُس نے مجھے دس دینار بغیر اس کے کہ اُن پر کچھ اور نفع مقرر کرتا قرض دیئے۔ (اقرب)

تفسیر:- فرماتا ہے۔ اے مسلمانو! اگر تم نے سود کو نہ چھوڑا تو تم خدا اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ یہ ایک بہت بڑی تنبیہ ہے جو مسلمانوں کو کی گئی مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اِس حکم کی خلاف ورزی کی اور پھر اس کا خطرناک نتیجہ بھی انہوں نے دیکھا۔ اُن کی زمینیں اور جائیدادیں چھن کر دوسروں کے پاس چلی گئیں۔ اور وہ مفلس اور قلاّش ہو گئے بلکہ مسلمانوں کی گذشتہ دور میں جسقدر سلطنتیں تباہ ہوئیں اُن کی تباہی کی بڑی وجہ بھی یہی ہوئی۔ وہ اکثر سود لیکر یا سود دے کر ہی تباہ ہوئی ہیں۔ اگر انہوں نے سودی روپیہ لیا تو روپیہ دینے والی سلطنتوں نے اُنکے ملک میں آہستہ آہستہ اپنا تسلّط جمانا شروع کیا۔ کبھی ریلوں کا ٹھیکہ لیا۔ کبھی کانوں کو کفالت میں رکھا کبھی کسی اور چیز پر قبضہ کر لیا۔ اور آہستہ آہستہ تمام ملک پر چھا گئے۔ پھر اگر انہوں نے سود پر قرض دیا۔ تو جب کبھی سلطنتوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی تو وہ ارکانِ سلطنت جنہوں نے اپنا تمام سرمایہ غیروں کو سود پر دیا ہؤا تھا اپنے قرض داروں کے طرفدار ہو گئے تاکہ اُن کا روپیہ نہ مارا جائے۔ چنانچہ لکھنؤ اور اودھ والوں نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے کسی کو سود دیا نہیں بلکہ خود لینا چاہا اور بہت سا روپیہ انگریزی بنکوں میں جمع کرا دیا۔ جب لکھنؤ پر حملہ ہؤا تو بڑے بڑے رئیسوں کو انگریزوں نے کہلا بھیجا کہ اگر تم ذرا بھی مخالفت کروگے تو تمہارا تمام مال جو ہمارے بنکوں میں ہے ضبط کر لیا جائیگا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ سب لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور ایک شخص بھی نواب کی تائید میں نہ اُٹھا۔ ایک ڈاکو کے قتل پر بھی بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں لیکن لکھنؤ کے نواب کے قتل پر ایک شخص بھی انگریزوں کے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہؤا۔ غرض سیاسی طور پر سود کا لینا بھی مسلمانوں کے حق میں سخت نقصان دہ ثابت ہؤا۔

فَاْذَنُوْا

رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى

اور اُس دن سے کہ جس میں تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا ڈرو ۔ پھر ہر ایک شخص کو

کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے حکم کی صریح خلاف ورزی کی۔ یُوں تو دوسری حکومتیں بھی سود لیتی اور دیتی رہی ہیں مگر اُن کو اس سے وہ نقصان نہیں پہنچا جو مسلمانوں کو ہُوا۔ اِس کی ایک روحانی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کو اللہ تعالیٰ نے کلّی طور پر اِس طرح چھوڑ رکھا ہے جس طرح ایک باپ اپنے بچّہ کو عاق کر دیتا ہے اور اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن مسلمان اس بچہ کی طرح ہیں جس سے اُس کے ماں باپ کو پیار ہوتا ہے۔ پس مسلمان جب بھی احکامِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کریں گے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح تھپڑ پڑے گا جس طرح ایک باپ اپنے بچّہ کو تھپڑ مارتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنا تعلق منقطع کر لیگا اور دنیا میں اس کی اصلاح کے لئے اپنا ہاتھ نہیں بڑھائیگا۔ مگر مسلمانوں کی تو یہ حالت ہے کہ ایک طرف تو وہ بڑے زور سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اقرار کرتے ہیں اور دوسری طرف آپکے احکام کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اور یہ صورت ایسی ہے جس میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ اُن کی گرفت کے لئے بڑھتا ہے اور انہیں وقتاً فوقتاً فہمائش کرتا رہتا ہے۔ ورنہ محض کفر پر اس دنیا میں نہیں بلکہ اگلے جہان میں عذاب دیا جاتا ہے اور ایسا کافر جو کسی کو دُکھ نہیں دیتا اور اپنے خیال کی بنا پر اپنے مذہب پر عمل کرتا رہتا ہے۔ اُس سے یہاں کوئی پرسش نہیں کی جاتی۔ مگر وہ لوگ جو اسلام کو قبول کرتے ہوئے پھر بھی اسلام کے احکام پر عمل نہیں کرتے اُن کو یہاں بھی سزا دی جاتی ہے تاکہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اور اُن کا خدا تعالیٰ سے تعلق کُلّی طور پر منقطع نہ ہو۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوسری سلطنتوں پر بھی مختلف اوقات میں زوال آئے۔ مگر وہ زوال صرف سیاسی رنگ کے تھے۔ لیکن اسلامی سلطنتیں محض اس لئے تباہ ہوئیں کہ انہوں نے سود پر قرض لیا یا دیا۔ اور اس طرح اسلامی احکام کی خلاف ورزی کی۔

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص سود دے یا لے۔ اُس سے قومی طور پر بائیکاٹ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ باغی ہے۔ اور خدا تعالیٰ اور اس کے رسول کے ایک واضح حکم کی نافرمانی کرنے والا ہے۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ حکم صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے سود پر روپیہ دیا ہُوا تھا۔ مگر پھر انہوں نے توبہ کرلی۔ اللہ تعالیٰ انہیں فرماتا ہے کہ اگر آئندہ کے لئے تم اس فعل سے توبہ کر لو تو رأس المال وصول کرنا تمہارے لئے جائز ہے۔ گو ممکن ہے کہ اس عرصہ میں تم اصل مال سے بھی زیادہ سود لے چکے ہو۔

۳۸ ع ۶

كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۲﴾ يٰٓاَيُّهَا

جو کچھ اُس نے کمایا ہوگا پُورا (پُورا) دے دیا جائیگا۔ اور اُن پر (کوئی) ظلم نہیں کیا جائیگا ۱۸۹ اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

ایمان دارو! جب تم کسی دوسرے سے کسی مقررہ میعاد کے لئے قرض لو

فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ

تو اُسے لکھ لو۔ اور چاہیئے کہ کوئی لکھنے والا تمہارے درمیان (طے شدہ معاہدہ کو) انصاف کے ساتھ لکھ دے۔ اور

كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ

کوئی کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے کیونکہ اللہ نے اُسے (لکھنا) سکھایا ہے پس چاہیئے کہ وہ (ضرور) لکھے۔ اور تحریر وہ لکھوائے

الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ

جس کے ذمہ حق ہو۔ اور چاہیئے کہ وہ (لکھواتے وقت) اللہ کا جو اس کا رب ہے تقویٰ مدنظر رکھے اور اس میں سے کچھ (بھی)

شَيْــــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا

کم نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے نادان ہو یا کمزور ہو یا (خود)

اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ

لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو چاہیئے کہ (اس کی بجائے) اُس کا کارپرداز انصاف کے ساتھ (تحریر) لکھوائے

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا

اور تم اپنے مردوں میں سے (اس موقعہ پر) دو کو گواہ (مقرر) کر لیا کرو۔ ہاں اگر دونوں (گواہ)

۱۸۹ **حل لغات**:۔ اَلنَّظِرَۃُ کے معنے ہیں اَلتَّاخِيْرُ وَ الْاِمْهَالُ فِي الْاَمْرِ ۔ ادائیگی کے لئے مہلت دینا۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ آج اگر تم لوگوں سے حسن سلوک کروگے اور اپنے قرضوں کی وصولی میں نرمی سے کام لوگے تو یاد رکھو ایک دن تمہارا بھی حساب ہوگا اُس دن تم سے بھی اچھا سلوک کیا جائیگا اور تمہارے گناہوں سے درگذر کیا جائیگا لیکن اگر آج تم نیک سلوک نہیں کروگے تو اس دن تم سے بھی کوئی نیک سلوک نہیں کیا جائیگا۔ یہ وہی حکم ہے جسکی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے زمین میں رحم سے کام لو تاکہ آسمان پر تمہارا خدا بھی تم سے رحم کا سلوک کرے۔

اَلنَّظِرَۃُ

رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ

مرد نہ ہوں تو (موقعہ کے) گواہوں میں جن لوگوں کو (بطور گواہ) تم پسند کرتے ہو اُن میں سے ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنا لیا کرو)

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ

(دو عورتوں کی شرط اسلئے ہے) تا اُن میں سے ایک کے بھول جانے کی صورت میں دونوں میں (ہر) ایک دوسری کو (بات) یاد دلائے۔ اور جب گواہوں کو

الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا

بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اور (خواہ) چھوٹا (لین دین) ہو یا بڑا ہو تم اُسے اس کی میعاد سمیت لکھنے میں

اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ

سستی نہ کیا کرو۔ یہ بات اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والی ہے۔ اور شہادت کو زیادہ درست رکھنے والی ہے۔ نیز (تمہارے

وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا

لئے اس بات کو) قریب تر کر دینے والی ہے کہ تم شک میں نہ پڑو (پس لین دین کا لکھنا ضروری ہے) سوائے اس (صورت) کے کہ تجارت دست بدست ہو۔

بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا

جسے تم آپس میں (مال اور رقم) لے دے کر (اُسی وقت قصہ ختم کر) لیتے ہو۔ اس صورت میں اس (لین دین) کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور جب

تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا

باہم خرید و فروخت کرو تو گواہ بنا لیا کرو۔ اور (یہ امر یاد رہے کہ) نہ کاتب کو تکلیف دی جائے اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم (ایسا) کرو تو یہ (بات)

فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ

تم میں نافرمانی (کی علامت) ہوگی۔ اور چاہیئے کہ (تم) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور (اگر تم ایسا کرو گے تو) اللہ تمہیں علم دیگا۔

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۸۲)

اور اللہ (تعالیٰ) ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ ۱۹۰

۱۹۰ حل لغات :۔ تَدَايَنْتُمْ : تَدَايَنَ الْقَوْمُ ۔۔۔ کے ۔۔۔ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ۔ ایک دوسرے سے قرض لیا۔ (اقرب)

يُمْلِلْ : اَمْلَلْتُ الْكِتٰبَ عَلَى الْكَاتِبِ اِمْلَالًا وَ

تَدَايَنْتُمْ

يُمْلِلْ

أَمْلَيْتُهُ عَلَيْهِ إِمْلَاءً کے معنے ہیں أَلْقَيْتُهُ عَلَيْهِ أَيْ قُلْتُ لَهُ فَكَتَبَ عَنِّي۔ یعنی أَمْلَلْتُ الْكِتَابَ عَلَى الْكَاتِبِ کے یہ معنے ہیں کہ مَیں نے کاتب کو کچھ مضمون لکھوایا۔ جسے اُس نے لکھ لیا۔ پس یُمْلِلُ کے معنے ہیں لکھوائے۔ اِملاء بھی اِسی میں سے ہے۔ (اقرب)

سَفِيْهًا

سَفِيْهٌ کے معنے کم علم اور جاہل کے ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ نے مُسرف کے معنے کئے ہیں۔ اور مجھے بھی یہی پسند ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ۔ یعنی منافق کہتے ہیں ہم تو انکار کرکے اپنا مال بچاتے اور اسے محفوظ رکھتے ہیں۔ اِن کو کیا معلوم کہ مال کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے۔ یہ لوگ تو ایمان لاکر اپنا مال تباہ کرلیتے ہیں۔

تفسیر:- اوپر کی آیات میں قومی تباہی کا ایک بہت بڑا سبب اللہ تعالیٰ نے سود بتایا تھا۔ اب دوسرا سبب قومی تنزل کا یہ بتاتا ہے کہ لین دین کے معاملات میں احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ قرض دیتے وقت تو دوستی اور محبت کے خیال سے نہ واپسی کی کوئی میعاد مقرر کرائی جاتی ہے اور نہ اُسے ضبط تحریر میں لایا جاتا ہے۔ اور جب روپیہ واپس آتا دکھائی نہیں دیتا تو لڑائی جھگڑا شروع کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مقدمات تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اور تمام دوستی دشمنی میں تبدیل ہوکر رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپس کے تعلقات کو خراب مت کرو۔ اور قرض دیتے یا لیتے وقت ہماری ان دو ہدایات کو ملحوظ رکھو۔ اوّل یہ کہ جب تم کسی سے قرض لو تو اس قرض کی ادائیگی کا وقت مقرر کرلو۔ دوم روپیہ کا لین دین ضبطِ تحریر میں لے آؤ۔ اِس شرط کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اِس طرح مقروض کو احساس رہتا ہے کہ فلاں وقت سے پہلے پہلے مَیں نے قرض ادا کرنا ہے۔ اور وہ اُس کی ادائیگی کے لئے جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اور پھر ایک اور فائدہ یہ ہے کہ قرض لینے والا ایک معیّن میعاد تک اطمینان کی حالت میں رہتا ہے اور اُسے یہ خدشہ نہیں رہتا کہ نہ معلوم قرض دینے والا مجھ سے کب اپنے روپیہ کا مطالبہ کردے غرض اِس میں دینے والے کا بھی فائدہ ہے اور لینے والے کا بھی۔ قرض دینے والے کا فائدہ تو یہ ہے کہ مثلاً ایک مہینے کا وعدہ ہے تو وہ ایک مہینہ کے بعد جاکر طلب کریگا۔ یہ نہیں کہ اس کو روز روز پوچھنا پڑے۔ اور قرض لینے والے کا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ قرض لینے لگیگا تو سوچیگا کہ مَیں جتنے عرصے میں ادا کرنیکا [illegible] کرتا ہوں اتنے عرصہ میں ادا بھی کرسکونگا یا نہیں۔ اِس کے علاوہ یہ شرط اس لئے بھی عاید کی گئی ہے کہ بعض کمزور لوگ اعتراض کرسکتے تھے کہ ہم سود پر روپیہ اسلئے دیتے ہیں کہ قرض لینے والے کو اس کی ادائیگی کا فکر رہتا ہے۔ اور وہ کوشش کرتا ہے کہ جلد اس قرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔ لیکن اگر سود نہ لیا جائے تو اُسے ادائیگی کا احساس نہیں رہتا۔ اس وسوسہ کے ازالہ کیلئے فرمایا کہ جب تم ایک دوسرے کو قرض دو۔ تو معاہدہ لکھوا لیا کرو کہ فلاں وقت کے اندر اندر ادا کردونگا تاکہ تمہارا روپیہ بھی محفوظ رہے اور دوسرے شخص کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر قرض إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ہو تو لکھ لیا کرو اور اگر إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى نہ ہو تو بے شک نہ لکھو۔ اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی کو قرض دیتا ہے تو بہرحال ایک أَجَلٍ مُّسَمًّى کے لئے ہی دیتا ہے خواہ وہ میعاد تھوڑی ہو یا بہت۔ اِس کے بعد وہ اسے وصول کرنے کا حقدار ہوتا ہے۔ یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے دوسرے کو قرض دیا ہو اور پھر اس کے واپس لینے کا اس کے اندر کوئی احساس ہی نہ ہو۔ ہدیۃً یا

امداد کے رنگ میں اگر کسی کو کوئی رقم دی جائے تو وہ ایک علیحدہ امر ہے۔ لیکن جس چیز پر قرض کے لفظ کا اطلاق ہوگا۔ وہ بہرحال اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی ہی ہوگی۔ خواہ زبان سے کوئی میعاد مقرر کی جائے یا نہ کی جائے۔ ہاں اگر خاص وقت کے لئے قرض نہیں بلکہ یونہی ایک دو گھنٹہ کے لئے یا ایک دو دن کے لئے ہے تو ایسی صورت میں اگر نہ لکھا جائے تو کوئی شرعی گناہ نہیں۔

افسوس ہے کہ مسلمان ان دونوں باتوں کی پرواہ نہیں کرتے۔ یعنی نہ تو قرض دیتے وقت دوستی اور محبت کے نقطۂ نگاہ سے کوئی مدّت مقرر کرتے ہیں۔ بلکہ کہہ دیتے ہیں کہ جب جی چاہے دے دینا اور نہ اُسے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں جس کی وجہ سے بعد میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں اُس کے تلخ نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ۔ تیسرا حکم یہ دیا کہ لکھنے والا کوئی اور شخص ہو۔ قرض دینے والا یا لینے والا نہ لکھے بلکہ ایک غیر شخص ہو جو عدل اور انصاف کے ساتھ لکھے۔ یعنی اپنی طرف سے اس معاہدہ میں کوئی بات نہ ملائے بلکہ وہی کچھ لکھے جس کے لکھنے کا اُسے حکم دیا گیا ہے۔ پھر کاتب کو حکم دیا کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اُسے سکھایا ہے اُسی طرح اُسے چاہیئے کہ وہ لکھے یا یہ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے لکھنا سکھایا ہے وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ كَمَا عَلَّمَهُ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ جتنا ہنر اس کو حاصل ہو اُس کے مطابق لکھے۔ اور یہ بھی کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اُس پر فضل کیا ہے اُسے بھی چاہیئے کہ وہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ یہ نہ ہو کہ وہ انکار کر دے اور ضرورتمند قرض نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہو۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ۔ چوتھا حکم یہ دیا کہ جس کے ذمہ حق ہو وہ املاء کروائے۔ یعنی روپیہ لینے والے کو چاہیئے کہ وہ خود تحریر لکھوائے۔ اس میں ایک بہت بڑی حکمت ہے۔ بظاہر تو یہ چاہیئے تھا کہ روپیہ دینے والا لکھوائے۔ مگر یہ حکم نہیں دیا۔ بلکہ اسکی ذمہ واری قرض لینے والے پر رکھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ روپیہ لینے والے کی ضرورت روپیہ مل جانے کی وجہ سے پوری ہو جاتی ہے۔ وہ اس وقت اپنے اندر خوشی کی ایک لہر محسوس کرتا ہے اور روپیہ کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ بعد میں ضرورت پوری ہونے پر کہدے کہ مجھے تو اس وقت یہ خیال ہی نہ تھا کہ کیا لکھوا رہے ہیں۔ اس لئے اُسے کہا کہ وہ خود ہی لکھوائے۔ تا کہ اُس کی زبان کا اقرار موجود رہے ورنہ جس نے روپیہ دیا ہوتا ہے وہ تو چوکس ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس نے تو اپنے پاس سے رقم دی ہوئی ہوتی ہے۔ اسلئے اُس کو تو بہرحال یاد ہی رہتا ہے کہ میں نے اسقدر روپیہ دیا ہُوا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تحریر اُس کے پاس رہیگی جس نے روپیہ دیا ہے۔ پس اس کے لئے تو موقعہ ہے کہ دیکھ لے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ مگر لینے والے کے پاس تحریر نہیں رہتی اس لئے اگر اسوقت اُس کی پوری توجہ تحریر کی طرف نہ ہو تو اُسے نقصان پہنچنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا۔ یہ پانچواں حکم دیا کہ لکھواتے وقت وہ کوئی چیز اُس قرض میں سے کم نہ کرے بلکہ اُسے صحیح صحیح لکھوائے۔ اس میں بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرض میں تو کوئی کمی نہیں ہو سکتی کیونکہ دونوں فریق آمنے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ پھر لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا کا کیوں حکم دیا؟ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ بعض قرض عجیب عجیب شکل میں ہوتے ہیں۔ جن کو تحریر میں لاتے وقت لوگ ایسے پیچیدہ الفاظ لکھتے ہیں جن کا نتیجہ آخر میں کمی کی صورت

میں ظاہر ہوتا ہے خصوصاً وہ قرض جو لمبی میعاد کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں ۔ اور مختلف انواع کے ہوں اُن کو تحریر میں لاتے وقت کئی قسم کے دھوکے کئے جاتے ہیں جیسے حکومتوں کے قرض ہوتے ہیں ۔ چونکہ ایسے لمبے قرضوں میں عموماً معاہدہ کے وقت چالاکیاں اور فریب کئے جاتے ہیں اس لئے فرمایا کہ لکھوانے میں دیانت سے کام لو اور ایک حبّہ بھی کم کرنے کی کوشش نہ کرو ۔

فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۔ فرماتا ہے اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق ہے دماغی لحاظ سے اس قابل نہ ہو کہ مالی معاملات کی اہمیت کو سمجھ سکے یا کمزور ہو ۔ مثلاً بچہ ہو یا بہت بوڑھا ہو یا لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو ۔ مثلاً گونگا ہو یا پڑھا لکھا نہ ہو تو ایسی صورت میں اُس کی طرف سے ایک ولی مقرر ہونا چاہیئے جو تمام امور پورے عدل اور انصاف کے ساتھ ملکی قانون کے مطابق لکھوائے چونکہ پہلے یہ حکم دیا جا چکا تھا کہ قرض لینے والا لکھوائے اس لئے فرمایا کہ اگر وہ لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس صورت میں اس کا ولی اس ذمہ داری کو ادا کرے ۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۔ یہ ساتواں حکم دیا کہ اس کے لئے دو گواہ بھی مِنْ رِّجَالِكُمْ بنائے جائیں یعنی اپنے واقف آدمیوں میں سے جن پر تمہیں اعتماد ہو ۔ اور جنہیں ضرورت کے وقت تم آسانی سے بلا سکتے ہو ۔ کوئی غیر ملکی یا مسافر یا ناواقف آدمی نہ ہوں جن کی گواہی ضائع چلے جانے کا خطرہ ہو ۔ ورنہ تم انکو کہاں تلاش کروگے ۔ اسکے بعد جو مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ کے الفاظ آتے ہیں ان کا تعلق بھی وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ سے ہی ہے ۔ ورنہ یہ مطلب نہیں کہ اگر رجال پسند نہ ہوں تو عورتیں ہی گواہ مقرر کر لی جائیں ۔ اسجگہ تَرْضَوْنَ میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ گواہ ایسے ہونے چاہئیں جو فریقین کے پسندیدہ ہوں ۔ یعنی وہ گواہی دینے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں ۔ ایسے نہیں ہونے چاہئیں جنہیں شاہد عادل قرار نہ دیا جا سکے ۔

فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ ۔ یہ آٹھواں حکم دیا کہ اگر دو مرد نہ ملیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنا لیا کرو ۔ مگر گواہ انہیں کو بناؤ ۔ جن کو تم پسند کرو ۔ ایک مرد کی بجائے دو عورتیں رکھنے کی وجہ یہ بتائی کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے ۔ تو دوسری یاد دلا دے ۔ وہ بھول جائے تو یہ یاد دلائے ۔ چونکہ دونوں میں سے ہر ایک بھول سکتی اور ہر ایک یاد کرا سکتی ہے ۔ اسلئے لفظ مبہم رکھے ہیں اور اس لئے بھی کہ یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ کون بھولی ہے ۔ اس لئے فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک دوسری کو یاد دلا دے ۔ دراصل گھریلو جھگڑوں سے تعلق رکھنے والی باتوں کو تو عورت خوب یاد رکھتی ہے ۔ لیکن قضاء سے تعلق رکھنے والے امور کو اپنے ذہن میں زیادہ عمدگی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی ۔ اس لئے دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے ۔ اس آیت کی روشنی میں ایک واقعہ کی دو گواہ عورتوں کو بیک وقت قضاء میں بلایا جا سکتا ہے اور قاضی کے سامنے بھی اُن میں سے ایک عورت دوسری کو یاد دلا سکتی ہے کہ بہن یہ بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے ۔ گویا جس طرح مرد بعض باتوں کا سوچکر جواب دیتا ہے اسی طرح عورتیں بھی ایک دوسری کو یاد دلا کر جواب دے سکتی ہیں ۔ پھر جس بات پر وہ دونوں اتفاق کریں وہی اُن کی گواہی سمجھی جائیگی ۔

مرد کے مقابلہ میں دو عورتوں کی گواہی رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ ہر شخص جو کسی کام کا عادی ہوتا ہے وہ بہ نسبت دوسروں کے جو اس کام میں نہ پڑے ہوں زیادہ تجربہ کار ہوتا ہے ۔ مرد چونکہ لین دین کے معاملات اور مقدمات وغیرہ

میں اکثر حصہ لیتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ شہادت دینا کتنی بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ اس لئے وہ تمام واقعات کو احتیاط سے یاد رکھتے اور ہوشیاری سے اپنا بیان لکھواتے ہیں۔ لیکن عورتوں کا نہ تو لین دین کے معاملات میں زیادہ دخل ہوتا ہے اور نہ عدالتوں کی کارروائی سے وہ واقف ہوتی ہیں۔ ان کا دائرہ عمل صرف گھریلو زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ کسی بات کو وہ پورے طور پر یاد نہ رکھ سکیں۔ اس احتیاط کے پیش نظر ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کی گواہی مقرر کی گئی ہے۔

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ یہ مِنْ رِّجَالِكُمْ کا بدل ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ کی صفت ہے۔ لیکن ابوحیان کا قول ہے کہ یہ اِسْتَشْهِدُوْا سے متعلق ہے۔ اور یہی درست ہے۔ یعنی اسجگہ اہلیت اور پسندیدگی کی شرط مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ہے۔ صرف مردوں یا صرف عورتوں کے لئے نہیں۔

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا۔ یہ نواں حکم دیا کہ جب گواہوں کو گواہی کے لئے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں اور خواہ کسی فریق کی ناراضگی کا ہی خطرہ ہو پھر بھی سچی سچی بات بیان کردیں۔

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ اسجگہ اَجَل کو اَجَلِهٖ لیکر پھر پہلے حکم کو دہرا دیا ہے جس کا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى میں ذکر کیا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر میعادی قرضہ کو نہ لکھو یا صرف مدت کی مقدار لکھ لو اور قرض کو مبہم رہنے دو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرض بھی لکھ لو اور مدت بھی مقرر کرلو۔ چونکہ اِلٰی کے ایک معنے مَعَ کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ مدت کو بھی ساتھ ہی لکھ لیا کرو۔ گویا قرض اس کی ادائیگی کی میعاد اور شہادت سب باتوں کو اکٹھا لکھو۔ تاکہ دوسرے کو خیانت کا موقعہ ہی نہ ملے۔

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ فرماتا ہے۔ یہ بات انصاف کو قائم کرنے والی اور شہادت کو درست رکھنے والی ہے۔ اگر یہ قانون نہ رکھا جاتا تو نہ تو انصاف قائم ہوسکتا اور نہ ہی شہادت درست رہ سکتی۔

وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا۔ اس میں بتایا کہ اس قانون کی اتباع کا نتیجہ یہ نکلیگا کہ تم دوسرے کی دیانت اور امانت کے متعلق مختلف قسم کے وساوس اور شبہات سے محفوظ رہوگے۔ اور اپنے روپیہ کے متعلق بھی تمہیں اطمینان رہیگا کہ وہ ضائع نہیں ہوسکتا۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ۔ فرماتا ہے کہ ہم اس قانون میں ایک استثنیٰ کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر ایسی تجارت ہو جو آمنے سامنے کی اور دست بدست ہو جسے تم اِدھر اُدھر پھرا دیتے ہو تو ایسی صورت میں اگر تم اسے تحریر میں نہ لاؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ وہ دین نہیں۔ گویا اگر حاضر تجارت ہو اور ایک تاجر دوسرے تاجر کو کہدے کہ میرا مال فلاں گودام میں پڑا ہوا ہے میں ابھی جاکر لے آتا ہوں آپ مجھے اتنا روپیہ دے دیں تو ایسی صورت میں کسی تحریر کے بغیر بھی دوسرے کو روپیہ دے دینے میں کوئی حرج نہیں۔ تاجروں کو ایسے معاملات روزانہ پیش آتے رہتے ہیں۔ گو لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجارت کے وقت لین دین کو نہ لکھنا گناہ تو نہیں لیکن اچھا یہ ہے کہ اس میں بھی رسید کاٹی جائے۔ جیسا کہ انگریزی فرموں اور تاجروں میں یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز ان سے خریدی جائے تو ساتھ ہی وہ رسید بھی لکھدیتے ہیں۔ اس سے کئی جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا

اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (اس کا قائم مقام)

فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

رہن باقبضہ ہے - پس اگر تم میں سے کوئی شخص کسی (دوسرے) کو امین جانے (اور اُسے کچھ رقم دیدے)

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ

تو جسے امین سمجھا گیا ہو اُسے چاہیئے کہ اُسکی (یعنی امانت رکھنے والے کی) امانت کو (عند الطلب) واپس کرے اور اپنی ربوبیت

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ

کرنیوالے اللہ کا تقویٰ اختیار کرے - اور تم گواہی کو (کبھی) مت چھپاؤ - اور جو اُسے چھپائے وہ یقیناً ایسا (شخص) ہے

اور کسی جیتی یا چوری وغیرہ کا الزام عاید نہیں ہو سکتا - بہرحال اسجگہ تجارتِ سلم اور تجارتِ نقد کا ذکر کیا گیا ہے - تجارتِ سلم کی صورت میں مال اور مدت کی تعیین لازمی قرار دی گئی ہے اور اس کا لکھنا فرض کیا گیا ہے - اسی طرح اس خرید کی صورت میں بھی کہ مال لے لیا جائے اور رقم کی ادائیگی کا آئندہ وعدہ ہو - لیکن جب نقد سودا ہو کہ مال لے لیا اور قیمت دے دی تو لکھنا فرض نہیں رکھا گیا - گو عبارت سے ظاہر ہے کہ اس صورت میں بھی پسندیدہ یہی ہے کہ تحریر دی جائے - ہاں جب تحریر نہ ہو تو گواہ مقرر کرلے - جیسا کہ وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ سے ظاہر ہے تاکہ بعد میں دو کاندار چوری وغیرہ کا الزام نہ لگا دے - اور کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ - فرمایا - گواہ اور کاتب کو خرچ دیئے بغیر عدالتوں میں بلانا اُن کے لئے نقصان کا موجب ہے - اس لئے انکو خرچ دینا تمہارے لئے ضروری ہے - یہ لین دین کے سلسلہ میں گیارھواں حکم دیا کہ معاہدہ لکھنے والے اور گواہوں کو خرچ دو - اور انکو تکلیف میں نہ ڈالو - اگر ایک کاتب جس کا کام یہ ہے کہ وہ اُجرت پر لکھتا ہے - اُسے مجبور کیا جائے کہ وہ بلا اُجرت کوئی مضمون لکھ کر دے تو یہ اُس پر ظلم ہوگا یا مثلاً کوئی شخص اگر کسی اور بڑی ذمہ داری کے کام پر جا رہا ہو تو ایسے شخص کو مجبور کرنا کہ وہی لکھے - یا بلا خرچ آکر گواہی دے اُس پر ظلم ہے -

وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ فرماتا ہے اگر تم ان کو دق کرو گے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم ہمارے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہو - اور اطاعت کا جُوا اپنی گردن سے اُتارتے ہو بِكُمْ کے معنے فِيْكُمْ کے ہیں - یعنی یہ بات تمہارے اندر فسق اور خروج عن الطاعۃ کی رُوح پیدا کرنے والی ہوگی -

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ - فرماتا ہے - یہ تمدنی احکام ہیں جن پر تمہارے معاشرہ کی ترقی کا انحصار ہے - اس لئے انکو ہمیشہ مدنظر رکھو - اور اس بات کو سمجھ لو کہ تم

۳۹ ع ۷

اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (۲۸۴) ع

جس کا دل گنہگار ہے۔ اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ ۱۹۱

جتنا تقویٰ اختیار کروگے اللہ تعالےٰ تمہارے کاروبار میں اُتنی ہی برکت ڈالے گا اور تمہیں اپنے علم سے حصّہ عطا فرمائیگا۔ کیونکہ ترقی کی کوئی راہ اس سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ہر چیز کو خوب جانتا اور سمجھتا ہے۔

رِهٰنٌ

۱۹۱ حل لغات:۔ رِهٰنٌ مصدر بھی ہے۔ اور رِهْنٌ کی جمع بھی۔ اور الرَّهْنُ کے معنے ہیں۔ مَا وُضِعَ وَثِيْقَةً لِلدَّيْنِ۔ وہ چیز جسے قرضہ حاصل کرنے کے لئے بطور ضمانت رکھا جائے۔ وَقِيْلَ الرَّهْنُ لُغَةً اَلْحَبْسُ مُطْلَقًا وَكَثِيْرًا مَّا يُطْلَقُ عَلَى الشَّيْءِ الْمَرْهُوْنِ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رھن کا لفظ مطلق حبس پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر استعمال اس چیز پر ہوتا ہے جسے قرض کے لئے گرو رکھا جائے (اقرب)

اُؤْتُمِنَ

اُؤْتُمِنَ: اِئْتَمَنَهٗ کے معنے ہیں عَدَّهٗ اَمِيْنًا اَوِ اتَّخَذَهٗ اَمِيْنًا اسے امین سمجھا یا امین بنا لیا۔

اِنَّهٗ میں ضمیر شان استعمال ہوئی ہے۔ اور اس کے معنے ہیں "بات یہ ہے"۔

تفسیر:۔ فرماتا ہے۔ اگر تم سفر پر ہو۔ اور تمہیں کوئی کاتب اور وثیقہ نویس نہ ملے تو اس کا قائم مقام رہن باقبضہ ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ تم اپنی کوئی چیز قرض دینے والے کے پاس بطور رہن رکھوا دو۔ تاکہ اُسے اپنے روپیہ کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ رہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام قرض کے معاملہ میں کتنی احتیاط اور دوراندیشی سے کام لینے کی ہدایت دیتا ہے۔ اور کس طرح قدم قدم پر مومنوں کے اموال اور اُن کے ایمان کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر ان قواعد کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص قرض کا انکار کر دے اور اس طرح دوسرے کو مالی لحاظ سے اور اُسے خود ایمانی لحاظ سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔ اسلام اس قسم کے خدشات کا علاج یہ بتاتا ہے کہ قرض کے معاملہ کو اوّل ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ ضبط تحریر میں لاؤ جس پر گواہوں کی گواہی بھی ثبت ہو۔ دوم اگر باقاعدہ تحریر کا کوئی انتظام نہ ہو سکے جیسا کہ سفر کی حالت ہے تو رہن باقبضہ کی صورت میں قرض دیدو۔ یوں تو حضر میں بھی رہن رکھنا جائز ہے بلکہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ قرض لیا اور اپنی زرہ رہن رکھدی۔ لیکن سفر کا خصوصیت سے اسلئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی اور انتظام نہ ہوسکنے کی دِقت موجود ہوتی ہے۔

اس کے بعد نصیحت کرتے ہوئے فرماتا ہے فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ۔ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کے متعلق مطمئن ہو اور اُسے بلا رہن روپیہ دے دے تو وہ شخص جسے روپیہ دیا گیا ہے اور جسے امین جانا گیا ہے اُس کا فرض ہے کہ دوسرے کے مطالبہ پر روپیہ بلا حجت واپس کر دے۔ اور اللہ تعالےٰ کا تقویٰ اختیار کرے۔ اسجگہ قرض کو امانت قرار دیا گیا ہے جس میں یہ حکمت ہے کہ دنیا میں عام طور پر امانت کی ادائیگی تو ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن قرض کی ادائیگی میں ناواجب تساہل اور غفلت سے کام لیا جاتا ہے اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرض بھی ایک امانت ہی کی قسم ہے۔ کیا فرق اس وجہ سے

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا

اللہ ہی کا ہے۔ اور جو کچھ (بھی) آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ اور جو کچھ تمہارے

مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ

دلوں میں ہے خواہ تم اُسے ظاہر کرو یا اُسے چھپائے رکھو اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

پھر جسے چاہیگا بخشدیگا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔

کہ اس کے استعمال کی تم کو اجازت دی جاتی ہے اور تم پر احسان کیا جاتا ہے۔ تم اس کی ادائیگی میں سُستی کرسکتے ہو۔ آخر امانت اور قرض میں کیا فرق ہے؟ یہی کہ امانت ایسی حالت میں رکھوائی جاتی ہے جبکہ امین کو ضرورت نہیں ہوتی۔ اور قرض اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ اُسے ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں قرض لینے والے پر دوسرے کا احسان ہوتا ہے۔ اور اُس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ وقت پر خندہ پیشانی سے قرض ادا کردے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے ہر قسم کی امانتوں کی حفاظت اور اُن کی بروقت واپسی کا بھی ایک عام سبق ملتا ہے جس کی طرف قرآن کریم کی ایک دوسری آیت وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (سورۃ مومنون آیت ۹) میں بھی اشارہ کیا گیا ہے اور نصیحت فرمائی ہے کہ تمدنی معاملات کی ایک اہم شاخ دوسرے کے پاس امانت رکھوانا بھی ہے۔ پس نہ صرف قرض کے معاملات میں بلکہ امانت کے معاملہ میں بھی تمہیں تقویٰ اللہ سے کام لینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ امانت لینے والا آئے اور تم واپسی میں پس وپیش کرنے لگ جاؤ۔

پھر ایک اور نصیحت کرتا ہے۔ فرماتا ہے وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ تم آپس کے لین دین کے معاملات میں ہمیشہ سچی بات کیا کرو۔ اور کبھی کسی گواہی کو چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ تمہارا دل گنہگار ہو جائے گا۔ اور جب دل گندہ ہو گیا تو تم میں نورِ ایمان کہاں باقی رہیگا۔ اس آیت میں صرف گواہوں کی تخصیص نہیں کی گئی بلکہ وہ تمام افراد جو کسی معاملہ میں شریک ہوں ان سب کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو جھوٹ بولنا یا جھوٹی گواہی دینا تو الگ رہا سچی گواہی کو بھی چھپانے کی کوشش کرے۔ ورنہ تم دنیوی فائدہ تو ممکن ہے حاصل کرلو لیکن تم سے نیکیوں کی توفیق چھین لی جائیگی اور تمہارا دل سیاہ ہو جائے گا۔

غرض تمدنی مشکلات کے حل کے لئے اسلام نے ان آیات میں نہایت جامع ہدایات دی ہیں۔ اگر مسلمان ان احکام پر عمل کریں تو وہ کئی قسم کے جھگڑوں اور فسادات سے بچ سکتے ہیں۔

وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۸۵)

اور اللہ ہر ایک چیز پر بڑا قادر ہے۔ ۱۹۲ھ

۱۹۲ھ تفسیر:- وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ یعنی پہلے تو یہ کہا گیا تھا کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اگر تم اُسے ظاہر کرو یعنی اس کے مطابق عمل کرو تب بھی اور اگر تم اس کو چھپاؤ یعنی صرف دل کے خیالات تک ہی محدود رکھو تمہارے جوارح اس کے مطابق کوئی عمل نہ کریں تب بھی اللہ تعالیٰ اس کے متعلق تم سے حساب لیگا۔ لیکن پھر کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اور چونکہ دل کے خیالات کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے اس لئے وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ والی آیت منسوخ ہوگئی مگر ان کا یہ خیال درست نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ حالات کے تغیر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے نہ کہ دل کے خیالات کے ساتھ۔ مثلاً اسلام میں پہلے گدھے کا گوشت کھانے کی اجازت تھی مگر بعد میں اس سے روک دیا گیا۔ لیکن صحابہؓ کے دل کی حالت تو پہلے بھی ویسی ہی تھی جیسے بعد میں تھی۔ یعنی جس طرح پہلے وہ اپنے دل کے خیالات پر کوئی قابو نہیں رکھتے تھے اسی طرح بعد میں بھی نہیں رکھتے تھے۔ پس دل کے خیالات کے متعلق نسخ کے کوئی معنے ہی نہیں ہیں۔ منسوخ تو وہ احکام ہوتے ہیں جو تبدیلیٔ حالات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ امر تو تبدیلی پذیر ہے ہی نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے اس آیت کو سمجھا ہی نہیں۔ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ انسان کے دل میں جو خیال بھی آ جائے اُس کے حساب لینے کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس آیت میں اُن امور کا ذکر ہے جن کو انسان اپنے نفس میں چھپا کر رکھتا ہے۔ آنی خیالات تو بخشے جائیں گے۔ لیکن ایک غلط عقیدہ بُغض۔ حسد اور بُخل وغیرہ کے خیالات سب دل میں ہی ہوتے ہیں اگر اُن کو بھی بخش دیا جائے تو پھر ایمان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔ پس اس جگہ تُخْفُوْهُ سے مراد حسد کینہ اور بُغض وغیرہ ہے جو دل میں رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح اس سے ایسے خیالات مراد ہیں جن کو انسان اپنے دل میں قائم رکھتا ہے اور جن کو عمل میں لانے کی نیّت کر لیتا ہے۔ لیکن اگر ایک خیال آئے اور انسان اُسے اپنے دل سے فوراً نکال دے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ ایک نیکی ہے جس میں اُس نے حصّہ لیا۔ پس محض دل کے خیالات قابلِ مؤاخذہ نہیں جبتک کہ اُن پر عمل نہ کیا جائے یا اُن کو پختگی سے قائم نہ کر لیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ مَا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَتَكَلَّمْ اَوْ تَعْجَلْ بِهٖ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے میری امت کے اُن خیالات سے درگذر فرما دیا ہے جو اُن کے دلوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ان کو زبان پر نہ لائیں اور نہ اُن پر جلدی سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔

پس اس آیت میں اُن خیالات کا ذکر کیا گیا ہے جن کو انسان اپنے دل میں چھپا کر رکھتا ہے۔ اور جن کے متعلق سکیمیں سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ وقتی اور آنی خیالات کا اِس میں کوئی ذکر نہیں اور نہ اُن پر کوئی گرفت ہے۔

ہاں غلط عقائد اور بغض اور حسد اور کینہ وغیرہ بھی اگر بغیر توبہ کے بخشدیئے جائیں تو پھر ایمان کی کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی اس لئے ان پر مؤاخذہ کیا جائیگا۔ کیونکہ یہی تمام گناہوں کی جڑھ ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (بقرۃ آیت ۲۲۶) یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں سے لغو قسموں پر تم سے کوئی مؤاخذہ نہیں کریگا ہاں جو گناہ تمہارے دلوں نے بالارادہ کمایا ہے اس پر تم سے مؤاخذہ کرے گا۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل آیت ۳۷) یعنی کان آنکھ اور دل سب کے متعلق انسان سے سوال کیا جائیگا یعنی کان آنکھ کے گناہوں کے علاوہ ان خیالات کا بھی جائزہ لیا جائیگا جو مستقل طور پر کسی انسان کے دل میں پیدا ہوتے رہے۔ اسی طرح فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (نور آیت ۲۰) یعنی وہ لوگ جو چاہتے ہیں کہ مومنوں میں بدی پھیل جائے۔ ان کے لئے بڑا دردناک عذاب مقدر ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اور تم نہیں جانتے۔ اس آیت میں بھی ان لوگوں کا کوئی عمل بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے دل کی حالت بیان کرکے سزا تجویز کی گئی ہے۔ پس وہ خیالات جن کو انسان اپنے دل میں قائم رکھے اور ان کے متعلق سوچتا اور غور کرتا رہے خواہ ان کو عمل میں نہ لاسکے قابلِ سزا ہیں مگر وہ ناپاک خیالات جو دل میں آئیں اور انسان بائیں طرف تھوک کر اور استغفار اور لاحول پڑھ کر ان کو دل سے نکال دے۔ ان پر کوئی گرفت نہیں۔ اسی طرح اوپر کے رکوع میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ (بقرہ آیت ۲۸۴) یعنی تم سچی گواہی کو مت چھپاؤ اور یاد رکھو کہ جو شخص سچی گواہی کو چھپاتا ہے وہ یقیناً ایسا ہے جس کا دل گنہگار ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ اِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا سَيِّئَةً وَاِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوْهَا حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا عَشْرًا یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کو یہ حکم دے دیا ہے کہ جب میرا بندہ کسی بدی کا ارادہ کرے تو اسے مت لکھو ہاں اگر اس ارادہ کے مطابق عمل بھی کرلے تو ایک بدی اس کے نامہ اعمال میں درج کردو۔ لیکن اگر وہ کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کی ایک نیکی لکھو۔ اور اگر اس نیکی پر عمل کرلے تو پھر دس نیکیاں لکھو۔

ان آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خیالات تین قسم کے ہیں۔ اول۔ ایک وسوسہ یا خیال اٹھا اور خود بخود چلا گیا۔ اس کا نہ تو ثواب ہے نہ عذاب۔ دوم۔ ایک بدعقیدہ دل میں پیدا ہوا یا ایک بدکام کی تحریک دل میں پیدا ہوئی اور اس نے اس کو رد کردیا۔ چونکہ بدی کا مقابلہ نیکی ہے اس کو ایک نیکی کا ثواب ملیگا۔ سوم۔ اگر اس نے اس کو باہر نہ نکالا اور اپنا مال سمجھ کر دل میں رکھ لیا۔ تو اس کو ایک بدی کا گناہ ہوگا۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ سخت گھبرائے اور انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم نماز اور روزہ اور جہاد اور صدقہ وغیرہ

احکام پر تو عمل کر سکتے ہیں مگر اس آیت میں ایک تو ایسا حکم نازل ہؤا ہے جس پر عمل کرنے کی ہم میں طاقت ہی نہیں۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْا كَمَا قَالَ اَهْلُ الْكِتٰبِ مِنْ قَبْلِكُمْ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا بَلْ قُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ فَلَمَّا اقْتَرَاَهَا الْقَوْمُ وَذَلَّتْ بِهَا اَلْسِنَتُهُمْ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْ اَثَرِهَا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (مسلم) یعنی کیا تم چاہتے ہو کہ تم وہی کہو جو اہلِ کتاب نے تم سے پہلے کہا تھا کہ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا۔ تمہارا فرض تو یہ ہے کہ تم کہو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ جب صحابہؓ نے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ کہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور انہوں نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔ اور اُس کی مغفرت اور رحم کے طلبگار ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اظہار خوشنودی کے طور پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر صحابہ کرامؓ نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کرلی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعریف کی۔ پھر یہ آیت منسوخ کس طرح ہو سکتی ہے نسخ تو کسی عمل کا ہوتا ہے اور یہاں کسی عمل کا ذکر نہیں۔ پس یہ بالکل غلط ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس آیت میں تزکیۂ نفس کے لئے خیالات کی پاکیزگی بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ بے شک خیالات کو کلی طور پر پاک رکھنا تو ہر انسان کے لئے ناممکن ہے لیکن اگر کوئی بُرا خیال پیدا ہو تو اُسے اپنے دل سے نکال دینا تو ہر انسان کے لئے ممکن ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال آئے کہ میں رشوت لوں تو وہ اُسکے متعلق سوچنا اور مختلف قسم کی تدابیر میں لانا شروع نہ کرے بلکہ جہاں تک ہو سکے اس خیال کو فوراً اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کرے ورنہ اس کا نقش مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔ اور پھر اس خیال کا مٹانا سخت مشکل ہو جائیگا۔ اسی طرح اگر کوئی چلتے چلتے کہیں مال دیکھتا ہے اور اُس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ میں اِسے اُٹھا لوں تو صرف اس خیال کے آنے پر اُس سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ ہاں اگر اس خیال کے آنے پر وہ سوچنا شروع کردے کہ میں کس طرح اِس مال کو اٹھاؤں اور کس وقت اٹھاؤں تو اس کا یہ سوچنا اور تدبیریں کرنا قابلِ مؤاخذہ ہوگا۔

غرض وہ خیال جو دل میں گڑ جاتا ہے اور جس کو سوچنے میں انسان لگ جاتا اور تدبیریں شروع کر دیتا ہے اس کا محاسبہ ہوگا۔ ورنہ اگر کسی کو خیال آئے کہ میں چوری کروں۔ اور وہ اُسے فوراً . . . اپنے دل سے نکال دے تو وہ ایک نیکی کرتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو قتل کرنیکا خیال آئے لیکن وہ اسے اپنے دل سے نکال دے تو وہ نیکی کرنے والا سمجھا جائیگا۔ سزا کا مستحق وہ اُسی حالت میں ہوتا ہے جب وہ اِس خیال پر قائم رہتا ہے۔ غرض تزکیۂ نفس کی بنیاد انسانی قلب کی صفائی پر ہے۔ اور اس کی اہمیت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک اور جگہ بھی بیان فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ۔ یعنی انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ تندرست ہوتا ہے تو سارا جسم تندرست ہوتا ہے۔ اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ غور کے ساتھ سُنو کہ وہ گوشت کا ٹکڑا دِل ہے۔

پس اسلام میں پاکیزگی اس کا نام نہیں کہ صرف زبان پر اچھی باتیں ہوں۔ یا اعمال تو اچھے ہوں اور دل میں بُرائی ہو۔ بلکہ اسلام میں اصل پاکیزگی دل کی سمجھی جاتی ہے جو انسان اپنے دل کے لحاظ سے پاکیزہ نہیں وہ خدا تعالیٰ

کے نزدیک ہرگز پاک نہیں۔ ایک شخص اگر قطعاً کوئی گناہ نہ کرے۔ مگر اس کے دل میں گناہ اور بُرائی سے اُلفت ہو اور گناہ کے ذکر میں اُسے لذّت محسوس ہو تو وہ نیک اور پاک نہیں کہلائے گا۔ جب تک کہ اس کے دل میں بھی یہ بات نہ ہو کہ اُسے گناہوں میں ملوّث نہیں ہونا چاہیئے اسی طرح کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ عادت کے ماتحت انہیں غصّہ آجاتا ہے مگر گالی نہیں دیتے لیکن اُن کا دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ فلاں انسان بڑا بدمعاش اور شریر ہے ایسے لوگوں کے متعلق ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ پاکیزہ ہیں بلکہ یہ کہیں گے کہ وہ اپنے گند کو چھپائے بیٹھے ہیں۔ پس اسلام میں پاکیزگی دل کی ہے۔ اعمال اور زبان تو آلات اور ذرائع ہیں جن سے پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالےٰ نے یہاں فرمایا ہے کہ دل کی حالت بھی محاسبہ کے نیچے آتی ہے۔ خواہ تم اپنے دل کی حالت کو چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ یہاں خدا تعالیٰ نے کیا عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے کہ زبان اور اعمال تو دلی حالت کا اظہار کرتے ہیں اصل چیز دل کی حالت ہے اور خدا تعالیٰ اس کا محاسبہ کریگا۔ پس فرماتا ہے کہ تم اپنی دلی حالت کو ظاہر کرو یا چھپاؤ یعنی تم گندے اعمال نہ کرو یا زبان سے ظاہر نہ کرو مگر تمہارے دل میں گند ہے تو ضرور پکڑے جاؤگے۔

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ میں باء کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنے ذریعہ اور سبب کے ہو سکتے ہیں اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ اسکے ذریعہ تم سے حساب لے گا یعنی تمہارے اعمال کی بنیاد دل پر رکھی جائیگی۔ صرف ظاہری اعمال کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ دل کی حالت کو بھی مدِّنظر رکھا جائیگا۔ اور تمہاری نیتوں کو بھی دیکھا جائیگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔ یعنی اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے پس اعمال کے ساتھ دل کی نیّت کو بھی مدِّنظر رکھا جائیگا۔ (۲) دوسرے معنے اس کے فِیْ کے ہو سکتے ہیں یعنی "اس کے بارے میں"۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں آتا ہے کہ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (سورۃ بقرۃ آیت ۲۲۶) (۳) تیسرے معنے اس کے عَلٰی کے ہو سکتے ہیں۔ یعنی اس جرم پر اللہ تعالیٰ تم سے حساب لے گا۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ میں بتایا کہ جیسی جیسی انسان کی نیّت ہوگی ویسی ہی اُس کی جزا ہوگی۔ سزا کے مستحق سزا پائیں گے اور جو مغفرت کے مستحق ہونگے اللہ تعالےٰ انہیں اپنے دامنِ مغفرت میں لے لیگا۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چار عظیم الشان کاموں کا ذکر کیا گیا تھا۔ اوّل۔ تلاوتِ آیات۔ دوم تعلیم کتاب۔ سوم تعلیم حکمت چہارم۔ تزکیہ نفوس۔ آپؐ کے ابتدائی تین کاموں پر اس سورۃ میں تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب صرف يُزَكِّيْهِمْ کے وعدہ کا ایفاء باقی تھا۔ سو اس رکوع میں اس شق پر بھی روشنی ڈال دی۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تزکیہ نفوس کا کام کسی انسان کے بس کا نہیں۔ آخر والدین سے زیادہ محبت کرنیوالا اور کون وجود ہو سکتا ہے مگر وہ بھی اپنی اولاد کا تزکیہ نفس نہیں کر سکتے۔ تزکیہ میں دو باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ اوّل ترک گناہ۔ دوم روحانیت میں ترقی۔ ترک گناہ کے لحاظ سے فرمایا کہ ہم تم کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور آسمان و زمین اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ سب اللہ تعالےٰ کے ماتحت ہے۔ پس جس چیز کے لینے کی وہ اجازت دے صرف وہی تم لو اور جس سے منع کرے اُس سے رُک جاؤ۔ کیونکہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو استعمال کرنے والا مستوجب سزا قرار پاتا ہے۔ دوسری شق روحانیت میں ترقی کرنا تھا۔ اس کے لئے

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ

جو کچھ بھی اِس رسول پر اس کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر وہ (خود بھی) ایمان رکھتا ہے اور (دوسرے) مومن بھی (ایمان رکھتے ہیں)

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ

یہ سب (کے سب) اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں کہ) کہ ہم اُسکے

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ

رسولوں میں سے ایک (دوسرے) کے درمیان (کوئی) فرق نہیں کرتے اور (یہ بھی) کہتے ہیں کہ ہم نے (اللہ کا حکم) سُن لیا ہے

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۶﴾

اور ہم اس کے (دل سے) فرمانبردار ہو چکے ہیں۔ (یہ لوگ دعائیں کرتے ہیں کہ) اے ہمارے رب ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹنا ہے ۱۹۳

فرمایا کہ سب کچھ ہمارا ہے۔ اور ہمارے ہی ذریعے سے ہر قسم کی خیر و برکت مل سکتی ہے۔ اس لئے جب تم ہمارے حکموں کی اطاعت کرو گے تو ہم تم کو اپنی مغفرت کے دامن میں لے لیں گے۔ اور ہمارا قادرانہ تصرّف تمہیں ہمارے قرب میں پہنچا دے گا۔

۱۹۳ تفسیر:- اِس آیت میں تزکیۂ نفوس کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ پر، اس کے ملائکہ پر۔ اس کی کتابوں پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانا مومن کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ جب تک عقیدہ اور عمل دونوں کی اصلاح نہ ہو انسان اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ اتنی واضح آیت کے باوجود بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ نجات کے لئے صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آنا کافی ہے۔ اس کے رسولوں اور کتابوں وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ اِسی قسم کے خیالات ڈاکٹر عبدالحکیم پٹیالوی کے بھی تھے۔ اور انہی خیالات کی وجہ سے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُسے اخراج از جماعت کی سزا دی اور بڑے زور سے تحریر فرمایا کہ یہ عقیدہ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ اسلام تمام رسولوں پر اور بالخصوص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا نجات کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کسی ایک رسول کا انکار بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مورد بنا دیتا ہے۔ پس خواہ کوئی نبی تشریعی ہو یا غیر تشریعی پہلے زمانہ میں آچکا ہو یا آئندہ زمانہ میں آئے ہر ایک کا ماننا ضروری ہے۔ بیشک مدارج کے لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہے۔ جس مقام پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اُس مقام پر نہ موسیٰ علیہ السلام ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام اور نہ کوئی اور نبی۔ مگر جہاں تک نفسِ ایمان کا سوال ہے جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اِسی طرح بغیر کسی فرق کے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور اس لحاظ سے انبیاء میں کسی قسم کی تفریق پیدا کرنا جائز نہیں۔ اِسی طرح خدائی کلام پر عمل کرنے کے لحاظ سے بھی انبیاء میں کسی قسم کا کوئی امتیاز کرنا جائز نہیں۔ بیشک اُن کے

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اللہ کسی شخص پر سوائے اُس (ذمہ واری) کے جو اس کی طاقت میں ہو کوئی ذمہ واری نہیں ڈالتا۔ جو اُس نے (اچھا) کام کیا ہو

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ

(وہ بھی) اس کیلئے (نفع مند) ہوگا اور جو اُس نے (بُرا) کام کیا ہو (وہ بھی) اُسی پر (وبال ہوکر) پڑیگا۔ (اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ) اے ہمارے

نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ

رب! اگر (کبھی) ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمیں سزا نہ دیجیو۔ اے ہمارے رب! اور تو ہم پر (اُس طرح) ذمہ واری نہ ڈال

اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا

جس طرح تُو نے اُن لوگوں پر جو ہم سے پہلے (گذر چکے) ہیں ڈالی تھی۔ اے ہمارے رب!

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۣ

اور اسی طرح ہم سے (وہ بوجھ) نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہمیں طاقت نہیں۔ اور ہم سے درگذر کر

درجات مختلف ہوں۔ لیکن اُن پر کلام نازل کرنیوالا چونکہ ایک ہی ہے اس لئے یہ فرق کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں کہ مثلاً فلاں نبی چونکہ درجہ میں بڑا ہے اس لئے اس پر نازل ہونے والے کلام کو تو ہم مانیں گے لیکن فلاں نبی چونکہ درجہ میں چھوٹا ہے اس لئے اس پر نازل ہونے والے کلام کو ماننا ہمارے لئے ضروری نہیں۔ اس قسم کا احمقانہ فرق کرنا ایسا ہی ہے جیسے مثلاً کوئی کہے کہ میرے افسر نے فلاں حکم چونکہ رجسٹری کے ذریعہ نہیں بھیجا بلکہ عام ڈاک میں بھیجا ہے اس لئے مَیں نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ کیا جاہل سے جاہل شخص بھی اِس قسم کا عذر پیش کرسکتا ہے اور کیا اسے تسلیم کرنے کیلئے کوئی تیار ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر خدائی کلام کے متعلق یہ فرق کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے

اِس کے ساتھ ہی مومنوں کی یہ علامت بیان فرمائی ہے کہ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ یعنی وہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت میں ایک ذرا سی غفلت اور سستی بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ اِدھر اللہ تعالیٰ کا حکم سُنتے ہیں اور اُدھر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ اے ہمارے رب! ہم نے تیرا حکم سُن لیا اور ہم اِسکے دل سے فرمانبردار ہیں۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔

غُفْرَانَكَ دراصل اِغْفِرْ غُفْرَانَكَ ہے۔ یعنی غُفْرَانَكَ سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ اور معنے اِس کے یہ ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بخشش سے حصّہ دے اور ہمیں معاف فرما۔

چونکہ گذشتہ آیات میں تزکیۂ نفس کی طرف

ع ۴۰ ۸

وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۸۷) ع

اور ہمیں بخش دے۔ اور ہم پر رحم کر (کیونکہ) تو ہمارا آقا ہے پس کافروں کے گروہ کے خلاف ہماری مدد کر۔ ۱۹۴

خاص طور پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے جو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ کہنے والی ہے اور جس کا سر خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ہر حالت میں جھکا رہتا ہے۔

۱۹۴ حل لغات يُكَلِّفُ: كَلَّفَهٗ کے معنے ہیں اَمَرَهٗ بِمَا يَشُقُّ عَلَيْهِ اُسے ایسے کام کا حکم دیا جو اُس پر گراں گذرا۔ حدیث میں آتا ہے كَلِّفُنَا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا نُطِيْقُ وسلم ہمیں ایسے ہی اعمال کا حکم دیا گیا ہے جن کی بجا آوری کی ہم طاقت رکھتے ہیں۔

اِصْرًا: اَلْاِصْرُ کے معنے ہیں اَلثِّقْلُ۔ بوجھ اَلْعَهْدُ۔ پختہ عہد۔ اَلذَّنْبُ۔ گناہ۔

حَمَّلْتَهٗ: حَمَّلَهُ الْاَمْرَ کے معنے ہیں جَعَلَهٗ يَحْمِلُهٗ وَ كَلَّفَهٗ بِحَمْلِهٖ۔ اُس سے بوجھ اُٹھوایا اور بوجھ اٹھوا کر اُسے تکلیف اور مشقت میں ڈالا۔

تفسیر:۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جس کی بجا آوری کی انسان میں طاقت نہ ہو۔ یا اُس کی استعداد اور قابلیت سے بالا ہو۔ پس جبکہ اس کی طرف سے ہمیشہ ایسے ہی احکام نازل ہوتے ہیں جن پر عمل انسانی مقدرت سے باہر نہیں ہوتا تو لازماً سب ذمہ داری انسان پر ہی عائد ہوتی ہے اور اطاعت البعید کا بھی وہی مستحق ٹھہرتا ہے اور عدمِ تعمیل کی بنا پر سزا کا بھی وہی مستحق قرار پاتا ہے اسی لئے آگے چلکر اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یعنی انسان اگر اچھا عمل کرے گا تو اس کا فائدہ بھی اُسے ہی پہنچیگا۔ اور اگر بُرا کام کرے گا تو اُس کا نقصان بھی اُسے ہی ہوگا۔

ضمناً اس آیت میں اس مضمون کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ جو کام اس زمانہ میں امتِ محمدیہ کے سپرد ہوا ہے وہ اس کی طاقت اور قابلیت کے عین مطابق ہے اور ایک دن وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دنیا کو دکھا دیگی کہ وہ اس منصب کی سب سے زیادہ اہل تھی۔ اگر یہی کام پہلے کسی نبی کی اُمّت کو کرنا پڑتا تو وہ اُسے کبھی سرانجام نہ دے سکتی۔

(۲) اس آیت میں اسلام کی اس فضیلت کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کے تمام احکام میں انسان کی کمزوریوں اور ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ایسی لچک رکھی گئی ہے کہ ہر حالت میں وہ اُن پر عمل کر سکتا ہے۔ مگر باقی مذاہب اپنی تعلیم میں یا تو افراط کی طرف چلے گئے ہیں یا تفریط کی طرف اور اس طرح وہ اپنے حقیقی توازن کو کھو بیٹھے ہیں۔ اور قلوب پر انکی حکومت جاتی رہی ہے۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو فطرتِ انسانی کے مطابق تعلیم دینے کی وجہ سے انسان کے دل پر حکمرانی کر رہا ہے۔

(۳) اس آیت میں اسطرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جب تم کو تمام احکام تمہاری طاقت اور قابلیت کے مطابق دیئے گئے ہیں اور تم پر کوئی ناقابلِ برداشت

بوجھ نہیں ڈالا گیا تو اب تمہارا فرض ہے کہ تم بھی دیانتداری کے ساتھ ان احکام پر ایسا عمل کرو جیسا کہ عمل کرنیکا حق ہے۔

(۴) اس آیت میں کفارہ کا بھی رد کیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ گناہوں سے بچنا انسانی مقدرت سے بالا نہیں بلکہ ہر انسان کے اندر ایسی طاقت رکھی گئی ہے کہ وہ اگر گناہوں پر غالب آنا چاہے تو آسکتا ہے۔ پس اسکی نجات کیلئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں بلکہ انسان کو خود اپنے فطری قویٰ کو ابھارنے اور اُن سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ میں بتایا کہ ہم نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ اگر کوئی اچھا کام کرے گا تو اُسے اُس کا فائدہ پہنچیگا اور اگر کوئی بُرا کام کریگا تو اُس کا نقصان بھی اُسے ہی پہنچیگا۔

کسب اور اکتساب میں یہ فرق ہے کہ کسب کی نسبت اکتساب میں زیادہ محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے پس نیکی کے متعلق کسب اور بدی کے متعلق اکتساب کا لفظ رکھکر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیکی ایک فطری چیز ہے جس پر عمل انسان کیلئے کوئی بوجھ نہیں ہوتا لیکن بدی ایک غیر فطری چیز ہے جو اخلاقی قوتوں کو برمحل استعمال نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے مرتکب کو ایسے رستہ پر چلنا پڑتا ہے جو اس کیلئے تکلیف اور اذیت کا باعث بنتا ہے۔

پھر ان الفاظ میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نیکی تو ہر حال میں قابلِ جزا ہے۔ لیکن بدیوں میں سے صرف اس بدی کی سزا ملیگی جس میں اکتساب کا رنگ پایا جائیگا۔ یعنی قصداً اور ارادتاً اس کا ارتکاب کیا جائیگا۔

اس کے بعد تزکیۂ نفس کیلئے اللہ تعالیٰ مومنوں کو بعض خاص دعائیں سکھلاتا ہے کیونکہ دُعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا چہرہ دیکھتا ہے۔ اور دُعا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے اس کی قدرتوں پر زندہ ایمان پیدا ہوتا ہے اور پھر وہ دُعا جو اللہ تعالیٰ خود سکھائے اُسکی قبولیت میں تو کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہمارے مومن بندے ہمیشہ یہ دُعا کرتے رہتے ہیں کہ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا۔ اے ہمارے ربّ! اگر ہم کبھی بھول جائیں یا کوئی خطا ہم سے سرزد ہو جائے تو ہمیں سزا نہ دیجیو بلکہ ہم سے رحم اور عفو کا سلوک کیجیو۔ بھول جانے کے معنے یہ ہیں کہ کوئی کام کرنا ضروری ہو مگر نہ کیا جائے اور خطا کے یہ معنے ہیں کہ کام تو کیا جائے مگر غلط کیا جائے۔ بعض لوگ اس بحث میں پڑ گئے ہیں کہ نسیان اور خطا دو ہم معنے لفظ یہاں کیوں لائے گئے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا میں تمام کام دو قسم کے ہوتے ہیں کوئی کام تو ایسے ہوتے ہیں جو کرنے ضروری ہوتے ہیں مگر انسان نہیں کرتا۔ اور کوئی کام ایسے ہوتے ہیں جو انسان کرتا تو ہے مگر غلط طور پر کرتا ہے اور یہ دونوں ہی غلطیاں ہوتی ہیں۔ نسیان کے معنے بھول جانے کے ہیں اور بھولنا کرنے کے متعلق ہوتا ہے نہ کرنے کے متعلق نہیں ہوتا۔ پس لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا کے معنے یہ ہوئے کہ خدایا ایسا نہ ہو کہ جو کام ہمارے لئے کرنے ضروری ہیں وہ ہم نہ کریں اور اس طرح ہم ترقی سے محروم ہو جائیں۔ پس تو ہماری حفاظت فرما۔ اور ہمیں اس غلطی سے محفوظ رکھ۔ أَوْ أَخْطَأْنَا اور یا الٰہی یہ بھی نہ ہو کہ جو کام ہمیں نہیں کرنا چاہیئے وہ ہم کریں یا ہم کریں تو وہی جو ہمیں کرنا چاہیئے مگر غلط طریق پر کریں۔ پس نسیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کام کرنے تھے وہ انسان سے رہ جائیں اور خطا کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کام نہیں کرنے چاہیئے تھے وہ کرلئے جائیں یا جن کاموں کا کرنا ضروری تھا وہ غلط طور پر کئے جائیں۔ غرض نسیان عدمِ عمل کا نام ہے اور خطا عمل کی خرابی کو کہتے ہیں۔ اسی لئے یہاں دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ پس ان میں سے کوئی لفظ بھی زائد نہیں بلکہ ہر لفظ اپنی اپنی جگہ ضروری ہے۔ نسیان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آدمؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طٰہٰ آیت ۱۱۶) یعنی آدمؑ بھول گیا لیکن ہم نے بھی دیکھ لیا کہ اُس کے

دل میں ہمارا حکم توڑنے کے متعلق کوئی ارادہ نہ تھا۔

پھر فرماتا ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ یعنی مومن یہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ اے خدا ہم پر اس طرح ذمہ داری نہ ڈالیو۔ جس طرح تُو نے اُن لوگوں پر جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں ڈالی تھی۔

اِصْر کے ایک معنے چونکہ گناہ کے ہیں اس لئے اس دُعا کا ایک مفہوم یہ ہے کہ اے خدا تو ہم پر اس طرح گناہ نہ ڈال جس طرح تُو نے پہلی قوموں پر ڈالا۔ یعنی ہمیں اُن اعمال سے اپنے فضل سے محفوظ رکھ جن کے نتیجہ میں ہماری طرف گناہ منسوب ہوں۔ اور دنیا میں ہمیں ظالم اور روسیاہ قرار دیا جائے اور طرح طرح کے عیوب ہماری طرف منسوب کئے جائیں جیسا کہ پہلی قوموں کے ساتھ ہوا۔

اِصْر کے دوسرے معنے عَھْد کے ہیں اس لحاظ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا کے معنے یہ ہیں کہ الٰہی ہم سے کوئی ایسا عہد نہ لیجیو جس کو توڑ کر ہم تیری سزا کے مستوجب ہوں جس طرح پہلی قومیں سزا کی مستوجب ہوئیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عہد لینا بُری چیز تھی تو پھر دوسری اُمتوں سے کیوں لئے گئے۔ اور اگر اچھی چیز ہے تو اس اُمت سے کیوں نہ لیا جائے۔ بلکہ اس کے کامل اُمت ہونے کی وجہ تو ضروری ہے کہ اس کے ہر فرد سے عہد لیا جائے۔ سو یاد رکھنا چاہیئے کہ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم سے کوئی عہد ہی نہ لیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے ربّ! آپ ہم سے جو عہد لیں اُس کے متعلق ہمیں توفیق بھی عطا فرمائیں کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں اور پہلی قوموں کی طرح عہد شکن اور غدار قرار نہ پائیں۔ گویا یہ دُعا عہد سے بچنے کیلئے نہیں بلکہ عہد کی ذمہ داریوں پر باحسن طریق عمل پیرا ہونے کے لئے ہے۔

(۳) اِصْر کے ایک معنے بوجھ کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے اس کے معنے یہ ہیں کہ اے ہمارے ربّ! تُو ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر بوجھ ڈالا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ہمیں اتنی نمازیں پڑھنے کو نہ بتا کہ جو ہم پڑھ نہ سکیں کیونکہ خدا تعالیٰ پہلے ہی فرما چکا ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا خدا تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آتے ہیں وہ انسان کی طاقت اور اُس کی توفیق کے مطابق ہوتے ہیں۔ پس اس کے یہ معنے نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ بعض جرائم کی بنا پر پہلے لوگوں کے لئے جو سزائیں نازل کی گئی تھیں وہ سزائیں ہم پر نازل نہ ہوں اور ہم سے وہ غلطیاں سرزد نہ ہوں جو پہلے لوگوں سے سرزد ہوئیں اور جن کی وجہ سے وہ تباہ کر دیئے گئے۔ انہوں نے تیری نافرمانیاں کیں اور تیرے احکام کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا جس کی وجہ سے اُن پر ایسی حکومتیں مسلط ہوئیں اور ایسے قوانین اُن کیلئے مقرر کر دیئے گئے جو اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھے۔ تو ہمیں اپنے فضل سے ایسے مقام پر کھڑا کیجیو کہ ہم سے ایسی خطائیں سرزد نہ ہوں اور ہمیں ایسی سزائیں نہ ملیں جو ہمارے نفس کی طاقتِ برداشت سے باہر ہوں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ نفس کی طاقتِ برداشت کے مطابق اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی سزا ملے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر روحانی سزا انسان کی برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ یہ انسان کی رذالت ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایسی سزا کو برداشت کر لیتا ہے ورنہ اگر شرافتِ نفس ہو تو چھوٹی سے چھوٹی سزا بھی انسان کیلئے ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ چنانچہ دیکھ لو۔ جب کسی کو دوسرے سے محبت ہوتی ہے تو اُس کی معمولی سی ناراضگی کو دیکھ کر ہی اس کا دل بے چین ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ کہتا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھیں میری طرف نہیں پھیریں۔ بعض دفعہ کہتا ہے اُس نے مجھ سے اچھی طرح باتیں نہیں کیں۔ بعض دفعہ کہتا ہے اُس نے مجھ سے باتیں تو کیں مگر اُن میں بشاشت معلوم نہیں ہوتی تھی اور اس بات کا اُس کی طبیعت پر اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ وہ غمگین ہو جاتا ہے۔ پس اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمیں بڑی سزا نہ دیجیو چھوٹی سزا دیجیو بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہمیں کوئی سزا دیجیو ہی نہیں نہ چھوٹی نہ بڑی۔

پھر دنیا میں بعض مصائب ایسے بھی ہوتے ہیں جو بغیر قصور کے آ جاتے ہیں۔ قصور ہمسایہ کا ہوتا ہے اور دُکھ اُسے پہنچ جاتا ہے۔ قصور دوست کا ہوتا ہے اور سزا کا اثر اُس پر آ پڑتا ہے۔ اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ دُعا سکھلائی کہ تم یہ کہا کرو کہ ہم سے ایسی خطا یا نسیان نہ ہو جائے جس کی وجہ سے ہم تیری

سزا کے مستحق ہو جائیں۔ وہاں دوسری دُعا یہ سکھلائی کہ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ اے خدا! ایسا نہ ہو کہ قصور تو ہمارے ہمسایہ کا ہو اور سزا ہمیں مل جائے۔ یا قصور دنیا کا ہو اور اُس کی مصیبت کا اثر ہم پر آپڑے مگر یہاں ایک شرط بڑھا دی اور وہ یہ ہے کہ مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ اِس شرط کو اس لئے بڑھایا گیا ہے کہ یہاں ناراضگی کا سوال نہیں بلکہ دنیوی مصائب اور ابتلاؤں کا ذکر ہے ناراضگی بے شک چھوٹی بھی برداشت نہیں ہو سکتی مگر چھوٹی تکلیف برداشت کر لی جاتی ہے۔ پس جہاں روحانی سزا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذکر تھا وہاں تو یہ دُعا سکھلائی کہ ہم میں تیری کسی ناراضگی کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں وہ ناراضگی چھوٹی ہو یا بڑی مگر جب دنیوی تکالیف کا ذکر آیا تو یہ دُعا سکھلائی کہ چھوٹے موٹے ابتلاؤں پر مجھے اعتراض نہیں۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ میرا قدم ہمیشہ پھولوں کی سیج پر رہے۔ البتہ وہ ابتلاء جو تیری ناراضگی کا موجب نہیں اور جو دنیا میں عام طور پر آیا ہی کرتے ہیں۔ اُن کے متعلق میری صرف اتنی درخواست ہے، کہ کوئی ابتلاء ایسا نہ ہو جو میری طاقت سے بالا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ مومن ایسے ابتلاء خود چاہتا ہے بلکہ خدا تعالےٰ نے چونکہ بتایا ہوا ہے کہ مَیں مومنوں کا امتحان لیا کرتا ہوں اس لئے مومن یہ نہیں کہتا کہ خدایا میرا امتحان نہ لے بلکہ وہ کہتا ہے خدایا امتحان تو لیجیو مگر ایسا نہ لیجیو کہ میری طاقت سے بڑھ کر ہو۔

غرض جو حصہ ناراضگی کا تھا وہاں تو کہہ دیا کہ مَیں ذرا سی ناراضگی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ مگر جہاں دنیوی تکالیف اور ابتلاؤں کا ذکر تھا وہاں کہہ دیا کہ خدایا! تکالیف تو آئیں مگر ایسی نہ ہوں جو ہماری طاقت سے بڑھ کر ہوں۔

پھر فرمایا وَاعْفُ عَنَّا۔ اے خدا ہم سے عفو کر۔ یہ نَسِيْنَا کے مقابلہ میں ہے یعنی جو کام ہمیں کرنے چاہیئے تھے چونکہ ہم نے نہیں کئے اسلئے ہمیں تو معاف فرمادے۔

وَاغْفِرْ لَنَا اور جو غلط کام ہم کر چکے ہیں اُن کے خمیازہ سے ہمیں بچا لے اور ان کاموں کو نہ کئے کی طرح کر دے۔ عفو کے معنے رحم کے بھی ہوتے ہیں اور جو چیز کسی انسان سے رہ جائے اس کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ مہیا کر دی جائے۔ اس لئے وَاعْفُ عَنَّا کے یہ بھی معنے ہیں کہ جو چیز رہ گئی ہے اُس کو تُو اپنے فضل اور رحم سے ہمیں مہیا فرما دے۔ اس کے مقابلہ میں جو کام غلط ہو جائے اس کی درستی اِسی طرح ہو سکتی ہے کہ اُس کو مٹا دیا جائے۔ چنانچہ اَخْطَاْنَا کے مقابلہ میں اِغْفِرْ لَنَا رکھ دیا۔ اور غفر کے معنے عربی زبان میں مٹا دینے کے ہی ہوتے ہیں۔ پس اس کے معنے یہ ہیں کہ اے خدا جو کام ہم غلط طور پر کر چکے ہیں اُن کو مٹا دے اور انہیں نہ کئے کی طرح کر دے۔ گویا ایک طرف تو یہ کہہ دیا کہ جو کام ہم نے نہیں کیا اور اِس طرح رخنہ واقع ہو گیا ہے اُس رخنہ کو تُو اپنے فضل سے پُر کر دے اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ جو کام ہم غلط طور پر کر چکے ہیں اُن کو تو مٹا ڈال۔

وَارْحَمْنَا پھر اس کام کے نتیجہ میں ہم سے جو اور غلطیاں ہوئی ہیں اور جن ترقیات کے حصول میں روک واقع ہو گئی ہے اُن غلطیوں کے متعلق بھی ہم پر رحم فرما۔ اور ہماری ترقیات کے راستہ میں جو روکیں حائل ہو گئی ہیں اُن کو اپنے فضل سے دُور کر دے۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا تو ہمارا مولیٰ ہمارا آقا اور ہمارا مالک ہے۔ آخر ہماری کمزوریاں کسی نہ کسی رنگ میں لوگوں نے تیری طرف ہی منسوب کرنی ہیں۔ لوگوں نے یہی کہنا ہے کہ یہ خدائی جماعت کہلاتی تھی مگر اسے بھی دُکھ پہنچا۔ اور اِسے بھی دوسروں کی طرح تکلیف ہوئی۔ پس اے ہمارے مولیٰ تو ہمارا آقا ہے۔ اور ہم تیرے خادم۔ تو آقا ہونے کے لحاظ سے ہم پر رحم کر کیونکہ ہماری کمزوریاں آخر تیری طرف ہی منسوب ہونگی اور لوگ ہدایت سے محروم ہو جائیں گے

احادیث میں آتا ہے کہ غزوہ احد میں جب ابوسفیان نے بڑے زور سے کہا کہ لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ یعنی ہماری تائید میں ہمارا عزّٰی بُت ہے۔ مگر تمہاری تائید میں کوئی بُت نہیں۔ تو اُس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ تم کہو۔ لَنَا مَوْلٰی وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ ہمارا والی اور ہمارا مددگار ہمارا حیّ و قیّوم خدا ہے مگر تمہارا کوئی والی اور مددگار نہیں۔ یہ اَنْتَ مَوْلٰنَا کی سچائی کا کیسا عملی ثبوت تھا کہ تلواروں کے سایہ میں بھی انہوں نے یہی کہا کہ اللہ ہمیں بچا سکتا ہے۔

آخر میں یہ تعلیم دی کہ تم خدا تعالیٰ سے یہ دُعا بھی کرتے رہو کہ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ یعنی اے خدا ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔ ہم بے بس اور کمزور ہیں لیکن ہمارا دشمن طاقتور اور تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ ہمارا غلبہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ تو ہمارے ساتھ ہو۔ اور اپنے رحم اور کرم سے کام لیکر ہمارے ایک ایک آدمی کے اندر ایسی رُوح پھونک دے کہ وہ سو سو بلکہ ہزار ہزار مخالف پر بھی بھاری ہو اگر تو اپنے فضل سے ایسے سامان پیدا فرما دے تو ہم بچ سکتے ہیں ورنہ ہمارے بچاؤ کی اور کوئی صورت نہیں۔ پس اے ہمارے رب! جو لوگ ایسے کام کر رہے ہیں جن سے اسلام کی ترقی میں روک واقع ہوتی ہے اُن پر تو ہمیں غالب کر اور ایسے سامان پیدا فرما جو تیری تبلیغ اور تیرے نام کو دنیا میں پھیلانے کا باعث ہوں۔

پھر یہ دُعا صرف مادی غلبہ کے لئے ہی نہیں بلکہ روحانی رنگ میں بھی دشمنوں پر غالب آنے کیلئے ایک عاجزانہ پکار ہے اور اس میں خدا تعالیٰ کے حضور یہ عرضداشت پیش کی گئی ہے کہ اے ہمارے رب! اگر ہمارے اندر تیرے اِس پاک رسول پر ایمان لانے کے نتیجہ میں کوئی تغیّر پیدا نہ ہوا اور کفار میں اور ہم میں ایک نمایاں رُوحانی امتیاز اور فرق لوگوں کو محسوس نہ ہوا۔ ہمارے اخلاق اور کردار اُن سے بلند نہ ہوئے اور ہمارے معاملات اُن سے بہتر نہ ہوئے تو دنیا ہمیں طعنہ دے گی کہ اِنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر کیا فائدہ اٹھایا۔ اِن میں تو کوئی بھی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ پس اے خدا تو اپنے فضل سے ہمیں اپنے اندر ایسا نیک تغیّر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے رحم اور کرم کو جذب کر لیں اور کفار پر ہمیں جسمانی رنگ میں ہی نہیں بلکہ اخلاق اور روحانیت کے لحاظ سے بھی ایک نمایاں تفوق اور غلبہ حاصل ہو جائے اور تیرا دین دنیا کے کناروں تک پھیل جائے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کلیدِ مضامین

جلد دوم

اشاریہ کلیدِ مضامین

تفسیرِ کبیر جلد دوم

کلید مضامین

(مرتبہ :- سید عبدالحی ایم اے)

فضیلت

تعلیم

عبادات

اسلامی نظام

اسلامی حکومت

اشاعتِ اسلام

غلبۂ اسلام

اسلام اور جماعتِ احمدیہ

مسلمانوں کے لیے قابلِ توجہ

اسلامی یونیورسٹیاں

اُسوۂ حسنہ

اِشاعت

اَشہر الحج

اَشہر الحُرم (عزت والے مہینے)

اِطاعت

امانت

اُمّتِ موسویہ

امّتِ عیسویہ

اُمّتِ محمدیہ

مقام

امتِ محمدیہ کا نصب العین

امن

امر

امیر

انجیل

انسان

انصار اللہ

انصار مدینہ رضی اللہ عنہم

انعام

انفاق فی سبیل اللہ

انقلاب

ت

تابوت

تبلیغ

تثلیث

تجارت

تحویل قبلہ

دیکھئے قبلہ

تخلیقِ کائنات

تلبیہ

تلقیح

تمتُع

تمثیل

تمدّن

توبہ

توحید

تورات (نیز دیکھئے بائیبل)

توکّل

تہجّد

تہوّر

ج

جادو (دیکھئے عنوان سحر)

جارحیّت

٭

جامعہ ازہر

جان

جبر

جبر و قدر (نیز دیکھئے تقدیر)

جذبات

جزع فزع نیز دیکھئے صبر

جماعتِ احمدیہ

حُجَّت

حجرِ اسود

حدیث

احادیث کا ترجمہ

حکومت

حلال (نیز دیکھئے طیب۔ حرام)

حلالہ

حواری

خلافتِ اندلس

خلافتِ عباسیہ

خلع

خلق ج اخلاق

خنزیر

خواب (نیز دیکھئے عنوان رویاء۔کشف)

دل

دلیل

دماغ

دنیا

دیّت

۞

رونا

رویاء (نیز دیکھئے خواب)

رویت

رہبانیّت

شعائر اللہ

شعر

شعور

شفاعت

عمل

عورت

عُود

عہد

عیسائیت

تاریخ

عقائد

☆

قبض وبسط

قتل

قتلِ اولاد

قدر

قِران

قرآنِ کریم

نزول

قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

امتیازی خصوصیات

تعلیم

ترتیب اور ظاہری محاسن

قصاص

قلب (نیز دیکھئے دل)

قمری کیلنڈر

قولِ معروف

قوم

قیامت (نیز دیکھئے آخرت اور حیات بعد الموت)

قیدی

ک

کافر

کامیابی

کان

کائنات

گ

منافق / نفاق

منصبِ خلافت (تصنیف حضرت مصلح موعودؓ)

منعم علیہ گروہ

مواخذہ

موت

مؤلّفۃ القلوب

مومن (نیز دیکھئے ایمان)

مہدی

مقام

نبی پر ایمان اور اس کی اطاعت

خصائص

اقسام

غیر تشریعی

نبوّت اور اُمّتِ محمدیہ

مخالفت

متفرق

نجات

نِدّ

نَذر

نسخ فی القرآن

نسیان

نشان

نصیحت

نظام

نفس کشی

نفل

نکاح

نماز

☆

نبی آخرالزماں کی انتظار

یہودِ مدینہ

اسلام کے خلاف سازشیں

اَسماء

ب

تاریخ:

د

ڈ

ذ

ر

ز

مقام

ردِّ الوہیت

غ

دعویٰ

مقصدِ بعثت:

مصداق/مصدق

خَاتَمَ النَّبِیّٖن

فضائل:

صداقت:

ن

و

ھ

ی

مقامات